فی ظلالِ القرآن

پارہ ۹ تا ۱۲

جلد سوم

سیّد قطب شہید

ترجمہ

سیّد معروف شاہ شیرازی

ادارہ منشوراتِ اسلامی

بالمقابل منصورہ مُلتان روڈ لاہور

تفسیر	------------	فی ظلال القرآن
مصنف	------------	سید قطب شہید ؒ
مترجم	------------	سید معروف شاہ شیرازی
ناشر	------------	سید عارف شاہ شیرازی
جلد سوم	------------	پارہ ۹ تا ۱۲
اشاعت دوم	------------	ستمبر ۱۹۹۷ء
تعداد	------------	۱۱۰۰
مطبع	------------	عید محمد پریس
ہدیہ	------------	۲۵۰ روپے

--- ○○○ ---

عرض ناشر

شہید اسلام سید قطبؒ ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ۱۹۰۳ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے ۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے ۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دار العلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی ۔ اس اسکول میں طلباء کو دار العلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوکر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دار العلوم میں داخل ہوئے ۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی ۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے ۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرو اشاعت نے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطبؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبد السلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے ۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا' اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کیمونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں ۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے ۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

تفسیر فی ظلال القرآن ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی' جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے ۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی ۔ آپ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی ۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے ۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے ۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے ۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے ۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ متاثر ترین تفسیر ہے ۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے' الفاظ اور معنی کا دریا ہے ۔ جس میں تحقیق' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں ۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے ۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے ۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیاں میں ہے ۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے ۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے' اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے ۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں ۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔

مترجم سید معروف شاہ شیرازی

سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں ہروڑی میں پیدا ہوئے ' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے ' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی ' بعد ۱۹۶۳ میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے عربی کا امتحان پاس کیا اور بعد میں ۱۹۶۰ میں پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ گورنمنٹ ہائی سکول بٹل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ "اسوہ" راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے "اسوہ ڈائجسٹ" کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو "اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو" "اسلام میں جرم و سزا" (دو حصے) "حسن البناء شہید کی یادداشتیں" اور "نشانات راہ" کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

لیکن ۱۹۷۰ میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے۔پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران "سیرت القرآن" حصہ اول دوم "اسلامی انقلاب کا منہاج" "اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ" "مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب" "سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ" "جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر" اور انگریزی کی کتاب "The Shape Of Basic Organs in Islamic State" ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمہ کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی ؒ سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے 'تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی ؒ کے ساتھ بھی رہے 'بلکہ مولانا مودودی ؒ اکثر انہیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے ' ۱۹۶۲ میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے 'قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے۔موصوف آجکل نیم جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی صوبائی شوری کے بھی منتخب رکن ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب "حرمت سود" "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" "کتاب نکاح" "تحریکات اسلامیہ" "غربت اسلام کی نظر میں" "مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار" کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اب فی ظلال القرآن کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی مزید ۳ جلدیں 'جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

جلد سوم

سورۃ الاعراف ـ ۷	آیات	۹۴ -- تا -- ۲۰۶
سورۃ الانفال ـ ۸	آیات	۱ -- تا -- ۷۵
سورۃ التوبہ ـ ۹	آیات	۱ -- تا -- ۱۲۹
سورۃ یونس ـ ۱۰	آیات	۱ -- تا -- ۱۰۹
سورۃ ھود ـ ۱۱	آیات	۱ -- تا -- ۱۲۳
سورۃ یوسف ـ ۱۲	آیات	۱ -- تا -- ۵۳

---m m m---

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

فہرست جلد سوم

پارہ نمبر- ۹------- سورۃ الاعراف - ۷

سورۃ الانفال ـ ۸

پارہ نمبر- ۱۰

سورۃ التوبہ-۹

پارہ نمبر- ۱۱

سورۃ یونس -- ۱۰

پارہ -- ۱۲.......... سورۃ ھود -- ۱۱

سورۃ یوسف -- ۱۲

---m m m---

فی ظلال القرآن

پارہ ۔۔۔۔۔ ۹

سورۃ الاعراف ۔ ۷

۹۴ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۲۰۶

درس نمبر ۸۷ ایک نظر میں

اس سورہ میں اب تک کے مضمون میں یہ سبق گویا ایک وقفہ ہے ۔ اس سے قبل قوم حضرت نوح ' قوم ہود ' قوم صالح ' قوم لوط ' اور قوم شعیب علیہم السلام کے جو قصے بیان کئے گئے ۔ اس وقفے میں ان پر مجموعی تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اور یہ وقفہ اس لئے کیا گیا تاکہ اس میں اس سنت الٰہیہ کا بیان کیا جائے جو اس کرۂ ارض پر جاری و ساری ہے اور اس دنیا کی ہر بستی کے مکذبین پر تقدیر الٰہی نے اسے نافذ کیا ہے ' یہاں لفظ ''قریہ'' استعمال کیا گیا جس سے مراد کوئی بڑا شہر ہے ' یا کوئی موجود مرکزی تہذیب ہے ۔ یہ سنت الٰہیہ کا واحد اور اٹل قانون ہے اور اس کا نفاذ اللہ کی جانب سے تمام مکذبین پر ہوتا ہے ۔ اور اسی سنت الٰہیہ سے انسانی تاریخ بنتی ہے ' بلکہ انسانی تاریخ کا اصلی پہلو ہی سنت الٰہیہ ہے ۔ اور سنت الٰہیہ کا یہ کام اور غرض و غایت ہے کہ وہ جھٹلانے والوں کو رنج و الم میں مبتلا کرتی ہے ۔ شاید کہ ان کے دل پسیج جائیں اور نرم ہو کر اللہ کی طرف مائل ہو جائیں اور اللہ کی حقیقت الوہیت اور اپنی حقیقت عبودیت کو اچھی طرح معلوم کر لیں ۔ اور اگر وہ پھر بھی متوجہ نہ ہوں اور انہیں ہوش نہ آئے تو پھر اللہ ان مکذبین پر اپنی نعمتوں کی فراوانی کر دیتا ہے ۔ اور ان پر ہر طرف سے سہولیات اور نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور پھر ان کی آبادی بڑھ جاتی ہے ۔ وہ ناز و نعمت میں گھر کر عیاشیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ ان کے لئے آزمائش ہوتی ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں وہ جن مشکلات میں مبتلا ہوئے ہیں ایسی ہی مشکلات ان سے قبل ان کے آباؤاجداد پر بھی نازل ہوئی تھیں اور دنیا کے حالات ایسی ہی ڈگر پر نشیب و فراز کے ساتھ چلتے رہتے ہیں وَقَالُوا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ (اور وہ کہتے ہیں کہ ایسی ہی مشکلات میں ہمارے آباء بھی مبتلا ہوئے تھے اور ایسی ہی خوشحالی بھی ان پر آئی تھی ۔) وہ ایسی ہی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور غفلت کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں کہ ان کو اللہ کی پکڑ آلیتی ہے اور ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ فراخیوں اور فراوانیوں اور مشکلات و مصائب میں اللہ کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے ۔ اس آزمائش میں اللہ کی جو حکمت ہوتی ہے وہ اس کا ادراک نہیں کر پاتے اور اللہ کے غضب میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور جو غافل اور لاپرواہ ہوتے ہیں ان کے انجام سے وہ نہیں ڈرتے اور وہ اسی طرح عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح حیوان زندگی بسر کرتے ہیں ۔ یہ اسی مدہوشی کی حالت میں ہوتے ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کا نزول ہو جاتا ہے ۔ اگر وہ ایمان لاتے اور خدا خوفی کا رویہ اختیار کرتے تو ان کا یہ حال نہ ہوتا بلکہ ان پر آسمانوں سے مزید برکات نازل ہوتیں اور زمین سے اور آسمانوں سے ان پر رزق نازل ہوتا اور ان پر اللہ اپنی طمانیت کی وہ حالت نازل کرتا جس سے ان کی زندگی نہایت اطمینان سے بسر ہوتی اور اس اطمینان اور فراخی کے بعد ان پر زوال اور بربادی کی کوئی حالت نہ آتی ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ڈراتے ہیں جو ان ہلاک کئے جانے والوں کے بعد زمین کے وارث اور اہل اقتدار بنائے گئے ۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ غفلت اور غرور سے اپنے آپ کو بچاؤ اور ہر وقت بیدار رہو اور خدا تعالیٰ سے

ڈرتے رہو۔ ان کو اس تاریخی حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں اللہ نے کئی اقوام کو پے در پے ہلاک کیا اور ان کی جگہ دوسری اقوام کو مواقع فراہم کئے مگر انہوں نے ہلاک ہونے والوں کے انجام سے نصیحت نہ پکڑی لہذا بستیوں والوں کا انتظار اللہ کا قانون مکافات کر رہا ہے اور انسانی تاریخ میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

یہ وقفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب پر ختم ہوتا ہے۔ آپ کو کہا جاتا ہے تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا (یہ قومیں جن کے قصے ہم تمہیں سنا رہے ہیں) تاکہ آپ کو ان لوگوں کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کا یہ انجام سنت الہیہ کے مطابق ہوا۔ فرمایا جاتا ہے وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا) یہ آخری رسول اور اس آخری رسول کی امت تمام رسولوں کی اخلاقی دولت کے وارث ہیں اور صرف یہ رسول اور ان کی امت ہی ان تاریخی واقعات و اطلاعات سے فائدہ اور نصیحت لیتے حاصل کرتے ہیں۔

---O O O---

درس نمبر ۷۸ تشریح آیات

۹۴--- تا --- ۱۰۲

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ
لَعَلَّهُمۡ یَضَّرَّعُوۡنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَکَانَ السَّیِّئَةِ الۡحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوۡا وَّ قَالُوۡا
قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹۵﴾
وَلَوۡ اَنَّ اَهۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَاتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ
الۡاَرۡضِ وَلٰکِنۡ کَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۹۶﴾

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو' اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں - پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ "ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے ہی رہے ہیں -" آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی - اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا' لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے -"

یہاں سیاق کلام سے غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ کسی متعین حادثے کو بیان کیا جائے بلکہ یہاں مقصد نموی سنت الٰہیہ کا بیان ہے - یہاں کسی خاص قوم کے خدوخال بیان کرنا مطلوب نہیں ہیں' بلکہ اللہ کے نظام قضا و قدر کے اقدامات کا بیان مقصود ہے - چنانچہ یہاں اللہ کے اس ناموس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے - جس کے مطابق یہ پورا نظام کائنات چل رہا ہے اور تمام واقعات اس کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور اس ناموس کی وجہ سے اس جہان میں انسانی تاریخ اپنا سفر کرتی ہے اور "رسالت" بھی اس کرۂ ارض پر ناموس الٰہی کا ایک حصہ ہے کیونکہ ناموس الٰہی بھی دراصل ایک وسیع تر اور عظیم تر رسالت ہے - یہ کہ اس جہان میں واقعات بغیر کسی پروگرام کے وقوع پذیر ہوتا ہے وہ تقدیر الٰہی سے مطابق

ہوتے ہیں' اس کی حکمت کے عین مطابق ہوتا ہے اور اس کے مقرر کردہ مقاصد و اہداف کے مطابق ہوتا ہے اور آخری نتائج مشیت الٰہیہ کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں اور یہ مشیت سنت الٰہیہ کے مطابق کام کرتی ہے اور یہ ناموس اور سنت دونوں مشیت الٰہیہ کے وضع کردہ ہیں۔

ماضی کی ان بستیوں کو جو واقعات پیش آئے وہ اللہ کی بے قید مشیت کی وضع کردہ سنت کے مطابق پیش آئے اور اسی طرح بعد میں آنے والی اقوام کو بھی اسی عالمی ناموس کے مطابق چلایا جائے گا۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق انسان کا ارادہ اور اس کی جدوجہد' اس کی تاریخ کی تشکیل میں ایک اہم عنصر ہے' لیکن انسانی جدوجہد اور انسانی ارادے اللہ کی بے قید مشیت کے وسیع دائرے کے اندر رہتے ہیں اور للہ کا نظام قضا و قدر ان کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْط "اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے" انسان کا یہ ارادہ اور اس کی یہ جدوجہد اللہ کے نظام مشیت اور نظام قضا و قدر کے اندر رہتے ہوئے اس پوری کائنات کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ انسان اور اس کی جدوجہد اس کائنات سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور متاثر کرتے بھی ہیں' گویا عوامل اور مناظر کا ایک بڑا مجموعہ ہے جس سے انسانی تاریخ تشکیل پاتی ہے اور یہ دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے مقابلے میں انسانی تاریخ کی اقتصادی تعبیر اور انسانی تاریخ کی طبیعاتی تعبیر اور انسانی تاریخ کی جغرافیائی تعبیر نہایت ہی محدود اور چھوٹے دائرے نظر آتے ہیں جبکہ اسلامی تصور تاریخ کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں یہ محدود دائرے انسان کے بنائے ہوئے کھیل نظر آتے ہیں اور بے ڈھب لکیریں دکھائی دیتی ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ (۹۴) "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو' اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اتر آئیں۔"

یہ بات محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں ہوتی' کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بہت ہی بلند ہے کہ وہ لوگوں کو تنگی اور سختی میں محض کھیل تماشے کی غرض سے مبتلا کرے اور ان پر جسمانی اور مالی پریشانیاں آئیں۔ اللہ کی شان سے یہ تصور مطابقت ہی نہیں رکھتا کہ لوگوں کو رنج و محن میں اس لئے مبتلا کیا جائے کہ الہٰ ان سے انتقام لیتا ہے اور کینہ کی تسکین کرتا ہے۔ جیسا کہ تمام بت پرستانہ مذاہب میں الہوں کی طرف اس قسم کے قصے مشہور ہیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الہوں کا کام یہ ہے کہ وہ عبث مشغلوں اور انتقامی کارروائیوں میں ہر وقت لگے رہتے ہیں اور انسانوں کے معمولی جرائم پر سخت سے سخت انتقامی کارروائی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے پھر لوگوں کو سختیوں اور مشکلات سے کیوں دوچار کیا جاتا ہے؟ صرف اس لئے کہ جن لوگوں کی فطرت بالکل مسخ نہ ہو چکی ہو اور اس میں بھلائی کی کچھ نہ کچھ رمق موجود ہو' وہ فطرت جاگ اٹھے۔ اور وہ دل نرم ہو جائیں جن میں کچھ بھی لچک موجود ہے اور جو بالکل ہی پتھر نہ بن گئے ہوں اور یہ کہ یہ ضعیف انسان اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے جو قہار و جبار ہے۔ اور وہ عاجزی اور تضرع سے اللہ کی طرف متوجہ ہوں' اور اس کی رحمت کے طلبگار ہوں۔ اور اس عاجزی اور تضرع کے اظہار کے ذریعے اس بات کا اعلان کر دیں کہ وہ اللہ کے بندے ہیں' کیونکہ

اللہ کی بندگی کرنا انسانی وجود کی اصل غرض و غایت ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی جانب سے عاجزی کرنے اور بندگی کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ انسان کی ضرورت اور اس کا مقصد وجود ہے ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (٥٦) مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (٥٧) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں ۔ میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ ان سے کھانے کا طلبگار ہوں ۔ حقیقت یہ ہے کہ رزاق اور پختہ قوت کا مالک تو صرف اللہ ہی ہے ۔" اور حدیث قدسی میں آتا ہے کہ "اگر تمام انسان اور جن ' ایک شخص کے دل کی طرح اللہ کی عبادت اور بندگی پر جمع ہو جائیں تو یہ مکمل اجتماع اللہ کی حکومت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا اور اگر تمام جن و انس ایک شخص کے دل کی طرح اللہ کی معصیت پر جمع ہو جائیں تو بھی اللہ کی حکومت سے کسی چیز کو کم نہیں کر سکتے ۔" لیکن لوگوں کی جانب سے اعلان بندگی اور اللہ کے سامنے عجز و نیاز مندی کا اظہار خود ان کے لئے مفید ہے ۔ انسان کی زندگی اور انسان کا معاشی نظام بھی اس سے اصلاح پذیر ہوتا ہے جب لوگ صرف اللہ کی بندگی کا اظہار کرتے ہیں تو وہ اللہ کی بندگی اور غلامی کے سوا تمام بندگیوں اور غلامیوں سے نجات پا لیتے ہیں ' وہ شیطان کی غلامی سے بھی بچ جاتے ہیں جو انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہے ' اور اس سورہ کے آغاز ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ شیطان کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرے ۔ اسی طرح اللہ کی غلامی اختیار کر کے انسان اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے بھی نجات پاتے ہیں اور وہ شیطان کی پیروی کرنے سے حیا کرتے ہیں اور اس طرح ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے کسی قول و عمل سے اللہ کے غضب کے مستحق نہیں ہوتے ۔ وہ مشکل حالات میں بھی اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں اور اس راہ پر استقامت کے ساتھ گامزن ہوتے ہیں جو انہیں آزادی کی طرف لے جاتی ہے ' جس میں ان کی اخلاقی تطہیر ہوتی ہے اور وہ ہوا و ہوس کے غلام بھی نہیں ہوتے اور دوسرے افراد کی غلامی سے بھی بالا ہو جاتے ہیں ۔

چنانچہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر بستی کے باشندوں کے لئے ایک نبی بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اسے جھٹلائیں اور پھر انہیں پکڑا جائے اور اس پکڑ کا آغاز اس طرح ہو کہ ان کو نفسیاتی اور روحانی مصائب میں مبتلا کر دیا جائے اور ان کو بدنی اور مالی تاوان کی اذیت کا مزہ چکھایا جائے تاکہ یہ اذیتیں سہ کر ان کے دل دوبارہ زندہ ہوں ۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان رنج و الم میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی شخصیت کے اندر سے کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں اور اس کے اندر تہذیب آ جاتی ہے اور اندر سے خیر و برکت کے خشک سوتے تازہ ہو کر پھوٹ نکلتے ہیں ۔ زندہ دلوں کے اندر احساس تیز ہو جاتا ہے اور انسان اللہ کی رحمتوں کے سائے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر جب اندوہناک لمحات میں گھرے ہوئے ضعیف آدمی پر اللہ کی رحمت کی ہواؤں کے خوشگوار جھونکے چلنے لگتے ہیں تو ایسا انسان نہایت ہی اطمینان اور سکینت محسوس کرتا ہے ۔ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ "شاید کہ وہ عاجزی پر اتر آئیں ۔"

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ "اس کے بعد ہم نے ان کی بدحالی کو خوشحالی سے بدل دیا ۔" سختی کی

جگہ نرمی آگئی' تنگی کی جگہ فراوانی آگئی' غربت کی جگہ انعامات آگئے' بیماری کی جگہ صحت آگئی' اولاد کی کمی کی جگہ کثرت اولاد آگئی' ہر چیز میں کمی کی جگہ کثرت نے لے لی اور خوف کی جگہ امن آگیا۔ چنانچہ عیش و آرام کے تمام ساز و سامان مہیا ہو گئے' ناز و نعمت اور کھانے پینے کے لئے سامان فراہم ہو گئے' لیکن اللہ کے اس اصول کے مطابق دراصل یہ سب کچھ ایک قسم کی آزمائش تھی۔

اگر کسی کو مصائب میں مبتلا کر کے آزمائش میں ڈالا جائے تو بعض اوقات اس پر لوگ صبر کرتے ہیں اور اکثر لوگ اس کو برداشت کرتے ہیں۔ کیونکہ شدت سے فریق مخالف میں دفاعی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ظلم اور شدت کا شکار شخص بعض اوقات اللہ کو یاد کر کے قوت حاصل کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں بھلائی کی کوئی رمق ابھی باقی ہو۔ ایسا شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے عاجزی اور زاری کرتا ہے اور ذکر الٰہی کے سایہ میں وہ اطمینان و سکون حاصل کر لیتا ہے۔ یاد رہے کہ ذکر الٰہی کے آفاق وسیع ہیں اور اس کے میدان طویل و عریض ہیں اور اللہ کی جانب سے ذاکرین کے لئے جو وعدے ہوتے ہیں' ان میں ان کے لئے خوشخبری ہوتی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو مال و دولت کی فراوانی کے ذریعے آزماتا ہے تو یہ آزمائش غربت و افلاس کے مقابلے میں بہت سخت ہوتی ہے۔ دولت مندی کی وجہ سے انسان غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سرکشی اختیار کر لیتا ہے اور بہت ہی کم لوگ ایسے حالات میں صبر کر سکتے ہیں اور ایسے کم لوگ ہی پھر اللہ کے صحیح بندے ہوتے ہیں۔

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَّقَالُوا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ

وَالسَّرَّآءُ "پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ "ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے ہی رہے ہیں۔"

یعنی یہ لوگ پھلے پھولے' اور زمین میں پھیل گئے' عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے' ان کو زندگی کی تمام سہولیات فراہم ہو گئیں اور انہوں نے سب کچھ کرنا شروع کر دیا۔ کسی معاملے میں احتیاط یا ڈر ان کی راہ میں حائل نہ رہا۔ عَفَوْا کے لفظ سے جہاں کسی چیز کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس سے لاپرواہی کی نفسیات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو خفیف اور ہلکی سمجھنے لگے۔ ہر معاملے میں خواہ وہ شعوری دنیا سے متعلق ہو یا طرز عمل کے ساتھ متعلق ہو' اس میں وہ سہل انگار ہو گئے تھے۔ یہ نفسیاتی اور عملی صورت حالات ان تمام لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے جن لوگوں کو مال و دولت کی فراوانی حاصل ہو اور وہ بڑے آرام کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ خصوصاً جبکہ عیش کوشی میں وہ ایک طویل عرصے تک غرق رہے ہوں' خواہ افراد ہوں یا اقوام ہوں۔ گویا ان کے دل و دماغ سے سنجیدگی اور احساس جاتا رہتا ہے اور وہ بڑے بڑے معاملات میں بھی سنجیدہ ہونا پسند نہیں کرتے۔ وہ کھلے ہاتھوں خرچ کرتے ہیں' وسیع پیمانے پر داد عیش دیتے ہیں' عیش و عشرت میں ہر وقت گم رہتے ہیں اور نہایت ہی لاپرواہی سے معاملات کو لیتے ہیں اور ایسے ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں جس کے بارے میں سن کر بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ ایسے افعال کا ارتکاب بڑی بے باکی سے کرتے ہیں وہ اللہ کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ وہ عوام سے شرم محسوس نہیں کرتے۔ ان سے ہر قسم کی ذات کا صدور بڑی لاپرواہی سے ہوتا ہے۔ وہ اس کائنات میں جاری سنت الٰہیہ کو نہیں پاتے۔ ان آزمائشوں کو نہیں سمجھتے' اور یہ

سمجھتے ہیں کہ یہ معاملات یہاں یونہی چلتے رہتے ہیں' ان کا کوئی معلوم سبب نہیں ہے اور نہ یہ کائنات کسی منصوبے کے ساتھ چل رہی ہے اور یہ کہ (ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں) قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ ہم نے مشکلات کا دور گزار لیا ہے' اب ہمارے اچھے دن آئے ہیں اور یہ دن بہت ہی اچھی طرح بسر ہو رہے ہیں اور یہ بغیر کسی منصوبے کے گزر رہے ہیں۔

یہ وہ آخری حد ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں ڈوب جاتے ہیں' ہر نصیحت کو بھول کر لہو و لعب اور سرکشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اس حد پر انجام بد ان کو آ لیتا ہے اور یہ سنت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے۔ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۹۵) "آخر کار ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔"

ان کی غفلت' غرور اور اللہ سے ان کی دوری پر ان کو یہ سزا دی گئی۔ انہوں نے اپنی خواہشات کو کھلی چھٹی دے دی تھی۔ وہ کسی بھی برے کام کے ارتکاب میں کوئی باک نہ کرتے تھے۔ اور ان کے دلوں کے پیمانے سے خدا خوفی کا آخری قطرہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

یہی ہے اللہ کی سنت' اس کائنات میں اور وہ اسی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ یہ سنت اللہ کی مخلوق میں اس کی مشیت کے مطابق کام کرتی ہے۔ انسانی تاریخ کا قافلہ انسان کے ارادے اور عمل کے ساتھ' اللہ کی قدرت اور مشیت کے وسیع دائرے میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اور قرآن کریم اس سنت الٰہیہ کو لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور بار بار انہیں اس سے ڈراتا اور متنبہ کرتا ہے۔ یہ فتنہ عذاب الٰہی کا فتنہ ہے اور اس میں انسان کو مصائب و مشکلات میں مبتلا کر کے آزمایا جاتا ہے اور اس میں انسان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت چوکنا رہے اور برے انجام سے بچتا رہے' کیونکہ یہاں مکافات عمل کا قانون جاری و ساری ہے اور مکافات عمل کا قانون اٹل ہے۔ اس لئے جو شخص چوکنا نہ رہے' جس نے خدا خوفی کا راستہ نہ اپنایا' اور احتیاط نہ کی وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ اور وہ اپنے آپ کو ایسے عذاب سے دوچار کرے گا جو ٹلنے والا نہ ہو گا۔ اور اللہ کسی نفس پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا' لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔"

یہ اللہ کی سنت جاریہ کا ایک دوسرا پہلو ہے' اگر بستیوں کے لوگ جھٹلانے کے بجائے مان لیتے اور بدکرداری کے بجائے تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔ (بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ) اور بلا حساب ان کو دیتا رہتا' آسمانوں سے اور زمین سے ان پر برکات کی بارش ہوتی۔ قرآن نے جو انداز تعبیر اختیار کیا ہے' اس کے پیش نظر ہم اسے ہر طرح کی فراوانی سے تعبیر کر سکتے جو کسی ایک جنس ضرورت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہر قسم اور ہر نوع کی فراوانی۔

اس آیت اور اس سے قبل کی آیت میں ہم ایک عظیم حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں ۔ اس حقیقت کا تعلق بیک وقت انسانی نظریات اور انسانی زندگی کے حقائق سے بھی ہے اور اس پوری کائنات کے حقائق سے بھی ہے ۔ اور ان کے اندر انسانی تاریخ کا اہم عنصر اور عامل بھی بیان کیا گیا ہے ۔ اس اہم فیکٹر کو دنیا کے انسانوں کے وضع کردہ نظامہائے حیات نے پوری طرح نظر انداز کیا ہے بلکہ اس کا انکار کیا ہے ۔

وہ فیکٹر ہے ایمان و عقیدہ اور خدا خوفی کا ۔ ایمان و عقیدے اور خدا خوفی کا مسئلہ انسانی زندگی کے حقائق سے جدا چیز نہیں ہے اور نہ وہ انسانی تاریخ سے کوئی الگ چیز ہے بلکہ ایمان باللہ اور خدا خوفی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی برکات نازل فرماتے ہیں ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ ایفائے عہد کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔

ہم لوگ جو اللہ پر ایمان لانے والے ہیں ' ہمارا شیوہ تو یہ ہے کہ اللہ کے اس عہد کو مومنانہ دل سے لیتے ہیں ۔ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے علل و اسباب کو سمجھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے ' اور اس آیت کے مدلول و مفہوم کی تصدیق میں لحہ بھر تردد بھی نہیں کرتے ۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان تو ہے ہی ایمان بالغیب اور اس ایمان کے تقاضے کے طور پر ہم اللہ کے اس عہد کی تصدیق کرتے ہیں ۔

اس کے بعد ' ہم پھر اللہ کے اس عہد پر غور و فکر کرتے ہیں کیونکہ اللہ نے خود حکم دیا ہے کہ تم قرآن میں غور و فکر کرو اور غور و فکر کے بعد ہمیں اس بات کی ماہیت و حقیقت کا علم بھی ہو جاتا ہے ۔

اللہ پر ایمان لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی فطرت زندہ ہے اور فطری حقائق کے ادراک اور قبول کرنے کی اہلیت اس میں موجود ہے ۔ ایسے شخص کا ادراک سچا ہے اور اس کی انسانی بنیاد صحیح و سالم ہے ۔ اور اس شخص کے دماغ میں اس قدر وسعت ہے کہ وہ اس کائنات کے حقائق کا ادراک کر سکے ۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جو عملی زندگی میں انسان کی کامیابی کے ضامن ہیں ۔

اللہ پر ایمان ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو آگے بڑھاتی ہے ' یہ انسانی شخصیت کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے انہیں ایک جہت اور رخ پر ڈال دیتی ہے اور اس جہت میں انسانی شخصیت اللہ کی قوت کی مدد سے آگے بڑھتی ہے اور اس زمین پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کے لئے جدوجہد کرتی ہے ۔ اس کرۂ ارض کی تعمیر میں لگ جاتی ہے ۔ نتیجۃ اس کرۂ ارض سے فتنہ و فساد کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور انسان اس زمین کی ترقی اور تعمیر میں لگ جاتا ہے اور اس طرح انسان عملی زندگی میں کامیاب رہتا ہے ۔

اللہ پر پختہ ایمان انسان کو خود اپنی خواہشات کی غلامی اور دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دیتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ صرف اللہ کا غلام اور دوسری تمام غلامیوں سے آزاد انسان ہی اس کرۂ ارض پر خلافت راشدہ کا صحیح نظام قائم کر سکتا ہے ۔ ایسا شخص ان لوگوں سے قوی تر ہو گا جو ایک دوسرے کے غلام ہیں یا اپنی خواہشات کے غلام ہیں ۔

خدا کا خوف ایک دانشمندانہ بیداری ہے ۔ اس سے انسان سرکشی ' غرور ' بے راہ روی جیسے اخلاقی عیوب سے محفوظ ہو جاتا ہے ۔ اس کی سرگرمیاں اعتدال اختیار کر لیتی ہیں اور اس کی زندگی کا اسلوب سنجیدہ ہو جاتا ہے ۔ انسان کی پوری جدوجہد محتاط ہو جاتی ہے ۔ اور وہ سرکشی کا ارتکاب کر کے اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھتا اور اپنی زندگی کو صالحانہ حدود میں رکھتا ہے ۔

ایک صالح انسان کی زندگی کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی متوازن اور اعتدال پر مبنی ہوتی ہے ۔ وہ آگے بڑھنے

اور رکاوٹوں کے درمیان توازن پیدا کر لیتا ہے۔ وہ زمین پر محنت کرتا ہے اور آسمان کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ ہوائے نفس ' سرکشی اور تجاوز سے آزاد ہوتا ہے اور اس کے دل میں ہروقت خوف خدا ہوتا ہے۔ ایسا شخص ایک صالح 'نتیجہ خیز اور مفید کردار کا مالک ہوتا ہے اور ایسا ہی شخص اللہ کی امداد کا مستحق ہوتا ہے اور اس کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے اوپر برکات الہی کے سائے نزول کرتے ہیں۔ ان کے کام میں خیر و برکت عام ہوتی ہے اور اس کی زندگی پر فلاح سایہ فگن ہوتی ہے۔ اس کی زندگی بظاہر اسباب کے مطابق چل رہی ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایک غیبی قوت اس کی مددگار ہوتی ہے۔

وہ برکات جو مومنین اور اہل تقویٰ پر سایہ فگن ہوتی ہیں وہ مختلف النوع ہوتی ہیں اور اس آیت میں ان کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں لیکن وہ یقیناً موجود ہوتی ہیں۔ اس آیت میں جو اشارات ہیں ان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان پر ہر جانب سے برکات کا نزول ہو رہا ہوتا ہے۔ ہر طرف سے برکت کے چشمے پھوٹتے ہیں جن کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔ لہٰذا اس سے مراد ہر قسم و نوع کی برکات ہیں ' ہر شکل و صورت میں ان کا نزول ہوتا ہے ' بعض ایسی ہیں جو لوگوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں ہوتیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو وہ سمجھتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ پر ایمان لانا اور اللہ سے خوف کھانا محض پرائیویٹ عبادت کا مسئلہ ہے اور اس کا انسان کی عملی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسے لوگوں نے دراصل حقیقت ایمان کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ اللہ کے نزدیک تو ایمان کا عملی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ تعلق موجود ہے۔ اور اس پر اللہ عزوجل گواہی دے رہا ہے اور اللہ کی شہادت کافی شہادت ہے۔ اور اللہ ان باتوں سے متعلق کرتا ہے جن کے بارے میں لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ عملی اور اجتماعی زندگی کے معاملات ہیں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰىٓ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ "اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا ' لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔"

بعض لوگ دیکھتے ہیں کہ بعض اقوام کا نقطہ نظر اس معاملے میں یوں ہے: "ہم مسلمان ہیں اور ہمارے اوپر رزق کے دروازے بند ہیں اور ہمارے حصے میں خشک سالی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ اقوام ایسی ہیں جو نہ مومن باللہ ہیں اور نہ اہل تقویٰ میں سے ہیں لیکن ان پر ہر طرف سے رزق کی بارش ہو رہی ہے۔ ان کے پاس بے پناہ قوت ہے اور وہ دنیا میں بااثر ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں جس سنت الہیہ کا ذکر ہوا ہے وہ ہم پر صادق کیوں نہیں آتی؟"

دراصل ایسے لوگوں نے اس مسئلے کے صرف ظاہری اور سطحی پہلو کو لیا ہے۔ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں ' وہ مومن اور متقی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ نہ ان لوگوں نے خالصتاً اللہ کی بندگی اور غلامی کا رویہ اپنایا ہے۔ ان کی عملی زندگی میں لا الہ الا اللہ کی شہادت موجود نہیں ہے بلکہ یہ لوگ اپنے میں سے بعض غلاموں کی غلامی کر رہے

ہیں۔"یہ" غلام ان کے الٰہ بنے ہوئے ہیں اور ان کے لئے قانون بناتے ہیں۔ نہ صرف قوانین بلکہ ان کے لئے حسن و قبح کی اقدار بھی تجویز کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ایسے لوگ کہاں مومن ہیں۔ مومن کا تو فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو ختم کر دے جو ان پر مقتدر اعلیٰ بنے ہوئے ہیں۔ مومن کا تو پہلا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو بھی الٰہ و رب نہ بنائے جو ان پر اپنے قوانین اور اپنا نظام نافذ کرے۔ جب ایسے مدعیان کے اسلاف حقیقی مومن اور مسلم تھے تو ان کے سامنے پوری دنیا سرنگوں تھی اور ان پر آسمان اور زمین کی برکات کی بارش ہوتی تھی اور ان کے ساتھ ان کے رب کا وعدہ سچا تھا کیونکہ وہ خود سچے تھے۔

رہے وہ لوگ جن پر رزق کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں تو یہ بھی سنت الٰہیہ کا ایک حصہ ہے۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ "پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے رہے ہیں (۷:۹۸) ان لوگوں پر جو انعامات ہوتے ہیں وہ دراصل ان کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے اور یہ ابتلاء مصیبت کی ابتلاء سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ کفار پر جو انعامات ہوتے ہیں اور اہل ایمان پر جو انعامات ہوتے ہیں ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے' برکت الٰہی بعض اوقات ایک قلیل چیز میں بھی اپنے رنگ دکھاتی ہے۔ جب انسان ایک تھوڑی چیز سے اچھی طرح فائدہ اٹھاتا ہے اور امن و سکون کے ساتھ خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہے' دوسری جانب بڑی بڑی ترقی یافتہ اور مالدار اقوام ایسی ہیں جو پریشانی اور عدم اطمینان کی زندگی بسر کرتی ہیں حالانکہ بظاہر وہ نہایت ہی امن و امان سے زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کے افراد کے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں ہے۔ افراد معاشرہ کے درمیان بے چینی کا دور دورہ ہے۔ اور قریب ہے کہ یہ اقوام مکمل طور پر تباہ ہو جائیں۔ ساز و سامان بسیار مگر اطمینان مفقود ہے' ہر چیز کی فراوانی ہے' لیکن لوگ بدکردار ہیں' ان کی خوشحالی ہی ان کے لئے برے مستقبل کا پتہ دے رہی ہے اور یہ خوشحالی ان کے لئے انتقام الٰہی کا سبب ہے۔

اہل ایمان کو جو برکات ملتی ہیں' ان کے کئی رنگ ہیں' ان کی ضروریات کی چیزوں میں برکت ہوتی ہے' ذات انسانی میں برکت ہوتی ہے' انسانی شعور میں برکت ہوتی ہے' پاکیزہ زندگیوں میں برکت ہوتی ہے اور ان برکات کے نتیجے میں زندگی بڑھتی ہے اور اس کے اندر سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے' یہ نہیں کہ ہر طرف سہولیات تو وافر ہوں اور انسان جہنم میں ہو جسمانی اور نفسیاتی انحلال میں مبتلا ہو۔ (۱)

سنت جاریہ جس پر تاریخ انسانی بھی ایک گواہ ہے اور جس کے بیان کے متصل بعد اب روئے سخن اہل غفلت کی طرف مڑتا ہے۔ ان حالات کے جاننے اور دیکھنے کے بعد جن میں مکذبین کو تباہ و برباد کیا گیا اور ان پر عذاب نازل ہوا جن کی وجہ سے پڑھنے والے کے شعور اور وجدان کے اندر ایک ہمہ گیر ارتعاش پیدا ہو گیا کیونکہ ان لوگوں نے اپنی نرمی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش انعامات اور زندگی کے ساز و سامان میں غفلت کا مظاہرہ کیا اور حکمت الٰہیہ کو نہ سمجھ سکے کہ یہ تو دراصل ان کی آزمائش ہے۔ ایسے حالات میں اب سیاق کلام ان اہل غفلت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اپنے حال

(۱) دیکھئے میری کتاب الاسلامی و مشکلات الحضارۃ کی فصل تخبط و اضطراب اور فصل شہادۃ القرن العشرین۔ از کتاب التصور و الشبہات از محمد قطب۔

میں مست ہیں۔ ایسے لوگوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ رات اور دن کے کسی بھی وقت میں ان کو عذاب الٰہی اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے ' ایسے حالات میں کہ لہو و لعب اور خواب غفلت میں ڈرے ہوئے ہوں۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾
اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا ۱۲
مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ ع ۱
يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ ۲
نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آ جائے گی جب کہ وہ سوئے پڑے ہوں؟ یا انہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ آ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔

اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں ' اس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں 'پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔"

کیا لوگ سنت الٰہیہ کو دیکھتے ہوئے بھی اس قدر بے خوف ہوگئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو خوشحالی اور فراوانی دے کر اور شدائد و مصائب میں مبتلا کر کے آزماتا ہے۔ اس کے بعد ناشکروں اور نافرمانوں اور جھٹلانے والوں کو تباہ و برباد کرتا ہے اور ان کی تباہی اور ہلاکت کے میدان تمہاری نظروں کے سامنے ہیں جو تباہ ہوئے اور جنہوں نے ان بستیوں کو خوب آباد کیا اور تباہی کے بعد پیچھے آنے والوں کے لئے چھوڑ دیا 'کیا وہ اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر بھی اچانک عذاب الٰہی آ جائے اور وہ غفلت اور بے خبری میں مبتلا ہوں اور تباہ و برباد ہو جائیں۔ عذاب دن کے کسی وقت میں آئے یا رات کو کسی ایسے وقت میں آئے کہ وہ غافل ہوں۔ یاد رہے کہ نیند میں انسان اس طرح غرق ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی شعور اور ارادہ نہیں رہتا اور نہ کوئی کام کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ نہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر سکتا ہے۔ نہ کسی معمولی کیڑے مکوڑے کے خلاف مدافعت کر سکتا ہے۔ اللہ جیسی عظیم قوت کے مقابلے میں تو وہ کیا کرے گا؟ جس کے مقابلے میں کوئی انسان نہایت بیداری اور قوت و حکمت کے ساتھ بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

غرض ان پر یہ عذاب دن کو بھی آ سکتا ہے جب یہ کھیل رہے ہوں 'کھیل کے وقت انسان کو کوئی ہوش نہیں ہوتا۔ وہ کھیل میں غرق ہوتا ہے اور اس کی توجہ صرف مدمقابل کی طرف ہوتی ہے۔ رہا وہ حملہ جو اللہ کی جانب سے ہو تو اس کا مقابلہ تو وہ پوری تیاری اور پوری بیداری کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا اور جب وہ غافل ہو تو کیا کرے گا؟

اللہ کا عذاب اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ جاگ رہے ہوں یا سو رہے ہوں کسی حالت میں بھی وہ اس کے آگے ٹک نہیں سکتے۔ وہ کھیل میں ہوں یا سنجیدہ حالت میں ہوں' اس کا مقابلہ تو وہ نہیں کر سکتے' لیکن قرآنی سیاق انسان کے سامنے اس کی زندگی کے وہ لمحات پیش کرتا ہے تاکہ انسانی شعور میں پوری طرح انسان کے ضعف اور کمزوری کا احساس پیدا کر دیا جائے اور وہ محتاط ہو جائے اور اپنے بچاؤ کی فکر کرے جب تباہ کن حملہ ہو اور ایسے حالات میں ہو کہ انسان پوری طرح غفلت اور لاپرواہی میں ہو اور مکمل بے خبری میں اسے آلیا جائے تو ایسے حالات میں اس کا دفاع نہایت ہی کمزور ہوتا ہے۔ رہا عذاب الٰہی تو انسان باخبر ہو یا بے خبر ہو' اس کے مقابلے میں اس کی بے بسی یکساں ہوگی۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (۹۹) "کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔"

اللہ کے مکر سے مراد وہ خفیہ تدبیر ہے جس سے وہ بے خبر ہوں تاکہ انسان اللہ سے ڈرتے رہیں اور اللہ کے احکام میں محتاط رہیں۔ اور جو لوگ نہ ڈریں گے وہ خسارے میں رہیں کیونکہ عافیت کوشی' غفلت اور حد سے گزر جانے اور لاپرواہی کا نتیجہ خسران مبین ہی ہو سکتا ہے۔

کیا یہ لوگ اللہ کی چال اور تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے آباؤ اجداد کو ہلاک کر دیا گیا اور ان کے بعد یہ لوگ اس دنیا کے وارث بنائے گئے اور جنہیں ان کی غفلت ہی کی وجہ سے برباد کیا گیا کہ ان کی بربادی میں ان کے لئے کوئی ہدایت اور عبرت نہیں ہے؟

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۱۰۰) "اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں' اس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں' پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔"

بے شک اللہ کی سنت اٹل ہوتی ہے اور اللہ کی مشیت جاری رہتی ہے۔ اگر اللہ ان لوگوں کے گناہوں کے سبب انہیں اسی طرح پکڑے جس طرح ان کے آباؤ اجداد پکڑے گئے تھے تو انہیں کون بچا سکتا ہے؟ یا اگر اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور ان سے ہدایت کی توفیق ہی سلب کر لے اور وہ ہدایت سے ہمیشہ ہی کے لئے محروم ہو جائیں اور دلائل ہدایت کی طرف سے ان کا رخ ہی پھر جائے اور ان کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جائیں تو کون ان کی مدد کو پہنچ سکے گا۔ سابقہ لوگوں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان موجودہ لوگوں کی جانشینی اور اس بارے میں اللہ کی سنت کی کارفرمائیاں یہ سب امور ان کے لئے غور و فکر و ہدایت و تقویٰ کا وافر سامان مہیا کرتے تھے اور ان سے یہ توقع تھی کہ وہ اللہ سے ڈرتے اور اس عارضی مصنوعی عافیت کو چھوڑ دیتے ہیں جس میں وہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔ اس لاپرواہی کو ایک طرف چھوڑ دیتے تو وہ اصلاح پذیر ہو جاتے اور ان واقعات سے عبرت لیتے۔ کاش کہ وہ ایسا کرتے۔

اس آیت میں جو تنبیہ کی گئی ہے' اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ ہر وقت نامعلوم عذاب اور مستقبل کی اچانک

تباہی اور بربادی کے خوف سے کانپتے ہی رہیں اور وہ ہروقت غیر یقینی صورت حالات سے دوچار رہیں کہ کسی بھی وقت ان پر کوئی عذاب نازل ہو سکتا ہے ۔کیونکہ ہروقت کا جزع و فزع 'کسی بھی وقت آجانے والے عذاب کا ڈر 'اور ہروقت یہ خطرہ کہ کسی بھی وقت کوئی آفت نازل ہو سکتی ہے 'ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے انسانی قوتیں شل ہو جاتی ہیں اور انسان علم و عمل کی خوبی سے محروم ہو سکتا ہے ۔اور اس طرح مایوس ہو کر انسان اس کرۂ ارض کی تعمیر اور ترقی کے مسلسل عمل سے دستکش ہو سکتا ہے ۔اس تنبیہ کی غرض و غایت انسان کو شل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان بیدار ہو 'اس کے اندر ہروقت خدا خوفی کا احساس ہو 'وہ ہروقت اپنے نفس کے اوپر نگران رہے اور دنیا میں گزرے ہوئے واقعات سے سبق لے وہ انسانی تاریخ کے محرکات کو معلوم کر لے ۔اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر وقت قائم رہے اور عیش و عشرت کی زندگی اسے غافل اور مغرور نہ کر دے ۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوگوں کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں آخرت میں امن 'اطمینان 'اپنی رضامندی 'دنیا و آخرت کی رضامندی عطا کرے گا لیکن یہ اس وقت ہو گا جب انہوں نے اللہ کے بارے میں اپنے احساس کو تیز رکھا ۔اور انہوں نے تقویٰ اور خدا خوفی کی وجہ سے اپنے آپ کو آلودگیوں میں ملوث نہ کیا ۔انہوں نے اپنی مادی قوت کے مقابلے میں اللہ پر اعتماد کیا ۔انہوں نے اپنے محدود مادی وسائل کے مقابلے میں ان وسائل پر بھروسہ کیا جو اللہ کے ہاں موجود ہیں ۔

اس دنیا میں ایسے لوگ پختہ مومن اور اللہ سے ڈرنے والے تھے جو اللہ کے اس عذاب کی خفیہ تدابیر سے محفوظ تھے اور جو اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کرتے تھے 'ان کے دل دولت ایمان سے بھرے ہوئے تھے ۔وہ اللہ کے ذکر پر مطمئن تھے 'وہ اپنی خواہشات اور شیطانی حرکات پر کنٹرول کئے ہوئے تھے ۔وہ اس کرۂ ارض پر مصلح کے طور پر اللہ کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے ۔وہ لوگوں سے نہ ڈرتے تھے اور صرف اللہ سے ڈرتے تھے اور اللہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے ۔

اس انداز میں ہم اللہ کے عذاب سے اس دائمی ڈراوے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں 'ایسا عذاب جو اٹل ہوتا ہے اور وہ اللہ کی ان تدابیر کے مطابق ہوتا ہے جس کا ادراک انسان کو نہیں ہوتا ۔اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن کی ان آیات کا مطلب محض خوف و ہراس پھیلانا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے اندر بیداری پیدا کرنا ہے 'لوگوں کے اندر بے چینی پیدا کرنا نہیں بلکہ ان کے اندر احساس زیاں پیدا کرنا مطلوب ہے ۔زندگی کو معطل کرنا مطلوب نہیں ہے 'بلکہ اسے لاپرواہی اور سرکشی سے بچانا مطلوب ہے ۔

اسلامی اور قرآنی منہاج تربیت کا یہ طریقہ کار ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے بدلتے ہوئے طور طریقوں کی اصلاح بھی کرتا ہے 'اقوام اور سوسائٹیوں کے مسائل و اطوار کو بھی درست کرتا ہے ۔اور ہر ایک کا علاج اس کے حالات کے مطابق کرتا ہے ۔کسی کو امن 'اطمینان اور اللہ پر بھروسے کی امید کی دولت دیتا ہے ۔اور کسی کے لئے خوف 'بیداری اور سٹینڈ ٹو کا نسخہ تجویز کرتا ہے کہ وہ اپنی بداعمالیوں سے باز آجائے اور اللہ کے عذاب سے ڈرے جو کسی بھی وقت انہیں گھیر سکتا ہے ۔خصوصاً اس وقت جب وہ مادی زندگی پر بھروسہ کر کے غرے میں مبتلا ہو جائے ۔اللہ بہرحال اپنی مخلوق سے اچھی طرح باخبر ہے اللہ لطیف و خبیر ہے ۔

---OOO---

یہاں سنت جاریہ کا بیان ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی وجدان کو اس سنت کے شعور کا فیض دیا گیا اور نہایت ہی اچھے اشارات دیئے گئے۔ اب روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پلٹ جاتا ہے اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ ان بستیوں کے باشندوں کا مجموعی طور پر کیا انجام ہوا اور اس انجام سے کفر کا کیا مزاج سامنے آتا ہے اور ایمان کا مزاج کس رنگ میں سامنے آتا ہے اور اقوام عالم کی تاریخ سے ان دو قسم کے انسانوں کی عمومی روش کیا معلوم ہوتی ہے؟

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

”یہ قومیں جن کے قصے ہم تمہیں سنا رہے ہیں (تمہارے سامنے مثال کے طور پر موجود ہیں) ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جھٹلا رہے چکے تھے پھر اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اس طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔“

یہ قصے اللہ کی جانب سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا کوئی علم نہ تھا۔ آپ کو یہ قصے بذریعہ وحی تعلیم کئے گئے۔

(لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ) ”ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے۔“ لیکن ان نشانیوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور رسولوں کو جھٹلاتے رہے جس طرح وہ ان نشانیوں سے پہلے بھی جھٹلاتے تھے۔ یہ نشانیاں اور معجزات بھی ان کو ایمان تک نہ پہنچا سکے۔ یہ نہ تھا کہ ان کے سامنے دلائل کی کمی تھی بلکہ حقیقی صورت حالات یہ تھی کہ ان کے دلوں کو تالے لگے ہوئے تھے، ان کا احساس مردہ ہو گیا تھا، اور ہدایت کی طرف وہ متوجہ ہی نہ تھے۔ جس چیز کی کمی تھی وہ یہ تھی کہ ان کی فطرت مر چکی تھی، وہ متاثر ہی نہ ہوتے تھے، لہٰذا وہ دعوت کو قبول ہی نہ کرتے تھے۔ جب ان کے دل دلائل ایمان کی طرف متوجہ ہی نہ تھے اور ہدایت کے اشارات ان تک پہنچ ہی نہ پا رہے تھے تو اللہ نے بھی انہیں اس حال پر چھوڑ کر ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور ان کے لئے قبولیت حق کے تمام راستے بند ہو گئے۔

(كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ) ”دیکھو اس طرح اللہ تعالیٰ منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔“ یہ مزاج ان میں سے اکثریت کا تھا۔

(وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ) ”ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔“

یہاں جس عہد کا ذکر ہے وہ فطرت انسانی کا عہد بھی ہو سکتا ہے جس کا ذکر اس سورہ کے آخر میں ہوا ہے۔ (واذ

اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا) "اے نبی لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا: "ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔" ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ (۷:۱۷۲)

اس عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو ان لوگوں کے اسلاف نے اپنے رسولوں سے کیا تھا کہ وہ ایمان لائیں گے مگر بعد میں آنے والے لوگ اس سے منحرف ہو گئے جیسا کہ ہر جاہلیت میں یہی ہوتا رہا ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اہل ایمان جاہلیت کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور آخر کار پوری طرح جاہلیت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

بہرحال عہد سے مراد جو بھی ہو، لیکن ہلاک ہونے والوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کسی عہد و پیمان کے پابند نہ تھے، نہ وہ کسی بات پر قائم رہتے تھے۔ یہ لوگ اپنی ذاتی خواہشات کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ ان کا مزاج بھی ایسا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی بات پر جمتے نہ تھے اور نہ سچا طرز عمل اختیار کرتے تھے۔ بلکہ اکثر کو فاسق پایا گیا یعنی اپنے دین سے منحرف پایا گیا۔ اور یہ اس لئے کہ وہ ہر وقت بدلتے رہتے تھے اور کسی عہد کا پاس نہ رکھتے تھے بلکہ وہ اغراض کے بندے ہو گئے تھے جو قوم اللہ کے ساتھ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہتی اور اپنے دین اور راہ ہدایت پر قائم نہیں رہتی اور اللہ سے ہدایت اخذ نہیں کرتی تو ظاہر ہے کہ ایسی قوم تتر بتر ہو جاتی ہے۔ راہ حق سے منحرف ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ فاسق بن جاتی ہے چنانچہ ان بستیوں والوں کی یہی حالت ہو گئی تھی اس لئے ان کا یہ انجام ہوا۔

---ooo---

درس نمبر ۹۷ ایک نظر میں

اس سبق میں فرعون اور اس کے درباریوں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں' ان واقعات کی وہ کڑیاں جو اس کے دعوائے ربوبیت اور اس کے لشکر سمیت اس کی غرق یابی کے واقعات پر مشتمل ہیں۔ ان کڑیوں کی درمیانی کڑیاں مثلاً جادوگروں کے ساتھ مقابلہ اور حق کا باطل پر غالب آنا' جادوگروں کا ایمان لانا' اور ان کے الفاظ کے ساتھ کہ ہم رب موسیٰ اور رب ہارون پر ایمان لاتے ہیں' پھر فرعون کی جانب سے انہیں سخت عذاب کی دھمکی' اور ان کے دل و دماغ میں ایمان و اسلام کی سربلندی کا مظاہرہ اور ان کی جانب سے اپنی زندگی کے مقابلے میں ایمان و اسلام کو ترجیح دینا' اس کے بعد بنی اسرائیل پر فرعون کی جانب سے مظالم کا ذکر' پھر اللہ کی جانب سے آل فرعون اور اہل مصر پر خشک سالی وغیرہ کے عذاب کا نزول اور ہر قسم کی پیداوار کی تباہی' پھر طوفان' پسوؤں اور مینڈکوں کے حملے اور خون کی بارش اور ہربار ان کی جانب سے حضرت موسیٰ کی روحانی قوت کے سامنے جھکنا کہ وہ رب العالمین سے سوال کریں تاکہ انہیں اس عذاب سے نجات ملے۔ لیکن جب ان پر سے یہ مصیبت دور کی جاتی تو جلد ہی وہ لوگ دوبارہ اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ جاتے اور اعلان کر دیتے کہ جس قدر آیات و معجزات بھی وہ دکھائیں ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ ان بار بار کی بدعملیوں کی وجہ سے ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور وہ غرق کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ معجزات کو جھٹلاتے ہیں اور اس آزمائش میں غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ تمام امور سنت جاریہ کے مطابق انجام پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان پر سختی کر کے اور مصائب میں مبتلا کر کے بھی آزماتے ہیں اور ان کو خوشحال اور فراوانی عطا کر کے بھی آزماتے ہیں۔ اس کے بعد وہ واقعات آتے ہیں کہ جب قوم موسیٰ ان آزمائشوں میں پوری اترتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو خلافت فی الارض عطا فرماتے ہیں اور غلامی کی اس شدت اور مصیبت کے بعد خلافت فی الارض عطا کر کے پھر ان کو آزمایا جاتا ہے اور فراوانی عطا کی جاتی ہے۔

ہم نے مذکورہ بالا واقعات پر مشتمل ایک سبق تجویز کیا ہے اور اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کی جانب سے جو واقعات درپیش ہوئے اسے دوسرا درس بنایا ہے کیونکہ دونوں کا موضوع مختلف ہے۔

یہ قصہ یہاں جس انداز سے شروع کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس قصے کو لانے کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا جاتا ہے۔

(ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ) "پھر ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی

نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ مگر انہوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا' بس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟"

یہ تصریح کی جاتی ہے کہ یہاں اس قصے کو لانے کی غرض و غایت کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اس دنیا میں ہمیشہ مفسدین کا انجام ایک ہی جیسا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ قصے کی غرض و غایت کے اظہار کے بعد اس کے ضروری مضمون و موضوع کے ساتھ مناسب حلقے پے در پے لائے جاتے ہیں۔

اس قصے میں زندہ اور متحرک مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ ان میں حرکت بھی ہے اور مکالمات بھی ہیں۔ تاثرات بھی ہیں اور مختلف لوگوں اور کرداروں کے خدوخال اور ان کی شناخت بھی ہے۔ اس کے درمیان جگہ جگہ ہدایات و اشارات بھی ہیں اور عبرت آموزی بھی ہے اور اس بات کی صفائی بھی ہے کہ دعوت الی اللہ کے خدوخال کیا ہوتے ہیں اور دعوت الی الطاغوت کا مزاج کیا ہوتا ہے اور یہ کہ تمام طاغوتی قوتیں دراصل ربوبیت اور حاکمیت کی مدعی ہوتی ہیں اور دعوت الی رب العالمین کی تڑپ جس نفس میں گہرائی تک بیٹھ جاتی ہے' اس نفس سے طاغوتی قوتوں کا خوف یکسر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اس راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں اور کسی وعدہ و وعید کو خاطر میں نہیں لاتے۔

---○○○---

درس نمبر ۷۹ تشریح آیات

۱۰۳ ـــ تا ـــ ۱۲۷

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ
فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

”پھر ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ مگر انہوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا' پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟“

اس سے پہلے اس سورت میں جن بستیوں کا ذکر ہوا تھا' ان کے اہالیان نے دعوت حق کی تکذیب کی تھی اور ان کو ہلاک کیا گیا تھا' ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے ۔ قصے کا آغاز اس مقام سے ہوتا ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ایک دوسرے کے آمنے سامنے آتے ہیں اور خلاصہ یہاں دے دیا جاتا ہے کہ فرعون اور اس کا ٹولہ دعوت حق کا استقبال کس طرح کرتا ہے اور اس انجام کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے جس تک وہ پہنچے ۔ انہوں نے ان آیات و معجزات کے ساتھ ظلم اس طرح کیا کہ ان کا انکار کر دیا۔ یعنی انہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا۔ قرآن کریم میں بارہا کفر کے لئے فسق کا لفظ اور شرک کے لئے ظلم کا لفظ استعمال ہوتا ہے کیونکہ کفر و شرک سے بڑا ظلم اور بڑا فسق اور نہیں ہے ۔ جو لوگ کفر کرتے ہیں یا شرک کرتے ہیں وہ دراصل ایک عظیم سچائی کے ساتھ ظلم کرتے ہیں یعنی اللہ کی حاکمیت اور عقیدۂ توحید کے ساتھ ۔ اور یہ لوگ دراصل خود اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں کیونکہ اپنے آپ کو یہ لوگ ہلاکت و بربادی کا مستحق ٹھہراتے ہیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔ پھر ایسے لوگ عوام الناس پر یہ ظلم کرتے ہیں کہ انہیں ایک اللہ وحدہ کی غلامی اور بندگی سے نکال کر مختلف طاغوتی طاقتوں کے بندے بناتے ہیں اور ان کو رب اور مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں اور اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ کفر ظلم ہے اور کافرون ظالمون ہیں جیسا کہ قرآن کریم ایسا انداز بیان اختیار کرتا ہے نیز جو شخص کفر اور ظلم اختیار کرتا ہے وہ راہ مستقیم کو چھوڑ کر غلط راستوں پر چلتا ہے اور مختلف بے راہ رویوں میں پڑ کر فاسق اور بدکار بن جاتا ہے اور آخر کار جنت کے بجائے جہنم کا مستحق قرار پاتا ہے ۔

فرعون اور اس کے ٹولے نے آیات الٰہی کے ساتھ ظلم کیا یعنی ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے وہ برے

انجام تک پہنچے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۷:۱۰۳) ''پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟'' اس انجام کا ذکر سیاق کلام میں عنقریب آنے والا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ لفظ مفسدین کی تشریح کر دیں۔ یہ لفظ اس مقام پر کافرین اور ظالمین کے مترادفات میں سے ہے یعنی ان کا ہم معنی ہے۔ انہوں نے آیات الہی کے ساتھ ظلم کیا یعنی ان کا انکار کر دیا اور اس لئے ان کا یہ انجام ہوا۔

یہ لوگ مفسد کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ظالم ہیں یعنی کافر اور منکر ہیں۔ کیونکہ کفر شدید ترین فتنہ و فساد کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف ایمان و اسلام کی اساس ہی پر درست ہو سکتی ہے۔ یعنی جب تک اللہ وحدہ کو الہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا اور جب تک کسی سرزمین پر بندگی اور غلامی صرف اللہ کے لئے خالص نہیں کر دی جاتی اور صرف اللہ کی بندگی اور غلامی تب قائم ہو گی جب ہم اللہ کو حاکم اور فرمانروا تسلیم کر لیں۔ ہم بندگی اور عبادت بھی اسی کی کریں۔ ہم اپنی زندگی میں قوانین اور ضابطے بھی اسی کے جاری کریں اور اس معاملے میں اللہ کے ساتھ کسی اور ذات کو شریک نہ کریں۔ فساد جس طرح لوگوں کی فکری دنیا میں برپا ہوتا ہے' اسی طرح ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں بھی سرایت کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں فساد اس وقت قائم ہوتا ہے کہ جب لوگ ارباب متفرقون کی غلامی اور اطاعت اختیار کر لیں۔ اور اللہ کو چھوڑ دیں۔ یہ بات پتے کی بات ہے کہ لوگوں کی زندگی اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتی جب تک اپنے نظریات اور اپنی عملی زندگی کو نظریہ حاکمیت خدائے واحد کے اوپر استوار نہیں کرتے۔ اور نہ اس وقت تک کوئی انسان صحیح معنوں میں آزاد تصور ہو سکتا ہے۔ انہی وجوہات کی بناء پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۷:۱۰۳) ''پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا؟'' ہر وہ طاغوتی نظام جس میں اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی دوسرے قانون کی اطاعت کی جاتی ہو وہ فسادی نظام ہے اور اسی کے بارے میں اللہ کا حکم ہے کہ ایسی طاغوتی قوتیں مصلحین میں نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ فسادی قوتیں ہوتی ہیں۔

---ooo---

اس انداز میں قصے کا آغاز کرنا قرآن کریم کا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ یہاں اس سورت میں جو موضوع اور مضمون چل رہا تھا اس کے لئے یہی انداز موزوں تھا۔ کیونکہ اس انداز سے قاری ایک ہی لمحہ میں اس ہدف تک پہنچ جاتا ہے جس کے لئے اس طویل قصے کو لایا جا رہا ہے اور پھر وہ تفصیلات کو بڑے اطمینان کے ساتھ پڑھتا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ قصے کی اگلی کڑیاں کس طرح آتی ہیں اور کس طرح انجام تک لے جاتی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان اس پہلی ملاقات میں جو مکالمات ہوئے اور واقعات پیش آئے تھے وہ اس طرح تھے۔

وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ

مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ بِـَٔايَةٍ فَأْتِ بِهَآ إِن كُنتَ
مِنَ الصَّٰدِقِينَ ﴿١٠٦﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿١٠٧﴾ وَنَزَعَ ۱۳
يَدَهُۥ فَإِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ ﴿١٠٨﴾ قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ ع ۹
هَٰذَا لَسَٰحِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٠٩﴾ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۳
﴿١١٠﴾ قَالُوٓا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حَٰشِرِينَ ﴿١١١﴾ يَأْتُوكَ
بِكُلِّ سَٰحِرٍ عَلِيمٍ ﴿١١٢﴾

موسیٰ نے کہا "اے فرعون' میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں' میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں' میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں' لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔" فرعون نے کہا "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر۔" موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا اور اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔ اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے' تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟" پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔"

حق و باطل اور ایمان و کفر کے مابین یہ پہلا معرکہ ہے' اس منظر میں ایک جانب رب العالمین کی طرف سے دعوت دی جا رہی ہے مد بالمقابل وہ طاغوتی طاقت ہے جس نے ربوبیت کے تمام حقوق اپنے لئے خاص کئے ہوئے ہیں اور زندگی کے ان معاملات میں رب العالمین کی اطاعت نہیں کی جاتی۔

(وَقَالَ مُوسَىٰ يَٰفِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَٰلَمِينَ (١٠٤) حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّآ أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ)

موسیٰ نے کہا "اے فرعون' میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں' میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں' میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں' لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔"

ذرا انداز خطاب ملاحظہ ہو= "اے فرعون' آپ نے اسے مائی لارڈ سے خطاب نہیں فرمایا۔ جس طرح عموماً لوگ

اس لفظ کو غیراللہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔اور انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ فی الحقیقت لارڈ اور مولیٰ کون ہے؟ ہاں آپ نے بادشاہ کو بڑی عزت سے اس کے لقب سے پکارا' اس لفظ کے استعمال کے ذریعہ آپ نے فرعون کو بتا دیا کہ آپ صرف فرعون ہیں اور دوسری یہ حقیقت بھی اس کے سامنے کھول دی کہ (اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۷: ۱۰٤) "میں اس کائنات کے مالک کا نمائندہ ہوں۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو حقیقت پیش کی یہی حقیقت آپ سے پہلے آنے والے تمام رسولوں نے بھی پیش کی تھی اور وہ یہ تھی کہ تمام جہانوں کا اب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ایک ہی حاکم ہے اور پوری زندگی میں اس کی اطاعت ضروری ہے۔ آج کل کے ماہرین ادیان جو کچھ کہتے ہیں کہ عقائد میں بھی تغیر اور ارتقاء کا عمل ہوتا رہا ہے اور وہ سماوی ادیان کو بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں کرتے تو ان حضرات کا یہ نظریہ باطل ہے 'کیونکہ آدم علیہ السلام سے نبی آخرالزماں تک تمام رسولوں کا عقیدہ ایک ہی رہا ہے' اس میں صرف اللہ حاکم اور مطاع رہا ہے' اور یہ نہیں رہا کہ پہلے متعدد الہوں کے نظریات تھے پھر تین خداؤں اور پھر ایک خدا کا عقیدہ جاری ہو گیا۔ یہ تو تھی صورت اسلام کی۔رہی جاہلیت تو اس کے اندر جو اختلاف و اضطراب رہا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے۔روح پرستی' متعدد الہوں کی پرستش' سورج کی پرستش' دو خداؤں کی پرستش' ایک خدا کی مشرکانہ پرستش اور بے خدا جاہلیت وغیرہ۔ لہٰذا سماوی ادیان رسولوں کی تعلیمات اور جاہلی ادیان کے افکار کو ایک ہی اصول پر نہیں پرکھا جاسکتا۔

غرض حضرت موسیٰ اور فرعون اور اس کے ٹولے کے درمیان جو آمنا سامنا ہوا' یہی صورت ہر نبی کو اپنے اپنے دور میں پیش آئی۔حضرت موسیٰ سے پہلے آنے والوں کو بھی اور ان کے بعد آنے والوں کو بھی۔ ہر دور میں حکمرانوں نے یہ سمجھا کہ یہ دعوت ان کے اقتدار کے خلاف سازش ہے جس طرح فرعون نے یہ سمجھا کہ یہ درحقیقت ان کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ایک تحریک ہے۔جب کوئی یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ اللہ وحدہ رب العالمین ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے سوا تمام دوسری حاکمیتیں باطل نہیں اور اللہ کے سوا وہ تمام لوگ جو عوام سے اپنا قانون منواتے ہیں وہ دراصل طاغوت ہیں۔اور اس اعلان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دعوے کے ساتھ پیش فرمایا کہ وہ اللہ رب العالمین کی جانب سے رسول ہیں اور وہ جو بات کرتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے کرتے ہیں اور ان کا اللہ کی جانب سے یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں تک یہ دعوت پہنچائیں۔

(حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ) "میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔" اس لئے کہ جو رسول حقیقت الوہیت سے خبردار ہے وہ اللہ کے بارے میں سچ کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا ہے 'کیونکہ وہ مقام خدائی اور مرتبہ کبریائی سے خبردار ہوتا ہے۔

(قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ)"میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں۔" اور یہ ایسی دلیل ہے جو میری بات کی صداقت پر بین دلیل ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے ہوں۔"

اب اس عظیم حقیقت کے عنوان سے اور اللہ کی ربوبیت عامہ اور حاکمیت شاملہ کے نظریہ کے تحت حضرت موسیٰ نے یہ مطالبہ کیا کہ فرعون بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے ساتھ واپس اپنے وطن جانے کی اجازت دے دے۔

بنی اسرائیل صرف اللہ کے بندے اور غلام تھے ۔ لہذا فرعون کو یہ حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ انہیں اپنا بندہ اور غلام بنائے کیونکہ کوئی بھی انسان دو آقاؤں کا غلام نہیں بن سکتا ۔ نہ وہ دو الہوں کا معبود بن سکتا ہے ' جو شخص عبداللہ ہو وہ کسی اور کا عبد نہیں ہو سکتا ۔ ایک طرف فرعون بنی اسرائیل کو اپنی خواہشات کا غلام بنا رہا تھا اور دوسری جانب حضرت موسیٰ یہ اعلان کر رہے تھے کہ صرف اللہ ہی رب العالمین ہے صرف ربوبیت الہیہ کے اعلان ہی سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو جو غلام بنا رکھا ہے وہ کالعدم ہے ۔

یہ اعلان کہ صرف اللہ رب العالمین ہی ہمارا حاکم اور رب ہے ' بذات خود ہی انسان کی آزادی کا چارٹر ہے اور اس اعلان کے ساتھ ہی ایک انسان غیراللہ کی غلامی 'اطاعت اور قانون سے آزاد ہو جاتا ہے ۔ وہ انسانی غلامی ' اپنی خواہشات کی غلامی ' انسانی رسومات کی غلامی اور انسانی قانون و حرکت کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے ۔

لہذا یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی اللہ کی رب العالمین کا اعلان بھی کرے اور پھر غیراللہ میں سے کسی کی غلامی کا دم بھی بھرے ۔ اس اعلان کے ساتھ کسی غیراللہ کی حکومت و اقتدار جمع ہو سکتا اور نہ کسی اور کا قانون جمع ہو سکتا ہے ۔ جو لوگ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور اس کے بعد وہ اپنے ہاں وہ قوانین جاری کئے ہوئے ہیں جو انہی جیسے انسانوں نے بنائے ہیں یا خود انہوں نے بنائے ہیں اور ان کے ہاں اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت رہی ہے تو یہ لوگ ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں اور وہ ایک لحظہ کے لئے بھی مسلمان نہیں ہو سکتے ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ان پر حاکمیت غیراللہ کی ہو اور وہ دین اللہ میں داخل ہوں ۔ ان کے ہاں رائج قانون ' قانون شریعت نہ ہو اور وہ مسلمان بھی ہوں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حالات میں وہ اپنے ملوک اور حکام کے دین پر تو ہوتے ہیں لیکن اللہ کے دین پر نہیں ہوتے ۔

یہی وہ نظریہ تھا جس کی بنا پر حضرت موسیٰ نے فرعون سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو واپس جانے دے ۔ ذرا ان فقرات کو دوبارہ پڑھیے "اے فرعون میں رب العالمین کا رسول ہوں ۔" --- "لہذا میرے ساتھ بنی اسرائیل کو رخصت کیجئے ۔" بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ اس اساس پر ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور رسالت کا یہ منطقی نتیجہ ہے کہ لوگوں کو غلامی سے رہا کیا جائے ۔ یہ لازم و ملزوم امور ہیں ۔

فرعون اور اس کے ٹولے نے بھی اس اعلان کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اللہ کی ربوبیت کے اعلان کا مفہوم کیا ہے ؟ یہ بات ان کی نظروں سے اوجھل نہ تھی ۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس دعوت کے نتیجے میں ان کی حکومت کا خاتمہ یقینی ہے ۔ اس دعوت سے ایک عظیم انقلاب برپا ہو جائے گا ۔ اس کی حکومت کے قانونی جواز کے لئے یہ اعلان ایک چیلنج ہے اور یہ کھلی بغاوت اور مخالفت ہے ۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ وہ موسیٰ کو جھوٹا ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ رسول رب العالمین ہیں اس لئے انہوں نے فی الفور معجزات کا مطالبہ کر دیا ۔

(قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ) فرعون نے کہا "اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر ۔"

فرعون نے مطالبہ معجزات کا راستہ اس لئے اختیار کیا کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حضرت موسیٰ رب العالمین کے رسول نہیں اور جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں تو آپ کی دعوت یہاں ہی ختم ہو جائے گی اور آپ کی ہوا اکھڑ جائے گی اور

جن لوگوں کو یقین ہی نہ رہے گا تو پھر جو چاہیں کہتے پھریں۔ وہ ایک بے دلیل دعویٰ کے مدعی ہوں گے اور اس کے لئے کوئی خطرہ نہ ہوں گے۔ حضرت موسیٰ کا جواب یہ تھا:

(فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ (۱۰۷) وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ (۱۰۸)) "موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔" حضرت موسیٰ کے ہاتھوں اچانک عظیم معجزات کے صدور سے وہ لوگ ششدر رہ گئے۔ عصا ایک سانپ بن گیا تھا اور اس کی حقیقت یوں بدل گئی تھی کہ اب اس کے سانپ ہونے میں شک ہی نہ رہا تھا

(مُبِیْنٌ) کے معنی واضح طور پر جیتا جاگتا۔ دوسری صورت میں کہا گیا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی "تو وہ اچانک چلنے پھرنے والا سانپ بن گیا۔" حضرت موسیٰ سرخ رنگ والے تھے۔ انہوں نے اپنا گندم گوں ہاتھ نکالا تو وہ بلب کی طرح چمکتا ہوا باہر آیا۔ لیکن یہ سفیدی بوجہ بیماری نہ تھی بلکہ معجزانہ سفیدی تھی۔ جب آپ نے ہاتھ دوبارہ اپنے کپڑوں میں چھپایا تو دوبارہ اپنی اصلی حالت میں چلا گیا یعنی گندم گون رنگ کا ہو گیا۔

یہ تھی حضرت موسیٰ کے دعوائے نبوت پر دلیل۔ آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ آپ رب العالمین کے نمائندے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فرعون اور اس کے ٹولے نے ان معجزانہ دلائل کو تسلیم کیا؟ کیا انہوں نے رب العالمین کی ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا؟ اگر وہ ایسا کرتے تو پھر فرعون کی ربوبیت 'اقتدار اور تاج و تخت کا جواز کیا رہ جاتا اور اس کے ٹولے کے لئے مراکز و مناصب پر مقتدر رہنے کا کیا جواز رہ جاتا جو ان کو فرعون نے عطا کئے تھے اور وہ فرعون کی حکومت کے کل پرزے تھے۔ اگر وہ اللہ کو رب العالمین تسلیم کرتا تو عملاً اس کا اقتدار ختم ہو جاتا۔

اگر اللہ کو رب العالمین تسلیم کیا جائے تو اس کا منطقی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پھر ملک کے اندر اللہ کی شریعت اور قانون نافذ ہو کیونکہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق اللہ کے سوا کسی اور کے حکام کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اس لئے اس نظریہ کے مطابق فرعون کا قانون اور اس کے احکام بے اثر ہو جاتے ہیں۔ وہ احکام جو شریعت کے خلاف ہوں اور نہ شریعت پر مبنی ہوں۔ اگر لوگوں کے رب اللہ رب العالمین قرار پائیں تو پھر ان کا کوئی اور رب نہیں رہتا جس کے احکام اور قوانین کے وہ مطیع ہوں اور لوگ فرعون کے احکام اور شریعت کی جو اطاعت کرتے ہیں تو اس لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے اسے اپنا رب تسلیم کر لیا ہے۔ لوگوں کا رب وہ شخص ہوتا ہے جس کے قوانین کی وہ اطاعت کرتے ہیں اور یہ لوگ اس رب کے دین میں ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بات تو اس قدر جلدی سے نہیں مانی جا سکتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طاغوت ٹھنڈے پیٹوں اپنے اقتدار اعلیٰ سے دست بردار ہو جائے اور اس کا نظام باطل اور کالعدم قرار پا جائے؟

فرعون اور اس کا ٹولہ اس قدر بے وقوف نہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعلان اور مطالبے کے نتائج سے باخبر نہ ہو بلکہ وہ واضح طور پر موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کو سمجھ جاتے ہیں اور اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ لیکن اس انداز میں کہ لوگوں کی نظریں حضرت موسیٰ کے معجزانہ دلائل سے پھر جائیں۔ چنانچہ فرعون اور اس کے ٹولے نے حضرت موسیٰ

پر یہ الزام لگایا کہ وہ ایک عظیم جادوگر ہیں۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ (۱۰۹) يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ

اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۱۱۰) "اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے 'اب کہو کیا کہتے ہو؟" وہ چلا چلا کر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جو دعویٰ کیا ہے وہ کس قدر دور رس نتائج کا حامل ہے اور کس قدر خطرناک ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ہمیں سرزمین مصر سے نکالنا چاہتا ہے 'حکومت چھیننا اس کا مطلب ہے۔وہ ہمارے نظام حکومت کے خلاف سازش کر رہا ہے بلکہ وہ انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔دور جدید میں اسے یہی کہا جاسکتا ہے۔

یہ زمین اللہ کی ہے' عوام الناس اللہ کے پیدا کردہ ہیں' اگر اللہ کی سرزمین پر اللہ کے بندوں پر حکومت بھی اللہ کی قائم ہو جائے تو وہ تمام طاغوتی حکمرانیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں جو اللہ کی شریعت کے برعکس قائم ہوں۔اور ان لوگوں کا اقتدار خود بخود ختم ہو جاتا ہے جو از خود لوگوں کے خدا بنے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کا اقتدار بھی خود بخود ختم ہو جاتا ہے جنہیں ان طاغوتی حکمرانوں نے صاحب منصب اور اہلکار بنا رکھا ہے۔

اس طرح فرعون اور اس کے ٹولے نے معلوم کر لیا کہ حضرت موسیٰ کی دعوت کس قدر خطرناک ہے۔اور یہی بات تمام طاغوتی قوتیں ہر دور میں اچھی طرح جان لیتی ہیں۔

ایک عرب نے اپنے فطری فہم و ادراک کی اساس پر یہ کہا کہ حضور ؐ جو لوگوں کا (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ) کی دعوت دیتے ہیں یہ ایک ایسی دعوت ہے جسے بادشاہ پسند نہیں کرتے۔اور ایک دوسرے عرب دانشور نے اپنی فطری معاملہ فہمی کی اساس پر یہ کہا اگر تم نے اس دعوت کو جاری رکھا تو عرب و عجم تمہارے ساتھ برسرپیکار ہو جائیں گے۔یہ دونوں عرب دانشور دراصل عربی زبان کے مفاہیم کو اچھی طرح جانتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ) کا اعلان حکمرانوں کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔کیونکہ وہ عربی کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ ایک دل میں یا ایک سرزمین پر کلمہ طیبہ کی شہادت اور پھر غیراللہ کی اور خلاف شریعت حکمرانی قائم نہیں ہو سکتی۔اس وقت کے عرب کلمہ شہادت کو اس طرح نہ سمجھتے تھے جس طرح آپ کے نام نہاد مسلمان اسے سمجھتے ہیں۔آج کے لوگوں کا مفہوم کلمہ شہادت بہت ہی ناقص 'کم درجے کا اور کمزور درجے کا ہے۔

اب فرعون اور اس کے ٹولے کے درمیان مذاکرات اور مشورے شروع ہو گئے۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ (۱۱۱) يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ

عَلِيْمٍ (۱۱۲) "پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھئے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔" اس وقت مصر میں کاہن اور جادوگر بڑی تعداد میں تھے۔خود کاہن جادوگری کا کام بھی کرتے تھے۔تمام بت پرستانہ مذاہب میں جادو دین کا ایک حصہ ہوتا ہے

چنانچہ ان ادیان کے کاہن اور مجاور جادوگری کا کام بھی کرتے تھے۔ آج کل ادیان کے جدید ماہرین اس صورت حالات کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایک دور ایسا بھی رہا ہے کہ جادوگری سے دین کا آغاز ہوا۔ اور زیادہ پکے ملحد یہ یاوہ گوئی کرتے ہیں کہ جس طرح جادو بالکل دین قرار پا گیا ہے اسی طرح ہر ایک دین بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح سائنس نے جادوگری کے دور کو ختم کر دیا ہے اسی طرح ایک وقت ایسا آئے گا کہ مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ بہرحال یہ ان کا خبط ہے جس میں وہ سائنس کے عنوان سے مبتلا ہیں۔

فرعون کے مشیروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ حضرت موسیٰ اور آپ کے بھائی کو وقت دے دیں اور اپنی ریاست کے اطراف و اکناف سے بڑے بڑے جادوگروں کو طلب کریں تاکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جادوگری کا مقابلہ کریں۔ (نعوذ باللہ)

فرعون نے اپنی معروف و مشہور فرعونیت کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں سرکشی کا مظاہرہ نہ کیا اور اس کا رویہ بیسویں صدی کے بعد کے فرعونوں سے زیادہ معقول رہا۔ آج کل کے فرعون دعوت اسلامی کا مقابلہ تشدد اور قید و بند اور باطل طریقوں سے کرتے ہیں۔

---○○○---

قرآن کریم اب درمیانی تفصیلات چھوڑ کر ایک دوسرے منظر کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح فرعون کے ٹولے نے لوگوں کو جمع کیا اور کن کن کو جمع کیا بلکہ پردہ اٹھتے ہی جادوگر سامنے آجاتے ہیں اور یہ قرآن کریم کا بیان کردہ قصص میں نہایت ہی موثر اور پیارا اسلوب ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ایک منظر کو لپیٹ کر دوسرا منظر سامنے لایا جاتا ہے۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ﴿۱۱۳﴾قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴿۱۱۴﴾

"چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آگئے۔ انہوں نے کہا "اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟"
فرعون نے جواب دیا "ہاں، اور تم مقرب بارگاہ ہو گے۔"

یہ لوگ پیشہ ور جادوگر تھے اور اسی طرح پیشہ ور کاہن تھے اور دونوں کاموں سے ان کا مقصد پیسے کمانا تھا۔ دنیا میں ہمیشہ پیشہ ور علمائے دین نے طاغوتی طاقتوں اور ظالم بادشاہوں کی خدمت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ نیز دنیا میں جب بھی اللہ کی حاکمیت کا نظام معطل ہوا ہے اور اللہ وحدہ کی بندگی ختم ہوئی ہے اس کی جگہ طاغوتی نظام قائم ہو گیا ہے اور جب طاغوتی نظام قائم ہوا ہے تو ایسے حکمرانوں کو پیشہ ور اہل دین کی ضرورت پیش آئی ہے اور ان حکمرانوں نے ان اہل پیشہ کو ان کے پیشے پر اجر دیا ہے اور انہوں نے دینی اعتبار سے اس طاغوتی نظام کو قبول کیا ہے۔ یوں دونوں کے درمیان باہم معاہدہ رہا ہے اور طاغوتی حکمرانوں نے ان پیشہ ور اہل دین کو پیسہ بھی دیا ہے اور مقرب بھی بنایا ہے۔

فرعون نے یقین دہانی کرائی کہ وہ اس کام پر انہیں اجرت بھی دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے مقربین میں سے بھی ہوں گے۔ یوں فرعون نے ان کو آمادہ کیا کہ وہ صرف موسیٰ کا بے جگری سے مقابلہ کریں اور سخت جدوجہد

کریں۔ لیکن ان کو کیا پتہ تھا کہ معاملہ اس قدر آسان نہیں ہے کہ وہ چرب زبانی یا چالاکی سے حضرت موسیٰ کو شکست دے دیں گے۔ یہاں تو ان کا واسطہ خدا' خدا کے رسول' خدائی معجزات اور خوارق عادت' حقائق و واقعات سے تھا' محض شعبدہ بازی اور تخیلاتی جادوگری نہ تھی۔

---ooo---

جادوگر اجر کے بارے میں مطمئن ہو گئے اور فرعون کی ہمنشینی کی لالچ میں ان کی گردنیں بلند ہو گئیں اور مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب یہ حضرت موسیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور آپ کو چیلنج دیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ اس مقام بلند تک جا پہنچتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے مقرر کیا تھا اور جس کے بارے میں انہیں تصور بھی نہ تھا اور وہ اس اجر کے مستحق قرار پائے جس کی انہیں توقع ہی نہ تھی۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ

"پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا "تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟" موسیٰ نے جواب دیا "تم ہی پھینکو"

انہوں نے اختیار حضرت موسیٰ کو دے دیا کہ چاہو تو تم اپنا عصا کو پھینکو یا ہم پھینکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت اعتماد سے چیلنج کر رہے تھے۔ ان کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اور اپنی فنکاری پر اعتماد تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت موسیٰ بھی نہایت ہی پر اعتماد تھے اور انہوں نے لاپرواہی سے جواب دیا "تم پھینکو" انہوں نے صرف ایک لفظ میں جواب دیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ان کے کرتب کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے نفس کے اندر پورا یقین و اطمینان تھا۔ یہ امور اور یہ معانی قرآن کریم کے طریقہ کلام کے مطابق الفاظ کے استعمال سے ظاہر ہوتے ہیں۔

جس طرح حضرت موسیٰ اچانک اس صورت حالات سے دوچار ہوئے' سیاق کلام اور انداز بیان ایسا ہے کہ ہر قاری اچانک ایک خوفناک صورت حال سے دوچار ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑی لاپرواہی سے جواب دے رہے ہیں لیکن اچانک انہیں بھی ایک نہایت ہی خوفناک اور مرعوب کن صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے جسے دیکھ کر انسان خائف ہو جاتے ہیں اور کانپ اٹھتے ہیں۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

"انہوں نے جو اپنے آنچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوفزدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔"

ہمارے لئے یہ بات کافی ہے کہ ان لوگوں کے فن کے بارے میں قرآن کریم نے بھی سحر عظیم کا لفظ استعمال کیا اور اس سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا جادو کس قدر عظیم تھا۔ انہوں نے لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور لوگوں کے

دلوں کو رعب سے بھر دیا اور ماحول پر خوف کی فضا طاری ہو گئی۔

لفظ استرھب کے استعمال سے ماحول کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے یعنی انہوں نے لوگوں کے اندر خائف ہونے کا تاثر پیدا کر دیا۔ اس طرح کہ وہ ڈرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور سورت طٰہ میں تو یہ بھی بتایا گیا کہ حضرت موسیٰ بھی دل ہی دل میں خائف ہو گئے تھے۔ ان تمام الفاظ سے ان لوگوں کی خوفناک جادوگری کے بارے میں یقین آجاتا ہے۔

لیکن اب ایک دوسری سرپرائز سامنے آتی ہے۔ ایک عظیم واقعہ پیش آتا ہے۔ فرعون اور اس کا ٹولہ اور جادوگر سب کے سب ششدر رہ جاتے ہیں۔ تمام لوگ دم بخود رہ جاتے ہیں اور اس عظیم میدان کے بے شمار اور عظیم مجمع پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے جنہوں نے جادوگری کے اس عظیم عمل کو دیکھا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

”ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔ اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدان مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) الٹے ذلیل ہو گئے۔“

باطل ہمیشہ پھول جاتا ہے اور آنکھوں کو چکاچوند کر دیتا ہے' دلوں کو مرعوب کر دیتا ہے اور اکثر لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ باطل غالب ہی رہے گا۔ یہ سیلاب کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ اور تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دے گا لیکن جونہی اس کا واسطہ ایک سنجیدہ' پرعزم اور مضبوط سچائی سے ہوتا ہے تو اس سے غبارے کی طرح ہوا نکل جاتی ہے اور وہ بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے' خارپشت کی طرح سکڑ جاتا ہے اور محض گھاس کے شعلے کی طرح ہوتا ہے جو ایک منٹ میں بجھ جاتا ہے۔ اب سچائی کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ اس کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں اور جڑیں گہری ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے یہاں جو انداز تعبیر اختیار کیا ہے' اس میں اس مفہوم کا پرتو موجود ہے۔ یہ تاثر ملتا ہے کہ حق ایک عظیم اور بھاری وجود کا مالک ہے اور اس کی زد بڑے زور سے پڑتی ہے اور وہ مستقلاً ثابت ہو جاتا ہے اور حق کے سوا تمام دوسرے امور ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور باطل کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔ سچائی باطل اور اس کے پیروکاروں پر غالب آجاتی ہے اور نہایت پھلنے پھولنے اور آنکھوں کو چندھیانے کے بعد یہ باطل بڑی تیزی سے سکڑ جاتا ہے۔

(فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ) ”فرعون اور اس کے ساتھی میدان مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور فتح مند ہونے کے بجائے الٹا ذلیل ہوئے۔“ لیکن ابھی تک یہ سرپرائز ختم نہیں ہوئی' اس منظر میں ایک کے بعد خلاف توقع دوسرے مناظر آتے ہیں۔ اب ایک عظیم منظر اچانک نظروں کے سامنے ہے۔

وَ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۱﴾
رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے "ہم نے مان لیا رب العالمین کو' اس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں۔"

یہ ہے انسانی ضمیر میں سچائی کا رعب اور دبدبہ۔ انسانی شعور اچانک روشن ہو جاتا ہے اور جب کوئی دل قبولیت حق کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو اس کے اندر اچانک سچائی کا چراغ روشن ہو جاتا ہے اور وہ یقین سے بھر جاتا ہے۔ یہ جادوگر اپنے فن کی حدود سے اور اس کی ماہیت سے اچھی طرح باخبر تھے اور اگر حضرت موسیٰ جادوگر ہوتے تو وہ اور لوگوں کے مقابلے میں انہیں بہت جلد پہچان لیتے۔ حضرت موسیٰ کے ہاتھوں جس معجزے کا ظہور ہوا وہ انسانی قدرت اور جادو کے دائرے سے ورا تھا۔ ایک ماہر فنکار اپنے فن کے بارے میں حقیقت کو بہت جلد تسلیم کر لیتا ہے' بشرطیکہ حقیقت اس پر منکشف ہو جائے۔ اس لئے کہ صاحب فن حقیقت کے قریب ہوتا ہے' اور اس کا علم ان لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے جو صرف سطحی معلومات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جادوگر چیلنج اور تحدی کے موقف کو چھوڑ کر تسلیم و رضا کا پیکر بن گئے کیونکہ وہ اپنے دلوں کے اندر یقین پا رہے تھے اور یہ حقیقت ان کے شعور کا حصہ بن گئی تھی۔

لیکن کوئی بھی طاغوتی طاقت اس بات کو نہیں سمجھ سکتی کہ انسان کا دل کس طرح نور سے بھر جاتا ہے یا یہ کہ انسان کو ایمان کی یہ شرح صدر کس طرح ہو جاتی ہے اور انسان کے دل میں یقین کی گرمی کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ طاغوتی قوتیں چونکہ طویل عرصے تک لوگوں کو غلام بنائے رکھتی ہیں اس لئے انہیں یہ زعم ہو جاتا ہے کہ وہ معاملات کو اپنے ڈھب پر ڈالنے کی قوت رکھتی ہیں اور لوگوں کے دل و دماغ کو پھیر بدل سکتی ہیں۔ حالانکہ انسان کا دل تو رحمن کی انگلیوں میں ہوتا ہے' وہ جس طرح چاہے اسے پھیر دے۔ جادوگروں کی جانب سے اعلان شکست اور اعلان ایمان فرعون کے لئے ناقابل تصور اور تعجب خیز تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کے دلوں میں تو ایمان کا شائبہ تک نہ تھا اور نہ ان کے ضمیر میں ایمان کا کوئی دخل و عمل اس کے علم میں تھا۔ پھر اس کے لئے یہ اچانک اعلان ایمان اس قدر خطرناک تھا کہ اس سے اس کی حکومت خطرے میں پڑ گئی۔ اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ جادوگر صرف جادوگر ہی نہ تھے بلکہ وہ اس وقت کی عبادت گاہوں کے کاہن اور علماء و خطباء تھے' جب کسی ملک کے تمام مذہبی راہنما ایمان لے آئیں تو پھر حکومت کے لئے اپنی جگہ پر ٹھہرنا ممکن نہیں رہتا۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ وہ مقابلے کے لئے میدان میں آئے ہوں۔ ایسے حالات میں کہ جب طاغوتی نظام بذات خود خطرے میں ہو تو اہل طاغوت سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ
مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۲۴﴾

فرعون نے کہا "تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں' یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کرو۔ اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔"

ذرا انداز ملاحظہ ہو "تم اس پر ایمان لائے ہو قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔" گویا یہ ان کا قانونی فرض تھا کہ وہ اس سے اجازت لیں کہ وہ ایمان قبول کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ خود مختار نہیں ہیں۔ یا مطلب یہ ہے کہ ان کے شعور و وجدان کو کوئی حرکت نہیں کرنا چاہئے اور وہ اپنے شعور کے معاملے میں بھی خود مختار نہیں ہیں۔ اگر ان کے قلب و نظر پر کوئی روشنی پڑتی ہے تو انہیں حجاب کرنا چاہئے اور اس معاملے میں بھی فرعون سے پوچھنا چاہئے۔ اگر ان کے دلوں میں کوئی عقیدہ یا یقین بیٹھتا ہے تو انہیں اس کی اجازت نہیں ہے کہ فرعون کے اذن کے بغیر ایسا کریں غرض ان کا فرض ہے کہ ہر قسم کی نئی روشنی سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔

لیکن ہر طاغوتی طاقت جاہل اور غبی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر طاغوتی طاقت متکبر' مغرور اور انتہا پسند ہوتی ہے۔ نیز ہر طاغوتی طاقت اپنے اقتدار کے بارے میں نہایت حساس ہوتی ہے اور اسے ایسی باتوں سے اپنا اقتدار خطرے میں نظر آتا ہے اور طاغوتی تخت اور اقتدار متزلزل نظر آتا ہے۔

(اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا (۱۲۳)) "یقیناً کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔ اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔"

اور ایک دوسری آیت میں ہے (اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ) "یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔" بہرحال یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ حضرت موسیٰ کی دعوت رب العالمین کی طرف تھی اور ہر وہ دعوت جو رب العالمین کی طرف ہوتی ہے وہ نہایت خوفناک ہوتی ہے۔ جہاں بھی رب العالمین کی طرف دعوت پھیل جائے وہاں طاغوتی نظام باقی ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ طاغوتی نظام قائم ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ اس میں رب العالمین کے اقتدار اور قانون کے بجائے دوسرے انسانوں کا اقتدار اور قانون نافذ ہوتا ہے اور انسان زمین پر بطور رب کام کرتے ہیں۔ انسانوں کو اپنا غلام بناتے ہیں اور ان کے لئے جو چاہتے ہیں قوانین بناتے ہیں۔ دراصل یہ دو مستقل نظام حیات ہوتے ہیں جو ایک جگہ جمع ہو ہی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ دو الگ الگ دین ہوتے ہیں اور ان کے دو الگ الگ رب ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو فرعون اچھی طرح جانتا تھا' اس کی جماعت بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت کے نتیجے میں فرعون کا اقتدار متزلزل ہو گیا تھا اور اب جبکہ جادوگر سب کے سب سجدے میں گر گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ انہوں نے رب العالمین کی دعوت تسلیم کر لی ہے اور وہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے رب پر ایمان لائے ہیں۔ یہ جادوگر اس وقت کے مذہبی لیڈر اور کاہن تھے اور انہوں نے دینی اعتبار سے فرعون کو رب الناس کا مقام دیا ہوا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون نے ان کو اس قدر وحشیانہ اور عبرت آموز سزا کی دھمکی دی۔

(لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ (۱۲۴)) "میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی چڑھاؤں گا۔"

تشدد، تعذیب اور سخت اور عبرت آموز سزا۔ یہ ہیں وہ وسائل جو ہر طاغوتی نظام، حق کے مقابلے میں لاتا ہے۔ اس لئے کہ حق کا مقابلہ کبھی بھی حجت اور استدلال سے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ تشدد کے ہتھیار ہمیشہ سچائی کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔

...... لیکن جب نفس انسانی کو ایمانی سربلندی حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے اندر ایمان کی حقیقت جاگزیں ہو جاتی ہے تو وہ اس کرۂ ارض کی عظیم قوتوں کے مقابلے میں آکھڑا ہوتا ہے اور اسے سرکشوں اور طاغوتوں کے انتقام کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اور ایسے افراد کی زندگی میں نظریہ حیات کو دنیاوی زندگی پر برتری حاصل ہو جاتی ہے اور یہ فانی زندگی آنے والی دائمی زندگی کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ جب نفس انسانی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا ہے اور کیا چھوڑے یا کیا ہے یا وہ کیا پائے گا اور کیا کھوئے گا اور اس کو اس راہ میں کیا کیا مشکلات انگیز کرنی ہوں گی؟ اور کیا کیا مشقتیں اٹھانی ہوں گی؟ کیونکہ اس کا نصب العین دور افق پر روشن نظر آتا ہے اور اس کی نظر بلند ہو جاتی ہے اور وہ پھر نیچے راستے کے کانٹوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں ہے۔

قَالُوٓا إِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنقِمُ مِنَّآ إِلَّآ أَنْ ءَامَنَّا ۱۴
۱۸ ع بِـَٔايَـٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۚ رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿۱۲۶﴾ ۴

انہوں نے جواب دیا "بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا۔ اے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمان بردار ہوں۔"

یہ ہے وہ ایمان حقیقی کا حامل انسان، جو نہ خائف ہوتا ہے اور نہ اس کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں۔ نہ وہ جھکتا ہے اور نہ غلام ہے۔ جو اپنے انجام کے بارے میں مطمئن ہے اور اس راہ پر راضی ہو گیا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ رب العالمین کی طرف لوٹنے والا ہے اور وہ اس راہ کو اب نہیں چھوڑ سکتا۔

(قَالُوٓا إِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ (۱۲۵)) انہوں نے جواب دیا "بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔" جو شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے اور طاغوتی نظام کے درمیان برپا معرکے کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ کہ یہ معرکہ ایک نظریاتی معرکہ ہے، وہ پھر مداہنت نہیں کرتا اور نہ جنگی داؤ پیچ سے کام لیتا ہے نہ درگزر اور عفو سے کام لیتا ہے۔ خصوصاً ایسے دشمن کے مقابلے میں جس کا مقصد یہ ہو کہ اہل ایمان اپنے ایمان اور نظریے سے دستبردار ہو جائیں۔

(وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا) "تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا۔"

جو شخص یہ جانتا ہو کہ وہ کس کے خلاف صف آرا ہے' اور وہ کس کے مقابلے میں آگے بڑھ رہا ہے' پھر وہ اپنے دشمن سے امن و عافیت کا سوال نہیں کیا کرتا۔ وہ صرف اپنے رب سے سوال کرتا ہے اور وہ بھی اس بات کا کہ اسے اس فتنے میں صبر و استقامت عطا کی جائے اور یہ کہ وہ اسلام کا وفادار ہے۔

(رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ) "اے رب' ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمان بردار ہوں۔"

اب سرکشی ایمان کے مقابلے میں بے بس ہو جاتی ہے' اسے ایک فہم سے اور اطمینان کے ایک پہاڑ سے واسطہ پڑتا ہے۔ سرکشی اور طغیان کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ اسے اختیار کرنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح اسے انسان کے جسم پر غلبہ اور کنٹرول حاصل ہے' اس طرح اسے لوگوں کے دل و دماغ پر بھی تسلط حاصل ہے۔ اور جس طرح وہ لوگوں کے جسموں پر حکم چلاتے ہیں اسی طرح وہ لوگوں کے دماغوں کو بھی کنٹرول کرتے ہیں' لیکن یہ بات ان کے لئے انہونی ہوتی ہے کہ کوئی دل ان کی نافرمانی کرے حالانکہ ایسا ہوتا ہے' اس لئے کہ دل تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور جب کسی دل کا رابطہ اللہ سے ہو جائے اور وہ سرکشی کے مقابلے میں ڈٹ جائے تو یہ سرکشی بے بس ہو جاتی ہے۔ جب دل اللہ کے ہو جائیں اور ان کا ربط اللہ سے ہو جائے تو بڑی سے بڑی طاقت بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ ایمانی قوت کے مقابلے میں بڑے بڑے سلطان اور جبار عاجز آ جاتے ہیں۔

یہ انسانی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موقف ہے۔ ایک طرف فرعون' اس کا طاغوتی نظام اور اس کے پیروکار ہیں اور دوسری جانب بے بس مومن جادوگر ہیں جو کبھی جادوگر تھے۔ اب وہ ایک تاریخی موقف کے حامل ہیں۔ ان کا نظریہ حیات زندگی پر فاتح ہو کر برتری حاصل کر چکا ہے۔ انسانی عزیمت نے جسمانی رنج و الم پر برتری حاصل کر لی ہے۔ انسان شیطان پر غالب آگیا ہے۔

بے شک یہ انسانی تاریخ کا ایک دو ٹوک موقف ہے۔ اس موقف کے ذریعے ایک حقیقی آزادی کا اعلان کیا گیا ہے۔ آزادی کی ماہیت کیا ہے؟ آزادی یہ ہے کہ ایک انسان اپنے عقیدے اور نظریات کو لے کر سرفراز ہو جائے اور جباروں اور سرکشوں کے مقابلے میں ڈٹ جائے۔ اور اس مادی قوت کو ہیچ سمجھ لے جو انسانی جسموں پر تو کنٹرول کرتی ہے لیکن جسے انسان کی روح اور نظریات تک رسائی نہیں ہوتی' اور جب مادی قوتیں دلوں کو مسخر کرنے سے عاجز آ جائیں تو اس مقام سے حقیقی حریت اور آزادی کا جنم شروع ہوتا ہے اور یاد رہے کہ یہ جنم آزاد دلوں میں ہوتا ہے۔

یہ ایک دو ٹوک موقف ہے اور پوری انسانی تاریخ میں یہ موقف واضح طور پر بتاتا ہے کہ مادی قوت بے کس و بے بس ہے۔ ذرا دیکھئے کہ یہ جادوگر ابھی تو فرعون سے معمولی اجرت کے طلبگار تھے اور پھر یہ تمنا رکھتے تھے کہ اس کے دربار میں کرسی نشین ہو جائیں اور بادشاہ کے ساتھ انہیں قرب نصیب ہو۔ یہ حقیر گروہ' ایمان کے بعد' اب فرعون کے مقابلے میں سرفرازی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور دار و رسن کے مقابلے میں تیار کھڑا ہے۔ حالانکہ مادی اعتبار سے ان کے ماحول میں

ہر چیز اسی حالت میں ہے جو تغیر ہوا ہے ۔ وہ صرف یہ ہے کہ ایک حقیر ستارے کو خفیہ اجالا مل گیا ہے 'اور اب یہ حقیر ستارہ نہیں بلکہ حقیر ذرہ ایک مستحکم برج میں داخل ہو گیا ہے اور ایک فانی فرد ازلی اور ابدی قوت تک رسائی حاصل کر چکا ہے ۔ قلب مومن پر ایک سوئی رکھ دی گئی' اب دل مومن قدرت کے اثرات قبول کر رہا ہے' اس کے ضمیر میں سے قدرتی آوازیں آرہی ہیں' اور انسانی بصیرت پر انوار پڑتے ہیں' یہ سوئی قلب مومن کو احساس دلاتی ہے جبکہ عالم مادیت میں کچھ بھی تغیر پذیر نہیں ہوتا ۔ لیکن انسان عالم مادیت سے سربلند ہو کر ایسے جہان نو میں چلا جاتا ہے جن کے بارے میں پہلے وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا ۔

اب دھمکی اپنا راہ لیتی ہے اور ڈرلاوا تلاش میں رہتا ہے لیکن ایمان اپنی راہ پر دور نکل چکا ہوتا ہے ۔ وہ پیچھے کی طرف دیکھا ہی نہیں' اسے کوئی تردد نہیں ہوتا اور نہ وہ بے راہ ہوتا ہے ۔

اس حد تک جب منظر چلتا ہے تو پردہ گر جاتا ہے اور مزید تفصیلات نہیں دی جاتیں کیونکہ یہاں اس منظر کی خوبصورتی اپنے عروج کو پہنچ کر ایک بات بھی مکمل ہو جاتی ہے اور ایک فنی خوبصورتی بھی اپنے کمال تک پہنچ جاتی ہے ۔ قرآن کا فنی کمال یہاں پر بھی اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے اور قاری کا وجدان بھی قصے کے نفسیاتی مقاصد کو پالیتا ہے ۔ نہایت ہم آہنگی کے ساتھ اور قرآن کریم کے مخصوص اسلوب اظہار میں ۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی)

---ooo---

قرآن کے سائے میں' اس دلچسپ منظر کے سامنے کھڑے ہو کر ہمیں چاہئے کہ قدرے غور و فکر کریں ۔

☆ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے جادوگروں کی جانب سے ایمان اور رب موسیٰ اور ہارون کو تسلیم کر لینے کے فعل کو اپنے نظام حکومت کے خلاف ایک سازش سمجھا اور اس بات کا اظہار کیا کہ ان کی حکومت اور اقتدار خطرے میں ہے ۔ اس لئے کہ جس اصول پر ایمان کا نظام قائم ہوتا ہے وہ اصول فرعونی نظام کے اساسی اصول سے متضاد ہے ۔ اس بات کی تشریح اس سے قبل ہم کر چکے ہیں ۔ یہاں بطور تکرار و تاکید دوبارہ یہ بات لائی جاتی ہے' کسی ایک دل' کسی ایک ملک' کسی ایک نظام میں یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ بھی رب العالمین ہو اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی انسان بھی رب الناس ہو' اور اس کے قوانین لوگوں میں رائج اور نافذ ہوں اس لئے کہ اللہ کا دین بھی ایک مکمل نظام ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فرعونی دین بھی ایک مکمل دین ہے ۔

☆ جب جادوگروں کے دلوں میں شمع ایمان روشن ہو گئی اور انہوں نے ایمان و کفر کی حقیقت کو پا لیا تو انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ ان کے اور فرعون کے درمیان ایسا نظریاتی اور اصولی اختلاف ہے' اور یہ کہ فرعون جو انتقامی کارروائی کی دھمکی دے رہا ہے وہ محض اس لئے دے رہا ہے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اللہ کو رب العالمین تسلیم کر لیا ہے ۔ اور اس انداز میں ایمان لانا فرعون کے نظام حکومت کے لئے چیلنج ہے ۔ اسی طرح فرعون کی حکومت کے اعلیٰ ڈھانچے اور دستوری نظام کے لئے بھی یہ ایک چیلنج ہے ۔ یعنی فرعون کا نظام ربوبیت جس بت پرستانہ تصورات پر قائم تھا وہ جڑ سے اکھڑ گئے تھے ۔ جو شخص بھی رب العالمین وحدہ لاشریک کی طرف دعوت دیتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے ۔ اس لئے کہ اس ادراک ہی کی وجہ سے اہل ایمان کے لئے تمام مصائب و شدائد قابل برداشت بن گئے ۔ اب وہ دار و رسن کے لئے تیار ہو گئے اس

لئے کہ انہوں نے ایمان کا دعویٰ کر دیا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا اور فرعون کا دین ان سے جدا ہے اس لئے کہ فرعون نے لوگوں کو غلام بناکر اور اپنا قانون جاری کر کے اللہ کی رب العالمینی کا انکار کر دیا ہے لہٰذا فرعون کافر ہے۔ اس طرح ہر داعی کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ایمان کی طرف دعوت دے رہا ہے اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والے کافر ہیں اور فرعونی نظام کے داعی ہیں۔ اور یہ دشمنی محض (اَلْبُغْضُ فِی اللّٰہِ) ہے۔ اس کی تہ میں کوئی اور داعیہ ' داعیہ ایمان کے سوا نہیں ہے۔

☆ اس کے بعد اس منظر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ ایمان کے سامنے پوری زندگی اور اس کی آسائشوں کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ عزم و ارادے کے سامنے رنج والم کے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ انسانی قوت شیطانی قوت پر فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ ایک نہایت ہی فرحت بخش اور حیران کن منظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس منظر کی خوبصورتی کا بیان ممکن نہیں ہے۔ خود نصوص قرآن ہی کو پڑھئے۔ ۔

---O O O---

اب اس قصے کا مزید مطالعہ کیجئے۔ پردہ اٹھتا ہے اور ایک جدید اور دوسرا خوبصورت منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس میں کفر کی پارلیمنٹ نظر آتی ہے۔ مشورہ اور نجوہ ہوتا ہے اور کسی سخت اقدام کے لئے ایک دوسرے کو جوش دلایا جاتا ہے۔ پہلے اور کھلے میدان کے معرکے میں کھلی کھلی شکست میں خفت اٹھائے ہوئے اعیان دولت بپھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے لئے یہ صورت حالات ناقابل برداشت ہے کہ موسیٰ اور ہارون اس طرح کامیاب و کامران ہو جائیں۔ اور یہ ایمان لانے والے لوگ بھی مزے مزے سے ان کے ہم رکاب ہوں۔ حالانکہ حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والوں میں چند کمزور لوگ شامل تھے اور وہ فرعون سے ہروقت ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں فرعون ان کو فتنے میں نہ ڈال دے۔ جیسا کہ دوسرے مقامات پر قرآن نے تصریح کی ہے۔ یہ پارلیمنٹ سختی کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے خلاف فرعون کو برانگیختہ کر رہے ہیں اور اسے ڈراتے ہیں کہ اگر اس کے خلاف سخت ایکشن نہ لیا گیا تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ حکومت کا رعب جاتا رہے گا۔ جدید خطرناک نظریات پھیل جائیں گے۔ لوگ فرعون کے بجائے اللہ کو رب العالمین سمجھیں گے۔ چنانچہ وہ تیار ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ وہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ ان لوگوں کے خلاف شدید ایکشن لے اور قوت کا استعمال کرے اور اخلاقی شکست کے بعد پوری مادی قوت استعمال کرے۔ مادی قوت کے مالکان ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

"فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا "کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد

پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھیں؟" فرعون نے جواب دیا "میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔"

فرعون کا دعویٰ یہ نہ تھا کہ وہ اس کائنات کا الٰہ اور خالق ہے اور اس کائنات کو وہ چلاتا ہے یا یہ کہ اسے اس کائنات کے طبیعی نظام پر قدرت حاصل ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو اپنی کمزور پبلک پر الٰہ اور رب سمجھتا تھا۔ اس معنی میں کہ وہ حاکم اور مقنن ہے اور یہ کہ اس کا حکم اور ارادہ قانون ہیں اور ان پر عمل ہوتا ہے اور ہونا چاہئے اور تمام حکام اور بادشاہوں کا بھی یہی دعویٰ ہوتا ہے کہ ان کا قانون چلتا ہے اور ان کے حکم سے امور طے ہوتے رہیں اور یہی مفہوم ہے ربوبیت کا ازروئے لغت۔ مصر میں لوگ فرعون کی بندگی اس معنی میں نہ کرتے تھے کہ وہ فرعون کی نمازیں پڑھتے تھے یا فرعون کے روزے رکھتے تھے بلکہ ان کے اپنے الٰہ تھے جس طرح فرعون نے اپنے لئے الٰہ بنا رکھے تھے اور یہ لوگ ان الہوں کی بندگی بجالاتے تھے اور اس حقیقت کا اظہار درباریوں کے اس قول سے بھی ہوتا ہے

(وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ) "تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے ہیں۔" اور یہ حقیقت مصر کی فرعونی تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ فرعون کا الٰہ تھا۔ لہٰذا فرعون اس معنی میں ان کا رب اور الٰہ تھا کہ یہ لوگ اس کے اوامر و نواہی کے پابند تھے اور اس کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کر سکتے تھے اور نہ اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کر سکتے تھے اور عبادت کا یہی لغوی، حقیقی اور اصطلاحی مفہوم ہے بلکہ یہی واقعی مفہوم ہے جو شخص کسی انسان کے وضع کردہ قانون کی اطاعت کرے وہ گویا اس کی عبادت کر رہا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تشریح فرمائی ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی تشریح کے بارے میں ایک صحابی عدی ابن حاتم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت تو نہ کرتے تھے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ احبار و رہبان ان کے لئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے تھے اور یہ لوگ اس میں ان کی اطاعت کرتے تھے، یہی تو ان کی جانب سے ان کی عبادت ہے۔ (ترمذی)

رہی یہ بات جو اس نے کہا مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ "میرے علم میں تمہارے لئے میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے؟" تو اس کی تفسیر خود قرآن نے کر دی ہے۔ قرآن نے فرعون کی زبانی یہ بات نقل کر دی

(اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (۵۲) فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (۵۳) "لوگو، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا کہ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی (معیت) میں نہ آیا۔" (۴۳:۵۱, ۵۳) ظاہر ہے کہ وہ اس میں اپنا اور حضرت موسیٰ کا موازنہ پیش کر رہا تھا۔ اس کے پاس کنگن نہیں

ہیں اور میں نے کنگن پہنے ہوئے ہیں یعنی میں بادشاہ ہوں اور زیب و زینت کا مالک ہوں اور موسیٰ کے پاس یہ خوبی نہیں۔ لہٰذا اس کے اس قول سے مراد یہ ہے کہ میرے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ میں ہی حاکم ہوں اور جس طرح چاہتا ہوں اس مملکت کو چلاتا ہوں اور لوگ میری بات سے سرتابی نہیں کر سکتے اور اس مفہوم میں حاکمیت الوہیت کے مترادف ہے۔ اور فی الحقیقت الوہیت کا مفہوم ہی یہی ہے۔ الٰہ ہوتا ہی وہ ہے جو لوگوں کے لئے قانون بناتا ہے۔ چاہے وہ الوہیت کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔ (۱)

اس تفسیر کے مطابق ہم فرعون کے امراء کے اس قول کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں۔

(وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ) ”فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا ”کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھیں۔“

ان لوگوں کے نقطہ نظر سے فساد فی الارض یہ ہے کہ انسان اللہ وحدہ کی ربوبیت اور حاکمیت کی طرف لوگوں کو بلائے کیونکہ جب کوئی اللہ رب العالمین کو الٰہ اور حاکم تسلیم کرتا ہے تو اس سے از خود تمام دوسرے نظاموں اور حاکموں کی نفی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ فرعونی نظام حاکمیت غیراللہ کے اصول پر قائم ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ نظام فرعون کی ربوبیت کے اصول پر قائم ہوتا ہے اور یہ شخص اللہ کی ربوبیت کا داعی ہوتا ہے۔ لہٰذا اب ہر شخص فرعونیوں کی نظروں میں مفسد فی الارض ہوتا ہے۔ وہ باغی اور انقلابی ہوتا ہے اور ملک کے موجودہ قائم حالات کے اندر اکھاڑ پچھاڑ چاہتا ہے۔ اور موجود مستحکم حالات کی جگہ نئے حالات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جن میں ربوبیت اور حاکمیت صرف اللہ کے لئے ہو کسی انسان کو یہ حقوق حاصل نہ ہوں۔ لہٰذا ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ یہ مفسدین فی الارض ہیں اور فرعون اور اس کے الہوں کی بندگی کو ترک کرنا چاہتے ہیں۔

دراصل فرعون نے اپنے تمام حقوق اس دین سے اخذ کئے تھے جس کا وہ پیروکار تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ ان الہوں کا محبوب بیٹا ہے اور باپ بیٹے کے جس تعلق کا وہ داعی تھا وہ کوئی حسی اور طبعی تعلق نہ تھا کیونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ فرعون جس ماں باپ سے پیدا ہوا تھا وہ مصری باشندے تھے اور انسان تھے۔ یہ ایک اشاراتی اور رمزی ابنیت تھی جس کے ذریعے وہ اپنے لئے وہ تمام حقوق حاصل کرتا تھا' جو اس نے اپنے لئے مخصوص کر رکھے تھے۔ جب موسیٰ اور آپ کی قوم نے رب العالمین کی براہ راست بندگی شروع کر دی اور فرعونی الہوں کو ترک کر دیا جن کی عبادت مصری لوگ کرتے تھے' تو اس فعل سے وہ نظریاتی اساس ہی ختم ہو جاتی تھی جس پر فرعون کی مملکت کی تعمیر ہوئی تھی۔ پھر وہ اپنے نظام مملکت میں اپنی قوم کو کچھ حیثیت بھی نہ دیتا تھا اور وہ لوگ بھی اس کی اطاعت کرتے تھے وہ اللہ کے دین سے خارج تھے اور فاسق تھے۔ دوسری جگہ میں ہے (فاستخف قومه فاطاعوه ...... انهم قوم فاسقين) ”اس نے اپنی

(۱) اس مسئلے کی تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب المصطلحات الاربعه فی القرآن مصنفہ مسلم صادق سید ابو الاعلیٰ مودودی ﷺ امیر جماعت اسلامی پاکستان (سید قطب)

قوم کو ہلکا کر دیا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی..... بے شک یہ لوگ فاسق تھے۔" یہ تاریخ کی صحیح تفسیر ہے۔ اگر فرعون کی قوم ہلکے لوگوں پر مشتمل نہ ہوتی اور فسق و فجور کی عادی نہ ہوتی تو ہرگز فرعون کی اطاعت نہ کرتی۔ اللہ پر جو شخص ایمان لے آتا ہے طاغوت اسے ہلکا نہیں سمجھ سکتا۔ اور نہ کوئی مومن طاغوت کی اطاعت کر سکتا ہے بشرطیکہ مومن یہ جانتا ہو کہ یہ معاملہ شریعت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون اور تمام لوگوں کو رب العالمین کی طرف دعوت دینا، پھر میدان مبارزت میں جادوگروں کو شکست دینا اور ان کا ایمان لے آنا اور اس کے بعد قوم موسیٰ کی طرف سے رب العالمین پر ایمان لانا اور رب واحد کی عبادت کرنا یہ سب امور ایسے تھے جو فرعون کے نظام حکومت کے لئے نہایت ہی خطرناک تھے اور جہاں بھی کوئی ایسا نظام قائم ہو جس میں انسان انسان کا غلام اور مطیع ہو اور ایسے نظام کے اندر کوئی صرف رب العالمین کی بندگی اور اطاعت کی دعوت شروع کر دے تو یہ اس نظام کے لئے چیلنج ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شہادت لا الہ الا اللہ کی طرف دعوت دے اور یہ دعوت اس کلمہ کے حقیقی مفہوم کی طرف ہو کہ لوگ پورے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ جزوی طور پر مراسم عبودیت اللہ کے سامنے بجا لائیں تو یہ دعوت کسی بھی موجود نظام کفر کے لئے چیلنج ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون نے اس صورت حالات میں سخت الفاظ میں اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے سخت اقدامات کرنے کا اعلان کر دیا کیونکہ اس کا پورا نظام مملکت خطرے میں تھا۔

(قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (۱۲۷)) فرعون نے جواب دیا "میں ان کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔"

حضرت موسیٰ کی پیدائش کے دور میں بھی بنی اسرائیل کے خلاف نسل کشی کی یہ پالیسی اختیار کی گئی تھی۔ فرعون اور اس کا نظام مملکت ان کے لڑکوں کو قتل کر رہا تھا۔ سورہ قصص میں اس کی تفصیلات یوں دی گئی ہیں:-

(اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸ : ۴)) "واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا، اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقعہ وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔"

یہ سرکشی ہر دور میں رہتی ہے اور ہر جگہ رہتی ہے۔ آج بھی وہ یہی ذرائع و وسائل اختیار کرتی ہے اور صدیاں پہلے بھی اس کے یہی ذرائع تھے۔

---ooo---

اب پھر پردہ گرتا ہے، فرعون اور اس کے حوالی و موالی کو سازش اور دھمکیوں اور سخت تندی کی حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور اب اس قصے کا ایک دوسرا خاص منظر سامنے آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے تشدد کی کارروائیاں شروع

کر دی ہیں ۔ اس منظر میں حضرت موسیٰ اپنی قوم میں نظر آتے ہیں' آپ اپنی قوم کے ساتھ ایک نبی کے قلب کے ساتھ اور ایک نبی کی زبان میں بات کر رہے ہیں' آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے رب کی پوری پوری معرفت حاصل ہے ۔ آپ رب تعالیٰ کی سنت جاریہ کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں' آپ کو علم ہے کہ اللہ کے منصوبے اور اس کی تقدیر کے فیصلوں پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا ۔ آپ ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپ یہ مشکلات انگیز کریں ۔ صبر سے کام لیں اور اللہ سے ان مشکلات کی برداشت کے لئے مدد اور معاونت طلب کریں ۔ آپ انہیں اس کائنات کی اصل صورت حال سے آگاہ کرتے ہیں ۔ وہ یہ کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری انجام ان لوگوں کا اچھا ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے' صرف اللہ سے ڈرتے ہیں ۔ اور جب وہ لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ اے موسیٰ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم پر یہ مصائب تھے اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہم ان مشکلات سے دوچار ہیں اور یہ مشکلات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں تو آپ ان کو ان الفاظ میں تسلی دیتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کرۂ ارض کی خلافت تمہیں دے دے لیکن پھر تمہاری بھی آزمائش کا دور شروع ہو گا ۔

قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ
لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا
مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۗ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ
15
عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع ۳
موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو' زمین اللہ کی ہے' اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا 5
ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے' اور آخری کامیابی انہی کے لئے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں ۔" اس کی قوم کے لوگوں نے کہا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں ۔" اس نے جواب دیا "قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے' پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ۔"

نبی کی بصیرت دیکھ رہی ہے کہ اللہ کی قوتیں اس کائنات میں کس طرح متصرف ہیں ۔ اور اللہ کی حقیقت اور قوت کس قدر عظیم ہے ۔ اور اس کائنات میں سنت الٰہیہ کس طرح جاری و ساری ہے اور اللہ کی راہ میں مشکلات برداشت کرنے والے لوگوں کے لئے اس میں کیا کیا مراعات ہیں ؟

جو لوگ رب العالمین کی طرف دعوت دیتے ہیں' ان کے لئے جائے پناہ صرف ایک ہے اور وہ مامون محفوظ اور

قابل بھروسہ جائے پناہ ہے۔ان کا صرف ایک ہی ولی اور آقا ہوتا ہے جو بڑی قوت والا اور ناقابل شکست ہے۔ لہذا ایسے لوگوں کو اس وقت تک صبر اور مصابرت کا مظاہرہ کرنا چاہئے جب تک ان کا آقا ان کے لئے فتح و کامرانی کے احکام صادر نہیں کرتا' انہیں اس معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ انسان کو معلوم نہیں ہے کہ غیب میں اس کے لئے کیا کیا پوشیدہ ہے اور اس کی بھلائی کس چیز میں ہے؟

یہ زمین اللہ کی ہے۔فرعون اور اس کی قوم یہاں مسافرین ہیں اور ان کے چلے جانے کے بعد یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ یہاں کس قوم کو لاتا ہے اور اسے اس زمین کا وارث بناتا ہے۔یہ کام اللہ اپنے سنن جاریہ کے مطابق کرتا ہے' لہذا جو لوگ رب العالمین کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ اس بات کو خاطر میں نہیں لاتے کہ ان کا جس طاغوتی طاقت سے مقابلہ ہے' وہ اس سرزمین پر بظاہر بڑی مستحکم نظر آتی ہے اور اس کی بنیادوں میں کوئی تزلزل نہیں ہے۔اس لئے کہ اس زمین کا مالک اللہ ہے اور وہ کسی مناسب وقت میں کسی سے اقتدار چھین کر کسی دوسرے بندے کے حوالے کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آخری اچھا انجام بہرحال متقین کا ہوتا ہے' چاہے طویل عرصے کے بعد یہ انجام ظاہر ہو یا جلدی ظاہر ہو۔لہذا رب العالمین کی طرف دعوت دینے والوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دلوں سے اپنے انجام کے بارے میں ہر خلجان کو نکال دیں اور یہ گمان نہ کریں کہ آج جن اہل باطل کی زمین پر چلت پھرت ہے وہ ہمیشہ ہی اسی طرح رہیں گے۔

یہ تو نبی کی چشم بصیرت تھی جو اس کائنات میں ہونے والے واقعات کو دور تک دیکھ رہی تھی لیکن بنی اسرائیل بھی تو بنی اسرائیل تھے۔

(قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا) "اس کی قوم کے لوگوں نے کہا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جارہے ہیں۔"

ان الفاظ کے پیچھے ایک خاص ذہنیت ہے' ان کے اندر قطعیت کے ساتھ ان کی مایوسی کا اظہار ہے۔کہتے ہیں کہ تیرے آنے سے پہلے بھی ہم پر مظالم ہوتے رہے اور آپ کے آنے کے بعد بھی جاری ہیں۔ان کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آرہا ہے۔یہ ختم ہوتے نظر نہیں آتے۔

لیکن نبی اپنی نہج اور ڈگر پر جاری رہتا ہے۔وہ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ ذکر الہی میں مشغول ہوں' پر امید رہیں' نبی انہیں اشارہ بھی دیتے ہیں کہ دشمن ضرور ہلاک ہوگا اور تمہیں مقام خلافت فی الارض ضرور نصیب ہوگا لیکن جسے یہ مقام ملتا ہے وہ دراصل بڑی آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۲۹)) "اس نے جواب دیا" قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے' پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔"

حضرت موسیٰ نبوت کے دل و دماغ اور بصیرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں' آپ سنت الہیہ کو مثامثا دیکھ رہے ہیں۔یہ سنت حسب وعدہ صابرین کے حق میں فیصلہ کرتی ہے' اسی طرح منکرین حق کے لئے بھی اس کے فیصلے وقت پر ہوتے ہیں۔آپ

کو صاف صاف نظر آتا ہے کہ طاغوتی طاقتوں نے تباہ و برباد ہونا ہے اور ان کی جگہ صابرین و مجاہدین نے لینی ہے' لہٰذا آپ اپنی قوم کو راہ مصابرت پر آگے بڑھاتے ہیں تاکہ سنت الہیہ ان کے حق میں فیصلے کر دے۔ آپ کو تو آغاز ہی سے معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کو زمین کا وارث بنانا ان کے لئے آزمائش ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اللہ کے چہیتے ہیں اور محبوب ہیں' جیسا کہ بعض بنی اسرائیل اپنے بارے میں زعم رکھتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے ان کے گناہوں کی وجہ سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا' اس لئے کہ یہ دنیا یونہی بے مقصد بھی نہیں بنائی گئی اور نہ یہ ازلی اور ابدی ہے بلکہ یہاں ہر قوم کا عروج انسان کے لئے ہے۔ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ "تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟" اللہ تو کسی چیز کے واقعہ ہونے سے بھی پہلے جانتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی جانب سے ارتکاب جرم سے پہلے سزا نہیں دیتا۔ جب تک کہ وہ بات ان سے واقعہ نہیں ہو جاتی جس کا اللہ کو پہلے سے عالم الغیب ہونے کی حیثیت سے علم ہوتا ہے۔

اب سیاق کلام موسیٰ اور ان کی قوم کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے۔ اب ایک دوسرا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ اس منظر میں فرعون اور اس کی قوم نظر آتے ہیں۔ فرعون اپنی قوم پر انتہائی ظلم کرتے ہوئے نظر آتا ہے اور حضرت موسیٰ کا وہ وعدہ سچ ہو جاتا ہے جو اس نے اپنی قوم سے کیا تھا اور جس کی انہیں امید تھی۔ اب رسول کی تمام باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے اس لئے کہ یہ قصہ یہاں اسی مقصد کے لئے لایا گیا ہے۔

یہ منظر نہایت ہی معمول کے حالات میں شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد دھیرے دھیرے فضا میں تندی اور تیزی آتی جاتی ہے اور پردہ گرنے سے پہلے ہم فضا میں ایک خوفناک طوفان دیکھتے ہیں۔ ہر چیز تباہ و برباد کر دی جاتی ہے۔ روئے زمین کو صاف کر دیا جاتا ہے۔ اب یہاں کوئی طاغوت و سرکش نہیں رہتا۔ اور نہ طاغوت کے اہالی و موالی کا کوئی اتہ پتہ نظر آتا ہے اور ہمیں یہ بات معلوم ہو گئی کہ بنی اسرائیل نے مشکلات پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جزائے خیر دے دی۔ فرعون اور اس کی پارٹی نے فسق و فجور کی راہ لی اور ظلم کیا اور وہ بھی اپنے کئے پر مناسب انجام تک پہنچ گئے۔ اللہ کا وعدہ بھی پورا ہوا اور اس کی وعید نے بھی رنگ دکھایا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے حق کو جھٹلایا۔ سنت الہیہ کے مطابق سلوک ہوا۔ اللہ نے انہیں نہایت ہی مشکل حالات میں مبتلا کیا۔ ذرا تفصیلاً مطالعہ کریں۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا
بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَ

وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا
عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا
هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۗ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ الربع

"ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے ۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں' اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فال بد ٹھہراتے' حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی' مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے ۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لئے خواہ کوئی نشانی لے آئے' ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں ۔" آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا' ٹڈی دل چھوڑے' سرسریاں پھیلائیں' مینڈک نکالے اور خون برسایا ۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے ۔ اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے ۔ جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے "اے موسیٰ' تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بناء پر ہمارے حق میں دعا کر' اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے ۔" مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقت مقرر تک کے لئے' جس کو وہ بہرحال پہنچنے والے تھے' ہٹا لیتے تھے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے ۔ تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہ ہو گئے تھے ۔ اور ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے' اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا ۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر

سے کام لیا تھا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے ۔"

فرعون اور اس کے ساتھی اپنے جبروت میں اور تشدد میں آگے ہی بڑھتے گئے ۔ فرعون نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ۔ اس نے مردوں کو قتل کرنا اور عورتوں کو زندہ رکھنا شروع کر دیا ۔ حضرت موسیٰ اور آپ کی قوم ان مشکلات کو برداشت کرتے اور یہ امید کرتے رہے کہ ایک دن ضرور ان کی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ انہوں نے نہایت ہی صبر و تحمل سے ان مشکلات کو برداشت کیا اور جب دونوں جماعتوں کا موقف بالکل واضح ہو گیا ایمان اور کفر آمنے سامنے آگئے ' ایک طرف سے مظالم ہوتے رہے اور دوسری جانب سے صبر ہوتا رہا ۔ اللہ کی زمین پر اٹھنے والی قوت اللہ ہی کو چیلنج کرنے لگی ۔ اب وقت آگیا کہ اللہ کی جانب سے مداخلت ہو اور اللہ تعالیٰ مجرمین اور صابرین کے درمیان فیصلہ کر دیں ۔

(وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ) "ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے ۔

یہ اللہ کی طرف سے ان کے لئے ابتدائی تنبیہ تھی ۔ ملک کو خشک سالی نے آلیا اور ہر قسم کی فصلیں ضائع ہو گئیں اور پیداوار ختم ہو گئی ۔ سنین عربی اصطلاح میں خشک سالوں اور قحط اور شدت کے لئے بولا جاتا ہے ۔ قحط سالی مصر جیسے سرسبز اور گل گزار ملک میں عذاب الٰہی تصور ہوتی ہے ۔ لوگوں کے اندر اس سے خوف و ہراس پیدا ہو جاتا تھا اور وہ پریشان ہو کر عالم بالا کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے ۔ لیکن چونکہ طاغوتی قوتیں اور ان کے اہلکار لوگوں کو غافل کرتے ہیں ' دین سے دور کرتے ہیں اور لوگ ان کی اطاعت کرتے ہیں ' اس لئے وہ اس لائن پر نہیں سوچتے کہ یہ عذاب الٰہی ہے جو ان پر بصورت خشک سالی وغیرہ آیا ہے ۔ طاغوتی قوتوں کی وجہ سے لوگوں کے اندر اس قدر غفلت اور لاپرواہی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ کی تنبیہات کو بھول جاتے ہیں اور یہ اعتراف نہیں کرتے کہ ایمان اور روحانی اقدار اور طبیعی حالات کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے ۔ اور عالم الغیب کی نظر لوگوں کی اخلاقی زندگی اور ان کے طبیعی حالات دونوں پر ہوتی ہے ۔ طاغوتی نظام کے تحت لوگوں کا دماغ اس قدر موٹا ہو جاتا ہے کہ وہ محسوسات کے علاوہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے اور وہ بہائم کی سطح تک اتر آتے ہیں کیونکہ بہائم بھی صرف محسوسات کو دیکھ سکتے ہیں ۔ اگر اس قسم کے لوگ کچھ ایسے واقعات دیکھیں بھی جن کی وہ طبیعی تعبیر نہیں کر سکتے تو بھی ان اہم واقعات کو وہ اتفاقات اور مصادفات کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ اور ان واقعات کے پیچھے کام کرنے والی سنت الٰہیہ اور ناموس قدرت کو وہ نہیں سمجھ پاتے ' جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے ۔ (۱)

غرض قوم فرعون کو اللہ نے متنبہ کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ کافر اور فاسق و فاجر تھے ۔ بت پرستی کے خرافات نے

---

(۱) جب خروچیف کے دور میں روس خشک سالی کا شکار ہوا اور ہر قسم کی زرعی پیداوار ختم ہو گئی تو اس نے کہا کہ قدرت ہمارے خلاف جا رہی ہے ۔ حالانکہ وہ لامذہب کمیونزم کا قائل تھا اور کسی غیبی طاقت کو تسلیم نہ کرتا تھا ۔ غرض یہ لوگ زبردستی اپنے آپ کو اندھا کرتے ہیں اور دست قدرت کو دیکھنا نہیں چاہتے ۔ سوال یہ ہے کہ وہ قدرت کیا ہے جو ان کے خلاف جا رہی ہے؟ یہی تو رب تعالیٰ ہے ۔

ان کی فطرت کو تبدیل کر دیا تھا اور اس کائنات میں جو ناموس قدرت جاری ہے اور جس کے مطابق خود انسانوں کی زندگی بھی رواں دواں ہے اس کے ساتھ ان کا کوئی ربط و تعلق نہ تھا۔ کیونکہ اس ناموس قدرت کا صحیح ادراک صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہیں صحیح ایمان اور نور ایمان نصیب ہوا ہو۔ اہل ایمان ہی یہ ادراک کر سکتے ہیں کہ یہ کائنات یونہی پیدا نہیں کی گئی اور نہ ہمیشہ کے لئے یونہی بے مقصد رہے گی بلکہ اس کے اوپر اللہ کے سچے قوانین حاوی ہیں۔ یہ ہے حقیقی علمی سوچ۔ یہ سوچ اللہ کے عالم مغیبات کا انکار نہیں کرتی۔ اس لئے کہ حقیقی علم و سائنس اور علم غیب کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ کائنات اور انسانی زندگی دونوں کے پیچھے اللہ کی ذات کام کرتی ہے جو (فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ) ہے اور ذات الٰہی کا مطالبہ یہ ہے کہ بندے ایمان لائیں اور اللہ خلافت فی الارض کا منصب ان کے سپرد کر دے۔ اور جس نے ہمیشہ انسانوں کے لئے ایسی شریعتیں تجویز کی ہیں جو ان قوانین فطرت اور نوامیس قدرت سے ہم آہنگ رہی ہیں اور انہوں نے اس کائنات میں انسانی زندگی اور اخلاقی زندگی کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔

فرعون اور اس کے اہالی و موالی یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے کفر و فسق اور آل موسیٰ پر ان کے مظالم اور قحط سالی کے عذاب کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے۔ خصوصاً مصر میں جہاں ہمیشہ تازگی' سرسبزی اور بہار رہتی ہے اور ہر قسم کے پھلوں اور زرعی پیداوار کی کثرت اور فراوانی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ مشکلات ان کے فسق و فجور کی وجہ سے ان پر نازل ہو رہی ہیں۔

غرض اہل فرعون مصر میں عظیم خشک سالی کے مہلک آثار کو دیکھ کر بھی متنبہ نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی آنکھیں بند کئے رکھیں۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ جب کبھی ان پر اچھے دن آتے تو کہتے کہ یہ تو ان کا حق ہے اور وہ اس کے مستحق ہیں لیکن جب خشک سالی اور مشکلات درپیش ہوتیں تو یہ کہتے کہ یہ سب کچھ موسیٰ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی وجہ سے یہ مشکلات ان پر آ رہی ہیں۔

(فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ) "مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں' اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لئے فال بد ٹھہراتے۔"

جب انسانی فطرت جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جاتی ہے تو اسے نظر نہیں آتا کہ اس کائنات کو دست قدرت چلا رہا ہے۔ ان کو اللہ کا نظام قضا و قدر نظر نہیں آتا جس کے تحت تمام چیزیں پیدا ہو رہی ہیں اور تمام واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ جب یہ فطرت اس حد تک خراب ہو جائے تو پھر وہ اس کائنات میں پائے جانے والے نوامیس قدرت کا ادراک نہیں کر سکتی۔ حالانکہ یہ قوانین قدرت مستقلاً یہاں رواں دواں ہیں۔ ایسے لوگ پھر کائنات کے واقعات کی تفسیر اور تشریح انفرادی واقعہ کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ اس واقعہ کا کسی کلی اصول کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ ایسے لوگ دفتر خرافات لئے ہوئے بے آب و گیاہ وادیوں میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں۔ کسی اصول پر متفق نہیں ہوتے اور یہ کسی ایک راہ و رسم کے قائل نہیں ہوتے' ان کی سوچ منطقی نہیں ہوتی۔ خروشیف جیسے لوگ بھی یہ کہتے ہیں کہ "طبیعت" ہمارے خلاف جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مادہ کس طرح ان کے خلاف جا رہا ہے۔ لیکن وہ (فَعَّالٌ لِّمَا

مُرتُبُۂ کا قائل ہی نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ بعض لوگ اصول الدین کا انکار کرتے ہوئے اور خدا اور خدا کی غیبی قدرت کا انکار کر کے بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

فرعون اور اس کے ساتھی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی ایسی تشریح کرتے تھے کہ اگر دنیا کے حالات اچھے ہوں تو کہتے کہ بس یہ ہمارا حسن کارکردگی ہے اور ہم اس کے مستحق ہیں۔ اور اگر حالات خراب ہوں تو وہ کہتے کہ یہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ہوئے ہیں' یعنی ان سے بدشگونی لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ بدشگونی کیا چیز ہے۔ اس کے لئے یہاں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ طیر ہے۔ اس کے لغوی معنی پرندے کا اڑنا ہیں۔ اہل جاہلیت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ اس کائنات میں سنت الہیہ جاری ہے اور قدرت کے بعض ضوابط کے مطابق یہاں واقعات رونما ہوتے ہیں' وہ ظاہری حالات کو دیکھ کر اور بت پرستی کے زیر اثر بعض عجیب توہمات پر یقین رکھتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام کا ارادہ کرتا تو کسی پرندے کے گھونسلے کے قریب جاتا اور گھونسلے سے پرندے کو اڑاتا۔ اگر پرندہ اس کے دائیں جانب سے اڑتا تو اسے "سانح" کہتے۔ اس سے وہ خوش ہوتے اور اس کام کو کر گزرتے۔ اگر پرندہ بائیں جانب سے اڑتا تو اسے وہ "بارح" کہتے اور اسے بدشگونی سمجھ کر اس کام سے باز آجاتے۔ تو اسلام نے اس خرافاتی سوچ کو کالعدم کر دیا۔ اور اس کی جگہ غور و فکر کا سائنٹیفک انداز دیا۔ اور نتائج کو اللہ کے سنن جاریہ پر چھوڑ دیا کہ نتائج جو بھی نکلیں گے وہ اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق ظاہر ہوں گے۔ اسلام نے تمام معاملات کو سائنسی اور علمی انداز پر چھوڑ دیا جس میں اہمیت انسان کے ارادے اور اس کی نیت' اس کی حرکت اور اس کی جدوجہد کو دی گئی۔ اور اللہ کے دائرہ قضا و قدر پر اللہ کی مشیت محیط ہے۔

(اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ) "حالانکہ درحقیقت ان کی فال بد تو اللہ کے پاس تھی مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔"

اس دنیا میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ان کا سبب واحد یہ ہے کہ یہ اللہ کے حکم سے واقع ہوتے ہیں اور اللہ ہی کے ہاں سے ان کو اچھی بات نصیب ہوتی ہے جس میں ان کے لئے آزمائش ہے اور اللہ ہی کی طرف سے ان پر مصائب آتے ہیں اور یہ بھی آزمائش کے لئے ہیں۔ ونبلوکم بالشر والخیر فتنة والینا ترجعون "اور ہم خیر و شر میں مبتلا کر کے انہیں آزمائیں گے اور یہ آزمائش بڑا فتنہ ہے اور تم ہماری جانب لوٹو گے۔" انسان پر جو مشکلات آتی ہیں وہ اس کی شامت اعمال ہیں لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے اور اکثر تو ایسے ہیں جو سرے سے تقدیر الہی کے قائل ہی نہیں ہیں وہ اپنے نظریات کا اظہار سائنٹیفک سوچ کے لفظ سے کرتے ہیں اور بعض اسے "قدرت کا عدم تعاون" کہتے ہیں مثلاً اشتراکی لوگ لیکن یہ سب حضرات حقیقت سے جاہل اور ناعلم ہیں۔

ذرا آگے بڑھیے: فرعون اور اس کے حواری اپنی سرکشی میں آگے بڑھ رہے ہیں' عزت نفس کے مجروح ہو جانے کی وجہ سے بہت ہی طیش میں ہیں اور غصے اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ کہتے ہیں:

(وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۳۲))

"انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لئے خواہ کوئی نشانی لے آئے' ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔"

یہ وہ حیوانی خود سری ہے جسے سدھایا نہیں جاسکتا' جس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا' جسے کسی دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا' وہ نہ فکر و نظر جانتی ہے اور نہ غور و تدبر سے کام لیتی ہے' دلیل کا سامنا کرنے سے بھی پہلے وہ بات کو رد کر دیتی ہے' وہ دلیل کا راستہ ہی روک دیتی ہے۔ یہ وہ نفسیاتی حالت ہے جس میں ہر وہ شخص مبتلا ہو جاتا ہے جو جابرانہ انداز میں اور اپنی مصلحتوں کے لئے اقتدار میں ہوتا ہے اور جسے دلیل نے شکست دے دی ہوتی ہے بلکہ دلیل و برہان اس کا پیچھا کر رہے ہوتے ہیں لیکن اپنی مصلحتوں کی وجہ سے سچائی دلیل اور ثبوت کا سامنا نہیں کر سکتا۔ جب ایسے حالات ہوں تو پھر قادر مطلق اپنے خاص وسائل کام میں لاتا ہے۔

(فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۱۳۳)) "آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا' ٹڈی دل چھوڑے' سرسریاں پھیلائیں' مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔"

یہ تھا ڈرامہ 'ابتلاء' آیات متصلات کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نشانیاں واضح واضح طور پر بتا رہی تھیں' ایک کے بعد ایک ابتلا آرہی تھی' اور پچھلی آنے والی اگلی کا منطقی نتیجہ تھی۔

قرآن کریم نے ان تمام آیات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے حالانکہ یہ مصائب ان پر یکے بعد دیگرے آئے تھے۔ جب بھی کوئی مصیبت آتی تو مشکلات کے دباؤ کے تحت وہ حضرت موسیٰ کے آگے جھکتے اور وعدہ کرتے کہ اگر تمہاری دعا سے ہمیں اس سے نجات ملی تو بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔ لیکن جب بھی عذاب ٹلتا تو ان کی روش وہی رہتی۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۱۳۴)) "جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے "اے موسیٰ! تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے' اس کی بناء پر ہمارے حق میں دعا کر' اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔"

ہر بار وہ وعدہ خلافی کرتے' اور دوبارہ وہ اسی حالت میں چلے جاتے جو ان کے لئے ایک مہلت تھی اور ان کے لئے اللہ نے ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔

(فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۱۳۵)) "مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقت مقرر تک کے لئے' جس کو وہ بہرحال پہنچنے والے تھے' ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے۔"

سیاق کلام میں ان تمام نشانیوں کو ایک جگہ لایا گیا' اس طرح کہ گویا بیک وقت ان سب کا ظہور ہوا' اور ان کے بعد جب اللہ نے ان مشکلات کو رفع فرمایا تو ایک ہی بار فرعونیوں نے بدعہدی کی' یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا کہ جب بھی کوئی

نشانی آئی اور دور ہوئی تو انہوں نے پھر عہد وفا نہ کیا۔ یہ انداز بیان قرآن کے اسالیب میں سے ایک ہے ' چونکہ واقعات ایک ہی جیسے تھے ' اس لئے ایک ہی جگہ ان کے آغاز کی طرف اشارہ کر دیا گیا گویا ایک ہی دل کے ساتھ یہ تمام تجربات پیش آئے اور وہ دل اس قدر سخت ہو چکا تھا کہ کسی تجربہ نے بھی اس کے اندر راہ نہ پایا۔ اور کسی نے عبرت نہ حاصل کی۔

یہ تمام نشانیاں جن تفصیلات کے ساتھ آتی رہیں ' قرآن کریم نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ احادیث مرفوع میں بھی ان کا تذکرہ نہیں آیا۔ ہم بھی فی ظلال القرآن میں اختیار کئے ہوئے اسلوب کے مطابق ان کو یونہی مجمل چھوڑتے ہیں اس لئے کہ قرآن کی تشریح یا قرآن سے ہوگی یا سنت ثابتہ سے۔

یہ اسلوب ہم نے اسرائیلیات سے بچنے کے لئے اپنایا ہے کیونکہ اسرائیلی روایات بے اصل روایات ہوتی ہیں۔ اس قسم کی اسرائیلی روایات تمام سابقہ تفاسیر کا حصہ بن گئی ہیں۔ کوئی ایسی تفسیر نہیں ہے جو ان سے خالی ہو۔ امام طبری کی تفسیر باوجود اس کے کہ وہ ایک نفیس تفسیر ہے اور نہایت ہی قیمتی تفسیر ہے ' ابن کثیر کی تفسیر باوجود اس کے کہ وہ قابل قدر تفسیر ہے ' دونوں اسرائیلیات سے خالی نہیں ہیں۔

اس بارے میں حضرت ابن عباس بہت سے بھی روایات منقول ہیں۔ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ اور تفسیر دونوں میں ذکر کی ہیں اور ان میں سے ایک روایت یہ ہے =

سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ جب موسیٰ ؑ فرعون کے دربار میں آئے تو انہوں نے اس سے یہ مطالبہ کیا کہ میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو۔ اس نے انکار کر دیا۔ تو اللہ نے ان پر طوفان بھیجا ' یعنی سخت بارش ہوئی۔ جب یہ بارش طویل عرصے تک برستی رہی تو یہ لوگ ڈر گئے کہ شاید یہ کوئی عذاب نہ ہو ' اہل فرعون نے حضرت موسیٰ سے عرض کی کہ آپ اپنے خدا کے سامنے سوال کریں کہ وہ اس بارش کو بند کر دے۔ اگر یہ بند ہو جائے تو ہم تم پر ایمان لائیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ آپ نے رب تعالیٰ سے دعا کی لیکن وہ ایمان نہ لائے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیجا۔ تو اس سال ان کے ہاں فصلیں ' پھل اور چارہ اس قدر ہوا کہ اس سے قبل نہ ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہی تو ہماری تمنا تھی۔ تو اللہ نے ان پر ٹڈی دل بھیج دیئے۔ ٹڈی دلوں نے گھاس کو صاف کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ٹڈی دل نے گھاس کو چاٹ لیا ہے تو اب ظاہر ہے کہ یہ فصل کو بھی نہ چھوڑے گی۔ اب پھر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ رب تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ہمیں اس بلا سے نجات ملے۔ اگر نجات مل گئی تو ہم ایمان بھی لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ اللہ نے ٹڈی دل کو بھی ختم کر دیا اور یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لائے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیجا۔ انہوں نے فصل کاٹی اور گھروں میں ڈال دی اور کہا اب تو ہم نے فصل گھروں تک پہنچا دی ہے۔ اس پر اللہ نے ان پر سرسریاں پھیلا دیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص دس پیمانے دانے لے کر پن چکی پر جاتا اور جب آٹا واپس ہوتا تو وہ صرف تین پیمانے ہوتا۔ اب پھر انہوں نے حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ اے موسیٰ اللہ سے سوال کریں کہ اگر وہ سرسریوں کو دفع کر دیں تو ہم ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ حضرت نے دعا کی اور ان سے یہ عذاب بھی دور ہو گیا۔ اب بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے اور انہوں نے آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیجنے سے انکار کر دیا۔ یوں ہوا کہ حضرت موسیٰ فرعون کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے مینڈک کی آواز سنی۔ حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا "تم اور تمہاری قوم کو اس سے تکلیف پہنچنے والی ہے۔" فرعون نے کہا کہ یہ مینڈک کیا سازش کر سکتے ہیں؟ شام ہونے سے پہلے اس قدر مینڈک امنڈ آئے کہ جب کوئی

بات کرتا تو منہ میں مینڈک سے گر جاتا۔ اب پھر انہوں نے حضرت موسیٰ سے عرض کی کہ آپ دعا کریں کہ اللہ ہم سے اس عذاب کو دور کرے ۔ ہم ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے ۔ اللہ نے یہ عذاب بھی دور کر دیا ۔ لیکن اہل فرعون نہ ایمان لائے اور نہ بنی اسرائیل کو بھیجا ۔ اب اللہ نے ان پر خون بھیج دیا ۔ اب ان کی نہروں میں کنوؤں میں ' برتنوں میں تازہ بہ تازہ خون تھا ۔ لوگوں نے فرعون کے پاس شکایت کی کہ اب تو آزمائش کی حد ہو گئی ہے ' ہمارے پینے کے لئے بھی پانی نہیں رہا تو فرعون نے کہا کہ درحقیقت موسیٰ نے جادو کر دیا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہم پر سحر کہاں سے ہوا ' ہمارے برتنوں میں بھی جو پانی تھا وہ بھی تازہ خون ہے ۔ اب پھر وہ حضرت موسیٰ کے پاس آئے اور کہا اے موسیٰ اپنے رب کو پکارو ' اگر یہ عذاب ہم سے دور ہو جائے تو ہم ضرور تم پر ایمان لائیں گے ۔ آپ نے رب تعالیٰ کو پکارا ' اللہ تعالیٰ نے یہ عذاب بھی دور کر دیا ۔ انہوں نے پھر بھی یہی کیا کہ نہ ایمان لائے اور نہ بنی اسرائیل کو بھیجا ۔ ''

اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا واقعات ہوئے ' بہرحال اس حدیث میں جو واقعات ذکر ہوئے وہ قرآن سے متضاد نہیں ہیں ۔ یہ عذاب اللہ نے بے شک ان پر نازل کئے تاکہ ان کو آزمائے اور جھٹلانے والوں کے ساتھ اللہ کی روش ایسی ہی ہوتی ہے بار بار آزماتا ہے تاکہ وہ مان جائیں ۔

فرعون کی قوم ' اپنی بت پرستی اور جاہلیت کے باوجود اور فرعون کی جانب سے ان پر ظلم و تشدد اور ان کی ذلت و خواری کے باوجود ' حضرت موسیٰ کے دامن میں پناہ لیتی تھی کہ وہ اپنے رب سے سوال کرے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ساتھ یہ عہد کیا ہوا تھا کہ وہ دعا قبول کرے گا اور آپ یہ دعا کریں کہ ان سے یہ مصیبت دور ہو ۔ اگرچہ ' مصر کے حکام وعدہ خلافی کرتے اور ایمان نہ لاتے کیونکہ اس وقت کا نظام حکومت اس نظریہ پہ قائم تھا کہ فرعون ان کا رب اور حاکم ہے ۔ یہ لوگ فرعون کی جگہ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کے قیام سے خوف کھاتے تھے ۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ فرعون کا نظام حکومت ختم ہو جائے اور ملک کے اندر صرف اللہ کی حاکمیت قائم ہو جائے ۔ رہے وہ لوگ جو جاہلیت جدیدہ کے داعی ہیں تو اللہ تعالیٰ بار بار ان کے رزق پر آفات و بلیات نازل کرتا ہے لیکن وہ اپنی روش سے باز نہیں آتے ۔ اور جب زمیندار اور اہل دیہات اس بات کو محسوس کریں اور اللہ کے سامنے دست بدعا ہوں جس طرح کافروں کے تحت الشعور میں بھی اللہ کی جانب رجوع کا داعیہ ہوتا ہے تو آج کل کے جاہلیت زدہ اور اپنے آپ کو سائنٹیفک کہنے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ خرافات میں یقین رکھنا ہے اور جہالت ہے اور یہ کام اہل جاہلیت جدیدہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے کرتے ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں ان لوگوں کی یہ حرکت قدیم بت پرستوں سے زیادہ بری ہے ۔

اب اللہ کی سنت کے مطابق قدرتی انجام سامنے آتا ہے ۔ ان لوگوں کو مشکلات میں مبتلا کر کے بھی آزمایا گیا ' انہیں فراوانی دے کر بھی آزمایا گیا لیکن وہ باز نہ آئے ۔ اب وہ واقعہ پیش آتا ہے جو یقینی بنا ۔ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین ہلاک ہوتے ہیں ۔ اب ان کی مہلت ختم ہے اور جس انجام تک انہوں نے پہنچنا تھا ' وہ قریب آ گیا ہے ۔ اور ضعفاء اور صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ کا جو عہد ہوتا ہے اس کا وقت بھی آ پہنچا ہے لہٰذا سرکشوں اور جابروں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے ۔

(فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ

(۱۳۶) وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا

بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۷)) "تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا کیوں کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پروا ہو گئے تھے۔ اور ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے 'اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔"

یہاں سیاق کلام میں 'فرعون کی غرق یابی کے واقعہ کو مختصراً بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی وہ تفصیلات نہیں دی گئیں جو دوسرے مقامات میں دی گئی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں مضمون صرف یہ ہے کہ اللہ سرکشوں کو مہلت کے بعد پکڑتا ہے۔ لہٰذا اس موضوع کو قصوں کی تفصیلات کی ضرورت نہیں تھی اور ایسے موقعے میں محض اشارات زیادہ اثر انگیز ہوتے ہیں اور احساس پر ایسے واقعات کا زیادہ اچھا اثر ہوتا ہے۔

(فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ) "تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا۔" ایک ہی وار میں ان کا کام تمام کر دیا۔ وہ سرکش 'دست دراز اور متکبر تھے۔ اللہ نے انہیں سمندر کی تہہ میں ڈال کر یہ دکھایا کہ تم اب پستیوں سے بھی پست ہو۔ اور یہ تمہارے لئے مناسب جزا ہے۔

یہ کیوں؟ اس لئے بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ "کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہ ہو گئے تھے۔"

اس فیصلہ کن انداز کی مناسبت سے تصویر کا دوسرا رخ بھی اختصار کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں دے دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی دوسرا جابر آگیا بلکہ مستضعفین نے ملک میں اپنا اقتدار قائم کر دیا یعنی بنی اسرائیل حکمران بن گئے۔ اس لئے کہ اس وقت وہ اصلاح کے معیار پر پورے اترے تھے۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی وہ بگڑ گئے اور اللہ نے ان پر ذلت اور جلاوطنی مسلط کر دی۔ بنی اسرائیل کا یہ استخلاف مصر میں نہ تھا کہ وہ فرعون کے تخت پر بیٹھ گئے 'ان کا نظام حکومت شام میں برپا ہوا اور فرعون کی غرقابی کے بعد کئی سال کے بعد۔ اس وقت حضرت موسیٰ فوت ہو چکے تھے اور بنی اسرائیل تیہ کے صحرا میں چالیس سال خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر چکے تھے جیسا کہ قرآن نے دوسرے مقامات پر دیا ہے۔ یہاں قصے کے بیان میں ان کڑیوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور فرعون کی غرقابی کے بعد جلد ہی' موقعہ و موضوع کی مناسبت سے بنی اسرائیل کے اقتدار کے قیام کا ذکر کر دیا گیا۔

(وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا

كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۷) ”اور ان کی جگہ ہم نے 'ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے' اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا' اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدہ خیر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔“

یعرشون کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تعمیرات کرتے تھے' اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انگوروں کی بیلیں اپنی چھتوں پر چڑھاتے تھے۔

ہم انسان صرف زمان و مکان کے حدود کے اندر ہی سوچ سکتے ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ یہ واقعہ فلاں کے بعد یا اس سے پہلے ہوا کیونکہ ہم واقعات کو وقوع اور مرور کے بعد ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا عروج اور ان کا اقتدار فرعون کی غرقابی کے بعد پیش آیا۔ لیکن اللہ علیم و خبیر ہے اور مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ اس کے سامنے کھلے صفحات میں ہے۔ علم الٰہی مکان و زمان سے وراء ہے۔ اس کا عالم مثال بھی بلند ہے اور عالم علم تو اس کے عالم مثال تک بھی ایسا نہیں ہے۔

اب پردہ گرتا ہے' ایک طرف ہلاکت و بربادی کے مناظر تھے' دوسری جانب ضعفاء مسند اقتدار پر براجمان ہو رہے تھے۔ ایک سرکش اور متکبر اور گردن فراز سمندر میں سرنگوں تھے۔ ان سے وہ تمام برتریاں' تعمیرات اور سہولیات حیات چھوٹ گئیں' تمام باغ و راغ نظروں سے اوجھل ہو گئے' چشم زدن میں سب کچھ ان کی نظروں میں نابود تھا' اور اس منظر کشی میں قرآن نے چند الفاظ استعمال کئے اور اسے آڑیو کر دیا۔

یہ مثال اللہ تعالیٰ مکہ کی ایک قلیل جماعت کے سامنے رکھتے ہیں۔ اہل شرک ان پر مظالم ڈھا رہے ہیں' شہر بدر کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے لئے شمع امید روشن کی جا رہی ہے۔ آج دنیا میں جہاں جہاں بھی لوگ اسلامی انقلاب کے لئے کام کر رہے ہیں ان کے لئے یہ شمع امید ہے۔ آج جو عواقب وہ جھیل رہے اور دار و رسن کو چوم رہے ہیں تو یقیناً اللہ اس دنیا کے مشرق و مغرب کو ان کے اقتدار میں دینے والا ہے کیونکہ انہوں نے صبر کیا' مگر انعام کے طور پر نہیں آزمائش کے طور پر کہ دیکھا جائے کہ وہ کیا کرتے ہیں؟

---○○○---

درس نمبر ۸ ایک نظر میں

اس سبق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کی ایک دوسری کڑی چلتی ہے۔ اب آپ کا معاملہ اپنی قوم بنی اسرائیل سے ہے۔ یہ لوگ اب دشمن سے نجات پا چکے ہیں۔ اللہ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور وہ تمام ترقی اور تعمیرات وہ سب کچھ سمجھتے تھے ' تباہ و برباد کر دی گئی ہے۔ آج حضرت موسیٰ کو فرعون اور اس کے طاغوتی نظام سے واسطہ نہیں پڑا ہوا' طاغوت کے ساتھ جو معرکہ تھا وہ تو سر ہو چکا ہے۔ آج آپ کو ایک نئے محاذ میں لڑنا ہے اور یہ معرکہ نہایت ہی شدید' طویل اور تکلیف دہ ہے۔ آج حضرت موسیٰ کو نفس انسانی کے ساتھ معرکہ درپیش ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر جو جاہلیت رچی بسی ہوتی ہے۔ آج اس کے ساتھ معرکہ درپیش ہے۔ آج حضرت موسیٰ اس ذلت اور پستی سے بر سرپیکار ہیں جو بنی اسرائیل کی شخصیت میں' دور غلامی کے اندر تہ بہ تہ بیٹھی ہوئی ہے۔ ان کے مزاج میں کجی آگئی ہے' ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے ہیں اور میدان جنگ میں وہ سخت بزدل نظر آتے ہیں۔ زندگی اور بلند تر زندگی کی راہ میں جو مشکلات ہوتی ہیں ان کے انگیز کرنے میں وہ نہایت ہی کمزور ہیں۔ اور وہ شخصی میلانات کے بندے ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذلت' غلامی اور مظلومیت انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ طویل عرصے تک خائف زندگی گزارنا' خفیہ سرگرمیاں' کج فطرتی' اور تشدد اور عذاب سے بچنے کے لئے مخفی رہنا اور رات کے اندھیرے میں کام کرنا ہر وقت تشدد اور مصیبت میں ابتلاء کا ڈر ایک ایسا ماحول ہوتا ہے جس سے انسان کی فطرت میں سخت بگاڑ اور عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک سخت ترین تشدد کا شکار رہے تھے۔ طویل عرصے تک ان پر خوف' ڈر' بت پرستی اور فرعونیت کا سایہ رہا۔ فرعون ان کی بچیوں کو زندہ رکھتا اور لڑکوں کو ذبح کر دیتا۔ یہ سنگ دلانہ تشدد کبھی موقوف بھی ہوتا لیکن ذلت غلامی اور توہین آمیز زندگی تو مستقلاً ان کی قسمت میں تھی۔

ان کی شخصیت میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کا مزاج غیر معتدل ہو گیا تھا۔ فطرت میں کجی داخل ہو گئی تھی۔ خیالات بگڑ گئے تھے۔ ان کی نفسیات میں ذلت' بزدلی' کینہ پروری' نفرت رچی بسی تھی۔ جب بھی کوئی انسانی طبقہ اس اس قسم کے مظالم کا شکار ہو تو ان میں ایسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ربانی بصیرت عطا کی تھی۔ آپ انسانوں کی نفسیات سے اچھی طرح باخبر تھے۔ انہوں نے اپنے تمام حکام سے کہہ رکھا تھا اور یہ وصیت کر دی تھی "آپ لوگ لوگوں کے چہرے پر مار کر سزا مت دو' اس طرح تم لوگوں کو ذلیل کر دو گے۔" ان کو علم تھا کہ چہرے پر مار کی وجہ سے لوگ ذلیل ہو جاتے ہیں اور اسلام کی تو یہ بنیادی پالیسی ہے کہ رعیت کو ذلیل و خوار نہیں کرنا ہے' کیونکہ اسلامی مملکت میں لوگ باعزت تصور ہوتے ہیں۔ اسلام کی پالیسی اور خواہش یہ ہے کہ لوگ باعزت ہوں۔ اور حکام کو اس بات سے منع کیا گیا کہ وہ لوگوں کو مار مار کر ذلیل

کریں۔ اسلام نے یہ کہا کہ لوگ حکام کے غلام نہیں ہوتے۔ وہ اللہ کے غلام اور معزز لوگ ہوتے ہیں۔ وہ تمام غیر اللہ سے محترم ہیں۔

فرعونیت کے طاغوتی نظام میں فرعونیوں نے بنی اسرائیل کو مار مار کر ذلیل کر دیا تھا۔ بلکہ ان پر جو مظالم ڈھائے گئے ان کے مقابلے میں یہ مار بالکل معمولی بات نظر آتی تھی۔ بنی اسرائیل کے بعد تمام مصری قوم کو بعد میں آنے والے حکمرانوں نے مار مار کر ذلیل کیا' فرعونی طاغوت کے بعد رومی طاغوت نے مصریوں کو اسی طرح مار مار کر ذلیل کیا۔ ان مصائب سے مصری قوم کو صرف اسلام نے نجات دی۔ جب اسلام آیا تو اس نے مصری قوم کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات دی۔ عمرو ابن العاص حاکم مصر اور فاتح مصر کے بیٹے نے جب ایک قبطی کی پشت پر ایک کوڑا مار دیا۔ غالباً اس وقت رومیوں کے کوڑوں کے آثار اس کی پشت پر موجود تھے۔ اس قبطی کو صرف ایک کوڑا مارے جانے پر بہت ہی غصہ آیا اور وہ بھی فاتح مصر اور گورنر کے بیٹے کی طرف سے۔ اس نے اونٹنی پر سوار ہو کر ایک ماہ تک سفر کیا اور یہ شکایت حضرت عمر ابن خطاب تک پہنچائی۔ صرف ایک کوڑا مارنے کی شکایت۔ حالانکہ فتح مصر سے پہلے رومیوں کی جانب سے مارے جانے والے کئی کوڑوں پر وہ صبر کرتا تھا۔ یہ تھا اسلامی انقلاب کا معجزہ۔ جس نے قبطیوں کے اندر بھی انقلاب پیدا کر دیا۔ اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں۔ اسلام نے انسانیت کو ذلت و خواری کی جمی ہوئی تہوں کے نیچے سے نکالا اور آزادی دی۔ لوگ اس طرح اٹھے کہ ان کا جسم و روح آزاد ہو گیا اور انہوں نے اپنے آپ سے ذلت کے غبار کو ایک دم جھاڑ دیا۔ کسی غیر اسلامی نظام نے انسانیت کو اس قدر آزادی نہیں دی تھی۔

اب حضرت موسیٰ کا واسطہ اس مہم سے تھا کہ انہوں نے اپنی قوم کی شخصیت سے صدیوں کی غلامی کی وجہ سے اور طاغوتی نظام کے تحت ذلت کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمزوریوں کو دور کرنا تھا۔ بنی اسرائیل مصر سے نکل چکے تھے اور انہوں نے سمندر کو عبور کر لیا تھا۔ قرآن کریم کے بیان کردہ قصص میں ان لوگوں کی شخصیات صاف صاف نظر آتی ہیں۔ یہ غلامی کے گرد و غبار سے اٹی ہوئی ہیں۔ دوسری جانب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آثار جاہلیت سے مقابلہ ہے۔ حضرت موسیٰ کا مقابلہ اب ان لوگوں کی کٹ حجتی' اخلاقی بے راہ روی' فکر و نظر کی جہالت سے ہے جو ان کی شخصیت میں' اس طویل عرصہ اسیری میں کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھیں۔

اس سلسلے میں ہمیں معلوم ہو گا کہ ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے حضرت موسیٰ کس قدر ان تھک مصائب برداشت کر رہے ہیں۔ ان کو ایسے لوگوں سے واسطہ ہے جن کی فطرت صدیوں تک زمین بوس رہی ہے۔ ان کی حالت یہ تھی جس طرح غلاظت کا کیڑا غلاظت سے نکلنا پسند نہیں کرتا اور ذلت اور غلاظت کو اپنے لئے معمول سمجھتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی جدوجہد میں ہر صاحب دعوت کے لئے ایک سبق ہے۔ خصوصاً ایسے صاحب دعوت کے لئے جسے ایسے لوگوں سے واسطہ ہو' جو صدیوں تک ذلت اور غلامی میں رہے ہوں اور جنہوں نے ایسے طاغوتی نظام میں زندگی بسر کی ہو ظالم بھی ہو اور متشدد بھی۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ لوگ یہ بھی جانتے ہوں کہ داعی جس طرف بلا رہا ہے وہ راہ نجات ہے۔ بلکہ وہی راہ نجات ہے لیکن ایک طویل عرصہ عالم ہونے اور مومن ہونے کی وجہ سے ان کے لئے یہ دعوت ایک عادی دعوت بن گئی ہو اور ان کا دین ایک بے روح رسمی دین بن گیا ہو۔

ایسے حالات میں ایک داعی کے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ دگنا ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسے داعی کے

لئے صبر کی بھی بڑی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسے داعی کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کی کج فہمی' ان کی بد اخلاقی' ان کے مزاج کی سہل انگاری اور ان کے اقدام کی سست رفتاری پر صبر کرے۔ ہر مرحلے پر ایسے لوگوں میں شکست اور دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ جانے کی خواہشات پر نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ صبر کرے۔

قصہ بنی اسرائیل کو امت مسلمہ کے لئے قرآن کریم میں اسی لئے ثبت کر دیا گیا ہے کہ امت مسلمہ کے لئے اس میں بڑی عبرتیں ہیں اور اسی حکمت کے تحت اسے بار بار مختلف پہلوؤں سے لایا گیا ہے۔تاکہ امت مسلمہ اس تجربے سے فائدہ اٹھائے اور حضور اکرم ؐ کے بعد آنے والے تمام داعیوں کے لئے بھی اس قصے میں بڑی مقدار میں زاد راہ موجود ہے۔

---000---

درس نمبر ۸ تشریح آیات

۱۳۸ --- تا --- ۱۷۱

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي
اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ
قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَي
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ
الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ ۱۶
مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ۱۲ع
۶

"بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا' پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے "اے موسیٰ ﷺ' ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔" موسیٰ ﷺ نے کہا "تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔" پھر موسیٰ نے کہا "کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔ اور (اللہ فرماتا ہے) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی' جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے' تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

اس قصے کا یہ ساتواں منظر ہے۔ اس میں بنی اسرائیل اس وقت نظر آتے ہیں جب وہ نجات پا کر بحر قلزم سے اس پار چلے

گئے ہیں۔ اب ہمیں فرعونی مناظر کے برعکس اس میں بنی اسرائیل کی سرکش، معصیت کیش اور نہایت ہی کج مزاج شخصیت کا سامنا ہے۔ اور یہ اخلاقی کمزوریاں ان کے مزاج میں تہ بہ تہ صدیوں کی تاریخ کے دوران جمی ہوئی ہیں۔ اس پر کوئی طویل عرصہ نہ گزرا تھا کہ اللہ نے انہیں فرعون سے نجات دی تھی جس نے انہیں خوب ذلیل کر کے رکھا ہوا تھا۔ فرعون کی قوم بھی اس کام میں شریک تھی اور یہ نجات انہیں حضرت موسیٰ کی وجہ سے ملی تھی، حضرت موسیٰ نے یہ تحریک اللہ رب العالمین کے نام سے چلائی تھی۔ رب العالمین نے ان کے دشمن کو ہلاک کیا اور ان کی نجات کے لئے سمندر کے ٹکڑے کئے اور انہیں اس ذلت آموز زندگی سے نجات دی۔ وہ تو مصر کی بت پرستی اور سرزمین ظلم سے ابھی رہا ہو کر آئے تھے۔ لیکن سمندر کو پار کرتے ہی جب وہ ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں جس کا ایک بت ہے اور وہ اس کی پوجا کرتی ہے اور ہر شخص اپنے بتوں کی پوجا پاٹ میں مشغول ہے تو وہ جھٹ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کے لئے بھی ایسا ہی بت تجویز کر دیں تاکہ وہ بھی اسی طرح پوجا پاٹ شروع کر دیں حالانکہ حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش خالص نظریہ توحید پر مبنی تھی اور اسی نظریہ کے تحت فرعون کی ہلاکت ہوئی تھی اور ان کو نجات ملی تھی۔

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ (۷:۱۳۸) "بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا، پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے "اے موسیٰ" ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں۔"

متعدی بیماریاں جس طرح جسم کو آلیتی ہیں اسی طرح روحانی بیماریاں بھی متعدی ہوتی ہیں، لیکن متعدی بیماریاں تب ہی پھیلتی ہیں جب لوگوں کے اندر ان کے پھیلاؤ کے لئے جراثیم موجود ہوں اور قرآن کریم نے جس طرح بنی اسرائیل کے مزاج کا نہایت ہی سچا گہرا اور ہمہ جہت نقشہ کھینچا ہے اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اخلاقی اعتبار سے نہایت ہی بودے، ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست تھے، وہ گمراہی کو اسی طرح قبول کرتے تھے جس طرح پٹرول کو آگ لگتی ہے۔ وہ اٹھتے ہی گر جاتے تھے، چند قدم ہی راہ مستقیم پر چلتے تھے کہ اچانک ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے تھے، اس لئے کہ ان کے کلیجے میں گمراہی کے جراثیم داخل ہو چکے تھے۔ وہ سچائی سے دور تھے۔ ان کا احساس مر چکا تھا، اور ان کا شعور بجھ چکا تھا۔ اچانک جب وہ ایک بت پرست قوم کو بت پرستی میں مشغول دیکھتے ہیں تو وہ حضرت موسیٰ کی بیس یا تیس سالہ جدوجہد اور اپنی غلامی کی صدیاں بھول جاتے ہیں اور مطالبہ کر دیتے ہیں کہ ان کے لئے بھی بت تجویز کئے جائیں۔ سابقہ معجزات کو تو چھوڑ دیں ایک طرف، ابھی ابھی تو وہ سمندر پھٹا اور بڑے بڑے تودوں سے گزر کر آئے ہیں۔ جس میں ان کی آنکھوں کے سامنے ان کا دشمن ہلاک کیا گیا۔ فرعون اور اس کا ظالم عملہ سب بت پرست تھے اور وہ بنی اسرائیل کے خلاف فرعون کو اسی بت پرستی کے نام پر ابھارتے تھے۔ وہ اہل فرعون کی یہ باتیں بھول گئے جو وہ کہتے تھے

اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَہٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَکَ وَاٰلِھَتَکَ "کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ رہا ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں اور وہ تمہیں اور تمہارے الہوں کو چھوڑ دیں۔" یہ سب کچھ بھول بھلا کر وہ اپنے

نبی اور رسول سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جس طرح تمہارے کہنے پر دوسرے معجزات سرزد ہوئے اب اپنے رب سے ہمارے لئے بتوں کی منظوری بھی لے لے تاکہ ہم بھی بت پرستی شروع کر دیں۔ اگر یہ لوگ خود ہی بت پرستی شروع کر دیتے تو پھر بھی کوئی بات تھی مگر انہیں اس قدر حیا نہ آئی نبی اور رب العالمین سے بت پرستی کی اجازت چاہی لیکن یہ بنی اسرائیل ہیں' ان سے سب کچھ متوقع ہے۔

اس مطالبے پر حضرت موسیٰ کو بہت غصہ آتا ہے' جس طرح رب العالمین کے کسی رسول کو اپنے رب کے بارے میں آنا چاہئے۔ اس لیے کہ کوئی بھی رسول عقیدۂ توحید کے بارے میں سخت غیرت مند ہوتا ہے اور اس کے لئے شرک ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ ان کو ایسا جواب دیتے ہیں جو ان کے لئے مناسب ہے۔ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (٧: ١٣٨) موسیٰ نے کہا "تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔" یہاں ان کی جہالت کو مخصوص نہیں کیا گیا' لہٰذا مفہوم یہ ہوا کہ تم غایت درجے کے جاہل ہو' اگر یہ علم کے مقابلے میں استعمال ہو تو مراد بے علمی ہوتی ہے اور اگر یہ لفظ عقل کے مقابلے میں آئے تو مراد حماقت ہوتی ہے یعنی تم غایت درجہ کے احمق اور غایت درجے کے کورے اور بے علم ہو۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ عقیدہ توحید سے جو لوگ منحرف ہوتے ہیں وہ جاہل بھی ہوتے ہیں اور احمق بھی ہوتے ہیں اور یہ کہ علم اور سائنس اور عقلمندی انسان کو عقیدۂ توحید پر پہنچاتی ہے۔ علم اور عقل کبھی بھی عقیدہ توحید کے سوا کسی اور عقیدہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

علم اور عقل تو اس پوری کائنات کا مشاہدہ کر کے یہ شہادت پاتے ہیں کہ اس کا ایک خالق اور مدبر ہے' یہ خالق اور مدبر ہے بھی وحدہ لاشریک۔ اس لئے کہ اس پوری کائنات کے ضوابط و قوانین اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا مدبر ایک ہے۔ اور جس قدر اس کائنات میں غور و فکر کیا جاتا ہے اور اس کے اندر جستجو کی جاتی ہے یہی بات سامنے آتی ہے کہ ضوابط و آثار کی یک رنگی دلیل ہے وحدت خالق کی۔ اس سے اعراض اور صرف نظر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پرلے درجے کے جاہل ہوں یا احمق ہوں۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو عالم اور سائنس دان کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو سمجھاتے ہیں کہ جس بت پرستی میں وہ پڑے ہوئے ہیں وہ نہایت ہی بری چیز ہے اور ان کی جانب سے یہ سراسر غیر معقول مطالبہ ہے' کیا تم ایسے لوگوں کی پیروی کرتے ہو جو خود ہلاک و برباد ہونے والے ہیں؟
اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٧: ١٣٩) "یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔"

یہ شرک و بت پرستی' یہ بتوں کی پوجا پاٹ' یہ بت پرستانہ تہذیب و تمدن جس میں کئی رب ہوں اور ان ارباب کے نیچے پھر مسند نشینیں اور مذہبی لیڈر ہوں اور حاکم اور محکوم ہوں اور وہ بت پرستی سے اپنے حقوق کا تعین کرتے ہوں۔ یہ تمام خرافات اور توہمات زندگی کے فاسد تصور پر مبنی ہیں اور باطل اور بے اصل ہیں۔ اور ان تصورات اور اعمال نے دنیا سے ختم ہونا ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے ہلاکت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں اپنے نظریہ حیات اور اپنے رب کے بارے میں غیرت کی وجہ سے مزید جوش آجاتا ہے۔ ان کا لغہ تیز تر ہو جاتا ہے اور وہ برہمی کے ساتھ ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ابھی ابھی سمندر کے کنارے جو کچھ ہوا تم بھول گئے ہو' تم اپنے مرتبہ و مقام کا خیال بھی نہیں رکھتے۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۷: ۱۴۰) "پھر موسیٰ نے کہا "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔"

اس دور میں تمام اقوام پر بنی اسرائیل کی فضیلت واضح ہے کہ تمام مشرک اقوام میں سے بنی اسرائیل کو منصب رسالت دیا گیا۔ اس سے بڑی فضیلت اور اس سے زیادہ احسان اور کیا ہو سکتا ہے۔ رسالت ایک عظیم فضل اور عظیم احسان ہے۔ نیز اس وقت بنی اسرائیل کو اس منصب کے لئے بھی چنا گیا کہ وہ اس زمین پر مقتدر اعلیٰ ہوں گے۔ خصوصاً ارض مقدس کو ان کے ہاتھوں واگزار کرنے کا فیصلہ بھی ہوا کیونکہ اس دور میں ارض مقدس پر غیر قوموں کا قبضہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان اعزازات کے بعد وہ کس منہ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے لئے کوئی الٰہ تجویز کیا جائے جیسا کہ دوسری اقوام نے اپنے لئے الٰہ تجویز کر رکھے ہیں' جبکہ ان پر اللہ کا بڑا فضل و کرم تھا۔

قرآن کا یہ انداز کلام ہے کہ انبیاء کے کلام کے ساتھ متصلا اللہ کے کلام کو بھی ذکر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی حکایت کے ساتھ متصلا اللہ کا کلام بھی آ جاتا ہے۔

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۷: ۱۴۱) "اور (اللہ فرماتا ہے) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمہیں نجات دی' جن کا حال یہ تھا کہ تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے' تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

اللہ کے کلام اور اللہ کے نبیوں کے کلام کو یکجا کرنے سے دراصل نبیوں کی تکریم مقصود ہے اور یہ دراصل اعزاز و تکریم کا یہ نہایت ہی بہترین انداز ہے۔

یہ احسان جو بنی اسرائیل پر کئے گئے اور یہاں جتلائے گئے وہ ان کے دل و دماغ میں موجود تھے۔ اور ان کا مشاہدہ تازہ تھا۔ محض ان احسانات کی یاد دہانی ہی اس بات کے لئے کافی تھی کہ وہ سجدہ شکر بجا لاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ یہ عبرت کا مقام ہے اور انسانوں پر مشکلات اور اس کے بعد مشکلات سے نجات سب کچھ انسان کے لئے ایک آزمائش ہے۔ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۷: ۱۴۱) "اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔" اس لئے کہ ان میں سے کوئی واقعہ بھی اتفاقی نہ تھا۔ سب کچھ تقدیر الٰہی کے مطابق تھا اور آزمائش تھی اور آزمائش سے مقصد عبرت آموزی تھی اور مسلمانوں کو تجربات سے دوچار کر کے کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنا مطلوب تھا اور یہ مقصد تھا کہ جب ان کو سزا دی جائے تو ان کے لئے گلے شکوے کا کوئی موقعہ نہ رہے' اس وقت جب یہ تمام آزمائشیں ان پر کارگر نہ ہوں۔

اب یہ منظر بھی ختم ہو جاتا ہے' اس سے بڑا دلچسپ دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ یہ آٹھواں منظر ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ اور آپ کے رب العالمین کے درمیان ملاقات ہونے والی ہے۔ حضرت موسیٰ اس عظیم تقریب کے لئے بڑا اہتمام کرتے

ہیں ۔حضرت ہارون کو وصیت کر کے اپنا قائم مقام بناتے ہیں اور اس کے بعد آپ اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہیں ۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۱۴۲﴾

”ہم نے موسیٰ کو تیس شب و روز کے لئے (کوہ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا' اس طرح اس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہو گئی۔ موسیٰ نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ ”میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔“

حضرت موسیٰ کی مہم کا پہلا مرحلہ اب مکمل ہو گیا ہے' اس مرحلے میں بنی اسرائیل کو ذلت اور زبردستی کی زندگی سے نکال دیا گیا ہے ۔اب وہ قوم فرعون کی ایذا رسانیوں اور تشدد کے دائرے سے باہر نکل آتے ہیں۔ ذلت اور غلامی کی شہری زندگی کو ترک کر کے اب وہ صحرا کی آزاد فضاؤں میں گھوم رہے ہیں۔ اور ارض مقدس کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں لیکن ابھی تک وہ ارض مقدس کی بازیابی کی عظیم اور اصلی مہم کے اہل ہی نہیں بنے۔ یہ تو نہایت ہی عظیم اور کانٹوں سے پر راہ ہے کہ کوئی کرۂ ارض پر اقتدار کے مناصب حاصل کر کے فریضہ خلافت ارضی کا منصب سنبھال لے ۔اس سے قبل کے منظر میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے دلوں میں بت پرستی اور شرک نے کس طرح گھر کر لیا ہے کہ ایک بت پرست قوم کو دوران سفر دیکھتے ہی اپنے لئے بتوں کا مطالبہ کر دیا۔ ان کے اذہان و قلوب سے عقیدہ توحید متزلزل ہو گیا جس کے لئے حضرت موسیٰ کو خاص طور پر رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس پر کچھ زیادہ عرصہ بھی نہ گزرا تھا۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ حضرت موسیٰ کو تفصیلی ہدایات دے کر ان کے پاس واپس بھیجا جائے اور آپ نئی ہدایات کے تحت اس قوم کی تنظیم و تربیت کریں تاکہ وہ ارض مقدس کی آزادی کا عظیم فریضہ ادا کر سکیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک مقررہ وقت و مقام میں ملاقات کی دعوت دی تاکہ آپ اللہ تعالیٰ سے براہ راست کئی ہدایات لیں۔ اور اس ملاقات میں خود حضرت موسیٰ کی بھی مزید تربیت مقصود تھی تاکہ آپ بھی آنے والے مشکل حالات اور مشکل مہمات کے لئے تیار ہو جائیں ۔آپ کی تربیت کا کورس تیس دن مقرر ہوا تھا۔ اس میں دس دن کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ یوں چالیس دن تک یہ سلسلہ چلا۔ حضرت موسیٰ نے اس عرصے میں ملاقات الٰہی کے لئے ریاض کیا۔ آپ اس دنیا کی دلچسپیوں سے دور ہو گئے۔ اور عالم بالا کی طرف قریب ہو گئے' لوگوں سے دوری اور رب العالمین سے قرب حاصل کیا۔ آپ کی روح صاف ہو گئی اور آپ کا اندرون روشن ہو گیا اور یوں آپ کو براہ راست رب العالمین کی تربیت میں آنے والے فرائض منصب رسالت کے لئے تیار کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی روانگی سے قبل اپنے بھائی اور جانشین حضرت ہارون کو ان الفاظ میں وصیت کی۔

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ

(۷: ۱۴۲) "موسیٰ نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔"

حضرت موسیٰ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت ہارون بھی اللہ کی جانب سے نبی مرسل ہیں۔ لیکن ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو نصیحت کرے بلکہ نصیحت ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر فرض ہے۔ پھر حضرت موسیٰ کو ان بھاری ذمہ داریوں کا اچھی طرح احساس تھا اور آپ اپنی قوم بنی اسرائیل کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ حضرت ہارون نے بھی کشادہ دلی سے نصیحت کو سنا اور قبول کیا۔ انہوں نے اس پر برا نہ منایا کیونکہ نصیحت برے لوگوں کو اچھی معلوم نہیں ہوتی' کیونکہ یہ لوگ بھلائی سے چھٹکارا چاہنے والے ہوتے ہیں اور ان چھوٹے قد والوں پر بھی نصیحت گراں گزرتی ہے جو اپنے آپ کو بہت ہی بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کو نصیحت کی جائے تو یہ چھوٹے قد کے لوگ اس میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ چھوٹے قد والے متکبر وہ ہوتے ہیں کہ تم ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہو کہ ان کی امداد کرو اور وہ تمہارے ہاتھ کو جھٹک دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو بڑا دکھا سکیں۔

یہ تیس راتیں اور پھر ان میں دس دن کی مزید وسعت میں کیا حالات پیش آئے؟ ان کے بارے میں ابن کثیر کہتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ساتھ تیس راتیں مقرر کی تھیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اس عرصے میں روزے رکھے اور کچھ نہ کھایا۔ اور جب میعاد پوری ہوگئی تو آپ نے درخت کے چھلکے سے مسواک کی۔ اس پر اللہ نے ان کو حکم دیا کہ آپ چالیس دن پورے کریں۔"

---ooo---

اب تو یہ منظر آپ کے سامنے ہے۔ یہ منظر ایک منفرد منظر ہے اور یہ حضرت موسیٰ کا خاصہ ہے۔ اس میں رب ذوالجلال اور رب العالمین براہ راست اپنے بندے سے مخاطب ہیں۔ اس منظر میں ایک ذرہ' ایک محدود ذرہ اور ایک فانی وجود ایک ازلی اور ابدی ذات کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ایک بندہ اپنے خالق سے براہ راست ہدایت اخذ کرتا ہے جبکہ خالق ابدی و ازلی وراء الوراء ہے اور بندہ زمین پر ہے۔ لیکن اس التقاء کی کیفیت کیا تھی؟ اس کے ادراک سے ہم عاجز ہیں۔ اللہ کے ساتھ ہمکلام ہونے کی کیفیت کیا تھی' اس کے بارے میں ہم نہیں بتا سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کن ذرائع ادراک سے یہاں ہدایات اخذ کرتے تھے' کلمات کس طرح تھے؟ یہ سب تصورات ہم بندوں اور محدود قوت کے مالک انسان کے لئے ناقابل تصور ہیں۔ اس لئے کہ ہماری قوت مدرکہ محدود ہے۔ ہمارا سرمایہ ادراک محدود ہے۔ ہمارے تجربے واقعاتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر جو لطیف راز اور جو لطیف شعور ودیعت کر رکھا ہے اس کے ذریعے ہم معلوم کرتے ہیں کہ یہ ہمکلامی واقع ہوئی اور ہمیں اس کا یقین ہے اور شعوری یقین ہے لیکن کیفیت کے بارے میں سوال کرتے ہمیں اپنے یقین کو گدلا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ تعلق' محدود اور لامحدود کا تعلق ہمارے محدود پیمانہ ادراک میں سما نہیں سکتا۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ
اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ
مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوسٰى
صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٤٣﴾
قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ
اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ
مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا
بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ
يَتَكَبَّرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ
وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ
يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٤٦﴾
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ
١٧
ع٦ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٧﴾ ع

٧ ”جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ ”اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔“ فرمایا ”تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ' اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔“ چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا ”پاک ہے تیری ذات' میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔“ فرمایا ”اے موسیٰ' میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجالا۔“

اس کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ہر شعبہ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی اور اس سے کہا ”ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی

پیروی کریں‘ عنقریب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں‘ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے‘ اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے‘ اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہوگئے۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں؟“

ہمیں چاہئے کہ اس منفرد منظر کو ہم اپنے خیال‘ اپنے اعصاب اور اپنے وجود میں پوری طرح مستحضر کر لیں۔ اپنی پوری قوتوں‘ فہم و ادراک کی پوری قوتوں کو مستحضر کر کے اور اس منظر کے تصورات کے قریب جانے کی کوشش کریں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جس حقیقت کا ادراک کرتے تھے اور اس کا شعور پاتے تھے‘ اس میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہو سکیں۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (۷: ۱۴۳)

”جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ ”اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔“

یہ ایک خوفناک منظر ہے۔ حضرت موسیٰ اللہ کی طرف سے کلمات سن رہے ہیں اور ان کو جس بات کا شوق ہے اور جس طرف وہ کھنچے چلے جا رہے ہیں اور ان کی روح جس سمت میں بلند ہو رہی ہے ایسے حالات میں حضرت موسیٰ بھول جاتے ہیں کہ ان کی بساط کیا ہے اور یہ کہ اللہ کی حالت شان کیا ہے‘ وہ مطالبہ کر دیتے ہیں‘ ایک ایسے امر کا جو اس کرۂ کی بشریت کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اگر اسے ممکن بنا دیا جائے تو کسی انسان کی طاقت ہی میں یہ نہیں ہے۔ یعنی آپ رویت ذات باری کا مطالبہ فرماتے ہیں۔ شوق و امید کے ان حالات میں اور محبت و وصال کے اس ماحول میں وہ عالم شہود میں ذات باری کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جواب میں دو ٹوک بات آتی ہے۔ قَالَ لَنْ تَرٰنِيْ (۷: ۱۴۳) فرمایا ”تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔“ اور اس کے بعد اللہ کی شفقت سامنے آتی ہے۔ اور آپ کو یہ بات پڑھا دی جاتی ہے کہ لَنْ تَرٰنِيْ (۷: ۱۴۳) کی وجہ کیا ہے یہ کہ آپ کے اندر اس کی طاقت ہی نہیں ہے۔ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰنِيْ (۷: ۱۴۳) ”ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ‘ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔“ اس لئے کہ پہاڑ انسان کے مقابلے میں زیادہ جمنے والا ہے۔ پھر وہ متاثر ہونے والا بھی نہیں ہے اور وہ انسان کے مقابلے میں قبولیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود جو واقعہ ہوا وہ یہ تھا۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (۷: ۱۴۳) ”چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔“

سوال یہ ہے کہ یہ تجلی کیسی تھی‘ ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ اس کی کوئی صفت بیان کر سکیں۔ نہ ہم اس کا ادراک کر سکتے ہیں‘ نہ ہم اس تجلی کو دیکھ سکتے ہیں‘ ہم اسے صرف اس لطیف روحانی تعلق کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں اور یہ روحانی رویت بھی اس وقت ممکن ہے جب انسان کی روح صاف و شفاف ہو جائے اور پوری طرح اپنے اس اصل اور

مصدر کی طرف متوجہ ہو جائے۔ صرف الفاظ اور بے معنی الفاظ کے ذریعے ہم کسی کیفیت کو قارئین کے اذہان میں منتقل نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہم کوشش نہیں کرتے کہ ہم اس کو الفاظ کے ذریعے سمجھائیں۔ نیز اس موضوع پر جو روایات وارد ہیں ان کو بھی ہم ایک طرف رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان روایات میں سے کوئی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس پارے میں کوئی تفصیل نہیں دی ہے۔

اس تجلی کے آثار کے بارے میں قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور زمین پر ہموار۔ حضرت موسیٰ انسانی ضعیف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۷: ۱۴۳) ”جب ہوش آیا تو بولا ”پاک ہے تیری ذات‘ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔“

جب انہیں ہوش آیا‘ انہیں معلوم ہوا کہ انسانی قوت ادراک کی حدود کیا ہیں اور انہیں عملاً معلوم ہو گیا کہ انہوں نے یہ سوال کر کے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے تو اعتراف کیا کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے‘ میں توبہ کرتا ہوں‘ میں نے حد سے تجاوز کیا‘ میں پہلا مسلمان ہوں اور رسول ہمیشہ پہلا مسلمان ہوا کرتا ہے‘ وہ اللہ کی عظمت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہے‘ سب سے پہلے وہ اپنی رسالت اور اپنے اوپر نازل ہونے والے کلام پر ایمان لاتا ہے‘ پیغمبروں کو اللہ کا حکم ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے ایمان کا اعلان کریں۔ یہ مضمون قرآن کریم میں کافی مقامات پر آیا ہے۔

حضرت موسیٰ نے دوسری بار رحمت الٰہیہ کا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا‘ اب انہیں خوشخبری مل رہی ہے کہ وہ منتخب روزگار ہیں۔ آپ میرے کلام اور پیغام کے حامل ہیں۔ فرعون سے مطالبہ یہ تھا کہ میری قوم کو رہا کر دو‘ اب آپ نے اپنی قوم میں کام کرنا ہے۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۷: ۱۴۴) فرمایا ”اے موسیٰ ؑ میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بتایا ”میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا ہے کہ میری پیغمبری کرے۔“ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے زمانے کے سب لوگوں میں سے آپ کو رسول بنانے کے لئے منتخب کیا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں اور بعد میں بھی۔ لہٰذا انتخاب اور اصطفاء سے مراد ہے‘ قرآن کے مطابق اس دور کے لوگوں کے مقابلے میں ہے۔ رہی صفت ہم کلامی باری تعالیٰ‘ تو اس صفت میں حضرت موسیٰ منفرد ہیں۔ وہی یہ بات کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو یہ حکم دیا کہ آپ وہ ہدایات پکڑیں اور شکر ادا کریں تو یہ اللہ کی جانب سے ہدایت اور راہنمائی اور یہ تذکیر ہے کہ اللہ کے ان انعامات کا جواب ایک ہی ہے یعنی شکر ادا کرنا۔ رسول چونکہ قائد ہوتے ہیں اور قائدین لوگوں کے لئے نمونہ ہوتے ہیں‘ اس لئے لوگوں کا بھی فرض بن جاتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہدایات کو لیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ یوں ان پر اللہ کے مزید انعامات نازل ہوں گے‘ ان کی اصلاح ہو گی اور وہ اللہ سے جڑ کر سرکشی سے بچ جائیں گے۔

اب چند الفاظ اس رسالت کے مضمون اور طریقہ کار کے بارے میں ہیں کہ یہ رسالت کس طرح دی گئی :

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۴۵:۷) اس کے بعد ہم نے موسیٰ ؑ کو ہر شعبہ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی۔"

روایات اور مفسرین کے درمیان ان تختیوں کے بارے میں اختلافات ہیں 'بعض نے ان کے بارے میں تفصیلات دی ہیں۔ ان تفصیلات کا بیشتر حصہ ان اسرائیلی روایات پر مشتمل ہے جو اسلامی تفاسیر کے اندر داخل ہو گئی ہیں۔ ان روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات مرفوع نہیں ہے۔ چنانچہ ہم اس آیت کو پڑھ کر آگے جانے سے رک جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان روایات میں جو تفصیلات ہیں ان سے ان الواح کی حقیقت میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی۔ یہ تختیاں کیسی تھیں 'کس چیز کی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر کس انداز کی تحریر درج تھی 'اس کے بارے میں ہمارے پاس تفصیلات نہیں ہیں 'نہ ان کی کوئی ضرورت ہے 'کیونکہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان تختیوں میں لکھا ہوا کیا ہے اور کیا تھا؟ ان میں وہ تمام تفصیلات تھیں جن کا تعلق حضرت موسیٰ کی رسالت سے تھا۔ مثلاً اللہ کا بیان' اللہ کی شریعت کے احکام 'لوگوں کی اصلاح کے لئے مزید ہدایات 'امت کے حالات اور جن امور کی وجہ سے ان کے اندر بگاڑ پیدا ہو گیا تھا 'یعنی ان کی تاریخ وغیرہ۔

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا (۱۴۵:۷) اور اس سے کہا "ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔"

اللہ کی جانب سے اہم حکم یہ تھا کہ آپ نہایت ہی قوت اور عزم سے ان الواح و ہدایات کو لیں اور اپنی قوم کو سختی سے حکم دیں کہ وہ ان ہدایات پر عمل کریں۔ اگرچہ وہ مشکل ہوں اس لئے کہ وہ ان کی اصلاح حال کے لئے نہایت ہی موزوں تھیں اور احسن تھیں۔

حضرت موسیٰ کو اس انداز میں ہدایات لینے کا حکم دینے کے دو مقصد ہیں۔ ایک یہ 'بنی اسرائیل نے ایک طویل عرصہ تک غلامی کی زندگی بسر کی تھی 'ایک طویل عرصہ تک غلامی کی زندگی بسر کرتے کرتے ان کے اندر اخلاقی بگاڑ پیدا ہو گیا تھا' لہٰذا ان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت سختی اور سنجیدگی کی اشد ضرورت تھی' تاکہ وہ ان کے اندر فرائض رسالت اچھی طرح ادا کر سکیں اور پھر فرائض منصب خلافت ادا کر سکیں اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو نظریہ حیات کی اساس پر کام کرتے ہوں ان کو اپنے نظریات پر صحیح طرح جم جانا چاہئے۔

اللہ کے نزدیک عقیدہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ اس پوری کائنات کے نقطہ نظر سے بھی نظریہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی اس کائنات کے تصرفات اور انسانی تاریخ کے بارے میں انسان کا صاف ستھرا نقطہ نظر ہونا چاہئے۔ اسی طرح اس دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی کے بارے میں انسان کے افکار صاف ہونے ضروری ہیں۔ یوں انسان کی بندگی صرف اللہ وحدہ کی الوہیت کے لئے مخصوص ہو۔ اس کے بعد اس نظریہ پر مبنی ایک ایسا نظام زندگی قائم ہو جو انسانی زندگی کو یکسر تبدیل کر دے اور زندگی کے لئے بالکل ایک نیا انداز مقرر کر دے۔ وہ نظام ایسا نہ ہو جس کے تحت جاہلیت چلتی ہے 'جس

میں اللہ کے سوا کسی اور کی الوہیت قائم ہوتی ہو۔ غرض پوری زندگی کا ایک ایسا تفصیلی اور جامع نظام جو اس نظریہ حیات پر مبنی ہو۔ ایسے نظام کا قیام ضروری ہے۔ اللہ کے نزدیک واضح عقیدہ اور اس پر مبنی نظام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس پوری کائنات کی تخلیق' اس کے اندر انسان کے وجود اور پھر اس انسان کی تاریخ کے بارے اسلامی نظریہ حیات پر انسان کو بڑی سختی سے جم جانا چاہئے۔ انسان کو اس کے بارے میں سنجیدہ ہونا چاہئے' واضح طور پر وہ اپنے نظریات کا اعلان کرے اور دو ٹوک الفاظ میں کرے۔ اس معاملے میں سہل انگاری سے کام نہ لے۔ نرمی اختیار نہ کرے' رخصتیں تلاش نہ کرے۔ اس لئے کہ یہ بہت ہی اہم اور بنیادی معاملہ ہے۔ اس معاملے کے تقاضے بھی اس قدر مشکل ہیں کہ نرم مزاج' لچک والے اور رخصتیں تلاش کرنے والے لوگ ان کو پورے نہیں کر سکتے۔

لیکن اسلامی نظریہ حیات پر جمنے اور اسے سختی سے پکڑنے کے معنی یہ بھی نہیں کہ انسان متشدد' پیچیدہ مزاج اور خشک مزاج ہو جائے۔ اس لئے کہ دین اسلام کی یہ نفسیات نہیں ہیں۔ دین صرف یہ تقاضا کرتا ہے کہ دین کے لئے ایک شخص سنجیدہ ہو' بات صاف کرتا ہو' دو ٹوک نظریات رکھتا ہو اور صاف گو ہو۔ یہ باتیں تشدد' سختی' خشکی اور بدمزاجی سے الگ ہیں۔ نظریات پر جمنے اور بدمزاجی میں بہرحال فرق ہونا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصر کی طویل غلامانہ زندگی نے بنی اسرائیل میں ایسی اخلاقی کمزوریاں پیدا کر دی تھیں' جن کے لئے سختی پر مبنی ہدایات ضروری تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کو جس قدر ہدایات بھی دی گئیں ان میں نہایت ہی سختی پائی جاتی ہے۔ تاکہ روایتی سہل انگاری' کمزور اخلاقی قوت اور بے راہ روی کا علاج کیا جا سکے اور وہ دین کے معاملے میں درست فکر' صریح آواز اور واضح انداز اختیار کریں۔

وہ تمام اقوام جو ایک طویل عرصے تک غلام رہی ہوں ان کے اندر ایسی ہی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ غلامی' ذلت' عاجزی' ذر' طاغوت کی غلامی وغیرہ جن کی وجہ سے ایسے لوگ کج فہم' دھوکہ باز' سہل انگار اور محنت و مشقت سے بھاگنے والے ہوتے ہیں۔ آج کل ہمارے دور میں جو اقوام بھی غلام رہی ہیں ان کے اندر یہ صفات موجود ہیں کیونکہ غلامی میں لوگوں کے ضمیر بدل جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نظریات سے دور بھاگتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نظریات کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ جس طرف دنیا چلتی ہے' یہ لوگ اسی طرف چلتے ہیں اور جدھر کی ہوا ہو انسان اس طرف بڑی آسانی کے ساتھ چل سکتا ہے۔

یہ ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کو یہ بشارت بھی دیتے ہیں کہ اگر تم نے اپنے نظریہ حیات کو سختی سے تھامے رکھا تو تمہیں زمین کا اقتدار اعلیٰ نصیب ہو گا اور تم فاسقوں کے گھروں کے مالک بن جاؤ گے۔ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ (۱۴۵) "عنقریب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔"

آیات کے اس ٹکڑے کا اقرب مفہوم یہ ہے کہ اس سے مراد ارض مقدس ہے جو اس دور میں بت پرستوں کے قبضے میں تھی۔ یہ حضرت موسیٰ کو بشارت تھی کہ تم اس پر قابض ہو گے۔ اگرچہ حضرت موسیٰ کے عہد میں بنی اسرائیل اس میں داخل نہ ہوئے کیونکہ آپ کے دور میں ابھی تک ان کی اخلاقی تربیت مکمل نہ ہوئی تھی۔ ان کے اخلاق ابھی تک درست نہ تھے کیونکہ وہ جب ارض مقدس کے سامنے آئے تو انہوں نے اپنے نبی سے کہہ دیا "اے موسیٰ! اس میں تو ایک جبار قوم بستی ہے اور ہم اس وقت تک اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس سے نکل نہیں جاتے۔ ہاں اگر

وہ نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے ۔"

ان میں ایک دو شخص سچے مومن تھے ' انہوں نے اصرار کیا کہ شہر میں داخل ہو جاؤ اور حملہ کر دو ' یہ دو شخص دراصل اللہ سے ڈرنے والے تھے ۔ اس پر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا "ہم تو اس شہر میں ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک یہ قوم وہاں موجود ہے ۔ تم اور تمہارا رب جاؤ ' لڑو ' ہم یہاں بیٹھے ہیں انتظار میں ۔"

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کا مزاج کس قدر بگڑا ہوا تھا ۔ وہ کس قدر کج رو تھے اور حضرت موسیٰ ' ان کی دعوت اور ان کی شریعت کن لوگوں کی اصلاح کے لئے تھی ۔ ایسے حالات میں یہ نہایت ہی موزوں ہدایت تھی کہ تورات کی ہدایات کو قوت سے پکڑو اور اپنی قوم سے ان پر سختی سے عمل کراؤ ۔

اب اس منظر کے آخر میں اور موسیٰ اور رب موسیٰ کے مکالمے کے اختتام پر ان لوگوں کے انجام کے بارے میں بتایا جاتا ہے جو متکبر ہیں ' جو اللہ کے معجزات و ہدایات سے منہ موڑتے ہیں ۔ اور بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں اور ان لوگوں کی تصویر کشی بڑے واضح رنگ اور قرآن کریم کے انداز تصویر کشی کے عین مطابق ۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ (١٤٦) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (١٤٧)

(٧:١٤٦ - ١٤٧) "میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں ' وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے ' اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے ' اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے ۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے ۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں ۔"

اللہ تعالیٰ یہاں ان لوگوں کے بارے میں اپنی مشیت کا اعلان فرماتے ہیں جو اس زمین میں بغیر جواز کے تکبر کرتے ہیں اور بڑے بنتے ہیں ۔ یہ لوگ کس قسم کے ہوتے ہیں؟ ایسے کہ چاہے جو معجزانہ استدلال ان کے سامنے پیش کیا جائے وہ ماننے والے نہیں ہیں ۔ ان کو کسی اچھے کام کی دعوت دی جائے تو اس پر لبیک نہیں کہتے ' اگر وہ برائی کا کوئی کام بھی دیکھیں اس کی طرف لپکیں لہٰذا ایسے لوگوں کا صحیح علاج یہ ہے کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ایسے لوگوں پر کام کیا جائے جو مانتے ہیں ' یہ تو ماننے والے نہیں ' آیات و دلائل جو اس کائنات میں ظاہر و باہر ہیں اور وہ آیات و دلائل جو اللہ کی کتابوں میں ہیں ' اس لئے کہ انہوں نے پہلے سے تکذیب کا فیصلہ کر لیا ہے اور اعراض کا فیصلہ کر لیا ہے ۔

قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے ہوں گے ان کی حرکات اور ان کی صفات یہ ہیں :

الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۷: ۱۴۶) "جو بغیر کسی حق کے زمین پر بڑے بنتے ہیں ۔" اس لئے کہ اللہ کے بندوں میں سے کسی بندے کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر خود بڑا بنے ۔ بڑائی تو اللہ کی صفت ہے ' اور کبریائی میں اللہ کسی کو شریک نہیں کرتا کیونکہ یہ اللہ کی چادر ہے ۔ لہٰذا کوئی انسان جو اس کرۂ ارض پر بڑا بنتا ہے وہ بغیر جواز کے تکبر کرتا ہے اور سب سے بڑا تکبر یہ ہے کہ کوئی اس سرزمین پر قانون سازی کا حق اپنے لئے مخصوص کرلے اور اللہ کے بندوں پر اللہ کے بجائے اپنا اقتدار اعلیٰ استعمال کرے ۔ اور لوگوں سے اپنے قوانین پر عمل کرائے ۔ اس تکبر اور بڑائی سے تمام دوسری برائیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ یہ تمام شرارتوں کی بنیاد ہے اور ہر قسم کا فساد اس سے برپا ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسری صفات ایسے لوگوں کی یہ آتی ہیں ۔

وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا (اگر سیدھا راستہ سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں ۔" ان کی یہ فطرت ہے کہ سیدھے راستے کو دیکھ کر ہی اس سے ایک طرف ہو جاتے ہیں اور ٹیڑھے راستے کو دیکھتے ہی اس پر روانہ ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی فطرت کا حصہ ہے ۔ اور اس کے خلاف وہ نہیں جا سکتے ۔ یہ ہے ان کی صفت ۔ قرآن کریم اس انداز میں اس کی تعبیر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ کی مشیت نے ایسے لوگوں کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ سزا یہ ہے کہ ہدایت کے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے گئے ہمیشہ کے لئے ۔

اس قسم کے لوگ ہمیں ہر معاشرے میں ملتے رہتے ہیں ۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ حق سے اجتناب کرتے ہیں اور باطل کی طرف سخت میلان رکھتے ہیں اور بغیر تدبیر اور بغیر سوچے باطل کی طرف لپکتے ہیں ۔ سچائی کا مستقیم راستہ ان کو مشکل اور باطل کا ٹیڑھا راستہ ان کو آسان نظر آتا ہے اور ایسے لوگ اللہ کی آیات و دلائل اور معجزات سے دور بھاگتے ہیں ' ان پر غور و فکر نہیں کرتے ' ان کے ذرائع فہم و ادراک پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ اور نہ فطرت اور حق کے اشارات ان پر اثر کرتے ہیں ۔

سبحان اللہ ' اس عجیب قرآنی ہدایات کی ان جھلکیوں سے اس قسم کے لوگ ممتاز طور پر نظر آتے ہیں ۔ اور ایسے لوگوں کو اپنے ماحول اور معاشرے میں دیکھتے ہی ایک قاری کہہ اٹھتا ہے ۔ ہاں ہاں اس قسم کے لوگوں کو میں جانتا ہوں ۔ فلاں فلاں شخص ان قرآنی کلمات کا مصداق ہے ۔

اس قسم کے لوگوں کو ایسی ایسی تباہ کن اور مہلک سزا دے کر اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم نہیں کرتا ۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں ۔ یہ وہ سزا و جزا ہے جس کے وہ لوگ ٹھیک طور پر مستحق ہیں جو آیات الہیہ کی تکذیب کرتے ہیں ۔ اور ان کے بارے میں غفلت برتتے ہیں اور زمین میں بغیر حق اپنی بڑائی جماتے ہیں ۔ ان کی روش یہ ہے کہ ہر اس راستے سے ایک طرف ہو جاتے ہیں جو ہدایت کا راستہ ہو اور ہر اس راستے کی طرف لپکتے ہیں جو گمراہی کا راستہ ہو ' ایسے لوگوں کو تو ان کے عمل کی سزا مل رہی ہے اور یہ لوگ اپنے طرز عمل کی وجہ سے ہلاکت کے دروازے تک آپہنچے ہیں ۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ (۷: ۱۴۶) "اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پرواہی کرتے رہے ۔" اور یہ کہ

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا (۷: ۱٤۷) "ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا آخرت کی ہستی کا انکار کیا اور اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے 'کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں۔"

حبطت کا لفظ حبوط سے ہے۔ کہتے ہیں حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۷: ۱٤۷) جب وہ زہریلی گھاس چرے اور اس کا پیٹ پھول جائے اور پھر اس سے گیس نکل جائے 'اس لفظ کو باطل کی قوت کے لئے اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ باطل کے اعمال بظاہر بہت ہی پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی جب غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے تو پھر کچھ نہیں رہتا۔

یہ تو مناسب سزا ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی اور آخرت کی جوابدہی سے انکار کیا لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اعمال کس طرح ختم ہو جاتے ہیں اور برباد ہو جاتے ہیں؟

نظریاتی اور اعتقادی لحاظ سے تو ہمارا ایمان ہے کہ ان کے اعمال ضائع ہوں گے 'اگرچہ ظاہری حالات ایسے نظر آئیں کہ ان میں' ان لوگوں کے اعمال کا یہ انجام متوقع نہ نظر آتا ہو۔ لیکن جو کوئی بھی اللہ کی ایات کی تکذیب کرے اور آخرت کی جوابدہی کا یقین نہ رکھے اس کے اعمال آخر کار ضائع اور برباد ہوں گے اور ان کی حیثیت ایسی ہو گی جیسے کہ وہ کچھ نہیں ہیں۔

لیکن نظری پہلو سے بھی یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ ان آیات و معجزات کی تکذیب کرتے ہیں جو اس پوری کائنات کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کی تائید میں وہ آیات و دلائل بھی موجود ہیں جو اللہ کے پیغمبروں نے پیش کئے 'اور اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ آخرت کی جوابدہی کا بھی انکار کرتے ہیں 'ایسے لوگوں کی روح دراصل مسخ شدہ ہے اور ایسے لوگ اس کائنات کے مزاج اور اس کے قوانین سے سرکش ہیں۔ اس کائنات سے ایسے شخص کا کوئی حقیقی رابطہ نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے لوگ اس کی جدوجہد کی راہ سے ہم آہنگ ہیں۔ ایسے لوگوں کے اعمال چونکہ کائنات کے رخ' اس کے مقاصد اور اللہ کے قوانین کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ اعمال اگرچہ بظاہر خیرہ کن ہوں' بے حقیقت ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوں' اس لئے کہ یہ اعمال ان دائمی مضبوط دواعی اور نظریات پر مبنی نہیں ہوتے جو اس پوری کائنات کی بنیاد ہیں۔ ان اعمال کا ہدف اور نصب العین وہ نہیں ہوتا جو اس پوری کائنات کا ہدف اور نصب العین ہے۔ ان کی مثال اس نہر جیسی ہے جو اپنے سرچشمے سے کٹ گئی ہو اور اس نے جلد یا بدیر لامحالہ خشک ہونا ہے۔

جو لوگ ان ایمانی اقدار اور انسانی تاریخ کے درمیان گہرے رابطے کا ادراک نہیں کر سکتے اور جو لوگ تقدیر کے اس اٹل فیصلے کو نہیں پا سکتے جو ان لوگوں کے حق میں صادر ہو چکا ہے جو ان ایمانی اقدار کے منکر ہیں 'یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ غافل ہیں۔ اور انہی کے بارے میں یہ سزا سنائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی سنت جاریہ اور ناموس کلی کو نہ پا سکیں گے۔ کیونکہ ان کا رخ پھر گیا ہے اور اب ان کے بارے میں آخری فیصلے کا ظہور باقی ہے۔

جن لوگوں کو اس دنیا کی عمر مختصر نے غرے میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ آخرت سے غافل لوگ بظاہر اس دنیا میں بڑی کامیابی سے زندگی بسر کر رہے ہیں' ان کو یہ دھوکہ اس سوجن سے ہو گیا جو کسی جانور کو مسموم گھاس کھانے کی وجہ سے لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جانور تازہ اور موٹا ہو گیا ہے اور وہ بہت ہی صحت مند ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ مرنے والا ہوتا ہے۔

اس دنیا میں جو اقوام نابود ہو کر مٹ چکی ہیں' اور ان کی جگہ جو دوسری اقوام آکر آباد ہو گئی ہیں۔ وہ ان سابقہ اقوام

سے عبرت نہیں لیتیں - وہ اللہ کی اس سنت کو نہیں دیکھ رہی ہیں کہ وہ کس طرح اس کائنات میں کام کرتی ہے - اللہ کی یہ تقدیر اور اس کا نظام جاری و ساری ہے - اس میں کسی وقت بھی ٹھہراؤ نہیں آتا - اللہ سب لوگوں پر احاطہ کئے ہوئے ہے -

---O O O---

جس دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے دربار میں تھے 'یہ ایک منفرد ملاقات تھی اور ہماری محدود آنکھوں کے لئے ظاہر ہے کہ اس منظر کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے - نہ ہماری روح اس منظر کو دیکھ سکتی ہے اور ہماری فکر اور قوت مدرکہ اس کے بارے میں حیران ہے - حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں ان کی قوم نے گمراہی اختیار کر لی - وہ دوبارہ مصری بیماریوں میں مبتلا ہو گئے اور بت پرستی کے گڑھے میں گر گئے - انہوں نے ایک بولتے ہوئے بچھڑے کے بت کو اپنا الٰہ بنا لیا اور اس کی عبادت شروع کر دی -

ان حالات میں اب اس قصے کے نویں منظر سے ہم آگے بڑھتے ہیں اور ہمارے سامنے اس کا دسواں منظر آتا ہے - نواں منظر بلند عالم بالا میں ہے 'جس کے مناظر میں خوشی اور روشنی کا ماحول ہے' محبتوں اور بہار کے مکالمات ہمارے سامنے تھے 'لیکن اچانک ایک ایسا منظر نظر آتا ہے کہ لوگ سربلندیوں سے پستیوں میں گرتے ہیں' وہ صحت مندی کے بعد دوبارہ بیمار نظر آتے ہیں - واضح سوچ کے بجائے خرافات کے پیچھے بھاگ رہے ہیں -

---

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

"موسیٰ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں بیل کی سی آواز نکلتی تھی - کیا انہیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انہوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم تھے - پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے -"

یہ ہے بنی اسرائیل کا مزاج 'وہ قدم قدم پر بے راہ روی اختیار کرتے ہیں - وہ ظاہری اور معنوی کسی بھی اعتبار سے بلندی کی طرف نہیں جاتے بلکہ ان کی فطرت میں پستی کی طرف گرنا ہی لکھا ہے - جونہی ہدایت و راہنمائی کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے وہ غلط راہوں پر چل پڑتے ہیں -

انہوں نے بحر قلزم کو معجزانہ طور پر پار کرتے ہی دیکھا کہ ایک قوم بت پرستی میں مشغول ہے تو انہوں نے پیغمبر سے مطالبہ کر دیا کہ ہمارے لئے بھی ایسا ہی الٰہ بنا دیا جائے - اس پر حضرت موسیٰ نے انہیں روکا اور ان کے اس خیال کو تنق

سے رد کر دیا۔ جب حضرت موسیٰ طور پر گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک سنہری بچھڑا' آواز نکال رہا ہے اور اس میں زندگی کے آثار بھی نہیں محض ایک جسد ہے' یہ سامری کی مصنوعات میں سے ایک عجیب صنعت تھی۔ یہ شخص سامرہ کا رہنے والا تھا' اس کے بارے میں سورت طہٰ میں تفصیلات درج ہیں۔ اس نے اس بچھڑے کو اس طرح ڈیزائن کیا کہ اس سے بیلوں جیسی آواز نکل رہی تھی۔ جب انہوں نے اسے دیکھا تو ہر طرف سے امنڈ آئے اور جب سامری نے ازروئے شیطنت یہ کہا کہ یہ تمہارے موسیٰ اور تمہارا الہ ہے تو یہ اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے کہا کہ موسیٰ جس الہ کی ملاقات کے لئے گئے ہیں وہ تو یہ رہا۔ موسیٰ نے مقام اور وقت کے تعین میں غلطی کی ہے۔ انہوں نے خصوصاً اس لئے بھی یقین کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزار لیا۔ جب حضرت موسیٰ تیس دنوں کے بعد بھی نہ لوٹے تو سامری نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام غلطی کر گئے ہیں الہ تو یہ رہا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نے ان کو ایک ایسے رب کی عبادت کی تعلیم دی تھی جو نظر نہیں آتا تھا' جو رب العالمین تھا۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ جسد تو ان میں سے ایک شخص سامری کی صنعت ہے۔ بنی اسرائیل اپنے کردار کا جو نقشہ پیش کر رہے تھے وہ انسانیت کی ایک نہایت ہی بھونڈی تصویر تھی' قرآن کریم اس تصویر پر تعجب کا اظہار کر کے مشرکین مکہ کو یہ تصور دیتا ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو ان کی حالت کیا ہے؟

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ (۷:۱۴۸)

"کیا انہیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی راہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انہوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم تھے۔"

اس سے بڑا ظالم کون ہے جو ایک ایسے جسد کی عبادت کرتا ہے جسے خود اس نے بنایا ہو' حالانکہ خود انسانوں کو اور ان کی مصنوعات کو اللہ بناتا ہے' حقیقی خالق اللہ ہے۔

ان میں حضرت ہارون موجود تھے' وہ اس بھونڈی گمراہی سے ان کو نہ روک سکے۔ ان میں بعض عقلاء اور مومنین بھی موجود تھے' لیکن وہ بھی بے عقل عوام کے اس ریلے کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ خصوصاً جبکہ وہ سونے کا بنا ہوا تھا۔

آخر میں جب جوش و خروش ختم ہوا اور لوگوں کے حواس بحال ہوئے اور حقیقت سامنے آگئی اور انہوں نے جان لیا کہ وہ تو گمراہ ہو گئے اور انہوں نے کھلے شرک کا ارتکاب کر لیا ہے تو وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۷:۱۴۹)

"پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔"

سقط فی یدہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کا حیلہ اور تدبیر اس کے سامنے فیل ہو جائے۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ وہ جس گمراہی میں ملوث ہو گئے اب تو وہ اس سے صاف نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا' تو ایسے حالات میں بے بس ہو کر انہوں نے کہا "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔"

اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان میں اصلاح پذیری کا مادہ بہرحال موجود تھا۔ اور ان کے دل

اس قدر سخت نہ ہو گئے تھے جس طرح بعد میں ہوئے کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا کہ وہ پتھر بن گئے یا پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ۔ بہرحال اس وقت جب انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ غلطی پر ہیں اور اللہ کی رحمت اور مغفرت کے سوا ان کے لئے فلاح کا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو انہوں نے اس طرح توبہ کی اور اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس دور میں یہ لوگ قابل اصلاح تھے ۔

---○○○---

یہ واقعات اس وقت ہوئے جب حضرت موسیٰ رب ذوالجلال کے دربار میں کھڑے تھے ' اور اللہ سے ہمکلام تھے ۔ آپ کو معلوم نہ تھا کہ ان کے پیچھے ان کی قوم کیا کر رہی ہے ۔ اگر اللہ ان کو بتاتے تو انہیں اس وقت علم ہو جاتا' بہرحال اب حضرت موسیٰ کی واپسی پر گیارہواں منظر سامنے آتا ہے ۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ
قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ
وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ
وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ښ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۵۰ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ښ وَاَنْتَ ۸
اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۱۵۱ ع ۴
۸

" ادھر سے موسیٰ غصے اور رنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا ۔ آتے ہی اس نے کہا " بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے ؟ " اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارون) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا ۔ ہارون نے کہا " اے میری ماں کے بیٹے ' ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے ۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر ۔ " تب موسیٰ نے کہا " اے رب ' مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما ' تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے ۔ "

حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو ان حالات کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے ۔ آپ کے اقوال اور آپ کے اقدامات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سخت غصے میں تھے ۔ اور آپ کے غصے کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے ۔

بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ (۷ : ۱۵۰) آتے ہی اس نے کہا " بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے ۔ " اسی طرح آپ کے اقدامات سے بھی غصہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے بھائی کو داڑھی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ۔ "

وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ اِلَيْهِ (۷: ۱۵۰) (اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا) حضرت موسیٰ کا یہ غصہ بالکل برحق تھا' اس لئے کہ وہ اچانک ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے جن کی انہیں توقع نہ تھی۔ یہ ایک انقلابی صورت حالات تھی۔ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ (۷: ۱۵۰) "بہت بری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد!" میں تمہیں ٹھیک راستے پر چھوڑ کر گیا تھا' تم نے اسے ضلالت سے بدل دیا۔ میں تمہیں اس حال میں چھوڑ کر گیا کہ تم خدا کی عبادت کر رہے تھے اور جب واپس ہوا تو تم بچھڑے کی عبادت کر رہے تھے حالانکہ وہ صرف ایک جسد تھا اور بیل جیسی آواز نکال رہا تھا۔ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ (۷: ۱۵۰) "کیا تم سے اس قدر صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے۔" یعنی تم نے اپنے رب کے فیصلے کا انتظار نہ کیا' اس کے عذاب کا انتظار نہ کیا اور اس نے جس عرصے کے لئے مجمع بلایا تھا اس کا انتظار نہ کیا۔" وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ اِلَيْهِ (۷: ۱۵۰) "اس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔" اس اقدام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سخت مشتعل تھے۔ اس لئے کہ ان تختیوں میں اللہ کا کلام تھا' اور ان کے پاس ادب کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ان کو زمین پر نہ پھینکتے لیکن اس وقت آپ سخت غصے میں تھے اور آپ ضبط نہ کر سکے۔ بھائی کو بھی بالوں سے پکڑ کر کھینچا حالانکہ ان کے بھائی عبد صالح اور پیغمبر تھے۔ حضرت ہارون نے برادرانہ جذبات سے اپیل کی تاکہ آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور آپ موافقانہ رویہ اختیار کریں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی صفائی پیش کی اور یہ بتایا کہ انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ (۷: ۱۵۰) ہارون نے کہا "اے میری ماں کے بیٹے' ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔"

اے میری ماں کے بیٹے کے الفاظ استعمال کر کے حضرت ہارون ان کے جذبہ کی طرف نہایت ہی جوش و خروش سے لپک رہے تھے۔ اور ایسے حالات موجود تھے کہ اگر حضرت ہارون ان کی زیادہ مزاحمت کرتے تو وہ تشدد پر اتر آتے اور اس صورت حال کی تصویر وہ اس طرح کھینچتے ہیں "قریب تھا کہ وہ مجھے مار ڈالتے۔" اس لئے وہ بے قصور تھے۔

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۷: ۱۵۰) "پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر۔"

اس دوسرے فقرے سے بھی حضرت ہارون اپنے بھائی کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر دونوں بھائیوں کے مشترکہ دشمن ہوں تو بھائی ایک دوسرے کی پوزیشن کا خیال رکھتے ہیں۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ آپ مجھے اور ظالموں کو ایک صف میں کھڑا نہ کریں۔ ظالم وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور میں نے تو ان کے ساتھ ظلم میں شرکت نہیں کی۔ میں تو بری الذمہ ہوں۔

اب حضرت موسیٰ کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور آپ معذرت کو معقول سمجھ لیتے ہیں' اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مغفرت اور شفقت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۷: ۱۵۱) تب موسیٰ نے کہا "اے رب' مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما' تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔"

اب فیصلہ کن بات سامنے آتی ہے اور آخری فیصلہ بہرحال اللہ سبحانہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی بات کو اپنے بندے حضرت موسیٰ کی بات سے متصلاً لاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کی عزت افزائی کا ایک انداز ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿١٥٢﴾ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

(جواب میں ارشاد ہوا) ”کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے ۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں اور جو لوگ برے عمل کریں پھر توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں تو یقیناً اس توبہ و ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمانے والا ہے ۔“

یہ حکم بھی ہے اور وعدہ بھی ہے ۔ بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو الٰہ بنایا ۔ عنقریب ان پر غضب آنے والا ہے اور اس دنیا کی زندگی میں وہ ذلت سے رہیں گے ۔ اور یہ اللہ کا ایک دائمی اصول اور اس کی سنت ہے کہ جو لوگ برے کام کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں تو اللہ ان کی مغفرت کر دیتا ہے ' اللہ کو چونکہ علم تھا کہ بچھڑے کے پجاری توبہ نہ کریں گے ۔ اس لئے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا گیا کیونکہ اللہ کو علم تھا کہ وہ اپنی روش درست نہ کریں گے اور اس اصول سے استفادہ نہ کریں گے اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا بنی اسرائیل ایک کے بعد ایک نافرمانی کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ انہیں بار بار معاف کرتے رہے یہاں تک کہ وہ دائمی غضب کے مستحق ہوئے ۔ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ (۷: ۱۵۲) ”جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں ۔“ قیامت تک جو بھی افتراء باندھیں گے یہ ایک مسلسل سزا ہے جب بھی جرم ہو گا یہی سزا ہو گی ۔ چاہے افتراء بنی اسرائیل کی طرف سے ہو یا غیر بنی اسرائیل کی طرف سے ہو ۔

اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے جن لوگوں نے بچھڑے کو الٰہ بنایا ' ان پر اللہ نے ذلت لکھ دی ہے اور وہ ہمیشہ مغضوب علیہ رہیں گے اور غضب کی شکل یہ ہے کہ قیامت تک ان پر ایسی اقوام کو مسلط کر دیا جائے گا جو ان کو بدترین عذاب دیتی رہیں گی ۔ جب بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ زمین میں سرکشی اختیار کئے ہوئے ہیں اور ان پڑھ اور پسماندہ لوگوں پر برتری حاصل کر رہے ہیں اور جیسا کہ تلمود کی زبان میں ایسے لوگوں کے لئے ”گوئم“ کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ یہ لوگ اپنی مالی اور پروپیگنڈے کی قوت سے غلط فائدہ لینے لگے یا انہوں نے ایسے نظامہائے حکومت قائم کئے اور ان کے ذریعے سے اپنے منصوبے جاری کرنا شروع کئے یا انہوں نے اللہ کے بندوں کو اپنے گھروں سے نکالنا شروع کر دیا اور ان پر مظالم شروع کر

دیئے اور جب کبھی گمراہ حکومتوں نے ان کے ہم کاب چلنا شروع کر دیا جیسا کہ آج کے دور میں ان کی یہ پوزیشن بظاہر نظر آتی ہے۔گو یہ تمام امور ان کے خلاف اللہ کے مذکورہ فیصلے کے خلاف یا متضاد نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کے مذکورہ بالا خود اپنے اقدامات کی وجہ یہ دنیا کے لوگوں کے اندر قابل نفرت ہیں اور اس مواد کو جمع کر رہے ہیں جو آخر کار ان کی ہلاکت کا سبب بنے گا۔اہل فلسطین ان کے ان مظالم کا شکار اس لئے ہیں کہ اہل فلسطین کا کوئی دین نہیں ہے' اور اہل فلسطین صحیح مسلمان نہیں ہیں۔یہ لوگ دین اسلام کے علاوہ بعض دوسرے جھنڈوں کے نیچے لڑتے ہیں' جمع ہوتے ہیں اور متفرق ہوتے ہیں۔یہ لوگ اسلامی نظریہ حیات کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ناکام و نامراد ہیں اور اسرائیل کی چھوٹی سی جمعیت اگرچہ بظاہر ترقی پذیر نظر آتی ہے' لیکن یہ حالات دائمانہ رہیں گے۔یہ ایک عارضی دور ہے' اور اس میں مسلمانوں سے وہ قوت اور وہ اسلحہ گم ہو گیا ہے جو ان کا واحد ہتھیار ہے۔وہ واحد نظام ہے' واحد جھنڈا ہے' یعنی اسلامی جھنڈا جس کے تحت انہوں نے ہزار سال تک دنیا پر غلبہ حاصل کیا۔اسی جھنڈے تلے وہ غالب آئے اور اس کے سوا ہمیشہ مغلوب ہوں گے۔اس وقت امت مسلمہ سکڑنے اور غائب ہونے کے دور سے گزر رہی ہے۔اور یہ گمشدگی اس زہر کی وجہ سے ہے جو امت مسلمہ کے اندر عالمی یہودیت اور عالمی صلیبیت نے پھیلائی ہے۔اور یہ عالمی جمہوریت اور صہیونیت اور صلیبیت نے عالم اسلام پر کڑی نظر رکھی ہوئی ہے کہ یہاں کے حالات درست نہ ہوں لیکن یہ حالات ہمیشہ یونہی نہ رہیں گے۔اس گمشدگی کے بعد امت مسلمہ کو نمود اور ظہور ضرور نصیب ہو گا۔آخر کار آنے والے مسلمان اپنے اسلاف کے ہتھیار کو پائیں گے۔کون جانتا ہے کہ کب پوری دنیا ہوش کے ناخن لیتی ہے اور یہودی مظالم کے خلاف اٹھتی ہے تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اور وہ دنیا میں دوبارہ ذلت کے اس گڑھے میں جا گریں جو اللہ ان پر لکھ دیا ہے۔اگر پوری انسانیت یہودیوں کے خلاف بیدار نہیں ہوتی تو ہمارا یقین ہے کہ امت مسلمہ ضرور بیدار ہو گی۔

غرض یہ تو ایک وقفہ اور لمحہ فکریہ تھا تاکہ بچھڑے کو الہ بنانے والوں کے انجام پر قدرے غور کر لیا جائے۔اب سابقہ منظر ہی اختتام کو یوں پہنچتا ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ۝

"پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے وہ تختیاں اٹھا لیں جن کی تحریر میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔"

قرآن کا ذرا انداز تعبیر ملاحظہ ہو گویا غضب اور غصہ ایک شخصی چیز ہے' جس نے حضرت موسیٰ پر تسلط حاصل کر لیا ہے اور اپنی مرضی سے ان کو چلاتا ہے اور حرکت میں لاتا ہے۔اور جب یہ خاموش ہو گیا اور حضرت موسیٰ کو اس نے آزاد چھوڑ دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے اختیار میں آگئے۔غصے کی وجہ سے جو تختیاں انہوں نے پھینک دی تھیں۔وہ دوبارہ ہاتھ میں لے لیں۔اب بتایا جاتا ہے کہ ان تختیوں میں اللہ کی ہدایات تھیں۔اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرنے والے تھے ان کے لئے یہ رحمت تھیں ان کے دل راہ راست پر آنے کے لئے کھل گئے تھے۔اور انہوں نے اللہ کی

رحمتوں سے دامن بھر لئے تھے۔ اور ایک گمراہ اور بے راہ شخص سے اور کون بدبخت ہو گا جو اپنے سامنے کوئی راہ نہیں پاتا۔ اور اس روح سے اور کوئی بدبخت نہیں ہے جو ماری ماری پھرتی ہے اور جسے نہ کوئی صحیح راہ نظر آتی اور نہ اسے دولت یقین ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اور خدا خوفی ہی وہ صفت ہے جس سے دل کھلتے ہیں اور جس سے غفلت دور ہوتی ہے اور انسان راہ راست پر آتا ہے اور حق کو قبول کرتا ہے۔ اللہ ان ربوں کا خالق ہے۔ اور وہی اس حقیقت کا فیصلہ اور اعلان کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ دلوں کا حال رب العالمین سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔

اب یہ قصہ ذرا آگے بڑھتا ہے۔ ایک نیا منظر اسکرین پر آتا ہے۔ اس قصے کا یہ بارہواں منظر ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ اپنے منتخب ستر افراد کے ساتھ رواں دواں ہیں۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۖ اَتُهْلِكُنَا بِمَا
فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۖ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ
مَنْ تَشَآءُ ۖ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾
وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۖ قَالَ
عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۖ فَسَاَكْتُبُهَا
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾
اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ
اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۖ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَ
۱۹
ع ۶ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
۹

"اور اس نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اس کے ساتھ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار' آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعہ سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے' آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔ اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی' ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔" جواب میں ارشاد ہوا "سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں' مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے' زکوۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔"

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر' نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے' بدی سے روکتا ہے' ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے۔ اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے' وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

اللہ کے ساتھ تعین وقت کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ شاید یہ وقت اس لئے متعین ہوا تھا کہ اس میں بنی اسرائیل توبہ کریں اور انہوں نے جس کفر اور شرک کا ارتکاب کیا تھا' اس پر اللہ سے معافی چاہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ اس جرم کے عوض بنی اسرائیل کے لئے بطور کفارہ جو سزا مقرر کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ وہ خود اپنے لوگوں کو قتل کریں یعنی ان میں سے مطیع فرمان لوگ نافرمانوں کو قتل کریں' انہوں نے ایسا ہی کیا اور یہاں تک وہ قتل کرتے رہے کہ جب تک اللہ نے ان کو معاف کر کے یہ حکم نہیں دے دیا کہ اب بس کرو۔ یہ ستر آدمی ان کے زیرک اور سمجھدار لوگ تھے' یا ان کے نمائندے تھے' "یہ الفاظ کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا کہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر حاضر ہوں" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نائب یا نمائندے تھے۔

یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ یہ لوگ کون تھے؟ انہیں سخت زلزلے نے آلیا اور یہ بے ہوش ہو گئے جیسا کہ دوسری سورتوں میں ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اللہ کو کھلا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہم آپ پر اترنے والی ہدایات اور الواح کو تسلیم کر لیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مزاج کیا تھا۔ ان کے منتخب لوگوں کا یہ حال تھا تو دوسرے عام لوگوں کا حال کیسا ہو گا اور اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ لوگ گئے ہیں توبہ قبول کرانے کے لئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ آپ درخواست فرما رہے ہیں کہ آپ قصور معاف کر دیں اور رحمت فرمائیں۔ آپ عاجزی کر رہے ہیں اور قصور کا اعتراف کر رہے ہیں۔

فَلَمَّآ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِيَّایَ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا

فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا (۷: ۱۵۵) "جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار، آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا، ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟"

اللہ کی قدرت کے سامنے یہ مکمل تسلیم و رضا کا اظہار ہے کہ پہلے بھی آپ چاہتے تو ہمیں ہلاک کر سکتے تھے، اور یہ مکمل تسلیم و رضا کا اظہار وہ دعائے مغفرت سے پہلے بطور تمہید کرتے ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اے اللہ آپ کیا ہم میں سے چند نادانوں کی وجہ سے ہم سب کو ہلاک فرما رہے ہیں۔ استفہام کا صیغہ استعمال کر کے حضرت موسیٰ یہ تاثر دیتے ہیں کہ اے اللہ تیری شان کریمی سے یہ مستبعد ہے کہ تو ایسا کرے۔ گویا یہ دعا بشکل استفہام ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (۷: ۱۵۵) "یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعہ سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔"

موسیٰ علیہ السلام یہ بتاتے ہیں کہ اس جہاں میں جو کچھ واقعہ ہوتا ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ کہ جو بھی پیش آئے وہ اللہ کی جانب سے ابتلا ہوتا ہے اور آپ بتاتے ہیں کہ وہ دوسروں کی طرح اللہ کی مشیت سے غافل نہیں ہیں۔ تمام آزمائشوں کا یہی حال ہوتا ہے، جو لوگ ان کی حقیقت کو جان لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے ابتلاء ہے اور ایک امتحان ہے جس سے انہوں نے گزرنا ہے اچھی طرح جانتے ہوئے اور ببانگ دہل۔ اور جو لوگ ان واقعات کی حقیقت سے غافل ہوتے ہیں ان کے لئے یہ واقعات و مشکلات گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حقیقت کا اظہار اس مقصد کے لئے کرتے ہیں جو آگے آتا ہے یعنی اللہ کے سامنے یہ درخواست اور دعا کہ وہ اس امتحان میں انہیں کامیاب کرے۔

اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ (۷: ۱۵۵) "ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے، آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔"

آپ ہمارے سرپرست ہیں اس لئے ہماری مدد کیجئے۔ اس آزمائش سے ہم آپ کی مدد اور معاونت کے بغیر کامیابی سے نہیں نکل سکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں آپ کی مغفرت اور آپ کی رحمت کی بھی ضرورت ہے۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ (۷: ۱۵۶) "اور ہمارے لئے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجئے اور آخرت کی بھی، ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔"

ہم مکمل طور پر تیری طرف لوٹ گئے ہیں، تیری رحمت میں پناہ لئے ہوئے ہیں اور تیری جانب سے نصرت کے امیدوار ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلیم و رضا اور حکمت ابتلاء کو سمجھتے ہوئے مغفرت اور رحمت کی درخواست پیش فرمائی اور یہ حتمی اعلان کر دیا کہ ہم اللہ کی پناہ گاہ کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ اس طرح حضرت موسیٰ کی یہ دعا ہر مسلمان کے لئے خضوع و خشوع اور مقام کبریائی کے آداب کے عین مطابق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندے کو اپنی

درخواست کس طرح شروع کرنا چاہئے اور کس طرح اس کا اختتام ہونا چاہئے ۔ اور اس کے بعد جواب یہ آتا ہے۔ قَالَ عَذَابِیْ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (۷: ۱۵۶) "جواب میں ارشاد ہوا" "سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ۔"

یہ اللہ کی بے قید مشیت کی حکمرانی کا اعلان ہے جس نے اس کائنات کے لئے اپنے اختیار سے ایک قانون وضع کیا ہے اور اسے اپنی مرضی سے جاری کیا ہے اور اس نے اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ وہ اسے عدل و انصاف کے ساتھ چلائے گا ۔ اور سچائی پر وہ چلے گا ۔ کیونکہ عدل اللہ کی صفات میں سے اہم صفت ہے اور اللہ کی مشیت نہایت عدل کے ساتھ جاری رہتی ہے ۔ اس لئے کہ اللہ نے اسی طرح کرنا چاہا ہے ۔ لہٰذا عذاب اسی شخص پر آتا ہے جو اللہ کے نزدیک مستحق عذاب ہو ' یہی اس کی مشیت کا تقاضا ہے ۔ اس کی رحمت نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور رحمت بھی مستحق رحمت کو ملتی ہے ۔ یہ بھی اسی کی مشیت ہے 'کسی کو سزا دینے میں یا کسی پر انعامات کی بارش کرنے میں اللہ کی مشیت یونہی بغیر کسی منصوبے اور اتفاقاً نہیں چلتی ۔ اللہ اس سے بہت برتر ہے ۔

اس اصول کے تعین کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت موسیٰ کو بعض آنے والے واقعات کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں ۔ یہ امت مسلمہ اور آخری امت کے بارے میں ہے جن پر اللہ کی رحمت کی بارش ہوگی ' اس انداز تعبیر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت اس پوری کائنات سے وسیع ہے ۔ انسان اس کی انتہاؤں کو نہیں پا سکتا ۔ اس کی وسعتوں سے اللہ ہی واقف ہے 'کیا ہی عظیم رحمت ہوگی یہ !

فَسَاَکْتُبُہَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ہُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۵۶) اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَہُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُہُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہٰہُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْہِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْہُمْ اِصْرَہُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْہِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷)

"اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے ' زکوۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے ۔"

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر' نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں ۔ جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے ۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے 'بدی سے روکتا ہے ' ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے ۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے ' وہی فلاح پانے والے ہیں ۔"

یہ ایک عظیم خبر تھی' اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ نبی آخر الزمان کے بارے میں بنی اسرائیل کو پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اور یہ اطلاع ان کے بڑے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی دی گئی تھی اور نبی آخر الزمان کے عملاً آنے سے بہت ہی پہلے یہ اطلاع کر دی گئی تھی۔ یہ یقینی خبر تھی کہ آپ مبعوث ہوں گے' آپ کی یہ صفات ہوں گی' آپ کی رسالت اس منہاج پہ ہوگی۔ آپ کی امت کی صفات یہ ہوں گی۔ وہ نبی امی ہوگا۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا۔ وہ تمام پاک چیزوں کو حلال کرے گا اور تمام ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے گا۔ اور بنی اسرائیل پر ان کی معصیتوں کی وجہ سے جو بوجھ ڈال دیئے گئے' انہیں اتار دے گا اور جن پابندیوں میں انہوں نے اپنے آپ کو جکڑ لیا تھا وہ بھی کھول دے گا' بشرطیکہ وہ اس پر ایمان لے آئیں' اس نبی کے متبعین رب سے ڈرنے والے ہوں گے۔ وہ اپنے مالوں سے زکوٰۃ دیں گے اور اللہ کی آیات پر یقین رکھیں گے۔ اور اس نبی پر جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اس کی نہایت درجے کی تعظیم کریں گے' اس کی عزت کریں گے۔ اس کی مدد کریں گے' ہر معاملے میں اس کی تائید کریں گے اور کتاب اللہ کی صورت میں جو نور اس پر نازل ہوگا وہ اس کے تبع ہوں گے اور یہی لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہوں گے۔

بنی اسرائیل کو اس بڑے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے' نہایت ہی قبل از وقت اطلاع دے کر اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو بتا دیا تھا کہ اس کا آئندہ کا دین کیا ہوگا' آئندہ اس کا جھنڈا بلند کرنے والے کون لوگ ہوں گے' اس کے متبعین کون ہوں گے اور اس کی رحمت کن لوگوں پر ہوگی' لہٰذا تمام ادیان سماوی کے متبعین کے پاس اب کوئی عذر نہیں ہے کہ وہ اس یقینی اطلاع پر عمل نہ کریں۔

یہ خبر رب العالمین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے بھیجی ہے' اور ایسے اہم وقت میں اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے ستر منتخب لوگوں کے ساتھ اللہ کی ملاقات کے لئے مقررہ وقت پر گئے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس نبی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کس قدر گھناؤنا جرم تھا اور یہ کہ اگر وہ ایمان لے آتے تو اس میں خود ان کے لئے بہت سی بھلائیاں تھیں اور مومنین کے ساتھ شامل ہو کر وہ فلاح پاتے۔

علم اور دلیل کے باوجود اس جرم کا ارتکاب ہو رہا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل وہ شرمناک لوگ ہیں جنہوں نے ہمیشہ نبی آخر الزمان اور آپ کے لائے ہوئے دین کی مخالفت کی۔ پہلے یہودی یہ دشمنی کرتے رہے اور ان کے بعد صلیبیوں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور یہ نہایت ہی مکارانہ لڑائی ہے جس کا اعلان انہوں نے اس نبی اور اس کے دین کے خلاف کر رکھا ہے۔ وہ مسلسل اس جنگ میں مشغول ہیں اور انہوں نے اسے اپنا وطیرہ بنا رکھا ہے۔

جو شخص صرف ان نصوص کا مطالعہ کرے جو قرآن کریم میں اہل کتاب کے بارے میں اور ان کی اسلام دشمنی کے بارے میں آئے ہوئے ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ سورہ بقرہ' سورہ آل عمران' سورہ نساء اور سورہ مائدہ میں ہوا ہے اسے معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے اس دین کے خلاف کس قدر ہمہ گیر جنگ کی ہے اور کس قدر بے رحمی اور بے جگری کے ساتھ وہ اس دین کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔

اور جو شخص قرآن کے بعد کی تاریخ کو غور سے پڑھے کہ جب مدینہ میں اسلام کے جھنڈے بلند ہوئے' اسلام کی ایک مملکت قائم ہوئی اور تب سے لے کر آج تک جو زمانہ بھی گزرا ہے' اس سے معلوم ہوگا کہ ان لوگوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے اور وہ ہمیشہ اس بات پر مصر رہے ہیں۔

دور جدید کی عالمی صہیونیت اور صلیبیت نے اسلام کے خلاف وہ کارروائیاں کی ہیں جو کبھی وہ پوری اسلامی تاریخ میں نہ کر سکے تھے۔ اس دور میں انہوں نے ایسی سازشیں کی ہیں کہ اس دین کو سرے سے مٹا دیا جائے۔ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اسلام کے خلاف آخری فیصلہ کن معرکہ لڑیں گے۔ اور اس کے لئے وہ تمام وہ تدابیر اختیار کر رہے ہیں جس کا وہ اس سے قبل پوری تاریخ میں تجربہ کر چکے ہیں اور وہ تمام جدید طریقہ ہائے کار بھی اختیار کریں گے جو انہوں نے اب ایجاد کئے ہیں۔

آج بعض سادہ لوح انسان جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' وہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ دنیا کے ملحدین کے خلاف تمام اہل ادیان کو باہم مل کر تعاون کرنا چاہئے' حالانکہ یہ اہل ادیان ہر اس شخص کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہیں جو اپنے آپ کو صرف اسلام کی طرف منسوب کرتا ہے اور اہل اسلام کے خلاف وہ ایسی جنگیں لڑ رہے ہیں جن کے خدوخال صلیبی جنگوں اور اندلس کی تفتیشی عدالتوں جیسے ہیں مثلاً وہ دوسرے ممالک میں استعماری اور نوآبادیاتی نظام قائم کر کے ایسا کریں یا آزاد ممالک کے اندر ایسے حالات پیدا کر کے جن کے ذریعہ اسلامی تصورات کا قلع قمع کرنے کے لئے ہروقت لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہر قسم کے غیبی تصور کے منکر ہیں' سائنس اور تجربے کے سوا کسی چیز کو نہیں مانتے' ترقی کے نام پر اخلاقی بگاڑ پیدا کرتے ہیں' فقہ اسلامی میں تبدیلیوں کے لئے مستشرقین کی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں' ربا کو حلال قرار دیتے ہیں اور اس کے علاوہ تمام محرمات کے سلسلے میں عالم اسلام کو غلط راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک وحشیانہ جنگ ہے جو یہ لوگ اسلام کے خلاف جاری کئے ہوئے ہیں حالانکہ انہیں اسلام اور نبی اسلام کے بارے میں بہت پہلے خوشخبری دی گئی تھی' لیکن انہوں نے اسے ماننے کے بجائے اسلام اور نبی اسلام کے خلاف یہ عناد اور کینہ شروع کر دیا۔

---○○○---

قبل اس کے کہ سیاق کلام اگلے منظر کی نقاب کشائی کرے' یہاں قدرے وقفہ کیا جاتا ہے اور اس وقفے میں روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ جاتا ہے کہ آپ پوری انسانیت کو دعوت دیتے رہیں اور یہ اللہ کا وعدہ قدیم ہے۔

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ٱلَّذِى لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِىِّ ٱلْأُمِّىِّ ٱلَّذِى يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَكَلِمَٰتِهِۦ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۸﴾

اے محمدؐ' ان سے کہو کہ "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے' پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے' اور پیروی اختیار کرو اس کی' امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔"

یہ آخری رسالت ہے' یہ پوری دنیا کے لئے عام ہے' یہ کسی نوع یا کسی نسل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' اس

رسالت سے پہلے جو رسالتیں گزری ہیں وہ مقامی تھیں یا محدود اور ایک محدود زمانے کے لئے تھیں اور زمانہ وہی تھا جو کسی رسول کے بعد دوسرے رسول کے آنے کے درمیان ہوتا ہے۔ ان رسالتوں کے دور میں انسانیت نے ترقی کی طرف چند ہی قدم رکھے تھے' تاکہ انسانیت رفتہ رفتہ ترقی کرتی چلی جائے اور آخری رسالت تک یہ قافلہ پہنچ جائے۔ ہر رسالت میں شریعت کے بعض احکام کے اندر اضافے و ترمیم کا کام ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب آخری رسالت کا دور آیا تو یہ آخری رسالت اپنے اصول اور فروع کے اعتبار سے ایک مکمل رسالت تھی اور یہ ایسی تھی کہ اس کے اصول نئے قوانین کی شکل میں دنیا میں نافذ ہو سکتے تھے اور یہ آخری رسالت ساری دنیا کے لئے آئی۔ اس لئے کہ اس آخری رسالت پر سلسلہ رسل ختم ہو گیا ہے۔ اب اور کوئی رسالت آنے والی نہیں ہے اور یہ بالکل انسانی فطرت کے مطابق ہے جس میں تمام انسان باہم مشترک بھی ہیں۔ اس آخری رسالت کے لئے نبی امی منتخب ہوا تاکہ اس کا پیغام فطری پیغام ہو اور اللہ کی جانب سے جو کچھ آئے وہ پہنچا دے اور اس کا معلم صرف اللہ ہو' اس لئے اس آخری رسالت کے اوپر کسی دنیاوی تعلیم کی چھاپ نہیں ہے' نہ وہ انسانی افکار سے متاثر ہے تاکہ فطری رسالت لوگوں کی فطرت تک پہنچے اور اپیل کرے۔

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷:۱۵۸) اے محمد "ان سے کہو" اے انسانو' میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں۔"

یہ آیت مکی سورہ میں ایک مکی آیت ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ پوری دنیا کے لئے اپنی رسالت کا اعلان کر دیں' یہ ان اہل کتاب اور مستشرقین کا مسکت جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں' اہل مکہ اور قریش سے آگے وسیع علاقے میں اپنی رسالت کے بارے میں نہ سوچتے تھے۔ یہ کہ قریش سے آگے اہل عرب اور پھر اہل عرب سے آگے اہل کتاب تک اپنی دعوت کو وسعت انہوں نے اس وقت دی اور جزیرۃ العرب سے بھی باہر پوری دنیا تک دعوت پھیلانے کا انہوں نے اس وقت سوچا جبکہ کامیاب حالات نے ان کو اس پر آمادہ کیا۔ یہ حقیقت میں ایک عظیم افتراء ہے اور اسلام کے خلاف ان کی ایک قدیم نظریاتی جنگ ہی کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ نظریاتی جنگ وہ ہر وقت جاری رکھے ہوئے ہیں۔

پریشانی کی بات یہ نہیں ہے کہ اہل کتاب اس دین کے خلاف یہ سازشیں کیوں کرتے ہیں اور مستشرقین جو اہل کتاب کے سرخیل ہیں اور اسلام کے خلاف لڑنے والی ایک زبردست قوت ہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں' پریشانی اور عظیم پریشانی کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ ان ملمع سازوں سے اپنا دین سیکھتے ہیں اور بڑے فخر سے ان کی شاگردی اختیار کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو اپنا استاد سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے لکھے ہوئے ان خرافات کے حوالے اپنی کتابوں میں دیتے ہیں۔ وہ اسلامی تاریخ بھی ایسے ملمع کاروں سے لیتے ہیں اور اس قسم کے دھوکہ کھائے ہوئے احمق پھر اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور مہذب بھی کہتے ہیں۔

اب ہم دوبارہ آیت کی تشریح کی طرف آتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دینے کے بعد کہ آپ اعلان کر دیں کہ آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لئے ہے' یہ بتایا جاتا ہے کہ جس رب کی طرف دعوت دی جارہی ہے اس کی پہچان کیا ہے؟

اَلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (۷:۱۵۸) "جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے -"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کے لئے رسول ہیں اور آپ اس رب کے فرستادہ ہیں جو تمام مخلوقات کا رب ہے - اور وہ بھی اسی کائنات کا ایک حصہ ہیں - اللہ وحدہ الٰہ اور حاکم ہے - تمام لوگ اس کے بندے ہیں - اور آپ کی بادشاہت اور قدرت کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ واحد پیدا کرنے والے اور زندہ کرنے والے ہیں -

اللہ تمام کائنات کا مالک ہے' وہ تمام موجودات پر حاکم ہے' وہ موت و حیات کا مالک ہے - لہٰذا وہی اس بات کا مستحق ہے کہ لوگ اس کے دین پر چلیں اور اس کے فرستادے سب کے سب اسی دین کو پھیلانے والے ہیں - اس طرح قرآن کریم لوگوں کو ان کے رب کی شناخت کراتا ہے - تاکہ وہ اپنی زندگی کا نظام اس رسول کی اطاعت پر قائم کریں -

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۷:۱۵۸) "پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے' اور پیروی اختیار کرو اس کی' امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے -"

اس پکار اور دعوت کے اندر نہایت ہی لطیف اشارے ہیں چاہیے کہ ہم ذرا وقفہ کر کے ان پر غور کریں -

☆ اس پکار اور دعوت میں سب سے پہلا امر یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ پر ایمان لاؤ اور یہ ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے کلمہ طیبہ میں منضبط کیا گیا ہے -

☆ اور اس پر ایمان و اقرار کے بغیر اسلام اور ایمان کا تصور بھی ممکن نہیں ہے لیکن یہاں ایمان لانے کی دعوت سے پہلے اللہ کی تعریف کی گئی اور اس کی شناخت دی گئی کہ ایسے اللہ پر ایمان لاؤ - یعنی وہ "جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اس کے سوا کوئی الٰہ و حاکم نہیں ہے' وہ زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے -" لہٰذا یہاں جس خدا پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے اس کی صفات پہلے بیان کر دی گئی ہیں - اسی طرح جس رسول پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے کہ سب لوگ اس کو مانیں اور اطاعت کریں اس کی صفات بھی پہلے بیان کر دی گئیں -

☆ دوسری بات یہ کہ نبی امی بھی اللہ پر اور اللہ کے کلام پر ایمان لاتے ہیں - یہ بات واضح ہے لیکن اس کے اندر یہ اہم حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی بھی دعوت سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ داعی کا خود اس پر یقین ہو' اس کے دین میں دعوت کا مفہوم واضح ہو' اسے اس پر پورا یقین ہو' یہی وجہ ہے کہ جس رسول کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے وہ "اللہ پر بھی ایمان لاتا ہے اور اس کے کلمات پر بھی -" اور اسی کی طرف وہ لوگوں کو بھی دعوت دیتا ہے -

☆ پھر یہاں ایمان کے تقاضے بھی دیئے گئے ہیں' کہ سب لوگ رسول کی اطاعت بھی کریں اور اس کی لائی ہوئی شریعت کو بھی اپنے ہاں جاری کریں - اس کی سنت کو مشعل راہ بنائیں - اور اس بات کی نشاندہی یوں کی گئی ہے "لہٰذا اس کی پیروی اختیار کرو' اس کی امید ہے کہ شاید تم راہ راست پالو گے -" اس سے معلوم ہوا کہ اگر لوگ رسول کی اطاعت نہیں کرتے تو ان کی فلاح کی کوئی امید نہیں ہے - یہ بات کافی نہیں ہے کہ لوگ دلوں میں ایمان

لے آئیں اور پھر رسول کا اتباع نہ کریں۔عملی اتباع ہی دراصل اسلام ہے۔

دین اسلام اپنے مزاج اور اپنی ماہیت کی وضاحت ہر موقع و محل میں کرتا ہے۔اس طرح کہ اسلام مجرد عقیدہ و نظریہ نہیں ہے' نہ اسلام صرف مراسم عبودیت کا نام ہے۔اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل اتباع کا نام ہے' تمام ہدایات جو رسول پہ اترے' تمام شرعی قوانین جو رسول نے وضع کیے ان کا اتباع ضروری ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ حکم نہیں دیا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو' اور نہ صرف یہ حکم دیا ہے کہ اس طرح مراسم عبودیت بجا لاؤ بلکہ اسلام نے ایک مکمل قانون اور نظام دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب تک تم پورے نظام شریعت اور اسلامی قانون اور نظام کو اپنی عملی زندگی میں واضح نہ کرو گے اس وقت تک تمہاری فلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔

یہ ہے دین اسلام اور اس دین کی کوئی اور تصویر قابل قبول نہیں ہے' صرف اس کی یہی شکل قابل قبول ہے جس میں کہا گیا (واتبعوہ) اس کی اطاعت کرو' شاید کہ تم فلاح پاؤ۔اگر صرف اعتقادی تصور ہی مطلوب ہوتا تو اللہ صرف یہ بات کہنے پر اکتفا کرتے۔فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِه (۷:۱۵۸)

---ooo---

شدید زلزلے کے بعد کیا واقعات پیش آئے جس میں بنی اسرائیل کے ستر لیڈر ہلاک کر دیئے گئے؟ یہاں صرف یہ بات آئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی اس اچانک موت پر اللہ کے ہاں نہایت ہی عاجزی سے دعا کی' یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں کا کیا بنا لیکن دوسری سورتوں میں یہ قصہ جس طرح لایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعاء کی وجہ سے اللہ نے انہیں زندہ کر دیا اور یہ لوگ پکے مومن کی طرح اپنی قوم کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ لوٹے۔

لیکن قصے کی اگلی کڑیاں لانے سے قبل یہاں اس حقیقت کو بیان کر دیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی قوم میں سے کچھ لوگ اچھے بھی تھے' وہ حق کو قبول کرتے تھے۔

وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ﴿۱۵۹﴾

"موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا۔"

حضرت موسیٰ کے دور مین ان میں اچھے لوگ بھی تھے۔ان میں سے ایک طبقہ ایسا تھا جو حق بات کرتا تھا اور انصاف سے کام لیتا تھا۔اور خود حضور کے دور میں بھی ان میں سے بعض حق پرستوں نے اسلام کو قبول کیا۔خصوصاً ان لوگوں نے جو اپنے ہاں موجود تورات میں نبی امی کے بارے میں لکھا ہوا پاتے تھے۔ان کے سرخیل آپ کے صحابی حضرت عبداللہ ابن سلام تھے اور یہ اس وقت کے یہودیوں کا مقابلہ ان پیشن گوئیوں سے کرتے تھے جو نبی آخر الزمان کے بارے میں تورات میں موجود تھیں۔نیز ان کے ہاں جو شریعت کے نصوص تھے وہ بھی اسلامی نظام قانون کے ساتھ ہم رنگ تھے۔

اب اس اہم ضمنی بات کے بعد اصل قصے کا مضمون یوں آگے بڑھتا ہے۔

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ
اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا
عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا
وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

"اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی۔ اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا۔ "کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔" مگر اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ آپ اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔"

یہ اللہ کی خاص مہربانی تھی جس کا سایہ حضرت موسیٰ پر قائم و دائم رہا۔ انہوں نے بچھڑے کی عبادت کر کے کفر کیا اور اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر کے غلطی معاف کروائی۔ انہوں نے اللہ کو دیکھنے کا مطالبہ کیا اور زلزلے کی وجہ سے ان کی جان نکل گئی۔ اور حضرت موسیٰ کی آہ و زاری کے بعد دوبارہ ان کو زندگی ملی۔ اسی طرح ان کو ۱۲ گروہوں میں ان کی شاخوں کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا۔ ان کے ۱۲ گروہ تھے اور ہر گروہ حضرت یعقوب کے پوتوں میں سے کسی ایک کی شاخ تھا۔ ان لوگوں نے قبائل کی طرح اپنے سلسلہ انساب کو اچھی طرح محفوظ کر رکھا تھا۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا "اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ان بارہ فرقوں میں محض انتظامی اعتبار سے پانی کی تقسیم کے لئے بانٹا گیا تاکہ وہ ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہ کریں۔

وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰی اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْبَجَسَتْ

مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ (۷: ۱٦۰) "اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور

ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔"

ان پر بادلوں کا سایہ اس لئے کیا گیا کہ صحرا کے اندر بے پناہ تپش تھی۔ من ایک قسم کا بری شہد ہے اور سلویٰ ایک چڑیہ پرندہ ہوتا ہے۔ اس طرح پانی فراہم کرنے کے بعد ان کے لئے زندگی کی تمام ضروریات فراہم ہوگئیں۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۷: ۱۶۰) "ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا۔۔۔ "کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔" مگر اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا، بلکہ آپ اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔"

یہاں ان کو حکم دیا گیا کہ تمام طیبات کو کھاؤ، معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان پر، ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے بعض طیبات کو حرام نہ کیا گیا تھا۔

ان کے ساتھ یہ تمام مراعات بالکل واضح ہیں لیکن یہ لوگ بہرحال بدفطرت تھے اور ہر وقت معصیت اور نافرمانی کے لئے تیار رہتے تھے۔ اور اس آیت کے آخری حصے وَمَا ظَلَمُوْنَا (۷: ۱۶۰) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام انعامات و اکرامات، ان کے لئے معجزانہ انداز میں چشمے نکالنے اور حضرت موسیٰ کے عصا مارنے کے نتیجے میں ۱۲ چشمے ابل پڑنے، اور تپتے ہوئے صحرا میں ان پر بادلوں کے سائے اور پھر صحرا میں ان کے لئے اس قدر قابل فخر غذا فراہم کرنے کے باوجود انہوں نے "آپ اپنے اوپر ظلم کیا" یعنی وہ کفر و ظلم کر کے خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے اور خود اپنے آپ کو سزا و عذاب کا مستحق ٹھہرا رہے تھے۔

عنقریب سیاق کلام میں ان کے ظلم کے کچھ نمونے آئیں گے۔ مثلاً اللہ کے احکام کی نافرمانی کرنا، ان سے پہلوتہی کرنا، یہ سب کام وہ اپنے خلاف کرتے تھے، اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے، اللہ تو غنی بادشاہ ہے۔ اگر تمام مخلوقات اس کی نافرمانی کرے تو اس کی بادشاہت میں کچھ کمی نہیں آتی۔ اور اگر تمام مخلوقات مطیع فرمان ہو جائے تو اللہ کی بادشاہت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ معصیتوں کا ارتکاب کر کے دراصل وہ اپنا ہی گھاٹا کرتے ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

---○○○---

اب ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ بنی اسرائیل اللہ کے انعامات و اکرامات کے جواب میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور ان کے کج رو قدم کس طرح کی روش اختیار کرتے ہیں۔

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ

۳۰

السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾ ع۵

۱۰

”یاد کرو وہ وقت جب ان سے کہا گیا کہ ”اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور حِطَّةٌ حِطَّةٌ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو‘ ہم تمہاری خطائیں معاف کریں گے اور نیک رویہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔“ مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی‘ بدل ڈالا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا۔

انہوں نے بچھڑے کی عبادت کی اور اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ انہوں نے اللہ کو دیکھنا چاہا اور زلزلے سے جان ہی چلی گئی۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کر کے دوبارہ زندہ کیا۔ اللہ نے ان پر بہت بڑے انعامات کئے۔ لیکن دیکھئے ان کی کج رو طبیعت صراط مستقیم کی راہ پر جانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بغیر جواز کے انہوں نے نافرمانی شروع کر دی۔ بات کو بدلنے کی جسارت کی۔ انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اس شہر میں داخل ہو جاؤ‘ یہ شہر تمہارا ہے‘ یہ کون سا شہر تھا‘ اس کا یہاں نام نہیں لیا گیا‘ کیونکہ سیاق کلام میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شرط صرف یہ عائد کی گئی کہ اس شہر میں داخل ہوتے وقت ایک مخصوص دعا مخصوص کلمات کی صورت میں پڑھتے جاؤ‘ اور اس شہر میں داخل ہوتے وقت سجدہ ریز ہوتے جاؤ اور تمہیں جو فتح و نصرت عطا ہوئی اس پر شکر ادا کرو‘ بعینہ اسی طرح جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تھے اور آپ اپنی سواری کے اوپر سجدہ ریز تھے۔ ان لوگوں سے اللہ وعدہ کر رہے تھے کہ اگر تم اس حالت میں اس شہر میں داخل ہو گے تو اللہ تمہاری تمام غلطیاں معاف کر دے گا اور اگر تم میں سے کوئی مزید نیکی کا راستہ اختیار کرے گا تو اللہ مزید بارش کرے گا اپنے انعامات کی۔ لیکن ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں بعض نے گستاخانہ انداز میں دعا کے الفاظ ہی بدل دیئے اور بعض نے داخلے کے لئے مقرر شکل بدل دی۔ انہوں نے یہ نافرمانی کیوں کی؟ الفاظ بدلنے یا سجدہ ریز نہ ہونے سے انہیں کیا فائدہ مل رہا تھا؟ محض سرکشی اور کج مزاجی کی تسکین!

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ (۷: ۱۶۲) ”مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی‘ بدل ڈالا۔

لہٰذا اب ان پر عالم بالا کی طرف سے عذاب آتا ہے‘ وہ اللہ جو ان پر من و سلویٰ اتار رہا تھا‘ اور ان پر اس کے بھیجے ہوئے بادل سایہ فگن تھے‘ اب ان پر عذاب نازل فرما رہا ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۷: ۱۶۲) ”اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا۔“

اس طرح ان میں جنہوں نے ظلم کیا یعنی کفر کیا انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا‘ کیونکہ وہ عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہرے۔ اس بار قرآن مجید نے اس عذاب کی تصریح نہیں کی جو انہیں دیا گیا۔ کیونکہ عذاب کے تعین کے بغیر ہی اس قصے کی غرض و غایت پوری ہو جاتی ہے۔ قصے سے اصل غرض و غایت یہ بتانا ہے کہ اللہ کی معصیت کرنے والے عذاب کے مستحق ہوتے ہیں اور اللہ کا ڈراوا حقیقت بن جاتا ہے اور کوئی نافرمان اللہ کے انصاف سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

اب پھر بنی اسرائیل معصیت اور سرکشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس بار وہ کھلے بندوں احکام الٰہی کی خلاف ورزی نہیں کر رہے بلکہ تاویل سے کام لے رہے اور احکام سے گلو خلاصی کر رہے ہیں۔جب ان کو آزمایا جاتا ہے تو صبر نہیں کرتے کیونکہ ابتلاء اور مشکلات پر وہ لوگ صبر کرتے ہیں جن کی طبیعت سنجیدہ ہو اور جو ذاتی خواہشات اور ہر قسم کی لالچ کے مقابلے میں ضبط رکھتے ہوں۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ
فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ
لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ
مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ
قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا
بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ
بَـِٔيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ
كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَ
اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

”اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ ”تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے۔“ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ”ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔“ آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے' اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا'

تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ' ذلیل اور خوار۔

اور یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ "وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔" یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے اور یقیناً وہ درگزر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔"

یہاں قرآن نے بنی اسرائیل کے احوال ماضی کے بیان کو چھوڑ کر' اب ان بنی اسرائیل کے بارے میں بیان شروع کیا ہے' جو سابقہ بنی اسرائیل کی اولاد تھے اور حضور ؐ کے دور میں موجود تھے۔ یہ لوگ مدینہ میں بھی تھے۔ یہ آیات ت آیت وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (۷: ۱۷۱) تک مدنی آیات ہیں۔ یہ مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ مکالمے کے طور پر نازل ہوئیں اور انہیں مضمون کے اعتبار سے اس مکی سورت میں رکھ دیا گیا تاکہ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا مضمون مکمل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ان سے اس واقعہ کے بارے میں دریافت کریں جو ان کے ہاں بہت ہی مشہور و معروف ہے اور ان کی تاریخ میں درج ہے۔ قرآن کریم اگلے اور پچھلے بنی اسرائیل کو ایک ہی امت سمجھتا ہے۔ ان کو وہ جرائم بھی یاد دلاتا ہے جو مختلف ادوار میں ان سے سرزد ہوئے اور اس کے بدلے میں اللہ نے انہیں بندر بنا دیا اور ان پر مسخ جیسا عذاب نازل ہوا۔ ان پر ذلت اور اللہ کا غضب مسلط ہو گئے۔ ہاں ان سب عذابوں سے وہ لوگ بہرحال محفوظ رہے ہوں گے جنہوں نے نبی آخر الزمان کی مطابقت اختیار کی اور اس کی وجہ سے ان کے کاندھوں سے بوجھ اتر گئے اور جو بیڑیاں انہیں لگی ہوئی تھیں' وہ کھل گئیں۔

سمندر کے کنارے والی بستی کون سی تھی۔ قرآن نے اس کا نام نہیں لیا کیونکہ نام لینے کی ضرورت ہی نہ تھی اور گاؤں کا نام مخاطبین کے ذہنوں میں تھا۔ اس واقعہ کے کردار بنی اسرائیل کے سرکردہ لوگ تھے اور یہ کسی ساحلی شہر میں آباد تھے۔ بنی اسرائیل نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہفتے میں ان کے لئے ایک چھٹی کا دن مقرر کیا جائے جو آرام اور عبادت کا دن ہو۔ اور اس میں ان کے لئے معاشی سرگرمیاں منع ہوں۔ ہفتے کا دن ان کے لئے ایسا دن مقرر کیا گیا۔ اب اللہ نے اس دن کے بارے میں انہیں آزمائش میں ڈال کر یہ سمجھانا چاہا کہ وہ زندگی کی دلکشیوں اور لالچوں سے کس طرح چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے لئے یہ ضروری بھی تھا اس لئے کہ وہ ایک طویل عرصے تک غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے اور غلاموں کے ضمیر بدل جاتے ہیں اور ان کے اندر اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ذلت اور غلامی سے بدنی نجات کے بعد یہ ضروری ہے کہ انسان ذہناً اور اخلاقاً بھی غلامی سے نجات پا جائے تاکہ وہ صحیح اور صالح زندگی بسر کر سکے۔ خصوصاً وہ لوگ جو داعی کے مقام پر فائز ہوں۔ ان کے لئے تو ایسی اخلاقی تربیت فرض عین ہے۔ پھر خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کے ذمے خلافت فی الارض کی ذمہ داری بھی ہے اور وہ مناصب حکمرانی پر فائز ہوں۔ ارادے کی پختگی اور نفس پر ضبط کے معاملے میں پہلی آزمائش آدم و حوا کی ہوئی اور ان سے لغزش ہو گئی اور انہوں نے شیطان کے ورغلانے کی وجہ سے شجرۂ خلد کو چکھ لیا اور یہ لالچ کیا کہ ان کی حکمرانی دائمی ہو جائے اور ان کے بعد بھی ہر وہ جماعت جسے اللہ نے منصب خلافت فی الارض عطا کیا اسے آزمایا گیا۔ مختلف اقوام کو مختلف انداز اور مختلف حالات میں ضرور آزمایا گیا۔

لیکن اس آزمائش میں بنی اسرائیل پورے نہ اترے۔ اس لئے کہ وہ اس سے قبل بار بار وعدہ خلافی کر چکے تھے اور بار بار انہوں نے سرکشی اختیار کی تھی۔ آزمائش یوں ہوئی کہ ہفتے کے روز مچھلیاں ساحل کے قریب آ جاتیں' ان کا

شکار سہل ہو جاتا' لیکن وہ یہ مچھلیاں اس لئے نہ پکڑ سکتے تھے کہ ہفتے کو شکار کرنا حرام تھا۔ اور اس حرمت میں خود ان کی خواہش شامل تھی۔ جب ہفتہ نہ ہوتا اور وہ شکار کے لئے نکلتے تو مچھلیاں قریب نہ ہوتیں جیسا کہ ہفتے کو وہ دیکھا کرتے تھے۔ یہ وہ بات تھی جسے حضور اکرم ﷺ کے ذریعے اللہ انہیں یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ذرا یاد کریں کہ انہوں نے اس حرمت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَأْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَأْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۷: ۱۶۳) "اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔"

سوال یہ ہے کہ مچھلیوں کا یہ واقعہ کیسے پیش آگیا' تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ خارق عادت اور ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ مچھلیاں ساحل کے قریب بڑی تعداد میں دوڑتی پھرتیں اور اگر کوئی پکڑتا تو بسہولت پکڑ سکتا۔ آج کل بعض لوگ خود اللہ کے جاری کئے ہوئے قوانین کو کونیہ کو قوانین طبعیہ کا نام دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی بات نہیں ہو سکتی تو یہ ان کا مجرد دعویٰ ہے۔ اسلامی تصور حیات کے مطابق بات ایسی نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ نے خود اس کائنات کو بنایا ہے اور اس کے اندر جو طبعی قوانین جاری کئے ہیں وہ اس نے یہاں ودیعت کئے ہیں۔ یہ اللہ کی مشیت ہے۔ اللہ کی یہ مشیت خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کی پابند نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف نہ جا سکتی ہو۔ ان قوانین کے بعد بھی مشیت الٰہیہ آزاد ہے۔ جن لوگوں کو اللہ نے حقیقی علم دیا ہے وہ اس نکتے سے غافل نہیں ہوتے۔ اگر اللہ کی حکمت اور مشیت کا تقاضا یہ تھا کہ انسانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ یہ قوانین فطرت درست طور پر کام کرتے رہیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ کی مشیت ان قوانین کے ہاتھ میں قید ہو گئی۔ جس وقت بھی اللہ کی مشیت یہ چاہے کہ کوئی واقعہ ان قوانین کے خلاف وقوع پذیر ہو جائے تو ایسا ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ان قوانین کے مطابق جو جزئی واقعہ بھی ہوتا ہے۔ (اگر کوئی پتا بھی گرتا ہے) تو وہ اللہ کے نظام تقدیر کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ یوں نہیں ہے کہ یہ اسباب و مسببات اب مشیت الٰہیہ سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں نظام قوانین طبعی بھی مشیت کا پابند ہے لہٰذا جو جزئی واقعہ قوانین طبعیہ کے مطابق ہوتا ہے یا خلاف یہ اللہ کے علم و قدر کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا مطابق عادت واقعہ اور خارق عادت واقعہ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اس نظام کائنات میں خود کاری نہیں ہے جیسا کہ بعض سطح میں لوگوں کو نظر آتا ہے۔ بعض فلاسفہ نے اب اس بات کو سمجھنا شروع کر دیا ہے (دیکھئے فی ظلال القرآن ج ۷' ص ۵۲۰/ ۶۲۲)

بہرحال بنی اسرائیل کی ایک ساحلی آبادی پر یہ واقعہ پیش آیا۔ چنانچہ اس آزمائش میں بعض لوگ گر جاتے ہیں۔ ان کے عزائم شکست کھا جاتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے ساتھ کئے ہوئے اپنے پختہ عہد کو بھول جاتے ہیں' یہ حیلہ سازی

شروع کر دیتے ہیں اور حیلے بہانے یہودیوں کا پرانا طریقہ ہے ۔ جب دلوں میں کجی آ جائے اور خدا خوفی ختم ہو جائے تو انسان حیلے بہانے ہی تلاش کرتا ہے ۔ پھر لوگ نصوص کی عبارات کے ساتھ کھیلتے ہیں اور مقصد اور معانی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی قانون کی حفاظت اس کے دفعات و عبارات کے ذریعے ممکن نہیں ہے ۔ قانون اور ضابطے کی پابندی دلوں کے ساتھ ہوتی ہے اور دل تب قانون کی پابندی کرتے جب ان کے اندر تقویٰ اور خشیت ہو ۔ ایک متقی اور خدا سے ڈرنے والا دل ہی قانون کی حفاظت کر سکتا ہے ۔ اور جب کوئی قوم دل و جان سے کسی قانون کی حفاظت کرنا چاہے تو اس کے بارے میں لوگ حیلے بہانے نہیں کر سکتے ۔ لیکن اگر کسی قانون کی حفاظت صرف حکومتی ذرائع سے مغلوب ہو' محض خوف سزا سے پابندی کرائی جائے تو اس طرح کبھی نہیں ہو سکتا ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حکومت ہر فرد پر ایک نگران مقرر کر دے ۔ اور وہ نگران تنہائی اور مجمع دونوں میں پوری پوری نگرانی کر سکتا ہو ۔

یہی وجہ ہے کہ وہ تمام قانونی اسکیمیں فیل ہو جاتی ہیں جن کی قوت نافذہ لوگوں کا دلی تقویٰ اور دلی میلان نہ ہو اور اسی طرح وہ تمام نظامہائے زندگی ناکام رہتے ہیں جو بعض انسانوں نے دوسرے انسانوں کے لئے بنائے ہیں اور جس میں قوت نافذہ خوف خدا پر مبنی نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام ادارے ناکام ہو جاتے ہیں جن کے ذمے قوانین کا نفاذ ہوتا ہے ۔ پھر ان اداروں پر نگران ادارے بھی ناکام ہو جاتے ہیں (کرپشن میں ترقی ہوتی ہے اور انٹی کرپشن ادارہ کرپٹ ہوتا ہے) اور ان کا کام اول سے آخر تک سطحی ہو جاتا ہے ۔

چنانچہ اس گاؤں کے باسیوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کے سلسلے میں حیلہ سازیاں شروع کر دیں ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہفتے کے دن مچھلیوں کو گھیرنے کے لئے بند باندھ دیتے اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو یہ لوگ جلدی سے آکر مچھلیاں پکڑ لیتے ۔ اب دل کو تسلی یوں دیتے کہ انہوں نے ہفتے کے دن بہرحال مچھلیوں کو ہاتھ نہیں لگایا ۔ مچھلیاں بہرحال بندوں کے اندر پانی میں ہوتیں ۔ اور ان میں سے اچھے لوگوں کا ایک گروہ سامنے آیا ۔ اس نے ان لوگوں پر تنقید کی جو یہ حیلہ سازی کرتے تھے ' یہ لوگ انہیں تلقین کرتے تھے ' خدا سے ڈرو اور ایسا نہ کرو ' اور ایک تیسرا گروہ ایسے نیک لوگوں کا بھی سامنے آگیا جو کہتا کہ یہ تنقید کرنے والے لوگ بے فائدہ کام کر رہے ہیں کیونکہ یہ لوگ جس کام میں پڑ گئے ہیں ان کے لئے نصیحت و تنقید سے کوئی فائدہ نہ ہو گا ۔ اللہ نے ان کو سزا دینا اور ہلاک کرنا لکھ دیا ہے ۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ

قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۷ : ۱۶۴) "اور انہیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ "تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے ۔" تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ "ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لئے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں ۔"

ان لوگوں کے خیال کے مطابق ان حیلہ سازوں کو وعظ و نصیحت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ اور نہ اس کا فائدہ ہے ۔ کیونکہ اللہ نے ان کے لئے ہلاکت و بربادی کا فیصلہ کر لیا ہے اس لئے کہ انہوں نے احکام الہیٰ کو مذاق بنایا ہے ۔

لیکن منع کرنے والے گروہ نے جواب دیا کہ یہ ان پر ایک فریضہ ہے ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور لوگوں کو

انجام بد سے ڈرانا پیغمبروں کا فریضہ ہے اور اگر ہم نہ ادا کریں تو ہم قیامت میں معقول عذر پیش نہ کر سکیں گے۔ایک تو یہ ہو گا کہ اللہ کے ہاں ہم سرخرو ہوں گے۔دوسرے یہ امکان بھی ہے کہ شاید یہ لوگ راہ راست پر آ جائیں اور ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو جائے۔

یوں اس ساحلی بستی کے لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے یا تین جماعتیں بن گئیں۔اسلامی تصورات کے مطابق امت ”لوگوں کا وہ مجموعہ ہے جو ایک نظریہ رکھتا ہو' جس کی سوچ ایک جیسی ہو' جس کی قیادت ایک ہو۔“ امت سے مراد وہ قدیم جاہلی دور کی امت نہیں ہے اور نہ جدید جاہلی تصورات کے مطابق امت ہے' جاہلی تصورات کے مطابق امت ”لوگوں کا وہ مجموعہ ہے' جو کسی ایک علاقے میں رہتا ہو' اور اس پر ایک حکومت ہو۔“ یہ مفہوم امت کا اسلامی مفہوم نہیں ہے۔یہ قدیم یا جدید جاہلیت کی اصطلاح ہے۔

امت کا لفظ عربی لغت میں محض آبادی یا لوگوں کے ایک گروہ کے لئے بھی آتا ہے۔مثلاً (وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ) ”جب وہ مدین کے پانی کے پاس آئے تو انہوں نے لوگوں کے ایک گروہ کو پانی پلاتے ہوئے پایا۔“ اور امت بمعنی قیادت اور امامت کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔(اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک علیحدہ امت تھے یعنی قائد تھے۔لیکن یہ لغوی مفہوم اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کے متضاد نہیں ہیں ”یعنی لوگوں کا وہ مجموعہ جس کا عقیدہ ایک ہو اور تصور ایک ہو۔“

غرض اس گاؤں کے لوگ تین جماعتوں میں بٹ گئے' ایک جماعت سرکشی اختیار کرنے والی' دوسری جماعت اس کا راہ روکنے والی جو اصلاح اور نصیحت کا فریضہ انجام دے رہی تھی' تیسری جماعت غیر جانبدار تھی' وہ نہ تو سرکشوں کا ساتھ دیتی تھی اور نہ ہی امر بالمعروف کرنے والوں کا ساتھ دیتی تھی۔خیالات و سرگرمیوں کے ان تین طریقوں کو یہاں تین امتوں سے تعبیر کیا گیا۔

جب نصیحت اور وعظ سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا اور گمراہی کی راہ پر چلنے والے چلتے ہی رہے تو ان پر اللہ کا عذاب آنا ہی ٹھہرا۔اور اللہ نے جو ڈراوا ان تک پہنچایا تھا اس کا وقت آ پہنچا۔صرف وہ لوگ نجات پانے والوں میں شامل رہے جو يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْءِ (۷: ۱۶۵) برائیوں سے روکنے والے تھے۔اور جو سرکش تھے ان کو عذاب نے آ لیا۔تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔رہی وہ تیسری جماعت جو غیر جانبدار تھی اس کے بارے میں قرآن نے کچھ نہیں کہا۔شاید ان غیر جانبداروں کو اس لئے یہاں نسیاً منسیاً کر دیا کہ ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور یہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کا یہاں ذکر کیا جائے۔اس لئے کہ انہوں نے مثبت رویہ اختیار نہ کیا۔محض منفی انکار کا کمزور موقف اختیار کیا۔لہذا اللہ نے بھی ان کا تذکرہ نہ کیا۔اگرچہ وہ سزا سے بچ گئے ہوں۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۱۶۵) فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ (۱۶۶) ”آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی

گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو برائی سے روکتے تھے' اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کئے چلے گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا' تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلیل اور خوار۔"

ان لوگوں کو یہ سخت سزا اس لئے دی گئی تھی کہ یہ لوگ معصیت اور نافرمانی میں ڈوب گئے تھے اور قرآن نے اسے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ کبھی اسے ظلم کہا گیا' کبھی فسق کہا گیا اور قرآن کریم میں بارہا یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ کفر اور شرک کو ظلم اور فسق سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ انداز تعبیر اس فقہی اور قانونی انداز تعبیر سے مختلف ہے جو ازمنہ مابعد میں اختیار کیا گیا۔ لہٰذا قرآنی انداز تعبیر اس فقہی اصطلاح کا پابند نہیں ہے کیونکہ اصطلاحات کا تعین بعد میں ہوا اور یہ شدید عذاب کیا تھا؟ یہ کہ آدمیوں کی شکل کو بندروں کی شکل میں بدل دیا گیا' کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو مرتبہ انسانیت سے گرا دیا تھا' اس لئے کہ انسانیت کی مخصوص ترین خصوصیت یعنی قوت ارادی کا انسانی خواہشات پر غالب رہنا انہوں نے ترک کر دیا تھا اور وہ حیوانات کی طرح خواہشات کے پابند ہوگئے تھے' لہٰذا ان سے کہا گیا کہ اچھا تو پھر حیوان ہی بن جاؤ' کیونکہ یہی وہ مقام ہے جو تم نے اپنے لئے پسند کیا ہے۔ یہ کہ وہ کس طرح بندر بن گئے' ان کی شکل کس طرح بدل گئی۔ کیا وہ بذات خود بدل کر بندر بن گئے یا ان سے بندر پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ اس سلسلے میں تفاسیر میں متعدد روایات ہیں اور اس نکتے کے بارے میں قرآن خاموش ہے' اور اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کوئی روایت منقول نہیں ہے۔ لہٰذا ہم اس معاملے میں زیادہ گہرائی میں نہیں جاتے۔

انسان کی تخلیق بھی لفظ (کن) سے ہوئی تھی اور اس کی خلق میں تبدیلی بھی لفظ كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (۷: ۱۶۶) سے ہوئی یعنی "ذلیل و خوار بندر بن جاؤ" چنانچہ وہ ذلیل و خوار بندر بن گئے کیونکہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کوئی حکم نہیں۔ اور نہ اسے کوئی رد کر سکتا ہے۔

اس سزا کے بعد' سب پر اللہ تعالیٰ نے ابدی لعنت کا حکم فرمایا اور صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جو نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں گے' اس لئے کہ وہ ایک عرصے تک یہی نافرمانیاں کرتے رہے اور اب ان کا زمانہ معصیت ختم ہو گیا اور مشیت الٰہیہ نے ان کے حق میں یہ دائمی حکم صادر کر دیا جو اٹل ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷: ۱۶۷) "اور یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ "وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔" یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے اور یقیناً وہ درگذر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔"

یہ ایک دائمی اعلان (Standing Order) ہے اور جب سے یہ صادر ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ وقفے وقفے سے یہودیوں کی سرکوبی کے لئے کسی نہ کسی طاقت کو بھیجتا رہا ہے۔ اور عمومی اعتبار سے یہ حکم آئندہ بھی روبعمل ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان پر ایسی قوتوں کو مسلط کرتے رہیں گے۔ اور یہ قوتیں ان کو ایسا ہی عذاب دیتی رہیں گی۔ جب بھی وہ پھلیں پھولیں گے اور سرکشی کا رویہ اختیار کریں گے۔ اللہ ان پر ایسی ہی قوتوں کو بھیجتے رہیں گے۔ اور وہ ان پر

اچھی ضرب لگاتے رہیں گے کیونکہ یہ ایک ایسا باغی اور سرکش گروہ ہے کہ جب یہ ایک نافرمانی سے نکلتا ہے تو دوسری میں داخل ہو جاتا ہے' ان کی ایک ٹیڑھ کو اگر درست کر دیا جائے تو ان کے اندر دوسری ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات اس طرح نظر آتا ہے کہ ان پر یہ مسلسل لعنت شاید ختم ہو گئی ہے اور شاید یہودی اب باعزت اور صاحب قوت ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخ کے وقفوں میں سے بعض وقفے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر کس کو مسلط کرتا ہے اور سابقہ ادوار ذلت کے بعد ان پر کون سی قوم مسلط ہوتی ہے۔

اللہ نے تو ان کے لئے یہ آرڈر قیامت تک کے لئے نافذ کر دیا ہے اور قرآن میں اپنے نبی کو اور اس کی امت کو اس کی اطلاع بھی کر دی ہے لیکن اس دائمی فیصلے کے باوجود اللہ کی صفت رحمت اور عفو و درگذر اپنی جگہ قائم ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷: ۱۶۷) اپنی صفت سرعت عذاب کی وجہ سے وہ ان لوگوں کو پکڑ لیتا ہے جن پر نزول عذاب برحق ہو چکا ہے۔ جیسا کہ ساحلی بستی والوں کو اس نے پکڑا۔ اور اپنی صفت رحمت و مغفرت کی وجہ سے وہ ہر اس شخص کو معاف کرتا ہے جو تائب ہو گیا مثلاً بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ جو نبی آخر الزمان کو تسلیم کرتے ہوئے ایمان لائے کیونکہ ان کے ہاں تورات میں نبی آخر الزمان کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی سے انتقام نہیں لیا جاتا اور نہ اس دربار میں کسی کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ وہاں تو سب کے ساتھ انصاف ہوتا ہے' بلکہ وہاں تو معافی اور رحمت کے لئے بہانہ درکار ہے۔

---()()()---

اس کے بعد یہ قصہ تاریخی خطوط پر آگے بڑھتا ہے۔ حضرت موسیٰ' آپ کے خلفاء انبیاء اور آپ کے بعد نسلاً بعد نسل آنے والے لوگوں سے آگے بڑھ کر اب اس نسل سے بات ہو رہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہے اور جماعت مسلمہ اور اس کے درمیان مقابلہ ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

”ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھے اور برے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا' اور اگر وہی متاع دنیا سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے' کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے ہو؟ جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم کر رکھی ہے' یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔“

یہ آیات بھی مدنی ہیں اور ان کو یہاں اس لئے رکھا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے قصے کو مکمل کر دیا جائے۔ یہ اس وقت کے حالات ہیں جب یہودی اس کرۂ ارض پر دور تک پھیل گئے تھے۔ ان کی مختلف جماعتیں بن گئی تھیں اور انہوں نے مختلف مذاہب اور عقائد اپنا لئے تھے۔ ان کے مسلک اور مشرب مختلف ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ نیک تھے اور کچھ عام لوگ تھے' کہیں ان کی آزمائشیں ہوتی رہیں' کبھی خوشحال بن کر انہیں آزمایا جاتا اور کبھی بدحال بنا کر' تاکہ وہ راہ راست کی طرف لوٹ آئیں اور راہ ہدایت پالیں اور سیدھے راستے پر چلیں۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۱۶۸:۷) ”ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھے اور برے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔“

اللہ کی طرف سے آزمائش بھی ایک قسم کی رحمت ہوتی ہے اور ان آزمائشوں کی وجہ سے انسان مسلسل اللہ کو یاد کرتا رہتا ہے اور انسان غافل نہیں رہتا' کیونکہ غافل لوگ ہلاکت میں جا پڑتے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ (۱۶۹:۷) ”پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا' اور اگر وہی متاع دنیا سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔“

بعد میں آنے والوں کی صفات یہاں یہ دی گئی ہیں کہ یہ لوگ کتاب کے وارث تھے' اسے پڑھتے تھے' لیکن وہ اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق نہ ڈھالتے تھے' اور ان کے دل اور ان کا طرز عمل اس کتاب سے متاثر نہ ہوتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ ان کا ایمان ان کی ثقافت بن گیا تھا۔ ایک علم تھا جسے وہ پڑھتے تھے لیکن جب وہ مقاصد دنیاوی میں سے کوئی بھی مقصد دیکھتے تو اس کی طرف لپکتے چاہے جائز ہوتا یا ناجائز اور خوش فہمی یہ رکھتے تھے کہ

امید ہے کہ اللہ ہمیں معاف کر دے گا۔لیکن عفو کی امیدواری کے بعد پھر اگر کوئی دنیاوی اغراض ان کے سامنے آئیں تو پھر ان کی طرف لپکتے۔

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ

(۷:۱۶۹) "کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔"

کیا کتاب میں ان سے وعدہ نہ لیا گیا تھا کہ وہ کتاب اللہ میں بے جا دلیل اور حجت نہ کریں گے اور نصوص کے تقاضوں سے بچنے کے لئے حیلہ سازی نہ کریں گے اور اللہ کی جانب سے سوائے سچائی کے اور کوئی بات نہ کریں گے۔ اس کے برعکس ان کا طرز عمل تو یہ ہے کہ دنیاوی مفادات دیکھتے ہی ان کی طرف لپکتے ہیں اور امید یں یہ لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید اللہ ہمیں بخش دے۔اور وہ جو اللہ کی طرف غلط باتیں منسوب کرتے ہیں اس میں اپنے آپ کو حق بجانب اس لئے قرار دیتے ہیں کہ وہ مغفرت کے بے جا امیدوار ہیں حالانکہ ان کو اس بات کا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو بے شک معاف فرماتا ہے لیکن صرف ان لوگوں کو جو فی الحقیقت تائب ہو گئے ہوں اور انہوں نے عملاً معصیت کو چھوڑ دیا ہو جبکہ ان کا طرز عمل ایسا نہیں ہے۔ان کا حال تو یہ ہے کہ کوئی ناجائز مفاد سامنے آتے ہی یہ لوگ بے چین ہو جاتے ہیں اور اس کی طرف لپکتے ہیں حالانکہ انہیں کتاب اللہ کے احکام اور تقاضوں کا اچھی طرح علم ہوتا ہے۔

ہاں! وہ پڑھتے ہیں لیکن پڑھنا صرف اس شخص کے لئے مفید ہوتا جس کے دل میں تعلیم اتر جائے 'کئی ایسے پڑھنے والے ہیں جن کے دلوں سے قرآن بہت دور ہے۔یہ لوگ کتاب اللہ کی تدریس اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی تاویل بھی کریں۔اور اس کے مفہومات کو بدل دیں اور اپنے مطلب کے فتویٰ کے ذریعے دنیاوی مفادات حاصل کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ دین کو محض پڑھنے کی خاطر پڑھیں 'اسے اپنا نظریہ اور عقیدہ نہ بنائیں نہ وہ اللہ سے ڈریں اور اس کی سزا سے خائف ہوں۔

وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷:۱۶۹) "آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے 'کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟"

ہاں یہ اصل بات دار آخرت کی ہے 'جو اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ صرف ان کی روش میں آخرت کی بات ہوتی ہے اور یہی لوگ دنیاوی مفادات کی کشش کے دائرے سے باہر نکل سکتے ہیں۔کوئی دل اور کوئی نظام زندگی اس کے سوا درست نہیں ہو سکتا۔انسان کے نفس اور اس کی نفسیات اور اس کی عملی زندگی کی اصلاح بھی صرف فکر آخرت سے ہو سکتی ہے۔ورنہ بتایا جائے کہ وہ کون سا جذبہ ہو سکتا ہے جو انسان کو وہ تمام اغراض گھیر لینے سے روک سکتا ہے۔وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جو انسان کو طمع اور لالچ سے روک دے اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی سے روک دے۔اور وہ کیا چیز ہے جو دل کو مرغوبات سے روکے اور نفس انسانی کی شہوتوں پر کنٹرول کرے۔زندگی کی اس ہیجان خیز کشمکش میں انسان کو ایک اطمینان بخش سکے۔صرف اجر اخروی کی امید ہے جس کی وجہ سے انسان اخروی مفاد کی خاطر دنیا کی محرومیاں برداشت کر سکتا

ہے ۔ مزید یہ کہ حق و باطل کے معرکے میں 'خیر و شر کی جنگ میں' دنیوی اغراض اور اخروی مفادات کے درمیان فیصلے میں انسان ثابت قدم رہ سکتا ہے ۔جبکہ شر سرکشی میں مبتلا ہو اور باطل حد سے آگے بڑھ رہا ہو ۔

"حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی اس ہیجان خیز کشاکش میں صرف فکر آخرت اور عقیدۂ آخرت انسان کے لئے یقین اور سکون کا سبب بن سکتا ہے ۔جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے لئے یہ نہایت ہی مفید ہے ۔ایسے لوگ عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں' آلودگیوں سے بالا رہتے ہیں اور جادہ حق پر ثابت قدم رہتے ہیں' قدم پھسلا دینے والے اور جھنجھوڑنے والے فتنے صرف اس شخص پر اثرانداز نہیں ہوتے جو متقی اور آخرت پر ایمان لانے والا ہو ۔ایسے لوگوں کے دل مطمئن اور ثابت قدم ہوتے ہیں اور یہ لوگ کامیابی کا پوری طرح یقین رکھتے ہیں ۔

آج کے دور میں اشتراکیت کے داعی اس غائبانہ حقیقت کو ہمارے دلوں کے پردے سے محو کرنا چاہتے ہیں ۔ہمارے عقائد و نظریات سے آخرت کے تصور کو مٹانا چاہتے ہیں اور یہ ہمارے دلوں میں جنوں کی وہ آگ روشن کرنا چاہتے ہیں جو صرف یقین آخرت سے بجھ سکتی ہے ۔فکر آخرت کے سوا رشوت' فساد' لالچ' ظلم اور لاپرواہی کی بیماریاں زیادہ ہی ہوتی ہیں اور ایسے لوگ جہاں بھی ہوں خائن اور چور ہوتے ہیں ۔

یہ بات کہ عالم غیب اور عالم مشاہدہ' یعنی سائنس اور عالم غیب کے درمیان مکمل تضاد ہے ۔یہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی جہالت کی وبا ہے جہاں تک حقیقی سائنس دانوں اور اہل علم کا تعلق ہے انہوں نے تو اس نظریے کو ایک عرصے سے رد کر دیا ہے ۔صرف بیسویں صدی کے جاہل کبھی کبھار اس کا ورد کرتے ہیں ۔یہ ایک ایسی جہالت ہے جو انسانی فطرت سے موڑ نہیں رکھتی ۔یہی وجہ ہے کہ اس جہالت کے شکار لوگوں کی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے ۔اور یہ اب ہمہ گیر بگاڑ ہے جس کے نتیجے میں پوری انسانیت کی تباہی کا خطرہ ہے ۔لیکن افسوس ہے کہ یہ نہایت ہی عیارانہ صیہونی منصوبہ ہے ۔صیہونی کے اس منصوبے کی پشت پر یہ غرض کارفرما ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں سے وہ اصلی قوت سلب کر لی جائے جو انسانوں کی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی ہے تاکہ یہ صیہونی پوری دنیا کو اپنے مقاصد کے مطیع بنا سکیں اور صیہونی منصوبہ سازوں کے اس منصوبے کو یہ لوگ جگہ جگہ اپنے ڈھنڈورچیوں کے ذریعے پھیلاتے ہیں ۔پوری دنیا میں صیہونیوں نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس میں تمام لوگ خودبخود اس منصوبے کو عملاً چلا رہے ہیں ۔

فکر آخرت اور خدا خوفی' انسانی زندگی کے دو نہایت ہی اہم مسئلے ہیں' جو لوگ دنیاوی مفادات کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہے ہیں قرآن کریم ان کو یہ تصور دیتا ہے کہ وہ عقل کے ناخن لیں "آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے ۔"

اگر فیصلہ کرنے کا موقعہ عقل کو دیا جائے اور خواہشات نفسانیہ کا اس میں دخل نہ ہو ۔اگر علم اور سائنس کو حقیقی معنوں میں لیا جائے اور جہالت کا نام علم نہ رکھا جائے تو آخری فیصلہ حتمی ہو کہ اس دنیائے دنی کے مقابلے میں آخرت ہی بہتر ہے ۔تقویٰ اور خدا خوفی مومنین کے لئے دنیا و آخرت کا توشہ بن جائے ۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ

(۷ : ۱۷۰) "جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم کر رکھی ہے' یقیناً ایسے نیک کردار

لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔"

یہ ان لوگوں پر ایک طنز ہے جن سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور اسے پڑھیں اور انہوں نے عہد کے باوجود کتاب کو مضبوطی سے نہ پکڑا حالانکہ وہ اسے پکڑ تو لیتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے اور اپنے نظریہ و عمل میں اسے نافذ نہیں کرتے' نہ اپنے نظام زندگی میں اسے جاری کرتے ہیں۔اگرچہ یہ ایک تعریض ہے لیکن آنے والی تمام نسلوں کے لئے اس میں طے کردہ اصول باقی ہے۔

تمسک کے لفظ سے ایسے مفہوم کا اظہار ہوتا ہے جو ذہن کے سامنے ایک عملی نقشہ اسکرین پر پیش کر دیتا ہے۔ایک معنوی چیز کو قرآن نے تمسک کے ذریعے حسی بنا دیا ہے۔معنی یہ ہیں کہ قوت کے ساتھ اس کتاب کو پکڑ لو اور تختی اور سنجیدگی کے ساتھ اس کے اصولوں کو رائج کرو۔جس طرح اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی کتاب کو لیا جائے' بغیر ہٹ دھرمی کے' بغیر شکن کے اور بغیر گھٹن کے۔اس لئے کہ سنجیدگی' قوت اور پختگی اور چیز ہے اور ہٹ دھرمی اور گھٹن اور دل گرفتگی اور چیز ہے۔سنجیدگی' قوت اور پختگی یسر کے متضاد نہیں ہے البتہ سہل انگاری اور کردار کے بودے پن سے متضاد ہے۔یہ صورت حال وسعت قلبی کے متضاد نہیں ہے۔البتہ بے دینی کے متضاد ہے' حالات کی رعایت اور حکمت کے متضاد نہیں البتہ وہ حالات اور واقعات کی رو میں نہیں بہتی۔واقعات کو شریعت کے مطابق ہونا تو پالیسی ہے۔یہ پالیسی نہیں ہے کہ ہم شریعت کو واقعی صورت حالات کے مطابق بناتے چلے جائیں۔

کتاب اللہ کو پختگی سے پکڑ لینا' نماز اور دوسرے مراسم عبودیت کی پابندی کرنا یہ اسلامی نظام حیات کے دو اہم پہلو ہیں۔یہاں تمسک بالکتاب کو ایک خاص رنگ یعنی مراسم عبودیت کے ساتھ متعین کیا گیا یعنی پورے اسلامی نظام حیات کے ساتھ ساتھ مراسم عبودیت کو لوگوں کی اصلاح کے لئے لازم کیا گیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اس میں تمسک بالکتاب ہو اور اس میں عبادات کی پابندی ہو' اس کی طرف اشارہ ان الفاظ میں ہے۔لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (۷: ۱۷۰) "ہم نیک اور مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔" یعنی کتاب کو مضبوطی سے پکڑنا پوری کتاب کو اور عبادات پر عمل پیرا ہونا ہی اصلاح معاشرہ کا ذریعہ ہے۔

کسی معاشرے میں ان دو باتوں میں سے کوئی ایک مفقود ہو جائے تو وہ بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔یعنی اس میں کتاب اللہ کو مضبوطی سے نہ پکڑا جائے اور لوگ اپنے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہ کریں۔دوسرے یہ کہ اس سے عبادت الہی مفقود ہو جائے جو دلوں کی صفائی کا ذریعہ ہے۔اس لئے کہ اگر دل صاف نہ ہوں تو لوگ اللہ کے احکام کے ساتھ یہودیوں جیسی حیلہ سازی کریں گے۔اس لئے کہ ان کے دلوں میں تقویٰ اور خدا خوفی نہ ہوگی۔

اسلامی نظام ایک مکمل نظام ہے' وہ باہم مربوط ہے۔عبادات کے ذریعے دلوں کا زنگ صاف ہوتا ہے اور پھر انسانی جسم احکام کتاب کو درستگی سے مانتے ہیں یوں عملی اور روحانی اصلاح مکمل ہوتی ہے۔یہ اللہ کا طریقہ اصلاح ہے اور اس کے سوا ہم اصلاح کا کوئی اور طریقہ اختیار نہیں کر سکتے۔اگر کوئی ایسا کرے گا تو بدبختی اور عذاب اس کی قسمت میں ہوگا۔

---ooo---

اس قصے کے آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کس طرح پکڑا۔

وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ ۲۱
خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۱﴾ ۹ ع
۱۱

"انہیں وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جب کہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آ پڑے گا اور اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو' توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔"

یہ ناقابل فراموش عہد تھا' کیونکہ یہ ایسے ظروف و احوال میں لیا گیا تھا جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ عہد اس وقت لیا گیا کہ جب پہاڑ ان پر اس طرح چھا گیا کہ گویا چھتری ہے۔ وہ یہی گمان کر رہے تھے کہ ابھی گرا۔ اس لئے کہ عہد لیتے ہی وہ سرکشی کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان سے ایسی صورت میں عہد لیا گیا تھا کہ اس کے بعد وہ دوبارہ عہد شکنی کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں۔ ان غیر معمولی حالات میں ان سے کہا گیا کہ کتاب اللہ کو سنجیدگی سے لو۔ سختی سے اس پر عمل کرو' اس میثاق کے بعد بد عہدی' سست روی اور پسپائی اختیار نہ کرو' کتاب اللہ کی ہدایات کو یاد رکھو۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح تمہارے دل بیچ جائیں اور تمہارا تعلق باللہ قائم رہے۔

لیکن بنی اسرائیل' بنی اسرائیل ہی رہے۔ ان پر اللہ کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی' اللہ نے انہیں اپنے وقت کی سپر پاور بنا دیا تھا۔ ان پر نعمتوں کی بارش کر دی تھی لیکن انہوں نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔ اللہ کے عہد کا کوئی پاس نہ رکھا' ان کو میثاق الٰہی یاد ہی نہ رہا اس لئے وہ اس انجام تک پہنچے ورنہ اللہ تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

---ooo---

درس نمبر ۱۸ ایک نظر میں

اس سبق کا موضوع عقیدہ توحید اور رد شرک ہے۔ اس پوری سورہ میں لائے جانے والے قصوں کا موضوع بھی یہی عقیدہ توحید تھا' اس پہلو سے کہ تمام رسولوں نے اسی عقیدے کی طرف دعوت دی تھی اور تمام رسولوں نے لوگوں کو شرک کے انجام بد سے ڈرایا تھا۔ لیکن یاد دہانی اور ڈراوے کے بعد وہ حالات پیش آئے جن سے ڈرایا گیا تھا۔

لیکن اس سبق میں توحید کے مسئلے کو ایک نئے زاویئے سے لیا گیا ہے' گہرے رخ سے اس پر بات کی گئی ہے۔ انسانی فطرت کے زاویہ سے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ انسان جب عالم ذریت میں تھا تو اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات اور بشریت سے یہ عہد لیا تھا کہ آیا میں تمہارا رب ہوں یا نہیں' اقرار ربوبیت کو فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بشریت انسانی وجود کی گہرائیوں میں اپنے خالق اور رب کے وجود کا شعور رکھتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد رسول کیوں آئے ہیں تو رسولوں کی آمد محض تذکیر کے لئے ہوتی ہے اور ایک رسول بشیر و نذیر کی حیثیت سے آتا ہے۔ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے آتا ہے جو فطرت سے انحراف کر چکے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقیدہ توحید دراصل ایک میثاق ہے جو فطرت انسانی اور خالق فطرت کے درمیان انسان کے ابتدائی دور کے وقت طے شدہ ہے۔ لہذا اس عہد کے توڑنے کے لئے انسان کے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ اگرچہ تذکیر اور یاد دہانی کے لئے ان کے پاس کوئی رسول نہ آیا ہو' لیکن یہ اللہ کی خالص رحمت اور احسان ہے کہ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے منحرفین کی اصلاح کے لئے رسولوں کو ارسال کیا اور لوگوں کو محض ان کے عقول پر نہیں چھوڑ دیا گیا' یونکہ عقل غلطی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اللہ نے رسول بھیجے تاکہ لوگوں کے لئے کوئی حجت ہی نہ رہے کہ فطرت کے تقاضے کے علاوہ اب تو رسول بھی آگئے۔

اس سبق میں مسئلہ توحید کو اس زاویہ سے لیا گیا ہے اور اس زاویہ سے کئی خطوط کھینچے گئے ہیں۔

ایک تاریخی لکیر ہے۔ اس میں ایک شخص کے تاریخی کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس کا تعلق بھی تاریخ بنی اسرائیل کے ساتھ ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ اس کا کسی خاص اور متعین واقعہ یا خاص زمان و مکان کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک نفسیاتی حالت کی تصویر کشی ہے جو بار بار پیش آتی رہتی ہے۔ مثلاً جس شخص کو اللہ نے علم دیا ہے تو اس علم کا تقاضا اور اس سے توقع یہی ہے۔ یہ شخص ہدایت یافتہ ہو اور حق پر قائم ہونے والا ہو۔ لیکن اچانک یہ غیر متوقع صورت حالات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے علم کے تقاضوں سے بھاگ نکلتا ہے۔ وہ اپنے علم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اور وہ راہ ضلالت پر اس شخص کے دوش بدوش چلتا ہے جو بالکل بے علم ہے۔ بلکہ یہ عالم شخص اس بے علم سے بھی زیادہ شرپسند' گمراہ اور بدبخت ثابت ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ علم کو ایمان کی چاشنی نہ دی گئی ہو۔ کیونکہ ایمان کے رنگ سے ہی یہ علم چراغ روشن بن جاتا ہے۔ اور مسافر کے لئے روشنی کا

مینار ہوتا ہے۔

ایک دوسرا خط یا دوسری لکیر ملاحظہ ہو۔اس میں انسانی فطرت کے انحراف کا ایک دوسرا قصہ یا نمونہ بتایا گیا ہے کہ انسان کس ڈھٹائی کے ساتھ توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کر لیتا ہے۔ایک شادی شدہ جوڑا ہے وہ اللہ کے سامنے دست بدعاء ہوتا ہے کہ اگر انہیں ایک صالح بچہ دیا گیا تو وہ صرف اللہ کا شکر ادا کریں گے۔یہاں تک تو فطرت کے تقاضوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ لوگ بھی خلاف توقع بچے کی پیدائش کے عمل میں دوسروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں اور ان کی فطرت میں کجی آجاتی ہے۔

ایک تیسری لائن خود انسانی وجود کے اندر پائے جانے والی ادراکی قوتوں کے بارے میں ہے کہ اگر ان قوتوں کو صحیح طرح کام میں نہ لایا جائے تو ایک معقول انسان انسانیت کے مرتبہ اور مقام سے گر کر حیوانی سطح پر اتر آتا ہے اور پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جہنم کا مستحق ہو کر اس کا ایندھن بن جاتا ہے۔ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی کہ وہ دل رکھتے ہیں لیکن اس کے اندر جذبہ ادراک نہیں ہوتا۔وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن بینائی نہیں ہوتی' وہ کان رکھتے ہیں لیکن سنتے ہی نہیں ہیں۔ ایسے لوگ ضلالت کے پیچھے اس طرح بھاگتے ہیں کہ نہ واپسی ہوتی ہے اور نہ واپسی کا موقع رہتا ہے۔

ایک اشاراتی لائن ہے' ہدایت کی جاتی کہ دل و دماغ کو بیدار رکھو اور ہر معاملے میں غور و فکر کرتے رہو' اس زمین و آسمان کے نظام مملکت کو دیکھو۔ان میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا پیدا کیا ہے اور پھر ہر چیز کے خاتمے کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔اس لئے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر توجہ کرو اور غور کرو کہ اس دعوت کے حامل کو مجنون اور گمراہ کہا جاتا ہے۔

ایک لائن میں ان پر سخت تنقید کی گئی ہے اور یہ تنقید ان الہوں کے بارے میں ہے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ حالانکہ وہ جن کو پکارا جاتا ہے الہیت کی ابتدائی خصوصیات سے بھی عاری ہیں بلکہ ان میں تو زندگی کے معمولی آثار بھی ناپید ہیں۔

یہ سبق اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ آپ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ انہیں اور ان کے خداؤں کو چیلنج دیں کہ وہ کچھ تو پکاریں۔کہا جاتا ہے کہ آپ ان سے مکمل بائیکاٹ کا اعلان فرما دیں اور ان کے معبودوں اور عبادت سے علیحدہ ہو جائیں اور اس مولیٰ کے ہاں پناہ لیں جس کے سوا کوئی مولیٰ نہیں ہے۔ اَلَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ "میرا ناصر وہ ہے جس نے کتاب نازل کی اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے۔"

اس سے پہلے سبق کے آخر میں بنی اسرائیل کے اوپر پہاڑ کو چھتری کر کے ان سے عہد لیا گیا تھا' اور اس سبق کا آغاز انسانیت کے ساتھ میثاق اکبر کے ذکر سے کیا گیا جو فطرت انسانی کے ساتھ طے پایا تھا۔یہ عہد بھی ایسے منظر کی شکل میں ہے کہ اپنی خوبصورتی اور حلاوت کے اعتبار سے اس منظر سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

---OOO---

درس نمبر ۸۱ تشریح آیات

۱۷۲ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۱۹۸

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ
وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ‌ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ‌ ؕ قَالُوۡا بَلٰى‌ ۛۚ شَهِدۡنَا‌ ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ
الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَۙ ﴿۱۷۲﴾ اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ
وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۡۢ بَعۡدِهِمۡ‌ ۚ اَفَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ‏ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ‏ ﴿۱۷۴﴾

”اور اے نبی ”، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ انہوں نے کہا ”ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔“ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ”ہم تو اس بات سے بے خبر تھے“ یا یہ نہ کہنے لگو کہ ”شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا؟“ دیکھو، اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں۔

یہ فطرت انسانی کا مسئلہ ہے لیکن قرآن کریم نے اسے ایک منظر میں پیش کیا ہے اور یہ قرآن کریم کا عمومی انداز ہے، بہرحال یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد منظر ہے۔ عالم غیب میں موجود انسانی نسل اس میں ایک کردار ہے، یہ نسل انسانوں کی پشتوں میں موجود تھی، قبل اس کے کہ وہ اس دنیا کے عالم شہود پر آئے، یہ نسل عالم بالا کے اسٹیج پر آتی ہے۔ اللہ کی جانب سے اس نسل کے سامنے ایک سوال رکھا جاتا ہے۔ ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟“ یہ پوری نسل انسانی اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتی ہے۔ اللہ کو وحدہ لا شریک تسلیم کرتی ہے۔ یہ پوری نسل ذروں کی طرح موجود ہے اور اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

یہ ایک حیران کن کائناتی منظر ہے۔ ہم تک تمام زبانوں کے اندر آج تک جو تصورات منتقل ہوئے ہیں اس تصور کی

کوئی مثال کہیں بھی نظر نہیں آتی - جب انسانی تصورات اور قوائے مدرکہ اس تصور کا صحیح طرح احاطہ کر لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب تصور ہے - انسانی خلیے تمام کائنات سے اخذ کر لئے گئے ہیں - اور ان سے اس طرح بات ہو رہی جس طرح ایک مکمل انسان سے بات ہوتی ہے اور وہ بھی ایک عقلمند انسان کی طرح بات کرتے ہیں 'کیونکہ ان میں بات کرنے کی صلاحیت تو موجود ہے - یہ خلیے اعتراف کرتے ہیں اور شہادت توحید دیتے ہیں اور اس عظیم میثاق پر دستخط کرتے ہیں اور ہیں وہ انسانوں کے صلب میں -

جب انسان اس خوبصورت 'حیران کن اور منفرد منظر کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی شخصیت کی گہرائیوں سے متاثر ہوتا ہے - وہ باریک خلیوں کے اندر انسانی نسل کے ذرات کو دیکھ رہا ہے جو فضا میں تیر رہے ہیں - ہر ذرہ اس وقت زندہ ہے 'اور ہر ایک میں مکمل استعداد موجود ہے' ہر ذرے کے اندر مکمل انسانی صفات موجود ہیں صرف وہ نشوونما کی اجازت کا منتظر ہے - اس کائنات کی نامعلوم وسعتوں سے وہ ظہور اور شہادت کا منتظر ہے - یہ ذری موجودات اس میثاق کو قبول کرتی ہے - اگرچہ ہماری نظروں میں آنے والے عالم معلوم ہیں یہ موجود ذرہ ابھی تک منصہ شہود پر نہیں آیا -

قرآن کریم نے اس خوبصورت 'حیران کن اور منفرد منظر کو اس عظیم حقیقت کے ذہن نشین کرانے کے لئے پیش کیا جو اس کائنات کی حقیقت میں نہایت ہی گہرائی پر موجود اور مستحکم ہے - یہ منظر قرآن کریم نے آج سے ۱۴ سو سال قبل پیش کیا - اس وقت انسانوں کو اس کائنات کی تخلیق کے بارے میں کچھ زیادہ سائنسی معلومات نہ تھیں - اس موضوع پر انسانی معلومات چند اوہام پر مشتمل تھیں - انسانی مزاج اور تخلیق انسانیت کے بارے میں زمانہ مابعد میں انسان نے کچھ حقائق دریافت کئے - چنانچہ ان سائنسی انکشافات نے کہ جین کے اندر وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو کسی انسان میں بعد کے ادوار میں نمودار ہوتی ہیں اور ان میں ایک مکمل فرد کی خصوصیات بھی موجود ہوتی ہیں جو بعد میں فرد کی صورت میں سامنے آتا ہے حالانکہ یہ خلیے کی شکل میں ہوتا ہے - ان خلیوں میں تین ہزار ملین انسانوں کا ریکارڈ محفوظ ہوتا ہے جس میں ان کی تمام خصوصیات بھی ہوتی ہیں - ان خلیوں کا حجم ایک مکعب سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتا یعنی سوئی کے ناکے کے برابر اور یہ وہ معلومات ہیں کہ اگر اس وقت لوگوں کو یہ بتائی جائیں تو لوگ کہتے کہ یہ شخص مجنوں ہے - لیکن اللہ تعالیٰ نے سچ کہا سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ "ہم عنقریب ان کو آفاق میں اور خود ان کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہ حق ہے -"

ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے - "حضور ؐ نے فرمایا تمہارے رب نے آدم کی پشت کو چھوا 'اس سے وہ تمام جرثومے برآمد ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت تک پیدا کرنے والا تھا 'اب اللہ نے ان سے پختہ وعدہ لیا اور انہیں خود ان کے خلاف گواہ ٹھہرایا - اور سوال کیا 'کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو ان سب نے جواب دیا ہاں! 'یہ روایت حضرت ابن عباس سے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح سے مروی ہے - لیکن حضرت ابن عباس کی موقوف روایت زیادہ قوی ہے -

سوال یہ ہے کہ یہ منظر کیسے تھا 'اور اللہ نے کس طرح تمام پیدا ہونے والی مخلوقات کو نکال لیا اور ان کی گواہی خود ان کے خلاف ثبت کر لی - اور ان کو مخاطب کرنے کا انداز اور سوال و جواب کس طرح تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ افعال الٰہی کی کیفیت بھی غیوب میں سے ایک غیب ہے 'جب تک انسان کے اندر ذات باری کے ادراک ذہنی کی قوت پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک انسان کے لئے افعال الہیہ کی کیفیت کا ادراک بھی ممکن نہیں ہے - کیونکہ جب کسی ماہیت کا

ادراک نہیں ہو سکتا تو اس کے فروعات یعنی کیفیات کا ادراک کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اور وہ تمام افعال جن کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے مثلاً ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَھِیَ دُخَانٌ "پھر اللہ آسمانوں پر متمکن ہوا اور یہ ایک دھواں تھا۔" ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ "پھر عرش پر متمکن ہوا۔" یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ "اللہ جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ٹھہراتا ہے۔" وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ "اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔" وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا "تمہارا رب آئے گا اور فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے۔" وَمَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ "جو تین آدمیوں کا مشورہ ہو ' ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے۔" وغیرہ یہ سب آیات جو افعال الہیہ کے بارے میں وارد ہیں ' یہ افعال تو لازماً صادر ہوئے اور ہوں گے لیکن ان کی کیفیت کا ادراک مشکل ہے۔ اس لئے کہ کیفیت کا تصور بھی ماہیت کے تصور کا فرع ہوتا ہے۔ اور اللہ کی ذات ایسی ہے کہ اس جیسی کوئی ذات نہیں ہے۔ لہذا اللہ کی ماہیت اور اس کے افعال کی کیفیت کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں تشبیہ لازم آتی ہے اور اس کے مشابہ کوئی نہیں ہے۔ اللہ کے افعال کو انسانی افعال کے ذریعے سمجھنے کی جو کوشش بھی کی گئی وہ گمراہی پر منتج ہوئی ہے۔ کیونکہ اللہ اور مخلوق اللہ کی ماہیت میں فرق ہے۔ فلاسفہ اور سائنس دانوں نے انسانی افعال کے رنگ میں اللہ کے افعال کی کیفیات کو سمجھنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ نامراد ثابت ہوئی ہیں۔

نیز اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ اس سے مراد فطرت انسانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کے اندر اعتراف ربوبیت الہی ودیعت کر دیا ہے اور فطرتاً ایک شخص اعتراف رب کرتا ہے ' البتہ بعض خارجی عوامل اسے فطرت کی راہ مستقیم سے بدراہ کرتے ہیں۔

ابن کثیر فرماتے ہیں "سلف اور خلف کے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے لوگوں کو توحید کی فطرت پر پیدا کیا ہے جیسا کہ اس سے قبل حضرت ابو ہریرہ اور عیاض ابن حمار المجاشی کی حدیث میں منقول ہے۔ ان سے حسن بصری نے روایت کی ہے۔ جس نے اس آیت کی تفسیر اس کے مطابق کی ہے۔ ان لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ نے آدم کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ بنی آدم کا لفظ استعمال کیا ہے اور مِنْ ظَھْرِهٖ نہیں کیا بلکہ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ "ان کی پشتوں سے" کیا ہے۔ (ذریتھم) کے لفظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد لوگ ہیں جو نسلاً بعد نسل اس دنیا میں مختلف زمانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ "اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ "وہ تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔" اور دوسری آیت میں ہے كَمَا اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ "جیسا کہ تمہیں دوسری قوم کی پشت سے پیدا کیا۔

پھر اللہ نے فرمایا وَاَشْهَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ "انہیں اپنے اوپر گواہ بنا کر پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو انہوں نے کہا ہاں! یعنی ان کو وجود میں لاکر ان سے پوچھا اور انہوں نے اسے تسلیم کیا یعنی پیدائش کے وقت۔ علماء کہتے ہیں کہ شہادت کبھی تو قولی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ "انہوں نے کہا ہم اپنے اوپر شہادت دیتے ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے غرے میں ڈال دیا ہے اور انہوں نے اپنے اوپر شہادت دی کہ وہ کافر تھے۔" اور کبھی حالاتی شہادت ہوتی ہے مثلاً قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ

"مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کو تعمیر کریں۔ در آں حالیکہ وہ اپنے اوپر کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ یعنی ان حالات کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ اگرچہ وہ زبان سے اپنے آپ کو کافر نہیں کہتے۔ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ "اور وہ اس پر گواہ ہے۔" اسی طرح سوال بھی کبھی تو قولی ہوتا ہے اور کبھی حالاتی ہوتا ہے۔ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ "اور تمہیں وہ سب کچھ دیا جس کا تم نے سوال کیا۔"

مفسرین کہتے ہیں کہ اگر لوگوں کو عملاً اٹھا کر ان سے اقرار لیا گیا تھا اور یہ اقرار ان کے خلاف باںنڈنگ تھا تو پھر چاہئے تھا کہ لوگوں کو وہ یاد بھی ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس واقعہ کی اطلاع ہی کافی ہے تو جواب یہ ہے کہ مشرکین تو اس حدیث کے ساتھ حضور اکرم کے تمام اخبار کو جھٹلاتے ہیں اور یہ ان کے خلاف حجت کے طور پر پیش کیا گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس سے مراد وہ فطرت ہے جس پر تمام انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے کہ وہ توحید کا اقرار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد تمام انسانوں کو کہا اَنْ تَقُوْلُوْا "یہ نہ ہو کہ تم کہو" یعنی قیامت کے دن تم یہ کہہ سکو کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔ یا یہ نہ کہو اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا "دراصل ہمارے آبا مشرک تھے۔"

بعض احادیث میں بھی اس فطرت کی طرف اشارہ موجود ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔" (بعض روایات میں ملت پر پیدا ہو رہا ہے۔) بعد میں اس کے باپ اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی یا مجوسی جیسا کہ تمام جانوروں کے بچے صحیح سالم پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی کان کٹا ہوتا ہے؟

صحیحین میں عیاض ابن حمار کی روایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو سیدھا پیدا کیا' اس کے بعد شیاطین آئے اور انہوں نے بندوں کو ان کو دین سے پھیر دیا اور ان پر وہ باتیں حرام کر دیں جو حلال تھیں۔

ابن جریر نے اسود ابن سریع کی حدیث نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں نے حضور اکرم کے ساتھ چار غزوات میں شرکت کی۔ انہوں نے کہا کہ لوگوں نے جنگ کے بعد بچوں کو بھی قتل کیا۔ یہ بات رسول اللہ تک پہنچی اور یہ ان پر بہت ہی گراں گزری۔ اس کے بعد آپ ؐ نے فرمایا کیا حال ان لوگوں کا' جو بچوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ حضور ؐ کیا یہ لوگ مشرکین کے بچے نہیں ہیں۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا کہ تم میں سے بہتر لوگ بھی تو مشرکین کے بچے ہیں' جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اس فطرت پر ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی۔ حسن نے کہا "اللہ تعالیٰ کے فرمان کا یہی مطلب ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (۷: ۱۷۲) "جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا۔" الی الی آخرہ۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس آیت کو اپنے حقیقی معنوں میں بھی مستبعد نہیں سمجھتا کیونکہ جس طرح اللہ نے فرمایا ہے اسی طرح اس کا وقوع ممکن ہے "اور لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور انہیں خود ان پر گواہ بنایا تھا۔" اور کوئی بات بھی اس میں خلاف عقل نہیں ہے لیکن اوپر جن مفسرین نے اسے حالات فطرت کے معنوں میں لیا ہے وہ تفسیر بھی مستبعد نہیں ہے۔ ابن کثیر' حسن بصری وغیرہ نے اسے اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم!

بہ حال یہ بات پیش نظر رہے کہ انسانی فطرت نے اللہ کے ساتھ یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اللہ کو وحدہ لاشریک ٹھہرائے گی ۔ حقیقت توحید انسانی فطرت میں ودیعت ہے ۔ ہر بچہ جب زندگی پاتا ہے تو یہ عہد اس کی فطرت کے ساتھ آتا ہے وہ اس وقت تک اس فطرت پر قائم رہتا ہے جب تک کوئی خارجی عامل اسے اس فطرت سے پھیر نہیں دیتا ۔ اور یہ خارجی عوامل انسان کی فطری استعداد کو استعمال کرتے ہیں کیونکہ اللہ نے جس طرح فطرت میں توحید و ودیعت کی ہے اسی طرح فطرت کو یہ صلاحیت بھی دی ہے کہ وہ ہدایت قبول کرے یا ضلالت ۔ اور جن حالات میں بچہ پیدا ہوتا ہے وہ حالات اور ظروف احوال اس پر اثرانداز ہوتے ہیں ۔

حقیقت توحید صرف فطرت انسانی کے اندر ہی ودیعت نہیں کی گئی بلکہ نظریہ توحید اس پوری کائنات کے اندر بھی رکھا ہوا ہے کیونکہ انسانی فطرت بہرحال اس وسیع فطری نظام ہی کا ایک حصہ ہے ۔ انسانی وجود اس کائنات کے وجود سے منقطع نہیں ہے ۔ یہ بھی اسی قانون کے مطابق چل رہا ہے جس کے مطابق پوری کائنات چل رہی ہے ۔ جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کے احکام اور اشارات قبول کرتی ہے اسی طرح اس چھوٹے سے انسان کی فطرت بھی تکوینی اثرات قبول کرتی ہے ۔

وہ ناموس توحید جو اس کائنات پر حکمران ہے وہ اس کائنات کی شکل و صورت میں بالکل نمایاں ہے ۔ اس کائنات کی ہم آہنگی' اس کے اجزاء کا باہم ربط اور تناسب' اس پوری کائنات اور اس کے اجزاء کی حرکت کا نظام' اس کے قوانین کا تسلسل اور پوری کائنات کا ان قوانین کے مطابق مسلسل رواں دواں ہونا اور پھر ان قلیل معلومات کے مطابق جن تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے کہ وہ ذرات جن سے یہ کائنات مرکب ہے اور ان ذرات کی توڑپھوڑ کے نتیجے میں نکلنے والی شعاعیں یہ سب کچھ اس کائنات کے خالق کی وحدت پر دلیل ہیں ۔

اس ہمہ گیر وحدت کے رازہائے نہفتہ کو انسان رات دن کھول رہا ہے جن سے اس کائنات کے مزاج کی وحدت معلوم ہوتی ہے' اس کے قوانین کی یک رنگی معلوم ہوتی ہے اور یہ یک رنگی آٹومیٹک نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور اس کے نظام تقدیر کے مطابق ہو رہا ہے ۔ ہم بہرحال انسانی انکشافات پر بھی بھروسہ نہیں کرتے کیونکہ انسان کا علم بہرحال ظن و تخمین پر مبنی ہے ۔ اور انسان کا علم یقینی علم نہیں ہے' اس لئے کہ انسان کو جو ذرائع ادراک دیئے گئے ہیں وہ بھی یقینی نہیں ہیں اور ہم یقیناً یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ناموس الہی کیا ہے ؟ جہاں تک انسانی علم اور ذرائع علم کا تعلق ہے انسان صرف حقیقت سے مانوس ہو سکتا ہے ۔ ہمارے پاس اس کائنات کے ناموس اکبر کے بارے میں بھی حقیقی ذریعہ اطلاع اور ذریعہ علم صرف خالق کائنات کا پیغمبر ہے ۔ قرآن کریم بہرحال یقینی طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک قانون توحید جاری و ساری ہے ۔ اور اس قانون توحید کو اللہ رب العزت نے جاری کیا ہے اور یہ کائنات اور اس کے اندر بسنے والی تمام مخلوقات صرف اسی رب واحد کی غلام ہے ۔ اور اس کا فرض ہے کہ وہ رب کی بندگی کرے ۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے تو ہم صرف اس کائنات کے جاری و ساری نظام ہی کو دیکھ سکتے ہیں جو ایک قاعدے کے مطابق چل رہا ہے ۔

یہ ناموس اکبر جو اس عظیم کائنات کے اندر اللہ کی مشیت اور تقدیر نے جاری کیا ہے' یہی خود انسان کے اس چھوٹے سے وجود میں بھی جاری ہے کیونکہ انسان بھی اس کائنات کا ایک کارکن ہے ۔ یہ بھی اپنی فطرت میں جکڑا ہوا ہے جسے اپنی فطری حرکات کا عقلی احساس بھی ضروری نہیں ہے کہ ہو' اس لئے وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ادراک رکھتا

ہے اور یہ ادراک حقیقت اس کی فطرت کی گہرائیوں میں ہے۔ اس کی ذات اس کا شعور بھی رکھتی ہے۔ وہ اس کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ جب تک کہ خلل و فساد اس پر طاری نہ ہو جائے۔ اس خلل و فساد کی وجہ سے اس کا ذاتی ادراک ماند پڑ جاتا ہے اور انسان عارضی حالات کے تابع ہو جاتا ہے۔ اور اب وہ بیرونی عوامل کے مطابق چلتا ہے۔ اور اس کا اندرونی عامل اپنا کام چھوڑ دیتا ہے۔

یہ ناموس فطرت بذات خود اللہ اور بندے کے درمیان ایک عقد ہے اور یہ عقد انسان کے وجود کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ اپنی پیدائش کے وقت سے وہ ہر خلیے میں رکھ دیا جاتا ہے اور یہ عقد آدم علیہ السلام کے وقت سے آج تک جاری و ساری ہے۔ انسان کا ہر خلیہ ربوبیت کا اقرار کرتا ہے اور اسی اقرار اور عقد یعنی ناموس قدرت کے مطابق دنیا میں آتا ہے۔ لہذا اس فطری عقد کے بعد مزید کسی دلیل و حجت کی انسان کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چاہے یہ دلیل بلسان الحال ہو یا بلسان القول ہو۔ لہذا اب انسان کے لئے یہ بات مفید نہ ہوگی کہ وہ کہے کہ میں تو غفلت کا شکار ہو گیا تھا اور میں نے کتاب اللہ اور رسول اللہ کی تعلیمات سے لاپرواہی برتی تھی۔ یا کوئی شخص یہ بہانہ نہیں پیش کر سکتا کہ جب وہ کائنات میں وارد ہوا تو میرے آباء و اجداد اور ماحول میں شرک ہی شرک تھا اور عقیدۂ توحید کی قبولیت کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لہذا وہ اپنے عقائد و اعمال کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے صاف صاف وضاحت فرما دی۔

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (۷:۱۷۳) "یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے"' یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے' پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کاروں نے کیا تھا"

لیکن یہ اللہ کی نہایت ہی مہربانی ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ انسان میں ہدایت اور ضلالت دونوں کی استعداد ہے۔ اور یہ کہ انسان اپنے اس فطری عہد کے باوجود انحراف اختیار کر سکتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے صحیح راہ سے شیاطین جن و انس منحرف کرتے ہیں اور یہ جن و انس کے شیاطین بڑی ہوشیاری سے انسان کی کمزوریوں کو کام میں لاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رحم یہ فرمایا کہ اس نے انسان کو محض اپنی فطری صلاحیت پر ہی ذمہ دار ہدایت نہیں ٹھہرایا۔ اور نہ اپنی عقلی اور فطری قوت ادراک اور تمیز پر اس سے جواب طلبی فرمائی۔ بلکہ اس کے باوجود اللہ نے رسول بھیجے 'جنہوں نے تفصیلات کے ساتھ آیات و دلائل پیش کئے تاکہ وہ فطرت کے اوپر چڑھے ہوئے زنگ کو اتاریں۔ اسے صیقل کریں اور انسان کو خواہشات اور شہوات کی بندگی سے چھڑائیں۔ اگرچہ اللہ کو معلوم تھا کہ رسولوں اور دعوتوں کے بغیر بھی انسان کی ہدایت کے لئے اس کی فطری استعداد اور عقلی قوت کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ نے حساب و کتاب کا مدار رسالت اور دعوت پر رکھا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷:۱۷۴) "دیکھو' اس طرح ہم نشانیاں واضح

طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں۔"

یہ آیات و ہدایات اس لئے اتاری گئیں کہ انسان راہ فطرت پر واپس آجائے اور اس صلاحیت کو کام میں لائے جو اس کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ یعنی ان فطری صلاحیتوں اور عقلی ادراک کی وجہ سے بھی وہ بجا طور پر حقیقت کا ادراک کر سکتا تھا لیکن اللہ نے رسول اور ہدایات اس لئے ارسال کیں کہ وہ راہ ہدایت پالے۔ اور یاد دہانی اور زاوے سے استفادہ کرے۔

---()()()---

اب 'فطرت کی راہ سے انحراف کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے' جس میں ایک شخص اپنا عہد فطرت توڑتا ہے اور ہدایت کے بعد اللہ کی آیات اور نشانات سے پھر جاتا ہے۔ اللہ نے اپنی آیات اور دلائل اس کے سامنے بکھیر دیئے' وہ اپنی فکر و نظر سے انہیں دیکھ سکتا تھا اور ان میں غور کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اس سے نکل بھاگا اور وہ اس طرح نکل گیا جس طرح کوئی اپنے لباس سے نکل جائے اور زمین پر گر جائے اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہو جائے اس نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے میثاق کو مضبوطی سے نہ پکڑا اور نہ ان آیات نے نے اس کے لئے ہدایت کا سامان فراہم کیا۔ شیطان اس پر حاوی ہو گیا اور وہ اللہ کے دائرۂ امن سے نکل گیا۔ گمراہ' بے قرار' اور ادھر ادھر بھاگتا رہا۔

لیکن قرآن کریم نے اس شخص کی مثال نہایت ہی معجزانہ انداز میں دی ہے۔ اس مثال میں ایک متحرک منظر ہے۔ جس میں اس شخص کے خدوخال بالکل واضح نظر آتے ہیں۔ اس منظر کے تاثرات نہایت حقیقی اور واقعات فطری اور عبارت نہایت ہی زندہ اور اشاریت سے بھرپور ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿١٧٥﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٧٦﴾ سَاۗءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾

"اور اے نبی ؐ ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے 'مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا' لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو

تب بھی زبان لٹکائے رہے - یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں -

تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں - بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں -"

یہ ایک عجیب منظر ہے' جدید ترین فنی تصویر کشی - الفاظ کی تصویر کشی - ایک شخص کو آیات و نشانات دیئے جاتے ہیں' اسے فضل و کرم کی خلعت پہنائی جاتی ہے' اس کو علم کا لباس دیا جاتا ہے اور اسے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں کہ وہ راہ ہدایت لے' اللہ سے جڑے اور سربلندی اختیار کرے لیکن وہ اس صورت حالات سے اپنے آپ کو نکال دیتا ہے - لباس فاخرہ کو اتار کر ننگا ہو جاتا ہے اور سربلندی اور طہارت کے بجائے کیچڑ میں اپنے آپ کو لت پت کر دیتا ہے - خواہشات نفس کے پیچھے بھاگ رہا ہے - اس نے پہلا فطری عہد بھی توڑ دیا - پھر اس نے ان آیات و دلائل کو بھی ترک کر دیا جن میں اس کے لئے سامان ہدایت تھا - وہ آیات و ہدایات سے نکل رہا ہے یوں کہ یہ آیات و ہدایات اس کے لئے گویا گوشت پوست ہیں اور یہ زبردست جدوجہد نہایت مشقت کے ساتھ ان سے نکل رہا ہے - یوں جس طرح زندہ انسان سے چمڑا کھینچا جا رہا ہو - حقیقت یہ ہے کہ دلائل ایمان انسانی جسم کے ساتھ اس طرح چمٹے ہوئے ہیں جس طرح چمڑا جسم کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے - وہ آیات سے نکل رہا ہے - وہ گویا ننگا ہو رہا ہے' اپنے آپ کو بچانے والے گوشت و پوست سے نکل رہا ہے اور راہ ہدایت کو چھوڑ کر خواہشات نفسانیہ کے پیچھے بھاگ رہا ہے - گویا وہ آفاق کی سربلندیوں سے گر کر کیچڑ میں لت پت ہو رہا ہے - یوں شیطان اس پر حملہ آور ہوتا ہے اور اب اس کے بچانے والا کوئی ذریعہ نہیں ہے - چنانچہ شیطان اس کے پیچھے پڑتا ہے اور اسے اپنے قابو میں لے آتا ہے - اب ہم اچانک ایک نہایت ہی خوفناک منظر کے سامنے ہیں - یہ نہایت ہی برا اور پریشان کن منظر ہے - ہمارے سامنے اس قسم کی مخلوق ہے جو کیچڑ میں لت پت ہے - زمین پر گری پڑی ہے - اچانک یہ مخلوق مسخ ہو کر کتے کی شکل میں آ جاتی ہے' تم اسے دھتکارتے ہو تب بھی زبان لٹکائے ہوئے ہے اور اگر تم اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے ہوئے ہے - غرض یہ متحرک مناظر تسلسل کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں - ہماری قوت متخیلہ ان مناظر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے نہایت روشن تاثرات لئے ہوئے چلتی ہے - اور جب ہماری متخیلہ اس آخری منظر پر پہنچتی ہے جس میں ایک کتا زبان لٹکائے ہوئے نظر آتا ہے تو اچانک اس پورے منظر پر درج ذیل تبصرہ سنا جاتا ہے -

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ

(۱۷۶) سَآءَ مَثَلَاِ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ

(۷:۱۷۷) "یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں - تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں - بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں -"

یہ ہے ان کی مثال - حقیقت یہ ہے کہ ہدایت کے دلائل اور ایمان کے موجبات خود ان کی فطرت میں سے ہوئے

تھے اور یہ دلائل اور اشارات ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کے اندر بھی موجود تھے' لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو کھینچ کر ان سے نکال لائے - اب یہ مسخ شدہ اجسام تھے' جو ننگے تھے اور مقام انسانیت سے گر کر یہ لوگ حیوانیت تک اتر آئے تھے - یہ اس کتے کی طرح تھے جو کیچڑ میں لت پت ہو - ان کے پاس تو ایمان اور دلائل ہدایت کے وہ پر تھے جن کے ذریعے یہ اعلیٰ علیین تک پرواز کر سکتے تھے - ان کی تخلیق بھی بہترین ڈیزائن میں ہوئی تھی لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اعلیٰ علیین کے مقابلے میں اسفل سافلین کے مقام کو اپنے لئے پسند کیا - "بڑی ہی بری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے -"

کیا اس مثال سے کوئی اور بری مثال ہو سکتی ہے کہ کوئی خود اپنی کھال سے کھینچ کر باہر نکل آئے اور ہدایت سے بالکل ننگا ہو جائے اور یہ کہ کوئی خواہشات نفسانیہ کی تسکین کے لئے کیچڑ میں لت پت ہو - ان لوگوں سے زیادہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا اور کون ہو گا کہ وہ خود اپنی ہی کھال کھینچ کر اپنی ہڈیوں اور گوشت کو ننگا کر دے - اپنے حامی اور مددگار کو تباہ کر دے اور اپنے گوشت کو شیطانی درندوں کے نوچنے کے لئے ننگا اور آسان کر دے - اور پھر شیطان ایسے شخص کو مرتبہ انسانیت سے گرا کر مرتبہ حیوانیت تک لے آئے اور وہ اسی طرح حیران و پریشان ہو جائے جس طرح باؤلا کتا زبان لٹکائے ہوئے ہوتا ہے -

یہ قرآن کریم ہی کا حصہ ہے کہ اس نے ایسی صورت حالات کی تصویر کشی ایسے موثر الفاظ میں کی' اس طرح کہ اس کا اعجاز بالکل واضح ہے -

سوال یہ ہے کہ آیا ایسے لوگوں کی کوئی مخصوص مثال بھی اس وقت تھی یا ایک عمومی بات کو یہاں مثال کی شکل میں لایا گیا ہے؟ کیا ان مثالوں کے مصداق کے بارے میں ذخیرہ روایات میں کچھ ہے؟

بعض روایات میں آتا ہے کہ فلسطین میں ایک صالح شخص تھا - یہ اس سے قبل گزرا ہے جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تھے - اس شخص کے انحراف اور اس کی اخلاقی بربادی کا ایک طویل قصہ بیان کیا جاتا ہے - بہرحال وہ شخص بھی اس مثال کا مصداق بن سکتا ہے لیکن چونکہ یہ اسرائیلی روایات اسلامی تفاسیر میں داخل ہو گئی ہیں لہٰذا اس قصے کی تمام تفصیلات کو درست تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے - پھر ان اسرائیلی روایات کے اندر چونکہ بے حد اختلاف و اضطراب ہے' اس لئے بھی ان کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنا ضروری ہے -

روایات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص بلعام ابن باطور نامی تھا' یہ شخص فلسطین کے جابر حکمرانوں میں سے تھا - اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عربوں کا امیہ ابن الصلت تھا - بعض روایات مین ابو عامر فاسق کو اس کا مصداق قرار دیا گیا ہے - بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ شخص حضرت موسیٰ کے معاصر تھا - بعض روایات میں ہے کہ یہ حضرت یوشع ابن نون کے دور میں تھا - اور حضرت یوشع ابن نون نے تیہ میں بنی اسرائیل کی چالیس سالہ سرگردانی کے بعد ان جابر حکمرانوں کے ساتھ معرکہ آرائی کی تھی - جبکہ موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ان جباروں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے سے بنی اسرائیل نے معذرت کر دی تھی - انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہہ دیا تھا کہ جاؤ تم اور تمہارے رب دونوں لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں - بعض روایات میں آتا ہے کہ اس شخص کو جو آیات دی گئی تھیں وہ اسم اعظم تھا - جس کے ساتھ ہر دعا مستجاب ہوتی ہے - بعض روایات میں آتا ہے کہ اس شخص کو کتاب الہٰی دی گئی تھی - یہ نبی تھا اور اس کے بعد اس

کے بارے میں بڑی اختلافی بحثیں ہوئیں۔

یہاں ظلال القرآن میں اپنے منہاج کے مطابق ہم ان تفصیلات میں نہیں جاتے۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے نص میں ان تفصیلات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا' نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی مرفوع حدیث منقول ہے۔ بہرحال قرآن کریم نے جس واقعی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس دنیا میں انسانی تاریخ میں بار بار دہرائی جاتی ہے کہ ایک شخص کے سامنے آیات دلائل پیش ہوئے ہیں۔ وہ ان کی حقانیت کو جانتے ہیں لیکن ان کو تسلیم کر کے اپنی زندگی کو ان کے مطابق درست نہیں کرتے۔ اکثر لوگ جنہیں دینی علم دیا جاتا ہے لیکن وہ خود اپنے علم سے ہدایت نہیں لیتے بلکہ وہ اپنے علم کو تحریف کتاب کا ذریعہ بناتے ہیں اور یہ لوگ ذاتی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ان لوگوں کی خواہشات اور ان لوگوں کے اوپر تسلط حاصل کرنے والوں کی خواہشات یعنی اس عارضی دنیا کے مفادات کے ہاتھ ہی میں ان کی تکمیل ہوتی ہے۔

ہم نے کئی علمائے دین کو دیکھا ہے کہ وہ ایک حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن وہ لائن پر نہیں آتے۔ ادھر ادھر ہو جاتے ہیں بلکہ اپنی زبان سے ایسی باتوں کا اعلان کرتے ہیں جنہیں خود بھی سچا نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگ اپنے علم کو تحریف و انحراف کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے فتاوی اہل اقتدار کے حق میں استعمال کرتے ہیں اور اس طرح وہ ایسے اہل اقتدار کے اقتدار کو اور مضبوط کرتے ہیں جو اس زمین پر اللہ کے اقتدار کے لئے چیلنج ہوتے ہیں۔

ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قانون صرف اللہ کا حق ہے' اور جو شخص قانون سازی کا حق اپنے لئے مخصوص کرے وہ دراصل مدعی الوہیت ہے اور جو شخص بھی خدائی کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے۔ جو شخص کسی انسان کے لئے اس حق کو تسلیم کرے وہ بھی کافر ہے۔ اس کے باوجود اور اس بات کو جانتے ہوئے وہ ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا جو اپنے آپ کو قانون ساز کہتے ہیں اور الوہیت اور خدائی کے مدعی ہیں اور جن کے بارے میں خود اس عالم دین نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ وہ کافر ہیں بلکہ یہ عالم دین ایسے لوگوں کو مسلمان بھی کہتا ہے اور جو وہ کرتے ہیں اس کو اسلام کہتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک سال جو کچھ لکھتا ہے تو سود کو حرام قرار دیتا ہے اور دوسرے سال اپنی تحریروں میں سود کو حرام قرار دیتا ہے۔ ان میں سے بعض لوگ فسق و فجور کو ایک مبارک امر قرار دیتے ہیں۔ فسق و فجور کو اسلامی نام اور عنوان دیتے ہیں اور اسے اسلامی لباس میں لاتے ہیں۔

اب یہ شخص کیا اس تبصرے کا مصداق نہ ہو گا کہ جسے اللہ نے ایسی آیات دیں اور علم دیا اور وہ اللہ کے دلائل و علم سے نکل بھاگا' شیطان نے اسی پر گرفت مضبوط کر لی اور یہ شخص گمراہیوں میں سے ہو گیا۔ قرآن کریم جس شخص کے بارے میں خبر دے رہا وہ شخص اسی کا مصداق ہو گا۔ اس کو اللہ نے علم دیا' سربلندی کے ذرائع دیئے لیکن وہ بلندیوں کی طرف سفر کرنے کے بجائے پستیوں کی طرف گرتا رہا۔ ذرا قرآن کریم کے اس تبصرے اور اس خبر کو پڑھئے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ

(۱۷۵) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ

الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (۷: ۱۷۶) "اور اے نبی" ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔

جس شخص کی خبر قرآن دے رہا ہے یہی ہمارے دور کے ایسے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ یہ مثال ہر اس شخص پر فٹ ہے جسے اللہ نے علم دیا تاکہ لیکن وہ اس علم کے تقاضوں پر نہ چلا۔ اس نے ایمان کی راہ اختیار نہ کی' اللہ کی نعمتوں سے کھینچ کر نکل گیا۔ اور شیطان کا تابع مہمل ہو گیا۔ اب وہ باؤلے کتے کی طرح زبان لٹکائے پھرتا رہے گا۔

جس طرح قرآن ہمارے احساس میں ڈالتا ہے۔ یہ شخص اغراض دنیا کے پیچھے زبان لٹکائے بھاگ رہا ہے اور اغراض دنیا ہی کی وجہ سے یہ انعامات الہیہ سے اپنے آپ کو کھینچ کر باہر لے آیا ہے۔ اور یہ کتے کی طرح زبان لٹکائے ہوئے ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایسا شخص اغراض دنیا کی جانب سے کبھی بھی مطمئن نہ ہوگا۔ جس شخص کی نکیل اغراض دنیا کے ہاتھ میں چلی جائے وہ ان سے چھوٹ نہیں سکتا' چاہے تم انہیں ہزار وعظ و نصیحت کرو۔ وہ اس راہ پر زبان لٹکائے سرکاری دفاتر کا طواف کرے گا اور کرتا رہے گا۔

انسانی زندگی کا گہرا مطالعہ کیجئے۔ اس مثال کا مصداق تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود ہے۔ بلکہ زمانے گزر جاتے ہیں اور ایسے لوگ ہر طرف نظر آتے ہیں۔ ہر طرف سے بڑھے چلے آتے ہیں اور جن لوگوں کو اللہ بچا لیتا ہے وہ قدرت نادرہ ہوتے ہیں۔ جو آیات الہیہ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوتے ہیں' جو زمین کی پستیوں کی طرف آنے کے بجائے بلندیوں کی طرف اٹھتے ہیں' جو خواہشات نفسانیہ کو دباتے ہیں جنہیں شیطان ذلیل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اپنی ناک میں ایسی نکیل نہیں ڈالتے سمت نہیں جاتے جس کا سرا اہل اقتدار کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ غرض یہ ایک ایسی تمثیل ہے جس کے مصداق کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ہر وقت وارد اور موجود رہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو بہت دور بنی اسرائیل کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔

حضور ؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنی قوم پر یہ آیات پڑھیں اور انہیں خبردار کریں کہ وہ ان آیات الہیہ سے اپنے آپ کو کھینچ کر باہر نہ کر دیں۔ لہٰذا حضور کے بعد ہمیں ان آیات کی تلاوت کر کے لوگوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ ان آیات کی مضبوط پناہ گاہ سے اپنے آپ کو باہر نہ نکالیں۔ اور ان کو اللہ کے علوم میں سے جو حصہ ملا ہے' اسے ترک کر کے وہ اس انجام تک اپنے آپ کو نہ پہنچائیں۔ نیز اپنے آپ کو اس صورت حال میں مبتلا نہ کریں کہ انسان کتوں کی طرح زبان لٹکائے خواہشات دنیا کے پیچھے بھاگتا پھرے' جن کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اپنے آپ پر وہ ظلم نہ کریں جو ایک دشمن اپنے دشمن پر بھی نہیں کرتا کیونکہ اپنے آپ کو ایسی شکل میں ڈال کر وہ صرف اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔

ہم نے اپنے دور میں ایسے اہل علم کو دیکھا ہے کہ جو اپنے اوپر اس قسم کے ظلم کرنے میں بہت ہی حریص ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو جہنم کے ٹھکانے کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ صبح سے شام تک اپنے لئے جہنم کے ٹھکانے کو مضبوط کر رہے ہیں اور رات دن زبان لٹکائے اس کے پیچھے پھر رہے ہیں نہ ان پر نصیحت کا اثر ہوتا

ہے اور نہ کسی کی دھتکار کا۔ ایسی ہی حالت میں یہ لوگ آخر کار اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اے اللہ ہمیں بچائیو! ہمارے قدم مضبوط کیجیو۔ اور ہم پر صبر کی بارش کیجیو اور ہمیں اہل اسلام کے ساتھ موت اور خیر نصیب کیجئے۔

قرآن کریم نے ایک شخص کے بارے جو خبر ایک تمثیل کی صورت میں دی ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اس پر قدرے طویل اور دوبارہ غور کریں۔

یہ ایک ایسے صاحب علم کی تمثیل ہے 'جس پر خواہشات نفس اور لذات دنیاوی اس قدر بوجھ ڈال دیں کہ وہ اس بوجھ کو نہ سہار سکے اور زمین پر گر جائے اور ان شہوات کی جاذبیت کی وجہ سے وہ براہ راست ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے پیچھے پڑ جائے اور شیطان اس کے پیچھے پڑ جائے اور اسے اپنی گرفت میں لے کر اپنی مرضی سے چلانا شروع کر دے اور اس کے منہ میں خواہشات نفسانیہ کی لگام پڑی ہو۔

چونکہ صرف علم انسان کو نجات نہیں دے سکتا۔ اسی لئے قرآنی منہاج تربیت نفس انسانی کی تربیت اور اسلامی زندگی کی ترویج کے لئے ایک خاص منہاج وضع کرتا ہے۔ اسلام صرف علم پیش نہیں کرتا بلکہ علم کو ایک زندہ اور متحرک شکل دیتا ہے تاکہ اسلامی مقاصد ذہنی اور فکری دنیا میں بھی سامنے آئیں اور عملی زندگی میں بھی سامنے آئیں۔

اسلامی منہاج یہ نہیں ہے کہ اسلامی عقائد کو محض نظریات کی شکل میں پیش کرے۔ محض تحقیق و توثیق کے لئے۔ اور انسان کے فکر و نظر اور اس کے عمل اور تگ و دو پر اس کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس قسم کی مجرد تحقیقات محض جامد علم ہوتی ہیں' ایسا علم انسان کو خواہشات نفسانیہ کی زد سے نہیں بچا سکتا۔ نہ دنیا میں اسے سربلند کر سکتا ہے' خصوصاً سفلی جذبات و خواہشات سے۔ ایسا علم شیطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ یہ شیطان کے لئے راہ ہموار کرتا ہے اور اس کی وجہ سے انسان شیطان کی غلامی اختیار کر لیتا ہے۔

اسلام دین کے بارے میں محض تحقیقات میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ مثلاً اسلامی نظام کے بارے میں "تحقیقات" اسلامی فقہ کے بارے میں "تحقیقات"' اسلام کے اقتصادی نظام کے بارے میں "تحقیقات" اسلام کے سائنسی نظریات کے بارے تحقیقات' علوم نفس کے بارے میں اسلامی تحقیقات وغیرہ وغیرہ۔

اسلام عقائد اسلامی کو ایک متحرک' ترقی پذیر' زندہ اور بیدار اور غالب اور سربلند ہونے والے عقائد کی شکل میں لاتا ہے۔ عقل و نظریہ پر چھانے کے بعد یہ عقائد فوراً ایک مسلمان کو اسلامی مقاصد پورے کرنے کے لئے متحرک کر دیتے ہیں۔ جب کسی مردہ ضمیر آدمی کے قلب و نظر میں بھی یہ عقائد جاگزیں ہوتے ہیں تو اسے زندہ کر دیتے ہیں۔ اور یہ عقائد قبول کرنے والا اپنے آپ کو جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اسلام کی سربلندی کے لئے جدوجہد شروع کر دیتا ہے۔ اس کی فطرت فوراً پہلے فطری عہد کی طرف لوٹ جاتی ہے اور یہ شخص بلند مقاصد کے لئے متحرک ہو جاتا ہے اور اسے دنیا کی آلودگیاں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں۔ یہ کبھی فسق و فجور کے کیچڑ میں لت پت نہیں ہوتا۔ قرآن اسلام کو ایک منہاج فکر و تدبر کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہ دنیا کے تمام مناہج سے ممتاز نظر آتا ہے۔ یہ آیا ہی اس لئے ہے کہ دنیا کے دوسرے نظاموں کو کوتاہیوں کی نشاندہی کرے' ان کی غلطیوں اور کج رویوں کی اصلاح کرے' ان پر سے جسمانی اور مادی بوجھ اتار دے اور انہیں شیطان کی گمراہیوں سے نجات دے۔

قرآن اسلام کو حق و باطل کے لئے ایک معیار اور میزان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس معیار کے ذریعہ لوگوں کے ذرائع ادراک اور ان کی عقلوں کو پرکھا جاتا ہے' لوگوں کی حرکات' ان کے رجحانات اور ان کے تصورات کو اس کے مطابق جانچا جاتا ہے۔ اسلام سے قبل دنیا میں کوئی ایسا معیار نہ تھا کہ اسے کام میں لایا جاتا اور یہ میزان اور معیار جسے رد کر دے وہ ردی ہو گا اسے پھینک دیا جائے گا۔

اسلام انسانیت کو ترقی دے کر ایک نہایت ہی بلند مقام تک لے جانا چاہتا ہے لیکن شاہراہ ترقی پر اسلام اسے نہایت ہی دھیمی رفتار سے لے جانا چاہتا ہے۔ یہ کام وہ اپنے منصوبے اور اپنے اندازوں کے مطابق کرتا ہے' ترقی کی اس شاہراہ پر چلنے کے لئے اسلام لوگوں کو اپنا ایک مفصل نظام زندگی دیتا ہے۔ ان کو ایک مفصل نظام قانون دیتا ہے' ان کو ایک مستقل نظام اقتصاد دیتا ہے' ان کے لئے سوسائٹی کے اصول اور سیاست کے اصول متعین کرتا ہے' اس کے بعد وہ لوگوں کو وضع اصول کے بعد آزادی دیتا ہے کہ ان اصول کی روشنی میں وہ اپنے لئے تفصیلی نظام وضع کریں۔ کائناتی امور میں انسان انکشافات کرتے ہیں اور نفسیاتی دنیا کے لئے' قواعد بناتے ہیں اور اپنی عملی زندگی کو منضبط کرتے ہیں۔ یہ اس دنیا میں رات و دن ترقی کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں حرارت ایمان موجود رہتی ہے۔ وہ ایک حقیقی نظام قانون وضع کرتے ہیں اور اس سے وہ اپنی تمام ضروریات کا حل نکالتے ہیں۔

اس طرح اسلامی نظام حیات' اسلامی زندگی کی شکل میں نفس انسان کی قیادت کرتا ہے' رہی وہ تحقیقات جو محض نظری قیل و قال تک محدود ہوتی ہیں تو ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نہ تو شیطان کے مقابلے میں ایک فرد کو فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اسلامی خطوط پر انسانی زندگی کو عملاً منظم کر سکتا ہے' نہ انسانی زندگی کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتا ہے۔ اس منظر میں جو مثال دی گئی ہے' اب اس پر یہاں ایک مختصر تبصرہ کیا جاتا ہے' اس شخص کی مثال جسے اللہ نے اپنی ہدایات دیں مگر وہ ان سے نکل گیا' تبصرہ یہ ہے کہ ہدایت دراصل وہی ہوتی ہے جو من جانب اللہ ہو' جسے اللہ ہدایت دینا چاہے وہی ہدایت پر ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے وہ ہمیشہ کے لئے خسارے میں پڑ جاتا ہے۔ اب وہ کسی معاملے میں بھی نفع نہیں کما سکتا۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

"جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پاتا ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے' وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ صرف اسی شخص کو ہدایت دیتا جو ہدایت کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ دوسری سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا "جو لوگ ہمارے بارے میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کریں گے۔" اور دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ "اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت بدلنے کی سعی نہ کرے اور دوسری جگہ ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ

مَنْ دَسّٰاھَا" "اور وہ نفس کی اور یہ جو اسے برابر کیا اور اسے برائی اور خدا خوفی سے آگاہ کیا۔ وہ کامیاب ہوا جس نے اس نفس کو پاک کیا اور وہ ناکام ہوا جس نے اسے ناپاک کیا۔"

جو شخص دلائل ہدایت کو ترک کر کے اپنے لئے راہ ضلالت کو پسند کر لیتا ہے اللہ بھی اسے گمراہ کر دیتا ہے کیونکہ ایسا شخص اپنے دل' اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو ہدایت کے لئے بند کر دیتا ہے اور اسی سیاق و سباق میں درج ذیل آیت اسی مفہوم کو ظاہر کر رہی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔"

اور دوسری جگہ فرمایا گیا فِی قُلُوْبِھِمْ مَرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا "ان کے دل میں بیماری ہے' پس اللہ نے بھی ان کی بیماری کو زیادہ کر دیا۔" اور ایک دوسری آیت میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْھَا "وہ لوگ جنہوں نے کفر کو اختیار کیا اور اپنی جانوں پر ظلم کیا' اللہ بھی ان کو بخشنے والا نہیں ہے اور نہ انہیں صحیح راستے کی ہدایت دیتا ہے' ماسوائے جہنم کے راستے کے جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔"

ان تمام آیات پر غور و فکر کرنے کے بعد جن میں ہدایت و ضلالت کا ذکر ہے اور ان کے مفہوم کے اندر تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے بعد صرف ایک ہی تشریح و تطبیق ممکن ہے جس میں دل کا اطمینان بھی ہے اور وہ ان لاہوتی جدلیات سے بھی پاک ہے جن میں اسلامی متکلمین' یہودی' مسیحی اور دوسرے مذاہب فلسفہ ہمیشہ باہم دست و گریبان رہے ہیں' وہ یہ کہ اس کائنات میں اللہ کا نظام قضا و قدر اللہ کی مشیت کے ایک وسیع دائرے کے اندر کام کرتا ہے۔ اس دائرے کے اندر انسان کی تخلیق ہوئی ہے اور اس نظام قدر کے مطابق انسان کے اندر ہدایت اور ضلالت کی دہری صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ انسان کی فطرت مخلوقہ کے اندر ہی یہ فطری عہد رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اللہ وحدہ کی معرفت حاصل کرے اور ربوبیت کا اعتراف کرے' پھر انسان کو ہدایت و ضلالت کی دہری صلاحیت کے ساتھ عقل کی قوت تمیز بھی دی گئی ہے جو ہدایت و ضلالت کو پہچانتی ہے۔ اس پر مستزاد اسے رسولوں کے ذریعے دلائل و نشانات ہدایت بھی بھیجے گئے تاکہ اگر اس کی فطرت پر کوئی تہ جم گئی ہو تو

اسے صاف کرتا جائے لیکن ان تمام انتظامات کے ساتھ ساتھ اس میں قبولیت ہدایت و ضلالت کی دہری صلاحیت قائم رہتی ہے اور یہ تمام انتظام اللہ کے دائرہ مشیت' وسیع تر دائرہ مشیت کے اندر ہے۔

اللہ کی مشیت کے اندر اللہ کا نظام قضا و قدر جاری رہتا ہے اور اپنا کام کرتا ہے لہٰذا اس دائرے کے اندر جو شخص ہدایت کا انتخاب کرتا ہے وہ ہدایت کی راہ لیتا ہے 'تقدیر اسے ہدایت دیتی ہے اور اگر وہ دلائل ہدایت اور اشارات فطرت کے مطابق نہیں چلتا تو یہ تقدیر اسے راہ ضلالت پر ڈال دیتی ہے۔ اس لئے کہ اس شخص نے اس عقل سے کام نہ لیا جو اسے عطا ہوئی تھی۔ اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہ لیا جو اس کائنات کے اندر بکھری ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے اسے دی گئی تھی۔ پھر ان ہدایات میں بھی موجود تھیں جو رسولوں کے ذریعے بھیجی گئیں۔

لیکن کوئی شخص جو راہ بھی اختیار کرے وہ اللہ کے دائرۂ مشیت کے اندر رہتا ہے اور جو واقعہ بھی ہوتا ہے اللہ کے نظام قضا و قدر کے اندر رہتا ہے اور اللہ کی قوت کے برعکس نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ کسی انسان کا کسی طرح کا عمل بھی چلتا ہو اللہ کی مشیت کے دائرے کے اندر ہی رہتا ہے 'کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ کائنات میں صرف اللہ کی مشیت کام کرتی ہے اور تقدیر اس دائرے کے اندر ہے۔ کیونکہ اللہ کی قوت کے سوا کوئی اور قوت نہیں ہے جو اس قسم کے نظام و واقعات کو وجود میں لا سکتی ہو۔ غرض انسان اس وسیع دائرے کے اندر متحرک ہے اور اسی دائرے کے اندر وہ جو راہ چلتا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ تصور جو ان تمام آیات کے مطالعے سے ذہن میں آتا ہے بشرطیکہ ان آیات کو ایک دوسرے کے بالمقابل بطور مناظرہ نہ پیش کیا جائے اور انہیں یکجا پڑھ کر ان کی تطبیق کر کے ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب الخصائص التصور الاسلامی) آخر میں یہ تبصرہ آتا ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ "جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پر ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔"

یعنی مذکور بالا تفسیر کے مطابق جو راہ ہدایت لیتا ہے تو اللہ اسے ہدایت دے دیتا ہے' وہ اپنے مطلوب تک پہنچ جاتا ہے۔ اسے راستہ بھی معلوم ہوتا ہے' وہ اسی راستے پر چلتا ہے۔ اور دنیا و آخرت میں فلاح پاتا ہے۔ اور جسے اللہ اپنی سنت کے اصولوں کے مطابق گمراہ کرتا ہے۔ وہ گمراہ ہوتا ہے۔ تو وہ ہمہ پہلو خسارے میں رہتا ہے اگرچہ وہ بظاہر مالدار نظر آئے۔ لیکن وہ خسارے میں ہوتا ہے 'کیونکہ اس کی دولت بے حقیقت ہوتی ہے 'محض ہوا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے اپنی ذات کو گنوا دیا ہے' اور جس کی شخصیت گم ہو جائے' اپنی ذات کو ہار جائے اسے کیا نفع ہو گا۔

---ooo---

مذکورہ بالا آیات کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کی تائید درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷:۱۷۹) "اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے ۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں ۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ' یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں ۔"

جن و انس میں سے اکثریت جہنم کے لئے پیدا کی گئی ہے' اس کے لئے وہ تیار ہو رہے ہیں' تو ان لوگوں کا یہ انجام کیوں ہے ؟ اس اعلان کے دو پہلو ہیں' ایک یہ کہ اللہ کو پیشگی علم تھا کہ وہ یہ مخلوق جہنم کی راہ لے گی اور جہنم تک پہنچے گی ۔ ان لوگوں کا عملاً جہنم کی راہ لینا اللہ کے علم سے متاثر نہیں ہوتا ۔ اللہ کا علم تو ہر شے پر محیط اور ازلی ہے ۔ اللہ کو پیدائش انسان اور عمل انسان سے بھی بہت پہلے معلوم تھا کہ فلاں فلاں یہ راہ لے گا ۔ اللہ کا علم وقوع واقعات پر موتوف نہیں ہے بلکہ پہلے سے ذات باری کا حصہ ہے ۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ اپنے علم ازلی سے جو ذات باری کے ساتھ ہے لوگوں کو عالم واقعہ میں اس امر پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ یہ کریں اور دوسری راہ اختیار نہ کریں بلکہ وہ خود اپنی صلاحیت اور ذات کی وجہ سے خود ایسا کرتے ہیں ۔ چنانچہ اللہ فرماتے ہیں "ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں' مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں ۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان کے ساتھ سنتے نہیں ۔"

ان کو دل و دماغ اس لئے دیئے گئے تھے کہ وہ انہیں کھولیں اور بات کو سمجھنے کی کوشش کریں' جبکہ پوری کائنات میں دلائل ایمان بکھیرے پڑے ہیں' پھر رسولوں نے جو پیغام دیا اس میں بھی دلائل و معجزات موجود ہیں اگر دل بصیرت رکھتا ہو اور آنکھیں کھلی ہوں تو ہدایت پا سکتے تھے مگر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور آیات الہیہ کو نہ دیکھا ۔ انہوں نے کان بند کر لیے اور پیغمبروں کی دعوت کو نہ سنا ۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو معطل کر لیا ۔ حالانکہ وہ ان کے فائدے کے لئے دی گئی تھیں ۔ وہ حیوانات کی طرح غافل رہے لہٰذا وہ جانوروں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں ۔"

وہ لوگ جو ان آیات و نشانات سے غفلت برتتے ہیں جو ان کے اردگرد کائنات میں بکھری پڑی ہیں' جو لوگ اپنی آنکھوں سے ایسے واقعات اور عبرت آموز حادثات دیکھتے ہیں لیکن ان میں ان کو اللہ کا ہاتھ نظر نہیں آتا' یہ لوگ بے شک جانوروں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں ۔ اس لئے کہ مویشیوں کے بھی کچھ فطری وظائف ہوتے ہیں اور ہر جانور انہیں پورا کرتا ہے ۔ رہے جن و انس تو انہیں ایک سوچنے والا دل دیا گیا اور دیکھنے والی آنکھ دی گئی' سننے والے کان دیئے گئے جب انہوں نے دلوں سے نہ سوچا' آنکھوں سے نہ دیکھا' اور کانوں سے نہ سنا اور اس پوری کائنات کی رفتار پر سے غافل ہو کر گزر گئے اور اس کے مقاصد و معانی نہ سمجھے' ان کی آنکھوں نے ان اشارات کو نہ دیکھا جو یہاں ہیں' ان کی سماعت پر اس پوری کائنات کی چیخ و پکار نے بھی اثر نہ کیا تو یقیناً یہ لوگ اور اس قسم کے دوسرے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ٹھہرے جو کم از کم اپنے فطری وظائف تو سرانجام دیتے ہیں ۔ اور یہ لوگ جہنم کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اللہ کی مشیت کے وسیع دائرے میں اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق پر جہنم کے مستحق ٹھہرے ہیں ۔ انہیں مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ یہ راہ اختیار کریں بلکہ اللہ کو اس کے علم قدیم کے ذریعے اس کا علم تھا کہ وہ ایسا کریں گے

اور بھریں گے اور جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

---○○○---

توحید کے فطری اور کائناتی میثاق کے منظر کو پیش کرنے کے بعد اور اس میثاق سے انحراف کرنے والوں کی تمثیل کے بعد جو ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہیں آیات الہیہ دی جاتی ہیں اور وہ ان سے نکل بھاگتے ہیں۔ اب یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو لوگ منحرف اور گمراہ ہیں اور جو دعوت اسلامی کا مقابلہ کرتے ہوئے شرک اور کفر کے نمائندے ہیں' جو اللہ کے ناموں کو بگاڑ کر غلط استعمال کرتے ہیں اور ان سے اپنے بتوں کو موسوم کرتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

"اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں' اس کا بدلہ وہ پاکر رہیں گے۔"

الحاد کے معنی یہ ہیں کہ کوئی راستی سے منحرف ہو جائے۔ جزیرۃ العرب میں منحرفین مشرکین نے اللہ کے ناموں میں انحراف اور تبدیلی کر دی تھی اور اللہ کے نام انہوں نے قدرے تغیر کے ساتھ اپنے الہوں اور بتوں کے رکھ دیئے تھے۔ اللّٰہ کو اللّات کر کے بت کا نام رکھ دیا۔ العزیز کو العزیٰ بنا کر ایک دوسرے بت کا نام رکھ دیا۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے نام کسی اور کے لئے استعمال نہ کرو اور اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ ان ناموں کے ساتھ صرف اللہ کو پکاریں اور الفاظ میں بھی کوئی تحریف اور تبدیلی نہ کریں اور نہ امالہ کریں۔ اور اگر منحرفین ان ناموں کو غلط استعمال کرتے ہیں تو ان کے ہم محفل نہ ہوں۔ وہ جانیں اور ان کا خدا جانے۔ عنقریب انہوں نے اللہ کے سامنے جانا ہے۔ ان کے ساتھ اللہ حساب و کتاب کر لے گا۔

یہ حکم کہ جو لوگ اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں ان سے قطع تعلق کر لو صرف اس تاریخی صورت حال تک ہی محدود نہیں جس میں وہ لات اور عزیٰ کے لئے اللہ اور العزیز کو استعمال کرتے تھے' یہ اسماء الٰہی کے تحریف لفظی تک محدود ہے۔ یہ کہ اس کا اطلاق ہر قسم کی لفظی اور معنوی تحریف پر بدستور ہوتا ہے۔ چاہے وہ تحریف کریں یا انحراف کریں۔ وہ تصور الٰہ میں انحراف کریں مثلاً اللہ کے لئے اولاد کے قائل ہوں یا یہ معنوی انحراف کریں کہ اللہ کی مشیت قوانین فطرت میں مقید ہے یا وہ اللہ کے اعمال اور اعمال کی کیفیات کو انسانوں کے اعمال کی کیفیت سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ یا وہ اللہ کو زمین و آسمان اور آخرت کا الٰہ تو قرار دیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک زمین پر اللہ کی سیاسی اور قانونی حکمرانی نہیں ہے۔ اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قانون سازی کرے۔ لوگ بذات خود یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے لئے قانن سازی کریں اور یہ قانون سازی وہ اپنی عقل' تجربے اور مفادات کے مطابق کریں۔ لہٰذا سیاسی اعتبار سے ایسے لوگوں کے نزدیک انسان خود اپنے خدا اور معبود ہیں۔ یا بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کے خدا اور الٰہ ہیں۔ یہ تمام افکار اللہ کی ذات و صفات میں الحاد کے ضمن میں آتے ہیں۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان امور سے اپنے آپ کو

بچائیں اور دور رکھیں - اور جو لوگ اس قسم کا الحاد کرتے ہیں ان کے لئے یہ وعید ہے کہ انہیں سخت سزا دی جائے گی بوجہ اس الحاد کے -

---

اس کے بعد اب ہدایت و ضلالت کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام بیان کی جارہی ہیں' اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بعض لوگ پیدائشی طور پر جہنمی ہیں -" ان کے دل ہیں مگر ان کے ساتھ سوچتے نہیں - ان کی آنکھیں ہیں مگر ان کے ساتھ دیکھتے نہیں' ان کے کان ہیں مگر ان کے ساتھ سنتے نہیں -"

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں اور اللہ کے اس حسنیٰ کو غلط جگہ استعمال کرتے ہیں - ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے سچائی کو پختگی کے ساتھ پکڑا ہوا ہے اور وہ لوگوں کو بھی سچائی کی طرف بلاتے ہیں - وہ سچائی کے مطابق فیصلے صادر کرتے ہیں اور اس سے ذرہ بھر انحراف نہیں کرتے - ایک گروہ ایسا ہے جو ضد کی وجہ سے حق کا انکار کرتا ہے - اللہ کی آیات کو جھٹلاتا ہے - پہلا گروہ تو وہ ہے کہ ان کا وجود اس سرزمین پر مستحکم ہے - یہ لوگ جمے ہوئے ہیں اور یہ حق کے نگہبان ہیں - اور جو لوگ انحراف کرتے ہیں اور جو ٹیڑھی راہوں پر چلتے ہیں یہ ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور جب دوسرے لوگ حق کی تکذیب کرتے ہیں اور حق کو چھوڑ دیتے یہ لوگ حق کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں - رہے فریق مخالف تو ان کا انجام خوفناک ہو گا اور ان کے مقابلے میں اللہ کی تدبیر مستحکم ہو گی -

---

۲۲

وَ مِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ ع ۱۰

۱۲

وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾

"ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ ہدایت اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے - رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے' تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی - میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں' میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے -

یہ لوگ جو حاملین حق ہیں اگر انسانیت میں یہ نہ ہوں تو انسانیت عزت اور شرف کی مستحق ہی نہ ہو' یہ گروہ جسے قرآن کریم اسلامی اصطلاح کے مطابق امت کہتا ہے اس دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے - یہ وہ جماعت ہوتی ہے جس کا ایک ہی نظریہ ہوتا ہے' جو اس نظریہ اور عقیدے پر باہم منظم اور مربوط ہوتی ہے اور اس کی قیادت بھی ایک ہی ہوتی ہے - یہی امت ہے جو حق پر جمی ہوئی ہے - جو حق پر عمل پیرا ہوتی ہے' اور یہ اس سچائی کی نگہبان ہوتی ہے - اور یہ اس نظریہ کی شہادت لوگوں پر دیتی ہے اور گمراہیوں کے خلاف اللہ اس امت کے ذریعے شہادت اور حجت قائم کرتے ہیں -

اور ذرا اس کی صفت پر غور کریں۔

يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷: ۱۸۱) "یہ گروہ حق سے ہدایت لیتا ہے اور حق کی ہدایت دیتا ہے اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کرۂ ارض پر سے اس امت کا وجود ختم نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس کے افراد کی تعداد کم ہو جائے۔ یہ لوگ سچائی کی ہدایات دیتے اور اس کے پیرو ہیں ہیں اور یہ لوگ کسی بھی وقت اس دعوت سے خاموش نہیں ہوتے۔ وہ اس حق پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ اس حق کو اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے دوسروں تک بھی پہنچاتے ہیں۔ ان کے ارد گرد ایسی قیادت موجود ہوتی ہے اور اس قیادت نے حق کو ترک کر دیا ہوتا ہے اور انہوں نے اپنے اس فطری عہد کو بھی بھلا دیا ہوتا ہے جو انہوں نے اللہ سے کر رکھا تھا۔ غرض اس گروہ کا عمل مثبت ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے آپ تک محدود نہیں ہوتے بلکہ وہ اس کے حامل ہوتے ہیں اور دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اور وہ اس سچائی کے ساتھ قیادت کرتے ہیں۔

ان کی ڈیوٹی یہاں تک ہی ختم نہیں ہو جاتی کہ بس وہ حق کی دعوت دے دیں بلکہ ان کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں میں اس حق کو قائم کریں۔ اس کے مطابق فیصلے کریں۔ دنیا میں نظام عدل قائم کریں اور ظاہر ہے کہ نظام عدل اس حق کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ حق اس لئے نہیں آیا کہ اسے صرف پڑھایا جائے اور ایک علمی مشغلہ ہو' یہ حق اس لئے بھی نہیں آیا کہ یہ محض وعظ اور نصیحت ہو' بلکہ یہ اس لئے آیا ہے کہ حق لوگوں کے درمیان فیصلے کر دے۔ پہلے وہ لوگوں کے اعتقادی تصورات اور نظریات کے فیصلے کرے کہ کیا عقیدہ درست ہے اور کیا نظریہ غلط ہے۔

چنانچہ حق سب سے پہلے تطہیر افکار کا کام کرتا ہے اور لوگوں کی فکری اساس کو درست کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ حق لوگوں کا ربط اللہ سے قائم کر کے اللہ کے سامنے جو مراسم عبودیت ادا کئے جاتے ہیں ان کو درست کرتا ہے۔ اور اس کے بعد لوگوں کی اجتماعی زندگی کو اس حق پر استوار کر کے اسے ایک نظام زندگی کی شکل میں قائم کرتا ہے۔ لوگوں کی اجتماعی زندگی اور ان کی سوسائٹی کو حق کے اصولوں پر قائم کر کے ' اس اجتماعی نظام میں حق کے قوانین اور شریعت کو نافذ کرتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اخلاق و عادات ' ان کے رسم و رواج ' ان کے طرز عمل اور سلوک کو سچائی پر منظم اور استوار کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ درست تصورات اور عقائد کی اساس پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے طرز فکر ' ان کے علوم اور ان کی ثقافتی سرگرمیوں کو بھی اس نظام حق پر ترقی دی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ ڈیوٹی جو اس امت کو دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امت ممتاز اور متعارف ہے اور یہ اس امت کی شناخت ہے۔

غرض اس دین کا مزاج بالکل واضح ہے اور اس کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی یا التباس ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ٹھوس مزاج ہے اور یہ بدل ہی نہیں سکتا' جو لوگ دین میں الحاد کی مساعی کرنا چاہتے ہیں وہ بسا سعی نامسعود کے ساتھ دین کے اس سخت مزاج کو بدل نہیں سکتے۔ یہ لوگ اس سلسلے میں ان تھک مساعی کرتے ہیں مسلسل اپنے تگ جاری رکھے ہوئے ہیں' یہ لوگ ہر قسم کے وسائل و ذرائع کام میں لا کر اس دین کے نقطہ نظر کو بدلنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں تمام تجربات سے استفادہ کرتے ہیں' اس پوری دنیا میں جو لوگ احیائے اسلام کا کام کرتے ہیں اور جو اس سچائی کو سینے سے لگا کر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ان کے خلاف اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہر حربے کو استعمال کرتے

ہیں - ان کو مٹانے کی سعی کرتے ہیں اور انہوں نے تمام اسلامی علاقوں میں اپنے ایجنٹوں کی تنظیمیں اور حکومتیں قائم کر رکھی ہیں، پھر یہ لوگ ان علاقوں پر دین فروش علماء کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور یہ علماء دین اسلام کی تحریف کا کام کرتے ہیں - یہ لوگ حرام کو حلال کرتے ہیں اور حلال کو حرام کرتے ہیں' اللہ کی شریعت کو نرم کرتے ہیں اور ہر قسم کے فسق و فجور کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' اور فحاشی کو رواج دیتے ہیں' اور فحاشی اور فسق و فجور کو اسلامی عنوانات دیتے ہیں - یہ لوگ ایسے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جو جدید مادی ترقیات سے متاثر ہوں' اور جدید نظریات سے مرعوب ہوں اور انہیں اپنے جھولوں میں بٹھاکر ورغلاتے ہیں - اس طرح یہ لوگ اسلام کو اپنی ٹھوس اساس سے ہٹاکر جدید نظریات کا رنگ دیتے ہیں یوں اسلام کے اندر جدید نظریات' تہذیب جدید کے شعارات اور جدید رسوم اور قوانین اسلام کے نام سے داخل کرتے ہیں - یہ لوگ یہ تاثر دیتے ہیں کہ اسلامی تہذیب ایک تاریخی حادثہ تھا اور اسے کسی صورت میں بھی دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا - نہ اس حادثے کا اعادہ ممکن ہے - یہ لوگ اسلام کی عظمت رفتہ کو رفت و گزشت سے تعبیر کر کے مسلمانوں کے جذبات کو سن کرنا چاہتے ہیں اور پھر ان کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آج اسلام اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو وہ ایک عقیدے اور مراسم عبودیت تک محدود ہوکر زندہ رہ سکتا ہے - اس کا سیاسی اور قانونی نظام نہیں چل سکتا - اسلام کے لئے عظمت رفتہ کے قصے کہانیاں ہی بہتر اور کافی و شافی ہیں - اگر یہ نہیں تو پھر یہ ممکن ہے کہ اسلام کے اندر اس قدر تغیرات پیدا کئے جائیں کہ وہ جدید دور کے حالات کے تابع ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو لوگوں کی خواہشات اور ان کی واقعی صورت حالات کے مطابق ڈھال لے' اور عالم اسلام میں یہ لوگ خود جو لادینی نظریات رائج کر رہے ہیں ان کو وہ اسلام قرار دینے کے درپے ہیں - یہ لوگ قرآن کی ایسی تعبیرات کرتے ہیں جو قدیم قرآن میں متعارف نہ تھیں بلکہ خدا اور جبریل اور مصطفیٰ ؐ کو بھی ان کا پتہ نہ تھا - یہ لوگ جس طرح قرآن کو بدلنا چاہتے ہیں اسی طرح اسلامی معاشروں کو بھی بدلنا چاہتے ہیں - اور یہ اس لئے کہ دین اسلام کو ایسے افراد کار ہی نہ ملیں جو اس کے کام کے ہوں - عالم اسلام میں یہ لوگ ایسا معاشرہ وجود میں لانا چاہتے ہیں جو جنسی بے راہ روی گندے کے تالاب میں غرق ہو اور لوگ فحاشی اور بدکاری اور بد اخلاقی میں غرق ہوں اور جنہیں دنیاوی عیش و مستی کے سوا کسی اور غرض سے سروکار نہ ہو اور وہ دنیا میں اس قدر غرق ہوں کہ انہیں حق و صلاحیت اور اصل قرآنی ہدایات سننے کے مواقع ہی نہ ہوں' اس طرح کہ غلطی سے بھی ان کے کانوں تک اسلامی ہدایات نہ پہنچ سکیں -

یہ وہ ہمہ گیر معرکہ ہے جو اس وقت اس امت کے خلاف اور اس دین کے خلاف چار دانگ عالم میں برپا ہے' وہ امت جو اس دین سے ہدایت لیتی ہے اور اس کی داعی ہے اور جو اس کا نظام عدل دنیا میں قائم کرنا چاہتی ہے - یہ وہ ہمہ گیر معرکہ آرائی ہے جس میں دشمنان اسلام ہر قسم کا ہتھیار کام میں لا رہے ہیں - بے حد و حساب وسائل اس میں جھونک رہے ہیں - اس کے لئے دشمن اپنی تمام تر قوتوں کو منظم کر کے' انہیں وسائل دے کر اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع اور جدید سے جدید ذرائع ابلاغ دے کر میدان میں لایا ہے - ان قوتوں کی پشت پر عالمی تنظیمیں اور ادارے ہیں اور یہ عالمی کفالت اور ضمانت نہ ہو تو دشمنان اسلام کے یہ ایجنٹ اور یہ ادارے اور حکومتیں اس امت کے داعیوں کے سامنے ایک دن بھی ٹک نہ سکیں -

لیکن اس ہمہ گیر معرکہ آرائی اور وسیع و عریض مہمات کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین نہایت ہی سخت جان

دین ہے۔ یہ امت جو اس دین کے لئے کوشاں ہے' نہایت ہی سخت جان ہے۔ اپنی قلت تعداد اور اپنے قلت وسائل کے باوجود اور اپنی کمزوریوں کے باوجود وہ اس وحشیانہ حملے کے مقابلے میں ڈٹی ہوئی ہے۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۸۲) وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ (۱۸۳) "ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت کرتا ہے اور حق کے مطابق انصاف کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے' تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں' میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے۔"

یہ لوگ اس قوت' اس الٰہی قوت کو خاطر میں نہیں لاتے' اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مذکورہ بالا مہم جاری رکھے ہوئے ہیں' حالانکہ امت مسلمہ نے اسلام کو مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے وہ اسلام کی قوت پر مجتمع ہے۔ یہ وہ قوت ہے کہ آیات الٰہیہ کی تکذیب کرنے والے اس کو سمجھ نہیں پا رہے۔ وہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے کہ اللہ نے ان لوگوں کو ڈھیل دے رکھی ہے' اور یہ ڈھیل ایک مقررہ وقت تک ہے' اور ان کو یہ یقین ہی نہیں ہے کہ اللہ کی تدبیر نہایت ہی مستحکم ہوتی ہے۔ ان دشمنان اسلام نے ایک دوسرے کے ساتھ دوستیاں گانٹھ رکھی ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس زمین پر ان کا راج ہے۔ لیکن یہ لوگ خدا کی قوت کبریٰ کو دیکھ نہیں پا رہے۔ غرض جھٹلانے والوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اللہ ان کو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اور سرکشی اور نافرمانی کے لئے انہیں طویل مہلت دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اللہ کی اسکیم میں پوری طرح پکڑے جاتے ہیں اور یہ تدبیر عام شخص کی نہیں ہوتی کہ اللہ جیسے جبار اور صاحب قوت متین کی تدبیر ہوتی ہے۔ لیکن دشمنان اسلام غافل ہیں اس بات سے کہ آخری انجام ان لوگوں کا ہی ہوگا جو متقین ہیں اور جو حق پر ہیں اور حق کے داعی ہیں اور حق کا نظام عدالت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن کریم ان آیات میں ان لوگوں کو تنبیہ کر رہا ہے جو اس وقت مکہ میں اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ لیکن یہ آیت مکہ کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' ازمنہ مابعد میں بھی امت مسلمہ کے ساتھ اس کے دشمنوں کا یہی سلوک ہے اور ہو گا' اللہ ان مخالفوں کو مہلت دیتا ہے لیکن اس کی تدبیر مستحکم ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں آنکھیں کھول کر کریں۔ اپنے دل و دماغ سے کام لیں اور اپنے آپ کو جہنمی مخلوق میں شامل نہ کریں۔ اسلام اہل مکہ کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معاملے میں اپنے رویئے پر اچھی طرح غور کریں' کیا وہ دیکھتے نہیں کہ آپ حق کے حامل اور حق کے داعی ہیں۔ نیز اہل مکہ زمین و آسمان کی ساخت اور بادشاہت پر غور کریں۔ کیا اس میں سچائی تک پہنچانے والی آیات و معجزات بکھرے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ مہلت جو انہیں دی جا رہی ہے یہ بہت ابدی اور طویل نہیں ہے۔ اللہ کی تدبیر کے وقوع کا وقت بہت ہی قریب ہے۔ وہ کیوں اس قدر غافل ہو گئے ہیں؟

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ

مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ
شَيْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

''اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (برا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے' آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟''

اسلام یہ کوشش کرتا ہے کہ انسانوں کو مدہوشی سے ہوش میں لائے' ان کو غفلت کے خواب گراں سے جگائے اور انسان کی فطرت کو ان تہوں کے نیچے سے نکال کر باہر لائے جو اس کے اوپر جمی ہوئی ہیں۔ انسانوں کے شعور کو تازہ کرے۔ قرآن انسان کی شخصیت اور انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور اس کی ان صلاحیتوں کو جگاتا ہے جن کے ذریعہ وہ دعوت اسلام کو قبول کرلیں۔ قرآن کریم محض جامد اور خشک قسم کا مناظرہ نہیں کرتا۔ وہ انسان کی حقیقی شخصیت کو گمراہی کی گہری تہوں کے نیچے سے نکالتا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۷:۱۸۴) ''اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (برا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔''

قریش کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈے کی جنگ میں سب سے بڑا ہتھیار یہ تھا کہ وہ آپ پر یہ الزام لگاتے کہ آپ کو جنون لاحق ہوگیا ہے اور اس پر دلیل یہ دیتے تھے کہ تم دیکھتے نہیں کہ وہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو عربوں کے معروف اسالیب کلام سے بالکل مختلف ہے۔

قریش جو یہ پروپیگنڈہ کرتے تھے' اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بک رہے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضور ؐجس دعوت کے حامل ہیں وہ دعوت حق ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو سننے کے لئے بے تاب رہتے تھے اور اپنے آپ کو کنٹرول نہ کرسکتے تھے کہ اس کے سننے سے باز رہیں۔ اس سماع کے ان پر گہرے اثرات پڑتے تھے۔ اخنس ابن شریق' ابوسفیان ابن حرب اور عمرو ابن ہشام ابوجہل کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ سب سے چھپ چھپ کر قرآن سنتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ یہ تینوں حضرات چھپ کر قرآن سننے کے لئے آئے۔ اس واقعہ کو فی ظلال القرآن میں ہم ذکر کر آئے ہیں۔ نیز عتبہ ابن ربیعہ کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ اس نے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سورہ فصلت کی آیات سنیں اور انہوں نے اسے متزلزل کر دیا۔ اور یہ واقعات بھی مشہور ہیں کہ یہ لوگ موسم حج میں لوگوں کو قرآن سے دور رکھنے کی تدابیر کرتے۔ ولید ابن مغیرہ لوگوں سے کہتے کہ یہ نہایت ہی موثر جادو ہے۔ ان سب روایات

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام' دعوت اسلام اور قرآن کی حقانیت میں شک نہ رکھتے تھے بلکہ یہ لوگ اپنے آپ کو اس دعوت سے مقابلے میں بڑا سمجھتے تھے۔ پھر ان کو یہ خطرہ تھا کہ جب ہم لہ اللہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرلیں گے تو پھر محمد ہمارے حاکم اور مقتدر اعلیٰ ہوں گے۔ کیونکہ اس کلمے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان انسانوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آجائیں اور تمام طاغوتی طاقتوں کو ختم کر دیں۔

قرآن مجید ایک عجیب اور منفرد کتاب ہے' اور اس کا اسلوب بھی لوگوں کے اندر مروج اسالیب کلام سے زیادہ منفرد ہے اس لئے قریش اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ نیز عربوں میں پیش گوئی کرنے والوں اور مجنونوں کے درمیان یک رنگی ہوتی تھی' مثلاً مجذوب لوگ عربوں میں بھی اپنے آپ کو عالم بالا سے متعلق قرار دیتے تھے جو اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے جن کی تاویل وہ حسب منشا کر سکتے تھے' ان روایات کی وجہ سے قریش حضرت نبی صلی اللہ کو بھی ایک مجذوب یا مجنون قرار دیتے تھے اور آپ ؐ کے کلام کو مجذوب یا مجنون کا کلام کہتے تھے۔

قرآن کریم ان لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا تھا اور یہ مشورہ دیتا تھا کہ یہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں غور و فکر کریں جنہیں وہ خوب جانتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ انہوں نے اس سے قبل کبھی ایسی مجذوبانہ باتیں نہیں کی تھیں۔ پھر وہ خود اس بات کے بھی گواہ تھے کہ آپ سچے اور امین ہیں جبکہ آپ کی حکمت اور دانائی اور سنجیدگی کے بھی وہ قائل تھے۔ جب حجر اسود کے معاملے میں انہوں نے آپ کو حکم بنایا اور آپ نے جو فیصلہ کیا اس کی وجہ سے وہ ایک بہت ہی عظیم خانہ جنگی سے بچ گئے۔ پھر آپ کے پاس سب لوگ اپنی امانتیں رکھتے اور یہ امانتیں اس وقت تک آپ کے پاس تھیں جب تک آپ ؐ مکہ میں تھے اور آپ ؐ کے چلے جانے کے بعد آپ ؐ کے ابن عم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں تک پہنچائیں۔

قرآن مجید ان لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ حضرت محمد کا ماضی کھلی کتاب ہے' تم' آپ ؐ کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو' آخر وہ کیا بات ہے کہ جس کی وجہ سے تم' آپ کو مجنون کہتے ہو' آپ جس معیار کا کلام آپ پیش کر رہے ہیں کیا یہ مجنونوں اور پاگلوں کا کام ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۷: ۱۸۴) "ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں' وہ ایک خبردار کرنے والا ہے جو صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔"

آپ کی عقل میں کوئی خلل نہیں ہے۔ وہ تو واضح واضح بات کرنے والا ہے۔ آپ ؐ کا کلام مجنون کے کلام سے بالکل مختلف ہے۔ اور آپ ؐ کے حالات زندگی مجنونوں کے حالات زندگی سے مختلف ہیں۔

اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (۷: ۱۸۵) "کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے' آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟

اس عجیب کائنات کے بارے میں یہ ایک دوسری کھڑکی ہے اور اس عظیم اور وسیع و عریض کائنات کو کھلی آنکھوں اور

بیدار دل کے ساتھ دیکھنے کی دعوت ہے۔اگر غور سے اس عظیم کائنات ہی پر نظر ڈال لی جائے تو انسانی فطرت جہالت کے جن دبیز پردوں کے نیچے گم ہے وہ باہر نکل آئے اور انسانی شخصیت کے سامنے حق کی راہیں کھل سکتی ہیں۔اس کائنات میں تخلیق کی عجیب و غریب کار فرمائیاں اور ایسے کارنامے ہو معجز ہیں اور جو قادر مطلق اور وحدہ لا شریک کی ذات پر دال ہیں۔کیا وہ کسی ایک چیز کی تخلیق پر غور نہیں کرتے 'جبکہ اس کائنات میں بے شمار قابل غور چیزیں ہیں جن پر غور کرنے سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے' انسانی فکر عاجز رہ جاتی ہے اور عقل ان کاریگریوں کے صناع اور کاریگر کی تلاش میں نکل جاتی ہے۔اور پھر وہ اس ارادے کو جاننا چاہتی ہے جس نے اس خلق کو پیدا کیا اور اس کے لئے اس نظام کو جاری کیا۔

یہ مخلوقات اس طرح کیوں ہے؟ اس کے علاوہ اس کائنات کے لئے ہزاروں امکانیات تھے۔یہ کائنات دوسری طرح کیوں نہ بنی۔دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر کیوں یہ کائنات اس موجودہ طریقے پر چل پڑی اور پھر وہ کون سی قوت ہے جو اسے اس نہج پر چلائے رکھتی ہے۔اس پوری کائنات میں ایک ہی نظام طبیعت جاری و ساری ہے' یہ کیوں؟ اگر اس کے پیچھے ایک ہی فعال لما یرید نہیں ہے تو اس پوری کائنات میں جاری و ساری اور اس کے پیچھے کیوں ایک ہی ارادہ اور ایک ہی ناموس نظر آتا ہے۔اور ایک ہی تقدیر اور اندازہ مسلسل چل رہا ہے۔

ایک زندہ جسم! نہیں بلکہ ایک خلیہ ایک عظیم معجزہ ہے جس کے عجائبات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔اس کا وجود' اس کی ترکیب اور اس کے تصرفات اور اس کے اندر پیدا ہونے والی مسلسل تبدیلیاں جو مسلسل اس کے وجود کا تحفظ کرتی ہیں اور اس کے اندر پھر نئی نسلوں تک تجدید نسل کا انتظام۔پھر تمام نسلوں میں اس کے فرائض کا تعین' جو شخص اس ایک خلیے کا مطالعہ کرے تو اس کا ضمیر اور اس کی عقل کبھی بھی اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتی کہ یہ کائنات بغیر کسی الٰہ اور مدبر کے نہیں چل سکتی یا کوئی عقل کبھی بھی اس نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہو سکتا ہے۔

زندگی کا یہ تسلسل بذریعہ نظام نسل کشی بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کائنات ایک خالق اور مدبر کے قانون کے مطابق چل رہی ہے ورنہ کروڑوں سال کے عرصہ میں وہ کون سی طاقت ہے جو نسل کشی کے لئے مرد اور عورت کا ایک تناسب قائم رکھے ہوئے ہے۔ایسا دور کیوں نہیں آتا کہ مرد ہی مرد پیدا ہوں صرف عورتیں ہی پیدا ہوں۔اگر کبھی ایسا واقعہ ہو جائے تو اس دور میں نسل کشی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔سوال یہ ہے کہ نسلاً بعد نسل اس تناسب اور توازن کو کس قوت نے قائم کر رکھا ہے۔

یہ توازن زمین و آسمان کے نظام میں مکمل طور پر کارفرما ہے۔صرف اس زندہ مخلوق ہی کے اندر نہیں ہے۔ایک ایٹم کی ساخت اور کسی مرکب چیز کی ساخت میں مکمل توازن موجود ہے۔زندہ اور مردہ تمام مخلوقات کے اندر مکمل توازن موجود ہے۔اور اگر ایک لمحہ بھر کے لئے یہ توازن بگڑ جائے تو یہ کائنات ڈھیر ہو کر رہ جائے۔لہٰذا یہ بہت ہی اہم سوال ہے کہ وہ ذات کون سی ہے جس نے یہ توازن زمین و آسمان میں قائم کر رکھا ہے۔

جزیرۃ العرب کے باشندے جن کو سب سے پہلے اس قرآن نے مخاطب کیا' وہ علوم و فنون میں اس قدر زیادہ ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ زمین اور آسمانوں کے نظام میں پائے جانے والے نہایت ہی لطیف توازن پر غور کر سکتے یا اللہ کی پیدا کردہ کسی ایک ہی چیز کا سائنسی تجزیہ کر سکتے۔لیکن انسانی فطرت اس کائنات کے ساتھ اپنی گہرائیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔انسانی فطرت اور کائنات کی فطرت کے درمیان قائم ربط سائنسی مکالمات کا محتاج نہیں ہے۔ان کے درمیان ایک

توازن پایا جاتا ہے۔ ہر انسان جس کا دل کھلا ہوا اور آنکھوں میں بصیرت ہو وہ اس ہم آہنگی کو محسوس کر سکتا ہے اور اس کے اشارات کو قبول کر کے راہ ہدایت لے سکتا ہے۔

جب انسان اپنی فطرت صافی کے ذریعے فطرت کائنات کے ان اشارات کو پاتا ہے تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی الٰہ ضرور ہے اور اس کے احساس پر یہ حقیقت اور یقین اسی طرح چسپاں ہو جاتا ہے کہ کبھی غائب نہیں ہوتا۔ انسان نے اگر کوئی غلطی کی ہے تو اس نے الٰہ کی صفات میں کی ہے۔ رسولوں کی بعثت کا مقصد زیادہ تر یہی رہا ہے کہ انہوں نے اس الٰہ کا تعارف کرایا ہے۔ اس کی صفات کا صحیح تصور دیا ہے۔ رہے جدید ملحد' یعنی سائنٹیفک اشتراکیت کے داعی تو یہ وہ مسخ شدہ لوگ ہیں جن کی فطرت بگڑ چکی ہے بلکہ دراصل وہ فطرت کے منکر ہیں اور ان کی اپنی فکر میں اگر کچھ اشارات پائے جاتے ہیں تو وہ ان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص جب فضائے آسمان میں قدرے بلند ہوا اور وہاں سے اس نے یہ حیران کن منظر دیکھا کہ زمین اس عظیم فضا کے اندر ایک چھوٹی سی گیند نظر آتی ہے' اس کی فطرت نے اس وقت اسے آواز دی کہ ذرا سوچو تو سہی' اس فضا میں اسے کس چیز نے معلق کر رکھا ہے' لیکن جب وہ زمین پر اترا اور حکومت کی جانب سے تشدد کا خوف اسے لاحق ہوا تو اس نے یہ بیان دیا کہ اسے فضا آسمانی میں خدا نہیں ملا۔ اس شخص نے اپنی فطرت کی آواز اور فطرت کی جانب سے اصرار کو دبا دیا اور آسمان و زمین کے نظام میں اس کے لئے جو سامان عبرت تھا' اسے نظرانداز کر دیا۔

اللہ تعالیٰ انسان سے مخاطب ہے کیونکہ انسان کی تخلیق اسی نے کی ہے۔ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہے۔ آخر میں ان کو حادثہ موت سے ڈرایا جاتا ہے' جو مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا اور بہت قریب ہے اور عالم الغیب میں وہ وقت طے شدہ ہے اگرچہ یہ لوگ اس وقت سے غافل ہیں۔

اَوَ لَمْ يَنظُرُوا فِى مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ وَّاَنْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَىِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ (۷: ۱۸۵) "اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو؟ پھر آخر پیغمبرؐ کی اس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟

ان کو کیا پتہ ہے کہ ان کا وقت قریب ہے یا دور ہے' اور کیا وجہ ہے کہ وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور ان کے کوچ کا وقت پردہ غیب میں مستور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاددہانی' خصوصاً جب وہ کسی بھی وقت میں آ سکتی ہے' انسان کے دل کو جھنجوڑنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ اس کی یاد سے انسان کے دل کے دروازے ہدایت کے لئے کھل سکتے ہیں اور انسان معاملات کو حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ اللہ اس قرآن کو نازل کرنے والا اور انسان کو پیدا کرنے والا ہے۔ اللہ کو معلوم ہے کہ موت کا تصور ہر انسان پر اپنا اثر ضرور کرتا ہے لیکن بعض لوگ اس قدر ضدی ہوتے ہیں کہ وہ یہ اثر قبول کرنے کے باوجود انکار کرتے ہیں اور مکابرے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ حدیث رحلت سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔ آخر ان پر کیا چیز اثر کر سکتی ہے؟

یہی تو بات ہے جو دلوں کو پگھلا دیتی ہے اور وہ نرم ہو جاتے ہیں۔ تذکرہ موت کا یہ نچ جو انسانی شخصیت کو اس آیت میں دیا گیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی شخصیت کے خطاب میں کیا منہاج اختیار کرتا ہے۔ وہ انسانی شخصیت کے ہر پہلو کو مخاطب کرتا ہے۔ وہ ہر زاویہ اور ہر وتر سے اس پر اثرات چھوڑتا ہے۔ قرآن کریم انسانی عقل کو مخاطب نہیں کرتا مگر عقل کو مہمل بھی نہیں چھوڑتا بلکہ وہ انسانی شخصیت کو ہمہ پہلو خطاب کرتا ہے اور اس کے ہر گوشے کو روشن کرتا ہے۔ قرآن کریم خشک بحث و مباحثے کا طریقہ بھی اختیار نہیں کرتا۔ قرآن کریم عقل اور سوچ کو زندہ کرتا ہے تاکہ انسان فکر کرے' لیکن اس کی زندگی سرد اور جامد نہ ہو بلکہ حرارت سے پر ہو اور انسانی شخصیت بھرپور انداز میں آگے بڑھے۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والوں کو یہی انداز اختیار کرنا چاہئے کیونکہ انسان بہرحال وہی انسان ہے اور اس کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ قرآن بھی وہی قرآن ہے اور یہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔ انسان کو اللہ نے جو خطاب کیا ہے وہ اسی طرح قائم ہے' چاہے دنیا جس قدر بھی ترقی کرے اور حالات جس قدر بھی بدل جائیں۔

---ooo---

اب بات قدرے ایک مختصر وقفے کے لئے رک جاتی ہے اور اس وقفے میں اللہ کی اس سنت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ جو اللہ نے ہدایت و ضلالت کے لئے اسی دنیا میں جاری کی ہوئی ہے۔ یعنی اس قانون کے مطابق کہ جو شخص ہدایت کے لئے جدوجہد کرے گا' وہ ہدایت پائے گا' طلب صادق کے ساتھ۔ اور جو شخص منہ موڑے گا اور دلائل ایمان اور اشارات ہدایت کو پکڑنے کی سعی نہ کرے گا گمراہ ہو جائے گا۔

یہاں یہ اشارہ ان لوگوں کے حالات کی مناسبت سے کیا جا رہا ہے' جن کو قرآن خطاب کر رہا تھا اور قرآن کا یہ انداز اور خاص طریق کار ہے کہ قرآن کریم ایک انفرادی واقعہ کے بیان کے بعد اس سے اصول عامہ اخذ کرتا ہے اور اسے بطور اٹل سنت الہیہ پیش کر دیتا ہے۔ وہ واقعہ تو انفرادی ہوتا ہے اور وقوع کے بعد حصہ تاریخ بن جاتا ہے لیکن اصول اپنی جگہ رہتا ہے اور بار بار سامنے آتا رہتا ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَ يَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

"جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لئے پھر کوئی رہنما نہیں ہے' اور اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔"

جو لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں' وہ کیوں گمراہ ہوتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ نہ ہدایت کی فکر کرتے ہیں اور نہ واقعات و مسائل پر تدبر کرتے ہیں اور جو شخص آیات الہیہ سے غفلت کرتا ہے اور ان پر تدبر نہیں کرتا اسے اللہ گمراہ کر دیتا ہے اور جسے اللہ نے اپنی سنت کے مطابق گمراہ کر دیا پھر وہ ہدایت نہیں پا سکتا اور نہ اس کے لئے کوئی ہادی بن سکتا ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (۷ : ۱۸۶) "جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لئے پھر کوئی رہنما نہیں ہے۔" اور جس شخص پر اللہ ضلالت مسلط کر دے' اپنی سنت جاریہ کے مطابق تو وہ ہمیشہ کے لئے گمراہ ہو جاتا ہے اور وہ ہدایت کے معاملے میں مادر زاد اندھا ہو جاتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے؟

وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۷ : ۱۸۶) ”اور اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے ۔“

ان لوگوں کو اللہ نے اس تاریکی میں چھوڑ کر 'ان پر کوئی ظلم نہیں کیا 'کیونکہ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے خود اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں ۔ انہوں نے اپنے دلوں کو معطل کر دیا تھا ۔ اپنے اعضائے مدرکہ سے کام لینا بند کر دیا تھا ۔ انہوں نے اس دنیا کی تخلیق کے عجائبات پر غور نہ کیا اس کائنات کے رازوں کو پانے کی سعی نہ کی ۔ خصوصاً ہر ایک پیدا کردہ چیز کی حقیقت اور اس کے راز جس کی طرف سابقہ آیات میں اشارہ کیا گیا تھا 'انہوں نے اس حقیقت کی شہادت کو قبول نہ کیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انسان نے اس کائنات میں نظر دوڑائی اسے اس کے عجائبات نظر آئے ۔ جب بھی اس نے آنکھیں کھولیں اسے کوئی نہ کوئی دلیل نظر آئی ۔ جب بھی انسان نے اپنی ذات اور اپنے ماحول کا مطالعہ کیا ۔ اسے اپنی تخلیق کا اعجاز معلوم ہوا ' اسے اپنے ماحول کی ہر مخلوق ایک اعجاز نظر آئی 'لیکن جب انسان نے اپنے آپ کو اندھا کر لیا تو وہ اندھا ہو گیا اور اللہ نے بھی اسے اندھیرے میں چھوڑ دیا اور اس کے بعد جب اس نے سرکشی شروع کر دی تو اللہ نے اسے اس میں ڈھیل دی ۔ یہاں تک کہ وہ ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے ۔ ”اور اللہ انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے ۔“

---O O O---

یہ لوگ جو اپنے ماحول سے غافل ہیں 'اپنے ماحول سے انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ پردۂ غیب میں مستور قیامت کب برپا ہوگی ۔ ان لوگوں کا سوال اسی طرح ہے کہ ایک شخص کی بینائی اس قدر کمزور ہو کہ وہ اپنے قدموں میں کچھ نہ دیکھ سکتا ہو مگر خواہش یہ رکھتا ہو کہ وہ دور افق اعلیٰ میں بھی کچھ دیکھے ۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ
رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ
اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ
اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛ
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ۲۳ ع ۷

۱۳ ”یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟ کہو ”اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے ۔ اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا ۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہوگا ۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا ۔“ یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو ۔ کہو ”اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے “مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں ۔“ اے نبی ؐ ان سے کہو کہ ”میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور

نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں۔"

عقیدہ آخرت اور اس میں میزان کا قیام اور سزا و جزا کا واقع ہونا یہ مشرکین مکہ کے لئے ایک انوکھا نظریہ تھا۔ حالانکہ یہ عقیدہ دین ابراہیمی کا اساسی عقیدہ تھا اور مشرکین مکہ کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم سے ملتا تھا۔ یہی عقیدہ حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کے دین میں بھی ایک اساسی نظریہ تھا۔ لیکن ابراہیم علیہ السلام کے بعد زمانے گزر گئے اور وہ اسلام کے ان اصولوں سے دور چلے گئے جو دین ابراہیم اور دین اسماعیل کے اساسی عقائد تھے۔ ایک ایسا دور بھی آیا کہ ان کے تصور ہی سے عقیدہ آخرت مٹ گیا۔ یہ عقیدہ انہیں اب عجیب و غریب نظر آنے لگا تھا اور ان کے شعور زندگی سے بالکل متضاد سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ حضور ؐ کی زبان سے دعوت سنتے اور اس میں آپ ان کو بعث و نشر کے بارے میں بتاتے اور حساب و کتاب کے حالات ان کے سامنے رکھتے تو انہیں یہ بات نہایت ہی عجیب و غریب اور بعید الوقوع نظر آتی۔ ایک دوسری جگہ قرآن کریم نے ان کے اس تعجب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا .... الْبَعِيْد (سورہ سبا) "منکرین حق لوگ کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارا جسم ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا اس وقت تم نئے سرے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہو گیا ہے۔ نہیں بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح بہکے ہوئے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم تھا کہ کوئی امت پوری انسانی کی قیادت اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اس کے نظام فکر میں عقیدہ بعث بعد موت اچھی طرح پختہ نہ ہو چکا ہو' اور امت مسلمہ کا فریضہ بہرحال یہی ہے کہ وہ پوری دنیا کی قیادت کرے۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو ایک محدود زندگی تصور کرے' جو اس محدود دنیا کے چھوٹے سے کرے پر ہے۔ عقیدہ آخرت کے بغیر اس قسم کی امت کا پیدا کرنا ممکن نہ تھا جس کے سامنے اس قدر عظیم نصب العین ہو۔"

عقیدہ آخرت انسانی تصور میں وسعت پیدا کرتا ہے' نفس انسانی میں کشادگی آ جاتی ہے' زندگی جس کے تسلسل کے بارے میں انسان کی شخصیت کے اندر تمنا پائی جاتی ہے' وہ تمنا پوری ہوتی ہے اور پھر امت مسلمہ کے ذمہ جو فرائض ہیں ان کی ادائیگی کے لئے یہ عقیدہ ضروری ہے۔ پھر اس عقیدے کی وجہ سے انسان کے سفلی جذبات اور محدود دنیاوی خواہشات پر بھی کنٹرول ہوتا ہے۔ نیز اس سے انسان کا دائرہ حرکت وسیع ہو جاتا ہے اور انسان کو دنیا کے محدود نتائج مایوس نہیں کر سکتے اور نہ اسے دردناک قربانیاں اپنے مقصد کے حصول سے روک سکتی ہے نیکی کے کاموں اور دعوت اسلامی کے پھیلانے اور بھلائی کی طرف لوگوں کی قیادت کرنے میں وہ کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کی جدوجہد کے فوری نتائج اس کی منشا کے خلاف ہوں اور اس کی راہ میں دردناک رکاوٹیں ہوں۔ یہ شعور اور یہ اوصاف ہر اس فرد اور جماعت کے لئے ضروری ہیں جس کے کاندھوں پر یہ عظیم ذمہ داری ڈالی گئی ہو۔

آخرت کا عقیدہ دو تصورات کے درمیان ایک دوراہا ہے۔ایک تصور حیوانی تصور ہے' جو احساس کے حدود کے اندر محدود ہے۔ دوسرا تصور ایک انسانی تصور ہے جو اس دنیا کو ایک وسیع دائرے کے اندر دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دینا ہے' وہ حیوانی تصور کے ساتھ یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں امت مسلمہ کے لئے عقیدہ آخرت کے یقین کو ایک اساسی عقیدہ قرار دیا گیا ہے۔دین اسلام نے عقیدہ آخرت کو نہایت ہی گہرا' نہایت ہی وسیع اور نہایت ہی واضح شکل میں پیش کیا ہے۔یہاں تک کہ ایک مسلمان کے شعور اور عمل میں عالم آخرت 'اس محدود دنیا کے مقابلے میں زیادہ گہرائی تک 'زیادہ وسعت کے ساتھ اور زیادہ واضح طور پر بیٹھا ہوا ہے۔حالانکہ مسلمان بہرحال اس جہان میں رہ رہے ہیں 'اور یہی وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے امت مسلمہ نے انسانیت کی قیادت کا فریضہ سرانجام دیا اور یہ قیادت راشدہ تھی جسے اسلامی اور عالمی تاریخ نے خوب سمجھا۔

سورہ اعراف میں اس موضوع پر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ سوال نہایت ہی تعجب انگیزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔مشرکین نے فی الواقعہ عقیدہ آخرت کو ایک انوکھی بات سمجھا۔ان کا سوال یہ بتاتا ہے کہ وہ وقوع قیامت کو مضحکہ خیز سمجھتے تھے اور اسے بالکل بعید از امکان سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہ سوال کیا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷:۱۸۷) "یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟"

قیامت یہ غیب ہے اور اس کا علم اللہ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے' اپنی مخلوق میں سے کسی کو اللہ نے قیام قیامت کی اطلاع نہیں دی کہ وہ کب ہوگی۔اس کے باوجود مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ قیامت کب ہوگی۔ یہ سوال یا تو بطور امتحان تھا' یا تعجب کرنے والے شخص کا سوال تھا جو کسی بات کو عجیب و غریب سمجھتا ہو یا ایک ایسے شخص کا سوال تھا جو مسئول الیہ کی توہین کرنا چاہتا ہو اور حقارت کے ساتھ یہ سوال کر رہا ہوں۔

اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷:۱۸۷) کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کی کشتی کب لنگر انداز ہوگی اور قیامت کب واقع ہو کر رک جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہرحال ایک بشر تھے۔آپ علم غیب کے مدعی نہ تھے۔ آپ کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ غیبی امور عالم الغیب کے سپرد کر دیں۔اور لوگوں کو یہ بتا دیں کہ یہ موضوع الوہیت کے خصائص کے ساتھ متعلق ہے۔آپ ایک بشر ہیں اور آپ بشریت کے دائرے سے باہر کسی چیز کے مدعی نہیں ہیں۔نہ بشریت کے حدود سے باہر جانا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ رب کی جانب سے سکھایا ہوا ہے اور اللہ کی مرضی ہے کہ وہ رسول کو کیا بتائے اور کیا نہ بتائے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ (۷:۱۸۷) کہو "اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔"

کیونکہ قیامت کا علم اللہ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور اس کا علم لوگوں کو تب ہوگا جب اس کے وقوع کا آغاز ہوگا' کسی دوسرے پر اس کا انکشاف نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد لوگوں کی توجہ اس کے وقت وقوع کے بجائے اس کی حقیقت اور ماہیت کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے اور یہ شعور دیا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم اور ہولناک واقعہ ہو گا اور اس کا بوجھ نہایت ہی بھاری ہو گا' اس کا بوجھ زمین و آسمان کی موجودہ نظر آنے والی کائنات میں بہت ہی بھاری ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ اچانک واقعہ ہوگی اور اس سے غافل لوگ اپنی غفلت میں مارے جائیں گے۔

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (۷:۱۸۷) "آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہو گا۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا۔" لہٰذا بہتر یہ ہے کہ تمہارا سب اہتمام اس پہلو سے ہو کہ تم اس کی تیاریاں کرو اور جب وہ اچانک آئے تو تم اس کے لئے تیار ہو۔ کیونکہ جب وہ اچانک آئے گی تو اس وقت کوئی احتیاط اور کوئی قوت کام نہ دے گی' اس وقت تم جو احتیاطی تدابیر کرو گے' وہی کام آسکیں گی' وہی قوت کام آئے جو تم نے اس وقت تیار کی ہو۔ اس وقت عمر کافی ہے اور فرصت کے کافی اوقات تمہارے پاس ہیں۔ لہٰذا ابھی سے اس کے لئے تیاریاں شروع کر دو اور ایک منٹ بھی ضائع نہ کرو ممکن ہے کہ اگلے ہی منٹ میں قیامت ہو۔

اس کے بعد ان لوگوں کے سوال پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا سوال کرتے ہیں یہ لوگ رسالت کی نوعیت اور رسول کی حقیقت سے نابلد ہیں۔ نیز یہ لوگ اللہ عظیم کی بادشاہت کی حقیقت سے بھی لاعلم ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ رب عظیم کے سامنے اللہ کے پیغمبر کس قدر باادب ہوتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا (۷:۱۸۷) "یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں' گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔"

گویا حضور ؐ دائماً اسی کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں یا آپ کی ڈیوٹی یہ ہے کہ آپ قیامت کے وقوع کی گھڑی کا کھوج لگائیں۔ ظاہر ہے کہ حضور رب تعالیٰ سے ان موضوعات کے بارے میں پوچھتے ہی نہیں جو اللہ العالمین کا مخصوص دائرہ ہے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۷:۱۸۷) "کیونکہ اللہ نے اسے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور اس کی اطلاع کسی کو نہیں دی۔"

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ (۷:۱۸۷) "مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے" یہ صرف قیامت کے وقوع کی گھڑی کی بات نہیں ہے۔ یہ ہر غیبی امر کے متعلق اصولی بات ہے۔ علم غیب صرف اللہ کو ہے اور علم غیب میں سے کچھ بات اگر اللہ چاہے تو کسی کو بتا دیتا ہے اور جس قدر چاہے بتا دیتا ہے' جس وقت چاہتا ہے بتا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ بعض اوقات لوگ ایک کام کرتے ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ان کے لئے مفید ہو گا لیکن آخر کار وہ ان کے لئے مضر ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایک کام مضرت کے لئے کرتے ہیں لیکن انجام کار وہ ان کے لئے مفید ہوتا ہے۔ کبھی وہ کسی کام کو ناپسند کرتے ہوئے مجبوراً کرتے ہیں اور وہ ان کے لئے مفید ہوتا ہے اور کبھی وہ کسی کام کو بہت ہی دلچسپی سے محبوب رکھتے ہوئے کرتے ہیں لیکن وہ ان کے لئے مضر ہوتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔

وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

"ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو محبوب رکھو اور وہ تمہارے لئے شر ہو" جس شاعر نے یہ کہا ہے اس کی بھی یہی مراد ہے۔

الا من یرینی غایتی قبل مذهبی

ومن این والغایات بعد المذاهب

"کون ہے جو مجھے میرے مرنے سے پہلے میری منزل بتا سکے قبل اس کے کہ میں سفر کروں۔ ایسا کب ہو سکتا ہے؟ انجام تو سفر کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے۔" اس شعر میں غیب مستور کے بارے میں انسانی موقف کو بیان کیا گیا ہے' انسان کا علم جس قدر وسیع ہو اور وہ تعلیم کے میدان میں چاہے جس قدر ترقی بھی کر لے تو اس کے سامنے غیب کا دروازہ بند ہے اور عالم غیب کے سامنے پردے گرے ہوئے ہیں' اس کی انسانیت کی حدود اسے یہ بات یاد دلاتے رہیں گے کہ اس کی انسانیت کے سامنے غیب کی دنیا محجوب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا شان ہے اور آپ کو اللہ کے ساتھ جو قرب ہے وہ بھی اپنی جگہ پر ہے۔ آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ عالم غیب کے دروازے پر آپ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک بشر ہیں اور وہ خود اپنی ذات کے لئے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں کیونکہ آپ کو غیب کا علم نہیں ہے اور آپ کو راستوں پر چلنے سے پہلے منزل کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے' کوئی بھی اپنے افعال کے انجام سے باخبر نہیں ہے۔ اس طرح کہ اگر وہ کسی فعل کے انجام کو جانتا ہو کہ وہ اچھا ہو گا تو وہ اس کو کر گزرے اور یا وہ یہ جانتا ہو کہ اس فعل کا انجام برا ہو گا' تو اس سے رک جائے۔ انسان تو سوچ کر ایک کام کرتا ہے مگر اس کا انجام اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اللہ کی تقدیر ہو۔

قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِى نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ۚ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ ٱلْغَيْبَ لَٱسْتَكْثَرْتُ مِنَ ٱلْخَيْرِ ۔ "اے نبی' ان سے کہو کہ "میں اپنی ذات کے لئے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا' اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔"

یہ ایک اہم اعلان ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلام کا نظریہ توحید بالکل صاف و شفاف ہو کر سامنے آگیا ہے اور وہ ہر قسم کے شرک کے معمولی شائبے سے بھی پاک ہو گیا ہے۔ ذات باری اپنے خصائص میں منفرد ہو گئی ہے اور اس کے خصائص میں اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں رہا ہے۔ اگرچہ وہ شریک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ جو اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ کے برگزیدہ ہیں۔ غیب کے دروازے پر آپ کا راستہ بھی بند ہے' پوری انسانیت کا علم اس دروازے پر رک جاتا ہے۔ جہاں دوسرے انسان یہاں آکر رک جاتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض بھی یہاں پہنچ کر محدود ہو جاتے ہیں۔

انْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷: ۱۸۸) "میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں' ان لوگوں کے لئے جو میری بات مانیں -"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو محض خبردار کرنے والے اور خوشخبری سنانے والے ہیں - لیکن آپ کی نذارت و بشارات سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اپنے دلوں میں ایمان رکھتے ہوں' اہل ایمان ہی اس دعوت کی حقیقت کو سمجھتے ہیں جس کے آپ ؐ حامل ہیں - وہی سمجھتے ہیں کہ اس دعوت کے پیچھے کیا آنے والا ہے - اہل ایمان دراصل بشریت کا خلاصہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل ایمان کا خلاصہ ہیں -

یہ فقرہ اس شخص کے لئے مفید ہو سکتا ہے جس کا دل کھلا ہو' جس کا دماغ روشن ہو اور قبولیت حق کے لئے تیار ہو - حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے خزانوں کے دروازے اس شخص کے لئے کھلتے ہیں جو مومن ہو' اس کا پھل وہی شخص چکھ سکتا ہے' جو مومن ہو اور اس کے اسرار تک رسائی اہل ایمان ہی کی ہو سکتی ہے - بعض صحابہ کرام ؓ سے مروی ہے کہ اللہ ہمیں قرآن دینے سے قبل ایمان دیتا تھا - یہ ایمان ہی تھا جس کے ذریعے ان کو قرآن کا وہ ذوق دیا گیا جس کی مثال نہیں ہے' اور وہ اس کے معانی اور مقاصد کا وہ ادراک رکھتے تھے جس سے تمام دوسرے لوگ محروم ہیں اور یہ قرآن ہی تھا جس کے ذریعے انہوں نے انسانی تاریخ میں معجزات اور حیران کن کارناموں کا ایک ذخیرہ چھوڑا اور یہ عظیم کارنامے انہوں نے تاریخ کے نہایت ہی مختصر دور میں سرانجام دیئے -

یہ منفرد گروہ قرآن کریم کی مٹھاس کا صحیح ذوق رکھتا تھا - ان کی آنکھیں اس کی روشنی میں دیکھتی تھیں' وہ اس کے دلائل کو پاتے تھے اور خارق العادہ پاتے تھے - لیکن مخاطبین محمد ؐ کے صرف وہی لوگ تھے جن کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی تھی - یہ قرآن ہی تھا کہ جس کی کشش نے ان کی ارواح کو ایمان کی طرف کھینچا - لیکن اس ایمان ہی کی وجہ سے ان پر قرآن کے راز بھی کھلتے گئے -

یہ لوگ قرآن میں زندہ رہے' قرآن کے لئے زندہ رہے - یہی وجہ ہے کہ وہ گروہ منفرد رہا اور کبھی ایسے لوگ دوبارہ پیدا نہ ہو سکے' یعنی اس قدر کثیر گروہ' اس قدر نئی جدت کے ساتھ پوری اسلامی بلکہ انسانی تاریخ میں کبھی پیدا نہ ہو سکا' ہاں چند افراد' منفرد لوگ کبھی کبھار اسلامی تاریخ میں ضرور پیدا ہوتے رہے -

وہ ایک طویل عرصے تک قرآن کے لئے وقف ہو گئے تھے - وہ قرآن کے چشمہ صافی ہی سے سیراب ہوتے رہے اور اس میں انہوں نے کوئی انسانی کلام یا ہدایت شامل نہ کی - الا یہ کہ حضور اکرم ؐ کے اقوال و احادیث ان کے لئے ہادی ہے - آپ کے اقوال بھی بہرحال قرآن ہی کا حصہ تھے - یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کا یہ گروہ بے مثال رہا -

جو لوگ وہی کام کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے کیا تو ان کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ وہی انداز اختیار کریں جو انہوں نے کیا - وہ اس قرآن میں زندہ رہیں اور ایک طویل عرصہ وہ اس میں گم ہو جائیں اور وہ تمام انسانی تحریروں کو چھوڑ کر صرف قرآن کا مطالعہ کریں - صرف اسی صورت میں وہ وہی بن سکتے ہیں جو وہ تھے - (دیکھئے نشانات راہ باب اول)

---ооо---

عقیدہ توحید کے بارے میں ایک بار پھر اس کا آغاز قصے کی صورت میں ہوتا ہے - اور اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ توحید سے شرک کی طرف انتقال میں کیا کیا مراحل پیش آتے ہیں - یہ ان لوگوں کے انحراف کے مراحل ہیں جو دین ابراہیم

سے پھر کر موجودہ مشرکانہ عقائد و اعمال کے پیرو بن گئے ہیں۔ اور آخر میں بتایا جاتا ہے کہ وہ جن الہوں کی عبادت کرتے ہیں، ان کی عبادت کس قدر بودا اور احمقانہ فعل ہے۔ پہلی نظر ہی میں اور معمولی غور و فکر کے بعد ہی نظر آ جاتا ہے کہ ان کی سوچ و عمل باطل ہیں۔ اس فقرے کے آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان کو چیلنج دیں کہ یہ اللہ آپ کا جو بگاڑنا چاہیں بگاڑ لیں اور آپ یہ بھی اعلان کر دیں کہ میرا ولی اور مددگار اللہ رب العالمین ہے۔ وہ میری نصرت کے لئے کافی ہے۔ ذرا ایک نظر ملاحظہ ہو۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا
زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ
فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ
مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا ۚ
فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٩٠﴾ أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾
وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٢﴾ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى
الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ ﴿١٩٣﴾
إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ ۖ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا
لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٩٤﴾ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ
بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ
ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ ﴿١٩٥﴾ إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ
الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ﴿١٩٦﴾ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا
يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٧﴾ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ

لَا يَسْمَعُوْا ۚ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ' اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے۔ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں' کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں' جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد ہی پر قادر ہیں۔ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں۔ تم خواہ انہیں پکارو یا خاموش رہو' دونوں صورتوں میں تمہارے لئے یکساں ہی ہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو' یہ تمہاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمہارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟ اے نبی" ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو' میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے۔ بخلاف اس کے تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں' بلکہ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

یہ جاہلیت اور اس کے تصورات کے ساتھ ایک ٹکر ہے' جاہلیت جب اللہ وحدہ کی غلامی اور بندگی سے منحرف ہو جاتی ہے تو وہ ضلالت اور گمراہی کی حدوں کو پار کر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ تدبر اور غور و فکر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس ٹکڑے میں ان مراحل کی تصویرکشی کی گئی ہے جب ابتدائی طور پر انسان راہ انحراف اختیار کرتا ہے اور آخر کار مکمل گمراہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (۷:۱۸۹) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لئے لئے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ' اپنے رب سے

دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے ۔"

یہ ہے فطرت جس کے مطابق اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے 'اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کی طرف متوجہ ہو 'اور اللہ وحدہ کی ربوبیت کا اس طرح اعتراف کرے کہ اس میں کوئی اور شریک نہ ہو 'اور خوف اور رجا دونوں میں یہ اعتراف ہو ۔ یہاں اللہ نے اس فطرت کی جس مثال کو بیان کیا ہے 'وہ تخلیق انسان سے شروع ہوتی ہے اور نظام تخلیق میں خاوند اور بیوی کے تعلق کی نوعیت کو لیا ہے ۔

هُوَ الَّذِیْ .... (۷: ۱۸۹) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑ بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے ۔"

مرد اور عورت تخلیقی اعتبار سے ایک ہیں اس لئے انہیں نفس واحد کہا گیا 'اگرچہ مرد اور عورت کا فطری وظیفہ جدا جدا ہے ۔ فرائض طبیعیہ کا یہ اختلاف اللہ نے اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ مرد عورت کے پاس سکون حاصل کرے اور وہ اس کے لئے راحت کا سبب ہو ۔ انسان کی حقیقت کے بارے میں اسلام کا یہ تصور ہے اور زوجین کے باہم تعلق اور فرائض کے بارے میں اسلام یہ تاثر دیتا ہے ۔ یہ ایک مکمل اور سچا تصور ہے 'جو صرف اسلام نے پیش کیا ہے ۔ اور آج سے چودہ سو سال قبل پیش کیا گیا ہے ۔ جبکہ تحریف شدہ ادیان سماوی میں تصور یہ تھا کہ تمام انسانی مصائب کی ذمہ دار عورت ہے ۔ اسے نجاست اور لعنت سمجھا جاتا تھا ۔ اور گمراہی کا ایک خطرناک پھندا اسے کہا جاتا تھا اور ہروقت یہ تلقین کی جاتی کہ اس سے ہروقت خطرہ محسوس کیا جائے ۔ جبکہ قدیم و جدیدیت پرست ادیان اور تہذیبوں میں اس کا مقام کنڈم مال کا سا تھا یا اگر کہیں اسے کوئی رتبہ دیا جاتا تو وہ صرف یہ ہوتا کہ وہ مرد کی خادمہ ہے اور اس کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہے ۔

زوجین کے ملاپ کا اصل مقصد 'اسلام میں یہ ہے کہ وہ باہم ملیں 'سکون حاصل کریں اور امن و محبت کی فضا میں آرام کی زندگی بسر کریں ۔ تاکہ یہ کائنات اور گھر کے امن کی فضا میں بچے کے سر پر سایہ ہوں اور انسانیت کے قیمتی اثاثے کے لئے سہولت فراہم ہو ۔ اور نئی نسل انسانی تہذیب و تمدن کی حامل بن کر اس امانت کو اگلی پشتوں تک منتقل کرنے کی اہل ہو سکے ۔ اور اس میں مناسب اضافہ بھی کر سکے ۔ اسلام نے زوجین کے اس ملاپ کی غرض و غایت وقتی لذت اور عارضی جذبات کو قرار نہیں دیا ہے اور نہ اسے مرد اور عورت کے درمیان دشمنی اور نزاع تصور کیا ہے ۔ نہ مرد اور عورت کے فرائض میں سے کسی ایک کو اہم قرار دے کر دوسرے کے ساتھ متعارض قرار دیا ہے ۔ نہ عورت کو مرد کے فرائض کی دعویدار بنایا ہے اور نہ مرد کو عورت کے فرائض سپرد کئے ہیں جیسا کہ قدیم و جدید جاہلیت نے ان میں التباس کرنے کی سعی کی ہے ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے الاسلام و مشکلات الحضارہ)

یہاں مرد اور عورت کی پہلی ملاقات کے لئے قرآن کریم نے نہایت ہی لطیف و دقیق انداز بیان اختیار کیا ہے ۔ تغشاھا "مرد نے عورت کو ڈھانک لیا ۔" اس لفظ سے مباشرت کی تصویر کے ساتھ ساتھ امن و سکون کی فضا کا بھی اظہار ہوتا ہے ۔ بات کو دو جنسوں کے درمیان ملاپ کا رنگ دیا گیا ہے ' صرف اجسام کے ملاپ کا تصور نہیں دیا گیا تاکہ انسانی جنسی ملاپ اور حیوانی جنسی ملاپ میں فرق و امتیاز بتایا جا سکے ۔ اسی طرح حمل کی تصویر کشی بھی نہایت ہی اچھے پیرائے میں دی گئی ہے ۔ ابتداء میں وہ نہایت ہی خفیف شکل میں ہوتا ہے اور بعد میں بوجھ بنتا ہے ۔

حمل کا دوسرا درجہ بوجھل ہوتا ہے

فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ

(۷: ۱۸۹) "پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ' اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔"

اب اس دوسرے مرحلے میں حمل واضح ہوگیا ہے اور زوجین کے دل اس کے ساتھ اٹک گئے ہیں اور ان امیدوں کا وقت آگیا ہے کہ بچہ صحیح و سالم اور خوبصورت اور صالح ہو اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی تمنا سب والدین' اولاد کے بارے میں کرتے ہیں جبکہ وہ ماں کے پیٹ کی تاریکیوں میں جنین ہوتی ہے اور وہ عالم غیب میں ہوتی ہے۔ امید کے اس عالم میں انسانی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ اور والدین اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' وہ اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہیں اور اللہ وحدہ کے فضل و کرم کے امیدوار ہوتے ہیں 'کیونکہ انسانی فطرت کو ذاتی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کائنات میں قوت 'نعمت اور فضل و کرم کا واحد سرچشمہ ذات باری ہے۔ چنانچہ دَّعَوَا اللّٰهَ (۷: ۱۸۹)

"دونوں نے اپنے رب کو پکارا کہ اگر اس نے ہمیں صالح بچہ دیا تو ہم شکر ادا کرنے والوں میں سے ہوں گے۔"

فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا (۷: ۱۹۰) "مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح و سالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔"

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ ایک حقیقی واقعہ تھا۔ یہ واقعہ حضرت آدم اور حوا کو پیش آیا 'کیونکہ ان کے جو بچے پیدا ہو رہے تھے وہ بدشکل اور بگڑی ہوئی صورت کے ہوتے تھے۔ شیطان نے حضرت حوا کو اس طرح ورغلایا کہ اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے اس کا نام عبدالحارث رکھ دے۔ حارث ابلیس کا نام تھا۔ اس طرح یہ بچہ صحیح و سالم پیدا ہوگا۔ اس نے حضرت آدم کو بھی ورغلا کر ایسا ہی کہا۔" بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اسرائیلی طرز کی ہے۔ کیونکہ اسرائیلی اور یہودی تصور کے مطابق وہ آدم کے ورغلانے میں حوا کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ جب کہ اسلام اس تصور کو جڑ سے اکھاڑتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہودی اور عیسائی ادیان میں حقیقت سے انحراف کیا گیا ہے۔

ہمیں اس آیت کی تشریح میں ایسی اسرائیلی روایات کی طرف کوئی احتیاج نہیں ہے۔ اس آیت میں دراصل ان انحرافات کی طرف اشارہ ہے جو نفس انسانی میں بتدریج راہ پاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور آپ سے پہلے ادوار میں بھی یہ رواج تھا کہ مشرکین اپنے بچوں کی بتوں کے نام پر نذر مانتے تھے یا گرجوں اور عبادت گاہوں کی خدمت کے لئے وقف کرتے تھے۔ یہ کام وہ بطور تقرب الی اللہ کرتے تھے۔ اس معاملے میں پہلے تو ان کی توجہ کا مرکز ذات باری ہوتی تھی کیونکہ توحید کے بلند مقام سے گرنے اور بت پرستی کے گڑھے میں نیچے چلے جانے کے بعد وہ اس قسم کی نذر و نیاز مختلف آستانوں پر گزارتے تھے تاکہ ان کے بچے زندہ رہیں اور صحیح و سالم ہوں اور وہ خطرات سے دوچار نہ ہوں' جس طرح آج بھی لوگ اپنے بچوں میں سے بعض کو اولیاء اور مذہبی شخصیات کے لئے وقف کرتے ہیں۔ مثلاً وہ بچوں کے بال اس وقت تک نہیں منڈواتے جب تک پہلی مرتبہ کسی ولی اور پاکباز شخص کی درگاہ پر نہ لے جائیں۔ بعض

اوقات اس کا ختنہ بھی نہیں کرتے اور یہ ختنہ بھی کسی گدی اور درگاہ پر لے جاکر کرتے ہیں - حالانکہ یہ لوگ کلمہ پڑھ کر اللہ وحدہ لاشریک کو تسلیم کرتے ہیں اور اس اقرار اور اعتراف کے باوجود یہ مشرکانہ رجحانات رکھتے ہیں - غرض وہی لوگ اور وہی ان کے خیالات مشرکانہ :

فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۷: ۱۹۰) "اللہ بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں -" یعنی وہ پاک ہے ان تصورات سے جو وہ اس کے بارے میں رکھتے اور ان باتوں سے جو اس کے حوالے سے وہ کرتے ہیں -

لیکن ہم اپنے دور جدید میں بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ انواع و اقسام کے شرک میں مبتلا ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا زعم یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور موحد ہیں اور ان لوگوں کے یہ جدید شرک اور بت پرستیاں بھی اسی شکل و صورت جیسی ہیں جن کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے -

آج لوگ اپنے لئے نئے نئے بت گھڑتے ہیں 'بعض اسے "قوم" کا نام دیتے ہیں 'بعض اسے "وطن" کا نام دیتے ہیں بعض اسے "شعب" کا نام دیتے ہیں وغیرہ - یہ بھی بت ہیں لیکن یہ غیر مجسم بت ہیں' یہ سابقہ بت پرستوں کی طرح سادہ اور مجسم بت نہیں - یہ بھی دراصل ان لوگوں کے خدا ہیں جو ان کو پوجتے ہیں - یہ ان بتوں کو اللہ کی تخلیق اور نذر و نیاز میں اسی طرح شریک کرتے ہیں جس طرح اس سے قبل قدیم الہوں کی پوجا کی جاتی تھی - یہ ان بتوں کی چوکھٹ پر اسی طرح قربانیاں دیتے ہیں جس طرح قدیم بتوں اور بت خانوں پر خون بہایا جاتا تھا - اور وسیع پیانے پر بہایا جاتا تھا -

لوگ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ ان کا رب ہے 'لیکن وہ اللہ کے اوامر و احکام اور شریعت کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں جبکہ ان جدید غیر مجسم بتوں کے احکام اور قوانین کی وہ پوری طرح پابندی کرتے ہیں اور انہیں مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اللہ کے احکام و شرائع کو مکمل طور پر ترک کر دیتے ہیں - سوال یہ ہے کہ اگر یہ الٰہ نہیں ہیں 'اگر یہ شرک نہیں ہے' اور لوگوں کی اولاد میں یہ لوگ شریک نہیں ہیں تو اور کیا ہیں - آخر جاہلیت جدیدہ کی اس بت پرستی کو ہم کن الفاظ سے تعبیر کریں - ظاہر ہے کہ یہ بت پرستی ہی ہے -

میں سمجھتا ہوں کہ جاہلیت قدیم اللہ کے معاملے میں زیادہ باادب تھی - اس کا کہنا تو یہ تھا کہ ہم اپنی اولاد' اپنی پیداوار اور اپنے مویشیوں میں ان الہوں کا حصہ اس لئے مقرر کرتے ہیں تاکہ ان ذرائع سے ہم اللہ کا قرب اور نزدیکی حاصل کر لیں - ان کے احساس و شعور میں ان بتوں اور الہوں سے اللہ بلند تھا - رہی جاہلیت جدیدہ تو اس کے احساس و شعور میں یہ غیر مجسم بت اللہ سے اعلیٰ و ارفع ہیں' اس طرح کہ جاہلیت جدید اللہ کے احکام و شرائع کو ترک کر رہی ہے اور ان بتوں کے احکام و شرائع کو سینے سے لگا رہی ہے -

ہم بت پرستی کے بارے میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ساری بت پرستی ہے جو قدیم زمانے کی طرح کوئی کسی بت کی طرف اشارہ کرے یا وہ مراسم ادا کرے جو بتوں کے حوالے سے قدیم زمانے کے لوگ کرتے تھے - دور جدید کی بت پرستی میں بتوں کی شکل و صورت اور ان کے سامنے مراسم ادا کرنے کی شکل اگرچہ بدل گئی ہے لیکن ان کی تہ میں جو شرک ہے وہ ہرگز نہیں بدلا اور وہ علیٰ حالہ قائم ہے - ہمیں چاہئے کہ ہم اس حقیقت کو نوٹ کریں اور اس

معاملے میں دھوکے کا شکار نہ ہوں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ عورت عفت و وقار اور شرافت کو اپنا زیور بنائے اور "وطن" کا حکم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے عورت گھر سے نکل آئے اور جاہلیت کی زیب و زینت اختیار کرے۔ وہ عریاں ہو، ہوٹلوں میں خادمہ کا کام کرے، جس طرح بت پرست جاپان میں "جیشا" عورتیں کرتی ہیں لہٰذا کون الہ ہے جس کے احکام مانے جاتے ہیں، اللہ کے احکام مانے جاتے ہیں یا الہ وطن اور الہ پیداوار کے۔

اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ اجتماع کا مدار عقیدے پر ہونا چاہئے، سوسائٹی کا مدار لا الہ پر ہو لیکن قومیت اور وطن کا حکم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی سے اسلامی عقائد و تصورات کی نفی کی جائے اور سوسائٹی کا مدار قوم پرستی یا نسل پرستی پر ہو۔ یہاں بھی یہی سوال ہے کہ الہ کون ہے اللہ یا وطن اور نسل۔

اللہ کا حکم یہ ہے کہ اس کی شریعت کی پابندی ہوگی لیکن انسانوں میں سے ایک انسان ڈکٹیٹر اٹھتا ہے یا لوگوں کا ایک گروپ اٹھتا ہے (اسمبلی) کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ قانون تو اسمبلی کا چلے گا۔ اب آپ بتائیں کہ اسمبلی الہ ہے یا اللہ جل شانہ الہ ہے۔

یہی وہ مثالیں ہیں جن کے مطابق پوری دنیا چل رہی ہے اور پوری انسانیت ان مثالوں سے متعارف ہے اور گمراہ ہو چکی ہے اور یہ ہے اس وقت کی مروج اور چلتی ہوئی بت پرستی اور یہ ہیں آج کے بت۔ قدیم بتوں کے مقابلے میں یہ جدید بت سامنے آگئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بت نظر نہیں آتے اور وہ سابقہ بت مجسم تھے، نظر آتے تھے لیکن دونوں کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن کریم کا خطاب اس سادہ بت پرستی سے تھا۔ قدیم جاہلیت سے جو بالکل واضح تھی۔ قرآن انہیں اس کم عقلی سے جگا رہا تھا۔ وہ انسان جیسی مخلوق کے شایان شان نہ تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے ان کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے لئے ایسی مثال دی جس میں ان کی ذہنی کیفیات کو آشکارا کر دیا۔

أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ (۱۹۱) وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ (۷:۱۹۲) "کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں، جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد ہی پر قادر ہیں۔"

قرآن انہیں یہ سمجھاتا ہے کہ جو خالق ہے وہ اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اس کی بندگی کی جائے اور جن الہوں کی وہ بندگی کرتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس جہاں کا خالق نہیں ہے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں تو آخر کیا جواز ہے کہ یہ لوگ ان بتوں کی بندگی کرتے ہیں۔ کس لئے وہ اپنے نفوس اور اپنی اولاد میں ان بتوں کو کیوں شریک کرتے ہیں۔

پرستش اور عبادت تو اس کی کی جاتی ہے جو اپنے بندوں کی حفاظت کرتا ہے اور وہ اپنی قوت سے ان کی مدد کرتا ہے۔ قوت، غلبہ اور بادشاہت تو صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہ جن بتوں کو پکارتے ہیں وہ کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ وہ بت خود اپنی امداد بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اپنی جانوں اور اپنی اولاد اور اموال میں وہ کس جواز کی بنیاد پر ان بتوں کو شریک کرتے ہیں۔

تخلیق کی دلیل اور حجت جس طرح جاہلیت قدیمہ کے خلاف حجت تھی، اسی طرح یہ جاہلیت جدیدہ کے خلاف بھی

حجت ہے۔ جاہلیت جدید نے جو نئے بت تراشے ہیں ان میں سے کس بت نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے کہ وہ لوگ انہیں اپنی جان' اپنی اولاد اور اپنے اموال میں شریک کرتے ہیں۔ پھر ان جدید بتوں میں سے کون بت ایسا ہے جو نفع و نقصان کا مالک بن سکتا ہے۔

اگر انسانی عقل اور سوچ کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ اس صورت حالات کو یکسر رد کر دے اور کبھی اسے قبول نہ کرے۔ یہ تو لوگوں کی خواہشات اور میلانات اور خارجی گمراہی اور فریب کاری ہے کہ لوگ ان جدید بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ خارجی اثرات اور سازشیں ہیں کہ وہ لوگوں کو مرتد کر کے اس جدید جاہلیت کی طرف لوٹا رہی ہیں اور اس جدید شکل میں اسے شرک و بت پرستی میں مبتلا کر رہی ہیں۔ اس لئے لوگ ان بتوں کو پوجتے ہیں جو انہوں نے خود گھڑے ہیں (قوم' نسل' وطن) اور یہ بت لوگوں کے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں۔

دور جدید کی انسانیت اس بات کی محتاج ہے کہ اسے قرآن کی تعلیمات سے مخاطب کیا جائے۔ جس طرح قدیم ادوار میں اس تک قرآنی تعلیمات پہنچائی گئی تھیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ جاہلیت کی قیادت کر کے اسے اسلام کی طرف لایا جائے۔ اسے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لایا جائے' اور اس کے عقل و شعور کو اس جدید جاہلیت سے نجات دی جائے۔ اسے اس جدید فکری گندگی سے اسی طرح نجات دی جائے جس طرح آج سے صدیوں قبل اسلام نے انسانیت کو نجات دی تھی۔ قرآن کریم نے قدیم جاہلیت کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ان میں یہ اشارہ بھی ہے کہ انسانوں میں سے بھی کسی کو الہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ذرا دوبارہ غور کریں۔

"کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ ان کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں' نہ آپ اپنی مدد پر ہی قادر ہیں۔"

ان آیات کے صیغوں میں جمع مذکر کے صیغے اور ہم کی ضمیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان بتوں میں سے کچھ عقلا بھی تھے۔ یہ بات ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرب کچھ انسانوں کو بھی اپنا الٰہ اس معنی میں تسلیم کرتے تھے کہ وہ ان کی بندگی کرتے ہوں اور ان کے سامنے مراسم عبودیت بجا لاتے ہوں' انسانوں کو وہ الٰہ اس معنی میں بناتے تھے کہ وہ اجتماعی امور میں ان کے رسم و رواج اور ہدایات کی اطاعت کرتے تھے اور اپنے نزاعات میں ان کے قوانین کے مطابق فیصلے کرتے تھے یعنی زمینی حاکمیت کے اعتبار سے قرآن کریم اسی عمل کو شرک کہتا ہے اور وہ اس معنوی بت پرستی اور ان کی مجسم بت پرستی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسلامی نقطہ نظر سے یہ دونوں شرک ہیں اور اسی معنی میں یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے مذہبی لیڈروں کو رب بنا رکھا تھا کہ وہ ان کے احکام و قوانین کو خدا کے احکام و قوانین کی طرح مانتے اور جانتے تھے جبکہ ان میں سے کوئی بھی خدا کی طرح ان کے سامنے مراسم عبودیت بجا نہ لاتا تھا لیکن قرآن نے ان کے اس فعل کو شرک اور خروج عن التوحید سے تعبیر کیا۔ اس توحید سے خروج جس کا ذکر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے کیا گیا ہے اور یہ تعبیر اس نکتے کے عین مطابق ہے جو ہم نے جاہلیت جدیدہ کے بارے میں اوپر بیان کیا۔ احادیث کے مطابق حضور نے آیات اتخذوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی یہی تعبیر فرمائی ہے۔

زوجین کے قصے کی شکل میں اوپر جس شرک کا ذکر کیا گیا تھا' وہ دراصل ہر شرک کی بات تھی۔ ان لوگوں کو بت پرستی کے خلاف منظم کرنا مطلوب تھا' جن کو قرآن مخاطب کر رہا تھا۔ اور ان کو یہ بتلانا مقصود تھا کہ وہ جس بت پرستی میں

مبتلا ہیں وہ نہایت ہی کمزور اور احمقانہ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو الٰہ بنا رہے ہیں جو کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں' نہ صرف یہ کہ وہ چیزیں تمہیں نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتیں بلکہ وہ خود اپنے نفع و نقصان کی مالک ہی نہیں ہیں۔ خواہ یہ چیزیں زندہ انسان ہوں یا مردہ بت ہوں' یہ سب کی سب نہ تخلیق کر سکتی ہیں اور نہ کسی کی نصرت پر قادر ہیں۔ چونکہ قرآن کا مقصد اس تمثیل سے صرف یہی تھا' اس لئے تمثیل کے بعد روئے سخن براہ راست مشرکین مکہ کی طرف مڑ جاتا ہے اور حکایت کے اسلوب کو ترک کر کے اچانک خطاب شروع کر دیا جاتا ہے۔ بات وہی سابقہ ہے' پہلے تمثیل و قصہ تھا اور اب براہ راست خطاب ہے۔ ان الہوں کی حقیقت کے بارے میں۔

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ (۱۹۳) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۹۴) اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (۷:۱۹۵)

"اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں۔ تم خواہ انہیں پکارو یا خاموش رہو' دونوں صورتوں میں تمہارے لئے یکساں ہی رہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو' یہ تمہاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمہارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟"

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بیان کیا۔ مشرکین عرب کی بت پرستی ایک سادہ بت پرستی تھی' انسانی عقل کے ترازو میں بالکل بے وزن تھی' اگرچہ یہ عقل نہایت ہی ابتدائی اور پتھر کے دور کی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں قرآن کریم عقل کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ ان بتوں کے بارے میں جن شرکیہ خیالات کو سچا سمجھتے ہیں یہ نہایت ہی کم عقلی کی دلیل ہے۔

ذرا اپنے بتوں کے بارے میں غور تو کرو' بظاہر ان کے پاؤں چلنے کے قابل نہیں ہیں' ان کے ہاتھ پکڑنے والے نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نظر نہیں ہے۔ ان کے کانوں میں قوت سماعت نہیں ہے جبکہ تمہارے پاس جو اعضاء ہیں ان میں یہ قوتیں موجود ہیں' تو پھر تم ایسے بے جان اعضاء والے بتوں کی کیوں پوجا کرتے ہو؟

بعض اوقات بت پرست یہ کہتے ہیں کہ ان بتوں سے ان کا اصل مدعاء اشارہ ہے بعض رشتوں کی عزت یا آباء و اجداد کی طرح تو قرآن کہتا ہے کہ وہ بھی تو تمہاری طرح کے بندے ہیں اور اللہ کی مخلوق ہیں اور وہ خود کوئی چیز پیدا کرنے والے نہ تھے اور نہ ہیں اور نہ نفع و نقصان کے مالک ہیں اور نہ خود اپنے نفع و نقصان کے مالک ہیں۔

چونکہ عرب بت پرستی میں ظاہری بت پرستی بھی تھی اور سابقہ انسانوں کی طرف اشارہ بھی تھا۔ اس لئے قرآن کریم

نے ان کے لئے ذوی العقول کے صیغے استعمال کئے اور یوں آدمیوں کی طرف خطاب کیا۔ ذوی العقول کی ضمیر میں اشارہ ان شخصیات کی طرف ہے جن کی طرف بتوں میں رمز تھا۔ کبھی تو براہ راست بتوں کی بات کی گئی اور کبھی عبادٌ امثالکُمْ (۷: ۱۹۴) کیا گیا۔ بہرحال دونوں طرز کا شرک اسلامی نظر میں باطل ہے۔ اور قرآن انسانیت کو اس ذلت سے نکالنے کے درپے ہے۔ اور اسے انسانیت کے شایان شان عقیدۂ توحید کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

---ooo---

اس مباحثے اور نقد و جرح کے آخر میں اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ آپ ان کو چیلنج کریں۔ ان لاچار خداؤں کو بھی چیلنج کریں اور ان کے سامنے واشگاف الفاظ میں اپنے صاف اور ستھرے نظریات رکھیں۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵) اِنَّ وَلِيِّ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (۱۹۶) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۷: ۱۹۸) ”اے نبی ؐ ان سے کہو کہ ”بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے، بخلاف اس کے تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں، بلکہ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔“

یہ ہے وہ بات جو ہر داعی کو کسی بھی جاہلیت کے سامنے کرنی چاہئے۔ اور یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کی جس طرح ان کے رب نے ان کو حکم دیا۔ اور اپنے دور میں آپ نے بت پرستوں اور ان کے بتوں کو اسی انداز میں چیلنج کیا۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۷: ۱۹۵) ”اے نبی ؐ ان سے کہو کہ ”بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔“

آپ ؐ نے اس تحدی کو ان کے اور ان کے بتوں کے منہ پر دے مارا اور فرمایا کہ میرے خلاف جو تدابیر تم کر سکتے ہو، وہ کرو۔ جس قدر کر سکتے ہو، کوئی کمی نہ چھوڑو۔ مجھے کوئی مہلت نہ دو، اور یہ تحدی آپ نے اس شخص کی طرح دی جسے اپنے مقصد پر یقین ہوتا ہے اور اپنے خالق اور اللہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اور مخالفین کی سازشوں اور قوتوں کے مقابلے میں وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔

اِنَّ وَلِیِّ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ (۷: ۱۹۶) "میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے۔"

آپ ؐ نے اعلان کر دیا کہ وہ کس پر بھروسہ کرتے ہیں، صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں جس نے کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب کے نزول سے معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ کیا ہے، یہ کہ سچائی پر مشتمل اس کتاب کو رسول لوگوں کے سامنے پیش کریں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ وہ اس سچائی کو ہر باطل اور اہل باطل پر بلند اور غالب کر دیں گے اور اس دعوت کے حاملین بندگان کی حفاظت اور ولایت وہ خود کریں گے جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ کے بعد ہر دور اور ہر علاقے میں دعوت کے حاملین کا یہی نعرہ اور یہ نصب العین ہو گا: "اے نبی ان سے کہو" "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے۔" ہر صاحب دعوت کا یہ فرض ہے کہ وہ دنیا کے تکیوں اور بھروسوں پر اعتماد نہ کرے اور وہ دنیا کے بھروسوں کو کوئی اہمیت نہ دے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے سہاروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وہ بہت ہی کچے سہارے ہوتے ہیں۔ اگرچہ دنیاوی سہارے نہایت ہی قوی ہوں اور بظاہر نہایت ہی طاقتور نظر آئیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (۲۲: ۷۳) "لوگو، ایک مثال دی جاتی ہے، غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔"

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا وَاِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۲۹: ۴۱) "جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنالئے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے، جو اپنا گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے، کاش کہ یہ لوگ علم رکھتے۔"

غرض جو شخص اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے، وہ بھروسہ بھی اللہ پر کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے سوا دوسرے سرپرستوں اور سہاروں کی حیثیت ہی کیا رہتی ہے۔ اور ایسے شخص کے شعور میں ان کی گنجائش کیا رہتی ہے۔ اگرچہ دوسرے لوگ داعی کو اذیت دینے پر بھی قدرت رکھتے ہوں۔ داعی کو اگر کوئی اذیت دیتا ہے تو یہ بھی اذن الٰہی سے ہوتا ہے، جو داعی کا والی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ داعی کی حمایت سے عاجز و لاچار ہوتا ہے اور نہ اس لئے کہ داعی کی حمایت سے اللہ تعالیٰ دست کش ہو گیا ہے۔ نہ یہ صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کی مدد نہیں کر سکتا۔ آخر اللہ تعالیٰ داعیوں کے مخالفین

کو یہ مہلت اور اجازت کیوں دیتا ہے کہ وہ اللہ کے دوستوں کو اذیت دیں؟ ان کی تربیت کے لئے کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنے کے لئے اور ان کو مجرب بنانے کے لئے۔ نیز اللہ کے دشمنوں کی رسی دراز کرنے کے لئے انہیں مہلت دینے کے لئے اور ان کے خلاف سخت ترین اقدامات اور تدابیر اختیار کرنے کے لئے اللہ ان کو ڈھیل دیتا ہے۔

ایک موقع ایسا بھی آیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشرکین مکہ اذیت دے رہے تھے اور آپ کو جوتوں کے تلوؤں کے ساتھ مار رہے تھے۔ آپ کے چہرے پر انہوں نے اس قدر ضربات لگائیں کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر آنکھیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کرۂ ارض پر اس عظیم ترین ہستی پر اس قدر بے رحمانہ تشدد ہو رہا تھا لیکن اس پورے تشدد کے دوران آپ یہی کہتے رہے: ''اے اللہ' آپ کس قدر حلیم ہیں! اے اللہ آپ کس قدر حلیم ہیں!'' وہ دل و جان سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اس اذیت کے پیچھے رب کا حلم کام کرتا ہے۔ ان کو پورا یقین تھا کہ رب تعالیٰ عاجز نہ تھا کہ وہ اپنے ان دشمنوں کو تہس نہس کر دے۔ نیز ان کو یہ یقین بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو بھی بے سہارا نہیں چھوڑتا۔

جب مشرکین نے حضرت عبداللہ ابن مسعود پر تشدد کیا اور یہ تشدد انہوں نے محض اس لئے کیا کہ انہوں نے کعبہ کے سائے میں' مشرکین کی ایک محفل کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی تھی۔ انہوں نے اسے اس قدر مارا کہ ان کا سر چکرانے لگا اور ان کے لئے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ اس سنگدلانہ تشدد کے بعد وہ کہتے ''خدا کی قسم کہ یہ لوگ میرے لئے اس وقت سے زیادہ کبھی بھی قابل برداشت اور آسان نہ تھے۔'' آپ کو علم تھا کہ یہ اللہ کے دشمن تھے اور ان کو یہ بھی یقین تھا کہ اللہ کا دشمن ایک مومن کے لئے بہت ہی آسان اور خفیف ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے دوستوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کے دشمنوں کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔

حضرت عبداللہ ابن مظعون عتبہ ابن ربیعہ مشرک کی پناہ میں تھے' انہوں نے اپنے آپ کو عتبہ کی پناہ سے نکال دیا۔ کیونکہ وہ یہ پسند نہ کرتے تھے کہ وہ عتبہ کی مشرکی پناہ میں مزے سے رہیں اور دوسرے مسلمانوں پر تشدد جاری ہو' جب انہوں نے عتبہ کی پناہ کو حقارت سے پھینک دیا تو مشرکین ان پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ان پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ ایک آنکھ سے محروم ہو گئے۔ عتبہ دیکھتے تھے کہ ان پر یہ تشدد ہو رہا ہے اور ان کو دعوت دیتے تھے کہ وہ دوبارہ اس کی پناہ میں آ جائیں۔ انہوں نے کہا: ''میں ایک ایسی ذات کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ طاقتور ہے۔'' عتبہ کہتا: ''اے بھائی تمہاری آنکھ اس سے مستغنی اور محفوظ تھی جو اذیت اسے پہنچی۔'' تو وہ جواب دیتے: ''ہرگز نہیں خدا کی قسم! میری دوسری آنکھ بھی اس بات کی متمنی کہ اسے بھی اللہ کے راستے میں وہ کچھ پہنچے جو اس کے لئے بہتر ہو۔'' وہ جانتے تھے کہ اللہ کی پناہ بندوں کی پناہ سے زیادہ طاقتور ہے۔ ان کو یقین تھا کہ رب تعالیٰ ہرگز انہیں بے سہارا نہ چھوڑیں گے۔ اگرچہ وہ نفس کو سربلند کرنے اور آزمانے کے لئے ان مشکلات سے دوچار کرتا ہے۔ کیا خوب کہا ''خدا کی قسم میری دوسری آنکھ بھی اس صورت حال کی مستحق ہے جو اس کے لئے اللہ کے راستے میں بہتر ہو۔''

یہ ہیں مثالیں اس گروہ کی جنہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرسہ میں تربیت پائی اور اللہ کی ان ہدایات کے سائے میں پلے۔ ''اے نبی ان سے کہہ دو کہ ''بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو' پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو' اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو' میرا حامی اور ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں

کی حمایت کرتا ہے۔"

اس تشدد کا نتیجہ کیا تھا؟ انہوں نے مشرکین کی جانب سے یہ تشدد برداشت کیا۔ انہوں نے اللہ پر بھروسہ کیا' جس نے کتاب نازل کی تھی اور جو نیک بندوں کا حامی تھا۔ تاریخ اس نتیجے سے اچھی طرح واقف ہے ۔ مسلمانوں کو غلبہ' عزت اور شوکت نصیب ہوئی کیونکہ وہ اللہ کے دوست تھے ۔ ہزیمت' شکست اور ہلاکت و بربادی ان لوگوں کے حصے میں آئی جو نیک لوگوں کے دشمن تھے اور طاغوت تھے اور ان میں سے جن لوگوں کے نصیب میں ایمان لانا مقدر تھا' وہ ایمان لے آئے اور ان سابقین اولین کے تابع ہو گئے ۔ جنہوں نے خود ان کے ہاتھوں تکالیف اٹھائی تھیں ۔ لیکن ان کے عزم و استقلال میں کوئی کمی نہ آئی تھی ۔

اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان کو چیلنج کریں تو آپ نے ان کو چیلنج دے دیا ۔ اور حکم دیا کہ آپ ان کے الہوں کی کمزوری اور عاجزی کو ان الفاظ میں بیان کریں اور آپ نے اس کی تعمیل فرمائی ۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۷:۱۹۸) اگر یہ موقف عربوں کی سادہ جاہلیت پر پوری طرح منطبق تھا' تو آج کی جدید اور نظریاتی جاہلیت پر بھی اسی اعلان اور اس موقف کا اطلاق ہوتا ہے ۔ یہ جدید مشرکین بھی دراصل اللہ کے سوا دوسرے لوگوں کو اپنا ولی سمجھتے ہیں' اس لئے کہ ان کے ہاتھوں میں دنیا کا اقتدار ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ان سرکشوں اور فرعونوں کے اندر اس قدر قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان کی کوئی امداد کر سکیں ۔ اور اللہ کی تقدیر اور اس کی سنت اپنے بندوں کے بارے میں اپنے مقررہ طریقے پر چلتی رہتی ہے ۔

عربوں کے مصنوعی الٰہ اپنی سادہ شکل میں سنتے نہ تھے حالانکہ ان کی دھاتوں یا موتیوں کی بنی ہوئی آنکھیں تھیں' تو دور جدید کے بعض الٰہ بھی نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں ۔ الٰہ وطن بھی اندھا ہے اور الٰہ القوم بھی بہرا ہے ۔ اور الٰہ پیداوار بھی گونگا بہرا ہے ۔ اور ان کے بارے میں بھی تاریخ کا فیصلہ اٹل ہو گا ۔ جدید دور کے الہوں میں سے صرف وہ الٰہ سنتے اور سمجھتے ہیں جو انسانوں میں سے ہیں' جنہیں اقتدار دیا گیا ہے اور جو الٰہ حقیقی کے مقابلے میں قانون سازی بھی کرتے ہیں اور اس کے احکام کے برعکس احکام بھی صادر کرتے ہیں' تو یہ الٰہ بھی درحقیقت نہ دیکھتے ہیں اور نہ سنتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید نے کہہ دیا ہے ۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷:۱۷۹) "اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم

ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان کے ساتھ سوچتے نہیں۔ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے ہیں۔ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے ہیں۔وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔"

ہر داعی کو ہی ایک صورت حال پیش آتی ہے۔تمام جاہلیتوں کے مقابلے میں اسے ایک ہی جیسے حالات سے سابقہ پڑتا ہے اور اسے چاہئے کہ وہ ہر جاہلیت کو وہی چیلنج دے جو اللہ نے نبی آخر الزمان کو بتایا۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۹۵) اِنَّ وَلِيِّیَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ (۱۹۶) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۱۹۷) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۱۹۸:۷) "اے نبی" ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو' میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے' بخلاف اس کے تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو' وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں' بلکہ اگر تم انہیں سیدھی راہ پر آنے کے لئے کہو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

غرض یہ الٰہ اب بھی وہی ہیں جو مکہ میں تھے' ہر دور اور ہر مقام پر دراصل یہ وہی کچھ ہیں اور ان کو اسی قسم کا چیلنج درکار ہے جو حضور ؐ نے بحکم خدا دیا۔

---ooo---

درس نمبر ۸۲ ایک نظر میں

اس سورہ کے آخر میں یہ ربانی ہدایات ہیں ' اللہ کی جانب سے خاص اپنے دوستوں کو یہ نصیحت کی جا رہی ہے ۔ ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں سے خطاب ہے ' اس وقت یہ لوگ ابھی مکہ ہی میں تھے ۔ یہ ہدایات انہیں اس ہمہ گیر جاہلیت کے مقابلے کے لئے دی جا رہی ہیں جو مکہ اور اس کے ارد گرد پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی ۔ یہ ہدایات اس ہمہ گیر جاہلیت کے مقابلے کے لئے خاص طور پر جاری ہوئی ہیں اور گمراہ انسانیت کو راہ ہدایت دکھانے کے لئے ہیں ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت قائد دعوت یہ حکم دیا جاتا ہے کہ لوگوں کے لئے نہایت ہی یسر اور نرمی کے ساتھ پیش آئیں اور ایسی باتوں کا حکم دیں جنہیں سلیم فطرت انسانی افعال خیر سمجھتی ہو ۔ تمہارے احکام و ہدایات میں تعقید اور تشدید نہ ہو ' اور جہاں جاہلیت اصلاح پذیر نہ ہوں وہاں اس کے ساتھ الجھنے کے بجائے اس سے پہلوتہی کیا جائے ' لوگوں سے مجادلہ نہ کیا جائے ' ان کی فضول محفلوں میں شریک نہ ہوں اور اگر اہل جاہلیت آپ ؐ کو غصہ دلائیں اور حدود پار کریں اور ضد و عناد کا مظاہرہ کریں اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے نتیجے میں آپ کو طیش آ جائے تو آپ شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کریں اور تعوذ کے ذریعے اطمینان حاصل کر کے صبر کریں ۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۱۹۹) وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۰۰) اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷:۲۰۱) " اے نبی ؐ ' نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو ' معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو ۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو ' وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے ۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے ۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان جاہلوں کے مزاج سے متعارف کرایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ کس قوت کی وسوسہ اندازی ہے جو ان لوگوں کو سرکشی اور گمراہی پر ابھار رہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ جو سلوک کر رہے ہیں اس کا ایک حصہ بھی یہاں بتایا جاتا ہے کہ وہ آپ سے خوارق عادت امور طلب کرتے ہیں چنانچہ حضور ؐ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کے اس سلوک اور مطالبوں کا یہ جواب دیا جائے تاکہ ان کو معلوم ہو کہ رسالت کی حقیقت کیا ہے ؟ رسول کا مقام کیا ہے ؟ تاکہ رسالت اور رسول کے مقام و ماہیت کے بارے میں ان کے تصورات کی اصلاح کر دی جائے

اور یہ بتایا جائے کہ رسول اور رب العالمین کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ (۲۰۲) وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷:۲۰۳) "رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لئے چلے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اے نبی "جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو "میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔"

بذریعہ وحی قرآن کے نزول کی طرف آیت سابقہ میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اس مناسبت سے یہاں مسلمانوں کو وہ آداب سکھائے جاتے ہیں جو تلاوت قرآن کے وقت ملحوظ رکھے جائیں گے۔ اللہ کے ذکر کے آداب اور یاد الٰہی پر دوام اور اسے عادت بنا لینے کی ہدایت اور کسی بھی وقت یاد الٰہی سے غافل نہ ہونے کی ہدایت بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح ملائکہ ہر وقت اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں، تسبیح کرتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں لہٰذا انسانوں کے لئے یہ ضروری اور بہتر ہے کہ وہ غفلت نہ کریں اور تسبیح و تہلیل اور رکوع و سجود میں مشغول رہیں۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۰۴) وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (۲۰۵) اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ (۷:۲۰۶) "جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔"

اے نبی" اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو، دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے، اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۸۲ تشریح آیات

۱۹۹ --- تا --- ۲۰۶

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ
إِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾
إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰۗىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ
مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

"اے نبی" نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو' معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ ممکن حد تک لوگوں کے ساتھ نرمی کرو۔ معاشرت' باہم میل جول میں لوگوں سے اخلاق عالیہ کا بدرجہ کمال توقع نہ کرو۔ اور ایسے اخلاق بھی ان پر مسلط نہ کرو جو ان پر شاق گزریں اور ان کے لئے ان کا مظاہرہ ممکن نہ ہو۔ ان کے اندر جو غلطیاں پائی جاتی ہوں' ان میں جو کمزوریاں اور جو نقائص پائے جاتے ہوں' ان کے بارے میں عفو و درگذر سے کام لو۔ لیکن یہ عفو و درگزر کی پالیسی ذاتی اور شخصی معاملات کے اندر ہے۔ شرعی فرائض و واجبات میں عفو و درگذر کی پالیسی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اسلامی عقائد میں سے کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہے جس سے چشم پوشی کی جاسکتی ہو۔ اور اسلامی شریعت میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس سے چھوٹ دی جاسکتی ہو۔ ہاں لوگ لین دین کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ میل و جول اور معاشرت میں نرمی اور تسامح کر سکتے ہیں۔ باہم معاشرت میں نرمی سے لوگوں کی زندگی بہت ہی اچھے اسلوب میں گزر سکتی ہے' خصوصاً بڑے لوگوں کی جانب سے چھوٹے لوگوں کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنا' انسانی کمزوریوں سے درگزر کرنا اور ان پر رحم کرنا اور ان کے ساتھ دریا دلی کا رویہ اختیار کرنا' ان کے فرائض میں شامل ہے اور ان کے شایان شان تصور ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ معلم' مربی اور مصلح بھی ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ان اوصاف حمیدہ کی رعایت کرنا ان کے شایان شان ہی نہیں ان کے فرائض میں سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی معاملات میں سے کسی معاملے میں کبھی بھی کسی شخص پر

طیش میں نہیں آئے ' لیکن اگر معاملہ دین کا ہوتا تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔
یہی حکم ان تمام افراد کے لئے ہے جو دعوت دین کا کام کرتے ہیں ' ان کے لئے بھی وہی حکم ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے ۔اس لئے انسانی نفوس کو راہ ہدایت پر لانے کے لئے ان کے ساتھ وسعت قلبی کا سلوب ہو ' چاہئے ۔ان کے ساتھ اچھا رویہ خوش اخلاقی اور نرمی کا برتاؤ ہونا چاہئے 'مگر شرط یہ ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی نرمی نہیں کی جا سکتی ' نہ اللہ کے دین میں افراط و تفریط سے کام لیا جاسکتا ہے۔

وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (۷: ۱۹۹) ''معروف کی تلقین کر'' معروف سے مراد وہ کام ہے جو اچھا ہو نا جس کی بھلائی میں کوئی شبہ نہ ہو ' اور اس میں کسی کا اختلاف اور جھگڑا نہ ہو اور جس میں تمام سلیم الفطرت اور درست فکر و نظر رکھنے والے لوگوں کا اختلاف نہ ہو۔جب نفس انسانی ان معروف امور کا عادی بن جائے تو پھر اس کی قیادت اور راہنمائی آسان ہو جاتی ہے اور وہ بغیر کسی مشقت کے اچھے کاموں کی طرف آگے بڑھتا ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ جب آغاز ہی میں نفس انسانی کو مشقت 'مشکلات اور شدت اور سختی سے دوچار کر دیا جائے تو اس اچانک سخت صورت حالات سے نفس انسانی بدک جاتا ہے اور اس کی اصلاح کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں ۔نفس انسانی کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ آغاز کار میں اسے آسان کام دیئے جائیں جو معروف اور مشہور ہوں تاکہ وہ خود مشکل کاموں کی طرف بڑھنے کا حوصلہ کرے اور بڑی سہولت سے وہ کام کر گزرے ۔

وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۷: ۱۹۹) ''اور جاہلوں سے نہ الجھو'' جہالت رشد و ہدایت کے مقابلے میں ہے ' جہالت علم کے بالمقابل بھی ہے ۔گمراہی اور بے علمی گویا ہمسائے ہیں ۔ اعراض کس طرح کریں 'یعنی جاہلوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں ۔ نیز جو باتیں وہ کرتے اور جو برے اعمال وہ کرتے ہیں ان کو اہمیت نہ دیں اور اگر ایسے حالات سامنے آ جائیں تو شریفانہ انداز اختیار کر کے گزر جائیں ۔ان کے ساتھ بحث و تکرار نہ کریں جس کا نتیجہ ماسوائے کشیدگی کے اور کچھ نہیں ہوتا اور جس میں محض وقت اور قوت ضائع ہوتی ہے ۔بعض اوقات سکوت اور اعراض کی وجہ سے ان کا نفسیاتی علاج بھی ہو جاتا ہے ۔یوں ان کے سرکش نفوس کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یہ اصلاح بدکلامی اور بحث و مناظرے کے مقابلے میں زیادہ موثر ہوتی ہے ۔جس کے نتیجے میں عناد اور نفرت پیدا ہوتی ہے ۔مزید یہ کہ الجھاؤ کے نتیجے میں مخاطبین کی اصلاح ہو گی یا نہ ہو گی یہ بات مشکوک ہے البتہ الجھنے والا داعی بہرحال ان لوگوں سے دور ہو جاتا ہے جن میں اصلاح احوال اور قبولیت حق کا مادہ ہوتا ہے ۔اور جب داعی لغو اور بدکلام لوگوں سے اعراض کر دے ۔تو وہ پروقار نظر آتا ہے اور لوگ دیکھتے ہیں کہ داعی کے مخالف لوگ جہالت میں مبتلا ہیں ' احمقانہ کام کرتے ہیں تو اس وجہ سے وہ عوام الناس کی نظروں میں گر جاتے ہیں ۔
ہر صاحب دعوت کو چاہئے کہ وہ اللہ کی ان ہدایات پر اچھی طرح غور و فکر کرے کیونکہ رب العالمین انسانی نفسیات کی داخلیات سے بھی اچھی طرح واقف ہے اسی لئے اس نے یہ ہدایات دی ہیں ۔
لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہرحال بشر تھے ۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ جاہلوں کی جہالت کی وجہ سے آپ غصہ ہو جاتے تھے ۔بعض احمق اور سفیہ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کرتے تھے کہ وہ آپ کے لئے ناقابل برداشت ہوتے تھے ' اور

اگر چہ آپ ان کو برداشت بھی کر لیتے لیکن آپ کے بعد آنے والے اصحاب دعوت ہو سکتا ہے کہ اس قدر برداشت کا مادہ نہ رکھتے ہوں' ایسے حالات میں شیطان اکساتا اور ورغلاتا ہے ۔ اور نفس انسانی جوش میں آکر بے قابو ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد تمام داعیوں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ اعوذ باللہ کے ذریعے اپنے غضب اور جوش پر قابو پانے کی سعی کریں تاکہ شیطان اپنی راہ لے ۔

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۷: ۲۰۰) "اور اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے ۔" اس آیت پر یہ تبصرہ کہ اللہ سمیع و علیم ہے' نہایت ہی بامعنی اور برمحل ہے ۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ جاہلوں کے جہل اور ان کی حماقت کو سن رہا ہے اور ان کی جہالتوں اور حماقتوں کی وجہ سے تمہیں جو تکلیف ہو رہی ہے اس سے بھی اللہ واقف ہے ۔ لہٰذا تم تسلی رکھو ۔ تمہارے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے یا جو حالات تم کو پیش آ رہے ہیں اللہ انہیں جانتا ہے اس سے بڑی اور تسلی کیا ہو گی کہ ایک شخص لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہا ہو اور وہ داعی الی اللہ ہو اور اس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہو اور اللہ کہہ دے کہ بہرحال ہم جانتے ہیں جو کچھ ہو رہا ہے تسلی رکھو ۔

قرآن کریم ایک داعی کی نفسیاتی تسلی کے لئے ایک دوسرا تاثر بھی دیتا ہے کہ داعی کی مشکلات اس کے حق میں اللہ کے نزدیک سامان قبولیت ہیں اور شیطان کے وسوسوں اور اکساہٹوں کے دفیعے کے لئے اہم ہتھیار تقویٰ اور ذکر الٰہی ہے ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ

(۷: ۲۰۱) "حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لئے صحیح طریق کار کیا ہے ۔"

اس مختصر آیت میں عجیب تاثرات دیئے گئے ہیں ۔ جو گہرے حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ تاثرات قرآن کریم کے خوبصورت انداز کلام سے معلوم ہوتے ہیں ۔ آیت کے آخر کو ذرا ملاحظہ فرمائیں ۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷: ۲۰۱) "انہیں اچانک نظر آنے لگتا ہے کہ صحیح طریق کار کیا ہے ۔"

یہ آخری فقرہ پوری آیت کو بے شمار معانی عطا کرتا ہے حالانکہ سابقہ آیات کے الفاظ میں ان معانی کے لئے کوئی لفظ اشارہ تک نہیں کرتا ۔ اس آخری فقرے نے یہ بات بتائی کہ جب انسان کے احساس کو شیطانی خیال چھوتا ہے تو انسان کی فکر و نظر ایک مختصر وقت کے لئے معطل ہو جاتی ہے ۔ لیکن تقویٰ' خدا خوفی اور اللہ کی یاد اور خشیت الٰہی وہ گہرا رابطہ ہے جو دلوں کو اللہ سے جوڑے رکھتا ہے اور انہیں بار بار غفلت سے جگاتا ہے اور ہدایت دیتا رہتا ہے ۔ اہل تقویٰ کو جب حقیقت یاد آ جاتی ہے تو ان کی فکر و نظر اور شعور سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور وہ اچانک وہ راہ دیکھ لیتے ہیں جن پر انہیں چلنا ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان کا مس انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور اللہ کی یاد انسان کی آنکھیں کھول دیتی ہے ۔ مس شیطان ظلمت اور تاریکی ہے اور اللہ کی طرف رجحان نور اور روشنی ہے ۔ مس شیطان کا علاج صرف تقویٰ اور یاد الٰہی سے ہو سکتا ہے اور جن لوگوں میں تقویٰ اور ذکر الٰہی ہو ان پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا ۔

---○○○---

متقین کی شان یہ ہوتی ہے کہ جب شیطان کے اثر سے برا خیال انہیں چھو بھی لے تو وہ چوکنے ہو جاتے ہیں اور صحیح راہ دیکھنے لگتے ہیں۔

وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

"رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لئے چلے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اے نبی ؐ، جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو "میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔"

یعنی شیاطین کے بھائی ان کو ان کی کج روی میں کھینچے لیے چلے جاتے ہیں، اور بعض اوقات ان کے بھائی شیاطین انس بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کی گمراہی میں ان کو ترقی ہی دیتے ہیں، نہ تھکتے ہیں، نہ آرام کرتے ہیں اور نہ خاموش ہوتے ہیں اور یہ لوگ حماقت اور جہالت اور کج روی میں مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

مشرکین مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزات کا مطالبہ ہر وقت کرتے رہتے تھے۔ یہاں ان کے بعض اقوال کو نقل کر کے دکھایا جاتا ہے کہ وہ کس قدر جاہل تھے اور رسالت کی حقیقت سے کس قدر بے خبر تھے۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا (۷:۲۰۳) "اے نبی ؐ، جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لئے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی۔" یعنی تم نے یہ اصرار، رب العالمین کے سامنے کیوں نہ کیا کہ مجھے یہ نشانی اور معجزہ دیا جائے یا یہ مطلب تھا کہ تم نے ازخود معجزے کا صدور کیوں نہ کیا۔ کیا تم نبی نہیں ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ رسالت کی ماہیت اور رسول کے فرائض منصبی سے واقف ہی نہ تھے۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ رب العالمین کے دربار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر باادب تھے اور آپ کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ کی جانب سے جو کچھ ملتا آپ اسے لے لیتے اور اگر کچھ نہ ملتا تو آپ ازخود مطالبہ نہ کرتے نہ کوئی تجویز دیتے۔ نہ آپ میں اس قدر طاقت تھی کہ کسی معجزے کا صدور وہ اپنی طرف ہی سے کر لیتے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے سامنے یہ اعلان کر دیا جائے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷:۲۰۳) "ان سے کہو میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔" میں نہ تو رب العالمین کے سامنے کوئی تجویز دیتا ہوں' نہ اپنی طرف سے کوئی معجزہ ایجاد کرتا ہوں۔ میرے بس میں وہی کچھ ہے جو اللہ وحی کرتا ہے اور میں وہی کچھ کرتا ہوں جس کا امر ہوتا ہے۔

دور جاہلیت میں جعلی نبیوں نے عوام کے سامنے اچھے لوگوں کی جو تصویر پیش کی تھی وہ لوگوں کی نظروں کے سامنے تھی۔ حقیقی رسالت اور رسول کے اصل منصب کی ماہیت کے ادراک کے لئے ان کے پاس کوئی علم نہ تھا۔

چنانچہ حضور کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے سامنے وہ علمی حقائق پیش کریں جو ان کے لئے چشمہ بصیرت ہوں اور جن کو قرآن میں نازل کیا گیا ہے اور وہ ان سے جاہل ہیں۔ ان حقائق پر غور کرنے کے بجائے وہ معجزات طلب کرتے ہیں حالانکہ وہ قرآن کو پڑھ کر ان حقائق کو پا سکتے ہیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷:۲۰۳) "یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔" بے شک قرآن بصیرت کی روشنی ہے' اور رحمت الٰہی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو اسے تسلیم کر لیں اور ایمان لائیں اور اس مال غنیمت کو لوٹ لیں کیونکہ یہ تو ہے ہی عامۃ الناس کی بھلائی کے لئے۔

وہ عرب جو جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے وہ اس قرآن سے روگردانی کر کے اس کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خارق عادت معجزات طلب کرتے تھے جس طرح اس وقت لوگ نبیوں سے معجزات طلب کرتے تھے جب انسانیت دور طفولیت میں تھی اور اس وقت لوگ اپنے اپنے علاقوں میں محدود تھے اور عالمی سطح پر لوگوں کے درمیان علم و حکمت کا تبادلہ نہ ہوا تھا۔ اس وقت کی رسالتیں بھی علاقوں اور مختصر زمانوں کے لئے ہوا کرتی تھیں اور ان کا خطاب بھی ان ہی لوگوں تک محدود تھا جو اس وقت موجود تھے۔ بعد کے آنے والوں پر ان رسالتوں کا اطلاق نہ ہوتا تھا جنہوں نے ان معجزات کو نہ دیکھا تھا۔ وہ معجزات صرف ان لوگوں ہی کے لئے مفید تھے' بعد میں آنے والوں کے لئے مفید نہ تھے جنہوں نے ان کو نہ دیکھا تھا اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

قرآن کریم اس قدر معجز ہے کہ کوئی مادی معجزہ اس کے مقابلے میں معجزہ نہیں ہے۔ جس دور کو لیا جائے اور جس پہلو سے لیا جائے قرآن مجید حیران کن ہے۔ یہ کسی وقت یا کسی دور کے لوگوں کے لئے ہی معجز نہیں ہے بلکہ تاقیامت معجزہ ہے۔ لفظاً و معناً معجز ہے۔

ذرا اس کا لفظی اور اس تعبیری پہلو ملاحظہ کیجئے۔ جاہلیت کے دور میں عربوں کے اندر جو فصاحت و بلاغت پائی جاتی تھی وہ ان کے اعتبار سے بالکل واضح معجزہ تھا وہ جس طرز ادا کے عادی تھے اور جس طرح وہ اپنے بازاروں اور تہواروں میں اس پر باہم فخر کیا کرتے تھے۔ ذرا دیکھئے کہ اس پہلو سے جس طرح وہ اس وقت معجز رہا تھا' آج بھی ہے اور کوئی انسان آج تک ان بلندیوں کو نہیں چھو سکا حالانکہ قرآن نے ان کو اس وقت بھی چیلنج دیا تھا اور آج بھی دے رہا ہے۔ انسانوں میں سے جو لوگ تعبیرات کلامی سے واقف ہیں اور جن کو ادراک ہے کہ انسان کس قدر فصاحت و بلاغت تک پہنچ سکتا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اپنی طرز ادا کے اعتبار سے قرآن معجز ہے اور معجز رہے گا۔ اور یہ ماہرین اسلوب چاہے قرآن مجید پر ایمان لائے ہوں۔ چاہے نہ لائے ہوں وہ اس کے اعجاز کو مانتے ہیں کیونکہ یہ چیلنج جن اصولوں پر قائم ہے ان کے سامنے مومن اور کافر دونوں

برابر ہیں۔کبرائے قریش قرآن کریم کے ان چیلنجوں کو رات دن پڑھتے تھے 'لیکن ان کے پاس ان کے جواب کی کوئی سبیل نہ تھی حالانکہ وہ قرآن کریم کے منکر تھے اور اسے بالکل پسند نہ کرتے تھے۔ آج بھی ہر جاہل قرآن کریم کے ان چیلنجوں کو پاتا ہے مگر اس کے پاس جواب کی کوئی سبیل نہیں ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔

اس لفظی اور اسلوبی اعجاز کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے فطرت انسانی پر معجزانہ اثرات ہیں۔بشرطیکہ انسانی فطرت اور اس کتاب کے درمیان رکاوٹیں ایک لمحے کے لئے بھی دور ہو جائیں۔ وہ لوگ جن کے دل سیاہ ہو چکے ہیں اور جن کے دلوں پر تہ بہ تہ جاہلیت کی گرد پڑی ہوئی ہو' ان کے دل بھی بعض اوقات گرد جھاڑ کر اٹھ جاتے ہیں اور جب وہ قرآن کو سنتے ہیں تو ان کے دل بھی تلملا اٹھتے ہیں اور ان کے دل قرآن کریم کے مسحور کن اثرات میں گھر جاتے ہیں۔

بہت سے لوگ بات کرتے ہیں اور بعض لوگوں کے کلام میں اصول و مذاہب اور مختلف افکار اور رجحانات ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی فطرت پر قرآن مجید کا جو اثر ہوتا ہے وہ ایک منفرد اثر ہوتا ہے۔ انسانی دلوں پر اس کی تلاوت کے مخصوص اثرات پڑتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھنے والوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ قریش اپنے زیر دست متبعین کو یہ مشورہ دیتے تھے اور دراصل وہ خود اپنے آپ کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "اس قرآن کی طرف کان نہ دھرو' بلکہ اس میں شور مچاؤ شاید کہ تم غلبہ پالو۔"

وہ قرآن کریم کے اثرات خود اپنے نفوس کے اندر محسوس کرتے تھے' وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان اثرات کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ آج ہمارے دور جدید کے کبراء بھی یہ چاہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی توجہ قرآن کریم سے ہٹائیں لیکن قران کریم آج بھی غالب اور موثر ہے اور انسانی کلام کے اندر اگر قرآن کریم کی ایک یا دو آیات کو رکھ دیا جائے تو وہ واضح طور پر منفرد نظر آتی ہیں۔ ان کا اثر دوسرے کلام سے علیحدہ ہوتا ہے۔انسانی احساس پر ان کا اثر گہرائیوں تک ہوتا ہے اور اس سے انسانی کلام بالکل جدا اور علیحدہ نظر آتا ہے۔حالانکہ انسانی کلام بڑے تکلف اور نقش و نگار سے مزین کیا گیا ہوتا ہے۔

اب ذرا اس کتاب کے موضوع اور مواد پر غور کریں۔ قرآن کے مواد اور موضوعات پر کلام کے لئے ظلال القرآن کے مختصر صفحات میں کلام کی گنجائش نہیں ہے۔کیونکہ موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے تو وہ بحر ناپیدا کنار ہے۔ اس قدر مختصر صفحات میں کہاں کہا جاسکتا ہے۔

بہرحال انسان اور انسانی شخصیت کے ہر پہلو کو قرآن نے موضوع بحث بنایا ہے۔انسانی شخصیت کو قرآن نے ہر جہت سے لیا ہے۔ ایک ہی رو میں انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بات کی ہے۔انسانی شخصیت کے ہر دروازے سے یہ کتاب اندر داخل ہوتی ہے۔انسانی تفکرات میں سے ہر فکر اور انسانی جذبات میں سے ہر جذبے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

قرآن کریم جب ذات انسان کے مسائل پر بحث کرتا ہے تو اس کا منہاج بحث بڑا انوکھا ہوتا ہے۔ انسان کا دل و دماغ اور اس کی فطرت جس بات کو محسوس کرتی ہے' قرآن اسے لیتا ہے۔ اس کی واضح شکل سامنے لاتا ہے اور اس موضوع پر انسان کی فطری ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا فیصلہ دیتا ہے۔انسان کی پوشیدہ قوتوں کو یہ کتاب جگاتی ہے اور ان کو صحت مند راستے پر ڈالتی ہے۔

پھر قرآن کا منہاج ایسا حکیمانہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کو لے کر قدم بقدم' مرحلہ وار' نہایت ہی تدریج کے ساتھ'

نرمی اور سہولت کے ساتھ بلندی پر چڑھاتا جاتا ہے۔ انسان اس راستے پر نہایت ہی خوشی اور پر جوش طریقے سے آگے بڑھتا ہے' اسے اپنی راہ بالکل واضح اور صاف نظر آتی ہے اور وہ یوں ترقی کرتا ہے جس طرح ایک انسان بلندی پر ایک ایک سیڑھی عبور کر کے چڑھتا ہے اور بلندیوں کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور اس راہ پر بڑھتے ہوئے وہ علم و نظر' جوش و خروش ' استقامت اور یقین ' اعتماد اور امید اور آرام اور اطمینان کے ساتھ ' اس کائنات کے پورے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ' خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے ' آگے بڑھتا جاتا ہے۔

قرآن کا عجیب منہاج و انداز یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی کو ایک ایسے مقام سے بیدار کرتا ہے جس کے بارے میں کوئی شخص یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کس قدر بیدار اور حساس مقام ہے۔ یا یہ کہ اس زاویہ سے فطرت انسانی زیادہ قبولیت کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی فطرت اپنے اسی پہلو سے بیدار ہوتی ہے اور پر جوش انداز میں قرآنی ہدایات پر لبیک کہتی ہے' اس لئے کہ جس ذات نے یہ قرآن نازل کیا ہے۔ وہی تو اس فطرت کی خالق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ اس قدر رکھتا ہے جو قربت انسان کی شہ رگ نہیں رکھتی۔

یہ منہاج یا یہ مواد جسے قرآن کریم اس اسلوب و منہاج میں پیش کرتا ہے' اس کے اس قدر وسیع پہلو ہیں جن پر قول و کلام حاوی نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے کہا گیا ہے :

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي

وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَادًا "کہو کہ اگر اللہ کے کلمات کے لئے سمندروں کو سیاہی بنا دیا جائے' تو یہ سمندر ختم ہو جائیں اور اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں' اگرچہ ہم ان جیسے مزید سمندر ہی سے سیاہی بنائیں۔" اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ "اور سمندر سے سیاہی بنانے میں مزید سات سمندر استعمال کئے جائیں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں۔"

راقم الحروف ' اللہ کے فضل و کرم سے ' ۱۵ سال تک قرآن کریم کا نہایت ہی گہرا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ اس عرصے میں وہ اس کتاب کے موضوعات کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ دوڑاتا رہا ہے۔ انسان کے حاصل کردہ علوم کے مختلف میدانوں میں جہاں انسانی ذہن کی رسائی ہوئی ہے اور جہاں انسانی اذہان ابھی تک نہیں پہنچ سکے۔ میں نے ان علوم کے بارے میں ان چیزوں کا مطالعہ بھی کیا جو انسانوں نے ان موضوعات کے بعض پہلوؤں کے بارے میں بطور انسانی کاوش پیش کی ہیں' لیکن میں نے اس حقیقت کو پایا ہے کہ قرآن کریم کا فیض بہت ہی عام وسیع اور کھلا ہے۔ اس کے مقابلے میں انسانی علم ایک چھوٹا سا بجیرہ ہے' بلکہ ایک چھوٹا سا کنواں یا سوراخ ہے بلکہ وہ ایک ایسا تالاب ہے جو مسلسل ٹھہراؤ کی وجہ سے بدبودار ہو گیا ہے۔

میں نے اس کائنات پر قرآن کی روشنی میں ایک کلی نگاہ ڈالی۔ اس کائنات کے مزاج ' اس کی ماہیت ' اس کی پیدائش و تخلیق اور اس کی ترقی اور اس کی پشت پر رازہائے نہفتہ کو خوب پڑھا۔ اس کائنات کی خفیہ اور پوشیدہ صفات اور خصوصاً اس کی زندہ مخلوق پر غور کیا' خصوصاً وہ تحریریں بھی مطالعہ کیں جو اس کائنات کے بارے میں انسان نے اپنے

علم و تجربے سے تحریر کیں ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب خصائص التصور الاسلامی وغیرہ)

پھر انسان کے وجود' اس کی نفسیات' اس کی اصلیت' اس کی نشوونما' اس کی پوشیدہ صلاحیتوں' اس کی سرگرمیوں کے دائروں' اس کے وجود کی ساخت' اس کے تاثرات' اس کے میلانات اور دوسرے حالات اور راز جن کے بارے میں انسانوں نے بھی کچھ معلومات فراہم کی ہیں' مثلاً علوم الحساب اور حیاتیات کے مختلف موضوع' انسانی عقائد و ادیان اور ان کے اجتماعی فلسفے' ان موضوعات کا بھی میں نے بغور مطالعہ کیا۔ (دیکھئے الاسلام و مشکلات الحضارہ وغیرہ)

پھر میں نے انسانی نظام ہائے حیات کا بھی مطالعہ کیا۔ ان نظاموں میں انسان کی سرگرمیوں کا بھی مطالعہ کیا' اس میں انسانوں کے باہم روابط اور اختلافات کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ انسانی روابط کی تجدید و اصلاح کی اسکیموں پر بھی غور کیا۔ اور ان کے بارے میں ان موضوعات پر مطالعہ کیا جن کے بارے میں بہت سے مکاتیب فکر میں اور جن پر انسانوں نے کام کیا ہے مثلاً سیاسی' اقتصادی اور اجتماعی مسائل (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب نحو مجتمع اسلامی)

ان تمام شعبوں میں اور ان تمام موضوعات پر انسانی علوم و فنون کے مطالعے کے بعد جب میں نے قرآن مجید کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان موضوعات کے بارے میں بڑی کثرت سے آیات موجود ہیں جن میں تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں اور جو علم کا خزانہ قرآن میں ہے وہ نہایت ہی حقیقی' ٹھوس اور وسیع ہے۔

ان موضوعات پر سالہا سال تک غور کرتے ہوئے میں نے کبھی بھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ قرآن سے باہر' کسی حوالہ سے مدد لی جائے۔ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و احادیث کی ضرورت بہرحال پڑتی ہے کیونکہ وہ کلام بھی آثار کلام الٰہی میں سے ہے۔قرآن و سنت کے سوا ان موضوعات پر انسانوں نے جو کہا ہے وہ نہایت ہی کمزور اور ناقص ہے۔اگر صحیح بھی ہو تب بھی تشفی بخش نہیں ہے۔راقم الحروف نے ہر انسانی تحریر کے مقابلے میں قرآن کو مفصل اور تشفی بخش پایا۔

میں جو بات کہہ رہا ہوں' ایک طویل عرصہ تک قرآن پر غور و فکر کرنے اور انسانی مسائل کے حل قرآن و سنت کی روشنی میں تلاش کرنے کی ضرورت کے تحت عملاً قرآن کے سائے میں رہنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔میں قرآن کی خوبیاں بیان کر کے قرآن کے بارے میں آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر رہا' نہ تمام انسان قرآن کی تعریفیں کر کے اس کے کمالات میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کا ایک نہایت ہی منفرد گروہ اور نسل گراں قدر ہے' یعنی صحابہ کرام۔' ان کی تربیت' ان کے علم اور ان کی راہنمائی کا سرچشمہ یہی کتاب تھی۔اسی کتاب نے ان کو بنایا تھا۔اس کے بعد انسانوں میں کوئی گروہ اس معیار کا تیار نہیں ہو سکا' نہ اس سے قبل انسانی تاریخ میں صحابہ کی ٹکر کا کوئی گروہ ہمارے علم میں ہے۔یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے انسانی تاریخ میں ایک گہرا اور وسیع انقلاب برپا کیا۔لیکن اس عظیم انقلاب اور اس عظیم واقعہ کا انسانوں نے فی الحقیقت گہرا مطالعہ نہیں کیا۔

انسانی تاریخ میں گروہ صحابہ کے ذریعے جو انقلاب برپا کیا گیا اور جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ہے' درحقیقت وہ اسی کتاب یعنی قرآن کے سرچشمے سے پھوٹا۔حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام رسولوں کے ہاتھوں جن معجزات کا صدور ہوا' یہ معجزہ یعنی انسانیت کے انقلاب عظیم کا معجزہ' ان تمام معجزات سے برتر اور ان پر بھاری ہے۔کیونکہ یہ ایک حقیقی' قابل ملاحظہ اور زیر مشاہدہ معجزہ ہے۔غرض گروہ صحابہ انسانی تاریخ کا

ایک منفرد معجزہ تھے۔

اسلامی معاشرے کی پہلی ترکیب اس منفرد گروہ سے تھی' اس کے بعد ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک اسلامی معاشرہ زندہ و تابندہ رہا اور اس میں اسلامی شریعت کے قوانین نافذ رہے۔ یہ معاشرہ اسلامی اقدار' اسلامی حسن و قبح کے پیمانوں اور اسلامی ہدایات اور اشارات کا پابند رہا۔ یہ ہزار سالہ اسلامی معاشرہ بھی درحقیقت ایک دوسرا تاریخی معجزہ تھا خصوصاً جبکہ کوئی تاریخی مبصر اس اسلامی معاشرے اور دوسرے انسانی معاشروں کے درمیان تاریخی موازنہ کرے۔ یہ دوسرے جاہلی معاشرے مادی ترقی میں تو اسلامی معاشرے سے برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں لیکن انسانی تہذیب و تمدن میں وہ برتری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ آج جدید جاہلیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی نفسیاتی ضروریات' اپنی اجتماعی ضروریات اور اپنی زندگی کی بہبود قرآن کے بجائے کسی اور سرچشمے سے اخذ کرتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جس طرح عرب جاہلیت کے پیروکار قرآن کریم کے علاوہ خوارق و معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ عرب کے سادہ جاہلوں کو تو قرآن مجید کا یہ عظیم معجزہ اس لئے نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہایت ہی گہری جاہلیت اور جہالت میں مبتلا تھے اور ان کے ذاتی مفادات بھی قرآنی تعلیمات سے متضاد تھے۔ لہٰذا وہ قرآنی عجائبات کو پانے سے محروم رہے۔

رہی جدید جاہلیت تو وہ جہالت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے تعلیمی معیار کے غرور کی وجہ سے قرآنی عجائبات کے دیکھنے سے محروم ہے' حالانکہ علم کے یہ دروازے' ان پر اللہ ہی نے کھولے ہیں لیکن انہوں نے علم کو مادی دنیا کے اندر محدود کر دیا۔ نیز انسانی ضروریات کے تحت آج دنیا کو جو ضروریات لاحق ہیں ان ضروریات کے حصول کے لئے انسانی زندگی بہت زیادہ منظم ہو چکی ہے اور تنظیم و تشکیل کے زاویہ سے جدید جاہلیت کے پرستار نہایت ہی غرور میں مبتلا ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ زیادہ تجربات کی وجہ سے دور جدید کی زندگی نہایت ہی منظم اور پختہ ہو چکی ہے اور مختلف ضروریات کی وجہ سے پیچیدہ بھی ہو چکی ہے۔ اور اس جدید زندگی کے دلدادہ لوگ غرور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ نیز چودہ سو سال سے یہودی اور صیہونی لابی اسلام دشمنی میں مبتلا ہے اور اس نے ان چودہ سو سالوں میں اسلام اور قرآن کے خلاف اپنی سازشوں کو لمحہ بھر کے لئے بھی موقوف نہیں کیا۔ یہودیوں کی پالیسی یہ رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اس کتاب سے غافل کر دیں۔ وہ اس کتاب سے ہدایات نہ لیں' کیونکہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے طویل تجربات کے ذریعے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ مسلمان جب تک قرآنی ہدایات کی پیروی کرتے رہیں گے یہ لوگ ان پر قابو نہیں پا سکتے۔ لیکن اس بات کے لئے ایک شرط ہے کہ مسلمان کتاب اللہ کو اس طرح پکڑیں جس طرح دور اول کی لاثانی جماعت' جماعت صحابہ نے اسے پختہ طریقے سے پکڑا تھا۔ یہ نہ ہو کہ وہ اس کی آیات کو تو اچھی طرح گاتے ہوں اور خوش الحانی سے پڑھتے ہوں لیکن ان کی عملی زندگی سو فیصد اس کی تعلیمات کے برعکس ہو۔ یہ یہودیوں کی نہایت ہی خبیث اور مذموم سازش ہے یہ مسلسل مسلمانوں کے خلاف بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ اس سازش ہی کا آخری نتیجہ وہ حالات ہیں جن میں وہ اقوام مبتلا ہیں جو اپنے نام مسلمانوں جیسے رکھتی ہیں' حالانکہ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں شریعت الہیہ کو نافذ نہ کر دیں۔ غرض اسی سازش کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ اس دین کے آثار کو مٹایا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ مواقع فراہم نہیں ہوتے کہ وہ اپنی زندگیوں کو قرآن کی ہدایات کے مطابق منظم کریں اور اپنے تمام اختلافات و نزاعات میں بھی قرآن کو اس طرح حکم بنائیں جس طرح قرون اول کے مسلمان قرآن کی ہدایت کے

مطابق عمل کرتے تھے اور اپنے لئے قوانین و اصول قرآن کی روشنی میں بناتے تھے۔

آج حالت یہ ہے کہ اہل قرآن نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ماسوائے حسن قراءت ' ترتیل کے اس کا مطالعہ نہیں کرتے ' اوہام اور تعویذوں کے سوا اس کا استعمال نہیں کرتے۔ یہ حالت گہری اور مذموم صیہونی اور صلیبی سازش کی وجہ سے ہے ' مسلمانوں کی جہالت اور غرور علم کی وجہ سے ہے اور مسلمانوں کے فکر و نظر کے عمومی فساد کی وجہ سے ہے۔

دور قدیمہ میں جاہلیت کے پرستار لوگوں کو اس سے اسی طرح غافل کرتے تھے کہ وہ اسے سننے اور اس پر غور کرنے کے بجائے خوارق عادت واقعات کے صدور کا مطالبہ کرتے تھے۔ دور جدید کے جاہل اس قرآن سے مسلمانوں کو دور رکھتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں اپنے بنائے ہوئے قرآن دیتے ہیں اور ابلاغ اور میڈیا کے جدید وسائل کے ذریعے وہ اپنے بنائے ہوئے نظریات کو لوگوں کے ذہنوں پر مسلط کرتے ہیں اس قرآن کے بارے علیم و خبیر کا فیصلہ یہ ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷:۲۰۳) "یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں ' تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے قبول کریں۔"

---ooo---

اور قرآن کا مقام چونکہ یہی ہے ' اس لئے خود ہدایت دی جاتی ہے کہ تمہارا قرآن کے ساتھ رویہ یہ ہونا چاہئے۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو ' شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔" اس آیت پر یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے اور سورہ کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ اسی کتاب والاصفات کی طرف اشارہ تھا:

كِتَابٌ أُنْزِلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ "یہ کتاب ہے ' جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے ' پس اے نبی ' تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو نصیحت ہو۔"

جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اس وقت خاموش رہنے کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ قرآن مجید ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے کہ امام جہراً قراءت کرتا ہے ' تو مقتدی پر فرض ہے کہ وہ خاموش رہے۔ جب وہ جہری نماز میں امام کو سن رہا ہو تو اس کے لئے پڑھنا منع ہے۔ لا ینازع الامام القرآن "امام کے ساتھ قرآن میں تنازعہ نہ ہو۔" یہ روایت امام احمد اور اہل سنن نے نقل کی ہے۔ اور امام ترمذی نے اسے حدیث حسن کہا ہے اور ابو حاتم الرازی نے اسے حدیث صحیح کہا ہے۔ انہوں نے زہری ' ابو اکثمہ لیثی کے واسطہ سے ابو ہریرہ سے نقل کیا کہ حضور ؐ جب ایک جہری نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ ابھی میرے پیچھے تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قراءت کی؟ ایک شخص نے کہا "ہاں" رسول خدا ؐ میں نے پڑھا۔ حضور ؐ نے فرمایا "میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن کے ساتھ تنازعہ کر رہا ہوں۔" اس کے بعد لوگ حضور ؐ کے ساتھ جہری نمازوں میں قراءت کرنے سے باز آ گئے۔ کیونکہ انہوں نے حضور ؐ کی یہ ہدایت سن لی۔ اسی طرح ابن جریر نے بھی اپنی

تفسیر میں ابو داؤد ابن ابو الہند' بشیر ابن جابر کی روایت سے حضرت ابن مسعود کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے سنا کہ بعض لوگ امام کے ساتھ پڑھتے ہیں' تو جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا :''کیا اب وقت نہیں آگیا کہ تم سمجھو' کیا وقت نہیں آگیا کہ تم عقل سے کام لو' اللہ کا حکم مانو' اللہ فرماتے ہیں۔''جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔''

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں دراصل مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ مشرکین کی طرح رویہ نہ اختیار کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تو مشرکین اگر سنتے۔ اس لئے ان میں سے بعض لوگوں نے دوسروں سے کہا تم لوگ قرآن نہ سنو بلکہ جب تلاوت ہو رہی ہو تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ''اس قرآن کی طرف کان نہ دھرو' بلکہ اس میں شور مچاؤ شاید کہ تم غلبہ پا لو۔'' اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا (۷: ۲۰۴) ''جب قرآن مجید پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ امام قرطبی کہتے ہیں کہ یہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ' ابن مسعود' جابر' زہری' عبید اللہ ابن عمیر' عطاء اور سعید ابن مسیب سے اس سلسلے میں روایات نقل کی ہیں۔

علامہ ابن جریر نے بھی اس کی شان نزول نقل کی ہے۔ اس نے ابو کریب' ابوبکر ابن عیاش عاصم' مسیب ابن رافع کے سلسلے کے ذریعے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے ''ہم میں سے بعض لوگ ایک دوسرے کو نماز میں سلام کرتے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) ''جب قرآن مجید پڑھا جا رہا ہو' غور سے سنو اور خاموش ہو جاؤ۔ شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اس کی تفسیر میں امام قرطبی کہتے ہیں کہ محمد ابن کعب قرظی نے یہ کیا ہے کہ جب حضور قرآن مجید پڑھتے تھے تو لوگ اسے دہراتے تھے۔ جب آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے تو لوگ بھی اسی طرح کہتے۔ پوری فاتحہ اور سورت کی تلاوت میں لوگ ایسا ہی کرتے۔ ایک عرصہ تک یہی معمول رہا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) ''جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ جہراً نہ پڑھا جائے جس طرح کہ وہ لوگ رسول اللہ کی اطاعت میں پڑھتے تھے۔

یہ تو تھی امام قرطبی کی رائے۔ اس آیت کے بارے میں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ جب نماز ہو رہی ہوتی تھی تو ایک شخص آتا اور نمازیوں سے پوچھتا تم نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں اور کتنی باقی ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) ایسی ہی روایت مجاہد سے منقول ہے کہ مسلمان نماز میں حسب ضرورت بات کر لیا کرتے تھے' اس لئے یہ آیت اتری 'لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) جن لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حکم صرف اس تلاوت پر موقوف ہے' جو نماز میں ہوتی ہے تو ان کا استدلال ابن جریر کی روایت سے ہے۔ انہوں نے حمید ابن مسعدہ' بشر ابن جریری' طلحہ ابن عبید اللہ ابن عمیرؓ سے روایت کی ہے۔ یہ صاحب کہتے ہیں کہ

میں نے عبید اللہ ابن عمیر اور عطا ابن ابی رباح کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مباحثہ کر رہے تھے اور قاری قراءۃ کے ساتھ تلاوت کر رہا تھا۔ کیا تم کان نہیں دھرتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے' اس کے مستحق نہیں بنتے یعنی لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۷: ۲۰۴) کے۔ اس پر انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی بات میں مشغول ہو گئے۔ کہتے ہیں' میں نے دوبارہ اپنی بات کا اعادہ کیا' انہوں نے پھر میری طرف دیکھا اور پھر اپنی بات میں مشغول ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ میں نے تیسری بار اپنی بات کا اعادہ کیا تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا "یہ تو نماز کے بارے میں ہے۔" وَاِذَا قُرِیءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا (۷: ۲۰۴) علامہ ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ سفیان ثوری ابو ہاشم اسماعیل ابن کثیر نے' انہوں نے مجاہد سے یہی روایت کی ہے کہ آیت وَاِذَا قُرِیءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ (۷: ۲۰۴) نماز کے بارے میں ہے۔ کئی لوگوں نے مجاہد سے یہی روایت نقل کی ہے۔ عبدالرزاق نے ثوری سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر نماز کے علاوہ قراءت ہو رہی ہو اور کوئی بات کر رہا ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ جس طرح نماز میں یہ حکم ہے اسی طرح خطبہ جمعہ اور عیدین میں بھی یہی حکم ہے۔ یہ سعید ابن ابوجبیر' مجاہد عطاء' عمرو ابن دینار' یزید ابن اسلم' قاسم ابن مخیرہ' سلمہ ابن بسار' شہر بن حوشب اور عبداللہ ابن مبارک بھی اسی طرف گئے ہیں لیکن قرطبی کہتے ہیں "یہ مذہب ضعیف ہے۔ اس لئے کہ خطبات میں قرآن مجید کا حصہ کم ہوتا ہے۔ اور خاموشی سب میں واجب ہے۔ علامہ ابن عربی اور نقاش نے کہا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں نہ کوئی خطبہ تھا اور نہ جمعہ واجب تھا۔

امام قرطبی کہتے ہیں کہ اہل تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کو کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا جس طرح فرض نماز میں ہے' اسی طرح غیر فرض میں بھی ہے۔ لغوی مفہوم کے اعتبار سے ہر معاملے میں قرآن کو سننا اور خاموش رہنا فرض ہے' الا یہ کہ کوئی مخصوص دلیل ہو۔

اسباب نزول کے بارے میں اس سے قبل جو روایات دی گئی ہین' ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو یہ بتاتی ہو کہ یہ آیت صرف نماز کے ساتھ مخصوص ہے یا فرض اور غیر فرض نماز میں فرق ہے۔ کیونکہ حکم تو آیت کے الفاظ کی عمومیت پر ہوتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آیت کس خصوصی موقعہ پر نازل ہوئی۔ اقرب بات یہ ہے کہ یہ آیت عام تصور ہو' اور اس کے لئے کسی نص کو مخصوص نہ سمجھا جائے' قرآن کی عظمت اور احترام کے قرین قیاس اور قرین مرتبہ یہ ہے کہ جہاں بھی تلاوت قرآن ہو' خاموشی اختیار کی جائے۔ اور چونکہ اللہ کا کلام ہے' اس لئے اللہ کا ادب بھی اسی میں ہے۔ جب خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید پڑھا جا رہا ہو تو خاموشی اختیار کرو اور سنو اور اسی میں تمہارے لئے رحمت کی امید ہے۔ لہذا کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ اس عمل کو نماز کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے بلکہ جہاں بھی قرآن پڑھا جائے وہاں اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے۔ نفس انسان کو ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور یہ ادب اور احترام اس بات کا ضامن ہے کہ انسان پر دنیا و آخرت میں رحم ہو۔

حقیقت ہے کہ قرآن کریم سے اعراض اور روگردانی کر کے لوگ عظیم خسارے میں جا پڑے ہیں۔ بعض اوقات انسان ایک آیت کو غور سے سنتا ہے اور اس کے نتیجے میں عجیب و غریب تاثرات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتے ہیں اور اس پر علم و ادراک کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ انسان کو اطمینان قلبی' خوشی اور روحانی کیفیات نصیب ہوتی

ہیں اور اس کی سوچ اور عمل میں بڑی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تاثرات اور یہ خصوصیت صرف اس شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں، جس نے انہیں کبھی چکھا ہو۔

قرآن کریم کا مسلسل مطالعہ ' اس پر غور و فکر اور تدبر ' صرف ترنم کے ساتھ قراءت ہی نہیں 'بلکہ یہ انسان کے قلب و نظر پر گہرا غور و فکر اور تدبر پیدا کر دیتا ہے۔ اور انسان کو نہایت ہی دور رس قوت مدرکہ عطا ہو جاتی اور اس پر نہایت ہی یقینی علوم کا القا ہوتے ہیں۔ انسان کے اندر زندگی کی حرارت اور اقدامی قوت پیدا ہو جاتی ہے ' وہ پر عزم ' مثبت سوچ اور مصمم ارادے کا مالک بن جاتا ہے۔ یہ علوم انسان کو تدبر قرآن کے علاوہ کسی اور مشق یا اور ذریعہ علم سے حاصل نہیں ہوتے۔

قرآنی تصورات کے نتیجے میں سے انسان اس کائنات کے حقائق معلوم کر لیتا ہے۔ انسان زندگی کے بارے میں نئے حقائق کا ادراک و انکشاف ہوتا ہے۔ انسان کو انسانی زندگی کے حقائق ' انسانی ضروریات ' انسان کے مزاج اور اس کی فطرت و طبیعت کا نہایت ہی واضح گہرا اور دقیق و عمیق شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہ شعور خالص قرآنی عبادات اور احکام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس کائنات اور انسانی زندگی کے ساتھ وہ انسان جس نے قرآن کا مطالعہ کیا ہو نہایت ہی مختلف روح کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اب انسان کا طرز عمل اس کائنات اور انسان کے ساتھ وہ نہیں ہوتا جو اس انسان کا ہوتا ہے جس کی تربیت محض انسانی علم و معرفت کی فضا میں ہوئی ہو۔

یہ فضا اللہ کی رحمت کی امیدواری کی فضا ہے اور یہ نماز اور غیر نماز میں برابر ہے۔ لہٰذا اللہ کی رحمت کی فضا کو ہم نماز کے ساتھ کسی وجہ سے بھی مخصوص نہیں کر سکتے اور وہی رائے درست ہے جو قرطبی نے نقل کی ہے۔

---ooo---

اس سورت کا خاتمہ اس ہدایت پر ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی کی طرف منہ موڑ لو۔ خواہ یہ ذکر نماز میں ہو یا نماز کے علاوہ عام حالات میں ہو۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ
الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ ۲۴
الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ع ۱۸
۱۴

"اے نبی ؐ، اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آ کر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں ' اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔"

ابن کثیر فرماتے ہیں "اللہ حکم دیتے ہیں کہ اسے دن کے شروع میں یاد کیا جائے ' دن کے آخر میں یاد کیا جائے اور

بڑی کثرت سے یاد کیا جائے ۔ اور دوسری جگہ حکم دیا ہے کہ ان اوقات میں اللہ کی تسبیح اور بندگی کرو۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ "پس اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے ۔" یہ حکم اس وقت تھا جبکہ اسراء کی رات میں ابھی پانچ نمازیں فرض نہ ہوئی تھیں ۔ یاد رہے کہ یہ آیت مکی ہے لیکن اس آیت میں لفظ غدو اور اصال استعمال ہوا ہے ۔ غدو کے معنی دن کا اول حصہ ہے' اصال اصل کی جمع ہے جس طرح ایمان جمع یمین ہے ۔ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً (۷: ۲۰۵) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو اپنے دل میں نہایت ہی عاجزی اور خوف و رجا کی حالت میں یاد کرو۔ زبان سے بھی ذکر الٰہی کرو مگر جہرا نہ کرو۔ اس لئے دون الجهر من القول کہا گیا ۔ یعنی ہلکی آواز میں ۔ ذکر الٰہی کا مستحب طریقہ یہی ہے کہ یہ چیخ و پکار کی صورت میں نہ ہو اور جب صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا "کیا ہمارے رب قریب ہیں تاکہ ہم اس کو ہلکی آواز میں پکاریں یا دور ہیں تاکہ ہم اسے بلند آواز سے پکاریں' تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے ۔"

صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت موجود ہے ۔ کہتے ہیں کہ سفروں میں سے کسی سفر میں لوگوں نے خدا تعالیٰ کو بلند آواز سے پکارنا شروع کر دیا ۔ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "اے لوگو' ذرا اپنی آواز کو اپنے تک محدود رکھو' تم نہ کسی غائب ذات کو پکار رہے ہو اور نہ کسی کونگی بہری ذات کو ۔ جسے تم پکار رہے وہ سمیع بھی ہے اور قریب بھی ہے' وہ تم میں سے ہر شخص کی سواری کی گردن سے زیادہ قریب ہے ۔

ابن کثیر اس بارے میں ابن جریر اور عبد الرحمن ابن زید ابن اسلم کی رائے کو قبول نہیں کرتے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص قرآن کریم کو سن رہا ہوں وہ ہلکی آواز سے اللہ کو یاد کرے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اس قول پر کوئی دلیل انہوں نے پیش نہیں کی ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد بندوں کی طرف سے صبح و شام مطلق ذکر الٰہی ہے تاکہ وہ غافل نہ ہو جائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں فرشتوں کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ وہ رات اور دن ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں ۔ اور وہ اپنی بندگی اور ذکر میں نکلتے ہیں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (۷: ۲۰۶) اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ مسلمان ان کی تقلید کریں اور اللہ کی اطاعت کریں اور کثرت سے اسے یاد کریں اور بندگی بجا لائیں ۔

امام ابن کثیر نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اور جو احادیث نقل کی ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دور اول کے مسلمانوں کی تربیت کس طرح کر رہا تھا ۔ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی عربوں کی نفسیاتی تربیت اور رب تعالیٰ کی معرفت میں انہیں نہایت ہی لطیف حقائق سے آگاہ کرتے رہے تھے نیز ان کو بتایا جاتا تھا کہ ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کی حقیقت کیا ہے ۔ ان لوگوں کے سوالات اور اللہ کی جانب سے اور رسول اللہ کی جانب سے جوابات کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے فکر و عمل میں کس قدر عظیم اور دور رس انقلاب برپا کر دیا گیا تھا اور یہ کتاب

اللہ اور سنت رسول کا حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ یہ ایک عظیم اور دور رس انقلاب تھا جو ان لوگوں کے لئے باعث رحمت تھا لیکن اے کاش کہ لوگ جانتے۔

یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ ان نصوص میں جس ذکر کے بارے میں کہا گیا ہے وہ صرف زبانی ذکر نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد قلبی ذکر ہے' اس لئے کہ جس ذکر سے مومن اور ذاکر کا دل مرتعش نہ ہو' جس سے اس کا وجدان اور شعور متاثر نہ ہو' جس ذکر کا اثر انسان کی ذات اور اعمال پر نہ ہو' اور وہ ذکر عاجزی' تضرع اور خوف کے ساتھ نہ کیا جائے تو اسے ذکر نہ سمجھا جائے گا بلکہ بعض حالات میں تو وہ اللہ کی شان میں گستاخی تصور ہو گا' ذکر کا مفہوم تو یہ ہے کہ انسان نہایت ادب' نہایت عاجزی اور نہایت ہی خوف و رجا کی حالت میں اللہ کو یاد کرے۔ اور اللہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اللہ کی عظمت اور جلالت شان کا تصور بھی کیا جائے اور دعا کی جائے کہ انسان اللہ کے غضب سے محفوظ ہوں' صرف اس ذکر سے انسان کو روحانی جلا نصیب ہو سکتی ہے۔

جب زبان ضمیر اور قلب کے ساتھ حرکت کرتی ہو' اور ہونٹ جب روح کے ہم رکاب ہوں' تو یہ اس صورت میں ہوں کہ خشوع اور خضوع میں فرق نہ آئے' نہایت ہی دھیمی آواز میں ہو اور چیخ و پکار اور شور و شغب کی صورت میں نہ ہو اور نہ ترنم اور غنا کی صورت مناسب ہے۔ اور نہ پریڈ میں اور طربیہ انداز میں۔

ذرا آیت پر دوبارہ نگاہ ڈالیں وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (۷: ۲۰۵) "اے نبی اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو' دل ہی دل میں' زاری اور خوف کے ساتھ' اور زبان سے بھی ہلکی آواز میں۔"

بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ (۷: ۲۰۵) "صبح و شام" یعنی دن طلوع ہوتے وقت اور دن کے آخری وقت ہیں' اس طرح کہ دن کے دونوں حصوں میں۔ انسان کا قلب اللہ کے ساتھ جڑا ہوا ہو' ذکر الٰہی ان اوقات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' اللہ کی یاد تو ہر وقت قلب و نظر میں ہونا چاہئے' ہر وقت دل پر اللہ کی نگرانی قائم رہنا چاہئے' ان اوقات کا خصوصاً ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان میں کائنات کے صفحات پر ایک نمایاں تغیر رونما ہوتا ہے' رات سے دن اور دن سے رات نمودار ہوتی ہے۔ اور ایک حساس انسان کا دل اپنے ماحول میں اللہ کے عظیم کارناموں میں تغیرات اور انقلابات دیکھتا ہے۔ اس کائنات کے ظاہری احوال بدلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ ان اوقات میں انسان کا دل اور اس کا نفس قبولیت کے قریب تر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں بکثرت ایسے اوقات میں ذکر الٰہی کی ہدایت کی گئی ہے جن میں انسان کے قلب و نظر پر یہ کائنات بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اس طرح انسان کا دل نرم ہوتا ہے۔ اور وہ باری تعالیٰ کی ذات سے تعلق قائم کرنے کے لئے خوب تیار ہوتا ہے۔ مثلاً مشکلات کے وقت فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ "جو باتیں یہ لوگ کرتے ہیں ان پر صبر کرو' اور اپنے رب کی تعریف کرو' اس کی تسبیح کرو طلوع شمس اور غروب سے پہلے۔" رات کو بھی اللہ کی تسبیح کرو اور سجدوں کے بعد بھی۔" وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ "اور رات کے حصے میں تسبیح کرو' دن کے اطراف کے وقت بھی' شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ، وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا "اور

اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو' رات کے ایک حصے میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوا کرو اور طویل رات میں اس کی تسبیح کرو۔" یہاں کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان اوقات میں ذکر الٰہی کا حکم فرضیت صلوۃ سے پہلے نازل ہوا تھا' جس کے اوقات معلوم ہیں اور اب ان اوقات میں ذکر الٰہی کی ضرورت یا حکم نہیں ہے ۔ اس لئے کہ یہاں جس ذکر کا بیان ہو رہا ہے یہ نماز سے عام ہے اور اس ذکر کے اوقات فرض نمازوں کے اوقات کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں ۔ یہ ذکر نماز کی شکل کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے ' یہ قلبی ذکر ہے ' یا قلب اور زبان دونوں کے ساتھ ہو سکتا ہے ' بلکہ یہ ان صورتوں سے بھی زیادہ عام ہے' ہروقت اللہ کا مستحضر رہنا اور ہروقت اللہ کی جلالت کا قلب و نظر پر جاری رہنا اور خفیہ اور اعلانیہ ہر حالت میں' چھوٹے معاملے میں یا بڑے معاملے میں حرکت میں اور سکون میں' نیت میں اور اعمال میں' غرض ہر حال میں اللہ کو یاد کرنا ان آیات کا ماحصل ہے ۔ صبح و شام کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا ہے کہ ان اوقات میں انسان کا قلب اور نظر قبولیت کے لئے تیار ہوتی ہے ۔ اور اللہ جانتا ہے کہ اس وقت انسان پر کائناتی اثرات ہوتے ہیں ۔

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (۷ : ۲۰۵) "ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت کا شکار ہیں ۔" یعنی ایسے لوگوں میں سے نہ بنو جو اللہ کی یاد سے غافل ہیں ۔ جن ہونٹوں پر اور جن کی زبان پر اللہ کا نام نہیں آتا' نہ ان کے قلب و نظر میں تصور خدا ہوتا ہے ۔ جو اب ذکر نہیں کرتے جس کے ساتھ دل کی دھڑکن وابستہ ہو' اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان راہوں پر نہیں چلتے جن پر اللہ تعالیٰ چلنے کو پسند نہیں کرتے جسے اللہ دیکھے تو انہیں شرمندہ ہونا پڑے ۔ وہ چھوٹی اور بڑی ہر بات میں اللہ کا لحاظ رکھتے ہیں ۔ ایسا ہی ذکر ان آیات کا مفہوم ہے ۔ اگر کسی ذکر کا اثر انسان کے اعمال اور اس کے طرز عمل پر نہیں ہوتا اور وہ اللہ کا اتباع نہیں کرتا تو وہ ذکر' ذکر بھی نہیں ہے اور نہ اس آیت کا مطلوبہ ذکر ہے ۔

یعنی اللہ کو یاد کرو' اور اس سے غفلت نہ کرو ۔ تمہارا دل اس بات سے غافل نہ ہو کہ وہ مسلسل نگرانی کر رہا ہے ۔ انسان اس بات کا سخت محتاج ہے کہ ہروقت اس کا جوڑ اللہ کے ساتھ رہے ۔ صرف اس صورت میں وہ شیطانی وساوس سے بچ سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ فَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۔" (اعراف ۲۰۰) اس سورہ کے آغاز میں آدم و ابلیس کے معرکے کا تفصیلی بیان آیا تھا ۔ پھر اس پوری سورہ میں قافلہ ایمان کی کہانی بیان ہوتی رہی ہے ۔ اور اس قافلے کی راہ میں جنوں اور انسانوں کے شیاطین جو رکاوٹیں ڈالتے رہے ہیں' مثلاً اس شخص کی مثال کا بھی تفصیلی ذکر ہوا جسے اللہ نے اپنی نشانیاں دی تھیں لیکن وہ ان سے نکل بھاگا ۔ شیطان نے اس کا پیچھا کیا اور اسے گمراہوں کے ٹولے میں شامل کر کے چھوڑا ۔ سورت کے آخر میں شیطان کے اکسانے کا ذکر ہوا اور حکم دیا گیا کہ ایسی حالت میں مداوا یہ ہے کہ تم اللہ کی پناہ میں چلے جاؤ ۔ وہ جاننے اور سننے والا ہے ۔ غرض قرآن مسلسل اور مربوط کلام ہے اور اس کے آخر میں حکم دیا جاتا ہے کہ ہروقت نہایت ہی عاجزی کے ساتھ اللہ کو یاد کیا کرو ۔ اور غفلت سے بچو ۔ یہ حکم اس بات کے دوران آتا ہے جس میں اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہیں کہ عفو و درگزر کو اپنا شعار بناؤ' معروف باتوں کا حکم دو اور جاہلوں سے پہلوتہی کرو' لہٰذا یاد الٰہی درحقیقت اسلامی انقلاب کے نشانات منزل کا تکملہ اور آخری منزل ہے ۔ اور یہ راہ رو منزل کے لئے وہ توشہ ہے جس کے ذریعے وہ مشکل ترین منازل طے کر سکتا ہے ۔

اب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے سامنے ملائکہ مقربین کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ جن پر شیطان کی اکساہٹ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کے اندر تخلیقی اعتبار سے کوئی کمی نہیں ہوتی نہ ان کے اندر شہوات ہوتی ہیں اور نہ میلانات ہوتے ہیں۔ وہ رات دن ذکر الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی بندگی میں نہ کوئی تقصیر کرتے ہیں اور نہ غرور کرتے ہیں حالانکہ اللہ کی بندگی اور تسبیح کرنے کے معاملے میں انسان ان سے زیادہ محتاج ہے۔ انسان کی راہ میں زیادہ مشکلات ہیں اور اس پر شیطان کی اکساہٹ کا اثر بھی جلد ہوتا ہے۔ انسان تباہ کن غفلت کا ارتکاب بھی کر سکتا ہے۔ انسان کی سعی بھی محدود ہے' اگر ذکر الٰہی کا توشہ نہ ہو تو اس کے لئے منزل تک پہنچنا ہی دشوار ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ

(۷:۲۰٦) ''جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا قیام رکھتے ہیں وہ کبھی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکتے رہتے ہیں۔''

عبادت اور ذکر الٰہی دین اسلام کے اساسی طریقوں میں شامل ہیں۔ یہ محض علم و معرفت کا طریق کار نہیں ہیں۔ نہ لاہوتی جدلیات سے ان کا تعلق ہے بلکہ ان کا تعلق سلوک و عمل اور عملی حرکت کے ساتھ ہے۔ اور اس کے ذریعے انسان کی عملی دنیا کو بدلنا مطلوب ہوتا ہے۔ انسان کی عملی زندگی کی جڑیں لوگوں کے نفس کے اندر ہوتی ہیں' عمل کی اساس کے خزانے انسان کے اندر ہوتے ہیں' لوگوں کو عملاً جاہلیت سے نکالنا اور اسلامی منہاج میں داخل کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اور اس کے لئے نہایت ہی مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس راہ کی مشکلات پر صبر ایوبی کی ضرورت ہے جبکہ داعی کی طاقت محدود ہوتی ہے۔ اس لئے داعی کے لئے اس محدود قوت کے ساتھ اضافی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قوت محض علم و معرفت اور دلیل و برہان سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اس کا سرچشمہ عبادت' تعلق باللہ اور اللہ کی نصرت میں ہوتا ہے۔ یہی وہ توشہ ہے جو ختم نہیں ہوتا۔ اور یہی سرچشمہ نصرت ہے جو اس طویل اور خطرناک راہ میں درکار ہوتا ہے۔

اس سورت کا آغاز ان الفاظ سے ہوا۔ كِتَابٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ''یہ کتاب ہے جو تمہاری جانب نازل کی گئی ہے۔ پس اے نبی تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے منکرین کو ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت ہو۔''

پوری سورہ میں قافلہ اہل حق کی کہانیاں بیان ہوئیں اور اس قافلے کی قیادت رسل کرام اپنے اپنے اوقات میں کرتے رہے۔ راستے پر شیطان رجیم ان کی راہ بار بار روکتا رہا۔ جنوں اور انسانوں کے شیاطین ان کو اذیت دیتے رہے' اس دنیا کے جبار و قہار ان پر مظالم ڈھاتے رہے اور طاغوتی نظاموں کے ہرکارے ان کے آڑے آتے رہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو لوگوں کی گردنوں پر سوار ہو کر ان کو غلام بنا رہے تھے۔

بے شک یہی ہے اس راستے کا توشہ اور یہی ہے اس راستے کے معزز مسافروں کا سازوسامان۔

فی ظلال القرآن

پارہ ۔۔۔۔ ۹

سورۃ الانفال ۔ ۸

۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۴۰

سورۃ الانفال ایک نظر میں

ایک بار پھر ہم مدنی قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔کیونکہ گذشتہ دونوں سورتیں، انعام اور اعراف مکی تھیں ۔اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ فی ظلال القرآن میں ہمارا طریقہ مصحف کے مطابق ہو گا' نزولی ترتیب کے مطابق نہ ہو گا مثلاً بقرہ' آل عمران' نساء اور مائدہ ۔یہ اس لئے کہ سورتوں کی ترتیب نزولی کے بارے میں آج کے دور میں ہم کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے ۔ہم اب اجمالاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں اور یہ مدنی ہیں اور اس کے بارے میں تھوڑے بہت اختلافات موجود ہیں ۔رہی یہ بات کہ کون سی سورہ کس سورہ سے پہلے اور کس کے بعد نازل ہوئی ہے تو اس کے بارے میں آج کے دور میں ہم کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے ۔یا یہ کہ فلاں آیت کس دور میں نازل ہوئی ہے یا آیات کا کوئی گروپ کس دور میں نازل ہوا۔یہ تعین اب قریب قریب ناممکن ہے ۔آج کے دور میں کوئی قطعی بات نہیں کی جا سکتی ۔ہاں بعض آیات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں وقت اتریں جن کے بارے میں تواتر کے ساتھ روایات وارد ہیں یا ایک ہی قطعی روایت ایسی آ گئی ہے جس کے ذریعہ کسی آیت کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود کہ آیات اور سورتوں کی ترتیب زمانی اور ان کے زمانہ نزول کا علم نہایت ہی اہم ہے ۔اور اسی ذریعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تحریک اسلامی کو کن مراحل میں کیا اقدامات کرنے پڑے لیکن اس باب میں تعین کے ساتھ کوئی بات کہنا نہایت ہی مشکل کام ہے ۔جن لوگوں نے بھی اس سلسلے میں کچھ نتائج اخذ کئے ہیں وہ تخمینی اور ظنی ہیں ۔کسی نتیجے کو قطعی اور یقینی نہیں کہا جا سکتا ۔اس کے باوجود کہ سورتوں کے زمانہ نزول کے تعین کے یقینی اسباب و ذرائع نہیں ہیں لیکن اس میدان میں ظنی نتائج پر بھی بہت ہی اہم نتائج مرتب ہوئے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ہم نے ظلال القرآن میں اگرچہ مصحف عثمانی کے مطابق تفسیر لکھی ہے تاہم ہر سورہ کے زمانہ نزول کی اہمیت کے پیش نظر اس کے زمانہ نزول کا تعین بھی کیا ہے ۔ہر سورہ کے تاریخی حالات کو ہم نے بطور اجمال ہی لیا ہے اور زمانہ نزول کے تعین میں ترجیحات قائم کی ہیں' تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ آیات کن حالات میں نازل ہوئیں ۔جس طرح ہم نے اس سے قبل مختصراً تمام سورتوں کے زمانہ نزول کے بارے میں بحث کی ۔اس سورہ میں بھی انشاء اللہ ہم اس اسلوب کے مطابق بات کریں گے ۔(میں نے اپنی کتاب شاہد القیامت فی القرآن میں مشاہد ترتیب نزول کے مطابق ہی دیئے ہیں **لیکن فی ظلال القرآن میں** ہم نے مروج طریق کار ہی استعمال کیا ہے ۔

سورہ انفال سورہ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ۔یہ بدر الکبریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ۔یہ جنگ رمضان المبارک سن دو ہجری میں ہوئی یعنی راجح روایات کے مطابق ہجرت کے بعد انیسویں مہینے میں ۔لیکن یہ بات بھی قطعی نہیں ہے کہ یہ سورہ' سورہ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ۔اس لئے کہ سورہ بقرہ یکبارگی نازل نہیں ہوئی ۔اس کے بعض حصے تو مدینہ میں آمد کے ابتدائی ایام میں نازل ہوئے اور بعض آیات ایسی بھی ہیں جو مدینہ کے آخری دور میں نازل ہوئیں ۔اس کی ابتدائی

آیات اور آخری آیات کے درمیان ۹ سال کا فاصلہ زمانی ہے۔ لہٰذا یقینی بات یہی ہے کہ سورہ انفال ان دو زمانوں کے درمیان نازل ہوئی جبکہ سورہ بقرہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی نازل ہوتی رہی اور حضور کی ہدایات کے مطابق آیات کو اپنے مقامات نشاندہی پر رکھ دیا جاتا۔ اب رہی یہ بات کہ فلاں سورہ فلاں سے پہلے اور بعد میں نازل ہوئی تو اس کا دار و مدار صرف سورتوں کے ابتدائی حصے پر رہا ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلات ہم سورہ بقرہ کے آغاز میں بیان کر آئے ہیں۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ سورہ انفال کی درج ذیل آیات ۳۰ تا ۳۶ مکی ہیں۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۳۰) وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۱) وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۲) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (۳۳) وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴) وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۳۵) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ (۳۶) (۸ : ۳۰ – ۳۶)

”اور اے پیغمبر، وہ وقت یاد کرو، جب کافر تمہارے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے تاکہ تمہیں قید کریں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں، وہ اپنی چال چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا، اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ اور جب ہماری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کی باتیں ہم بھی کر لیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں مگر اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور جب انہوں نے کہا تھا کہ اے اللہ اگر یہ واقعی تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا دے یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ اور اللہ ایسا کرنے والا نہ تھا کہ تم ان کے درمیان موجود ہو اور وہ تمہارے رہتے ان کو عذاب دے۔ اللہ ایسا بھی کرنے والا نہیں کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان پر عذاب نازل کرے اور اب ان کا کیا استحقاق رہا ہے کہ وہ مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکیں اور

اللہ ان کو عذاب نہ دے حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو متقی لوگ ہی ہو سکتے ہیں لیکن ان کافروں میں سے اکثروں کو معلوم نہیں۔ اور ان کی نماز خانہ کعبہ میں کیا ہے سوائے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے۔ پس جیسے کفر تم کرتے رہے ہو اب اس کی پاداش میں مزا چکھو۔ جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ سو یہ لوگ آئندہ بھی خرچ کرتے رہیں گے اور پھر یہ ان کے لئے موجب حسرت ہو گا اور پھر وہ مغلوب ہوں گے اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔

شاید ان لوگوں نے ان آیات کو مکی اس لئے کہا ہے کہ ان میں جن امور کا ذکر کیا گیا ہے وہ مکہ میں واقع ہوئے تھے اور ہجرت سے پہلے درپیش ہوئے تھے لیکن یہ کوئی حقیقی سبب نہیں جو ان آیت کو مکی قرار دے۔ اس لئے کہ کئی مدنی آیات اور سورتیں ایسی ہیں جن میں مکی واقعات پر تبصرے کئے گئے ہیں۔ اسی سورہ میں ان آیات سے پہلے کی آیت ۲۶ بھی مکی حالت سے بات کرتی ہے۔

وَاذْكُرُوٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸: ۲۶)

"وہ وقت یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے اور کمزور سمجھے جاتے تھے، تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت بخشی اور تمہیں رزق کا بہترین سامان دیا تاکہ تم شکر کرو۔"

جبکہ اس سورہ کی آیت ۳۶، جو آیات کے اس گروپ کی آخری آیت ہے جس کے بارے میں مکی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے، یہ واقعہ بدر کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ بدر کے بعد مشرکین غزوہ احد کی تیاری کے لئے بہت بڑی دولت خرچ کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ (۸: ۳۶) "جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ اپنے مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں، سو یہ لوگ آئندہ بھی خرچ کرتے رہیں گے اور پھر یہ ان کے لئے موجب حسرت ہو گا۔ اور پھر وہ مغلوب ہوں گے اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔"

جن روایات میں ان آیات کے مکی ہونے کا ذکر آیا ہے، ان میں ان کے سبب نزول میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو قابل اعتراض ہے۔ ان روایات میں آیا ہے کہ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تمہارے خلاف تمہاری قوم کیا کیا سازشیں کر رہی ہے؟ تو آپ ؐ نے فرمایا ان کا ارادہ ہے کہ مجھ پر جادو کریں، مجھے قتل کر دیں اور مجھے مکہ سے نکال دیں۔ ابو طالب نے کہا کہ تمہیں اس کی اطلاع کس نے دی۔ تو حضور ؐ نے فرمایا مجھے میرے رب نے اس کی اطلاع دی ہے تو انہوں نے کہا بالکل درست ہے، رب تمہارا ہی رب ہے۔ اس لئے آپ اپنے رب کے بارے میں

بھلائی کی وصیت کریں۔ حضور نے فرمایا کیا میں اپنے رب کے بارے میں بھلائی کی وصیت کروں بلکہ میرا رب میرے بارے میں بھلائی کا ارادہ کرے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَاِذْ یَمْکُرُبِكَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ (۸: ۳۰) ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ تنقید کی ہے۔ "اس روایت میں ابو طالب کا تذکرہ بالکل نامانوس ہے بلکہ منکر ہے کیونکہ یہ آیت مدنی آیت ہے' پھر یہ کہ یہ قصہ اور اس سلسلے میں قریش کا اجتماع اور مشورہ' آپ کی گرفتاری یا ملک بدری یا قتل کا فیصلہ انہوں نے اس رات کیا تھا جس میں آپ نے ہجرت فرمائی اور اس وقت ابوطالب فوت ہو چکے تھے اور ان کی وفات پر تین سال بھی گزر گئے تھے۔ صرف ان کی موت ہی کی وجہ سے ان کو جرات ہوگئی تھی کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ فیصلے کریں اس لئے کہ وہی تھے جو آپ کو گھیرے میں رکھ کر آپ کی امداد کرتے تھے اور آپ کی پوری ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لئے ہوئے تھے۔"

ابن اسحاق نے عبداللہ ابن نجیح' مجاہد نے' ابن عباس کی سند سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں قریش کی اس آخری رات کی سازش کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: "اس وقت اللہ نے آپ کو اجازت دے دی کہ اب آپ نکل جائیں اور جب آپ مدینہ چلے گئے تو آپ پر یہ سورہ انفال نازل ہوئی جس میں اللہ نے اپنے ان انعامات کا ذکر کیا جو آپ پر کئے گئے اور جن آزمائشوں سے آپ گزرے۔

وَاِذْ یَمْکُرُبِكَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ (۸: ۳۰) یہ روایت حضرت ابن عباس سے منقول ہے اور قرآن کریم کے سیاق کلام کے ساتھ بھی یہ لگا کھاتی ہے۔ اور ان آیات کا ربط بھی اپنے ماقبل اور مابعد سے درست ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یاد دلاتے ہیں اور اہل ایمان کو یاد دہانی کراتے ہیں کہ ذرا ان واقعات کو تو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ کے کیا کیا کرم تم پر ہوئے' اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ اور جب تم معرکہ کارزار میں پہنچو تو ثابت قدم رہو وغیرہ۔ تمام مضامین جن سے یہ سورہ بحث کرتی ہے۔ لہٰذا یہ بات ہی درست ہے کہ یہ آیات بھی اسی طرح مدنی ہیں جس طرح یہ سورہ مدنی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ محض ایسے ہی غیر یقینی حالات کی وجہ سے اور اسباب نزول کی ایسی ہی روایات کی وجہ سے جو ہم نے یہ موقف اپنایا کہ قرآن کی تفسیر مصحف عثمانی کے مطابق لکھی جائے اور قرآن مجید کی ترتیب نزولی کے مطابق تفسیر نہ لکھی جائے۔ اس لئے کہ ترتیب نزول کے سلسلے میں آج بھی ہم کسی یقینی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ ہم نے اسباب نزول قرآن اور ہر سورہ کے حالات نزول کے بارے میں بقدر استطاعت بحث کی ہے اور اللہ ہی ہے جو توفیق دینے والا ہے۔

---()()()---

یہ سورہ بدر کبریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ غزوہ بدر تحریک اسلامی کی تاریخ میں بلکہ خود انسانی واقعات کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ یہ غزوہ تحریک اسلامی کے لئے ایک بہترین معلم ثابت ہوا' اپنے حالات اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج کے زاویہ سے۔

اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن کو جمعیتوں کی مڈبھیڑ کا دن اور یوم الفرقان کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ بلکہ نہ صرف یہ کہ اسے اس دنیا میں تحریک اسلامی کے راستے کا اہم موڑ قرار دیا بلکہ اسے آخرت کی کامیابی کے لئے بھی سنگ میل قرار دیا۔

یہ دن صرف دنیا کے لوگوں کے لئے ہی فیصلہ کن نہ تھا بلکہ آخرت کا فیصلہ یہ دن اس طرح کرتا ہے :

فَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ یُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِیْمُ (۱۹) یُصْهَرُ بِهٖ مَا فِیْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ (۲۰) وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ (۲۱) كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۲۲) اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ (۲۳) وَهُدُوْۤا اِلَى الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِیْدِ (۲۴) (۲۲ : ۱۹ - ۲۴)

”یہ دو فریق ہیں' ایک دوسرے کے مخالف' جو اپنے رب کے بارے میں آپس میں جھگڑتے ہیں تو جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے ان کے لئے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں اور ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا' اس سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے گل جائے گا اور ان کی کھالیں گل جائیں گی اور ان کے مارنے کے لئے لوہے کے گرز ہوں گے جب کبھی وہ گھٹن کے سبب نکلنا چاہیں گے تو اس میں پھر دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا۔اب جلنے کا عذاب چکھو۔دوسری طرف جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کو اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔وہاں انہیں سونے کے کنگن اور ہار پہنائے جائیں گے اور لباس ان کا ریشمی ہو گا اور یہ سب انعام انہیں اس لئے ملے گا کہ دنیا میں انہیں پاکیزہ بات کی ہدایت کی گئی اور انہیں خدائے ستودہ صفات کی راہ بتائی گئی۔“

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات ان دو فریقوں کے بارے میں نازل ہوئیں جنہوں نے بدر میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا'یعنی یوم الفرقان میں۔صرف دنیا ہی میں نہیں انسانی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی بلکہ نہایت ہی دور رس طور پر فیصلہ کرنے والے دن میں۔ اللہ جل شانہ کی طرف سے یہ شہادت کافی ہے کہ بدر کا دن یوم الفرقان تھا اور یہ فیصلہ کن دن تھا۔جب ہم بدر کے واقعات پر تبصرہ کریں گے تو اس دن کے فیصلہ کن اثرات سے بحث کریں گے اور اس سے نکلنے والے نتائج بھی قارئین کے سامنے رکھیں گے۔ان شاء اللہ۔

لیکن اس دن کی عظمتوں کے باوجود میں یہ بات کہوں گا کہ اس دن کے معرکے کی حقیقی قدر و قیمت اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک ہم اسے تحریک جہاد اسلامی کی کڑیوں میں سے ایک کڑی تسلیم نہ کریں اور جب تک ہم لوگوں کو اس جہاد کے اسباب' محرکات اور مقاصد کا ادراک نہ کرلیں اور جب تک ہم اسلام کے نظریہ جہاد کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں کہ اس کے مقاصد کیا ہیں اور یہ نہ سمجھ لیں کہ اسلامی نظام حیات اور دین اسلام کے تقاضے کیا ہیں؟

اسلام کا نظریہ جہاد

امام ابن قیم جوزی نے 'اپنی مشہور کتاب' زاد المعاد میں 'حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجاہدانہ زندگی کے بارے میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔ "بعثت سے لے کر وفات تک کفار اور منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل" اس عنوان کے تحت وہ رقم طراز ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کی طرف یہ وحی نازل کی کہ "آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیں' یوں ہوا آپ کی نبوت کا آغاز' اس وقت جو حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ اپنے دل میں پڑھیں۔ ابھی آپ کو تبلیغ کا حکم نہ ملا تھا' کچھ عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی یَاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی اقراء سے آپ کو نبوت ملی اور یاایہا المدثر سے آپ کو منصب رسالت عطا ہوا اور حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں' رشتہ داروں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو انجام بد سے ڈرایا۔ قوم کے بعد مکہ مکرمہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے قبائل کو تبلیغ کی۔ اس کے بعد یہ پیغام پوری عرب دنیا تک عام کر دیا گیا اور بالآخر اس دعوت کو بین الاقوامی دعوت بنا دیا گیا۔

دعوت اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کئی سال تک صرف وعظ اور تبلیغ کرتے رہے اور طاقت کا استعمال نہ کیا' بلکہ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صبر اور درگزر سے کام لیں اور لعنت کا جواب پتھر سے نہ دیں۔ ایک عرصہ بعد آپ کو ہجرت کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی دشمنوں سے لڑنے کی بھی اجازت دی گئی تاہم یہ اجازت اس حد تک تھی کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو لڑنے کے لئے میدان میں اتر آئیں اور دوسروں سے نہ لڑا جائے۔ سب سے آخر میں یہ حکم دیا گیا کہ کفار اور مشرکین سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہو جاتا۔ (لِيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰه) جس وقت آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا اس وقت حضور اور کفار کے درمیان تعلقات کی صرف تین شکلیں تھیں' اہل صلح' اہل حرب اور اہل ذمہ' اہل صلح یعنی جن کے ساتھ امن کے معاہدات ہوئے تھے' ان کے بارے میں حکم ہوا کہ عہد کو آخر تک نبھایا جائے 'لیکن صرف اس صورت میں کہ جانب مخالف اپنے معاہدے کا پابند ہو اور اگر وہ عہد شکنی اور غداری کریں تو آپ بھی معاہدہ ان کے منہ پر دے ماریں' البتہ ایسے لوگوں کے ساتھ عملاً جنگ اس وقت تک نہ چھیڑی جائے جب تک انہیں باقاعدہ اطلاع نہ دی جائے کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ جب سورۂ براءت نازل ہوئی تو ان تمام اقسام کے احکام علیحدہ علیحدہ بیان ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے 'نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے اس وقت تک لڑیں کہ یا وہ جزیہ قبول کریں اور یا اسلام میں داخل ہو جائیں اور مشرکین اور منافقین سے بھی جہاد کا حکم دیا گیا۔ نیز منافقین سے مزید سختی برتنے کا حکم دیا گیا۔ کفار کے ساتھ آپ کا جہاد مسلح جنگ کی شکل میں تھا اور منافقین کے ساتھ زبان اور دلیل سے۔

سورہ براءۃ میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ کفار کے ساتھ کئے ہوئے تمام معاہدات کو ختم کر دیا جائے اور علی الاعلان ان سے براءت کا اظہار کر دیا جائے۔ اس اعلان کے بعد اہل عہد کی تین اقسام قرار پائیں' وہ جن کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور اپنے عہد پر قائم نہیں رہے تھے' ان لوگوں کے ساتھ حضور نے جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ عہد تھا اور وہ اسے نبھاتے بھی رہے۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے اسے مقررہ مدت تک برقرار رکھا جائے اور شرائط کی پابندی کی جائے۔ تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی کہ جن کے

ساتھ اگر چہ معاہدہ تو نہ تھا لیکن یہ لوگ آپ کے خلاف کسی جنگ میں بھی شریک نہ ہوئے تھے یا ان کے ساتھ تعین مدت کے بغیر معاہدہ طے پا گیا تھا' ایسے لوگوں کے بارے میں حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس کے بعد کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا۔ یا مسلمان ہو جاؤ ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

چنانچہ انہی ہدایات کے مطابق آپ نے عہد شکنوں کے ساتھ جنگ کی' اور جن کے ساتھ کوئی عہد نہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی اور راست باز معاہدین کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اور ایسے تمام لوگ معاہدہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اہل ایمان اور مسلمانوں کا جزو بن گئے اور اہل ذمہ پر جزیہ عائد ہوا۔

جیسا کہ کہا گیا سورۂ برات کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کے تعلقات تین قسم کے رہ گئے تھے یعنی محارب' اہل ذمہ اور اہل عہد اور چونکہ اہل عہد سب کے سب اسلام میں داخل ہو گئے تھے' اس طرح صرف اہل ذمہ اور اہل حرب ہی باقی رہ گئے۔ اہل حرب کی حالت یہ رہتی تھی کہ آپ کے دور میں وہ ہمیشہ آپ سے خائف رہتے تھے۔ (۱)

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں حضورؐ اور تمام انسانوں کے تعلقات کی نوعیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ ان میں سے بعض مسلم اور مومن تھے' بعض آمن اور مسالم تھے اور بعض آپؐ سے خائف اور محارب تھے۔

منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ ان کے اعلان اسلام کو قبول فرمائیں اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیں اور ان کے مقابلے میں علم و استدلال کے ہتھیار ہی استعمال کریں اور ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اختیار کریں اور ان سے سختی برتیں اور ان کی نفسی کیفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ارشادات عالیہ سے ان کی اصلاح کی سعی کریں' ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں اور نہ حضورؐ ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کریں اور یہ کہ اگر آپ ان کے لئے دعائے مغفرت مانگ بھی لیں تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ تھا مختصر بیان حضورؐ کے طرز عمل کا اپنے کفار اور منافق دشمنوں کے ساتھ۔"

اقامت دین کی جدوجہد اور اس کی خصوصیات

علامہ ابن قیم نے اسلامی جہاد کے مختلف مراحل کی یہ بہترین تلخیص پیش کی ہے اور اس سے دین حق کے تحریکی پہلو کی مستقل اور گہری بنیادیں واضح ہو جاتی ہیں جو اس لائق ہیں کہ خاصی دیر ٹھہر کر ان پر اچھی طرح غور کر لیا جائے۔ اس مختصر سی بحث میں ہم صرف چند اشارات پر ہی اکتفاء کریں گے۔

---

(۱) یہ حکم صرف مشرکین عرب کے لئے ہے انہیں جزیہ دے کر اسلامی ریاست کے زیر سایہ ذمی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ اس لئے کہ حق کے پورے انکشاف کے بعد ان کے انحراف کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ نبی ہیں اور قرآن ان کی اپنی زبان میں نازل ہونے کی وجہ سے انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ محض ہٹ دھرمی کی بناء پر یہ انکار کئے جا رہے تھے اس لئے یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ عرب اہل کتاب اور غیر عرب مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ یہ رعایت رکھی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو حفاظت جان و مال کا معاوضہ یا جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے زیر سایہ باعزت شہری کے طور پر رہیں۔

۱۔ ابن قیم کے اس "سیرت پارہ" سے "اسلامی جہاد کی جو پہلی بنیاد سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دین حق اپنے طریق کار میں بھرپور واقعیت پسند ہے' یہ طریق کار دراصل اس حرکت کا نام ہے' جو زمین پر موجود کسی انسانی سوسائٹی کا سامنا کرتی ہے اور ایسے سب ذرائع سے اس کا سامنا کرتی ہے' جو سوسائٹی کے واقعی وجود کے مقابلہ میں کام آسکیں۔

وہ جاہلیت کے اس فکری دائرہ پر یلغار کرتی ہے جس پر عملاً زندگی کا چلتا پھرتا ایک نظام قائم ہے جسے وقت کا اقتدار مادی قوت کے ذریعہ سہارا دیئے چلا جاتا ہے۔

اسلامی تحریک عالم واقع میں اس واقعی صورت حال کا مقابلہ کرتی ہے۔ان تمام ذرائع و وسائل کو کام لاکر جن سے کہ یہ جاہلیت کام لیتی ہے۔وہ اس جاہلیت کا سامنا بیان و تقریر سے بھی کرتی ہے' تاکہ سوسائٹی کے افکار و عقائد کی اصلاح ہوسکے اور وہ غایت درجہ سعی کے ساتھ طاقت بھی استعمال کرتی ہے' تاکہ جاہلیت کے نظام و اقتدار کو ملیامیٹ کیا جاسکے۔

وہی اقتدار جو عوام اور تعمیر افکار کی اصلاح کے کام میں روگ بن کر کھڑا ہے اور جو جبراً ان پر مسلط ہے اور انہیں اندھیرے میں رکھے ہوئے ہے اور جو انہیں رب اکبر کے مقابلہ میں دوسروں کا بندہ بنائے ہوئے ہے۔یہ ایک ایسی تحریک ہے جو صرف بیان و اظہار پر اکتفاء کر کے ختم نہیں ہو جاتی جس طرح کہ اس تحریک میں یہ بھی نہیں ہے کہ مادی غلبہ حاصل کر کے لوگوں سے جبراً اپنی بات منوالے --- یہ رد و قبول میں جبر کی قائل ہی نہیں لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین حق کے طریق کار میں یہ دونوں ہی باتیں نہیں ہیں وہ تو ایک تحریک ہے۔اس لئے برپا کی گئی ہے کہ لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی میں داخل کر دے۔تفصیل آگے آتی ہے۔

۲۔ اس دین کی دوسری خصوصیت (علامہ ابن قیم کے سیرت پارہ کی روشنی میں) یہ ہے کہ اس کے اصلاحی طریق کار میں واقعیت پسندانہ تحریکیت پائی جاتی ہے۔وہ ایک ایسی تگ و دو سے عبارت ہے جس کے کئی مراحل ہیں' ہر مرحلے میں اس کے مناسب ذرائع اور وسائل کو کام میں لایا جاتا ہے' جو اس مرحلے کے واقعی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور اس مرحلے سے یہ تحریک بتدریج آگے بڑھتی ہے۔اس تحریک کا طریق کار یہ ہے کہ یہ واقعی حالات کا مقابلہ مجرد نظریات سے نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے وسائل و ذرائع جمود کا شکار ہیں۔ ہمارے دور میں جو لوگ اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں لکھنے بیٹھتے ہیں اور قرآن کی آیات پر بحث کرتے ہیں' ان کے پیش نظر پہلی تحریک اسلامی کے مختلف مراحل نہیں ہوتے' نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان مراحل میں سے کس مرحلے سے متعلق آیات کا شان نزول پس منظر) کیا تھا' یہ لوگ' خلط مبحث کرتے ہیں اور دین کے نظریہ جہاد کے بارے میں گمراہ کن التباس و اشتباہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور قرآنی آیات کو ایسے معنی پہناتے ہیں جن کی وہ متحمل نہیں ہوتیں' بعض آیات کا تعلق تحریک کے ابتدائی مراحل سے ہے' یہ لوگ انہیں آخری مراحل کے لئے اصول قرار دیتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بے شمار غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے اور ابتدائی ہدایات کو آخری فیصلے سمجھ بیٹھے۔حد یہ ہے کہ یہ اس بات کے قائل ہو گئے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ کا جواز ہے' دراصل یہ لوگ فکری و ذہنی طور پر شکست خوردہ ہو گئے اور یہ رائے انہوں نے اس لئے قائم کی کہ اس مادی دور کے حالات کی سنگینی سے "فرزندان اسلام" عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔جن کے ہاں اسلام کا صرف نام ہی رہ گیا ہے اس پر مستزاد یہ کہ دین حق پر ڈھائے ہوئے اپنے ظلم کو اسلام کی خدمت قرار دیتے ہیں' اسلام کا اصل موقف تو یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر سے طاغوت کا اقتدار ختم کر دیا جائے اور تمام لوگوں کو غیراللہ کی غلامی سے نجات دی جائے۔

اس معاملہ میں اسلام کا اصل رول یہ ہے کہ جاہلیت نے دنیا میں دین حق کے پھیلنے کی راہ میں جو جو رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں انہیں ہٹا دیا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حق کے مقابلہ میں باطل سرنگوں ہو جائے یا مٹ جائے اور یا اتنا مغلوب ہو جائے کہ اسلام کی بالادستی کو تسلیم کر کے اس کے سایہ عاطفت میں تحفظ جان و مال کا معاوضہ (جزیہ) ادا کر کے پرامن شہری کی حیثیت سے رہائش پذیر ہو اور اسلام اور عوام الناس کے درمیان حائل نہ ہو تاکہ لوگ اس بارے میں بالکل آزاد ہوں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

۳۔ ابن قیم کے "سیرت پارہ" کی روشنی میں) اس دین کی تیسری خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وسعت پذیر تحریکیت اور نئے نئے وسائل 'ات اپنے بنیادی اصولوں سے منحرف نہیں کر سکتے اور نہ اس نصب العین ہی میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے جو شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ یہ دین ہمیشہ اپنے اصولوں پر سختی سے جما رہا ہے۔ دعوت رشتہ داروں کو دی جا رہی ہو' قریش کو دی جا رہی ہو' تمام عرب کو بلایا جا رہا ہو' یا تمام کرۂ ارض کو خطاب کیا جا رہا ہو' اس کی دعوت ہر وقت یہی رہی ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی اختیار کرو اور اللہ کے سوا تمام غلامیوں کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکو' مصلحت کی خاطر اصول کو چھوڑا جا سکتا ہے' نہ نرمی برتی جا سکتی ہے اور نصب العین کے حصول کے لئے متعین طریق کار ہے' جس کی حدود متعین ہیں۔ پھر اس کے لئے جدوجہد کے مراحل بھی متعین ہیں اور ہر مرحلہ کے لئے وسائل و ذرائع میں سے نوبہ نو ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں (یہاں بھی حدود اللہ کا لحاظ رکھنا لازم ہے) اس سلسلہ میں اوپر بھی "اشارہ" گزر راہے۔

۴۔ (ابن قیم کے مطابق) دین حق کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بین الاقوامی علائق کے لئے اس کا اپنا ایک ضابطہ ہے اور اس ضابطہ و قانون کی اساس و بنیاد اس امر پر ہے کہ اسلام کا اپنا ایک موقف (Stand) ہے اور وہ یہ ہے کہ :-

"تمام بنی آدم اللہ وحدہ' لا شریک کی اطاعت کریں یہ ان پر فرض ہے اور انہیں زندگی میں اللہ کی اطاعت ہی کی روش اختیار کرنی چاہئے۔ یہ نہیں تو کم از کم تمام بنی آدم کو "الٰہی طاعت" کے اس نظام (اسلام) کو برداشت کرنا چاہئے اور مصالحانہ روش اختیار کرنا چاہئے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ بنی آدم میں سے کوئی بھی اس کی دعوت کی راہ میں حائل ہو--- کوئی سیاسی نظام ہو یا مادی قوت --- وہ تمام بنی آدم کے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ دنیا کے عوام اور اس کے درمیان آڑے نہ آئیں تاکہ لوگ اپنے آزاد ارادے کے ساتھ اسلام کو اختیار کریں یا اسے رد کر دیں۔ اسلام بطور خود بھی رد و قبول میں جبر و طاقت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی شخص' کوئی گروہ (خواہ وہ کوئی بھی ہو' کہیں بھی ہو' کیسا ہی ہو---) اسلام اور عوام کے درمیان حائل ہوتا ہے' تو اسلام اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ تا اینکہ اسے ملیامیٹ کر دیا جائے یا وہ اسلام کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔"

کیا جہاد دفاعی جنگ کا نام ہے ؟

ذہنی اور فکری شکست خوردگی میں مبتلا حضرات جب اسلامی جہاد پر قلم اٹھاتے ہیں--- اور ان کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ "جہاد" کے نام سے اسلام پر لگائی گئی "تہمت" کے سلسلہ میں اپنی صفائی پیش کریں تو انہیں بظاہر دین حق کی اشاعت اور قیام کے سلسلہ میں تضاد نظر آتا ہے ایک طرف ارشاد ہے کہ :

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ "دین میں جبر و اکراہ نہیں ہے۔" اور دوسری طرف اسلام کا نظریہ جہاد یہ ہے کہ ان تمام

سیاسی اور مادی قوتوں کے مقابلہ کے لئے ہر طرح کی سعی و جہد فرض ہے جو اسلام اور دنیا کے عوام کے راستہ میں حائل ہیں اور جو لوگوں کو انہی جیسے دوسرے لوگوں کا بندہ بنائے ہوئے ہیں اور جو انہیں اللہ کی بندگی کے اختیار کرنے سے روکتی ہیں، چنانچہ یہ قلم کار غلط مبحث کا شکار ہو جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ذہنی مرعوبیت میں مبتلا ہیں اور جہاد کو صرف دفاعی جنگ ثابت کرنے کی سعی ناتمام کرتے ہیں حالانکہ اسلام کے ان دونوں احکام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا الگ موضوع ہے اور جہاد فی سبیل اللہ ایک دوسرا عنوان ہے۔

اسلامی جہاد کا کوئی تعلق ان جنگوں سے سرے سے ہے ہی نہیں جو اس دور میں لڑی جاتی ہیں۔ آج کل کی یہ لڑائیاں اور اسلامی جہاد ایک دوسرے سے اغراض و مقاصد میں مختلف ہیں۔کیفیت اور نوعیت میں مختلف ہیں، جن اغراض و مقاصد کے تحت اسلام جہاد کو فرض قرار دیتا ہے، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے مزاج، طبیعت اور زمین پر اس کی حکمرانی کی روشنی میں انہیں تلاش کریں۔ یہ وہی مقاصد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرمائے ہیں اور اسی نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور آپ کی ذات پر نبوت ختم فرما دی ہے اور آپ کی رسالت کو اپنا آخری پیغام قرار دیا ہے۔

دین حق دراصل انسانی آزادی اور حریت کے لئے ایک عمومی چارٹر اور منشور ہے، یہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرانے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ اسے اپنے نفس کی بندگی سے بھی آزاد کراتا ہے، یہ بھی بندوں کی غلامی کی ایک صورت ہے۔

دین حق کا یہ اعلان دراصل اللہ وحدہ لاشریک کی الوہیت کا اعلان ہے اور اس امر کا اعلان ہے کہ وہ تمام جہانوں کا رب ہے، آپ جانتے ہیں کہ تمام جہانوں کے رب ہونے کے معنے کیا ہیں؟

یہ انسانی حاکمیت کے خلاف ایک انقلابی نعرہ ہے۔ اس انسانی حاکمیت کی کوئی صورت ہو، کوئی سی ہیئت ہو اس کا جو بھی نظام ہو اور جو بھی طریقہ ہو، اللہ کی ربوبیت کے یہ معنے ہیں زمین کے ہر ایک گوشہ میں انسانی حاکمیت کو چیلنج کر دینے کے جس صورت میں کہ یہ موجود ہو۔ یا یوں کہئے کہ اللہ کی ربوبیت کے معنے ہیں کہ انسان کی خدائی کو چیلنج کیا جائے جس صورت میں کہ یہ موجود ہو، اور اس کا سبب یہ ہے کہ جس حکم کا سرچشمہ انسان کی اپنی رضا ہو اور جس حکم میں اقتدار اعلیٰ انسان ہی کو تسلیم کیا گیا ہو، اس کے معنے یہ ہیں کہ اس حکم میں انسان کو الہ بنا لیا گیا ہے، بعض نے بعض کو اللہ کے مقابلہ میں رب ٹھہرا لیا۔

تو اس صورت میں اللہ کی ربوبیت کے اعلان کے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے غصب کردہ اقتدار اعلیٰ کو ان کے ہاتھوں سے چھین کر اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دینا اور ان غاصبوں کو اقتدار اعلیٰ کے اس منصب سے اتار دینا، یہ غاصب جو لوگوں کو اپنے بنائے ہوئے قانون کا پابند بناتے ہیں خود ان کے سامنے رب بن کر بیٹھتے ہیں اور انہیں غلاموں کا درجہ دیتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے :۔ ”بشری حاکمیت کے مقابلہ میں حکومت الٰہیہ کا قیام“ قرآن مجید کے اپنے الفاظ میں اس کی تعبیر یہ ہے : هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ ”اللہ کی حاکمیت جس طرح آسمانوں پر ہے اسی طرح زمین پر بھی ہے۔

اَنْ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ - اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ..... ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف ۔ ۴) ”خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔ اس نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی غلامی نہ کرو..... یہی ہے دین مستقیم۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ - فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۳ : ۶۴) ”کہہ دو اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔“

زمین پر حکومت الہیہ کے قیام کی یہ صورت نہیں ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے اونچے مقام پر کسی مذہبی طبقہ کو فائز کر دیا جائے۔ جس طرح کلیسا کے اقتدار کے دور میں ہوا۔ اسی طرح حکومت الہیہ کے قیام کی یہ شکل بھی نہیں ہے کہ تھیاکریسی کے نام سے مذہبی طبقہ کو اللہ بنا لیا جائے۔ اس کی تو ایک ہی صورت ہے کہ اللہ کی شریعت کا نفاذ عمل میں لایا جائے اور حاکمیت کے معاملہ کو اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور اسی کے حکم کے مطابق فیصلے کئے جائیں جس طرح کہ اس نے اپنی نازل کردہ شریعت میں بیان فرما دیا ہے۔

اسلامی نظام کے قیام کا صحیح طریق کار

اسلامی نظام حکومت کا قیام اور انسانی نظام مملکت کا خاتمہ، انسانی ہاتھوں سے اقتدار اعلیٰ (Soverignity) کا لینا اور اسے دوبارہ اللہ کی ذات کے لئے مخصوص کر دینا، انسانی قوانین کی تنسیخ اور شریعت اسلامی کا قیام اور اس قسم کے تمام دوسرے انقلابی کام، محض وعظ و تقریر اور تبلیغ و بیان سے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو لوگ عوام الناس کی گردنوں پر سوار ہیں اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے، وہ اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتے کہ محض وعظ اور نصیحت سے، اپنی اس برتری سے دست بردار ہو جائیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو انبیاء علیہم السلام بسہولت لوگوں سے ایک خدا کی الوہیت کا اقرار کرا لیتے۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ کام کس قدر کٹھن تھا، نیز اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت بھی اس پر گواہ ہے کہ یہ کام کس قدر کٹھن تھا، نیز اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت بھی اس پر گواہ ہے کہ اسلامی نظام حیات کے قیام کا کام محض وعظ اور تبلیغ سے ممکن نہیں رہا ہے۔

زمین پر انسان کی آزادی کا یہ اعلان عام --- (دین حق) --- کہ کوئی انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کا بندہ نہیں، اللہ وحدہ لاشریک ہی سب کا الہ اور معبود ہے۔ وہی تمام جہانوں کا رب ہے، نہ یہ فلسفیانہ تخیل تھا اور نہ منفی قسم کے منتشر خیالات تھے بلکہ یہ تحریک کی شکل میں ایک ایجابی نظریہ تھا۔ یہ ایک ایسا اعلان تھا جس کے لئے چاہا گیا تھا کہ اس کی پشت پر ایک نظم حکومت ہونا چاہئے جو لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی شریعت کی تعمیل کرائے اور انہیں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کر دے۔ چنانچہ یہ ضروری تھا کہ بیان اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ تحریک

کی شکل بھی اختیار کر لی جائے تاکہ انسانی سوسائٹی میں ہر جہتی تبدیلی کے لئے تمام ممکنہ وسائل سے کام لینے میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔

دعوت اسلامی کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ آج اور کل انسانی سوسائٹی کی واقعی حالت دین حق کے خلاف رہی ہے اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ جاہلی سوسائٹی نے اپنے پورے وسائل سے کام لے کر بے پناہ رکاوٹیں اسلامی نظام حیات کے قیام کی کوششوں کی راہ میں لاکر کھڑی کر دی ہیں 'کیونکہ اسلام انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دینے کا اعلان عام کرتا ہے۔ اس طرح جن جاہلی معاشروں کے مفاد پر زد پڑتی ہے وہ اپنے تمام اعتقادی 'تصوراتی' مادی 'سیاسی' معاشرتی' معاشی' قومی اور طبقاتی وسائل کو لے کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ یہ تمام وسائل جب مجتمع ہو جاتے ہیں تو دین حق کے مقابلہ میں ان کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس طرح دین حق کو ان شدید رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس سورت کے پیش نظر ایک طرف تو تحریک اسلامی کو غلط تصورات اور باطل عقائد کو ختم کرنے کے لئے وعظ و تبلیغ سے کام لینا پڑتا ہے اور دوسری طرف ان تمام مادی رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تنظیم اور جتھہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مادی رکاوٹوں میں سرفہرست جاہلی نظام زندگی اور اس میں قائم شدہ جاہلی سیاسی نظام ہوتا ہے اور یہ نظام اس دور کی موجودہ اعتقادی 'فکری' قومی' اقتصادی اور اجتماعی حالت پر نہایت پیچیدگی اور باہمی گہرے ربط سے قائم ہوتا ہے۔ اس طرح وعظ و تلقین کی تحریک اور اجتماعی تنظیم دونوں مل کر اس موجود اجتماعی نظام کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں اور اپنے پورے وسائل کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ لہٰذا انسانی آزادی اور پورے کرۂ ارض پر تمام انسانوں کی آزادی کے لئے تبلیغ و بیان اور تنظیم و تحریک دونوں کی اشد ضرورت ہے۔ یہ نکتہ اس قدر اہم ہے کہ اسے بار بار واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

---()()()---

ایک عالمی نظام حیات (۱)

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اسلامی نظام حیات صرف اس لئے نہیں آیا تھا کہ وہ صرف اہل عرب کو آزادی کی نعمت سے نوازے بلکہ یہ نظام حیات پوری انسانیت کے لئے ہے' اس کا میدان کار پورا کرۂ ارض ہے' پورے کا

(۱) سید قطب شہید نے اپنے مدعا کی وضاحت بڑے بسط سے کر دی ہے' دراصل عرب ممالک کی نسبت ہند و پاک میں اسے سمجھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہاں ایک عظیم تحریک کی تمام طاقتیں محض اس مفروضے پر ضائع ہو رہی ہیں کہ ایک ایک شخص کو تبلیغ و بیان کے زور سے درست کر دو' تمام جہان درست ہو جائے گا' اور انقلاب خود بخود آجائے گا۔ یہ ایک ایسا مفروضہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے بعد آج تک' تحریک اسلامی کی اس طویل تاریخ میں' عملاً ایسا نہیں ہوا' بلکہ وہی کچھ ہوتا رہا ہے جس کی وضاحت سید قطب صاحب کر رہے ہیں۔ (مترجم)

پورا۔ اس نظام زندگی کی رو سے اللہ تعالیٰ صرف عربوں کا اللہ ہی نہیں ہے' کہ وہی اسلامی نظام زندگی قبول کریں بلکہ وہ رب العالمین ہے اور اسلامی نظام زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ عالمین کو ان کے رب اور خالق تک پہنچائے اور انہیں غیراللہ کی بندگی سے چھڑا کر صرف ایک خدا کی بندگی میں داخل کر دے۔ اسلامی نظریہ حیات کی رو سے بندگی اور اطاعت کا اعلیٰ مقام قوانین اسلام اور شریعت کی اطاعت میں ہے اور یہی وہ اطاعت ہے جسے اللہ جل شانہ صرف اپنی ذات کے لئے خاص کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کی شریعت اور قانون کے سوا' کوئی اگر کسی اور کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اللہ کی غلامی سے خارج ہو جاتا ہے۔

زبانی طور پر خواہ وہ کچھ بھی دعویٰ کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصریح فرما دی ہے کہ شریعت اور قانون کی اطاعت ہی دراصل بندگی ہے۔ غیر اسلامی قانون کی اطاعت ہی کی وجہ سے یہود و نصاریٰ مشرک قرار پائے تھے' اسی وجہ سے قرآن کریم نے انہیں دعوت دی کہ وہ اللہ کے سوا تمام دوسرے ارباب کی غلامی ترک کر دیں۔

امام ترمذی نے اپنی سند سے حضرت عدی بن حاتم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آپ کو دعوت اسلامی کے آغاز کا علم ہوا تو وہ شام کی طرف نکل کھڑے ہوئے' یہ جاہلیت کے زمانہ میں عیسائی ہو گئے تھے' ایک غزوہ میں آپ کی بہن اور قبیلے کے دوسرے لوگ گرفتار ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ نہایت ہی اچھا سلوک کیا اور ان کی بہن کو گراں قدر عطیہ بھی دیا۔ بہن رہا ہو کر عدی سے ملی اور انہیں ترغیب دی کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ عدی' حضور ؐ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں' جب یہ مدینہ پہنچے تو ان کی گردن میں چاندی کی صلیب لٹک رہی تھی اور حضور ؐ اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے اتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ "ان لوگوں نے اپنے اللہ کو چھوڑ کر عالموں اور درویشوں کو رب بنا رکھا ہے۔"

حضرت عدی نے یہ عرض کی کہ یہود و نصاریٰ تو احبار و رھبان کی عبادت نہیں کرتے' آپ نے فرمایا کہ احبار و رھبان ان کے لئے حرام کو حلال ٹھہراتے رہے اور حلال کو حرام کرتے رہے اور وہ ان کی پیروی کرتے رہے۔ یہی تو دراصل احبار اور رھبان کی "عبادت" کرنا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی یہ جو تفسیر بیان فرمائی ہے' یہ اس امر میں نص قطعی ہے کہ آئین و قانون میں ماسوی اللہ کی اطاعت وہ عبادت ہے جس کے ارتکاب کے بعد آدمی کا مقام دین کے اندر نہیں رہتا اور یہ اطاعت اور یہ عبادت ایک اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا رب بنانا ہے' ماسوی اللہ کی یہی بندگی ہی تو ہے جس کے بندھنوں سے انسان کو آزاد کرانے کے لئے یہ دین آیا ہے تاکہ وہ یہ اعلان کر دے کہ پورے کرۂ ارض پر انسان ماسوی اللہ کی بندگی سے آزاد ہے۔

ماسوی اللہ کی بندگی سے آزادی کے اس اعلان کے سلسلہ میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ جاہلیت کے مقابلہ میں ایک طرف تقریر و تحریر کے ذریعہ دعوت دی جائے اور دوسری طرف عملاً ایک تحریک برپا کی جائے اور ان سیاسی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جو لوگوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اللہ کے قانون کو چھوڑ کر اپنے بنائے ہوئے قانون و دستور کی ان سے پیروی کراتے ہیں۔ لوگوں کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور انہیں آزاد ارادہ سے عقیدہ و مسلک اختیار کرنے نہیں دیتے اور اپنی قوت اقتدار سے ان کی آزادی رائے کے حق کو سلب کئے ہوئے ہیں' اس تحریک کا

برپا رہنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کے نتیجہ میں اسلام کا اجتماعی ' سیاسی اور اقتصادی نظام قائم ہو گا جو باطل کے غیر نمائندہ اقتدار --- یہ محض سیاسی اقتدار ہو یا قومی اقتدار یا ایک ہی قومیت کے دائرے میں طبقاتی اقتدار ہو 'کسی نوعیت کا ہو یہ اقتدار ظلم کے استیصال کے بعد انسانی آزادی کی اس تحریک کو زندہ اور برپا رکھنے کا ضامن ہو گا۔

مذہبی آزادی اور اقتدار اعلیٰ

اس بات میں شک نہیں ہے کہ اسلام کسی ایک فرد کو بھی بہ جبر دائرہ اسلام میں داخل کرنا نہیں چاہتا' لیکن جیسا کہ اس سے قبل ہم لکھ آئے ہیں ' اسلام اس بات کا اعلان عام کرتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر کسی انسان کو دوسرے انسان کی غلامی میں رکھے جانے کی اجازت نہ ہو گی اس لئے دین حق سب سے پہلے ہم سے یہ اقدام کراتا ہے کہ ہم زمین پر سے ان تمام تنظیمات اور حکومتوں کے اقتدار کو ہٹانے کی کوشش کریں جن کی بنیاد انسانی حاکمیت پر ہے اور جن میں ایک انسان اپنے جیسے انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرتا ہے۔اس طرح دراصل اسلام بنی آدم کے لئے آزادی اور حریت کی ایسی فضا قائم کرتا ہے جس میں وہ ہر قسم کی سیاسی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے آزاد ارادہ سے جو چاہیں عقیدہ اختیار کریں۔ اس سلسلے میں ' اسلام صرف یہ کام کرتا ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعہ لوگوں کے سامنے اسلامی نظریہ حیات کی وضاحت کر دیتا ہے (اور وہ جبراً لوگوں پر اپنا نظریہ نہیں ٹھونستا)' لیکن آزادی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ لوگ اپنی خواہشات ہی کو اپنا الٰہ بنالیں گے اور اپنے آزاد ارادہ سے یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ اپنے جیسے دوسرے بندوں کے غلام بن کر رہیں گے یا اللہ کو چھوڑ کر ان میں سے بعض کو اپنا رب بنالیں ' اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا' اس کی پالیسی یہ ہے کہ روئے زمین پر اقتدار اعلیٰ بہرحال اللہ کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ (دوسرے الفاظ میں اسلام کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ملکی قانون اور سیاسی نظام بہرحال بندگی رب پر مبنی ہونا چاہئے۔اس کے بعد کوئی شخص ' جو بھی مذہبی عقیدہ رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے۔ اسلام اپنے دائرہ اقتدار میں زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دینے کا قائل نہیں ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ معقول بات ہے اور کوئی بھی نظریاتی ریاست اس کے بغیر دو دن بھی نہیں چل سکتی۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس میں دین مکمل طور پر اللہ کے لئے خالص ہو سکتا ہے یعنی اطاعت ۔ خود سپردگی اور پیروی اور بندگی صرف اللہ کے لئے ہو۔اسلامی نظریہ حیات میں دین کا مفہوم مذہب کے مقابلہ میں وسیع تر ہے۔ درحقیقت وہ طریق زندگی کا نام ہے ' جو پوری زندگی کو بالفعل کنٹرول کرتا ہے۔ اسلام میں دین کی بنیاد عقیدہ ہی پر رکھی گئی ہے تاہم دین عقیدہ کے مقابلہ میں عام اور وسیع تر ہے۔ مثلاً اسلامی نظام حیات کے دائرہ اقتدار میں ایسے لوگ بھی رہ سکتے ہیں جو اسلامی عقائد پر سرے سے ایمان ہی نہ لائے ہوں اور صرف سیاسی لحاظ سے وہ اس کے مطیع ہوں۔ (آخر ذمی ' اسلامی ریاست کے پرامن شہری ہوتے ہیں اور ملکی قانون ان پر ویسا ہی لاگو ہوتا ہے جیسا مسلمانوں پر۔)

جو لوگ اس دین کو اپنے اسی مفہوم کے اعتبار سے اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں ان کے لئے اس بات کا سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ اسلامی نظام حیات کے قیام کے لئے صرف وعظ و ارشاد اور بیان و تبلیغ ہی کافی نہیں ' اس کے لئے عملی جدوجہد اور جہاد بالسیف کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ پھر یہ لوگ بسہولت سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا بھی وہ محدود مفہوم نہیں ہے جو "دفاعی جنگ" کا ہے ' آج کل بعض مسلمان مستشرقین کے پرفریب پروپیگنڈے کے سامنے ہتھیار ڈال کر

ذہنی طور پر شکست کھا چکے ہیں اور اسلامی جہاد کو "دفاعی جنگ" قرار دیتے ہیں' ٹھیک ہے اسے دفاع ہی کے نام سے پکاریں لیکن یہ روئے زمین پر پھیلی ہوئی سسکتی ہوئی انسانیت کا دفاع ہے' اس اعتبار سے یہ انسانی حریت کے لئے ایک اقدامی جدوجہد ہے' تقریر و تحریر کے میدان میں بھی اور سیف و سنان کے ساتھ بھی۔ سوسائٹی کی واقعی صورت حال کو سامنے رکھ کر یہ ایک اقدام ہے' مرحلہ بمرحلہ اور پھر ہر مرحلہ میں تو بہ تو ذرائع اور وسائل کے ساتھ' اس طرح اسلامی جہاد دراصل ایک "اقدامی تحریک" ہے۔

حریت انسانی کا دفاع

اگر یہ ضروری بھی ہو' کہ ہم اسلام کے نظریہ جہاد کی تعبیر دفاعی جنگ سے کریں' تو پھر ہمیں دفاع کا مفہوم ہی بدل دینا ہو گا۔ پھر دفاع کا مفہوم یہ ہو گا کہ اسلام پوری انسانیت کی حریت اور آزادی اور دفاع کے لئے' ان تمام عناصر کے مقابلے میں آتا ہے' جو انسانیت کی آزادی اور حریت فکر پر قدغن لگاتے ہیں۔ یہ عوامل خواہ کسی عقیدے کی شکل میں ہوں' یا کسی سیاسی نظام کی شکل میں ہوں' ان کی بنیاد معاشی امتیاز پر ہو' طبقاتی تقسیم پر ہو یا نسلی امتیاز پر ہو' عوامل کل بھی موجود اور غالب تھے اور آج بھی مختلف شکلوں میں دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں اور ایک غالب نظام کی حیثیت سے موجود ہیں۔

لفظ دفاع کے لئے اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے ہی' ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ کن اسباب کی بناء پر اسلام' اس کرۂ ارض پر جہاد بالسیف کے ذریعہ متحرک رہا اور آگے بڑھتا گیا۔ اس سے ہمیں اسلام کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دراصل اسلام حریت انسانی کا اعلان عام ہے اور اس کا مقصد اول ہی یہ ہے کہ ماسوی اللہ کی غلامی کے تمام آثار کو پورے کرۂ ارض پر سے نیست و نابود کر دیا جائے' اس کی جگہ صرف ایک خدا کی غلامی اور الوہیت قائم کی جائے اور اللہ کی اس زمین پر انسانی خواہشات کے بجائے صرف شریعت الٰہی کی حکمرانی ہو۔

بعض لوگ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کو (آج کے مفہوم میں) دفاعی جنگ تک محدود کر دیں۔ یہ لوگ اسلامی تاریخ اور ذخیرۂ احادیث سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی روایات نکال لاتے ہیں' جن سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کے دور اول میں جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں' وہ اس لئے ہوئیں کہ اسلامی ریاست کو ہمسایہ ممالک سے خطرہ لاحق تھا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ بعض کے نزدیک اسلامی ریاست صرف عرب تک محدود ہے۔ دراصل یہ لوگ اس دین کے مزاج اور طبیعت ہی سے بے خبر ہیں نہ ہی یہ اس دور سے کوئی واقفیت رکھتے ہیں جس میں کہ اسلام اس لئے آیا ہے کہ وہ روئے زمین کا نظام بن کر رہے گا جس طرح کہ ان کی اس سعی نامشکور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آج کی جاہلی سوسائٹی کی گرفت اور مستشرقین کے پروپیگنڈے کی وجہ سے شکست خوردگی میں مبتلا ہو گئے ہیں

دفاعی جنگ' تبلیغی انقلاب اور تاریخی حقائق

تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو روم اور فارس سے خطرہ درپیش نہ ہوتا تو کیا وہ زمین کی

آخری حدوں تک اسلام کے پہنچانے اور پھیلانے سے رک جاتے - ان کے لئے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کہ وہ اس دعوت کو پھیلا سکتے کیونکہ دعوت حق کے راستہ میں ہر طرح کی مادی رکاوٹیں کھڑی تھیں 'منظم حکومتیں اور سوسائٹی کی نسلی ' طبقاتی اور معاشی تنظیمات سدراہ تھیں اور انہیں مادی تفوق حاصل تھا اور حکومت ان کی پشت پناہی کرتی تھی - ان حالات میں یہ ممکن نہ تھا کہ یہ حضرات طاقت استعمال کئے بغیر دعوت اسلامی کو دوسروں تک پہنچا سکتے اور دین حق بغیر کسی روک ٹوک کے پھیلتا چلا جاتا ہے -(۱)

یہ خیال محض بچگانہ خام خیالی ہے کہ کوئی تحریک یہ نصب العین لے کر اٹھے کہ وہ پورے کرۂ ارض پر تمام انسانوں کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر رہے گی اور پھر اس کے سامنے بڑے بڑے نظاموں اور حکومتوں کی صورت میں رکاوٹیں بھی موجود ہیں اور ان باطل قوتوں سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو اور یہ کام وہ محض وعظ و ارشاد ہی سے کرتی چلی جائے - یہ کام اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ تحریک اسلامی اور لوگوں تک اسلامی نظریہ حیات پہنچانے کے راستے میں کوئی مادی یا سیاسی رکاوٹ نہ ہو اور لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ اس دعوت کے رد و قبول میں آزادانہ فیصلہ کر سکتے ہوں - ایسے حالات میں بے شک لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا اصول چلتا ہے 'لیکن اگر مادی 'سیاسی اور معاشی قوتیں سدراہ ہو رہی ہوں تو پہلے طاقت استعمال کر کے ان کو دور کرنا ضروری ہے -

جس تحریک کا بھی یہ مقصد ہو کہ اسے پورے کرۂ ارض پر سے تمام انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا ہے ' اس کے لئے جہاد ضروری ہو جاتا ہے 'کیونکہ ہر معاشرہ میں ہمیشہ ایسی تحریک کو چیلنج کیا جاتا ہے 'بشرطیکہ آزادی انسانیت کی یہ دعوت محض فلسفیانہ وعظ و تبلیغ ہی نہ ہو ' جہاد ہر حال میں ضروری ہے خواہ دارالاسلام کے پڑوسی ملک میں حالات پرامن ہوں یا پرامن نہ ہوں 'کیونکہ اسلام ایسے امن کا قائل نہیں جو صرف دارالاسلام تک محدود ہو 'بلکہ ایسا امن چاہتا ہے جس میں صرف اللہ کا حکم چلتا ہو اور لوگ صرف ایک خدا کی بندگی کر رہے ہوں - ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہو ' جو خود خدا بن گیا ہو - اس معاملے میں ہمارے لئے معیار وہ آخری مرحلہ ہے جس تک اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق تحریک اسلامی پہنچی ہو - اس مرحلہ کی تفصیل امام ابن القیم جوزی کے بیان کے مطابق یہ ہے :-

"سورۂ توبہ کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کا تعلق صرف تین قسم کا رہ گیا تھا - محارب ' اہل عہد اور اہل ذمہ - اس کے بعد اہل عہد اور اہل صلح اسلام میں داخل ہو گئے - لہٰذا اب ان تعلقات کی صرف دو قسمیں رہ گئیں - محارب اور اہل ذمہ - محاربین کی حالت یہ تھی کہ وہ ہر وقت آپ سے ڈرتے رہتے تھے - اس طرح پوری انسانیت کے ساتھ آپ کے تعلقات صرف تین قسم کے رہ گئے - اہل ایمان ' اہل صلح یعنی ذمی اور محارب یعنی بر سر پیکار ڈرنے والے -"

تعلقات کی یہی قسمیں ایسی ہیں جو دین اسلام کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں - رہے وہ لوگ جو زمانہ حاضرہ کے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں اور مستشرقین کے پرفریب پروپیگنڈے کا شکار ہیں اور دوراز کار تاویلات کرتے

---

(۱) اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے دیکھئے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب الجہاد فی الاسلام - سید مودودی نے پہلی مرتبہ اسلام کے نظریہ جہاد کو صحیح اور مثبت انداز میں پیش کیا ہے اور انہوں نے اس انداز کا رد کیا جس کی شکایت سید قطب کر رہے ہیں - (مترجم)

ہیں تو وہ اس دین کے مزاج اور اس کے مقاصد کے خلاف جا رہے ہیں۔

جہاد کے مراحل

اللہ تعالیٰ نے مکہ میں مسلمانوں کو قتال اور مسلح جھڑپوں سے روکا اور مدینہ میں بھی ابتداءً یہی حکم رہا۔ فرمایا گیا۔

كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ "ہاتھ روک لو، نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔"
اس کے بعد مسلمانوں کو قتال اجازت دی گئی :

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ (۳۹) الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ - وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۴۰) اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲ : ۳۹ تا ۴۱) "اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔" "اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جس میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے، اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم سے جو لوگ لڑتے ہیں صرف انہی سے لڑو

وَقَاتِلُوْا الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ "ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں" اور اس کے بعد تمام مشرکین کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً "اور تمام مشرکین سے لڑو جیسا کہ تمام مشرکین تم سے لڑتے ہیں۔" --- چنانچہ اس سلسلے میں اصولی حکم ان الفاظ میں دیا جاتا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (۹ : ۲۹) ”جو لوگ اہل کتاب میں سے خدا پر ایمان نہیں لاتے اور نہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں‘ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔“

لہٰذا ابن قیم رحمہ اللہ کے قول کے مطابق‘ جہاد و قتال کے مراحل یہ تھے۔ ”حرام‘ پھر اجازت‘ پھر ان لوگوں سے لڑنے کا حکم جو لڑنے کا آغاز کریں‘ یا پھر آخری مرحلے میں تمام مشرکین سے قتال کا حکم۔“

تمام قرآنی آیات جو اس بارے میں وارد ہیں اور وہ تمام احادیث نبوی جن میں جہاد کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اور وہ تمام واقعات جہاد جو تاریخ اسلامی کے اس طویل عرصے میں وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ سب کے سب اس بات کے شاہد ہیں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا وہ محدود مفہوم نہیں لیا جا سکتا جو شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والے یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ حضرات مستشرقین کے زہریلے پروپیگنڈے کا شکار ہو چکے ہیں ورنہ کوئی ذی ہوش ایسا نہ ہو گا جو قرآن کریم کی ان آیتوں اور اقوال رسول کے اس ذخیرے کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد اور جہاد اسلامی کی تاریخ کے سامنے رکھتے ہوئے یہ خیال بھی کر سکتا ہو کہ یہ محض ایک عارضی واقعہ تھا‘ جو مخصوص حالات میں پیش آیا اور اب تو صرف دفاعی جنگ ہی لڑی جا سکتی ہے۔

جب پہلے پہل مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی اجازت ملی تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یہ بیان کر دیا کہ اس دنیا کی زندگی کا فطری تقاضا اور تکوینی فلسفہ ہی یہ ہے کہ بعض لوگ بعض دوسروں کے بالمقابل سینہ سپر ہوں اور اس طرح طاقت کا توازن قائم رہ کر دنیا سے فساد ختم ہو چنانچہ آیت اذن قتال کے بعد فرمایا جاتا ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ (۳۹) الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ - وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ---- (۲۲ : ٤٠) ”جن مسلمانوں کے خلاف لڑائی ہوئی ہے ان کو اجازت ہے کہ وہ بھی لڑیں کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے۔ الا یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو صومعے اور گرجے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں خدا کا بہت ذکر کیا جاتا ہے ‘گرائی جا چکی ہوتیں۔

اسلامی نظریہ جہاد اور قتال ایک دائمی حالت ہے‘ محض عارضی حالت نہیں ہے‘ اس لئے اسلامی نظام زندگی اور

باطل نظاموں کے درمیان مصالحت ہرگز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ اس زمین پر باہم مل کر اکٹھے رہ سکتے ہیں - جب بھی اسلام یہ مقصد لے کر اٹھا کہ زمین پر اللہ کی ربوبیت اور خدائی قائم ہو اور انسان کو انسانی غلامی سے چھڑا کر صرف اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کیا جائے ' تو اس پر ان طاقتوں نے فی الفور حملہ کیا ہے ' جنہوں نے خداوند قدوس کے حق خدائی کو غصب کر رکھا ہوتا تھا - ان طاقتوں نے کبھی بھی اسلام کو برداشت نہیں کیا اور اسلام بھی ہمیشہ ان طاقتوں پر حملہ آور ہوتا رہا ہے اور انہیں ختم کر کے ' ان کے از خود قائم کردہ اقتدار کو ختم کر کے ' انسانوں کو اس کی غلامی سے نجات دیتا رہا ہے اور یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک اسلام پورے کرۂ ارض پر غالب اور برتر طاقت نہیں بن گیا اور و يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ کا مقصد پورا نہیں ہو گیا -

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو جہاد و قتال سے روکنا درحقیقت ایک طویل منصوبے کا ایک مختصر مرحلہ تھا ' اسی طرح ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں جہاد سے روکنا بھی ایک خاص مقصد کے لئے تھا ' اور جہاد کا آغاز بھی صرف اس لئے نہ تھا کہ مدینہ طیبہ کو کوئی فوری خطرہ درپیش تھا اور اس کا دفعیہ ضروری تھا ' اگرچہ یہ بھی ابتدائی اور ضروری مقصد تھا لیکن محض مدینہ کا بچاؤ ہی آخری اور بڑا مقصد نہ تھا بلکہ تحریک جہاد کے آغاز کے لئے ایک وسیلہ تھا کیونکہ تحریک کے مرکز کو مامون اور محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے جہاں سے تحریک کا آغاز کئی دوسرے مقامات پر بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی راہ سے تمام رکاوٹیں دور کی جا سکتی ہیں -

نیز مکہ مکرمہ میں جہاد و قتال سے اس لئے بھی روکا گیا تھا کہ وہاں مسلمانوں کو دعوت اسلامی اور تبلیغ و تلقین کی آزادی بہرحال حاصل تھی ' حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم کی قوت کے بل بوتے پر کھلے بندوں اپنی دعوت پیش کرتے تھے ' آپ کی دعوت لوگوں کے کانوں تک بڑی آزادی سے پہنچ رہی تھی اور ان کے دل و دماغ کو متاثر کر رہی تھی - آپ اس معاشرے کے ایک ایک فرد کو دعوت دیتے تھے اور وہاں کوئی ایسی منظم سیاسی قوت موجود نہ تھی جو آپ کو اپنے افکار کی نشر و اشاعت سے روک سکتی ' یا وہ لوگوں کو اس بات سے منع کر سکتی کہ وہ آپ کے ارشادات نہ سنیں - اس لئے ایسے حالات میں قوت کے استعمال کی ضرورت بھی نہ تھی ' نیز مکی دور میں قتال سے روکنے کے کچھ اور اسباب بھی تھے ' جو اس وقت موجود تھے ان کا خلاصہ میں نے ' اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں ' سورۂ نساء کی آیت کف قتال (۴ : ۷۷) کے ضمن میں بیان کیا ہے ' اور ان میں سے بعض اسباب یہ ہیں -

(ا) مکی دور میں قتال پر پابندی اس لئے بھی لگائی گئی کہ یہ دور دراصل ٹریننگ کا دور تھا - مخصوص حالات ' ایک خاص قوم ' ایک منفرد معاشرے کے درمیان یہ حکم دیا گیا ' ایسے معاشرہ میں جو اپنے وقت میں بالفعل قائم تھا ' ایک عرب انسان کو اس بات پر آمادہ کرنا مطلوب تھا کہ وہ ناموافق اور ناپسندیدہ صورت حال دیکھ کر اس پر صبر کرے ' جب کہ عام طور پر صورت حال یہ تھی ' ایسے عربوں کو یا ان کے متعلقین کو ایسے حالات پیش آتے تو وہ صبر نہ کرتے تھے ' یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں کے دل و دماغ سے شخصیت اور انفرادیت کے بت کو نکالا جائے اور ان کی زندگی کا محور اور محرک محض ان کی ذات یا شخصیت نہ ہو ' نیز وہ اپنے اعصاب پر کنٹرول کرنا سیکھیں اور پہلی ناخوشگواری ہی انہیں آپے سے باہر نہ کر دے اور ان کی طبیعت میں اعتدال پیدا ہو جائے - کیونکہ عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ بات بات پر مشتعل ہو جاتے تھے اور اسلام یہ چاہتا تھا کہ ایک مسلم کی ہر حرکت معتدل ہو - اس کی ایسی تربیت ہو جائے کہ

وہ ایک ایسے منظم معاشرے کے تقاضے پورے کرنے کا عادی ہو جائے' جس کی ایک مستقل قیادت ہو۔ زندگی کے تمام امور میں وہی قیادت اس کا مرجع ہو' صرف اسی قیادت کے اوامر کے مطابق وہ عمل پیرا ہو' اور اس کے اندر اطاعت کا جذبہ اس قدر پختہ ہو کہ اگر قیادت کے احکامات اس کی عادات اور طرز زندگی کے خلاف بھی ہوں تو بھی وہ اطاعت کرے۔ یہ وہ مقصد تھا جو ایک عربی شخصیت کی تربیت کے لئے اشد ضروری تھا' جس سے آئندہ جاکر ایک مسلم معاشرہ کی تعمیر مطلوب تھی اور جسے ایک بااختیار قیادت کے زیر نگیں ہونا تھا اور جسے ایک ترقی پذیر' مہذب اور قبائلی طوائف الملوکی سے پاک معاشرہ کی صورت میں منظم ہونا تھا۔

۲۔ نیز مکی زندگی میں جہاد کی عدم مشروعیت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قریش جیسے نخوت پسند اور صاحب مرتبہ خاندان کے اندر پرامن دعوت ہی زیادہ موثر ہو سکتی تھی' اگر ایسے مرحلے میں قریش کے ساتھ جنگ چھیڑ دی جاتی تو تمام کی تمام قوت بے حد' بغض و عناد میں مبتلا ہو جاتی اور اس سے خانہ جنگی کا ایک غیر منقطع سلسلہ شروع ہو جاتا' جو اس سے پہلے جنگ "داحس و غبراء" اور جنگ "بسوس" کی صورت میں کئی سالوں تک ہوتا رہا تھا اور جس کی لپیٹ میں آکر' قبیلوں کے قبیلے فنا ہو گئے تھے۔ اس طرح یہ جدید خون خرابے بھی اس نئی تحریک کے حساب میں جمع ہو جاتے اور تحریک اسلامی ہونے کے بجائے یہ' جنگ و جدال کی ایک تحریک بن کر رہ جاتی اور اس کا مقصد اصلی نظروں ہی سے اوجھل ہو جاتا اور آئندہ بھی اس کا نام نہ لیا جاتا۔

۳۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت یہ مناسب نہ تھا کہ تحریک اسلامی گھر گھر میں اختلافات اور فتنہ و فساد برپا کر دے' کیونکہ مکہ میں معروف معنوں میں کوئی منظم سلطنت موجود نہ تھی' جو مومنین پر سختیاں کر کے انہیں تکالیف پہنچاتی ہو' یہ کام اس وقت ہر خاندان اپنے طور پر کر رہا تھا' جس خاندان کا کوئی فرد مسلمان ہوتا' وہ اسے سزا دیتا اور اگر غلام ہوتا تو اس کا مالک اس کی تعذیب اور تادیب کا بندوبست کرتا' اور اگر ایسے حالات میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی جاتی" تو ہر خاندان میں قتل و غارت اور جنگ و فساد شروع ہو جاتا اور مخالفین اسلام کو یہ موقع ملتا کہ وہ تحریک اسلامی پر یہ الزام لگائیں کہ یہ ہے تمہارا اسلام؟ جب کہ جنگ نہ کرنے اور مصائب و مشکلات پر صبر کرنے کے باوجود مخالفین نے اسلام پر یہ الزام لگایا کہ اس نے گھر گھر میں فساد ڈلوا دیا ہے' قریش حج کے موقع پر تاجروں' حاجیوں اور عام عربوں میں اس مضمون کا زبردست پروپیگنڈا کیا کرتے تھے کہ دیکھ لو' محمد نے باپ بیٹے' فرد اور خاندان اور قوم کے افراد کے درمیان فتنے کے بیج بو دیئے ہیں' ان سے بچنا' لیکن اگر ایسے حالات میں آپ بیٹے کو حکم دیتے کہ وہ اپنے باپ کو قتل کر دے' غلام کو حکم دیتے کہ وہ آقا کو ختم کر دے اور ایک فرد کو قوم و قبیلہ کے خلاف ابھارتے تو ان کے پروپیگنڈا کا کیا عالم ہوتا؟

۴۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو لوگ مکہ میں مسلمانوں کو بے حد و حساب تکالیف پہنچا رہے تھے' ان کی اکثریت بعد میں مسلمان ہو کر اسلام کا سپاہی بننے والی تھی اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم تھا کہ حضرت عمر اور خالد بن ولید جیسے لوگ ان میں موجود ہیں۔

۵۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عربوں کا موروثی غرور اور نخوت انہیں ہمیشہ اس بات پر آمادہ رکھتی تھی کہ وہ مظلوم کی حمایت کریں' بالخصوص ایسا مظلوم جو انتقام نہ لے سکتا ہو اور جب کہ ظلم شرفاء پر ہو رہا ہو۔ تاریخ میں ہمیں کئی ایسے

واقعات ملتے ہیں جو ہماری اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ابن دغنہ نے حضرت ابوبکر ؓ کو ہجرت کرنے سے روکا کیونکہ وہ ایک معزز آدمی تھے۔اس کا خیال تھا کہ ایسے شخص کی ہجرت تمام عربوں کے لئے باعث ننگ ہے۔اس لئے انہوں نے حضرت ابوبکر کو امان دی اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔اسی جذبے کے تحت شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کے محاصرے کی دستاویز کو ختم کر دیا گیا۔کیونکہ بعض لوگوں کو یہ ناگوار ہوا کہ شرفاء بھوک اور مصائب میں مبتلا رہیں۔ عربوں کے برعکس دوسرے معاشروں میں صورت حال یہ رہی ہے کہ ایذارسانی پر خاموش رہنا معاشرہ میں طنز و مزاح اور ذلت و احتقار کا باعث رہا ہے اور ظالم اور موذی کو عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

۶۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی' پورا جزیرہ عرب ابھی دعوت سے روشناس نہ ہوا تھا' کہیں اگر دعوت پہنچی بھی تھی تو منتشر اور غیر مصدقہ اطلاعات کی شکل میں اور دوسری طرف عربوں کی حالت یہ تھی کہ وہ قریش اور اس کے مسلم افراد کی کشمکش میں غیر جانبدار ہو گئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ اس کی کشمکش کا اونٹ کس کروٹ پر بیٹھتا ہے۔اس صورت حال میں اگر جنگ کی اجازت دے دی جاتی تو مسلمان اگر اپنے آپ سے دوگنی تعداد کو بھی قتل کر دیتے پھر بھی وہ شکست کھاتے اور کفر و شرک اپنی جگہ جمے رہتے۔مٹھی بھر جماعت کا ختم کرنا ان کے لئے نہایت ہی آسان کام تھا اور اس طرح کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا اور نہ ہی اس کا کوئی واقعی وجود پایا جاتا' حالانکہ مطلوب یہ تھا کہ اسلام ایک منظم اور عملی شکل میں قائم ہو' تاکہ وہ لوگوں کے لئے ایک نمونہ ہو۔

ایک سوال

اب صرف یہ سوال ہمارے سامنے رہ جاتا ہے کہ مدینہ کے ابتدائی ایام میں جہاد و قتال کا حکم کیوں نہ دیا گیا۔اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ آتے ہی حضور ؐ نے یہود اور حوالی مدینہ کے مشرکین کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا' وہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ اولاً اس لئے کہ اس معاہدے کی رو سے اس پورے علاقے میں مسلمانوں کو تحریک اور تبلیغ کے پورے مواقع حاصل ہو گئے تھے اور وہاں کی کوئی حکومت یا سیاسی طاقت ایسی نہ تھی جو اس کام کے لئے رکاوٹ بن رہی ہو۔اس معاہدے کے تمام شرکاء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں چلنے والی اسلامی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا اور تمام سیاسی امور کے فیصلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آگئے تھے' بیرونی طاقتوں سے 'کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر' کوئی تعلق قائم نہ کر سکتا تھا اور یہ بات مسلم تھی کہ اقتدار اعلیٰ دراصل مسلمانوں کے ہاتھوں میں آچکا ہے۔دعوت کے سامنے میدان کار کھلا تھا اور تمام باشندوں کو یہ آزادی مل گئی تھی کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کر لیں۔ ثانیاً یہ کہ اس مرحلے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم صرف قریش کے مقابلے کے لئے یکسو ہونا چاہتے تھے۔یہ لوگ دراصل تحریک اسلامی اور پورے عالم عرب کے درمیان حائل ہو گئے تھے اور دعوت کے پھیلاؤ کی راہ میں سنگ گراں تھے۔صورت حال یہ تھی کہ عالم عرب کے تمام باشندے قریش اور فرزندان توحید کے درمیان برپا اس طویل کشمکش کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مدینہ آتے ہی حضور ؐ نے حملہ آور دستے بھیجنے شروع کر دیئے اور ہجرت کے صرف سات ماہ بعد ہی پہلا علم حضرت حمزہ بن عبدالمطلب نے بلند کیا۔ اس کے بعد نویں مہینے' پھر تیرہویں مہینے' پھر

سولہویں مہینے اور بالآخر سترہویں مہینے کے بعد حضرت عبداللہ بن جحش کی فوج کشی ہوئی۔ یہ پہلی فوج کشی تھی جس میں کفار کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی اور قتل و مقاتلہ کا آغاز ہوا۔ چونکہ یہ مقابلہ "حرام" مہینوں میں ہوا تھا اور کفار نے اس پر پروپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا اس لئے اس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ------ (۲:

۲۱۷) "اے محمدؐ لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا اور اس کا کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اہل مسجد کو اس میں سے نکال دینا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر مقدور رکھیں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔"

اس کے بعد اسی سال رمضان المبارک میں بدر الکبریٰ کی جنگ ہوئی جس کے بارے میں سورۂ انفال نازل ہوئی۔

میرے اس نقطہ نظر کو اگر واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو محض دفاع اپنے محدود معنوں میں کبھی بھی تحریک اسلامی کا اساسی مقصد قرار نہیں پاسکتا۔ یہ تو ان لوگوں کا معذرت خواہانہ انداز تاویل ہے جو موجودہ حالات کے سامنے سپر ڈال چکے ہیں اور مستشرقین کے مکروہ اور پرفریب پروپیگنڈے سے متاثر ہیں۔

آج کل مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے اقتدار جا چکا ہے' قوت و شوکت سے وہ محروم ہوگئے ہیں اور ان کی اکثریت ایسی ہوگئی ہے کہ جس کے ہاتھ سے رشتہ اسلام تک چھوٹ چکا ہے دوسری طرف سے باطل طاقتوں نے اپنے مکروہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کر رکھا ہے کہ اسلام طاقت کے زور سے پھیلا ہے۔ ایسے حالات میں قدرتی طور پر بعض لوگ اس پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے ہیں اور وہ دور اول میں اسلام کے اس حیرت انگیز پھیلاؤ کے جواز کے لئے دفاعی اسباب و عوامل کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے اخلاقی جواز تلاش کرتے ہیں' حالانکہ اسلام کے انقلابی عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے' ہمیں قرآنی نصوص کے علاوہ کسی اور اخلاقی جواز کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے۔ اس بارے میں صرف ان لوگوں کا موقف جاندار ہے جو یہ کہتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ہم اسلام کے اس اعلان کو پورا کر کے رہیں گے کہ اس پورے کرۂ ارض پر سے تمام انسانوں کو انسانی سلطنتوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ اس بارے میں قرآنی آیات بالکل واضح ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۷۴) وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (۷۵) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا

(۷٦) (٤ : ۷٤ تا ۷٦) ''اور جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ خدا کی راہ میں جنگ کریں اور جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے یا غلبہ پائے ہم عنقریب اس کو بڑا ثواب دیں گے۔ اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔ جو مومن ہیں وہ تو خدا کے لئے لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ بتوں کے لئے لڑتے ہیں سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو کیونکہ شیطان کا داؤ بودا ہوتا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۸) وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۹) وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (٤۰)

(۸ : ۳۸ تا ٤۰) ''کفار سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر پھر وہی کرنے لگیں گے تو اگلے لوگوں سے جو سلوک ہو چکا ہے وہی ان کے حق میں بھی برتا جائے گا۔ ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب خدا ہی کا ہو جائے۔ اور اگر باز آ جائیں تو خدا ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے اور اگر روگردانی کریں تو جان رکھو کہ خدا تمہارا حمایتی ہے اور وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔''

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۹) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ

اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى
يُؤْفَكُوْنَ (۳۰) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ
مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳۱)
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ
الْكٰفِرُوْنَ (۳۲) (۹: ۲۹ تا ۳۲) "جو لوگ اہل کتاب میں سے خدا پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ ہی دین حق کو قبول کرتے ہیں' ان سے جنگ کرو' یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ بھی انہی کی ریس کرتے ہیں۔ خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح بن مریم کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا ہے حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے کا نہیں۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔"

اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے صحیح اخلاقی جواز

حقیقت یہ ہے کہ اس زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنا' لوگوں کی زندگیوں میں اسلامی نظام حیات نافذ کرنا اور طاغوتی طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہی وہ کافی وجوہ جواز ہیں' جو اسلام کے نظریہ جہاد کی صحت پر دلیل ہیں۔ اسلامی نظام زندگی میں جہاد اس لئے شروع ہوا ہے کہ ان لوگوں کے اقتدار کو ختم کیا جائے جنہوں نے اس دنیا میں اللہ کی مخلوق کو غلام بنا رکھا ہے' اسلام کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کرۂ ارض پر اپنی مرضی سے قوانین نافذ کرے۔ اسلام اقتدار اعلیٰ کو ہر حال میں صرف اللہ کے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے سائے میں پھر لوگوں کو آزادی دی جاتی ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں۔ یہی مقصد ہے لا اکراہ فی الدین کا۔ بس صرف یہی ایک وجہ جواز ہی اسلامی نظریہ جہاد کے لئے کافی و شافی ہے اور ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ ہم اس کے علاوہ کوئی اور وجوہ جواز تلاش کریں۔ صحابہ کرام کے دلوں میں یہ بات اس قدر جاگزیں ہو گئی تھی کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا کہ مسلمان جہاد کے لئے کیوں نکلے پڑے۔ انہوں نے کبھی بھی اس نہج پر نہیں سوچا "ہم اپنے ملک کی حفاظت کر رہے ہیں کیونکہ اس کی سلامتی خطرے میں ہے" یا یہ کہ ہم اپنے گھروں سے اس لئے نکلے ہیں کہ ہمیں فارس اور روم سے حملوں کا خطرہ ہے یا ہم اس لئے نکلے ہیں کہ ہم تمام دنیا کے اموال سمیٹ لیں اور اپنے مقبوضات کا دائرہ وسیع کرتے چلے جائیں۔ کسی صحابی نے کبھی ان خطوط پر نہیں سوچا۔

صحابہ کرام کا نقطہ نظر' حضرت ربعی بن عامر' حضرت حذیفہ بن محصن اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کے ایک تاریخی جواب سے خوب واضح ہوتا ہے۔ یہ جواب انہوں نے قادسیہ میں فارسیوں کے کمانڈر انچیف کے سامنے پیش کیا' جنگ شروع ہونے سے قبل مسلسل تین دن وہ ان بزرگوں سے پوچھتا رہا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں اور کیوں نکلے ہیں؟ اور اسے ہر دفعہ یہ جواب ملتا رہا۔ "اللہ نے ہمیں اس لئے برپا کیا ہے کہ اپنے بندوں میں سے جسے وہ انسانوں کی غلامی سے نکالنا چاہے' ہم اسے غلامی سے چھڑا لیں اور صرف ایک اللہ ہی کی غلامی میں داخل کریں' اسے ایک تنگ دنیا سے نکال لیں اور ایک وسیع جہان کی طرف لے آئیں' اور باطل نظامہائے زندگی کے ظلم و ستم سے اسے نجات دلا دیں اور اسلامی نظام زندگی کے عدل و انصاف میں داخل کر دیں' اس غرض کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک رسول کو مبعوث فرمایا' اسے اپنا تجویز کردہ نظام زندگی دیا' ہم اسی نظام کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جو اسے قبول کرتا ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور واپس لوٹ جاتے ہیں اور جو انکار کرتا ہے ہم اس سے لڑتے ہیں یہاں تک کہ یا تو ہم جنت تک رسائی حاصل کرلیں اور یا پھر فتح یاب ہو جائیں۔"

بلکہ میں کہوں گا کہ اسلامی نظام حیات کا مزاج ہی دراصل حقیقی وجہ جواز ہے۔ یہ نظام' مقررہ مراحل کے مطابق' اپنے پورے وسائل لے کر تمام باطل نظاموں کو چیلنج کرتا ہے اور اس کا یہ چیلنج اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ دارالاسلام کو کوئی بیرونی خطرہ لاحق ہو' اسلامی نظام زندگی کا مزاج اس کی واقعیت پسندی اور اس کے مقابلے میں موجود باطل نظاموں کی کھڑی ہوئی رکاوٹوں کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ عملی جہاد شروع کر دے' اس کے نظریہ جہاد کے لئے دماغی اسباب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

بلکہ میں کہوں گا کہ صرف یہ بات کہ ایک مسلم اپنے مال اور اپنی جان کو لے کر اللہ کی راہ میں نکل جاتا ہے' جہاد کرتا' اعلیٰ اقدار کی خاطر لڑتا ہے اور اس کے اس کام سے اس کی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ صرف یہی کافی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسلام کے نظریہ جہاد کے جواز کے لئے صرف یہی عدیم المثال بے لوثی ہی کافی وجہ جواز ہے۔

مسلمان جب کفار کے مقابلے میں کسی معرکے میں اترتا ہے تو وہ اس سے پہلے خود اپنے نفس کے خلاف ایک بہت بڑا معرکہ سر کر چکا ہوتا ہے۔ یہ جہاد اکبر خود نفس شیطان کے خلاف ہوتا ہے' خود اپنی خواہشات اور شہوات کے خلاف ہوتا ہے' اپنی امیدوں اور مزعومات کے خلاف ہوتا ہے' خود اپنی ذات' اپنی قوم اور اپنے خاندان کی مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے' جائز زیب و زینت کے سوا تمام زیبائشوں کے خلاف ہوتا ہے اور جہاد کے محرکات کے سوا تمام محرکات کے خلاف ہوتا ہے۔ غرض اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس زمین پر اللہ کی حکومت قائم کی جائے اور اس کے حقوق سلطنت پر دست درازی کرنے والے تمام طاغوتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

جو لوگ نظریہ جہاد اسلامی کے اخلاقی جواز کے لئے صرف دارالاسلام کی حفاظت کے اسباب و وجوہ تلاش کرتے ہیں' انہوں نے دراصل نظام اسلامی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگایا۔ وہ اس نظام کو ایک وطن سے بھی کم تر درجے کی کوئی چیز سمجھتے ہیں' حالانکہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ خیال درست نہیں ہے۔ یہ بالکل ایک نیا تصور ہے جو اسلامی تصور پر غالب ہو رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام پہلے عقیدے کو اہمیت دیتا ہے' پھر اس نظام کو جو اس عقیدے پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر اس معاشرے کو جس میں وہ نظام قائم ہوتا ہے یہی چیزیں اسلامی تصور حیات میں اہمیت کی حامل

ہیں...... باقی رہی صرف کوئی سرزمین تو بذات خود اسلام میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ۔ کسی اسلامی سرزمین کو اہمیت صرف اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ اس میں اللہ تعالٰی کی حکومت قائم ہوتی ہے اور وہ اسلامی عقیدے کا گہوارا اور اسلامی نظام حیات کے لئے ایک کھیت کی حیثیت اختیار کر کے' دارالاسلام قرار پاتی ہے اور "تحریک آزادی انسان" کے لئے مرکز بن جاتی ہے ۔

دارالاسلام کی حفاظت بھی اس لئے ہوتی ہے کہ اس عقیدے' اس نظام حیات اور اس معاشرے کی حفاظت ہو' جو اس دارالاسلام میں قائم ہوتا ہے ۔ بذات خود دارالاسلام کوئی مستقل بالذات مقصد نہیں اور نہ تحریک جہاد اسلامی کا منتہائے نظر صرف دارالاسلام کی حفاظت ہی ہے ۔ اس کی حفاظت تو محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہاں حکومت الہیہ کا قیام عمل میں لایا جا سکے اور اس کے بعد تمام روئے زمین پر پھیلنے اور تمام نوع انسانی تک دعوت اسلامی کو پہنچانے کے لئے اسے مرکز بنایا جا سکے ۔ اس طرح گویا پوری انسانیت اس دین کا موضوع ہے اور پورا کرۂ ارض اس کا میدان کار ہے ۔

جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ چکے ہیں' جب بھی دین کو پھیلانے کا کام شروع ہو گا اس کے راستے میں اس وقت کی سیاسی طاقت' اس وقت کے موجودہ اجتماعی نظام اور اس وقت کے معاشروں کی عادات و اطوار کی جانب سے مادی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں ۔ پھر اسلام بھی' ان تمام چیزوں کو اپنی قوت کے بل بوتے پر اپنے راستے سے ہٹاتا ہے تاکہ وہ براہ راست لوگوں کو اپیل کر سکے' ان کے ضمیر اور ان کے افکار کو مخاطب کر سکے اور تبلیغ دین اور انسانوں کے درمیان کوئی مادی رکاوٹ نہ رہے ۔ اس کے بعد انہیں اختیار دیا جائے کہ وہ اسلامی عقیدے کو قبول کرتے ہیں یا نہیں ۔

ہمیں اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں کسی سے مرعوب نہ ہونا چاہئے اور نہ مستشرقین کی وسوسہ اندازیوں سے متاثر ہونا چاہئے ۔ موجودہ بین الاقوامی حالات سے دب کر' اسلام کے نظریہ جہاد کی جدید تعبیر کرنا مناسب نہیں ہے ۔ اس سے اس کی روح ختم ہو جائے گی ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حالات اور واقعات جن کا تعلق وقتی دفاع سے تھا' اگر وہ نہ بھی ہوتے تو بھی مسلمان اسی طرح جہاد کرتے جس طرح انہوں نے ان حالات کے ہوتے ہوئے کیا ۔

براہ راست مطالعہ

ہمیں صرف اسلامی نظام حیات کا تاریخی جائزہ لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کن کن امور کو اولیت دیتا ہے ۔ اس کا مزاج کیا ہے' اور وہ کس چیز کا اعلان کرتا ہے ۔ اس کا طریق کار کیا ہے؟ ان تمام امور کے بارے میں کوئی حتمی فیصلے کرتے وقت ہمیں وقتی اور دفاعی اقدامات اور دائمی نصب العین میں فرق کرنا چاہئے ۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست کہ یہ دین حملہ آوروں کا دفاع بھی کرتا ہے کیونکہ جاہلیت کسی حال میں بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی ۔ محض یہ اعلان ہی جاہلیت کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے ۔ اس کے سوا کوئی انسان کسی کا غلام نہیں ۔ خالی خولی اعلان ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک قیادت کے تحت عملی تحریک بھی منظم کرنا اور بالکل ایک نئے اور ممتاز معاشرہ کی بنیاد رکھنا' جو سیاسی لحاظ سے اللہ کے سوا تمام حاکمیتوں کا انکار کرتا ہو' یہ سب چیزیں ہمیشہ جاہلیت کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہیں ۔ غرض اسلامی نظام زندگی کا وجود ہی اپنی اس تاریخی صورت میں' جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیش کیا تھا' اس بات کے لئے کافی تھا کہ اس وقت کے تمام جاہلی

معاشرے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں' جن کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ انسان انسان کی غلامی کرے اور کوشش کر کے اس دین کو ختم کریں اور اپنے وجود کا دفاع کریں۔ ان حالات میں اسلامی نظام زندگی کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ وہ اپنا دفاع کرے اور پر خطر حالات میں بچاؤ کی تدابیر اختیار کرے۔ یہ ایک ناگزیر ضرورت تھی' اسلام کے وجود کے ساتھ اس کا دفاع بھی ضروری تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی نئی ابھرنے والی طاقت فوراً ہی اقدامی پوزیشن حاصل کر لے۔ ایک دور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نئی ابھرنے والی طاقت فوراً ہی اقدامی پوزیشن حاصل کر لے۔ ایک دور ایسا بھی ہوتا ہے جس میں اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام ابد الاباد تک اپنا دفاع ہی کرتا رہے۔ بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے وجود کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ مناسب حالات میں' آگے بڑھے اور پوری انسانیت کو غیر اللہ کی غلامی سے رہائی دلائے۔ اس معاملہ میں اسلام کسی جغرافیائی حد بندی کا قائل نہیں ہے' یہ اسلام کے مزاج کے خلاف ہے کہ پوری انسانیت کو جہالت اور گمراہی کے اندھیرے میں بھٹکتا اور ظلم و ستم میں پستا چھوڑ کر صرف ایک نسل یا ایک مخصوص قوم کی اصلاح پر قانع ہو جائے۔

بعض اوقات ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں کہ جاہلیت کے حامی نظام اسلام کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس پر حملہ آور نہیں ہوتے اور اسلام بھی انہیں ان کی جغرافیائی حدود کے اندر آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو غلام بنا کر ان پر حکمرانی کریں اور مداخلت نہیں کی جاتی اور نہ ہی تحریک اسلامی کو ان حدود تک وسیع کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ وقفہ عارضی ہوتا ہے' اصل پالیسی یہی ہوتی ہے کہ اسلام ان جاہلی معاشروں کے ساتھ اس وقت تک مصالحت نہیں کرتا' جب تک وہ اسلام کے اقتدار اعلیٰ کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دیں اور جزیہ ادا کر کے یہ ثبوت فراہم نہ کر دیں کہ ان کے ملک کے دروازے تحریک اسلامی کے لئے کھلے ہیں اور ان کی حدود میں قائم حکومت' اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ ہے اس دین کا مزاج اور اس کی اصل غرض و غایت یعنی تمام انسانیت کو غیر اللہ کی غلامی سے چھڑا کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کرنا۔

دین اسلام کے اس تصور اور اس تصور کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے جو اسے ایک محدود علاقے کے اندر بند کر کے رکھ دیتا ہے۔ اگر ہم اسلام کے اس محدود تصور کو اپنا لیں تو اس صورت میں ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ قرن اول میں اسلام کی وسعت پذیری کے لئے وجوہ جواز تلاش کریں۔

لیکن اگر ہمارے سامنے اسلامی نظام زندگی کا تصور یہ ہے کہ اسلام تمام انسانوں کے لئے' اللہ کا تجویز کردہ نظام زندگی ہے اور اس کا تعلق انسانوں کے کسی خاص گروہ اور نسل سے نہیں ہے تو اسلام کی وسعت پسندی کی حقیقی وجوہات خود بخود ہمارے سامنے آ جاتی ہیں اور جب تک یہ حقیقت ہمارے ذہنوں سے اوجھل رہتی ہے' ہم اس وسعت پذیری کے لئے خارجی اسباب تلاش کرتے پھرتے ہیں حالانکہ مسئلہ کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ اسلام کا نصب العین پوری انسانیت کی حریت اور اللہ کی غلامی ہے اور جس کسی کے ذہن میں یہ حقیقت بیٹھ جائے اسے کسی اور اخلاقی جواز کے تلاش کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

دو نقطہ ہائے نظر

اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں' ایک یہ کہ اسلام مجبور تھا کہ وہ معرکہ جہاد میں کود پڑے کیونکہ جاہلی معاشرے اس کو مٹانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے ' دوسرا تصور یہ ہے کہ اسلام از خود اقدام کرتا ہے اور معرکہ جہاد میں داخل ہوتا ہے۔ اگرچہ ابتدائی دور میں ان دونوں تصورات کے درمیان امتیاز کرنا دشوار نظر آتا ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں اسلام کو معرکہ جہاد میں کودنا پڑا ہے لیکن آگے جاکر دونوں میں فرق واضح ہو جاتا ہے ' جس سے اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے نقطہ نظر اور احساس و شعور میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور اس کے دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

دوسرے نقطہ نظر کے مطابق اسلام ایک ایسا نظام زندگی بن جاتا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تجویز کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پوری انسانیت اللہ کی بندگی میں داخل ہو' انسانوں پر صرف اللہ کا حکم چلے اور اس کی شریعت ملک کا قانون ہو اور الوہیت کا مستحق صرف اللہ ہو' جب اسلام کے بارے میں یہ نقطہ نظر اختیار کیا جائے تو یہ اس کا طبیعی حق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے راستے میں حائل ہونے والی تمام مشکلات کو دور کرے تاکہ وہ براہ راست لوگوں کی عقل و شعور اور وجدان کو اپیل کر سکے۔ اسلام کے اس جامع تصور اور اس تصور کے درمیان بہت بڑا فرق ہے' جس کی رو سے اسے ایک "علاقائی اور مقامی "تصور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ہم اسے ایک علاقائی نظام سمجھیں تو پھر اس کا حق صرف یہ رہ جائے گا کہ وہ اپنے ان علاقائی حدود کے اندر اپنے وجود اور اپنی بقاء کے لئے مدافعت کر سکے۔ اسلام کے یہ دونوں تصورات نظریہ جہاد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں صورتوں میں مسلمانوں کو معرکہ جہاد میں کودنا پڑتا ہے لیکن دونوں تصورات کے نتیجے میں نظریہ جہاد کی نوعیت اور حقیقت بدل جاتی ہے۔

جب اسلام کسی ایک قوم اور نسل کا دین نہیں ہے تو پھر اس کا یہ فطری حق ہے کہ وہ متحرک ہو' کیونکہ وہ ایک الٰہی نظام ہے اور پورے جہان کے لئے ہے۔ لہٰذا اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ آگے بڑھے اور زندگی کے باطل نظاموں کو ختم کر دے۔ غلط اوضاع و اطوار کے پردوں کو چاک کر دے اور ان بندشوں کو ختم کر دے جنہوں نے عوام الناس سے آزادانہ ردو قبول کے اختیار کو سلب کر رکھا ہے۔ اس معاملے میں اسلام نے صرف یہ احتیاط برتی ہے کہ وہ کسی ایک فرد پر جبر نہیں کرتا۔ بلکہ وہ زندگی کے اجتماعی نظم اور اجتماعی عادات و اطوار پر حملہ آور ہوتا ہے تاکہ زندگی پر اثر انداز ہونے والے غلط اثرات سے افراد کو محفوظ رکھا جا سکے جو انسان کی فطرت کو بگاڑ کر اس کی آزادی کو سلب کر لیتے ہیں۔

اسلام کا یہ حق ہے کہ وہ لوگوں کو غیراللہ کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کرے اور اپنے اس مطمح نظر کو ایک حقیقت بنا دے کہ اللہ کے سوا کوئی رب اور آقا نہیں ہے۔ تمام لوگ اب جھوٹے آقاؤں کی غلامی سے آزاد ہیں۔ یہ کام صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں اسلامی نظام زندگی قائم ہو' کیونکہ صرف یہی ایک نظام ہے جس میں اللہ تعالیٰ ہی تمام انسانوں کے لئے قانون سازی کرتا ہے' خواہ وہ انسان حکمران ہوں یا محکوم ہوں' سفید رنگ ہوں یا سیاہ فام ہوں' دور کے رہنے والے ہوں یا قریب کے رہنے والے ہوں' فقیر ہوں یا امیر ہوں۔ غرض ایک ہی قسم کی قانون سازی ہے جس کے سامنے سب کے سب سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ جب اسلام کے سوا تمام دوسرے نظاموں میں حالت یہ ہے کہ

بعض انسان انسانوں کی بندگی کر رہے ہیں کیونکہ ان کے لئے انسان قانون بناتے ہیں اور قانون سازی ، دراصل الوہیت کا ایک اہم خاصہ ہے ' جو شخص بھی یہ دعوے کرتا ہے کہ اسے انسان کے لئے قانون سازی کا حق ہے تو وہ دراصل ربوبیت کا دعویدار ہے ' خواہ وہ اپنے اس دعوے کا صریح الفاظ میں اعلان کرے یا نہ کرے ۔ اور جو شخص بھی کسی ایسے شخص کے دعوے کو تسلیم کر لیتا ہے وہ دراصل اسے اپنا الٰہ مان لیتا ہے خواہ وہ اس کا اعلان کرے یا نہ کرے ۔

یہ بات اچھی طرح یاد رکھئے کہ اسلام محض فلسفہ اور نظریہ نہیں ہے کہ وہ فقط وعظ و بیان پر اکتفاء کرے ۔ اور اپنے تصورات کو لوگوں کے گوش گزار کر دے بلکہ وہ ایک اجتماعی نظام زندگی ہے اور بڑی قوت اور زور سے آگے بڑھ کر لوگوں کو غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہے اور دوسرے اجتماعی نظام اس کے اہل نہیں ہیں کہ وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کی تنظیم ان خطوط پر کر سکیں جو اسلام کو مطلوب ہیں ۔ اس لئے اسلام اپنے آپ کو اس میں حق بجانب سمجھتا ہے کہ وہ ان باطل نظاموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے تاکہ وہ انسان کی حریت فکر کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں ۔ یہی مفہوم ہے ویکون الدین کلہ للہ کا۔ یعنی اسلامی نظام میں قانون سازی اور حاکمیت کے اصلی اختیارات صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہوتے ہیں ۔

زمانہ حال کے بعض اہل قلم اسلامی نظام زندگی کی اس خصوصیت کو نہیں پا سکے اور اسلام کے نظریہ جہاد کو محض دفاعی نظریہ قرار دیتے ہیں ۔ یہ لوگ مستشرقین کے اس پروپیگنڈے سے دب گئے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور وہ بہ جبر لوگوں کو مسلمان کرتا ہے ۔ اپنی جگہ مستشرقین اسلامی نظام کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے نظریہ جہاد کی حقیقت کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر دی جائیں ۔ اس صورت حال کے مقابلے میں یہ اہل قلم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سوالات کا جواب دیتے ہیں اور ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہوتا کہ وہ دفاعی جنگ کے وجوہ و اسباب تلاش کریں ۔ یہ حضرات اسلام کے مزاج اور اس کے نصب العین کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ اسلامی نظریہ حیات کی رو سے اسلام کا یہ فرض ہے کہ وہ اقدام کرے ۔ نہ کہ دفاع ۔ ان شکست خوردہ اہل قلم کے دل و دماغ میں مذہب کا مغربی تصور اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو بھی ایک مذہبی عقیدہ سمجھتے ہیں ' جسے زندگی کے عملی اور اجتماعی نظام سے کوئی سروکار نہ ہو ' اس لئے دینی جہاد (Holy War) کے معنے ان کی نظروں میں صرف یہ رہ جاتے ہیں کہ لوگوں کو دین میں داخل کرنے کے لئے جہاد کیا جائے اور ان پر ایک خاص عقیدہ مسلط کر دیا جائے ' حالانکہ صورت حال بالکل اس کے برعکس ہے ۔ اسلام پوری زندگی کے لئے ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس کی اساس اس عقیدے پر ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو خود حاکم اور فرمانروا بھی ہے اور اس نے یہ مکمل نظام پوری انسانیت کے لئے تجویز کیا ہے اور اس کے مطابق جہاد کے معنے یہ ہیں کہ انسانوں پر اس نظام کو نافذ کیا جائے ۔ رہا یہ سوال کہ کوئی اسلامی عقائد کو اپناتا ہے یا نہیں تو یہ بالکل اس کے آزادانہ اختیار تمیزی پر موقوف ہے ۔ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ آزادانہ غور و فکر کے لئے اسے آزاد فضاء میسر ہو اور ایسی فضا میسر ہونے کے لئے اسلامی نظام زندگی کا نفاذ ضروری ہے ۔ یہ ہے مذہب کا وہ حقیقی اسلامی تصور جو مذہب کے مغربی تصور سے بالکل مختلف ہے ۔

اسلامی معاشرے کے ظہور کے بعد اور اس میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کے بعد اللہ تعالیٰ اس معاشرے کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھے اور اقتدار پر قابض ہو اور اس نظام کو پورے کرۂ ارض پر جہاں تک ممکن ہو ' نافذ کر

دے - رہا یہ کہ شعوری طور پر کوئی اس نظام زندگی کو قبول کرتا ہے یا نہیں تو اس میں ہر کوئی آزاد ہے - حالات اور مواقع کے اعتبار سے بعض اوقات یوں بھی ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد بالسیف سے روکا ہے - یہ مستقل پالیسی نہ تھی بلکہ وقتی حالات اور مصالح کا تقاضا تھا - تحریک کے عملی تقاضوں کی بناء پر ایسا کیا گیا - ہم نے اس مضمون میں مختلف ادوار کی آیات پر بحث کر کے ان کا مفہوم متعین کر دیا ہے - اس کی روشنی میں ہمیں چاہئے کہ وہ پالیسیاں جو مختلف مواقع پر طے ہوئیں اور وہ نظریہ اور نصب العین جو ابد الاباد کے لئے طے ہوا ہے ' ان کے درمیان فرق کریں اور وقتی احکامات کے پیش نظر دائمی احکامات کو پس پشت نہ ڈالیں -

اب ہمارے سامنے صرف یہ نکتہ رہ گیا ہے کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا مزاج کیا ہے ؟ اور اسلامی نظام زندگی کی نوعیت کیا ہے تو اس سلسلے میں امیر جماعت اسلامی پاکستان سید ابوالاعلیٰ مودودی کی نہایت ہی مختصر اگر قیمتی بحث ہماری بہت ہی اچھی راہنمائی کرتی ہے - یہ بحث انہوں نے اپنی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" میں کی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اس کتاب سے قدرے طویل اقتباسات نقل کرنے کی ضرورت ہے - جو شخص اس موضوع کو اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہے اس کے لئے اس کتاب کا پڑھنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ اس مسئلے کی گہرائی میں جاکر اسے اچھی طرح سمجھ سکے اور اس بات کا ادراک کر سکے کہ تحریک اسلامی کے برپا کرنے میں اس کا کیا کردار ہے ' فرماتے ہیں :

"عموماً لفظ "جہاد" کا ترجمہ انگریزی زبان میں (Holy War) مقدس جنگ" کیا جاتا ہے اور اس کی تشریح وتفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوش جنوں" کا ہم معنی ہوکر رہ گیا ہے - اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے ' داڑھیاں چڑھائے ' خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آرہا ہے - جہاں کسی کافر کو دیکھ پاتا ہے پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الہ الا اللہ ورنہ ابھی سر تن سے جدا کر دیا جاتا ہے - ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی فنکاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ :

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود کئی صدیوں سے انتہا درجہ کی غیر مقدس جنگ (Unholy War) میں مشغول ہیں - ان کی اپنی تصویر یہ ہے کہ دولت اور اقتدار کے بھوکے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہوکر قزاقوں کی طرح ساری دنیا پر پل پڑے ہیں اور ہر طرف تجارت کی منڈیاں ' خام پیداوار کے ذخیرے ' نو آبادیاں بسانے کے قابل زمینیں اور معدنیات کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ اپنی حرص کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کے لئے ایندھن فراہم کریں - ان کی جنگ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ پیٹ کی راہ میں ہے - ہوس اور نفس امارہ کی راہ میں ہے - ان کے نزدیک کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے بس یہ کافی وجہ جواز ہے کہ اس کی زمین میں کانیں ہیں ' یا اجناس کافی پیدا ہوتی ہیں ' یا وہاں تیل نکل آیا ہے ' یا ان کے کارخانوں کا مال وہاں اچھی طرح کھپایا جاسکتا ہے ' یا اپنی زائد آبادی کو وہاں آسانی کے ساتھ بسایا جاسکتا ہے - کچھ اور نہیں تو اس قوم کا یہ گناہ بھی کوئی معمولی گناہ نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے ملک کے راستے میں رہتی ہے جس پر یہ پہلے قبضہ کرچکے ہیں یا اب قبضہ کرنا چاہتے ہیں - ہم نے تو جو کچھ کیا وہ زمانہ ماضی کا قصہ ہے - اور ان کے کارنامے حال کے واقعات ہیں جو شب و روز دنیا کی آنکھوں کے سامنے گزر رہے ہیں - ایشیا ' افریقہ '

امریکہ، غرض کرۂ زمین کا کون سا حصہ ایسا بچا رہ گیا ہے جو ان کی اس غیر مقدس جنگ سے لالہ زار نہیں ہو چکا مگر ان کی مہارت قابل داد ہے۔ انہوں نے ہماری تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بری بنائی کہ خود ان کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی اور ہماری سادہ لوحی بھی قابل داد ہے۔ جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی تو ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوروں کی صورت دیکھنے کا ہوش ہی نہ آیا اور لگے معذرت کرنے کہ حضور! بھلا ہم جنگ و قتال کیا جانیں۔ ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پر امن مبلغ لوگ ہیں۔ چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرا لینا، بس یہ ہمارا کام ہے۔ ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کسی نے ہمیں مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھا دیا۔ سو اب تو ہم اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں۔ حضور کی خاطر سے کے لئے تلوار والے جہاد کو سرکاری طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اب تو جہاد فقط زبان و قلم کی کوشش کا نام ہے۔ توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے اور زبان و قلم چلانا ہمارا کام۔

جہاد کے متعلق غلط فہمی کے اسباب

خیر، یہ تو سیاسی چالوں کی بات ہے مگر خالص علمی حیثیت سے جب ہم ان اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے "جہاد فی سبیل اللہ" کی حقیقت کو سمجھنا غیر مسلموں ہی کے لئے نہیں، خود مسلمانوں کے لئے بھی دشوار ہو گیا ہے تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے۔

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو ان معنوں میں ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا ہے جن میں یہ لفظ عموماً مستعمل ہوتا ہے۔

ان دو غلط فہمیوں نے صرف ایک جہاد ہی کے مسئلہ کو نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے پورے اسلام کے نقشہ کو بدل ڈالا ہے اور مسلمانوں کی پوزیشن کلی طور پر غلط کر کے رکھ دی ہے۔

"مذہب" کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیویٹ معاملہ ہی ہونا چاہئے۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں اور آپ کا ضمیر جس کی عبادت کرنے پر راضی ہو، اس کو جس طرح چاہیں پکاریں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جوش اور سرگرمی آپ کے اندر اس مذہب کے لئے موجود ہے تو آپ دنیا بھر میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھریئے اور دوسرے عقائد والوں سے مناظرے کیجئے۔ اس کے لئے تلوار ہاتھ میں پکڑنے کا کون سا موقع ہے؟ کیا آپ لوگوں کو مار مار کر اپنا ہم عقیدہ بنانا چاہتے ہیں؟ یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے جبکہ آپ اسلام کو عام اصطلاح کی رو سے ایک "مذہب" قرار دے لیں۔ یہ پوزیشن اگر واقعی اسلام کی ہو تو جہاد کے لئے حقیقت میں کوئی وجہ جواز ثابت نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح "قوم" کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ وہ ایک متجانس گروہ اشخاص (A homogeneous Group of Men) کا نام ہے جو چند بنیادی امور میں مشترک ہونے کی وجہ سے باہم مجتمع اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو گیا ہے۔ اس معنی میں جو گروہ ایک قوم ہو وہ دو ہی وجوہ سے تلوار اٹھاتا ہے اور اٹھا سکتا ہے۔ یا تو اس کے جائز حقوق چھیننے کے لئے کوئی اس پر حملہ کرے، یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق چھیننے کے لئے کوئی اس پر حملہ کرے یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق

چھیننے کے لئے حملہ آور ہو۔ پہلی صورت میں تو خیر تلوار اٹھانے کے لئے کچھ نہ کچھ اخلاقی جواز موجود بھی ہے (اگرچہ بعض دھرماتماؤں کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے) لیکن دوسری صورت کو تو بعض ہٹلروں کے سوا کوئی بھی جائز نہیں کہہ سکتا حتیٰ کہ برطانیہ اور فرانس جیسی وسیع سلطنتوں کے مدبرین بھی آج اس کو جائز کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

جہاد کی حقیقت

پس اگر اسلام ایک "مذہب" اور مسلمان ایک "قوم" ہے تو جہاد کی ساری معنویت، جس کی بناء پر اسلام میں اسے افضل العبادات کہا گیا ہے، سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی "مذہب" کا اور مسلمان کسی "قوم" کا نام نہیں ہے۔ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم (Social Order) کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق اسے تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت (International Revolution Party) کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے منظم کرتا ہے اور جہاد اس انقلابی جدوجہد (Revolutionary Struggle) کا اور اس انتہائی صرف طاقت کا نام ہے، جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلامی جماعت عمل میں لاتی ہے۔

تمام انقلابی مسلکوں کی طرح اسلام بھی عام مروج الفاظ کو چھوڑ کر اپنی ایک خاص اصطلاحی (Terminology) اختیار کرتا ہے تاکہ اس کے انقلابی تصورات عام تصورات سے ممتاز ہو سکیں۔ لفظ جہاد بھی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام نے حرب اور اسی نوعیت کے دوسرے عربی الفاظ جو جنگ (War) کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں، قصداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ "جہاد" کا لفظ استعمال کیا جو (Struggle) کا ہم معنی ہے بلکہ اس سے زیادہ مبالغہ رکھتا ہے۔ انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

(To exert One's Utmost Endeavour in Promoting a Cause) "اپنی تمام طاقتیں کسی مقصد کی تحصیل میں صرف کر دینا"

سوال یہ ہے کہ پرانے الفاظ کو چھوڑ کر یہ نیا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ "جنگ" کا لفظ قوموں اور سلطنتوں کی ان لڑائیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور آج تک ہو رہا ہے۔ جو اشخاص یا جماعتوں کی نفسانی اغراض کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ ان لڑائیوں کے محرک محض اپنے شخصی یا اجتماعی مقاصد ہوتے ہیں جن کے اندر کسی نظریئے اور کسی اصول کی حمایت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسلام کی لڑائی چونکہ اس نوعیت کی نہیں ہے اس لئے وہ سرے سے اس لفظ ہی کو ترک کر دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر ایک قوم کا مفاد یا دوسری قوم کا مفاد نہیں ہے۔ وہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ زمین پر ایک سلطنت کا قبضہ رہے یا دوسری سلطنت کا۔ اس کی دلچسپی جس چیز سے ہے وہ انسانیت کی فلاح ہے۔ اس فلاح کے لئے وہ اپنا ایک خاص نظریہ اور ایک عملی مسلک رکھتا ہے۔ اس نظریئے اور مسلک کے خلاف جہاں کی حکومت بھی ہے، اسلام اسے مٹانا چاہتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی قوم ہو اور کوئی ملک ہو۔ اس کا مدعا اپنے نظریئے اور مسلک کی حکومت قائم کرنا ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ کون اس کا جھنڈا لے کر اٹھتا ہے اور کس کی حکمرانی پر اس کی ضرب پڑتی ہے۔ وہ زمین مانگتا ہے۔ زمین کا ایک حصہ نہیں بلکہ پورا کرۂ ارض ... اس لئے نہیں کہ ایک قوم یا بہت سی قوموں کے ہاتھ سے نکل کر زمین کی حکومت کسی خاص قوم کے ہاتھ میں آ جائے۔ بلکہ صرف اس لئے

کہ انسانیت کی فلاح کا جو نظریہ اور پروگرام اس کے پاس ہے یا بالفاظ صحیح تر یوں کہئے کہ فلاح انسانیت کے جس پروگرام کا نام ”اسلام“ ہے اس سے تمام نوع انسانی متمتع ہو۔ اس غرض کے لئے وہ تمام ان طاقتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لئے کارگر ہو سکتی ہیں اور ان سب طاقتوں کے استعمال کا ایک جامع نام وہ ”جہاد“ رکھتا ہے۔ زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطہ نظر کو بدلنا اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔ تلوار کے زور سے پرانے ظالمانہ نظام زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے اور اس راہ میں مال صرف کرنا اور جسم سے دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد ہے۔

”فی سبیل اللہ“ کی لازمی قید

لیکن اسلام کا جہاد نرا ”جہاد“ نہیں ہے بلکہ ”جہاد فی سبیل اللہ“ ہے۔ ”فی سبیل اللہ“ کی قید اس کے ساتھ ایک لازمی قید ہے۔ یہ لفظ بھی اسلام کی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کی طرف ابھی میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے ”راہ خدا میں“ اس ترجمے سے لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ زبردستی لوگوں کو اسلام کے مذہبی عقائد کا پیرو بنانا جہاد فی سبیل اللہ ہے کیونکہ لوگوں کے تنگ دماغوں میں ”راہ خدا“ کا کوئی مفہوم اس کے سوا نہیں سما سکتا۔ مگر اسلام کی زبان میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہر وہ کام جو اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے کیا جائے اور جس کے کرنے والے کا مقصد اس سے خود کوئی دنیوی فائدہ اٹھانا نہ ہو بلکہ محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو، اسلام ایسے کام کو ”فی سبیل اللہ“ قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ خیرات دیتے ہیں۔ اس نیت سے کہ اس دنیا میں مادی یا اخلاقی طور پر اس خیرات کا کوئی فائدہ آپ کی طرف پلٹ کر آئے تو یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ اور اگر خیرات سے آپ کی نیت یہ ہے کہ ایک غریب انسان کی مدد کر کے آپ خدا کی خوشنودی حاصل کریں تو یہ فی سبیل اللہ ہے۔ پس یہ اصطلاح مخصوص ہے ایسے کاموں کے لئے جو کامل خلوص کے ساتھ، ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر، اس نظریئے پر کئے جائیں کہ انسان کا دوسرے انسانوں کی فلاح کے لئے کام کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے اور انسان کی زندگی کا نصب العین مالک کائنات کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

”جہاد“ کے لئے بھی ”فی سبیل اللہ“ کی قید اسی غرض کے لئے لگائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب نظام زندگی میں انقلاب برپا کرنے اور اسلامی نظریئے کے مطابق نیا نظام مرتب کرنے کے لئے اٹھے تو اس قیام اور اس سربازی و جاں نثاری میں اس کی اپنی کوئی نفسانی غرض نہ ہو۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہ ہو کہ قیصر کو ہٹا کر وہ خود قیصر بن جائے۔ اپنی ذات کے لئے مال و دولت، یا شہرت و ناموری، یا عزت و جاہ حاصل کرنے کا شائبہ تک اس کی جدوجہد کے مقاصد میں شامل نہ ہو۔ اس کی تمام قربانیوں اور ساری محنتوں کا مدعا صرف یہ ہو کہ بندگان خدا کے درمیان ایک عادلانہ نظام زندگی قائم کیا جائے۔ اس کے معاوضہ میں اسے خدا کی خوشنودی کے سوا کچھ بھی مطلوب نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ

(۴ : ۷۶) ”جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ ———

میں لڑتے ہیں ۔"

"طاغوت" کا مصدر "طغیان" ہے جس کے معنی حد سے گزر جانے کے ہیں ۔ دریا جب اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو آپ کہتے ہیں طغیانی آگئی ہے ۔ اسی طرح جب آدمی اپنی جائز حد سے گزر کر اس غرض کے لئے اپنی طاقت استعمال کرتا ہے کہ انسانوں کا خدا بن جائے یا اپنے مناسب حصہ سے زائد فوائد حاصل کرے تو یہ طاغوت کی راہ میں لڑنا ہے ۔

اور اس کے مقابلہ میں راہ خدا کی جنگ وہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ خدا کا قانون عدل دنیا میں قائم ہو' لڑنے والا خود بھی اس کی پابندی کرے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرائے ۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸ : ۸۳) "آخرت میں عزت کا مقام تو ہم نے صرف ان لوگوں کے لئے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنا اور فساد کرنا نہیں چاہتے ۔ عاقبت کی کامیابی صرف خدا ترس لوگوں کے لئے ہے ۔"

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "راہ خدا کی جنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لئے جنگ کرتا ہے ۔ دوسرا شخص بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے ۔ تیسرے شخص کو کسی سے عداوت ہوتی ہے یا قومی حمیت کا جوش ہوتا ہے اس لئے جنگ کرتا ہے ۔ ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "کسی کی بھی نہیں ۔ فی سبیل اللہ تو صرف اس شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا ۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی حاصل کرنے کی بھی نیت ہوئی تو اس کا اجر ضائع ہو گیا ۔" اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو محض اس کی خوشنودی کے لئے ہو اور کوئی شخصی یا جماعتی غرض پیش نظر نہ ہو ۔ پس جہاد کے لئے فی سبیل اللہ کی قید اسلامی نقطہ نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ مجرد جہاد تو دنیا میں سب ہی جاندار کرتے ہیں ۔ ہر ایک اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے لیکن "مسلمان" جس انقلابی جماعت کا نام ہے اس کے انقلابی نظریات میں سے ایک اہم ترین نظریہ بلکہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اپنی جان و مال کھپاؤ' دنیا کی ساری سرکش طاقتوں سے لڑو' اپنے جسم و روح کی ساری طاقتیں خرچ کر دو' اس لئے کہ دوسرے سرکشوں کو ہٹا کر تم ان کی جگہ لے لو' بلکہ صرف اس لئے کہ دنیا سے سرکشی و طغیانی مٹ جائے اور خدا کا قانون دنیا میں نافذ ہو ۔

جہاد کے اس مفہوم اور فی سبیل اللہ کی اس معنویت کو مختصراً بیان کر دینے کے بعد اس دعوت انقلاب کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جا سکے کہ اس دعوت کے لئے جہاد کی حاجت کیا ہے اور اس کی غایت (Objective) کیا ہے ۔

اسلام کی دعوت انقلاب

اسلام کی دعوت انقلاب کا خلاصہ یہ ہے :-

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ "لوگو! صرف اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

اسلام مزدوروں یا زمینداروں یا کاشت کاروں یا کارخانہ داروں کو نہیں پکارتا بلکہ تمام انسانوں کو پکارتا ہے۔ اس کا خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے اور وہ کہتا یہ ہے کہ اگر تم خدا کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت اور فرماں برداری کرتے ہو تو اسے چھوڑ دو۔ اگر خود تمہارے اندر خدائی کا داعیہ ہے تو اسے بھی دماغ سے نکال دو کیونکہ دوسروں سے اپنی بندگی کرانے اور دوسروں کا سر اپنے آگے جھکوانے کا حق بھی تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تم سب کو ایک خدا کی بندگی قبول کرنی چاہئے اور اس بندگی میں سب کو ایک سطح پر آجانا چاہئے۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ـــــ (۳: ٦٤) "آؤ ہم اور تم ایک ایسی بات پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اور خداوندی میں کسی کو خدا کا شریک بھی نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے بجائے امر و نہی کا مالک بھی نہ بنائے۔"

یہ عالمگیر اور کلی انقلاب کی دعوت تھی۔ اس نے پکار کر کہا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ "حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے۔" کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذات خود انسانوں کا حکمران بن جائے اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز سے چاہے روک دے۔ کسی انسان کو بالذات امر و نہی کا مالک سمجھنا دراصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے۔ اور دنیا میں یہی اصل بنائے فساد ہے۔ اللہ نے انسان کو جس صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے اور زندگی بسر کرنے کا جو سیدھا راستہ اسے بتایا ہے اس سے انسان کے ہٹنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں اور نتیجۃً خود اپنی حقیقت کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ اس کا انجام پھر لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف بعض اشخاص یا خاندان یا طبقے خدائی کا کھلا یا چھپا داعیہ لے کر اٹھتے ہیں اور اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں۔ اور دوسری طرف اسی خدا فروشی و خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کا ایک حصہ طاقتوروں کی خداوندی مان لیتا ہے اور ان کے اس حق کو تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ حکم کریں اور یہ اس حکم کے آگے سر جھکا دیں۔ یہی دنیا میں ظلم و فساد اور ناجائز انتفاع (Exploitation) کی بنیاد ہے اور اسلام پہلی ضرب اسی پر لگاتا ہے۔ وہ ہانکے پکارے کہتا ہے:

وَلَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ (۱۵۱) الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۱۵۲) ((۲٦: ۱۵۱ ـ ۱۵۲)) "ان لوگوں کا حکم ہرگز نہ مانو جو اپنی جائز حد سے گزر گئے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔"

لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸: ۲۸) "اس شخص کی اطاعت ہرگز نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات نفس کا بندہ بن گیا ہے

اور جس کا کام افراط و تفریط پر مبنی ہے۔"

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا

---- (۱۹) (۱۱:۱۸ – ۱۹) "خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو خدا کے بنائے ہوئے زندگی کے سیدھے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔

وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲: ۳۹) "یہ بہت سے چھوٹے خدا' جن کی بندگی میں تم پسے جا رہے ہو' ان کی بندگی قبول ہے' یا اس ایک خدا کی جو سب سے زبردست ہے؟ اگر اس خدائے واحد کی بندگی قبول نہ کرو گے تو ان چھوٹے اور جھوٹے خداؤں کی آقائی سے تمہیں کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ یہ کسی نہ کسی طور سے تم پر تسلط پالیں گے' اور فساد برپا کر کے رہیں گے :

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ

يَفْعَلُوْنَ (۲۷: ۳۴) "یہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کے نظام حیات کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا یہی وطیرہ ہے۔"

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا

يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲: ۲۰۵) "اور جب وہ اقتدار پالیتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔ کھیتوں کو خراب اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔"

یہاں پوری تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوت توحید و خدا پرستی محض اس معنی میں ایک مذہبی عقیدے کی دعوت نہ تھی جس میں عام طور پر مذہبی عقائد کی دعوت ہوا کرتی ہے' بلکہ حقیقت میں یہ ایک اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کی دعوت تھی۔ اس کی ضرب بلاواسطہ ان طبقوں پر پڑتی تھی جنہوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بن کر' یا سیاسی رنگ میں بادشاہ اور رئیس اور حکمران گروہ بن کر' یا معاشی رنگ میں مہاجن اور زمیندار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنا لیا تھا۔ یہ کہیں علانیہ ارباب من دون اللہ بنے ہوئے تھے۔ دنیا سے اپنے پیدائشی یا طبقاتی حقوق کی بنا پر اطاعت و بندگی کا مطالبہ کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى اور اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اور کسی جگہ انہوں نے عامۃ الناس کی جہالت کو استعمال (Exploit) کرنے کے لئے بتوں اور ہیکلوں کی شکل میں مصنوعی خدا بنا رکھے تھے جن کی آڑ پکڑ کر یہ اپنے خداوندی حقوق بندگان خدا سے تسلیم کراتے تھے۔ پس کفر و شرک اور بت پرستی کے خلاف اسلام کی دعوت' اور خدائے واحد کی بندگی و معبودیت کے لئے اسلام کی تبلیغ' براہ راست حکومت اور اس کو سہارا دینے والے یا اس کے سہارے چلنے والے طبقوں کی اغراض سے متصادم ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جب کبھی کسی نبی نے يٰقَوْمِ اعْبُدُوْا

اللہَ مَا لَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ کی صدا بلند کی' حکومت وقت فوراً اس کے مقابلے میں آن کھڑی ہوئی اور تمام ناجائز انتفاع کرنے والے طبقے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے ـ کیونکہ یہ محض ایک مابعد الطبیعی قضیہ (Metaphysical Proposition) کا بیان نہ تھا' بلکہ ایک اجتماعی انقلاب کا اعلان تھا اور اس میں پہلی آواز سنتے ہی سیاسی شورش کی بو سونگھ لی جاتی تھی ـ

اسلامی دعوت انقلاب کی خصوصیت

اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب انقلابی لیڈر تھے اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے انقلابی لیڈر ہیں ـ لیکن جو چیز دنیا کے عام انقلابیوں اور ان خدا پرست انقلابی لیڈروں کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے انقلابی لوگ خواہ کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہو' عدل اور توسط کے صحیح مقام کو نہیں پا سکتے ـ وہ یا تو خود مظلوم طبقوں میں سے اٹھتے ہیں یا ان کی حمایت کا جذبہ لے کر اٹھتے ہیں اور پھر سارے معاملات کو انہی طبقوں کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں ـ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر غیر جانبدارانہ اور خالص انسانیت کی نظر نہیں ہوتی بلکہ ایک طبقے کی طرف غصہ و نفرت کا اور دوسرے طبقے کی طرف حمایت کا جذبہ لئے ہوئے ہوتی ہے ـ وہ ظلم کا ایسا علاج سوچتے ہیں جو نتیجۃً ایک جوابی ظلم ہوتا ہے ـ ان کے لئے انتقام' حسد اور عداوت کے جذبات سے پاک ہو کر ایک ایسا معتدل اور متوازن اجتماعی نظام تجویز کرنا ممکن نہیں ہوتا جس میں مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح ہو ـ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام خواہ کتنے ہی ستائے گئے ہوں اور کتنا ہی ان پر اور ان کے ساتھیوں پر ظلم کیا گیا ہو' ان کی انقلابی تحریک میں کبھی ان کے شخصی جذبات کا اثر آنے نہیں پایا ـ وہ براہ راست خدا کی ہدایت کے تحت کام کرتے تھے اور خدا چونکہ انسانی جذبات سے منزہ ہے' کسی انسانی طبقے سے اس کا مخصوص رشتہ نہیں' نہ کسی دوسرے انسانی طبقے سے اس کو کوئی شکایت یا عداوت ہے ـ اس لئے خدا کی ہدایت کے تحت انبیاء علیہم السلام تمام معاملات کو بے لاگ انصاف کے ساتھ اس نظر سے دیکھتے تھے کہ تمام انسانوں کی مجموعی فلاح و بہبود کس چیز میں ہے ـ کس طرح ایک نظام بنایا جائے جس میں ہر شخص اپنی جائز حدود کے اندر رہ سکے ـ اپنے جائز حقوق سے متمتع ہو سکے اور افراد کے باہمی روابط' نیز فرد اور جماعت کے باہمی تعلق میں کامل توازن قائم ہو سکے ـ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی انقلابی تحریک کبھی طبقاتی نزاع (Class War) میں تبدیل نہ ہونے پائی ـ انہوں نے اجتماعی تعمیر نو (Social Reconstruction) اس طرز پر نہیں کی کہ ایک طبقے کو دوسرے طبقے پر مسلط کر دیں' بلکہ اس کے لئے عدل کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں تمام انسانوں کے لئے ترقی اور مادی و روحانی سعادت کے یکساں امکانات رکھے گئے تھے ـ

جہاد کی ضرورت اور اس کی غایت

اس مختصر مقالہ میں میرے لئے اس اجتماعی نظام (Social Order) کی تفصیلات پیش کرنا مشکل ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے ـ تفصیل کا موقع انشاء اللہ عنقریب آئے گا ـ یہاں اپنے موضوع کی حد میں رہتے ہوئے جس بات کو مجھے واضح کرنا تھا' وہ صرف یہ تھی کہ اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ اور چند عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع سسٹم ہے جو دنیا سے زندگی کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹانا چاہتا ہے اور ان کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے جس کو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے سب سے بہتر سمجھتا ہے ـ

اس تخریب و تعمیر اور انقلاب و اصلاح کے لئے وہ کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ وہ خود ان ظالم طبقوں اور ناجائز انتفاع کرنے والے گروہوں' حتیٰ کہ بادشاہوں اور رئیسوں کو بھی پکارتا ہے کہ آؤ اس جائز حد کے اندر رہنا قبول کر لو جو تمہارے خالق نے تمہارے لئے مقرر کی ہے۔اگر تم عدل اور حق کے نظام کو قبول کر لو گے تو تمہارے لئے امن اور سلامتی ہے۔یہاں کسی انسان سے دشمنی نہیں ہے۔دشمنی جو کچھ بھی ہے 'ظلم سے ہے' فساد سے ہے' بداخلاقی سے ہے' اس بات سے ہے کہ کوئی شخص اپنی فطری حد سے تجاوز کر کے وہ کچھ حاصل کرنا چاہے جو فطرت اللہ کے لحاظ سے اس کا حق نہیں ہے۔

یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کر لیں وہ خواہ کسی طبقے' کسی نسل' کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں' یکساں حقوق اور مساویانہ حیثیت سے اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے جسے قرآن "حزب اللہ" کے نام سے یاد کرتا ہے اور جس کا دوسرا نام "اسلامی جماعت" یا "امت مسلمہ" ہے۔

یہ پارٹی وجود میں آتے ہی اپنے مقصد وجود کی تحصیل کے لئے جہاد شروع کر دیتی ہے۔اس کے عین وجود کا اقتضاء یہی ہے کہ یہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو مٹانے کی کوشش کرے۔اور اس کے مقابلہ میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطہ کی حکومت قائم کرے جسے قرآن ایک جامع لفظ "کلمۃ اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔اگر یہ پارٹی حکومت کو بدلنے اور اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس کے وجود میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے' کیونکہ یہ کسی اور مقصد کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہے اور اس جہاد کے سوا اس کی ہستی کا اور کوئی مصرف ہی نہیں۔قرآن اس کی پیدائش کا ایک ہی مقصد بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (۳: ۱۱۰) "تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔"

یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین (Preachers) اور مبشرین (Missionaries) کی جماعت نہیں ہے بلکہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے۔لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم' فتنہ' فساد' بداخلاقی' طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے۔ءَ اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی خداوندی کو ختم کر دے۔بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ "ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت صرف خدا کے لئے ہو جائے۔"

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ "اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ ہو گا اور بڑا فساد برپا رہے گا۔"

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ "وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور حق کی اطاعت کا صحیح

ضابطہ دے کر بھیجا ہے تاکہ تمام اطاعتوں کو مٹا کر اسی ایک اطاعت کو سب پر غالب کر دے۔ خواہ وہ لوگ اس پر راضی نہ ہوں جو خداوندی میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔"

لہٰذا اس پارٹی کے لئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ مفسدانہ نظام تمدن ایک فاسد حکومت کے بل پر ہی قائم ہوتا ہے۔ اور ایک صالح نظام تمدن اس وقت تک کسی طرح قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکومت مفسدین سے مسلوب ہو کر مصلحین کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔

دنیا کی اصلاح سے قطع نظر اس جماعت کے لئے خود اپنے مسلک پر عامل ہونا بھی غیر ممکن ہے۔ اگر حکومت کا نظام کسی دوسرے مسلک پر قائم ہو۔ کوئی پارٹی جو کسی سسٹم کو برحق سمجھتی ہو، کسی دوسرے سسٹم کی حکومت میں اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ایک اشتراکی مسلک کا آدمی اگر انگلستان یا امریکہ میں رہ کر اشتراکیت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہے تو کسی طرح اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کا ضابطہ حیات حکومت کی طاقت سے بہ جبر اس پر مسلط ہو گا اور وہ اس کی قہرمانی سے کسی طرح بچ نہ سکے گا۔ اسی طور پر ایک مسلمان بھی اگر کسی غیر اسلامی نظام حکومت میں رہ کر اسلامی اصول پر زندگی بسر کرنا چاہے تو اس کا کامیاب ہونا محال ہے۔ جن قوانین کو وہ باطل سمجھتا ہے جن ٹیکسوں کو وہ حرام سمجھتا ہے، جن معاملات کو وہ ناجائز سمجھتا ہے، جس تہذیب اور جس طرز زندگی کو وہ فاسد سمجھتا ہے، جس طریق تعلیم کو وہ مہلک سمجھتا ہے، وہ سب کے سب اس پر، اس کے گھر بار پر، اس کی اولاد پر اس طرح مسلط ہو جائیں گے کہ وہ کسی طرح ان کی گرفت سے بچ کر نہ نکل سکے گا۔ لہٰذا جو شخص یا گروہ کسی مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو، وہ اپنے اعتقاد کے فطری اقتضاء ہی سے اس امر پر مجبور ہوتا ہے کہ مسلک مخالف کی حکومت کو مٹانے اور اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ مخالف نظریے کی حکومت مسلط ہو تو اس صورت میں وہ خود اپنے مسلک پر عمل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کوشش سے غفلت برتتا ہے تو اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ وہ درحقیقت اپنے عقائد ہی میں جھوٹا ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (٤٣) لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ——— اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

(التوبہ — ٤٣ تا ٤٥) "اے نبی! خدا تمہیں معاف کرے، تم نے ان لوگوں کو جہاد کی شرکت سے علیحدہ رہنے کی اجازت کیوں دے دی؟ تمہیں اجازت نہ دینی چاہئے تھی تاکہ یہ بات تم پر کھل جاتی کہ اپنے ایمان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟ جو لوگ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ انہیں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معذور رکھا جائے...... ایسی درخواست تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر۔"

ان الفاظ میں قرآن نے صاف اور صریح فتویٰ دے دیا ہے کہ اپنے اعتقاد (Conviction) میں کسی جماعت کے صادق ہونے کا واحد معیار یہی ہے کہ وہ جس مسلک پر اعتقاد رکھتی ہو اس کو حکمران بنانے کے لئے جان و مال سے جہاد کرے۔ اگر تم مسلک مخالف کی حکومت کو گوارا کرتے ہو تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ تم اپنے اعتقاد میں جھوٹے ہو اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ آخر کار اسلام کے مسلک پر تمہارا نام نہاد عقیدہ بھی باقی نہ رہے گا۔ ابتداء میں تم مسلک مخالف کی حکومت کو بکراہت گوارا کرو گے۔ پھر رفتہ رفتہ تمہارے دل اس سے مانوس ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ کراہت رغبت سے بدل جائے گی۔ اور آخر میں نوبت اس حد تک پہنچے گی کہ مسلک مخالف کی حکومت قائم ہونے اور قائم رہنے میں تم خود مددگار بنو گے' اپنی جان و مال سے جہاد اس لئے کرو گے کہ مسلک اسلام کے بجائے مسلک غیر اسلام قائم ہو یا قائم رہے۔ تمہاری اپنی طاقتیں مسلک اسلام کے قیام کی مزاحمت میں صرف ہونے لگیں گی اور یہاں پہنچ کر تم میں اور کافروں میں اسلام کے منافقانہ دعوے' ایک بدترین جھوٹ' ایک پرفریب نام کے سوا کوئی فرق نہ رہے گا۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نتیجہ کو صاف، صاف بیان فرما دیا ہے۔

والذی نفسی بیده لتامرن بالمعروف ولتنهن عن المنکر ولتاخذن ید المسئی ولتطرنه علی الحق اطراء ولیضربن الله قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم کما لعنهم "اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یا تو تمہیں نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا اور بدکار کا ہاتھ پکڑنا اور اسے حق کی طرف بزور موڑنا ہو گا' یا پھر اللہ کے قانون فطرت کا یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا کہ بدکاروں کے دلوں کا اثر تمہارے دلوں پر بھی پڑ جائے اور ان کی طرح تم بھی ملعون ہو کر رہو۔

عالمگیر انقلاب

"اس بحث سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلامی جہاد کا مقصود (Objective) غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کے نظام حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزل مقصود ایک عالمگیر انقلاب (World Revolution) کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی انقلابی مسلک جو قومیت کے بجائے انسانیت کی فلاح کے اصول لے کر اٹھا ہو' اپنے انقلابی مطمح نظر کو کبھی ایک ملک یا ایک قوم کے دائرے میں محدود نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنی فطرت کے عین اقتضاء ہی سے مجبور ہے کہ عالمگیر انقلاب کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ حق جغرافی حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اگر کسی پہاڑ یا دریا کے اس پار حق ہوں تو اس پار بھی حق ہی ہوں۔ نوع انسانی کے کسی حصہ کو بھی مجھ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ انسان جہاں بھی ظلم و ستم کا اور افراط و تفریط کا تختہ مشق بنا ہوا ہے وہاں اس کی مدد کے لئے پہنچنا میرا فرض ہے۔ اسی تخیل کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (۴ : ۷۵) "تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ان مردوں ' عورتوں اور بچوں کے لئے نہیں لڑتے جنہیں کمزور پاکر دبالیا گیا ہے اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے کارفرما ظالم ہیں۔

علاوہ بریں قومی اور ملکی تعصبات کے باوجود انسانی تعلقات و روابط کچھ ایسی عالمگیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ممالک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو جائے۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاح عمومی اور تحفظ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفاء نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں۔ اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دے گی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں ان کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑکر غیراسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی۔

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب ' جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی۔ پھر جب ان کے برسراقتدار لوگوں نے اس دعوت اصلاح کو رد کر دیا تو آپ ؐ نے ان کے خلاف جنگی کارروائی کا تہیہ کر لیا۔ غزوۂ تبوک اسی سلسلہ کی ابتداء تھی۔ آنحضرت ؐ کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیراسلامی حکومتوں پر حملہ کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حملے کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچایا۔ (۱)"

دین اسلام کی اس تشریح اور اس کی ماہیت اور دین کے اندر جہاد کی اہمیت کے بارے میں سید مودودی ؒ کے اس بیان کی روشنی میں اور جہاد کے مراحل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی انقلاب کے منہاج اور اس کے تحریکی منصوبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہمارے لئے یہ آسان ہے کہ ہم بدر الکبریٰ کے بارے میں کلام کریں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ وہ یوم الفرقان ہے۔ نیز اس کے بعد ہم سورہ انفال پر ایک طائرنہ نظر بھی ڈال سکتے ہیں جو غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی۔

بدر تحریک جہاد اسلامی کا پہلا قدم نہ تھا ' جیسا کہ ہم نے بتایا۔ اس سے پہلے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کئی سرایا ارسال کر چکے تھے۔ ہاں ان میں ماسوائے ایک کے کسی میں جنگ نہ ہوئی تھی۔ جس سریہ میں جنگ ہوئی تھی وہ سریہ عبداللہ ابن جحش ہے ' جو ماہ رجب میں ہجرت کے سترہ ماہ بعد ہوئی تھی۔ اور تمام سرایا اس پالیسی کے مطابق تھیں جس کے اوپر اسلام کا نظریہ جہاد قائم تھا اور جس کے بارے میں ہم اس سے قبل تفصیلاً بحث کر آئے ہیں۔

---

(۱) (جہاد فی سبیل اللہ – سید مودودی ؒ ص ۳ تا ۴)

یہ تمام سرایا یا چھاپہ مار دستے اہل قریش کے خلاف بھیجے گئے تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دوسرے معزز مسلمانوں کو مکہ سے نکالا تھا اور جنہوں نے بیت اللہ کی حرمت کا بھی پاس نہ رکھا۔ حالانکہ بیت اللہ کی حرمت دور جاہلیت اور دور اسلام دونوں میں قائم تھی۔ البتہ یہ سبب اسلام کے نظریہ جہاد میں کوئی اصولی سبب نہ تھا۔ اسلامی جہاد کا اصل سبب اور مقصد یہ اعلان کرنا تھا کہ کوئی انسان بھی آئندہ کے لئے غیراللہ کا بندہ نہ ہو گا' آئندہ کے لئے سب لوگ صرف اللہ کے بندے ہوں گے۔ ان کا حاکم صرف اللہ ہو گا اور پوری زمین پر اس کی حکومت چلے گی۔ ان تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا جائے گا جو لوگوں کو غلام بناتے ہیں اور عوام الناس کو ان کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے گا اور جزیرۃ العرب میں اہل قریش ہی وہ بڑے طاغوت تھے جو اس راہ میں حائل تھے کہ لوگ آزادانہ طور پر اللہ کی بندگی میں داخل ہوں اور اس کے سوا کسی کے غلام نہ ہوں۔ لہٰذا اسلام کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اس طاغوت کو چیلنج کرے اور یہ چیلنج اس کی عمومی پالیسی کے بالکل مطابق تھا جبکہ ضمناً اس کے نتیجے میں اہل قریش کے اس ظلم اور زیادتی کا بدلہ بھی ہو گیا جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف روا رکھا تھا۔ نیز ضمناً یہ مقصد بھی حاصل ہو گیا کہ اہل قریش دارالاسلام مدینہ کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ جب ہم قریش کے خلاف کارروائی کے ان فوری اسباب کی بات کریں تو ہمارے ذہن میں دین اسلام کا اصل منصوبہ اور اسلام کے نظریہ جہاد کی اصل غرض و غایت بھی موجود رہنا چاہئے۔ اس لئے اسلام کا اصل نظریہ جہاد اس دین کا حتمی تقاضا ہے۔ اصل پالیسی اور غرض و غایت یہ ہے کہ اس کرۂ ارض کے اوپر کوئی طاغوت موجود نہ ہو جو اللہ کے حق بادشاہت کا کوئی حصہ اپنے لئے مخصوص کرتا ہو اور جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی بادشاہت کے سوا کسی اور نظام کا پابند بنا رہا ہو۔

غزوہ بدر کے اصل واقعات کو یہاں ہم تفصیلات کے ساتھ اس لئے دے رہے ہیں کہ سورہ انفال سے پہلے ہمارے مطالعہ کی فضا مکمل طور پر اس جنگی ماحول کے رنگ میں رنگ جائے اور اس مطالعہ میں ہمیں نصوص کا اصل ہدف اچھی طرح معلوم ہو جائے۔ نیز یہ معلوم ہو کہ ان واقعات پر نصوص قرآن نے کیا تبصرہ کیا اور واقعات سے کیا نصیحت اخذ کی گئی ہے۔ اس لئے کہ قرآن کے نصوص کو ہم صرف ڈکشنری اور لغوی مفہوم کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے جب تک پورا بیک گراؤنڈ ہمارے پیش نظر نہ ہو۔ آیات کو سمجھنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ ہم عملاً ان حالات میں داخل ہو کر بس جائیں اور ایسی فضا پیدا کر دیں کہ گویا تحریک اب بھی برپا ہے اور مثبت طور پر کام کر رہی ہے اور آیات ایک عملی اور زندہ صورت حال کے مقابلے میں اتر رہی ہیں۔ اگرچہ ان کے اثرات اس تاریخی صورت حال سے زیادہ گہرے اور دور رس ہیں اور یہ تاریخی صورت حال ہی ہے جو ان آیات کے اندر وسعت اور دور رس مفہوم پیدا کرتی ہے۔ اس کے بعد ان آیات میں انسان کے لئے دائمی راہنمائی پائی جاتی ہے اور وہ ہر دور میں موثر رہتی ہیں۔ لیکن یہ اثرات مرتب تب ہوتے ہیں کہ لوگ عملاً اس دین کے مطابق حرکت کریں اور ان نصوص سے وہ ہدایات اخذ کریں جو وہ لوگ اخذ کرتے تھے جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ اور ان کو ایسے ہی حالات سے سابقہ درپیش ہو جس طرح کے حالات نزول قرآن کے وقت درپیش تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے اسرار ان لوگوں پر نہیں کھلتے جو نکمے بیٹھے ہوتے ہیں اور وہ کسی تحریک کے بجائے محض لغت اور بیان کے ذریعے قرآن کی تشریحات کرتے ہیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ ابوسفیان شام سے قریش کا ایک عظیم قافلہ لے کر واپس آ رہے ہیں۔ اس

قافلے کے ساتھ قریش کے مال اور تجارتی سازوسامان تھا۔تیس یا چالیس قریشی بھی قافلے میں موجود تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مسلم زہری' عاصم ابن عمر ابن قتادہ' عبداللہ ابن ابوبکر' یزید ابن رومان' عروہ ابن الزبیر وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایات نقل کی ہیں۔ان سب نے مجھے واقعات کے بعض حصے بتائے۔بدر کے واقعات کے بارے میں انہوں نے جو بتایا وہ یہ تھا۔

جب حضورؐ کو یہ معلوم ہوا کہ ابوسفیان شام سے ایک بڑا قافلہ لے کر آ رہا ہے تو آپ نے لوگوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اس قافلے پر حملہ کریں۔آپ نے فرمایا"قریش کا یہ قافلہ آ رہا ہے۔اس میں قریش کا سامان ہے۔آپ اس کی طرف بڑھیں شاید اللہ ان اموال سے تمہیں بہرہ مند کر دے۔" لوگوں نے تیاری کی اور اس معاملے میں بعض لوگوں نے چستی دکھائی اور بعض نے کاہلی سے کام لیا' اس لئے کہ ان کو یہ یقین نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زاد المعاد اور امتاع الاسماع میں ہے کہ حضورؐ نے صرف ان لوگوں کو نکلنے کا حکم دیا تھا جن کی سواریاں موجود تھیں۔اور سب لوگوں کے نکلنے کا کوئی اہتمام نہ فرمایا تھا۔ابن قیم فرماتے ہیں کل افراد تین سو دس سے کچھ اوپر تھے۔ان میں سے ۸۶ مہاجر تھے۔اوس کے ۶۱ تھے اور خزرج کے ۱۷۰ تھے۔اوس کی تعداد کم تھی۔اگرچہ وہ خزرج کے مقابلے میں زیادہ' جنگجو اور اہل قوت تھے۔اس لئے کہ ان کی رہائش گاہیں مدینہ کے اردگرد تھیں۔اور قافلے کے لئے نکلنے کا اعلان اچانک ہو گیا تھا اور حضورؐ کا حکم یہ تھا کہ جس کی سواری موجود نہ ہو تو وہ ہمارے ساتھ نہ جائے۔ بعض لوگوں نے یہ عرض کی کہ ان کی سواریاں مدینہ کے مضافات میں ہیں۔اس لئے آپ قدرے تاخیر کر لیں تاکہ وہ سواریاں لے آئیں لیکن حضورؐ نے تاخیر کرنے سے انکار کر دیا۔اس لئے کہ جنگ کرنے کا کوئی مصمم ارادہ نہ تھا۔اور نہ مسلمانوں نے جنگ کے لئے کوئی تیاری کی تھی۔نہ سامان جنگ جمع کیا تھا۔لیکن اللہ کی مرضی یہ تھی کہ مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان قبل از وقت معرکہ ہو جائے۔"

ابوسفیان رئیس قافلہ جب مدینہ کے قریب ہوا تو وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چوکنا تھا۔راستے میں اسے جو سوار بھی ملتے وہ ان سے معلومات حاصل کرتا۔وہ لوگوں کے مال کے بارے میں بہت ہی فکرمند تھا جو اس کی تحویل میں قافلے کے پاس تھے۔راستے میں ملنے والے بعض سواروں سے اسے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو تمہارے اور تمہارے قافلے کے خلاف نکالا ہے۔اس لئے آپ محتاط رہیں۔اس نے ضمضم ابن عمرو غفاری کی خدمات حاصل کیں اور انہیں مکہ کو بھیجا۔اسے حکم دیا کہ وہ مکہ پہنچ کر قریش کو ان کی اس دولت کے بچانے کے لئے نکالے۔اہل مکہ کو اطلاع دیں کہ محمد نے اپنے ساتھیوں کو لے کر ہماری راہ روک لی ہے۔ضمضم ابن عمرو برق رفتاری کے ساتھ مکہ پہنچے۔

علامہ مقریزی امتاع الاسماع میں لکھتے ہیں' اہل مکہ کو تب ہی معلوم ہوا جب ضمضم نے چلا کر کہا:"اے قریش! لوی ابن غالب کے فرزندو! لطیمہ قافلہ کی مدد کو پہنچو (عرب لطیمہ اس قافلے کو کہتے تھے جس میں صرف آرائش و زیبائش کا سامان ہو۔مثلاً خوشبوئیں' کستوری' کپڑے' لیکن اس میں کریانہ اور دوسری کھانے کی چیزیں نہ ہوں۔(یعنی نہایت ہی قیمتی سامان تجارت) محمد کے ساتھیوں نے اس کی راہ روک لی ہے اور مجھے یقین نہیں ہے کہ تم اسے پا سکو۔" یہ اعلان اس نے ایسے حالات میں کیا کہ اس نے اپنی اونٹنی کے کان کاٹ دیئے تھے' اپنی قمیص پھاڑ دی تھی اور اپنے اونٹ کا

کچاوہ الشاکر دیا تھا۔ قریش کے لئے فوراً امداد کے لئے نکلنے کے سوا اب کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ وہ نکلے اور سہل اور دشوار گزار گھاٹیوں سے ہوتے ہوئے انہوں نے صرف تین دنوں میں تیاری مکمل کی۔ بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے صرف دو دن کے اندر تیاری کر لی۔ جو لوگ اصحاب وسائل تھے' انہوں نے ناداروں کی امداد کی' سہیل ابن عمرو' زمعہ ابن الاسود' طعیمہ ابن عدی' حنظلہ ابن ابوسفیان اور عمر ابن ابوسفیان بہت تیز تھے اور لوگوں کو نکلنے کے لئے ابھار رہے تھے۔ ''غالب کی اولاد! تم محمد اور یثرب کے صابیوں کے ہاتھوں اپنے قافلوں اور مالوں کو لٹتا دیکھ سکتے ہو' جو مال چاہتا ہے تو یہ ہے مال' جو سامان چاہتا ہے تو یہ ہے سامان۔'' یہ تھی تقریر سہیل کی۔ اسی سہیل کے بارے میں امیہ ابن الصلت چند مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ نوفل ابن معاویہ الدیلی اہل قریش کے مالداروں کے پاس گیا۔ انہوں نے ان کے اس قافلے کو بچانے کے لئے لشکر کے اخراجات اور ٹرانسپورٹ کے بارے میں بات کی۔ (انہوں نے اخراجات کے لئے ان سے خصوصی چندے کی اپیل کی) یہ ان لوگوں کے لئے جو جانا چاہتے تھے۔ عبداللہ ابن ابو ربیعہ نے کہا ''یہ لو پانچ صد دینار' جہاں چاہو خرچ کرو'' اس نے حویطب ابن عبدالعزی سے دو صد دینار لئے۔ اور تین صد دینار کا اسلحہ اور سواری اس نے فراہم کی۔ اس نے طعیمہ ابن عدی کو بیس اونٹ دیئے اور ان کے خاندان کو بھی امداد دی۔ قریش میں سے جو شخص اس مہم سے پیچھے رہتا تھا وہ اپنی جگہ کسی شخص کو بھیجتا۔ ان لوگوں نے ابولہب کو آمادہ کیا کہ وہ اس مہم پر نکلے مگر اس نے انکار کر دیا۔ اور یہ بھی نہ کیا کہ اپنی جگہ دوسرے کو بھیجے۔ یہ روایت ہے کہ اس نے اپنی جگہ ایک عاص ابن ہشام ابن مغیرہ کو بھیجا۔ عاص پر ان کا قرضہ تھا۔ ابولہب نے کہا تم میری جگہ جاؤ اور تمہارا قرضہ معاف۔ چنانچہ ان کی جگہ عاص گیا۔ شیبہ اور عتبہ پسران ربیعہ کو ان کے غلام عداس نے ملامت کی اور اس مہم پر جانے سے روک دیا (عداس وہ شخص ہے کہ جب حضور ؐ طائف کو گئے اور وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہوئے گاؤں کے اوباش آپ کے پیچھے لگا دیئے اور انہوں نے حضور ؐ پر سنگ باری کر کے آپ کو زخمی کر دیا اور آپ نے عتبہ اور شیبہ کے باغ میں پناہ لی تو اس وقت عتبہ اور شیبہ نے انگوروں کے گچھے عداس کے ہاتھ آپ کے لئے بھیجے۔ عداس حضور ؐ سے بہت ہی متاثر ہوا اور آپ کے ہاتھ اور پاؤں چوم لئے) اس طرح اس غلام نے عاص ابن منبہ ابن الحجاج' ابو امیہ ابن خلف کو بھی اس مہم پر جانے سے روک دیا۔ جب عقبہ ابن ابومعیط اور ابوجہل کو اس کا علم ہوا تو وہ آئے اور انہوں نے عداس کو سخت سست کہا۔ اس پر امیہ ابن خلف نے کہا کہ میرے لیے وادی مکہ کا بہترین اونٹ خریدو۔ چنانچہ اس کے لئے نعیمہ بنی قشیر سے تین صد درہم قیمت کا اونٹ خریدا گیا۔ اور اس جنگ کے بعد وہ مسلمانوں کو مال غنیمت میں ملا۔ حارث ابن عامر سب سے زیادہ بوجھل پاؤں کے ساتھ نکلے۔ ایک شخص ضمضم ابن عمر نے خواب میں دیکھا کہ وادی مکہ کے اوپر سے بھی خون کا سیلاب آیا ہوا ہے اور نیچے سے بھی اور عاتکہ بنت عبدالمطلب نے ایسے خواب دیکھے جن کی تعبیر یہ بنتی تھی کہ قریش کے ہر گھر میں سے کوئی نہ کوئی مارا جائے گا یا زخمی ہو گا۔ اس لئے سمجھدار لوگ اس لشکر پر نکلنے کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس لئے بعض لوگ دوسروں کے پاس گئے بھی۔ چنانچہ سب سے زیادہ سست حارث ابن عامر' امیہ ابن خلف اور عتبہ و شیبہ پسران ربیعہ تھے۔ نیز حکیم ابن حزام اور ابوالبختری ابن ہشام علی ابن امیہ ابن خلف' عاص ابن منبہ۔ ان لوگوں پر ابوجہل نے بہت کام کیا اور آمادہ کیا اور عقبہ ابن ابومعیط' نضر ابن حارث ابن کلدہ نے اس کی امداد کی اور تب جا کر وہ اس لشکر کشی پر آمادہ ہوئے۔ قریش نے اپنے سات گانے والیوں اور گانے بجانے کے سامان بھی لئے جہاں بھی لشکر رکتا یہ لوگ گاتے

بجاتے ' اونٹ ذبح کرتے ' سات سو پچاس افراد لڑنے والے تھے - ان کے پاس سو گھوڑے ' جن پر سازو سامان سے لیس سو افراد تھے - ان کے علاوہ بھی پیدل زرہ پوش بھی تھے - ان کے پاس سات سو اونٹ تھے - ان کے حالات اس طرح تھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا -

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۸:۴۷) "اور دیکھو ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور شان دکھاتے ہوئے نکلے حالانکہ ان کا موقف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ ان کو گھیرے ہوئے ہے -"

اہل قریش کی یہ عظیم جمعیت سوئے مدینہ روانہ ہوئی ' ان کے دل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کے خلاف بغض سے بھرے ہوئے تھے - اس لئے کہ وہ ان کے عظیم قافلے کو لوٹنا چاہتے تھے - اس سے پہلے مسلمان عمرو ابن الحضرمی کے قافلے کو لوٹ چکے تھے (سریہ عبداللہ ابن جحش میں) ابو سفیان جس قافلے کو لے کر آرہا ہے اس کی حفاظت کے لئے ستر آدمی تھے اور ابن اسحاق کی روایت کے مطابق صرف تیس آدمی تھے - ان میں مخرمہ ابن نوفل اور عمرو ابن العاص بھی تھے - قافلہ ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا - اور سب سامان سے لدے ہوئے تھے - جب یہ قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا تو انہیں بہت بڑا خوف دامن گیر ہو گیا - وہ ضمضم اور قریش کے امدادی لشکر کو لیٹ سمجھ کر مایوس ہو گئے - بدر کے قریب ابو سفیان قافلے سے آگے ہو گئے - وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ شاید مسلمان گھات میں بیٹھے ہوں گے - اس نے قافلے کا رخ موڑ دیا - مدینہ کے راستے سے آگے جاکر ساحل کی طرف نکل گیا - بدر کو اپنے بائیں طرف چھوڑ دیا اور بہت ہی تیزی سے اس نے یہ راستہ طے کیا - قریش جب مدینہ کی طرف آئے تو ہر گھات پر گاتے بجاتے اور کھاتے پیتے جاتے تھے - اونٹ ذبح کرتے - ابو سفیان نے اپنا ایک پیغام لانے والا بھیجا یعنی قیس ابن امرالقیس اور قریش کے لشکر کو مشورہ دیا کہ اب وہ واپس آجائیں اور یہ کہ ان کا قافلہ بچ کر نکل آیا ہے ' اس لئے مناسب نہیں ہے کہ تم اہل یثرب کے ہاتھوں قربانی کا بکرا بنو - اپنے آپ کو خواہ مخواہ ذبح نہ کرو - اس لئے کہ قافلے سے زیادہ مزید تمہیں کسی جنگ کی ضرورت نہیں ہے - اس لئے کہ تم قافلے کے بچاؤ اور اپنے اموال کے بچاؤ کے لئے نکلے تھے اور یہ چیزیں اللہ نے بچا دی ہیں - قیس نے بہت کوشش کی مگر قریش نے انکار کر دیا اور اس وقت ان کا لشکر جحفہ پہنچ چکا تھا - ابو جہل نے کہا : "خدا کی قسم ہم ہرگز نہ لوٹیں گے - ہم بدر تک ضرور جائیں گے - تین دن رہیں گے ' اونٹ ذبح کریں گے ' کباب کھائیں گے اور شراب پئیں گے اور گانے والیاں ہم پر گائیں گی اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام عرب ہم سے خائف ہوں گے - قیس واپس ہوا اور اس نے اطلاع دی کہ قریش آگے بڑھ گئے - ابو سفیان چیخا : "اے بدبخت قوم ! یہ ابو جہل کا فیصلہ ہو گا - وہ رئیس قوم ہے ' اس کی یہ سرکشی ' بدشگونی اور کمزوری ہے اور اگر محمد نے اس لشکر کو مار لیا تو ہم ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جائیں گے -"

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ' اخنس ابن شریق ابن عمرو ' ابن وهب ثقفی نے بنی زہرہ سے کہا جبکہ وہ جحفہ میں تھے : "اے بنی زہرہ ' اللہ نے تمہارا مال بچا لیا ہے اور تمہارے سردار مخرمہ ابن نوفل بھی بچ گئے ہیں اور تم لشکر کے ساتھ اس لئے نکلے تھے کہ اسے اور اس کے مال کو بچاؤ ' اس لئے تم اس جنگ میں عدم شمولیت کی بزدلی میرے کھاتے میں

ڈال دو اور واپس ہو جاؤ اس لئے کہ بغیر نقصان کے لشکر کشی کرنا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے اور ابو جہل کی بات نہ سنو۔" یہ لوگ واپس ہو گئے' اس لشکر میں کوئی ایک زہری بھی نہ تھا۔ ان کے علاوہ قریش کا کوئی قبیلہ نہ تھا جس سے لوگ نہ نکلے ہوں' ماسوائے بنی عدی ابن کعب کے جن کے بارے میں آیا ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں گیا (امتاع الاسماع کی روایت یہ ہے کہ طعیمہ ابن عدی نے بیس اونٹوں پر لوگوں کو سوار کیا۔ اور انہیں امداد دی اور گھر کے لئے بھی اخراجات فراہم کئے۔ طالب ابن ابو طالب اور بعض قریش کے درمیان مکالمہ ہوا۔ لوگوں نے کہا کہ اے بنی ہاشم ہمیں یقین ہے کہ اگر تم ہمارے لشکر میں بھی نکلو لیکن تمہاری ہمدردیاں بہرحال حضرت محمد ؐ کے ساتھ ہیں۔ اس پر طالب ابن ابو طالب اپنے آدمیوں کو لے کر مکہ چلے گئے۔

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضور ؐ رمضان شریف کی چند راتوں کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکلے تھے۔ حضور ؐ کے ساتھیوں کے پاس کل ستر اونٹ تھے اور یہ لوگ باری باری ان پر سوار ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت علی اور مرثد ابن ابو مرثد ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ حمزہ ابن عبدالمطلب' زید ابن حارثہ' ابوکبشہ اور انس جو رسول اللہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور عبدالرحمٰن ابن عوف ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔

حضور ؐ تشریف لے گئے۔ جب بدر کے قریب پہنچے تو آپ کو قریش کی لشکر کشی کی اطلاع مل گئی۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکر اٹھے اور بہترین باتیں کیں۔ حضرت عمر اٹھے اور آپ نے بھی بہترین مشورے دیئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ معاملہ قریش کی عزت کا ہے اور قریش کو بھی ذلت اٹھانی نہیں پڑی اور اس نے جب کفر کرنا شروع کیا ہے تو اس نے آج تک تسلیم نہیں کیا اور چونکہ یہ اس کی عزت کا مسئلہ ہے اس لئے وہ کبھی بھی اپنی عزت کے معاملے سے ہاتھ نہ کھینچیں گے۔ قریش خواہ مخواہ آپ سے لڑیں گے اس لئے مناسب ہے کہ ہم جنگ کے لئے تیار ہو جائیں اور وقت ضائع کیے بغیر تیاری شروع کر دیں۔ اس کے بعد مقداد ابن عمرو اٹھے اور کہا :"رسول اللہ! آپ خدا کے حکم کے مطابق آگے بڑھیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور خدا کی قسم ہم وہ بات ہرگز نہ کریں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کی تھی :"جاؤ تم اور تمہارا رب اور لڑو' ہم تو ادھر ہی بیٹھے ہیں۔" ہم تو یہ کہیں گے "جاؤ تم اور تمہارے رب اور لڑو اور ہم تمہارے لڑنے والوں میں سے ہیں۔ خدا کی قسم آپ اگر ہمیں برک الغماد تک لے جائیں تو ہم پھر بھی جانے کے لئے تیار ہیں۔ (برک الغماد یمن کے ساحل پر جگہ ہے) حضور ؐ نے اسے بہت شاباش دی اور ان کے لئے دعا کی۔ اس کے بعد آپ نے پھر لوگوں سے کہا کہ براہ کرم اپنی ضمیر کی بات ظاہر کرو۔ آپ کا اشارہ انصار کی طرف تھا۔ آپ کا خیال یہ تھا کہ شاید انصار اس جنگ میں حصہ نہ لیں اس لئے کہ انصار نے جو معاہدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ حضور کی مدافعت اس حد تک جس حد تک وہ اپنی اولاد اور مال کی مدافعت کرتے تھے کریں گے یعنی مدینہ کے اندر اندر۔ یعنی بیعت عقبہ ثانیہ میں جب انہوں نے حضور ؐ کے ساتھ معاہدہ کیا تو اس کے الفاظ میں یہ بات تھی جس کی اساس پر آپ نے ہجرت فرمائی تھی۔ اس دعوت پر حضرت سعد ابن معاذ تھے۔ انہوں نے کہا حضور ؐ انصار کی طرف سے میں جواب دیتا ہوں۔ حضور ؐ آپ گویا ہم سے مشورہ چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں میری مراد تم سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ کسی ایسے معاملے میں نکل پڑے ہیں جس کے بارے میں شاید آپ کو بذریعہ وحی ہدایت نہیں ہوئی یا

وحی کسی دوسرے معاملے میں آئی تھی (یعنی آپ ایسے معاملے کے لئے نکل گئے ہیں جس کے متعلق وحی نہ تھی اور وحی دوسرے معاملے کے بارے میں تھی 'یعنی آپ قافلے کی غرض سے نکلے تھے' اب معاملہ لشکر کا ہے) ہم تو آپ پر ایمان لائے ہیں 'آپ کی تصدیق کی ہے اور آپ پر جو کلام اترا ہے اس کی شہادت دی ہے کہ وہ حق ہے۔ ہم نے آپ کے ساتھ پختہ وعدے کئے ہیں اور ہم نے یہ پیمان باندھا ہے کہ ہم سمع و اطاعت کریں گے حتی المقدور۔ اس لئے آپ جو چاہتے ہیں 'کر گزریں۔ خدا کی قسم اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ اس سمندر میں کود پڑو تو ہم کود پڑیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص بھی پیچھے نہ رہے گا۔ آپ جس کے ساتھ چاہیں جڑیں 'جس کے ساتھ چاہیں قطع تعلق کریں' ہماری دولت حاضر ہے۔ اس میں سے جو چاہیں لیں اور ہمارے مال سے آپ جو چیز لیں گے' وہ ہمیں اس سے زیادہ محبوب ہوگی جو آپ چھوڑیں گے۔ اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے 'میں اس راہ پر کبھی نہیں آیا اور نہ میں اس کے بارے میں زیادہ علم رکھتا ہوں۔ ہم اس بات کو ناپسند نہیں کرتے کہ کل ہم اپنے دشمن کے ساتھ ٹکرا جائیں۔ ہم ایسے لوگ ہیں کہ جنگ میں صبر کرنے والے ہیں۔ سچی لڑائی لڑتے ہیں 'ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ذریعہ آپ کو ایسی باتیں دکھائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ سعد ابن معاذ ؓ نے فرمایا: ہم مدینہ میں بعض ایسے لوگوں کو چھوڑ آئے ہیں جو حقیقتاً ہم سے آپ کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور ہم سے زیادہ وہ آپ کے مطیع فرمان ہیں۔ لیکن وہ لوگ اس لئے نہیں آئے کہ انہوں نے سمجھا کہ شاید آپ کی مڈبھیڑ قافلے سے ہوگی۔ ہم آپ کے لئے ایک چبوترہ بناتے ہیں۔ آپ اس میں ٹھہریں گے اور ہم آپ کے پاس آپ کی سواریوں کو تیار رکھیں گے اور اس کے بعد ہم دشمن سے لڑیں گے۔

اگر اللہ نے ہمیں غالب کر دیا اور عزت بخشی تو یہ تو ہماری پسندیدہ مراد ہوگی اور اگر ہم کسی دوسرے انجام سے دوچار ہو گئے تو آپ سواری پر بیٹھ کر مدینہ پہنچ جائیں گے اور پیچھے آنے والوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ حضور ؐ نے آپ کے لئے دعائے خیر کی اور فرمایا: "سعد' اللہ تعالیٰ اس سے بھی کوئی اچھا فیصلہ کر دے گا۔" جب سعد مشورہ سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ ان دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے اور خدا کی قسم میں ان لوگوں کے مقامات قتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔" لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بس اب ان کو جنگ کرنی ہوگی۔ اور یہ کہ قافلہ جا چکا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں فتح کی امید پیدا ہو گئی کیونکہ حضور ؐ کے کلام میں اس کی طرف اشارہ تھا۔ آج حضور ؐ نے جھنڈے بلند کئے۔ تین جھنڈے بلند کئے گئے۔ ایک جھنڈا مصعب ابن عمیر کے ہاتھ میں تھا' دو سیاہ جھنڈے تھے ایک علی کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا انصار میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں تھا۔ (سعد بن معاذ تھے) آپ نے اسلحہ ظاہر کر دیا۔ آپ جب مدینہ سے نکلے تھے تو اس وقت جھنڈے بلند نہ کئے گئے تھے۔

حضور ؐ میدان بدر کے نچلے حصے میں جمعہ کے دن پہنچے۔ رمضان شریف کے سترہ دن گزر چکے تھے۔ آپ نے حضرت علی' حضرت زبیر' سعد ابن ابی وقاص اور ---- ابن عمر رضی اللہ عنہم کو پانی کی تلاش میں بھیجا۔ آپ نے ایک چھوٹی سی پتھریلی پہاڑی کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا شاید تم اس پہاڑی کے پاس موجود کنویں پر کچھ خبریں پاؤ گے۔ جب یہ لوگ اس کنویں پر پہنچے تو وہاں انہوں نے قریش کے پانی بردار اونٹ اور سقے پائے اور پکڑ لیا۔ عام لوگ بھاگ گئے اور ان میں ایک شخص عجیر تھا۔ وہ اپنے کیمپ میں پہنچا اور اطلاع دی کہ ابن ابی کبشہ کے بیٹے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

قریب ہی موجود ہیں اور انہوں نے تمہارے پانی بردار اونٹ پکڑ لئے ہیں۔ فوج کے اندر بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے اس واقعے کو اپنے لئے فال بد سمجھا۔ آسمان سے بارش ہو رہی تھی۔ اس رات کو مسلمانوں نے عبیدہ ابن سعید ابن العاص کے غلام کو پکڑ لیا۔ منبہ ابن الحجاج اور ابو رافع امیہ ابن خلف کے غلام اسلام لے آئے۔ وہ حضور ؐ کے سامنے پیش کئے گئے۔ اس وقت آپ ؐ نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو قریش کے سقے ہیں اور ان کے لئے پانی لے جا رہے تھے۔ مسلمانوں نے ان کی اس اطلاع کو برا سمجھا اور انہیں پیٹنا شروع کر دیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم ابو سفیان کے ساتھی ہیں اور قافلے کے لوگ ہیں۔ اس پر مسلمانوں نے انہیں پیٹنا بند کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا اور فرمایا "اگر یہ لوگ تم سے سچ کہیں تو تم انہیں مارتے ہو اور اگر جھوٹ کہیں تو تم مارنے سے رک جاتے ہو۔"

اس کے بعد آپ ؐ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے بتایا کہ قریش اس ٹیلے کے پیچھے ہیں اور یہ کہ وہ کسی ایک دن دس اور ایک دن نو ذبح کرتے ہیں۔ انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا جو مکہ سے آئے تھے تو حضور ؐ نے فرمایا کہ لشکر نو سو اور ہزار کے درمیان ہے اور اس کے بعد فرمایا: "مکہ نے تمہارے لئے اپنے جگر گوشوں کو جمع کر دیا ہے۔"

آپ نے اپنی قیام گاہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا۔ حباب ابن منذر ابن جموح نے عرض کی کہ حضور ؐ آپ ہمیں قریش کے مقابلے میں نچلے کنویں کے پاس لے جائیں۔ میں اس کنویں اور اس کے محل وقوع کو خوب جانتا ہوں۔ یہ پرانا کنواں ہے اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کا پانی بے حد میٹھا ہے۔ اس کا پانی بہت ہی زیادہ ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ہم اس چشمے پر حوض بنا دیں گے اور اس میں برتن ڈال کر پانی نکال سکیں گے۔ دشمن کے ساتھ جنگ کریں گے۔ اور دوسرے لوگوں کو ہم اس کنویں سے روکیں گے۔ اس پر آپ ؐ نے کہا: حباب تو نے بہترین رائے دی۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے جو روایت نقل کی ہے کہ حباب ابن منذر نے کہا کہ حضور ؐ جس جگہ آپ ؐ نے پڑاؤ ڈالا ہے کیا یہ جگہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے منتخب کی ہے؟ جس سے ہم لوگ آگے پیچھے نہیں ہٹ سکتے یا یہ بات ہماری رائے' جنگ اور جنگی تدابیر کا معاملہ ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا: یہ تو رائے' جنگ اور جنگی تدابیر کا معاملہ ہے۔ تو اس پر حباب نے کہا کہ یا رسول اللہ پھر میں کہوں گا کہ یہ مناسب جگہ نہیں ہے اور اس کے بعد انہوں نے مذکورہ بالا مشورہ دیا۔ چنانچہ حضور ؐ وہاں سے چلے اور بدر کے کنویں پر قیام کیا۔ اس رات حضور ؐ ایک کٹے ہوئے درخت کی منڈی کی طرف نماز پڑھتے رہے (یعنی جب درخت کاٹتے ہیں تو اس کے نچلے حصے سے جو اپنی جگہ رہ جاتا ہے) یہ رمضان المبارک کی سترہویں اور جمعے کی رات تھی۔ آپ ؐ نے حباب ابن منذر کے مشورے کے مطابق انتظام فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بارش شروع ہوگئی اور ریگستانی زمین تر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا اور قریش ایسی مصیبت میں گرفتار ہوگئے کہ ان کے لئے اس سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے کہ ان کے درمیان ریت کا ایک ٹیلہ تھا۔ چنانچہ یہ بارش مسلمانوں کے لئے رحمت بن کر آئی اور مشرکین کے لئے مصیبت بن گئی۔ پھر اس رات اللہ کی جانب سے مسلمانوں پر خوشگوار نیند نازل ہوئی اور وہ خوب سوئے۔ مثلاً وہ بیٹھے ہوئے ہوتے تو ان کا سر اپنے سینے پر جھک جاتا اور اسے پتہ بھی نہ ہوتا کہ وہ کروٹ لے کر مزے سے سو رہا ہوتا۔ ایک شخص رافع ابن واقع ابن مالک تو اس قدر سوئے کہ انہیں احتلام ہو گیا اور رات کے آخری حصہ میں انہوں نے غسل فرمایا۔ حضور ؐ نے عمار ابن یاسر اور عبداللہ ابن مسعود

کو بھیجا تاکہ وہ دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ انہوں نے دشمن کی قیام گاہ کے گرد چکر لگایا اور واپس آکر حضور ؐ کو یہ رپورٹ دی کہ دشمن بہت پریشان حال ہے اور یہ کہ بارش ان پر خوب برس رہی ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنویں پر اترے تو آپ کے لئے ایک چبوترہ بنایا گیا' کھجور کی شاخوں سے۔ اور حضرت سعد ابن معاذ اپنی تلوار سونت کر اس کے دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ حضور ؐ نے میدان جنگ میں گشت کیا۔ اور آپ نے اپنے ساتھیوں کو قریش کے سرداروں میں سے ایک ایک کی قتل گاہ بتائی۔ آپ فرماتے یہاں فلاں قتل ہو گا' یہاں فلاں قتل ہو گا' یہ سب قتل ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی حضور اکرم ؐ کی مقرر کردہ جگہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ آپ ؐ نے مسلمانوں کی صفوں کو درست کیا اور اپنے چبوترے کی طرف لوٹے۔ آپ کے ساتھ صرف حضرت ابوبکر تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں' قریش ساری رات سفر کرتے رہے اور صبح کے وقت مقابلے پر آگئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو دیکھا تو آپ نے اس ٹیلے سے منہ پھیر کر آپنا چہرہ وادی کی طرف موڑ دیا اور اس وقت آپ نے یہ دعا فرمائی "اے اللہ یہ ہے قبیلہ قریش جو نہایت ہی کبرو غرور کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا ہے اور یہ تیری دشمنی میں آیا ہے' اور تیرے رسول کی تکذیب کر رہا ہے۔ آج میں تیری اس امداد کا طلبگار ہوں جس کا تو نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ اے اللہ کل انہیں پیس کر رکھ دیجئے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہہ رہے تھے۔ آپ کی نظر عتبہ ابن ربیعہ پر پڑی جو سرخ اونٹ پر سوار تھے۔ وہ قریش کے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا اگر اہل قریش میں سے کسی کے ہاں کوئی بھلائی ہو سکتی ہے تو صرف سرخ اونٹ والے سوار کے ہاں ہو سکتی ہے۔

حفاف ابن ایما ابن رحضہ الغفاری نے یا اس کے باپ ایما نے اہل قریش کو اپنے بیٹے کے ہاتھ کچھ مویشی برائے ذبح بھیجے۔ اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی دیا کہ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اسلحہ اور افراد کی امداد بھی دے سکتے ہیں۔ قریش نے اس کے بیٹے کے ذریعے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تو نے صلہ رحمی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور تم پر جو حق تھا وہ تم نے ادا کر دیا ہے اور کہا خدا کی قسم اگر ہم انسانوں سے لڑنے نکلے ہیں تو انسانوں کے مقابلے میں ہم اپنے اندر کوئی کمزوری نہیں محسوس کرتے۔ اور اگر ہماری یہ جنگ خدا کے خلاف ہے جس طرح محمد سمجھتے ہیں تو خدا کے مقابلے میں کسی کی کوئی طاقت نہیں ہے۔

جب لوگ اپنی منزل پر اترے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ حوض پر کچھ لوگ پانی لینے آئے۔ ان میں حکیم ابن حزام بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں پانی پینے دو۔" غرض اس حوض سے جس نے بھی پانی پیا۔ وہ مارا گیا ماسوائے حکیم ابن حزام کے' یہ بعد میں مسلمان ہوگئے اور بہت اچھے مسلمان بنے اور جب حلف اٹھاتے اور بہت تاکید کرتے تو کہتے اس خدا کی قسم جس نے مجھے بدر کے دن نجات دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: مجھے ابو اسحاق ابن یسار حجی انصار کے دوسرے اکابر نے بتایا کہ جب اہل قریش نے اطمینان سے پڑاؤ کر لیا تو انہوں نے عمر ابن وہب جحی کو بھیجا کہ وہ اصحاب محمد کا اندازہ لگا کر بتائیں کہ اسلامی لشکر کی کوئی خفیہ فوج بھی ہے یا کوئی امدادی فوج ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ دو بار وادی میں دور تک گیا۔ اسے کچھ نظر نہ آیا اور واپس آکر رپورٹ دی کہ مجھے کچھ سراغ نہیں ملا۔ لیکن اے اہل قریش میں ایک ایسی مصیبت دیکھ رہا ہوں جس میں بہت لوگوں کی موت ہے۔ یثرب کے ترنج میں موت واضح طور پر نظر آرہی ہے۔ ہمارا مقابلہ ایسی قوم سے ہے جن کا دفاع اور جن کا قلعہ صرف ان کی تلواریں ہیں۔ خدا کی قسم میں یہ نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کوئی شخص مارا جائے گا الا یہ کہ وہ ہم سے ایک

آدمی کو قتل کر دے ۔ اگر وہ اپنی تعداد جتنے لوگ بھی ہم سے مار لیں تو ہمارے لئے زندہ رہنے میں کوئی مزہ نہ ہو گا۔ اس لئے مناسب ہے کہ آپ لوگ اس جنگ کے بارے میں سوچ لیں ۔

جب حکیم ابن حزام نے یہ باتیں سنیں تو وہ لوگوں میں گھوما اور اس نے سب سے پہلے عتبہ ابن ربیعہ سے ملاقات کی ۔ اس نے کہا :''اے ابو الولید ! تم قریش کے معمر بزرگ اور سردار ہو اور اس میں تمہاری بات بھی چلتی ہے ۔ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ تمہاری ایک بھلائی کو قوم قیامت تک یاد رکھے ۔'' اس نے کہا''حکیم وہ کیا بھلائی ہے ۔'' حکیم نے کہا بھلائی یہ ہے کہ تم لوگوں کو لے کر واپس ہو جاؤ ۔ اور تمہارے حلیف عمرو ابن الحضرمی کا معاملہ تمہارے اوپر عائد ہو ۔ اس نے جواب دیا مجھے یہ منظور ہے ۔ تم اس پر میرے گواہ ہو ۔ وہ میرا حلیف ہے' اس لئے اس کی دیت میرے ذمہ ہو گی ۔ (یعنی اس کے بھائی کی دیت جو مسلمانوں کے ہاتھوں عبداللہ ابن جحش کے سریہ میں مارا گیا تھا) نیز مسلمانوں نے اس سے جو مال لیا تھا وہ بھی میرے ذمہ ہے ۔ لیکن مناسب ہے کہ تم نے حنظیہ کے بیٹے کے پاس جاؤ کیونکہ مجھے یہ ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر اختلافات پیدا ہو جائیں گے ۔ اس سے ان کی مراد ابو جہل سے تھی ۔ اس کے بعد عتبہ ابن ربیعہ نے ایک تقریر کی ۔

''اے اہل قریش خدا کی قسم تم محمد اور اصحاب محمد سے کیا لو گے 'اگر تم نے انہیں قتل کر دیا تو تم سے کوئی شخص پسند نہ کرے گا کہ وہ مقتول کو دیکھے اس لئے کہ اس کا مقتول یا اس کا چچازاد ہو گا یا خالہ زاد ہو گا یا اس کے خاندان میں سے کوئی ہو گا ۔ لہذا مناسب یہ ہے کہ تم لوگ لوٹ جاؤ اور محمد اور تمام عربوں کو مقابلہ کرنے دو ۔ اگر عربوں نے اسے قتل کر دیا تو تمہاری مراد پوری ہوئی اور اگر اس کے سوا کوئی اور صورت حال ہو تو تم اسے اس حال میں ملو گے کہ تم نے اس کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا ہو گا ۔

اس تقریر کے بعد میں ابو جہل کے پاس آیا ۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی زرہ تھیلے سے نکالی ہوئی ہے اور اسے وہ تیار کر رہا ہے ۔ میں نے اسے کہا اے ابو الحکم مجھے عتبہ نے آپ کے پاس یہ تجاویز دے کر بھیجا ہے ۔ اس نے جواب دیا کہ محمد اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے ہیں 'ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ خدا کی قسم ہم ہرگز واپس نہ ہوں گے 'جب تک کہ اللہ ہمارے اور محمد کے درمیان فیصلہ نہیں کر دیتا اور عتبہ جو باتیں کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دیکھ لیا ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی جانور ذبح کر کے کھا کر رہے اور ان میں ان کے بیٹے ابو حذیفہ بھی ہیں جو مسلمان ہو گئے اور عتبہ کو ڈر ہے کہ لشکر قریش کے ہاتھوں وہ قتل نہ ہو جائیں ۔

اس کے بعد اس نے عامر الحضرمی کو یہ پیغام بھیجا کہ دیکھو عتبہ تمہارا حلیف ہے اور وہ لوگوں کو لے کر واپس جانا چاہتا ہے حالانکہ تم نے اپنے شکار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے' اس لئے آپ اٹھیں اور اپنے عہد کا واسطہ دلائیں اور لوگوں کو یاد دلائیں کہ تمہارے بھائی قتل ہو چکے ہیں ۔ اس پر عامر الحضرمی اٹھا اور اپنے آپ کو ننگا کر کے چلایا'' اے عمر' اب جنگ شروع ہو گئی اور لوگوں کے درمیان معرکہ تیز ہونے لگا' اور انہوں نے جس فتنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اس پر پرعزم ہو گئے اور لوگوں کے ذہنوں سے وہ بات نکل گئی جس کی طرف عتبہ لوگوں کو بلا رہے تھے ۔ جب عتبہ کو معلوم ہوا کہ ابو جہل یہ باتیں کرتا ہے تو اس نے کہا کہ عنقریب اس کے چوتڑوں کی زردی کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کے اوسان خطا ہو گئے ہیں ۔ میرے یا اس کے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اسود ابن عبد الاسد مخزومی ایک نہایت ہی جری اور بد مزاج شخص تھے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم میں ان کے حوض سے پانی پیوں گا یا اسے منہدم کر دوں گا اور یا اس حوض کے پاس قتل ہو جاؤں گا۔ جب وہ نکلا تو حمزہ ابن عبد المطلب اس کی طرف بڑھے۔ جب حضرت حمزہ نے اس پر وار کیا تو اس کی ایک ٹانگ کو اڑا دیا۔ یہ اس وقت حوض کے قریب تھے۔ وہ پشت کی جانب پر گر پڑے اور اس کی ٹانگ سے خون کے فوارے اپنے ساتھیوں کی جانب چھوٹ رہے تھے لیکن وہ پیٹ کے بل حوض کی طرف بڑھا اور حوض میں گھس گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس نے اپنی قسم پوری کر دی ہے، لیکن حضرت حمزہ نے اس کا پیچھا کیا اور ایک ہی وار کر کے اسے حوض کے اندر قتل کر دیا۔

اس کے بعد عتبہ ابن ربیعہ نکلے، اس کے ساتھ اس کے بھائی شیبہ اور بیٹا ولد ابن عتبہ بھی تھے۔ جب یہ لوگ اپنی صف سے جدا ہوئے تو انہوں نے دعوت مبارزت دی۔ ان کے مقابلے میں انصار میں سے تین نوجوان آگے بڑھے جن کے نام عوف، معوذ پسران حارث جن کی والدہ عفرا تھی اور ایک شخص دوسرا تھا۔ یعنی عبداللہ ابن رواحہ۔ عتبہ کے گروپ نے کہا کہ تم کون ہو؟ تو انہوں نے کہا ہم انصاری ہیں۔ اس پر عتبہ نے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی کام نہیں ہے۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ عتبہ نے ان انصاری حضرات سے کہا کہ تم ہمارے معزز ہم پلہ ہو لیکن ہمارا مقصد اپنے بھائیوں سے لڑنا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے آواز دی اے محمد تم ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کے ہم پلہ لوگوں کو سامنے لاؤ۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا: ”عبیدہ ابن الحارث، حمزہ اور علی تم نکلو۔“ جب یہ لوگ نکلے اور عتبہ گروپ کے قریب گئے تو انہوں نے یہی سوال کیا تم کون ہو؟ عبیدہ نے کہا میں عبیدہ ہوں، حمزہ نے کہا میں حمزہ ہوں۔ اور علی نے کہا میں علی ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا ہاں تم معزز ہم پلہ ہو۔ عبیدہ نے جو سن رسیدہ تھے عتبہ ابن ربیعہ کو دعوت مبارزت دی اور حمزہ نے شیبہ ابن ربیعہ کو اور حضرت علی ؓ نے ولید ابن عتبہ کو۔ حمزہ نے تو شیبہ کو ایک وار ہی میں ختم کر دیا۔ اور علی نے ولید کو ایک ہی وار میں قتل کر دیا۔ عبیدہ اور عتبہ کے درمیان دو دو وار ہوئے اور دونوں نے ایک دوسرے کو ایسا زخمی کر دیا کہ جگہ سے حرکت ممکن نہ رہی۔ لیکن حضرت علی اور حضرت حمزہ عتبہ کی طرف لوٹے اور اس کا کام تمام کر کے اپنے ساتھی کو اٹھا کر اپنے کیمپ میں لے گئے۔

اب لوگ آگے بڑھے اور جنگ شروع ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس وقت تک حملہ نہ کریں جب تک آپ انہیں حکم نہ دیں۔ اور اگر وہ لوگ حملہ آور ہوں تو نیزوں کے ذریعہ مدافعت کریں۔ اس کے بعد حضور ؐ نے صفیں درست کیں اور آپ اپنے چبوترے کی طرف لوٹ گئے۔ آپ اندر گئے اور اس وقت آپ کے ساتھ صرف ابوبکر تھے اور کوئی نہ تھا۔ حضور ؐ اپنے رب کو پکار رہے تھے اور وہ وعدہ یاد دلا رہے تھے جو آپ کے ساتھ نصرت کے بارے میں ہوا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ آپ نے اس پکار کے موقعہ پر یہ باتیں کہیں۔ ”اے اللہ! اگر یہ مٹھی بھر لوگ آج قتل ہو گئے تو تیری بندگی کبھی نہ ہو گی۔“ حضرت ابوبکر فرما رہے تھے۔ آپ اپنی دعا کو کم کر دیں۔ اللہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔

امتاع الاسماع مصنفہ مقریزی میں ہے کہ عبداللہ ابن رواحہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حضور ؐ میں آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں حالانکہ آپ ؐ کو کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہ اللہ کو اس کے وعدوں کی یاد دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔ تو آپ ؐ نے فرمایا ابن رواحہ، کیا میں اللہ تعالیٰ کو وعدہ یاد نہ دلاؤں۔ اللہ تو وعدہ پورا کرنے

والے ہیں کبھی خلاف نہیں کرتے۔

ابن اسحاق نے کہا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چبوترے میں تھے تو آپ کو قدرے اونگھ نے آلیا۔ جب آپ جاگے تو فرمایا: "ابوبکر مبارک ہو، اللہ کی مدد آگئی۔ یہ ہیں جبرئیل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے چلے آرہے ہیں اور اس کی دونوں جانب غبار اٹھ رہا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام مہجع کو ایک تیر لگا اور وہ شہید ہو گیا۔ یہ مسلمانوں میں سے پہلا مقتول تھا۔ اس کے بعد حارثہ ابن سراقہ نے بنی عدی ابن نجار کے ایک شخص کو تیر مارا اور اسے ہلاک کر دیا۔ یہ شخص حوض سے پانی پی رہے تھے۔ نیز اس شخص کی گردن میں لگا اور وہ شہید ہو گیا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم چبوترے سے نکلے اور آپ نے لوگوں کو جنگ کرنے پر اکسایا۔ آپ نے فرمایا: "خدا کی قسم آج جو شخص بھی صبر، تحمل سے فی سبیل اللہ لڑا اور وہ آگے ہی بڑھتا رہا اور پیٹھ نہ پھیری وہ لازماً جنت میں داخل ہو گا۔"

ایک شخص عمر ابن الہمام بنی سلمہ کے بھائی تھے جو اس وقت کھجوریں کھا رہے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سنی اور کہا بہت خوب! حضور ؐ کیا میرے اور جنت کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر دیں؟ اس کے بعد اس نے وہ کھجوریں پھینک دیں۔ تلوار لی اور خوب لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔

ابن اسحاق نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص عوف ابن الحارث نے "جو عفرا" کا بیٹا تھا، نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ اپنے بندے کے کس فعل پر ہنس دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ اس بات سے ہنس پڑتا ہے کہ ایک شخص کے جسم پر زرہ بھی نہ ہو اور وہ تلوار لے کر دشمن کی صفوں میں گھس جائے۔" چنانچہ اس نے جو زرہ پہنی ہوئی تھی اسے اتار پھینکا۔ اس کے بعد تلوار لی اور دشمن کی صفوں میں گھس گیا اور اس قدر لڑا کہ شہید ہوا۔

ابن اسحاق نے زہری سے ایک روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو ابوجہل نے کہا، اے اللہ ہم سے جو قطع رحمی کرنے والا ہو اور ایسے کام کرنے والا ہو جو معروف نہ ہوں تو کل اسے شکست دے دے، چنانچہ اس کی دعا قبول ہوئی۔

ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی ریت لی اور اسے قریش کی طرف پھینکا اور فرمایا شاہت الوجوہ اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ زور لگاؤ اور اس کے بعد مخالفین کو شکست ہوئی اور قریش کے سرداروں میں سے اکثر مارے گئے اور باقی گرفتار ہوئے۔

جب لوگوں نے قتل سے ہاتھ کھینچ لئے اور لوگوں کو گرفتار کرنے لگے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سعد ابن معاذ کے چہرے پر کراہت کے آثار نظر آتے ہیں کیونکہ لوگ مخالفین کو قتل کرنے کے بجائے گرفتار کر رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخاطب کر کے کہا "خدا کی قسم اور شاید تم لوگوں کی اس حرکت کو ناپسند کرتے ہو۔" اس نے کہا ہاں جناب میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ یہ پہلا معرکہ ہے جس میں کفر و اسلام کا تصادم ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معرکے میں دشمن کا پوری طرح کچل دینا ہمارے لئے اس سے بہتر تھا کہ ہم انہیں گرفتار کرتے۔"

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس کی ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو

یہ حکم دیا تھا کہ بنی ہاشم میں سے بعض لوگ مجبوراً اس لشکر میں آئے ہیں اور وہ ہمارے خلاف لڑنا نہیں چاہتے ۔ اس لئے تم میں سے جو شخص بنی ہاشم میں سے کسی کے سامنے آئے تو انہیں قتل نہ کرے ۔ اور جو شخص ابو البختری ابن ہشام ابن الحارث ابن اسد کو پائے اسے بھی قتل نہ کرے ۔ اور جو شخص عباس ابن عبد المطلب کو پائے اسے بھی قتل نہ کرے ۔ کیونکہ حضرت عباس مجبور الشکر کے ساتھ آگئے ہیں ۔ اس پر ابو حذیفہ ابن عتبہ ابن ربیعہ نے کہا (یہ مسلمان تھے) "کیا ہم اپنے باپوں' بھائیوں اور بیٹوں اور خاندان کو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں ۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے ملا تو اسے مزہ چکھاؤں گا ۔" تو یہ بات حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی تو آپ نے حضرت عمر ابن الخطاب سے کہ "اے ابو حفص ' (اور یہ پہلا دن تھا کہ حضور ؐ نے مجھے اس کنیت کے ساتھ خطاب فرمایا) "کیا رسول اللہ کے چچا کے چہرے کو تلوار سے مارا جائے گا ۔" اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول خدا ؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن کو اڑا دوں ۔ خدا کی قسم یہ منافق ہے ۔" اس گفتگو کے بعد ابو حذیفہ کہا کرتے تھے کہ اس وقت میں نے جو بات کی میں آج تک اس سے ڈرتا ہوں اور میں ہمیشہ اس سے ڈرتا رہوں گا ۔ الا یہ کہ شہادت پاکر میں اس کا کفارہ ادا کروں ۔ بعد میں ابو حذیفہ مرتدین کے ساتھ جنگ میں یوم الیمامہ میں شہید ہوئے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضور نے ابو البختری کے قتل سے اس لئے روکا تھا کہ جب آپ مکہ میں تھے تو وہ لوگوں کو آپ ؐ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے سے روکتا تھا ۔ وہ حضور ؐ کو اذیت دینے والوں سے بچاتا تھا اور اس کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسی بات نہ سنی تھی جو آپ کے لئے موجب اذیت ہوتی ۔ اور قریش نے بنی ہاشم کے ساتھ بائیکاٹ کا جو معاہدہ لکھا تھا اس کے توڑنے والوں میں وہ بھی تھا ۔ لیکن اس دن وہ اس لئے مارا گیا کہ اس نے قیدی بننے سے انکار کر دیا ۔

ابن اسحاق نے یحییٰ ابن عباد سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ان کے والد نے کہا کہ امیہ ابن خلف میرا دوست تھا ۔ اور میرا نام جاہلیت میں عبد عمرو تھا ۔ میں نے جب اسلام قبول کیا تو نام عبد الرحمٰن رکھ لیا ۔ اس وقت ہم مکہ میں تھے ۔ امیہ مجھے کہتا عبد عمرو تو نے اپنے اس نام کو چھوڑ دیا جس کے ساتھ تمہارے باپ نے تجھے موسوم کیا تھا ۔ میں کہتا ہاں ۔ اس نے کہا میں رحمٰن کو نہیں جانتا اس لئے تم میرے لئے آپس کا کوئی نام تجویز کر دو تاکہ میں تمہیں اس کے ساتھ پکاروں ۔ اس لئے کہ تم پہلے نام کے ساتھ پکارنے کا جواب نہیں دیتے اور میں دوسرا نام نہیں لیتا جسے میں جانتا نہیں ہوں ۔ جب وہ مجھے عبد عمرو کہتا' میں جواب نہ دیتا ۔ میں نے اسے کہا کہ تم ہی کوئی نام رکھ دو' چنانچہ اس نے میرا نام عبد الالہ رکھ دیا ۔ اور جب ہم ملتے تو وہ مجھے عبد الالہ کہتا اور ہم باتیں کرتے ۔ بدر کے دن میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے علی ابن امیہ کے ساتھ کھڑا ہے ۔ اور میں بعض زرہیں اٹھاکر جارہا ہوں جو میں نے جنگ کے بعد لوٹ لی تھیں ۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس نے کہا اے عبد عمرو' تو میں نے جواب نہ دیا ۔ اس پر اس نے کہا اے عبد الالہ تو میں نے کہا' ہاں ۔ کیا تمہیں ہمارے اندر کوئی دلچسپی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں میں تمہارے لئے ان زروں سے زیادہ مفید رہوں گا جو تو نے اٹھا رکھی ہیں ۔ میں نے کہا' ہاں ۔ تو انہوں نے کہا کہ میں نے زرہیں پھینک دیں ۔ اور ان دونوں کو میں نے ہاتھ سے پکڑ لیا اور دونوں کو قیدی بنا لیا ۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ایسا دن کبھی نہیں دیکھا ۔ کیا تمہیں دودھ کی ضرورت نہیں ہے ۔ یعنی مجھے جس نے قید بنایا تو میں اسے دودھ دینے والی اونٹنیاں فدیہ میں دوں گا ۔ میں انہیں لے کر کیمپ میں چلا گیا ۔

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمٰن ابن عوف نے بتایا کہ مجھے امیہ ابن خلف نے کہا' اس وقت میں اس

کے اور اس کے بیٹے کے درمیان تھا اور میں نے دونوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے - اے عبدالالہ' تم میں سے وہ شخص کون تھا جس نے اپنے سینے پر شتر مرغ کے پر لگا رکھے تھے؟ کہتے ہیں' میں نے کہا کہ وہ حمزہ ابن عبدالمطلب ہے - اس نے کہا کہ اس شخص نے ہمارے خلاف سخت کارہائے نمایاں کئے -

عبدالرحمن کہتے ہیں 'خدا کی قسم میں ان لوگوں کو لے کر جا رہا تھا کہ اچانک اسے حضرت بلال نے میرے ساتھ دیکھ لیا - اور یہ وہی شخص تھا جو حضرت بلال کو اذیت دیتا تھا اور مکہ میں اسے ترک اسلام پر مجبور کیا کرتا تھا - وہ اسے مکہ کے ریگستان کی طرف لے جاتا - جب یہ ریت گرم ہوتی' تو یہ شخص انہیں الٹے لیٹاتا اور اس کے بعد ان کے سینے پر بڑا پتھر رکھ دیتا اور اس کے بعد کہتا کہ تم اسی طرح پڑے رہو گے الا یہ کہ تم دین محمد ؐ کو چھوڑ نہ دو - اور بلال کہتے جاتے ' احد احد - کہتے ہیں جب اسے بلال نے دیکھا وہ چلایا' یہ تو رئیس الکفار امیہ ابن خلف ہے - اگر یہ بچ نکلا تو میں نے نجات نہ پائی - میں نے کہا کہ بلال تم میرے اسیر کے ساتھ یہ کرتے ہو - اس نے پھر کہا اگر یہ نجات پا گیا' تو گویا مجھے نجات نہ ملی - میں نے پھر سختی سے کہا "اے کالی کے بیٹے تم سنتے نہیں' اس نے پھر کہا اگر یہ نجات پا گیا تو میں مرا - کہتے ہیں اس کے بعد بلال نے نہایت ہی بلند آواز سے پکارا - اے اللہ کے انصار' یہ ہے رئیس الکفار امیہ ابن خلف - اگر یہ بچ نکلا تو میں مر گیا - کہتے ہیں کہ لوگوں نے ہمیں گھیر لیا - لیکن میں ان دونوں سے لوگوں کو روکتا ہی رہا - پیچھے سے ایک آدمی آیا اور اس نے اس کے بیٹے پر وار کیا اور وہ گر گیا - اس کے بعد امیہ ابن خلف نے ایک چیخ نکالی - اس پر میں نے کہا کہ جان بچاؤ تاکہ میں بھی بچ جاؤں خدا کی قسم اب میں کچھ نہیں کر سکتا - کہتے ہیں کہ لوگوں نے ان پر تلواروں سے پے در پے وار کئے اور ان سے فارغ ہو گئے - عبدالرحمن کہا کرتے تھے - اللہ بلال پر رحم کرے کہ میری زرہیں بھی گئیں اور میرے قیدیوں کو بھی قتل کر کے اس نے مجھے دکھ پہنچایا -

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دشمن سے فارغ ہوئے تو حکم دیا گیا کہ مقتولوں میں سے ابوجہل کو تلاش کیا جائے - اور جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ معاذ ابن عمرو ابن الجموح بنی سلمہ کے بھائی نے کہا کہ میں نے لوگوں سے سنا کہ ابوجہل تک پہنچنا بہت مشکل ہے اور وہ اس وقت ایک درخت کی اوٹ میں تھا - جب میں نے یہ باتیں سنیں تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں یہ کام کروں گا - میں اس کی طرف بڑھا - جب میرے لئے ممکن ہوا تو میں نے اس پر حملہ کر دیا - میں نے اس پر ایک ایسا وار کیا کہ میں نے اس کے پاؤں کو نصف پنڈلی کے ساتھ اڑا دیا - جب اس کا پاؤں اڑا تو مجھے ایسا لگا جس طرح گٹھلی توڑنے والے پتھر کے نیچے سے گٹھلی اڑتی ہے - اس وار کے بعد اس کے بیٹے عکرمہ نے مجھے مارا اور میرے کاندھے پر ایسی چوٹ آئی کہ میرا بازو کٹ گیا اور وہ ایک جانب سے میرے پہلو میں چمڑے کے ساتھ لٹک رہا تھا - اب لڑائی میں جلدی اور تیزی آ گئی - میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور پورا دن لڑتا رہا - اور یہ ہاتھ میری پشت کے ساتھ لٹکا رہا - جب اس نے مجھے بہت تنگ کیا تو میں نے اس پر اپنا پاؤں رکھا اور اسے کاٹ کر پھینک دیا -

اس کے بعد معوذ ابن عفرا ابوجہل تک جا پہنچا اور اس وقت اس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی - اس نے اسے اس قدر زخمی کر دیا کہ وہ اب حرکت کے قابل نہ رہا - اور معوذ لڑتا رہا یہاں تک کہ وہ قتل ہو گیا - اس کے بعد عبداللہ ابن مسعود ابوجہل تک جا پہنچا - یہ اس وقت ہوا جب حضور ؐ نے حکم دیا تھا کہ ابوجہل کو مردوں میں تلاش کیا جائے - تلاش کرنے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا کہ اسے تلاش کرو - اگر اسے پہچاننے میں دقت ہو' تو اس کے گھٹنے پر ایک

زخم ہے اسے دیکھو اس لئے کہ میں اور وہ دونوں ایک دن عبداللہ ابن جدعان کی دعوت میں شریک تھے اور اس وقت ہم دونوں لڑکپن میں تھے۔ اژدحام میں' میں نے اسے دھکہ دیا اور اگرچہ میں اس کے مقابلے میں دبلا پتلا تھا' وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ اس کا ایک گھٹنا اس قدر زخمی ہوا کہ زخم کے اثرات زائل نہ ہوئے۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے اسے اس حال میں تلاش کر لیا کہ وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ میں نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھا۔ اس نے مکہ میں ایک بار میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ مجھے مارا تھا اور مکے لگائے تھے۔ اس کے بعد میں نے اسے کہا: اللہ کے دشمن تم نے جان لیا کہ آج اللہ نے تجھے ذلیل کیا ہے؟ "مجھے کیوں ذلیل کیا ہے؟" اس نے کہا' کیا تم نے مجھ سے کسی بڑے آدمی کو بھی قتل کر دیا ہے۔ اس نے کہا یہ تو بتاؤ آج کی جنگ کس نے جیتی؟ میں نے جواب دیا اللہ اور رسول ؐ اللہ نے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنی مخزوم کے بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ابن مسعود نے کہا کہ اس نے مجھے یہ کہا کہ اے چرواہے' تم ایک عظیم آدمی کی گردن پر سوار ہو' جس پر سوار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اس کی گردن کو تن سے جدا کیا اور لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا اور کہا اے رسول خدا یہ رہا خدا کے دشمن کا سر۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ مجھے مقامی کے ماہرین اہل علم نے بتایا کہ حضرت عمر ابن الخطاب نے سعید ابن العاص کو ایک مرتبہ یہ کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تجھے میرے بارے میں غلط فہمی ہے کہ شاید میں نے تمہارے باپ کو قتل کیا ہے۔ اگر میں نے اسے قتل کیا ہوتا تو میں اس کے قتل کی ہرگز معذرت نہ کرتا۔ لیکن میں نے اپنے ماموں عاص ابن ہشام ابن المغیرہ کو قتل کیا تھا۔ رہا تمہارا باپ تو میں جنگ میں اس کے پاس سے گزرا تھا۔ اس طرح لڑ رہا تھا جس طرح ایک بیل جنگ کے وقت اپنے سینگوں کے ساتھ زمین کو چیرتا ہے۔ تو میں اس سے ایک طرف ہو گیا اور مجھ سے آگے بڑھ کر اس کے چچا زاد نے اس کا رخ کیا اور اسے قتل کر دیا۔

ابن اسحاق' یزید ابن رومان' عروہ ابن الزبیر کے واسطے سے حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں' جب حضور ؐ نے حکم دیا کہ مقتولین کو ایک گڑھے میں پھینکا جائے' تو ایک گڑھا کھود کر سب کو اس میں پھینک دیا گیا' ماسوائے امیہ ابن خلف کے۔ کیونکہ وہ اپنی زرہ کے اندر پھول گیا تھا اور زرہ کو بھر دیا تھا' لوگ اس کے پاس گئے اور اسے حرکت دی تو اس کا گوشت اپنی جگہ چھوڑ گیا۔ لوگوں نے اسے اسی جگہ چھوڑ دیا اور اس کے اوپر مٹی ڈال دی۔ جب تمام مقتولین کو گڑھے میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گڑھے کے دہانے پر کھڑے ہوئے اور کہا: "اے گڑھے والو' کیا تم نے وہ انجام دیکھ لیا جو تم سے تمہارے رب نے اس کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے تو وہ انجام دیکھ لیا جو مجھ سے میرے رب نے وعدہ کیا تھا پوری طرح۔ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول نے آپ سے سوال کیا: "کہ آپ تو مردوں سے بات کر رہے ہیں۔" آپ نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ وہ اب جانتے ہیں کہ ان سے ان کے رب نے جو وعدہ کیا تھا وہ سچ تھا۔" عائشہ کہتی ہیں لوگ کہتے ہیں کہ حضور ؐ نے یہ فرمایا: "درحقیقت میں نے جو کہا وہ سنتے ہیں۔" حالانکہ حضور نے فرمایا تھا: "دراصل وہ جانتے ہیں کہ رب کا وعدہ سچا تھا۔"

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب حضور ؐ نے حکم دیا کہ انہیں گڑھے میں پھینک دیا جائے تو عتبہ ابن ربیعہ کو گڑھے کی

طرف کھینچا گیا تو حضورؐ نے ان کی طرف دیکھا (یہ بات مجھ تک پہنچی ہے) کہ ابوحذیفہ ابن عتبہ نہایت ہی غمگین ہیں اور ان کا رنگ بدل گیا ہے تو آپ نے فرمایا: ابوحذیفہ 'شاید تمہارے باپ کی وجہ سے تم پر اثر ہو گیا ہے۔'' یا جو الفاظ حضورؐ نے کہئے 'ابوحذیفہ نے کہا ،''حضورؐ خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے۔ مجھے اپنے باپ کے بارے میں کوئی شک نہیں اور نہ اس کے قتل کے بارے میں شک ہے 'لیکن میں جانتا تھا کہ میرا باپ بڑا مدبر' بردبار اور صاحب علم آدمی تھا۔ اور میری دلی خواہش تھی کہ اللہ اسے اسلام کی طرف ہدایت دے۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کی یہ حالت ہے اور مجھے جب یہ خیال آیا کہ یہ تو کفر کی حالت میں دنیا سے چلا گیا اور میری آرزو پوری نہ ہوئی تو اس وجہ سے مجھے یہ دکھ ہوا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باپ لئے دعائے خیر فرمائی اور اس کے لئے بھی بہت اچھے کلمات کہے۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر گاہ میں جو کچھ تھا' اسے یکجا کرنے کا حکم دیا۔ تمام مال غنیمت یکجا کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ جن لوگوں نے مال جمع کیا تھا' انہوں نے کہا کہ اس پر پورا ہمارا حق ہے کیونکہ ہم نے جمع کیا ہے' اور جو لوگ دشمن کو مار رہے تھے اور اس کا تعاقب کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ اگر ہم نہ ہوتے تو تم کہاں جمع کرتے۔ ہم نے دشمن کو مشغول رکھا' اور تم نے مال جمع کیا۔ اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر مامور تھے انہوں نے کہا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمن کے حملے سے بچایا ہے۔ لہٰذا تمہارے مقابلے میں ہمارا حق زیادہ ہے' ہم نے یہ سامان اس وقت دیکھ لیا تھا' مگر آپ کا محافظ کوئی نہ تھا۔ ہم اس بات سے ڈر گئے کہ اگر ہم چلے گئے تو دشمن آپؐ پر حملہ نہ کر دے۔ لہٰذا ہم حفاظت میں رہے۔ چنانچہ تم لوگ ہم سے زیادہ مستحق نہیں ہو۔

ابن اسحاق کہتے کہ عبدالرحمٰن ابن الحارث وغیرہ نے سلیمان' مکحول اور ابو امامہ باہلی سے روایت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبادہ ابن الصامت سے انفال کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ سورہ ہم اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت ہمارے درمیان انفال کے بارے میں اختلافات ہو گئے تھے اور اس کے بارے میں ہماری اخلاقی حالت اچھی نہ رہی تھی تو اس وجہ سے اللہ نے انفال کو ہم سے لے کر اسے رسول اللہ کے اختیار میں دے دیا' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے درمیان مساویانہ تقسیم کر دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنی عبدالدار کے بھائی نبیہ ابن وہب نے بتایا کہ حضور جب قیدیوں کی طرف لوٹے تو آپ نے انہیں اپنے ساتھیوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اور آپ نے ان کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ تو ابو عزیز ابن ہاشم' مصعب ابن عمیر کے سگے بھائی تھے اور قیدی تھے۔ ابو عزیز نے بتایا کہ ایک انصاری مجھے گرفتار کر رہے تھے اور مصعب ابن عمیر میرے بھائی آگئے تو انہوں نے انصاری سے کہا کہ اسے خوب باندھیئے کیونکہ ان کی والدہ مالدار خاتون ہیں وہ اس کا خوب فدیہ دیں گی۔ کہتے ہیں کہ جب میدان جنگ سے مجھے لے کر آئے تو میں انصاریوں کے پاس تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تو وہ لوگ مجھے روٹی دیتے اور خود کھجوروں پر اکتفاء کرتے کہ انہیں حضورؐ نے ہمارے بارے میں وصیت کی تھی کہ حسن سلوک کرو' ان میں سے جس کے ہاتھ بھی روٹی آتی وہ مجھے دے دیتا۔ میں شرمندہ ہو کر انہیں واپس کرتا مگر وہ مجھے دوبارہ واپس کر دیتے اور اسے ہاتھ بھی نہ لگاتے۔

ابن ہشام کہتے ہیں ابو عزیز بدر کے دن مشرکین کے علم بردار تھے۔ اور یہ علم انہیں نضر ابن الحارث کے بعد ملا تھا'

جب ان کے بارے میں، اس کے گرفتار کرنے والے ابو الیسیر کو مصعب ابن عمیر نے وہ بات کہی (جو اوپر مذکور ہے) تو ابو عزیر نے کہا اے بھائی، تم میرے بارے میں یہ سفارش کرتے ہو، تو مصعب نے کہا کہ یہ انصاری تم سے پہلے میرا بھائی ہے۔ اس پر اس کی ماں نے معلوم کیا کہ کسی قریش کا زیادہ سے زیادہ فدیہ کیا رہا ہے؟ تو اسے بتایا گیا کہ چار ہزار درہم تو اس نے چار ہزار درہم بھیجے اور اس کا فدیہ دیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کے بعد قریش نے اسیروں کا تاوان بھیجا۔

---OOO---

یہ تھا غزوہ بدر کا واقعاتی نقشہ، ہم نے بقدر استطاعت اسے مختصراً بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ سورہ انفال اسی غزوہ پر بطور تبصرہ نازل ہوئی۔ اسی میں اس غزوہ کے ظاہری واقعات پر بھی تبصرہ ہے۔ اس کے تاریخی پس منظر کا بھی ذکر ہے۔ اور یہ تمام تبصرے قرآن کے منفرد اور معجز انداز بیان میں ہیں جن کی تفصیلات ہم آئندہ تشریح آیات کے درمیان بیان کریں گے۔ یہاں ہم نے صرف اس سورہ کے مضامین کے اساسی خدوخال مختصراً دے دیئے ہیں۔

یہ سورہ کس لائن پر جا رہی ہے؟ اس کے اندر ایک مضمون اس کی پوری طرح وضاحت کرتا ہے۔ ابن اسحاقؒ نے حضرت عبادہ ابن الصامت سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ سورہ بدری لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب ہم مال غنیمت کے بارے میں باہم اختلاف کرنے لگے اور اس سلسلے میں ہمارے اخلاق بھی خراب ہوئے تو اللہ نے انفال کا اختیار ہمارے ہاتھ سے لے لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا اور آپ نے انفال کو مساویانہ اصول کے مطابق تقسیم کر دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس سورہ کا آغاز کس طرح ہوا اور اس کی لائن کیا ہے۔ لوگوں نے اس واقعہ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کے بارے میں اختلاف کیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں قیامت تک فرقان قرار دیا تھا۔

اللہ کو مطلوب یہ تھا کہ ان کو اور ان کے بعد آنے والوں کو بعض اہم تعلیمات دیں۔ یہی تعلیم یہاں پوری طرح انہیں دی گئی اور یہ تعلیم اللہ نے جس تدبیر اور نظام قضا و قدر کے مطابق دی، ہر اقدام ایسا نظر آتا ہے جس کے پیچھے کوئی اصلاحی تدبیر ہے۔ اس لئے کہ جنگ بدر اور اس کے نتیجے میں جو عظیم فیصلے ہوئے اس کے بارے میں خود مسلمانوں کی منصوبہ بندی کو کوئی دخل نہ تھا۔ نہ انہوں نے جنگ بدر کے معمولی اموال غنیمت کے متعلق کوئی اپنی تدبیر کی تھی اور نہ اس جنگ کے عظیم نتائج انہوں نے سوچے تھے۔ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی منشا اور تدبیر کے ذریعے ہوئے۔ اس واقعہ میں اللہ نے مسلمانوں کو خوب آزمایا اور یہ اس کا فضل و کرم تھا۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ لوگ اپنے بارے میں کیا سوچتے تھے۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ قافلے کو لوٹ لیں۔ مگر اللہ نے ان کے لئے قافلے کے مقابلے میں ایک مسلح لشکر لا کر کھڑا کر دیا۔ دونوں میں کس قدر فرق ہے تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ خود ان کی اپنی سوچ کس قدر موثر ہے اور ان کے بارے میں اللہ کی تدبیر کس قدر دور رس حکمت کی حامل ہے۔ اور دونوں کے اندر کس قدر فرق ہے۔

سورہ کا آغاز اس طرح ہے کہ انفال کے بارے میں عوام کی جانب سے ایک سوال ہے اور اللہ کی طرف سے مختصر جواب ہے کہ یہ مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول اللہ کا ہے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ وہ خدا سے ڈریں اور باہم

تعلقات کو درست کریں۔ جس طرح حضرت عبادہ ابن الصامت نے کہا کہ ہمارے اخلاق پر اثر پڑ گیا تھا۔ اسے دور کر
دیں اور اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں۔کیونکہ سمع و اطاعت ایمان کا مقتضا ہے۔سورہ کے آغاز میں اہل ایمان کے
لئے ایک نہایت ہی موثر تصویر کشی کی گئی ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ
بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (١) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ
(٢) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (٣) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا
لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٤) (٨: ١ تا ٤)) "اے پیغمبر لوگ تم
سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دو کہ یہ غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں' پس اللہ سے ڈرو اور
آپس کے باہم تعلقات ٹھیک رکھو۔اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔مومن تو وہ ہے کہ جب اللہ
کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان پر آیات الٰہی کی تلاوت ہوتی ہے تو ان کے ایمان کو زیادہ کر
دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے
خرچ کرتے ہیں۔ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں اور مغفرت ہے
اور عزت کی روزی ہے۔"

اس کے بعد بدر کے معاملے کو یاد دلایا جاتا ہے۔یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے لئے کیا سوچتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کے
لئے سوچ رہا تھا اور وہ زمین پر دنیاوی معیار کے مطابق جو کچھ دیکھ رہے تھے اور اللہ کا نظام تقدیر جو کچھ کر رہا تھا۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (٥)
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (٦)
وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ
تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (٧) لِيُحِقَّ
الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (٨) (٨: ٥ تا ٨)) "جیسا کہ تمہارے رب نے
تجھے حق کے ساتھ اپنے گھر سے نکال دیا اور مومنوں کے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔وہ حق بات کے سلسلے میں تم سے جھگڑ
رہے تھے۔حالانکہ واضح ہو چکا تھا۔ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ موت اپنی آنکھوں

سے دیکھ رہے ہیں۔ جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے کوئی ایک گروہ تمہارے ہاتھ آ جائے گا۔ اور تم چاہ رہے تھے کہ کمزور گروہ تمہارے ہاتھ آئے لیکن اللہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے خواہ مجرموں کو ناگوار ہی کیوں نہ لگے۔"

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس غیبی امداد کے بارے میں یاد دہانی کراتے ہیں' جو امداد انہیں اس مشکل وقت میں دی گئی اور پھر آخرت میں ان کے لئے جو اجر تیار کیا گیا ہے وہ تو واضح ہے۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۹) وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۱۰) ع اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۱۲) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳) ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (۱٤) (۸: ۹ تا ۱٤)

"اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم نے اپنے رب سے فریاد کی تھی تو اس نے تمہاری فریاد سن لی تھی کہ ہم ایک ہزار فرشتوں سے یکے بعد دیگرے تمہاری مدد کریں گے اور اللہ نے یہ بات اس لئے کی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دلوں کو اس سے اطمینان ہو جائے' ورنہ مدد تو ہر حال میں اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ یقیناً اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔ اور وہ وقت بھی یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تمہاری تسکین کے لئے تم پر غنودگی طاری کر دی تھی اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ اس کے ذریعے سے تم کو پاک کرے اور تم سے شیطان کے وسوسوں کی گندگی دور کرے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے۔ اور اس کے باعث تمہارے قدم جما دے۔ جب تمہارے رب نے فرشتوں پر وحی کی تھی کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں لہٰذا تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' ہم ابھی کافروں کے دل میں رعب ڈالے دیتے ہیں پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو یاد رکھو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔"

یوں بات آگے بڑھتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ تمام معرکہ اللہ کے حکم اور تدبیر سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اللہ کی

ہدایات کے مطابق جنگ ہو رہی ہے۔ اس کی معاونت اسی میں شامل ہے۔ اللہ کی تقدیر اور براہ راست دست قدرت کام کر رہا ہے۔ اور یہ معرکہ صرف اللہ کے لئے ہے اور اس کی راہ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ کے آغاز ہی میں یہ فیصلہ دے دیا جاتا ہے کہ انفال اللہ اور رسول کے لئے ہیں' اور اس کے بعد بھی حضور نے جو ان کے درمیان تقسیم کر دیئے تو یہ اللہ اور رسول اللہ کا خاص احسان تھا۔ چنانچہ لوگوں نے انفال کے لئے جو امیدیں لگا رکھی تھیں وہ یہاں کاٹ دی جاتی ہیں۔ ان کے دلوں کو تمام مفادات سے پاک کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کا جہاد خالص فی سبیل اللہ ہو جائے۔ چنانچہ ان مضامین پر درج ذیل آیات کا مطالعہ کریں۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۷) ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۸) (۸:۱۷ – ۱۸) "پس تم نے کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے قتل کیا۔ تم نے خاک نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تاکہ ایمان والوں کو اپنی طرف سے اچھی آزمائش کرے یقیناً اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ تھا۔ رہے کافر تو اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔"

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(۸:۲٦) "اس وقت کو یاد کرو جب تم سرزمین مکہ میں تھوڑے تھے اور کمزور سمجھے جاتے تھے۔ اور تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں۔ پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت بخشی اور تمہیں رزق کا بہترین سامان دیا تاکہ تم شکر کرو۔"

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٤۱) اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ

حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (٤٢) اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَلَوْ اَرٰكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٤٣) وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٤٤) (٨: ٤١ - ٤٤)

"اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ بطور غنیمت تمہیں حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول ؐ کے لئے ہے اور قرابت داروں کے لئے، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم اللہ اور اس بات پر ایمان رکھتے ہو۔ جو فیصلے اور دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی اور اللہ ہرچیز پر قادر ہے۔ جب تم نزدیک والے کنارے پر تھے اور وہ دور والے کنارے پر، اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ اور اگر تم دونوں فریقوں نے آپس میں لڑائی ٹھہرائی ہوتی تو ضرور اس تقرر کے بارے میں تم میں اختلاف ہو جاتا لیکن اللہ نے دونوں فوجوں کو بھڑا دیا تاکہ اللہ اس بات کو پورا کر دکھائے جو ہونے والی تھی کہ جسے ہلاک ہونا ہے، وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

وہ وقت یاد کرو جب اللہ تمہیں خواب میں کافروں کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور اگر اللہ انہیں زیادہ دکھاتا تو تم ضرور ہمت ہار جاتے اور اس امر میں ضرور آپس میں جھگڑنے لگتے، مگر اللہ نے تمہیں اس صورت حال سے بچا لیا۔ بلاشبہ وہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

اور وہ وقت یاد کرو جب تم کافروں کے مقابل ہوئے تو اللہ نے انہیں تمہاری نظر میں تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمہیں تھوڑا دکھایا تاکہ اللہ اس بات کو پورا کر دکھائے جو ہونے والی تھی اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوں گے۔"

---ooo---

یہ جنگ، یا کوئی جنگ جس میں کوئی مومن لڑ رہا ہو وہ اللہ کی تدبیر اور اللہ کا کام ہوتا ہے۔ اور یہ معرکہ اللہ کی قیادت اور ہدایت کے مطابق ہوتا ہے، اس کی معاونت اور نصرت سے ہوتا ہے۔ اللہ کے فضل اور اس کی قدرت سے ہوتا ہے۔ یہ معرکہ اللہ کے لئے ہوتا ہے اور اس کی راہ میں ہوتا ہے۔ اس پوری سورہ میں دعوت دی جاتی ہے کہ اس میں ثابت قدم رہو۔ اس میں پوری طرح حصہ لو، اس کے لئے تیاری کرو اور یہ اطمینان رکھو کہ اس میں اللہ ہی تمہارا ولی ہے اور اس بات کا خیال رکھو کہ مال اور دولت کی محبت اس راہ میں تمہارے لئے رکاوٹ نہ بنے۔ اس معرکے کے آداب کو پورا کرو۔ اور اس میں دکھاوے اور غرور کے ساتھ شرکت نہ کرو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرو۔ ان مطالب کے بیان کے لئے درج ذیل آیات وارد ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (١٥)

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۱٦) (۸: ۱۵ ـ ۱٦) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم جب میدان جنگ میں کفار سے دوبدو مقابل ہو تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور جو کوئی ایسے موقعہ پر پیٹھ دکھائے گا وہ اللہ کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے ۔ مگر جو شخص جنگی چال کے طور پر یا کسی دستے سے ملنے کے لئے ایسا کرے ' تو جائز ہے ۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۸: ۲٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے ۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۷) وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (۲۸) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو' جبکہ تم اس بات کو خوب جانتے ہو اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس اجر عظیم ہے ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (٤٥) وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (٤٦) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (٤٧) وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَكُمْ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَى عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكُمْ إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (٤٨) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو' تو ثابت قدم رہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ

کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے نکلے تھے اور جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں اللہ ان پر چھایا ہوا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸ : ۶۰) "اور جہاں تک تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے کافروں کے لئے مہیا کئے رکھو تاکہ اس طرح اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو اور ان کے سوا دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے، مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔"

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۶۵) "اے نبی، مومنوں کو کافروں کے ساتھ جنگ پر ابھارو، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت دم رہیں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو وہ ایک ہزار پر غالب رہیں گے۔ کیونکہ یہ کافروہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہی نہیں۔"

---ooo---

یہاں جنگ میں ثابت قدمی کی بابت بار بار ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی اہل ایمان کے قلب و نظر میں اسلامی نظریہ اور عقیدہ بھی بٹھایا جا رہا ہے اور تمام امور کو، تمام احکام کو اور تمام ہدایات کو بھی اسلامی نظریئے اور عقیدے کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ احکام و ہدایات محض ہوا میں نہیں دیئے جاتے بلکہ انہیں عقیدے اور اصولوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

(الف) مسئلہ انفال میں انہیں ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ خدا سے ڈریں اور جب خدا کو یاد کریں تو خوف محسوس کریں اور ایمان کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٤) (۸: ۱ تا ٤)) "اے پیغمبر لوگ تم سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دو کہ یہ غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں' پس اللہ سے ڈرو اور آپس کے باہم تعلقات ٹھیک رکھو۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ مومن تو وہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان پر آیات الٰہی کی تلاوت ہوتی ہے تو ان کے ایمان کو زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں اور مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔"

(ب) اس جنگ کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ جنگ کا منصوبہ خود اللہ نے بنایا اور اللہ کی تقدیر اور تدبیر اس میں کارفرما رہی اور تمام مراحل میں دست قدرت کام کرتا رہا۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ---

(۸: ۲ ٤) "حقیقت یہ ہے کہ کافروں کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے قتل کیا اور تم نے مٹی نہیں پھینکی جب پھینکی تھی' بلکہ اللہ نے پھینکی تھی تاکہ ایمان والوں کی اپنی طرف سے اچھی آزمائش کرے۔"

(ج) جب یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم جنگ میں ثابت قدم رہو' تو ساتھ ہی بتا دیا جاتا ہے کہ اس جنگ کے ذریعے اللہ تمہیں زندہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر اللہ چاہے تو وہ تمہارے اور اس کے درمیان حائل ہو سکتا ہے۔ اگر تم اللہ پر بھروسہ کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸: ٤ ۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

(۸: ٥ ٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو' تو ثابت قدم رہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

(ھ) اس معرکے کا ہدف اس طرح مقرر کیا جاتا ہے :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ "اور کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے ۔"

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ "نبی کے لئے سزاوار نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کر لے ۔"

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸) (۸ : ۷ - ۸) "وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے کوئی ایک تمہارے ہاتھ آ جائے گا۔ اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ کمزور گروہ تمہارے ہاتھ آئے، لیکن اللہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائے، خواہ مجرموں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو ۔"

(و) اسلامی معاشرے میں لوگوں کا باہم تعلق اور پھر اسلامی معاشرے کا دوسری اقوام سے تعلق اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر متعین ہو گا۔ اس نظریہ پر اکٹھ اور اسی پر جدائی ہو گی اور اسلامی صفوں میں لوگ آگے اور پیچھے اسی عقیدے کی اساس پر ہوں گے ۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۷۴) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷۵) ع (۸ : ۷۴ - ۷۵) "جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور مدد کی تو یہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لے آئے اور ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو ان کی مدد کرنا تم پر لازم ہے، مگر اس قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ برپا ہو گا۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی

راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور ان کی مدد کی تو یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کی روزی اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد بھی کیا تو وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں۔قرابت دار تو اللہ کے حکم کے مطابق ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔یقیناً اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔"

---ooo---

اس سورہ میں اسلامی نظریہ حیات کی لائن کے علاوہ ایک دوسری لائن پر بھی تفصیلی بات ہوئی ہے اور وہ ہے عمل جہاد' اور اس موضوع پر بتایا گیا ہے کہ جہاد کی ایمانی اور تحریکی حیثیت کیا ہے اور یہ کہ اس جہاد کو خالص اللہ کی راہ میں ہونا چاہئے اور اس کے اندر ذاتی خواہشات کا شائبہ تک داخل نہ ہونا چاہئے۔نیز جہاد کے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ہر مجاہد کو آگے بڑھنا چاہئے۔نہایت اعتماد' نہایت اطمینان اور نہایت ہی علو شان کے ساتھ۔اس پوری سورہ میں جہاد کے بارے میں ہدایات ہیں' ہم یہاں چند آیات کو بطور نمونہ پیش کریں گے اور تشریحات آیات پر تفسیر کے وقت دیکھئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (۱۵) وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱٦) (۸: ۱۵ - ۱٦) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم جب میدان جنگ میں کفار سے دوبدو مقابل ہو تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور جو کوئی ایسے موقعہ پر پیٹھ دکھائے گا وہ اللہ کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔مگر جو شخص جنگی چال کے طور پر یا کسی دستے سے ملنے کے لئے ایسا کرے' تو جائز ہے۔"

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۵۵) اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ (۵٦) فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۵۷) (۸: ۵۵ تا ۵۷) "اے پیغمبر بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے۔تو وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہیں اور خصوصاً وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقعہ پر اپنا عہد توڑتے رہتے ہیں اور خدا سے ذرا نہیں ڈرتے' پھر اگر تم انہیں لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں ان کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں اور شاید یہ عبرت پکڑیں۔"

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸: ۶۰) "اور جہاں تک تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے کافروں کے لئے مہیا کئے رکھو تاکہ اس طرح اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو اور ان کے سوا دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔"

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۸: ۶۵) "اے نبی مومنوں کو کافروں کے ساتھ جنگ پر ابھارو' اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے سو آدمی ایسے ہوں گے تو کافروں کے ایک ہزار پر غالب رہیں گے کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں۔"

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۸: ۶۷) "نبی کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ اس کے لئے قیدی ہوں جب تک کہ وہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرلے۔ تم تو دنیا کی متاع چاہتے ہو مگر اللہ تمہیں آخرت کی نعمتیں دینا چاہتا ہے اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸: ۷۴) "اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور اس کی مدد کی تو یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت و آبرو کی روزی ہے۔"

---○○○---

سب سے آخر میں' اس سورہ میں اسلام کے اجتماعی نظام اور اسلامی سوسائٹی کی بنیاد اسلامی نظریہ حیات پر رکھی گئی ہے اور وہ احکام بھی اس سورہ میں دیئے گئے جن کے مطابق اسلامی ریاست نے دوسری اقوام کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔ حالت جنگ میں بھی اور حالت صلح میں بھی' خصوصاً ان حالات میں جن میں یہ سورت نازل ہوئی تھی۔ اس میں اموال غنیمت کی تقسیم' معاہدات وغیرہ اور اسلامی حکومت کے قیام اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے لئے اس تین بنیادی خطوط دیئے گئے ہیں اور یہ تمام امور نہایت ہی واضح الفاظ و عبارات ہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۸: ۱) "اے پیغمبر' تم سے غنیمت کے

کے بارے میں پوچھتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں ۔"

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (۱۵) وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۶) (۸ : ۱۵ - ۱۶) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم میدان جنگ میں کفار کے ساتھ دوبدو مقابل ہو' تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ اور سینہ سپر ہوکر مقابلہ کرو اور جو کوئی ایسے موقعے پر پیٹھ دکھلائے گا' تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے ۔ مگر ہاں جو شخص جنگی چال کے طور پر یا کسی گروہ سے جاملنے کے لئے ایسا کرے' تو کر سکتا ہے ۔"

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو' اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو ۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ' جو کہتے تو ہیں کہ ہم نے سن لیا' حالانکہ وہ سنتے سناتے نہیں ہیں ۔"

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸ : ۲۴) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو' جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم اسی کی طرف لوٹنا ہے ۔"

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(۸ : ۲۷) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت نہ کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم اس بات کو خوب جانتے ہو۔"

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۸) وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۹) (۸ : ۳۸ - ۳۹)) "اے پیغمبر جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' ان سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا' وہ سب انہیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ

پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو پچھلی قوموں کے ساتھ جو کچھ گزر چکا ہے تو وہ سب کو معلوم ہے۔ اور ان کے ساتھ اس وقت تک لڑتے رہو کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے' پھر اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو کچھ نہ کریں گے۔ اللہ دیکھنے والا ہے۔

وَاعْلَمُوْآ اَنَّمَا غَنِمْتُم مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۸: ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ بطور غنیمت تمہیں حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے اور قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔"

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۴۵) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۴۶) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۴۷) (۸: ۴۵ تا ۴۷) "اے ایمان والو' جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو' تاکہ تم فلاح پاؤ' اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو' اور آپس میں جھگڑا نہ کرو' ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور لڑائی کی تکلیفوں پر صبر کرو' بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان کافروں جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں' اللہ اپنے علم و قدرت سے اس پر چھایا ہوا ہے۔"

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۵۵) اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ (۵۶) فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۵۷) وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۵۸) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۵۹) وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (٦٠) (٨: ٥٥

تا ٦٠) ”اے پیغمبر بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے تو وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا' پھر وہ ہر موقعہ پر اپنا عہد توڑتے رہتے ہیں اور خدا سے ذرا نہیں ڈرتے' تو تم اگر انہیں لڑائی میں پاؤ تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہیں' ان کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں اور شاید بدعہدی کے انجام سے عبرت پکڑیں اور اگر انہیں کسی قوم کی طرف سے دغا کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے سامنے پھینک دو تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔ یقیناً اللہ دغا بازوں کو پسند نہیں کرتا اور کافر یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ بازی لے گئے۔ وہ ہمیں عاجز نہیں کر سکتے۔ جہاں تک تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے ہوئے گھوڑے کافروں کے لئے تیار رکھو' تاکہ اس طرح اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو نیز ان کے سوا دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے' مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں دے دیا جائے گا اور ذرا بھی تمہاری حق تلفی نہ ہوگی اور اے پیغمبر' اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اسی طرف جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور اگر ان کا ارادہ تمہیں دھوکہ دینے کا ہو تو بھی کچھ پرواہ نہ کرو۔ اللہ تمہارے لئے کافی ہے وہی تو ہے جس نے تمہیں اپنی مدد سے اور مومنین کی جماعت سے تمہاری تائید کی۔“

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (٦٤) يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ (٦٥) الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (٦٦) (٨: ٦٤ –

٦٦) ”اے پیغمبر' تمہارے لئے اللہ کافی ہے اور مومنین کے لئے بھی جنہوں نے تمہارا اتباع کیا۔ اے پیغمبر مومنوں کو کافروں کے ساتھ جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے سو آدمی ایسے ہوں گے تو کافروں کے ایک ہزار پر غالب رہیں گے۔ کیونکہ کافر ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے ہی نہیں۔ مسلمانو اب اللہ نے تم پر تخفیف کر دی۔ اس نے جان لیا کہ تم میں ابھی کمزوری ہے تو اگر تم میں سے ثابت قدم رہنے والے سو ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور یاد رکھو کہ اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔“

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۸: ۶۷) "نبی کے لئے سزاوار نہیں ہے کہ اس کے لئے قیدی ہوں جب تک کہ وہ ملک میں غلبہ حاصل نہ کرلے۔ تم تو دنیا کی متاع چاہتے ہو مگر اللہ تمہیں آخرت کی نعمتیں دینا چاہتا ہے اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔"

اور اگر اس بارے میں اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا تھا اس کی پاداش میں تمہیں بڑا عذاب پہنچتا۔ بہرحال جو کچھ تمہیں غنیمت میں ہاتھ لگا ہے اسے حلال وطیب سمجھ کر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بلاشبہ اللہ غفور ورحیم ہے۔ اے پیغمبر قیدی جو ہنوز تمہارے قبضے میں ہیں' ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ کو تمہارے دلوں میں کچھ نیکی کا علم ہوا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عطا فرمائے گا اور تمہیں بخش دے۔ اللہ غفور ورحیم ہے لیکن اگر وہ تم سے خیانت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں۔ تو اللہ نے ان کو تمہارے ہاتھ گرفتار کرا دیا۔ اللہ بڑے علم اور حکمت والا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۷۴) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷۵) ع (۸: ۷۴ - ۷۵) "جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور مدد کی تو یہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لے آئے اور ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو ان کی مدد کرنا تم پر لازم ہے مگر اس قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو۔ اللہ اسے دیکھتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ برپا ہو گا۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور ان کی مدد کی تو یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کی روزی اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد بھی کیا تو وہ بھی تم ہی میں داخل ہیں۔ قرابت دار تو اللہ کے حکم کے مطابق ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ یقیناً اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔"

---ooo---

یہ تھے ' اجمالاً اس سورہ کے بڑے بڑے خطوط۔ اگرچہ یہ سورہ غزوۂ بدر کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کے مباحث اصلا اس واقعہ پر تبصرہ ہیں۔ لیکن یہ سورہ بھی مسلمانوں کی تربیت کا ایک خاص انداز اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس

نے مسلمانوں کو انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور اس میں یہ بات بھی کھول کر بتا دی گئی ہے کہ اسلامی نظام زندگی اور دین اسلام زندگی کے عملی واقعات اور کرۂ ارض پر رونما ہونے والے حالات پر کس انداز سے نظر ڈالتا ہے اور زندگی کے حقائق کے بارے میں اسلام کا کیا تصور سامنے آتا ہے۔

درحقیقت یہ غزوہ' وہ پہلا بڑا ٹکراؤ تھا جو مسلمانوں اور ان کے مشرک دشمنوں کے درمیان ہوا' اس ٹکراؤ میں مشرکین کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی' لیکن فی الحقیقت مسلمان اپنے گھروں سے اس مقصد کے لئے نہ نکلے تھے مسلمان درحقیقت قافلہ قریش پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نکلے تھے۔ جنہوں نے مہاجرین کو اپنے گھروں سے نکال کر ان کے اموال پر قبضہ کر لیا تھا۔ بس اللہ نے اس مومن گروہ کے لئے وہ بات پسند نہ کی جو انہوں نے خود اپنے لئے پسند کی تھی۔ اللہ نے یہ پسند فرمایا کہ قافلہ بچ نکلے اور مسلمان دستے کا مقابلہ اس دشمن سے ہو جائے جس نے تحریک اسلامی کی راہ روک رکھی تھی اور انہوں نے آخر قائد تحریک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش بھی کی تھی اور اس سے قبل انہوں نے آپ کے ساتھیوں پر وہ مظالم ڈھائے تھے جو آخری حدود تک پہنچ گئے تھے۔ انہیں ناقابل تصور اذیت دی تھی۔

اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ واقعہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ بن جائے اور اس کے ذریعہ اسلامی تاریخ کا دھارا بدل جائے بلکہ اس کے ذریعے پوری انسانی تاریخ کا رخ پھیر دیا جائے۔ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اہل ایمان کو جتلا دے کہ وہ اپنے لئے جو بہتری سوچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے لئے جو بہتری سوچتا ہے ان دونوں کے درمیان کس قدر تفاوت ہے۔ حالانکہ وہ اللہ کی پسند کو ابتداء میں پسند نہ کرتے تھے۔ نیز اس واقعہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ یہ بھی جتلانا چاہتے تھے کہ فتح اور شکست کے اسباب اور اصل عناصر کیا ہوتے ہیں' ان کو ان عوامل کا پتہ اس وقت چلا جب وہ میدان معرکہ میں تھے۔ غرض اس پوری سورہ میں ان اعلیٰ مفاہیم کے اشارے پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے حقائق اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ نیز اس میں قوانین صلح و جنگ بھی وضع کئے گئے ہیں۔ قوانین مال غنیمت' قوانین اسیران' اصول معاہدات و مواثیق اور اسباب فتح و شکست بیان ہوئے ہیں مگر نہایت ہی موثر اور معجزانہ انداز میں۔ غرض ان سب امور کے بارے میں نظریات اور تصور حیات کو تمام انسانی سرگرمیوں کا اصل محرک بتایا گیا ہے۔ اور یہ قرآنی فلسفہ تعبیر واقعات کا ایک خاص اسلوب ہے۔

پھر اس سورہ میں واقعات جنگ کے بعض مناظر بھی دکھلائے گئے۔ اس جنگ سے قبل لوگوں کی سرگرمیاں 'جنگ کے دوران لوگوں کی کشمکش اور جنگ کے بعد کے واقعات بھی ثبت کئے گئے ہیں۔ یہ مناظر اس قدر تازہ اور زندہ ہیں کہ انسان کے تصور میں واقعات جنگ کو از سر نو تازہ کر دیتے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ قارئین کی آنکھوں کے سامنے یہ واقعات نمودار ہو رہے ہیں۔ اور پڑھنے والا واقعات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

اس سورہ میں حضور کی زندگی کے بعض واقعات' آپ کے ساتھیوں کی زندگیوں کے بعض واقعات جب وہ مکہ میں تھے اور قلیل و ضعیف تھے۔ اس قدر ضعیف کہ ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کوئی بڑی طاقت اس تحریک کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دے۔ اور یہ جھلک ان کو اس لئے دکھائی جاتی ہے کہ اس حالت فتح و کامرانی میں وہ ذرا اپنے پچھلے حالات کو بھی ذہنوں میں تازہ رکھیں اور سمجھیں کہ اللہ نے ان پر کس قدر کرم کیا ہے اور ان کو یہ بھی معلوم ہو کہ ان کو یہ نصرت اللہ کے فضل و کرم سے نصیب ہوئی ہے اور یہ کہ انہوں نے جان و مال کی قربانی دی ہے۔ اسی لئے فتح نصیب ہوئی ہے۔ اس سورہ

میں ہجرت سے قبل اور ہجرت کے بعد کے ادوار میں مشرکین کے حالات زندگی کی کچھ جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں اور انسانی تاریخ سے اہل کفر و شرک کے انجام بھی بتائے گئے ہیں مثلاً اہل فرعون اور ان سے پہلے کے لوگوں کے واقعات تاکہ یہ بتایا جائے کہ اس کائنات میں اللہ کی جاری کردہ سنت کے مطابق واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور یہ کہ اللہ اپنے دوستوں کی مدد کرتے ہیں اور دشمنوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔

یہ ہیں اجمالاً اس سورہ کے موضوعات بحث' یہ پوری سورہ ایک اکائی ہے۔اگرچہ ہم اس کے ایک حصے کا تجزیہ یہاں کریں گے اور دوسرے کا دسویں پارے میں کریں گے۔ان شاء اللہ ----- میں سمجھتا ہوں کہ اس سورہ پر یہاں اس قدر تبصرہ کافی ہے اور اب ہم نصوص قرآنی کی تفسیر اور تشریح کی طرف آتے ہیں۔

درس نمبر ۸۲ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا پہلا سبق ہے ۔ اس کا موضوع انفال اور اموال غنیمت کی تقسیم ہے ۔ اموال غنیمت اور انفال میں وہ تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں جو میدان جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ لگتی ہیں ' جبکہ یہ جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہو ۔ سب سے پہلے اہل بدر کے درمیان اموال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں اختلافات پھوٹ پڑے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا فیصلہ اس طرح کیا کہ ان کے بارے میں جو حکم دیا جا رہا ہے وہ تمہارے لئے ضابطہ عمل ہو گا ۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خدا خوفی اور اطاعت رسول کے معاملے کی طرف بھی متوجہ کیا اور لوگوں کے دلوں میں ایمان اور تقویٰ کے جذبات ابھارے گئے ۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں یاد دلایا کہ تم تو آغاز ہی سے یہ چاہتے تھے کہ قافلے پر حملہ کر کے مال غنیمت حاصل کر لو ۔ لیکن اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ تمہیں نصرت اور عزت سے نوازے ۔ پھر انہیں یاد دلایا کہ ذرا اس معرکے کے مراحل پر غور کرو کہ تمہاری تعداد اور سازو سامان دشمن کے مقابلے میں بہت ہی کم تھا ' وہ تم سے کہیں زیادہ تھا ۔ مگر اللہ نے فرشتوں کے ذریعے تمہارے قدم مضبوط کئے ۔ پھر اس نے بارش برسا کر تمہارے لئے لڑنا آسان کر دیا ۔ تمہارے پاؤں مضبوطی سے جمتے تھے ' تم بارش کے پانی سے مویشیوں کو سیراب کرتے تھے اور غسل کرتے تھے کیونکہ جنگ بدر ریت کے میدان میں لڑی گئی تھی اور ریت میں انسانوں اور گھوڑوں کے قدم دھنس جایا کرتے ہیں ۔ پھر یاد دلایا گیا کہ تم کو ایک قسم کی نیند نے آلیا اور نیند آتے ہی تم مطمئن ہو گئے ۔ پھر اللہ نے تمہارے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور ان پر شدید عذاب نازل کر دیا ۔

ان تجربات کی روشنی میں قرآن ان کو حکم دیتا ہے کہ تم ہر جنگ میں ثابت قدمی اختیار کرو ۔ اگرچہ بظاہر تمہیں دشمنوں کی قوت زیادہ نظر آئے کیونکہ قتل کرنے والا اللہ ہوتا ہے ۔ اللہ ہی دراصل تیر چلاتا ہے ۔ وہی معاملات کی تدبیر کرتا ہے ' تم تو دراصل تقدیر الٰہی کے لئے ایک پردہ ہو ' وہ تمہیں جس طرح چاہتی ہے ' چلاتی ہے ۔

اس کے بعد اس سبق میں مشرکین کی اس احمقانہ حرکت پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اس واقعہ سے قبل اللہ کے سامنے دست بدعا تھے کہ اے اللہ آپ آج کی جنگ میں اس فرقے کو تباہ کر دیں جو گمراہ ہو اور جو صلہ رحمی کا قاطع ہو ۔ اللہ فرماتے ہیں اَنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ "اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو فیصلہ تمہارے سامنے آگیا "

مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ اپنی زندگیوں سے نفاق کو دور کرو اور منافقوں کا رویہ اختیار نہ کرو ۔ جو کہتے تو یہ تھے کہ ہم سنتے ہیں لیکن سنتے نہ تھے اس لئے کہ وہ سن کر مانتے نہ تھے ۔

اس سبق کے آخر میں مسلمانو! کو بار بار پکارا جاتا ہے کہ مسلمانو! رسول تمہیں جب بھی پکارے تو لبیک کہو ' اس لئے کہ وہ تمہیں ایک ایسی دعوت دیتا ہے جس کے نتیجے میں تمہیں زندگی دوام حاصل ہو گی ۔ اگرچہ بظاہر وہ تمہیں موت اور قتل کی طرف بلا رہا ہو ۔ اللہ اہل ایمان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ وقت یاد کرو جب تم قلیل اور کمزور تھے ۔ تمہیں ہر وقت ہر

طرف سے ڈر لگا رہتا تھا کہ دشمن کہیں تمہیں اچک نہ جائے ۔ان حالات میں اللہ نے تمہیں پناہ دی 'نصرت دی ۔ اور اب تمہارے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ اگر تم تقویٰ کی راہ اختیار کرو تو اللہ تمہیں فیصلہ کن طرز عمل اور فیصلہ کن رائے عطا کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا' تمہاری تقصیرات سے درگذر کرے گا اور اللہ کے ہاں جو کچھ تمہارے لئے دار آخرت میں تیار ہے وہ اس جہاں کے تمام غنائم و اموال سے کہیں زیادہ ہے ۔

---OOO---

درس نمبر ۸۲ تشریح آیات

۱ ــــ تا ـــــ ۲۹

سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ (۸) مَدَنِيَّةٌ (۸۸) اٰيَاتُهَا ۷۵ رُكُوْعَاتُهَا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ۚۖ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴ۚ

(اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔لوگ تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں ۔کہو" یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ہیں ' پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو 'اگر تم مومن ہو ۔" سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں ' جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں ۔ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں ۔ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں 'قصوروں سے درگذر ہے اور بہترین رزق ہے ۔)

ان آیات کے نزول کے بارے میں جو روایات وارد ہیں ' ان کا ایک بڑا حصہ ہم نے اس سورہ کے تعارف کے ضمن میں نقل کیا تھا ۔یہاں ہم بعض دوسری روایات کا اضافہ کرتے ہیں ۔تاکہ وہ حالات قاری کے پیش نظر رہیں جن میں عموماً یہ سورت نازل ہوئی ہے ۔ خصوصاً جن حالات میں وہ آیات نازل ہوئیں جن کا تعلق اموال غنیمت سے ہے ۔ ان روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ مدینہ میں پہلی اسلامی حکومت کے قیام کے وقت جماعت مسلمہ کے خدوخال کیا تھے ؟ اور وہ کن عملی دشواریوں سے گزر رہی تھی ۔

ابن کثیر فرماتے ہیں : ابو داؤد ' نسائی ' ابن جریر ' ابن مردویہ (الفاظ ان کے ہیں) ابن حبان ' اور حاکم نے بواسطہ داؤد ابن ابوہند اور عکرمہ ' ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بدر کا دن آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے یہ یہ کیا ' اسے یہ یہ جزا ہوگی ۔" اسی طرح قوم کے نوجوان آگے بڑھ گئے اور بوڑھے لوگ جھنڈوں کے آس پاس رہے ۔ جب اموال غنیمت کا وقت آیا تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ مطالبات شروع کر دیئے جن کا وعدہ حضور ؐ نے فرمایا تھا ۔ تو بڑے لوگوں نے یہ کہا کہ تم لوگ ترجیحات کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ ہم لوگ تمہارے لئے چادر تھے ' اگر تمہیں شکست ہوتی تو تم ہمارے پاس پناہ لیتے ۔ اس پر ان دو گروہوں کے درمیان تنازعہ ہو گیا ۔ اس موقعہ پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ (۸ : ۱) تا وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور ثوری نے کلبی سے ' ابو صالح سے ' ابن عباس سے یہ روایت کی ہے ۔ کہتے ہیں : جب بدر کی جنگ ہوئی ' تو حضور ؐ نے فرمایا کہ جس نے کسی کو قتل کیا تو اس کے لئے یہ یہ انعام ہو گا اور جس نے کسی کو قید کیا تو اسے یہ یہ انعام دیا جائے گا ۔" اس موقع پر ابو الیسیر نے دو آدمیوں کو قیدی بنا لیا تو انہوں نے عرض کیا یہ لیجئے حضور ؐ آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا ۔ اس پر سعد ابن عبادہ کھڑے ہوئے اور فرمایا حضور ؐ اگر آپ نے ان لوگوں کو اس طرح غنائم دیئے تو آپ کے ساتھیوں کے لئے کچھ نہ رہے گا ۔ نیز ہم لوگ لڑائی کرنے سے اس لئے باز نہیں رہے کہ ہمیں اجر کی ضرورت نہ تھی یا ہم دشمن سے ڈرتے تھے ۔ ہم یہاں اس لئے کھڑے رہے کہ آپ کی حفاظت ہو ۔ یہ نہ ہو کہ دشمن پیچھے سے آپ ؐ پر حملہ کر دے ۔ چنانچہ اس پر کافی تنازعہ ہو گیا اور اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۸ : ۱) انہوں نے کہا اور اسی سلسلے میں یہ آیات بھی نازل ہوئیں وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الخ

امام احمد نے ایک روایت نقل کی ۔ فرماتے ہیں : ابو معاویہ نے روایت کی ہے ' ابو اسحاق شیبانی سے ' محمد ابن عبید اللہ ثقفی سے ' سعد ابن ابو وقاص سے ' یہ کہتے ہیں : بدر کی جنگ کے موقعہ پر میرے بھائی عمر قتل ہو گئے تھے ' میں نے سعید ابن العاص کو قتل کیا اور اس کی تلوار لے لی ۔ اس تلوار کا نام "ذوالکثیفہ" تھا ۔ میں یہ تلوار لے کر حضور ؐ کے پاس آیا ۔ حضور ؐ نے فرمایا جاؤ اور اسے مقبوضات میں پھینک دو ۔ کہتے ہیں ' میں تلوار پھینک کر لوٹا لیکن میرے حال کو صرف خدا ہی جانتا تھا کہ میرا بھائی بھی قتل ہو گیا اور میرے ہاتھ جو قیمتی چیز لگی تھی وہ بھی نہ مل سکی ۔ میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ سورہ انفال نازل ہو گئی ۔ حضور ؐ نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ وہ تلوار لے لو جو تمہارے ہاتھ لگی تھی ۔

امام احمد فرماتے ہیں ' اسود ابن عامر نے روایت کی ' ابوبکر سے ' عاصم ابن ابو النجود سے ' مصعب ابن سعد سے ' سعد ابن مالک سے ۔ یہ کہتے ہیں : میں نے حضور ؐ سے کہا کہ آج اللہ نے مشرکین سے مجھے شفا عطا کی تو یہ تلوار آپ مجھے بخش دیں ۔ حضور ؐ نے فرمایا یہ تلوار نہ میرے لئے ہے اور نہ تیرے لئے ۔ اسے ادھر رکھ دو ۔" تو اس نے کہا کہ میں نے تلوار رکھ دی اور واپس ہو گیا ۔ ممکن ہے کہ یہ تلوار اس شخص کو ملے جس نے میری طرح اس کا حق ادا نہ کیا ہو ۔ اچانک میں نے سنا کہ ایک شخص پیچھے سے مجھے پکار رہا ہے ۔ کہتے ہیں میں نے یہی سمجھا کہ شاید میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہو گئی ۔ حضور ؐ نے فرمایا تم نے مجھ سے تلوار مانگی تھی ' اور یہ میری ملکیت نہ تھی اور اب یہ مجھے بخش دی گئی ہے لہٰذا اب یہ تمہاری ہے ۔" اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں ۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (۸ : ۱) ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے ابوبکر ابن عیاش سے یہ روایت نقل کی ہے۔ متعدد طریقوں سے، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔

ان روایات سے وہ فضا معلوم ہو جاتی ہے جس میں سورہ انفال نازل ہوئی۔ انسان یہ روایات پڑھ کر ایک بار حیران سا ہو جاتا ہے کہ اہل بدر اور یہ باتیں! اس لئے کہ ان میں تو وہ لوگ تھے جو یا تو مہاجرین تھے جنہوں نے مکہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اور محض اپنے نظریات کی وجہ سے مدینہ چلے آئے تھے اور ان کی نظروں میں اس دنیا کے مفادات بہرحال ہیچ تھے۔ یا ان میں وہ انصار سابقین تھے جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی تھی اور انہیں اپنے علاقے اور اموال میں شریک کر لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد میں بھی بخل نہ کرتے تھے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹ : ۹) "یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ محتاج ہوں۔"

اس صورت حالات کی تشریح کی طرف اشارہ خود ان روایات میں موجود ہے۔ اس وقت مال غنیمت کا تعلق اس بہادری اور شجاعت سے تھا، جس کا مظاہرہ ایک فوجی میدان جنگ میں کرتا تھا اور یہ مالی انعام اس بات کی علامت بھی ہوا کرتا تھا کہ انعام پانے والے نے داد شجاعت دی ہے اور اس دور میں لوگ اس بات کی خواہش رکھتے تھے کہ انہیں رسول اللہ کے ہاتھوں انعام خصوصی ملے جو براہ راست اللہ کی طرف سے انعام تصور ہو گا۔ خصوصاً اس پہلے معرکے میں جو اسلام اور کفر کے درمیان برپا ہوا۔ اس حرص اور انعام کے اس لالچ میں ایک دوسری صفت دب کر رہ گئی اور بعض لوگوں نے اموال غنیمت کے بارے میں بات کی اور اللہ نے ان کو اس صفت کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ معاملات میں ذرا حسن معاملت کی ضرورت ہے اور تمہاری قلبی اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا اور سمجھ گئے۔ ایک موقع پر حضرت عبادہ ابن الصامت نے فرمایا: "یہ آیات ہم اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئیں۔ جب ہم نے اموال غنیمت میں اختلاف کیا اور اس میں ہم اخلاقی حدود سے آگے نکل گئے۔ اللہ ان اموال کو ہمارے اختیار سے نکال لایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا۔"

اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی عملی اور لسانی تربیت فرمائی۔ چنانچہ اموال غنیمت کی تقسیم کے اختیارات ان سے لے لئے اور کلی طور پر یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیئے۔ یہاں تک کہ تقسیم غنائم کے بارے میں تفصیلی احکامات نازل ہوئے۔ لہٰذا اس معاملے میں ان کے لئے کسی تنازعے کا کوئی حق ہی نہ رہا۔ یہ اللہ کا فضل ہو گیا۔ رسول اللہ نے ان کے درمیان ان کی تقسیم اس طرح فرمائی جس طرح رب تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دی۔ اس عملی اصلاح کے ساتھ ساتھ یہ طویل اور مسلسل ہدایات بھی ان کو دی گئیں اور یہ ہدایات اس سورہ میں دور تک چلی گئیں۔ آغاز یوں ہوا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸: ۱) "تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو "یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ہیں، پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔"

یہ سوال ان لوگوں کی جانب سے تھا جنہوں نے غنائم پر تنازعہ کیا تھا اور یہ پکار بھی انہی کے نام ہے کہ اللہ کا خوف کرو، اللہ تمہارے دلوں کا خالق ہے اور تمہارے دلوں میں جو باتیں آتی ہیں ان کو وہ جانتا ہے۔ اللہ اس بات پر گرفت نہیں کرتا کہ کسی کے دل میں دنیاوی مقاصد کی خواہش کیوں آتی ہے۔ اور اس پر نزاع کیوں واقع ہو گیا۔ اگرچہ اس نزاع کی تہ میں یہ جذبہ تھا کہ رسول کے ہاتھوں ان کو انعام ملے جو ان کے حسن کارکردگی پر دلیل و برہان ہو۔ لیکن اللہ نے دنیا و آخرت کی کامیابی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ تم اپنے دلوں میں تقویٰ اور خدا خوفی کا جذبہ پیدا کرو، اس لئے کہ جس دل کا تعلق باللہ نہ ہو اور وہ اللہ کے غضب سے نہ ڈرتا ہو اور اسے رضائے الٰہی کے حصول کی خواہش نہ ہو تو وہ ہرگز دنیاوی مفادات کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور وہ کبھی بھی شعوری طور پر ان آلودگیوں سے دور نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ دلوں کی لگام ہے اور تقویٰ ہی کے ذریعے دلوں کی قیادت کی جا سکتی ہے اور بڑی ہی سہولت کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ قرآن کریم اول سے آخر تک انسان کی قیادت اسی تقویٰ اور تعلق باللہ کی لگام کے ذریعے کرتا ہے اور اس کو اصلاح کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۸: ۱) "تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔" اور آگے کہا جاتا ہے کہ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی وجہ سے تم اطاعت رسول کر سکتے ہو۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸: ۱) "اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔"

اللہ اور رسول ؐ کی پہلی اطاعت یہ ہے کہ تم ان احکام کو تسلیم کرو جو اللہ کی طرف سے انفال کے بارے میں آ رہے ہیں۔ مثلاً اموال غنیمت کو اب مجاہدین کی ملکیت سے نکال دیا گیا ہے اور ان کی ملکیت اللہ اور رسول ؐ کو دے دی گئی ہے۔ لہٰذا اب ان کے بارے میں تصرف کا حق صرف اللہ اور رسول ؐ کو ہے۔ اہل ایمان کا فرض یہ ہے کہ اس کے بارے میں اللہ اور رسول ؐ کے احکام کو تسلیم کریں۔ اور اللہ کی ہدایات کے مطابق رسول اللہ ؐ کی تقسیم کو قبول کریں اور بطیب خاطر قبول کریں، راضی برضا ہوں اور اپنے مابین کے تعلقات کی اصلاح کریں اور اپنے شعور اور احساسات کو درست کریں اور اپنے دلوں کو ایک دوسرے کے معاملے میں صاف کر لیں۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸: ۱) "اگر تم مومن ہو۔"

یہ ضروری ہے کہ ایمان کی کوئی عملی اور واقعی صورت ہو۔ اور اس عملی صورت میں ایمان نظر آئے اور واضح طور پر نمایاں ہو۔ وہ مجسم شکل میں نظر آئے اور انسان کے اعمال اس کے ایمان کے ترجمان ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ليس الايمان بالتمني ولكن هو ما وقر في القلب وصدقه الاعمال "ایمان صرف تمنا نہیں، یہ دل میں جاگزیں ہوتا ہے اور اعمال ایمان کی تصدیق کرتے ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اس قسم کے فقرے فیصلہ کن انداز میں بار بار آتے ہیں اور ان سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے اور اس کا اعمال کے

ساتھ کیا تعلق ہے۔ایمان صرف الفاظ کا نام نہیں ہے جو زبان پر جاری ہوتے ہیں' یا وہ محض تمنا بھی نہیں ہے جو نہ عالم واقعہ میں کچھ حقیقت رکھتی ہو اور نہ عالم اعمال میں اس کا وجود ہو!

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ایک سچے مومن کی حقیقی صفات کیا ہوتی ہیں تاکہ ان کو یہ بتایا جائے کہ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۸ : ۱) سے مراد کیا ہے؟ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ رب العالمین کے نزدیک مومن ایسا ہوتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ (۲) الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۳) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ (٤) (۸ : ۲ تا ٤) "سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں' قصوروں سے درگذر ہے اور بہترین رزق ہے۔"

لفظی اور نحوی اعتبار سے ان آیات کا طرز تعبیر نہایت ہی معنی خیز ہے اور نہایت ہی گہری معنویت رکھتا ہے۔یہاں لفظ قصر (انما) استعمال کیا گیا ہے۔اور یہاں کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ ہم لفظ انما کی قصر کی تاویل کریں جبکہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی تاکید سے ایک بات کہنا چاہتے ہیں' تاویلات یوں کی گئی ہیں کہ اس سے مراد ایمان کامل ہے۔اگر اللہ اس طرح کہنا چاہتا تو کہتا کہ کامل مومن وہ ہیں جو ایسے ایسے ہوں' درحقیقت یہ ایک نہایت مفصل تعبیر ہے۔مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا احساس و شعور ایسا ہو اور جن کے صفات و اعمال ایسے ہوں وہی درحقیقت مومن ہوتے ہیں۔اور جن لوگوں کے اندر یہ صفات و اعمال نہیں ہیں وہ مومن نہیں ہیں اس لئے کہ اس آیت کے آخر میں اس نکتے کی بتکرار تاکید کی گئی ہے۔اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا "ایسے ہی لوگ فی الحقیقت مومن ہیں۔" اور جو لوگ فی الحقیقت مومن نہیں ہوتے وہ پھر کس طرح کے لوگ مومن کہلاتے ہیں---- قرآن کی تعبیرات خود ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر کرتی ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ "حق سے آگے گمراہی کے سوا اور ہو کیا سکتا ہے۔" اس لئے جو حق نہ ہو گا وہ ضلالت ہو گی۔میں یہ کہتا ہوں کہ اَلْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کے مقابلے کی تعبیر یہ نہیں ہو سکتی۔اَلْمُؤْمِنُوْنَ اِیْمَانًا غَیْر ------ لہٰذا قرآن مجید کی اس قدر واضح اور دقیق انداز تعبیر کو تاویلات کے خراد پر نہیں چڑھانا چاہئے جن کی وجہ سے ہر صحیح تصور اور ہر صحیح تعبیر اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ بعض سلف صالحین یہ کہتے تھے کہ جس شخص کے عقیدے کے اندر اور اعمال کے اندر یہ صفات نہ ہوں اس نے ایمان نہیں پایا۔اور وہ سرے سے مومن ہی نہیں ہے۔ابن کثیر میں ہے 'علی ابن طلحہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آیت

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۸: ۲) "میں درحقیقت منافقین کا ذکر ہے' وہ جب نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں ان کے دلوں میں کچھ بھی داخل نہیں ہوتا اور وہ درحقیقت آیات الٰہیہ پر ایمان ہی نہیں رکھتے اور اللہ پر توکل ہی نہیں کرتے۔ اور جب لوگوں کے سامنے نہ ہوں تو ان کے ساتھ صلہ رحمی بھی نہیں کرتے اور وہ اپنے اموال کی زکوۃ بھی نہیں دیتے۔" تو اللہ نے ان منافقین کے بارے میں خبر دی کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے حقیقی مومنوں کی صفات گنوا دیں۔ مثلاً

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۸: ۲) "اہل ایمان وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں۔" اس طرح وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (۸: ۲) "جب ان پر آیات الٰہیہ پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے۔" یعنی ان کی تصدیق میں اضافہ ہوتا ہے۔ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۸: ۲) "اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔"

آئندہ سطور میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ ان حقائق کے بغیر سرے سے ایمان کا وجود ہی نہیں قائم رہتا۔ اور اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے ایمان کامل ہوتا ہے اور نہ ہونے سے ناقص ہوتا ہے بلکہ سوال ایمان کے عدم یا وجود کا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۸: ۲) "اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں۔" جب کوئی مومن کسی امر یا نہی کے سلسلے میں اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ان کے دل کے اندر ایک وجدانی ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ان کے دل پر اللہ کی جلالت شان کی وجہ سے ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور ان کے دل میں خوف خدا کی لہریں اٹھتی ہیں' اس طرح ان کی تقصیرات اور گناہوں کے بالمقابل اللہ کی ہیبت آکھڑی ہوتی ہے اور اس طرح وہ باعث بنتی ہے عمل اور طاقت کا۔ جیسا کہ ام الدرداء رضی اللہ عنہا نے کہا: الوجل في القلب كا فراق السعفة اما تجد له قشطريره؟ قال بلى قالت اذا وجدت فاذا وجدت ذلك فادع الله عند ذلك فان الدعاءيذهب ذلك "وجل" کا مطلب یوں سمجھئے کہ جب کسی کو پھنسیاں نکل آئیں تو اسے جلن ہوتی ہے۔ کیا تم ایسی حالت میں کپکپی محسوس نہیں کرتے۔ کہا' ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ فرمایا جب تم ایسی حالت کو پاؤ تو اللہ کو پکارو' دعا کے نتیجے میں یہ حالت چلی جاتی ہے۔"

غرض یہ وہ حالت ہے جس میں دل میں بے قراری پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے حالات میں ذکر اور دعاء کے نتیجے میں انسان کو راحت اور قرار نصیب ہوتا ہے اور یہ وہ حالت ہے جب انسان کسی امر اور نہی کے معاملے میں اللہ کو یاد کرتا ہے۔

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (۸: ۲) "اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔" قلب مومن کے لئے فی الحقیقت ان آیات میں وہ نکات ہیں جو اس کے ایمان کے لئے اضافہ کا باعث ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے مومن کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے۔ قرآن قلب مومن کے ساتھ براہ راست سلوک اور برتاؤ کرتا ہے اور قرآن اور قلب مومن کے درمیان صرف کفر کا پردہ حائل ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے قرآن

سے قلب مجوب ہو جاتا ہے اور قلب سے قرآن ۔جب ایمان کی وجہ سے حجاب اٹھتا ہے تو دل حلاوت قرآن کو محسوس کرنے لگتا ہے اور اس طرح قرآنی اثرات پڑتے پڑتے ایمان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔یہاں تک کہ انسان کامل اطمینان کے مقام تک پہنچ جاتا ہے ۔جس طرح قرآن کے اثرات دل میں ایمان کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں ۔اسی طرح دل بھی قرآن کے اثرات کو اپنی طرف کھینچتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں یہ فقرہ بار بار آتا ہے ۔ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ "بے شک اس میں مومنین کے لئے نشانیاں ہیں ۔" اس فقرے میں اسی حقیقت کو دہرایا جاتا ہے ۔ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ "اس میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو ایمان لاتی ہے ۔" اور بعض صحابہ کرام کے اس قول کا یہی مطلب ہے کہ "ہمیں قرآن دیئے جانے سے قبل ایمان دیا جاتا تھا ۔"

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام قرآن کے ساتھ ایک مخصوص تعلق اور ذوق رکھتے تھے ۔ اور اس میں ان کی مدد وہ فضا کرتی تھی جس میں وہ باد نسیم کے جھونکے پاتے تھے جبکہ قرآن ان کی عملی زندگی تھا ۔ایک عمل تھا' محض ذوق و ادراک نہ تھا ۔ اس آیت کے نزول کی روایات میں ایک روایت سعد ابن مالک کا قول ہے ۔انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ ان کو مال غنیمت کے طور پر ایک تلوار دے دیں ۔اس وقت قرآن کی وہ آیات نازل نہ ہوئی تھیں جن میں غنائم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیارات کی طرف لوٹا دیا گیا تھا ۔ آپ ؐ کو نہ یہ اختیار دیا گیا تھا کہ آپ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں ۔اور حضور ؐ نے انہیں جواب دیا تھا :"بے شک یہ تلوار نہ میری ہے اور نہ تیری ہے ۔اسے اموال کے ساتھ رکھ دیں ۔" جب سعد کو دوبارہ پیچھے سے پکارا گیا حالانکہ وہ تلوار رکھ کر واپس ہو گئے تھے تو وہ توقع رکھتے تھے کہ شاید اللہ نے اس معاملے میں کچھ آیات اتار دی ہیں ۔کہتے ہیں :"میں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں کچھ آیات نازل کر دی ہیں؟" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'تم نے مجھ سے تلوار کے لئے درخواست کی تھی' حالانکہ اس وقت وہ میرے اختیار میں نہ تھی' اب چونکہ اللہ نے غنائم مجھے دے دیئے ہیں لہذا میں نے تجھے دے دی ۔" یہ تھا ان لوگوں کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ اور یہ تھا ان کا سلوک اس قرآن کے ساتھ جو مسلسل نازل ہو رہا تھا ۔یہ ایک عظیم طرز عمل ہے ۔

انسانی تاریخ میں یہ ایک عجیب دور تھا ۔اس لئے وہ قرآن کو اس طرح چکھتے تھے اور اسے سنتے ہی اپنی عملی زندگی میں واقعیت دے دیتے تھے ۔ان کا یہ ذوق خاص اس واقعیت کو ایک نہایت ہی اچھی کیفیت عطا کر دیتا تھا اور سامع اور قاری دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے تھے ۔اگرچہ یہ پہلا تجربہ تو دہرایا نہیں جا سکتا لیکن جب بھی اس کرۂ ارض پر کوئی مومن گروہ وجود میں آتا ہے تو ایسے ہی تجربات سامنے آتے رہتے ہیں بشرطیکہ اٹھنے والی تحریکات دین کو اسی طرح قائم کرنے کا مقصد پیش نظر رکھتی ہوں جس طرح جماعت مسلمہ اولیٰ کا مقصد تھا اور ایسی ہی جماعتیں جو کہیں کہیں اٹھتی ہیں اور جماعت اول کی طرح اقامت دین کا نصب العین رکھتی ہیں' انہی کے اندر قرآن فہمی کا وہ ذوق پیدا ہوتا ہے' جو جماعت اولیٰ کے مماثل ہوتا ہے ۔اس کی تلاوت سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے ۔ان جماعتوں کے نزدیک دین اس تحریک کا نام ہوتا ہے جس کا مقصد دین کی اقامت ہو اور اس پہلے تجربے کو دہرانا مقصود ہوتا ہے ۔ایسے لوگوں کے نزدیک ایمان محض تمنا نہیں ہوتا بلکہ ایمان اس حقیقت کو کہا جاتا ہے جو دل میں اچھی طرح جاگزیں ہو اور عمل کی صورت میں اس کا ظہور ہو ۔ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ "اور وہ اپنے رب پر اعتماد کرتے ہیں ۔" صرف رب پر ۔نحوی ترکیب کی رو سے

اس کا یہی معنی ہے یعنی حصری۔

وہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کر کے اس سے نہ استعانت کرتے ہیں اور نہ اس پر توکل کرتے ہیں۔ امام ابن کثیر نے لکھا ہے "وہ اس کے سوا کسی سے امید نہیں رکھتے 'کسی کی طرف قصد ہی نہیں کرتے 'کسی کے ہاں پناہ ہی نہیں لیتے 'کسی سے حوائج طلب نہیں کرتے 'کسی کی طرف ان کی رغبت اور میلان ہی نہیں ہوتا اور وہ جانتے ہیں کہ اللہ جو کچھ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو کچھ نہیں چاہتا' نہیں ہوتا۔ وہ اس کائنات میں اکیلا صاحب اختیار ہے ' اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے ' نہ اس کے حکم سے کوئی سرتابی کر سکتا ہے۔ وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ چنانچہ حضرت سعید ابن جبیر کہتے ہیں۔ اللہ پر توکل کرنا ایمان کی لذت ہے۔

یہ تو ہے اللہ کی وحدانیت کے عقیدے کا اخلاص ' اللہ کی بندگی کا اخلاص ' لہذا اب یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک دل میں عقیدہ توحید بھی ہو اور اس کے ساتھ وہ شخص اللہ کے سوا اوروں پر بھروسہ بھی کرتا ہو۔ جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور دوسروں پر تکیہ کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ذرا غور سے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ آیا ان میں ایمان بھی ہے یا نہیں۔

ہاں اللہ پر توکل مانع اسباب نہیں ہے کیونکہ مومن اسباب کو بھی ایمان اور اطاعت کی راہ سے لیتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ مسبب الاسباب بھی اللہ ہے اور اسی نے انسان کو راہ اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن مومن کا یہ ایمان بھی ہوتا ہے کہ نتائج کا نکلنا اسباب پر موقوف نہیں ہے۔ جس طرح اسباب اللہ کی مخلوق و مقدور میں ہیں اسی طرح نتائج بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ مومن کے شعور و عقیدہ میں یہ بات لازمی نہیں ہے کہ خدا کے مہیا کردہ اسباب کے بعد بھی نتائج نمودار ہوں۔ لہذا اسباب کا اختیار کرنا عبادت و اطاعت ہے اور نتائج اللہ کی تقدیر پر نمودار ہوں گے۔ نتائج کا صدور اللہ کی تقدیر کے تابع ہے۔ صرف اللہ چاہے تو نتائج نمودار ہوں گے۔ ایک مومن کے شعور میں اسباب و نتائج کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک مومن کا شعور اسباب کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس آزادی کے ساتھ ساتھ ایک مومن اسباب کو برائے حصول ثواب اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کا مطیع ہو۔

جاہلیت جدیدہ ابھی تک اپنے اس نظریہ کے تاریک سمندر میں غوطے کھا رہی ہے کہ اسباب و مسبب کا باہم تعلق قطعی ہے اور قوانین طبیعی اٹل ہیں تاکہ اللہ کی تقدیر اور اللہ کی غیبی قوت کی نفی کر سکیں۔ لیکن جونہی اس جاہلیت نے اس راہ پر ایک حد تک سفر طے کیا' اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے آگے تو اللہ کی تقدیر کی حدود شروع ہو گئی ہیں اور اس سرحد پر یہ جاہلیت حیران و پریشان کھڑی ہے اب اس نے عالم مادی میں قوانین طبیعت کے اٹل ہونے کے نظریے کو ترک کر کے "احتمالات" کا نظریہ اپنا لیا ہے۔ گویا پہلے جس چیز کو وہ اٹل کہتے تھے اب "محتمل" ہو گئی ہے اور عالم غیب کی جس سرحد پر یہ جاہلیت کھڑی ہے۔ اس سے آگے اس کے تمام راستے بند ہیں اور یہی حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ یہ تقدیر الہٰی ہی ہے جو اس عالم میں کام کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ آیت اس عالم غیب پر حکمران ہے۔ لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا "تمہیں نہیں معلوم کہ شاید اللہ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دے۔" تقدیر الہیہ کا نظریہ ہی حتمی اور آخری نظریہ ہے۔ اور یہ نظریہ صاف کہتا ہے کہ اس دنیا کے مادی قوانین کے پیچھے ارادہ الہیہ کار فرما ہے اور اللہ کا ارادہ بے قید ہے۔ جو چاہتا ہے ' کرتا ہے اور اس کا ارادہ مطلق اور آزاد ہے۔ اپنے بنائے ہوئے نظام اسباب و مسبب کا پابند نہیں ہے۔

سر جیمس طبیعیات اور ریاضی کے پروفیسر ہیں - وہ کہتے ہیں: "قدیم سائنس یہ بات وثوق سے کہتی تھی کہ طبیعت صرف ایک ہی راہ لے سکتی ہے اور وہ وہی راہ ہے جو اس کے لئے اس کے چلنے سے پہلے ہی تجویز کر دی گئی ہے - اس پر اسے آغاز سے لے کر انجام تک چلنا ہے - اور مسلسل اور دائماعلل اور معلول کا قانون اس کائنات میں جاری ہے - اس بات میں تخلف نہیں ہو سکتا کہ حالت (الف) کے بعد حالت (ب) پیدا ہو گی - رہی جدید سائنس تو اس کی رو سے صرف یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ حالت (ب) کے بعد اس بات کا احتمال ہے کہ حالت (ب) کے ظہور کا احتمال دوسرے احتمالات سے زیادہ ہے - یاج کا احتمال (د) سے زیادہ ہے علیٰ ھذا القیاس -

نیز سائنس کے دائرہ قدرت کے اندر یہ بات بھی ہے کہ وہ (ب)' (ج) اور (د) کے احتمالات کی نسبت کا تعین کر دے - لیکن نتیجے کے بارے میں کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے - کہ (الف) کی حالت کے بعد کون سی حالت کا ظہور ہو گا کیونکہ احتمال بہرحال احتمال ہوتا ہے لیکن کون سی حالت صادر ہوئی ہے - یہ پھر تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے - اب تقدیر کی حقیقت کیا ہے' جو حقیقت بھی ہو -" (تفصیلی بحث ہم آیت عندہ مفاتح الغیب میں کر آئے ہیں) (دیکھئے پارہ ہفتم ص)

جب قلب مومن اسباب ظاہریہ کے دباؤ سے آزاد ہو جائے تو پھر غیراللہ پر بھروسہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ اس لئے کہ یہ اللہ کی تقدیر ہی ہے' جس کے پیچھے سے سب کچھ نمودار ہو رہا ہے اور یہی یقینی حقیقت ہے - رہے ظاہری اسباب تو ان کے نتیجے میں صرف حتمی احتمالات ہی وجود میں آ سکتے ہیں - یہ ہے وہ عظیم انقلاب جو اسلامی نظریہ حیات انسانی قلب کے اندر پیدا کر دیتا ہے اور اسی کے مطابق انسانی سوچ پروان چڑھتی ہے - جدید جاہلیت تین سو سال تک اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی اور پورے تین سو سال کے بعد وہ اس ابتدائی حقیقت کے دروازے تک پہنچ سکی ہے - یعنی خالص عقلی اعتبار سے - لیکن ابھی تک شعوری طور پر وہ اس حقیقت میں داخل نہیں ہوئی ہے اور نہ انسانیت نے ابھی تک وہ طرز عمل اختیار کیا ہے جو اللہ کے نظام قضا و قدر کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہئے یا جو اسباب ظاہریہ کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہئے - یہ انقلاب دراصل عقلی آزادی اور عقلی انقلاب ہے - شعوری انقلاب' سیاسی انقلاب ہے - معاشرتی انقلاب ہے اور اخلاقی انقلاب ہے - اور کوئی انسان جب تک وہ اسباب کا غلام ہے اور طبیعت کو اٹل سمجھتا ہے' آزاد نہیں کہلا سکتا - کیونکہ جب وہ اسباب کو اٹل سمجھتا ہے تو پھر وہ انسانوں کے ارادے کا غلام بن جائے گا یا طبیعت کے ارادے کا غلام تصور ہو گا - کیونکہ اگر کوئی شخص اللہ کے ارادے اور تقدیر کے سوا کسی اور چیز کو بھی حتمی سمجھتا ہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ آزاد نہیں ہے' غلام ہے - یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا کہ صرف اللہ پر بھروسہ کرو اور اللہ اور صرف اللہ پر بھروسہ ہی ایمان اور عدم ایمان پر دلالت ہے اسلام کا نظام تصورات ایک کل اور اکائی ہے - اور اس تصور حیات پر جو نظام تجویز ہوا ہے وہ بھی ایک کل' متکامل اور اکائی ہے - اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ "جو نماز قائم کرتے ہیں -" یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان ایک متحرک صورت میں ہمارے سامنے ہے - اس سے قبل جو حقائق بیان ہوئے' ان میں ایمان ایک قلبی اور ذہنی حقیقت تھی' جو نظر نہ آتی تھی - کیونکہ ایمان کی تعریف ہی یہ ہے جو دل میں پروقار طریقے سے بیٹھا ہو اور اعمال جوارح ہی اس کی تصدیق کر رہے ہوں کہ وہ ہے - لہذا عمل ایمان کی دلالت ظاہری ہے - اور یہ ظاہری علامات کا ظہور لابدی ہے تاکہ یہ گواہی فراہم ہو سکے کہ دلوں کے اندر ایمان موجود ہے -

اقامت صلوٰۃ کا مفہوم صرف یہ نہیں ہے کہ نماز کو ادا کر لیا جائے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کو حقیقی معنوں

میں ادا کیا جائے یوں کہ نظر آئے کہ نمازی اللہ کے حضور کھڑا ہے۔ نماز محض قیام تعوذ اور قراۃ ہی نہ ہو کہ رکوع و سجود ہو اور دل غافل ہو۔ نماز اگر صحیح طرح قائم ہو تو وہ ایمان پر گواہ ہے۔ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ''اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' یہ عام ہے خواہ زکوۃ ہو یا دوسرے صدقات ہوں۔ جو بھی خرچ کیا جائے وہ اللہ کے دیئے ہوئے سے ہو گا۔ اس لئے وہ اللہ کے دین کا حصہ تصور ہو گا۔ قرآن کی ہدایت کا اپنا رنگ ہوتا ہے اور اس کے اندر خاص تعبیری اشارات ہوتے ہیں۔ یہاں یہ اشارہ ہے کہ اس مال و دولت کو تم نے نہیں پیدا کیا۔ یہ تو اللہ نے تمہیں دیا ہے اور تمہیں جو بھی دیا گیا ہے وہ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے اور اللہ کا دیا ہوا اس قدر زیادہ ہے کہ انسان اسے گن ہی نہیں سکتا۔ اور جب انسان اللہ کے دیئے ہوئے میں سے دیتا ہے تو ظاہر ہے اس کا ایک حصہ دیتا ہے اور باقی کو اپنے لئے محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا دیا ہوا ہوتا ہے۔

یہ وہ صفات ہیں جن کے اندر اللہ نے ایمان کو محدود کر دیا ہے۔ ان صفات میں ایک تو اللہ کی وحدانیت کا اعتقاد ہے اور اس کی وحدانیت کو قبول کرتے ہوئے ذکر الٰہی اور پھر اللہ کی آیات اور ذکر الٰہی سے قلبی تاثر لینا' پھر اللہ وحدہ پر توکل کرنا' پھر اقامت صلوٰۃ کماحقہ' اور سب سے آخر میں یہ کہ اللہ کے دیئے ہوئے میں سے کچھ حصہ اس کی راہ میں صرف کرنا' یہ ہیں اس مقام پر علامات ایمان۔

یہ آیات و صفات درحقیقت ایمان کے اجزاء اور تفصیلات نہیں ہیں۔ جیسا کہ دوسری آیات میں ذکر ہوا ہے بلکہ یہاں ایمان کی واقعی صورت حالات کو بیان کیا گیا ہے یعنی وہ واقعی صورت حالات جن میں انفال و غنائم کے بارے میں اختلاف ہو گیا اور اہل ایمان کے باہم تعلقات خراب ہو گئے۔ لہذا یہاں اہل ایمان کو مومنین کی صفات سے آگاہ کیا جاتا ہے اور انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ اہل ایمان کی صفات ایسی ہوتی ہیں لیکن اگر ان صفات میں سے کسی میں کوئی صفت بھی موجود نہ ہو تو ایسے لوگوں سے حقیقت ایمان عملاً منتفی ہو سکتی ہے۔ لہذا یہ صفات ایمان کی اساسی علامات ہیں' چاہے یہ ایمان کی پوری صفات ہوں یا پوری نہ ہوں' کیونکہ یہ اسلامی نظام تربیت کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ مخصوص حالات کے لئے ایمان کی کون سی شرائط کا تذکرہ کرتا ہے اور کون سی شرائط کا نہیں کرتا۔ کیونکہ اسلامی منہاج تربیت ایک عملی اور حقیقت پسندانہ منہاج ہے۔ یہ محض نظریاتی طریقہ کار نہیں ہے کہ وہ ایک نظریہ وضع کرے اور اسے پھیلائے فقط۔ اسی قاعدے کے مطابق یہ آخری تبصرہ ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ

(۸ : ٤) ''ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں' قصور سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔''

یہ وہ صفات ہیں جو کوئی بھی حقیقی مومن اپنے نفس اور اپنے اعمال کے اندر موجود پاتا ہے۔ اگر یہ تمام صفات کسی کی ذات سے غائب ہوں تو گویا اس میں ایمان کی کوئی صفت نہیں ہے۔ یہ آیات چونکہ ایک واقعی صورت حالات کی طرف مخاطب ہیں اس لئے ان کا تقاضا یہ ہے کہ مخصوص حالات میں جس کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کے لئے اجر عظیم ہے اور جن لوگوں کے اندر یہ صفات ہیں ان کے لئے اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے اور بڑے درجے ہیں۔ اسی

طرح ان میں ان واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس وقت اہل ایمان کے درمیان رونما ہوئے جیسا کہ حضرت عبادہ ابن الصامت نے فرمایا۔ تو ان آیات میں کہا گیا کہ ان لوگوں کے لئے مغفرت ہے۔ اور جن لوگوں نے اموال کے لئے نزاع کیا ان کے لئے بہترین رزق ہے۔ لہٰذا ان آیات میں ان جزوی واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اور اپنی جگہ بات اصولی طور پر کہہ دی گئی ہے کہ مومن ایسے ہوتے ہیں۔ یہ ان کی صفات ہیں اور جس میں یہ نہ ہوں وہ اپنے ایمان کی خبر لے۔ أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (۸: ۴) "ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔"

پہلی اسلامی جماعت کو یہ بات سکھائی جا رہی ہے کہ ایمان کی ایک حقیقت ہے اور ہر مومن کو چاہئے کہ اس کے نفس میں وہ حقائق پائے جائیں۔ ایمان محض دعویٰ نہیں ہے۔ نہ ایمان چند کلمات کا نام ہے اور نہ چند معصوم تمناؤں کا نام ہے۔ حافظ طبرانی ایک روایت کرتے ہیں' محمد ابن عبداللہ حضرمی سے 'ابوبکر سے ' ابد ابن الحباب سے ' ابن لبیعہ سے ' خالد ابن یزد سکسکی سے ' سعید ابن بلال سے ' محمد ابن ابو الجہم سے ' حارث ابن مالک انصاری سے 'یہ کہتے ہیں : کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اور رسول اللہ نے کہا "حارث تم صبح کیسے اٹھے؟" تو حارث نے کہا کہ "میں ایک سچے مومن کی طرح اٹھا ہوں۔" آپ نے فرمایا ذرا دیکھو کیا کہہ رہے ہو؟ کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ حارث نے کہا "میں نے دنیا سے نفرت کر لی ہے 'رات کو جاگتا ہوں اور دن کو مطمئن رہتا ہوں۔ میری حالت یہ ہے کہ گویا میں اللہ کے عرش عظیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ گویا میں اہل جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے ملاقاتیں کر رہے ہیں اور میں اہل جہنم کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہیں۔

حضور ؐ نے فرمایا "حارث تم نے پالیا ہے لہٰذا اسے پکڑے رکھو۔" یہ بات آپ نے تین بار کہی۔ یہ صحابی جو رسول اللہ کی طرف سے سند معرفت کے مستحق قرار پائے انہوں نے اپنے نفس کا حال بیان کرتے ہوئے ایسی باتوں کا ذکر کیا جس سے اس کے شعور کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے اور اس نے ایسی چیزوں کا تذکرہ بھی کیا جن کا تعلق اعمال و حرکات سے ہے 'گویا وہ عرش ربی کو دیکھ رہا ہے۔ اہل جنت کو دیکھ رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اہل جہنم کو دیکھ رہا ہے۔

یہ صحابی محض نظریات کی بات نہیں کرتے۔ وہ مسلسل اعمال کی بات کرتے ہیں۔ یہ اعمال اور حرکات اسی شعور سمیت اس کی زندگی پر حاوی ہیں۔ وہ رات کو جاگتے اور دن کو اطمینان کے ساتھ سوتے ہیں اور یقین ایسا ہے کہ انہیں سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

حقیقت ایمان کے بارے میں ہمیں بہت ہی سنجیدہ ہونا چاہئے۔ اس لئے اس معاملے میں ہمیں اس قدر لبرل نہیں ہونا چاہئے۔ ایمان چند کلمات کا نام رہ جائے جو زبان پر جاری ہوتے رہیں لیکن عملی زندگی اس کے برعکس گواہی دے رہی ہو۔ تو یہ حالت حقیقت ایمان سے خالی ہے احتیاط کے معنی یہ نہیں کہ ہم ایمان کے بارے میں صرف لبرل ہو جائیں۔ ایمان کی شعوری حقیقت کا وجود لازمی ہے۔ اور اس کے تصور میں احتیاط ضروری ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے معاملے میں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ امامت دین کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے اٹھے ہیں جبکہ آج یہ لوگ جس آبادی میں اقامت دین کا کام کرنے اٹھے وہ مکمل جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور جاہلیت کے قالب میں ڈھل چکی ہے۔

---○○○---

اب اس معرکے کے واقعات یہاں بیان کئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ اموال غنیمت ہاتھ آئے تھے اور نتیجۃً مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ الجھ گئے تھے جیساکہ حضرت عبادہ ابن الصامت نے نہایت ہی خلوص ' وضاحت اور صاف گوئی سے بتایا۔ یہاں حالات و واقعات پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں مختلف لوگوں کے موقف اور احساس کو قلم بند کیا گیا ہے ۔اس پورے تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معرکے میں مسلمان دست قدرت کے لئے گویا ایک پردہ تھے اور جو واقعات بھی پیش آئے اور ان کے جو نتائج بھی رونما ہوئے ان میں اموال غنیمت اور ان کے بارے میں تنازعات بھی شامل ہیں ۔یہ سب کے سب تقدیر الہی کے کرشمے تھے ' اللہ کی تدبیر' تقدیر اور ہدایت کے مطابق سب کچھ رونما ہوا۔ اس جنگ کے بارے میں خود مسلمانوں کی جو پلاننگ تھی یا جو ارادے تھے وہ بہت ہی معمولی سی بات تھی ، نہایت ہی محدود ۔ اور اللہ نے جو چاہا تھا وہ نہایت ہی بڑا اور لامحدود تھا ۔کیونکہ اللہ چاہتا تھا کہ یہ معرکہ عظیم ہو اور فیصلہ کن (یوم الفرقان) ہو۔ اور زمین اور آسمان دونوں پر اس کے اثرات ہوں ۔اس سے ملاء اعلیٰ کے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں اور زمین کی مخلوق بھی متاثر ہو۔ اس کے ذریعے انسانی تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا جائے ۔فرماتے ہیں کہ تم میں سے ایک فریق تو نہایت ہی بددلی کے ساتھ اس معرکے میں جا رہا تھا ۔بعض نے انفال پر تنازعہ شروع کر دیا ۔تو دیکھو کہ تم جو کچھ سوچ رہے تھے اور جسے تم پسند یا ناپسند کرتے تھے ' وہ اللہ کے ہاں جو فیصلے ہو رہے تھے ان کی نسبت سے بہت ہی حقیر تھا ۔تمام امور آخرکار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں ۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا
يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ
اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ
لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷
لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ
رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹ وَ

مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَ لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ ۱
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ۧ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ ۱۰ع
يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ ۱۵
الشَّيْطٰنِ وَ لِيَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ
اِلَی الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

"(اس مال غنیمت کے معاملہ میں بھی ویسی ہی صورت پیش آرہی ہے جیسی اس وقت پیش آئی تھی جب کہ) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے۔ درآں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں۔

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل' باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے' جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں' ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔

اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور

تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔

اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔" یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لئے نہایت سخت گیر ہے ---- یہ ہے تم لوگوں کی سزا' اب اس کا مزہ چکھو' اور تمہیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے۔"

اللہ نے اموال غنیمت کا اختیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ آپ ان کے درمیان برابری کے اصول پر تقسیم کریں۔جیسا کہ آگے آرہا ہے کہ آپ کو اختیار دیا گیا کہ قومی مصارف کے لئے خمس حضور ؐ کے لئے مختص کر دیا گیا اور یہ انتظام اس لئے کیا گیا کہ جہاد کے مقدس فریضے میں مسلمانوں کے دلوں سے یہ لالچ بھی جاتی رہے کہ انہیں اموال غنیمت میں سے بھی کچھ ملے گا۔ تاکہ اموال غنیمت پر آئندہ اس قسم کے تنازعات پیدا نہ ہوں۔اس میں حق تصرف حضور اکرم ؐ کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔حضور ؐ کی تقسیم کے نتیجے میں ظاہر ہے کہ کسی کو کوئی شکایت پیدا ہونے کا سوال ہی نہ تھا اور تاکہ ان لوگوں کے دلوں سے خلش دور ہو جائے جنہوں نے اموال غنیمت کو جمع کیا تھا کیونکہ وہ بہرحال تمام لوگوں کے ساتھ اصول مساوات کے مطابق برابر کے شریک تھے۔

اب اللہ تعالیٰ یہاں خود ان کے طرز عمل سے ایک مثال پیش کر کے سمجھاتے ہیں کہ جو اللہ چاہتا ہے وہی بہتر ہے۔ اور جو وہ خود چاہتے ہیں وہ اللہ کی اسکیم کے مقابلے میں حقیر ہوتا ہے۔لہٰذا ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ انفال کے بارے میں اللہ جو اسلامی قانون نازل کر رہا ہے وہی بہتر رہے گا۔اس لئے کہ لوگ تو سامنے کے فائدے کو دیکھ سکتے ہیں' عالم غیب پر ان کی نظروں کے سامنے نہیں ہے اور اللہ یہ تبصرہ اللہ اسی واقعہ کو موضوع بنا کر فرما رہا ہے جو ان کے سامنے ہے اور اسی معرکے کا حصہ ہے جس کے نتیجے میں غنائم ملے اور انہوں نے جھگڑا شروع کر دیا۔اس معرکے کے بارے میں وہ کیا ارادہ رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کس کا ارادہ کر لیا۔اب ذرا دیکھو اپنے ارادے کو بھی اور اللہ کے ارادے کو بھی۔دونوں میں قدر و قیمت کے اعتبار سے کس قدر فرق ہے۔دونوں ارادوں کا یہ فرق کس قدر بعید ہے۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (٥)
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (٦)
وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ
تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (٧) لِيُحِقَّ
الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (٨) (٨: ٥ تا ٨) "(اس مال غنیمت کے معاملہ میں بھی ویسی ہی صورت پیش آرہی ہے جیسی اس وقت پیش آئی تھی جب کہ) تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے

نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے۔ در آں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل' باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اموال غنیمت کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹانا اور پھر ان کو جمع کر کے مسلمانوں کے درمیان اصول مساوات کے مطابق تقسیم کرنا اور اس اصول مساوات کو بعض لوگوں کی کا ناپسند کرنا اور اس سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بعض نوجوانوں کو دوسروں کے مقابلے میں بہتر حصہ دینا اسی طرح لوگوں کو پسند نہ تھا جس طرح ان لوگوں کو میدان جنگ کی طرف نکلنا پسند نہ تھا۔ کیونکہ مدمقابل بہتر سازو سامان سے لیس تھا۔ اس لئے بعض مومنین اس وقت جنگ کو پسند نہ کرتے تھے لیکن نتائج سب کے سب ان کے سامنے تھے۔

کتب سیرۃ سے غزوۂ بدر کے واقعات کے بیان میں ہم یہ بات کہہ آئے ہیں کہ جب قافلہ نکل گیا اور خبر ملی کہ اب مقابلہ تو لشکر قریش کے ساتھ آن پڑا ہے جو بہتر سازو سامان سے لیس ہے اور جب رسول اللہ نے مشاورت طلب کی تو اس میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر نے نہایت ہی اچھا اور مثبت جواب دیا اور مقداد ابن عمرو اٹھا اور اس نے نہایت ہی طویل تقریر میں یہ کہا کہ رسول خدا ہم قوم موسیٰ کی طرح آپ کو یہ جواب نہیں دیتے کہ جایئے اور اپنے رب کی معیت میں جنگ کیجئے' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا جواب یہ ہے کہ جایئے اور اپنے رب کے ساتھ اور جنگ کیجئے ہم بھی آپ کے ساتھ جنگ کرنے والوں میں شامل ہیں۔ لیکن یہ سب تقاریر مہاجرین کی طرف سے تھیں۔ اس کے بعد حضور اکرم ؐ نے دوبارہ لوگوں کو کچھ کہنے کی دعوت دی۔ اس پر انصار سمجھ گئے کہ روئے سخن ہماری طرف ہے۔ اس پر سعد ابن معاذ اٹھے اور نہایت ہی طویل تقریر کی اور فیصلہ کن اور اطمینان بخش بات کر دی۔

لیکن حضرت ابوبکر و عمر کی بات اور مقداد اور سعد کی بات ان سب لوگوں کی بات نہ تھی جو آپ کے ساتھ مدینہ سے نکلے تھے' ان میں سے بعض لوگ پھر بھی یہ خیال کرتے تھے کہ جنگ مناسب نہیں ہے اور وہ رکاوٹ بن رہے تھے' اس لئے کہ اس عظیم جنگ کے لئے مسلمان تیار نہ تھے' ان کی تیاری تو محض غیر مسلم قافلے کے لئے تھی اور اس قافلے کی حفاظت ایک معمولی قوت کر رہی تھی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ قریش کی فوج اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ' اپنے بہادروں اور شہ سواروں کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہے تو بعض لوگ اسے پسند نہ کرتے تھے اور قرآن کی اس آیت میں اسی ناپسندیدگی کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (۵) يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (٦) (۸ : ۵ – ٦) "تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو

یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے۔ در آں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جارہے ہیں۔"

حافظ ابوبکر ابن مردویہ اس آیت کی تفسیر میں ابو ایوب انصاری سے روایت کرتے ہیں۔ہم مدینہ میں تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ابوسفیان واپس آرہا ہے۔کیا یہ مناسب ہو گا کہ ہم اس قافلے کی طرف نکلیں شاید اللہ ہمیں مال غنیمت سے نواز دے۔" ہم نے کہ یہ تجویز بالکل درست ہے۔ حضور بھی نکلے اور ہم سب بھی نکلے۔جب ہم نے ایک دن یا دو دن کا راستہ طے کیا' تو حضورؐ نے فرمایا کہ قریش کے ساتھ جنگ کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے۔قریش کو تمہارے نکلنے کی خبر ہو گئی ہے۔" تو ہم نے یہ جواب دیا کہ خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا' ہم دشمن سے لڑنے کے لئے نہ تیار نہیں اور نہ موت کے لئے۔ہمارا ارادہ تو قافلے کے بارے میں تھا۔اس کے بعد حضورؐ نے دوبارہ اس موضوع کو غور کے لئے پیش کیا اور فرمایا کہ اس مسئلے پر سوچ کی ضرورت ہے۔صحیح رائے دو۔تو ہم نے دوبارہ وہی منفی جواب دیا۔اس پر مقداد ابن عمرو اٹھا اور اس نے کہا "حضورؐ ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو قوم موسیٰ نے حضرت موسیٰ کو دیا کہ جاؤ تم اور تمہارا رب اور دونوں لڑو' ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" اس پر ہم انصاریوں سے یہ تمنا کی گئی کہ ہم نے کیوں وہ جواب نہ دیا جو مقداد نے دیا۔اگر ہم یہ جواب دیتے تو یہ مال عظیم سے زیادہ قیمتی ہوتا۔کہتے ہیں' اسی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ

(۸: ۵) یہ تھی وہ بات جو مومنین کے ایک فریق کے لئے خلجان کا باعث تھی۔اور جس کی وجہ سے وہ اس وقت جنگ کو پسند نہ کرتے تھے۔چنانچہ قرآن کریم نے یہ رائے رکھنے والوں پر یہ تبصرہ کیا كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (۸: ۶) "ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف دھکیلے جارہے ہیں۔" اور یہ تبصرہ اس وقت ہوا جب سچائی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ ان کی قسمت میں ایک گروہ بہرحال ہے۔ ان کو اختیار ہی نہ تھا کہ وہ کس گروہ کو لیں کیونکہ قافلہ تو چلا گیا تھا' اب ان کی مڈبھیڑ لشکر قریش سے ہونا ہی تھی۔ یہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا اور یہ بھی مقدر تھا کہ وہ فتح پائیں گے۔جو ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا یا قافلہ تھا اور یا لشکر تھا یا ضعیف گروہ تھا جو صرف قافلے کی حفاظت پر مامور تھا اور یا زاد و عتاد کا مالک لشکر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب نفس انسانی کے سامنے خطرہ مجسم شکل میں موجود ہو تو ایسے ہی حالات فطری ہوتے ہیں۔ انسان کا عقیدہ جو بھی ہو لیکن جب اسے فی الواقعہ عملی خطرات سے سابقہ پیش آتا ہے تو ایسی ہی صورت حالات ہوتی ہے اور خوف بہرحال پیدا ہو جاتا ہے۔یہاں قرآن کریم جو تصور پیش کرتا ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنا عملی معیار ذرا کم کر دیں اور محض نظریاتی اور اعتقادی دنیا سے باہر نکل آئیں۔ ہمیں انسان کی فطری کمزوریوں کو مدنظر رکھنا چاہئے اور ہمیں نفس انسانی سے اس وقت مایوس نہیں ہو جانا چاہئے جب وہ عملی خطرات کے وقت لرز جائے 'بشرطیکہ اس کا قلب عقیدے پر مطمئن ہو۔خصوصاً جبکہ بعد میں تزلزل دکھانے والے نفوس اس راستے پر چل پڑیں۔عملاً خطرات کا مقابلہ کر دکھائیں اور اپنی کمزوری پر قابو پا لیں۔یہ لوگ تو اہل بدر تھے اور ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے

""شاید اللہ نے اہل بدر کو یہ اطلاع کر دی ہو اور کہا ہو کہ جاؤ جو مرضی ہے کرو کیونکہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔
غرض اس بارے میں یہی کافی ہے۔

لیکن جماعت مسلمہ یہی خواہش رکھتی تھی کہ ان کی مڈبھیڑ کمزور گروہ سے ہو۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ

(۸:۷) ""اور یاد کرو وہ موقعہ کہ جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔""

یہ بات اس وقت امت مسلمہ اپنے لئے پسند کرتی تھی لیکن اللہ کا ارادہ کچھ اور تھا۔

وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ

وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸)(۸:۷ - ۸)) ""مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے، خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔""

اللہ کا فضل و کرم تھا کہ اس نے مسلمانوں کے لئے غنیمت کے بجائے قتال اور جہاد کو پسند کیا تاکہ حق و باطل کے درمیان ایک کھلا معرکہ پیش آجائے، حق کا بول بالا ہو اور باطل کی جڑ کاٹ دی جائے اور وہ کمزور اور زائل ہو جائے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہوا۔ کفار میں سے کچھ لوگ قتل ہوئے اور باقی قید ہوئے۔ ان کے سردار قتل ہوئے۔ ان کا رعب جاتا رہا۔ اور اسلام کے جھنڈے بلند ہو گئے۔ اور یوں اللہ کا کلمہ بلند ہوا اور امت مسلمہ کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے نظام زندگی کے مطابق امن سے رہے اور اس زمین پر اللہ کی الوہیت پر مبنی نظام زندگی قائم کیا جائے اور دنیا سے طاغوتی نظاموں کی جڑ اکھاڑ کر رکھ دی جائے۔ اسلامی اقتدار اعلیٰ کا قیام ایک حقیقت بن جائے محض گپ شپ نہ ہو بلکہ یہ نظام جہاد و قتال اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے قائم کیا جائے۔ عالم واقعہ میں ہو، محض نظریہ نہ ہو۔

اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ امت مسلمہ امت بن جائے، اس امت کی اپنی حکومت ہو، اور اس حکومت کی ایک قوت ہو۔ یہ بھی ارادہ تھا کہ دشمن اسلامی حکومت کی قوت کو صحیح طرح سمجھیں اور اسلامی قوت دشمن کی قوت سے برتر ہو۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ فتح و نصرت صرف سازوسامان اور تعداد اور تیاری پر موقوف نہیں ہوتی بلکہ فتح کا مدار تعلق باللہ پر ہوتا ہے۔ کیونکہ تعلق باللہ کی قوت کے مقابلے میں انسانوں کی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ ایک واقعی تجربے کی صورت میں ہو۔ محض اعتقادی تصور نہ ہو اور نہ محض نظریہ ہو تاکہ امت مسلمہ اس تجربے کی روشنی میں اپنے لئے مستقبل کے منصوبے بنائے۔ اسے یہ یقین ہو جائے کہ اس کی تعداد چاہے کتنی ہی کم ہو اور دشمن کی تعداد چاہے بہت ہی زیادہ ہو وہ اس پر فتح پا سکتی ہے۔ نیز سازوسامان چاہے کتنا ہی تھوڑا ہو اور دشمن کے ساتھ سازوسامان چاہے جس قدر بھی زیادہ ہو اس پر فتح و شکست کا مدار نہیں ہے۔ اور اگر بدر کا فیصلہ کن معرکہ پیش

نہ آتا تو یہ حقائق واضح طور پر سامنے نہ آتے۔

ناظرین ذرا دقت نظر سے دیکھیں کہ مسلمانوں نے اپنے لئے جو راہ پسند کی تھی اور اللہ نے ان کے لئے جو راہ پسند کی تھی ان کے درمیان کس قدر فرق ہے۔ انہوں نے خود اپنے لئے جو بھلائی سوچی تھی اس میں اور اللہ نے جو ان کے لئے پسند کیا تھا اس میں کس قدر فرق ہے۔ آج یا کل اگر اس پر غور کیا جائے تو ان دونوں منصوبوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی بات کس قدر غلط ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے لئے اچھا یا برا خود سوچ سکتے ہیں اور اس معاملے میں خدا کی راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لئے جو راہ تجویز کی ہے' وہ مضر ہے اور اس میں اذیت و مشقت ہے حالانکہ اپنے نتائج کے اعتبار سے اس میں اس قدر خیر اور بھلائی ہوتی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا اس موقعہ پر امت مسلمہ کے اختیار کردہ اور پسندیدہ امر میں اور اللہ کے اختیار کردہ اور پسندیدہ امر میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر وہ کمزور گروہ کو لیتے تو کہانی فقط یہ ہوتی کہ ایک مظلوم قوم نے ظالم قوم کے ایک قافلے پر ہلہ بول دیا۔ اسے لوٹ لیا اور بہت سا مال ان کے ہاتھ لگا۔ لیکن واقعہ بدر کی تاریخی اہمیت ایک نظریاتی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ کا ایک فیصلہ کن معرکہ شمار ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف ایک تھوڑی تعداد ہے جن کے پاس خاطر خواہ اسلحہ اور سامان نہیں ہے اور دوسری طرف اسلحہ سے لیس اور سازو سامان سے مسلح پیادوں' سواروں اور بہادروں کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل لشکر ہے۔ ایک طرف حق اور دوسری جانب باطل ہے لیکن ایک طرف وہ گروہ ہے جو اللہ کے لئے لڑتا ہے اور دوسری جانب وہ گروہ ہے جو ذاتی مفادات کے لئے لڑتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو قتال کو پسند نہیں کرتے لیکن اکثریت ثابت قدم ہے۔ ان کے تصور میں مادی سازو سامان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسے یقین ہے کہ حقیقی قوت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اعلیٰ اقدار کو سینے سے لگایا ہوا ہے اور نفسانی خواہشات پر قابو پا لیا ہے۔ اگرچہ بظاہر کفار کا پلہ ہر لحاظ سے بھاری تھا لیکن انہوں نے تعلق باللہ اور یقین کی بدولت ظاہری اور مادی پلڑے کو شکست دی۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ بدر اپنے ان حالات اور واقعات کے ساتھ انسانی تاریخ میں ایک ممتاز مثال ہے اور یہ جنگ فتح و شکست کے لئے ایک الگ دستور اور پیمانے وضع کرتی ہے۔ یہ جنگ بتاتی ہے کہ فتح و شکست کے حقیقی اسباب کیا ہوتے' حقیقی اسباب' نہ کہ ظاہری اسباب۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے اور صدیوں تک اور جب تک یہ جہاں قائم ہے' اس کو پڑھا جائے گا کیونکہ اس کے حقائق ناقابل تغیر ہیں۔ یہ جنگ گویا اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کی سنت جاریہ کی بہترین اور اعلیٰ ترین مثال ہے' جب تک یہ جہاں قائم و دائم ہے۔ آج جاہلیت دنیا پر چھائی ہوئی ہے' اور امت مسلمہ اس کے خلاف بر سرپیکار ہے۔ ان حالات میں امت کو چاہئے کہ وہ اس جنگ پر طویل غور و فکر کرے اور اس کے فیصلہ کن پہلوؤں کو نظروں میں لائے۔ ذرا دیکھئے کہ انسانی خواہشات اور منصوبوں کے مقابلے میں انسانی خواہشات اور منصوبے کس قدر حقیر ہوتے ہیں' ذرا پھر غور کیجئے۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ

الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (۸) (۸:۷ – ۸)) "یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ نے تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل 'باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اس وقت امت کے جو گروہ اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں' وہ تحریکی اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ اس مرحلے تک نہ پہنچے ہوں جن تک مسلمان جنگ بدر کے موقع پر پہنچ چکے تھے لیکن جنگ بدر کے جو حالات تاریخ نے ریکارڈ کیے ہیں' ان کے اندر اسلام نے اور قرآن نے جو ہدایات دی ہیں اور جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور جو تبصرے اس پر ہوتے وہ آج بھی تحریک اسلامی کو واضح ہدایات دے رہے ہیں چاہے تحریک اسلامی جس مرحلے میں بھی ہو' کیونکہ یہ اقدار' یہ اہداف اور یہ نصب العین دائمی ہیں اور جب بھی کوئی گروہ' جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد شروع کرے گا اسے ان مراحل سے گزرنا پڑے گا۔"

---000---

اب سیاق کلام میں اس فیصلہ کن جنگ کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جماعت مسلمہ کا حال کیسا تھا' اور اللہ نے ان کے لئے کیسی تدابیر اختیار کیں اور اللہ کی تائید و نصرت ان کو محض مشیت الٰہیہ اور تائید ایزدی کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ قرآن کریم کا بے مثال انداز بیان اس معرکے کے مشاہدات' تاثرات' واقعات' پریشانیوں اور امیدوں کو نہایت ہی دقت سے قلم بند کرتا ہے اس طرح کہ قاری گویا اپنے آپ کو اس معرکے کے اندر محسوس کرے مگر قرآنی تبصرے کے ساتھ' تاکہ وہ حقائق کو بدر سے وسیع تر دائرے میں سمجھیں۔ جزیرۃ العرب سے بھی ان کی نظر وسیع بلکہ ان کا نقطہ نظر پوری کائنات سے بھی زیادہ وسیع ہو۔ اس بیان میں اب اس معرکے کا پس منظر ملاء اعلیٰ تک وسیع ہو جاتا ہے۔ اب یہ معرکہ یوم بدر سے بھی آگے' پوری انسانی تاریخ سے بھی آگے بڑھ کر' پوری دنیاوی زندگی کے دائرے سے بھی وسیع تر دار آخرت تک پہنچ جاتا ہے اور اس پیش منظر میں جماعت مسلمہ کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی کیا قدر و قیمت ہے' اس کے اعمال کس قدر اہم ہیں اور اس کی اقامت دین کی جدوجہد اور حرکت کس قدر مقدس ہے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ (۹) وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۱۰) ع إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (۱۱) إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي

فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۱۲) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳) ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ (۱۴) (۸: ۹ تا ۱۴)

"اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے ۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں ۔ یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں' ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے ۔

اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا' اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے ۔

اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ ۔" یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کرے' اللہ اس کے لئے نہایت سخت گیر ہے ۔ یہ ہے تم لوگوں کی سزا' اب اس کا مزا چکھو' اور تمہیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے ۔"

یہ ایک معرکہ ہے جو اللہ کے امر اور اس کی مشیت کے مطابق چل رہا ہے ۔ اللہ کا نظام قضا و قدر اس کی تدبیر خود کر رہا ہے ۔ اللہ کے خاص دستے اس میں شریک ہیں ۔ اس معرکے میں حرکت الاہزن کے مناظر اور اس کی خطرناکیاں اور اس کی کامیابیاں قرآنی عبارات میں صاف نظر آ رہی ہیں ۔ یہ ایک زندہ منظر ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ نظر ابھی آنکھوں کے سامنے ہے ۔

سوال یہ ہے کہ اس معرکے میں اہل ایمان کی فریاد کیا تھی؟ امام احمد حضرت عمر ابن الخطاب سے روایت کرتے ہیں' جب بدر کا واقعہ درپیش ہوا' تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا کہ وہ تین سو سے کچھ اوپر ہیں اور جب کفار کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہزار سے کچھ اوپر ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف چہرہ مبارک پھیرا' آپ چادر اور تہ بند اوڑھے ہوئے تھے اور کہا: "اے اللہ آپ نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر دیجئے ۔ اے اللہ اگر آج آپ نے اہل اسلام کے اس گروہ کو ہلاک کر دیا تو پھر دنیا میں کبھی تیری بندگی نہ ہوگی ۔" کہتے ہیں آپ اللہ کے سامنے اسی طرح فریاد کرتے رہے اور پکارتے رہے' یہاں تک کہ آپ کے کاندھوں سے چادر گر گئی ۔ حضرت ابوبکر آئے' انہوں نے چادر کو پکڑا اور اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا اور پیچھے سے اسے پکڑے رکھا اور اس کے بعد آپ نے کہا "اے اللہ کے نبی' بس اللہ کے سامنے آپ کی یہ فریاد کافی ہے' بے شک اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا ۔

اس پر اللہ نے یہ آیات نازل کیں ۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ

(۸ : ۹) "اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے ۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں ۔" یوم بدر میں فرشتوں کی تعداد اور ان کے طریقہ جنگ کے بارے میں متعدد اور مفصل روایات وارد ہیں ۔ اور ان میں بتایا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کو کیا کہتے تھے اور کس طرح ان کو جرأت دلاتے تھے اور کفار کو کیا کہتے تھے اور کس طرح انہیں شرمندہ کرتے تھے ۔ لیکن ظلال القرآن میں ہمارا جو طریقہ ہے ' اس کے مطابق ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے بارے میں قرآن و سنت کی نصوص واضح ہیں ۔ یہاں قرآنی آیات بالکل واضح ہیں ۔ مثلاً

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ

(۸ : ۹) "اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے ۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں ۔" یہ تو تھی ان کی تعداد ۔ اور ان کا طریقہ جنگ یہ تھا ۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸ : ۱۲)

"اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ "میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ ۔"

یہ تھا ان کا عملی کام ۔ اس سے مزید تفصیلات کی سرے سے ضرورت نہیں ہے کیونکہ آیت اپنے مفہوم میں واضح ہے ۔ ہمیں اس قدر یقین کر لینا چاہئے کہ اس معرکے میں اللہ نے مسلمانوں کو اپنے حال پر نہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ تعداد و اسباب کے اعتبار سے بہت کم تھے اور جس طرح قرآن کریم کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے ' اسی انداز سے فرشتوں نے اس جنگ میں شرکت کی ۔

امام بخاری باب شہود الملائکہ بدرا میں کہتے ہیں : ابن اسحاق سے ' جریر سے ' یحیٰ ابن سعید سے ' معاذ ابن رفاعہ ابن رافع الزرقی سے ' اس کے باپ سے (اور یہ اہل بدر میں سے تھے) کہتے ہیں کہ جبرئیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا تم اہل بدر کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو ' آپ نے فرمایا "ہم ان کو افضل المسلمین سمجھتے ہیں ۔ تو جبرئیل نے کہا اسی طرح ہم فرشتوں میں سے جو بدری تھے ' ان کو افضل سمجھتے ہیں ۔ (بخاری)

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۹) وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۱۰) ع (۸: ۹ - ۱۰) "اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے - جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں - یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لئے بتا دی کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں ' ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے -"

مسلمان اللہ کے دربار میں زاری کر رہے تھے تو اللہ نے ان کو جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں کی امداد تمہارے لئے بھیج رہا ہوں جو لگاتار نازل ہوتے رہیں گے - اس اعلان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بہت عظیم تھا ' اور اللہ کے نزدیک اقامت دین کی بہت اہمیت تھی ' لیکن اللہ تعالیٰ یہاں اس بات کی وضاحت بار بار فرماتے ہیں کہ دنیا میں اسباب کی اس قدر اہمیت نہیں ہے کہ ان سے تخلف ممکن نہ ہو - اصل اختیار اللہ کی مشیت کا ہوتا ہے - لہٰذا اسباب کے معاملے میں مومن کو اپنا ذہن صاف رکھنا چاہئے - اللہ کی جانب سے مدد کی قبولیت اور پھر اس کی اطلاع محض ایک خوشخبری تھی جس کے ذریعے مومنین کو اطمینان دلانا مقصود تھا - رہی نصرت تو وہ اللہ کی جانب سے تھی -

یہ ہے وہ حقیقت جو یہاں قرآن مومنین کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے تاکہ وہ کلی تکیہ اسباب پر نہ کریں -

مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی پوری قوت کو اس معرکے میں جھونک دیں اور کچھ بھی باقی نہ رکھیں - ابتدائی طور پر بعض لوگوں کے اندر جو تزلزل پیدا ہو گیا تھا اس پر قابو پا لیں - کیونکہ اس وقت وہ واقعی اور حقیقی خطرے سے دوچار تھے - وہ اللہ کا حکم بجا لاتے ہوئے آگے بڑھیں اور اللہ کی نصرت پر یقین رکھیں - بس یہی ان کے لئے کافی تھا تاکہ وہ اپنے حصے کا کردار اچھی طرح ادا کر لیں - آگے پھر قدرت الٰہیہ کا کام آتا ہے اور قدرت الٰہی اپنے معاملات کی تدبیر خود کرتی ہے - اس کے علاوہ جو اقدامات ہوئے اور اطلاعات دی گئیں وہ محض مسلمانوں کے اطمینان کے لئے ہیں - ان کے قدموں کو ثابت کرنے کے لئے تھیں کیونکہ وہ ایک حقیقی خطرے سے دوچار تھے - جماعت مسلمہ کے لئے یہ بات کافی تھی کہ اسے یہ اطمینان ہو کہ اللہ کے لشکر اس کے ساتھ ہیں اور یہ کہ نصرت ان کے لئے مقدر ہے - کیونکہ نصرت اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اور اللہ ان کے ساتھ ہے ' وہی عزیز ہے اور وہی غالب ہے ' وہی حکیم ہے اور وہ ہر بات کو اپنے حقیقی مقام پر رکھتا ہے -

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) (۸: ۱۱) "اور وہ وقت جب کہ اللہ اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا ' اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست

دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔"

یہ غنودگی کا واقعہ بھی نہایت ہی عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حالت تھی اور جنگ سے قبل مسلمانوں پر طاری ہوگئی تھی۔ یہ صرف امر الٰہی اور اللہ کی خاص تدبیر اور تقدیر کا کارنامہ تھا۔ جب لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو مسلمانوں پر قدرے خوف طاری ہوگیا کیونکہ ان کی توقع نہ تھی کہ اس قدر عظیم لشکر امنڈ آئے گا۔ اور اس وجہ سے ان کی تیاری بھی نہ تھی' اچانک انہیں غنودگی نے آلیا۔

جب یہ غنودگی دور ہوئی تو وہ بالکل فریش اور تروتازہ تھے۔ ان کے دل اطمینان سے بھرے ہوئے تھے۔ یہی حالت ان پر احد میں طاری ہوگئی تھی۔ لوگوں کے اندر بے چینی آگئی' اور اللہ نے ان پر غنودگی طاری کر دی اور انہیں اطمینان ہوگیا۔ میں ان آیات کو پڑھ کر گذر جاتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ یہ دور ماضی کا ایک واقعہ ہے۔ میں اس واقعہ کے بارے میں قرآن کریم کے اس قصے کو پڑھتا اور یہ سمجھتا کہ اس کا راز اللہ ہی جانتا ہے جس نے ہمیں اس کی اطلاع دی ہے۔ لیکن جب مجھ پر مشکلات آئیں اور بعض لمحات نہایت ہی تنگی اور پریشانی کے بھی گذرے۔ تو مجھے ان آیات کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ ایک بار میں نامعلوم خوف سے دوچار ہوگیا' غروب شمس کا وقت تھا' اچانک چند منٹوں کے لئے مجھ پر غنودگی آ جاتی ہے اور جب یہ حالت دور ہوتی ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں جو اس غنودگی سے پہلے تھا۔ میرا نفس نہایت ہی پرسکون تھا۔ دل مطمئن تھا اور میں گہرے اطمینان میں غرق تھا۔ چند لمحات میں یہ عمل کیسے طے ہوگیا' یہ اچانک کس طرح انقلاب برپا ہوگیا۔ یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہوگئی کہ قصہ بدر واحد میری سمجھ میں آگیا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے اپنی پوری شخصیت کے ساتھ اس قصے کو سمجھ لیا' محض عقلی طور پر نہیں' یہ اب میرے وجود میں ایک زندہ حقیقت تھی۔ محض تصور اور خیال نہ تھا۔ مجھے صاف نظر آیا کہ اس میں دست قدرت کی کارفرمائی ہے اور نہایت ہی خفی طور پر مجھے اطمینان عطا ہوگیا۔

بدر کے دن جماعت مسلمہ کے لئے یہ غنودگی اللہ کی غیبی امداد تھی۔ اِذْ یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً "اس وقت کو یاد کرو کہ تمہارا رب اپنی طرف سے غنودگی کی شکل میں تم پر اطمینان و بے خوفی کی کیفیت طاری کر رہا تھا۔" اس آیت میں یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ اور اَمَنَةً تینوں لفظ اس فضا پر ایک لطیف اور شفاف پرتو ڈالتے ہیں اور اس منظر کی عام فضا کی نقشہ کشی کرتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے شب و روز کیا تھے اور یہ کہ مسلمانوں کے عام حالات کے مقابلے میں اور ان کی اس نفسیاتی کیفیت میں فرق کیا تھا۔

اب بارش کا قصہ ملاحظہ فرمائیں۔

وَیُنَزِّلُ عَلَیْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَیُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) (۸: ۱۱) "اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔"

یہ واقعہ معرکہ سے قدرے پہلے پیش آیا۔ اور یہ بھی امت مسلمہ کے لئے ایک قسم کی خاص امداد تھی۔

علی ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے 'کہ یوم بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ پر قیام کیا اس کی پوزیشن یہ تھی کہ مشرکین اور پانی کے درمیان ایک ریت کا ٹیلہ تھا جو ایک پتھریلی جگہ تھی۔ اس دن مسلمان بہت ہی تھکے ہوئے تھے۔ ایسے حالات میں شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی شروع کر دی کہ تم دعویٰ تو یہ کرتے ہو کہ تم اللہ کے دوست ہو اور تمہارے اندر اللہ کے رسول موجود ہیں' حالانکہ مشرکین پانی پر قبضہ کر چکے ہیں اور تمہاری حالت یہ ہے کہ تم حالت جنابت میں نماز پڑھتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے شدید بارش برسائی۔ مسلمانوں نے پانی بھی پیا اور طہارت بھی حاصل کی اور اللہ نے شیطانی نجاست سے ان کو پاک کر دیا۔ جب بارش ہوئی تو ریت بھی بیٹھ گئی اور لوگ اور جانور اس کے اوپر آسانی سے چلنے لگے۔ اس طرح وہ آگے بڑھے۔ "اللہ نے نبی کو ایک ہزار فرشتوں کی امداد حضرت جبریل کی کمان میں پانچ صد فرشتے تھے جو ہر قسم کے سامان سے لیس تھے۔ اور میکائیل کی کمان میں بھی پانچ صد فرشتے تھے۔

یہ حالت اس وقت پیش آئی جب کہ حضور ؐ نے حباب ابن منذر کے مشورے پر کیمپ نہیں بدلا تھا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ مناسب یہ ہے کہ ہم بدر کے پانیوں کے قریب فروکش ہوں اور پانی کا حوض بنا کر مخالف کیمپ کا پانی بند کر دیں۔

"معروف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر کی طرف چلے تو آپ نے ابتدائی اور پہلے پانی پر قیام کیا لیا۔ اس پر حباب ابن منذر آگے بڑھے کہ جس مقام پر قیام کا حکم دیا گیا ہے آیا یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ ہم اس میں رد و بدل کر سکتے ہیں اور یہ مقام بطور جنگی چال اور تدبیر ہے۔ حضور ؐ نے فرمایا کہ میں نے یہ مقام محض جنگی سوچ کی بنا پر تجویز کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا پھر یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے فوجی کیمپ کے لئے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ ہمیں آخری پانی پر لے چلیں جو مشرکین کے قریب ہے اور اس آخری پانی سے پیچھے جس قدر پانی ہیں' ان کو ہم دشمن سے روک لیں گے۔ ہم خود پییں گے اور مویشیوں کو پلائیں گے۔ یوں ہمارے پاس پانی ہو گا اور ان کے پاس پانی نہ ہو گا۔ اس پر حضور ؐ نے لشکر کو ایسا ہی کا حکم دیا اور اس مشورے پر عمل کیا۔

حباب ابن المنذر کے مشورے سے قبل کی رات میں مسلمانوں کی یہ حالت تھی جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ بطور احسان اس جماعت سے کر رہے ہیں جو بدر میں شریک ہوئی۔ یہ جو امداد اللہ نے کی یہ دوسری امداد تھی۔ یہ روحانی بھی تھی اور مادی بھی تھی اس لئے کہ صحراؤں میں پانی پر زندگی موقوف ہوتی ہے۔ پانی فتح کا سامان ہوتا ہے اور صحراؤں میں جس لشکر کے پاس پانی نہ ہو وہ ذہنی طور پر شکست کھا جاتا ہے۔ اور روحانی اس طرح کہ مسلمان شیطانی وسوسوں سے بھی نکل آئے۔ وہ حالت جنابت میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اس وقت تک ان کو تیمم کی اجازت بھی نہ تھی۔ یہ اجازت بہت بعد میں غزوۂ بنی المصطلق میں دی گئی یعنی ۵ ہجری میں۔ ایسے حالات میں شیطان نے نفسیاتی وسوسے ڈالے اور لوگوں کے اندر نفسیاتی اور روحانی بے چینی پیدا کر دی تھی تاکہ جب یہ لوگ اس معرکے میں داخل ہوں تو روحانی اعتبار سے پریشان ہوں اور مادی شکست سے پہلے ان کو اندرونی طور پر شکست ہو چکی ہو اور وہ اندر سے ٹوٹ چکے ہوں۔ ایسے حالات میں امداد کی یہ امداد خاص آئی ہے۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ

وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۱۱) (۸ : ۱۱) ”اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی برسا رہا تھا تاکہ تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کرے اور تمہاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے سے تمہارے قدم جما دے۔“

یوں مادی امداد کے ساتھ ساتھ روحانی امداد بھی پوری ہو جاتی ہے۔ پانی کی وجہ سے دلوں کو اطمینان ہو گیا اور روح کی پاکیزگی کی وجہ سے وہ تروتازہ ہو گئے۔ بارش کی وجہ سے ریت بیٹھ گئی اور قدم بھی مضبوط ہو گئے۔

یہ تدابیر اس کے علاوہ تھیں کہ اللہ نے فرشتوں کو خصوصی ہدایت دے دیں کہ تم اہل ایمان کے قدموں کو مضبوط کرو اور کفار کے دلوں میں ان کا رعب ڈالو' اور فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ تم عملاً جنگ میں شرکت کرو۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ

الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸ : ۱۲)

”اور وہ وقت جب کہ تمہارا رب فرشتوں کو اشارہ کر رہا تھا کہ ”میں تمہارے ساتھ ہوں' تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں' پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔“

یہ ایک عظیم معاملہ ہے' اس معرکے میں فوج ملائکہ کے ساتھ خود اللہ بھی موجود ہیں اور ملائکہ اہل ایمان کی مدد کے لئے آ رہے ہیں۔ یہ اس قدر عظیم معاملہ ہے جو کسی صورت میں بھی نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ سوچئے! ملائکہ کس طرح شریک ہوئے؟ انہوں نے کتنے افراد کو مارا؟ کس طرح مارا؟ یہ ایک عظیم معاملہ ہے اور بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ جو جماعت اقامت دین کا کام کرتی ہے اس میں اس کے ساتھ ملائکہ شریک ہوتے ہیں اور ملائکہ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ مخلوقات رب العالمین میں ایک مخلوق ایسی ہے جسے ملائکہ کہا جاتا ہے کہ ان کی طبیعت اور ماہیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں ہمیں صرف اس قدر علم دیا گیا ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کیفیت کا بھی علم نہیں جس کے مطابق اس مخلوق نے مومنین کی امداد کی۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ رب تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ مومنین کے لئے ثابت قدمی کا باعث ہوں اور میں بھی تمہارے ساتھ ہوں اور انہوں نے یہ کام کیا' کیونکہ یہ وہ مخلوق ہے جو امر الٰہی کی پابند ہے۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے یہ کام کیسے کیا؟ اللہ نے یہ حکم بھی دیا کہ کفار کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ایک ایک جوڑ پر وار کرو تاکہ یہ کام کے ہی نہ رہیں اور انہوں نے ایسا کیا۔ لیکن کیسے کیا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہمیں ان کے بارے میں اسی قدر علم ہے جو اللہ نے بتایا۔ پھر اللہ کا حکم یہ تھا کہ کفار کے دلوں کے اندر رعب ڈالا جائے اور یہ ڈال دیا گیا اور ایسا کر دیا گیا۔ کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن ہمیں اس کی کیفیات کا بھی علم نہیں ہے کیونکہ یہ کفار اللہ کی مخلوق ہیں اور وہ اپنی مخلوق کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ اس پر کس طرح اثر ہو گا۔ وہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور وہ شاہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

ان افعال کی کیفیات سے بحث کرنا، دین اسلام کے مزاج کے خلاف ہے اور اس دین کی سنجیدگی کے ساتھ یہ طرز عمل لگا نہیں کھاتا۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ یہ ایک عملی دین ہے اور یہ عقیدہ اور نظریات و تصورات کو بھی عملی حد تک رکھتا ہے۔ لیکن بعد کے ادوار میں مسلمانوں کے علم الکلام کے اندر یہ مباحث زیادہ اہم ہو گئے اور یہ اس وقت ہوا کہ جب لوگ اسلام کے مثبت اور عملی کام سے فارغ ہو گئے اور علمی اور ثقافتی رنگ ان پر غالب ہو گیا۔ لیکن اصل بات تو یہ تھی کہ مسلمان میدان معرکہ میں ہوتے، فرشتے ان کے ساتھ برزخ کے عالم میں ہوتے اور فرشتوں اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہوتے تو یہ عملی صورت حال مسلمانوں کے لئے، اس ثقافتی جدل و جدال سے زیادہ نفع بخش ہوتی۔

اس تقریر کے آخر میں اور اس عظیم اور ہولناک حقیقت کے انکشاف کے آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس معرکے کا پس منظر کیا تھا اور کن حقائق کی وجہ سے کسی کو نصرت ملی اور کسی کے حصے میں ہزیمت آئی۔ وہ عظیم پس منظر یہ تھا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۱۳) "یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کا مقابلہ کرے، اللہ اس کے لئے نہایت سخت گیر ہے۔"

یہ کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ اچانک پیش آگیا۔ اور نہ ہی یہ اتفاقی حادثہ تھا جو پیش آگیا اور چلا گیا۔ اللہ نے جماعت مسلمہ کی نصرت کی اور اسے اس کے دشمنوں پر مسلط کر دیا اور اس کے دشمنوں کے دلوں کے اندر رعب بٹھا دیا۔ مسلح فرشتے ان کی امداد کے لئے پہنچ گئے۔ یہ اس لئے تھا کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے لئے وہ محاذ چن لیا جو اللہ کا محاذ نہ تھا اور وہ اللہ اور رسول ؐ کی مخالف صفوں میں چلے گئے۔ انہوں نے خدا اور رسول سے محاذ آرائی شروع کر دی اور وہ اسلامی نظام حیات کے قیام کے لئے رکاوٹ بن گئے تھے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۱۳) "اور جو اللہ اور رسول سے محاذ آرائی کرے تو اللہ شدید عذاب دینے والا ہے۔" یعنی ایسے لوگوں پر وہ سخت عذاب نازل کرتا ہے۔ اللہ اس قدر طاقتور ہے کہ وہ ان پر عذاب نازل کر سکتا ہے اور وہ اس قدر ضعیف ہیں جو اس عذاب کو برداشت کرنے کی قدرت اپنے اندر نہیں رکھتے۔"

یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے اور اس کا اصول ہے۔ یہ کوئی اچانک یا کوئی حادثہ یا اتفاق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر جب بھی کوئی جماعت اس لئے اٹھے کہ وہ یہاں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو قائم کرے گی اور یہاں صرف اسلامی نظام حیات قائم ہو گا اور اس جماعت کے خلاف اللہ کا کوئی دشمن اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اس جماعت کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی اور ایسے لوگ قوت اور رعب و داب کے مالک بھی ہوتے تو اللہ کی مدد اس جماعت کے ساتھ ہوا کرتی ہے بشرطیکہ یہ جماعت ثابت قدمی سے اپنے مقصد کی طرف گامزن ہو اور رب تعالیٰ کی راہ میں مطمئن ہو۔ اس پر توکل کرنے والی ہو اور اپنی راہ پر اس کا سفر جاری ہو۔

اس منظر کے آخر میں ان لوگوں کو مخاطب کیا جاتا ہے جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی ہے کہ یہ رعب اور پھر یہ ہزیمت جو تمہیں اس دنیا میں اٹھانی پڑی اس پر یہ بات ختم نہیں ہو گئی ہے کیونکہ یہ دین،

اس کا قیام اور اس کی جماعت صرف اس مختصر سے زمانہ دنیا پر ختم ہو جانے والا معاملہ ہی نہیں ہے۔ یہ معاملہ اس دنیا اور اس کائنات سے بہت آگے تک جاتا ہے۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر بھی اس کے اثرات ہیں اور وہ یہ ہیں۔

ذٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ (۸: ۱۴) "یہ ہے تم لوگوں کی سزا' اب اس کا مزہ چکھو' اور تمہیں معلوم ہو کہ حق کا انکار کرنے والوں کے لئے دوزخ کا عذاب ہے۔" یہ ہو گا اصلی انجام اور یہ عذاب اس عذاب سے بہت ہی مختلف قسم کا اور زیادہ ہو گا جو تمہیں مرعوب کر کے اور تمہاری گردنوں پر اور جوڑوں پر ضربات لگا کر تمہیں دیا گیا۔

---○○○---

جنگ بدر کے واقعات اور حالات کی منظرکشی کے بعد اور یہ دکھانے کے بعد کہ اس کے پس منظر میں دست قدرت کام کر رہا تھا اور اللہ کی معاونت اور امداد اس میں شامل تھی اور یہ جان لینے کے بعد کہ مسلمان کو اس پوری تگ و دو میں دست قدرت کے لئے ایک پردہ تھے 'کیونکہ اللہ ہی نے رسول کو گھر سے نکالا۔ یہ محض نمائش قوت کے لئے نہ نکلے تھے اور نہ ہی مظالم کے لئے نکلے تھے' یہ اللہ ہی نے فیصلہ کیا کہ دو گروہوں میں سے کون سا گروہ مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور وہی ہے جس نے مجرموں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تاکہ حق 'حق ہو جائے اور باطل 'باطل ہو جائے۔ اگرچہ مجرم اس بات کو پسند نہ کرتے تھے اور یہ اللہ ہی تھا جس نے ان کی مدد کے لئے وہ فرشتے بھیجے جو لگاتار آرہے تھے۔ پھر وہ اللہ ہی تھا جس نے ان پر غنودگی طاری کر دی تھی اور آسمانوں سے ان پر پانی اتارا تاکہ ان کو پاک کر دے اور ان کو شیطانی نجاست سے پاک کر دے ان کے دلوں کو مطمئن کر دے اور قدم مضبوط کر دے۔ اور یہ اللہ ہی تھا کہ اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے قدم مضبوط کر دیں' اور کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں اور وہ اللہ ہی تھا جس نے اس معرکے میں فرشتوں کو شریک کیا۔ ان کو حکم دیا کہ ان کی گردنوں پر ضربات لگاؤ اور ان کے جوڑوں میں چوٹیں لگاؤ اور پھر اللہ ہی تھا جس نے ان کو اموال غنیمت عطا کئے حالانکہ جب وہ گھر سے نکلے تھے تو ان کے پاس نہ مال تھا اور نہ سازوسامان تھا۔

اب جبکہ سابقہ واقعات بیان ہو گئے تو اس حقیقت کو ان کے ذہن نشین کرنے کے لئے دوبارہ بیان کیا جاتا ہے تاکہ یہ ان کی نظروں کے سامنے رہے کہ فیصلہ کن جنگ صرف سازوسامان اور زادو عتاد پر موقوف نہیں 'بلکہ اس میں نصرت الٰہی اور اللہ کی تدبیر اور مشیت فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ اس راہ میں اصل سازوسامان توکل علی اللہ ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف التجا اور اللہ کے ہاں فریادوزاری اور اللہ کی تدبیر اور تقدیر اس میں فیصلہ کن ہوتی ہے۔

یہ منظر ابھی تک ان لوگوں کے ذہنوں میں اچھی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ ایسے حالات اور ایسا ماحول اس بات کے لئے نہایت ہی مناسب ہوتا ہے اور اس میں بات مانی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے ماحول میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان کی صفت ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ جب کفار کے بالمقابل کھڑے ہوں تو ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور فرار اور ہزیمت کو ہرگز قبول نہ کریں۔ خصوصاً جبکہ نصرت اور ہزیمت اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے اور اس پر تمہارا ایمان ہے۔ نصرت اور ہزیمت کا فیصلہ صرف اسباب ظاہریہ پر ہی نہیں ہوتا' خصوصاً جبکہ کسی معرکے کی تدبیر اور کمان خود اللہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی ہو۔ جیسا کہ تمام امور کی تدبیر وہی کرتا ہے اور وہی ہے جو مومنین کے ہاتھوں کفار کو قتل کراتا ہے۔ وہی ہے جو تیر کو نشانے پر بٹھاتا ہے۔

اہل ایمان تو دست قدرت کے لئے ایک پردہ اور بہانہ ہیں اور اللہ اس بہانہ سے انہیں جہاد کا ثواب عطا کرتا ہے اور کافروں کو مسلمانوں کی نسبت سے مرعوب کرتا ہے۔ ان کی تدبیر کی چولیں ڈھیلی کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں انہیں عذاب سے دوچار کرتا ہے اس لئے کہ وہ درحقیقت اللہ اور رسول سے محاذ آرائی کیے ہوئے ہوتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ
الْأَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا
إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ
الْمَصِيرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ
وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ
سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۷﴾ ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۸﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری ------ الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جاملنے کے لئے ------ تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے۔

پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبی ؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے) تو یہ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے' یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ ہے اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔"

قرآن نے اس معاملے میں جو سخت انداز گفتگو اختیار کیا ہے اور سخت سزا تجویز کی ہے اور فیصلہ یہ کیا ہے کہ جو شکست کھاتے ہوئے بھاگے وہ غضب الہی کا مستحق ہو گا اور اس کا ٹھکانا جہنم میں ہو گا۔ یہ ذرا وا ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو۔ جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری ------ الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جاملنے کے لئے ------ تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا' اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم حالت "زحف" میں ہو یعنی جنگ میں دوبدو مقابلہ آن پڑے تو اس وقت فرار اختیار نہ کرو الا یہ کہ یہ فرار کسی جنگی چال کی صورت میں ہو' کہ تم بہترین مواقع کے لئے فرار اختیار کر رہے ہو یا کوئی اور بہترین منصوبے کی خاطر فرار کا حکم دیا گیا ہو۔ یا تم کسی دوسری جنگی کمپنی سے ملنے کے لئے فرار اختیار کر رہے ہو۔ یا تم جنگی ہیڈ کوارٹرز کی طرف بھاگ رہے ہو تاکہ دوبارہ حملہ کر سکو۔ ان حالات کے سوا کسی اور صورت میں اگر تم دشمن کو پیٹھ دکھاؤ

گے تو تم عذاب کے مستحق بن جاؤ گے تم پر اللہ کا غضب ہو گا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

بعض اقوال ایسے منقول ہوئے ہیں کہ یہ حکم صرف اہل بدر کے لئے تھا یا ایسے غزوات کے لئے تھا کہ جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود شریک ہوا کرتے تھے لیکن جمہور علماء اور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت اور حکم عام ہے اور یہ کہ دوبدو مقابلے سے بھاگنا ان سات گناہ ہائے کبیرہ میں سے ایک ہے جن کے بارے میں حضور ؐ نے لفظ "مولقات" استعمال کیا ہے۔ بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا سات ان گناہوں سے اجتناب کرو جو مولقات ہیں۔ کہا گیا حضور ؐ وہ کیا ہیں؟ تو آپ ؐ نے فرمایا الشرک باللہ' سحر' ایسے شخص کا قتل جس کا قتل حرام ہو' اکل ربا' اکل مال یتیم' دوبدو جنگ میں پیٹھ پھیرنا اور محض بے خبر مومن عورتوں پر الزام لگانا۔

امام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں اس کے بارے میں تفصیلات دی ہیں یہاں ان پر نظر ڈالنا مفید رہے گا۔ "اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ (۸:۱۶) ابونضرہ نے ابو سعید سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ یوم بدر کے معاملے میں تھا کیونکہ اس دن وہ بھاگ کر کس سے ملتے؟ صرف یہ صورت تھی کہ وہ مشرکین سے ملتے۔ کیونکہ مسلمان تو ان کے سوا کوئی تھا نہیں۔ ابونضرہ نے جو رائے اختیار کی ہے یہ درست نہیں ہے کیونکہ اس موقعہ پر مدینہ میں بے شمار انصاری مسلمان موجود تھے۔ اور حضور ؐ نے سب لوگوں کو حکم نہ دیا تھا کہ وہ نکلیں' اور نہ ان لوگوں کی رائے تھی کہ جنگ ہو جائے۔ سب کا خیال یہ تھا کہ قافلے کے ساتھ ہی مڈبھیڑ ہو گی۔ حضور ؐ ایک خفیف سی قوت لے کر نکلے۔ لہذا ابونضرہ کا کہنا کہ اس دن ان لوگوں کے سوا اور کوئی مسلمان نہ تھا اور اگر وہ بھاگتے تو صرف کفار کی طرف بھاگ جاتے' غلط ہے اور دلیل وہی ہے جو ہم نے بیان کی۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جنگ بدر کے دن ان کے لئے بھاگنا اور پیٹھ پھیرنا اس لئے جائز نہ تھا کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود تھے اور حضور کو چھوڑ کر بھاگنا جائز نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ

وَلَا يَرْغَبُوا عَنْ نَفْسِهِ "اہل مدینہ اور اس کے ماحول میں رہنے والے اعراب مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بیٹھے رہتے اور اس کی طرف سے بے پرواہ ہو کر اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔" اس لئے ان کے لئے یہ جائز نہ تھا کہ وہ اپنے نبی کو ناکام بناتے اور اسے چھوڑ کر دشمن کے حوالے کر دیتے۔ اگرچہ اللہ اس کا کفیل تھا اور ان کا مددگار تھا۔ اس نے ذمہ داری قبول کی تھی کہ اسے کافروں سے بچائے گا۔ جیسا کہ کہا گیا وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ "اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔" لہذا ان پر حضور ؐ کی مدد کرنا فرض تھا۔ چاہے دشمن زیادہ ہو یا قلیل ہو۔ اور ان لوگوں کی دلیل یہ بھی ہے کہ اس دن حضور ؐ ہی ایک دستہ تھے اور جنگ میں پیٹھ پھیرنا اس شرط پر جائز تھا کہ وہ مجاہدین کی کسی دوسری کمپنی کی طرف پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ حضور ؐ اس دن واحد گروہ تھے' کوئی اور گروہ بدریوں کے علاوہ کسی جگہ تعینات نہ تھا۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ میں ایک لشکر میں تھا۔ لوگوں نے یکبارگی حملہ کیا اور

ہم مدینہ کی طرف لوٹ آئے۔ ہم نے کہا کہ ہم تو بھاگنے والوں میں سے ہیں۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'میں تو تمہارے لئے فئہ ہوں۔ اس لئے جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہو اور وہ واپس آجائے تو اس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس ہونا جائز ہے۔ اور اگر حضور ؐ جنگ میں موجود ہوں تو پھر کوئی ایسا گروہ موجود نہ ہو گا جس کے ساتھ ملنے کے لئے فوجیوں کے لئے بھاگنا جائز ہو۔ و من یولھم یومئذ دبرہ "اور جو شخص اس دن پیٹھ کفار کی طرف پھیرے گا۔" اس آیت کے بارے میں ابن الحسن کہتے ہیں کہ اہل بدر پر بہت ہی سختی سے احکامات نافذ کرائے گئے اور یہ آیت

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّھُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا

کَسَبُوْا "وہ لوگ جو اس دن بھاگ گئے جس دن دو فوجوں کا آمنا سامنا ہوا 'ان کو شیطان نے ان کی بعض بداعمالیوں کی وجہ سے پھسلا دیا۔" اس لئے کہ یہ لوگ حضور ؐ سے بھاگ گئے تھے۔ نیز حنین کی جنگ میں بھی یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس لئے اللہ نے اس فعل پر ان کو سزا دی۔

وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ

بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ (۹ : ۲۵) "اور حنین کے دن کو یاد کرو جب تمہاری کثرت نے تمہیں غرور میں ڈال دیا تھا لیکن اس کثرت نے تمہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔" تو یہ تھا حکم اس حالت کے لئے جب حضور ؐ ان کے ساتھ تھے۔ چاہے دشمن کم ہو یا زیادہ۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی رعایت نہیں دی۔" "ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ

یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۸ : ۶۵) "اے نبی ؐ مومنوں کو جنگ پر ابھارو 'اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔" یہ حکم اس وقت کے لئے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس نہ ہوتے 'واللہ اعلم۔ ایسے حالات میں پہلے حکم یہ تھا کہ بیس دو سو سے مقابلہ کریں گے اور میدان چھوڑ کر نہ بھاگیں گے اور اگر دشمن اس تعداد سے زیادہ ہو تو پھر بہترین صورت میں حملے کے لئے پیچھے ہٹنا جائز ہو گا۔ لیکن یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا اور دوسری آیت نازل ہوئی۔

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا

مِائَتَیْنِ (۸ : ۶۶) "اچھا اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا 'اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے 'پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو وہ دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے۔"

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ پہلے فرض یہ کیا گیا تھا کہ ایک آدمی دس سے نہیں بھاگے گا۔ پھر اسے کم کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا (۸: ٦٦) "اچھا رب نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے۔"

اب فرض یہ عائد ہوا کہ ایک صد دو صد سے نہ بھاگیں گے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اب حکم یہ ہے کہ اگر ایک شخص دو سے بھاگے تو یہ فرار ہو گا اور اگر کوئی تین کے مقابلے میں بھاگ جائے تو فرار نہ ہو گا۔ شیخ کہتے ہیں کہ یہاں فرار سے مراد وہ فرار ہے جو اس آیت میں مقصود ہے۔ آیت نے یہ فرض کیا ہے کہ ایک آدمی دو کے مقابلے میں ڈٹ جائے گا اور اگر دو سے زیادہ تعداد ہو تو پھر مجاہد کے لئے دوبارہ جنگ کی تیاری کی نیت سے اور فوج کے ساتھ ملنے کی غرض سے فرار جائز ہے۔ لیکن اگر ایک شخص ایسے غیر مسلم مسلمانوں کی طرف فرار کرتا ہے تو بھی وہ اس وعید کا مستحق ہو گا جو اس آیت میں وارد ہے۔ کیونکہ آیت میں حکم ہے:

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۸: ۱٦) "جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری، الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے ---- تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔" یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ہر مسلمان کے لئے دوسری فوج (فئہ) ہوں۔ حضرت عمر ابن الخطاب کو جب معلوم ہوا کہ ابو عبید ابن مسعود نے ایک لشکر کے ساتھ جنگ کی اور شہید ہو گئے لیکن بھاگے نہیں تو انہوں نے کہا "اللہ ابو عبید پر رحم کرے اگر وہ میری طرف واپس آ جاتا تو میں اس کے لئے دوسری فوج ہوتا۔ اور جب ابو عبید کے ساتھی واپس آئے تو حضرت عمر نے کہا میں تمہارے لئے دوسری فوج ہوں۔ آپ نے ان پر کوئی سختی نہ کی اور نہ باز پرس کی۔ یہی حکم ہمارے ہاں ہے۔ (یعنی حنفیہ کے نزدیک جب تک مسلمانوں کی فوج کی تعداد ۱۲ ہزار تک نہیں پہنچ جاتی کیونکہ ۱۲ ہزار کے لئے اپنے مقابلے میں ہٹنا جائز نہیں ہے۔ اگر ان کی تعداد دگنی ہو الا یہ کہ وہ جنگی چال کے طور پر ایسا کریں۔ جنگی چال یہ کہ وہ ایک مورچے سے دوسرے مورچے میں چلے جائیں، یا کوئی دوسری چال اختیار کریں جس میں جنگ سے فرار کا عنصر نہ ہو۔ یا دوسری فوج اور یونٹوں سے ملیں۔ محمد ابن الحسن سے مذکور ہے کہ اگر فوج ۱۲ ہزار تک پہنچ جائے تو اس پر فرض ہے کہ ہر صورت میں دشمن کا مقابلہ کرے۔ اس بارے میں حنفیہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حنفیہ نے حدیث زہری سے استدلال کیا ہے جو انہوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ ابن عباس نے حضور ؐ سے یہ روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا: "اچھے ساتھی چار ہیں اور اچھے فوجی دستے چار سو ہیں اور اچھے لشکر چار ہزار ہیں اور ۱۲ ہزار افراد کے لشکر کو قلیل نہ سمجھا جائے گا اور نہ ہی وہ مغلوب ہوں گے۔" بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں: "کہ تم میں سے کوئی قوم بھی اگر ۱۲ ہزار ہو تو مغلوب نہ ہو گی بشرطیکہ کہ اس میں اتحاد ہو۔" امام طحاوی نے یہ نقل کیا ہے کہ امام مالک سے پوچھا گیا: "کیا ہمارے لئے ایسے شخص کے خلاف جہاد و قتال سے رکنا جائز ہے جو احکام الٰہی کی پیروی نہیں کرتا اور اللہ کے سوا دوسروں کے احکام کے مطابق فیصلے کرتا ہے تو انہوں نے کہا کہ اگر تمہارے جیسے ۱۲ ہزار افراد موجود ہوں تو پیچھے ہٹنا منع ہے۔ اور اگر اس قدر افراد نہ ہوں تو تمہارے لئے گنجائش ہے کہ قتال نہ کرو۔" اور یہ سائل عبد اللہ ابن عمر ابن عبد العزیز تھے۔ ابن عبد اللہ

ابن عمر تھے - اور یہ بات اس رائے کے مطابق ہے جو محمد ابن الحسن سے نقل کی گئی - نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ۱۲ ہزار کے بارے میں جو روایت ہے وہ اس موضوع پر اصل اور اصول ہے - اگرچہ کافروں کی تعداد بہت زیادہ ہو - ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ فرار اختیار کریں - اگرچہ وہ ان سے کئی گنا زیادہ ہوں - کیونکہ حضور ؐ نے جو شرط لگائی "اگر ان کے اندر اتحاد ہو۔" تو اس سے حضور اکرم ؐ ان پر اتحاد کرنا فرض کر دیا ہے ۔"

اسی طرح ابن عربی نے بھی اپنی کتاب احکام القرآن میں یہ تفصیلات دی ہیں - انہوں نے اس حکم کے بارے میں یہ کہا ہے :

"اس بارے میں اختلاف ہے کہ جنگ کے میدان سے فرار کی ممانعت یوم بدر کے لئے مخصوص تھی یا قیامت تک یہی حکم ہے -

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ یہ ممانعت یوم بدر کے ساتھ مخصوص تھی - کیونکہ اس دن اس کے لئے دوسری فوج صرف رسول اللہ کی ذات ہی تھی - یہی رائے نافع ' حسن ' قتادہ ' یزید ' ابن حبیب اور ضحاک کی ہے -

"حضرت ابن عباس اور تمام دوسرے علماء سے یہ روایت ہے کہ یہ حکم قیامت تک کے لئے باقی ہے اور جن لوگوں نے اسے یوم بدر کے ساتھ مخصوص کیا ہے انہوں نے وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ (۸ : ۱۶) سے استدلال کیا ہے کہ اس سے مراد بدر ہے حالانکہ یومئذ سے مراد یوم الزحف ہے یعنی مطلق جنگ کا دن -"

"اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیات یوم بدر کی قتال کے بعد نازل ہوئیں اور ان کے نزول کے وقت جنگ بدر ختم ہو چکی تھی - اور اس دن جو ہونا تھا ' وہ ہو چکا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم حدیث نقل کر آئے کہ کبائر یہ ہیں - اور ان میں سے جنگ کے دن بھاگنے کو بھی شمار کیا گیا اور یہ اس مسئلہ پر نص صریح ہے جس کے بعد اختلاف رفع ہو جانا چاہئے اور ہم نے اس نکتے پر متنبہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ اشکال پیش آیا کہ اس سے مراد یوم بدر ہے -"

ہمارے خیال میں ابن عربی نے تمام علماء کی جو رائے نقل کی ہے اور ابن عباس سے بھی وہی منقول ہے ' ہم بھی اسی کی طرف جاتے ہیں - اس لئے کہ جنگ کی صفوں سے بھاگ نکلنا ایک نہایت ہی برا فعل ہے اور اس کے دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں - تحریکی اعتبار سے بھی اور اعتقادی اور نظریاتی اعتبار سے بھی -"

مومن کا دل و دماغ نہایت ہی پختہ ہونا چاہئے - اس طرح کہ وہ زمین کی کسی بھی قوت کے سامنے متزلزل نہ ہو - اور اس کا رابطہ ایسی قوت کے ساتھ ہونا چاہئے جسے اپنے امور پر مکمل کنٹرول حاصل ہو اور وہ بندوں کے اوپر مکمل غلبہ رکھتی ہو اور جب کسی مومن کا دل و دماغ خطرات کو دیکھ کر متزلزل ہو گیا تو یہ تزلزل فرار پر منتج نہ ہونا چاہئے - کیونکہ موت اللہ کے اختیار میں ہے - اس لئے کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ موت کے ڈر سے پیٹھ پھیرے - یہ حکم ایسا نہیں ہے کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم دیا جا رہا ہے 'کیونکہ مومن بھی انسان ہے اور اس کا دشمن بھی انسان ہے - اس لحاظ سے وہ گویا ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں - پھر مومن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ربط ایسی قوت کے ساتھ ہے جس پر کوئی غالب نہیں ہے - اگر وہ زندہ ہے تو پھر وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسی طرف متوجہ ہے اور اگر مر گیا تو بھی اللہ کی طرف لوٹنے والا ہے - اگر اس کے لئے شہادت رکھ دی گئی ہے تو بھی وہ اس پوزیشن سے بہت اچھی ہے ' جو اس

کے دشمن کی ہے کیونکہ دشمن تو اللہ اور رسول اللہ کے مقابلے میں آتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ یہ قطعی حکم دیا جاتا ہے ۔

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۸:۱۶) "جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری' الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے ---- تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے۔"

---()()()---

یہاں قرآن کریم نے جو اسلوب گفتگو اپنایا ہے اس میں بہت سے اشارات ہیں' فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ (۸:۱۵) اور وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ (۸:۱۶) یہ دراصل ہزیمت اور شکست کی حسی تعبیر ہے اور نہایت ہی حقارت آمیز نقشہ دیا گیا ہے بھاگنے والوں کا۔اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ دشمن کو منہ دکھانا چاہنے مقعد نہیں ۔ پھر فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ (۸:۱۶) گویا شکست کھانے والا دراصل پیٹھ پھیرتا ہے اور اس کے ساتھ غضب الٰہی ہوتا ہے اور یہ غضب الٰہی اسے جہنم تک لے جاتا ہے جو برا ٹھکانا ہے۔وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۸:۱۶) یوں انداز کلام میں بھی جنگ کے دن پیٹھ پھیرنے کی منظرکشی اس طرح کی گئی ہے جس سے اس فعل کی قباحت اور کراہت بالکل واضح معلوم ہوتی ہے اور کوئی غیرت مند شخص اسے پسند نہیں کرتا۔

جنگ کے دن پیٹھ پھیرنے کی ممانعت کے بعد اب سیاق کلام میں یہ حقیقت بتائی جاتی ہے کہ اس معرکے کے پیچھے دراصل دست قدرت کام کر رہا ہے ۔یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے دشمنوں کو قتل کیا۔وہی ہے جو تمہارے تیر کو درست نشانے پر پہنچاتا ہے ۔اور تمہیں جو اجر دیا جاتا ہے وہ تو محض اس لئے ہے کہ اہل ایمان اس آزمائش میں کامیاب رہے اور انہوں نے جدوجہد کی اور اللہ نے ان کو اس ثواب کا مستحق بنایا اور اجر عطا کیا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۸:۱۷) "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبی ؐ تو نے پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کئے گئے) تو یہ اس لئے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے' یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔"

روایات میں آتا ہے کہ اس مارنے سے وہ مارنا مراد ہے کہ حضور ؐ نے کنکریاں اور ریت ہاتھ میں لیں اور انہیں کفار کے لشکر کی طرف پھینکا اور حضور ؐ نے اس وقت یہ الفاظ کہے شاھت الوجوہ - شاھت الوجوہ "ان کے چہرے بدشکل ہو جائیں' قبیح ہو جائیں ۔" اور یہ آیت اور کنکریاں ان چہروں پر جا کر لگیں جن کا اس جنگ میں قتل ہونا مقدر تھا۔

لیکن اس آیت کا مفہوم عام ہے ۔مقصد یہ ہے کہ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور لشکر اسلام جو کچھ کر رہا تھا' اس کے پیچھے دست قدرت کام کر رہا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد آیت میں یہ فقرہ ہے : وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا (۸: ۱۷) ''تاکہ مومنین کو اس آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے ۔'' یعنی تاکہ وہ مومنین کو آزمائش کا یہ موقعہ دے اور اس پر وہ اجر کے مستحق ہو جائیں جبکہ فتح تو اس نے لکھ دی تھی ۔گویا یہ کامیابی ہر حال میں مزید اجر کا باعث تھی' پہلے بھی اور بعد میں بھی ۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸: ۱۷) ''یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے ۔'' وہ تمہاری دعاؤں کو سن رہا تھا' اور تمہارے حالات سے اچھی طرح باخبر تھا۔ یہ سب معاملہ تو یہ تھا کہ تمہیں اس نے اپنی قدرت کے لئے ایک راہ بنایا۔ لیکن یہ اس وقت بنایا جب تم نے خلوص کا اظہار کر دیا۔ اسی لئے اس نے تمہیں نصرت بھی دی اور تم اجر کے مستحق بھی ٹھہرے ۔ ہمیشہ اللہ ایسا ہی کرتا ہے جیسا کہ اس نے بدر میں کیا۔ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (۸: ۸) ''یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ ہے اور کافروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اللہ ان کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے ۔''

یہ اللہ کی جانب سے دوسری امداد ہے ' اللہ کی تدبیر اس بات پر ختم نہیں ہو جاتی کہ وہ تمہارے دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتا ہے ۔ اور تمہارے تیروں کو ٹھیک نشانے پر بٹھاتا ہے ' اور تمہارے لئے آزمائش کا اچھا میدان فراہم کرتا ہے تاکہ وہ تمہیں اجر دے ۔ وہ یہ کام بھی کرتا ہے کہ کفار جو جو سازشیں کرتے ہیں ان کے بند بھی ڈھیلے کرتا جاتا ہے اور ان کی تدابیر کو کمزور کرتا ہے ۔ لہٰذا تمہیں ڈرنا نہیں چاہئے اور اس معرکے میں اہل ایمان کی شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ مسلمانوں کی جانب سے پیٹھ پھیرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے ۔

چنانچہ ان فقرات سے تمام سوالات کا جواب خود بخود سامنے آجاتا ہے ۔ اگر اللہ خود کفار کو قتل کرتا ہے اور اگر اللہ خود تیر یا پتھروں کو مارنے والا ہے اور خود وہ یہ میدان آزمائش سجانے والا ہے تاکہ مسلمانوں کو انعام دے ' اور اگر وہ خود دشمنوں کی تدابیر کو کمزور کرنے والا ہے ' تو پھر انفال اور اموال غنیمت کے بارے میں نزاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ' کیونکہ معاملات کا اختیار بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور آغاز و انجام بھی اسی کی تدابیر کے مطابق ہے ۔ رہے انسان اور مسلمان تو وہ صرف تقدیر الٰہی کے نشانات و علامات ہیں ۔

---○○○---

جب بات یہاں تک پہنچی کہ ''اللہ کافروں کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے ۔'' یہاں سے روئے سخن کفار کی طرف موڑ دیا جاتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اس معرکے سے پہلے ہی فیصلہ چاہتے تھے اور اللہ کے سامنے دست بدعا تھے کہ اے اللہ دو مقابل فریقین میں سے جو گمراہ ہے ' یہ جنگ اس کے خلاف کر دے ۔ جو ایسی باتیں کرتا ہے جو معروف نہیں ہیں ' اسے تباہ کر دے اور جو صلہ رحمی کے خلاف ہے ' اسے ہلاک کر دے ۔ یہ دعا ابوجہل نے کی تھی ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کا فیصلہ ان کے خلاف کر دیا اور اب ان کو خطاب کر کے ان پر طنز کیا جاتا ہے کہ تم ہی تو تھے جو بددعاء کرتے تھے ۔ مقصد یہ ہے کہ بدر میں جو کچھ ہوا' وہ اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق ہوا اور یہ کہ کفار کی کثرت اور اجتماع نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ کیونکہ اللہ کی سنت جاریہ کو وہ بدل نہ سکتے تھے اور اللہ مومنین کے ساتھ تھا۔

إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَإِنْ

۲ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ

۹ ع شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۹﴾

۱۶

(ان کافروں سے کہہ دو) "اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو' فیصلہ تمہارے سامنے آگیا۔ اب باز آجاؤ' تمہارے ہی لئے بہتر ہے' ورنہ پھر پلٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی اسی سزا کا اعادہ کریں گے اور تمہاری جمعیت' خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو' تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی۔ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔"

تم یہ دعائے فیصلہ کرتے تھے کہ مسلمانوں اور مشرکوں میں سے جو بھی حق پر ہو' اللہ یہ جنگ اس کے حق میں کر دے یا یہ کہ فریقین میں سے جو گمراہ اور صلہ رحمی کے خلاف موقف اختیار کر رہا ہو اس کے خلاف کر دے۔ اللہ نے یہ دعا قبول کر لی۔ جنگ تمہارے خلاف کر دی۔ اس سے تمہاری بات کی تصدیق ہو گئی اور جنگ گمراہ تر فریق کے خلاف فیصل ہو گئی۔ اگر تم فی الواقعہ گمراہ فریق کو معلوم کرنا چاہتے تھے' بھائی چارے کے خلاف فریق کو معلوم کرنا چاہتے تھے' تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ یہ کون سا فریق ہے۔ لہٰذا تمہارا فرض تو یہ ہے کہ تم نتائج جنگ دیکھ کر اسلام کی طرف آجاؤ اور شرک و کفر کو ترک کر دو اور مسلمانوں اور رسول اللہ کے خلاف معاندانہ رویہ چھوڑ دو۔

إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ وَإِنْ تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۸:۱۹) ع

(ان کافروں سے کہہ دو) "اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو' فیصلہ تمہارے سامنے آگیا۔ اب باز آجاؤ' تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔"

اور اس کے بعد ایک ذرا وا بھی وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ (۸:۱۹) ع "ورنہ پھر پلٹ کر اسی حماقت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی اسی سزا کا اعادہ کریں گے۔"

اور انجام سب کو معلوم ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں کثرت افواج فیصلہ کن نہیں ہوا کرتی اور نہ نتائج اس طرح بدل سکتے ہیں۔ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ (۸:۱۹) ع "اور تمہاری جمعیت' خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو' تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی۔"

اگر اللہ مسلمانوں کی طرف ہو تو کفار کی جمعیت کچھ بھی نہیں کر سکتی اور یہاں صورت یہ ہے: وَأَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ (۸:۱۹) ع "اور اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔"

اس لئے کہ اس رنگ میں جو معرکہ ہو گا' اس میں دونوں اطراف کی قوتوں کے درمیان کوئی توازن نہیں ہے۔ مومنین کے ساتھ اللہ ہے اور اللہ ان کے ساتھ صف میں ہو گا اور کفار کے ساتھ صرف ان ہی جیسے آدمی ہیں۔ یہ

دوسری صف میں ہوں گے اور ایسے فریقین کے درمیان معرکے کا نتیجہ پہلے سے معلوم ہے۔

مشرکین عرب بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے۔ اللہ کے بارے میں ان کا تصور اور معرفت اس قدر سطحی نہ تھی اور نہ پیچیدہ تھی جس طرح بعد کے ادوار میں کفار نے اللہ کے بارے میں سطحی نظریات اختیار کئے۔ کیونکہ عربوں کا شرک اس نوعیت کا نہ تھا کہ وہ ذات باری کے صاف منکر ہوں۔ نہ یہ کہ وہ حقیقت سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ ان کا شرک صرف یہ تھا کہ وہ عبودیت اور بندگی صرف اللہ کے لئے مخصوص نہ کرتے تھے اس طرح کہ وہ ہدایت اور قوانین صرف اللہ سے اخذ کرتے ہوں۔ اس قدر شرک بھی دراصل ان کی معرفت الوہیت کے ساتھ لگا نہ کھاتا تھا۔

اس سے قبل ہم اس معرکے کے واقعات میں یہ بات نقل کر آئے ہیں کہ خفاف ابن ایما ابن رحضتہ الغفاری یا ان کے والد ایما ابن رحضتہ الغفاری نے لشکر قریش کو اپنے بیٹے کے ہاتھ کچھ مویشی دے کر بھیجا اور یہ مویشی بطور ہدیہ ان کو دیئے۔ اور یہ پیشکش بھی کی کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اسلحہ اور جوان بھی دے دوں۔ قریش نے اس کے بیٹے کے ذریعے یہ جواب دیا کہ "تم نے صلہ رحمی کا حق ادا کر دیا اور تم پر جو فرض تھا وہ تم نے ادا کر دیا۔ خدا کی قسم اگر ہماری جنگ انسانوں سے ہو تو ہم اس قدر کمزور نہیں ہیں اور اگر ہماری جنگ خدا کے ساتھ ہو------- جیسا کہ محمد خیال کرتے ہیں------ تو اللہ کے مقابلے میں کوئی انسان نہیں لڑ سکتا۔"

اسی طرح کی ایک بات اخنس ابن شریق کی کتب سیرت میں موجود ہے۔ انہوں نے بنی زہرہ سے کہا اور یہ دونوں اس وقت مشرک تھے۔ "اے بنی زہرہ، اللہ نے تمہارے اموال کو بچا لیا اور تمہارے ساتھی مخرمہ ابن نوفل بسلامت آگئے۔ اور خود ابوجہل (جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کا فرعون قرار دیا) کی ایک دعا کتب سیرت میں منقول ہے: "اے اللہ ہم میں سے جو بھائی چارے کے خلاف ہے، اور ایسی باتیں کرتا ہے جو معروف نہیں ہیں تو کل اس کے دشمن بن جائیں۔"

اسی طرح حکیم ابن حزام کا قول، جب ان کے پاس عتبہ ابن ربیعہ کا پیغام آیا کہ اس جنگ سے لوٹ آؤ۔ اس نے کہا:

"خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم واپس نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان فیصلہ نہ کر دے۔"

ذات باری کے متعلق ان کا یہ تصور بہرحال تھا اور ہر موقعہ پر وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ ملحد تھے اور خدا کو مانتے اور جانتے نہ تھے۔ یا یہ نہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے ساتھ کوئی جنگ نہیں کر سکتا۔ یا وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ فریقین میں فیصلہ کرنے والا اللہ ہے اور اس کے حکم کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے۔ ان کے شرک کی ابتداء یہاں سے ہوئی تھی کہ وہ نظام زندگی کے بارے میں ہدایات صرف اللہ سے نہ لیتے تھے، غیر اللہ سے بھی لیتے تھے حالانکہ وہ ذات باری کا بھی جیسا کہ ہم نے بیان کیا، اعتراف کرتے تھے۔ اور یہ وہ بات ہے جس میں آج کے مسلمان اور اس وقت کے مشرک برابر ہیں۔ حالانکہ آج کے مسلمان یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ دین محمد پر ہیں جبکہ اس وقت کے مشرکین مکہ میں یہ عقیدہ رکھتے تھے اور اس بات کے مدعی تھے کہ وہ اپنے باپ ابراہیم کے دین پر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابوجہل، ابوجہل ہونے کے باوجود اللہ سے فیصلہ طلب کر رہا تھا۔ "اے اللہ، ہم میں سے جو زیادہ بھائی چارے کے خلاف ہو، اور جس کی بات زیادہ عرف کے خلاف ہو، کل اس کے دشمن بن جائیں۔" یہ تھے اس کے الفاظ۔

رہے وہ بت جن کے بارے میں یہ بات متعارف ہے کہ وہ ان کی پرستش کرتے تھے، ان کے بارے میں ان کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ بھی اسی طرح الٰہ ہیں جس طرح اللہ الٰہ ہے، خدا کے بارے میں ان کے اعتقادی تصورات کے بارے

میں قرآن کریم نے یہ تصریح کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ ان بتوں کی پوجا کیوں کرتے تھے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

"وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو ولی بنایا (کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔" یہ تھا ان کا تصور الہ یعنی یہ الہ ان کے سفارشی ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا حقیقی شرک یہی تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کے دربار میں سفارشی تصور کرتے تھے اور نہ ان کا اسلام صرف یہ تھا کہ وہ ان سفارشیوں کا انکار کر دیتے تھے' ورنہ وہ لوگ جو حنفاء کہلاتے تھے اور جو بتوں کو نہ پوجتے تھے وہ مسلمان تصور ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل میں اللہ وحدہ کو حاکم تصور کیا جائے' اور جو لوگ اللہ کو وحدہ حاکم اور مطاع تصور نہیں کرتے وہ چاہے جس زمان و مکان میں ہوں' وہ شرک میں ہیں۔ ان کو اس شرک سے ان کا یہ عقیدہ نہیں نکال سکتا کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے یعنی محض اعتقادی تصور اور صرف یہ بات بھی ان کو شرک سے نہیں نکال سکتی کہ وہ بندگی کے مراسم صرف اللہ کے سامنے بجالائیں کیونکہ اس حد تک آج کے مسلمانوں کو صرف حنفاء کہا جا سکتا ہے۔ مسلمان' مسلمان تب تصور ہوں گے جب اسلام کے تمام حلقوں اور کڑیوں کو ملا سکیں۔ یعنی وہ اللہ کو ایک سمجھے' اس کی عبادت بجالائے اور اسے الہ سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کی حاکمیت کا اقرار بھی کریں۔ اس کے احکام' اس کے قوانین' اس کی مقرر کردہ اقدار کو تسلیم کریں۔ صرف یہی اسلام حقیقی اسلام ہے۔ اور یہی اسلام کلمہ شہادت میں بیان ہوا ہے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا یہی مفہوم ہے۔ اور یہی مفہوم اسلامی عقائد اور اسلامی معاشرے میں معروف اور معتبر ہے۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ جو اس مفہوم کے اعتبار سے کلمہ طیبہ کا اقرار کریں وہ ایک اجتماعی شکل میں منظم اور متحرک ہوں اور ان کی اپنی مسلم قیادت ہو اور وہ تمام جاہلی آلودگیوں سے اس طرح نکل کر باہر آجائیں جس طرح مکھن سے بال نکل آتا ہے۔

جو لوگ حقیقتاً مسلمان بننا چاہتے ہیں' ان کو چاہئے کہ وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں۔ اس لئے ان کو اس بات سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ وہ محض عقیدے یا محض مراسم عبودیت کی وجہ سے مسلمان ہوگئے ہیں' صرف ان باتوں سے لوگ حقیقی مسلمان نہیں بن جاتے' جب تک وہ اللہ وحدہ کو اپنا حاکم تصور نہ کریں۔ اور تمام دوسرے لوگوں کی حاکمیت کا اقرار نہ کر دیں۔ اور جب تک وہ اپنی تمام ہمدردیاں اور دوستیاں جاہلی معاشروں سے واپس نہیں لے لیتے۔

یہ غلط فہمی بہت سے مخلص اور نیک مسلمانوں کو لاحق ہے۔ دراصل ایسے مخلص لوگ فی الحقیقت اسلام چاہتے ہیں لیکن وہ دھوکے میں مبتلا ہیں' لہٰذا ایسے مخلص مسلمانوں کا فرض ہے کہ پہلے وہ اسلام کی ماہیت کے بارے میں ذہنوں سے غلط فہمی دور کر دیں اور یہ معلوم کرلیں کہ جن لوگوں کو وہ مشرکین عرب کہتے ہیں وہ عقائد اور اعمال میں وہ ان سے مختلف نہ تھے۔ وہ اللہ کی ذات کو مانتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا' اپنے بتوں کو وہ اللہ کے ہاں سفارش تصور کرتے تھے۔ ان کا اصلی شرک' شرک فی الحاکمیت تھا' اعتقادی نہ تھا۔

جب عام مخلص مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلام کی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھیں تو پھر وہ لوگ جو اقامت دین کا کام کرتے ہیں اور عالم واقعہ میں اسلامی نظام زندگی اور اللہ کی حاکمیت کا احیاء چاہتے ہیں ان پر تو فرض ہے

کہ اس حقیقت کو نہایت ہی واضح طور پر اور اس کی گہرائی تک سمجھیں - اور اس بارے میں وہ کوئی مجمل بات نہ کریں اور نہ شف شف کریں - لوگوں کو دو ٹوک انداز میں اور واضح طور پر بتا دیں کہ حقیقی اسلام یہ ہے - یہ ان کے کام کا نقطہ آغاز ہے - اگر کوئی تحریک اس سے ادنیٰ انحراف بھی کرے گی تو وہ گمراہ ہو جائے گی اور وہ غلط اساسوں پر تعمیر شروع کر دے گی - اگرچہ اس کے رکن مخلص ہوں اور تحریک خود عظیم جدوجہد کرنے والی ہو -

اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلسل یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (۸ : ۲۰) سے انہیں مخاطب کیا جاتا ہے - اور یہ خطاب ان مضامین کے بعد آتا ہے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے' اور اس خطاب میں ان کو یہ وصیت کی جاتی ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں - ان کو اللہ اور رسول ﷺ سے سرکشی کرنے سے خبردار کیا جاتا ہے اور انہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے جو اللہ کی آیات کو سنتے ہیں اور ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں گویا انہوں نے سنا ہی نہیں ہے - یہ لوگ گونگے اور بہرے ہیں اگرچہ وہ آنکھیں اور کان رکھتے ہیں اور زبان رکھتے ہیں - یہ لوگ بدترین جانور ہیں - اس لئے کہ یہ جانوروں کی طرح سنتے تو ہیں لیکن راہ ہدایت نہیں پاتے -

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝۲۰ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ۝۲۱ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝۲۲ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَھُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ لَتَوَلَّوْا وَّھُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۳

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو - ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے تھے - یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے - اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انہیں سننے کی توفیق دیتا (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ ان کو سنواتا تو وہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے -"

یہ پکار ان لوگوں کو ہے جو ایمان لائے ہیں - انہیں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کریں - اللہ کی آیات و کلمات سنتے ہوئے روگردانی نہ کریں - یہ پکار ان اشارات کے بعد آئی ہے جو بطور مقدمہ و تمہید اس سے پہلے آنا ضروری تھے - اس سے قبل اس معرکے کے بڑے بڑے واقعات بیان کر دیئے گئے تھے - ذات باری کو دیکھنا' اس کی تدبیر کا تصور' اس کی معاونت اور امداد کی یقین دہانی' اور یہ تصریح کہ اللہ مومنین کے ساتھ ہے اور یہ کہ وہ کافروں کی تمام تدابیر کو ڈھیلا کرنے والا ہے لہذا اس کے بعد سمع و اطاعت کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا - ان حقائق کے ہوتے ہوئے بھی اللہ اور رسول اللہ سے روگردانی کرنا نہایت ہی قبیح اور منکر فعل نظر آتا ہے - کوئی عقلمند انسان ایسی حرکت نہیں کر سکتا - یہی وجہ ہے کہ یہاں چوپایوں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے' کیونکہ لفظ (دواب) میں طبیعت کے لحاظ سے انسان بھی شامل ہیں - لیکن دواب کا لفظ انسانوں کے مقابلے میں مویشیوں پر زیادہ بولا جاتا ہے - اس لئے اس لفظ کا بعض انسانوں پر

اطلاق کرنے سے حیوانات کا تصور خود بخود سامنے آجاتا ہے اور جو لوگ گونگے اور بہرے ہیں اور علم نہیں رکھتے ان کے بارے میں حیوانیت کا تصور دیا جاتا ہے۔ گویا جہلاء درحقیقت جانور ہیں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ جانوروں کے کان تو ہیں لیکن وہ چند مبہم کلمات ہی سن سکتے ہیں۔ ان کی زبان بھی ہے لیکن وہ معانی پر مشتمل کلمات نہیں بول سکتے۔ ہاں بہائم کو فطری صلاحیت دے دی گئی اور وہ اس فطری صلاحیت کے مطابق اپنا کاروبار زندگی چلاتے ہیں جبکہ انسان مویشی اپنی ضروریات زندگی بھی خود اپنی عقل سے تجویز کرتے ہیں۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۲۰) وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ ھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (۲۱) اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۲۲) (۸: ۲۰ تا ۲۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اور حکم سننے کے بعد اس سے سرتابی نہ کرو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" اور یہ لوگ کیوں شرالدواب ہیں؟

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَھُمْ (۸: ۲۳) "اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی بھلائی ہے تو وہ ضرور انہیں سننے کی توفیق دیتا۔" اس لئے کہ اللہ کو معلوم ہے کہ ان میں کوئی بھلائی نہیں ہے اور اگر ان میں بھلائی ہوتی تو اللہ ان کو سماعت اور قبولیت کی توفیق دے دیتا لیکن انہوں نے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنی فطری استعداد کو ختم کر دیا ہے۔ چونکہ انہوں نے اپنے دل و دماغ کے دروازے بند کر دیئے تھے' اس لئے اللہ نے بھی ان کو سماعت کی توفیق سے محروم کر دیا۔ اگر اللہ ان کو سمجھا بھی دیتا تو بھی ان کا رویہ ایسا ہو گیا تھا کہ وہ مان کر نہ دیتے۔

وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ ھُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸: ۲۳) (لیکن بھلائی کے بغیر) اگر وہ ان کو سنوارتا تو وہ بے رخی کے ساتھ منہ پھیر جاتے۔" کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ عقل ایک بات کو پا لیتی ہے لیکن دل اس قدر مسخ ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہ مان کر نہیں دیتے۔ اگر محض فہم و ادراک کی حد تک اللہ ان کو سنا بھی دے تو بھی یہ قبولیت سے محروم ہی رہتے ہیں۔ دنیا میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کی عقل حق پر مطمئن ہوتی ہے لیکن ان کے دل قبول نہیں کرتے۔"

---ooo---

اب دوبارہ اہل ایمان کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہیں۔ کیونکہ رسول کی پکار پر لبیک کہنا تمہارے لئے مفید ہے اور اگر تم نے انکار کیا تو یہ تمہارے لئے برا ہو گا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ

وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ
خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾ وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ
مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَ
أَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے' اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے ۔ اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو ۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے ۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے' زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا' تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں ۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی' اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا' شاید کہ تم شکر گزار ہو ۔"

ذرا رسول اللہ کی دعوت پر غور کرو ۔ وہ تو تمہیں ان نظریات کی طرف بلاتی ہے' جن میں تمہاری زندگی کا سامان ہے ۔ اور اس میں تمہاری روحانی اور طبیعی اور اجتماعی ہر قسم کی زندگی کا سامان ہے ۔

اس دعوت میں ان عقائد و تصورات کو پیش کیا گیا ہے جن سے دل و دماغ زندگی سے بھر جاتے ہیں اور تمام خرافات اور جہالتوں سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں ۔ اوہام اور افسانوں سے نجات پاتے ہیں اور ظاہری اسباب اور طبیعی قوانین کی جکڑ بندیوں سے بھی نجات پاتے ہیں اور غیر اللہ کی بندگی اور اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے انسان کو نجات دلاتے ہیں ۔

یہ دعوت تمہارے سامنے ایک ایسا قانونی نظام پیش کرتی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے ۔ اس قانونی نظام میں انسانیت کی آزادی اور انسانیت کے احترام کے وہ اصول پیش کئے گئے ہیں جو من جانب اللہ ہیں ۔ اس کے اجتماعی نظام میں تمام انسان صف واحد میں کھڑے ہیں ۔ بالکل مساوی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس نظام میں کسی فرد کی حکومت نہیں ہے' کسی طبقے کی حکومت کا تصور نہیں ہے ۔ کسی نسل کی حکومت کا تصور نہیں ہے ۔ کسی قوم کی حکومت کا تصور نہیں ہے' بلکہ اس نظام میں تمام لوگ آزاد اور باہم مساوی ہیں اور سب کے سب صرف قانون رب العالمین کے پابند ہیں ۔

یہ دعوت انہیں ایک ایسے نظام حیات کی طرف بلاتی ہے' ایک ایسے نظام فکر کی طرف بلاتی ہے اور ایک ایسے نظام تصورات کی طرف بلاتی ہے کہ وہ انہیں ماسوائے ضوابط فطرت کے ہر قسم کی جکڑ بندیوں سے رہا کرتی ہے ۔ یہ ضوابط فطرت وہی قوانین و ضوابط ہیں جسے خالق فطرت نے منظم کیا ہے ۔ یہ خالق اپنی مخلوقات کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ یہ قواعد و ضوابط انسان کی تخلیقی قوتوں کو باہم ٹکر اور مقابلے سے بچاتے ہیں اور یہ تخلیقی قوتوں کو ضائع بھی نہیں کرنے اور ان کا قلع قمع بھی نہیں کرتے اور نہ ان پر کوئی منفی پابندیاں لگاتے ہیں ۔

یہ دعوت تمہیں قوت' عزت اور سربلندی کی دعوت دیتی ہے اور انہیں یہ سکھاتی ہے کہ وہ اپنے عقائد' اپنے نظام کو مضبوط کریں ۔ اپنے رب اور اپنے دین پر پورا پورا بھروسہ کریں ۔ اس دعوت کو لے کر انہیں اور دنیا کے تمام انسانوں کو

یہ آزادی عطا کر دیں۔ تمام لوگوں کو خود ان جیسے انسانوں کی غلامی سے آزادی عطا کر دیں۔ کیونکہ تمام دنیا میں انسانوں کو باغیوں اور سرکشوں نے غلام بنا رکھا ہے۔

یہ دعوت انہیں جہاد فی سبیل اللہ کی طرف بلاتی ہے تاکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نظام قائم کیا جا سکے۔ لوگوں کی زندگیاں اس نظام کے مطابق استوار کی جا سکیں۔ اور دنیا سے اقتدار اعلیٰ کے ان نام نہاد مدعیوں کے اقتدار کو ختم کیا جا سکے۔ جن لوگوں نے اللہ کے حق حاکمیت اور منصب مقتدر اعلیٰ کو اپنے لئے خاص کر رکھا ہے یہاں تک کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کے امر اور اقتدار کو تسلیم کر لیں اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے جب تک دین صرف اللہ کا رائج نہ ہو جائے۔ اگر اس جہاد کے عمل میں ان کی جان بھی چلی جائے تو انہیں شہید کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

یہ ہے اجمالی تعارف اس دعوت کا جو حضور اکرمؐ دے رہے ہیں اس لئے یہ دعوت ہر مفہوم اور ہر پہلو کے اعتبار سے زندگی عطا کرنے کی دعوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ کوئی خفیہ عقیدہ نہیں ہے۔ یہ ایک عملی نظام ہے اور اس نظام کے سائے میں دراصل انسانیت زندگی اور ترقی حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ کہا گیا کہ رسول کی دعوت دراصل تمہیں زندہ کرنے کی دعوت ہے۔ اور یہ ہر میدان میں اور ہر پہلو سے کسی بھی سوسائٹی کو زندۂ جاوید کرنے والی ہے۔ قرآن کریم اس عظیم حقیقت کو چند الفاظ میں سمو دیتا ہے۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (۸: ۲۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسول ؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔"

اس کی دعوت پر اس طرح لبیک کہو کہ اس کو بطیب خاطر قبول کرو اور مطیع فرمان بندے بنو۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ تمہیں مجبور کر کے راہ ہدایت پر ڈال سکتا تھا مگر اس نے اس طرح نہیں کیا۔

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ (۸: ۲۴) "اور جان رکھو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے۔" وہ قادر مطلق ہے اور اس کی قدرت نہایت ہی خوفناک قدرت ہے۔ خود انسان اور اس کے دل و دماغ کے درمیان بھی وہ حائل ہو جاتا ہے اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کی راہ روک دیتا ہے اور جس طرف چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ جس طرح چاہتا ہے اس کے رخ کو پھیر دیتا ہے۔ جس شخص کے پہلو میں دل ہوتا ہے اسے اس پر کوئی دسترس حاصل نہیں ہوتی۔

فی الواقعہ یہ ایک خوفناک قدرت ہے اور قرآن کریم اس کا نقشہ کیسے الفاظ میں کھینچتا ہے۔ انسانی طرز تعبیر فی الواقعہ اس قسم کی حسی، لفظی اور معنوی اور موثر تعبیر سے بالکل عاجز ہے۔

یہ خوفناک تصویر ایک مسلمان کی دائمی بیداری کی ضامن ہے۔ مومن بروقت چوکنا رہتا ہے۔ محتاط رہتا ہے اور اپنے دل کی دھڑکن، اس کے میلانات اور اس کے رجحانات کو قابو میں رکھتا ہے۔ وہ ہر قسم کے وسوسے اور ہر برے رجحان کو قابو میں رکھتا ہے تاکہ اس سے لغزش نہ ہو جائے۔ وہ ہر وقت اپنی راہ پر نظر رکھتا ہے کہ اس راہ میں کس کس جگہ ٹھوکر لگنے کا

خطرہ ہے ۔ کہاں کہاں وسوسے اور پرکشش مقامات ہیں اس لئے کہ ایک مومن اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھتا ہے' کہ کسی بھی غفلت کے وقت 'کسی معمولی سی لغزش کے ذریعے 'کسی بھی اقدام کی وجہ سے وہ بھٹک نہ جائے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 'رسول خدا ہونے کے باوجود یہ دعا اکثر اوقات پڑھا کرتے تھے

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلٰى دِيْنِكَ "اے دلوں کے پھیرنے والے' میرے دل کو اپنے دین پر جما دے ۔" اگر رسول اللہ کا حال یہ تھا تو پھر ہم لوگوں کا کیا حال ہو گا جو نہ رسول ہیں اور نہ معصوم ہیں ۔

یہ وہ منظر ہے جس سے دل اٹھتے ہیں اور جب ایک مومن اپنے آپ کو قرآنی آیات کا مخاطب پاتا ہے تو اس کا پورا جسم لرز اٹھتا ہے ۔ کیونکہ اگر اس کے پہلو میں اس کا دل بھی اس کا نہیں ہے 'اللہ کے قبضے میں ہے تو پھر اسکی کیا حیثیت ہے ؟ آیت پر ذرا دوبارہ غور فرمائیں :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸ : ۲۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول ؐ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے ۔"

اس آیت کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ ان کو یہ کہتے ہیں کہ اللہ اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ وہ تمہیں لبیک کہنے پر مجبور کر دیں ۔ تم قہراً اس دعوت کو ماننے پر مجبور کئے جاسکتے ہو' اگر وہ چاہے 'لیکن اللہ تمہیں یہ اعزاز دینا چاہتا ہے کہ تم مطیع فرمان ہو کر اور اپنے ارادے اور اختیار سے اس دعوت کو قبول کر لو ۔ تاکہ اس پر تمہیں اجر و ثواب ملے اور تمہاری انسانیت کا مقام ایک مجبور کی سطح سے بلند ہو جائے ۔ تم انسانیت کے ارفع مقام تک پہنچ جاؤ اور اپنے اختیار سے راہ ہدایت پا لینے والی مخلوق میں داخل ہو جاؤ ۔ ایک فہیم اور مدبر مخلوق بن جاؤ' اور اپنے مقصد و ارادے اور علم معرفت سے اس راہ پر چل نکلو ۔

کیونکہ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۸ : ۲۴) "اور اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے ۔" تمہارے دل اس کے ہاتھ میں ہیں ۔ تم نے اٹھ کر حشر کے میدان میں کھڑا ہونا ہے ۔ اس کے سوا تمہارے لئے اور کوئی راہ نہیں ہے ۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں ۔ لیکن اس صورت حالات کے باوجود اللہ تم کو دعوت دیتا ہے کہ تم آزادانہ طور پر اس راہ پر چلو' مقہور اور مجبور بندے کی صورت میں نہیں ۔

اس کے بعد اہل ایمان کو اس بات سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ کہیں جہاد فی سبیل اللہ کے عمل کو چھوڑ نہ دیں اور اس دعوت کو چھوڑ نہ دیں جو آب حیات ہے ۔ کیونکہ جہاد کا مطلب دنیا سے منکر کو مٹانا ہے' جو سب کے لئے مضرت ہے ۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۲۵) "اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو ۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے ۔"

فتنہ کیا ہے؟ ابتلا اور معیبت فتنہ ہے ۔ اور وہ سوسائٹی جو اپنے بعض نادانوں کو کسی بھی صورت میں ظلم کرنے دیتی ہے ' اور ظالموں کی راہ نہیں روکتی ان کا مقابلہ نہیں کرتی ' یہ سوسائٹی اس بات کی مستحق ہے کہ وہ پوری کی پوری فساد کی لپیٹ میں آ جائے ۔ یاد رہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے سے اور کوئی بڑا فساد نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے اسلام ایک نظام ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے لئے کفیل ہیں ۔ یہ ایک مثبت نظام ہے اور یہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے ماننے والے افراد باہم ظلم کریں اور اس سوسائٹی میں فساد پھیلے چہ جائیکہ اس سوسائٹی میں اللہ کا مکمل دین ہی معطل ہو 'بلکہ اللہ کا اقتدار اعلیٰ ' اس کی حاکمیت اور الوہیت کا انکار ہو ۔ اس کی جگہ انسانوں کی بندگی قائم ہو اور یہ سوسائٹی خاموش رہے اور پھر یہ توقع بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو فتنے اور معیبت سے بچائے گا ۔ اس لئے کہ ذاتی طور پر وہ صالح ہیں ۔

ظلم کا مقابلہ کرتے ہوئے چونکہ جانی اور مالی قربانی دینا پڑتی ہے اس لئے قرآن کریم اپنی مخاطب پہلی جماعت مسلمہ کو یہ یاد دلاتا ہے کہ تم یاد کرو کہ تم ضعیف تھے اور تعداد اور سازوسامان کے اعتبار سے قلیل تھے ۔ تم مصائب سے دوچار تھے اور ہروقت تم پر خوف و ہراس کی فضا چھائی رہتی تھی ' لیکن دعوت اسلامی کی پناہ میں تم آئے تو تم معزز مالدار اور رزق طیب کے مالک بن گئے ۔ لہٰذا تم اس دعوت کی طرف سے غافل نہ ہو جاؤ جس میں تمہارے لئے آب حیات ہے ' جو اللہ کا عطیہ ہے اور اللہ ہی اس کا حامی ہے ۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸: ۲۶)

"یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے ' زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا ' تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں ۔ پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی ' اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا ' شاید کہ تم شکر گزار بنو ۔"

اپنی یہ پوزیشن یاد کرو تاکہ تمہیں یہ یقین آ جائے کہ دعوت اسلامی درحقیقت آب حیات ہے ۔ یہ یاد رکھتے جاؤ تاکہ دعوت اسلامی کی راہ میں جدوجہد کرنے اور مشکلات کو انگیز کرنے سے تم رک نہ جاؤ ۔ ذرا اپنے ایام ضعف اور خوف کو یاد کرو ۔ اب تو اللہ نے حکم دے دیا ہے کہ تم مشرکین کے ساتھ لڑو اور رسول ؐ نے تمہیں مشورہ دیا کہ قریش کے مسلح لشکر سے لڑو اور تم اس دعوت کو پسند نہیں کرتے لیکن کے کے وہ دن بھی یاد کرو کہ تمہیں ہر طرف سے خطرات لاحق ہوتے تھے اور اب تم انقلابی ' فاتح ' اجر اخروی کے مستحق اور رزق حسن کے پانے والے ہو ۔ کیا اچھے اچھے سامان خوراک تمہیں دے دیئے گئے ہیں ۔ تم اس پر اللہ کا شکر یہ ادا نہیں کرتے ۔

حالت خوف اور ضعف کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے ۔ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ (۸: ۲۶) "تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں مٹا نہ دیں ۔" یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں کوئی شخص کسی بھی وقت نازل ہونے والی معیبت کا انتظار کر رہا ہو ۔ وہ حالت خوف میں کسی بھی وقوعہ کا انتظار کر رہا ہو ' گویا وہ اپنی آنکھوں سے آنے والی معیبت کو دیکھ رہا ہو ۔ خوفناک ماحول میں اس کی آنکھیں بے قرار ہیں ۔ نظر آتا ہے کہ خوفناک ہاتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور

مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد ہے جو خوفناک حالت میں دبکی بیٹھی ہے۔

اس خوفناک منظر سے تمہیں نکال کر امن، فتح و نصرت اور عیش و عشرت اور ساز و سامان کی زندگی میں لایا گیا، اللہ کے سائے میں اور اللہ کی حمایت میں فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (۸: ۲۶) "پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا شاید کہ تم شکر گزار بنو"

اور اللہ کی یہ راہنمائی ان کے شامل حال رہی تاکہ وہ شکر بجالائیں اور اجر آئیں لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸: ۲۶) "شاید کہ تم شکر گزار بنو۔" کون ہے جو اس عظیم انقلاب پر غور و تامل کرے اور پھر اس مضبوط، پر امن اور مکمل آواز پر لبیک نہ کہے یعنی حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر، اور کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے ان انعامات و اکرامات اس کی جانب سے نصرت و امداد اور اس کے ان مناظر پر غور کرے جو قرآن کریم میں پیش کئے گئے اور ان پر لبیک نہ کہے۔ اس لئے ان مناظر میں نہایت ہی قوی اثرات ہیں اور سامع کے لئے واضح اشارات و ہدایات ہیں۔

پھر جماعت مسلمہ کا یہ پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا، جو بذات خود ان حالات سے عملاً گزرا تھا اور سختی و ترشی اور فراوانی اور امن کے یہ دونوں مناظر ان کے پردۂ خیال پر تازہ تھے۔ وہ اپنے ماضی اور حال سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اور اس طرح قرآن کریم کی یہ پکار ان پر زیادہ اثرات چھوڑتی تھی۔

آج کی ہر اسلامی تحریک جس کے پیش نظر یہ نصب العین ہو کہ اس نے مسلمانوں کی زندگیوں میں اس دین کو عملاً زندہ کرنا ہے اور اس کرۂ ارض پر اس کے مطابق اجتماعی نظام قائم کرنا ہے۔ اگرچہ وہ ان دو مراحل سے عملاً نہ گزر رہی ہو اور اس نے عملاً یہ دو حالات نہ بھی دیکھے ہوں لیکن قرآن کریم اس سے بھی یہی خطاب کر رہا ہے اور آج ہم اللہ کے اس قول کے مصداق ہیں:

اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ

(۸: ۲۶) "یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں۔" لہٰذا آج کی تحریک اسلامی کے لئے بہتر ہے کہ وہ اس دعوت حیات جدید پر لبیک کہے جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں اور نہایت ہی یقین اور اعتماد کے ساتھ اس وقت کا انتظار کریں جس میں اللہ کا سچا وعدہ سامنے آئے گا۔ جو اس نے پہلی تحریک اسلامی کے ساتھ کیا تھا اور وہ پورا ہوا تھا۔ یہی وعدہ ہے اس کا ہر اس تحریک کے لئے جو اللہ کے نام برپا ہو اور جو اس راہ کی مشکلات کو برداشت کرے اور اس انجام کا انتظار کرے۔

فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۸: ۲۶) "پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کئے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا شاید کہ تم شکر گزار بنو۔"

ظاہری حالات نظر فریب ہوتے ہیں لیکن تحریک اسلامی کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ اللہ کے وعدے پر

بھروسہ کرتی ہے اور اللہ کا وعدہ پورا ہونے والا ہوتا ہے۔ اور اس تحریک اسلامی کے حق میں ہوتا ہے جس کا نصب العین اسلامی انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے۔

---ooo---

اب پھر اہل ایمان کو دوبارہ پکارا جاتا ہے۔ انسان کے مالی معاملات اور اس کی اولاد کے مفادات بعض اوقات انسان کو خوف اور بخل کی وجہ سے جدوجہد کرنے سے روک دیتے ہیں۔ جس زندگی کی طرف رسول اللہ دعوت دے رہے ہیں وہ ایک باعزت زندگی ہے اور اس زندگی کے حصول کی راہ میں مشکلات لازماً پیش آتی ہیں ار اس کے لئے قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں لہٰذا قرآن کریم ان کمزوریوں کی اصلاح اس طرح کرتا ہے کہ وہ تحریک اسلامی کو فتنہ مال اور فتنہ اولاد کے بارے میں خبردار کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس طرح فتنہ ہیں کہ ان سے انسان کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔ اس امتحان اور آزمائش سے گزرنا مشکل کام ہے۔ ان کی وجہ سے دعوت جہاد سے انسان رک جاتا ہے اور امانت' عہد اور بیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ لہٰذا تم خبردار رہو کہ جہاد سے پیچھے رہ جانا رسول اللہ سے غداری ہے اور اس امانت سے غداری اور اس میں خیانت ہے جو مسلمانوں کے سپرد کی گئی ہے یعنی مقصد اعلائے کلمتہ اللہ اور قیام حاکمیت الہیہ اور لوگوں کو سچائی اور انسان کی دعوت اور ان کو یہ بھی یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں جو اجر عظیم ہے' اس تحریک جہاد پر وہ مال اور اولاد سے زیادہ قیمتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو' اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔"

اس کرۂ ارض پر امت مسلمہ کے ذمہ جو فرائض عائد کئے گئے ہیں' ان کو ترک کرنا اور ان سے دست بردار ہو جانا خدا اور رسول کے ساتھ خیانت ہے۔ اسلام کی اساس کلمہ طیبہ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) ہے۔ یعنی اللہ وحدہ لا شریک حاکم ہے۔ اور یہ حاکمیت اس شکل میں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی۔ انسانوں نے اپنی پوری تاریخ میں کسی وقت بھی ذات باری سے بالکل انکار نہیں کیا بلکہ انسان یہ غلطی کرتے رہے ہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک کرتے رہے ہیں۔ کبھی تو یہ شراکت محدود پیمانے پر اعتقادات اور عبادات میں ہوتی ہے اور کبھی نہایت ہی وسیع پیمانے پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور حق حاکمیت میں بھی ہوتی ہے۔ اور یہ دوسری صورت عظیم شرک کی صورت ہے لہٰذا اسلام کے سامنے کبھی یہ مسئلہ اہم نہیں رہا ہے کہ لوگ خدا کو تسلیم کریں اور ان کو یہ دعوت دی جائے کہ خدا موجود

ہے' بلکہ مسئلہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ خدا وحدہ لاشریک ہے اور اسے اس حیثیت کے ساتھ تسلیم کیا جائے اور لا الہ الا اللہ کا مفہوم یہی ہے کہ اس کرۂ ارض پر حق حاکیت بھی صرف اسے حاصل ہے اور جس طرح تمام لوگ اقرار کرتے ہیں کہ اس کائنات کا حاکم اللہ ہے' اسی طرح وہ یہ اقرار بھی کریں کہ زمین پر بھی وہ الہ ہے ۔ اور آسمان پر بھی هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ "اللہ وہ ہے جو آسمانوں پر بھی الہ ہے' اور زمین پر بھی الہ ہے ۔" یہ ہے اصل قضیہ ۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کا پیغام لانے والے ہیں لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بھی ضروری ہے ۔

یہ ہے دین اسلام کا اصل مسئلہ یعنی نظریات جن کا دل و دماغ میں جاگزیں ہونا ضروری ہے اور وہ عملی جدوجہد جس کے ذریعے اس کرۂ ارض پر عملی نظام قائم کیا جائے ۔ لہٰذا ان مقاصد سے دستکش ہونا خیانت ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو یہاں متنبہ کرتے ہیں کہ تم ہرگز ان مقاصد سے دستکش نہ ہونا ۔ یہ خیانت تصور ہوگی ۔ لہٰذا جو گروہ اپنے اس نظریہ کا اعلان کر دے اس کا فرض ہے کہ وہ اس کے لئے جدوجہد کرے ۔ اس راہ میں جو جہاد اور اس کی مشکلات پیش آئیں انہیں برداشت کرے ۔ چاہے مال دینا پڑے' چاہے اولاد کو قربان کرنا پڑے ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اس امانت میں خیانت کرنے سے بھی مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے جس کے وہ اس وقت سے حامل ہیں جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا ہے' کیونکہ اسلام صرف چند کلمات سے عبارت نہیں ہے جن کو جس زبان سے ادا کر دیا جائے' اور نہ چند عبادات اور دعاؤں کا نام ہے بلکہ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے جو پوری انسانی زندگی پر حاوی ہے ۔ اس کے قیام کی راہ میں بڑی بڑی مشکلات پیش آتی ہیں ۔ اسلام درحقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی پوری عملی زندگی کو کلمہ طیبہ کے اصولوں پر استوار کر دے ۔ اور لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف لوٹا دیا جائے ۔ انسانی معاشرے کو اللہ کی حاکیت اور اس کے قانون اور اخلاقی نظام کی طرف لوٹا دیا جائے ۔ ان لوگوں کو رد کر دیا جائے جو اللہ کے حق حاکیت پر دست درازی کرتے ہیں ۔ اپنی الوہیت قائم کرتے ہیں اور اس نظام میں لوگوں کے درمیان مکمل عدل اور انصاف نافذ کیا جائے اور کرۂ ارض پر انسان فریضہ خلافت الہیہ ادا کرتے ہوئے یہ سب کچھ کرے ۔

یہ ہیں وہ فرائض جو ہر مسلمان پر عائد ہوتے ہیں اور جو ان کو ادا نہیں کرتا وہ گویا خائن ہے ۔ وہ اس عہد کی خلاف ورزی کر رہا ہے جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا ہے ۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو توڑ رہا ہے اور اس میں خیانت کر رہا ہے ۔

اور یہ فرائض کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتے ہیں' ان کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ انسان مال اور اولاد کے فتنوں اور آزمائشوں میں کامیاب نکلے اور اس کا نصب العین رضائے الہی اور اجر اخروی ہو' جو عظیم اجر ہے اور جو ان لوگوں کے لئے محفوظ ہے جو امین ہیں' صابرین ہیں' قربانیاں دینے والے ہیں اور آخرت کو ترجیح دینے والے ہیں ۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۸:۲۸)

"اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے ۔"

قرآن کریم انسانی حقیقت سے مخاطب ہے ۔کیونکہ خالق کائنات انسان کو اچھی طرح جانتا ہے ۔اسے اس کی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا علم ہے ۔وہ اس راہ کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہے ۔

وہ اس مخلوق کے کمزور پہلوؤں سے بھی واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ مال کے لالچ اور اولاد کے مفادات اس کی ذات میں رچے بسے ہیں ۔اس لئے اللہ تعالیٰ انسان کو خبردار کرتا ہے کہ مال و اولاد کی حقیقت کیا ہے ۔اللہ نے انسان کو یہ دو محبوب عطیات اس کی آزمائش کے لئے دیئے ہیں ۔یہ دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور آزمائش ہیں ۔اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بندہ مال اور اولاد میں کس طرح تصرف کرتا ہے ۔ آیا شکر ادا کر کے حق نعمت پورا کرتا ہے یا غفلت اور نافرمانی کرتا ہے ۔ وَ نَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً "اور ہم تم کو خیر و شر کے ذریعے آزما کر فتنے میں ڈالتے ہیں ۔" فتنہ فقط مشکلات اور محرومیت کی شکل ہی میں نہیں آتا بلکہ یہ خوشحالی اور اللہ کے عطیات کی شکل میں بھی آتا ہے اور مال و اولاد کی شکل میں بھی آزمائشیں آتی ہیں ۔

یہ نہایت ہی اہم تنبیہ ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸:۲۸) "اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے ۔" جب انسان کو دل سے یہ معلوم ہو جائے کہ کس بات سے اس کا امتحان لیا جا رہا ہے تو یہ بات اس کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے تاکہ وہ بیدار رہے اور محتاط رویہ اختیار کرے ۔یہ نہ ہو کہ امتحان میں اس سے بھول چوک ہو جائے اور وہ امتحان میں پیچھے رہ جائے ۔

لیکن اس امتحان میں بھی اللہ بندے کو بے سہارا نہیں چھوڑتا ۔اللہ کو معلوم ہے کہ انسان امتحان میں فیل بھی ہو سکتا ہے ۔باوجود احتیاطات کے ۔اس لئے کہ اس راہ کی مشکلات بہت زیادہ ہیں ' خصوصاً جب معاملہ مال اور اولاد کا درپیش ہو لہٰذا اللہ انسان کو یہ روشنی دکھاتا ہے ۔مال و اولاد کے مقابلے میں اللہ کا اخروی اجر عظیم ہی تو ہے ۔

وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۸:۲۸) "اور اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے ۔" یہ مال اور دولت دینے والا تو اللہ ہی ہے اور اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ اولاد اور دنیاوی مال سے زیادہ قیمتی ہے ۔لہٰذا کوئی شخص بھی اس امانت کبریٰ کے حق ادا کرنے سے پیچھے نہ رہے اور یہ اللہ کی طرف سے ایک قسم کا تعاون ہے ۔اس ضعیف انسان کے ساتھ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا "اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے ۔"

غرض اسلامی نظام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے ' اس میں اعتقادات و تصورات بھی ہیں ' اس میں ہدایت و تربیت کے سامان بھی ہیں ' اس میں فرائض و واجبات بھی ہیں ۔یہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے اور اللہ علیم و خبیر ہے ۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ "کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا جبکہ وہ لطیف و خبیر بھی ہے ۔"

---○○○---

اب اہل ایمان کے نام یہ آخری پکار ہے اور اس سبق کے آخر میں ہے ۔یہ پکار اس خاطر ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں ۔اس لئے کہ اس عظیم ذمہ داری کا حق صرف وہ لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کے اندر نور تقویٰ ہو اور اس کے ذریعے وہ شیطانی شبہات اور وسوسوں کا مقابلہ کر سکیں اور اس راہ پر ان کے قدم مضبوط ہوں اور ان کو یہ فکری یکسوئی تب ہی نصیب ہو سکتی ہے جب وہ تقویٰ کے ذریعے حاصل کردہ ربانی نورانیت اور روشنی کو کام میں لائیں ۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تَتَّقُوا۟ ٱللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لئے کسوٹی بہم پہنچا دے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور کرے گا اور تمہارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

یہ ہے زاد راہ اور حقیقی سامان سفر۔ زاد تقویٰ جو دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کو بیدار کرتا ہے اور ان کے اندر ولولہ پیدا کرتا ہے۔ نیز اس کی وجہ سے دلوں کے اندر احتیاط اور بیداری پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان کو ایسا نور بصیرت ملتا ہے جس کی وجہ سے اس راہ کے نشیب و فراز سب روشن ہو جاتے ہیں۔ انسانی سوچ پر ان شبہات و وساوس کا اثر نہیں ہے جن کی وجہ سے راہ تاریک ہو جاتی ہے نیز تقویٰ کی وجہ سے انسان کو اس کی کوتاہیوں پر معافی بھی مل جاتی ہے۔ اور انسان کی زندگی میں سنجیدگی اور ثبات پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان پر امید ہوتا ہے اور مشکلات اور تقصیرات کی وجہ سے وہ مایوس نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کی وجہ سے انسان کے دل میں وہ دو ٹوک بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی راہ کی مشکلات میں صحیح فیصلے کر سکتا ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے کہ تمام روحانی تجربات کی طرح اس کو بھی عملاً اپنانے کے بعد ہی اس کی پوری ماہیت انسان پر منکشف ہوتی ہے۔ صرف کلام و بیان سے اس کی ماہیت کو پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ان لوگوں پر جن کا کوئی ذوق ہی نہ ہو۔

بعض امور حسن اور عمل کے درمیان پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اور انسان کی فکر و نظر ہمیشہ جادۂ حق کی نشاندہی میں پیچیدگی کا شکار رہی ہے۔ زندگی کی اہم راہوں پر انسان حق و باطل کے اندر مشکل سے تمیز کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے دلائل بھی انسان کو اطمینان قلبی عطا کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ آخر کار خاموشی چھا جاتی ہے اور قلب و نظر مطمئن نہیں ہوتے۔ دلائل و براہین کا یہ جدل و جدال بے فائدہ ہوتا ہے لیکن آخر کار تقویٰ ہی سامنے آتا ہے۔ تقویٰ کے ذریعہ ہی عقل کو روشنی ملتی ہے۔ تقویٰ ہی حق کی شکل و صورت وضع کرتا ہے اور راستہ منکشف ہوتا ہے' دل مطمئن ہوتا ہے' ضمیر کے اندر استراحت آ جاتی ہے اور قدم جم جاتے اور انسان راستے پر چل نکلتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بذات خود سچائی فطرت سے اوجھل نہیں ہوتی' فطرت کی بنا اور تعمیر سچائی پر ہے اور اس سچائی ہی کے ساتھ زمین و آسمان کو پیدا کیا گیا ہے لیکن انسانی خواہشات سچائی اور فطرت کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں۔ ذاتی خواہشات فضا میں آلودگی پیدا کر دیتی ہیں اور انسان کی حقیقی نظر کام نہیں کرتی اور انسان کو جادۂ حق نظر نہیں آتا۔ محض دلیل و برہان سے ذاتی خواہشات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تقویٰ اور خدا خوفی ہی ہے جس کے ذریعے خواہشات کو دبایا جا سکتا ہے۔ اور خوف خدا اور تقویٰ بروقت اپنا کام کرتے ہیں۔ خفیہ حالت میں بھی اور اعلانیہ حالات میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کو مبداء فرقان بتایا گیا ہے جس سے بصیرت منور ہوتی ہے اور ہر قسم کا التباس اور شک دور ہو جاتا ہے۔

یہ وہ قوت اور صلاحیت ہے جو بازار سے خریدی نہیں جا سکتی۔ یہ اللہ کا فضل عظیم ہی ہوتا ہے جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے اور اس فضل عظیم ہی کے نتیجے میں خطائیں معاف ہوتی ہیں۔ اور یہ وہ عمومی بخشش ہے جو رب العالمین اپنے خصوصی کرم سے جس پر چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

درس نمبر ۸۴ ایک نظر میں

اس سورہ میں سلسلہ کلام آگے بڑھتا ہے ۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ واقعات ماضی کی روشنی میں جاری ہے ۔ امت مسلمہ کے سامنے اس عظیم فتح کی تصویر کشی کر کے بتایا جاتا ہے کہ ذرا سوچو کہ تمہارا حال تمہارے ماضی کے مقابلے میں کس قدر بدل چکا ہے ۔ کس قدر عظیم انقلاب چشم زدن میں برپا کر دیا گیا ہے لیکن یہ کیونکر ہوا......؟ محض فضل ربی اور تدبیر الہی کے ذریعے ۔ اس عظیم انقلاب کو دیکھو! اس کے مقابلے میں اموال و غنائم کس قدر حقیر ہیں ۔ نیز تم نے جو قربانیاں دیں اور جو مشقتیں اٹھائیں وہ تمہیں تو بہت بڑی نظر آتی ہوں گی مگر اب نتائج کے مقابلے میں کس قدر حقیر ہیں ۔

درس سابق میں یہ بیان کر دیا گیا تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کے حالات کس قدر خراب رہتے تھے ' اس جنگ سے قبل مدینہ میں بھی تمہاری پوزیشن کچھ اچھی نہ تھی ۔ تم قلیل و ضعیف تھے تم ہر وقت خطرات میں گھرے ہوئے تھے ۔ خطرہ تھا کہ تمہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے ۔ مدینہ میں آکر تم مامون ہوئے اور اس جنگ اور نصرت کے بعد محض تدبیر الہی سے تم عزیز اور مقتدر ہو گئے ۔

اس سبق میں مشرکین کے موقف کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ لوگ تمہارے خلاف چالیں چل رہے تھے ۔ ہجرت سے قدرے پہلے اور یہ دعوے کرتے تھے کہ یہ شخص جو آیات الہی پڑھتا ہے اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام گھڑ سکتے ہیں اور وہ بغض و عناد میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ عذاب الہی کا خود مقابلہ کرنے لگے کہ اگر دعوت اسلامی حق ہے تو ہم پر عذاب آ جائے ۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دیکھو یہ لوگ دعوت اسلامی کی راہ روکنے کے لئے اپنی قیمتی دولت بھی فضول خرچ کر رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں ۔ لیکن یہ دنیا میں ناکام ہوں گے ۔ اور آخرت میں جہنم کا ایندھن ہوں گے نیز دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے سے دوچار ہوں گے ۔

آخر میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ کافروں سے بات کر کے ان کو یہ اختیار دیں کہ وہ دو امور میں سے ایک کو قبول کر لیں ۔ یا تو وہ کفر ' عناد ' اور اللہ اور رسول کے خلاف صف آرائی سے باز آ جائیں ' اگر وہ ایسا کریں تو اللہ ان کی سابقہ کوتاہیاں جو دور جاہلیت میں کی گئیں ان کو معاف کر دے گا ۔ یا وہ لوٹ کر اس حالت میں چلے جائیں جس میں وہ تھے اور اس برے انجام سے دوچار ہوں جو ہر اس شخص کو نصیب ہوا جس نے اس راہ کو اختیار کیا ۔ تب ان پر اللہ کی وہی سنت جاری ہوگی جس کا اللہ ارادہ کریں اور جس میں اس کی رضا ہو ۔

آخر میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتے ہیں کہ وہ ان کفار کے ساتھ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں یہاں تک کہ کفار کے ہاتھ میں ایسی قوت نہ رہے جس میں مسلمانوں کے لئے خطرہ ہو ۔ اس جہاں پر اللہ کی الوہیت قائم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے ۔ اگر وہ سر تسلیم خم کر دیں تو حضور ان سے یہ قبول کر لیں گے ۔ رہی ان کی نیت تو اس پر معاملہ اللہ کے ہاں ہو گا ۔ کیونکہ اللہ خبیر و بصیر ہے ۔ اگر وہ روگردانی کریں ' اسلام کے خلاف یہ جنگ جاری

رکھیں اور اسلام کے خلاف ان کے بغض و عناد کا یہی عالم رہے اور اللہ وحدہ کی حاکمیت کا اعتراف نہ کریں اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ کے سامنے نہ جھکیں تو مسلمان ان کے خلاف جہاد جاری رکھیں گے ۔ اس میں وہ صرف اللہ پر بھروسہ کریں گے جو ان کا سرپرست ہے ۔ وہ اچھا سرپرست اور بہترین مددگار ہے ۔

---()()()---

درس نمبر ۸۴ تشریح آیات

۳۰ --- تا --- ۴۰

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰

"وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر لیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔"

اب حالات مکہ معظمہ کی اسکرین پر لائے جاتے ہیں' جبکہ حالات کے اندر وہ انقلاب برپا نہ ہوا تھا جو اب ہو چکا ہے۔ اہل مکہ اپنے موقف پر سختی سے جمے ہوئے تھے مقصد یہ ہے کہ حالات بہت اچھے رخ پر جا رہے ہیں اور مستقبل تابناک ہے' لیکن اس میں تمہارا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے یہ تو اللہ کی تدبیر اور تقدیر کی کارستانیاں ہیں۔ دنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ ابتداء میں جن لوگوں کو مخاطب کیا جا رہا تھا وہ تو حالات کے ان دونوں ادوار کو اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ وہ ان ادوار سے ہو کر گزرے تھے۔ ان کے لئے تو سابقہ دور ماضی قریب تھا اور اس دور میں وہ جس خوف اور قلق میں مبتلا تھے وہ انہیں اچھی طرح یاد تھا۔ حال میں جو اطمینان تھا وہ ان کے سامنے تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا مکاریاں کی گئی تھیں اور کی جا رہی ہیں اور کس طرح وہ ان میں سے کامیاب ہو کر گزرے ہیں۔ انہوں نے مشکلات سے نجات ہی نہیں پائی بلکہ ان میں کامیاب بھی رہے ہیں۔

ان کی تدبیر یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کر کے بیڑیاں پہنا دیں یہاں تک کہ وہ رحلت کر جائیں یا انہیں قتل کر دیں یا آپ کو مکہ سے خارج کر دیں۔ انہوں نے ان تمام تجاویز پر غور کیا تھا اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ آپ ؐ کو قتل ہی کر دیں۔ اس کام کو تمام قبائل کے نوجوان سرانجام دیں تاکہ آپ ؐ کا خون تمام قبائل پر منقسم ہو جائے۔ بنو ہاشم آپ کا بدلہ نہ لے سکیں آخرکار دیت پر راضی ہو جائیں۔

امام احمد نے روایت کی ہے۔ عبدالرزاق سے' معمر سے' عثمان جریری سے' ---- مولیٰ عباس سے' کہتے ہیں کہ ابن عباس نے فرمایا کہ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ (۸ : ۳۰) کی تفسیر یہ ہے کہ ایک رات قریش نے مکہ میں باہم مشورہ کیا تو بعض نے کہا کہ جب وہ صبح نکلیں تو انہیں باندھ دیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں۔ بعض نے کہا اسے قتل کر دیا

جائے' بعض نے کہا کہ انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دے دی گئی۔حضرت علیؓ رات کو آپ ؐ کے بستر پر سوئے اور حضور ؐنکل کر غار میں چھپ گئے لیکن مشرکین رات کو حضور ؐ کی چوکی کرتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو وہ حملہ آور ہوئے۔جب انہوں نے دیکھا کہ بستر پر حضرت علیؓ سوئے ہوئے ہیں اور اللہ نے ان کی اس تدبیر کو ان پر الٹ دیا ہے' تو انہوں نے حضرت علی سے پوچھا کہ تمہارے صاحب کہاں ہیں تو حضرت علیؓ نے فرمایا: "مجھے معلوم نہیں ہے۔" چنانچہ انہوں نے آپ کی پتہ براری شروع کی اور نقش قدم پر چل پڑے۔جب وہ پہاڑ کے پاس پہنچے تو ان سے آپ ؐ کے قدموں کے آثار خلط ملط ہو گئے۔وہ پہاڑ پر چڑھ گئے' غار کے اوپر گئے۔انہوں نے دیکھا کہ دروازے پر عنکبوت نے تانا بانا بن دیا ہے۔انہوں نے کہا کہ اگر آپ یہاں داخل ہوئے ہوتے تو یہاں عنکبوت کا جالا نہ ہوتا۔چنانچہ حضور ؐ نے وہاں تین راتیں گزار دیں۔

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۸: ۳۰) "وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا' اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔" قرآن نے ان حالات کو جن الفاظ میں بیان کیا' وہ نہایت ہی موثر ہیں جس سے قریش کی مجلس کا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے ان کی تدابیر' تجاویز اور چالیں سامنے آتی ہیں لیکن اللہ ان پر محیط ہے۔ان کے معاملے میں اللہ کی چالیں سامنے آتی ہیں اور ان کی وجہ سے مشرکین کی تمام چالیں خاک میں مل جاتی ہیں لیکن انہیں آخر دم تک اس کا شعور ہی نہیں ہوتا۔

یہ نہایت ہی مسحور کن تصویر کشی ہے' اور نہایت خوفناک بھی' کیونکہ کمزور انسان قادر مطلق کے مقابلے میں کر ہی کیا سکتے ہیں۔ اللہ قہار و جبار ہے اور ہر چیز پر محیط ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو اپنے مخصوص انداز اور طرز پر بیان کرتا ہے کہ اسے پڑھ کر دل لرز اٹھتے ہیں اور انسانی شعور گہرائیوں تک متاثر ہو جاتا ہے۔

---()()()---

اب یہاں سے آگے سیاق کلام میں کفار کے افعال اور احوال بیان کئے جاتے ہیں۔ان کے دعوے اور ان کے اعتراضات کا بیان کیا جاتا ہے۔یہاں تک کہ ان کا یہ دعویٰ بھی یہاں ریکارڈ کر دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ اس قسم کا کلام پیش کر سکتے ہیں جبکہ یہ قرآن ان کے زعم میں محض پرانے قصوں پر مشتمل کتاب ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

"جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ "ہاں سن لیا ہم نے' ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں' یہ تو وہی پرانی کہانیاں ہیں جو پہلے سے لوگ کہتے چلے آرہے ہیں۔"

علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں سعید' سدی اور ابن جریج وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ بات کہنے والا النضر ابن الحارث تھا۔"یہ ملعون فارس کے علاقوں میں پھرتا رہا تھا۔اس نے ملوک فارس کی تاریخ اور رستم و اسفندیار کے قصے

یاد کر رکھے تھے ۔ جب وہ فارس سے واپس ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گئی تھی اور آپ ؐ لوگوں کے سامنے قرآن مجید پڑھتے تھے ۔ جب حضور ؐ کسی مجلس سے تبلیغ کر کے اٹھتے تو وہاں نضر ابن الحارث پہنچ جاتا اور لوگوں کو یہ قصے سناتا اور کہتا تمہیں خدا کی قسم سچ کہو ہم میں سے کون اچھا قصہ گو ہے ۔ میں یا محمد ؐ؟ جب بدر کی جنگ پیش آئی تو اللہ نے اسے گرفتار کیا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میرے سامنے اس کی گردن اڑا دی جائے اور ایسا ہی ہوا ۔ اسے مقداد ابن الاسود ؓ نے گرفتار کیا تھا ۔ اس بارے میں ابن جریر محمد ابن بشار سے محمد ابن جعفر سے ' شعبہ سے ' ابوبشر سے ' سعید ابن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن ' عقبہ ابن ابو معیط ' طعیمہ ابن عدی اور نضر ابن الحارث کی گردن اڑانے کا حکم دیا تھا ۔ مقداد نے نضر کو گرفتار کیا تھا ۔ جب حضور ؐ نے اس کے قتل کے احکام صادر کئے تو حضرت مقداد نے کہا "رسول اللہ ' یہ تو میرا قیدی ہے ۔" اس پر حضور ؐ نے اس کے قتل کا حکم دیا ۔ اس پر دوبارہ حضرت مقداد نے کہا حضور ؐ یہ میرا قیدی ہے ۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ مقداد کو اپنے فضل سے غنی بنا دے ۔" اس پر حضرت مقداد نے کہا "یہی تو میں چاہتا تھا" کہتے ہیں ان ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے :

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۸: ۳۱) "جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی تھیں تو کہتے تھے کہ "ہاں سن لیا ہم نے ' ہم چاہیں تو ایسی ہی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں ' یہ تو وہی پرانی کہانیاں ہیں جو پہلے سے لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں ۔"

قرآن کریم میں مشرکین کی اس بات کو بار بار لایا گیا ہے کہ قرآن کریم میں پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں :

قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُکْرَةً وَّ اَصِیْلًا "وہ کہتے ہیں یہ پرانی کہانیاں ہیں جو اس نے لکھ لی ہیں اور یہ صبح و شام اسے لکھوائی جاتی ہیں ۔"

یہ ان رکاوٹوں میں سے ایک ہے جو وہ قرآن کی انقلابی تعلیمات کے مقابلے میں کھڑی کرتے تھے ' حالانکہ قرآن کریم کا خطاب فطرت انسانی سے تھا اور یہ کلمات انسانی فطرت پر ایسا اثر کرتے تھے کہ وہ جھوم اٹھتی اور لبیک کہتی ۔ جب دلوں پر یہ کلمات پڑتے تو وہ لرز اٹھتے اور اس کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکتے ۔ چنانچہ اس کلام کے مقابلے میں قریش کے لیڈر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ۔ لیکن وہ خود بھی جانتے تھے کہ یہ چالیں کارگر نہ ہوں گی ۔ بہرحال انہوں نے کلام الٰہی میں ایک ایسی چیز تلاش کر لی جو ان کی پرانی کہانیوں کے مشابہ تھی ۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جاہل عربوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس انقلابی تحریک سے متاثر نہ ہو جائیں اور عوام جس طرح ان کبراء کی غلامی میں چلے آ رہے تھے ' بدستور چلتے رہیں ۔

قریش کے لیڈر یہ بھی جانتے تھے کہ دعوت اسلامی کی حقیقت کیا ہے ' وہ عرب تھے اور قرآن کے مضامین سے اچھی طرح واقف تھے ۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا مفہوم و مراد کیا ہے ؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ شہادت دینے والا تمام انسانوں کے اقتدار اور حاکمیت کا انکار کر رہا ہے ۔ یہ اپنے آپ کو تمام انسانوں کی حاکمیت سے نکال رہا ہے اور یہ اعلان کر رہا ہے کہ آج سے وہ صرف اللہ کی بندگی اور حاکمیت میں داخل ہو گیا ہے ۔ پھر وہ یہ بھی

اعلان کر رہا ہے کہ آج سے وہ صرف اللہ کی بندگی اور حاکمیت میں داخل ہو گیا ہے ۔ پھر وہ یہ بھی اعلان کر رہا ہے کہ آج سے وہ صرف اللہ کی بندگی اور حاکمیت میں داخل ہو گیا ہے ۔ پھر وہ یہ بھی اعلان کر رہا ہے کہ آج کے بعد وہ ہر قسم کی ہدایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرے گا۔ اب وہ ان لوگوں سے کوئی ہدایت نہ لے گا جو بتوں کے نام پر بات کرتے ہیں ۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جو لوگ یہ شہادت دے دیں وہ کلمہ پڑھتے ہی قریش کی غلامی' ان کے اثر اور ان کے اقتدار سے نکل جاتے ہیں وہ اس اجتماعی نظام کے کل پرزے بن جاتے ہیں جس کی قیادت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے ۔ یہ حضور ؐ کی قیادت و سیادت کے تابع اور مطیع ہو جاتے ہیں ۔ خواہ وہ جس قبیلے کے افراد ہوں ان کا تعلق ولدیت اور معاشرت اس قبیلے سے ختم ہو جاتا ہے اور وہ جدید قیادت کے وفادار اور ذمہ دار بن جاتے ہیں جس کا نام 'قیادت محمدی ؐ ' ہے ۔

یہ تھا کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا مفہوم ۔ یہ مفہوم انہوں نے مکہ کی گلیوں میں چلتا پھرتا دیکھا تھا ۔ وہ رات دن اس مفہوم سے خطرہ محسوس کرتے تھے ۔ ان کا اجتماعی نظام' ان کا قبائلی وجود اور ان کی قیادت و سیادت انہیں ختم ہوتی نظر آتی تھی ۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا وہ کمزور' بے مقصد اور بے اثر مفہوم کبھی بھی نہ تھا جو آج ہم اس کلمے سے سمجھتے ہیں یہ زعم رکھتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں ۔ محض اس لئے کہ ہم زبان سے کلمہ شہادت کو ادا کر رہے ہیں اور بعض مراسم عبودیت بھی بجالاتے ہیں جبکہ زمین پر اقتدار اعلیٰ اور لوگوں کی زندگیوں میں اسلامی نظام کا اتہ پتہ ہی نہیں ہے ۔ اسلامی معاشرے پر جاہلی قیادتیں اور جاہلیت کے پیروکار سربراہ حکمران ہیں اور اپنی مرضی سے تمام امور سرانجام دیتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ میں نہ تو اسلام کی حکومت تھی اور نہ وہاں شریعت نافذ تھی ۔ لیکن جو لوگ کلمہ طیبہ کا اقرار کرتے تھے وہ اپنی پوری قیادت و اختیارات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیتے تھے اور ان کی وفاداریاں خود اپنے معاشرے سے کٹ کر جماعت مسلمہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھیں ۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ جاہلی قیادت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکتے تھے بلکہ یہ جاہلی اقتدار سے باغی ہو جاتے تھے ۔ اپنے قبیلے' اپنے خاندان اور جاہلی قیادت سے فوراً کٹ جاتے تھے وہ کلمہ شہادت پڑھتے ہیں ۔ لہٰذا ان لوگوں کی طرف سے کلمہ طیبہ محض خالی خولی بات ہی نہ تھی بلکہ وہ ایک مفہوم تھا اور وہ مفہوم جماعت مسلمہ کی زندگیوں میں نمودار ہوا کرتا تھا ۔

یہ تھی وہ اصل بات جس سے قریش خوفزدہ تھے ۔ وہ دیکھتے تھے کہ اسلام سیلاب کی طرح امنڈتا چلا آ رہا ہے ۔ اس سے قبل حنفاء کی بھی ایک جماعت تھی مشرکین کے عقائد اور اعمال سے علیحدہ رہتے تھے اور ان کی طرح عبادت بھی نہ کرتے تھے ۔ اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھتے تھے ' صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی بتوں کی عبادت نہ کرتا تھا ۔ یہاں تک تو جو شخص جو رویہ چاہے اختیار کرے کوئی جاہلی نظام اسے نہ چھیڑے گا کیونکہ اس قدر رویہ اہل جاہلیت کے نظام کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا ۔ یہ تو محض مخالفانہ عقائد تھے اور ایک علیحدہ طریقہ عبادت تھا لیکن صرف یہ اسلام نہیں ہے جیسا کہ بعض پاکباز اور بھلائی پسند لوگ سمجھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ اچھے مسلمان بن گئے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھولے بھالے لوگ ہیں اور انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے ۔ اسلام صرف درست کلمہ کی تلاوت کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک تحریک کا نام بھی ہے اور تحریک یہ کہ انسان فوراً جاہلی تصورات اور جاہلی معاشرے اور جاہلی قیادت کی گرفت سے باہر نکل آئے اور جاہلی قیادت کے قوانین و شریعت سے نکل

کر اپنی پوری وفاداری کو اسلامی قیادت کے ساتھ وابستہ کر دے جو کسی خطہ زمین پر اسلام کو عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے ـ یہی وہ بات تھی جس کی وجہ سے قریش کے کبراء کی نیند حرام تھی اور وہ کانٹوں پر لوٹ رہے تھے ـ اور تحریک اسلامی کے خلاف قسم قسم کے حربے لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے ـ ان حربوں میں سے ایک حربہ یہ بھی تھا کہ قرآن کریم کے بارے میں یہ شکوک پھیلائے جائیں کہ یہ پرانی کہانیاں ہی تو ہیں اور اگر وہ چاہیں تو ایسی کہانیاں تصنیف کر سکتے ہیں ـ لیکن اس سے قبل قرآن نے ان کو بار بار چیلنج دیا تھا اور وہ ایسا کوئی کلام پیش کرنے سے عاجز ہو گئے تھے ـ اساطیر کا واحد اسطورہ ہے ـ اس سے مراد وہ قصص ہیں جن کے اندر مذہبی خرافات بھی ہوں یعنی خداؤں کی کہانیاں ' پرانے لوگوں کے قصے اور مذہبی لیڈروں کی بہادریاں اور ایسے محیر العقول واقعات جو تخیلات پر مشتمل ہوں' تخیل ان قصوں کا بنیادی عنصر ہوتا ہے ـ

قریش قرآن کریم میں بیان کردہ اقوام سابقہ کے قصص کی نشاندہی کر کے' ان میں سے معجزات کو لیتے اور اللہ تعالیٰ نے سابقہ زمانوں میں جھٹلانے والوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ واقعات لیتے اور مکہ کے غافل اور جاہل لوگوں کو یہ باور کراتے کہ تم خود پڑھو' یہ پرانے قصے ہیں ـ یہ قصص محمد نے ان لوگوں سے اخذ کئے ہیں جو اس میدان کے ماہرین ـ اور ماہرین سے لے کر وہ یہاں آکر تمہارے سامنے پڑھتا ہے ـ اور یقین یہ رکھتا ہے کہ یہ اس پر وحی ہوتے ہیں ـ یوں نضر ابن الحارث خود رسول اللہ کی مجلس میں بیٹھ کر یہ باتیں کرتا یا حضور ؐ کی مجلس کے بالمقابل اپنی مجلس جماتا اور اس میں ایسی باتیں کرتا ـ اس میں اہل فارس کے پرانے تاریخی قصے بیان کرتا اور پھر لوگوں کو کہتا یہ دیکھو یہ بھی ویسے ہی قصص ہیں جیسے قرآن کریم بیان کرتا ہے ـ دیکھو ان قصوں کے بل بوتے پر وہ نبوت کا مدعی ہے اور میں یہ دعویٰ نہیں کرتا لیکن ہیں یہ صرف پرانے قصے ـ

یہ تھی اس ملعون کی تقریر اور ضروری ہے کہ مکہ کے حلقوں میں خصوصاً ابتدائی دور میں ضرور اس کے کچھ اثرات بھی ہوں گے ـ اس ابتدائی دور میں جس میں ابھی تک قرآن کریم کے قصص اور فارس والوں کی پرانی کہانیوں کے درمیان فرق و امتیاز لوگوں کے ذہنوں میں واضح نہ ہوا تھا ـ یہی وجہ ہے کہ حضور ؐ کے منادی نے معرکہ بدر سے قدرے پہلے یہ اعلان کروا دیا تھا کہ نضر ابن الحارث بچنے نہ پائے اور قتل کر دیا جائے اور جب وہ اسیر ہو کر آیا تو آپ نے اسے قتل کرا دیا اور اس سے فدیہ قبول نہ کیا جس طرح دوسرے قیدیوں سے قبول کیا تھا ـ

لیکن ابتدائی حملے کے بعد مکہ میں یہ سب تدابیر بیکار ہوگئیں ' یہ انداز مخالفت جلد ہی ختم ہو گیا اور لوگوں پر اس کی حقیقت کھل گئی ـ قرآن کریم کی چھا جانے والی قوت جو اسے اللہ کی جانب سے دی گئی ہے اور وہ قوت جو اس کے اندر پیش کردہ سچائی کے اندر پوشیدہ ہے وہ انسانی فطرت کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہے ـ چنانچہ اس کے مقابلے میں جلد ہی اس قسم کے ہتھکنڈے فیل ہوگئے اور اس کے مقابلے میں جلد ہی میدان صاف تھا ـ اب قریش حیرانی و پریشانی کی حالت میں اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور ہو گئے ـ پہلے تو وہ لوگوں کو دعوت موزانہ دیتے تھے ' اب کہنے لگے لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ "اس قرآن کو مت سنو اور جب وہ پڑھا جا رہا ہو تو شور مچاؤ ' شاید کہ اس طرح تم غلبہ پا لو ـ" لیکن ان میں نہایت ہی سرکردہ لوگ مثلاً ابوسفیان ' ابوجہل اور اخنس ابن شریق جیسے لوگ بھی اس حکم پر عمل نہ کر سکے اور وہ ایک دوسرے سے چھپ کر رات کو جاتے اور قرآن کی تلاوت سنتے ـ وہ رات کو تلاوت قرآن کے مقررہ وقت میں صبر نہ کر سکتے اور دوسروں سے چھپ کر پہنچ جاتے تھے ـ لیکن جب ان کا راز ایک دوسرے پر کھلا تو پھر انہوں

نے کہا نہایت ہی سخت عہد کیا کہ ہرگز نہ آئیں گے ورنہ وہ قرآن کا شکار ہو جائیں گے ۔

یہ بات یاد رہے کہ قرآن کے خلاف نضر ابن الحارث کی تحریک ختم نہیں ہوگئی اور نہ ہوگی اور نہ یہ کوئی آخری تحریک تھی ۔ یہ تحریک بھی مختلف شکلوں میں انسانی تاریخ میں ہمیشہ رہی ہے ۔ دین اسلام کے دشمنوں نے اہل اسلام کو ہمیشہ قرآن سے باز رکھنے کی سعی کی ہے ۔ جب وہ اور طریقوں سے قرآن کو ختم نہ کر سکے تو انہوں نے اسے گانا شروع کر دیا ۔ قراء کرام اسے خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اور یہ لوگ اس پر جھومتے ہیں اور انہوں نے اس کے احکام و آیات سے گنڈے اور تعویذ بنانے شروع کر دیئے ۔ کسی نے بازو پر باندھ لیا' کسی نے گلے میں لٹکا لیا اور کسی نے تکیے کے نیچے رکھ لیا ۔ اور سمجھے کہ ہم تو مسلمان ہیں اور ہم نے قرآن کا حق ادا کر دیا ہے اور اس طرح اس دین کا حق ادا ہو گیا ہے ۔

آج صورت حالات یہ ہے کہ قرآن لوگوں کی زندگی کے لئے مصدر رشد و ہدایت نہیں ہے ۔ دشمنان دین نے قرآن کے مقابلے میں بعض اور مصادر اور مراجع وضع کر دیئے ہیں جہاں سے لوگ ہدایات لیتے ہیں ۔ یہ ان نئے مراجع سے اپنے تصورات' اور مقاصد اخذ کرتے ہیں اور قوانین و ضوابط بھی یہ لوگ ان دوسرے مصادر سے لیتے ہیں ۔ اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے بھی ان مصادر سے لیتے ہیں ۔ لیکن زبان سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ دین اسلام محترم ہے ۔ قرآن محفوظ ہے اور وہ صبح و شام لوگوں پر پڑھا جاتا ہے ۔ گانے والے اسے گاتے ہیں ۔ قراء اس کی تلاوت کرتے ہیں اس ترنم اور اس ترتیل کے بعد آخر لوگ اور کیا چاہتے ہیں؟ رہے تصورات اور مطالب' حسن و قبح کے پیمانے اور اقدار حیات' اجتماعی نظم اور معاشرتی طور طریقے' قوانین و ضوابط اور اصول و دستور تو ان کے بارے میں تو مسلمانوں نے کچھ اور قرآن گھڑ رکھے ہیں اور یہ لوگ اصل قرآن کی طرف لوٹتے ہی نہیں ۔

کیا اس ہتھکنڈے اور نضر ابن الحارث کے ہتھکنڈوں میں کوئی فرق ہے؟ ہاں جدید ہتھکنڈے جدید اسلوب میں ہیں ۔ یہ اس کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور زیادہ پوشیدہ ہیں اور یہ جدید چالیں جدید پیچیدگی زندگی میں زیادہ کامیاب ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ویسی ہی سازشیں ہیں جیسی قریش کرتے تھے یا اسلام کی طویل تاریخ میں ہوتی رہی ہیں ۔

لیکن قرآن کے بھی کیا کہنے؟ یہ ایک عجیب کتاب ہے اس کی طویل تاریخ میں اس کے خلاف یہ کھیل اور پیچیدہ سازشیں ہوتی رہی ہیں لیکن آخر کار فتح قرآن ہی کی ہوتی ہے ۔ یاد رکھو' قرآن کریم کی عجیب خصوصیات ہیں' انسانی فطرت پر اس کی گرفت بہت ہی مضبوط ہے ۔ اس کے خلاف یہود و ہنود اور انسانوں اور شیطانوں کی کوئی چال کامیاب نہیں ہوتی ۔ آج اس کے خلاف جو عالمی سازشیں ہو رہی ہیں جن کا سررشتہ عالمی یہودیت اور عالمی صیہونیت کے ہاتھ میں ہے وہ جاری و ساری ہیں اور قرآن غالب و ناصر ہے ۔

یہ قرآن آج بھی اس پورے کرۂ ارض پر اپنے دشمنوں کو شکست دے رہا ہے ۔ یہ دشمن مجبور ہیں کہ اس کی تلاوت کو پوری دنیا میں نشر کریں ۔ یہود و نصاریٰ اور ہندو وغیرہ اسے اپنے میڈیا سے نشر کرتے ہیں اور یہودیوں اور عیسائیوں کے وہ ایجنٹ حکمران بھی اسے نشریات کا حصہ بناتے ہیں' وہ ایجنٹ جو مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں ۔

بے شک یہ لوگ قرآن کو اپنی نشریات کا حصہ تو بناتے ہیں لیکن انہوں نے قرآن مجید کو محض قراءت اور ترنم اور ترتیل کا ذریعہ بنا دیا ہے یا اس سے آگے اسے تعویذوں اور گنڈوں کے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔ قرآن کریم کو انہوں نے مسلم فکر سے نکال دیا ہے اور اسے مسلمانوں کی فکری اور عملی راہنمائی کے مقام سے ہٹا دیا ہے مسلمانوں کی

فکری اور عملی راہنمائی کے لئے ان دشمنوں نے جدید فلسفے اور نظریات گھڑ لئے ہیں لیکن یہ کتاب بدستور تمام سازشوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ یہ بدستور اپنا کام کر رہی ہے اور اس دنیا کے ہر حصے میں ایسے گروہ موجود ہیں جو اس کو اپنا صحیح مقام عطا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ جدوجہد کر رہے ہیں کہ یہ کتاب رشد و ہدایت کا مرجع ہو۔ یہ گروہ ہر جگہ مصروف کار ہیں اور اللہ کی جانب سے تائید و نصرت کے طلبگار اور امیدوار ہیں کہ اللہ ان کو اس کرۂ ارض کا اقتدار نصیب کرے اور قرآن کریم اپنے اصل مقام کو پا لے۔ ایک موقع پہلے اگر یہ کامیاب ہو چکا ہے تو ان شاء اللہ دوبارہ بھی ہو کر رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

---()()()---

ذرا آگے ملاحظہ کیجئے۔ جب قرآن کے مقابلے سے یہ دشمن عاجز آ جاتے ہیں اور ان کی سازش ناکام ہو جاتی ہے تو یہ اس کے مقابلے میں عجیب طرز عمل اختیار کرتے ہیں اور ان کا جذبہ عناد اور ان کا غرور انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ یہ رویہ اختیار کریں اور کسی صورت میں بھی مان کر نہ دیں۔ اب یہ لوگ تمناؤں کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں کہ اگر یہ حق ہے تو اے اللہ ہم پر پتھر برسا دے۔ یا اور کوئی دردناک عذاب ہم پر نازل کر دے۔ لیکن وہ حق کے اتباع اور حق کی حمایت کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳۲﴾

”اور وہ بات بھی یاد ہے جو انہوں نے کہی تھی ”خدایا اگر یہ واقعی حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دردناک عذاب ہم پر لے آ۔“

یہ عجیب و غریب دعاء ہے۔ اس سے اس کمتر بغض و عناد کا اندازہ ہو جاتا ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف پایا جاتا تھا کہ وہ ہلاکت اور بربادی کو دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کو ماننے اور اس کی حمایت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ حق ہو۔ فطرت سلیمہ کا رویہ تو یہ ہوتا ہے کہ جب اسے کسی معاملے میں خلجان ہو تو ایسا شخص دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے اس معاملے میں راہ راست دکھا۔ وہ کبھی بھی اس معاملے میں تلخی محسوس نہیں کرتا۔ لیکن جب کبر و غرور اور بغض و عناد فطرت سلیمہ کو بگاڑ دیں تو پھر عالم یہ ہوتا ہے کہ غرور و عناد انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ لوگ مرنا پسند کرتے ہیں لیکن سچائی کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کے سامنے حق و باطل واضح ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اس میں خود ان کو کوئی شک نہیں رہتا۔ اس کی واضح مثال مشرکین مکہ کا رویہ ہے۔ یہ آخر دم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرتے رہے لیکن ان کے اس بغض و عناد کے باوجود یہ دعوت فتح یاب ہوئی۔

اس عناد اور اس دعاء کے جواب میں قرآن کیا کہتا ہے؟ ٹھیک ہے کہ یہ لوگ پتھروں کی بارش کے مستحق ہیں اور اس کا مطالبہ وہ اس شرط کے ساتھ کرتے ہیں کہ اگر یہ قرآن سچا ہو اور ظاہر ہے کہ قرآن سچا ہے اور شرط پوری ہے۔ لیکن ان کی جانب سے بربادی کی دعوت دینے کے باوجود اللہ ان پر یہ عمومی عذاب اس لئے نازل نہیں کرتا کہ حبیب خدا ان

میں موجود ہیں اور مسلسل ان کو دعوت حق دے رہے ہیں اور اللہ نے کسی قوم کو بھی اس وقت تک مکمل بربادی سے دوچار نہیں کیا جب تک رسول ان میں موجود ہوتا ہے۔ دعوت دے رہا ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اللہ اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک وہ اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے رہتے ہیں۔ اور ان پر یہ عذاب صرف اس لئے نہیں نازل ہو رہا ہے کہ یہ لوگ بیت اللہ کے مکین ہیں اگرچہ وہ اس گھر کی تولیت کے مستحق نہیں ہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہوں اور وہ ان کو عذاب دے دے۔ لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں، حالانکہ کہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے؟ بس سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے ہیں۔ پس اب لو، اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔"

یہ اللہ کی عظیم رحمت ہے کہ انہیں مہلت دے دی اور ان کے اس گہرے عناد کی وجہ سے ان پر عذاب نہیں آ رہا ہے۔ مسجد حرام سے یہ لوگ لوگوں کو روکتے ہیں اور پھر بھی ان کے لئے مہلت کی رسی دراز ہو رہی ہے۔ اس دور میں یہ مسلمانوں کو حج کرنے سے بھی روکتے تھے۔ جبکہ مسلمان کسی کو نہ روکتے تھے اور نہ کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔

یہ رحمت خداوندی ان کو اس لئے مہلت دیئے جا رہی تھی کہ شاید ان میں سے جن لوگوں کے دلوں میں مادۂ ایمان موجود ہے وہ ایمان لے آئیں اگرچہ وہ قدرے بعد میں آئیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ابھی تک موجود ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں سے ابھی تک توقعات وابستہ تھیں۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود بابرکت کی وجہ سے ان کو مہلت مل رہی تھی۔ ابھی تک عظیم عذاب سے بچنے کا دروازہ کھلا تھا، اگر وہ مان لیں، دعوت اسلامی کو قبول کر لیں اور اپنے رویے سے باز آ جائیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

"اس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تو ان کے درمیان موجود تھا اور نہ اللہ کا یہ (۸:۳۳)

قاعدہ ہے کہ لوگ استغفار کر رہے ہیں اور وہ ان کو عذاب دے دے۔"

لیکن اللہ اگر ان کے ساتھ ان کے حالات کے مطابق معاملہ کرنا چاہے تو وہ بے شک عذاب الہی کے مستحق ہیں۔

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۸: ۳۴) "لیکن اب کیوں نہ وہ ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجد حرام کا راستہ روک رہے ہیں، حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں، مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔"

ان پر یہ عذاب اس لئے نہیں لیٹ ہو رہا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں یا وہ بیت اللہ کے متولی ہیں۔ یہ تو ان کا محض دعویٰ ہی دعویٰ تھا، اس کی کوئی اساس نہ تھی۔ یہ لوگ دراصل اس گھر کے خادم اور متولی تھے ہی نہیں۔ یہ تو اس گھر کے دشمن تھے۔ انہوں نے زبردستی اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ کوئی ترکہ تو تھا نہیں جو آباؤ اجداد سے وراثت میں لیا جاتا۔ بیت اللہ کی تولیت کا حق تو اللہ کے متقی بندوں کا حق ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہ وہ حضرت ابراہیم کے وارث ہیں، یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ سچائی کا تعلق خون اور نسب سے نہیں ہوتا۔ سچائی میں وراثت تو دین اور عقیدے کی وراثت ہوتی ہے۔

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزی نیست

حضرت ابراہیم کے وارث تو اہل تقویٰ ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اس گھر کو تعمیر کیا تاکہ لوگ اس کی زیارت کریں اور تم اس سے روکتے ہو اور تم نے اس کی تولیت کو بھی مستحق لوگوں سے چھین لیا ہے۔

یہ لوگ، اگرچہ اس گھر میں اپنی نماز پڑھتے ہیں۔ اس گھر کی تولیت کے مستحق نہیں ہیں۔ پھر ان کی نماز ہی کیا ہے؟ سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔ ایسا شور و شغب اور ہائے ہو جس میں کوئی متانت اور سنجیدگی نہیں ہے نہ ان گھر کے احترام کا شعور ہے اور نہ اس میں اللہ کے تقدس اور کبریائی کا کچھ احساس ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہ لوگ اپنی گالوں کو زمین پر رکھتے تھے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ اور اس سے عالم اسلام، نام نہاد عالم اسلام کی وہ تصویر ذہن میں آجاتی ہے جس میں لوگ آستانوں پر گاتے بجاتے ہیں، شور و شغب کرتے ہیں اور اللہ ہو کے نعرے لگاتے ہیں اور قبروں کی چوکھٹوں پر چہرے رگڑتے ہیں۔ غرض یہ سب جاہلیت کے مظاہرے ہیں جو کبھی اس صورت میں ظاہر ہوتے تھے اور کبھی اس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام صورتوں کی اصل اور بنیادی صورت یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کی حاکمیت قائم ہو اور لوگوں پر انسان حکمران ہوں۔ یہ بڑی اور عظیم اور ہمہ گیر جاہلیت ہے جو تمام چھوٹی بڑی جاہلیتوں کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے اور یہ دوسری جاہلیتں اس کی شاخ اور فریم ہوتی ہیں۔

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۸: ۳۵) "پس اب لو اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔"

اور یہ عذاب کون سا عذاب ہے، وہی جو میدان بدر میں جماعت مسلمہ کے ہاتھوں ان پر پڑا۔ رہا وہ عذاب جو

انہوں نے خود طلب کیا تھا کہ ان کی جڑ کاٹ دی جائے تو اللہ نے ان پر وہ عذاب اس لئے نازل نہیں کیا کہ اللہ رحیم و کریم ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اس قسم کے عذاب کا نزول مناسب نہ تھا کیونکہ آپ ؐ نبی رحمت ہیں اور کفار میں سے کئی لوگوں کی جانب سے توبہ استغفار کی امید ابھی باقی ہے۔

---ooo---

اب ذرا ان کفار کے طرز عمل کو دیکھو یہ لوگ اپنے اموال اس مقصد کے لئے صرف کرتے ہیں کہ لوگوں کو راہ خدا سے روکیں۔ بدر میں ان کے مقاصد کیا تھے ' یہی کہ اس جنگ سے ان کے پیش نظر صرف یہ تھا کہ اس گروہ کو ختم کر کے دین داری کی تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جس طرح پہلے کیا گیا۔ بدر کے بعد بھی ان کی سوچ یہی رہی۔ اللہ تعالیٰ انہیں خبردار فرماتے ہیں کہ آخر کار تم نے ناکام ہونا ہے اور تمہیں اپنے رویے پر بے حد افسوس ہو گا اس لئے کہ تم نے دنیا میں شکست سے دوچار ہونا ہے اور آخرت میں تمہارے لئے دردناک عذاب ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ
فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ
۴ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ
ع ۹ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾

۱۸ "جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لئے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے ' مگر آخر کار یہی کوششیں ' ان کے لئے پچھتاوے کا سبب بنیں گی۔ پھر وہ مغلوب ہوں گے ' پھر یہ کافر جہنم کی طرف گھیر لئے جائیں گے تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کرے اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے۔ پھر اس پلندے کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ اصلی دیوالیے ہیں۔"

محمد ابن اسحاق نے زہری وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ جب قریش کو بدر میں شکست ہوئی اور ان کا شکست خوردہ لشکر مکہ پہنچا اور ابو سفیان قافلے کو لے کر وہاں پہنچا تو عبداللہ ابن ربیعہ 'عکرمہ ابن ابو جہل ' صفوان ابن امیہ چند دوسرے لوگوں کو لے کر ان لوگوں کے گھروں میں گئے جن کے آبا اور اولاد اور بھائی اس جنگ میں قتل ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے ابو سفیان ابن حرب اور ان تمام لوگوں سے بات چیت کی جن کے اموال اس قافلے میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ اے اہل قریش ' محمد ؐ نے تم سے خوب بدلہ لیا اور اس میں حد سے بڑھ گئے۔ اور تمہارے بہترین لوگوں کو قتل کیا۔ لہذا تم قافلہ تجارت کے اموال چندے میں دے دو تاکہ ہم بدر کا بدلہ لے سکیں۔ انہوں نے یہ تجویز قبول کر لی۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ انہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

انَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا ينفقُونَ اَموَالَهُمْ ---- (۸:۳۶) یہ جو بدر میں ہوا یا بدر کے بعد ہوا یہ دین کے دشمنوں کا معمولی حربہ ہے۔ یہ لوگ اپنے اموال اور اپنی قوتوں کو دین کی بیخ کنی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دین کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور یہ لوگ ہر جگہ اور ہر دور میں اسلام کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہ معرکہ ختم نہیں ہوا ہے ' دین کے دشمن کسی بھی وقت آرام سے نہیں بیٹھے اور انہوں نے کبھی بھی ایک لمحہ بھر کے لئے بھی ' حامیان دین کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اس لئے کہ اس دین کی واحد راہ ہی یہی ہے کہ وہ متحرک رہے اور جاہلیت پر ہجوم کرے۔ اہل دین کی صفت اور نصب العین ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ ہروقت متحرک رہیں اور اہل جاہلیت کی کمر توڑ کر رکھ دیں۔ اللہ کے جھنڈے کو اس قدر بلند اور غالب کر دیں کہ کسی دشمن دین کو اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خبردار فرماتے ہیں جو اپنے مال دین کی راہ روکنے میں صرف کرتے ہیں ان کا یہ فعل ان کے لئے حیرت کا باعث ہو گا۔ یہ تمام نفقات جلد ہی اکارت جائیں گے اور اہل حق اسی دنیا میں غالب و فتح یاب ہوں گے۔ اور آخرت میں تو یہ لوگ جہنم کی طرف رواں دواں ہوں گے اور یہ ان کے لئے عظیم حیرت ہو گی۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهُ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهُ فِيْ جَهَنَّمَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۸:۳۷) ''تاکہ اللہ گندگی کو پاکیزگی سے چھانٹ کر الگ کرے اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے پھر اس پلندے کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ اصلی دیوالیے ہیں۔''

یہ عمل کس طرح جاری ہو گا' یہ مال جو خرچ کیا جا رہا ہے یہ باطل کی قوتوں کو مجتمع کرتا ہے اور ان کو حق پر دست درازی کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اور حق اس کا مقابلہ کرتا ہے اور سعی و جہد کا میدان گرم ہوتا ہے۔ حق ایک تحریک کی شکل میں آگے بڑھتا ہے اور باطل کا سر پھوڑ دیتا ہے۔ اس کشمکش اور کڑوے عمل میں ہی حق و باطل کا امتیاز ہو جاتا ہے۔ اہل حق اور اہل باطل متمیز ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ اسلامی صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں ' ان کے درمیان سے بھی کمزور لوگ چھٹ جاتے ہیں اور وہی لوگ رہ جاتے ہیں جو ثابت قدم ' صابر اور بہادر اور اللہ کی نصرت کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسے ہی لوگ اس عظیم امانت کے اٹھانے کے قابل ہوتے ہیں۔ وہ کسی فتنے اور کسی بھی مشکل کی وجہ سے اپنے موقف سے نہیں ہٹتے۔ اسی عمل سے خباثت کے پلندوں کو جمع کر کے جہنم رسید کیا جا سکتا ہے اور یہی صورت اہل باطل کے خسران کا سبب بنتی ہے۔

قرآن کریم نے یہاں خباثت کو مجسم شکل میں پیش کیا ہے گویا اس کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور اسے جہنم میں لے جا کر ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا اس کے ختم کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

فَيَرْكُمَهُ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهُ فِيْ جَهَنَّمَ ''اور ہر قسم کی گندگی کو ملا کر اکٹھا کرے اور پھر اس پلندے کو جہنم میں جھونک دے۔'' کسی مفہوم کو اس طرح مجسم شکل میں پیش کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ احساس و شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک منفرد اسلوب کلام ہے۔

---○○○---

اب بات اس فیصلہ کن نکتے تک آ پہنچتی ہے اور اہل کفر کا انجام طے کر دیا جاتا ہے' اور گندگی کے ڈھیر کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ متعین کر دیا جاتا ہے - اب بات کا رخ حضور اکرم ؐ کی طرف پھرتا ہے کہ اہل کفر کو آخری تنبیہ کر دو' اور اہل ایمان کو بھی حکم دے دیا جاتا ہے کہ تمہارے لئے جو راہ اور طریقہ کار متعین کر دیا گیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھو - جہاد و قتال ہی اسلام کا واحد راستہ ہے - اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس کرۂ ارض سے ہر قسم کا فتنہ و فساد ختم نہیں ہو جاتا' اور دین خالص غالب نہیں ہو جاتا - اور تحریک اسلامی مطمئن اور مامون نہیں ہو جاتی - اسی صورت میں اللہ تحریک کا حامی و ناصر ہو گا اور لوگوں میں سے کوئی بھی بذریعہ جنگ یا بذریعہ سازش تحریک کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ
اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

"اے نبی" ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کر لیا جائے گا' لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے' وہ سب کو معلوم ہے -"

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ
فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے - پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے -"

کافروں کو متنبہ کر دو کہ تمہارا اکٹھ جس طرح یہاں ہے اسی طرح جہنم میں ہو گا' یہ اللہ کا فیصلہ ہے - تمہیں ناکامی ہو گی اور پھر حسرتیں ہی حسرتیں تمہاری قسمت میں ہیں - خصوصاً اس مال پر جو تم نے ناحق خرچ کیا - اور بڑی حسرت یہ ہو گی کہ دنیا میں جو گندگی اکٹھی ہو رہی ہے' یہ ختم ہو گی اور آخرت میں تم سب انہی خباثتوں کے ساتھ جہنم رسید ہو گے -

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۸ : ۳۸) "اے نبی' ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے' اس سے

درگزر کیا جائے گا 'لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گذشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے' وہ سب کو معلوم ہے۔"

لہٰذا تمہارے لئے اب بھی موقع ہے کہ تم اپنے آپ کو اس انجام بد سے بچالو' اور اسلام کے خلاف اٹھ نہ کرو اور اس میں اپنے اموال تجارت کو جھونکنے سے بچالو' توبہ کا دروازہ اب بھی تمہارے سامنے ہے اور کھلا ہے۔ اللہ کی راہ کی طرف واپس آ جاؤ۔ اللہ تمہاری تمام کوتاہیاں معاف کر دے گا۔ اور اگر اس تنبیہ کے بعد پھر یہ لوگ وہی رویہ اختیار کریں تو سنت الہیہ لازماً اپنی راہ لے گی۔ وہی ان کا انجام ہو گا جو اس راہ پر چلنے والوں کا زمانہ قدیم سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے دوستوں کو غلبہ اور اقتدار اعلیٰ نصیب ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اب اے اہل کفر تم ایک فیصلہ کن دوراہے پر کھڑے ہو۔ یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔

اب اہل کفر کے ساتھ ہم کلام ختم کر کے اہل ایمان ک اسلامی انقلاب کا طریقہ کار بتلایا جاتا ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۹) وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ

(۴۰) (۸:۳۹ - ۴۰)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے۔ اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے۔

یہ ہیں اسلامی جہاد کے حدود و قیود۔ یہ ہر جگہ اور ہر دور کے لئے ہیں۔ یہ احکام حضور ؐ کے زمانے کے ساتھ مخصوص نہ تھے۔ اس سورہ میں جہاد کے متعلق جو احکام آئے ہیں وہ اپنی آخری صورت میں نہیں آئے۔ اسلام کا قانون جنگ سورہ توبہ میں مکمل ہوا ہے جو ۹ھ ہجری میں نازل ہوئی۔ جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں کہا ہے کہ اسلام ایک مثبت تحریک ہے اور وہ پوری انسانیت کے مقابلے میں وہی وسائل اختیار کرتی ہے جو اس وقت کے حالات کے مطابق مناسب ہوں۔ پھر یہ تحریک ایک مرحلہ وار تحریک ہے اور ہر مرحلے کے لئے اس کے مخصوص احکام ہیں اور ہر مرحلے کے واضح اہداف و تقاضے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ بات فیصلہ کن ہے کہ یہ حکم وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸:۳۹) "ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔" یہ تحریک اسلامی کے لئے دائمی حکم ہے اور جاہلیت کے مقابلے کے لئے ایک مستقل پالیسی ہے۔

اس سورہ کے آغاز میں' اس کے تعارف کے دوران ہم نے کہا تھا کہ دنیا میں اسلام آیا ہی اس لئے ہے کہ انسان کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے نجات دلائے اور طرح کہ کوئی اپنے جیسے بندوں کی غلامی نہ کرے' اسی طرح کوئی شخص اپنی خواہشات نفسانیہ کی غلامی بھی نہ کرے اور یہ مقصد صرف اس صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ قائم کیا جائے اور صرف اللہ ہی اس کرۂ ارض پر تمام انسانوں کے حاکم اور

رب ہوں۔ یہ اعلان دراصل تمام انسانوں کی مروجہ حاکمیتوں اور اقتداروں کے خلاف اعلان بغاوت ہوتا ہے اور ان تمام صورتوں کے خلاف عملی جنگ ہوتی ہے جن میں کسی بھی شکل میں انسان کی حکومت انسان پر چل رہی ہو۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے اس پارے کے صفحات .....)

لہٰذا اس عظیم نصب العین کے حصول کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس دین پر اعتقاد رکھنے والے لوگ فتنہ و فساد سے مامون اور محفوظ ہوں۔ وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزادی کا اعلان کر سکتے ہوں اور صرف اللہ وحدہ کی غلامی کا اعلان کر سکتے ہوں۔ ان پر انسانوں میں سے کسی کا اقتدار اعلیٰ نہ ہو۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک ایسا گروہ موجود نہ ہو اور جس کی اپنی قیادت نہ ہو اور جو اس نظریہ کو کسی خطہ ارض پر عملاً نافذ نہ کر رہی ہو' اور اس خطے کے وہ عملاً ہر طاغوت کے مقابلے میں صف آرا نہ ہو رہی ہو۔ اور وہ ایسی قوتوں کا سدباب نہ کرے جو ایسی جماعت کو دین اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکتی ہو' یا ایسے لوگوں پر تشدد کرتی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی قوت نہ ہو اور اگر ہو تو اسے پاش پاش کر دیا جائے جو مقصد اولیٰ کی راہ میں سد راہ ہو۔ یعنی ایسی تمام قوتوں کو ختم کر دیا جائے جو اس کرۂ ارض پر حکومت الٰہیہ کے قیام کی راہ میں رکاوٹ ہوں۔ غرض اس کرۂ ارض پر اللہ کا اقتدار اعلیٰ پوری طرح قائم کر دیا جائے۔

یہاں یہ ضروری ہے کہ ایک اہم سوال کا جواب دے دیا جائے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم میں اللہ کا حکم ہے

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ "دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ راہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو چکا ہے۔"

اس کے باوجود کہ اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں ہم بحث کر آئے ہیں۔ خصوصاً استاذ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی محترم کی کتاب الجہاد فی الاسلام سے ہم نے جو طویل اقتباس دیا تھا' اس کے بعد اس موضوع پر کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کی قدرے مزید وضاحت کر دی جائے اس لئے اس نکتے پر اسلام کے مکار دشمن ہر طرف سے پروپیگنڈہ کر کے شبہات پھیلاتے ہیں۔

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ "دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے' اس سے مراد یہ ہے کہ دین کے مقابلے میں ایسی مادی رکاوٹیں نہ رہیں جو اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں۔ اور یہ مادی رکاوٹیں دراصل ان نظاموں کی شکل میں ہوتی ہیں جو طاغوتی نظام ہوتے ہیں اور ان کے حالات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان جبر کے شکنجوں میں کسے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا نظام نہ ہو جس میں ماسوی اللہ کا اقتدار اعلیٰ نافذ ہو اور نہ ایسا نظام ہو جس میں لوگ اللہ کے سوا کسی اور کے مطیع فرمان ہوں۔ جب اس قسم کی تمام رکاوٹیں انسان کی راہ سے دور کر دی جائیں تو پھر انسان آزاد ہوں گے۔ ان پر کوئی بھی عقیدہ اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی۔ یعنی ایسی صورت باقی نہ ہو گی کہ اسلام کے نظریہ حیات کے مخالف کسی نظریہ کی پشت پر مادی قوت ہو جو عوام کو متاثر کر رہی ہو اور جو لوگ اسلامی نظریہ حیات کو قبول کرنا بھی چاہیں تو ڈر سے ایسا نہ کر سکتے ہوں۔ جو لوگ اختیار کر چکے ہوں ان کے لئے

کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ اس طرح انسان تمام طاغوتی فتنوں سے عملاً آزاد ہو گا اس لئے کہ لوگ عقیدہ و نظریہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں گے اور ان پر رب العالمین کے اقتدار اعلیٰ کے سوا کوئی اور اقتدار نہ ہو گا۔

یاد رہے کہ انسانیت اس وقت تک شرف و عزت کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتی جب تک وہ ماسوا اللہ کے کسی اور اقتدار سے آزاد نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے کہ دین صرف اللہ کا ہو اور مسلمانوں کے لئے کوئی فتنہ نہ ہو۔

لئے جدوجہد کرتا ہے جس میں صرف اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم ہو۔

یہ ہے اس دین کا عملی اور مثبت طریقہ کار اور ان لوگوں کی رائے درست نہیں ہے جو کج فکر اور شکست خوردہ ہیں اور جن کو دھوکہ دے دیا گیا ہے۔ نہ ان مخلص اور پاکباز لوگوں کا موقف درست ہے جو اچھے مسلمان تو بننا چاہتے ہیں لیکن ان کی دینی فکر صاف نہیں ہے۔

الحمدللہ کہ اللہ نے ہمیں صحیح دینی فکر عطا کی ہے۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہمیں یہ فکر نصیب نہ ہو سکتی۔ (ہنگرام ۱۲ ستمبر ۱۹۹۱)

---()()()---

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۱۰

سورۃ الانفال آیات

۴۱ --- تا --- ۷۵

سورۃ التوبہ آیات

۱ --- تا --- ۹۲

پارۂ نمبر۱۰ ایک نظر میں

اس پارے میں سورت انفال کا باقی حصہ ہے' جس کا ابتدائی حصہ نویں پارے میں گزر گیا ہے۔ اس کے بقیہ حصے میں سورت توبہ کا بیشتر حصہ ہے۔ یہاں ہم سورت انفال کے زیر بحث حصے کا تعارف کرائیں گے اور سورت توبہ کا تعارف آغاز سورت توبہ میں حسب دستور آئے گا۔ ان شاء اللہ!

نویں پارے کے آخر میں ہم نے سورت انفال کے تعارف میں اس سورت کے مباحث کے اہم خطوط کو واضح کر دیا تھا۔ اس سورت کے حصہ زیر بحث کے خدوخال وہی ہیں جو اس کے پہلے حصے کے تھے۔ لیکن چونکہ موضوعات بحث مختلف ہیں' اس لئے ان میں تکرار بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ موضوعات کی ترتیب ایسی ہے کہ نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا حصہ اس کا پہلا دور تھا اور یہ حصہ دوسرا دور ہے۔ کیونکہ مباحث و موضوعات کے اندر بے حد ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

پہلے حصے کا آغاز یوں ہوا تھا کہ لوگ انفال کے بارے میں سوالات کرتے ہیں اور اس کے بارے میں مسلمانوں کے مابین تنازع کا ذکر ہوا اور اس کے نتیجے میں انفال کی ملکیت اور اختیار تقسیم رسول اللہ کی طرف لوٹا دیا گیا۔ اور لوگوں سے کہا گیا کہ ذرا خدا کا خوف کرو اور بتایا گیا کہ حقیقی ایمان کیا ہوتا ہے؟ اور انہیں دعوت دی گئی کہ اس حقیقی ایمان کی سطح تک بلند ہو جاؤ۔ اس کے بعد انہیں بتایا گیا کہ بدر کے تمام واقعات اللہ کی تقدیر و تدبیر کا مظاہرہ تھا' سب اسکیم اللہ کی تھی' امداد سب کی سب اللہ کی طرف سے تھی۔ تمام معرکہ اس لئے درپیش ہوا کہ اللہ کا ارادہ ظاہر ہو' جہاں تک لوگوں کا تعلق ہے' وہ محض کردار تھے۔ اور اللہ کی تقدیر کے آلات تھے۔ اس معرکے کی حقیقت کے انکشاف کے بعد ان کو پکارا گیا کہ جنگ کے وقت ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کرو اور انہیں اطمینان دلایا کہ اللہ تمہاری نصرت اور معاونت کرے گا۔ اور تمہارے دشمنوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دے گا۔ اس کے بعد انہیں اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ خیانت کرنے سے ڈرایا گیا۔ فتنہ مال اور فتنہ اولاد کے بارے میں خبردار کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ کفار کو اس انجام سے خبردار کر دیں جس سے وہ دوچار ہونے والے ہیں۔ اور اگر وہ توبہ کر کے بظاہر دعوت کو قبول کرتے ہیں تو ان کے اقرار کو مان لیا جائے اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ اور اگر وہ مان کر نہ دیں تو پھر ان سے اس وقت تک لڑا جائے جب تک دنیا فتنے سے پاک نہیں ہو جاتی اور نظام زندگی صرف اسلامی نہیں ہو جاتا۔

یہ تو تھا خلاصہ پہلے حصے کا' اب ذرا دیکھئے کہ اس دوسرے حصے میں بھی بات کا آغاز غنائم ہی سے ہوتا ہے اور پھر انہیں ایمان باللہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور اس کلام پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے جو اس دن نازل ہوا جس دن دو گروہوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ جن حالات میں یہ غنائم تمہارے ہاتھ لگے اس کے لئے اللہ کی تقدیر نے منصوبہ بندی کی تھی اور اس معرکے کے مواقف اور مشاہدات کے کچھ دوسرے پہلو پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس تقدیر و تدبیر کی فعالیت نمایاں نظر آتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان دراصل دست قدرت

کا پردہ تھے اور بطور آلات کام کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کو پکارا جاتا ہے کہ تم کو جب کفار کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے تو میدان جنگ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کرو کیونکہ واقعات کی حقیقت تو تم جان چکے ہو' اللہ کو ہر وقت یاد رکھو اور اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کرو' اور ہر قسم کے تنازعات سے بچو کیونکہ تنازعات کی صورت میں تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تم کمزور ہو جاؤ گے۔ پھر ان کو صبر کی تلقین کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جہاد میں کبرو غرور اور خود نمائی سے بچو۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح رویہ نہ اختیار کرو جو گھروں سے گھمنڈ میں نکلے' طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے' حالانکہ ان کے اس فعل کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اور یہ لوگ شیطان کی مکاری کے جال میں پھنس گئے تھے۔ پھر ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسہ کریں' جو قادر' حکیم اور مدبر ہے اور تمام کام اس کے حکم سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ وہ کافرین ہیں اور مکذبین کو کس طرح پکڑتا ہے اور یہ پکڑ ان کے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حصہ اول میں بتایا گیا تھا کہ فرشتے کس طرح میدان جنگ میں اترے تھے اور کس طرح کفار کی گردنیں اڑا رہے تھے اور ان کو آگے اور پیچھے سے مار رہے تھے' تو اس دوسرے حصے میں یہ کہا گیا کہ جب فرشتے کفار کی روح قبض کرتے ہیں' ان کو خوب مارتے ہیں اور حصہ اول میں کہا گیا کہ وہ برے حیوان ہیں اسی طرح اس حصے میں بتایا گیا کہ یہ لوگ عہد کی پابندی نہیں کرتے اور اس موقعہ پر ان کی صفت حیوانیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض احکام بابت قانون بین الاقوام دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض قوانین حتمی ہیں اور بعض عبوری ہیں۔ اور بعض کی تفصیلات بعد میں سورت توبہ میں آئیں گی۔

یہاں تک تو یہ دوسرا حصہ پہلے حصے کے مماثل ہے۔ یہاں تک کہ موضوعات اور واقعات کی بھی ایک ہی جیسی ترتیب ہے۔ ہاں بعض موضوعات پر ایک جگہ کلام مجمل ہے اور دوسری جگہ مفصل ہے۔ مثلاً اسلامی کیمپ اور غیر اسلامی کیمپوں کے بارے میں بعض احکامات اور معاملات کو مفصل لایا گیا ہے۔

سورت کے آخر میں بعض متفرق موضوعات اور احکامات بھی دیئے گئے جو انہی موضوعات کا تکملہ بحث ہیں جو ان دونوں حصوں میں آگئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان پر اپنا یہ احسان واضح کرتے ہیں کہ اس نے تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے۔ حالانکہ فطرتاً یہ لوگ سرکش تھے اور اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو ان کے درمیان یہ تالیف قلب پیدا کرنا کارے دارد۔

اللہ اہل ایمان کو یہ اطمینان بھی دلاتا ہے کہ وہ ان کے لئے کافی ہے۔ اور وہ ان کا حامی و مددگار ہے۔ اس لئے رسول اللہ کے واسطہ سے ان کو حکم دیا جاتا ہے کہ اہل ایمان کو قتال پر ابھارو۔ اور انہیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایمان کی وجہ سے اپنے سے کئی گنا کفار پر غالب ہوں گے۔ اس لئے کہ کفار نافہم قوم ہوتے ہیں اور نافہم اس لئے ہوتے ہیں کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور سمجھداری ایمان کے بغیر آ ہی نہیں سکتی بشرطیکہ تم لوگ صبر کرو اور اللہ بھی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس کے بعد قیدیوں کے فدیے کے مسائل و احکام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اے نبی ابھی تم نے کفار کو روند نہیں ڈالا اور نہ ہی ان کی قوت اور شوکت کو توڑا ہے' لیکن تم نے فدیہ قبول کر لیا ہے' یہ اچھا نہیں کیا ہے۔ کیونکہ تمہاری قوت اور سلطنت ابھی مضبوط نہیں ہوئی ہے۔ لہذا یہاں بتایا جاتا ہے کہ مختلف حالات میں مختلف منہاج اختیار کیا جاتا ہے' لہذا تحریک

اسلامی کی پالیسی کے اندر لچک رکھی گئی ہے تاکہ مختلف حالات میں مختلف پالیسیاں اختیار کی جاسکیں ۔ یہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ کس طرح انہیں ایمان کی طرف مائل کریں اور ان کے دلوں میں ایمان کو مزین کریں ۔ اگر یہ قیدی پھر خیانت کریں گے تو جس طرح اللہ نے پہلے انہیں شکست دی اسی طرح دوبارہ بھی شکست دے گا ۔ اور وہ رسول اللہ کے سامنے ذلیل ہوں گے ۔

آخر میں وہ اصول ذکر ہوتے ہیں جن کے اوپر جماعت مسلمہ کے افراد نے باہم تعلقات کو استوار رکھنا ہے ۔ نیز ان لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے ہیں جو دارالاسلام کو تو نہیں آئے لیکن اسلام قبول کر لیتے ہیں ۔ پھر کفار کے ساتھ تعلقات کے احکام ' ان تمام احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام کیا نوعیت رکھتا ہے ؟ اور اسلامی نظام کی پالیسی کیا ہے ؟ ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام ایک متحرک نظام ہے ۔ اور یہ اسلامی نظام کا بنیادی اصول ہے کہ وہ متحرک رہے گا ۔ اور اس کی اس حرکت سے ہی اس کے داخلی اور خارجی احکام وضع ہوتے رہیں گے ۔ اس لئے اسلامی نظام میں اسلامی نظریات کو تحریکیت اور عملی وجود سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ اسلامی معاشرے کا ہر دور اور ہر قسم کے حالات میں ایک عملی وجود ضروری ہے ۔

اس مختصر تمہید میں اس قدر تبصرہ کافی ہے ' لہٰذا اب ہم آیات کی تفصیلات کو لیتے ہیں ۔

---००---

درس نمبر ۸۵ ایک نظر میں

اس سبق کے آغاز اور سابق سبق کے خاتمے کے درمیان سلسلہ کلام مسلسل اور مربوط ہے۔ نویں پارے کے آخر میں قتال کا حکم دیا گیا تھا' اور اس سبق میں احکام قتال کا بیان جاری ہے۔ سابق پارے کے آخر میں خاتمہ کلام یہ تھا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ لَھُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ (۳۸) وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَھَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۳۹) وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰکُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ (۴۰) (۸:۳۸ تا ۴۰) "اے نبی ان کافروں سے کہو کہ اگر اب بھی باز آجائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے تو اس سے درگزر کر لیا جائے گا' لیکن اگر یہ اسی پچھلی روش کا اعادہ کریں گے تو گزشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کو معلوم ہے ...... اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان کافروں سے جنگ کرو' یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔ پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے' اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست اور بہترین حامی و مددگار ہے۔"

اس کے بعد اس سبق میں بات انہی اموال کے بارے میں چل رہی ہے کیونکہ اموال غنیمت بہرحال جنگ کے نتیجے میں ہاتھ آتے ہیں جس کے مقاصد اور اہداف آیت سابقہ کے آخر میں دیئے گئے تھے حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸ : ۳۹) "یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔"

اس حقیقت کے باوجود کہ اس نص صریح کے ذریعے جہاد کے مقاصد کو متعین کر دیا گیا کہ یہ جہاد و قتال اللہ کے لئے ہے۔ یہ دعوت اسلامی کے مقاصد کے لئے ہے' اور اسلامی نظام حیات قیام کے لئے ہے۔ اور اس کے باوجود کہ انفال کی ملکیت کے بارے میں سورت کے آغاز ہی میں ایک دو ٹوک فیصلہ کر دیا گیا کہ یہ اللہ اور رسول اللہ کی ملکیت ہیں۔ اور مجاہدین کو ان کے بارے میں دلچسپی لینے سے پاک کر دیا گیا تاکہ ان کے اندر خلوص نیت پیدا ہو اور ان کی تمام حرکات و سکنات اللہ کے لئے ہو جائیں' لیکن ان سب امور کے باوجود اسلامی نظام حیات کے ان اموال کے بارے میں منظم اور حقیقت پسندانہ احکام بھی عطا کرتا ہے' کیونکہ اموال غنیمت موجود ہیں اور مستحق مجاہدین بھی موجود ہیں اور یہ مجاہدین اپنے اموال اور اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں کھپا رہے ہیں۔ وہ رضاکارانہ طور پر جہاد میں شریک ہیں اور اپنے اخراجات خود برداشت کر رہے ہیں اور دوسرے رضاکار مجاہدین میں سے جو لوگ نادار ہیں ان کے اخراجات بھی وہ خود برداشت

کرتے ہیں ۔ پھر یہ لوگ اس معرکے میں اموال غنیمت پر قبضہ کرتے ہیں ۔ اور اپنے صبر و ثبات اور سعی و جہاد کی وجہ سے یہ اموال حاصل کر پاتے ہیں اور ان کے دلوں کو اللہ نے ان اموال غنیمت کے بارے میں ہر قسم کی حرص و آز سے پاک بھی کر دیا ہے کہ ان کی ملکیت اللہ رسول اللہ کی طرف منتقل کر دی ہے ۔ لہٰذا اب اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ان اموال میں سے ایسے لوگوں کو بھی حصہ دیا جائے جبکہ وہ سمجھتے ہوں کہ یہ اللہ اور رسول اللہ کی طرف سے خالص عطیہ ہے ۔ اور یہ محض اس لئے دیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی حقیقی ضروریات کو پورا کیا جا سکے ۔ ان کے جذبات انسانی کی تسکین بھی ہو اور اس میں کوئی انفرادی یا اجتماعی چھینا جھپٹی بھی نہ ہو ۔ کوئی تنازعہ نہ ہو کیونکہ سورت کے آغاز میں حکم دے دیا گیا ہے کہ اصل مالک اللہ و رسول اللہ ہیں ۔

یہ اسلامی نظام حیات ہے اور یہ انسانوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ اس لئے وہ اس متوازن اور جامع انداز میں اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے ۔ اس سے انسان کے جذبات کی تسکین بھی ہوتی ہے اور اس کی حقیقی حاجات بھی پوری ہوتی ہیں ۔ اور اس کے ساتھ معاشرے کے افراد کے دل بھی ایک دوسرے سے صاف رہیں ۔ اجتماعی عدل کے تقاضے بھی پورے ہوں اور اموال غنیمت باعث شر نہ ہوں 'بلکہ باعث رحمت ہوں ۔

---○○○---

درس نمبر ۸۵ تشریح آیات

۴۱ --- تا --- ۵۴

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا
عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ۝۴۱

"اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے ۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز' یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی' (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔"

اس آیت کے بارے میں جو روایات آئی ہیں ان میں طویل فقہی اختلافات مذکور ہیں ۔ پہلا اختلاف غنائم کے مفہوم و مدلول کے بارے میں ہے ۔ پھر انفال کے مدلول و مفہوم کے بارے میں ہے کہ آیا یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا دو مختلف چیزیں ہیں ۔ دوسرے یہ کہ پھر چار حصے مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بعد پانچویں حصے کے بارے میں بھی اختلافات ہیں کہ یہ حصہ کیسے تقسیم ہو گا ۔ تیسرے یہ کہ پانچویں کے پانچویں حصے کے بارے میں جو اللہ کے لئے ہے کہ آیا یہ مستقل خمس ہے یا وہی ہے جو رسول ؐ اللہ کے لئے ہے ۔ چوتھے یہ کہ آیا رسول اللہ کا حصہ خاص آپ کی ذات کے لئے ہے یا آپ کے بعد دوسرے ائمہ کو بھی یہ حق حاصل ہو گا ۔ پانچویں یہ کہ قرابت داروں کا جو حصہ ہے کیا وہ اب بھی رسول اللہ کے قرابت داروں کے لئے باقی ہے یعنی بنوہاشم اور بنی عبدالمطلب کے لئے جیسے کہ آپ کے دور میں تھا یا اب یہ ختم ہے ۔ اور اس کا تصرف بھی رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفاء کو حاصل ہے ۔ اور اسی قسم کے دوسرے فروعی اختلافات ہیں ۔

فی ظلال القرآن میں ہم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے ' اس کے مطابق ہم ان فروعی فقہی اختلافات میں نہیں جاتے 'کیونکہ مناسب یہی ہے کہ یہ فقہی اختلافات ان کتابوں میں پڑھے جائیں جو مخصوص طور پر ان موضوعات پر لکھی گئی ہیں ۔ یہ تو

تھی ایک عمومی بات ۔لیکن اموال غنیمت کے بارے میں خصوصاً اب جو صورت حالات موجود ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے کوئی واقعی اور عملی مسئلہ موجود نہیں ہے ۔جو حل طلب ہو' نہ کوئی عملی مسئلہ موجود ہے' نہ کوئی اسلامی مملکت موجود ہے' نہ کوئی ایسی جماعت موجود ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہی ہو اور ان کے ہاتھ کچھ مال غنیمت لگ گیا ہو۔ اور اسے ضرورت پیش آگئی ہو کہ ان کو کس طرح تقسیم کیا جائے ۔زمانہ اس طرح پھر گیا کہ اس دین کی حالت وہ ہو گئی جس طرح یہ پہلے دن دنیا میں اتارا گیا تھا۔اس وقت لوگ مکمل طور پر جاہلیت کی طرف لوٹ گئے تھے ۔وہ اللہ کے ساتھ کئی ارباب کو شریک کر رہے تھے ۔یہ ارباب لوگوں کو قانونی نظام دے رہے تھے ۔اس دین کی حالت بعینہ ابتدائی حالات جیسی ہو گئی ہے اور ہمارا فرض یہ ہے کہ لوگ اس میں نئے سرے سے داخل ہوں۔ وہ نئے سرے سے کلمہ شہادت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھیں ۔اللہ کو وحدہ لاشریک اور واحد حاکم مطلق سمجھیں ۔صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہدایات حاصل کریں اور ایک ایسی جماعت کی صورت میں زندگی بسر کریں جس کا نصب العین یہ ہو کہ یہ دین از سرنو قائم ہو جائے اور ایسے تمام لوگ اپنی اس جدید جماعت اور قیادت کے پوری طرح وفادار ہوں اور ایسی وفاداری اور اطاعت وہ کسی بھی جاہلی قیادت و شہادت کے ساتھ نہ رکھیں ۔

یہ ایک واقعی اور زندہ مسئلہ ہے جو اس دین کو درپیش ہے ۔ابتدائی طور پر اس کے سوا اس دین کو کوئی اور مسئلہ درپیش نہیں ہے ۔یہاں اموال غنیمت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ اس وقت کسی جگہ بھی جہاد کا عمل جاری نہیں ہے بلکہ کسی بھی جگہ اسلام کو کوئی انتظامی مسئلہ درپیش نہیں ہے نہ داخلی تعلقات میں اور نہ خارجی تعلقات میں اور اس کی وجہ بہت سادہ اور سمجھ میں آنے والی ہے ۔وہ یہ کہ اس دنیا میں کسی بھی ملک میں اسلامی معاشرہ موجود نہیں ہے جس کا مستقل وجود ہو اور جس کے اندر باہمی تعلقات کے لئے اور دوسرے معاشروں کے ساتھ اس کے روابط کے لئے کچھ احکام و ہدایات کی ضرورت ہو۔

اسلامی نظام حیات ایک عملی نظام ہے ۔اسلامی نظام ایسے مسائل و قضایا سے بحث ہی نہیں کرتا جو عملاً موجود نہ ہوں ۔اس لئے وہ ایسے مسائل سے بحث نہیں کرتا جو عملاً موجود نہ ہوں۔ یہ اس قدر حقیقت پسندانہ 'عملی نظام ہے جو اس قسم کی لاحاصل بحثوں سے اجتناب کرتا ہے ۔محض خیالی باتیں کرنا اس نظام کا طریقہ کار نہیں ہے ۔یہ ان نکمے لوگوں کا کام ہے جو فارغ ہوتے ہیں اور جن کے سامنے کرنے کا کوئی عملی کام نہیں ہوتا۔ اور اپنے خالی اوقات کو وہ محض نظری اور خالص تصورات باتوں میں صرف کرتے ہیں ۔ایسے موضوعات جن کا عملی وجود اس دنیا میں نہیں ہوتا ایسے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی مساعی کو اور اپنی قوتوں کو اسلامی نظام حیات کے قیام کے کام میں کھپائیں ۔اور ایک اسلامی معاشرہ عملاً وجود میں لائیں ۔اور یہ کام بھی وہ اسلامی نظام کے قیام کے طریقہ کار کے مطابق سرانجام دیں ۔یعنی سب سے پہلے وہ لوگوں کو کلمہ شہادت کی طرف بلائیں ۔لوگ دین اسلام میں از سرنو داخل ہونے کا اعلان کریں ۔جس طرح مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے اس کام کا آغاز ہوا تھا۔ایک تحریک برپا ہوئی تھی' اس کی اپنی ایک قیادت تھی' اور یہ جماعت اپنے اردگرد پھیلے ہوئے جاہلی معاشرے سے کٹ کر آئی تھی ۔پھر اس کے اور اس جاہلی معاشرے کے درمیان کشمکش برپا ہوئی اور اس کے بعد اللہ نے حق کو سربلندی نصیب فرما دی اور ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی ۔تب جاکر ایسے لوگوں کو غنائم اور انفال کے مسائل کی ضرورت ہوگی جب وہ عملاً ان کے سامنے پڑے ہوں گے تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات کا تصفیہ اسلامی

قانون کے مطابق ہو' اور جب اسلامی ریاست قائم ہوگی تو پھر اس کے اور دوسری ریاستوں کے درمیان تعلقات کے لئے احکام سامنے آئیں گے ۔ اب دور جدید میں اگر کچھ نئے مسائل پیدا ہو گئے تو وقت کے مجتہدین ان کے لئے حل تلاش کریں گے' خواہ یہ مسائل داخلی ہوں یا خارجی ۔ صرف اسی وقت اجتہادات کی کوئی قدر و قیمت ہو گی' کیونکہ یہ ایک حقیقت پسندانہ اور واقعی اجتہاد ہو گا ۔

ہم چونکہ اسلامی نظام حیات کے اس عملی پہلو کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں ۔ اس لئے ہم یہاں غنائم و انفال کے بارے میں ان فقہی اختلافات میں نہیں پڑتے جو ان کے بارے میں فقہی کتابوں میں موجود ہیں ۔ ایک وقت ضرور آئے گا کہ ان کے بارے میں تحقیقات ہوں گی ۔ اسلامی معاشرہ موجود ہو گا اور وہ عملاً جہاد پر عمل پیرا ہو گا اور اس میں غنائم و انفال کے احکام ہمارے سامنے آئیں گے ۔ ہمیں چاہئے کہ ہم تحریک اسلامی کے تاریخی عمل کو دیکھتے ہوئے ایمانی اصول کو اپنائیں اور اسلام کے منہاج تربیت کو پیش نظر رکھیں ۔ اس کتاب کا یہ ایک دائمی خاصہ ہے جو مرور زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا۔ دوسرے جو بھی طریق کار اور مسائل ہیں وہ اس کی تشریحات ہیں حکم عام جو اس آیت سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے :

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۸ : ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے ۔"

خلاصہ حکم یہ ہے کہ غنیمت کی ہر چیز سے چار حصے مجاہدین میں تقسیم ہوں گے اور پانچویں حصے میں رسول اللہ کو اختیار ہو گا کہ جس طرح چاہیں تصرف کریں اور آپ کے بعد ایسے سربراہان مملکت کو یہ اختیار ہو گا جو شریعت پر قائم ہوں اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوں اور وہ اس حصے کو ان مصارف پر خرچ کریں گے ۔ اللہ کی راہ میں' رسول ؐ اللہ پر' رشتہ داروں پر' یتیموں پر' مسکینوں پر ۔ اس طرح یہ مد موجودہ لوگوں کی حقیقی ضروریات کو پورا کرے گی ۔ یہاں بس اس قدر کہنا ہی کافی ہے ۔

اس کے بعد کوئی دائمی ہدایت یہ ہے یعنی آیت کا دوسرا حصہ ۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۸ : ۴۱) "اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز' یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی' (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔"

ایمان کی بعض علامات ہوتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہ شخص مومن ہے ۔ اللہ تعالیٰ اہل بدر کے ایمان کے اعتراف کے لئے بھی دلیل یہ دیتا ہے کہ انہوں نے غنائم و اموال کے بارے میں اللہ کی شریعت کو چونکہ تسلیم کر لیا ہے اس لئے وہ مومن ہیں حالانکہ اہل بدر اہل بدر تھے اور وہ مومن اس لئے بن گئے کہ انہوں نے یوم الفرقان میں اللہ کے بندے پر نازل ہونے والے احکام کو تسلیم کیا ۔ گویا قانون شریعت کو تسلیم کرنا اللہ کے نزدیک شرط ایمان ٹھہرا اور اطاعت شریعت کو ان کے

ایمان کا مقتضا قرار دیا تاکہ معلوم ہو کہ ان کا اعلان ایمان درست ہے -

غرض ایمان کا مفہوم قرآن کریم میں بہرحال دوٹوک ہے 'اس میں کوئی لچک نہیں ہے ' نہ اس میں تاویل اور پیوند کاری کی ضرورت ہے - نہ ان موشگافیوں کی ضرورت ہے جو بعض میں فقہی مباحث کی وجہ سے پیدا کر دی گئیں - اس وقت جبکہ فقہی مذاہب وجود میں آئے اور انہوں نے نصوص کے اندر طرح طرح کی تاویلات پیدا کیں اور لوگوں نے ان فقہی اور دینی موضوعات پر منطقی اور کلامی انداز میں مفروضوں کی شکل میں جدل و جدال شروع کر دیا - بعد کے ادوار میں انہی فقہی اور کلامی اختلافات کی وجہ سے ہر فرقے نے دوسرے پر الزامات لگائے اور دوسروں نے ان الزامات کے جوابات دیئے - پھر لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف کفر کی نسبت کرنا شروع کر دی اور دوسروں نے جواب دینا شروع کر دیا اور یہ تمام جدل و جدال دین کے واضح اصولوں پر قائم نہ تھا 'بلکہ یہ سب مباحث ذاتی اغراض ' ہوا و ہوس اور مخالفین کے عناد اور دشمنی پر مبنی تھا - اور اب کیا تھا کفر کے فتووں کے بازار گرم ہوئے اور فروعی مسائل پر بحثیں ہوئیں - پھر ان الزامات کا جواب تشدد سے دیا جانے لگا اور لوگ ان الزامات میں بہت ہی سختی کرنے لگے - یہ غلو ان خاص تاریخی اسباب و عوامل کی وجہ سے ہوتا رہا - دین اسلام تو وہ بالکل واضح ہے - اس میں کوئی لچک نہیں ہے ' نہ اس میں پیوندکاری ہے اور اس میں غلو ہے - حدیث میں آتا ہے - لیس الایمان .... "ایمان محض تمناؤں کا نام نہیں ہے 'بلکہ ایمان یہ ہے کہ وہ دل میں بیٹھ جائے اور عمل اس کی تصدیق کرے -" ایمان کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اللہ نے جو قانون بنایا ہے اس کو عملاً زندگی میں نافذ کیا جائے اور کفر یہ ہو گا کہ اللہ نے جو قانون بنایا ہے ' اسے ترک کر دیا جائے ' اللہ کے قوانین کے ماسوا دوسرے قوانین کے مطابق فیصلے کرنا اور شریعت کے سوا دوسری عدالتوں سے فیصلے کرانا کفر ہے - خواہ چھوٹے معاملات ہوں یا بڑے معاملات ہوں - یہ ہیں خدا و رسول کے سادہ ' دوٹوک اور واضح احکام - اس کے ماسوا جو بھی آراہوں گی وہ محض تاویلات اور مذہبی اختلافات کا نتیجہ ہیں -

یہ ہے ایک واضح مثال 'جس میں اللہ تعالیٰ واضح ' دوٹوک 'تاکیدی انداز میں فرماتے ہیں -

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۸ : ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے - اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی -" بعینہ یہی مثال ہے ان تمام ہدایات و اعلانات کی جو قرآن مجید میں ایمان اور اس کی حدود و قیود اور اس کے تقاضوں کے بارے میں بالکل واضح طور پر دی گئی ہیں اور جو بالکل دوٹوک اور فیصلہ کن ہیں -

اللہ تعالیٰ نے اموال غنیمت کی ملکیت ان لوگوں سے لے کر جنہوں نے ان کو جمع کیا تھا' اللہ اور رسول اللہ کے ہاتھ میں دے دی تھی - جیسا کہ سورت کے آغاز میں بصراحت بتلایا گیا تاکہ اس معاملے کا مکمل اختیار اللہ اور رسول اللہ کی طرف

منتقل ہو جائے اور مجاہدین کے دل اور عزائم ان آلودگیوں سے بالکل پاک ہو جائیں جن کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ اور اپنا معاملہ اول سے لے کر آخر تک اللہ اور رسول اللہ کے سپرد کر دیں۔ اللہ ان کا رب ہے اور رسول ان کا قائد ہے اور وہ صرف اللہ کے لئے اس معرکہ میں شریک ہوں' صرف اللہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں۔ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے وہ اپنی روح' اپنے جسم اور اپنے اموال میں اللہ و رسول اللہ کے احکام کو تسلیم کریں۔ اور اپنے تمام امور میں اللہ و رسول اللہ کے فیصلوں کو بے چون و چرا تسلیم کریں۔ یہ ہے حقیقت ایمان۔ اس سورت کے آغاز میں جب لوگوں سے ان کا حق ملکیت غنیمت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا جا رہا تھا تو ان سے یوں خطاب کیا گیا تھا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۸ : ۱) "تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں کہو یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول کے ہیں' پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو' اگر تم مومن ہو۔"

اور اس کے بعد جب انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا اور اللہ کے اس حکم پر راضی ہو گئے ان کے دلوں میں حقیقت ایمان جاگزیں ہو گئی تو اللہ نے پانچ حصوں میں سے چار پھر ان تک لوٹا دیئے اور پانچویں حصے کو علی حالہ چھوڑ دیا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں۔ اس حصے سے جماعت مسلمہ کے مستحقین رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کیا جائے گا۔ اب چار حصے جب ان کی طرف لوٹائے گئے تو اس وقت ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ اللہ کا مال ہے۔ یہ جہاد اور فتح و نصرت کی وجہ سے ان کی ملکیت نہیں بن گیا۔ کیونکہ جہاد و غزیٰ اللہ کے لئے ہے اور فتح و نصرت ان کی نہیں اللہ کے دین کی ہے۔ یہ جو اس کے مستحق ہو گئے ہیں تو یہ محض عطائے الٰہی ہے۔ جیسا کہ فتح و نصرت بھی عطائے الٰہی ہے۔ کیونکہ اس معرکے کی تمام اسکیم اللہ نے اپنے ہاتھوں سے تیار فرمائی اور مکرر ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی اللہ کے اس جدید حکم کو تسلیم کرنا بھی امر الٰہی کا تقاضا ہے اور عین ایمان ہے۔ یہ ایمان کی شرط ہے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ ذرا دوبارہ غور کیجئے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۸ : ۴۱) "اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول ؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی۔"

یہ آیات مسلسل ایک واضح' دو ٹوک اور فیصلہ کن اصول کو متعین کرتی ہیں جس کا تعلق اصول دین سے ہے۔ ان میں ایمان کے مفہوم و مدلول کو متعین کیا گیا ہے۔ ایمان کی حقیقت اس کی شرائط اور اس کے تقاضوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لفظ "عبدنا" کا استعمال کیا گیا ہے۔ "اپنے بندے" اور یہ لفظ اس صورت حال کے درمیان استعمال ہوا ہے جبکہ ابتداء تمام انفال وغنائم کا اختیار رسول اللہ کو دے دیا گیا اور پھر چار حصوں کو چھوڑ کر پانچویں حصے کا اختیار آپ کو دے دیا گیا (علی عبدنا) میں بھی یہی اشارہ ہے کہ عبدیت اور بندگی بھی حقیقت ایمان کا ایک حصہ ہے اور (عبدنا) کا مقام وہ بلند مقام ہے جس تک کبھی کوئی بندہ پہنچ سکتا ہے۔ اور یہ بات اس ماحول میں کی جا رہی ہے جس میں حضور اکرم ؐ کو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ دنیا کے انتظامی اختیارات بھی دیئے جا رہے ہیں ----- حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام فی الواقعہ ایک بلند مقام ہے جس تک کبھی کوئی پہنچ سکتا ہے کہ وہ دین دنیا کے اختیارات کا بھی مالک ہو اور مقام عبدیت پر بھی فائز ہو۔

صرف اللہ کی بندگی ہی انسان کو اپنی خواہشات کی بندگی کے مقام سے بلند کر سکتی ہے۔ اسی طرح یہی بندگی انسان کو دوسرے انسانوں کی بندگی سے بچا سکتی ہے۔ اور انسان انسانیت کی اعلیٰ شرف و برتری پر صرف اسی صورت میں فائز ہو سکتا ہے جب وہ اللہ کے سوا تمام لوگوں کی غلامی سے محفوظ ہو۔

جو لوگ اللہ وحدہ کے غلام بننے سے سرتابی کرتے ہیں' وہ اسی وقت ذلیل ترین غلامیوں کا جوا پہن لیتے ہیں۔ وہ اپنی خواہشات نفسانیہ اور سفلی میلانات کے غلام بن جاتے ہیں اور اس کا فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے صرف انسان کو جو وصف دیا تھا کہ وہ متحرک بالارادہ ہے ان کا یہ وصف اسی وقت ختم ہو جاتا ہے جب ان کو اپنے ارادے پر کنٹرول نہیں رہتا تو وہ مطلق حیوان بن جاتے ہیں بلکہ وہ ان حیوانات سے بھی ذلیل تر ہو جاتے ہیں اور وہ اسفل سافلین بن جاتے ہیں جبکہ اللہ نے انہیں احسن تقویم میں پیدا کیا تھا۔

نیز جو لوگ اللہ کی غلامی سے روگردانی کرتے ہیں وہ دوسری خطرناک غلامیوں میں جکڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی اختیار کرتے ہیں۔ یہ انسان آقا ان لوگوں کی زندگیوں کو اپنی خواہشات اور مقاصد کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ ان کی نظر کوتاہ جن نظریات کو پا سکتی ہے وہ ان لوگوں کی راہنمائی ان نظریات کی طرف کرتے ہیں اور ان نظریات کے پیچھے صرف یہ نظریات اور مقاصد ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان آقا اپنی برتری قائم کرتے ہیں اور لوگوں کی زندگی جاہلانہ نقائص سے پر اور خود سری پر مبنی ہوتی ہے۔

یہ انسان آقا ان کے لئے اصول موضوعہ تجویز کرتے ہیں اور کہتے ہیں اور انہیں باور کراتے ہیں کہ ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ ان کو چاہئے کہ وہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور ان اصولوں کی مخالفت نہ کریں۔ بعض اصول تاریخی جدلیات پر مبنی ہیں' بعض اقتصادی حقائق پر مبنی ہیں' بعض طبیعی ارتقاء پر مبنی ہیں۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری غلامیاں جو مادیت نے انسان پر مسلط کر دی ہیں اور انسان ان کی دلدل میں اس طرح پھنس گیا ہے کہ نہ وہ ان سے نکلنا چاہتا ہے اور اگر چاہے تو اسے کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اور وہ ان خود ساختہ اٹل اصولوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور خوفناک جبریت کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس کے بعد یہاں دوسرا لفظ بھی نہایت ہی اہم ہے۔ یہاں بدر کے لئے یوم الفرقان کہا گیا ہے۔ يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۸ : ۴۱) "فیصلے کے دن یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن" حقیقت یہ ہے کہ بدر کا دن فی الواقعہ ایک فیصلہ کن دن تھا۔ اس دن کے بارے میں پوری اسکیم اللہ نے تیار کی تھی اور اللہ کی نصرت و ہدایت کے

مطابق اس میں کام ہوا۔ یہ دن حق و باطل کے درمیان فیصلے کا دن تھا۔ یہی بات مفسرین نے اجمالاً کہی ہے۔ یہ دن فیصلے کا دن تھا۔ اس لئے کہ اس کے نتائج نہایت ہی گہرے' دور رس اور ہمہ گیر تھے۔

یہ دن عملاً حق و باطل کے درمیان فیصلے کا دن تھا۔ لیکن اس دن فیصلہ اس حقیقی سچائی اور باطل کے درمیان تھا۔ جس پر زمین و آسمان عملاً برپا ہیں۔ اس سچائی پر تمام اشیاء اور تمام زندہ مخلوقات کی فطرت استوار ہوئی ہے۔ وہ سچائی جو اللہ کی ذات کو وحدہ تسلیم کرتی ہے' اللہ ہی کو بادشاہ تسلیم کرتی ہے اور اسے اس عالم کا مدبر متصرف تسلیم کرتی ہے' وہ سچائی جو یہ سکھاتی ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی بندہ و غلام ہے۔ اس کائنات کے آسمان اس کی زمین' اس کی چیزوں اور اس کی زندہ مخلوق سب میں اللہ وحدہ متصرف ہے۔ اور یہ سب چیزیں اللہ کی الوہیت' اس کی بادشاہت اور اس کی تکوینی حکومت کے تحت ہیں اور کوئی اس سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ اور باطل کون سا باطل ہے؟ اس سے مراد وہ باطل ہے جو کھوٹا ہے اور جو اس وقت یوم بدر کے وقت دنیا پر چھایا ہوا تھا' اور اس نے اس عظیم سچائی کو دبایا ہوا تھا۔ اور اس باطل نے کرۂ ارض کے اوپر ایسی طاغوتی طاقتیں پیدا کر دی تھیں جو لوگوں کی زندگی کے معاملات میں جس طرح چاہتی تھیں' فیصلے کرتی تھیں۔ اس نظام باطل میں یہ لوگوں کی خواہشات ہی تھیں جو اشیاء و احیاء سب کی قسمتوں کے فیصلے کرتی تھیں۔

یہ تھا وہ عظیم فیصلہ جو اس دن ہوا۔ یعنی عظیم بدر کے دن یعنی اس دن اس عظیم سچائی اور اس ہمہ گیر باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ پیش آیا۔ ان کے درمیان یوم بدر میں ایسا فیصلہ اور فاصلہ ہوا کہ آئندہ کبھی ان کے درمیان کوئی التباس اور اشتراک نہ ہوا۔

یہ دن حق و باطل کے درمیان نہایت ہی وسیع اور گہرے معنوں میں ایک فیصلہ کن دن تھا۔ نہایت ہی دقیق اور لطیف معنوں میں۔ انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ تھا۔ انسانی تصورات اور شعور کے میدان میں وحدانیت اور شرک کے درمیان یہ فرقان تھا۔ انسانی اخلاق اور طرز عمل میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن دن تھا' اللہ کی عبادت اور بندگی میں حق و باطل کے درمیان یہ فیصلہ کن معرکہ تھا۔ توحید اور شرک کی تمام شکلوں اور صورتوں کے درمیان یہ فیصلہ کن دن تھا' چاہے اس کا تعلق اشخاص سے ہو' اقتدار سے ہو' رسم و رواج اور عادات سے ہو یا کسی اور شکل سے ہو۔ اور ظاہری واقعہ کے اعتبار سے بھی اس حق اور اس باطل کے درمیان یہ فیصلہ کن دن تھا۔ اس دن خواہشات اور اشخاص کی بندگی اور اقتدار اور تہذیب کے درمیان جنگ تھی' ایک طرف ذاتی اغراض تھیں اور دوسری طرف الٰہی قوانین تھے اور ایک طرف صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت' الوہیت اور اقتدار اعلیٰ کے نظریات تھے اور دوسری جانب انسان پر انسانوں کی برتری تھی۔ چنانچہ یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی نفع و نقصان دینے والا نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے' اس کے سوا کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ اب لوگوں کے سربلند ہو گئے۔ اب وہ کسی غیر کے سامنے نہ جھکتے تھے' لوگ سب کے سب باہم مساوی قرار پائے۔ ان پر اگر کوئی برتری تھی تو اللہ اور اس کے قانون کی تھی۔ اب لوگ غول در غول اٹھتے اور آزادی کے جھنڈے بلند کرتے' اور ظالموں اور سرکشوں سے نجات پاتے۔

یہ دن تحریک اسلامی کی تاریخ میں دو ادوار کے درمیان ایک حد فاصل تھا۔ پہلے تحریک صبر اور برداشت کے اصولوں پر عمل پیرا تھی' وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہی تھی۔ اب تحریک اسلامی کی قوت' آغاز کار اور ترقی کا دور شروع ہوا' اسلام نے پوری زندگی کے لئے ایک جدید تصور دیا۔ انسانی معاملات کے طے کرنے کے لئے ایک جدید نظام دیا۔ ایک جدید اجتماعی

نظام پیش کیا گیا۔ حکومت کے لئے ایک نیا سیاسی نظام اور دستور تجویز ہوا۔ اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب کوئی انسان دوسرے انسان کا غلام نہ ہو گا۔ سب کے سب صرف اللہ رب العالمین کے غلام ہوں گے۔ اور اب ان طاغوتی قوتوں کو زندہ رہنے کے لئے کوئی جواز نہیں ہے جنہوں نے اللہ کے حق حاکیت کو غصب کر لیا ہے۔ اسلام کے ایسے نظریہ کے لئے ضروری تھا کہ اس کی اپنی قوت ہو' وہ ایک تحریک ہو' وہ اقدامی پوزیشن رکھتا ہو اور آگے بڑھنے کی سکت اس میں ہو' اس لئے کہ اسلام ایسے نظریات رکھتے ہوئے خاموش تماشائی بن کر رہنے کی پوزیشن اختیار نہیں کر سکتا اور پھر غیر معین عرصے تک۔ اسلام کا منشا یہ نہ تھا کہ وہ اس کے حاملین کے لئے محض ایک تصور اور عقیدہ رہے۔ یا اس کا ظہور چند مراسم عبودیت ہی میں ہو یا اس کے مخصوص انفرادی اخلاقی ضوابط ہوں' لہذا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ جدید اخلاقی تصورات دے' وہ جدید نظام دے' جدید حکومت دے اور ایک جدید معاشرے کی بنیاد رکھے' اور یہ سب مظاہر عملی ہوں۔ پھر وہ اپنے ان اہداف کے حصول کے لئے وہ تمام رکاوٹیں دور کر دے جو ان مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بنیں اور مذکورہ بالا اصول کو مسلمانوں کی زندگی میں نافذ نہ ہونے دیں یا اس کرۂ ارض پر اسے رائج نہ کرنے دیں حالانکہ اسلام اللہ کی طرف سے آیا ہی اس لئے تھا کہ دنیا میں نافذ ہو۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے سورت انفال ص --)

یہ دن پوری انسانی تاریخ میں بھی یوم الفرقان تھا۔ اس لئے کہ اس سے قبل جو انسانیت کرۂ ارض پر بستی تھی' مجموعی اعتبار سے وہ اس انسانیت سے مختلف تھی۔ جو اس دن کے بعد آنے والے نظام میں نمودار ہوئی۔ یہ جدید تصور اور نظریہ جس کے نتیجے میں یہ جدید نظام تشکیل پایا یا اس جدید نظام نے انسان کو جو تصورات عطا کئے اور اس کے نتیجے میں جو نیا انسان نمودار ہوا' یہ دراصل پوری انسانیت کے لئے ایک نیا جنم تھا۔ یہ اقدار جن پر پوری زندگی استوار ہوتی ہے' اسی کی اساس پر اجتماعی نظام بھی تیار ہوتا ہے اور اسی کی اساس پر قانونی نظام بھی تیار ہوتا ہے۔ یہ تمام امور جنگ بدر کے صرف مسلمانوں کا اثاثہ نہ رہے جبکہ جدید اجتماعی نظام قائم ہو گیا تھا بلکہ آہستہ آہستہ یہ اقدار تمام انسانیت کا اثاثہ بن گئیں۔ اس تبدیلی سے انسانیت جس طرح دارالاسلام کے اندر متاثر ہوئی' اسی طرح دارالاسلام کے باہر بھی انسانیت اس سے متاثر ہوئی۔ اسلام کی دوستی میں بھی لوگ اس سے متاثر ہوئے اور اسلام کی دشمنی میں بھی لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ وہ صلیبی قوتیں جنہوں نے مغرب کی جانب سے اسلام کے خلاف لشکر کشی کی اور جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلام کے خلاف جنگ کریں اور اسلام کی برتری کو ختم کر دیں' وہ اسلامی معاشرے کے رسم و رواج اور اصول و قوانین سے متاثر ہوئے۔ یہاں سے واپس جا کر انہوں نے مغرب میں رائج جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد شروع کر دی' اس لئے کہ انہوں نے اگرچہ حقیقی اسلامی نظام تو نہ دیکھا تھا مگر اسلامی اصولوں کے جو آثار شرق اوسط کے معاشرے میں باقی تھے' ان سے وہ متاثر ہوئے۔ تاتاری جنہوں نے مشرق سے اسلام پر حملے شروع کئے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیں اور اس کام پر ان کو یہودیوں اور صلیبیوں نے آمادہ کیا تھا۔ وہ اسلامی نظریات سے متاثر ہو گئے اور انہوں نے اسلام کو مزید نئے علاقوں تک پھیلایا اور انہوں نے ایک ایسا نظام حکومت یعنی اسلامی خلافت قائم کیا جو پندرہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک یورپ کے دل میں قائم رہا' الغرض بدر کے بعد تمام انسانی تاریخ اسلامی افکار سے متاثر ہوئی اور یہ دن قدیم اور جدید تاریخ کے درمیان بھی حد فاصل اور فرقان تھا۔ اور انسانیت عالم اسلام کے اندر اور اس کے مخالف بلاک کے اندر بھی اسلام سے متاثر ہوئی۔

اسی طرح یہ دن فتح و نصرت کے دو تصورات کے درمیان بھی حد فاصل تھا۔ یہاں مشرکین کے حق میں فتح و نصرت کے تمام ضروری عناصر موجود تھے اور مسلمانوں کے محاذ پر بظاہر شکست کے تمام عوامل موجود تھے۔ یہاں تک کہ منافقین اور بیمار دل لوگوں نے یہ ریمارک پاس کیا کہ (غَرَّ هٰؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ) ان کے نئے دین نے ان کو غرے میں مبتلا کر دیا ہے۔ لیکن اللہ کا ارادہ یہی تھا کہ اسی انداز پر یہ جنگ ہو جائے۔ کفار کی ایک کثیر تعداد اور اہل ایمان کی ایک قلیل تعداد کے درمیان معرکہ تھا' تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ فتح و نصرت کے معیار وہ نہیں ہیں جو عام لوگوں کے درمیان معروف ہیں۔ بلکہ اللہ نے چاہا کہ یہاں قوی نظریات قلت سازو سامان کے ساتھ ایک عظیم لشکر پر فتح یاب ہو' جو بے عقیدہ ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ نصرت ایک صالح عقیدے اور برحق نظریات کے لئے مقدر ہوتی ہے۔ محض تعداد اور اسلحہ کی بنیاد پر فتح نصیب نہیں ہوتی اور یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ نظریاتی لوگوں کو چاہئے کہ وہ کفر کے خلاف معرکے میں کود جائیں اور اس وقت کا انتظار نہ کریں کہ فریقین کی ظاہری قوت برابر ہو جائے کیونکہ برحق نظریات رکھنے والے لوگوں کی پشت پر سچائی کی طاقت ہوتی ہے۔ یہ محض خالی خولی دعویٰ ہی نہیں ہے بلکہ جنگ بدر کے اندر اس کا دو ٹوک فیصلہ ہوا اور لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا۔

آخر میں' میں کہتا ہوں کہ جنگ بدر ایک دوسرے زاویئے سے بھی حق و باطل کے درمیان فرقان تھا اور اس پہلو کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸)(۸:۷ - ۸)) "یاد کرو کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے' تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل' باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

جو لوگ بدر کے لئے نکلے تھے وہ صرف اس ارادے سے نکلے تھے کہ ابو سفیان کے قافلے کو لے لیں جو غیر مسلح تھا۔ لیکن اللہ نے ان کی آرزو کو پورا نہ کیا۔ اللہ نے ابو سفیان کے قافلے کو بچ نکل کر جانے کا موقعہ دیا۔ اور اہل اسلام کو ابو جہل کے پرشوکت لشکر سے ٹکرا دیا۔ اور اس کے نتیجے میں جنگ ہوئی' مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور کفار قید ہوئے اور قتل ہوئے۔ اور یہ نہ ہوا کہ مسلمان بطور تفریح نکلیں اور قافلے پر قبضہ کر کے آسان طریقے سے مال غنیمت حاصل کر لیں۔ اور یہ کام اللہ نے اس لئے کیا لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۸: ۸)) "تاکہ حق' حق ہو جائے اور باطل' باطل۔" اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اللہ کی اسکیم کے مطابق احقاق حق کا طریقہ کیا ہے؟ مطلب یہ تھا کہ محض وعظ و تبلیغ اور نظریاتی اور حکیمانہ تبلیغ ہی سے احقاق حق نہیں ہوتا اور نہ نظریاتی بحث و جدال کے نتیجے میں احقاق حق ہوتا ہے کہ کوئی دلائل سے یہ بات کرے کہ حق یہ ہے اور باطل یہ ہے۔ حق اس وقت تک عملی شکل اختیار نہیں کرتا اور باطل لوگوں کی

عملی زندگی سے اس وقت تک خارج نہیں ہوتا جب تک باطل کی قوت اور اقتدار کو ختم نہ کر دیا جائے اور اس کی جگہ حق کا اقتدار اعلیٰ قائم نہ کر دیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک حق کی فوجوں کو نصرت اور فتح مندی نصیب نہ ہو اور بطل کو شکست نہ ہو جائے یعنی کسی جنگی معرکے میں۔ غرض یہ دین ایک حرکتی منہاج ہے 'محض نظریہ نہیں ہے 'محض علمی بحث و جدال نہیں ہے اور نہ ہی محض منفی اعتقاد ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے بلکہ اس کا مثبت پہلو بھی ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل میدان جنگ میں ہوتا ہے اور عملاً حق کو نصرت نصیب ہوتی ہے اور یہ عملی نصرت فرقان ہوتی ہے اور اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کیا چاہتے تھے اور یہ کہ اللہ نے رسول اللہ کو اس دن حق کے ساتھ گھر سے نکالا تھا اور حق یہ تھا کہ قافلہ چلا جائے اور ساز و سامان سے لیس لشکر سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے۔

یہ تھی اس دین اور اس دن کی حیثیت فرقانیت 'جس سے اس دین کی حقیقت 'اس کا مزاج واضح ہوتا ہے اور مسلمانوں کے احساس و شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ ایسی فرقانیت ہے جس کی ضرورت آج محسوس کی جاتی ہے کیونکہ مسلمانوں کے احساس و شعور کے اندر آج اسلام کے صحیح تصور کے اندر انحراف اور لچک پیدا ہو گئی ہے اور یہ ڈھیل اس قدر پھیل گئی ہے کہ بعض لوگ دعوت دین اور تبلیغ دین کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن احقاق حق کے اس منہاج کو وہ نہیں پا سکے۔

یہ تھی یوم بدر کی حیثیت فرقانیت جس کے بارے کہا گیا کہ وہ (یوم الفرقان) اور (یوم التقی الجمعان) ہے جس کے اندر گہری معنویت پائی جاتی ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" اور یوم بدر قدرت الہیہ کی بہترین مثال ہے۔ ایسی مثال جس میں کوئی مقال نہیں ہے اور نہ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہے۔ یہ ایک مشاہدہ ہے اور اس کی تفسیر کے لئے کسی طویل کلام کی ضرورت نہیں ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

---ooo---

اب سیاق کلام یوم الفرقان کی مزید تفصیلات میں چلا جاتا ہے۔ معرکے کی جھلکیاں دی جاتی ہیں۔ ان میں اس معرکے کو نہایت ہی عجیب موثر اور منظر کشی کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ گویا یہ منظر اسکرین پر چل رہا ہے اور اس کے مناظر میں اللہ کی تدبیر اور تقدیر عیاں و نمایاں ہیں۔ اس طرح کہ دست قدرت صاف صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنا کام کرتا ہے۔ نیز ان جھلکیوں سے وہ مقاصد صاف صاف عیاں ہیں جو اللہ کو مطلوب ہیں اور ابھی ایمان کا مقصود ہیں۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ

لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِىْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا
وَّيُقَلِّلُكُمْ فِىْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ ۵
الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ ع ۷

"یاد کرو وہ وقت جبکہ تم وادی کے اس جانب تھے اور وہ دوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے ۔ اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا ۔ اگر کہیں پہلے سے تمہارے اور ان کے درمیان مقابلہ کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلوتہی کر جاتے' لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لئے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا اسے ظہور میں لے آئے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے' وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے' یقیناً خدا سننے اور جاننے والا ہے ۔ ۱

اور یاد کرو وہ وقت جب کہ اے نبی " خدا ان کو تمہارے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا ۔ اگر کہیں وہ تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا شروع کر دیتے' لیکن اللہ ہی نے اس سے تمہیں بچایا' یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے ۔

اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمہیں کم کر کے پیش کیا تاکہ جو بات ہونی تھی' اسے اللہ ظہور میں لے آئے اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۔"

اس معرکے میں فریقین کے کیمپ سامنے نظر آتے ہیں اور اس میں دست قدرت رواں دواں ہے ۔ اللہ کی قدرت کا ہاتھ نمایاں نظر آتا ہے ۔ یہ ان لوگوں کا کیمپ ہے اور وہ دوسری جانب فریق مخالف ہے اور قافلہ دور سمندر کے ساحل سے گزر رہا ہے ۔ الفاظ قرآن رسول اللہ کی خواب کا نقشہ کھینچ رہے ہیں' اس نقشے میں مسلمانوں کو کفار کم نظر آتے ہیں اور کفار کو مسلمان ۔ یہ مناظر چند الفاظ میں صرف قرآن کریم ہی کا خاصہ ہے ۔ مشاہد و مناظر اور ان کا پس منظر دونوں صاف و شفاف نظر آتے ہیں ۔ منظر میں حرکات اور رنگ و روپ صاف نظر آتی ہے' صرف چند فقرات میں ۔

یہ مناظر جن کو ان آیات نے پیش کیا ہے ۔ ان مناظر کی طرف ہم اس سے قبل سیرت سے تفصیلات دے چکے ہیں' جب مسلمان مدینہ سے نکلے تو وہ وادی میں مدینہ کے قریب اترے اور اسی وادی کی دوسری طرف اہل کفار نے کیمپ لگایا ۔ ان دونوں کے درمیان ایک اونچا ٹیلہ تھا جو ان دونوں کے درمیان جدائی کر رہا تھا ۔ رہا قافلہ' تو ابوسفیان اسے ساحل کی جانب لے چلا تھا ۔ دونوں افواج سے نیچے کی طرف ۔

کوئی فوج یہ نہ جانتی تھی کہ فریق مخالف کہاں ہے ۔ اللہ نے ان کو ایک ٹیلے کے دونوں طرف جمع کر دیا ۔ یہ اللہ کی خاص منشا تھی ۔ اگر ان کے درمیان جگہ کا تعین پہلے ہو چکا ہوتا تو وہ اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہ آسکتے ۔ شاید ایک دوسرے سے پہلوتہی کر جاتے ۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی بات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی خاص تدبیر تھی ۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (۸: ۴۲) "یاد کرو وہ وقت جبکہ تم وادی کے اس جانب تھے اور وہ دوسری جانب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف تھا۔ اگر کہیں پہلے سے تمہارے اور ان کے درمیان مقابلکہ کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلوتہی کر جاتے' لیکن جو کچھ پیش آیا وہ اس لئے تھا کہ جس بات کا فیصلہ اللہ کر چکا تھا' اسے ظہور میں لے آئے۔

پروگرام کے یوں ایک دوسرے کے ساتھ آمنا سامنا ہو جانا اور اس قدر قریب کی بھاگنے کی صورت ہی نہ ہو۔ یہ بھی اللہ کی منشا تھی' کچھ نتائج تھے جن کا ظہور پذیر ہونا منشائے الٰہی تھا۔ اس لئے اللہ نے اس قدر خفیہ اور اچانک آمنا سامنا کرا دیا۔ اور تمہیں ذریعہ بنا دیا۔ ان نتائج کے ظہور کے لئے اور تمہارے لئے تمام حالات سازگار بنا دیئے گئے۔

آخر وہ کیا امر تھا؟ وہ کیا بات تھی جس کے لئے یہ تمام تدابیر عالم بالا کے ذریعے ہوئیں؟ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸: ۴۲) "تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے' وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔"

ہلاکت سے اس کا ظاہری مفہوم بھی لیا جاتا ہے اور کفر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ حیات بھی اپنے لغوی اور براہ راست مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ایمان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں یہ دوسرا مفہوم مراد ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوا ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا "وہ شخص جو مردہ ہو' اور ہم نے اسے زندہ کر دیا اور اس کو ایک ایسی روشنی دے دی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے' وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھیروں میں ہے اور ان سے نکلنے والا نہیں ہے۔" یہاں کفر کو موت' ایمان کو حیات قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح اسلام کا نظریہ حیات حقیقت ایمان اور حقیقت کفر کے بارے میں اپنا نقطہ نظر متعین کرتا ہے اور مذکورہ بالا آیت کی تشریح کرتے وقت ہم نے 'سورت انعام میں اس پر قدرے تفصیلی بحث کی ہے۔ (دیکھئے سورت انعام آیت ـــ)

یہاں اس مفہوم کو ہم اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ یوم بدر قرآن کے مطابق یوم الفرقان تھا۔ اس جنگ میں اللہ نے حق و باطل کے درمیان خوب جدائی کر دی' جس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں۔ اس لئے اب جو شخص کفر اختیار کرتا ہے تو گویا وہ دلیل و برہان کا منکر ہے اور جو شخص ایمان لاتا ہے تو وہ دلیل روشن پر ایمان لاتا ہے۔ اور یہ دلائل اب اس لئے روشن اور واضح ہیں کہ اس معرکہ نے سب کچھ کھول کر رکھ دیا ہے۔

یہ جنگ جن حالات میں ہوئی اور جن ظروف و احوال میں وہ لڑی گئی بذات خود ایک ایسی محبت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں ایسے اشارات ہیں کہ انسانی تدابیر کے پیچھے دست قدرت کام کر رہی ہے' یہ اشارات نہایت واضح اشارات تھے اور بتا رہے تھے کہ انسانی قوت کے علاوہ اور بھی فیصلہ کن قوتیں ہیں جو کام کرتی ہیں۔ اس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ اس دین کا ایک رب ہے اور وہ اپنے مخلص مجاہد بندوں کی پشت پر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ صبر کریں اور ثابت قدمی اختیار کریں۔ اگر فیصلہ ظاہری مادی قوت کے مطابق ہوتا تو مشرکین کو شکست نہ ہوتی اور جماعت مسلمہ کو اس قدر عظیم کامیابی نصیب نہ ہوتی۔

مشرکین نے خود اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے' جب وہ جنگ کے لئے جا رہے تھے تو ان کے حلیف نے ان کو امداد کی پیش کش کی تو انہوں نے کہا: "خدا کی قسم اگر ہمیں صرف انسانوں سے جنگ کرنا پڑتی تو ہم کمزور نہیں اور اگر یہ جنگ ہم خدا کے خلاف لڑ رہے ہیں' جیسا کہ محمد ؐ کا دعوی ہے' تو خدا کے مقابلے میں کسی کی کوئی بات نہیں ہے" وہ خود بھی یقین رکھتے کہ وہ خدا کے خلاف لڑ رہے ہیں جیسا کہ محمد ؐ کا دعوی ہے 'تو خدا کے مقابلے میں کسی کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ خود بھی یقین رکھتے کہ وہ خدا کے خلاف لڑ رہے ہیں کیونکہ حضرت محمد ؐ نے ان کو یہ حقیقت بتا دی تھی اور وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ حضرت محمد ؐ صادق و امین ہیں۔ اب اگر وہ ہلاک ہوئے تو برحق ہلاک ہوئے۔ اللہ تعالی نے اس بات پر یہ تبصرہ جو کیا ہے لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ "تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ دلیل روشن کے ساتھ زندہ رہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایک دوسرا اشارہ بھی نظر آتا ہے' وہ یہ کہ میدان کارزار میں حق و باطل کا معرکہ آرائی کرنا' اور میدان میں حق کا فاتح ہونا' جبکہ نظریاتی اعتبار سے حق نے میدان مار لیا ہو' اس بات کا سبب بنتا ہے کہ یہ لوگوں کی نظروں میں بالکل واضح اور نمایاں ہو جائے اور لوگوں کے دل و دماغ میں اس کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ اس طرح کہ میدان میں حق کی فتح بالکل واضح ہو جائے اور اس وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی ہلاکت اور کفر اختیار کرتا ہے تو اسے کوئی شبہ نہ ہو۔ اب اگر کوئی کفر کرتا ہے تو خودکشی کرتا ہے اور اسلام قبول کرتا ہے تو وہ بھی علی وجہ البصیرت زندگی اور سچائی کو قبول کرتا ہے اور اللہ کی نصرت کا اسے یقین ہوتا ہے کیونکہ وہ حق پر ہوتا ہے۔ اور اسے اللہ کی نصرت حاصل ہوتی ہے اور اس کے دشمنوں کو ہزیمت اور شکست ملتی ہے۔

اب ذرا پیچھے چلئے۔ نویں پارے اور سورت انفال کے تعارف میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ جہاد اس لئے ضروری ہے کہ کرہ ارض کے اوپر سے شرکی قوتوں کی کمر توڑ دی جائے اور طاغوتی اقتدار کو ختم کر دیا جائے اور اللہ کے کلمے اور اللہ کے جھنڈے کو بلند کر دیا جائے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ حق واضح اور جلی ہو جائے اور پھر اگر کوئی ہلاک ہوتا ہے تو علی وجہ البصیرت ہلاک ہو اور اگر کوئی زندہ ہوتا ہے تو علی وجہ البصیرت وہ زندہ ہو۔ اور اس سے اس سورت میں دی جانے والی ہدایت کے دور رس اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸ : ۶۰) "اور تم لوگ' جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے' ان کے مقابلے کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے۔" قوت کا تیار کرنا اور دشمنوں کو ڈرانا بھی ایک ذریعہ ہے جس کے باعث حق واضح ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس طرح حق کو قبول کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قوت سے مرعوب ہو کر اور حق کی ضربات کو دیکھ کر سمجھتے

ہیں اور انہیں ایسا دیکھ کر نظر آتا ہے کہ یہ تحریک درحقیقت انسان کی آزادی کی تحریک ہے اور اس کے نتیجے میں انسان پوری کائنات میں آزادی حاصل کرتا ہے۔

اس پورے مضمون پر اس پہلو سے یہ تعقیب آتی ہے کہ اس معرکے میں تدبیر الٰہی ان مقاصد کے لئے کام کر رہی تھی۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۸: ۴۲) "یقیناً خدا سننے اور جاننے والا ہے۔" اللہ وہ ذات ہے کہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے خواہ وہ سچے فریق کی ہو یا باطل فریق کی طرف سے ہو۔ اور اپنے افعال و اقوال کی پشت پر جو سوچ وہ رکھتے ہیں اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ اس لئے وہ جو تدبیر کرتا ہے وہ ظاہر و باطن کی اطلاعات پر مبنی ہوتی ہے۔ وہ تو سمیع و علیم ہے۔

یہ تو تھا تبصرہ نظام تدبیر الٰہیہ پر کہ اس کی تدابیر کس قدر گہری' خفیہ اور لطیف تھیں۔ اب بتایا جاتا ہے کہ ان تدابیر کی شکل و صورت کیا تھی؟

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۸: ۴۳) "اور یاد کرو وہ وقت جب کہ اے نبی ؐ، خدا ان کو تمہارے خواب میں تھوڑا دکھا رہا تھا۔ اگر کہیں وہ تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور لڑائی کے معاملہ میں جھگڑا شروع کر دیتے لیکن اللہ ہی نے اس سے تمہیں بچایا' یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔"

اللہ کی تدابیر خفیہ میں سے ایک یہ تھی کہ اللہ کے رسول اللہ کو خواب میں کفار کی تعداد کم بتلائی۔ وہ یوں نظر آئے کہ ان کے پاس نہ قوت ہے اور نہ ان کا کوئی وزن ہے۔ حضور ؐ نے اپنے ساتھیوں کے سامنے اپنا خواب بیان فرمایا۔ انہوں نے اسے بشارت سمجھا اور ان کے حوصلے بڑھ گئے اور معرکے میں کود پڑے۔ اللہ تعالیٰ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ نبی کو دشمن کی تعداد کم کیوں بتائی گئی! اس لئے کہ اگر ان کی تعداد زیادہ بتلائی جاتی تو ان کی نظریں اپنی قلت تعداد اور قلت سامان جنگ پر مرکوز ہو جاتیں جبکہ وہ نکلے بھی قافلے کے مقابلے کے لئے تھے اور جنگ کی توقع نہ رکھتے تھے۔ اس طرح وہ ضعف اور کمزوری کا شکار ہو سکتے تھے۔ اور دشمن کے سامنے ٹکرا جانے میں بحث و جدال شروع ہو جاتا۔ بعض لوگ کہتے لڑنا اچھا ہے اور بعض کہتے مڈبھیڑ سے بچنا مفید ہے۔ اور ایسے حالات میں فوج کے درمیان یہ فکری انتشار ایسی فوج کے لئے مہلک ہوتا ہے جو جنگ کے لئے تیار ہو۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۸: ۴۳) "لیکن اللہ نے اس سے تمہیں بچا لیا۔ یقیناً وہ سینوں کا حال تک جانتا ہے۔" اللہ تو دلوں کا حال جانتا ہے' اس نے مسلمانوں کے ساتھ بہت بڑی مہربانی کی کہ ان کو اس انتشار کی کیفیت سے بچایا جو باعث ضعف ہوتی ہے لہذا مشرکین کو خواب میں قلیل دکھایا گیا اور زیادہ نہ دکھایا گیا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب کا مدلول بھی حقیقی تھا۔ حضور ؐ نے دیکھا کہ کفار قلیل ہیں۔ اگرچہ تعداد میں زیادہ تھے' لیکن وزن کے اعتبار سے وہ ہلکے تھے۔ ان کی حقیقت کچھ نہ تھی' ان کے دل دماغ ٹھوس نظریات سے خالی تھے۔ ان کے دل ایمان سے خالی تھے اور وہ نفع بخش سازوسامان سے تہی دامن تھے۔ ان کی ظاہری حیثیت اگرچہ آنکھوں

کو دھوکہ دے رہی تھی لیکن اندر سے وہ بے حقیقت و بے وزن تھے ۔ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی باطنی حیثیت دکھائی تھی ۔ اور اس طرح لوگوں کے دلوں کو اطمینان سے بھر دیا گیا ۔ اس لئے کہ اللہ دلوں کے بھیدوں سے واقف تھا ۔ اللہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد اور سازوسامان دشمن کے مقابلے میں کم ہے ۔ اور اگر ان کو صحیح علم ہو جائے تو ان کے دلوں میں کیا خیالات ابھریں گے ۔ اس طرح امکان تھا کہ وہ معرکے میں کمزوری دکھائیں اور معرکہ آرائی بذات خود تنازعہ امر بن جائے ۔ یہ اللہ کی تدابیر میں سے ایک عظیم تدبیر تھی اس لئے کہ اللہ سمیع و علیم تھا ۔

اب جب فوجیں آمنے سامنے میدان بدر میں تیار کھڑی ہیں تو حضور ؐ کا سچا خواب پھر سامنے آتا ہے اور یہ جانبین کی صف آرائی کی حالت میں آتی ہے ۔ یہ بھی اللہ کی تدابیر میں سے ایک خاص تدبیر تھی ۔ اللہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ ذرا اس کو دوبارہ پیش نظر رکھو ' اس معرکے کے واقعات پر تبصرے کے دوران یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٨: ٤٤) "اور یاد کرو جب کہ مقابلے کے وقت خدا نے تم لوگوں کی نگاہوں میں دشمنوں کو تھوڑا دکھایا اور ان کی نگاہوں میں تمہیں کم کر کے پیش کیا تاکہ جو بات ہونی تھی ' اسے اللہ ظہور میں لے آئے اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۔"

تدابیر الٰہیہ میں سے اہم تدابیر یہ تھی کہ یہ معرکہ ٹل نہ جائے اور فریقین اس معرکے کے لئے آمادہ ہو جائیں ۔ مسلمان جو دشمنوں کو قلیل دیکھ رہے تھے تو یہ دشمنوں کو ان کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے اور کفار جو مسلمانوں کو قلیل دیکھ رہے تھے تو یہ بھی ظاہری آنکھ کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے ۔ دونوں کی نگاہ اپنے اپنے زاویہ سے تھی ' دونوں میں تدبیر الٰہی کے مقاصد کام کر رہے تھے ۔ یوں یہ واقعات امر الٰہی اور منشائے الٰہی کے مطابق رونما ہوئے ۔

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (٨: ٤٤) "اور آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں ۔" یہ تبصرہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے نہایت ہی مناسب ہے کہ تمام نتائج قضا و قدر کے نظام کے مطابق باہر ہوتے ہیں ۔ تمام امور کا مرجع اللہ ہے ' وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی کائنات میں تصرف کرتا ہے ' اپنے اقتدار ' اور اپنے ارادے اور اپنی قدرت و حکمت کے ساتھ اور اس کائنات میں کوئی بات بھی اللہ کی تقدیر کے تقاضوں کے سوا ظہور پذیر نہیں ہو سکتی ۔

---ooo---

اگر معاملہ ایسا ہی ہے ' تدبیر سب کی سب اللہ کی ہے ۔ نصرت اللہ کی جانب سے ہے ۔ محض کثرت تعداد ہی فیصلہ کن فیکٹر نہیں ہے اور محض مادی سازوسامان ہی کسی معرکے کے لئے فیصلہ کن نہیں ہوتا ' لہٰذا جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کو چاہئے کہ جب کفار کے ساتھ ان کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ ثابت قدمی اختیار کریں ۔ اور ان کو چاہئے کہ وہ حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کے لئے حقیقی سازوسامان تیار کریں اور ان کو وہ وسائل اختیار کرنے چاہئیں جن کا تعلق صاحب تدبیر اور صاحب تقدیر کے اسلحہ خانہ سے ہو ۔ اور فتح و نصرت اور صاحب عون مالک حقیقی سے امداد حاصل کریں ۔ اس ذات کی طرف رجوع کریں جو مقتدر اعلیٰ اور قوت و سطوت کا مالک ہے ۔ اور ان باتوں سے بچیں جو کفار مشرکین کے لئے باعث شکست ہوتی ہیں حالانکہ ان کی تعداد اور سازوسامان بہت زیادہ ہے ۔ اور ان کو چاہئے کہ وہ کبر و غرور اور اترانے

اور دکھانے سے بچیں ۔ شیطان کے دھوکوں سے ہشیار رہیں جس نے کفار کو مار ڈالا ۔ لہٰذا ان کو چاہئے کہ وہ اللہ پر توکل کریں جو عزیز و حکیم ہے ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا
لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ
رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا
غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ
عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ ٦
وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ع۴
غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾ ۲

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو ' توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی ۔ صبر سے کام لو ' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔ اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں ' جو کچھ وہ کر رہے ہیں ' وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے ۔

ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ میرا تمہارا ساتھ نہیں ہے ' میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے ۔ مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے ' جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے ' کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے ' حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو

یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔"

ان قلیل فقروں میں معانی و اشارات کا ایک سمندر موجزن ہے۔ اہم اصول و ہدایات منضبط کر دی گئی ہیں۔ مناظر اور مشاہد اس طرح نظر آتے ہیں کہ گویا اسکرین پر چل رہے ہیں۔ اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ الفاظ دل کے خیالات' ضمیر کے جذبات اور دماغ کے نہاں خانوں کی کیفیات کے مظہر ہیں۔ اگر انہی معانی کو کوئی انسان اور ادیب قلم بند کرنا چاہے تو دفتر درکار ہیں اور پھر بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ حق ادا کر سکے۔ غرض یہ حیرت انگیز تصویر کشی ہے جو قرآن کرتا ہے۔

اہل ایمان کو پکارا جاتا ہے' جس طرح اس صورت میں مسلسل پکاریں منضبط ہیں۔ ہدایات دی جاتی ہیں کہ جب بھی کسی دشمن سے آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہنے کی سعی کرو۔ اور فتح و نصرت کے حقیقی وسائل اپنے اندر پیدا کرو۔ اصل تیاری یہ تیاری ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (٤٥) وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (٤٦) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (٤٧) (٨:٤٥ تا ٤٨)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو' توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو گی۔ اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں' جو کچھ وہ کر رہے ہیں' وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔"

یہ ہیں فتح و نصرت کے حقیقی اسباب کہ دشمن کے مقابلے میں فوج اسلام ثابت قدم ہو' اس کے دل اللہ کے ساتھ مربوط ہو' وہ رسول اور اپنے قائد کی مطیع فرمان ہو۔ اور اس کے افراد باہم تنازعات اور اختلاف سے مجتنب ہوں۔ اس راہ میں ان کو جو مشکلات درپیش ہوں ان کو برداشت کرنے والے ہوں اور اترانے اور دکھانے والے نہ ہوں اور نہ اپنی قوت کی وجہ سے سرکشی کرنے والے ہوں۔

جہاں تک ثبات اور جم جانے کا تعلق ہے تو یہ فتح و نصرت کی راہ میں پہلا قدم ہے۔ جو بھی میدان میں جم جائے گا وہی نصرت پائے گا۔ پھر جبکہ مسلمانوں کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ ان کا دشمن کس قدر مشکلات انگیز کر رہا ہے اور جس طرح ان کو دکھ پہنچ رہے ہیں' دشمن کو بھی پہنچ رہے ہیں جبکہ اہل ایمان اللہ کی جانب سے عزا اور شہادت کی صورت میں

مرتبوں کے امیدوار ہیں اور ان کو یہ امید بھی نہیں ہے بلکہ جنہم یقینی ہے۔ مومن اللہ کے ہاں سے اجر پانے کی صورت میں امید کرتا ہے۔اس لئے وہ ثابت قدم رہتا ہے جبکہ ان کو کوئی امید ہی نہیں ہے۔اگر وہ ذرا بھی صبر و ثبات کا مظاہرہ کریں تو دشمن ٹوٹنے ہی والا ہے۔اہل اسلام تو دو بھلائیوں میں ایک ضرور پائیں گے۔اور ان کو گارنٹی دے دی گئی ہے یا شہادت اور یا فتح و نصرت۔جبکہ ان کے دشمن کو اس دنیاوی زندگی کی بھی گارنٹی نہیں ہے' جس پر وہ فدا ہے' اس لئے کہ آخرت میں تو اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر جنگ میں ذکر الہٰی تو ایک دائمی زادراہ ہے اور مومنین کو اس کی سخت تاکید کر دی گئی ہے اور اہل ایمان مجاہدین نے ہمیشہ ذکر الہٰی کو زبان اور دل میں زندہ رکھا اور قرآن کریم میں اہل ایمان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے' اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

اہل ایمان کی جانب سے ذکر الہٰی کا تذکرہ قرآن کریم بار بار کرتا ہے۔ ساحروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جب ایمان قبول کیا اور فرعون نے ان سے دھمکی آمیز خطاب کیا۔تو ان کا جواب یہ تھا :

وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ آمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ اور تم ہم سے انتقام محض اس لئے لوگے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر ایمان لائے ہیں' جبکہ یہ آیات ہم تک پہنچ گئیں۔اے ہمارے رب ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں اس حال میں مار کہ ہم مسلمان ہوں۔"

اسی طرح بنی اسرائیل کی ایک قلیل فوج کے واقعات میں بھی اس صفت کا ذکر آیا ہے۔اس قلیل تعداد کا مقابلہ جب جالوت اور اس کی افواج کثیرہ سے آیا تو انہوں نے کہا وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲: ۲۵۰) "جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی "اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر' ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔"

اسی طرح اسلامی تاریخ میں بے شمار مومن دستوں نے کفار کے مقابلے میں جو مواقف اختیار کئے ان کے بارے میں قرآن کریم یہ کہتا ہے :

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ (۱۴۶) وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۴۷) (۳: ۱۴۶ – ۱۴۷)) "اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری

نہیں دکھائی اور وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہی تھی "اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

جماعت مومنہ کے دلوں میں یہ تعلیم خوب بیٹھ گئی۔ جب بھی اس کا مقابلہ دشمن سے ہوا کرتا تھا اس کا رویہ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد جنگ احد میں جماعت مسلمہ کو مشکلات درپیش ہوئیں اور وہ دل شکستہ ہو گئے اور بدر کے عین دوسرے دن جب اس شکست خوردہ لشکر کو دوبارہ پکارا گیا تو یہ تعلیم ان کے نفوس پر پوری طرح حاوی تھی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ "وہ لوگ جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے خلاف جمع ہو گئے، لہٰذا ان سے ڈرو، تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے کہا: اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور اچھا مددگار ہے۔"

دشمن کے آمنے سامنے ہونے کے وقت ذکر الٰہی کے بے شمار فوائد ہیں، ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان کا رابطہ ایک ایسی قوت سے ہو جاتا ہے جس پر کوئی غالب قوت نہیں ہے، پھر یہ اللہ پر بھروسہ ہے جو اپنے دوستوں کی بھرپور نصرت کرتا ہے۔ اس سے اس معرکے کی حقیقت، اس کے اسباب اور اس کے مقاصد ذہن میں مستحضر رہتے ہیں، کیونکہ یہ معرکہ اللہ کی خاطر لڑا جاتا ہے۔ اس کرۂ ارض پر اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے لڑا جاتا ہے۔ اور ان طاغوتی طاقتوں کو ختم کرنے کے لئے لڑا جاتا ہے جنہوں نے ان کے حق اقتدار پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے، کیونکہ اس معرکے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کیا جائے۔ یہ جنگ نہ ملک گیری کے لئے ہے، نہ اموال غنیمت اور لوٹ مار کے لئے ہے۔ نہ شخصی حکومت کے قیام کے لئے ہے اور نہ قومی حکومت کے قیام کے لئے ہے۔ نیز اس حکم سے یہ تاکید بھی مقصود ہے کہ مشکل ترین حالات میں بھی انسان کو ذکر الٰہی سے غافل نہیں رہنا چاہئے۔ یہ تمام اشارات نہایت ہی قیمتی اشارات ہیں اور اللہ کی ان تعلیمات کی وجہ سے یہ حقیقت کا روپ اختیار کرتے ہیں۔

رہا اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا حکم تو ان کا مقصد یہ ہے کہ معرکے میں داخل ہوتے ہی انسان سر تسلیم خم کر دے اور وہ دواعی ہی ختم ہو جائیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان باہم نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔ اور حکم یہ ہے وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (۸ : ۴۶) "آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔" لوگوں کے درمیان تنازعات صرف اس وقت سر اٹھاتے ہیں جب ان کی قیادت کے مراجع ایک سے زیادہ ہو جائیں اور وہ مختلف جہتوں سے ہدایات لینے والے ہوں یا وہ صرف اپنی خواہشات کے پیروکار ہوں اور ان کے افکار اور تصورات کا ماخذ صرف ان کے سفلی جذبات ہوں۔ اس کے مقابلے میں جب لوگ صرف اللہ اور رسول اللہ کے مطیع فرمان ہوں تو نزاع کی پہلی بڑی وجہ سرے سے ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ لوگوں کا نقطہ نظر مختلف ہے کیونکہ نزاع صرف اختلاف نقطہ نظر ہی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مبدا ہوائے نفس ہوتی ہے۔ ہوائے نفس کی وجہ سے ہر نقطہ نظر رکھنے والا شخص اپنے موقف پر اصرار شروع کر دیتا ہے۔ اگرچہ اسے نظر آ جائے

کہ سچائی دوسری جانب ہے ۔ اب ترازو کے ایک پلڑے میں ایک شخص کی ذات ہوتی ہے اور دوسرے پلڑے میں سچائی ہوتی ہے ۔ اور ابتداء کے طور پر لوگ اپنی ذات کو سچائی پر ترجیح دے دیتے ہیں لہٰذا یہاں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ لوگ جنگ کے وقت اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کریں ۔ یہ امر ڈسپلن کا تقاضا ہے اور معرکوں میں ڈسپلن اولین فیکٹر ہوتا ہے ۔ یعنی اعلیٰ کمان کی اطاعت اور پھر اس امیر کی اطاعت جو اس اعلیٰ کمان کو چلاتا ہے ۔ اسلام میں جو اطاعت ہوتی ہے وہ دلی اطاعت ہوتی ہے اور عام دنیاوی افواج کی طرح کی اطاعت نہیں ہوتی 'کیونکہ عام افواج کی معرکہ آرائی اللہ کے لئے نہیں ہوتی ۔ اور نہ ان کے افراد کے درمیان للہ فی اللہ اخوت ہوتی ہے ۔ لہٰذا اسلامی افواج کے ڈسپلن اور سیکولر افواج کے ڈسپلن کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے ۔

رہا صبر تو وہ معرکہ آرائی خصوصاً اسلام کے لئے جنگ کرنے والوں کی اہم صفت ہوتی ہے ۔ چاہے یہ معرکہ انسانی نفسیات کے اندر حق و باطل کے درمیان ہو یا قتال کے میدان میں ہو ۔ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ''صبر سے کام لو' یقیناً اللہ تعالیٰ صبر سے کام لینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے ۔''

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۸:۴۷) ''اور ان لوگوں جیسے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں ۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے ۔''

یہ ہدایات امت مسلمہ اور جماعت مجاہدین کی تطہیر کے لئے دی جارہی ہیں کہ وہ قتال اور جہاد میں شرکت ایسے حالات میں نہ کریں کہ اپنی قوت اور کثرت پر اترا رہے ہوں اور اپنی قوت کو جو انہیں اللہ نے عطا کی ہے' ان راہوں میں خرچ نہ کریں جن کے بارے میں اللہ کا حکم نہیں ہے ۔ کیونکہ مومنین کے دستے قتال فی سبیل اللہ کے لئے نکلتے ہیں' ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی زندگیوں میں اللہ کی بادشاہت نافذ ہو ۔ لوگ صرف اللہ کے غلام ہوں اور یہ اس لئے علم جہاد بلند کرتے ہیں کہ ان تمام طاغوتی طاقتوں کو کرش کر کے رکھ دیں جنہوں نے لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا ہوا ہے اور جو طاقتیں زمین پر خدا کے مقابلے میں اپنی الوہیت قائم کر رہی ہیں حالانکہ اللہ کی جانب سے ان کو ایسا کرنے کی کوئی اجازت نہیں ہے ۔ نہ اللہ کی شریعت ان کے اس فعل کو تسلیم کرتی ہے ۔ یہ علم اس لئے بلند ہوتا ہے کہ پورے کرۂ ارض کے تمام انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا جائے 'کیونکہ یہ غلامیاں انسان کی کرامت اور شرافت کے خلاف ہیں اور اسلامی دستے جہاد و قتال کے لئے نکلتے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کی شرافت اور ان کی آزادی کا تحفظ ہو ۔ ان کا مقصد اپنا اقتدار قائم کرنا' زمین میں علو حاصل کرنا نہیں ہوتا ۔ نہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنا غلام بنائیں یا اتراتے پھریں اور انہیں اللہ نے جو قوت دی ہے اسے غلط مد میں صرف کریں ۔ اس طرح اسلامی دستوں کے مقاصد میں ذاتی مقاصد کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور اگر انہیں نصرت نصیب ہوتی ہے اور وہ غالب ہو جاتے ہیں تو انہوں نے امتثال امر کیا ہوتا ہے' اسلامی نظام حیات قائم کرتے ہیں' اللہ کا کلمہ بلند کرتے ہیں اور اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہوتے ہیں ۔ یہاں تک کہ معرکے کے نتیجے میں جو اموال غنیمت ملتے ہیں' وہ ان سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں ۔

کون اترا کر نکلا تھا' کون لوگوں کے سامنے اپنی قوت کی نمائش کر رہا تھا؟ اور کون لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتا تھا' یہ لوگ مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ یہ قریش کے لشکر کی شکل میں موجود تھے۔ جس طرح کہ یہ لشکر نکلا تھا۔ اور جو قریش فخر و مباہات کے ساتھ نکلے تھے' ان کا انجام بھی مسلمانوں کے سامنے تھا اور جس طرح ذلیل و خوار اور ٹوٹ پھوٹ کا وہ شکار ہو چکے تھے وہ بھی اہل اسلام کے سامنے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خود دستوں سے جو خطاب کیا اس کا مصداق ان کے سامنے تھا۔ ذرا دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۸:۴۷) "اور ان لوگوں جیسے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کرو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔"

اترانا اور شان دکھانا اور اللہ کے راستے سے روکنا' یہ سب امور ابوجہل کے اس تبصرے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ابوجہل کے پاس جب ابوسفیان کا پیغام آیا کہ میں ساحل کی جانب سے بچ کر نکل آیا ہوں اور آپ اپنے لشکر کو لے کر واپس ہو جائیں اس لئے کہ تمہیں محمد اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قریش کی حالت یہ تھی کہ وہ ساتھ گانے والی لونڈیوں کو بھی لے کر چلے تھے۔ راستے پر گاتے بجاتے اور مویشی کاٹتے اور شراب و کباب کے دور چلاتے ہوئے آ رہے تھے۔ ابوجہل نے اس پیغام کے جواب میں کہا: "ہم اس وقت تک واپس نہ ہوں گے جب تک ہم بدر کے میدان میں پہنچ نہ جائیں' تین دن قیام نہ کریں' جانور نہ کاٹیں' شراب نہ پییں اور گانے بجانے کی محفلیں منعقد نہ کریں' اگر ہم نے ایسا کیا تو تمام عرب ہم سے خوف کھائیں گے۔" جب ابوسفیان کا ایلچی واپس ہوا اور ابوجہل کا جواب پہنچایا تو ابوسفیان نے کہا: "افسوس کہ میری قوم کا کیا بنے گا! یہ ابوجہل کی حرکت ہے۔ اس نے واپسی کو نہ پسند کیا کیونکہ یہ قوم کا لیڈر تھا' اور اس نے سرکشی اختیار کی۔ سرکشی بہرحال ایک نقص ہے اور شگون بد ہے۔ اگر محمد نے اس لشکر کو کرش کر دیا تو ہم ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جائیں گے۔" ابوسفیان کی فراست درست نکلی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اس لشکر کو تہس نہس کر دیا اور اس اترانے کی وجہ سے لشکر کفار ذلیل ہوا' اس لئے کہ وہ سرکشی' دکھاوے اور راہ خدا کو روکنے کے مقاصد لیے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر میں ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۸ : ۴۷) "جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت میں ہے۔" اللہ سے ان کی کوئی تدبیر بچ کر نہیں نکل سکتی۔ ان کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان کی قوت اور ان کا علم سب کچھ اس کی گرفت میں ہے۔

اس سے آگے بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان مشرکین کو مسلسل ابھار رہا تھا کہ وہ یہ جنگ لڑیں اور چونکہ یہ لوگ شیطان کے دھوکے میں آ گئے تھے' اس لئے ان کو اس طرح ذلیل ہونا پڑا۔ اور وہ شکست و ریخت کا شکار ہوئے۔

وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ

لَكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸:۴۸) "ذرا خیال کرو اس وقت کا جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا کہ میرا تمہارا ساتھ نہیں ہے۔ میں کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم لوگ نہیں دیکھتے۔ مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے اور خدا بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔"

یہاں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بارے میں متعدد روایات منقول ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی روایت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا درجہ نہیں رکھتی۔ صرف ایک حدیث ہے جو امام مالک نے موطا میں نقل کی ہے۔ احمد روایت کرتے ہیں 'عبدالمالک ابن عبدالعزیز سے' ابن الماجشون سے' مالک سے' ابراہیم ابن ابو عبلہ سے' طلحہ ابن عبید اللہ ابن کریز سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابلیس یوم عرفہ میں جس قدر چھوٹا سا' حقیر سا غضبناک ہوتا ہے۔ اس قدر عام حالات میں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔ اللہ گناہوں کو معاف فرماتے ہیں۔ ہاں یوم بدر کے دن بھی وہ ایسا ہی تھا۔ صحابہ کرام ؓ نے دریافت کیا کہ حضور ؐ بدر کے دن اس نے کیا دیکھا تھا کہ ایسا تھا۔ اس نے اس دن دیکھا کہ حضرت جبرائیل ملائکہ کو تقسیم کر رہے ہیں۔"

یہ حدیث مرسل بھی ہے اور اس میں عبدالمالک ابن عبدالعزیز الماجشون راوی ہے جو ضعیف ہے۔

اس کے علاوہ جو آثار ہیں وہ حضرت ابن عباس ؓ سے ہیں اور ان سے یہ روایات بذریعہ علی ابن ابو طلحہ اور بذریعہ ابن جریج نقل ہیں۔ یا عروہ ابن زبیر بذریعہ ابن اسحاق' قتادہ سے بذریعہ سعید ابن جبیر' حسن اور محمد ابن کعب سے ان سب کو ابن جریر طبری نے روایت کیا ہے۔

مثنی سے 'عبداللہ ابن صالح سے' معاویہ سے' علی ابن ابو طلحہ سے' حضرت ابن عباس ؓ سے: کہتے ہیں کہ ابلیس یوم بدر میں شیاطین کا ایک لشکر لے کر آیا۔ اس کے پاس جھنڈا بھی تھا۔ یہ شخص بنی مدلج کے ایک شخص کی شکل میں تھا۔ خود شیطان سراقہ بن مالک ابن جعشم کی شکل میں تھا شیطان نے مشرکین سے کہا: "آج تم پر کوئی غالب نہ ہو گا اور میں تمہارا پڑوسی ہوں۔" جب لوگوں نے صف آرائی کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی کی ایک مٹھی لی۔ اور اسے مشرکین کے چہروں پر مارا۔ ان کو شکست ہوئی۔ حضرت جبرئیل ابلیس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس کا ہاتھ مشرکین میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں تھا تو اس نے اپنا ہاتھ اس مشرک سے چھڑایا اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا' اس کے ساتھی بھی بھاگے۔ ایک شخص نے کہا: اے سراقہ! تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم ہمارے پڑوسی ہو۔ تو اس نے جواب دیا: "کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھتے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں' بے شک اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں۔" یہ اس نے اس وقت کہا جب اس نے فرشتوں کو دیکھا۔

ابن حمید سے' سلمہ سے' ابن اسحق سے' یزید ابن رومان سے' عروہ ابن الزبیر سے' کہتے ہیں کہ جب قریش جمع ہو کر نکلنے لگے تو میں نے ان کے اور بنی بکر کے درمیان معاملات کا ذکر کیا' یعنی جنگ کا۔ قریب تھا کہ وہ واپس ہو جائیں' انہیں اس

وقت ابلیس سراقہ ابن مالک ' ابن جعشم المدلجی کی شکل میں ظاہر ہوا۔یہ شخص کنانہ کے شرفاء میں سے تھا۔اس نے کہا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں۔اگر کنانہ تمہارے پیچھے کچھ اقدام کریں تو تم اسے پسند نہ کروگے۔اس پر وہ بڑی تیزی سے نکلے۔

بشر ابن معاذ سے ' یزید سے ' سعید سے ' قتادہ سے۔کہتے ہیں کہ آیت وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (۸: ۴۸) سے وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸: ۴۸) تک کی تفسیر میں یہ بات ذکر ہوئی ہے کہ شیطان نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل نازل ہو رہے ہیں اور آپ کے ساتھ اور فرشتے ہیں۔اس اللہ کے دشمن کو یہ یقین ہو گیا کہ فرشتوں کے مقابلے میں وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔تو اس نے کہا "میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے 'میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔" یہ الفاظ اس دشمن خدا نے جھوٹ بولے ہیں۔اس کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے لیکن اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ مقابلہ نہیں کر سکتا اور اللہ کے اس دشمن کی عادت ہے کہ وہ اپنے پیروں کاروں کی قیادت کرتا ہے لیکن جب حق و باطل کا آمنا سامنا ہوتا ہے تو یہ اپنے ساتھیوں کو بری طرح چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور ان سے اپنی براءت کا اعلان کرتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں ہم نے جو منہاج اختیار کیا ہے اس کے مطابق ہم ان غیبی امور کے ساتھ تعرض نہیں کرتے جن کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی تفصیل نہیں دی گئی کیونکہ غیبی امور کا تعلق اعتقادات سے ہوتا ہے اور اعتقادی امور کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن سے ثابت ہوں یا سنت نبوی ؐ سے ثابت ہوں لیکن ہمارا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ ہم ہر غیبی امر کا انکار کر دیں اس لئے کہ یہ غیبی ہے۔

یہاں قرآن کریم کی آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کے لئے مزین بنا دیا تھا۔شیطان نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کریں اور یہ کہ وہ ان کی امداد کرے گا۔اور بعد ہ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو یہ شیطان الٹے پاؤں بھاگا اور کہا کہ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نے نہیں دیکھا۔میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔اس طرح شیطان نے ان کو ذلیل کیا اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔تاکہ وہ اپنے انجام تک خود پہنچیں اور اس نے ان کے ساتھ جو عہد کیا تھا اس کو پورا نہ کیا۔

اب یہ کیفیت کیسی ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کیا اور کس طرح اس نے باور کرایا کہ آج مشرکین کے خلاف کوئی غالب و برتر نہیں ہے اور کس طرح اس نے امداد کا وعدہ کیا اور کس طرح وہ بھاگا۔یہ سب تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔

یعنی ان واقعات کی تفصیلی کیفیت کے بارے میں ہم جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ شیطان اور اس کی سرگرمیاں سب کی سب غیبی امور سے متعلق ہیں۔اور ہم اس کے بارے میں کوئی جزمی اور یقینی بات نہیں کہہ سکتے جب تک کوئی صریح نص نہ ہو۔نص قرآن میں حادثہ اور واقعہ کا ذکر تو ہے لیکن تفصیلی کیفیات یہاں مذکور نہیں ہیں۔

یہاں آکر ہمارا اجتہاد ختم ہو جاتا ہے۔ہم اس معاملے میں جناب محمد عبدہ کے مکتب فکر کی رائے کو اختیار نہیں کرتے جو اس قسم کے تمام غیبی امور کے سلسلے میں ایک متعین انداز تاویل اختیار کرتے ہیں کہ ان غیبی جہانوں میں وہ ہر قسم کے حسی اعمال کا انکار کرتے ہیں۔اس آیت کی تفسیر میں شیخ رشید رضا یہ فرماتے ہیں :

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (۸:۴۸) "اے پیغمبر مومنین کو یہ بات یاد دلائیں کہ شیطان نے اپنے وسوسوں کے ذریعہ ان مشرکین کے سامنے ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیا تھا۔ اور ان کے دلوں میں یہ جذبات ڈال دیئے تھے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ آج ان پر کوئی غالب نہیں ہے۔ محمد کے ضعیف و ناتواں متبعین بھی اور عربوں کے دوسرے قبائل بھی اس لئے کہ تم تعداد اور سازوسامان میں ان سے زیادہ ہو اور تمہارے فوجی ان سے زیادہ جنگجو ہیں۔ اور ان حالات کے ساتھ ساتھ میں تمہارا امدادگار ہوں۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس نے ان کے وہم میں یہ بات ڈال دی کہ وہ جو اس کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ ان کا مددگار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہ دعا کرتے تھے "اے اللہ ان دو گروہوں میں سے جو زیادہ ہدایت پر ہو' اس کی مدد کر اور ان دو ادیان میں سے جو دین زیادہ حق پر ہو اس کی امداد کر۔"

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ (۸:۴۸) یعنی جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور حالات کو سمجھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ لوگ ایک دوسرے پر وار کریں اور قبل اس کے کہ میدان کارزار گرم ہو' شیطان بھاگ گیا اور الٹے پاؤں لوٹا یعنی پیچھے کی طرف اور جن مفسرین نے تَرَآءَتِ کا معنی یہ کیا کہ جب لوگ میدان کارزار میں ٹکرا گئے تو ان کی مراد غلط ہے۔ معنی یہ ہوا کہ شیطان اب ان کے لئے ان کے اعمال کی تزئین بند کر دیتا ہے اور اب انہیں ورغلانا ترک کر دیتا ہے۔ اب یہ کلام ایک قسم کی تمثیل ہے اور اس میں شیطان کی وسوسہ اندازی کو آنے والے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس وسوسہ اندازی کو ترک کرنے کے فعل کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی جو پیچھے کی طرف الٹے پاؤں پھرتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کر دیا کہ اس کی جانب سے ان لوگوں کے ساتھ اپنے تعلق کی براءت کا ذکر کر دیا اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّنْكُمْ (۸:۴۸) یعنی اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ان سے بری الذمہ ہے۔ اور جب اس نے دیکھا کہ فرشتے مسلمانوں کی امداد کر رہے ہیں' وہ مایوس ہو گیا۔ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸:۴۸) یہ شیطان کا قول بھی ہو سکتا ہے اور جملہ مستانفہ بھی ہو سکتا ہے۔" "میں کہتا ہوں کہ ان سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شیطان کی فوجیں مشرکین کی صفوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے دلوں میں وسوسے ڈال رہی تھیں یعنی ان کے ارواح سے مل کر ان کو دھوکہ دے رہی تھیں اور دوسری جانب سے فرشتے مسلمانوں کی صفوں میں پھیلے ہوئے تھے اور یہ مسلمانوں کی پاک روحوں میں وہ ڈالتے تھے کہ جس سے ان کے دل مضبوط ہوتے تھے اور اللہ کی جانب سے ان کو نصرت کا جو وعدہ تھا' اس پر ان کا یقین اور مضبوط ہو جاتا تھا۔"

یہ رجحان کہ ملائکہ کے افعال اور ان کا حصہ اس جنگ میں صرف یہی تھا کہ وہ مسلمانوں کو روحانی امداد دیتے تھے۔ مصنف دوسری جگہ صراحت سے یہ اظہار کرتے ہیں کہ یوم بدر میں فرشتوں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ یہ ایک غلط رجحان ہے کیونکہ قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے۔

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ "پس تم ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔" شیطان کے افعال کی ایسی تشریح کہ وہ محض روحانی اتصال ہو' یہ معنی محمد عبدہ کے مکتب فکر کی اہم خصوصیت ہے۔ ایسی ہی تاویل وہ ابابیل سے متعلق بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل چیچک کے جراثیم تھے اور یہ استاد محمد عبدہ کی تفسیر پارہ عم میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان آیات کی تاویل میں یہ بہت ہی مبالغہ

ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو الفاظ کی ظاہری تفسیر کو ناممکن بناتی ہو۔ ہاں ہم صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ان واقعات کی تفصیلی کیفیت کو ظاہر کرتی ہو اور یہی طریق کار ہم نے اختیار کیا ہے۔

غرض اس طرف شیطان ان مشرکین کو دھوکہ دے رہا تھا جو اتراتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور اپنی پوزیشن لوگوں کو دکھاتے آرہے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں' شیطان ان کو لشکر کشی پر آمادہ کر رہا تھا۔ اور پھر عین موقعہ میں ان کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دوسری جانب مدینہ کے منافقین اور مریض لوگ دل ہی دل میں خوش تھے اور کہتے تھے کہ یہ لشکر تباہی کے راستے پر چل نکلا ہے۔ مشرکین کی عظیم قوت سے اس کا مقابلہ ٹھہرا ہے۔ جبکہ یہ لوگ قلیل تعداد میں ہیں اور ان کی تیاری بھی کوئی نہیں ہے۔ یہ لوگ امور کو صرف ظاہری طور پر دیکھتے تھے۔ اور بظاہر یہ بات نظر آتی تھی کہ اہل ایمان نے اپنے آپ کو بڑی تباہی سے دوچار کر دیا تھا۔ یہ لوگ اپنے نئے دین کی وجہ سے دھوکے میں تھے اور انہیں اپنی نصرت کا پورا پورا یقین تھا۔ یہ تھے منافقین کے خیالات۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ (۸ : ۴۹) "جب کہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے' کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے۔" منافقین جو دل کے مریض ہوتے ہیں یہ تعداد میں اکثر کم ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں تھے اور اسلام کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن ان کے عقائد صحیح نہ تھے اور نہ ہی ان کے دل اسلام پر مطمئن ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی اس کی لشکر کے ساتھ چلے آئے تھے لیکن یہ مذبذب تھے۔ ڈھل مل یقین۔ یہ تبصرہ ایسے لوگوں کا تھا کہ جنہوں نے دیکھا کہ مسلمان کم ہیں اور مشرکین بہت زیادہ ہیں۔

یہ منافقین جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے۔ دراصل فتح و نصرت کے حقیقی اسباب سے باخبر ہی نہ تھے۔ یہ صرف ظاہری حالات کو دیکھ پاتے تھے اور ان کو اس قدر بصیرت نہ دی گئی تھی کہ وہ پوشیدہ امور کو یا ان حقائق کو سمجھتے جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ ان کو پتہ نہ تھا کہ نظریات کے اندر کس قدر قوت ہوتی ہے۔ مومن کو اللہ پر بھروسہ کس قدر ہوتا ہے۔ وہ کس قدر متوکل ہوتا ہے اور اگر بڑے بڑے لشکر ہوں اور ایمان باللہ نہ ہو تو ان کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ اگرچہ مسلمانوں کو فریب خوردہ کہتے تھے اور اپنے دین کے بارے میں ان کو مغرور کہتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے کے دھانے پر لا رہے ہیں کیونکہ مشرکین سیلاب کی طرح بہے چلے آ رہے تھے لیکن ان کا یہ نقطہ نظر غلط تھا۔

ایک نظر آنے والی صورت حال ایک مومن کی نظر میں اور ایک غیر مومن دیکھنے والے کی نظر میں بظاہر یکساں ہوتی ہے۔ رہا باطن اور حقیقی قدر و قیمت تو اس اعتبار سے دونوں کے نزدیک وزن و پیمانے میں فرق ہو جاتا ہے۔ ایک غیر مومن ذہن کو صرف ظاہری صورت حالات ہی نظر آتی ہے اور پس منظر اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ لیکن ایک مومن کی نظر دور رس ہوتی ہے اور اسے ظاہری صورت حالات سے آگے بھی کچھ حقائق نظر آتے ہیں۔ مومن ظاہری صورت حال سے وراء اس کی حقیقت کا ادراک بھی رکھتا ہے اور وہ حقیقی وزن اور قدر متعین کرتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۸: ۴۹) "حالانکہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔" یہ ہے وہ بات جسے قلب مومن سمجھ سکتا ہے اور اس حقیقت پر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور جن دلوں میں ایمان نہیں ہوتا' ان سے یہ حقیقت اوجھل ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس وجہ سے مومن کا پلڑا بھاری ہوتا ہے اور نتیجہ اس کے حق میں ہوتا ہے اور آخر کار ہر معاملے میں یہ حقیقت فیصلہ کن ہوتی ہے۔ ہر دور اور ہر جگہ یہ حقیقت فیصلہ کن ہوتی ہے۔

بدر کے سلسلے میں منافقین اور دل کے روگی جو یہ کہتے ہیں "کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر دیا ہے۔" یہ بات ہر دور کے منافقین اور مریض ذہنیت کے لوگ کہتے رہتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ طاغوتی قوتیں زوروں پر ہیں۔ لیکن اس دین کا اصل سازو سامان اس کا یہ عقیدہ ہے جس کے اندر بذات قوت واقعہ ہے۔ یہ کہ جماعت مومن اللہ کی عزت اور برتری کی خاطر لڑ رہی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ غیور ہے اور وہ اپنے دوستوں کی ہر وقت مدد کرتا ہے۔

منافقین اور مریض ذہنیت کے لوگ تماشے کر رہے ہیں اور وہ دیکھتے ہیں کہ جماعت مسلمہ طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ یہ لوگ ان کو حقارت آمیز نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ جماعت مسلمہ خطرات کا مقابلہ کر رہی ہے اور ان کو ہیچ سمجھتی ہے۔ یہ مریض اور منافقین جب دیکھتے ہیں کہ جماعت مسلمہ خطرات میں کودتی ہے تو ان کو پہلے تعجب ہوتا ہے اور پھر ان پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ واضح خطرات میں کود رہے ہیں۔ اس قدر جرأت اور تہور کی کوئی حقیقی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی اور نہ ان کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو کیوں ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ لوگ دین اور نظریہ کو بازار کی تجارت سمجھتے ہیں' اگر اس میں ان کو واضح فائدہ نظر آئے تو یہ اس میں اقدام کرتے اور اگر واضح فائدہ نظر نہ آئے تو سلامتی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ یہ معاملات کو مومنانہ نظر سے نہیں دیکھتے اور نتائج کو بھی ایمان کے پیمانے سے نہیں ناپتے۔ لیکن مومن کے نقطہ نظر سے تو یہ کاروبار ہمیشہ ہی نفع بخش رہتا ہے۔ دو اچھے نتائج میں سے کوئی ایک نتیجہ ضرور ظاہر ہوتا ہے یا تو مومن فتح یاب اور غالب ہوتا ہے اور یا وہ سیدھا جنت میں داخل ہوتا ہے۔ رہی ذات باری تو منافقین اور مریض ذہنیت کے لوگوں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

قرآن کریم اہل ایمان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ تمام امور کو دین و ایمان کے نقطہ نظر سے دیکھیں اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ معاملات کا جائزہ لیں۔ اللہ کے نور اور اس کی ہدایات کی روشنی میں امور کو دیکھیں اور طاغوتی قوتوں کی عظمت کو خاطر میں نہ لائیں اور اپنی قوت اور اپنے وزن کو کم نہ سمجھیں کیونکہ اللہ کی ذات ان کے ساتھ ہے۔ اور ان کے دل میں ہمیشہ یہ بات تازہ رہنی چاہئے کہ "جس نے اللہ پر توکل اور بھروسہ کیا تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔"

---ooo---

اب اللہ اس معرکے میں ربانی قوتوں کے عمل و دخل کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ اس منظر میں فرشتے کام کر رہے ہیں۔ چشم بصیرت سے اس منظر کو دیکھو۔ فرشتے اس معرکے میں شریک ہیں۔ اور کفار کی پکڑ دھکڑ انہوں نے شروع کر دی ہے۔ ان کی روحوں کو نہایت ہی حقارت سے قبض کر رہے ہیں اور ان کو سخت سے سخت اذیت دے رہے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ یہ لوگ نہایت ہی تکبر سے اتراتے ہوئے شان و شوکت سے آ رہے تھے۔ اس میں ان کو بتایا جاتا ہے کہ اس

سخت اور مشکل وقت میں تمہارے ساتھ یہ سلوک تمہارے اعمال بد کی وجہ سے ہو رہا ہے اور اس میں تم پر کوئی بھی ظلم نہیں ہے۔ پھر اس منظرکشی کے بعد بتایا جاتا ہے کہ جھٹلانے کی وجہ سے کفار کو جو سزا دی جاتی ہے یہ اللہ کی ایک جاری سنت ہے۔ جس طرح آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

اور یہ اس اصول کے مطابق کہ اللہ جب کسی قوم پر انعام کرتا ہے تو وہ اس وقت تک اپنے انعامات کو واپس نہیں لیتا' جب خود ان اقوام کا رویہ بدل نہیں جاتا۔ اسی اصول کے مطابق اللہ نے فرعون اور اس سے پہلے کی اقوام کے ساتھ معاملہ کیا۔ اور آئندہ بھی جو قوم ایسی روش اختیار کرے گی' اللہ کا سلوک بھی ویسا ہی ہو گا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

"کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں' اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو' یہ وہ جزا ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا' ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔"

یہ معاملہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آیا جس طرح آل فرعون اور ان سے پہلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطہ کے مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو

جھٹلایا۔ تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ہلاک کیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔"

اس ٹکڑے کی دو پہلی آیات سے مراد یوم بدر میں کام آنے والے مشرکین سے ہے۔

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۵۰) ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ

(۵۱) (۸: ۵۰ – ۵۱) "کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جب کہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض رہے تھے۔ وہ ان کے چہروں' اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لو اب جلنے کی سزا بھگتو' جزا ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا' ورنہ اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

کیونکہ ملائکہ اس معرکے میں شریک تھے۔ جس طرح کہا گیا۔

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۱۲) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۳) (۸: ۱۲ –

۱۳)) "پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔ یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو اللہ اور رسول کا مقابلہ کرے اللہ اس کے لئے نہایت ہی سخت گیر ہے۔"

اگرچہ ہمیں اس مار اور جوڑ جوڑ پر ضرب لگانے کی تفصیلی کیفیت کا علم نہیں ہے' جس طرح نویں پارے میں اس آیت پر بحث کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا۔ لیکن اگر ہمیں کسی مفہوم کی تفصیلی کیفیت کا علم نہ ہو یا ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم آیت کو اپنے ظاہری مفہوم سے پھیر دیں۔ ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ملائکہ کو حکم تھا کہ وہ ماریں' اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ملائکہ اللہ کے کسی حکم سے سرتابی ہی نہیں کرتے۔ وہ تو وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ تو یہ دونوں آیات گویا واقعات بدر کو یاد رکھنے کی طرف اشارہ ہو گا اور یہ بتانا مقصود ہو گا کہ یہ بات بھی واقعات بدر میں شامل ہے کہ اس دن کفار کے ساتھ یہ یہ سلوک ہوا۔

لیکن یہ آیات بتا رہی ہیں کہ جب بھی کفار پر موت کا وقت آتا ہے تو فرشتے ان کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ فرشتوں کا یہ سلوک مقتولین بدر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور یہ خطاب وَلَوْ تَرٰى گویا تمام اہل ایمان کے لئے ہو گا۔ اور یہ انداز کلام قرآن ہر اس مقام پر اختیار کرتا ہے جہاں لوگوں کو ایک کھلے منظر کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ جسے ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا ہو۔

بہرحال ان دو آیات کی جو تفسیر بھی ہو اہل کفر کے قبض روح کا نظارہ نہایت ہی خوفناک ہے۔ ملائکہ ان کے اجسام سے ان کی روح کو نہایت ہی توہین آمیز انداز میں کھینچ لیتے ہیں اور اس حقارت و توہین کے ساتھ ساتھ یہ لوگ عذاب شدید میں مبتلا ہوتے ہیں۔

''کاش تم اس حالت کو دیکھ سکتے جبکہ فرشتے مقتول کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے ۔ وہ ان کے چہروں اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگاتے جاتے تھے ۔''

اب یہاں سے آگے بیانیہ انداز کے بجائے براہ راست خطاب شروع ہوتا ہے :

''لو اب جلنے کی سزا بھگتو۔'' اور انداز خطاب اس لئے اختیار کیا گیا کہ یہ منظر آنکھوں کے سامنے آجائے 'گویا جہنم' اس کی آگ اور جلنے کے عمل کے ساتھ موجود ہے اور لوگوں کو اس میں پھینکا جا رہا ہے ۔ لعنت و پھٹکار بھی ہو رہی ہے ۔

''یہ وہ جزاء ہے جس کا سامان تمہارے اپنے ہاتھوں نے پیشگی مہیا کر رکھا تھا۔'' اس لئے تمہیں جو سزا دی جا رہی ہے یہ عادلانہ سزا ہے ۔ تم اس کے مستحق ہو اور تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے ورنہ :''اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے ۔''

یہ آیت جو جہنم کے جلانے والے عذاب کی تصویر کشی کرتی ہے ' اس کو پڑھ کر ایک سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ آیا یہ تہدید جو ملائکہ کی طرف سے انہیں دی جا رہی ہے آیا اس عذاب کی ہے جو قیامت کے دن انہیں حساب و کتاب کے بعد دیا جائے گا یا کفار کے مجرد قبض روح کے ساتھ ہی وہ جہنم رسید ہو جاتے ہیں ۔

یہ دونوں صورتیں ممکن ہیں اور جائز ہیں ۔ اور دونوں مفہوم ان آیات سے اخذ کئے جا سکتے ہیں ۔ اس سے زیادہ ہم اس پر کوئی بحث نہیں کرتے ۔ کیونکہ یہ ایک غیبی امر ہے اور اللہ نے اسے اپنے علم میں محفوظ کر لیا ہے ۔ ہم پر فرض یہی ہے کہ ہم اس پر یقین کر لیں ۔ ایسا ہو گا اور کوئی بات اس میں مانع نہیں ہے ۔ ایسا کب ہو گا ۔ مرتے وقت یا بعد الحساب تو یہ اللہ کے علم میں ہے جو علام الغیوب ہے ۔

بدر کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب سیاق کلام ایک قاعدہ کلیہ کے بیان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ یہ واقعہ اور یہ منظر اسی کلیہ کا ایک جزئیہ ہے ۔ یہ کہ اہل کفر کو نہایت ہی توہین آمیز انداز میں گرفت میں لینا ایک جاری و ساری سنت ہے اور اس میں کوئی تبدیلی کبھی بھی نہیں ہوتی ۔ یہ سلوک اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ نے حق و باطل کی کشمکش کو اس جہاں میں چلایا ہے ۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸ : ۵۲) ''یہ معاملہ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آیا جس طرح آل فرعون اور ان سے پہلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا ۔ اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے ۔''

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہیں ہے کہ لوگوں کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دے یا ان کو اتفاقات زمانہ کے سپرد کر دے ۔ اور وہ کسی اصول اور ضابطے کے پابند نہ ہوں ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو اپنے ضابطہ قضا و قدر کا پابند کیا ہے ۔ مشرکین کو یوم بدر میں جو حالات پیش آئے یا آئندہ بھی وہ جن حالات سے دوچار ہوں گے ۔ وہ اللہ اور اس کے نظام قضا و قدر کے مطابق ہیں ۔ اور اسی نظام کے مطابق فرعون اور اس سے پہلے کے اہل کفر کے ساتھ ہوا ۔

''انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا ۔''

اور انہوں نے اللہ کی پکڑ میں اپنی کوئی مدافعت نہ کر سکی اور نہ وہ اس عذاب سے بچ سکے' اس لئے کہ :"بے شک اللہ قوت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔"

اللہ نے ان لوگوں پر انعامات کی بارش کی۔ ان پر فضل و کرم کر کے انہیں بہت کچھ دیا۔ زمین پر ان کا اقتدار قائم کیا۔ اور وہ اس اقتدار کے وارث بنے' لیکن اللہ یہ سب چیزیں جسے بھی دیتا ہے وہ برائے امتحان دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ لوگ شکر کرتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے شکر نہ کیا بلکہ ناشکری کا مظاہرہ کیا بلکہ انہوں نے بغاوت و سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ ان انعامات اور قوتوں کی وجہ سے وہ جبار و قہار بن گئے۔ اور فسق و فجور میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو طاغوتی قوت کی شکل دے دی۔ ان کے پاس اللہ کی آیات و معجزات آئے تو انہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا۔ لہٰذا اب وہ اس بات کے مستحق ہو گئے کہ انہیں اس قانون کے تحت پکڑا جائے جو اس کائنات کے لئے سنت جاریہ ہے کہ جب اللہ کی آیات کسی تک پہنچ جاتی ہیں اور لوگ ان کی تکذیب کرتے ہیں تو اللہ انہیں پکڑتا ہے اور ان کو پیس کر کے رکھ دیتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۵۳) كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۵۴) (۸:۵۳ - ۵۴)

"یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو' اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ آل فرعون اور ان سے پہلے کی قوموں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اسی ضابطہ کے مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تب ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ہلاک کیا اور آل فرعون کو غرق کر دیا۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔"

اللہ نے انہیں تب ہلاک کیا جب انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اس سے قبل ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی' باوجودیکہ وہ کافر تھے' کیونکہ یہ اللہ کی سنت جاریہ ہے اور اس کا کرم ہے کہ اس نے یہ اصول مقرر کیا ہے۔ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا "اور ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک رسول نہ بھیج دیں۔" یہاں آل فرعون اور ان سے پہلے کی اقوام جن کے پاس آیات الٰہی بھیجی گئیں اور انہوں نے تکذیب کی اور اللہ نے ان پر ہلاکت و بربادی نازل کی۔ یہ کارروائی ان کے خلاف کیوں کی گئی' اس لئے کہ (وہ ظالم تھے) یہاں لفظ ظلم بمعنی کفر یا شرک استعمال ہوا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ لفظ اکثر انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

یہاں اس آیت پر قدرے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے :-

"یہ اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو' اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔"

اللہ کی جانب سے بندوں کے ساتھ عدل و انصاف کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ اللہ نے جس بندے کو بھی کوئی نعمت دی ہے' وہ اس سے اللہ اس وقت تک نہیں چھینتا جب خود بندہ اپنی نیت نہیں بدل دیتا۔ اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتا' اور اپنے طور طریقوں کو نہیں بدل دیتا۔ اور اپنے آپ کو اس بات کا مستحق نہیں بنالیتا کہ اللہ ان سے وہ نعمت چھین لے جو ان کو دی گئی۔ کیونکہ یہاں جسے بھی جو کچھ دیا جاتا ہے' وہ آزمائش اور ابتلا کے لئے دیا جاتا ہے اور جب بندے اس عطا کی قدر نہیں کرتے اور اس کا شکر نہیں بجالاتے تو وہ ان سے یہ عطا واپس لے لیتا ہے۔ اور اس میں ایک پہلو انسان کی عظمت اور تکریم کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام قضا و قدر اور اخذ و عطا کو خود انسان کے طرز عمل کے ساتھ منسلک کر دیا ہے اور اپنے نظام قضا و قدر کو یوں چلاتا ہے کہ جس طرح انسان چلے اور کرے ویسا بھرے۔ انسان جو عمل اختیار کرے' اس کی نیت جس طرح کام کرتی ہے اور وہ اپنے لئے جو راہ' جو طرز عمل اور جو رویہ اختیار کرتے ہیں اس کے مطابق نظام قضا و قدر ان کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ ایک تیسرا پہلو یہ ہے کہ یہاں حضرت انسان پر اس کے اعمال کی عظیم ذمہ داری بھی عائد کی جاتی ہے۔ اور عزت و تکریم کے ساتھ اسے یہ موقعہ بھی دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ کے انعامات اور اس کے فضل و کرم کے جواب میں شکر نعمت کر کے ان میں اور اضافہ کرالے جس طرح ناشکری کے نتیجے میں یہ انعامات زائل بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک اہم حقیقت ہے اور اسلام کے تصور انسان میں یہ حقیقت تو بہت اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کائنات میں نظام قضا و قدر کا مقام انسانیت کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور انسان کا اس کائنات کے ساتھ کیا رابطہ ہے جس میں وہ رہا ہے؟ اس نظام قضا و قدر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں انسان کی اہمیت کس قدر ہے۔ اور اس پہلو سے اسلام نے انسان کو کس قدر اعزاز بخشا ہے کہ انسان کے اپنے معاملات میں اور اس کائنات میں رونما ہونے والے بڑے بڑے انقلابات میں انسان کی روش کو اہم فیکٹر قرار دیا گیا ہے۔ اور انسان کی اس مثبت روش ہی سے مثبت نتائج اور اس کی منفی روش سے اسے منفی اور ناخوشگوار نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے جبکہ انسان کے بارے میں آج کا مادی تصور یہ ہے کہ اس میں وہ ایک ذلیل و حقیر مخلوق ہے اور وہ مادیت کے جبری قوانین میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اقتصادی عوامل کے ہاتھوں میں بھی مجبور ہے۔ تاریخ کے حتمی اصولوں کے سامنے بھی مجبور محض ہے' اور ترقی کے جبری قواعد میں بھی اسے مجبور دکھایا گیا ہے۔ غرض دور جدید کے مادی تصور میں جو جبریات ہیں' ان کے مقابلے میں انسان کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہے۔ اس لئے اس کو یہ تصور دیا جاتا ہے کہ وہ ان طبیعی جبریات کے سامنے ایک بے بس' ذلیل اور کمزور مخلوق ہے۔

یہ حقیقت یہ تصور دیتی ہے کہ عمل اور جزاء کا باہم تعلق ہے اور اس کائنات میں انسان ایک موثر مخلوق ہے۔ اور اللہ اس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کرتا۔ اللہ کی سنت اور اس کے قوانین طبیعی اس کے نظام قضا و قدر کے مطابق چلتے ہیں جن میں انسانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔

وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ "اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔" اس لئے اللہ نے آل فرعون کو بھی ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ہلاک کیا۔ محض بے وجہ ان پر ظلم نہیں کیا ہے۔ ایک بار پھر آیت پر غور فرمائیں۔

"یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو' اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔"

درس نمبر۸۶ ایک نظر میں

سورت انفال کا یہ چوتھا اور آخری سبق ہے۔اس میں دوسرے ممالک اور بلاکوں کے ساتھ صلح و جنگ کے کچھ قواعد وضع کئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ اسلامی معاشرے کی داخلی تنظیم اور دوسری تنظیموں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو منضبط کیا گیا ہے۔مختلف احوال میں اسلام اور دوسری اقوام کے ساتھ معاہدوں کی نوعیت پر بحث ہے۔نیز خون رنگ ونسل 'علاقائیت اور عقائد ونظریات کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو متعین کیا گیا ہے۔

اس سبق میں ان موضوعات کے بارے میں ایسے احکام بھی دیئے گئے ہیں جو اپنے موضوع پر فائنل ہیں۔اور بعض ایسے ہیں جو اس مرحلے کے لئے تھے جن میں یہ صورت اتری ہے اور متعین حالات کے لئے تھے۔یا ایک متعین واقعہ کے لئے تھے اور جن میں بعد میں ترمیمیں کی گئیں اور انہوں نے بعد میں آخری صورت اختیار کی۔یعنی سورت توبہ میں ان احکامات نے آخری شکل اختیار کی۔سورت توبہ مدنی دور کی آخری سورتوں میں سے ہے۔

ان احکامات اور قواعد میں درج ذیل امور شامل ہیں۔

☆ جو لوگ اسلامی بلاک سے معاہدے کرتے ہیں اور بعد میں اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں وہ اس کرۂ ارض پر بدترین جانور ہیں۔لہٰذا اسلامی بلاک کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ان کی سبق آموز تربیت کرے۔اور ان کو ایسا سبق سکھائے کہ یہ لوگ اور ان کے بعد آنے والے یا ان کی پشت پر جو قوتیں کھڑی ہوں ان کے لئے بھی وہ اچھی عبرت ہو۔

☆ جن معاہد اقوام سے اسلامی حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہو کہ وہ بدعہدی کریں گی یا عہد میں امانت داری کے مقابلے میں خیانت کریں گی تو اسلامی قیادت کا یہ حق ہو گا کہ وہ اس عہد کو ان کے سامنے رکھ دے اور اعلان کر دے کہ اس کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کے بعد اگر اسلامی حکومت ان لوگوں کی سرزنش کرے تو وہ آزاد ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو خوفزدہ کر سکے جو اسلامی حکومت کے خلاف سرگرم ہوں اور تیاریاں کر رہے ہوں کہ حملہ کر دیں۔

☆ یہ کہ اسلامی بلاک کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی دفاعی افواج کو ہروقت چوکس رکھیں اور انتہائی ممکن حد تک اپنی فوجی قوت کو ترقی دیں۔اس طرح کہ اس کرۂ ارض پر ہدایت یافتہ قوت ہی بڑی قوت ہو اور اس سے تمام باطل قوتیں لرزہ براندام ہوں اور ان کی قوت کے بارے میں زمین میں تمام باطل قوتیں جانتی ہوں اور خائف ہوں اور یہ جراءت نہ کر سکیں کہ وہ حملہ آور ہوں اور وہ اللہ کی سلطنت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور صورت حال یہ ہو جائے کہ پوری دنیا میں کسی داعی اسلام کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور کوئی رکاوٹ ان لوگوں کے سامنے نہ رہے جو دعوت اسلامی کو قبول کرنا چاہتے ہیں اور کوئی قوت سیاسی اقتدار اعلیٰ اپنے لئے مخصوص کرنے والی نہ ہو بلکہ نظام

حکومت صرف اللہ کا چلتا ہو۔

☆ یہ کہ اگر غیر مسلموں میں سے کوئی اسلامی کیمپ کے ساتھ کوئی معاہدۂ امن کرنا چاہے اور وہ اسلامی حکومت کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے تو اسلامی حکومت کی قیادت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اسے قبول کر لے اور معاہدہ کر لے۔ اگر وہ کوئی خفیہ سازش کرنا چاہتے ہوں اور بظاہر دھوکے کی کوئی علامت نظر نہ آتی ہو تو ان کا فرض ہے کہ ان کے خفیہ ارادوں کو اللہ پر چھوڑ دے۔ اللہ اس قسم کے فریب کاروں کے شر سے بچانے والا ہے۔

☆ جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔ اگر چہ دشمن کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے دوگنا ہو۔ خدا کے فضل سے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں پر فتح نصیب ہوگی۔ ان میں سے ایک آدمی بیس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور کمزور حالات میں بھی ان میں سے ایک آدمی دو آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا جہاد کا فریضہ اس موقع کے لئے انتظار کی مہلت نہیں دیتا کہ مومنین اور ان کے دشمن کی تعداد برابر ہو۔ اس لئے مسلمانوں کی تیار قوت ہی کافی ہے اور ان پر فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ قوت تیار رکھیں۔ اللہ پر بھروسہ کریں، معرکے میں ثابت قدم رہیں۔ مشکلات میں صبر سے کام لیں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ اس لئے کہ وہ مادی قوتوں کے علاوہ روحانی قوت بھی رکھتے ہیں۔

☆ اسلامی محاذ کا پہلا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ وہ طاغوتی قوت کے تمام سرچشموں کو پاش پاش کر کے رکھ دے۔ اگر وہ سمجھتے ہوں کہ فوجیوں کو قید کرنا اور پھر تاوان جنگ لے کر چھوڑ دینا مفید مطلب نہیں ہے تو پھر ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ رسول اور مسلمانوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ طاغوتی قوتوں کو اچھی طرح پاش پاش کرنے سے قبل ہی لوگوں کو قید کرتے پھریں۔ لہٰذا ان کا ہدف یہ ہو کہ وہ دشمن کی قوت کو پاش پاش کر کے علاقے میں اپنا اقتدار اعلیٰ نافذ کر دیں۔ اس سے پہلے قیدی بنا کر فدیہ لینے سے بہتر ہے کہ وہ دشمن کو پیس کر رکھ دیں۔

☆ مسلمانوں کے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی یہ جائز کر دیا گیا ہے کہ وہ قیدیوں کو رہا کر کے جنگی تاوان وصول کریں لیکن اس وقت جب وہ دشمن کی قوت کو اچھی طرح توڑ دیں اور اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر دیں اور ان کے اقتدار کی شان و شوکت قائم ہو جائے۔

☆ اسلامی کیمپ میں قید ہونے والے کفار سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام میں دلچسپی لیں اور یاد رکھیں کہ تم سے جو اموال غنیمت لئے گئے ہیں اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو اللہ تمہیں اس سے اچھا دینے والا ہے۔ لیکن اگر تم خیانت کرو گے تو جس طرح تمہارا انجام جنگ بدر میں ہوا ہے وہی دوبارہ ہو گا۔

☆ اسلامی معاشرہ میں اکثر نظریات پر ہوتا ہے لیکن تعلق مولات تو خصوصاً نظریات اور مشترکہ تحریک کی اساس پر ہوتا ہے، لہٰذا جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جن لوگوں نے پناہ دی اور نصرت دی یہی لوگ دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے نظریہ تو قبول کر لیا اور ایمان بھی لائے مگر ہجرت نہ کی تو ان کے اور مومنین مہاجرین کے درمیان کوئی ولایت نہیں ہے۔ یعنی دارالاسلام ان کی نصرت اور ان کی کفالت اور ہمدردی کا پابند نہیں ہے۔ اور ان کی مسلمانوں پر نصرت اور ہمدردی صرف اس وقت فرض ہے جبکہ ان کا عقیدہ اور نظریہ زد میں ہو اور نظریات و عقائد کی وجہ سے ان پر ظلم ہو رہا ہو۔ لیکن اس بارے میں بھی ایک مزید شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ ظلم اور زیادتی اس قوم کی طرف سے نہ ہو جن کا اہل اسلام کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو۔

☆ اسلامی معاشرے کے اندر بھی دوستی اور ہمدردی کا تعلق صرف اس آکٹھ کے دائرے کے اندر ہے جس کا عقیدہ و نظریہ حقیقی ایمان کا ہو اور ان کے اندر اسلامی انقلاب کے لئے مشترکہ تحریک کا تعلق بھی ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رشتہ دار (اولو الارحام) دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ترجیح کے مستحق تصور نہ ہوں گے' لہٰذا وہ زیادہ قریب تصور ہوں گے۔ بشرطیکہ یہ رشتہ دار سب کے سب اسلامی نظریہ حیات کے قائل ہوں اور باہم مل کر اسلام کے لئے کام کر رہے ہوں۔ صرف رشتہ داری کافی نہیں ہے' یعنی ایسی رشتہ داری جس میں نظریات وعقائد کا اشتراک نہ ہو اور جس میں ایک مقصد کے لئے حرکت نہ پائی جاتی ہو۔

اجمالاً اس سبق میں یہی بڑے مضامین ہیں اور یہ مضامین و موضوعات اسلامی معاشرے کی تنظیم کے داخلی اور خارجی موضوعات کے اہم مضامین ہیں۔ اور تفصیلات آیات کی تشریح کے دوران ملاحظہ فرمائیں۔

---ooo---

درس نمبر ۸۶ تشریح آیات

۵۵--- تا--- ۷۵

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ
مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ
خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ
عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ع ١٠ ٣
سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَ
مِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ
لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ
إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ
عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦١﴾ وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ ۚ هُوَ
الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٣﴾

"یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ (خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔ پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں' ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو' یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ منکرین حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے' یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔

اور تم لوگ' جہاں تک تمہارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو' تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا۔ اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔

اور اے نبی "اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لئے اللہ کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے' یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔"

یہ آیات ایک قسم کی عملی ہدایات ہیں' اس وقت جبکہ جماعت مسلمہ ایسے حالات سے عملاً دوچار تھی۔ اس وقت مدینہ میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ ان عملی حالات میں' امت مسلمہ کو ضروری احکامات دیئے گئے۔

ان میں سے اکثر ہدایات اس وقت کی قائم اسلامی مملکت یا اسلامی محاذ اور اس وقت کی اسلامی حکومت کے اردگرد قائم مملکتوں اور محاذوں کے درمیان قانون بین الممالک کے موضوع پر ہیں۔ ان آیات کے بعد' قرآن کریم نے ان میں معمولی ترمیمات کی ہیں لیکن یہ ہدایات اسلام کے قانون بین الممالک کے سلسلے کی اساسی ہدایات ہیں۔

ان ہدایات میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ مختلف بین الاقوامی گروہوں اور مملکتوں کے درمیان باہم سلامتی کے معاہدات ہو سکتے ہیں' بشرطیکہ فریقین معاہدہ اس کی شرائط کی نیک دلی کے ساتھ پابندی کرتے ہوں۔ اگر کوئی فریق اس معاہدے کے پردے میں غداری اور خیانت کی تدابیر کر رہا ہو اور حملے اور شرانگیزیوں کی تیاری کر رہا ہو تو اسلامی مملکت کے سربراہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان معاہدوں کو علی الاعلان منسوخ کر دے اور اس کی اطلاع فریق مخالف کو بھی دے دے اور پھر اس کا اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے اس قسم کے خائنوں اور غداروں پر ضرب لگائے اور یہ ضرب اس قدر شدید ہو اور اس قدر سبق آموز ہو کہ کوئی کینہ پرور کھلے طور پر یا خفیہ طور پر اسلامی مملکت کے خلاف کسی قسم کی کاروائی کی جراءت بھی نہ کر سکے۔ رہے وہ لوگ جو اسلامی محاذ سے دوستی کا معاہدہ کر لیں اور پھر دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ بنیں یا یہ کہ وہ ہر شخص تک دعوت اسلامی کے پہنچنے میں مزاحم نہ ہوں تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار

حاصل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کرے اور جب تک ان سے کسی بدنیتی کا ظہور نہ ہو وہ ان کے ساتھ عہد پر قائم رہے۔

پڑوسی مملکتوں کے درمیان عملی حالات کا یہ ایک عملی ضابطہ ہے۔ یہ ضابطہ باہم تعلقات کو اس وقت تک ختم نہیں کرتا جب تک اسلامی مملکت کے پڑوسی ممالک دعوت اسلامی کے پھیلاؤ کی راہ میں کوئی مادی رکاوٹ کھڑی نہیں کر دیتے اور لوگوں کے کانوں تک اسلام کی تبلیغ کی رسائی کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تحفظ بھی دیا جاتا ہے کہ یہ معاہدے دشمن کے لئے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سبب نہ بن جائیں اور ان معاہدوں کے پس پردہ یہ لوگ اسلامی مملکت پر اچانک اور غدارانہ ضرب لگانے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔

وہ عملی حالات کیا تھے جن میں یہ ہدایات نازل ہوئیں۔ جب امت مسلمہ ہجرت کر کے مدینہ کو گئی تو اس وقت وہاں مسلمانوں کو جو حالات درپیش تھے ان کی تلخیص امام ابن قیم نے زاد المعاد میں یوں کی ہے: ''جب حضور ؐ مدینہ تشریف لائے تو ان کے اور کفار کے درمیان تین قسم کے تعلقات تھے۔ ایک قسم کے لوگ وہ تھے جنہوں نے حضور ؐ کے ساتھ مصالحت کی اور وعدہ کیا کہ وہ آپ ؐ کی مخالفت نہ کریں گے۔ آپ ؐ کے ساتھ جنگ نہ کریں گے نہ آپ ؐ کے دشمنوں کے ساتھ موالات کریں گے اور امداد دیں گے اور وہ اپنے کفریہ نظریات پر قائم رہیں گے اور پرامن رہیں گے۔ ان کا خون اور مال محفوظ ہو گا۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو آپ کے دشمن اور محارب تھے اور تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جنہوں نے نہ تو عہد کیا اور نہ ہی آپ کے ساتھ جنگ کی بلکہ وہ انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ان لوگوں میں سے بعض تو ایسے تھے جو آپ کی کامیابی کے دل سے خواہاں تھے اور بعض ایسے تھے جو آپ کے دشمنوں کی کامیابی اور فتح چاہتے تھے۔ اور بعض ایسے تھے جو مسلمانوں کی صفوں میں بظاہر شریک ہو گئے تھے لیکن فی الباطن وہ دشمنوں کے ساتھ تھے۔ یہ منافقین تھے' تو حضور ؐ نے ان لوگوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جس کا رب تعالیٰ نے حکم دیا۔

جن لوگوں نے آپ کے ساتھ عہد امن کیا اور وعدہ کیا وہ مدینہ کے ارد گرد رہنے والے تین یہودی قبائل تھے۔ بنی قینقاع' بنو النضیر اور بنو قریظہ اور ان کے علاوہ بعض مشرک قبائل بھی تھے جو مدینہ کے ارد گرد بستے تھے۔

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات وقتی حالات تھے اور عملی حالات تھے' جو مسلمانوں کو درپیش تھے۔ اور اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کے مستقل بین الاقوامی ضوابط نہ تھے۔ کیونکہ بعد میں ان کے اندر ترمیمات کی گئیں۔ اور سورت برات میں جو احکام وارد ہوئے وہ آخری احکام تھے۔

بین الاقوامی تعلقات جن مراحل سے گزرے ان کا ذکر ہم نے امام ابن القیم کی کتاب زاد المعاد سے پارۂ نہم میں نقل کیا تھا۔ یہاں مناسب ہے کہ دوبارہ وہ اقتباس دے دیا جائے۔

''بعثت سے لے کر وفات تک کفار اور منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل'' اس عنوان کے تحت آپ رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کی طرف یہ وحی نازل کی کہ ''آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیں' یوں ہوا آپ ؐ کی نبوت کا آغاز' اس وقت جو حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ اپنے دل میں پڑھیں ابھی آپ کو تبلیغ کا حکم نہ ملا تھا' کچھ

عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی یٰاَیُّھَا الْمُدَثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی اقراء سے آپ کو نبوت ملی اور یٰاَیُّھَا الْمُدَثِّرْ سے آپ کو منصب رسالت عطا ہوا اور حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں' رشتہ داروں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو انجام بد سے ڈرایا۔ قوم کے بعد مکہ مکرمہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے قبائل کو تبلیغ کی۔ اس کے بعد یہ پیغام پوری عرب دنیا تک عام کر دیا گیا اور بالاخر اس دعوت کو بین الاقوامی دعوت بنا دیا گیا۔

دعوت اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کئی سال تک صرف وعظ اور تبلیغ کرتے رہے اور طاقت کا استعمال نہ کیا۔ بلکہ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صبر اور درگزر سے کام لیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں۔ ایک عرصہ بعد آپ کو ہجرت کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی دشمنوں سے لڑنے کی بھی اجازت دی گئی تاہم یہ اجازت اس حد تک تھی کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو لڑنے کے لئے میدان میں اتر آئیں اور دوسروں سے نہ لڑا جائے اور سب سے آخر میں یہ حکم دیا گیا کہ کفار اور مشرکین سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہو جاتا۔ لِیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ جس وقت آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا اس وقت حضور ؐ اور کفار کے درمیان تعلقات کی صرف تین شکلیں تھیں۔ اہل صلح' اہل حرب اور اہل ذمہ۔ اہل صلح یعنی جن کے ساتھ امن کے معاہدات ہوئے تھے ان کے بارے میں حکم ہوا کہ عہد کو آخر تک نبھایا جائے' لیکن صرف اس صورت میں کہ جانب مخالف اپنے معاہدے کا پابند ہو اور اگر وہ عہد شکنی اور غداری کریں تو آپ بھی معاہدہ ان کے منہ پر دے ماریں' البتہ ایسے لوگوں کے ساتھ عملاً جنگ اس وقت تک نہ چھیڑی جائے جب تک انہیں باقاعدہ اطلاع نہ دے دی جائے کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ جب سورۂ براءۃ نازل ہوئی تو ان تمام اقسام کے احکام علیحدہ علیحدہ بیان ہوئے' اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے اس وقت تک لڑیں کہ یا وہ جزیہ قبول کریں اور یا اسلام میں داخل ہو جائیں اور مشرکین اور منافقین سے بھی جہاد کا حکم دیا گیا۔ نیز منافقین سے مزید سختی برتنے کا حکم دیا گیا۔ کفار کے ساتھ آپ کا جہاد مسلح جنگ کی شکل میں تھا اور منافقین کے ساتھ زبان اور دلیل سے۔

سورہ براءۃ میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ کفار کے ساتھ کئے ہوئے تمام معاہدات کو ختم کر دیا جائے اور علی الاعلان ان سے براءت کا اظہار کر دیا جائے۔ اس اعلان کے بعد اہل عہد کی تین اقسام قرار پائیں' وہ جن کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور اپنے عہد پر قائم نہیں رہے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ حضور ؐ نے جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ عہد تھا اور وہ اسے نبھاتے بھی رہے۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے اسے مقررہ مدت تک برقرار رکھا جائے اور شرائط کی پابندی کی جائے۔ تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی کہ جن کے ساتھ اگرچہ معاہدہ تو نہ تھا لیکن یہ لوگ آپ کے خلاف کسی جنگ میں بھی شریک نہ ہوئے تھے' یا ان کے ساتھ تعین مدت کے بغیر معاہدہ طے پا گیا تھا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس کے بعد کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا۔ یا مسلمان ہو جاؤ ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

چنانچہ انہی ہدایات کے مطابق آپ نے عہد شکنوں کے ساتھ جنگ کی' اور جن کے ساتھ کوئی عہد نہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی اور راست باز معاہدین کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اور ایسے تمام لوگ معاہدہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے

ہی اہل ایمان اور مسلمانوں کا جزو بن گئے اور اہل ذمہ پر جزیہ عائد ہوا۔

جیسا کہ کہا گیا سورۂ براءت کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کے تعلقات تین قسم کے رہ گئے تھے یعنی محارب ' اہل ذمہ اور اہل عہد' اور چونکہ اہل عہد سب کے سب اسلام میں داخل ہو گئے تھے ' اس لئے صرف اہل ذمہ اور اہل حرب ہی باقی رہ گئے۔ اہل حرب کی حالت یہ رہتی تھی کہ آپ کے دور میں وہ ہمیشہ آپ سے خائف رہتے تھے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں حضورؐ اور تمام انسانوں کے تعلقات کی نوعیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ ان میں سے بعض مسلم اور مومن تھے۔ بعض آمن اور مسالم تھے اور بعض آپ سے خائف اور محارب تھے۔

منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ ان کے اعلان سلام کو قبول فرمائیں اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیں اور ان کے مقابلے میں علم و استدلال کے ہتھیار ہی استعمال کریں اور ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اختیار کریں اور ان سے سختی برتیں اور ان کی نفسی کیفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ارشادات عالیہ سے ان کی اصلاح کی سعی کریں۔ ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں اور نہ حضور ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کریں اور یہ کہ اگر آپ ان کے لئے دعائے مغفرت مانگ بھی لیں تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ تھا مختصر بیان حضورؐ کے طرز عمل کا اپنے کفار اور منافق دشمنوں کے ساتھ۔"

اس تلخیص کے مطالعہ ' واقعات سیر کے مطالعہ اور ان آیات کے شان نزول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں سورت انفال نازل ہوئی وہ حالات ' مدینہ کے ابتدائی حالات اور سورت توبہ میں پیش کردہ آخری حالات کے درمیان ایک عبوری مرحلہ تھا۔ لہٰذا ان تاریخی مراحل کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان آیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ اگرچہ ان میں بعض حتمی اصول بھی موجود ہیں لیکن یہ آخری شکل میں نہیں۔ ان کو آخری شکل سورت توبہ میں دی گئی اور عملی طور پر ان اصولوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے آخری ایام میں نافذ کیا گیا۔

ابن قیم کے اس تفصیلی بیان کی روشنی میں اب ہم ان نصوص قرآنی کی تشریح کرتے ہیں:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۵۵) الَّذِينَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُونَ (۵٦) (۸: ۵۵ – ۵٦)

"یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والی مخلوق میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر کسی طرح وہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ (خصوصاً) ان میں سے وہ لوگ جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ ہر موقع پر اس کو توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔"

لفظ دواب کا اطلاق اگرچہ لغوی طور پر ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو زمین پر چلتی پھرتی ہیں۔ لہٰذا انسان پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے ' لیکن جب اس کا اطلاق انسانوں پر کیا جائے تو اس وقت بات کو ایک خاص رنگ دینا بھی مطلوب ہوتا ہے۔ یعنی انسانیت کو حیوانیت کا رنگ اور شیڈ دینا مطلوب ہوتا ہے۔ اس طرح جن انسانوں پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے ' ان کے بارے میں یہ تاثر دے دیا جاتا ہے کہ وہ بدترین بہائم ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کی روش اختیار کر لی ہے اور ان کے حالات ان کو یہاں تک لے آئے ہیں کہ اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کی

خصوصیت یہ ہے کہ یہ عہد کو توڑتے ہیں اور اللہ سے نہیں ڈرتے۔

اس آیت سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس کے بارے میں متعدد روایات وارد ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ بنو قریظہ ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بنو نضیر ہیں۔ بعض روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ بنو قینقاع ہیں۔ بعض میں یہ کہا گیا کہ اس سے وہ عرب مراد ہیں جو مدینہ کے ارد گرد رہتے تھے۔ اس آیت کے الفاظ اور تاریخی واقعات دونوں بتاتے ہیں کہ اس سے مراد یہ سب لوگ ہو سکتے ہیں کیونکہ یہودیوں میں سے ہر گروہ نے اپنی اپنی جگہ حضور کے ساتھ عہد شکنی کی۔ اور مدینہ کے ارد گرد مشرکین نے بھی بار بار عہد شکنی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں بدر سے پہلے اور بعد میں پیش ہونے والے سب واقعات پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن جو حکم دیا گیا ہے وہ قیامت تک کے لئے ہے اور ان تمام لوگوں پر اور تمام حالات پر صادق ہو گا جو قیامت تک اسی نہج پر پیش آئیں گے۔

یہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی یہ لوگ کفر میں دور تک چلے گئے ہیں اور انہوں نے ایسی روش اختیار کی ہے کہ اب ان کے ایمان کا کوئی امکان نہیں رہا ہے۔ اس طرح ان کی فطرت میں بگاڑ داخل ہو گیا ہے۔ اور وہ جانوروں میں سے بدترین جانور بن گئے۔ ان لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ یہ جو عہد بھی کرتے ہیں اسے توڑتے ہیں۔ تو اس طرح وہ انسانیت کے ایک اہم خاصہ یعنی وفائے عہد سے پاک ہو گئے ہیں' یہ ہر قید و بند سے اس طرح آزاد ہو گئے ہیں جس طرح بہائم آزاد ہوتے ہیں' اگرچہ بہائم تو اپنے فطری ضابطے کے اندر جکڑے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے چونکہ کوئی جبری فطری ضابطہ نہیں اس لئے وہ اللہ کے نزدیک بہائم سے بھی بدتر مخلوق تصور ہوتے ہیں۔

ایسے لوگ کہ جن کے عہد و پیمان پر کوئی مطمئن نہ ہو اور ان کی ہمسائیگی محفوظ نہ ہو۔ ان کے لئے یہی موزوں جزاء و سزا ہے کہ ان کو امن و اطمینان سے محروم کر دیا جائے۔ جس طرح خود انہوں نے دوسرے لوگوں کو امن سے محروم کر دیا ہے۔ ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو خوفزدہ کر دیا جائے' علاقے سے نکال دیا جائے اور ان کے ہاتھ توڑ کر رکھ دیئے جائیں۔ ان پر ایسی ضرب لگائی جائے کہ نہ صرف وہ خوفزدہ ہو جائیں بلکہ ان کے پیچھے رہنے والے تمام لوگوں کے لئے یہ ضرب عبرت بن جائے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ حکم ہے۔ اسی طرح آپ کے بعد کے آنے والوں کے لئے بھی یہی حکم ہے۔ اگر ان کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے تو وہ یہی رویہ اختیار کریں۔

فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ (۸:۵۷)

"پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے۔"

یہ ایک عجیب انداز کلام ہے۔ اس میں ایک خوفناک گرفت اور ہولناک رعب و دبدبہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے سنتے ہی انسان بھاگنے اور اپنا مقام چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ حال تو ان لوگوں کا ہو جائے گا جو سنیں اور دیکھیں۔ رہے وہ لوگ جن کو یہ سزا دی جائے تو ان کی حالت تو معلوم ہے کہ کیا ہو گی؟ یہ وہ ضرب ہے جس کا حکم اللہ نے اپنے رسول ؐ کو دیا ہے اور خوفناک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کے لئے عبرتناک بھی ہے جنہوں نے نقض عہد نہ کی ہو' جنہوں نے انسانی قواعد و ضوابط کو چھوڑ دیا ہو۔ یہ ہدایات اس لئے دی گئیں تاکہ اسلامی محاذ امن

کا سانس لے اور اس کی ہیبت کی وجہ سے خارجی قوتیں ' جو بھی ہوں ' اس قدر سہم جائیں کہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں خواہ وہ قریب کی ہوں یا دور کی ہوں۔

اسلامی نظام حیات کا یہ مزاج ہے اور اسلامی تحریک کے ذہن میں اسے اچھی طرح بیٹھ جانا چاہئے کہ اس دین کے لئے ہیبت اور رعب ضروری ہے ' اس کے لئے قوت ضروری ہے۔ اس کے لئے خوفناک شان لازی ہے اور یہ ضروری ہے کہ ان طاغوتی قوتوں کو مرعوب کر دیا جائے تاکہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں ' اس لئے کہ اسلام پورے کرۂ ارض پر انسانوں کی آزادی کا علمبردار ہے اور وہ انسان کو ہر طاغوتی قوت سے نجات دینا چاہتا ہے ' جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس دین کا طریق کار یہ ہے کہ محض دعوت و تبلیغ سے کام لیا جائے اور ان مادی رکاوٹوں کو نہ چھیڑا جائے جو طاغوت نے کھڑی کر دی ہیں ' وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس دین کے مزاج کو بالکل نہیں سمجھا ہے۔

یہ تو تھا پہلا حکم ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے عمداً نقض عہد کا ارتکاب کر لیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ان کی ایسی خبر لی جائے اور ان پر ایسی فیصلہ کن ضرب لگائی جائے کہ ان کے لئے اور ان کے بعد دوسرے دیکھنے سننے والوں کے لئے عبرت ہو اور ان کے کیمپوں میں خوف طاری کر دے۔

دوسرا حکم ان لوگوں کے بارے میں ہے جس سے نقض عہد کی علامات کا ظہور ہو چکا ہو اور یہ توقع پیدا ہو گئی ہو کہ وہ جلد ہی نقض عہد کا ارتکاب کریں گے۔ اور یہ علامات واضح ہوں تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ حکم ہے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

(۸ : ۵۸) "اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو ' یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔" اسلام معاہدہ اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے ' جب فریق دوم عمل کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو وہ اس عہد کو منسوخ کرنے کا اعلان اس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور علانیہ اس کو ختم کر دیتا ہے۔ خیانت اور غداری کا اسلام قائل نہیں ہے۔ دھوکے اور چالبازی کا بھی اسلام روادار نہیں ہے۔ اسلام فریق دوم کو علانیہ ہبانگ دہل کہتا ہے کہ اس نے اس عہد کو منسوخ کر دیا ہے لہٰذا اب کوئی فریق بھی اس عہد کے مشمولات کا پابند نہیں ہے۔ اس طرح اسلام انسانیت ' شرف اور ثابت قدمی کا مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے اور امن و اطمینان کا وسیع دائرہ عطا کرتا ہے۔ اسلام یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ شب خون اور وعدہ خلافی کر کے ایسے لوگوں پر حملہ کر دے جو عہد و میثاق کی بنا پر مطمئن بیٹھے ہوں اور ان کو یہ نوٹس نہ ہو کہ حملہ آور فریق نے عہد ختم کر دیا ہے۔ اسی طرح اسلام ایسے لوگوں کو خوفزدہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ جنہوں نے احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی ہوں اور جن سے اسلام کو صرف خیانت کا خطرہ درپیش ہو ' ہاں عہد کے ختم کر دیئے جانے کے بعد جنگ کے دوران چالیں چلی جا سکتی ہیں کہ جنگ کے دوران جنگی چالیں جائز ہیں کیونکہ دشمن کو نوٹس مل گیا ہے۔ اس نے احتیاطی تدابیر اختیار کر لی ہیں۔ اب اگر اس کے خلاف کوئی جنگی چال چلی جاتی ہے تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ غافل ہے اور غافلوں کے خلاف اگر کوئی جنگی چال چلی جاتی ہے تو وہ غداری نہیں ہے۔

اسلام انسانیت کی سطح کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسانیت آلودگیوں سے پاک ہو۔ لہٰذا غلبے کے لئے غداری کو اسلام جائز نہیں سمجھتا۔ جبکہ وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے جدوجہد کر رہا ہو ' کیونکہ اعلیٰ مقاصد کے لئے شریفانہ اسلوب

اختیار کرنا ضروری ہے۔

اسلام خیانت کے سخت خلاف ہے۔ اور وہ ان لوگوں کو بہت ہی حقیر سمجھتا ہے جو نقض عہد کے مرتکب ہوئے ہیں لہٰذا اسلام اپنے پیرو کاروں کو عہد میں خیانت کی اجازت نہیں دیتا۔ اگرچہ جن اہداف و غایات کے لئے یہ حرکت کی جا رہی ہو' وہ بہت ہی بلند ہوں۔ نفس انسانی کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ ایک بار انسان حقیر اور خسیس طریقے کرنا شروع کر دے وہ کبھی بھی اعلیٰ اور شریفانہ طرز عمل اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اچھے مقاصد کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے کو جائز سمجھتا ہو۔ لہٰذا یہ اصول اسلامی سوچ اور اسلامی شعور کے لئے بالکل اجنبی ہے کیونکہ اسلامی ذہنیت میں مقاصد اور وسائل کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے' کیونکہ ایک مسلمان اگر پاک و صاف جگہ پر پہنچنا چاہتا ہے تو وہ گندے کیچڑ سے ہو کر نہ گزرے گا کیونکہ ان کے گندے پاؤں صاف جگہ کو بھی گندا کر دیں گے۔ اگر کوئی اسے جائز سمجھتا ہے تو وہ خائن ہے اور اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (۸: ۵۸) ہمیں یہاں ذرا یہ غور کرنا چاہئے کہ جن حالات میں یہ احکام نازل ہو رہے تھے۔ ان حالات میں انسانیت کا مقام کیا تھا۔ ان میں انسانیت کے سامنے اس قدر بلند نصب العین نہ تھا۔ اس دور میں باہم لڑنے والے جنگل کے قانون پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس وقت ڈنڈے کا قانون چل رہا تھا اور ڈنڈے اور لوٹ پر کوئی قید و بند نہ تھا اور اس وقت سے لے کر اٹھارہویں صدی تک دنیا میں یہی جنگل کا قانون مروج رہا ہے اور یورپ تو خصوصاً اس قدر اندھیرے میں تھا کہ اسے اس وقت تک قانون بین الاقوام کا علم ہی نہ تھا۔ یہ روشنی اس نے اس وقت حاصل کی تھی جب اس کا واسطہ اسلامی ممالک سے پڑا اور آج تک بین الاقوامی معاملات میں یورپ اس مقام تک نہیں پہنچ سکا جس تک اسلامی نظام ایک جست میں پہنچا۔ حالانکہ یورپ نے کم از کم بین الاقوامی قانون کا نام سن لیا تھا۔ جو لوگ آج یورپ کی صنعتی ترقی سے مرعوب ہیں ان کو اس موضوع پر غور کرنا چاہئے اور اسلام کے بین الاقوامی قانون اور دور جدید کے قانونی نظاموں کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوں۔

ان ہدایات اور صاف ستھری پالیسی کے نتیجے میں اللہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو فتح و سرخروئی حاصل ہو گی اور یہ کہ ان کے لئے کفار کی قوت کا مقابلہ بہت ہی آسان ہو جائے گا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۸: ۵۹) "منکرین حق اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے' یقیناً وہ ہم کو ہرا نہیں سکتے۔" ان لوگوں کے خفیہ مشورے اور بدعہدی کے ارتکاب کے بارے میں منصوبے ان کو کامیاب اور مسلمانوں پر برتری عطا نہ کر سکیں گے کیونکہ اللہ مسلمانوں کی پشت پر ہے۔ اور خائن لوگ اللہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ کفار کو جب اللہ پکڑنا چاہے تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور جب اللہ مسلمانوں کی مدد کرنا چاہے تو یہ ان کو شکست نہیں دے سکتے۔

اس لئے وہ لوگ جو اچھے مقاصد کے لئے اچھے ذرائع اختیار کرتے ہیں' اگر ان کی نیت درست ہے تو انہیں مطمئن رہنا چاہئے کہ اوچھے ہتھیار استعمال کرنے والے ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس لئے کہ انہیں اللہ کی امداد حاصل ہے اور وہ اس کرۂ ارض پر سنت الٰہی قائم کرنا چاہتے ہیں' وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ اللہ

کا نام لے کر چلتے ہیں اور ان کا نصب العین یہ ہے کہ لوگوں کو تمام غلامیوں سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور غلامی میں داخل کر دیں اور اس میں اللہ کے ساتھ کوئی بھی شریک نہ ہو۔

لیکن اسلام یہ حکم بھی دیتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے دائرہ قوت کے اندر جو بھی ہو سکے وہ جائز ذرائع اختیار کرے اور تیاری کرے 'اگرچہ ان کو یہ اطمینان ہے کہ انہیں نصرت خداوندی حاصل ہے 'تاہم پھر بھی ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی تیاری مکمل رکھیں اور وہ وسائل فراہم کریں جن کو انسانی فطرت جانتی ہے اور جو انسانوں کے تجربے کے اندر ہیں ' اسلام ان لوگوں کو عالم بالا کی نصرت کی طرف دیکھنے کا مشورہ اس وقت دیتا ہے جب وہ ظاہری اعتبار سے اپنی مکمل تیاری کر لیں اور حقیقت پسندانہ جدوجہد کے لئے تیار ہوں تاکہ وہ اعلیٰ اہداف حاصل کئے جا سکتے ہوں جو اسلام کے پیش نظر ہیں۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۸ : ۶۰)

"اور تم لوگ ' جہاں تک تمہارا بس چلے ' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔

اپنی قوت اور مقدرت کے مطابق تیاری کرنا فریضہ جہاد کے ساتھ ساتھ ضروری ہے۔ یہ آیت حکم دیتی ہے مسلمانوں کو مختلف قسم کی جنگی تیاریاں اور سازوسامان فراہم رکھنا چاہئے اور یہاں خصوصاً تیار بندھے رہنے والے گھوڑوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اس وقت کے جنگی سامان کا اہم حصہ تھے 'جس وقت قرآن کریم نازل ہو رہا تھا۔ اگر قرآن کریم اس وقت گھوڑوں کے بجائے موجودہ دور کے سازوسامان کی تیاری کا حکم دیتا تو یہ ایک نامعلوم اور حیران کن سازوسامان کا حکم ہوتا اور وہ سن کر ہی حیران ہو جاتے۔ اس لئے اللہ نے لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق بات کی اور اللہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی بات کرے جسے مخاطب سمجھ ہی نہ سکیں۔ مناسب بات یہی ہے ' عام حکم دیا جائے اور وہ یہ ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (۸ : ۶۰)

"اور تم جہاں تک تمہارا بس چلے ' زیادہ سے زیادہ طاقت تیار رکھو۔" اسلام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ضروری قوت موجود ہو اور وہ اس قوت کے بل بوتے پر آگے بڑھے اور تمام انسانوں کو تمام غلامیوں سے رہا کرائے۔ چنانچہ اس قوت کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس قدر آزاد کرا دے کہ وہ کوئی بھی نظریہ قبول کرنے میں آزاد ہوں۔ انہیں کوئی روکنے والا نہ ہو اور نہ دنیا میں ایسی قوت ہو کہ کسی کو کسی مخصوص عقیدے کے اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہو۔ دوسرا فریضہ یہ ہے کہ یہ قوت دین اسلام کے دشمنوں کو اس قدر خوفزدہ کر دے کہ وہ اسلامی قوت کے

مرکز دارالاسلام پر حملے کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں ۔ اور تیسرا فریضہ یہ ہے کہ دین اسلام کے دشمنوں کو اس قدر مرعوب کر دیا جائے کہ وہ اسلام کی راہ روکنے کے بارے میں کسی بھی وقت نہ سوچیں ۔ تاکہ اسلامی تحریک اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کو آزاد کر سکے ۔ اور چوتھا فریضہ یہ ہے کہ یہ اسلامی قوت ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دے جو اللہ کے مقابلے میں اپنی حاکمیت قائم کرتی ہیں اور لوگوں پر اللہ کے مقابلے میں اپنی حاکمیت اور اپنا قانون جاری کرتی ہیں اور وہ یہ اعتراف نہیں کرتیں کہ حق حاکمیت صرف اللہ کو حاصل ہے ۔ کیونکہ وہی اللہ ہے ' وحدہ لاشریک ۔

اسلام کوئی لاہوتی نظام نہیں ہے جس کا تعلق صرف عقائد و نظریات سے ہو ' یا وہ کچھ مراسم عبودیت میں دخیل ہو اور آگے بس اس کا کام ختم ہو ۔ بلکہ اسلام پوری زندگی کا ایک عملی نظام ہے اور وہ تمام دوسرے نظاموں کے مقابلے میں آکر کھڑا ہوتا ہے اور وہ ان تمام قوتوں سے بر سرپیکار ہو جاتا ہے جو ان باطل نظاموں کی پشت پر کھڑی ہوتی ہیں ۔ لہٰذا اس کے سوا اسلام کے لئے اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی راہ میں حائل ہونے والی تمام قوتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دے کیونکہ یہ قوتیں اسلام کی راہ روکتی ہیں اور اسے قائم ہونے نہیں دیتیں بلکہ یہ قوتیں اسلام کے بالمقابل دوسرے نظام قائم کرتی ہیں ۔

اس عظیم حقیقت کے اعلان کے وقت کسی بھی مسلمان کو شف شف نہیں کرنا چاہئے اور نہ جلدی جلدی سرسری بات کرنا چاہئے کہ کوئی سمجھ بھی نہ سکے ۔ پھر اس حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں کو شرم بھی محسوس نہ کرنا چاہئے بلکہ انہیں اس حقیقت کا اعلان سر اٹھا کر کرنا چاہئے اور یہ کہنا چاہئے کہ یہ دراصل انسان کی آزادی کی تحریک ہے اور وہ اس کا علمبردار ہے ۔ یہ کسی انسانی نظام حیات کا علمبردار نہیں ہے ' نہ کسی لیڈر کی حکومت کا قیام چاہتا ہے ۔ نہ کسی طبقے کی نسلی گروہ اور فرقے کی حکومت چاہتا ہے ۔ اس کا نصب العین یہ نہیں ہے کہ وہ مزارعین کو غلام بنائے تاکہ وہ جاگیرداروں کی خدمت کریں جیسا کہ رومی تہذیب والوں کا مقصد تھا ' اور اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ دنیا پر قبضہ کر کے تمام دنیا کے خام مال پر قبضہ کیا جائے اور اپنی صنعتوں کو فیڈ کیا جائے جس طرح مغربی استعمار کا یہ مقصد تھا اور نہ وہ اس لئے اٹھا ہے کہ کسی علاقے میں کسی پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ قائم کر کے دوسرے لوگوں کو مویشیوں کی طرح غلام بنا دے جیسا کہ نظام اشتراکیت میں تھا ۔ یہ تو علیم و خبیر اور حکیم و بصیر کے اقتدار اعلیٰ کے قیام کا علمبردار ہے ۔ وہ اللہ کی حاکمیت کا قیام چاہتا ہے اور دنیا میں تمام انسانوں کو تمام غلامیوں سے نجات دینا چاہتا ہے ۔ اس طرح کہ کوئی بندہ کسی بندے کا غلام نہ ہو ۔

یہ ہے وہ عظیم حقیقت جسے شکست خوردہ ذہنیت کے مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے ' جو دین اسلام اور نظام اسلامی کی بے جا مدافعت کرتے ہیں اور اس مدافعت میں بھی وہ محض شف شف کرتے ہیں اور کوئی بات صاف ستھری اور واضح نہیں کر سکتے اور اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے عذر لنگ تلاش کرتے ہیں ۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کا قیمتی رسالہ الجہاد فی الاسلام) نیز ہم نے سورت انفال کے مقدمے میں اسلام کے نظریہ جہاد پر جو تفصیلی بحث کی ہے اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے ۔

پھر اس آیت میں ہمیں جس حد تک تیاری کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی حدود کا بھی ہمیں اچھی طرح علم ہونا چاہئے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ (۸ : ۶۰)

یعنی جس قدر تمہاری استطاعت میں ہو یعنی تیاری میں اپنی پوری قوت صرف کر دو ' یعنی جنگ اور فتح کے تمام

وسائل فراہم کیے جائیں یعنی ممکن حد تک۔

پھر اس آیت میں اس تیاری کی غرض و غایت بھی بتا دی گئی ہے کہ اس کی غرض یہ ہے تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (۸ : ۶۰)

"تاکہ اس کے ذریعے تم اپنے دشمنوں اور اللہ کے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوفزدہ کر سکو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ یعنی اس تیاری کے مقاصد یہ ہیں کہ اس سے تمہارے دشمن جو اللہ کے دشمن ہیں' خوفزدہ ہو جائیں۔ ان میں وہ ظاہری دشمن بھی شامل ہیں جن کو مسلمان جانتے ہیں اور کچھ ان کی پشت پر دشمن طاقتیں ہیں جن کا علم مسلمانوں کو تو نہیں ہے لیکن اللہ کو ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی دشمنی کا اظہار نہیں کیا ہے اور اللہ ان کے دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔ ان لوگوں کو اسلام کی قوت مرعوب کر دے گی۔ اگرچہ ابھی ان کو مسلمانوں کی جنگی قوت عملاً نہ پہنچی ہو۔ غرض مسلمانوں پر یہ بات فرض ہے کہ وہ صاحب قوت ہوں اور ان پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کی حد تک قوت جمع کریں تاکہ وہ زمین کے تمام لوگوں کے لئے باعث خوف ہوں اور یہ اس لئے کہ دنیا پر اللہ کا کلمہ بلند ہو اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔

اب جنگی تیاریوں کے لئے چونکہ اخراجات ہوں گے اور تھے۔ پھر اس وقت اسلامی معاشرہ صرف باہم تکافل پر چل رہا تھا۔ لہٰذا جنگی تیاریوں کے حکم کے ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں اپنی دولت کو خرچ کرو۔ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (۸ : ۶۰)

"اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ پورے کا پورا تمہیں مل جائے گا اور تم پر ظلم نہ ہو گا۔" اس طرح اسلام جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کو تمام دنیاوی اغراض و مقاصد سے پاک کر دیتا ہے۔ ان مقاصد کو ذاتی خواہشات سے بلند کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی قومی' طبقاتی اور وطنی شعور اور جذبات سے انہیں جدا کر دیتا ہے تاکہ وہ محض فی سبیل اللہ ہوں اور اللہ کی رضامندی کے لئے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام آغاز ہی سے ان تمام جنگوں کی ممانعت کر دیتا ہے جو بعض اشخاص کی برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں' یا بعض حکومتوں کی برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں یا منڈیوں پر قبضے کے لئے لڑی جاتی ہیں یا لوگوں پر غالب ہونے اور انہیں ذلیل کرنے کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ یا ایک ملک کی دوسرے ملک پر برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں' یا ایک قوم کی دوسری قوم پر برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں یا ایک نسل کی برتری کے لئے یا ایک طبقے کی دوسرے طبقات پر برتری کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ اسلام صرف ایک جنگ کی اجازت دیتا ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اور اللہ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی نسل دوسری نسلوں' یا کوئی وطن دوسرے اوطان پر یا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقات پر' یا فرد دوسرے افراد پر یا کوئی دوسری قوم دوسری اقوام پر غالب ہو کر اپنی حاکمیت' اپنی حکومت اور اپنا اقتدار اعلیٰ کو قائم کرے۔ وہ تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی حاکمیت دنیا میں قائم ہو تاکہ دنیا میں خیر' برکت' آزادی اور شرافت کا دور دورہ ہو۔ اور یہ صرف اللہ کی حاکمیت کے زیر سایہ ہو سکتا ہے۔

ان آیات میں تیسرا حکم ان اقوام کے بارے میں ہے جو اسلامی کیمپ کے ساتھ دوستی اور امن کا عہد کرنا چاہتے ہیں

اور امن و سلامتی کی طرف مائل ہیں اور ان کے ظاہری حالات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ یہ لوگ فی الواقعہ امن چاہتے ہیں۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۸ : ۶۱) "اور اے نبی "اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" یہاں امن کی طرف میلان کی حقیقت کو "جنوح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک لطیف انداز تعبیر ہے۔ یعنی پرندے پر امن اور آشتی کی طرف مائل ہیں اور پرندہ اپنے پروں کو نرم کر رہا ہے اور حالت امن اور مصالحت اور موانست کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر مصالحت اور موادعت میں توکل علی اللہ کا حکم بھی دیا گیا ہے' جو سمیع اور علیم ہے۔ وہ ہر بات کو سنتا ہے اور پوشیدہ ارادوں کو دیکھ سکتا ہے اور اللہ پر توکل ایک بہت بڑا ضامن ہے۔

اب ہم ذرا واپس اس تلخیص کی طرف جاتے ہیں جو امام ابن قیم نے اسلامی مملکت کے خارجی تعلقات کے سلسلے میں پیش کی تھی کہ مدینہ کے ابتدائی دور میں حضور ؐ کے تعلقات کفار کے ساتھ کیا تھے یعنی جنگ بدر اور ان احکام کے نزول تک۔ تو اس تلخیص سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گروہ کا تعلق اس طبقے سے ہے جن کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسالمت اختیار کر لی تھی اور اس کے ساتھ جہاد و قتال نہ کیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ حضور ؐ کے ساتھ صلح پر مائل تھے۔ اور انہوں نے دشمنی کا اظہار نہ کیا تھا۔ اور نہ ہی دعوت اسلامی کی راہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ نہ وہ اسلامی مملکت کے خلاف کوئی کاروائی کرتے تھے۔ اللہ نے رسول اللہ کو حکم دے دیا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان کی روش مصالحت اور امن کو قبول کر لیا جائے۔ (یہ حکم اس وقت تک تھا کہ جب سورت برائت نازل ہوئی اور جن لوگوں کے ساتھ بے قاعدہ معاہدہ نہ تھا ان لوگوں کو ایک متعین مہلت دے دی گئی یا ان لوگوں کے ساتھ عہد تھا مگر اس میں وقت کا تعین نہ کیا گیا تھا اور یہ مدت چار ماہ مقرر کر دی گئی تھی اور اس کے اختتام پر بھی تعلقات کا از سر نو تعین کیا گیا تھا)۔ لہذا مذکورہ بالا حکم انتہائی اور آخری حکم نہ تھا بلکہ وہ خاص حالات کے اندر مخصوص حکم تھا اور بعد میں آنے والے احکام نے اسے منسوخ کر دیا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میں تبدیلیاں کیں۔

ہاں یہ آیت اپنے وقت پر ایک عمومی حکم تھا اور سورت براءت کے نزول تک یہی حکم معمول بہ تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں ہونے والا صلح حدیبیہ بھی اس کی ایک مثال تھی۔

بعض فقہاء اس طرف گئے ہیں کہ یہ حکم فائنل اور حتمی ہے اور انہوں نے امن کی طرف میلان جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ وہ جزیہ ادا کرنے کو قبول کر لیں۔ لیکن یہ رائے تاریخی واقعات کے خلاف ہے۔ کیونکہ جزیہ کے احکام سورت براءت میں نازل ہوئے اور یہ سورت آٹھویں سن ہجری میں نازل ہوئی ہے اور زیر تفسیر آیت تو جنگ بدر کے بعد سن دوئم ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ اس وقت جزیہ کے احکام موجود نہ تھے۔ اسلامی نظام حیات کے تحریکی مزاج' واقعات نزول قرآن اور سیرت کے واقعات کو مدنظر رکھ کر اگر سوچا جائے تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ حکم فائنل نہیں ہے۔ اور اس میں سورت براءت میں نازل ہونے والے احکام کے ذریعہ تبدیلی اور ترمیم کی گئی ہے

اور جس میں دوسری اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کو یوں منضبط کیا گیا ہے کہ یا تو وہ اہل حرب ہوں گے اور مسلمانوں کے خلاف بر سرجنگ ہوں گے یا مسلمان ہوں گے اور اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے والے ہوں گے یا اہل ذمہ ہوں گے اور جزیہ ادا کرتے ہوں گے۔ اور وہ اس وقت تک اہل ذمہ رہیں گے جب وہ اپنے ذمی ہونے کے عہد پر قائم رہیں گے۔ یہ ہے وہ آخری نوعیت بین الاقوامی تعلقات کی جس پر اسلامی تحریک جہاد ختمی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اور کوئی صورت حالات موجود ہے تو وہ دراصل عملی صورت حالات ہے اور عملاً موجود ہے لیکن اسلامی نظام اس کی تبدیلی کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک مذکورہ بالا تین حالات متعین نہیں ہو جاتے جن کا ذکر سورت براءت میں ہوا اور جو آخری احکام ہیں اور یہ آخری احکام مسلم کی روایت میں موجود ہیں جس کی روایت امام احمد نے کی ہے۔

احمد روایت کرتے ہیں وکیع سے' سفیان سے' علقمہ ابن مرثد سے' سلیمان ابن زید سے' ان کے باپ سے' یزید ابن الخصیب اسلمی سے' یہ کہتے ہیں کہ جب حضور ؐ کسی کو لشکر بنا کر بھیجتے یا کسی دستے کا کپتان بنا کر بھیجتے تو اسے نصیحت کرتے کہ خدا خوفی اختیار کرنا اور اپنے ساتھی مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: "اللہ کے نام سے جہاد کرو' اللہ کی راہ میں کرو' ان لوگوں سے قتال کرو جنہوں نے اللہ کا انکار کیا اور جب تم مشرکوں میں سے اپنے دشمنوں کے ساتھ آمنا سامنا کرو تو انہیں دعوت دو کہ وہ تین پوزیشنوں میں سے کوئی ایک اختیار کریں۔ وہ ان میں سے جو پوزیشن بھی قبول کریں تم اسے منظور کر لو۔ اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ان کو اسلام کی دعوت دو' اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو قبول کر لو۔ پھر ان کو یہ دعوت دو کہ وہ اپنے علاقے سے مہاجرین کے علاقے میں آجائیں۔ اگر وہ یہ پوزیشن قبول کر لیں تو ان کے اور مہاجرین کے حقوق مساوی ہوں گے اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مہاجرین پر ہوں گی۔ اگر وہ انکار کریں اور اپنے ہی علاقے میں رہنا پسند کریں تو ان کو یہ اطلاع کر دو کہ ان کی حیثیت ان مسلمانوں کی طرح ہو گی جس طرح اعراب مسلمانوں کی ہے۔ ان پر بھی اللہ کے احکام جاری ہوں گے۔ جس طرح اعراب مسلمانوں پر ہوتے ہیں لیکن فے اور غنیمت میں ان کا حق نہ ہو گا الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں۔ اگر وہ اس پوزیشن کا بھی انکار کریں تو پھر ان کو یہ پیشکش کرو کہ وہ جزیہ دینا قبول کریں۔ اگر وہ قبول کر لیں تو تم بھی قبول کر لو' اور جنگ سے باز آ جاؤ' اور اگر وہ انکار کر دیں تو اللہ کی استعانت لیں اور قتال شروع کر دیں۔"

اس حدیث میں مشکل بات یہ ہے کہ اس میں ہجرت اور دارالمہاجرین کا ذکر ہے اور پھر جزیہ کا بھی ذکر ہے۔ جبکہ جزیہ فتح مکہ کے بعد فرض ہوا تھا اور فتح مکہ کے بعد ہجرت ختم ہو گئی تھی (یعنی پہلی جماعت مسلمہ جب مدینہ آئی اور فتح مکہ تک اسے استقلال حاصل ہو گیا تو ہجرت اس وقت ختم ہو گئی تھی) اور یہ بات احادیث اور تاریخ سے ثابت ہے کہ جزیہ آٹھویں سن ہجرت میں فرض ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عرب مشرک سے جزیہ نہیں لیا گیا۔ کیونکہ تمام عرب فرضیت جزیہ سے قبل ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ اس سن کے بعد مجوسیوں سے اور مشرکوں سے جزیہ لیا گیا اور اگر فرضیت جزیہ کے وقت عربوں میں کوئی مشرک ہوتا تو وہ بھی لازماً جزیہ ادا کرتا جیسا کہ امام ابن قیم نے تشریح کی۔ امام ابو حنیفہ اور ایک قول کے مطابق امام احمد کی رائے بھی یہی ہے۔ (قرطبی نے یہ قول امام اوزاعی' مالک سے بھی نقل کیا ہے۔)

بہرحال آیت زیر بحث وَاِنْ جَنَحُوْا ------ میں کسی فائنل حکم کا ذکر نہیں ہے۔ اور اس سلسلے کے فائنل

احکام بعد میں سورت براءت میں نازل ہوئے۔ اس میں اللہ نے رسول اللہ کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کی طرف سے مسالمت اور صلح کو قبول کرلیں جن کو آپ نے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اور ان کے ساتھ لڑائی شروع نہ کی تھی چاہے اس وقت تک ان سے کوئی معاہدہ ہوا تھا یا نہیں۔ تو آپ سورت براءت کے نزول تک کفار اور اہل کتاب کی جانب سے مسالمت کو قبول کرتے رہے اور براءت کے نزول کے بعد حکم یہ ہوگیا کہ یا تو اسلام قبول کرو گے یا جزیہ دو گے اور یہ وہ حالت مسالمت ہے جو اس وقت تک قابل قبول ہوگی جب تک لوگ اپنے عہد پر قائم رہیں گے ورنہ مسلمان ان کے ساتھ جہاد کریں گے جب تک ان کی استطاعت ہو تاکہ دین تمام کا تمام اللہ کے لئے ہو جائے۔

میں نے اس آیت کے بیان اور تفسیر میں قدرے طوالت سے کام لیا ہے اور یہ اس لئے کہ ان لوگوں کے شبہات کو دور کر دیا جائے جو ذہنی لحاظ سے شکست خوردہ ہیں۔ اس قسم کے لوگ جب اسلام کے نظریہ جہاد کے موضوع پر لکھنے بیٹھتے ہیں تو موجودہ حالات کے دباؤ میں آجاتے ہیں اور ان کی سوچ اور ان کی روح ان حالات کے دباؤ کے نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ اس بات کا یقین ہی نہیں کر سکتے کہ دین اسلام کا یہ کوئی مستقبل قاعدہ ہو سکتا ہے کہ یا اسلام قبول کرو یا جزیہ ادا کرو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ اس وقت جاہلیت اور طاغوت کی تمام قوتیں اسلام کے خلاف بر سرپیکار ہیں اور اسلام کا مقابلہ کر رہی ہیں اور اہل اسلام اپنے آپ کو مسلمان تو کہتے ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور ان کے قلب و نظر میں اسلام کا حقیقی شعور نہیں ہے اور دوسرے مذاہب کی عظیم قوتوں کے سامنے اپنے آپ کو بہت ہی کمزور محسوس کرتے ہیں۔ دوسری جانب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے ہراول دستے بہت ہی قلیل و نایاب ہیں اور اس کے ساتھ ضعیف و ناتواں ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں یہ لکھنے والے قرآن و سنت کو توڑ موڑ کر ان میں تاویلات کرتے ہیں اور یہ حرکت وہ محض حالات کے دباؤ کے تحت کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایسا موقف اختیار کرتے ہیں کہ اسلام اس موقف کا متحمل نہیں ہو سکتا، نہ اسلامی نصوص سے یہ بات نکلتی ہے۔

یہ لوگ ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جو تحریک اسلامی کے لئے وقتی ہدایات کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ لوگ ان آیات کو فائنل ہدایات تصور کر کے ان آخری ہدایات کی تاویل کرتے ہیں۔ حالانکہ جن آیات سے وہ استدلال کرتے ہیں وہ وقتی اور مقید نصوص تھے۔ یہ کام وہ کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ اسلام کے نظریہ جہاد کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ صرف دارالاسلام اور جماعت مسلمہ کا دفاع کرتا ہے اور جہاد اس وقت شروع ہو سکتا ہے جب دشمن حملہ آور ہو اور یہ کہ اسلام ہر قسم کے امن و امان کی پیشکش کو قبول کرتا ہے۔ اور ان کے نزدیک امن و امان کا مفہوم صرف یہ ہے کہ کوئی دارالاسلام پر حملے سے باز رہنے کا معاہدہ کرلے۔ ان لوگوں کے تصور کے مطابق اسلام اپنی حدود کے اندر جو چاہے کرے لیکن اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے لوگوں سے مطالبہ کرے کہ وہ اسلام کو قبول کریں اور نہ اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ لوگوں سے اسلامی نظام کی اطاعت کرنے کا مطالبہ کرے۔ اسلام صرف تبلیغ کا حق رکھتا ہے۔ رہی وہ قوت ' طاغوتی قوت ' جو جاہلیت کی پشت پر کھڑی ہے تو اسلام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس قوت کو چیلنج کرے یا اگر یہ قوت اسلام کو چیلنج کرے تو اسلام صرف دفاع کا حق رکھتا ہے۔

اگر اس قسم کے لوگ جنہوں نے موجودہ حالات کے مقابلے میں عقلاً اور روحاً شکست کھائی ہے ' ذرا سوچ کرتے اور موجودہ حالات کے مطابق قرآن و سنت میں سے احکام تلاش کرتے اور ان تاویلات کا راستہ اختیار نہ کرتے جن میں

قرآن و سنت کے نصوص کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں تو انہیں ان کے موجودہ حالات کے مماثل حالات کے بارے میں قرآن و سنت کے نصوص مل جاتے کیونکہ اسلام ایک حقیقت پسندانہ متحرک دین رہا ہے اور یہ کہتے کہ ایسے حالات میں اسلام نے یوں فیصلہ کیا تھا اور ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تو ان حضرات کو قرآن کی آخری اور فائنل ہدایات اور نصوص میں اس قسم کی تاویلات کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی - یہ لوگ کہہ سکتے تھے کہ موجودہ حالات میں اسلام کے یہ احکام مناسب ہیں لیکن یہ فائنل احکام نہیں ہیں - یہ وقتی تصرفات ہیں -

اسلام نے فی الواقعہ مختلف حالات میں مختلف حکمت عملی اختیار کی - چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں اور یہ مثالیں وقتی ضرورت کے مطابق تھیں -

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کے ارد گرد بسنے والے یہودیوں اور مشرکین کے ساتھ آپ سے ایک میثاق طے کیا جس میں باہم بھائی چارے ' امن اور مشترکہ دفاع کے امور طے کیے گئے اور یہ بھی طے کیا کہ مدینہ میں حق حاکمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو گا اور یہ کہ قریش کے مقابلے میں دفاع میں یہ سب لوگ مسلمانوں کے ساتھ ہوں گے - اور یہ کہ مدینہ پر جو کوئی بھی حملہ آور ہو گا یہ لوگ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھیں گے - مشرکین کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کریں گے الا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت دیں - اسی دوران حضورؐ کو اللہ نے حکم دیا تھا کہ جو قوم بھی مسالمت اور امن کا معاہدہ کرے اس کی پیشکش کو قبول کیا جائے - اگرچہ وہ باقاعدہ تحریری معاہدہ نہ کریں' بہرحال جب تک وہ صلح چاہیں' صلح رکھی جائے - اس کے بعد یہ تمام احکام بدل گئے تھے جس طرح ہم نے اوپر تفصیلات دیں -

اسی طرح جب جنگ خندق کے زمانے میں تمام مشرکین نے حضورؐ کے خلاف اشتراک کر لیا - بنو قریظہ نے بھی وعدہ کی خلاف ورزی کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو ختم ہی نہ کر دیا جائے - تو حضورؐ نے عیینہ ابن حصن الفزاری اور حارث ابن عوف المری رئیس غطفان کے سامنے مصالحت کی پیشکش کی اور طے کیا کہ وہ مدینہ کی یک تہائی پیداوار ان کو دیں گے اور آپ لوگ اپنی اقوام کو لے کر واپس ہو جائیں اور قریش کو اکیلے چھوڑ دیں - حضورؐ کی پیشکش ان کو خوش کرنے کے لئے تھی کوئی معاہدہ نہ تھا - جب حضورؐ نے دیکھا کہ یہ دونوں لوگ راضی ہو گئے ہیں تو آپ نے سعد ابن معاذ اور سعد ابن عبادہ کے ساتھ مشورہ کیا - ان دونوں نے کہا کہ حضورؐ یہ کام اگر آپ پسند کرتے ہیں تو ہم آپ کی وجہ سے قبول کر لیں گے اور اگر اللہ کا حکم ہے تو ہم اطاعت کریں گے اور اگر یہ کام آپؐ ہمارے لئے کرتے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ میں یہ اقدام آپ لوگوں کو بچانے کے لئے کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تمام عرب آپ لوگوں پر ایک ہی کمان سے تیر پھینک رہے ہیں - اس پر سعد ابن معاذ نے فرمایا : یا رسول اللہ خدا کی قسم ہم لوگ شرک میں مبتلا تھے ' بت پرست تھے ' اللہ کی عبادت نہ کرتے تھے اور نہ ہمیں اللہ کی معرفت حاصل تھی تو یہ مشرک ہم سے یہ توقع نہ کرتے تھے کہ ہم ان کو ایک کھجور بھی دیں ' الا یہ کہ وہ مول لیتے یا ہم مہمان نوازی کے طور پر دیتے اور جب اللہ نے ہمیں بذریعہ اسلام عزت دے دی اور بذریعہ قرآن ہدایت دے دی اور آپؐ کے ذریعے ہم معزز ہو گئے تو کیا اب ہم ان کو اپنا مال دے دیں؟ ہم ان کو تلوار دیں گے تاکہ وہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے - اس جواب سے حضورؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا (تم جانو اور وہ) اور عیینہ اور حارث سے کہا' چلو ہمارے پاس

تمہارے لئے تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بات جس کے بارے میں حضور ؐ نے مخصوص حالات میں سوچا ایک وقتی تدبیر تھی جو مخصوص حالات میں ضرورت کے لئے تھی' یہ کوئی فائنل حکم نہ تھا۔

ایک مثال یہ بھی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ معاہدہ کیا۔ یہ لوگ مشرک تھے اور اس معاہدے میں بعض شرطیں ایسی تھیں جن سے مسلمان خوش نہ تھے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں اور قریش کے درمیان بیس سال تک لڑائی نہ ہوگی۔ لوگ ایک دوسرے سے امن میں رہیں گے۔ مسلمان اس سال عمرہ کے بغیر واپس ہوں گے' اور اگلے سال وہ مکہ آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اگلے سال مسلمانوں کو مکہ آنے دیا' صرف تین دن کے لئے۔ اسلحہ وہی لائیں گے جو ایک سوار لاتا ہے اور وہ بھی نیام میں ہوگا اور یہ کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کرنا ہوگا اور اگر کوئی مدینہ سے مکہ چلا جائے تو مشرک واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ اس معاہدے پر حضور ؐ راضی ہوگئے کیونکہ حضور ؐ کو اللہ نے بذریعہ الہام بتا دیا تھا کہ یہ شرائط اگرچہ بظاہر قریش کے حق میں نظر آتی ہیں لیکن دراصل مسلمانوں کے لئے مفید ہیں۔ اس مثال میں بھی یہ گنجائش موجود ہے کہ اسلامی قیادت خاص حالات میں خاص فیصلے کر سکتی ہے۔

اسلام ایک دائمی تحریک ہے اور اس کا طرز عمل بھی تحریکی ہے۔ وہ حالات کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی واضح' پختہ اور آزمودہ کار قیادت رکھتا ہے۔ لوگ جن حالات سے بھی دوچار ہوں اور ان کو قرآن و سنت سے حسب حال ہدایت بہرحال ملتی ہے اور ان کو کسی قسم کی تاویل کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اسلام میں جو چیز مطلوب ہے' وہ یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ ہو اور وہ اس بات سے محتاط ہو کہ وہ اپنے دین کو جاہلیت کی شریرانہ قیادت کے حوالے کر دے' وہ شکست خوردہ ہو اور جاہلیت کے مقابلے میں معذرت خواہانہ دفاعی موقف اختیار کرے' حالانکہ دین اسلام غالب ہے' چھا جانے والا ہے۔ وہ انسان کی پوری ضروریات اور مسائل کو حل کرتا ہے اور وہ یہ مزاج رکھتا ہے کہ وہ بلند ہو اور ہر کام اور ہر مسئلے کے حل میں اقدامی پوزیشن کا مالک ہو۔

جب اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اگر کوئی دوستی کرنا چاہئے تو آپ دوستی قبول کریں اور اگر کوئی امن و سلامتی کی طرف مائل ہو تو آپ بھی اس طرف مائل ہوں' تو ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا کہ اللہ پر توکل کریں اور آپ کو مطمئن کر دیا کہ اگر اس قسم کے معاہدے کرنے والے دل میں کھوٹے ہوں تو اللہ سے بہرحال ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۸: ۶۱) اس کے بعد اللہ ان لوگوں کے دھوکے سے حضور ؐ کو مطمئن اور مامون فرماتا ہے۔ اگر یہ لوگ خیانت کا ارادہ کریں اور کوئی سازش کریں اور صلح اور دوستی کی پشت پر غداری کا کوئی منصوبہ ہو تو فرمایا کہ آپ مطمئن رہیں' اللہ کافی ہے۔ وہ حافظ ہے' وہی مددگار ہے اور بدر میں اسی کی نصرت تمہارے شامل حال رہی ہے۔ مومنین کے ذریعے اس نے تمہاری تائید کی۔ مومنین کو اتفاق و اتحاد عطا کیا حالانکہ جاہلیت میں ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کا پیدا ہونا ممکن ہی نہ تھا' یہ اللہ حکیم و قدیر کا کارنامہ ہے۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (٦٢) وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (٦٣) (٨: ٦٢ - ٦٣) "اور اگر وہ دھوکے کی نیت رکھتے ہوں تو تمہارے لئے اللہ کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے' یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔"

اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ آغاز تحریک میں اسی نے تو تمہاری امداد فرمائی اور تمہیں مومنین کا ایک ایسا سچا گروہ عطا کیا جنہوں نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو خوب نبھایا۔ اس نے ان کو متحدہ قوت کی شکل دے دی حالانکہ اس سے قبل ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے تھے۔ ان کی باہم دشمنی علانیہ تھی اور باہم لڑائی شدید ترین لڑائی تھی۔ اس سے مراد اوس و خزرج ہوں جو انصار تھے اور جاہلیت کے دور میں ان کے درمیان انتقام در انتقام کا لامتناہی سلسلہ تھا اور ان کے درمیان مصالحت ہی ممکن نہ تھی' چہ جائیکہ کہ ان کے درمیان ایسی اخوت پیدا ہو جائے جس کی نظیر پوری دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے یا اس سے مراد مہاجرین ہوں جو مکہ میں ویسے ہی حالات میں تھے جن میں انصار تھے یا اس سے تمام عرب ہوں کیونکہ اسلام سے قبل جزیرۃ العرب میں تمام عربوں کی حالت ویسی ہی تھی۔

بہرحال یہ معجزہ عربوں کی سرزمین پر رونما ہوا' اللہ کے سوا درحقیقت کوئی طاقت اور کوئی ذریعہ اس معجزے کو رونما نہ کر سکتا تھا۔ اور یہ کام صرف اسلامی نظریہ حیات کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ باہم نفرت کرنے والے یہ دل اور باہم ناقابل برداشت مزاج رکھنے والے یہ لوگ ایک ایسا جتھا بن گئے جس کے درمیان بے حد بھائی چارہ پیدا ہو گیا اور ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے اور وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں نہایت ہی نرم ہو گئے' یار غار بن گئے' اور ان کی اخوت' دوستی اور اتفاق و اتحاد ایک تاریخی مثال بن گیا۔ ان کی اجتماعی زندگی کا اہم رنگ' رنگ محبت تھا اور وہ جنگ کی زندگی کے لئے ایک تمہید و مثال تھے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰي سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ "اور ان کے دلوں کے اندر جو کدورت تھی' ہم وہ نکال دیں گے' وہ بھائی بن جائیں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھے ہوں گے۔"

اسلامی نظریہ حیات ایک عجیب اور عملی عقیدہ ہے۔ جب یہ دلوں کے اندر گھل مل جاتا ہے تو یہ ایک ایسے مزاج کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جس کا رنگ رنگ الفت و محبت ہوتا ہے' اس کے حامل جگری دوست بن جاتے ہیں۔ یہ اپنے ہم نشینوں کے لئے فرش بن جاتے ہیں' ان کا پہلو نرم ہو جاتا ہے اور ان کے اخلاق اور طرز عمل سے خشونت دور ہو جاتی ہے۔ اور ان کے اندر گہرے رابطے اور تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حالات یہ ہو جاتے ہیں کہ آنکھ کی ایک نظر' ہاتھ کا

معمولی چھونا ' زبان کی گفتگو ' دلوں کی دھڑکن ' باہم مہر و محبت ' دوستی اور ہمدردی اور ایثار و قربانی کے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی حقیقت کو صرف وہ ذات جانتی ہے جس نے ان حالات کی تخلیق کی ۔ اور ان کی حقیقت کا مزہ وہی شخص چکھ سکتا ہے جن کے اندر یہ انقلاب برپا ہو چکا ہوتا ہے ۔

یہ عقیدہ انسانیت کو الحب فی اللہ کا خون دیتا ہے ۔ انسانیت کے تاروں کو خلوص و محبت اور جوڑ و ملاپ کا نغمہ عطا کرتا ہے اور جب انسانیت اس نظریہ حیات کو قبول کرتی ہے تو یہ معجزہ رونما ہو جاتا ہے ۔ اور صرف اللہ ہی ہے جو اس معجزے کو ظہور میں لاتا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :" اللہ کے بندوں میں سے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ انبیاء اور شہداء نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن انبیاء و شہداء ان کے مقام اور مرتبے کے لئے ترسیں گے ۔ صحابہ کرام نے کہا کیا آپ بتائیں گے کہ وہ لوگ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہوں گے کہ وہ باہم اللہ کی روحانی قدروں کی وجہ سے محبت کرتے ہیں حالانکہ ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے ' نہ ان کے درمیان کوئی مالی مفاد موجود ہے ۔ خدا کی قسم ایسے لوگوں کے چہرے نور ہیں اور وہ نور پر ہیں ۔ یہ لوگ اس وقت خوف میں نہ ہوں گے جب تمام لوگ خوف میں ہوں گے اور یہ لوگ اس وقت بھی پریشان نہ ہوں گے جب تمام لوگ پریشان ہوں گے ۔ (ابو داؤد)

اور ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :"جب ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو ملتا ہے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو ان دونوں کے گناہ اس طرح گرتے ہیں جس طرح سخت آندھی کے دن درختوں سے خشک پتے گرتے ہیں اور اللہ ان دونوں کے گناہ اس طرح بخش دیتے ہیں ۔ اگرچہ وہ سمندروں کی جھاگ کی طرح زیادہ ہوں ۔ (طبرانی)

اس موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بے حد زیادہ ہیں ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں باہم محبت و الفت کی اہمیت پر یہ تمام اقوال ایک شاہد عادل ہیں ' نیز اس کے علاوہ امت مسلمہ کی تشکیل اور ترقی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقوال محض نعرے نہ تھے اور نہ خوشنما باتیں تھیں ۔ نہ یہ محض انفرادی اعمال اور شاذ مثالیں تھیں بلکہ یہ ایک واقعہ تھا اور امت مسلمہ اور اسلامی معاشرے کی صورت میں نمایاں تھا ۔ اذن الٰہی سے یہ اونچا ہوا تھا اور یہ وہ مینار تھا جسے اللہ کے سوا کوئی کھڑا نہ کر سکتا تھا ۔

---○○○---

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا جاتا ہے اور آپ کے واسطہ سے امت مسلمہ کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ اللہ تمہارا دوست اور والی ہے اور تم اس کے دوست ہو ۔ تم اس لئے کافی ہو اور وہ تمہارے لئے کافی ہے ۔ لہٰذا تم اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے حریص بن جاؤ اور تمہارے اندر جو قوت ایمانی ہے اس کی وجہ سے تم میں سے ایک آدمی دس کے برابر قوت رکھتا ہے اور اگر اہل ایمان بہت ہی کمزور ہو جائیں تو بھی وہ اپنے سے دگنے دشمنوں کو شکست دیں گے ۔ ۸

ع ۶ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾ يَاَيُّهَا
۴ النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ

يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ
اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ
يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

"اے نبی ؐ تمہارے لئے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لئے تو بس اللہ کافی ہے۔

اے نبی ؐ مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ اچھا' اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے' پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔"

یہاں انسانی سوچ کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔ وہ اس ناقابل شکست قوت پر غور کرتی ہے۔ اور انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ یہ قوت اللہ کی قوت ہے جو نہایت ہی قوی اور غالب ہے۔ اور اللہ کی قوت کے مقابلے میں وہ حقیر انسانی قوت ہے جو اللہ کی افواج کو چیلنج کر رہی ہے۔ دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ معرکہ یقینی طور پر محفوظ انجام رکھتا ہے اور اس کا نتیجہ واضح ہے اور اللہ کی ضمانت اس کی پشت پر ہے۔ اللہ کی ضمانت یہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (٨: ٦٤) "اے نبی ؐ تمہارے لئے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لئے تو بس اللہ کافی ہے۔" یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد مومنین کو کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کے لئے حریص بن جائیں۔ یہ حکم ایسے حالات میں دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے ہر شخص تیار ہے' ہر دل مستعد ہے' تمام اہل ایمان کے اعصاب اس کے لئے تن گئے ہیں۔ رگ و ریشہ اس کے لئے آمادہ ہے اور کاسہ دل ایمان' اطمینان اور اللہ پر بھروسے سے بھر گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ (٨: ٦٥) "اے نبی ؐ مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔" ان کو آمادہ کرو کیونکہ وہ اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کے ہم پلہ ہیں۔ اگرچہ تعداد میں وہ کم ہیں اور دشمن زیادہ ہے اور اردگرد پھیلا ہوا ہے۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (٨: ٦٥) "اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو

آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ بات نہایت ہی اچانک اور عجیب ہے لیکن اس کے اندر گہرائی ہے اور سچائی ہے۔ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (۸: ۶۵) "کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔" بظاہر فقاہت اور جنگ میں غلبے کے درمیان کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کے درمیان حقیقی اور نہایت ہی مضبوط تعلق ہے۔ مومن افواج اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کی راہ کیا ہے؟ ان کا منہاج کیا ہے؟ اس ذات کی حقیقت کیا ہے اور ان کا مقصد وجود کیا ہے؟ دراصل اہل ایمان کا دستہ اچھی طرح جانتا ہے کہ الوہیت کا مقام کیا ہے اور بندگی کے آداب کیا ہیں؟ وہ جانتے ہیں کہ الوہیت منفرد اور بلند ہوتی ہے اور بندگی کے آداب یہ ہیں کہ بندگی صرف اللہ کی کی جائے اور اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہ ہو۔ اہل ایمان کا دستہ یہ بھی جانتا ہے ' وہی امت مسلمہ ہے ' وہی اللہ کی ہدایت کا حامل ہے اور یہ دستہ دنیا میں اس لئے نکالا گیا ہے اور اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی بندگی اور غلامی سے نکال کر اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کر دے اور صرف وہی اللہ کا خلیفہ ہے ' اس کرۂ ارض پر۔ اسے یہاں اس لئے نہیں بٹھایا گیا کہ وہ خود اپنے آپ کو سربلند کرے اور عیش و عشرت کرے 'بلکہ وہ اللہ کے کلمے کو سربلند کرے اور اس کی راہ میں جہاد کرے اور اس زمین کو سچائی سے بھر دے اور لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلے کرے اور اس زمین پر ایک ایسی مملکت قائم کرے جس کا مقصد لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنا ہو۔ یہ ہے وہ فقہ جو اہل ایمان کے دلوں کو نور یقین اور قوت سے بھر دیتا ہے اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آمادہ کرتا ہے اور وہ نہایت ہی قوت اور یقین کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے انجام کے بارے میں پہلے سے یقین ہوتا ہے جبکہ ان کے دشمن ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ان اہداف و مقاصد کو نہیں سمجھتے۔ ان کے دل و دماغ پر تالے پڑے ہوتے ہیں ' ان کی نظریں کمزور ہوتی ہیں ' ان کی قوتیں شل ہوتی ہیں اگرچہ بظاہر وہ قوی ہیکل و تنومند نظر آئیں۔ ان کی قوت دراصل اپنے اصلی سرچشمے سے منقطع ہوتی ہے۔

یہ نسبت کہ ایک آدمی دس آدمیوں کے برابر ہو گا ' یہ جاننے والے اہل ایمان اور نہ جاننے والے اہل کفر کے درمیان اللہ کے ترازو میں اصلی اور حقیقی نسبت ہے۔ لیکن اگر مسلمان بہت ہی کمزور و ناتواں ہو جائیں تو بھی ان کے اور کفار کے درمیان ایک اور دو کی نسبت قائم رہے گی۔

الْـَٔانَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (۸: ۶۶)

"اچھا 'اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے 'پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔"

بعض فقہاء اور مفسرین نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ قوی ہوں تو ان میں سے ایک آدمی دس سے بھی نہ بھاگے گا اور اگر ضعیف ہوں تو ان میں سے ایک آدمی دو سے نہ بھاگے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اختلافات ہیں جن کی تفصیل یہاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ناپ و

تول کے جو پیمانے ہیں' ان میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کی قوت کا یہ حقیقی موازنہ ہے اور یہ حق ہے اور یہاں اللہ اہل ایمان کو یہ بتلانا چاہتا ہے تم اپنی قوت کا ذرا اچھی طرح اندازہ کر لو' اپنے آپ کو کم نہ سمجھو اور اطمینان رکھو۔ اور اپنے قدموں کو میدان کارزار میں مضبوطی سے جما دو' یہ موازنہ کوئی قانونی موازنہ نہیں ہے بلکہ نفسیاتی موازنہ ہے۔

---ooo---

قتال کے لئے ابھارنے اور جوش دلانے کے بعد اب قیدیوں کے احکام کی طرف بات کا رخ پھر جاتا ہے۔ اور یہ بات یہاں بدر میں رسول اللہ اور مسلمانوں کے اقدامات کے حوالے سے ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ تمہارے پاس جو قیدی ہیں ان کی ذہنی تربیت اس طرح کرو' ان کو ایمان کی ترغیب دو اور کہو کہ اگر اب بھی وہ ایمان لائیں تو اس سے قبل ان سے جو مواقع جاتے رہے ہیں' ان کی تلافی ہو سکتی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ
فِى الْاَرْضِؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَاۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾
فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖؗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾ ع ۵
يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّمَنْ فِىۡۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓىۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِىْ
قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ
مِنْهُمْؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

"کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے' اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے نبی' تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا' جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا' اللہ درگزر کرنے والا ہے

اور رحم فرمانے والا ہے لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انہیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آگئے، اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم ہے۔"

ابن اسحاق نے غزوۂ بدر کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہا ہے "جب لوگوں نے دشمن کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور رسول خدا ؐ اپنے چبوترے میں تھے۔ اور سعد ابن معاذ اس کے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے انصار بھی تھے۔ اور سعد نے تلوار سونتی ہوئی تھی۔ یہ سب لوگ رسول اللہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان لوگوں کو ڈر تھا کہ دشمن کی جانب سے حضور ؐ پر کوئی حملہ آور نہ ہو جائے۔ مجھے بتایا گیا کہ حضور ؐ نے سعد کے چہرے پر کچھ ناگواری کے اثرات محسوس کئے کیونکہ انہیں وہ پسند نہ تھا جو لوگ کر رہے تھے تو حضور ؐ نے فرمایا: سعد! تم شاید لوگوں کے اس فعل کو پسند نہیں کر رہے ہو۔ انہوں نے فرمایا: رسول خدا ؐ آپ کی بات درست ہے۔ یہ پہلا واقعہ تھا جس میں اللہ نے مشرکین کو اس قسم کی شکست سے دوچار کر دیا۔ میرے خیال میں اس معرکے میں لوگوں کو نیست و نابود کر دینا، ان کے زندہ گرفتار کرنے کے مقابلے میں زیادہ مناسب تھا۔

امام احمد نے اپنی سند سے روایت کی ہے، ابن عباس سے، انہوں نے حضرت عمر سے، فرماتے ہیں: جب اس دن افواج کی مڈبھیڑ ہوئی تو اللہ نے مشرکین کو شکست سے دوچار کر دیا۔ ان میں سے ستر افراد قتل ہوئے اور ستر افراد گرفتار ہوئے۔ حضور ؐ نے ابوبکر، عمر اور علی رضوان اللہ علیہم سے مشورہ کیا۔ ابوبکر ؓ نے فرمایا کہ حضور ؐ یہ لوگ چچازاد، ہم قوم اور بھائی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں، اس لئے جو ہم نے ان سے لیا وہ کفار کے خلاف بطور قوت استعمال ہو گا۔ اور یہ امکان ہے کہ یہ لوگ ہدایت پالیں اور یہ ہمارے لئے امداد کا سبب بنیں۔ اس کے بعد حضور ؐ نے فرمایا ابن خطاب تم بتاؤ؟ انہوں نے کہا کہ میں نے اس موقعہ پر یہ مشورہ دیا، خدا کی قسم میری رائے ابوبکر کی رائے کے مطابق نہیں ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ فلاں شخص (ان کے رشتہ دار) کو میرے حوالے کرو، تاکہ میں اس کی گردن اتار دوں اور حضرت علی کے حوالے عقیل ابن ابی طالب کر دیں تاکہ وہ ان کی گردن اڑا دیں اور حمزہ کے حوالے ان کے بھائی کو کر دیں تاکہ وہ اس کی گردن اڑا دیں، تاکہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے دل میں مشرکین کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ یہ لوگ تو ان کے اکابر امام اور قائدین ہیں۔ تو حضور ؐ نے حضرت ابوبکر ؓ کی رائے کو اختیار کر لیا اور میری بات کو نہ تسلیم کیا اور لوگوں سے فدیہ قبول کر لیا۔ دوسرے دن میں صبح صبح حضور ؐ کے پاس گیا اور دیکھا کہ حضرت ابوبکر ؓ اور حضور ؐ رو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ حضور ؐ آپ کو اور آپ کے ساتھی کو کیا چیز رلا رہی ہے؟ اگر کوئی رونے کی بات ہو تو میں بھی روؤں گا۔ اور اگر کوئی بات نہ ہو تو میں تمہارے رونے کی وجہ سے روؤں گا۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا: "وہ مشورہ جو آپ کے ساتھیوں نے فدیہ لینے کے بارے میں دیا، اس نے مجھے تمہارا عذاب اس قدر قریب کر کے دکھایا جس قدر یہ درخت قریب ہے۔ (آپ نے قریبی درخت کی طرف اشارہ کیا) اور اس پر اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ——— تا ————

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (۸:۶۷ تا ۶۹) اس طرح مسلمانوں کے لئے اموال غنیمت کو جائز قرار

دے دیا۔ (روایت مسلم' ابوداؤد' ترمذی' ابن جریر اور ابن مردویہ بطریق عکرمہ ابن عمار الیمانی)

امام احمد روایت کرتے ہیں علی ابن ہاشم سے' حمید سے' حضرت انس ؓ سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہاری قید میں دے دیا ہے' اس پر حضرت عمر ؓ کھڑے ہوگئے اور مشورہ دیا کہ حضور ؐ ان سب کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ تو حضور ؐ نے ان کی جانب سے منہ پھیر لیا اور پھر فرمایا لوگو' اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہاری قید میں دے دیا ہے لیکن یہ بات پیش نظر رکھو کہ کل وہ تمہارے بھائی تھے۔ اس پر حضرت عمر ؓ پھر کھڑے ہوگئے اور کہا حضور ؐ میرا مشورہ ہے کہ ان کی گردن اڑا دی جائے۔ حضور ؐ نے پھر ان سے منہ پھیر لیا اور لوگوں کے سامنے پھر یہ مسئلہ رکھا۔ اس پر ابوبکر ؓ نے مشورہ دیا کہ حضور ؐ مناسب یہ ہے کہ آپ ان کو معاف کر دیں اور ان سے فدیہ قبول کر لیں۔ اس مشورے کے بعد حضور ؐ کے چہرے پر پریشانی کے جو آثار تھے وہ ختم ہوگئے۔ حضور ؐ نے ان کو معاف کر دیا اور فدیہ قبول کر لیا۔ اس پر اللہ کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئیں :

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۸:۶۸) "اگر اللہ کی طرف سے پہلے کتاب نہ ہوتی تو تم نے جو لیا' اس کی وجہ تمہیں عذاب عظیم چھو لیتا۔" اعمش' عمران' ابن مرہ سے' عبیداللہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب بدر کا دن تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ قیدیوں کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہو۔ ابوبکر ؓ نے کہا' اے رسول اللہ ؐ یہ لوگ تمہاری قوم اور تمہارے رشتہ دار ہیں۔ ان کو زندہ رہنے دیں اور ان سے فدیہ قبول کریں شاید اللہ انہیں معاف کر دے۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا حضور ؐ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ کی تکذیب کی اور آپ ؐ کو اپنے گھر سے نکالا۔ انہیں اور ان کی گردن اڑا دیں۔ عبداللہ ابن رواحہ نے کہا اے رسول ؐ خدا آپ ایک لمبی وادی میں مقیم ہیں جس میں خشک لکڑیاں بہت ہیں۔ مناسب ہے کہ پوری وادی کو آگ سے بھر دیں اور ان کو اس میں پھینک دیں۔ حضور ؐ خاموش ہوگئے اور کوئی بات نہ کی اور اٹھ کر اپنے حجرے میں داخل ہوگئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ حضور ؐ ابوبکر ؓ کے مشورے کو قبول کریں گے۔ بعض نے کہا کہ آپ حضرت عمر ؓ کے مشورے کو قبول کریں گے۔ بعض نے کہا کہ حضور ؐ عبداللہ ابن رواحہ کے قول کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور فرمایا: "اللہ بعض لوگوں کے دلوں کو نرم کر دیتے ہیں اور وہ اس قدر نرم ہو جاتے ہیں کہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہوتے ہیں اور اللہ بعض لوگوں کے دلوں کو سخت کر دیتے ہیں اور وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ اے ابوبکر ؓ آپ کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ جنہوں نے فرمایا:

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "جس نے میری اطاعت کی تو وہ میرا ہوگا اور جس نے نافرمانی کی تو آپ غفور و رحیم ہیں۔" اور اسی طرح اے ابوبکر ؓ تم حضرت عیسیٰ کی طرح ہو' جنہوں نے کہا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ "اگر تو انہیں

عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو تو ہی عزیز اور حکیم ہے۔" اور اے عمرؓ تیری مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِھِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ "اے اللہ ان کے اموال کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک عذاب الیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔" اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوح علیہ السلام کی طرح ہے' جنہوں نے فرمایا: رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا "اے رب زمین پر کافروں سے کوئی زندہ بشر نہ چھوڑ۔ تم قابل اعتماد ہو' لہذا فیصلہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی رہا نہ ہو گا' الا یہ کہ فدیہ دے یا اس کی گردن اڑا دی جائے۔ ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے کہا حضور "ماسوائے سہل ابن بیضاء کے کیونکہ وہ اسلام کی توہین کیا کرتا تھا۔" اس پر حضورؐ خاموش ہو گئے۔ کبھی اس دن سے زیادہ مجھ پر حالت خوف طاری نہ ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ ابھی مجھ پر آسمان سے پتھر برسنے لگیں گے۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے فرمایا: "ماسوائے سہل ابن بیضاء کے" --- اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸:۶۷)

(احمد' ترمذی نے ابو معاویہ ابن اعمش کے واسطہ سے' حاکم نے کہا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن صحیحین نے اسے روایت نہیں کیا ہے) اثخان مطلوب یہ ہے کہ ان میں سے اس قدر آدمیوں کو قتل کیا جائے کہ ان کی قوت ٹوٹ جائے۔ اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی قوت برتر ہو جائے اور یہ بات اس سے قبل واقعہ ہو جانا چاہئے تھی یعنی گرفتاریوں سے قبل یعنی گرفتار کر کے اور فدیہ لے کر چھوڑنے کی پوری کاروائی سے قبل' اس لئے اللہ نے مسلمانوں کو سرزنش کی۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہ لوگوں کو گرفتار ہی نہ کرتے۔

غزوہ بدر مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان پہلا معرکہ تھا۔ اس وقت مشرکین کثیر تعداد میں تھے اور مسلمان قلیل تھے۔ اور ان میں سے زیادہ کو قتل کرنے سے ان کی عددی قوت میں کمی کرنا مطلوب تھا۔ اس طرح ان کے لیڈر ذلیل و خوار ہو جاتے اور ان کی قوت کم ہو جاتی اور وہ دوبارہ مسلمانوں پر حملے کی جراءت ہی نہ کر سکتے اور یہ اس قدر عظیم اور اہم ہدف تھا کہ اس کے مقابلے میں تاوان جنگ کی بڑی سے بڑی رقم بھی ہیچ تھی۔

نیز اس سے ایک اور غرض بھی مطلوب تھی۔ دلوں میں یہ نکتہ بٹھانا مقصود تھا' جس کی طرف حضرت عمرؓ نے واضح طور پر اشارہ فرمایا۔ دو ٹوک الفاظ میں اور نہایت ہی کھل کر "تاکہ اللہ کو معلوم ہو کہ ہمارے دلوں میں مشرکین کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں انہی دو مقاصد کی خاطر' اللہ نے مسلمانوں کے اس فعل کو پسند نہیں کیا کہ وہ لوگوں کو قید کریں اور رقم لے کر چھوڑ دیں۔ اور انہی عملی اقدامات کے بارے میں یہ آیت آئی ہے' جب بھی مسلمانوں کو ایسے حالات کا سامنا ہو تو یہ آیت ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸:۶۷)

"کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے ۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے پہلے ہی معرکے میں فدیہ قبول کیا اور دشمن کو قیدی بنایا' ان کے بارے میں یہ ریمارکس دیئے گئے :

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (٨: ٦٧)

"تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے ۔" یعنی تم نے قتل کرنے کے بجائے دشمن کو قیدی بنایا اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا ۔ اللہ کی اسکیم یہ تھی کہ تم ان کو اس معرکے میں خوب کچل دیتے لہذا مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اللہ کی اسکیم اور ارادے کے مطابق چلتے ۔ کیونکہ اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے' اور یہ تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب دنیا کے مفادات کو ترک کر دیا جائے ۔ اللہ عزیز و حکیم ہے ۔ اسی نے تو تمہارے لئے فتح و نصرت کا سامان کیا ۔ اور تمہیں اس کی توفیق دی ۔ اور اس کی پشت پر حکمت یہ تھی کہ دشمنوں کی جڑ کٹ جائے' حق حق ہو جائے اور باطل' باطل ہو جائے ۔ اگرچہ مجرم اس بات کو پسند نہیں کرتے ۔"

اس لئے پہلے اللہ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اہل بدر جو غلطی بھی کریں اللہ انہیں معاف کر دے گا ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے نتیجے میں اسارائے بدر کے بارے میں انہوں نے جو نامناسب عمل اختیار کیا' اس پر وہ عذاب عظیم سے بچ گئے ۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (٨: ٦٨) "اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے' اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی ۔"

نہ صرف یہ کہ عذاب سے بچ گئے بلکہ ان کے لئے ایک مزید انعام کا اعلان ہو گیا ۔ جنگ کے نتیجے میں آنے والا مال بھی ان کے لئے حلال ہو گیا' جس میں فدیے کی آمدن بھی شامل ہے' جس کے بارے میں عتاب مذکور بھی ہوا تھا جبکہ اس سے پہلے رسولوں کی امتوں پر یہ حرام تھا ۔ اللہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ تمہارا اصل سرمایہ تقویٰ ہے اور اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ غفور و رحیم ہے ۔ یہ ایک عجیب توازن ہے' اہل ایمان پر فرض کیا گیا کہ تم خدا خوفی کا رویہ ہر وقت اپنائے رکھو' بے شک اللہ غفور و رحیم ہے لیکن تم ہر وقت اس سے ڈرتے رہو اور صفت غفوریت کی وجہ سے بدعمل نہ ہو جاؤ ۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٦٩) ع "پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے' اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو ۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔" اب سیاق کلام قیدیوں کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ ان کو زندگی عطا کرنے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے چٹکی بھری جاتی ہے ۔ ان کے احساس کو جگایا جاتا ہے تاکہ ان کے شعور میں امید کی کرن روشن ہو' اور وہ پرامید ہو کر روشنی کی طرف آجائیں اور ماضی کے مقابلے میں ان کا مستقبل سنور جائے اور وہ جس زندگی میں ہیں' اس

کے مقابلے میں اچھی زندگی حاصل کر لیں اور ان کو جو مالی تاوان ہوا ہے اور ان کا جو علاقہ ہے' اس سے وہ اچھی جگہ آ جائیں اور اس پر اللہ کی رحمت اور مغفرت مستزاد۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَى إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۸: ۷۰) "اے نبی ؐ، تم لوگوں کے قبضہ میں جو قیدی ہیں' ان سے کہو اگر اللہ کو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بڑھ چڑھ کر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا' اللہ درگزر کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔" یہ ہے ان کے لئے ہمہ گیر بھلائی لیکن یہ بھلائی ان تک تب ہی پہنچ سکتی ہے جب ان کے دل نور ایمان کے لئے کھل جائیں۔ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ ان کے اندر بھلائی کا عنصر موجود ہے اور یہ عنصر ایمان کا عنصر ہے۔ یہ اس قدر عام اور ہمہ گیر خیر ہے کہ اس میں ایمان کے لفظ کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ایمان گویا خیر محض ہے اور کوئی بات اس وقت تک خیر اور بھلائی نہیں ہو سکتی جب تک وہ ایمان کے حوالے سے نہ ہو اور جس کا وجود ایمان کے عنصر کے نتیجے میں نہ ہو۔ اور وہ ایمان پر قائم نہ ہو۔

اسلام قیدیوں کا صرف اس لئے روادار ہے کہ وہ ان کے دلوں میں بھلائی کی تلاش کرے۔ اگر ان کے اندر کوئی خفیہ چنگاری ہو تو اسے جگا دے۔ ان کی فطرت کو خواب غفلت سے بیدار کرے اور وہ اسلامی نظریہ حیات کو قبول کرنے' اس سے متاثر ہونے کے لئے تیار ہو جائیں اور آخر کار نور ایمان سے منور ہو جائیں۔ اسلام دشمن کو اس لئے قید نہیں کرتا کہ وہ ان سے انتقام لے کر ان کو ذلیل کرے یا ان کا استحصال کرے جس طرح حضور ؐ کے دور میں رومی اور دوسری اقوام اور نسلوں میں یہ مقاصد عام طور پر مروج تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے کچھ لوگوں سے نقل کیا ہے اور انہوں نے ان کا نام بھی لیا ہے کہ اہل قریش نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے اور فدیہ کی ادائیگی کے لئے ایک وفد بھیجا۔ ہر قوم نے اپنے قیدی کو چھڑایا۔ جس پر لوگ راضی ہوئے۔ حضرت عباس ؓ نے فرمایا رسول خدا میں تو مسلم تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ کے اسلام کے بارے میں صحیح علم اللہ کو ہے۔ اگر معاملہ ایسا ہے جس طرح تم کہتے ہو تو اللہ تمہیں جزا دے گا۔ جہاں تک ظاہرداری کا تعلق ہے تو تم ہمارے خلاف تھے۔ لہذا آپ اپنا' اپنے دو بھتیجوں نوفل ابن حارث ابن عبدالمطلب اور عقیل ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب کا فدیہ دیں۔ نیز اپنے حلیف عتبہ ابن عمرو بنی الحارث ابن فہر کے بھائی کا فدیہ بھی دیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس ان لوگوں کا فدیہ کہاں ہے؟ تو اس پر رسول اللہ نے فرمایا وہ مال کہاں ہے جو تم نے اور ام الفضل نے دفن کیا تھا اور تم نے اسے کہا تھا کہ اگر میں اس سفر میں مرگیا تو یہ مال جو دفن کیا گیا ہے بنی فضل' عبداللہ اور قثم کا ہو گا۔' اس پر اس نے کہا: "خدا کی قسم رسول خدا میں جانتا ہوں کہ آپ رسول خدا ہیں۔ یہ تو وہ راز ہے جو میرے [illegible] فضل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" لہذا آپ لوگوں نے مجھ سے جو بیس اوقیہ مال لیا ہے' اسے فدیہ کی رقم میں حساب کر لیں۔ اس پر رسول ؐ اللہ نے فرمایا: "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو مال غنیمت تھا جو اللہ نے آپ سے ہمیں دلا دیا۔" اس پر عباس نے اپنا فدیہ دیا' اپنے دو بھتیجوں کا فدیہ بھی دیا اور اپنے حلیف کا فدیہ بھی دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ (۸: ۷۰) "اے نبی ؐ تم لوگوں کے قبضے میں جو قیدی ہیں ' ان سے کہو کہ اگر اللہ کو معلوم ہو کہ تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے ' تو وہ اس سے تمہیں بڑھ چڑھ کر دے جو تم سے لیا گیا ہے ' اور تمہاری خطائیں معاف کرے گا ' اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔" لیکن روشنی کی یہ کرن دکھاتے ہوئے اور امید کا دروازہ کھولتے ہوئے ' اللہ ان کو متنبہ بھی کرتا ہے کہ اگر انہوں نے رسول کے ساتھ خیانت کی تو پھر ان کا حال یہی ہو گا جو ہوا۔

وَ اِنْ يُرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۸: ۷۱) "لیکن اگر وہ تیرے ساتھ خیانت کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں ' چنانچہ اسی کی سزا اللہ نے انہیں دی کہ وہ تیرے قابو میں آگئے ' اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم ہے ۔"

انہوں نے اللہ کے ساتھ یوں خیانت کی کہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا۔ اور اللہ وحدہ کو اپنا رب تسلیم نہ کیا حالانکہ اس نے ان کی فطرت سے یہ عہد لیا تھا۔ اور اگر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی خیانت کا ارادہ کیا۔ حالانکہ اب وہ آپ ؐ کی قید میں ہیں تو ان کو پہلی خیانت کے نتائج پر غور کرنا چاہئے کہ اب وہ مسلمانوں کے ہاں قید ہیں اور اللہ نے ان کو رسول اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے ۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں ابن عربی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب مشرکین قید ہوئے تو ان میں سے بعض لوگوں نے اسلام کے متعلق بات کی ۔ لیکن وہ دل سے مسلمان نہ تھے ۔ اسلام کے بارے میں انہوں نے جو بات کی ' وہ بھی دو ٹوک نہ تھی ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے قریب آ جائیں لیکن مشرکین سے بھی دور نہ ہوں ۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر کوئی کافر ایمان کی بات کرے ' زبان سے اقرار بھی کرے لیکن وہ اس میں صاحب عزیمت نہ ہو تو وہ مومن تصور نہ ہو گا ' لیکن اگر مومنین میں سے کوئی اس قسم کی مذبذب بات کرے تو وہ کافر ہو گا ۔ الا یہ کہ دل میں کوئی ایسا وسوسہ آ جائے جو انسان کی قدرت سے باہر ہوتا ہے ' کیونکہ اسے تو خود اللہ نے معاف کر دیا ہے ۔ اللہ نے اپنے رسول ؐ کے سامنے یہ حقیقت کھول دی ہے ۔ وَ اِنْ يُرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ (۸: ۷۱) یعنی یہ بات اگر ان کی جانب سے بطور مکر و فریب اور خیانت ہے تو انہوں نے اس سے قبل بھی اللہ کی خیانت کا ارتکاب کیا ہے کہ انہوں نے کفر کو اپنایا ' اسلام کے خلاف سازشیں کیں اور آپ ؐ کے خلاف آمادۂ جنگ ہو گئے ۔ اگرچہ ان کی یہ بات برائے ظاہرداری اچھی ہے اور اللہ بھی جانتا ہے کہ اس کی پشت پر کوئی بھلائی موجود ہے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا اور ان کے سابقہ کرتوتوں کو ساقط کر دے گا۔

اب یہ درس ختم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ یہ سورت بھی ختم ہو جاتی ہے ۔ اس میں اسلامی معاشرے کے اندرونی حالات و تعلقات اور اسلامی معاشرے اور دوسرے معاشروں کے مابین تعلقات کو منضبط کیا گیا ہے ۔ اور اس بارے میں منظم بین الاقوامی قانون کی بنیاد رکھی گئی ہے ۔ ان احکام و ضوابط پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کا مزاج کیا ہے ۔ وہ کیا بنیاد ہے جس کے اوپر اس کی عمارت اٹھتی ہے اور وہ کیا انتہا ہے جس تک یہ نظام بڑھتا ہے ۔ اس نظام کی بنیاد خونی رشتوں پر نہیں ہے ۔ زمین اور علاقائی رشتوں پر بھی نہیں ہے ۔ رنگ و نسل کے رشتوں پر بھی نہیں ہے ۔ تاریخی مشترکہ ورثے کے تعلقات پر بھی نہیں ہے ۔ مشترکہ زبان اور مشترکہ اقتصادی نظام کے تعلقات پر

بھی نہیں ہے۔ یہ نظام نہ رشتہ داری کا نظام ہے' نہ وطنیت ہے' نہ قومیت ہے اور نہ اقتصادی مصالح کا نام ہے۔ بلکہ یہ نظام ایک نظریے پر بنا ہے۔ یہ ایک رسول کی قیادت پر وجود میں آیا ہے۔ یہ ایک تحریک کا نام ہے' لہٰذا جو لوگ ایمان لائے' انہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر دار ہجرت میں آگئے' اور انہوں نے اپنے تمام زمینی رشتے کاٹ دیئے' اپنی زمین کو چھوڑ دیا' قوم کو چھوڑ دیا' مفادات کو چھوڑ دیا اور اپنے مالوں اور اپنی جان کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ کیا اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور امداد دی اور وہ ان لوگوں کے قریب ہوگئے' نظریات کی وجہ سے' اور انہوں نے اسلامی قیادت کو قبول کر کے تحریک میں شامل ہوگئے۔ یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے بھائی اور ولی ہیں۔ اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کی تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی ولایت نہیں ہے کیونکہ اسلامی عقیدے کے قبول کرنے کے بعد وہ اس عقیدے کے لئے وقف نہ ہوئے اور اس عقیدے کے نظام کو قبول نہ کیا اور اجتماعی تحریک کی قیادت کے احکامات قبول نہ کئے' کیونکہ اسلامی معاشرے میں پائے جانے والے نظریاتی دو افراد کے درمیان پائے جانے والے تعلقات وراثت سے زیادہ اہم ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں کفار ایک دوسرے کے ولی بھی ہیں اور وارث بھی ہیں۔ یہ ہیں وہ اہم خطوط جن پر اسلامی معاشرے کی عمارت اٹھتی ہے۔ اور ان لائنوں پر افراد معاشرہ کے درمیان تعلقات بنتے اور بگڑتے ہیں جیسا کہ ان قرآنی آیات میں ان کو ضبط کیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ
وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ
فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
بَصِيرٌ ﴿٧٢﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ
فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ
اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَ
رِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ

فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ ۱۰
اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٧٥﴾ الربع ع ۶
۲

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے' اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی' وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے' جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے' لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اسے دیکھتا ہے جو لوگ منکر حق ہیں' وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا۔

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی' وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے' اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آگئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں' یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔"

یوم بدر تک اسلام کے آغاز میں مسلمانوں کے درمیان ولایت کی نوعیت یہ تھی کہ ان کے درمیان توارث اور تکافل کے تعلقات تھے اور وہ اس کے تحت دیت ادا کرتے تھے اور ان کے درمیان ایک دوسرے کی نصرت اور اخوت کی ولایت قائم تھی اور یہ ولایت قرابت' نسب اور خون کی ولایت کے قائم مقام تھی۔ لیکن جب یوم بدر کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو استحکام بخش دیا اور اسلامی مملکت مستحکم ہو گئی تو ولایت اور نصرت رہ گئی اور میراث اور دیات میں تکافل کو اسلامی معاشرے کے اندر خونی رشتوں کی طرف لوٹا دیا۔ اس آیت میں جس ہجرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جسے اس ولایت کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے خواہ ولایت عامہ ہو یا خاصہ ہو' تو اس سے مراد دارالشرک سے دارالاسلام کی طرف ہجرت ہے جس کی استطاعت ہو' جو لوگ ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ کریں اور اس لئے نہ کریں کہ انہیں دارالشرک میں مفادات اور رشتہ داریاں عزیز ہوں تو ایسے لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی ولایت نہیں ہے۔ اور یہی مسئلہ ان دیہاتی لوگوں کا تھا جو اسلام کو قبول کر چکے تھے لیکن ایسے ہی حالات کی وجہ سے انہوں نے ہجرت نہ کی۔ اس قسم سے بعض لوگ مکہ میں بھی تھے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اللہ نے ان کی نصرت لازم کی ہے بشرطیکہ وہ نصرت طلب کریں اور ان کی جس قوم کے ساتھ دشمنی ہو' مسلمانوں اور اس قوم کے درمیان کوئی معاہدہ نہ ہو کیونکہ اسلامی معاشرے کا عہد و پیمان اور اس کا تحریکی منصوبہ انفرادی ضرورتوں سے زیادہ اہم ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان میں مذکور احکام و ضوابط سے اسلامی معاشرے کے خدوخال اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی ترجیحات کیا ہیں؟ اس کی عضوی ترکیب کیا ہے اور اس کی بنیادی اقدار کیا ہیں؟ لیکن یہ بات اس وقت پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی جب تک اسلامی معاشرے اور اس کے تاریخی

ارتقاء پر ایک نوٹ نہ دے دیا جائے اور یہ وضاحت نہ کر دی جائے کہ ایک اسلامی معاشرے کے کیا اساسی قواعد ہیں اور اس کی حرکت اور جدوجہد اور اس کی ترجیحات کا منہاج کیا ہے۔

دعوت اسلامی جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر اٹھے تھے۔ دراصل اس عالمگیر دعوت اسلامی کے طویل سلسلے کی آخری کڑی ہے جسے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ؐ تک تمام انبیاء کرام پیش کرتے رہے۔ انسانیت کی اس طویل تاریخ میں دعوت اسلامی کا مطمع نظر اور نصب العین ایک ہی رہا ہے' یعنی لوگوں کو شرک وبت پرستی سے ہٹا کر صرف ایک رب ذوالجلال کی ذات سے متعارف کرانا اسی کا بندہ و غلام بنانا اور اس کے سوا تمام الاہوں اور بندگیوں سے نجات دینا۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ معدودے چند افراد کو چھوڑ کر اور چند مختصر وقفوں کے سوا' پوری انسانیت نے کبھی بھی الوہیت کے اصل سرچشمے' اللہ کی ذات کا انکار نہیں کیا۔ تمام اقوام و ملل میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا جاتا رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ لوگ کبھی تو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرنے میں ٹھوکریں کھاتے رہے ہیں اور یا اس کی الوہیت اور ربوبیت میں کسی نہ کسی کو شریک کرتے رہے ہیں۔ یہ شرک یا تو پرستش اور عقیدے میں ہوا ہے اور یا یہ حاکمیت اور اطاعت کے دائرہ میں ہوا ہے اور اپنی نوعیت اور نتائج کے لحاظ سے دونوں قسم کے شرک ایک ہی جیسے ہیں۔ لوگ اس کا ارتکاب کر کے اللہ کے دین سے نکل جاتے رہے۔

تاریخ کے ہر دور میں رسولوں کے ذریعہ لوگوں تک دین پہنچتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ لوگ دین حق سے خارج ہو ہو کر اس جاہلیت کی طرف پلٹتے جس سے دین حق نے انہیں نکالا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ مکمل طور پر خدا کا انکار نہ کرتے بلکہ اس کی ذات میں شرک کرتے یا عقائد و نظریات میں اور یا پھر اطاعت و حاکمیت میں یا ان سب میں۔

یہ ایک مقصد ہی دعوت اسلامی کا نصب العین رہا ہے اور پوری تاریخ انسانی میں تمام انبیاء کرام کی دعوت کا مقصد بھی ایک ہی رہا ہے یعنی اسلام۔ دوسرے لفظوں میں ایک اللہ اور رب کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا' لوگوں کو تمام الہوں کی بندگی اور غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت میں داخل کرنا یعنی لوگوں کو حاکمیت' شریعت' حکومت اور زندگی کی تمام عادات و اطوار میں صرف للہ وحدہ کی اطاعت میں داخل کرنا یہی وہ مقصد تھا جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے اور آپ سے قبل تمام انبیاء کا نصب العین بھی یہی رہا ہے۔ اس کا نام ہے اسلام' جو لوگوں کو دوبارہ صرف اللہ کی حاکمیت کے دائرہ میں لانا چاہتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس پوری کائنات میں تکوینی طور پر اللہ کی حاکمیت جاری ہے۔ ایک پتہ بھی حکم الٰہی کے بغیر اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ سورج چاند اس کے حکم سے گردش کر رہے ہیں بعینہ اسی طرح تشریعی امور بھی سب کے سب اسی ذات برتر کے حکم کے مطابق چلیں اور لوگ اپنے لئے کوئی نظام زندگی کوئی حکومت اور ایسی تدابیر اختیار نہ کریں جو اللہ کے تجویز کردہ نظام حیات' طرز حکومت اور تدبیر سے مختلف ہو یا ان کے متضاد ہو۔ کیونکہ اللہ ہی اس پوری کائنات پر متصرف ہے بلکہ وہ خود انسانی زندگی کے طبعی حصے پر بھی متصرف ہے۔ جو انسان کے دائرہ اختیار اور ارادے سے باہر ہے۔ مثلاً پیدائش نشوونما صحت و مرض حیات و ممات اور دوسرے وہ امور جو براہ راست اللہ کے تجویز کردہ طبعی قوانین کے تابع ہیں اور انسان اپنی طبعی اور اجتماعی زندگی میں ان فطری اصولوں کا طوعاً و کرھاً پابند ہے۔ اور کسی صورت میں بھی ان فطری اور طبعی قوانین کو نہیں بدل سکتا اور نہ آج تک کوئی طاقت ان قوانین کو بدل سکی ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ بعینہ اسی طرح زندگی کے اختیاری حصے میں بھی انسان الٰہی قوانین کا پابند ہو اور

اپنی پوری زندگی میں صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم اور مطاع بنا لے اور اس کی زندگی کا یہ اختیاری حصہ بھی زندگی کے تکوینی حصے اور کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے اور اس طرح ان تینوں میں ہم آہنگی پائی جائے۔"

مزید تشریح کے لئے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب "مبادی اسلام" غالباً رسالہ دینیات مراد ہے۔

جاہلیت جس کی بنیاد انسانی حاکمیت پر رکھی گئی ہے ----- جو جمہوریہ یا ڈکٹیٹر کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قانون بنائے ----- ظاہر ہے کہ جاہلیت کی یہ شکل ایک طرف کائنات کی فطرت سے باہر نکلی جا رہی ہے اور دوسری طرف انسانی زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری دائروں میں تصادم برپا کر دیتی ہے۔

اس جاہلیت کا ہر اک پیغمبر نے مقابلہ کیا ہے اور انسانی تاریخ کے ہر دور میں لوگوں کو صرف اللہ وحدہ' لاشریک کی اطاعت کی دعوت دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جاہلیت کا مقابلہ کیا ہے۔ جاہلیت کی یہ شکل صرف نظریہ کی شکل میں موجود نہیں تھی بلکہ بسا اوقات اس کے لئے کوئی مرتب دستوری ہیئت بھی نہیں رہی ہے۔

یہ جاہلیت "اجتماعی تحریک" کی شکل میں موجود رہی ہے۔ ایک منظم سوسائٹی میں اس کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔ یہ اجتماعی تحریک اس سوسائٹی کی فراہم کردہ قیادت کے تابع فرمان رہی ہے۔ یہ تحریک جاہلی سوسائٹی کے افکار' اقدار' مطلوبات حیات' رسوم اور عادات پوری طرح اپنا لیتی ہے۔ پھر یہ جاہلی سوسائٹی شیرازہ بند سوسائٹی رہی ہے۔ اس کے افراد میں عملی اشتراک' مل کر پروگرام کی تکمیل کرنا' نظم' باہمی قرب کا احساس اور آپس کا ایسا تعاون رہا ہے جو کسی پارٹی کے ارکان میں ہوا کرتا ہے۔

افراد کی یہ شیرازہ بندی اس جاہلی سوسائٹی کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متحرک رکھتی رہی ہے تاکہ سوسائٹی اپنا تحفظ کر سکے اور اپنی ذات کے دفاع کا انتظام کر سکے اور اپنے وجود کے خلاف خطرات کی ان تمام بنیادوں کو ملیامیٹ کر سکے جو اسے کسی بھی صورت میں چیلنج کر رہی ہیں۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ جاہلیت محض ایک عقیدے اور نظریہ کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک معاشرے اور اجتماعی تحریک کی شکل میں آتی ہے' تو اس سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ اس جاہلیت سے لوگوں کو دوبارہ اسلامی نظام حیات اور اللہ کی بندگی میں داخل کرنے کا کام محض نظریہ کی شکل میں ہرگز نہ ہو سکے گا اور نہ اس صورت میں کسی درجے میں یہ مفید ہو سکتا ہے کیونکہ اس شکل میں دعوت اسلامی کا نظریہ محض جاہلیت کے قائم شدہ نظام حیات کی برابری بھی نہ کر سکے گا۔ جس کے پیچھے ایک فعال معاشرہ ہو گا۔ چہ جائیکہ اسلامی نظریہ حیات جاہلیت پر غالب آ جائے اور اپنے آپ کو اس سے برتر ثابت کرے کیونکہ ایک قائم اور پرشوکت وجود کو گرانے اور اس کی جگہ ایک نئے وجود کو کھڑا کرنے کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ دوسرا وجود غالب ہو اور یہ نیا نظام حیات اپنے مزاج' اپنے طریق کار' اپنی ہستی اور اس کی جزئیات تک میں اس جاہلیت قائمہ سے بنیادی اختلاف رکھتا ہو' نیز یہ قائم ہونے والا نظام حیات ایک جاندار اور متحرک اور پرشوکت معاشرے کی شکل میں قائم ہو اور اس کے اساسی نظریات اور تفصیلی نظم کی بنیاد نہایت ہی ٹھوس اصولوں پر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ نظام اپنے روابط تعلقات اور ربط و ضبط اور تنظیم میں بھی اس جاہلی نظام حیات سے زیادہ مضبوط ہو۔

یہاں آ کر یہ سوال سامنے آ جاتا ہے کہ وہ فکری اور نظریاتی اساس کیا ہے۔ جس پر تمام ادوار میں اسلامی نظام

حیات کی عمارت تعمیر ہوتی رہی ہے؟ یہ ہے لا الہ اللہ یعنی اس بات کی گواہی کہ اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت 'قیومیت' بادشاہی اور حاکمیت میں وحدہ' لا شریک ہے۔ انسان اپنے عقیدے اور ضمیر میں اسے ایک سمجھے۔ صرف اسی کی عبادت بجالائے اور عملی زندگی میں صرف اسی کے قانون کی اطاعت کرے۔ یہ شہادت جب تک اس مفہوم میں نہ ہو شرعاً" وہ غیر موجود تصور ہوگی۔ اس کا شرعی وجود اس بات پر موقوف ہے کہ اس کا عملی میدان میں بھی ایک خارجی وجود ہو جس کی بنا پر فیصلہ کیا جاسکتا ہو کہ شہادت دینے والا مسلم ہے یا غیر مسلم ہے۔

اور اس نظریہ کے وجود میں آنے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی جانب لوٹ جائیں۔ زندگی کے ہر معاملے اور ہر شعبے میں صرف خدا کے فیصلے کو تسلیم کریں اور از خود فیصلہ نہ کریں بلکہ ہر معاملہ میں خدا کے حکم کی طرف رجوع کریں' اس کی اطاعت کریں اور یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو معلوم کرنے کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کریں۔ آپ ؐ ہی نے اللہ تعالیٰ کا حکم ہم تک پہنچایا اور آپ ؐ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ہیں۔ اسلام کے رکن اول کے دو اجزاء میں سے یہ دوسرا جزو ہے جو اس اقرار سے وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ یہ اسلام کا وہ بنیادی نظام عقیدہ ہے جس سے اسلامی نظام حیات تشکیل پاتا ہے۔ اس بنیادی عقیدہ کو جب پوری زندگی پر منطبق کیا جاتا ہے تو اس سے ایک مفصل نظام حیات جنم لیتا ہے۔ جسے اپنا کر ایک مسلمان آدمی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کر لیتا ہے۔ ملک کے داخلی مسائل بھی اس سے حل ہو جاتے ہیں اور خارجی مسائل بھی اسے معلوم ہو جاتے ہیں کہ اس مسلم سوسائٹی سے کس قسم کا تعلق رکھنا ہے اور غیر مسلم سوسائٹیوں سے اس کے روابط کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔

جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ اسلامی نظام حیات کو یہ مطلوب نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو نظریہ محض کی شکل میں پیش کرے اور صورت یہ ہو کہ لوگوں میں سے جس کی مرضی ہو' اس کو قبول کرے۔ چند مراسم عبادت بجالائے اور اس کے بعد اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے جاہلی اور غالب معاشرے میں ضم ہو کر جاہلیت کے زیر سایہ زندگی بسر کرے۔ اس لئے کہ ایسے حالات میں مسلمان اگر ایک عظیم تعداد میں بھی ہوں تو بھی وہ اسلامی نظام حیات کو بالفعل اور عملاً قائم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسے افراد جو اسلامی نظام حیات پر ایمان بھی لا چکے ہوں اور اس کے بعد ایک جاہلی معاشرے کا جزو بھی بن رہے ہیں وہ شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر طوعا" و کرھا" اپنے آپ کو اس جاہلی معاشرے کے مقاصد بروئے کار لانے میں مجبور پائیں گے اور ان کی زندگی کی ہر تگ و دو دراصل اس جاہلی معاشرے کے اساسی تقاضے پورے کر رہی ہوگی' جو اس کے وجود کے لئے ضروری ہوں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ایسے لوگ اس جاہلی معاشرے کے وجود کے لئے خطرناک ہوں گے۔ کیونکہ ایک اجتماع نظام اپنے تمام اجزاء کو ہمیشہ اپنے دفاع میں لگائے رکھتا ہے۔ خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں' دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایسے افراد اسلامی نظریہ حیات پر ایمان رکھنے اور جاہلی نظام حیات کا دشمن ہونے کے باوجود اس جاہلی معاشرے کی تعمیر اور خدمت میں مصروف ہوں گے اور ہر وقت اسے تقویت پہنچاتے رہیں گے۔ چلتی پھرتی زندہ لاشوں کی طرح یہ جاہلی معاشرے کی بقا اور دوام کے لئے اپنے وسائل صرف کریں گے۔ ان کی قابلیتیں' ان کے تجربات اور ان کی چستی اس جاہلی معاشرے کے زندہ اور مضبوط بنانے میں صرف ہوگی حالانکہ ان کی ساری تگ و دو اسی امر کے لئے ہونی چاہئے کہ جاہلی معاشرہ کو توڑ کر اسلامی سوسائٹی کو برپا کیا جائے۔

اس لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ اسلام کا بنیادی عقیدہ پہلے ہی مرحلہ میں ایک ایسی اجتماعی تحریک کی شکل میں نمودار ہونا چاہئے جو اس جاہلی تحریک سے الگ اور مستقل بالذات ہو۔ جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس اجتماعی تحریک کا محور ایسی قیادت ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو' جس کا نصب العین یہ ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ وحدہ لاشریک کی الوہیت' ربوبیت' قوامیت حاکمیت اور اس کے غلبہ و اقتدار اور شریعت کی طرف دعوت دے۔

اور جو شخص بھی پورے شعور کے ساتھ کلمہ شہادت ادا کر کے اس تحریک میں شامل ہو' وہ اس جاہلی سوسائٹی سے ربط و تعلق کو کاٹ کر الگ ہو جائے ----- یہ وہی جاہلی سوسائٹی ہے جس سے کٹ کر وہ یہاں آیا ہے ----- اسی طرح اسے جاہلی سوسائٹی کی قیادت سے بھی الگ ہونا پڑے گا ----- یہ جاہلی قیادت مذہبی شکل میں بھی ہوتی ہے' یہ کاہن ہیں' پجاری ہیں اور مجاور ہیں۔ جادوگر اور قیافہ شناس ہیں اور یہ جاہلی قیادت سیاسی' قبائلی اور معاشی رنگ میں بھی ہوتی ہے۔ اسلام کے عہد اول میں دونوں طرح کی یہ قیادت قریش کی جاہلی سوسائٹی میں موجود تھی' اسے اس جاہلی قیادت سے الگ ہونا پڑے گا اور اسے اپنی وفاداری اسلامی تحریک اور اس کے قائدین تک محدود رکھنی پڑے گی۔

بنیادی عقیدہ اجتماعی تحریک کی شکل میں پہلے ہی مرحلہ میں نمودار ہو جانا چاہئے۔ جب کہ ایک مسلمان آدمی شعور کے ساتھ از سرنو اپنے ایمان کو تازہ کرتے ہوئے "شہادتیں" ادا کرے کیونکہ مسلم سوسائٹی کا وجود خارجی اس کے بغیر متحقق ہی نہیں ہو سکتا' اس بنیادی عقیدہ کا محض دلوں میں راسخ ہو جانے سے ہی مسلم سوسائٹی وجود میں نہیں آ جاتی۔ چاہے اس کے افراد کی تعداد کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو جب تک کہ یہ افراد اجتماعی تحریک کی شکل میں منظم ہو کر باہمی تعاون کے ساتھ کام نہ کریں۔ یہ اجتماعی تحریک اپنے ذاتی وجود کے ساتھ مستقل طور پر قائم نہ ہو۔ اس کے ممبر تحریک کے ارکان کی حیثیت سے اپنا اجتماعی فریضہ انجام نہ دیں۔ جس طرح کہ ایک زندہ جسم کے اعضاء اپنا تکوینی وظیفہ عمل ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ارکان مسلم سوسائٹی اپنے وجود کو برقرار رکھنے' اس کی جڑوں کو اور گہرا کرنے اور اسے مزید وسعت دینے کا کام کریں۔ نیز انہیں ان عوامل کے مقابلہ میں اپنا دفاع بھی کرنا ہو گا' جو اس سوسائٹی کو ملیامیٹ کرنے کے درپے ہیں اور یہ سارا کارنامہ انہیں جاہلی قیادت کے مقابلہ میں اپنی مستقل قیادت کی راہنمائی میں انجام دینا ہو گا جو انہیں منظم اور متحرک رکھے گی اور انہیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے تحریک کی جڑوں کو اور گہرا کرنے اسے اور وسیع کرنے کی طرف متوجہ کرے گی اور اس طرح جاہلی تحریکات مقابلہ میں کھڑا کرے گی۔

اسلام اسی طرح وجود میں آیا کہ لوگوں کے سامنے پہلے ایک مجمل مگر جامع اصول اور نظریہ حیات رکھا گیا اور پھر ایک تحریک اٹھی اور ایک نئے معاشرے کی بنیاد پڑ گئی اور یہ نیا معاشرہ نہ صرف یہ کہ اس جاہلی معاشرے سے مختلف تھا بلکہ اس کے وجود کے لئے چیلنج بن گیا اور اس کے بالمقابل آ کھڑا ہوا۔ کسی دور میں بھی اسلام ایک مجرد نظریہ کی شکل میں نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ ایک فعال تحریک کی شکل میں آیا اور آئندہ بھی اس کا احیاء ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس صورت ہی میں ہو سکتا ہے کہ اس کی پشت پر ایک فعال تحریک ہو اور یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ ایک غالب جاہلی معاشرہ کے زیر سایہ اسلامی معاشرہ کا از سرنو احیاء ہو سکے۔ محض نظریاتی بنیاد پر اسلام کا احیاء کسی وقت اور کسی جگہ بھی ممکن نہیں جب تک کہ اس کی پشت پر عملاً تحریک موجود نہ ہو۔

جب ہم یہ سمجھ گئے کہ اس دین کا فطری ارتقاء یوں ہوتا ہے اور اس کا یہ فلسفہ ہے تو ہم اس وقت اس دین کی حقیقت اور اس کے تحریکی مزاج کو سمجھ سکیں گے۔ جب ہم نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا جس کی پوری تفصیلات ہم نے سورت انفال کے مقدمے میں دے دی ہیں۔ نیز صرف اس پس منظر ہی کے نتیجے میں ہم ان آیات کی حقیقت اور ان احکام کے مفہوم کو سمجھ سکیں گے جو اس سورت کے خاتمے پر دیئے گئے ہیں۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تنظیم کیا ہوگی؟ مہاجرین اور انصار کے تعلقات کیا ہوں گے؟ ان کی طبقاتی حیثیت کیا ہوگی؟ مقامی معاذین اور انصار کے تعلقات مہاجرین کے ساتھ کیا ہوں گے۔ نیز ان لوگوں کے ساتھ ان دونوں کے تعلقات کیسے ہوں گے جنہوں نے اس مرحلے پر ہجرت نہیں کی اور دوسرے کفار کے ساتھ اس اسلامی معاشرے کے بین الاقوامی تعلقات کیا ہوں گے؟ اور یہ تمام تدبر اور ادراک اس دین کے عضویاتی تشخص اور اس کے تحریکی ارتقاء کے تصورات کے رنگ میں ضروری ہوگا۔

اب ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم ان اصولوں کی روشنی میں ان آیات پر تفصیلی بحث کر سکیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۷۲) وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِیْرٌ (۷۳) (۸: ۷۲ — ۷۳)

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے' اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی' وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے' لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اسے دیکھتا ہے جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔"

مکہ مکرمہ میں جو شخص کلمہ شہادت پڑھ لیتا تھا' وہ اپنے خاندان' اپنے قبیلے' اپنے رشتہ داروں اور دور جاہلیت کی قیادت سے اپنے تعلقات ولایت توڑ دیتا تھا۔ اور اپنی ولایت اور قیادت کی زمام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دیتا تھا۔ اور وہ اس معاشرے اور خاندان کا فرد بن جاتا تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اٹھ رہا تھا اور قریش کا معاشرہ اپنے ذاتی قائم جاہلی وجود کی مدافعت کر رہا تھا کیونکہ یہ نیا معاشرہ درحقیقت سابق قائم معاشرے کے

خلاف بغاوت کر رہا تھا اور یہ کشمکش ان دونوں معاشروں کے درمیان جنگ بدر کے میدانی معرکے سے بہت پہلے برپا تھی اور قریش کا معاشرہ یہ چاہتا تھا کہ اس جدید معاشرے کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔

ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جدید معاشرے کے افراد کے درمیان مواخات قائم فرمائی۔ اس طرح کہ قریش کے جاہلی معاشرے سے جو جو افراد ٹوٹ کر آئے تھے' وہ اس جدید باہم متکافل (Secure) معاشرے کے فرد بنتے چلے جاتے تھے اور یہ نیا معاشرہ خون اور نسب کے رشتوں کے بجائے نظریات و عقائد کے رشتوں پر قائم تھا۔ اور لوگوں کی وفاداریاں اس جدید قیادت کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جاتی تھیں اور قدیم جاہلی قیادت سے کٹتی چلی جاتی تھیں۔ نیز ان کی محبت اس قدیم جاہلی معاشرے سے کٹ کر اس جدید اسلامی معاشرے سے وابستہ ہو جاتی تھی۔

اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے دارالہجرت (مدینہ) کے دروازے کھول دیئے۔ مدینہ میں اہل ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے اسلامی قیادت کے ہاتھ پہ غیر مشروط بیعت کر لی اور خوشی اور ناخوشی ہر حالت میں سمع و اطاعت کا عہد کر لیا اور یہ ذمہ لے لیا کہ وہ ہر حالت میں رسول اللہ کی حفاظت و حمایت کریں گے' جس طرح وہ اپنے اموال' اولاد اور اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور پھر مدینہ میں رسول اللہ کی قیادت میں اسلامی مملکت قائم ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مہاجرین کے درمیان دوبارہ مواخات قائم کی اور یہ مواخات بھی خون اور نسب کے رشتوں کے مقابلے میں اسلامی تصورات پر قائم ہوئی۔ اس مواخات میں بھی سابقہ مواخات کے پورے تقاضے ملحوظ رکھے گئے تھے یعنی وراثت دیت اور دوسرے معاوضوں میں اس کے افراد ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے بعینہ اسی طرح جس طرح خون اور نسب کے رشتوں کے تحت سابقہ نظام میں مواخات قائم تھی۔ اس سلسلے میں حکم یہ تھا:

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی' وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔"

یہ لوگ ایک دوسرے کی نصرت میں بھی ولی ہیں' ایک دوسرے کی میراث میں بھی ولی ہیں' دیت معاوضے اور تمام اجتماعی ادائیگیوں میں بھی ایک دوسرے کے ولی ہیں جو سابقہ ادوار میں خون اور نسب کے رابطے پر عائد ہوتی تھیں۔

ایک قسم کے لوگ وہ تھے جو دین اسلام میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن وہ عملاً ہجرت کر کے اسلامی معاشرے میں داخل نہ ہوتے تھے۔ یعنی انہوں نے مدینہ کی اسلامی ریاست کی طرف ہجرت نہ کی جہاں اسلامی شریعت نافذ تھی۔ جہاں اسلامی قیادت کا انتظام و انصرام تھا۔ اور وہ اس معاشرے کی طرف نہ آئے جہاں شرعی قوانین حکمران تھے۔ اور جس میں مکمل اسلامی تشخص اور وجود قائم تھا۔ جبکہ مکہ میں اس معاشرے کا وجود نسبتاً کم درجے میں قائم تھا یعنی وہاں بھی لوگ جدید قیادت کے وفادار تھے اور ایک اجتماعی تحریکی شکل میں وہ یکجا ہو گئے تھے اور اپنا ایک مستقل وجود رکھتے تھے جو اس وقت کے قائم جاہلی وجود سے کٹ گئے تھے اور اپنے اس نئے وجود کے ساتھ پورے جاہلی معاشرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

غرض ایسے لوگ مکہ کے اردگرد بھی موجود تھے اور مدینہ کے اردگرد بھی موجود تھے۔ جنہوں نے عقیدہ قبول کر لیا تھا لیکن وہ جاہلی معاشرے سے کٹ کر اسلامی معاشرے میں داخل نہ ہوئے تھے۔ اور وہ پوری طرح مدینہ میں قائم اسلامی حکومت اور قیادت کے ماتحت نہ تھے اور نہ وہ اس کے تابع تھے۔

یہ لوگ اسلامی معاشرے کے ممبر تصور نہ ہوتے تھے' اس لئے اللہ نے ان کو اسلامی معاشرے کی ولایت کے حقوق

نہ دیجئے کیونکہ یہ لوگ عملاً اسلامی معاشرے کے افراد نہ تھے اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا:

"رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ہاں اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔"

یہ حکم جیسا کہ ہم نے کہا' اس دین کے مزاج کے ساتھ اور اس کی عملی تحریکی سرگرمیوں کے ساتھ منطقی ربط رکھتا ہے کیونکہ یہ لوگ دراصل اسلام کے عملی معاشرے کے اجزاء نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اور اسلامی معاشرے کے درمیان ولایت کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ چونکہ عقائد و نظریات کا رابطہ موجود ہے لیکن محض نظریاتی رابطے کے نتیجے میں ان لوگوں کی ذمہ داری اسلامی معاشرے پر عائد نہیں ہوتی۔ الا یہ کہ ان کے دین اور نظریہ پر کوئی دست درازی ہو رہی ہو مثلاً ان پر ان کے نظریات کی وجہ سے تشدد ہوتا ہو۔ایسے حالات میں اگر وہ مسلمانوں سے امداد طلب کریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کو امداد دیں۔بشرطیکہ اس امداد کا اثر اس معاہدے پر نہ پڑتا ہو جو اسلامی معاشرے نے کسی دوسری قوم کے ساتھ کیا ہو۔اگرچہ یہ معاہدہ کرنے والی حکومت ہی یہ تشدد کر رہی ہو۔اس لئے کہ اصل اہمیت اسلامی معاشرے اور اس کے معاہدات کی ہے' افراد کی نہیں ہے۔کیونکہ معاہدات سے اسلامی معاشرے کے تحریکی منصوبے متاثر ہوتے ہیں' اس لئے معاہدوں کو افراد کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔اگرچہ معاملہ نظریات کی اساس پر تشدد سے ہو لیکن چونکہ تشدد کا شکار ہونے والے مسلمان خود اپنی مرضی سے اسلامی دارالحرت کی طرف نہیں آئے اس لئے ان پر شاید ظالم کو ترجیح دی گئی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں اجتماعی تحریکی مفادات کو افراد کے مقابلے میں کس قدر زیادہ اہمیت حاصل ہے' کیونکہ اسلام کا اجتماعی وجود زیادہ اہمیت رکھتا ہے' بمقابلہ ایک فرد اور اس کے مفادات کے۔

اس پوری اسکیم پر تبصرہ آتا ہے وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۸: ۷۲) "وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے) لہٰذا تمہارا پورا عمل اس کی نظروں میں ہے۔وہ ان اعمال کی ظاہری صورت اور باطنی مقاصد سے اچھی طرح باخبر ہے۔ان کے مقدمات اور ان کے نتائج سب کو جانتا ہے۔ان کے اسباب اور ان کے آثار کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔

جس طرح اسلامی معاشرہ باہم متوازن' متکافل اور معاون اور ذمہ دار ہوتا ہے' اسی طرح جاہلی معاشرہ بھی اپنے افراد کو سوشل سیکورٹی فراہم کرتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۸: ۷۳) "اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایک دوسرے کے ولی ہیں۔" جیسا کہ اوپر ہم نے تشریح کی' دو محاذوں کی پوزیشن ایسی ہی ہے۔ جاہلی معاشرہ بھی فرداً فرداً نہیں چلتا۔وہ بھی ایک عضویاتی تشخص کا حامل ہوتا ہے۔اس کے اعضاء جوارح اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح افراد کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے ذاتی تشخص کا دفاع اسی طرح کرتا ہے جس طرح اسلامی معاشرہ کرتا ہے' لہٰذا کفار ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں۔اور اسلام بھی اہل کفر کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک محاذ تصور کرتا ہے اور اسلام بھی ان کے معاشرے کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک معاشرے کی شکل میں پیش کرتا ہے لیکن اسلامی معاشرہ کفر کے مقابلے میں زیادہ گہری' مضبوط اور قوی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ اگر اسلامی معاشرہ کفار کے مقابلے میں ایک ایسا ہی اجتماعی معاشرہ کھڑا کر کے نہ لائے گا تو جاہلی معاشرے کی طرف سے اسے ہر وقت فتنہ و فساد کا خطرہ درپیش رہے گا کیونکہ

انفرادی طور پر مسلمان جاہلیت کے مضبوط اور باہم پیوستہ اجتماعی معاشرے کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور دنیا میں ایک عظیم فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا کیونکہ جاہلیت کا معاشرہ اسلام پر غالب آ جائے گا اور اس صورت میں جاہلیت اسلام پر دست درازی اور سرکشی کرے گی اور بندوں کی خدائی اللہ تعالیٰ کی خدائی پر غالب آ جائے گی۔ اور لوگ پھر سے انسانوں کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے اس سے بڑا فساد اور کیا ہو سکتا ہے؟

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (۸: ۷۳) "اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد برپا ہو گا۔" اس تنبیہہ کے بعد اور کیا تنبیہہ ہو گی اور اس ڈراوے کے بعد اور کیا ڈراوا ہو گا۔ وہ مسلمان جو اپنے اجتماعی وجود کی اساس اس قسم کے عضویاتی اور تحریکی اتحاد پر نہیں رکھتے جس کے افراد کے درمیان گہری اخوت ہو اور جس کی ایک قیادت ہو' وہ اللہ کے سامنے اس عظیم فساد کے ذمہ دار ہوں گے جو ان کے اجتماعی وجود کو لاحق ہو گا اور قیامت کے دن تو بہرحال تمام ذمہ داریاں ان پر ہوں گی کیونکہ اگر مسلمان ایسا نہ کریں گے تو ان کا معاشرہ فساد کا شکار ہو گا۔

اس کے بعد قرآن کریم صریح الفاظ میں ان کو بتاتا ہے کہ حقیقی ایمان کا تحقق یوں ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸: ۷۴) "جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی' وہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔" وہی سچے مومن ہیں 'بلکہ وہی مومن ہیں' کے الفاظ پر غور کریں۔ گویا ایمان کی حقیقی صورت یہی ہے۔ اور اسی صورت میں اور اسی شکل میں حقیقی دین نشوونما پاتا ہے۔ دین اسلام کی حقیقت محض اعلان نظریہ سے وجود میں نہیں آتی۔ نہ مجرد عقیدے کو قبول کر لینے سے دین کی حقیقت وجود میں آ جاتی ہے' نہ صرف دین کے شعائر اور مراسم عبودیت کے بجا لانے ہی سے دین وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ دین ایک ایسا نظام حیات ہے اور وہ عملاً تب ہی وجود میں آتا ہے کہ جب وہ اجتماعی تحریکی معاشرے کی شکل میں وجود میں آئے۔ صرف عقیدے کی صورت میں اقرار سے "حکماً" تو دین وجود میں آ جاتا ہے لیکن حقیقتاً وجود میں نہیں آتا۔ حقیقتاً تب وجود میں آتا ہے جب وہ ایک عملی تحریکی معاشرے اور اجتماعیت کی شکل اختیار کرے۔

ایسے ہی لوگ حقا مومن ہیں اور ان کے لئے مغفرت اور رزق کریم واجب ہے۔ یہاں رزق کریم کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہاں جہاد فی سبیل اللہ' انفاق فی سبیل اللہ' پناہ گاہ کی فراہمی اور امداد کی فراہمی اور دوسری مشکلات کا موضوع چل رہا ہے اور ان سب کاموں کے اوپر اجر و صلہ اللہ کی مغفرت ہے جو عظیم انعام اور مہمان نوازی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اگرچہ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کا درجہ بلند ہے' لیکن بعد میں آنے والے لوگ بھی انہی کے ساتھ اور ان کے حکم میں شامل ہیں اور یہ بعد میں آنے والے بھی ولایت اور اسلامی تحریکی معاشرے کی ممبری کے مستحق ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (۸: ۷۵) ع
"اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں۔" ہجرت کا یہ نظام اس وقت تک قائم رہا جب تک مکہ فتح نہ ہو چکا۔ فتح مکہ کے بعد عرب کی سرزمین اسلامی قیادت کے زیرنگیں آ گئی۔ اور لوگ سب کے سب اسلامی معاشرے میں منظم ہو گئے۔ لیکن فتح مکہ کے بعد ہجرت کا یہ حکم ختم کر دیا گیا اور جہاد کو جاری رکھا گیا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ پوزیشن ۱۲ سو سال تک قائم رہی۔ اور اسلام اس کرۂ ارض پر حکمران رہا۔ اسلامی نظام قانون نافذ رہا اور اسلامی قیادت حاکم اور حکمران رہی۔ لیکن آج اس پوری دنیا پر جاہلیت پھر سے غالب اور حکمران ہو گئی ہے اور اس وقت کرۂ ارض کے کسی خطے میں بھی لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کی شریعت نافذ نہیں بلکہ اقتدار اور قانونی نظام پوری دنیا میں طاغوت کا چل رہا ہے۔ لوگ اپنے جیسے انسانوں کی غلامی میں داخل ہو گئے ہیں جبکہ اسلام نے ان کو انسانوں کی غلامی سے نکال دیا تھا۔ لہٰذا اب تحریک اسلامی دوبارہ انہی ادوار سے گزرے گی جس طرح پہلے وہ گزری تھی۔ اس نے تنظیم شروع کی تھی' مرحلہ وار تحریک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دارالہجرت قائم ہو گا اور پھر وہ دارالاسلام اور دارالہجرت سے پھیلاؤ شروع کرے گی اور پھر ہجرت ختم ہو گی مگر جہاد جاری رہے گا جس طرح پہلی بار میں ہوا۔

پہلی بار جب تحریک اسلامی برپا ہوئی تو اس تحریکی عمل کے لئے کچھ مخصوص احکام تھے۔ اس تحریک پر مخصوص حالات کی وجہ سے کچھ مخصوص ذمہ داریاں تھیں۔ اس وقت اخوت اور برادری کے تعلقات کو خون اور نسب کی بنیادوں سے ہٹا کر اسلامی نظریات کی اساس پر رکھ دیا گیا تھا۔ مواخات کی تمام شکلوں' تمام ذمہ داریوں یعنی برائے اجتماعی تکافل دیت اور دوسرے معاہدات تاوان کو اسلامی اخوت پر قائم کر دیا گیا تھا لیکن جب اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا۔ اور جنگ بدر میں مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہو گیا تو بعض عبوری احکامات میں تبدیلی کر دی گئی کیونکہ یہ عبوری احکامات وقتی اور استثنائی حالات کے لئے تھے۔ اور ان میں سے اہم تبدیلیاں یہ تھیں کہ اجتماعی کفالت' دیت کی ادائیگی اور وراثت کے تعلقات کو لوٹا کر قرابت اور رشتہ داری کی بنیادوں پر قائم کر دیا لیکن اسلامی معاشرے کے اندر اور اسلامی خطوط کے اوپر۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۸: ۷۵) ع "مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔" لہٰذا اسلام کے عملاً قیام کے بعد' اسلام کے دائرے کے اندر اقربا کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ یہ انسان کی فطری خواہش کا ایک پہلو ہے۔ اور اسلام اس بات پر پابندی عائد نہیں کرتا کہ انسان کی فطری خواہشات کو دبایا جائے بشرطیکہ انسان کے یہ فطری میلانات معاشرے کے اسلامی اور اجتماعی پہلو کو نقصان نہ پہنچاتے ہوں اور اسی طرح کے دوسرے فطری احساس و شعور کے لئے مضر نہ ہوں۔ اسلام فطری میلانات کو توڑتا نہیں بلکہ ان کو منضبط کرتا ہے اور منضبط اس طرح کرتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اعلیٰ وجود کے لئے وہ مفید بن جائیں۔ وہ ان کو منضبط بھی اسلامی معاشرے کے اجتماعی وجود کے لئے کرتا ہے۔ اگر اسلامی معاشرے کے اجتماعی وجود کی ضروریات نہ ہوں تو پھر اسلام انسان کے فطری میلانات کو آزاد چھوڑتا ہے۔ اسلامی نظام کے عمومی [illegible] کے اندر۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بعض احکامات عارضی اور عبوری ہوتے ہیں اور یہ اسلام کے تحریکی عمل [illegible] ہوتے ہیں۔

ایسے احکام کو اسلام کے فائنل قانونی احکام تصور نہیں کیا جاتا جو اسلامی معاشرے کے قیام' جاری اور غالب وجود کو جاری رکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لہذا ہمیں ان احکام کو جو اسلام کے ابتدائی قیام کے مرحلے میں وارد ہوئے اور اس کے ان فائنل احکام کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے جو قائم معاشرے کو دائم رکھنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۸: ۷۵) ع "یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔" یہ تبصرہ اور تعقیب ان احکام کے آخر میں نہایت ہی موزوں ہے کہ یہ مختلف احکام اور انتظامی ہدایات اللہ کی طرف سے ہیں اور اللہ نہایت ہی وسیع علم کا مالک ہے۔وہ ہر حکم علم سے دیتا ہے۔یہاں ضروری ہے کہ اس قسم کے اسلامی معاشرے کے قیام و نظام پر ایک نوٹ دے دیا جائے۔

اسلام' امت مسلمہ کو' بنیادی عقیدہ دے کر اپنے مخصوص طریق کار کے تحت' اجتماعی تحریک کے ذریعہ اسے خارجی وجود بخش کر اور اس اجتماعی تحریک کے لئے بنیادی عقیدہ کو اساس بناکر اس لئے برپا کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ انسان کی انسانیت کو نمودار کر دے۔ اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات کو نمودار کر دے۔اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات اپنی تعلیمات اور اپنے شرائع اور احکام میں انسانیت کی اسی نشوونما کو اصل ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

چونکہ انسان تمام حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ بھی وجود میں اشتراک رکھتا ہے۔اس لئے سائنٹیفک جہالت کے علمبردار کبھی کہتے ہیں کہ انسان ایک حیوان ہی تو ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ اس کا وجود محض ایک مادی وجود ہے لیکن یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ حیوانات اور مادہ کے ساتھ وجود میں اشتراک کے باوجود انسان ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو اسے عام مادیات اور حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے ایک منفرد وجود بخشتی ہیں۔اب آکر کہیں اس سائنٹیفک جہالت کے علمبرداروں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے اور وہ واقعاتی حقائق اور مشاہدوں اور تجربوں نے ان کی گردن غرور کو توڑ دیا ہے اور اب وہ بے بس ہوکر اس بات پر مجبور ہوگئے ہیں کہ اخلاص اور تصریح کے بغیر اشاروں اشاروں میں اس حقیقت کا اعتراف کریں۔

جن لوگوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا ہے اور پھر پوری تاریخ انسانی پر بھی ان کی نظر ہے' وہ جانتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات اور اس کے قیام کے طریق کار کے نتائج کس قدر شاندار رہے ہیں۔ اسلام نے جدید معاشرے کی تعمیر' رنگ' وطن' قومیت' ملکی مصالح اور علاقائی تعلقات جیسے کمزور رشتوں کے بجائے صرف ایمان و نظریات اور عقائد و تصورات پر کی ہے اور اس نقطہ نظر سے اس نے انسانی وجود کے حیوانی اور مادی پہلو کو نظرانداز کیا اور انسان کی انسانیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اسلامی سوسائٹی میں داخل ہونے کے دروازے ہر جنس اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لئے کھل گئے اور اس طرح محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے اور حیوانی بندشوں اور باہمی امتیازات میں سے کوئی بندش اور امتیاز درمیان میں نہ رہا۔اس طرح اسلامی معاشرے کی کٹھالی میں بشریت کے مختلف اجناس کی خصوصیات اور قابلیتیں انڈھیل دی گئیں اور کٹھالی میں ان تمام خصائص نے ایک حسین امتزاج کی شکل اختیار کی اور اس خام مواد سے ایک نیا وجود سامنے آیا۔یہ سب کام ایک نہایت مختصر عرصہ میں ہوا اور

اس سے انسانوں کا ایک عجیب یک رنگ و ہم آہنگ گروہ تیار ہو گیا۔ جس نے ایک تابندہ اور عظیم الشان تہذیب کو جنم دیا۔ وہ تہذیب جو اپنے دور میں انسانیت کے استعدادی جوہر کا خلاصہ تھی' حالانکہ اس زمانہ میں آبادیوں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے تھے اور مواصلات کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس اعلیٰ ترین معاشرے میں بیک وقت عربی' فارسی' شامی' مصری' مغربی' ترکی' چینی' ہندوستانی' رومی' یونانی' انڈونیشی اور افریقی اور بے شمار دوسری قوموں اور نسلوں کے لوگ شامل ہو کر اس میں ضم ہو گئے تھے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرہ کی نشوونما میں ان تمام لوگوں کی قابلیتیں اور ذہانتیں مل کر باہمی تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ مصروف عمل ہو گئیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی وقت بھی یہ عظیم الشان تہذیب صرف عربی تہذیب نہیں رہی اور نہ ہی کبھی معروف معنوں میں قومی تہذیب رہی ہے بلکہ یہ ہمیشہ سے فکری تہذیب ہی رہی ہے۔

یہ سب لوگ اس تہذیب میں خالص مساوات کے اصولوں پر جمع ہوئے۔ باہمی مروت اور شفقت نے انہیں جوڑا' منزل مقصود کے اتحاد کی وجہ سے وہ باہم ملے اور اس مقصد اور نصب العین کے لئے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا۔

انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا اور اپنے تمام قومی اور تاریخی خصائص کو ظاہر کیا اور اپنے ذاتی اور موروثی کمالات کو نئے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا' مساوات و اتحاد کی بنیاد پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان سب کا رب حاکم مالک اور خالق ایک ہی ہے۔ اس عقیدہ کے پس منظر میں بلاروک ٹوک انسانیت ابھر آئی۔ وحدت الٰہ کا عقیدہ "وحدت انسان" کا عقیدہ رکھتی ہو۔

معاشرہ مشہور ترین معاشرہ رہا ہے لیکن اس میں بھی متعدد رنگ بے شمار زبانیں اور کئی قومیتیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کا مزاج اور طرز فکر مختلف ہے۔ اس کے باوجود اس معاشرے کی اساس انسانیت یا بلند تر نظریات پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ یہ ایک قسم کا طبقاتی گٹھ جوڑ تھا جس میں ایک طرف اشراف کا طبقہ تھا اور ایک طرف غلاموں اور کمزوروں کا گروہ تھا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ روم امپائر میں فاتح اور مفتوح اقوام علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں۔ رومن فاتح ہر لحاظ سے بزرگ و برتر ہیں اور مفتوح اقوام غلام اور زیر دست ہیں۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے رومی معاشرہ ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا جہاں تک اسلامی معاشرہ پہنچا اور نہ ہی اس نے انسانی تاریخ میں وہ کارنامے سرانجام دیئے جو صحت مند اسلامی معاشرہ کے شایان شان ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بھی کئی معاشرے عالم وجود میں آئے مثلاً انگریزی تہذیب کا قائم کردہ جدید معاشرہ' یہ معاشرہ بھی دراصل رومی معاشرے کا جانشین اور وارث تھا اور عملی میدان میں آکر یہ بھی طبقاتی اور استحصالی معاشرہ ثابت ہوا اور اس کا اصل الاصول یہ رہا کہ انگریز قوم کو قیادت اور برتری کا مقام حاصل رہے۔ اس کا بین ثبوت ان نو آبادیوں کے معاشری اور معاشرتی جائزے سے ملتا ہے جو کسی وقت انگریزوں کے زیر نگیں رہے ہیں اور بعینہ یہی طرز عمل یورپ کی دوسری شہنشاہیتوں اور معاشروں کا رہا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے نو آبادیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہسپانیوی' پرتگالی اور فرانسیسی معاشروں نے اپنی تمام کالونیوں میں وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا اور ان کے طرز عمل نے خود بتا دیا کہ یہ معاشرے کس قدر گھناؤنے' مہلک اور گرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے اشتراکی معاشرہ نمودار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے اساسی اصولوں میں سے رنگ و

قوم و جنس اور زبان و وطن کو خارج کر دیا لیکن اس کی اساس بھی خالص انسانی بنیادوں پر نہ اٹھی بلکہ ان کی نئی طبقاتی کشمکش پر اٹھی - یہ معاشرہ بھی رومی طرز کا طبقاتی معاشرہ بن گیا - فرق صرف یہ ہوا کہ رومی معاشرہ اشراف (Lords) کی حمایت پر سامنے آیا اور اشتراکی معاشرہ مساکین (Labours) کی حمایت میں نمودار ہوا - اس کی تکنیک یہ تھی کہ مزدوروں کے نفوس میں تمام دوسرے طبقات کے خلاف نفرت کے بیج بو دیئے جائیں - چنانچہ خونی کشمکش کا ایک طویل دور شروع ہو گیا ' اور اس میں انسانیت ایسے ایسے مصائب سے دوچار ہوئی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی ' کیونکہ اس کی بنیاد انسانیت کے بجائے خالص حیوانی زندگی پر تھی - اس نے یہ دعویٰ کیا کہ جنسی تعلقات خوراک اور مسکن ہی انسانیت کے بڑے مسائل ہیں اور انہی کے حل میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے - اسی طرح اشتراکیت نے تاریخ کا جدلی فلسفہ پیش کر کے اسے تاریخ تلاش معاش قرار دے دیا۔

لیکن دنیا پر اسلامی معاشرہ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنے نظام حیات میں انسان کی صرف ان خصوصیات کو اجاگر کیا جو خالص انسانی ہیں - اس طرح اس نے انسان کو محض ایک مادے اور ایک حیوان کی سطح سے بہت اونچا کر دیا اور پوری تاریخ انسانیت میں اس پہلو سے اسلامی نظام حیات بے مثال ہے - اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اسلامی نظام حیات کو چھوڑ کر دوسرے نظام اختیار کرتے ہیں ' وہ دراصل انسانیت کے دشمن ہیں اور وہ اعلیٰ انسانی قدروں کی جگہ قوم ' وطن ' جنس اور طبقات کی بنیاد پر انسانی زندگی کو منظم کرنا چاہتے ہیں - حالانکہ ان سے زیادہ کمزور اور گھناؤنی ذلیل چیز کوئی اور نہیں ہے - یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اور فطری اصولوں کے مطابق انسانی معاشرہ کی تعمیر ' خالص انسانی بنیادوں پر نہیں چاہتے اور نہ ہی یہ انسانی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیتے ہیں کہ وہ تمام انسانی تجربوں اور تمام انسانی خصائص و کمالات سے فائدہ اٹھائے اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں :

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا (١٠٣) اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (١٠٤) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (١٠٥) ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا (١٠٦) (١٨: ١٠٣ تا ١٠٦))

"اے محمد" ان سے کہو ' کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں - یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہیں کیا۔ اس لئے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے - قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے - ان کی جزا جہنم ہے کہ اس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے ہیں -

کیونکہ یہ لوگ ترقی کے انسانی خطوط کے خلاف کام کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کو دوبارہ بہائم کے معاشرے کی صورت میں بدلنا چاہتے ہیں جس کا مقصد صرف گھاس اور دانے کی تلاش ہوتی ہے اور یہ لوگ ایسے حالات میں یہ کام کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب کے ذریعہ لوگوں کو ایسی ہدایات دے دی ہیں جن پر تمام انسان مجتمع ہو سکتے ہیں۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اعلیٰ انسانی قدروں پر انسانی معاشرے کو استوار کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ لوگ جو خالص حیوانی نظریات پر معاشرے چلانا چاہتے ہیں، جامد رجعت پسند اور دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ تمام خوش نما باتیں اور تمام الزامات اس لئے ہیں کہ یہ اعلیٰ انسانی قدروں سے بھاگنا چاہتے ہیں۔

لیکن اللہ اپنے امور پر خود اختیار رکھتا ہے۔ اس لئے یہ پستیاں جو انسانی معاشروں پر غالب آگئی ہیں اور انسان کو حیوان محض بنا دیا گیا ہے، ان کے لئے دوام مقدر نہیں ہے۔ عنقریب وہ روشنی پھیلے گی اور وہ معاشرے وجود میں آئیں گے جن کو اللہ پسند کرتا ہے۔ انسانیت عنقریب عزت کا مقام دوبارہ پالے گی جس طرح پہلی بار انسانیت انسانی قدروں پر اکٹھی ہوئی تھی اور تاریخ میں اس کی مثال نہیں ہے۔ وہ آج بھی تاریخ کے افق پر روشن ہے اور لوگوں کے لئے ایک مثال ہے اور دوبارہ وہ معاشرہ منظم ہو گا اور کسی نہ کسی دن ایک مثالی معاشرہ ہو گا۔ ان شاء اللہ!

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ------- ۱۰

سورہ التوبة — ۹

آیات ۱ ـــ تا ـــ ۹۳

سورۂ التوبہ ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور اگر یہ نہ کہا جائے کہ یہ قرآن کی آخری سورت ہے تو اس کا تعلق نزول قرآن کے بالکل آخری دور سے بہرحال ہے۔ کیونکہ راجح روایات میں ہے کہ سورت النصر آخری سورت ہے۔ چنانچہ اس میں امت مسلمہ اور کرۂ ارض پر رہنے والی دوسری اقوام کے درمیان تعلقات سے متعلق جو احکام و قوانین ہیں' وہ آخری اور فائنل قوانین ہیں۔ اس سورت میں خود مسلم معاشرے کے اندر پائے جانے والے مختلف طبقات کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ ہر ایک کے حالات و کوائف بیان کئے ہیں۔ یہاں طبقات سے مراد وہ طبقات نہیں ہیں جن کے لئے آج کل یہ لفظ استعمال ہوتا ہے بلکہ ان سے مراد وہ گروہ ہیں جو اسلامی تصورات کے مطابق مختلف گروہ قرار پائے ہیں' مثلاً انصار' مہاجرین' اہل بدر' اصحاب بیعت رضوان' وہ لوگ جنہوں نے قبل فتح مکہ مال و دولت اسلام کی راہ میں خرچ کئے' وہ جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اپنا مال خرچ کیا' وہ جو جہاد میں جانے کے بجائے گھر بیٹھ گئے اور پھر وہ جو منافق رہے' غرض اس سورت میں اسلامی معاشرے کے شب و روز اور ان میں مذکورہ تمام طبقات اور گروہوں کے حالات بڑی تفصیل اور تحدید کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

اس پہلو سے اس سورت کی اہمیت بہت زیادہ ہے کہ اس میں تحریک اسلامی کے مختلف مراحل' مختلف اقدامات بیان ہوئے ہیں۔ خصوصاً جب اس کے فائنل احکامات کا مقابلہ ان احکامات سے کیا جائے جو اس سے متصلاً پہلی سورت میں تھے اور جو وقتی تھے۔ یہ تقابلی مطالعہ بتائے گا کہ یہ انداز تفسیر کس قدر مضبوط اور فیصلہ کن ہے۔ اور اگر یہ انداز مطالعہ اختیار نہ کیا جائے تو احکام و ضوابط کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص ان آیات کو لے جو ایک خاص مرحلے کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کو آخری اور فائنل احکام قرار دے اور ان آیات میں تاویل شروع کر دے جن میں آخری اور فائنل ہدایات دی گئی تھیں تاکہ یہ فائنل ہدایات ان آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو وقتی تھیں۔ خصوصاً جہاد اسلامی اور مسلم معاشرے اور دوسرے معاشروں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کے موضوع سے متعلق۔ امید ہے کہ ہم ان میں سے بعض موضوعات کی وضاحت تشریح آیات کے ضمن میں اور سورت توبہ کے اس مقدمے میں کر سکیں گے۔ یہ سورت کب نازل ہوئی؟ اس سورت کے موضوعات کے مطالعے' ان کے بارے میں روایات و احادیث کے مطالعے اسباب نزول کی روایات کے ملاحظے اور ان تاریخی حالات و واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت پوری کی پوری نویں صدی ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ دفعتہً نازل نہیں ہوئی ہے۔ ہم جزم کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس سورت کے مختلف حصے کس کس وقت نازل ہوئے' البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورت تین مرحلوں میں نازل ہوئی ہے۔ پہلا حصہ نویں سال ہجری میں غزوۂ تبوک سے قبل ماہ رجب میں نازل ہوا۔ دوسرا حصہ اس جنگ کے لئے تیاریوں کے دور میں اور جنگ کے دوران نازل ہوا اور تیسرا حصہ اس وقت نازل ہوا جب مسلمان اس غزوہ سے واپس ہو گئے۔

البتہ سورت کا ابتدائی حصہ یعنی آیت ۱ تا ۲۸ آخر میں سن نو ہجری کے آخری ایام میں نازل ہوئے یعنی حج سے قبل ذوالقعدہ یا ذوالحجہ میں۔ اجمالاً اسی قدر بات کہی جا سکتی ہے جس پر دل مطمئن ہوتا ہے۔

---ooo---

اس سورت کے پہلے حصے میں یعنی آیت ۱ تا ۲۸ جزیرۃ العرب میں بسنے والے مشرکین اور مسلمانوں کے تعلقات کی فائنل ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ اس ضابطہ بندی کے حقیقی اور عملی اسباب، اس کی تاریخی وجوہات اور نظریاتی اساسوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ قرآن میں اشاراتی اسلوب اور موثر انداز بیان، فیصلہ کن اور واضح طرز تعبیر کے ساتھ پیش کیا گیا۔ مناسب ہو گا کہ اس کے چند نمونے برائے غور آپ کے سامنے پیش کیے جائیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱) فَسِيْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِی الْكٰفِرِيْنَ (۲) وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳) اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٤) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٥) وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (٦) كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٧) كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً

يرضونكم بافواههم وتابى قلوبهم واكثرهم فسقون (٨) اشتروا بايت الله ثمنا
قليلا فصدوا عن سبيله انهم سآء ما كانوا يعملون (٩) لا يرقبون في مؤمن الا ولا
ذمة واولئك هم المعتدون (١٠) فان تابوا واقاموا الصلوة واتوا الزكوة
فاخوانكم في الدين ونفصل الايت لقوم يعلمون (١١) وان نكثوا ايمانهم من
بعد عهدهم وطعنوا في دينكم فقاتلوا ائمة الكفر انهم لا ايمان لهم لعلهم
ينتهون (١٢) الا تقاتلون قوما نكثوا ايمانهم وهموا باخراج الرسول وهم بدءوكم
اول مرة اتخشونهم فالله احق ان تخشوه ان كنتم مؤمنين (١٣) قاتلوهم
يعذبهم الله بايديكم ويخزهم وينصركم عليهم ويشف صدور قوم مؤمنين
(١٤) ويذهب غيظ قلوبهم ويتوب الله على من يشآء والله عليم حكيم (١٥)
ام حسبتم ان تتركوا ولما يعلم الله الذين جهدوا منكم ولم يتخذوا من دون
الله ولا رسوله ولا المؤمنين وليجة والله خبير بما تعملون (١٦) ما كان
للمشركين ان يعمروا مسجد الله شهدين على انفسهم بالكفر اولئك حبطت
اعمالهم وفي النار هم خلدون (١٧) انما يعمر مسجد الله من امن بالله واليوم
الاخر واقام الصلوة واتى الزكوة ولم يخش الا الله فعسى اولئك ان يكونوا من
المهتدين (١٨) اجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجد الحرام كمن امن
بالله واليوم الاخر وجهد في سبيل الله لا يستون عند الله والله لا يهدي القوم
الظلمين (١٩) الذين امنوا وهاجروا وجهدوا في سبيل الله باموالهم
وانفسهم اعظم درجة عند الله واولئك هم الفائزون (٢٠) يبشرهم ربهم

بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ (۲۱) خٰلِدِينَ فِيهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ
عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيمٌ (۲۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۳)
قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ
اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ
رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ (۲٤) لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ
كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ
(۲۵) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا
وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۲٦) ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ
فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۸) (۹:۱ تا ۲۸) ”جن لوگوں کے ساتھ تم نے صلح دامن کا معاہدہ کیا تھا اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان کو صاف صاف جواب ہے۔ پس اے مشرکو ملک میں چار مہینے چل پھر لو، کوئی روک ٹوک نہیں اور جان لو کہ تم اللہ کو کبھی عاجز نہ کر سکو گے اور اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے منادی کی جاتی کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بری الذمہ ہے۔ اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر روگردانی کرتے رہے تو جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور اے پیغمبر کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دے۔ ہاں مشرکین میں سے جن لوگوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کسی قسم کی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی وہ مستثنیٰ ہیں۔ تو ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے اس کی مدت تک پورا کرو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔ پھر جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ، قتل کرو اور انہیں گرفتار کرو اور ان کا محاصرہ کرو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو پھر

اگر وہ توبہ کر لیں ، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو کیونکہ اللہ غفور و رحیم ہے اور اے پیغمبر مشرکین میں سے کوئی پناہ مانگے تو پناہ دے دو تاکہ وہ اچھی طرح کلام الہٰی سن لے پھر اسے اس کے امن کی جگہ پہنچا دو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ علم نہیں رکھتے ۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکین کا عہد اللہ اور اس کے رسول ؐ کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب عہد کیا تھا اور انہوں نے اسے نہیں توڑا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہیں ، تم بھی ان کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ عہد کیسے ہو سکتا ہے ۔ جن کا حال یہ ہے کہ اگر تم پر غلبہ پائیں تو تمہارے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس کریں اور نہ عہد و پیمان کا یہ لوگ اپنی زبانوں سے تمہیں راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کے دل ان باتوں سے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں ۔ ان لوگوں نے اللہ کی آیتیں تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالیں ۔ پھر اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنے لگے ۔ افسوس ان پر بہت ہی برے کام تھے جو یہ کرتے رہے ۔ یہ کسی مومن کے بارے میں نہ قرابت کا پاس کرتے ہیں نہ عہد و پیمان کا اور یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں ۔ بہرحال اگر یہ توبہ کر لیں ، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جو لوگ سمجھ دار ہیں ان کے لئے ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو ان کفر کے سرغنوں سے جنگ کرو ۔ ان کی قسمیں ، قسمیں نہیں اور تمہیں ان سے جنگ اس لئے کرنی چاہئے کہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائیں ۔ مسلمانو کیا تم ان سے نہ لڑو گے جنہوں نے عہد کرنے کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال دینے کا قصد کیا اور تم سے لڑائی میں پہل بھی انہوں نے کی ۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو ۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو ۔ مسلمانو ان لوگوں سے بلا تامل لڑو ۔ اللہ تمہارے ہی ہاتھوں انہیں عذاب دے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور ان پر تمہیں غلبہ دے گا اور مومنوں کو اور ان کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں میں کافروں کی طرف سے جو غصہ بھرا ہوا ہے اس کی خلش کو بھی دور کرے گا اور جس کی چاہے توبہ قبول فرمائے گا اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے ۔

مسلمانو کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ سستے چھوٹ جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا جگری دوست نہ بنایا ۔ اور یاد رکھو جو کچھ بھی تم لوگ کرتے ہو ، اللہ کو اس کی سب خبر ہے ۔ مشرکین کو یہ حق نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اور مشرکانہ اقوال و افعال سے اپنے اوپر کفر کی گواہی بھی دیتے جائیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سارے عمل اکارت گئے اور یہ دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۔ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا تو ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں ۔ نماز قائم کرتے ہوں ، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں ۔ سو ایسے لوگوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہدایت پانے والے ہوں گے ۔ لوگو کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے والے اور مسجد حرام کو آباد رکھنے کو اس شخص کے عمل کے برابر سمجھ لیا ہے ۔ جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ۔ اللہ کے نزدیک تو یہ لوگ ایک دوسرے کے برابر نہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا ۔ اللہ کے نزدیک درجے میں بڑے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور

ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی کی بشارت دیتا ہے۔ نیز ایسے باغوں کی جن میں ان کی دائمی آسائش ملے گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے پاس نیک کرداروں کے لئے بڑا اجر ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں تو ان کو اپنا رفیق نہ بناؤ اور تم میں سے جو انہیں رفیق بنائیں گے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر یہ ساری چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ وہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ مسلمانو! اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کی ہے اور خاص کر جنگ حنین کے دن جب کہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے مگر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل فرمایا اور مدد کو فرشتوں کے ایسے لشکر اتارے جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے اور اس طرح ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا تھا' سخت سزا دی اور کافروں کی یہی جزا ہے۔ پھر تم دیکھ چکے ہو کہ سزا کے بعد اللہ جسے چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی دیتا ہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہ حقیقت ہے کہ مشرک ناپاک ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ آنے پائیں۔ اگر ان کے ساتھ لین دین بند ہو جانے سے تمہیں مفلسی کا اندیشہ ہے تو اللہ پر بھروسہ رکھو وہ چاہے گا تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

درج بالا جن آیات کا ہم نے اقتباس پیش کیا۔ ان میں اور اس سبق کی تمام دوسری آیات میں اس بات پر نہایت ہی تاکید اور شدت سے زور دیا گیا ہے کہ مشرکین عرب کے خلاف فیصلہ کن قدم اٹھاؤ اور مسلمانوں کو اس بات پر برانگیختہ کیا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ بائیکاٹ کرو اور پورے جزیرۃ العرب میں ان کے خلاف جنگی کاروائی شروع کر دو۔ اس شدید تاکید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جماعت مسلمہ یا ان میں سے بعض افراد کے رویوں میں یہ خوف تھا کہ پورے جزیرۃ العرب میں مشرکین کے خلاف بیک وقت اس قسم کی کاروائی شروع کرنا مناسب امر نہیں ہے یا ان کو فیصلہ کن انداز میں اس قسم کی کاروائی خوفناک نظر آتی تھی اور وہ اس بارے میں یکسو نہ تھے۔ اور اس کی بعض وجوہات بھی تھیں جن کے بارے میں ہم عنقریب اس تبصرے اور پھر تشریح آیات کے وقت کلام کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

اس سورت کے دوسرے حصے میں 'اسلامی معاشرے اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی حد بندی کی گئی اور اس میں جو احکامات دیئے گئے ہیں' وہ فائنل ہیں اور ان فیصلوں کے نظریاتی' تاریخی اور عملی اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے ان تعلقات کی ایسی ضابطہ بندی کی ہے۔ اس حصے میں اسلام اور اسلام کی مستقل حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب نے نظریاتی اور عملی ہر لحاظ سے اپنے صحیح دین سے انحراف کر لیا ہے۔ اس لئے اب وہ عملاً اس دین پر قائم نہیں رہے جو اللہ نے ان کی طرف بھیجا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اہل کتاب قرار پائے تھے مثلاً درج ذیل آیات پر غور فرمائیں۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے۔ اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں مانتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ (۳۰) اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۹ : ۳۰ – ۳۱) "یہود کہتے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان پر یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔"

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۳۲) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹ : ۳۲ – ۳۳) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۳٤) یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹ : ۳٤ — ۳۵) "اے ایمان لانے والو! ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دردناک عذاب کی خوشخبری دو' ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اس سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

اس حصے میں جو اسلوب گفتگو اپنایا گیا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات لوگوں کے اس خلجان کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئیں' جو وہ اہل کتاب کے خلاف کسی سخت لڑائی کے سلسلے میں اپنے اندر پاتے تھے' یا یہ تردد اور خوف ان میں سے بڑی اکثریت کے دلوں میں پایا جاتا تھا کہ وہ اہل کتاب کے حوالے سے پہلی آیت کے مطابق تعلق کا آغاز کس طرح کریں' لیکن درحقیقت ان آیات میں روئے سخن رومیوں کی طرف تھا جن کے ساتھ شام اور عرب کے عیسائیوں کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ رومیوں کے حوالے سے یہ تردد اور خوف بجا بھی تھا' اس لئے کہ جزیرۃ العرب کے باشندوں کے ہاں رومیوں کی تاریخی شہرت تھی۔ اگرچہ آیت کے الفاظ تمام اہل کتاب کے لئے عام ہیں اور آیت میں مذکور ہونے والے اوصاف سب ان پر منطبق تھے جیسا کہ آیت کی تشریح کے وقت ہم بتائیں گے۔

اس سورت کے تیسرے حصے میں ان کاہل اور سست لوگوں کا ذکر ہے جن کو جب جہاد کے لئے دعوت دی جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بوجھل بنا کر زمین پر گرا دیتے ہیں اور نفیر عام سے سستی برتتے ہیں۔ یہ سستی کرنے والے سب کے سب منافق نہ تھے جیسا کہ بعد میں واضح ہو گا بلکہ یہ مہم چونکہ پرمشقت تھی اور بعض لوگ مشکلات راہ کی وجہ سے سست پڑ گئے تھے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ (۳۸) اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَضُرُّوْہُ شَیْئًا وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۹) اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا وَجَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (٤٠) اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (٤١) (٩: ٣٨ تا ٤١)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیا کی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی' تو کچھ پروا نہیں اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا۔ جب وہ صرف دو میں دوسرا تھا' جب وہ دونوں غار میں تھے' جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے۔ اللہ زبردست دانا و بینا ہے۔ نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم جانو)

یہاں بار بار تاکید' تہدید اور ملامت کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جہاں تک رسول اللہ کی امداد کا تعلق ہے تو کسی انسان کی شرکت کے بغیر بھی اللہ نے ان کی مدد کی ہے۔ ذرا وہ وقت یاد کرو کہ جب مکہ سے کافروں نے انہیں نکالا تھا۔ کوئی فوج ان کے ساتھ نہ تھی لیکن وہ کامیاب رہے۔ پھر یہ تاکید کہ تم بوجھل ہو یا ہلکے بہرحال اس مہم میں نکلو' یہ سب امور بتاتے ہیں کہ یہ مہم بہت سخت تھی' لوگوں کے اندر سستی اور تردد بلکہ خوف طاری تھا۔ اس لئے یہاں سخت ترین الفاظ میں تاکید کی گئی ہے کہ لازماً اس مہم میں نکلو۔

اس کے بعد اس سورت کا چوتھا حصہ آتا ہے اور وہ قدرے طویل ہے۔ اس سورت کے نصف حصے پر مشتمل ہے۔ اس میں منافقین اور اسلامی معاشرے کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ غزوۂ تبوک' اس سے پہلے اور اس کے بعد کے ادوار میں ان کی نفسیاتی حالت اور ان کی عملی بوکھلاہٹ کو لیا گیا ہے۔ ان کی نیات' ان کے حیلوں بہانوں اور ان کے عذرات لنگ کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ اس جہاد سے پیچھے رہے۔ کس طرح اسلامی صفوں میں کمزوری' افتراق اور بے چینی پھیلاتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مخلص مومنین کو ایذائیں دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلص مومنین کو ان کی ریشہ دوانیوں سے متنبہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں تجویز کیا جاتا ہے کہ مخلصین کو ان سے دور رہنا چاہئے۔ یہ حصہ سورت کا بنیادی حصہ ہے۔ اور بنیادی وجود ہے۔ اس حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق جو فتح مکہ کے بعد قریباً قریباً ختم ہو گیا تھا کس طرح دوبارہ پھیل گیا تھا اور اگلے پیراگراف میں آپ دیکھیں گے کہ اس نفاق کے پھیلنے کے اسباب کیا تھے۔ یہاں ہم اس پورے حصے کو تو نقل نہیں کر سکتے البتہ بطور نمونہ چند فقرات ملاحظہ ہوں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَ

سيحلفون بالله لو استطعنا لخرجنا معكم يهلكون انفسهم والله يعلم انهم

لكذبون (۹ : ۴۲) ''اے نبی'' اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔ اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

ولو ارادوا الخروج لاعدوا له عدة ولكن كره الله انبعاثهم فثبطهم وقيل

اقعدوا مع القعدين (۴۶) لو خرجوا فيكم ما زادوكم الا خبالا ولا اوضعوا

خللكم يبغونكم الفتنة وفيكم سمعون لهم والله عليم بالظلمين (۴۷) لقد

ابتغوا الفتنة من قبل وقلبوا لك الامور حتى جاء الحق وظهر امر الله وهم

كرهون (۴۸) (۹ : ۴۶ تا ۴۸) ''اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ تیاری کرتے لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا۔ اس لئے ان کو سست کر دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر سوائے خرابی کے کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا یہ حال ہے کہ ابھی اس میں بہت سے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لئے ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آ گیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔

ومنهم الذين يؤذون النبي ويقولون هو اذن قل اذن خير لكم يؤمن بالله و

يؤمن للمؤمنين ورحمة للذين امنوا منكم والذين يؤذون رسول الله لهم عذاب

اليم (۹ : ۶۱) ''ان میں سے کچھ لوگ اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ [illegible] بھلائی کے لئے ایسا ہے' اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لو[illegible] جو تم میں سے ایماندار ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔''

ومنهم من يقول ائذن لي ولا تفتني الا في الفتنة سقطوا وان جهنم لمحيطة

بالكفرين (۴۹) ان تصبك حسنة تسؤهم وان تصبك مصيبة يقولوا قد اخذنا

اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ (۵۰) (۹: ۴۹ تا ۵۰) ''ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ ''مجھے رخصت دیجئے اور مجھ کو فتنہ میں نہ ڈالیے۔'' سن رکھو! فتنے میں ہی تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔ تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے۔ اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہے ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔''

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ (۵۶) لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۵۷) (۹: ۵۶ — ۵۷) ''وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہیں میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں۔ اصل میں وہ تو ایسے لوگ ہیں جو تم سے خوفزدہ ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں۔''

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (۵۸) وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (۵۹) (۹: ۵۸ — ۵۹) ''اے نبی ؐ ان میں بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگر اس مال میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں۔ اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ بھی انہیں دیا تھا' اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اور وہ اپنے فضل سے اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا۔ ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں۔''

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۹: ۶۱) ''ان میں سے کچھ لوگ اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہو ''وہ تمہاری بھلائی کے لئے ایسا ہے' اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو تم میں سے ایماندار ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔''

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا

مُؤْمِنِیْنَ (٦٢) اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ (٦٣) (٩: ٦٢ – ٦٣) "یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں، حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ و رسولؐ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور رسولؐ کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔"

یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (٦٤) وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (٦٥) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ (٦٦) (٩: ٦٤ تا ٦٦) "یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔ اے نبی ان سے کہو "اور مذاق اڑاؤ" اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو۔" اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے، تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔ ان سے کہو "تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کے آیات اور اس کے رسولؐ ہی کے ساتھ تھی۔ اب عذرات نہ تراشو، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر بھی دیا تو دوسرے گروہ کو ہم ضرور سزا دیں گے، کیونکہ وہ مجرم ہیں۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ یَقْبِضُوْنَ اَیْدِیَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٦٧) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا هِیَ حَسْبُهُمْ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (٦٨) (٩: ٦٧ – ٦٨) "منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے اور اپنے ہاتھ خیر سے روکے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔ ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لئے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہی ان کے لئے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔"

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۷۳) يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلٰمِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۷۴) (۹ : ۷۳ — ۷۴) "اے نبی کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ' آخرکار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی' حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے۔ یہ ان کا سارا غصہ اس بات پر ہے' تاکہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے۔ اب اگر یہ اپنی روش سے باز آ جائیں تو انہی کے لئے بہتر ہے اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔"

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۷۵) فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۷۶) فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۷۷) (۹ : ۷۵ تا ۷۷) "ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولتمند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پرواتک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے' اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا' جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔"

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۹) اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ

وَ رَسُوْلِه وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ (۸۰) (۹:۷۹ — ۸۰)) ”جو لوگ برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے نبی تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا ہے۔“

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا یَفْقَهُوْنَ (۸۱) فَلْیَضْحَكُوْا قَلِیْلًا وَّ لْیَبْكُوْا كَثِیْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۸۲) فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰی طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ (۸۳) وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِه اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِه وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ (۸۴) وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الدُّنْیَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۸۵) (۹:۸۱ تا ۸۵)) ”جن لوگوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر پر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ ”اس سخت گرمی میں نہ نکلو۔“ ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔ کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ۔ اس لئے کہ جو بدی یہ کما رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے۔ اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لئے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا کہ ”اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو، تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر میں بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے۔ ان کی مالداری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اللہ نے تو ارادہ کر لیا

ہے کہ اس مال اور اولاد کے ذریعے سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے۔ اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

یہ طویل تنقید جس میں بے شمار انکشافات کیے گئے اس بات کی مظہر ہے کہ اس وقت منافقین کی طرف سے اسلامی جماعت کی ایذا رسانی کے لئے رات دن کوششیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ منافق مختلف قسم کی سازشوں' فتنہ انگیزیوں اور جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے نصب العین سے ہٹانے کی سعی کرتے رہتے تھے۔ نیز اس تنقیدی تقریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی صفوں میں ہم آہنگی اور مکمل اتحاد کی کمی تھی اور جماعت مسلمہ کی عضویاتی تکمیل ابھی تک ادھوری تھی۔ اس کی طرف اس فقرے کے ذریعے اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ وَفِيكُمْ سَمَّٰعُونَ لَهُمْ (۹: ۴۷) ''اور تم میں ان کی بات پر کان دھرنے والے موجود ہیں۔'' نیز ایسے لوگوں کے لئے دعا کرنے کی سخت ممانعت اور ان کا نماز جنازہ نہ پڑھنے کی تاکید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایسے لوگوں کے لئے ہمدردی کے جذبات اسلامی صفوں میں موجود تھے۔ یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوگئی تھی کہ فتح مکہ کے بعد لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوگئے تھے اور ان کے دلوں میں ابھی تک ایمان اچھی طرح جاگزیں نہ ہوا تھا۔ نہ وہ ابھی تک پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگے گئے تھے۔ اس کی تفصیلات ہم اس سورت میں ان آیات کے ضمن میں دیں گے جن میں اسلامی جماعت کے اجزائے ترکیبی پر بحث کی گئی ہے جن سے اس وقت جماعت کی تالیف ہوئی تھی۔

اس سورت کے پانچویں حصے میں جماعت مسلمہ کے اندر شامل مختلف قسم کے لوگوں سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے اندر ایک طرف تو انصار و مہاجرین کے سابقون الاولون تھے جو اس جماعت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے' دوسری جانب مسلمانوں کے اندر کچھ دوسرے لوگ بھی تھے مثلاً اعراب جن میں مخلص لوگ بھی تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کے دلوں تک ایمان کے اثرات نہ پہنچے تھے اور بعض منافقین بھی تھے جو اہل مدینہ میں سے تھے اور بعض ایسے مسلمان بھی تھے جو ایک جانب سے نیک عمل تھے اور دوسری جانب ان میں عملی کمزوریاں تھیں اور ابھی تک وہ پوری طرح اسلامی رنگ میں نہ رنگے گئے تھے' نہ وہ پوری طرح اسلامی سانچے میں ڈھلے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے بارے میں کوئی کچھ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت مسلمہ کی کوئی رائے نہ تھی اور ان کا حال انہوں نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا کہ ان کا انجام کیسا ہو گا' ان میں ایسے سازشی بھی تھے جو دین کے عنوان سے سازشیں کرتے تھے۔ قرآنی آیات میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ ان تمام انواع و اصناف کے لوگوں کے بارے میں ریمارکس دیئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ مخلص مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے ان مختلف طبقات کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹۷) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹۸) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۹) (۹ : ۹۷ تا ۹۹) ”یہ بدوی عرب کفرو نفاق میں زیادہ سخت ہیں ' اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں ' جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے ۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے ۔ ان بدوی لوگوں میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردش کا انتظار کرتے ہیں ' حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے ۔ اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔ اور انہی بدویوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں اپنے تقرب کا اور رسول اللہ کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں ۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لئے تقرب کا ذریعہ ہے ۔ اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا ' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔“

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰۰) وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۱۰۱) (۹ : ۱۰۰ — ۱۰۱) ”وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی ' نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے ' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے ۔ تمہارے گردوپیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہوگئے ہیں ۔ تم انہیں نہیں جانتے ' ہم ان کو جانتے ہیں ۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دہری سزا دیں گے ' پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لئے واپس لائے جائیں گے ۔“

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۰۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۰۳) (۹ : ۱۰۲ — ۱۰۳) ”اور کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے ۔ ان کا عمل مخلوط ہے '

کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔بعید نہیں کہ اللہ ان پر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبی ؐ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور نیکی کی راہ میں انہیں بڑھاؤ۔اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی۔اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۹:۱۰۶) "اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے' چاہے انہیں سزا دے اور چاہے ان پر از سر نو مہربان ہو جائے اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔"

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۰۷) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

(۱۰۸) ((۹:۱۰۷ – ۱۰۸)) "کچھ لوگ ہیں جنہوں نے مسجد ضرار بنائی اس غرض کے لئے کہ دعوت حق کو نقصان پہنچائیں اور کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کے لئے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بر سرپیکار ہو چکا ہے۔وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو' اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔"

ان نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد مختلف طبقات' مختلف گروہ اور مختلف سطح کی ایمانی قوت رکھنے والے لوگ اسلامی صفوں میں داخل ہو گئے تھے۔اس لئے اسلامی صفوں کے اندر انتشار کی کیفیت تھی اس لئے ان آیات میں اسلامی معاشرے نے ان سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیا۔

اس سورت کے چھٹے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ بیعت جہاد کی نوعیت کیا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد کیا ہیں۔اور اہل مدینہ اور اس کے اردگرد رہنے والے بدوی آبادی کے اس سلسلے میں کیا فرائض ہیں اور یہ کہ ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس جہاد سے پیچھے رہ جائیں اور نہ ان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ رسول اللہ کو چھوڑ کر پیچھے رہ جائیں اور اپنی جان و مال سے اس کی مدافعت نہ کریں اور یہ کہ مسلمانوں اور مشرکین و منافقین کے درمیان مکمل بائیکاٹ ضروری ہے۔اور اسی حصے میں ان لوگوں کے کیس کا بھی فیصلہ مذکور ہے جو مخلص تھے' منافق نہ تھے لیکن جہاد سے

پیچھے رہ گئے تھے اور اس میں بعض منافقین کی جانب سے نزول قرآن کے بارے میں خاص رویہ اختیار کرنے کا بھی ذکر ہے۔چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِیْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(۹ : ۱۱۱) ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو؟پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکالیا ہے‘یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۱۳) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۱۱٤) (۹: ۱۱۳ — ۱۱٤) ”نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں‘ زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں‘ چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی‘ وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب وخدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَی النَّبِیِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۷) وَّعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰۤی اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ

اللّٰہَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۱۱۸) ”اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ مگر اللہ نے انہیں معاف کر دیا بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ کے دامن رحمت کے سوا نہیں تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲۰) وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۱) وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ

(۱۲۲) (۹: ۱۲۰ تا ۱۲۲) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔ مدینہ کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پرواہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لئے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ تھوڑا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔ اور کچھ ضروری نہیں کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ غیر مسلمانہ روش سے پرہیز کرتے۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (۱۲۳) وَاِذَا مَا اُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهِ اِيمَانًا فَاَمَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا فَزَادَتْهُمْ اِيمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۱۲۴) ((۹:۱۲۳ — ۱۲۴)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔"

وَاِذَا مَا اُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰكُم مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوبَهُم بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (۹:۱۲۷) "اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے کیونکہ وہ ناسمجھ لوگ ہیں۔"

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۲۸) فَاِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (۱۲۹) ((۹:۱۲۸ — ۱۲۹)) "دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے' خود تم ہی میں سے ہے' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے' ایمان لانے والوں کے لئے وہ شفیق و رحیم ہے۔ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی' ان سے کہہ دو کہ "میرے لئے اللہ بس کرتا ہے' کوئی الٰہ نہیں مگر وہ' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا۔"

اس اجمالی تبصرے میں' ہم نے اس سورت سے کافی طویل اقتباسات دیئے' جبکہ تفصیلی بحث بعد میں آنے والی تھی اور یہ طوالت ہم نے بالارادہ کی ہے کیونکہ فتح کے بعد اسلامی سوسائٹی کے جو خدوخال تھے ان کو اس سورت میں بڑی تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ اس سورت میں اس سوسائٹی کی عضویاتی تشکیل کی صورت حال کو دکھایا گیا ہے۔ اس کی تصویر کشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی صفوں میں ایک طرح کا انتشار تھا' بایں معنی کہ سوسائٹی کے اندر مکمل ہم آہنگی نہ تھی اور مختلف ایمانی درجات کے لوگ فتح مکہ کے بعد جمع ہوگئے تھے۔ لوگوں کے اندر بخل' کنجوسی' مال کی محبت' نفاق کی بیماری' سستی اور کمزوری دین اسلام کے تقاضے پورے کرنے میں تردد' دین کے مقاصد میں خلط اور عدم یکسوئی' اسلامی سوسائٹی اور جاہلیت کے معاشروں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کو نہ سمجھنا' پھر اسلامی اخوت کے مقابلے تمام دوسرے اجتماعی روابط کو توڑ دینا' اگرچہ اسلامی نظریہ کے سوا دوسرے جو روابط موجود تھے وہ اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر روابط کے ساتھ متضاد نہ تھے لیکن اس کے باوجود یہ برادریاں وغیرہ موجود تھیں' اس لئے ان تمام کمزوریوں

اور کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے اس سورت میں بھرپور اور واضح تنقید کی گئی تاکہ اسلامی سوسائٹی اور خالص اسلامی معاشرے کے خدوخال اور مقاصد کو واضح کیا جاسکے۔

اس سے پہلے ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اسلامی معاشرے کے اندر اس دور میں یہ خرابیاں اس لئے سرایت کر گئی تھیں کہ فتح مکہ کے بعد ہر قسم کے لوگ فوج در فوج دین اللہ میں داخل ہوگئے تھے اور ان لوگوں کی ابھی اچھی طرح تربیت نہ ہوئی تھی۔ اور یہ لوگ ابھی پوری طرح اسلامی قالب میں نہ ڈھلے تھے لیکن ہمارے اس مجمل اشارے کو اچھا اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد تاریخی پس منظر کو اچھی طرح ذہن میں تازہ نہ کر لیا جائے۔ اور اس میں تحریک اسلامی کے عملی ارتقاء کو ذہن میں نہ رکھا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں نہایت ہی اختیار کے ساتھ فتح مکہ سے پہلے اور بعد کے حالات پر ایک نوٹ دے دیں۔ اس تاریخی نوٹ کی روشنی میں اس سورت میں آنے والی آیات و نصوص کو اچھی طرح سمجھا جاسکے کہ ان حالات میں یہ تحریک کس طرح گزری اور کس طرح آگے بڑھی

---○○○---

تحریک اسلامی مکہ مکرمہ میں نہایت ہی شدید حالات میں ابھری' اس کا مقابلہ قریش کے جاہلی معاشرے سے تھا۔ تحریک اسلامی کا کلمہ دعوت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو قریش کے اس جاہلی معاشرے نے اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا' اس لئے کہ یہ کلمہ درحقیقت ان تمام معاشروں اور ان کے اقتدار اعلیٰ کے لئے ایک گونہ بغاوت کا اعلان تھا جن کا اقتدار اعلیٰ اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی حکومت سے ماخوذ نہ تھا۔ یہ کلمہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ کلمہ گو نے تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے اور وہ صرف اللہ کی حکومت اور اقتدار کا وفادار ہے۔ پھر قریش کے جاہلی معاشرے نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ یہ نئی دعوت ایک نئی قیادت' قیادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت ایک منظم تحریک کی شکل میں ابھر رہی ہے۔ اور اس نئی تحریک کا شعار پہلے دن سے یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کی جائے اور قریش کی جاہلی اور سرکش اور ظالم قیادت کی اطاعت کا انکار کر دیا جائے۔

جونہی قریش نے درج بالا خطرہ محسوس کیا کہ موجودہ نظام' اس کے مفادات اور اصولوں کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے تو اس جاہلی معاشرے نے تحریک اسلامی کے افراد کے خلاف تشدد اور ظلم کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے ایک جدید تحریک اور اس جدید سوسائٹی اور اس جدید قیادت کے خلاف وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے جو ان کے بس میں تھے۔ جن میں ایذارسانی' سازشیں' اوچھے ہتھیار اور فتنہ پردازیاں سب کچھ شامل تھے۔

قریش کا جاہلی معاشرہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا دفاع شروع کر دیا اور اس معاشرے نے بعینہ اسی طرح اپنا بچاؤ شروع کر دیا جس طرح ایک زندہ انسان اپنے آپ کو موت کے خطرات سے بچانا چاہتا ہے۔ اور قریش کے اس جاہلی معاشرے کا یہ ردعمل بالکل فطری تھا' اور جب بھی کوئی دعوت لوگوں کو صرف رب العالمین کی بندگی' ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ کی طرف بلانا شروع کرتی ہے' اس وقت کی قائم جاہلی سوسائٹی کا ردعمل ایسا ہی ہوتا ہے' کیونکہ جاہلی سوسائٹی میں انسان انسانوں کے غلام ہوتے ہیں اور اسلامی دعوت صرف رب العالمین کی بندگی کی طرف ہوتی ہے۔ جب بھی دعوت اسلامی ایک عضویاتی تحریک کی شکل میں اٹھے گی جاہلیت' اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوگی جس طرح نقیض نقیض کے مقابلے میں ہوتا ہے۔

اور اس قسم کی تحریک کا ہر کارکن جاہلی معاشرے کی زد میں آجاتا ہے اور اسے ہر قسم کے فتنوں اور مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور بسا اوقات اس تشدد کے نتیجے میں کارکنوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے' جب ایسے حالات ہوتے ہیں تو تحریک اسلامی کی صفوں میں اگر شہادت حق دینے والے صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اللہ کی راہ میں جان تک کا نذرانہ پیش کریں گے۔ اس دعوت اور تحریک اور اس جدید سوسائٹی کی رکنیت ایسے سرفروش ہی اختیار کرتے ہیں جو اذیت' فتنہ سامانیوں' بھوک' افلاس اور شدائد و مصائب برداشت کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں' یہاں تک کہ بعض اوقات انہیں قید و بند اور موت کے لئے بھی تیار ہونا پڑتا ہے۔

مکہ مکرمہ کے عربی معاشرے میں ایسے ہی مضبوط' طاقتور اور اولوالعزم لوگ ہی اسلامی قیادت کی بنیاد بنے۔ وہ لوگ جو مشکلات برداشت کر کے اور شدائد و مصائب انگیز نہ کر کے تحریک میں فوج در فوج داخل ہو گئے تھے وہ دوبارہ جاہلیت کی طرف مرتد ہو کر لوٹ گئے تھے۔ یہ اولوالعزم لوگ تعداد میں بہت ہی کم تھے اور یہ بات بالکل معروف اور کھلی ہے۔ اس لئے کہ ابتداء جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام کی مشکل اور پرخطر راہ کو اپنانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا ماسوائے ان ممتاز اور مختار اور برگزیدہ لوگوں کے جن کو اس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔

سابقین مہاجرین ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جو نادرۂ روزگار تھے اور یہ اس دین کا بنیادی اثاثہ تھے اور مضبوط بنیاد تھے اور انہوں نے ابتدائی مکی دور میں لبیک کہا۔ یہی لوگ جب مدینہ پہنچے تو یہ اس تحریک کے روح رواں اور دین کے مرکزی ستون تھے۔ ان کے ساتھ مدینہ میں انصار میں سے ایسے ہی اولوالعزم افراد مل گئے۔ ان لوگوں نے اگرچہ وہ مشکلات برداشت نہ کی تھیں جو مہاجرین نے کیں لیکن ان لوگوں نے چونکہ نہایت ہی مشکل حالات میں عقبہ کے مقام پر حضور ؐ کے ساتھ بیعت کی تھی' اس لئے یہ لوگ بھی پاک طینت اور اصلی مزاج کے لوگ تھے اور ان کے اندر وہ بنیادی اوصاف موجود تھے جو اس دین کے حاملین اولین میں ضروری تھے۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں کہتے ہیں "محمد ابن کعب قرظی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے بیعت عقبہ کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے جو شرائط ہم پر عائد کرنا چاہیں' عائد کر دیں۔ تو اس پر حضور ؐ نے فرمایا میں رب کے لئے تو یہ شرائط عائد کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' اور اپنے لئے یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم میری مدافعت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی مدافعت کرتے ہو' اس پر لوگوں نے کہا کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے لئے کیا اجر ہو گا؟ تو حضور ؐ نے فرمایا الجنۃ تو انہوں نے کہا یہ بہت ہی اچھا سودا ہے' نہ ہم اقالہ کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اقالہ کرے۔

یہ لوگ جو حضور ؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے' یہ جنت کے بغیر اور کچھ نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ نہ تو وہ اس سودے کو واپس کریں گے اور نہ ہی فریق دوم کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ اس سودے کو ٹالیں۔ اور یہ جانتے تھے کہ یہ بیعت کوئی معمولی بیعت نہ تھی' وہ جانتے تھے کہ اب قریش ان کے پیچھے پڑیں گے اور نہ صرف قریش بلکہ تمام عرب ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور وہ اب جاہلیت کے ساتھ مل کر پرسکون زندگی بسر نہ کر سکیں گے جو ان کے ارد گرد خیمہ زن ہے اور جزیرۃ العرب اور مدینہ کے اطراف واکناف پر حکمران ہے۔

ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے "امام احمد نے عبدالرزاق سے' اس نے معمر

ابن خیثمہ سے ' اس نے ابو الزبیر سے ' اس نے جابر سے ' کہتے ہیں کہ حضور ؐ نے مکہ میں دس سال گزارے ' وہ لوگوں کو ان کے گھروں تک پیغام پہنچاتے ' عکاظ اور المجنۃ کے بازاروں میں ان کا پیچھا فرماتے ' میلوں اور عیدوں پر ان سے خطاب کرتے اور ہر قبیلے سے آپ کا مطالبہ یہی ہوتا ' کون ہے جو مجھے پناہ دے سکتا ہے ؟ کون ہے جو میری نصرت کر سکتا ہے ؟ تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں اور اس کے لئے جنت ہو گی ؟ '' لیکن کوئی اس کام کے لئے تیار نہ ہوتا کہ آپ کو پناہ دے اور نصرت کرے ۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یمن اور علاقہ مضر سے سفر پر نکلتا تو اس کو اس کے رشتہ دار متنبہ اور خبردار کر دیتے کہ ذرا قریش کے نوجوان سے بچ کر رہنا ' تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے ۔ اور جب حضور ؐ ان لوگوں کے درمیان دعوت کے سلسلے میں پھرتے تو وہ انگلیوں سے اشارے کرتے ۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا تھا کہ اللہ نے یثرب سے ہمیں اٹھایا اور ہم نے آپ کو پناہ دی ' ہم نے اس کی تصدیق کی ۔ ہم میں سے لوگ مکہ جاتے ' قرآن سیکھتے اور یہ شخص جب واپس آتا تو اس کے اسلام کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی مسلمان ہو جاتے ۔ یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھرانا ایسا نہ رہا جس میں علی الاعلان اسلام کا اظہار کرنے والے کئی لوگ نہ ہوں ۔ اس کے بعد ہم نے مشورہ کیا کہ کب تک ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال پر چھوڑیں گے کہ وہ مکہ کی پہاڑیوں میں پھریں اور لوگ ان کو مسترد کریں اور وہ خوف کی حالت میں ہوں ۔ ہم میں سے ستر آدمی موسم حج میں جا کر آپ سے ملے ۔ ہم نے عقبہ کی پہاڑی پر اجتماع رکھا ۔ ہم ایک ایک ' دو دو آدمی وہاں پہنچے ۔ سب جمع ہو گئے ۔ ہم نے حضور ؐ سے کہا کہ ہم کس بات پر آپ کی بیعت کریں ؟ تو حضور ؐ نے فرمایا : '' آپ لوگ سمع اور اطاعت پر بیعت کریں ' چستی میں بھی اور سستی میں بھی اور خرچ پر بیعت کریں خواہ اسیری ہو یا غربت ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر بیعت کریں ۔ یہ کہ تم حق کہو گے اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرو گے اور اس پر کہ تم میری مدد کرو گے ' اور جب میں مدینہ آگیا تو میرا دفاع کرو گے ۔ جس طرح تم اپنی ذات ' اپنی بیویوں ' اپنے بچوں کا دفاع کرتے ہو اور تمہیں اس کے بدلے جنت ملے گی ۔ '' اس پر ہم اٹھے اور اسعد ابن زرارہ نے حضور ؐ کا ہاتھ لیا اور وہ سب سے چھوٹے تھے ۔ بیہقی کی روایت میں ہے کہ وہ ستر افراد میں سے چھوٹے تھے ماسوائے میرے ۔ اس پر اسعد نے فرمایا : '' اہل یثرب ذرا جلدی نہ کرو ' ہم حضور ؐ تک یہ طویل سفر کر کے محض اس لئے آئے ہیں کہ آپ رسول خدا ہیں اور آج اسے نکال کر لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمام عرب اقوام کو چیلنج کر رہے ہیں ' ہم اپنے بلند مرتبہ لوگوں کو قتل کر رہے ہیں ' اور ہر طرف سے تمہیں تلواریں کاٹ رہی ہوں گی ۔ اب تم اگر ایسے لوگ ہو کہ یہ سب کچھ برداشت کر سکو تو لو یہ بیعت اور اس کا اجر اللہ پر ہے ۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ایسے لوگ ہو جو اس بات سے ڈرتے ہو تو اسی وقت حضور ؐ کو چھوڑ دو اور یہ بات صاف صاف کہہ دو اور اللہ کے نزدیک تم معذور تصور ہو گے ۔ '' اس پر لوگوں نے کہا : اسعد ذرا ٹھہرو ' خدا کی قسم ہم یہ بیعت ضرور کریں گے اور کوئی اسے ہم سے سلب نہ کر سکے گا ۔ چنانچہ ہم لوگ کھڑے ہو گئے اور بیعت کر لی ۔ آپ نے ہم سے بیعت لی اور شرائط عائد کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اس پر ہمیں جنت ملے گی ۔ (اس کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے اور بیہقی نے بواسطہ داؤد ابن عبدالرحمن عطار روایت کی ہے ۔ امام بیہقی حاکم سے یحییٰ بن مسلم تک زیادہ سند کے ساتھ روایت کی ۔ ان دونوں نے پھر عبداللہ عثمان ابن خیثم سے ابو ادریس سے ۔ اسی طرح یہ سندیں عمدہ ہیں اور مسلم کی شرائط پر ہیں ۔ متن [illegible] نے اسے روایت نہیں کیا ہے ۔ بزار نے کہا ہے کہ ابن خیثم کے علاوہ کئی لوگوں نے اسے روایت کیا ہے لیکن اس کے

بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس نے جابر سے اس طریقے کے سوا اور کوئی روایت کی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ انصار کو یہ علم تھا اور یہ یقینی علم تھا کہ اس بیعت کے نتائج کیا ہوں گے اور انہوں نے یہ بات بھی اچھی طرح جان لی تھی کہ حضور ؐ نے ان کے ساتھ اس دنیا کے اندر کسی اجر و صلہ کا وعدہ نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ حضور ؐ نے ان کے ساتھ یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ تمہیں اس دنیا میں اس مقصد میں کامیابی نصیب ہو گی ماسوائے جنت کے۔ ان کے ساتھ کوئی اور وعدہ نہ تھا۔ یہ تھی ان کے فہم دین کی انتہا اور یہ تھی ان کی چاہت جو وہ اس دین کے ساتھ رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ سابقون اولون کے مقام بلند پر فائز ہوئے اور یہ لوگ مہاجرین کے اولین ساتھیوں میں قرار پائے جنہوں نے تعمیر دین کی بنیادوں میں حصہ لیا اور اس عمارت کو تیار کیا۔ یہ لوگ مدینہ کی سوسائٹی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے۔

لیکن مدینہ کا معاشرہ اور جماعت اسی طرح مخلص اور صاف رہی۔ اسلام کا ظہور مدینہ سے ہوا۔ وہ اس کے اندر دور تک پھیل گیا اور بہت سے لوگ خصوصاً ان میں سے صاحب مرتبہ اور سربراہ قسم کے لوگوں نے بھی اپنی قوم کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا تاکہ ان کی لیڈرشپ قائم رہے۔ جب جنگ بدر کا عظیم واقعہ پیش آگیا تو اس قسم کے لوگوں کے سرخیل عبد ابن ابی ابن سلول نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ معاملہ تو اب بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس لئے اس نے نفاق کے طور پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ بات ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو اسلام کا سیلاب بہاکر لے گیا اور انہوں نے دوسروں کی تقلید میں اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ یہ مقلد قسم کے لوگ منافق نہ تھے لیکن ان لوگوں نے اسلام کو ابھی تک اچھی طرح نہ سمجھا تھا اور نہ وہ اسلامی قالب میں اچھی طرح ڈھل گئے تھے' اس کی وجہ سے مدینہ کی اسلامی سوسائٹی میں افراتفری تھی کیونکہ مختلف لوگ ایمان کے مختلف درجات پر فائز تھے۔

قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اس قسم کے لوگوں کی تربیت شروع کی۔ چونکہ ایمان و اخلاق کے مختلف درجات کے لوگ اس سوسائٹی میں داخل ہو گئے تھے' اس لئے ضروری تھا کہ ان مختلف عناصر کے اندر توازن اور توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جائے اور جدید سوسائٹی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔

جب ہم مدنی سورتوں کا مطالعہ ترتیب نزولی کے مطابق کریں (اگرچہ یہ ترتیب اندازاً معلوم ہے) تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے اسلامی معاشرے میں مسلسل داخل ہونے والے جدید عناصر کی تربیت اور تطہیر کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رکھی کیونکہ آنے والے لوگ مختلف خاندانوں اور مزاجوں کے تھے اور مسلسل آرہے تھے۔ قریش اگرچہ لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے اور تمام عرب قبائل کو وہ اس دین کے خلاف آمادہ جنگ کرتے تھے۔ اسی طرح یہودی بھی اس دین کی راہ میں رکاوٹ تھے اور وہ بھی رات دن لگے ہوئے تھے کہ تمام اقوام اس دین جدید پر حملہ آور ہوں اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس لئے جدید آنے والے لوگوں کی تربیت کی بہت ضرورت تھی۔

تربیت اور تطہیر کی اس مسلسل جدوجہد کے باوجود کبھی کبھار خصوصاً مشکل اور شدید وقت میں اسلامی صفوں میں کمزوریوں کا ظہور ہو جاتا تھا۔ بعض گوشوں میں نفاق ابھرتا' بعض میں تردد اور غیریقینی صورت حال ہوتی۔ بعض لوگ دین جدید کی راہ میں مال خرچ کرنے میں بخل کرتے۔ بعض لوگ خطرات کا سامنا کرنے سے ڈرتے۔ بعض اوقات لوگ یہ نہ سمجھ سکتے کہ ان کے مابین اسلامی رابطے اور تعلق کا کیا مقام ہے اور ان کی سابقہ جاہلی رشتہ داریوں اور روابط کی

حیثیت اب کیا ہے؟ وہ اسلامی بھائی چارے کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے۔ اس سورت کی آیات سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ مختلف طریقوں سے اور مختلف زاویوں سے ایسے لوگوں کی تربیت کس طرح کرتی ہیں اور اس کے لئے کیا کیا اسلوب اختیار کرتی ہیں۔ ان آیات میں سے ہم بعض آیات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (۵) يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (۶) وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۷) لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸) (۹: ۵ تا ۸) ”جیسا کہ تیرا رب تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکال لایا تھا اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ سخت ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تجھ سے جھگڑ رہے تھے۔ در آں حالیکہ وہ صاف صاف نمایاں ہو چکا تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ یاد کرو وہ موقعہ جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔“

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۷) رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۸) رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳: ۷ - ۹) ”اللہ وہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں۔ وہی اصل کتاب ہیں اور بعض دوسری آیتیں متشابہ ہیں' تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے' وہ فتنے کی تلاش میں ان آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر جو لوگ علم میں پختہ ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب کی طرف

سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو دانشمند ہیں۔اے ہمارے رب ہمیں سیدھی راہ پر لگا دینے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر۔ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر' اے ہمارے رب تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک دن جمع کرنے والا ہے جس میں شک نہیں۔بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱) لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۲) لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۵۹ : ۱۱ — ۱۳) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے منافقت کی۔وہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم گھروں سے نکالے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی بات نہ مانیں گے۔اور تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے۔اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں گے۔پھر ان کو کوئی مدد نہ ملے گی۔تمہاری ہیبت تو ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر ہے یہ اس لئے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں۔"

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (۹) اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (۱۰) هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۱۱) وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۲) وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (۱۳) وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا

(۳۳ : ۹ — ۱۴) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو ' جب لشکر تم پر چڑھ آئے ہو تو ہم نے ان پر آندھی بھیج دی ۔ اور ایسی فوجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں اور جو کچھ تم کر رہے تھے ' اللہ دیکھ رہا تھا ۔ جب تمہارے اوپر کی طرف سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے اور جب آنکھیں پتھرا گئیں ' کلیجے منہ کو آ گئے اور اللہ کے بارے میں تم لوگ گمان کرنے لگے ۔ اس موقعہ پر ایمان والے آزمائے گئے اور بری طرح جھنجوڑ ے گئے اور جب منافقین نے اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں روگ تھا کہنا شروع کیا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ تر ا دھوکہ تھا اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو ' تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا موقعہ نہیں ہے ' پس اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور ان میں سے یک فریق نبی سے یہ کہہ کر رخصت مانگ رہا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے ۔ وہ جنگ سے بھاگنا چاہتے تھے ۔ اگر وہ شہر کے اطراف سے گھس آئے ہوتے ۔ اور ان سے فساد کو کہا جاتا تو یہ اسے مان لیتے اور اس میں ذرا بھی دیر نہ کرتے ۔“

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ خُذُوا۟ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُوا۟ ثُبَاتٍ أَوِ ٱنفِرُوا۟ جَمِيعًا (۷۱) وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ فَإِنْ أَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَىَّ إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا (۷۲) وَلَئِنْ أَصَٰبَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ ٱللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُۥ مَوَدَّةٌ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا (۷۳) (۴ : ۷۱ تا ۷۳) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' اپنی حفاظت اور تیاری میں لگے رہو ۔ پھر نکلو الگ الگ گروہوں میں ہو کر یا اکٹھے ہو کر اور یقیناً تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو دیر کرے ۔ پھر اگر کوئی مصیبت آ پڑے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر بڑا ہی احسان کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا اور اگر تم پر اللہ کا فضل ہو تو بول اٹھے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی رشتہ تھا ہی نہیں کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی کامیابی حاصل کر لیتا ۔“

أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوٓا۟ أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ ٱلْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ ٱلنَّاسَ كَخَشْيَةِ ٱللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا۟ رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا ٱلْقِتَالَ لَوْلَآ أَخَّرْتَنَآ إِلَىٰٓ أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ مَتَٰعُ ٱلدُّنْيَا قَلِيلٌ وَٱلْءَاخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ ٱتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا (۷۷) أَيْنَمَا تَكُونُوا۟ يُدْرِككُّمُ ٱلْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِى بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا۟ هَٰذِهِۦ مِنْ عِندِ ٱللَّهِ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا۟ هَٰذِهِۦ مِنْ عِندِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ فَمَالِ هَٰٓؤُلَآءِ ٱلْقَوْمِ لَا

يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۷۸)(٤: ۷۷ — ۷۸)) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا 'جن کو حکم دیا گیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو' پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے ایسا ڈرنے لگا جتنا اللہ سے ڈرا جاتا ہے یا اس سے بھی بڑھ کر۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی اور مہلت کیوں نہ دی 'کہہ دو' اس دنیا کا سرمایہ بہت قلیل ہے اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اس کے لئے آخرت ہی بہتر ہے۔ اور تم لوگوں کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ تم کہیں بھی ہو' موت تمہیں پالے گی۔ اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو۔ اور ان لوگوں کو اگر کچھ فائدہ پہنچ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری طرف سے ہے۔ تم کہو کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات ہی نہیں سمجھتے۔"

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ (۳٦) اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ (۳۷) هٰاَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۳۷) (٤٧ : ۳٦ — ۳۸) "دنیا کی زندگی تو بس زا کھیل تماشا ہے۔ اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے اجر تمہیں عطا کرے گا۔ اور تمہارے مال تم سے طلب نہیں کرے گا۔ اور اگر وہ تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجے تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم ضرور بخل کرنے لگو اور وہ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے۔ تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس پر بھی تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے تو درحقیقت وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔ ورنہ اللہ تو بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔ اور اگر تم منہ موڑو گے تو وہ دوسری قوم کو لا اٹھائے گا اور وہ تم جیسی نہ ہوگی۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (١٤) اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (١٥) اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (١٦) لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (١٧) يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ

لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۱۸) اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ (۲۰) كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۲۱) لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۲) (۵۹: ۱۴ تا ۲۲)

”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جنہوں نے ایسے گروہ کو دوست بنایا جن پر اللہ کا غضب ہے اور وہ لوگ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے اور باوجود یہ کہ وہ جانتے ہیں اور پھر بھی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت برا کر رہے ہیں انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے رسواکن عذاب ہے۔ ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے انہیں ذرا نہ بچا سکیں گے۔ وہ ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جس دن اللہ ان کو اٹھائے گا تو وہ اس کے آگے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے آگے اٹھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوب کر رہے ہیں۔ خوب جان لو وہ جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان مسلط ہو چکا ہے اور اس نے ان کو اللہ کی یاد بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کے گروہ کے لوگ ہیں' سن لو' شیطان کا گروہ ہی خسارے میں رہنے والا ہے۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یقیناً وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں' اللہ تو لکھ چکا ہے کہ ہم اور ہمارے پیغمبر ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ ہی بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں وہ ایسوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں خواہ وہ لوگ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبے کے ہی ہوں' یہی ہیں جن کے دلوں میں ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کی مدد کی ہے۔ اور وہ ان کو باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کا گروہ ہیں اور اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔“

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵۱) فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (۵۲) وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ (۵۳) (۵: ۵۱ تا ۵۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا تو وہ بے شک ان ہی میں سے ہو گا۔ یقیناً اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ تم دیکھتے ہو کہ جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے' وہ ان لوگوں کی طرف دوڑے جارہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ کسی مصیبت کے چکر میں نہ آجائیں۔ تو وہ وقت دور نہیں جب اللہ تمہیں فتح دے یا اپنی طرف سے کوئی بات لے آئے تو یہ لوگ اس بات پر نادم ہو جائیں جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ اور اہل ایمان کہیں گے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو بڑے زور و شور سے اللہ کی قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے تمام اعمال اکارت گئے اور یہ سراسر نقصان میں آگئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۱) اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (۲) لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ

لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (٤) (٦٠ : ١ تا ٤) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم ہماری راہ میں جہاد کرنے اور ہماری رضاجوئی کے لئے نکلے ہو تو ہمارے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ کہ تم ان کے ساتھ دوستی ڈالتے ۔ حالانکہ تمہارے پاس جو حق آیا ہے وہ اس کا انکار کر چکے ہیں ۔ رسول کو اور تم کو صرف اس بات پر نکالتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لائے ہو ۔ تم چپکے چپکے ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو' حالانکہ ہم جانتے ہیں جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو اور جو تم میں سے ایسا کرے وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ۔ اگر یہ تم پر قابو پائیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں اور تم پر برائی کے ساتھ دست درازی کریں اور زبان درازی کریں ۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ ۔ قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں تمہارے کام آئیں گی اور نہ تمہاری اولاد ۔ اس دن اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے ۔ تمہارے لئے اچھا نمونہ تو ابراہیم "اور اس کے ساتھیوں میں ہے ۔ جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم عبادت کرتے ہو' قطعی بیزار ہیں ۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت ہو گئی ۔ جب تک تم اللہ وحدہ پر ایمان نہ لاؤ مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں آپ کے لئے مغفرت کی دعا ضرور کروں گا' اگرچہ آپ کے لئے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتا ۔ اے ہمارے رب ہم نے تجھ ہی پر بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے ۔"

مختلف سورتوں میں یہ دس شواہد ہمارے مدعا کے لئے کافی ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں بعض اوقات اس قسم کے عارضی حالات پیش آتے تھے اور یہ اس لئے پیش آتے تھے کہ اسلامی معاشرے میں اچانک نئے لوگوں کا ایک ریلا داخل ہو گیا تھا جو اپنے ساتھ اپنی پرانی عادات لے کر آئے تھے ۔ اور یہ عادات مسلسل تربیت اور تطہیر کے بعد ہی دور ہو سکتی تھیں اور اس کے لئے مسلسل تربیتی جدوجہد کی ضرورت تھی ۔

لیکن مدینہ طیبہ میں مسلم معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ درست تھا' اس لئے کہ اس ڈھانچے میں بنیادی اہمیت صرف ان لوگوں کو حاصل تھی جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین تھے اور نہایت ہی مضبوط لوگ تھے ۔ نیز اس معاشرے کی تعمیر و تربیت میں اتحاد و اتفاق اور اس کے ڈھانچے میں اس قدر پختگی تھی اس نے ان کمزوریوں اور عوارض اور انتشار پر قابو پا لیا تھا اور وہ عناصر جو خوف اور پریشانی سے متاثر ہو جاتے تھے اور جن کی ابھی تک پوری تربیت نہ ہوئی تھی اور وہ اس جدید معاشرے میں ابھی تک ڈھل نہ گئے اور ان کے اندر پوری ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی تھی ان کو بھی اجتماعی معاشرتی نظام سنبھالا دیتا تھا ۔

بہرحال آہستہ آہستہ یہ جدید عناصر تربیت پا رہے تھے ۔ اس معاشرے میں ڈھل رہے تھے اور ان کی تطہیر مسلسل ہو رہی تھی اور وہ اسلامی معاشرے کی اصل قوت کے ساتھ ملتے رہتے تھے ۔ اور ضعیف القلب ' نافرمانی کرنے والوں اور ڈھل مل یقین قسم کے لوگوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی تھی ۔ مفادات سے ڈرنے والے اور ایسے لوگ جن کے دلوں میں ابھی تک اسلامی نظریہ حیات پوری طرح نہ بیٹھا تھا کہ وہ اپنے سوشل روابط بھی اسی نظریہ کی اساس پر استوار کریں

یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے حالت یہ ہوگئی تھی کہ اسلامی معاشرہ تعلیم و تربیت اور اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے مقام کمال کے قریب پہنچ گیا تھا اور اکثر لوگ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کے نقش قدم پر چل پڑے تھے۔ اور یہ معاشرہ اس قدر پاک اور تربیت یافتہ ہوگیا تھا کہ وہ اسلامی نظام حیات کے پیش نظر مطلوبہ معیار کے قریب تر تھا۔

یہ بات درست ہے کہ ابھی تک اس معاشرے میں ایسی قدریں نشوونما پا چکی تھیں کہ جن کا تعلق براہ راست اسلامی نظریات کے ساتھ تھا۔ ان اقدار کی وجہ سے تحریک کے اندر کچھ لوگ زیادہ ممتاز تھے اور زیادہ ثابت قدم تھے اور تحریک کی صفوں میں اوروں سے آگے تھے۔ مثلاً مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین' اہل بدر' حدیبیہ میں بیعت رضوان کرنے والے۔ پھر جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل جہاد' انفاق اور قتال میں حصہ لیا اور جنہوں نے بعد میں لیا۔ نصوص کتاب اللہ' احادیث نبوی اور تحریک کے بعض عملی اقدامات سے یہ تفاوت مراتب اور اقدار کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ اسلامی اقدار اور تفاوت اسلامی نظریہ حیات کو آگے بڑھانے کے نقطہ نظر سے متعین ہوئیں۔ قرآن مجید کی تصریحات

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۰۰) "وہ مہاجرین و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی' نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لئے ایسے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

ایک حدیث کے الفاظ میں یہ بھی ہے "شاید اللہ نے اہل بدر کو یہ اطلاع کر دی ہو کہ تم جو چاہو کرو' بس درحقیقت تمہارے لئے جنت واجب ہو چکی ہے۔" یہ بخاری کی حدیث کا ایک حصہ ہے۔ ان الفاظ میں حضرت عمرؓ کی اس تجویز کو مسترد فرمایا جس میں انہوں نے ایک بدری صحابی حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ کی گردن اڑانے کی اجازت طلب فرمائی تھی' جنہوں نے یہ کمزوری دکھائی تھی کہ قریش کو فتح مکہ کی تیاریوں کے سلسلے میں اطلاع دی تھی جسے پکڑ لیا گیا تھا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۱۸) وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۱۹) (۴۸ : ۱۸ — ۱۹) "اللہ مومنین سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے اور اللہ کو معلوم تھا' جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ اس لئے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ اور ان کو فتح بھی دے دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی دیں جنہیں یہ لوگ لے رہے ہیں اور اللہ زبردست اور حکمت والا

ہے ۔"

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ

(۵۷ : ۱۰) "تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور دشمنوں سے لڑے وہ لوگ بڑا درجہ رکھتے ہیں ان سے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور دشمن سے لڑے ۔ اگرچہ دونوں سے اللہ نے اچھے وعدے فرمائے ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے ۔"

"خالد ذرا آرام سے رہو' میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو' خدا کی قسم اگر تمہارے پاس اور جتنا سونا بھی ہو اور تم اسے فی سبیل اللہ خرچ کر دو تو تم وہ ثواب نہیں کما سکتے جو انہوں نے صبح و شام جہاد میں حصہ لے کر کمایا ۔" یہ حدیث ابن قیم نے زاد المعاد میں نقل کی ہے ۔ یہ الفاظ حضور ؐ نے حضرت خالد کو متنبہ کرتے ہوئے کہے ۔ جب انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے ساتھ تلخ کلامی کی ۔ خالد اگرچہ سیف اللہ تھے مگر ابن عوف سابقون اولون میں سے تھے ۔ "میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو ۔" حضور ؐ کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی معاشرہ میں یہ ممتاز طبقہ ہے ۔

اسلامی تحریک نے ان حضرات کے دلوں میں جو ایمان پیدا کیا اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر جو قدریں پیدا ہوئیں ان کے اختلاف کے مطابق ان کے درجے بھی مختلف تھے' لیکن فتح مکہ سے قبل یہ تفاوت بہت کم ہو گیا تھا اور اسلامی معاشرہ پوری طرح ہم آہنگ تھا اور اس کی ناہمواریاں پوری طرح چھپ گئی تھیں ۔ ان کی اکثر کمزوریاں دور ہو گئی تھیں اور جان و مال کے سلسلے میں ان کی شخصیات میں سے بخل دور ہو گیا تھا ۔ ان کے عقائد واضح ہو گئے تھے اور ان کی زندگی سے نفاق پوری طرح دور ہو گیا تھا اور فتح مکہ سے قبل مدنی معاشرہ کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک مکمل اسلامی معاشرہ بن گیا تھا جو اسلامی انقلاب کی اساس تھا ۔

مگر جب سن آٹھویں ہجری میں مکہ فتح ہوا اور اس کے بعد جنگ حنین کے نتیجے میں ہوازن ثقیف اور دوسرے قبائل فتح ہو گئے ۔ یہ دو قبائل قریش کے بعد عرب کی ممتاز قوتیں تھیں ۔ تو انسانوں کا ایک سیلاب اسلامی معاشرے میں داخل ہو گیا تھا ۔ ایمان و اخلاق کے اعتبار سے یہ مختلف سطح کے لوگ تھے ۔ ان لوگوں میں منافقین کی ایک بڑی تعداد بھی تھی جو اسلام کو دل سے ناپسند کرتے تھے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام کی شوکت کو دیکھ کر بہہ گئے تھے ۔ ان میں مؤلفۃ القلوب بھی تھے اور یہ طبقات ایسے تھے کہ وہ اسلامی قالب میں ابھی تک ڈھل نہ گئے تھے اور نہ ان کی پوری تربیت ہوئی تھی ۔ اسلام کی حقیقی روح سے یہ نئے لوگ نابلد تھے ۔

جزیرۃ العرب میں اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں قریش ایک دیوار اور بند کی طرح کھڑے تھے' کیونکہ دینی اور دنیاوی معاملات میں قریش کو ایک بڑا مقام حاصل تھا ۔ پھر ادبی' ثقافتی اور علمی و اقتصادی اعتبار سے بھی وہ دوسرے عربوں کے لئے قابل تقلید تھے ۔ اس وجہ سے ان کا مقابلے پر اتر آنا اور اس دین کی راہ روک دینا اس بات کا باعث ہوا کہ تمام عرب نے اس دین سے منہ پھیر لیا ۔ اور اسلام میں داخل نہ ہوئے' یا اگر انہوں نے صرف نظر نہ کیا تو کم از کم یہ صورت

حالات ضرور تھی کہ لوگ تردد میں رہے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ انتظار کیا جائے 'تاکہ مسلمانوں اور قریش کی کشمکش کا کوئی فیصلہ ہو جائے ۔ جب فتح مکہ کے بعد قریش سرنگوں ہوئے تو ہوازن وثقیف بھی سرنگوں ہو گئے ۔ مدینہ میں جو قوی یہودی قبائل تھے 'ان کی قوت اس سے پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی ۔ بنی قینقاع اور بنو نضیر شام کی طرف جلاوطن ہو گئے ۔ بنو قریظہ بھی ختم ہو کر رہ گئے اور خیبر کا معاملہ بھی صاف ہو گیا تھا ۔ خیبر کو فتح کر لیا گیا ۔ ان واقعات کی وجہ سے اب پورے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل گیا اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے اور صرف ایک سال کے عرصے میں لوگ دین اسلام میں داخل ہو گئے ۔

اسلام کا گراف افقی طور پر بلند ہونے کی وجہ سے وہ کمزوریاں اسلامی صفوں میں در آئیں جو جنگ بدر کی حیران کن کامیابی کی وجہ سے آگئی تھیں ۔ اب یہ کمزوریاں بہت بڑے پیمانے پر تھیں ۔ بدر الکبریٰ کے بعد جو کمزور عناصر اسلامی صفوں میں در آئے تھے ان کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قدر پاک و صاف کر دیا گیا کہ بدر الکبریٰ کے بعد فتح مکہ تک ست سالوں میں قریب تھا کہ مدنی معاشرہ تمام کمزوریوں سے پاک ہو جائے اور اہل مدینہ اسلامی انقلاب کے لئے مضبوط بیس اور مضبوط بنیاد بن جائے ۔ یہاں اولین 'مہاجرین و انصار کی ایک ایسی جمعیت تیار بیٹھی تھی کہ وہ ہروقت اسلامی نظام کے لئے امین تھی ۔ اگر یہ جمعیت نہ ہوتی تو اس عظیم انقلاب کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ۔ لیکن بدر الکبریٰ کے بعد اس جمعیت نے جو مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی اس عظیم انقلابی امانت کی مسلسل نگہبانی کی ۔ ان سات سالوں میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کی اس جمعیت کو اس کام کے لئے تیار کیا اور تربیت دی کہ یہ لوگ فتح عظیم کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے انسانوں کے سیلاب کو کنٹرول کر سکیں ۔ اللہ خوب جانتا تھا کہ وہ اپنی اس رسالت اور انقلابی رسالت کی حفاظت کا کام کس کے سپرد کرے ۔

ان کمزوریوں کا سب سے پہلے ظہور یوم حنین میں ہوا ۔ اس کا تذکرہ سورت توبہ میں ان الفاظ میں ہوا ہے :

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (٢٥) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (٢٦) (٩:٢٥ — ٢٦) "اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے ۔ ابھی غزوہ حنین کے روز ۔ اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا ۔ مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے ۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول ﷺ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے ۔ اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کا جو حق کا انکار کریں ۔"

اس جنگ میں ابتدائی شکست کا پہلا سبب یہ تھا کہ دس ہزار اسلامی لشکر میں دو ہزار طلقاء شریک تھے ..... یہ یوم فتح

مکہ پر ایمان لائے تھے اور اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے تھے۔ چنانچہ اسلامی لشکر کے ساتھ ان دو ہزار افراد کا وجود ہی اس انتشار کا سبب بنا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ ہوازن نے بالکل اچانک حملہ کیا اور لشکر اسلام چونکہ صرف مدینہ طیبہ کی حقیقی تربیت یافتہ فوج پر مشتمل نہ تھا' جن کی تربیت گزشتہ سات سالوں میں مکمل ہو چکی تھی اور جو اس تحریک کی اصل اساس اور سرمایہ تھے۔ اس لئے انتشار پیدا ہو گیا۔

غزوۂ حنین میں جو کمزوریاں سامنے آئیں وہ اسلام کی عددی قوت کے گراف اچانک عمودی بلندی کی وجہ سے تھیں۔ جدید لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے۔ جو ایمان اور اخلاص کے اعتبار سے مختلف درجات کے لوگ تھے۔ جن کے درمیان تفاوت درجات تھا۔ اور سورت توبہ میں ان کمزوریوں سے بحث کی گئی ہے۔ اور پھر مختلف زاویوں سے اور مختلف پہلوؤں سے سخت تنقید کی گئی ہے۔ جن کے تفصیلی اقتباسات ہم اس سے قبل دے آئے ہیں۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کی تربیت کی تاریخ کے مطالعے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فتح مکہ کے ٹھیک دو سال بعد کی تاریخ کے واقعات پر نظر ڈالیں۔ ٹھیک دو سال بعد جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو تمام جزیرۃ العرب ایک بار مرتد ہو گیا۔ صرف مدینہ کی تربیت یافتہ اسلامی سوسائٹی اپنی جگہ پر قائم رہی اور جیسا کہ ہم نے کہا' یہی اسلامی معاشرے کی مضبوط بنیاد تھی۔ چنانچہ ان حالات کو اگر نظر میں رکھا جائے تو ان کمزوریوں کے ظہور کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ فتح مکہ کے بعد صرف دو سال کے عرصے میں یہ ممکن نہ تھا کہ اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں کی اخلاقی تربیت اور تطہیر کردار کے کام کو مکمل کیا جا سکے۔ جبکہ آنے والوں کا معیار درجہ ایمانی کے اعتبار سے مختلف تھا۔ حضور ؐ کے انتقال کے بعد حالت یہ تھی کہ پورا جزیرۃ العرب فکری انتشار و خلفشار کا شکار تھا اور مدینہ طیبہ کا بیس (Base) اپنے موقف پر سختی سے قائم تھا۔ اپنی مضبوطی اور پختگی کے بل بوتے پر اور اپنے اتحاد اور یگانگت کے ذریعے سے اس انتشار اور سیلاب کے مقابلے میں یہ سوسائٹی جم گئی اور انسانوں کے اس سیلاب کو غلط بہاؤ سے روک کر اس کا دھارا پھر اسلام کی طرف پھیر دیا۔

ان حقائق کو اس زاویہ سے دیکھنے کے بعد ہمیں اچھی طرح یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مکہ میں دعوت اسلامی کو جن مشکلات اور مصائب سے دوچار کیا گیا تھا وہ اللہ کی تعمیری حکمت کے تحت ایک بامقصد امر تھا تاکہ یہ سوسائٹی جو اسلام کی بنیاد تھی' ان مشکلات سے کندن ہو کر نکلے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ میں مشرکین نے مسلمانوں کو کس قدر اذیت دی۔ فتنوں میں مبتلا کیا' ان کا خون بہایا اور ان کے ساتھ کیا کیا کیا۔

اللہ کو معلوم تھا کہ مضبوط اسلامی تحریک کے قیام کے لئے یہی منہاج تربیت ہے تاکہ جماعت کی بنیاد مضبوط ہو کیونکہ اس مضبوطی کے بغیر جو بھی عمارت کھڑی ہے' اس کا بوجھ برداشت کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ تحریک کے آغاز کے لئے اس قدر مضبوطی' خلوص' نصب العین کے حصول پر اصرار' اللہ کی راہ میں مشکلات انگیز کرنا' قلت جلاوطنی' بھوک اور افلاس' قلت تعداد اور زمینی وسائل کی کمی جیسی مشکلات کو برداشت کرنے کی صلاحیت ضروری تھی۔ تحریک کے آغاز کے لئے اسی معیار کی پختگی ضروری تھی۔

جب یہ ابتدائی گروہ مدینہ پہنچا تو اس گروہ کے ساتھ انصار میں سے سابقون اولون آ ملے۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ اسلامی تحریک کے لئے بنیاد بنیں اور بدر الکبریٰ کے بعد آنے والوں کو سنبھال سکیں جن کی مکمل تربیت نہ

ہوئی تھی۔

فتح مکہ سے پہلے مدینہ طیبہ کی سوسائٹی کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ یہاں کے باسیوں کی اکثریت تکمیل و تربیت کے اعلیٰ مدارج طے کر چکی تھی۔ اور یہی تربیت یافتہ صحابہ کا گروہ تھا جنہوں نے فتح مکہ کے بعد آنے والی افواج کو سنبھالا اور پھر حضورؐ کی وفات کے بعد ارتداد کے سیلاب کا مقابلہ کیا۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ پورے مکی دور میں اللہ تعالیٰ نے جو اسلامی تحریک کو سخت ترین مشکلات میں مبتلا کیا اور پھر مکی دور میں صلح حدیبیہ تک بروقت اس تحریک کو مشکلات 'جنگوں اور خوف کی حالت میں رکھا۔ اس کی حقیقی حکمت کیا تھی اس سے تحریکی عمل سے ہم یہ اصول اخذ کر سکتے ہیں کہ ہمارے دور میں اسلام کے تحریکی عمل کا منہاج کیا ہونا چاہئے۔

ابتدائی مراحل میں 'تمام اسلامی تحریکات کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ زیادہ توجہ اسلامی تحریک کی بنیادوں کو مضبوط کرنے پر صرف کریں۔ ابتدائی گروہ کی تربیت اور اخلاقی تطہیر پر توجہ دیں تاکہ تحریک کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر اٹھایا جائے۔ ان کے اندر ایمان کو گہرائی تک اتارا جائے تاکہ ان کے اندر پختگی پیدا ہو' وہ تحریک کے ساتھ لگن رکھتے ہوں اور ان کو اپنے نصب العین کا اچھی طرح شعور حاصل ہو۔ اور جب تک تحریک کے اندر ابتدائی گروہ کی اچھی طرح تربیت نہ ہو جائے' دعوت کی توسیع کا کام نہ شروع کیا جائے کیونکہ بنیادی گروہ کی اچھی تیاری سے قبل ہی کسی تحریک کو وسعت دے دینے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس آغاز ہی میں انتشار شروع ہو جائے۔ اگر کوئی اس طرح کرے گا تو وہ ربانی طریقہ تربیت کے خلاف کرے گا اور سنت نبوی اور طریقہ نبوی کے خلاف چلے گا۔

اس دعوت کی کامیابی کا کفیل اللہ ہے۔ جب اللہ کو منظور ہوتا ہے کہ کسی تحریک کو مضبوط بنیادوں پر اٹھایا جائے تو اللہ تعالیٰ تحریک کے ابتدائی دستوں کو بے پناہ مشکلات سے دوچار کر کے ان کو کردار کی پختگی عطا کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی کا طویل انتظار کراتا ہے۔ ان کی تعداد قلیل ہوتی ہے۔ لوگ ان سے دور رہتے ہیں لیکن جب معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اب صبر کرنے والے ہیں۔ یہ ثابت قدم ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے تیاری مکمل کر لی ہے۔ اور وہ صلاحیت پیدا کر چکے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کو ذریعہ بناتا ہے کہ ان سے اس عظیم کام کا آغاز ہو سکے۔ اور وہ اس کے امین اور علمبردار ہوں۔ پھر اللہ ان کو قدم بقدم آگے بڑھاتا ہے۔ اللہ اپنے کاموں پر غالب ہے۔ لیکن لوگ درحقیقت نہیں جانتے۔

ان مباحث کے بعد ہم اس طرف آتے ہیں کہ اس سورت کے مضامین کا اجمالی خلاصہ یہاں دے دیں۔ اس کے بڑے بڑے موضوعات اور خصوصاً وہ احکام جن میں مشرکین اور کافرین کے ساتھ اسلامی ریاست کے آئندہ تعلقات کی ضابطہ بندی کی گئی ہے کیونکہ اس موضوع پر جو احکام آئے ہیں' وہ آخری احکام ہیں۔ لہٰذا ان میں بلند ترین تحریکی خطوط کھینچے گئے ہیں۔

پارہ نہم میں سورت انفال کے تعارف میں ہم نے کفار و مشرکین کے ساتھ آخری ضابطہ کے بارے میں جو کچھ نقل کیا تھا' میں سمجھتا ہوں یہاں اس کا خلاصہ دوبارہ نقل کر دیا جائے۔ اگرچہ امام ابن قیم کا یہ اقتباس مکرر یہاں آجائے گا لیکن اس تکرار کے باوجود اس کے چند فقرے یہاں نہایت ہی موزوں اور سیاق کلام کے ساتھ مناسب رہیں گے اور ان کی وجہ سے بات میں جان پیدا ہوگی۔

امام ابن قیم جوزی نے اپنی مشہور کتاب زاد المعاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجاہدانہ زندگی کے بارے میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔"بعثت سے لے کر وفات تک کفار اور منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل" اس عنوان کے تحت آپ رقم طراز ہیں :

"اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آپ کی طرف یہ وحی نازل کی کہ "آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیں" یوں ہوا آپ کی نبوت کا آغاز' اس وقت جو حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ اپنے دل میں پڑھیں۔ابھی آپ کو تبلیغ کا حکم نہ ملا تھا' کچھ عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّر قُمْ فَاَنْذِرْ یعنی اقراء سے آپ کو نبوت ملی اور یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّر سے آپ کو منصب رسالت عطاء ہوا اور حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں' رشتہ داروں کے بعد آپ نے اپنی قوم کو انجام بد سے ڈرایا۔قوم کے بعد مکہ مکرمہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے قبائل کو تبلیغ کی۔اس کے بعد یہ پیغام پوری عرب دنیا تک عام کر دیا گیا اور بالآخر اس دعوت کو بین الاقوامی دعوت بنا دیا گیا۔

دعوت اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کئی سال تک صرف وعظ اور تبلیغ کرتے رہے اور طاقت کا استعمال نہ کیا' بلکہ آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ صبر اور درگزر سے کام لیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں۔ایک عرصہ بعد آپ کو ہجرت کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی دشمنوں سے لڑنے کی بھی اجازت دی گئی تاہم یہ اجازت اس حد تک تھی کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کی جائے جو لڑنے کے لئے میدان میں اتر آئیں اور دوسروں سے نہ لڑا جائے اور سب سے آخر میں یہ حکم دیا گیا کہ کفار اور مشرکین سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہو جاتا۔لِیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہ جس وقت آپ کو جہاد کا حکم دیا گیا اس وقت حضور ؐ اور کفار کے درمیان تعلقات کی صرف تین شکلیں تھیں۔اہل صلح' اہل حرب اور اہل ذمہ۔اہل صلح یعنی جن کے ساتھ امن کے معاہدات ہوئے تھے۔ان کے بارے میں حکم ہوا کہ عہد کو آخر تک نبھایا جائے۔لیکن صرف اس صورت میں کہ جانب مخالف اپنے معاہدے کا پابند ہو اور اگر وہ عہد شکنی اور غداری کریں تو آپ بھی معاہدہ ان کے منہ پر دے ماریں' البتہ ایسے لوگوں کے ساتھ عملاً جنگ اس وقت تک نہ چھیڑی جائے جب تک انہیں باقاعدہ اطلاع نہ دے دی جائے کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔جب سورۂ برائت نازل ہوئی تو ان تمام اقسام کے احکام علیحدہ علیحدہ بیان ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے اس وقت تک لڑیں کہ یا وہ جزیہ قبول کریں اور یا اسلام میں داخل ہو جائیں اور مشرکین اور منافقین سے بھی جہاد کا حکم دیا گیا نیز منافقین سے مزید سختی برتنے کا حکم دیا گیا۔کفار کے ساتھ آپ کا جہاد مسلح جنگ کی شکل میں تھا اور منافقین کے ساتھ زبان اور دلیل سے۔

سورہ برائت میں یہ حکم بھی دیا گیا کہ کفار کے ساتھ کئے ہوئے تمام معاہدات کو ختم کر دیا جائے اور علی الاعلان ان سے برائت کا اظہار کر دیا جائے۔اس اعلان کے بعد اہل عہد کی تین اقسام قرار پائیں۔وہ جن کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا' یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور اپنے عہد پر قائم نہیں رہے تھے۔ان لوگوں کے ساتھ حضور نے جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جن کے ساتھ عہد تھا اور وہ اسے نبھاتے بھی رہے۔آپ کو حکم دیا گیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہے' اسے مقررہ مدت تک برقرار رکھا جائے اور شرائط کی پابندی کی جائے۔تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی کہ جن کے ساتھ اگرچہ معاہدہ تو نہ تھا لیکن یہ لوگ آپ کے خلاف کسی جنگ میں بھی شریک نہ ہوئے تھے' یا

ان کے ساتھ تعین مدت کے بغیر معاہدہ طے پا گیا تھا۔ایسے لوگوں کے بارے میں حکم ہوا کہ انہیں چار ماہ کی مہلت دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس کے بعد کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے یا مسلمان ہو جاؤ ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

(یہ حکم صرف مشرکین عرب کے لئے ہے۔انہیں جزیہ دے کر اسلامی ریاست کے زیر سایہ ذمی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ اس لئے کہ حق کے پورے انکشاف کے بعد ان کے انحراف کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ نبی ہیں اور قرآن ان کی اپنی زبان میں انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے 'محض ہٹ دھرمی کی بناء پر یہ انکار کیے جا رہے تھے۔اس لئے یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں تھے۔عرب اہل کتاب اور غیر عرب مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ یہ رعایت رکھی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو حفاظت جان و مال کا معاوضہ (جزیہ) دے کر اسلامی ریاست کے زیر سایہ باعزت شہری کے طور پر رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔)

چنانچہ انہی ہدایات کے مطابق آپ نے عہد شکنوں کے ساتھ جنگ کی 'اور جن کے ساتھ کوئی عہد نہ تھا انہیں چار ماہ کی مہلت دی اور راست باز معاہدین کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اور ایسے تمام لوگ معاہدہ کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اہل ایمان اور مسلمانوں کا جزو بن گئے اور اہل ذمہ پر جزیہ عائد ہوا۔

جیسا کہ کہا گیا سورۂ براءت کے نزول کے بعد کفار کے ساتھ آپ کے تعلقات تین قسم کے رہ گئے تھے یعنی محارب ' اہل ذمہ اور اہل عہد اور چونکہ اہل عہد سب کے سب اسلام میں داخل ہو گئے تھے 'اس لئے صرف اہل ذمہ اور اہل حرب ہی باقی رہ گئے۔اہل حرب کی حالت یہ رہتی تھی کہ آپ کے دور میں وہ ہمیشہ آپ سے خائف رہتے تھے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں حضورؐ اور تمام انسانوں کے تعلقات کی نوعیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ ان میں سے بعض مسلم اور مومن تھے 'بعض آمن اور مسالم تھے اور بعض آپ سے خائف اور محارب تھے۔

منافقین کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپ ان کے اعلان اسلام کو قبول فرمائیں اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیں اور ان کے مقابلے میں علم و استدلال کے ہتھیار ہی استعمال کریں اور ان کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اختیار کریں اور ان سے سختی برتیں اور ان کی نفسی کیفیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے ارشادات عالیہ سے ان کی اصلاح کی سعی کریں۔ان کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کریں اور نہ حضورؐ ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کریں اور یہ کہ اگر آپ ان کے لئے دعائے مغفرت مانگ بھی لیں تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہ بخشے گا۔یہ تھا مختصر بیان حضورؐ کے طرز عمل کا اپنے کفار اور منافق دشمنوں کے ساتھ۔"

اقامت دین کی جدوجہد اور اس کی خصوصیات

علامہ ابن قیم نے اسلامی جہاد کے مختلف مراحل کی یہ بہترین تلخیص پیش کی ہے اور اس سے دین حق کے تحریکی پہلو کی مستقل اور گہری بنیادیں واضح ہو جاتی ہیں جو اس لائق ہیں کہ خاصی دیر ٹھہر کر ان پر اچھی طرح غور کر لیا جائے۔اس مختصر سی بحث میں ہم صرف چند اشارات پر ہی اکتفاء کریں گے۔

۱۔ ابن قیم کے اس "سیرت پارہ" سے "اسلامی جہاد" کی جو پہلی بنیاد سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دین حق اپنے طریق کار میں بھرپور واقعیت پسند ہے۔یہ طریق کار دراصل اس حرکت کا نام ہے 'جو زمین پر موجود کسی انسانی سوسائٹی کا سامنا کرتی ہے اور ایسے سب ذرائع سے اس کا سامنا کرتی ہے 'جو سوسائٹی کے واقعی وجود کے مقابلہ میں کام آ سکیں۔

وہ جاہلیت کے اس فکری دائرہ پر یلغار کرتی ہے جس پر عملاً زندگی کا چلتا پھرتا ایک نظام قائم ہے جسے وقت کا اقتدار مادی قوت کے ذریعہ سہارا دیئے چلا جاتا ہے۔

اسلامی تحریک عالم واقع میں اس واقعی صورت حال کا مقابلہ کرتی ہے۔ ان تمام ذرائع و وسائل کو کام لاکر جن سے کہ یہ جاہلیت کام لیتی ہے' وہ اس جاہلیت کا سامنا بیان و تقریر سے بھی کرتی ہے' تاکہ سوسائٹی کے افکار و عقائد کی اصلاح ہو سکے اور وہ بغایت درجہ سعی کے ساتھ طاقت بھی استعمال کرتی ہے' تاکہ جاہلیت کے نظام و اقتدار کو ملیامیٹ کیا جا سکے۔ وہی اقتدار جو عوام اور تعمیر افکار کی اصلاح کے کام میں روک بن کر کھڑا ہے اور جو جبراً ان پر مسلط ہے اور انہیں اندھیرے میں رکھے ہوئے ہے اور جو انہیں رب اکبر کے مقابلہ میں دوسروں کا بندہ بنائے ہوئے ہے۔

یہ ایک ایسی تحریک ہے جو صرف بیان و اظہار پر اکتفاء کر کے ختم نہیں ہو جاتی جس طرح کہ اس تحریک میں یہ بھی نہیں ہے کہ مادی غلبہ حاصل کر کے لوگوں سے جبراً اپنی بات منوالے..... یہ رد و قبول میں جبر کی قائل ہی نہیں۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین حق کے طریق کار میں یہ دونوں ہی باتیں نہیں ہیں۔ وہ تو ایک تحریک ہے' اس لئے برپا کی گئی ہے کہ لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلاکر اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی میں داخل کر دے۔

تفصیل آگے آتی ہے۔

۲- اس دین کی دوسری خصوصیت (علامہ ابن قیم کے سیرت پارہ کی روشنی میں) یہ ہے کہ اس کے اصلاحی طریق کار میں واقعیت پسندانہ تحریکیت پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی تگ و دو سے عبارت ہے جس کے کئی مراحل ہیں۔ ہر مرحلے میں اس کے مناسب ذرائع اور وسائل کو کام میں لایا جاتا ہے۔ جو اس مرحلے کے واقعی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور اس مرحلے سے یہ تحریک بتدریج آگے بڑھتی ہے' اس تحریک کا طریق کار یہ ہے کہ یہ واقعی حالات کا مقابلہ مجرد نظریات سے نہیں کرتی اور نہ ہی اس کے اختیار کردہ وسائل و ذرائع جمود کا شکار ہیں۔

ہمارے دور میں جو لوگ اسلام کے نظریہ جہاد کے بارے میں لکھنے بیٹھتے ہیں اور قرآن کی آیات پر بحث کرتے ہیں' ان کے پیش نظر پہلی تحریک اسلامی کے مختلف مراحل نہیں ہوتے۔ نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان مراحل میں سے کس مرحلے میں تحریک نے کیا تدابیر اختیار کی تھیں' انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ان مراحل سے متعلق آیات کا شان نزول (پس منظر) کیا تھا' یہ لوگ' غلط مبحث کرتے ہیں اور دین کے نظریہ جہاد کے بارے میں گمراہ کن التباس و اشتباہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور قرآنی آیات کو ایسے معنی پہناتے ہیں جن کی وہ متحمل نہیں ہوتیں' بعض آیات کا تعلق تحریک کے ابتدائی مراحل سے ہے۔ یہ لوگ انہیں آخری مراحل کے لئے اصول قرار دیتے ہیں۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ بے شمار غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے اور ابتدائی ہدایات کو آخری فیصلے سمجھ بیٹھے۔ حد یہ ہے کہ یہ اس بات کے قائل ہو گئے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ کا جواز ہے' دراصل یہ لوگ فکری و ذہنی طور پر شکست خوردہ ہو گئے اور یہ رائے انہوں نے اس لئے قائم کی کہ اس مادی دور کے حالات کی سنگینی سے "فرزندان اسلام" عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جن کے ہاں اسلام کا صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ دین حق پر ڈھائے ہوئے اپنے ظلم کو اسلام کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ اسلام کا اصل موقف تو یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر سے طاغوت کا اقتدار ختم کر دیا جائے اور تمام لوگوں کو غیراللہ کی غلامی سے نجات دی جائے۔ اس معاملہ میں اسلام کا

اصل رول یہ ہے کہ جاہلیت نے دنیا میں دین حق کے پھیلنے کی راہ میں جو جو رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں انہیں ہٹا دیا جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حق کے مقابلہ میں باطل سرنگوں ہو جائے یا مٹ جائے۔ اور یا اتنا مغلوب ہو جائے کہ اسلام کی بالادستی کو تسلیم کر کے اس کے سایہ عاطفت میں تحفظ جان و مال کا معاوضہ (جزیہ) ادا کر کے پرامن شہری کی حیثیت سے رہائش پذیر اور اسلام اور عوام الناس کے درمیان حائل نہ ہو تاکہ لوگ اس بارے میں بالکل آزاد ہوں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

۳۔ (ابن قیم کے "سیرت پارہ" کی روشنی میں) اس دین کی تیسری خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وسعت پذیر تحریکیت اور نئے نئے وسائل، اسے اپنے بنیادی اصولوں سے منحرف نہیں کر سکتے اور نہ اس نصب العین ہی میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے جو شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ یہ دین ہمیشہ اپنے اصولوں پر سختی سے جما رہا ہے۔ دعوت رشتہ داروں کو دی جا رہی ہو، قریش کو دی جا رہی ہو، تمام عرب کو بلایا جا رہا ہو، یا تمام کرۂ ارض کو خطاب کیا جا رہا ہو، اس کی دعوت ہر وقت یہی رہی ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی اختیار کرو اور اللہ کے سوا تمام غلامیوں کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکو، مصلحت کی خاطر اصول کو چھوڑا جا سکتا ہے، نہ نرمی برتی جا سکتی ہے اور نصب العین کے حصول کے لئے متعین طریق کار ہے، جس کی حدود متعین ہیں۔ پھر اس کے لئے جدوجہد کے مراحل بھی متعین ہیں اور ہر مرحلہ کے لئے وسائل و ذرائع میں سے نو بہ نو ذرائع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ (یہاں بھی حدود اللہ کا لحاظ رکھنا لازم ہے) اس سلسلہ میں اوپر بھی "اشارہ" گزرا ہے۔

۴۔ (ابن قیم کے مطابق) دین حق کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بین الاقوامی علائق کے لئے اس کا اپنا ایک ضابطہ ہے، اور اس ضابطہ و قانون کی اساس و بنیاد اس امر پر ہے کہ اسلام کا اپنا ایک موقف (Stand) ہے اور وہ یہ ہے کہ "تمام بنی آدم اللہ وحدہ لاشریک کی اطاعت کریں۔ یہ ان پر فرض ہے اور انہیں زندگی میں اللہ کی اطاعت ہی کی روش اختیار کرنی چاہئے۔ یہ نہیں تو کم از کم تمام بنی آدم کو "الٰہی اطاعت" کے اس نظام (اسلام) کو برداشت کرنا چاہئے اور مصالحانہ روش اختیار کرنا چاہئے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ بنی آدم میں سے کوئی بھی اس کی دعوت کی راہ میں حائل ہو۔ کوئی سیاسی نظام ہو یا مادی قوت ...... وہ تمام بنی آدم کے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ دنیا کے عوام اور اس کے درمیان آڑے نہ آئیں تاکہ لوگ اپنے آزاد ارادے کے ساتھ، اسلام کو اختیار کریں۔ یا اسے رد کر دیں، اسلام بطور خود بھی رد و قبول میں جبر و طاقت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتا، اگر کوئی شخص، کوئی گروہ (...... وہ کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو، کیسا ہی ہو ....) اسلام اور عوام کے درمیان حائل ہوتا ہے تو اسلام اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے تا آنکہ اسے ملیامیٹ کر دیا جائے یا وہ اسلام کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔"

---ooo---

اس بیان کی روشنی میں ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس سورت میں یہ آخری احکام کیوں دیئے گئے کہ اللہ اور رسول اللہ کی طرف سے مشرکین کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کو منسوخ کر دیا گیا اور جن لوگوں کے معاہدوں میں مدت کا تعین تھا، اور انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف لڑنے والی کسی قوت کے

ساتھ تعاون کیا تھا' ان کو مدت معاہدہ تک مہلت دے دی گئی اور جن لوگوں کے ساتھ معاہدے میں مدت مقرر نہ تھی اور انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی بھی نہ کی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سے تعاون کیا تھا' ایسے لوگوں کو چار ماہ کی مہلت دے دی گئی اور یہی مہلت ان لوگوں کو بھی دی گئی جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا۔ اور جن کے ساتھ معاہدے تھے مگر انہوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ ان کے معاہدوں سے براءت کے ساتھ ساتھ ان کو بھی چار ماہ کی مہلت دے دی گئی کہ وہ چار ماہ تک خوب چل پھر لیں اور جب یہ ماہ ختم ہوں گے تو پھر حکم یہ ہو گا کہ وہ پکڑے جائیں گے، قتل ہوں گے' ان کو گھیرا جائے گا اور ان کی نقل و حرکت پر پابندی ہوگی۔ یہ ہیں وہ احکام جو ہم نے ان آیات سے سمجھے کہ جو لوگ جزیرۃ العرب میں دین اسلام اور اللہ کے حقیقی دین سے انحراف کریں گے ان کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کی جائے گی؟ یہ کہ وہ اپنے ہاتھ سے فدیہ ادا کریں اور چھوٹے ہو کر زندگی بسر کریں۔ ان احکام و ضوابط کے بعد پھر یہ حکم آتا ہے کہ کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد میں اب ذرا سختی سے کام لو۔ ان کے مردوں کا جنازہ نہ بڑھاؤ۔ ان کی قبروں پر کھڑے نہ ہوں۔ یہ وہ احکام ہیں جنہوں نے سابق مراحل کے احکام منسوخ کر دیئے جو عبوری دور کے لئے تھے اور وہ احکام ان سورتوں میں تھے جو سورت توبہ سے قبل نازل ہوئی تھیں۔ اس بیان کی روشنی میں' ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے آخری ہدایت ہے۔

اب ان آخری اور فائنل احکام کی مزید تفصیلات یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پر مفصل کلام تشریح آیات کے ضمن میں آرہا ہے لیکن یہاں یہ بات نوٹ کرنا ضروری ہے' وہ یہ کہ سابق مراحل میں جو عبوری احکام نافذ کئے گئے تھے' ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ احکام اب منسوخ ہو گئے ہیں اور اب تمام حالات میں صرف ان احکام پر عمل ہو گا جو سورت توبہ میں اپنی آخری شکل میں وارد ہوئے ہیں بلکہ وہ احکام اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن ان کا اطلاق آنے والے ادوار میں ایسے ہی حالات میں ہو گا جیسے حالات میں وہ پہلی مرتبہ نازل ہوئے تھے اور ہر دور کے مجتہدین کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے دور اور اپنے حالات کے مطابق اس بات کا تعین کریں کہ کون سے احکام موجودہ عملی حالات کے لئے زیادہ مناسب ہیں۔

کسی مخصوص زمان و مکان میں اس وقت کے مجتہدین یہ فیصلہ کریں گے لیکن ہر دور کے مجتہدین کو یہ بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کا اصل ہدف وہ حالات و احکام ہیں جو سورت توبہ میں موجود ہیں۔ جب بھی امت اس قابل ہو کہ وہ سورت توبہ کے اہداف پر عمل کر سکے' اسے کرنا چاہئے یعنی جب ایسے حالات وجود میں آجائیں جیسے سورت توبہ کے وقت موجود تھے یا ایسے حالات آجائیں جو سورت توبہ کے حالات کے بھی بعد میں اسلامی فتوحات کے دور میں نازل ہوئے' چاہے وہ حالات اور احکام مشرکین کے متعلق ہوں یا اہل کتاب کے متعلق ہوں۔

آج کل مسلمانوں کی بدترین صورت حالات کو دیکھ کر بعض لوگ مایوس ہو کر ذہنی طور پر شکست کھا جاتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کو اسلام کے نام اور عنوان کے بغیر کوئی چیز نظر بھی نہیں آتی۔ پھر مستشرقین کی جانب سے اسلام کے نظریہ جہاد پر جو حملے کئے جاتے ہیں وہ ان سے بھی بہت خوفزدہ اور پریشان ہیں' ایسے لوگ ان آیات کا مطالعہ کر کے ان میں راہ فرار تلاش کرتے ہیں اور وہ الکل پچو سے اس مفہوم سے گریز اختیار کرتے ہیں جو ان آیات کا حقیقی مدلول ہوتا ہے۔ ان آیات جہاد کا حقیقی ہدف تو یہ ہے کہ بزور شمشیر تمام انسانوں کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر انہیں اللہ کی

بندگی میں شامل کیا جائے۔ اور ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے جو انسانوں کو غیراللہ کی غلامی میں جکڑ رہی ہیں۔ ان پر اللہ کے سوا دوسری حکومت قائم کرتی ہیں اور انسانی معاشروں میں اللہ کے قوانین کے سوا دوسرے قوانین نافذ کرتی ہیں۔

ایسے لوگ جب بات شروع کرتے ہیں تو وہ اپنی تقریر اسی طرح کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کہتا ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ”اگر وہ امن کے معاہدے کے لئے تیار ہوں تو کر لیں اور اللہ پر توکل کریں۔“ اور دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ --- (۸:۶۰) ”اللہ تمہیں ان لوگوں سے نہیں روکتا، جنہوں نے تمہارے ساتھ لڑائی نہ کی اور جنہوں نے تمہیں اللہ کے گھروں سے نہیں نکالا، کہ تم ان کے ساتھ نیکی کرو اور انصاف کرو۔“ اور دوسری جگہ یہ ہے وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۲: ۱۹۰) ”اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا۔“ اور اہل کتاب کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۳: ۶۴) ”اے اہل کتاب آؤ، ایسے کلمے کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی دوسرے کو رب نہ بنائے، اللہ کے سوا، اگر یہ اس دعوت سے منہ پھیریں تو پھر کہو کہ گواہ رہو کہ بے شک ہم مسلم ہیں۔“

لہٰذا ان آیات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام صرف ان لوگوں کے ساتھ لڑتا ہے جو اہل اسلام کے ساتھ دارالاسلام کے حدود کے اندر لڑتے ہیں یا وہ دارالاسلام کے حدود سے باہر رہ کر اس کے لئے باعث خوف بنتے ہیں۔ یہ کہ مشرکین کے ساتھ صلح حدیبیہ طے ہوا تھا۔ یہودیان مدینہ کے ساتھ بھی ایک معاہدہ ہوا تھا، لہٰذا (ان لوگوں کے شکست خوردہ خیال کے مطابق) اسلام کا پوری دنیا میں بسنے والے لوگوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے اور اسلام کو کیا کہ وہ لوگ جس کی چاہیں بندگی کریں۔ چاہے وہ ایک دوسرے کو رب بنالیں یا جو چاہیں کریں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر پرامن رہیں۔ یہ خیالات دراصل اللہ پر سوء ظن کا اظہار ہے۔ یہ اسلام کے بارے میں بدظنی کا اظہار ہے۔ اور اس قسم کے خیالات ان لوگوں کے ذہنوں میں اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ایسے لوگ درحقیقت مسلمانوں کے موجودہ حالات کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں۔ یہ رویہ اور سوچ نہایت ہی ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہے۔ ایسے لکھنے والوں نے دراصل دنیا کی سپر طاقتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اور یہ لوگ ان طاقتوں کے خلاف سوچ بھی نہیں

سکتے۔

اگر یہ لوگ دنیا کے لوگوں سے شکست کھاتے لیکن اپنی اس شکست خوردگی کو اسلام کی طرف منتقل نہ کرتے تو کوئی بات نہ تھی۔ وہ اپنی کمزوریوں کو اگر اسلام کی طرف منسوب نہ کرتے تو ہمیں ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی سروکار نہ ہوتا لیکن ایسے لوگ اپنی اس شکست خوردہ سوچ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ اسلام اللہ کا قوی اور متین دین ہے اور وہ غالب ہو کر رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن نصوص و آیات کا یہ لوگ سہارا لیتے ہیں یہ آیات دراصل اسلام کے آخری مراحل سے پہلے عبوری مراحل میں مسلمانوں کی راہنمائی کے لئے نازل ہوئی تھیں اور ایسے مراحل دوبارہ بھی امت مسلمہ کو پیش آسکتے ہیں جن میں ان آیات کی تطبیق کر کے ان پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ سیرۃ النبی کے تحرکی عمل میں ایسے حالات نہیں آئے تھے اور ان میں یہ احکام دیئے گئے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہ ہو گا کہ اسلام کا آخری ہدف یہ ہو گا یا اسلام کے غلبے کے حالات میں بھی یہ احکام ہوں گے۔ آخری مراحل مین بھی ایسی ہدایات ہوں گی۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنی قوت بڑھاتی رہے گی اور اپنے حالات درست کرتی رہے گی' وہ اپنے راستے سے مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتی رہے گی یہاں تک کہ اسے دنیا میں ~~عروج وغلبہ نصیب~~ ہو اور عروج و غلبہ کے وقت بھی اس کے لیے آخری ہدایات وہ ہوں گی جو سورت توبہ میں دی گئیں۔ وہ کیا ہدایات تھیں؟ جو آخر میں دی گئیں۔ ملاحظہ کیجئے:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱) فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ (۲) وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳) اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٤) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵)

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (٦) (٩ : ١ تا ٦) "اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے' ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو' اور یہ کہ اللہ منکر حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے' اور اس کا رسول ﷺ بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے۔ اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبی انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنادو۔ بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔ تو پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو' جہاں پاؤ۔ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اپنے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔"

اور اہل کتاب کے بارے میں یہ ہدایت ہے

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (٩ : ٢٩) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو حرام کیا ہے' اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

اگر اپنے حقیقی اور عملی حالات کی وجہ سے آج مسلمان ان احکام کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنا سکے تو موجودہ وقت اور مرحلے میں وہ اس کے مکلف نہیں ہیں اور اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت کے مطابق ہی تکلیف دیتا ہے اور عبوری حالات میں وہ ان عبوری احکام سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور جب وہ آخری احکام کے حالات میں داخل ہوں گے تو وہ آخری اور فائنل آیات سورت توبہ کو نافذ کر سکیں گے لیکن کسی کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ قرآن کریم کی ان ہدایات کو جو آخری اور فائنل مراحل کے لئے ہیں' توڑ مروڑ کر ان آیات کے تابع کر دیں جو عبوری دور کے لئے ہیں اور اپنی موجودہ کمزوریوں کے لئے قرآن سے وجہ جواز تلاش کریں۔ ایسے لوگوں کو خدا کا خوف کرنا چاہئے اور اللہ کے قرآن کو مسخ کر کے دین اسلام پر اپنی رائے نہیں ٹھونسنا چاہئے کہ اسلام دین ہے امن و سلامتی کا۔ حالانکہ اسلام کا آخری

نصب العین یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے جیسے انسانوں کی بندگی سے نکل کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل ہوں اور یہ کہ پوری انسانیت پوری کی پوری اسلام میں داخل ہو جائے۔ اسلامی نظام ایک ایسا نظام ہے کہ اللہ پوری انسانیت کو اس نظام تک سربلند کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ پوری انسانیت اس نظام سے متمتع ہو۔ یہ نظام انسانوں میں سے کسی انسان کا تخلیق کردہ نہیں ہے۔ نہ کسی انسانی فکر کا نتیجہ ہے۔ لہذا انسانوں کو اس بات کے اعلان سے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرنی چاہئے کہ اسلام کا آخری ہدف اور نصب العین یہ ہے کہ ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے جو اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

---ooo---

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو جن نظاموں کی اطاعت کرنی ہے اگر وہ نظام انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہیں اور ان کے پیچھے عمل پیرا نظریہ بھی ہم جیسے انسانوں کا پیش کردہ نظریہ ہے تو ایسے حالات میں پھر یہ سوچ درست ہے کہ ہر انسان یا انسانوں کے مجموعے کا پیش کردہ نظریہ اپنے حدود کے اندر زندہ رہے جب تک کہ وہ دوسرے نظریات اور حدود کو توڑتا نہیں ہے۔ اور ایسے انسانی نظریات اور انسانی نظاموں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔

لیکن اگر مسئلہ یہ نہ ہو اور ایک طرف اللہ کا دین ہو اور اللہ کی بنائی ہوئی شریعت ہو' اس کے وضع کردہ حدود و قیود من جانب اللہ ہوں اور اس کے مقابلے میں انسانوں کے بنائے ہوئے دین اور قانونی نظام ہوں تو پھر صورت حال مختلف ہو جاتی ہے۔ پھر اللہ کے دین کا یہ حق ہے کہ وہ ان تمام رکاوٹوں کو پاش پاش کر کے اپنی راہ نکالے جو انسانوں کے دین ہیں اور جن میں انسان' انسان کا غلام اور بندہ ہوتا ہے۔ اور ان رکاوٹوں کو دور کر کے پھر یہ دین حق بندوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جو دین اور نظریہ چاہیں اپنالیں' لیکن جہاں تک اعلیٰ سیاسی نظام کا تعلق ہے وہ صرف اللہ کا ہو گا۔

وہ لوگ جو دنیا میں شکست کھا چکے ہیں وہ آیات اور قرآنی ہدایات میں تاویلات کر کے اپنے آپ کو ان مشکل تقاضوں سے بچاتے ہیں جن کا مطالبہ قرآنی آیات و ہدایات کرتی ہیں اور جن کو وہ اپنے خیال میں حرج سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں ایک دین اور ایک نظام حیات دیا ہے اور جس کا مقصد اعلان آزادی انسان ہے اور اس میں کوئی انسان' انسان کا غلام نہیں ہو سکتا جبکہ دوسرے تمام انسانی نظاموں میں انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے۔

اسلام کے نظریہ جہاد کے لئے دلائل جواز ہیں اور وہ دلائل اسلامی نظام زندگی کے اندر سے فطرتاً اٹھتے ہیں۔ ان شکست خوردہ خیالات رکھنے والے منکرین کو چاہئے کہ وہ ان پر غور کریں۔ ممکن ہے کہ اللہ ان کی سمجھ میں یہ بات ڈال دے اور ان پر وہ رازہائے دروں اور حکمت دین واضح کر دے جو وہ اپنے متقی بندوں پر واضح کرتا ہے۔

---ooo---

آخری بات اس سورت کے بارے میں یہ ہے کہ اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھا گیا۔ اور حضرت عثمان ؓ کے مرتب کردہ مصحف میں بسم اللہ موجود نہ تھی۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان سے دریافت کیا کہ سورت انفال مثانی سے ہے' اور سورت براءۃ مئین میں سے ہے۔ آپ لوگوں کو ان

کے ساتھ ملا کر رکھا ہے اور ان کے درمیان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر تحریر نہیں کی ہے۔ اور دونوں کو سبع طوال میں رکھا ہے۔ یہ کام آپ حضرات نے کیوں کیا ہے؟ اس پر حضرت عثمان۔ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا وقت آیا تھا کہ متعدد سورتیں نازل ہوا کرتی تھیں تو جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ ان لوگوں کو بلاتے جو قرآن کریم کو لکھا کرتے تھے اور ان کو حکم دیتے کہ اس آیت یا آیات کو اس سورت میں رکھ دیں جس میں یہ ذکر ہوا ہے۔ سورت انفال مدینہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی اور براءت مدینہ کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ دونوں کا مضمون ایک جیسا تھا۔ میں نے تو یہاں تک خیال کیا کہ شاید یہ انفال ہی کا حصہ ہے۔ حضور فوت ہو گئے اور اس سلسلے میں آپ نے کوئی وضاحت نہ فرمائی۔ میں نے ترتیب کے وقت دونوں کو یکجا کر دیا اور ان کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر نہ لکھی اور ان کو سبع طوال میں رکھ دیا۔

ان سورتوں کو اسی طرح مرتب کرنے کے سلسلے میں یہ اقرب روایت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان بسم اللہ کی سطر نہیں لکھی گئی۔ اس روایت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کے اندر آیات کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور یہ کام حضور ؐ کے زمانے ہی میں مکمل ہوا تھا۔ اور یہ کہ بیک وقت کئی سورتوں کی تکمیل ہوتی رہتی تھی۔ جب کبھی کسی عملی صورتحال کے لئے کوئی آیت نازل ہوتی تھی' یا کسی حکم کی تکمیل کے لئے کوئی آیت یا آیات نازل ہوتی تھیں یا کسی حکم میں تخصیص اور تبدیلی ہوتی تھی' اس دین کے تحریکی منہاج کے مطابق تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھ دو۔ اور اس حکم کی خاص حکمت ہوتی تھی۔ چنانچہ سورتوں میں آیات کی یہ ترتیب حکمت الٰہیہ کے مطابق ہوتی تھی۔

ہم نے سورتوں پر تبصرہ کرتے وقت یہ بات بار بار کہی ہے کہ ہر سورت کی اپنی ایک شخصیت ہے۔ ہر سورت کے اپنے خدوخال ہیں اور ہر سورت کی ایک خاص فضا ہے اور ایک خاص پس منظر اور سایہ ہوتا ہے اور ہر سورت کا اپنا خاص انداز تعبیر ہوتا ہے جس سے اس کی خصوصیات اور اس کے خدوخال کا اظہار ہوتا ہے۔ حدیث ابن عباس سے اس بات کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے جس کی تشریح اور اس کی طرف اشارہ ہم نے بار بار کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس سورت کا اس قدر تعارف اور اس کے مضامین اور موضوعات کا یہ اجمالی تعارف کافی ہو گا۔ اب ہمیں آیات کی تفصیلی تشریح کی طرف آنا چاہئے۔

---ooo---

درس نمبر ۸۷ ایک نظر میں

یہ سبق پوری سورت کے بعد نازل ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں ترتیب سورت میں اسے پہلے رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے یہ بات واضح کر دی گئی ہے۔ کسی سورت میں آیات کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوتی تھی' لہٰذا سورتوں کی تشکیل ایک توقیفی امر ہے۔

اس حصے میں ان معاہدات کو ختم کرنے کی بات کی گئی ہے جو اس وقت تک مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان قائم تھے۔ معاہدوں کی منسوخی کا اطلاق ایک تو ان معاہدوں پر تھا جن میں فریق مخالف نے' ان کی یکطرفہ خلاف ورزی شروع کر دی تھی' یا وہ مطلق معاہدے تھے اور ان کے لئے چار ماہ کی مدت مقرر کر دی گئی یا وہ معاہدے تھے جن کی مدت خود بخود ختم ہو رہی تھی اور انہوں نے اس عرصے میں کوئی نقص عہد نہ کیا تھا اور نہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی بھی دوسری قوت کی طرفداری کی تھی۔ ان سب قسم کے معاہدوں کو بہرحال ختم کر دیا گیا۔ اور ان آیات میں یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ آئندہ مشرکین کے ساتھ جزیرۃ العرب میں کوئی عہد نہ ہو گا' ان سے مطلقاً براءت کا اظہار کر دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ مشرکین کے لئے رسول اللہ کا عہد کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟

معاہدات کے سلسلے میں ان ہدایات میں یہ ہدایت بھی شامل تھی کہ آئندہ مشرکین کو بیت اللہ کا طواف کرنے کی اجازت نہ ہو گی اور نہ ہی وہ بیت اللہ یا دوسری مساجد کی تعمیر میں کسی قسم کا حصہ لے سکیں گے۔ اور یہ ہدایات اس معاہدے کے برعکس تھیں کہ جو رسول اللہ اور مشرکین کے درمیان طے شدہ تھا کہ وہ حرام مہینوں میں اور بیت اللہ میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہ کریں گے اگرچہ وہ مشرک ہوں۔

جو لوگ سیرت النبی کے احوال و واقعات کا مطالعہ کریں' انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ احیائے اسلام کا تحریکی منہاج کیا ہے۔ اس کی نوعیت اور طبیعت کیا ہے۔ اور اس عمل میں مختلف اقدامات کے لئے مراحل کیا ہیں؟ اور اس کے آخری اہداف کیا ہیں؟ نیز وہ باسانی معلوم کر سکتا ہے کہ اسلامی محاذ اور جزیرۃ العرب کے مشرکین اور اہل کتاب کے مختلف کیمپوں کے درمیان اس سورت میں تعلقات کے جو آخری خطوط کھینچے گئے ہیں وہ بالکل بروقت تھے۔ ان کے لئے زمین تیار ہو گئی تھی' حالات سازگار تھے اور یہی خطوط اور اقدامات فیصلہ کن تھے اور ان کو اپنے وقت پر واقع ہونا تھا۔

مسلسل عملی تجربات سے یہ بات عیاں ہوتی جا رہی تھی اور طویل مراحل سے گزرنے کے بعد تو یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ان دو متضاد نظام ہائے حیات کے درمیان نہایت بنیادی اختلافات بلکہ تضادات پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی علاقے میں متوازن طور پر نہیں چل سکتے۔ یہ اختلاف اس قدر گہرے اور بنیادی ہیں کہ عقائد و تصورات' اعمال اور تنظیم اور طرز بود و باش اور اجتماعی اور اقتصادی نظام' سیاسی اور انسانی تصورات غرض ہر اعتبار سے ان کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ اور یہ وہ اختلاف ہے جو عقیدے اور سوچ سے لے کر زندگی کے تفصیلی شعبوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک نظام

اس عقیدے پر تعمیر ہوا ہے کہ بندگی صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ دوسرا نظام اس اساس پر ہے کہ یہاں انسان، انسان کا غلام ہو گا اور اس میں خود ساختہ الٰہ الٰہ ہوں گے اور متفرق ارباب ہوں گے اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر قدم پر ان کے درمیان تصادم ہو گا کیونکہ زندگی کے ہر قدم اور ہر مرحلے پر دونوں کے تقاضے مختلف اور متضاد تھے اور دو نظام مختلف رویے کا مطالبہ کرتے تھے۔

یہ کوئی عارضی امر نہ تھا کہ قریش دعوت اسلامی کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا مقابلہ شروع کر دیا۔ اور انہوں نے اسلام کے خلاف نہایت ہی ظالمانہ مزاحمت شروع کر دی۔ اسی طرح مدینہ کے یہودیوں نے اسلام کے خلاف جو محاذ کھول دیا، وہ بھی کوئی عارضی بات نہ تھی۔ نیز یہودیوں اور مشرکین کا اسلام کے خلاف متحدہ محاذ بھی کوئی عارضی اور اتفاقی بات نہ تھی حالانکہ یہودی اہل کتاب تھے اور شرک کے خلاف تھے لیکن انہوں نے مشرکین عرب کے ساتھ جنگ احزاب میں ایکا کیا بلکہ یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ اب ان کے نظام کے لئے یہ نئی مملکت ایک واضح خطرہ ہے کیونکہ یہ مملکت ایک نظریہ پر قائم ہے اور اس کے پاس ایک مکمل نظام حیات ہے جو ربانی ہدایات پر مبنی ہے۔ بعد میں عنقریب ہم بتائیں گے کہ نصاریٰ نے اسلام کے خلاف جو لشکر کشی شروع کر دی تھی تو یہ بھی کوئی اتفاقی اور حادثاتی امر نہ تھا۔ یمن اور شام اور ان سے آگے کے علاقوں میں یہ عیسائی اس تحریک کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے اور قیامت تک وہ سمجھتے رہے اور رہیں گے۔ یہ بالکل طبعی اور منطقی موقف تھا جو ان لوگوں نے اختیار کیا۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کا ایک طبعی موقف تھا اور اس کا طبعی نتیجہ تھا کہ تمام دوسرے نظام اس کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ اسلامی نظام کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے اور تمام انسانوں کو اللہ کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس مقصد کی راہ میں جو بھی رکاوٹ بنے اسلام اسے ایک ٹھوکر سے ہٹانا چاہتا ہے اور لوگوں کو ایک آزاد فضا کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ اس آزاد فضا میں جو نظریہ چاہیں قبول کریں۔ پھر چونکہ اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں کے درمیان ہر جزیئے میں اختلاف اور تضاد تھا اس لیے یہ ممانعت اور یہ محاذ آرائی بالکل قدرتی تھی۔ ان تمام نظاموں کی طرف سے یہ قدرتی محاذ آرائی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس خطرے سے بچائیں جو ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینک رہا تھا۔ لہٰذا ان قوتوں کی جانب سے یہ طرز عمل یقینی تھا اور ان لوگوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

ان نظاموں کی یہ مجبوری پوری اسلامی تاریخ میں انہیں اسلام کے خلاف محاذ آرائی پر مجبور کرتی رہی۔ اس سلسلے میں بار بار تجربات ہوئے۔ مختلف صورتوں میں اس کا ظہور ہوا۔ لہٰذا اس صورت میں جو آخری فیصلے کئے گئے وہ نہایت ہی ضروری تھے اور ان کے سوا اس صورت حالات کے مقابلے کی لئے کوئی اور راہ موجود نہ تھی۔ روایات میں جو بعض اسباب بیان کئے گئے ہیں وہ اس بڑے سبب اور ان حقیقی وجوہات کی بعض کڑیاں ہیں اور یہ کڑیاں اسلامی تاریخ اور سیرت النبی کی بعض روایات میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔

اس موقف کی گہرائی تک پہنچنے اور گہری فکر و نظر کے بعد اور مسلسل تحریکی تجربات کے بعد اسلام کا ان آخری اقدامات کو صحیح طرح سمجھا جاسکتا ہے لیکن ان گہرے اسباب کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ فوری اسباب بھی پیش نظر رکھنے ہوں گے کیونکہ یہ فوری اسباب حقیقی اسباب کا تانا بانا تھے اور حقیقی اسباب سے جدا نہ تھے۔

امام بغوی نے اپنی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی طرف نکلے تو منافقین نے بری خبریں پھیلانا شروع کر دیں۔ اور مشرکین نے ایک ایک کر کے عہد توڑنا شروع کر دیئے۔ تو اللہ نے ان کے بارے میں یہ آیات نازل کیں، ان میں ان لوگوں کو چار ماہ کی مدت دے دی جن کے معاہدے پہلے ختم ہو رہے تھے اور جن کے معاہدے کا عرصہ چار ماہ سے زیادہ رہتا تھا کہ ان کی مدت میں کمی کر دی گئی۔

امام طبری نے سورت کے آغاز میں مختلف تفسیری اقوال نقل کرنے کے بعد کہا "ان سب اقوال سے بہتر یہ قول ہے کہ یہ چار ماہ کی مدت کا تعین ان لوگوں کے لئے تھا جن کے ساتھ حضورؐ کا عہد تھا اور ان کو اس اعلان میں کہا گیا کہ تم فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (۹: ۲) (زمین میں چار ماہ تک چلو پھرو) یہ ان معاہد لوگوں کے لئے تھا جنہوں نے حضورؐ کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کر کے حضورؐ کے خلاف لشکرکشی کی تھی، لیکن جن لوگوں نے حضورؐ کے ساتھ اپنے عہد کا پاس کیا تھا اور وہ حضورؐ کے خلاف کیمپ میں شامل نہ ہوئے تھے تو ان کے بارے میں حکم یہ تھا کہ ان کے ساتھ عہد کو اپنی مدت تک نبھایا جائے۔ اللہ کا فرمان تھا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۴) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے، پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی معاہدے تک وفا کرو، کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

امام طبری نے اپنی سند کے ساتھ مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹: ۱) سے مراد اہل معاہدہ ہیں یعنی وہ عرب جن سے حضورؐ نے معاہدے کئے تھے یا جن کے ساتھ عہد تھا۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے فارغ ہوئے تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا لیکن اس کے بعد آپ نے فرمایا: "بیت اللہ میں چونکہ مشرک بھی حج تو کرتے ہیں اور ننگے طواف کرتے ہیں۔ اس لئے میں اس وقت تک حج کو نہ جاؤں گا۔ جب تک اس رسم کو ختم نہ کر دیا جائے۔" چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کو بھیجا۔ یہ دونوں لوگوں میں گھومے پھرے اور ذوالمجاز اور ان مقامات میں گئے جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بیع و شریٰ کرتے تھے۔ اس پورے موسم میں انہوں نے اعلان فرمایا کہ جو لوگ صاحب عہد میں وہ چار ماہ تک مامون رہیں اور یہ چار ماہ کا عرصہ مسلسل ہے یعنی ذوالحجہ کے آخری بیس دن اور ربیع الاخر کے ابتدائی دس دنوں سمیت اور اس کے بعد یہ معاہدہ ختم ہو گا اور اس کے بعد انہوں نے اعلان جنگ کر دیا الا یہ کہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اس لئے تمام لوگ چار ماہ کے اندر اندر مسلمان ہوگئے اور کسی شخص نے فَسِيْحُوْا سے فائدہ نہ اٹھایا۔

مذکورہ بالا اسباب درحقیقت فوری اسباب تھے جن کی وجہ سے یہ انتہائی قدم اٹھایا گیا لیکن دراصل اس اقدام کے گہرے اسباب کی کڑیوں میں سے یہ بھی کڑیاں تھیں۔ اور یہ اسباب حقیقی اسباب نہ تھے، حقیقی اور گہرا سبب یہ تھا کہ دونوں نظام ایک جگہ متوازی طور پر جاری نہ رہ سکتے تھے۔ لہٰذا دونوں میں سے ایک کو کسی دن لازماً ختم ہونا تھا۔

مرحوم رشید رضا نے اپنی تفسیر میں ان کڑیوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس آخری اقدام کے گہرے اور حقیقی سبب کا ذکر نہیں کیا ہے کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان گہرا حقیقی تضاد تھا اور جس انجام تک نظام شرک پہنچا اس تک اس نے ایک دن پہنچنا تھا۔ وہ فرماتے ہیں :

"یہ بات قطعی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضور کو اللہ نے ایک ایسا دین دے کر بھیجا تھا جو ایک نظام تھا جس کے ذریعے اس دین کو مکمل کر دیا گیا۔ اور اس کے لئے عظیم معجزہ اس قرآن کو قرار دیا گیا جو شان اعجاز لئے ہوئے تھا اور اس کے اعجاز کے مختلف پہلو تھے۔ جن کے اصول ہم نے (۲ : ۳) ص ۱۹۰ تا ص ۲۲۸ – ج ۱) میں نقل کئے اور اسلام کی طرف دعوت کو عقلی 'علمی اور تسلی بخش اور تشفی بخش دلائل پر رکھا۔(۱)

اور دین کے معاملے میں ہر قسم کے جبر اور اکراہ کے استعمال کو ممنوع قرار دیا جس طرح ہم نے آیات (۲ : ۲۵۶' ص ۲۶ – ۴۰' ج ۳) میں تفصیل سے دیا ہے۔ چنانچہ مشرکین نے حضور ؐ کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کر کے ان پر تشدد کیا۔ اور ان کو اللہ کی راہ سے روکنے کی کوشش کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انہوں نے تبلیغ کرنے سے جبراً منع کر دیا۔ اور حالات ایسے ہوگئے کہ آپ کے متبعین میں سے کوئی بھی مامون نہ تھا۔ ہر کسی کو تشدد اور جان کا خطرہ لاحق تھا۔ الا یہ کہ وہ کسی کی پناہ میں ہوں یا کسی کے حلیف ہوں۔ لہٰذا مسلمانوں نے کئی بار ہجرت کی۔ اس کے بعد ان کی ایذا رسانی اور نیش زنی میں مزید اضافہ ہو گیا' چنانچہ انہوں نے خفیہ فیصلہ کیا کہ آپ کو دائمی طور پر قید کر دیا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے اور یہ مشورہ انہوں نے دار الندوہ میں علانیہ کیا۔ لیکن آخری فیصلہ یہ کیا کہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا جیسا کہ اس کی تفصیلات ہم نے آیت (۸ : ۳۰) میں دے دی ہیں۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ (ج ۹' ص ۶۵) چنانچہ آپ نے ہجرت فرمائی اور جن دوسرے لوگوں کی قسمت میں یہ اعزاز لکھا تھا انہوں نے بھی ہجرت فرمائی اور ان لوگوں کو مدینہ میں انصار ملے جن کے دلوں میں رسول اللہ اور ہجرت کرنے والوں کی محبت بھی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے مثالی ایثار سے کام لیا اور اہل ہجرت اور رسول اللہ اور کفار مکہ کے درمیان اس وقت کے عرف کے مطابق حالت جنگ تھی۔ مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے اہل کتاب نے آپ کے ساتھ معاہدہ امن کیا لیکن انہوں نے اس معاہدے کو پورا نہ کیا اور خیانت اور غداری کی۔ اور مشرکین عرب کے ساتھ ساز باز کر کے وہ ہمیشہ رسول اللہ اور مسلمانوں کے خلاف قوتوں کی حمایت کرتے رہے جس کی تفصیلات ہم نے سورت انفال میں دی ہیں۔ دیکھئے اسی جلد کے صفحات (۵۳ تا ۶۸) "

اس سے قبل آپ نے حدیبیہ میں مشرکین کے ساتھ دس سالہ معاہدہ کیا تھا اور یہ معاہدہ آپ نے کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت اور غلبے کے باوجود مشرکین کے شرائط پر کیا۔ محض اس لئے کہ آپ امن و سلامتی کو پسند فرماتے تھے۔

---

(۱) یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ استاد محمد عبدہ اور آپ کے مکتب کے لوگ مغربی ممالک کے فلسفہ سے بہت متاثر تھے۔ خصوصاً ڈیکارٹ کے فلسفے سے جنہوں نے ہر معاملے میں عقل کی پیروی کا حکم دیا۔ اور اسلامی عقائد و نظریات کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا طریقہ ڈالا۔ لہٰذا یہاں یہ انتباہ ضروری ہے کہ اسلام کے حق میں عقلی اور سائنسی دلائل کے ساتھ ساتھ بدیہی فطری دلائل پر بھی غور کرنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ انسان کی شخصیت صرف عقل پر مشتمل نہیں ہے۔ عقل و برہان کے علاوہ بھی انسان کے اندر ملکات موجود ہیں۔ ان کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اور اپنے دین کو حجت و دلیل کے ساتھ پھیلانا چاہتے تھے۔(۱)

بنو خزاعہ نے آپ کے ساتھ عہد کیا اور بنو بکر نے قریش کے ساتھ عہد کیا۔ اس کے بعد قریش نے بنو بکر کی حمایت کرتے ہوئے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور اس طرح نقض عہد کے مستحق قرار پائے۔ اور اس نقض عہد کی وجہ سے مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان دوبارہ حالت جنگ عود کر آئی۔ اس کے نتیجے میں مکہ فتح ہوا۔ جس کی وجہ سے شوکت اسلام قائم ہوئی اور مشرکین ذلیل ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود جس وقت بھی ممکن ہوا یہ لوگ حضور اکرم کے ساتھ غداری کرتے رہے۔ اور یہ بات تجربے سے ثابت ہو گئی کہ وہ قوی ہوں یا ضعیف ہوں، مسلمانوں کے ساتھ غداری ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہ ہرگز پاس عہد نہیں رکھتے۔ جیسا کہ اسی سورت کی آیت کی تشریح میں آئے گا کہ وہ ہر وقت نقض عہد کے لئے آمادہ تھے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۹:۷) تا آخر آیت ۱۲ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (۹:۱۲) تک

یعنی ان کے بارے میں یہ سمجھ لو کہ وہ کسی عہد کو پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یعنی ان لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا بذریعہ معاہدہ یکجا رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس طرح کہ ان میں سے ہر فریق دوسرے کے شر اور فتنہ سے محفوظ و مامون ہو اور مشرکین اپنے نظریات پر رہیں اور قانون ان کا نہ چلے۔ اور اس طرح باہم مل کر دونوں فریق زندہ رہ سکیں۔ کیونکہ ان کی سابقہ غداریوں اور مکاریوں کی وجہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے حالانکہ ان کے حسب حال یہ تھا کہ وہ اہل کتاب ہونے کے ناطے وفائے عہد کرتے۔ ۲(۲)

”یہ ہے وہ حقیقی شرعی اصول جس کے مطابق مطلق معاہدات کی منسوخی کے احکامات وارد ہوئے اور جن لوگوں نے معاہدے کی خلاف ورزی نہ کی تھی ان کے ساتھ معاہدات کو اپنی مدت تک پورا کرنے کی ہدایت آئی اور ان احکام کی حکمت یہ تھی کہ جزیرۃ العرب سے شرک جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے اور جزیرۃ العرب کو مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے، لیکن سابقہ اصول اپنی جگہ قائم رکھے گئے مثلاً بقرہ ۱۹۰ میں کہا گیا وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (۲:۱۹۰) (یعنی اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی جائے جو تمہارے ساتھ لڑتے ہیں) اور

---

(۱) یہ بات اس حد تک درست ہے کہ تحریکی انداز میں تبلیغ اسلام بھی حجت و دلیل کے ساتھ ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لئے ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ دفاع کے سوا بھی جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔

(۲) ۱+۲۔ تعجب کی بات ہے کہ مصنف اس گہری حقیقت تک پہنچ گئے ہیں جو ان اقدامات کا اصل سبب ہے اور یہ کہ ان معاہدات کا جو حشر ہوا اس سے ثابت ہو گیا کہ اسلامی محاذ اور مشرکین کے محاذ کے درمیان باہم سلامتی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ الا یہ کہ چند مختصر عرصے کے لئے کوئی وقفہ ایسا ہو لیکن اس کے باوجود مصنف اسلامی نظام اور شرکیہ نظام کے درمیان ایسے معاہدات کے قائل ہیں جن کی وجہ سے دار الاسلام میں دونوں نظام یکجا ہو کر رہ سکتے ہیں۔ یہ ان کے نزدیک دائماً ممکن ہے اور اس کے خلاف اگر کوئی صورت ہوئی ہے تو وہ استثنائی ہے۔ الا یہ کہ امر مشرکین مکہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (کسی حد تک یہ بات درست ہے کہ یہ حکم مشرکین مکہ تک محدود ہے لیکن دوسرے مشرکین کی حالت بھی جزیرۃ العرب کے مشرکین سے مختلف کس طرح ہو سکتی ہے۔ تفصیلات ہم آگے دے رہے ہیں۔

دوسری وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۸: ۶۱) (یعنی اگر وہ سلامتی و امن کے لئے جھکیں تو تم بھی ان کی طرف جھکو۔) حتی الامکان یہ پالیسی رہی۔ اگرچہ جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ یہ سابقہ آیات اس سورت کی آیت سیف کے ذریعے منسوخ ہیں اور اہل شرک کے ساتھ تمام عہد منسوخ ہیں۔"

اس اقتباس اور اس پر آخری تعقیب اور تفسیر منار کی دوسری تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مصنف معاہدات کی منسوخی اور مشرکین و اہل کتاب کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف آغاز جنگ کے حقیقی اسباب تک بہرحال پہنچ گئے ہیں لیکن وہ اس سبب کی حقیقی جڑوں تک نہیں پہنچے اور نہ اس سبب کو وہ وسعت دے کر اسے عام پالیسی بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ اس معاملے میں دین کی حقیقت اور اس کے تحریکی مزاج تک نہیں پہنچ سکتے اور وہ اس نکتے تک بھی نہیں پہنچ سکے کہ اسلامی نظام حیات اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظامہائے حیات کے درمیان بنیادی اور حقیقی تضاد پایا جاتا ہے اور ان دونوں کا ایک جگہ زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

تفسیر منار کے علاوہ اس مسئلے پر استاد محمد عزہ کی تصریحات بھی قابل غور ہیں۔ وہ اپنی تفسیر "التفسیر الحدیث" میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ اس حقیقت کبریٰ سے بہت دور ہے اور وہ ان واقعات و احکامات کے حقیقی اسباب کو پا ہی نہیں سکے۔ استاد محمد عزہ زمانہ حال کے دوسرے اہل قلم کی طرح رات دن اس تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ اسلام کو امن و آشتی کا دین ثابت کریں اور اس کے لئے دلائل تلاش کریں، یہ لوگ آج کل جب ان نسلوں کے برے دنوں کو دیکھتے ہیں جن کے آباؤ اجداد مسلمان تھے اور پھر اس کے مقابلے میں دیکھتے ہیں کہ آج کل کے بے دین، ملحدین اور نام نہاد اہل کتاب مادی لحاظ سے عروج پر ہیں تو یہ لوگ رات دن یہ ثابت کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ اسلام تو نہایت ہی گوسفندانہ مذہب ہے اور وہ اپنے حدود کے اندر دبک کر رہنے والا ہے۔ اور جب بھی اس کے ساتھ کوئی امن و سلامتی کے سلسلے میں بات کرے وہ قبول کرتا ہے۔

یہ لوگ سورت توبہ کی ان آیات کا سبب نزول صرف اس بات کو قرار دیتے ہیں کہ بعض لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چونکہ نقض عہد کر دیا تھا لہٰذا ان کے خلاف یہ اقدام ہوا اور جن لوگوں نے نقض عہد نہ کیا تھا چاہے ان کے معاہدے موقت ہوں یا دائمی ہوں ان کو یہ سورت بحال رکھتی ہے۔ اور اگر کسی نے نقض عہد کر بھی لیا تھا تو یہ سورت اجازت دیتی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ از سر نو عہد کر لیا جائے۔ یہ لوگ ابتدائی مراحل کی آیات کو اصل الاصول قرار دیتے ہیں اور اس سورت کی ان آخری آیات کو مقید قرار دیتے ہیں۔

اس لئے یہ صاحب اس آیت ۴، ۵ توبہ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۴) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ

وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ

إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۵) (۹ : ۴ — ۵) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے۔پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ان دو آیات اور ان سے پہلی آیات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مدنی دور کے آخری دنوں کا ایک رنگ ہے۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان فتح مکہ کے بعد یا فتح مکہ کے قبل کے دور میں منعقد ہونے والے کچھ معاہدے تھے۔مشرکین میں سے کچھ لوگ تو ایسے تھے کہ وہ اپنے معاہدوں کو پورا کرتے رہے اور بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے عہد شکنی کی اور مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی قوتوں کی طرفداری کرتے رہے۔اور غداری اور نقض عہد کے مرتکب ہوتے رہے۔"

"ہم اس سے قبل کہہ آئے ہیں کہ مفسرین اور اہل تاویل زیر تفسیر دو آیتوں میں سے دوسری آیت کو آیت السیف کہتے ہیں۔اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آیت ان تمام آیات کو منسوخ کر دیتی ہے جن میں مشرکین کے حوالے سے تسامح، تساہل، چشم پوشی اور صرف نظر کے احکام یا اشارے موجود ہیں۔بلکہ اس آیت کے بموجب علی الاطلاق ان کا قتل واجب ہے۔ بعض مفسرین نے اتنا کہا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ معاہدہ ہے 'ان کے بارے یہ حکم دیا ہے کہ وہ لوگ اپنی مدت معاہدہ تک اس کے حکم سے مستثنیٰ ہوں گے اور بعض لوگ ان کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتے اور ماسوائے قبول اسلام کے ان سے کوئی اور صورت قبول نہیں کرتے۔

ہم نے اس پر اس سے قبل متنبہ کر دیا ہے کہ اس رائے میں غلو پایا جاتا ہے اور یہ رائے قرآن مجید کے صریح احکام کے خلاف ہے۔جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ماسوائے اعداء کے کسی اور کو قتل نہ کیا جائے اور یہ کہ دوستی کرنے والوں اور معاہدے کرنے والوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے۔ مفسرین نے اپنے اقوال اور روایات مکرر اسی حوالے سے قدیم اہل تفسیر و تاویل سے نقل کئے ہیں۔علامہ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ ان تمام لوگوں کی گردن پر تلوار رکھ دیں جن کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور ان کے ساتھ جو معاہدات ہوئے تھے ان کو ختم کر دیا جائے۔ خود اس مصنف نے سلیمان ابن عیینہ کا ایک عجیب قول نقل ہے جنہوں نے آیات اور سورت اور دوسری سورتوں میں آنے والی دوسری آیات جن میں مشرکین کے ساتھ قتال کا حکم نہیں ہے، کے درمیان تطابق اس طرح پیدا کیا ہے کہ یہ آیات تین تلواریں ہیں اور یہ کہ حضور ؐ نے حج اکبر کے دن حضرت علی ؓ ابن ابو طالب کو یہ تین آیات دے کر بھیجا تھا اور ان میں سے یہ آیت بھی ہے اور اسے انہوں نے عرب مشرکین کے لئے تلوار کہا ہے اور ایک تلوار اہل کتاب کے لئے ہے اور وہ سورت توبہ کی آیت ۹۲ ہے یعنی

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور کو کچھ اللہ اور اس کے رسول ؐ نے حرام قرار دیا ہے' اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

ایک تلوار منافقین کے لئے ہے اور وہ سورت توبہ کی آیت (۷۳) ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۹ : ۷۳) "اے نبی کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بد ترین جائے قرار ہے۔" اور ایک تلوار باغیوں کے خلاف ہے اور وہ سورت الحجرات کی آیت (۹) ہے۔

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ (۴۹ : ۹) "اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔" اور مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ امام طبری اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت کا اطلاق معاہدین اور غیر معاہدین سب پر ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔حالانکہ سورت ممتحنہ کی آیت (۸) کی تفسیر میں انہوں نے یہ قرار دیا کہ یہ آیت محکم ہے۔ آیت یہ ہے

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (۶۰ : ۸) (اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا' اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" لہٰذا اللہ مسلمانوں کو اس بات سے نہیں منع کرتا کہ جو شخص ان کے معاملات سے غیر جانبدار رہتا ہے اور امن و سلامتی کا معاہدہ کرتا ہے خواہ جس مذہب و ملت کا ہو' اس کے ساتھ تم احسان و انصاف کا رویہ اختیار کرو۔ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگ معاہد بھی نہ ہوں۔"

"یہ تمام دلائل اور اس آیت کے سیاق و سباق سے یہ بات واضح ہے کہ یہ حکم صرف ان لوگوں کے لئے آیا ہے جو معاہد تھے اور جنہوں نے اپنے عہد سے روگردانی کر لی تھی اس کے سوا کسی اور گروہ سے مطلق قتال جائز نہیں ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ یہ آیت السیف ہے اور ہر مشرک پر اس کا عموماً اطلاق ہوتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کی متحمل یہ آیت نہیں ہے اور نہ ہی سیاق کلام سے یہ مطلب نکلتا ہے۔ اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ یہ آیت متعدد آیات کی ناسخ ہے۔ خصوصاً ان آیات کی ناسخ ہے جن کا مضمون اصولی اور عمومی ہے۔ مثلاً لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یا الدعوت بالحکمت اور بذریعہ وعظ حسن یا مباحثہ و مجادلہ بطریق احسن' یا نیکی اور انصاف کی تلقین کرنے والی آیات خصوصاً ان لوگوں کے ساتھ جو مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑتے۔ اور نہ انہوں نے مسلمانوں کو گھروں سے نکالا ہے۔ خصوصاً جبکہ بعد میں اس مضمون کی آیات آ رہی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مسجد حرام کے پاس تمہارے ساتھ جن لوگوں نے معاہدہ کیا ہے' جب تک وہ معاہدے پر قائم رہیں اس معاہدے کا احترام کیا جائے جس پر ہم عنقریب تفصیلی بحث کریں گے۔"

"ان آیات میں جو احکامات ہیں ان کے بارے میں دو سوالات اٹھتے ہیں؟ پہلا یہ کہ پہلی آیت میں جو استثناء ہے وہ معاہدے کی مدت کے ختم ہونے تک ہے تو کیا معاہدہ کرنے والے مشرکین اس مدت کے خاتمے پر اللہ اور رسول اللہ کی ذمہ داری سے نکل جائیں گے اور اب ان کے ساتھ جنگ فرض ہوگی۔ مفسرین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قابل اعتبار روایت نہیں ملی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر آیت اول کے 'مفہوم کو علی الاطلاق لیا جائے تو مفسرین کا اخذ کردہ مفہوم درست ہے۔ اور اس کی پھر وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ دیکھا جائے گا کہ جن لوگوں نے معاہدہ کیا تھا ان کی پوزیشن اس معاہدے سے پہلے کیا تھی؟ یا تو وہ معاہدے سے پہلے دشمن تھے اور ان کے ساتھ جنگ اور مقاتلہ ہوا تھا۔ پھر مسلمانوں نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا جس طرح قریش کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر صلح کی تھی۔ یا وہ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے بغیر جنگ و جدال اور مقاتلہ کے مسلمانوں کے ساتھ امن اور دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ سورت نساء کی یہ آیت (۹۰) انہی لوگوں کے بارے میں ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُھُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا قَوْمَھُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَھُمْ عَلَیْکُمْ فَلَقٰتَلُوْکُمْ فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا (۴ : ۹۰) "البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جاملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے' اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں' نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم سے' اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کرنے کی کوئی سبیل نہیں رکھی)۔ تو ایسے لوگوں کا حکم اس آیت میں بطور واقعہ ذکر ہے۔ سیرت کے بعض واقعات میں بھی ایسے لوگوں کی مثالیں موجود ہیں۔ ابن اسحاق نے نقل کیا کہ حضور ؐ نے کنانہ کی شاخ بنو صخر سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ

آپ ان پر حملہ نہ کریں۔ اور نہ وہ مدینہ پر حملہ کریں گے۔ نہ وہ کسی قوم کی تعداد آپ کے خلاف بڑھائیں گے نہ آپ کے دشمن کی معاونت کریں۔ اسی سلسلے میں آپ نے ان کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ بھی کیا تھا۔ پھر اس آیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ تجدید عہد نہ کیا جاسکتا ہو یا یہ کہ کسی ایسی قوم کے ساتھ معاہدے کی مدت کو نہ بڑھایا جاسکتا ہو جبکہ ایسی قوم نے نہ وعدہ خلافی کی ہو اور نہ غداری کا ارتکاب کیا ہو۔ اور مسلمانوں کو اس کا کوئی اختیار بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑیں یا کسی نہ کسی شکل میں دست درازی کریں۔ خصوصاً اس آیت میں جو عنقریب آرہی ہے۔ بصراحت کہا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ عہد کو پورا کرو جب تک وہ عہد کو پورا کرتے ہیں' اس آیت میں بھی اس بات پر قرینہ موجود ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ ان شاء اللہ۔

"دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری آیت کے آخر میں کہا گیا ہے اگر وہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے اور ان کے ساتھ قتال کو ختم کر دیا جائے۔"

"اس سوال کے سلسلے میں جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے جن مشرکین نے نقض عہد کیا اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی تو اب وہ اس بات کے مستحق نہیں رہے کہ ان کے ساتھ دوبارہ کوئی معاہدہ کیا جائے لہٰذا مسلمانوں پر یہ فرض ہو گیا کہ ان پر ایسی شرائط مسلط کر دیں جن کے نتیجے میں علاقے میں امن و سلامتی کی ضمانت دی جاسکے اور وہ شرائط یہی ہو سکتی ہیں کہ وہ شرک سے توبہ کرلیں۔ اور اسلام میں داخل ہو جائیں اور اسلامی عبادات ادا کریں اور مالی ذمہ داریاں پوری کریں۔ اور ایسے اقدامات کو اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ تصور نہ کیا جائے گا۔ قطع نظر اس بات سے کہ جس نظام شرک میں وہ پڑے ہوئے ہیں وہ انسانیت کو نہایت ہی ذلت کے مقام تک گراتا ہے اور انسانوں کو ایسے عقائد و اعمال دیتا ہے جو نہایت ہی بودے اور عقل و منطق کے خلاف ہوتے ہیں اور ان نظریات کے نتیجے میں ایک ایسا جاہلی نظام رائج ہوتا ہے جو نہایت ہی ظالمانہ نظام ہوتا ہے۔ جس میں نہایت ہی مکروہ اور منکر افعال کا ارتکاب ہوتا ہے اور لوگ عجیب قسم کے تعصبات کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام ان پر جس نظام اسلامی میں داخلے کی شرائط عائد کرتا ہے اس میں ان کے لئے آزادی' ترقی اور عقلی اور عملی کمال کی ضمانت دی گئی ہے۔ اسلامی نظام ان کو عبادت کے اچھے طریقے' اخلاق کا اعلیٰ معیار اور فکر و نظر کا منطقی نظام دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ایسے نقض عہد کرنے والوں کے ساتھ دوبارہ کسی معاہدے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر فریقین کی مصلحت اسی میں ہو اور بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ مسلمان جنگ کرنے کے قابل ہی نہ ہوں یا ایسے لوگوں کو وہ جنگ کے ذریعے زیر نگیں لانے کی قوت ہی نہ رکھتے ہوں واللہ اعلم۔"

مصنف کی تفسیر سے ہم نے جو فقرے اوپر منتخب کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اور ان جیسے دوسرے لوگ اسلام کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ اٹھے اور اس پوری دنیا سے انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد کرے اور انہیں اللہ کی غلامی میں داخل کر دے' جہاں جہاں بھی اسلام کے لئے یہ ممکن ہو اور جب بھی ممکن ہو' قطع نظر اس سے کہ کہیں مسلمانوں پر زیادتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اور نہ زیادتی مسلمانوں پر ان کے اقلیمی حدود کے اندر ہوئی ہو یا باہر۔ ایسے لوگ اس اصول ہی کو مسترد کرتے ہیں حالانکہ اس اصول پر اسلام کا نظام جہاد مرتب ہوتا ہے اور اس اصول کے سوا دین اسلام کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی راہ سے وہ تمام مادی رکاوٹیں دور کر دے۔ اگر اس اصول کی نفی کر

دی جائے تو پھر اسلامی نظام واقعیت اور سنجیدگی کے ساتھ مساوی وسائل و مواقف کے ساتھ انسانیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ وہ مختلف حالات اور مراحل میں ان کے حسب حال اور حالات کے مطابق کوئی حکمت عملی اختیار کر سکتا ہے اور اسلام کے لئے صرف یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ مادی قوتوں کے سامنے صرف وعظ و تبلیغ سے کام لے۔ یہ ایک ایسی کمزور پوزیشن ہے جو اللہ اپنے دین کے لئے ہرگز پسند نہیں کرتا۔(۱)

ان اقتباسات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے فکر و نظر میں احیائے اسلام کا تحریکی منہاج نہیں ہے جس میں ہر موقع پر دشمن کے مقابلے میں برابر کے ہتھیار استعمال کئے جانے ضروری ہیں۔ مصنف نے جو انداز تفسیر اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تحریک اسلامی کے سابقہ مراحل والی آیات کو فائنل قرار دے کر آخری دور میں آنے والی آیات کو ان کے ذریعے مقید کرتا ہے۔ اور وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سابقہ ادوار میں جو آیات نازل ہوئیں وہ سابقہ مراحل اور حالات جیسے کے لئے ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ یہ احکام دراصل منسوخ نہیں ہیں بایں معنی کہ اب بھی کسی جگہ اگر ایسے حالات درپیش ہوں جس طرح کے حالات سابقہ آیات کے وقت تھے تو ان آیات کے احکام پر عمل نہ ہو گا اور سورت توبہ کی ان آخری آیات ہی کو لیا جائے گا۔ سابقہ آیات اب بھی باقی رہیں لیکن یہ آیات مسلمانوں کو اس بات کے لئے پابند نہیں کرتیں کہ اگر وہ سورت توبہ کی آخری آیات جیسے حالات میں داخل ہو چکے ہیں تو بھی وہ مناسب اقدامات نہ کر سکیں۔ اور زیر بحث آیات کو نافذ نہ کریں۔

یہ موضوع نہایت ہی وسعت قلبی اور گہری سوچ کا تقاضا کرتا ہے اور اس کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ احیائے اسلام کے مزاج اور اس کے تحریکی منہاج کو سمجھا جائے جیسا کہ ہم نے اوپر کہا۔

اب میں سمجھتا ہوں ان سطور پر ایک بار پھر نظر ڈالی جائے جن سے ہم نے اس سبق پر تبصرے کا آغاز کیا تھا۔

”جو لوگ سیرت النبی کے احوال و واقعات کا اچھی طرح مطالعہ کریں تو انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ احیائے اسلام کا تحریکی منہاج کیا ہے۔ اس کی نوعیت اور مزاج کیا ہے اور اس عمل میں مختلف اقدامات کے لئے مراحل کیا ہیں؟ اور اس کے آخری اہداف کیا ہیں۔ نیز وہ باسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی محاذ اور جزیرۃ العرب کے مشرکین اور اہل کتاب کے مختلف کیمپوں کے درمیان اس سورت میں تعلقات کے جو آخری خطوط کھینچے گئے ہیں وہ بالکل بروقت تھے۔ ان کے لئے زمین تیار ہو گئی تھی' حالات سازگار تھے اور یہی خطوط اور اقدامات فیصلہ کن تھے اور ان کو اپنے وقت پر ہونا تھا۔“

بار بار کے تجربات سے یہ اصول اور قانون متعین ہو رہا تھا کہ ایک ایسے معاشرے جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو اور جس کے قوانین اللہ کے بنائے ہوئے ہوں اور ایک ایسے معاشرے کے درمیان جو جاہلی معاشرہ ہو جس میں یہ تمام امور غیر اللہ کے لئے مخصوص ہوں یا ان میں اللہ کے ساتھ کوئی غیر اللہ بھی شریک ہو' کے درمیان تعلقات کی آخری نوعیت کیا ہو اور یہ تعلقات کا حتمی اصول وہ دائمی کشمکش ہے جو ایک اسلامی اور کسی بھی جاہلی

---

(۱) (تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب الجہاد فی الاسلام اور اس تفسیر کے نویں پارے میں ہم نے اس کتاب کے جو اقتباسات دیئے ہیں)

معاشرے کے درمیان ہر وقت برپا ہوتی ہے ۔جس کا تذکرہ سورت الحج کی اس آیت میں کیا گیا ہے ۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا (۲۲ : ۴۰) (اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں' جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جائیں) اور جس کے بارے میں سورت بقرہ کی آیت ۲۵۱ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِينَ (۲ : ۲۵۱)) (اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہے تو زمین میں فساد برپا ہو جائے)۔اس آخری اور حتمی قانون کے آثار دو طرح ظاہر ہوئے ۔

ایک یہ کہ اسلام قدم بقدم آگے بڑھتا رہا۔ایک غزوے کے بعد دوسرا غزوہ پیش آیا۔ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ آیا اور اسلام اردگرد کے علاقے میں پھیلتا رہا۔اور اللہ کا کلمہ علاقوں کے بعد دوسرے علاقوں اور قبیلے کے بعد دوسرے قبائل تک پھیلتا رہا۔اس طرح پورے کرۂ ارض تک دعوت اسلامی کو پہنچانا اور اس تبلیغ اور اشاعت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا تاکہ دنیا کے تمام انسانوں تک یہ دعوت بغیر کسی مادی رکاوٹ کے پہنچ سکے ۔ان مراحل کے آخر میں مسلمانوں نے مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا اور اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں آنے والی بڑی رکاوٹ دور ہو گئی اور ہوازن اور ثقیف جو قریش کے بعد طاقتور قبیلے تھے' انہوں نے بھی اسلام کی برتری کو قبول کر لیا۔اور اس مرحلے میں اسلام ایک ایسی قوت بن گیا جس سے اسلام کے دشمن خوف کھانے لگے اور اس طرح جزیرۃ العرب میں آخری اور فیصلہ کن اقدام کے لئے راہ ہموار ہو گئی اور یہ بات جزیرۃ العرب تک موقوف نہ تھی بلکہ یہی پالیسی تھی ۔ پوری دنیا کے لئے. جہاں جہاں بھی حالات سازگار ہوئے اسلام اور اسلامی تحریک یہ اقدامات اٹھاتی رہی تاکہ پوری دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو جائے ۔

دوسرا مظہر یہ ہے کہ جاہلی کیمپ بار بار ان معاہدوں کو توڑ دیتا تھا' جو معاہدے وہ خود اسلامی محاذ سے کرتا تھا اور جب بھی اسے موقعہ ملتا وہ یہ عہد توڑ دیتا تھا۔جب بھی اہل جاہلیت کو یہ احساس ہوتا اسلامی محاذ خطرے میں ہے اور زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے یا کم از کم عہد توڑنے والے مشرکین اور اہل کتاب کو یہ یقین ہو کہ ان کا مستقبل محفوظ ہے ۔ جس قدر بھی معاہدے ان لوگوں نے کئے ان کے پیچھے یہ خواہش نہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ فی الواقعہ امن و آشتی چاہتے تھے بلکہ یہ انہوں نے نہایت ہی مجبوری کی حالت میں کئے تھے اور ایک مناسب وقت کے لئے تھے ۔یہ معاہدے تو وہ کر لیتے لیکن وہ جب دیکھتے کہ اسلام موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے تو وہ بے بس ہو جاتے اور ان معاہدوں کو توڑ دیتے تھے ۔ کیونکہ اسلام اپنے وجود کے اعتبار سے ان کے وجود کے لئے متضاد تھا۔اور زندگی کے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ان کے طور طریقوں کے متضاد تھا۔اسلام میں چونکہ سچائی' زندگی' حرکت' پھیلاؤ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اس لئے وہ ان کے وجود کے لئے خطرہ تھا کیونکہ اسلام کا مقصد وحید ہی یہ تھا کہ تمام لوگوں کو اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے ۔

یہ آخری مظہر اور وہ اصول جس کے نتیجے میں یہ رنگ ظاہر ہوتا تھا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں اشارہ کیا ہے ۔ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوا (۲ : ۲۱۷) (اور وہ

مسلسل تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں' اگر وہ ایسا کر سکیں) ۔یہ تو تھا مشرکین کے بارے میں اور اہل کتاب کے بارے میں ۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (۲ : ۱۰۹) "اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹالے جائیں اگر چہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے' مگر اپنے نفس کے حسد کی بناء پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے)۔اور دوسری جگہ ہے وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲ : ۱۲۰) (یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔) چنانچہ ان قطعی نصوص کے ذریعے اللہ تعالیٰ خود اسلام کے خلاف تمام محاذوں کی سرگرمیوں کی اطلاع دیتا ہے' کہ وہ اسلام کے خلاف متحد ہیں اور ان کا یہ موقف عارضی نہیں ہے بلکہ دائمی ہے اور عالمگیر موقف ہے اور کسی زمان و مکان کا پابند نہیں ہے ۔

اسلامی معاشرے اور اس کی حکومت اور جاہلی نظاموں اور حکومتوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے اسلام کے حتمی اور آخری قانون اور ضابطے کو سمجھے بغیر اور اس قانون اور ضابطے کے تاریخی مظاہر پر غور کئے بغیر اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے دونوں محاذوں کے موقف کو سمجھے بغیر اسلام کے نظریہ جہاد کو بالکل نہیں سمجھا جاسکتا ۔نہ اس طویل تاریخی کشمکش کو سمجھا جاسکتا ہے ۔موجودہ سو سال سے اسلامی کیمپ اور جاہلیت کے کیمپوں کے درمیان قائم رہی ہے ۔ نہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ صحابہ کرام کے مجاہد گروہ نے کیوں یہ کارروائیاں کیں' نہ بعد کے ادوار میں ہونے والی اسلامی فتوحات کو سمجھا جاسکتا ہے' نہ بت پرستی اور اسلام کی جنگ کو سمجھا جاسکتا ہے' نہ اسلام اور صلیبی جنگوں کی طویل جنگوں کی طویل کشمکش کو سمجھا جاسکتا ہے' جو چودہ سو سال تک رہیں اور آج یہ جنگیں مسلمانوں کی اولاد کے خلاف بھی جاری ہیں' اگرچہ بدقسمتی کی وجہ سے انہوں نے اسلام کی حقیقت کو ایک عرصہ ہوا ہے' خیرباد کہہ دیا ہے' ان کے ہاں اسلام کا صرف نام اور عنوان ہی رہ گیا ہے ۔مسلمانوں کی اولاد کے خلاف یہ صلیبی جنگ روسی علاقوں' بت پرستوں کے علاقوں اور عیسائی صلیبی علاقوں میں آج بھی جاری ہے ۔روس میں' چین میں' یوگوسلاویہ میں' جاپان میں' ہندوستان اور کشمیر میں غرض ہر جگہ یہ جنگ جاری ہے ۔حبشہ' زنجبار' کینیا' جنوبی افریقہ اور امریکہ ہر جگہ اسلام کے خلاف صلیبی جنگ جاری ہے ۔پھر جہاں جہاں اسلامی تحریکات اٹھتی ہیں ان کو سر اٹھانے نہیں دیا جاتا۔خود عالم اسلام کے اندر یا اس خطے میں جو کبھی اسلامی تھا' اسلام کی احیاء کی تحریکات کو ختم کیا جاتا ہے بلکہ کچلا جاتا ہے ۔اور اس معاملے میں بت پرست' مغرب کے صلیبی اور مشرق کے کمیونسٹ بالکل متفق اور متحد ہیں ۔اور جو حکومتیں یہ فریضہ سرانجام دیتی ہیں ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ ان کی تمام ضروریات کے لئے کفیل ہوتی ہے اور پھر یہ حکمران جو اسلامی لیڈروں پر ظلم کرتے ہیں ان کے بارے میں ان نام نہاد ترقی یافتہ اور بنیادی حقوق کے داعی ممالک مکمل خاموشی اختیار کرتے ہیں ۔حالانکہ احیائے اسلام کا کام کرنے والے لوگ نہایت ہی معزز شہری ہوتے ہیں ۔

یہ اسلامی قانون بین الممالک سورت توبہ کے نزول سے قدرے پہلے ہی واضح ہو کر سامنے آگیا تھا اور فتح مکہ کے بعد یہ درج بالا دو مناظر و مظاہر کی شکل میں عیاں ہو گیا تھا' اس لئے جزیرۃ العرب میں مشرکین کے حوالے سے جو اقدامات بھی کیے گئے یا اہل کتاب کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا گیا اس کی تفصیلات سورت توبہ کے اس حصہ میں دی گئی ہیں۔

اس قانون اور ان اقدامات کے بارے میں تو اسلامی قیادت کو شرح صدر حاصل تھا لیکن اس وقت اسلامی جماعت کے اندر جو مختلف گروہ تھے' خصوصاً وہ لوگ جو ابھی ابھی ایمان لائے تھے یا مولفۃ القلوب میں شامل تھے یا ضعیف الایمان مسلمان یا منافقین تھے' ان کی سمجھ میں اسلام کا نظریہ جہاد یا جزیرۃ العرب میں یہ پالیسی نہ آرہی تھی۔

اسلامی معاشرے میں ایسے لوگ بھی تھے اور شاید وہ مسلمانوں میں معزز ترین اور مدبر و فہیم لوگ تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تمام مشرکین کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں کو کیوں ختم کیا جا رہا ہے۔ یعنی جن لوگوں نے نقض عہد کیا تھا' ان کو چار ماہ کی مہلت دی گئی۔ جن کے معاہدے میں کوئی وقت مقرر نہ تھا' یا ایسے لوگ جن کے ساتھ نہ معاہدہ تھا اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی تھی' یا جن کے ساتھ چار ماہ سے کم کے لئے تھا' یا جن لوگوں کے ساتھ موقت معاہدے تھے لیکن انہوں نے معاہدوں کی خلاف ورزی نہ کی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف محاذ میں شریک ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے یہ گروہ اگرچہ نقض عہد کرنے والوں یا جن سے خیانت کا خطرہ ہوتا ان کے ساتھ معاہدوں کے ختم کرنے کے اس حکم کو سمجھ رہے تھے جیسا کہ سورت انفال میں آچکا ہے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ

(۸ : ۵۸) "اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو' یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔" لیکن دوسرے لوگوں کے معاہدوں کو چار ماہ کے بعد ختم کر دینا یا ان کو مقررہ مدت کے بعد ختم کر دینا ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کیونکہ وہ دور جاہلیت میں اس قسم کے احکام کے عادی ہیں کیونکہ جاہلیت میں جب تک فریقین معاہدے کی پابندی کرتے یا ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرتے یا امن و سلامتی سے رہتے تو ایسے لوگوں کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اسکیم اس عادی اسکیم سے زیادہ دوررس تھی اور عربوں کے اندر انقلاب جہاں تک پہنچ گیا تھا یہ اس کا طبعی مرحلہ اور اقدام تھا۔

پھر اسلامی صفوں میں ایسے لوگ بھی موجود تھے اور ہو سکتا ہے کہ سربرآوردہ اور اہم لوگوں میں بھی ایسے لوگ ہوں جن کے خیال میں تمام مشرکین جزیرہ کے ساتھ قتال اور جنگ شروع کر دینا مناسب نہ تھا۔ خصوصاً یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھنا جب تک یہ لوگ اسلام کے سامنے جھک نہیں جاتے جبکہ اسلام جزیرۃ العرب میں فاتح و غالب ہو گیا تھا۔ صرف چند منتشر دور دراز علاقے رہ گئے جو اسلام کے زیر نگیں نہ تھے اور ان علاقوں سے اسلام کو کوئی ڈر نہ تھا۔ اور یہ توقع بھی تھی کہ یہ علاقے بھی اسلام کو قبول کر لیتے۔ خصوصاً پرامن حالات کے اندر خصوصاً ایسے لوگ اپنے اقرباء' ہم قبیلہ اور سماجی اور اقتصادی تعلقات رکھنے والے گروہوں اور لوگوں سے بھی لڑنا مناسب نہ سمجھتے ہوں۔ جبکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سخت کارروائی کے بغیر بھی ان لوگوں کے داخل اسلام ہونے کی راہ ہموار ہو گئی ہے لیکن اللہ کی منشا یہ تھی کہ دارالاسلام میں لوگوں کے باہم تعلقات صرف اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر رہ جائیں۔ دوسرے تمام روابط کٹ جائیں

اور جزیرۃ العرب اسلام کے لئے خالص ہو جائے اور یہ اسلام کا محفوظ مرکز بن جائے۔ جبکہ اللہ کو معلوم تھا کہ رومی شام کی جانب سے اسلام پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اسلامی معاشرے میں بعض ایسے لوگ بھی تھے' شاید یہ ان میں سے معزز اور معتبر لوگ ہوں' جو یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح مکہ و مدینہ کی منڈیاں کساد بازاری کا شکار ہو جائیں گی اور جزیرۃ العرب کے اقتصادی اور تجارتی تعلقات بگڑ جائیں گے کیونکہ اب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ہر جگہ جنگ اور قتل و مقاتلہ شروع ہو جائے گا۔ خصوصاً موسم حج اس سے متاثر ہو گا جبکہ اس اعلان میں یہ بات بھی ہے کہ مشرک اور ننگے حج نہ کریں گے۔ اور اب مشرکین کا حصہ تعمیر مساجد میں بھی نہ ہو گا جبکہ ایسے لوگوں کے خیال میں اس اقدام کی کوئی جنگی ضرورت نہ تھی۔ اور اس مقصد کو تدریجی اور پرامن طریقوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اللہ کا منشا یہ تھا کہ اجتماعی معاملات و تعلقات صرف نظریات کی اساس پر ہوں اور یہ کہ مومنین کے دلوں میں عقائد و نظریات کی اہمیت تمام دوسرے مقاصد و اہداف سے برتر ہو' چاہے یہ تعلقات قرابت داری کے ہوں' چاہے یہ صدقوں اور تجارتی منافع کے ہوں' چنانچہ اللہ نے فرمایا کہ وہی رزاق ہے اور اسباب رزق اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ جس طرح چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔

پھر اسلامی معاشرے میں اس وقت ضعیف العقیدہ' متردد' مولفۃ القلوب 'منافقین اور دوسرے غیر جانبدار عافیت کوش لوگ بھی تھے اور یہ دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوگئے تھے اور یہ پوری طرح اسلامی رنگ میں نہ رنگے گئے تھے' اور یہ لوگ مشرکین کے خلاف، عمومی اعلان جنگ سے ذرا خوف کھاتے تھے۔ خصوصاً تجارتی کساد بازاری اور جنگ کی حالت میں مواصلات کی خرابی اور تجارتی راستوں کی بندش اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاد کی مشکلات کو برداشت کرنا' جبکہ وہ اپنے اندر اس کی قوت نہ پاتے تھے' کیونکہ عوام کا جم غفیر اسلام کے غلبے کو دیکھ کر داخل ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ نفع کا سودا تھا۔ لیکن یہ اعلان عام تو ان کے حاشیہ خیال ہی میں نہ تھا کیونکہ یہ لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اس راہ کی مشکلات سے ابھی خبردار ہی نہ تھے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اسلامی صفوں کو پاک و صاف کر دے اس کا فرمان تو یہ تھا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۹:۱۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور اللہ ان لوگوں کو ممتاز نہ کرے گا جو تم میں سے جہاد کرتے ہیں اور جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ اور مومنین کے سوا کسی اور کو دل نہیں بنایا اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے خبردار ہے۔"

غرض اس مخلوط اسلامی معاشرے میں فتح مکہ کے بعد مختلف الاغراض لوگ تھے' اس لئے سورت توبہ کے اس حصے میں اس قدر مفصل اور مختلف اسلوب کلام میں ہدایات دی گئیں اور اشارات دیئے گئے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جو کمزوریاں یا غلط خیالات رہ گئے تھے ان کو دور کیا جاسکے' اسلامی صفوں میں سے بے چینی' انتشار اور خیالات و افکار سے شبہات کو پاک کیا جا سکے جو بعض مخلص ترین لوگوں کے دلوں میں بھی تھے۔

چنانچہ ایسے حالات میں اس سورت کا آغاز اس دو ٹوک اعلان سے ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول مشرکین سے اب بری الذمہ ہیں۔ اور ایک آیت کے بعد اعلامیہ میں دوبارہ بتکرار یہ بات دہرائی گئی کہ اللہ اور رسول اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہیں

اور نہایت ہی پرزور الفاظ میں تاکہ کوئی مسلمان ان لوگوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے جن سے اللہ اور رسول اللہ نے براءت کا اظہار کر دیا ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹ : ۱) (اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان کو مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے) اور مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے اور کافروں کو ڈرانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ یہ اعلان بھی کر دیا جائے کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے اور جو لوگ روگردانی کریں گے وہ اللہ کے عذاب سے بچ کر نکلنے والے نہیں ہیں۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ (۹ : ۳) "اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔"

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲) "ملک میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو الا یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔"

فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹ : ۳) "اب اگر تم توبہ کر لو، تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبی انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو۔"

اس بات پر سخت ناراضی کا اظہار کیا گیا کہ ان مشرکین کے ساتھ اللہ اور رسول اللہ کا عہد کیسے ہو سکتا ہے؟ ماسوائے ان لوگوں کے جنہوں نے عہد کیا اور پھر اس پر پوری طرح قائم رہے، تو یہ عہد بھی مدت عہد تک جاری رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ یہ مشرکین جب بھی قدرت پائیں گے وہ عہد و پیمان کا کوئی پاس نہ رکھیں گے۔ اور وہ مسلمانوں کے خلاف کسی بھی اقدام کو مذموم نہیں سمجھتے۔ بشرطیکہ وہ اس پر قادر ہوں۔ چنانچہ ان کے کفر کا نقشہ کھینچا گیا اور کہا گیا کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷)

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰) (۹:۷ تا ۱۰)

"ان مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول ؐ کے نزدیک کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے؟ بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے' جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے معاملے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کر رہے ہیں۔ کسی مومن کے معاملے میں یہ نہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوتی ہے۔"

مسلمانوں کے دلوں میں جو تلخ یادیں تھیں یا ان کے شعور اور جذبات میں انتقام کے لئے جو غیظ و غضب تھا' حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ذرا اسے ابھارا جائے' اس طرح اللہ کے دشمنوں' اللہ کے دین کے دشمنوں اور خود مسلمانوں کے دشمنوں کو کچل کر دلوں کو ٹھنڈا کیا جائے۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۳) قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۴) وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۵) (۹: ۱۳ — ۱۵)

"کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہتے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ ان سے لڑو' اللہ تمہارے ہاتھوں' ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔"

حالات کا تقاضا یہ تھا کہ نظریات کی اساس پر مکمل جدائی ہو جائے اور ذاتی مصلحتوں اور رشتہ داری کے جذبات کا

مقابلہ کیا جائے اور ان کو اللہ ' رسول اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں رکاوٹ بننے نہ دیا جائے ۔ چنانچہ مسلمانوں کو دو راستوں کے درمیان کھڑا کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک کے بارے میں فیصلہ کریں ۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۳) قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

(۲۴) (۹: ۲۳ — ۲۴)) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں ۔ تم میں جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے ۔ اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ ' تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں ' تم کو اللہ ' اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی راہنمائی نہیں کرتا ۔"

یہاں اس بات کی ضرورت تھی کہ اللہ ان لوگوں کو یاد دلائے کہ اس نے کن کن مشکل حالات میں تمہاری مدد کی اور قریب ترین مثال یوم حنین کی ہے کہ جس میں تم نے شکست کھائی تھی اور صرف اللہ نے تمہاری امداد کی ۔ اللہ کی خصوصی افواج کی مدد سے اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت قدم بنا دیا ۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (۲۵) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶) "اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے ۔ ابھی غزوہ حنین کے روز ۔ اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے ۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں ۔"

پھر یہ بات بھی ضروری تھی کہ مسلمانوں کو اس طرف سے مطمئن کر دیا جائے کہ رزق دینے والا خدا ہے اور معاشی اور تجارتی کساد بازاری کا جو خطرہ تم محسوس کرتے ہو یہ بے جواز ہے۔کیونکہ رزق فراہم کرنا اللہ کی مشیئت پر موقوف ہے۔اسباب ظاہریہ پر نہیں ہے جس طرح تم سمجھتے ہو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹: ۲۸) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مشرکین ناپاک ہیں' لہذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکیں۔اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔اللہ علیم و حکیم ہے۔"

یہ ہدایات اور تاکیدات' یہ حکمتیں اور تدابیر اور مختلف انداز سے تنقیدی تبصرے اور اشارات جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں یہ بتاتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد اسلام میں جو مختلف طرز کے لوگ فوج در فوج داخل ہوئے تھے اور اس عظیم وسعت کی وجہ سے ایسے لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے جن کی تربیت نہ ہوتی تھی اور اگر مدینہ طیبہ کی سوسائٹی تربیت یافتہ نہ ہوتی اور صحابہ کرام کے دور اول کے لوگ مختلف حالات و مشکلات سے نہ گزرے ہوتے تو ناتربیت یافتہ لوگوں کی یہ فوج اسلامی نظام کے لئے عظیم خطرہ بن جاتی جیسا کہ ہم نے بار بار اس بات کا تذکرہ کیا۔

اس سورت کے اس پہلے حصے پر ہم اس قدر کلام کے بعد اب ہم آیات کی تفصیلی تشریح کی طرف آتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۸۷ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۸

(۹) سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۳)
اٰيَاتُهَا ۱۲۹ رُكُوْعَاتُهَا ۱۶

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱
فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَ
اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲ وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ
الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَ
بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ
اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ
فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ
اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ
فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ

۱
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ ع
۶ع
۷

"اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔

اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔اور اے نبی ؐ' انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو' بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے' پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔"

یہ آیات اور اس کے بعد آنے والی آیات تا آیت ۲۸' اسلامی معاشرے اور حکومت اور مدینہ طیبہ اور دیگر جزیرۃ العرب میں پائے جانے والے مشرکین اور کافرین کے درمیان باہم تعلقات کی آخری حدود مقرر کرتی ہیں۔جن حالات میں یہ آیات نازل ہوئیں ان میں مدینہ طیبہ کے اندر موجود اسلامی مملکت کا اقتدار اعلیٰ پورے جزیرۃ العرب تک وسیع ہو گیا تھا' یہ احکام ان لوگوں پر جاری ہوئے جو دین اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے' چاہے ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ تھا اور انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی تھی' خصوصاً ان حالات میں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ روم کی سپر طاقت کے ساتھ تبوک میں جو ٹکراؤ ہونے والا ہے وہ اسلام پر ایک فیصلہ کن وار ہو گا یا اگر فیصلہ کن نہ ہو گا تو یہ جنگ مسلمانوں کی حکومت کی قوت کو توڑ کر رکھ دے گی۔ نیز ان احکام کا اطلاق ان لوگوں پر بھی تھا جن کے ساتھ معاہدہ تھا اور انہوں نے اس کی کوئی خلاف ورزی نہ کی تھی یا جن لوگوں کے ساتھ میعادی یا غیر میعادی معاہدے تھے اور انہوں نے یہ وعدے پورے کئے اور مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا چنانچہ یہ احکام ان تمام قسم کے لوگوں کے معاملات کی حد بندی کرنے کے لئے وارد ہوئے اور یہ احکامات ان اسباب کی وجہ سے وارد ہوئے جن کے بارے میں ہم نے اس سورت کے مقدمہ میں تفصیلا بات کی ہے۔ بہرحال یہ احکامات اسلامی حکومت اور غیر اسلامی گروہوں کے درمیان معاملات و تعلقات کی آخری اور فائنل حد بندی کے لئے نازل ہوئے۔

ان آیات کا انداز تعبیر اور اسلوب اعلامیہ یا نوٹیفکیشن جیسا ہے اور نہایت ہی پرقوت اور پرشوکت حاکمانہ انداز کلام ہے۔ لہذا موضوع کلام حالات مخاطبین کے عین مطابق انداز تعبیر اختیار کیا گیا ہے اور یہ قرآن کریم کا بہترین اور مناسب طریقہ کلام ہے جس کی وجہ سے یہ کلام معجزانہ بن گیا ہے۔(تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی فی القرآن)

یہ اعلان جن حالات میں ہوا اس کے بارے میں متعدد روایات وا رد ہوئی ہیں' نیز یہ اعلامیہ جس طرح مشتہر ہوا اس کے بارے میں بھی متعدد روایات وارد ہیں اور یہ کہ کس نے اس کی تشہیر کی۔

ان روایات میں سے ابن جریر نے جو روایات دی ہیں وہ زیادہ صحیح اور اس وقت اسلامی سوسائٹی کی جو صورت حال تھی' اس کے زیادہ مطابق ہیں اور ہم آہنگ ہیں۔ہم ابن جریر کی روایات اور اس کے تبصروں سے بعض ایسے اقتباسات دیتے ہیں جو اس بارے میں ہمارے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں۔اس کے اقوال میں سے جو ہمارے نقطہ نظر کے خلاف ہے یا اس کے تبصروں میں جو باتیں متضاد ہیں ان سے ہم نے صرف نظر کیا ہے کیونکہ ہمارے یہاں یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم ان روایات کی تنقیح کریں یا طبری کی رائے پر کوئی محاکمہ پیش کریں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ باتیں یہاں دے دیں جو ہمارے نقطہ نظر کی تائید کرتی ہیں۔

ابن جریر مجاہد کی ایک روایت نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (۹: ۱) "اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو۔" (کیا اہل العہد سے مراد مدلج اور وہ عرب ہیں جن کے ساتھ حضورؐ نے معاہدے کیے۔کہتے ہیں کہ جب حضور اکرمؐ تبوک سے واپس ہوئے اور اس سے فارغ ہوگئے تو آپ نے حج کا ارادہ کر لیا۔اس کے بعد آپ نے یہ فرمایا کہ بیت اللہ کو مشرکین بھی حج کے لئے آتے ہیں۔اور ان میں سے بعض ننگے حج کرتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اس وقت حج کروں جب یہ صورت حال نہ ہو۔ تو آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت علی کو بھیجا۔یہ دونوں لوگوں کے پاس گئے۔ ذوالمجاز بازار میں اور دوسرے ان مقامات میں جہاں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے اور حج کے تمام عرصے میں وہ یہ اعلان کرتے رہے۔ انہوں نے اہل معاہدہ کو یہ نوٹس دیا کہ چار ماہ تک تم لوگ امن و امان میں رہو گے۔یہ چار ماہ پے درپے تھے۔اور یہ عرصہ مہینوں سے اس طرح پورا کیا گیا تھا کہ ذوالحجہ کے آخری بیس دن اور ربیع الاول کے پہلے دس دن اس میں شامل تھے۔اور اس کے بعد معاہدات ختم ہوں گے اور پھر تمام لوگوں کے خلاف اعلان جنگ ہو گا الا یہ کہ وہ ایمان لے آئیں۔تو اس اعلان کے ساتھ ہی تمام لوگ ایمان لائے اور کسی نے بھی چار ماہ کی مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا۔"

تمام روایات نقل کرنے کے بعد طبری اس میعاد اس کی ابتداء وانتہا اور اس کی غرض وغایت کے بارے میں کہتا ہے :

"اس سلسلے میں سب سے زیادہ بہتر بات اس شخص کی ہے جس نے کہا ہے کہ اس میعاد سے مراد وہ میعاد ہے جو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لئے مقرر کی تھی کہ تم چار ماہ تک سیاحت کرو۔ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (۹: ۲) وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ (۹: ۲) کہ یہ ان لوگوں کے لئے تھی جنہوں نے حضورؐ کے ساتھ معاہدے کئے تھے اور پھر خلاف ورزی کی تھی اور مدت پوری ہونے سے پہلے ہی انہوں نے نقض عہد کر لیا تھا۔رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنا عہد نہ توڑا تھا اور نہ حضورؐ کے خلاف محاذ سے گٹھ جوڑ کیا تھا تو ان کے بارے میں اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ان کے ساتھ عہد کو مدت عہد تک پورا کرو۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا (۹: ۴) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی۔اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو

ایسے لوگوں کے خلاف تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو' کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے ۔"

"اگر کوئی یہ گمان کرے کہ اس سے قبل تو اللہ نے فرمایا ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا (۹: ۵) "پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو (توبہ ۔ ۵) اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ماہ کے بعد میعاد ختم ہے اور اس کے بعد جہاں بھی مشرک ملے اسے قتل کرنا فرض ہے ۔ لہٰذا جس قول کو ترجیح دی جارہی ہے' وہ غلط ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگلی آیت یعنی (۷) اس بات کی تصدیق کرتی ہے جو ہم نے کہا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ معاہدہ ہے ان پر آیت واقتلوا کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ اگلی آیت یہ ہے :

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۷)

"مشرکین کے ساتھ رسول اللہ کا کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے --- بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ۔"

تو مذکورہ آیت میں جن لوگوں کے ساتھ عہد پورا کرنے کا حکم دیا ہے' وہ بھی تو مشرکین تھے اور ان کے ساتھ حضور ؐ کو سیدھا رہنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ جب تک وہ سیدھے رہیں اور حضور ؐ کے خلاف دشمنوں کی مدد نہ کریں ۔"

"نیز حضور ؐ سے آمدہ روایات میں یہ روایت بھی ہے کہ جو لوگ حج اکبر کے موقعہ پر اعلان کرتے تھے وہ ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کرتے تھے کہ حضور ؐ اور جن قبائل کے درمیان عہد ہے تو وہ اپنی مدت تک پورا ہو گا ۔ ان روایات سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے ۔ کیونکہ ان آیات میں اللہ نے اپنے نبی کو یہ حکم نہیں دیا کہ آپ عہد کو توڑ دیں ان لوگوں کے ساتھ جو آپ کے ساتھ سیدھے چل رہے ہیں لہٰذا حقیقت ہے کہ چار ماہ کی مدت ان لوگوں کے لئے مقرر تھی جنہوں نے نقض عہد کیا تھا اور یہ نقض انہوں نے عہد کی میعاد کے اندر کیا تھا ۔ یہ جن لوگوں کے ساتھ غیر محدود عہد تھا ۔ رہے وہ لوگ جن کا عہد میعادی تھا اور انہوں نے اس عہد سے کسی قسم کا انحراف کر کے اپنے خلاف کسی اقدام کا راستہ ہموار نہ کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم یہی تھا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ میعاد تک عہد کو پورا رکھیں اور انہی امور کا اعلان یوم حج اکبر کے موقع پر رسول اللہ کے منادیوں نے کیا تھا ۔

ان عہدوں کے بارے میں روایات نقل کر کے ابن جریر ایک دوسرے تبصرے میں یوں اظہار رائے کرتے ہیں ۔

"ان تمام روایات اور اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نے جو رائے اختیار کی ہے وہ درست ہے ۔ اور یہ کہ چار ماہ کی مدت ان لوگوں کے ساتھ مخصوص تھی جو ہم نے اوپر بیان کیا ۔ رہے وہ لوگ جن کے معاہدے کے اندر میعاد متعین تھی تو ان کے ساتھ معاہدے توڑنے کا اختیار اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو نہیں دیا ۔ بلکہ رسول اللہ نے بھی ایسے لوگوں کے ساتھ معاہدے کی مدت تک معاہدہ پورا کیا ۔ کیونکہ خدا کا حکم یہی تھا ۔ آیات کی ظاہری عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور رسول اللہ سے مروی روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں ۔"

اگر ہم ضعیف روایات کو ترک کر دیں۔ اور یہ کہ ان روایات پر بعد کے ادوار میں شیعان علی اور حامیان بنو امیہ اور اہل سنت کے درمیان برپا ہونے والے اختلافات اثر انداز ہوئے ہوں۔ تو یہ بات ممکن ہے کہ حضور ؐ نے اس سال حضرت ابوبکر کو امیر الحج مقرر فرمایا ہو کیونکہ آپ اس سال حج میں شریک ہونا پسند نہ کرتے تھے کیونکہ مشرکین اور ننگے لوگ بھی حج میں شریک تھے۔ اس کے بعد سورت توبہ کی ابتدائی آیات نازل ہوگئی ہوں اور آپ نے ان کے پیچھے حضرت علی کو آخری ہدایات دے کر بھیجا ہو اور انہوں نے لوگوں کے اندر یہ اعلان کیا ہو کہ اب کوئی مشرک اور ننگا بیت اللہ میں طواف نہ کرے گا۔

امام ترمذی نے کتاب التفسیر میں نقل کیا ہے "جب سورت توبہ نازل ہوئی تو حضور ؐ نے چار باتوں کے اعلان کے لئے آدمی بھیجا کہ بیت اللہ میں کوئی ننگا شخص طواف نہ کرے، اور آج کے بعد بیت اللہ کے قریب کوئی مشرک نہ آئے۔ اور یہ کہ رسول اللہ اور جس قوم کے درمیان معاہدے ہیں وہ اپنی مدت تک رہیں گے اور یہ کہ جنت میں مسلمانوں کے سوا کوئی شخص داخل نہ ہو گا۔ یہ حدیث اس بارے میں صحیح ترین حدیث ہے۔ لہٰذا ہم اسی ہی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۹ : ۱) "اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔" یہ ایک اعلان عام ہے اور یہ اعلان عام اس قدر حاکمانہ اور زوردار الفاظ میں ہے۔ اس کے اندر جو اصول بیان کیا گیا ہے وہ ایک اسلامی ریاست اور ایک غیر مسلم سوسائٹی کے مابین تعلقات کا اصل الاصول ہے۔ اس اصول کا اطلاق اس وقت پورے جزیرۃ العرب میں قائم اسلامی حکومت اور مشرکین کے جتھوں پر ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت حضور ؐ اور مشرکین کے درمیان جو معاہدے تھے وہ جزیرۃ العرب کے مشرکین کے ساتھ تھے۔ لیکن اللہ اور رسول اللہ کی طرف سے براءت کا اعلان تمام مسلمانوں کے موقف کا اعلان ہے۔ اور اس کا ہر مسلمان کے دل پر نہایت ہی گہرا اور شدید اثر ہوتا ہے۔ یہ دو ٹوک اعلان سن کر مسلمانوں کے دل میں کوئی تردد نہیں رہتا اور نہ اس فیصلے کی واپسی کی کوئی صورت رہتی ہے۔ اس اعلان کے بعد اس کی تفصیلات اور حدود و قیود اور وضاحتیں آتی ہیں:

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲) "پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔" یہ تفصیلات ہیں اس مہلت کی جو اللہ نے مشرکین کو دی۔ چار مہینوں تک وہ آزادی سے پھر سکتے ہیں، ان میں نقل مکانی کر سکتے ہیں، بیع و شریٰ اور حسابات کی بے باقی، اپنے طور طریقوں کی تبدیلی ان چار مہینوں میں وہ آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ان کو کوئی شخص اچانک نہ پکڑے گا کہ ان کے خیال میں تو وہ معاہدے کے فریق ہوں اور حکومت انہیں اچانک پکڑ لے۔ مدینہ میں ایسے لوگ تھے جنہیں تبوک کے حالات میں یہ بات نظر آتی تھی کہ رسول اللہ ؐ اب تبوک سے واپس نہیں لوٹ سکتے اور یہ کہ رومیوں کی قوت اس قدر عظیم ہے کہ وہ اس تمام لشکر کو گرفتار کر لے گی۔ ایسے لوگ مدینہ میں حیرت انگیز افواہیں پھیلاتے تھے۔ منافقین نے

بھی ایسی ہی توقعات باندھی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کا یہ طرز عمل کب سے تھا؟ ایک طویل عرصے سے یہ لوگ ایسا ہی کرتے رہے تھے۔ حضور ان سے معاہدے کرتے اور ابھی معاہدے کی سیاہی خشک نہ ہوتی تھی کہ یہ لوگ معاہدے توڑنا شروع کر دیتے۔ ان طویل عہد شکنیوں اور سرگرمیوں کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف اس وقت جنگ کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے جب تک مسلمان دوبارہ شرک کو قبول نہیں کر لیتے۔ بظاہر یہ اقدامات سخت نظر آتے ہیں لیکن یہ اقدامات اسلامی تحریک نے تاریخ کے اس دور میں جبکہ پوری بین الاقوامی دنیا میں جنگل کے قانون کی حکمرانی تھی۔ اور بین الاقوامی طور پر تعلقات صرف دو قسم کے تھے یا تو جنگ کرو اور فاتح ہو جاؤ اور دندناتے پھرو یا پھر شکست کھا کر کر بے مسکین بن جاؤ اور یہ صورت حالات کسی بھی وقت پیش آسکتی تھی۔ کسی کو نوٹس دینا ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو خطرے سے آگاہ نہ دی جاتی تھی۔ کسی کے ساتھ کوئی رعایت وفاداری یا عہد کی پاسداری نہ تھی۔ جب بھی موقعہ ملا مخالف کو دبوچ لیا۔ لیکن اسلام اس دور میں بھی اسلام تھا۔ وہ اپنے اصول و مبادی میں کسی زمان و مکان کا قائل نہیں ہے کیونکہ اسلامی نظام کو مرور زمانہ سے کوئی ترقی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو خود انسانیت اور زمان و مکان کو بدل دیتا ہے۔ ہاں اسلام نے ہر دور کے لئے حقیقی اور واقعی صورت حالات کے لئے جامع اصول وضع کر دیئے ہیں اور وہ ان عظیم اصولوں کے ساتھ ہر صورت حالات کا سامنا کرتا ہے۔ وہ نئے سے نئے وسائل اصلاح انسانوں کے لئے استعمال کرتا ہے جو حالات زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں اور اسلام کے تحریکی مزاج کے ساتھ بھی جوڑ رکھتے ہیں۔

مشرکین کو مہلت دینے کے ساتھ ساتھ ایسی وارننگ بھی دی جاتی ہے کہ ان کے دل دہل جائیں۔ ایک واقعی صورت حال ان کے سامنے رکھ دی جاتی ہے تاکہ وہ خبردار ہو جائیں اور ان کی آنکھیں کھل جائیں یعنی اس عرصے میں وہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔ عرصہ سیاحت میں نہ وہ کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ بھاگ سکیں گے۔ ان کا جو نوشتہ ہے وہ دیوار پر پڑھ رہے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ذلت اور خواری ان کا مقدر ہے۔

وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲) "یہ جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو بلکہ اللہ یقیناً کافروں کو خوار کرنے والا ہے۔" آخر وہ کہاں جائیں گے۔ کس طرف نکل جائیں گے کہ اللہ ان کو پکڑ نہ سکتا ہو اور یہ پوری زمین تو اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور اس نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کافروں کو ذلیل و خوار کر دے۔ یہ نوشتہ دیوار ہے ان کے لئے۔

اس کے بعد اس اعلامیہ کے جائے صدور کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے جس میں اسے جاری کرنا ضروری تھا تاکہ مشرکین کو علم ہو جائے اور وہ نوٹس لیں اور میعاد مقررہ تک اپنی تیاری کر سکیں۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹ : ۳) "اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے

رسول ؐ کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی ۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو ۔ اور اے نبی ؐ ' انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو ۔"

یوم حج اکبر کون سا دن ہے ' اس بارے میں روایات مختلف ہیں ' یہ یوم عرفہ ہے یا یوم نحر ہے ۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ یوم نحر ہے ۔ اذان کے معنی اعلامیہ کے ہیں ۔ چنانچہ یوم حج اکبر پر یہ اعلامیہ جاری ہوا ۔ یہ حج اور اجتماع کا موقعہ تھا ۔ اس میں اللہ اور رسول کی طرف سے تمام ذمہ داریوں سے اعلان براءت کر دیا گیا ۔ اصولاً تمام مشرکین کے خلاف یہ اعلان جاری ہوا ۔ اگلی آیت میں استثنائی دفعہ دے دی گئی ۔ یہ بات قابل فہم ہے کہ اصل دفعہ عام اور شامل ہے کہ اللہ تمام مشرکوں سے بری الذمہ ہے ۔ کیونکہ آخر کار اصولاً اسی موقف کو جاری رہنا تھا ۔ اگلی آیت میں جو استثنائی دفعہ دی گئی ہے اس نے بہرحال وقت مقررہ کے بعد بے اثر ہو جانا تھا ۔ اسلامی محاذ جس کا نصب العین یہ ہے کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی کے دائرے میں رہیں اس کی جانب سے مشرکین کے ساتھ تعلقات کی یہ فائنل شکل بالکل قابل فہم کیونکہ مقابل کے محاذ لوگوں کو شریکوں کے غلام بناتے ہیں ' اس نکتے کی وضاحت ہم اس سبق پر تبصرے کے دوران کر آئے ہیں ۔

اس اعلامیہ کے اندر ہی مشرکین کو راستہ بھی بتا دیا گیا ہے ۔ فَاِنْ تُبْتُمْ (۹: ۳) "اب اگر تم توبہ کرو تو تمہارے ہی لئے بہتر ہے ۔ اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو ----- اور اے نبی ' انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو ۔" آیت براءت کے اندر یہ ترغیب اور ترہیب بذات خود اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ آئندہ کے لئے اسلامی نظام حیات سب سے پہلے ہدایت اور راہنمائی کا نظام ہے ۔ اسلام ان کو یہ موقع اور یہ میعاد جو دے رہا ہے اس لئے نہیں دے رہا کہ بس ادھر سے میعاد ختم ہو کہ ادھر وہ حملہ کر دے جیسا کہ بین الاقوامی تعلقات میں آج تک یہی ہو رہا ہے ۔ بلکہ وہ انہیں یہ مہلت جو دے رہا ہے تو یہ غور و فکر کے لئے دے رہا ہے اور یہ بہترین طریقہ ہدایت ہے ۔ اس مہلت کے عرصے میں اسلام انہیں ترغیب دیتا ہے کہ وہ لوٹ آئیں اور شرک کو چھوڑ کر اللہ وحدہ کی طرف آ جائیں ۔ وہ سرکشی اور روگردانی کے انجام بد سے انہیں خبردار کرتا ہے ۔ انہیں مایوس کرتا ہے کہ سرکشی سے انہیں کوئی فائدہ ہو گا ۔ دنیا کی ذلت و خواری کے علاوہ آخرت میں وہ عذاب الیم سے دوچار ہوں گے ۔ اس طرح قرآن کریم انہیں خوب جھنجوڑتا ہے تاکہ ان کی حقیقی فطرت جاگ اٹھے اور اس پر گرد و غبار کی جو دبیز تہہ جمی ہوئی ہے وہ چھٹ جائے اور اس طرح ان کی فطرت سنے اور بات مان کر دے ۔

اس ترغیب و ترہیب میں اسلامی محاذ کے لئے ایک قسم کی تسلی بھی ہے نیز بعض لوگ جن کے دلوں میں خوف اور وسوسے تھے اور جو اس قدر شدید اعلان سے ڈرتے ہوں گے ان کے لئے بھی یہ موجب تسلی ہے کیونکہ انہوں نے بھی سمجھ لیا کہ یہ تو معاملہ قضائے الٰہی کا ہے ۔ اللہ نے پہلے سے فیصلے کر رکھے ہیں کہ وہ کافروں کو خوار کرنے والا ہے ۔

عام اصول کے بیان کے بعد اب وقتی استثنائی حالت کی طرف آتے ہیں یعنی یہ استثنائی حالت بھی ختم ہو کر پہلی آیت میں آنے والی اصولی حالت کی طرف لوٹنے والی ہے ۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ

أَحَدًا فَأَتِمُّوٓا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۹ : ۴) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے، پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔" یہ استثنائی دفعہ جن لوگوں کے بارے میں آئی؟ اس بارے میں صحیح روایات یہی ہیں کہ بنی بکر کی ایک شاخ کے بارے میں ہے یعنی بنی خزیمہ ابن عامر، یہ بکر ابن کنانہ کی ایک شاخ تھی۔ حدیبیہ میں قریش اور اس کے حلفاء کے ساتھ جو عہد ہوا تھا انہوں نے اسے قائم رکھا اور یہ لوگ بنی بکر کے ساتھ خزاعہ کے خلاف لشکر کشی میں شریک نہ ہوئے تھے جبکہ قریش نے بنی بکر کی حمایت کی تھی اور ان کی حمایت ہی سے انہوں نے خزاعہ پر حملہ کیا تھا۔ اس طرح بنی بکر اور قریش نے صلح حدیبیہ کو توڑ دیا تھا اور اس معاہدۂ حدیبیہ کے دو سال بعد مکہ فتح ہوا تھا۔ حالانکہ یہ معاہدہ دس سالوں کے لئے تھا۔ یہ جماعت بنی بکر یعنی بنی خزیمہ ابن عامر نے عہد قائم رکھا اور شرک پر بھی قائم رہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے ساتھ عہد کو اپنی مدت تک پورا کیا جائے۔ ہماری اس رائے کی تائید محمد ابن عباد ابن جعفر کی روایت سے بھی ہوئی ہے۔ سدی کہتے ہیں: "کہ یہ لوگ بنی ضمرہ اور بنو مدلج تھے۔ یہ بنی کنانہ سے دو قبیلے تھے۔" اور مجاہد کہتے ہیں: "بنی مدلج و خزاعہ کے ساتھ عہد تھا اور انہی کے بارے میں اللہ نے فرمایا فَأَتِمُّوٓا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ (۹: ۴) ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو۔" لیکن یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد خزاعہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا یہ بات ان مشرکوں پر صادق ہوگی جو شرک پر قائم رہے۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۹ : ۷)

"مشرکین کے ساتھ رسول اللہ کا کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے --- بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔" چنانچہ یہ دو قبیلے تھے بنی کنانہ سے جنہوں نے حدیبیہ کے دن مسجد حرام کے پاس رسول اللہ ؐ سے عہد کیا تھا اور انہوں نے اس عہد میں کوئی کمی نہ کی تھی اور انہوں نے رسول اللہ کے مقابلے میں کسی دشمن کی مدد نہ کی تھی چنانچہ اس استثنائی دفعہ سے مراد یہی لوگ تھے اور بس اور تمام مفسرین نے یہی رائے قبول کی ہے۔ استاذ رشید رضا نے یہی قول اختیار کیا ہے لیکن استاذ عزہ دروزہ نے اپنی تفسیر میں ان سے مراد استثناء اول میں مراد لوگوں کے مقابلے میں اور لوگ لئے ہیں۔ اور یہ رائے انہوں نے اس لئے اختیار کی ہے کہ وہ دائمی طور پر مشرکین کے ساتھ معاہدات کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے نظریئے کی بنیاد اس فقرے پر رکھی ہے۔ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ (۹: ۷) "جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو۔" اور وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ مشرکین کے ساتھ معاہدہ دائمی طور پر ہو سکتا ہے۔ یہ دراصل ایک بعید قول ہے اور یہ قول ان آیات اور اسلامی نظام کے حقیقی موقف اور خود اس دین

کے مزاج کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے۔

اسلام نے یہ استثنائی دفعہ اس لئے رکھی ہے کہ جن لوگوں نے تحریک اسلامی کے ساتھ وفاداری کی ان سے وفاداری کی جائے۔ اس لئے اسلام نے ان کی مہلت کو چار مہینوں تک محدود نہ کیا۔ جیسا کہ دوسرے لوگوں کے لئے چار ماہ کی مہلت مقرر کر دی گئی تھی۔ بلکہ ان لوگوں کو مدت معاہدہ تک مہلت دی گئی کیونکہ انہوں نے نقض عہد نہ کیا تھا اور نہ دشمنوں کے ساتھ معاونت کی تھی۔ اس وفاداری کا تقاضا تھا کہ ان کے ساتھ وفاداری کی جائے اور یہ طویل مدت اس پالیسی کے باوجود دی گئی کہ اللہ تعالیٰ جزیرۃ العرب کو مشرکین سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ اور اسے اسلام کا محفوظ مرکز بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ جزیرۃ العرب کی حدود کے ساتھ متصل بیرونی دشمنوں نے اسلام کو ایک عظیم خطرہ تصور کر لیا تھا اور جیسا کہ غزوہ تبوک کی تفصیلات میں بات آئے گی۔ انہوں نے اس نئی قوت کے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس سے قبل موتہ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ اور اس نے آنکھیں کھول دی تھیں کہ رومی کس قدر تیاریوں میں مصروف ہیں۔ پھر یہ مشرکین جنوبی یمن میں اہل ایران سے ہمدردی رکھتے تھے اور ایران کی حمایت سے دین جدید پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔

علامہ ابن قیم نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ جن لوگوں کو اس آیت کے ذریعے مستثنیٰ کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ وفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے وہ مدت عہد ختم ہونے سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے تھے، بلکہ دوسرے لوگ جنہوں نے نقض عہد کا ارتکاب کیا تھا اور جن کو چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی کہ وہ چار ماہ تک چل پھر لیں، انہوں نے بجائے چلنے پھرنے اور جلاوطنی کے اسلام قبول کر لیا۔

اللہ تعالیٰ کو خوب علم تھا اور اللہ تعالیٰ تحریک اسلامی کو اپنے دست قدرت سے آگے بڑھا رہا تھا یہ جانتا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جزیرۃ العرب سے شرک و کفر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس آخری ضرب کے لئے حالات تیار ہو گئے تھے اور صحیح وقت آ پہنچا تھا اور یہ اقدام صحیح اور مناسب وقت پر کیا گیا تھا۔ حقیقی حالات و واقعات کے عین مطابق، اللہ کے قانون قضا و قدر کے مطابق۔

اللہ نے وفائے عہد کا جو حکم دیا ہے وہ یہاں قابل غور ہے کہ وفا کرنے والوں کے ساتھ وفا کیا جائے۔ فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۹: ۴) "ان لوگوں کے ساتھ مدت عہد تک وفا کرو، بے شک اللہ متقین کو محبوب رکھتا ہے۔" جہاں وفائے عہد کو خوف خدا اور محبت الٰہی سے منسلک کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ متقین کو محبوب رکھتا ہے۔ لہٰذا وفائے عہد بھی ایک قسم کی عبادت ہے، تقویٰ ہے اور اللہ تقویٰ کو محبوب رکھتا ہے۔ یہ ہے اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر۔ اسلام کے نظام قانون و اخلاق میں مصلحت اور مفادات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نہ اس میں رسم و رواج کی کوئی گنجائش ہے کیونکہ رسم و رواج بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اسلامی نظام اخلاق کی بنیاد اللہ کی بندگی اور خدا خوفی پر رکھی گئی ہے۔ ایک مسلمان کا اساسی فرض ہے کہ وہ ان امور پر عمل پیرا ہو جسے اس کا رب پسند کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی اخلاق خوف خدا اور رضائے الٰہی کی بنیاد پر مرتب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام میں اخلاقیات اپنے اندر مضبوط قوت رکھتے ہیں۔ ان کو اس حقیقی اور وجدانی شعور سے قوت ملتی ہے۔ اس شعور کے ساتھ ساتھ عملاً اسلامی اخلاق لوگوں کے لئے مفید بھی ہوتے ہیں۔ اور ان میں ان کی مصلحت بھی پوشیدہ ہوتی ہے اور ان کے نتیجے میں ایک ایسا اجتماعی معاشرہ اور سوسائٹی وجود میں آتی ہے جس میں باہم مفادات کی کشمکش کم سے کم ہوتی ہے۔ اس نظام میں انسان کی شخصیت بلند ہو جاتی

ہے - اور وہ زمین کی آلودگیوں کے مقابلے میں عالم بالا سے متعلق ہوتی ہے -

اللہ اور رسول اللہ کی جانب سے مشرکین کے بارے میں اعلان براءت کے بعد' یہ مشرکین چاہے معاہدہ کرنے والے ہوں یا غیر معاہد ہوں' ماسوائے ان لوگوں کے جنہوں نے عہد نہ توڑا اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی کی معاونت کی - اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ مسلمان اس مدت کے اختتام پر کیا اقدامات کریں گے؟

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹: ۵) "پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو - پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو - اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے -" یہاں لفظ الاشھر الحرام (حرام مہینے) کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں کہ ان سے مراد کون سے مہینے ہیں؟ عام مشہور حرام مہینے ہیں یعنی ذوالقعدہ' ذوالحجہ اور محرم اور پھر رجب تو پھر چار مہینوں سے مراد تین ماہ اور ذوالحجہ کے باقی بیس دن ہوں گے - یہ پچاس دن ہوئے' یعنی اعلان کے بعد - یا اس سے مراد مدت چار ماہ ہے اور اس کا آغاز دس ذوالحجہ سے ہے اور اختتام دس ربیع الاخر تک ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ پہلی مدت ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے عہد توڑا اور دوسری مدت ان لوگوں کے لئے جن کے ساتھ اس سے قبل کوئی معاہدہ ہی نہ تھا - یہ ہیں مختلف اقوال -

میرے نزدیک یہاں جن چار مہینوں کا تذکرہ ہوا ہے اس سے اصطلاحی اشہر حرم مراد نہیں ہیں اور ان چار مہینوں کو اشہر حرم (محترم مہینے) اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں قتل و مقاتلہ حرام قرار دے دیا گیا تھا تاکہ اس عرصے میں مشرکین چل پھر سکیں - یہ عام میعاد تھی - البتہ جن لوگوں کے معاہدوں میں مدت مقرر تھی اور ان کے لئے مدت تک مہلت دے دی گئی تھی...... چونکہ اللہ نے ان کو چار مہینے آزادی کا اختیار دے دیا تھا - اس لئے اس مدت کا آغاز اس کے اعلان سے ہونا چاہئے اور جس نوعیت کا یہ اعلامیہ تھا اس کی نسبت سے یہی راجح ہے کہ اس مدت کا آغاز روز اعلان سے چار ماہ تصور کیا جائے -

اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس مدت کے خاتمے کے بعد جہاں بھی مشرک ملے' اسے قتل کر دیں یا قید کر دیں اور ہر راہ اور گھات پر بیٹھ جائیں تاکہ ان میں سے کوئی بھاگ کر نکلنے نہ پائے' ماسوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں استثناء وارد ہے - اور وہ اس کے سوا کوئی دوسرا سلوک ان کے ساتھ نہیں کر سکتے - کیونکہ مشرکین کو ایک عرصہ تک انجام بد سے ڈرایا گیا اور انہیں مہلت دی گئی - اس لئے ان کے خلاف یہ لکشن نہ اچانک ہے اور نہ ہی غیر منصفانہ ہے - جبکہ ان کے ساتھ طے شدہ معاہدے ختم کر دیئے گئے ہیں - اب ان کے لئے کوئی بات غیر متوقع نہیں ہے -

بہرحال مشرکین کے خلاف یہ لکشن اس غرض کے لئے نہ تھا کہ ان کو نیست و نابود کر دے جائے بلکہ اس لئے تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیں -

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(۹ : ۵) "پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" اس سے قبل ان کے ساتھ تحریک اسلامی کے ۱۲ سال گزرے تھے اور اس عرصے میں دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں انہوں نے مسلمانوں کو بے پناہ اذیتیں پہنچائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لشکر کشیاں کیں اور ان کی حکومت کو ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ پھر دین اسلام نے ان کے ساتھ جس قدر نرم رویہ اختیار کیا (اللہ کے رسول نے ان کے ساتھ جس قدر شریفانہ سلوک کیا وہ ایک طویل تاریخ ہے۔ اس کے باوجود اسلام کے دروازے ان کے لئے کھلے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو جن کو اذیت دی گئی' جن کے ساتھ جنگ کی گئی اور جن کو ملک سے نکالا گیا اور قتل کیا گیا ایسے مسلمانوں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اگر یہ مشرکین توبہ کر لیں تو ان سے ہاتھ کھینچ لو اگر وہ سچے دل سے اسلام کو قبول کر لیں اور اسلامی شعائر کو قبول کر لیں۔ جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہو کہ وہ سچے دل سے مسلمان ہو گئے ہیں اس لئے کہ اللہ کسی بھی ایسے شخص کو مایوس نہیں کرتا جو سچی توبہ کر کے لوٹ آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹: ۵) "بے شک اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" اس آیت کے بارے میں فقہاء کے درمیان جو فقہی مباحث چلے ہیں' ہم ان سے کوئی تعرض نہیں کرتے یعنی فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۹: ۵) "یعنی اگر توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں....." فقہاء نے یہ بحثیں کی ہیں کہ آیا ادائے نماز اور ادائے زکوۃ شروط اسلام میں سے ہیں یا ان کے تارک کو کافر کہا جائے گا؟ اور کب وہ کافر ہو گا؟ اور کیا نماز اور زکوۃ ہی کو علامت توبہ سمجھا جائے گا یا دوسرے ارکان اسلام کا مطالبہ بھی ان سے کیا جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان سوالات میں سے کسی سوال کے حل کے لئے یہ آیت نازل ہی نہیں ہوئی ہے۔ یہ نص اس وقت مشرکین عرب کے واقعی حالات کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس وقت یہ تصور ہی نہ تھا کہ کوئی توبہ کرے تو صرف نماز اور زکوۃ پر عمل پیرا ہو اور دوسرے اعمال کو نظر انداز کر دے' جو توبہ کرتا تھا وہ پورے اسلام میں داخل ہوتا تھا بلکہ اس آیت نے اگرچہ ان دو باتوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ اس لئے کہ اس وقت جو لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے وہ اسلام کی تمام شرائط کے ساتھ اس میں داخل ہوتے تھے۔ اور ان میں سے پہلی شرط یہ ہوتی کہ وہ پوری زندگی میں اللہ کا دین نافذ کریں گے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آئیں...... لہٰذا فقہاء اور مفسرین نے جو بحثیں کی ہیں۔ اس آیت کے وہ پیش نظر نہ تھیں بلکہ یہ ایک عملی کارروائی کے سلسلے میں ہدایت تھی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ چار ماہ کی مدت کے بعد بھی اسلام رواداری' سنجیدگی اور واقعیت پسندی کا دامن نہیں چھوڑتا' جیسا کہ ہم نے کہا اسلام کی یہ جنگ نسل کشی کے لئے نہیں ہے' بلکہ وہ ہدایت کی ایک مہم ہے۔ وہ مشرکین جو جاہلی سوسائٹی کی صورت میں جتھہ بند نہیں ہیں' افراد کی شکل میں ہیں' اور وہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے' ان کے لئے دارالاسلام میں مکمل امن و امان کے حقوق محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ اور مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کو پناہ دیں اور وہ اللہ کے کلام کو سنیں اور سمجھیں اور پھر ان کو ایسے علاقے میں پہنچا دیں جہاں وہ امن سے ہوں۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹ : ۶) "اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی بے حد خواہش ہے کہ ہر شخص ہدایت پائے اور راہ راست پر آجائے اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص دار الاسلام میں پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دینا دار الاسلام کا فرض ہے 'کیونکہ جب مشرکین دار الاسلام میں پناہ گیر ہوں گے تو پھر وہ دار الاسلام کے ساتھ جنگ نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا ان کو پناہ دینا اور قرآن سنانا اور دین اسلام کے اصولوں سے ان کو شناسا کرنا مفید مطلب ہے۔ ممکن ہے کہ اس طرح ان کے دل کھل جائیں 'وہ ہدایت پا لیں اور قبول کر لیں۔ اگر وہ نہ بھی قبول کریں تب بھی اللہ نے اہالیان دار الاسلام پر یہ فرض کر دیا ہے کہ وہ ان کی حفاظت کریں اور ایسے ملک تک پہنچا دیں جہاں وہ امن و امان سے رہ سکیں۔

مشرکین کے لئے دار الاسلام کی یہ پناہ گاہ دراصل اسلام کے مقامات بلند سے ایک اعلیٰ مقام تھا۔ اور اس کے علاوہ بھی اسلام میں ایک بلند چوٹی سے آگے دوسری بلند چوٹیاں اور رفعتیں نظر آتی ہیں' اور ان میں سے یہ ایک نہایت ہی بلند مقام ہے کہ ایک مسلمان ایک مشرک کا محافظ ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن کا محافظ ہے۔ جس نے مسلمان اور اسلام کو سخت اذیتیں دی ہیں اور مشکلات میں مبتلا کیا اور یہاں تک حفاظت کی جا رہی ہے کہ وہ دار الاسلام سے باہر کسی مقام پر پہنچ جائے یہ رواداری کا ایک نہایت ہی بلند مقام ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام ہدایت کا نظام ہے اور یہ نسل کشی کا نظام نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام کے لئے ایک نہایت ہی مامون اور محفوظ مرکز کا بندوبست کرے۔

جو لوگ اسلامی نظام کے نظریہ جہاد پر یہ اعتراضات کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے لوگوں کو زبردستی اسلامی عقائد قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور پھر مسلمانوں میں سے جو لوگ مستشرقین کے یہ الزامات پڑھتے ہیں تو وہ خائف ہو جاتے ہیں اور پھر ان الزامات کے جواب میں دفاعی انداز اختیار کرتے ہیں اور پھر یہ موقف اختیار کر لیتے ہیں کہ اسلام تو صرف دفاع میں لڑتا ہے اور وہ دفاع بھی اپنی ریاستی حدود کے اندر کرتا ہے۔ ان دونوں طبقات یعنی الزامات لگانے والوں اور ان کا دفاع کرنے والوں کو ذرا اسلام کے اس مقام بلند پر جاکر دنیا پر نظر ڈالنا چاہئے اور پھر دوبارہ اس آیت کو پڑھ کر غور کرنا چاہئے۔ انہیں انسان کی پوری تاریخ پست نظر آئے گی' تہی دامن نظر آئے گی۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹ : ۶) "اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہئے تاکہ اللہ کا کلام سنے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دے۔ یہ اس لئے کرنا چاہئے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔" گویا یہ دین ان لوگوں کے لئے ایک خبرداری ہے جو جانتے

نہیں ہیں ۔ اور یہ دین ان لوگوں کے لئے جائے پناہ ہے جو پناہ چاہتے ہیں ۔بلکہ ان اعدا کے لئے بھی جنہوں نے اس کے خلاف تلوار اٹھائی 'اس کے خلاف جنگ کی اور اس کے ساتھ عناد رکھا ۔ اسلام علم جہاد اس وقت بلند کرتا ہے جب دعوت اسلامی اور عوام الناس کے درمیان مادی قوتیں حائل ہو جاتی ہیں اور ان کے کان تک دعوت پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں ۔ اور کلام الہی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ۔ ہدایت کی راہ روکتی ہیں ۔ نیز یہ مادی قوتیں لوگوں کو انسانوں کی غلامی اور بندگی سے رہا کرنے کی راہ میں مزاحم ہوتی ہیں اور لوگوں کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ غیراللہ کی بندگی کرتی رہیں ۔ اور جب ان قوتوں کو توڑ دیا جائے اور یہ رکاوٹیں دعوت اسلامی کی راہ سے دور ہو جائیں تو پھر تمام افراد آزاد ہو جاتے ہیں 'اپنی رائے میں آزاد ہیں ۔ اسلام پھر انہیں صرف تعلیم دیتا ہے 'نہ مجبور کرتا ہے اور نہ خواہ مخواہ کسی کو قتل کرتا ہے بلکہ ان کو پہنچا دیتا ہے ' ان کی حفاظت کرتا ہے اور پھر ان کو ان کے جائے امن تک پناہ دیتا ہے ۔ یہ سلوک باوجود ان کے اس طرز عمل کے ہوتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کا انکار کرتے ہیں ۔

اس وقت دنیا میں ایسے نظام اور ایسے طور طریقے رائج ہیں جنہیں خود انسانوں نے تشکیل دیا ہے ۔ اگر ان انسان کے بنائے ہوئے نظاموں اور طور طریقوں کی کوئی مخالفت کرے تو اس کی جان محفوظ نہیں رہتی 'نہ اس کا مال محفوظ رہتا ہے ' نہ اس کی عزت محفوظ رہتی ہے اور نہ اس کے دوسرے انسانی حقوق محفوظ رہتے ہیں ۔ بعض لوگ عمداً ایسی صورت حال کو دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور پھر بھی اسلام کے خلاف ان بے بنیاد الزامات اور اتہامات کے جواب میں شف شف کرتے ہیں اور ان کے جواب میں شکست خوردہ ذہنیت 'کمزور موقف اور تلوار اور توپ کے مقابلے میں محض معذرت اور قلم کو کام میں لاتے ہیں اور پھر ہمارے دور جدید ہیں ۔

---ooo---

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ
اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ
فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷﴾ كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا
عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى
قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا
وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾
وَاِنْ نَّکَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ
فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْکُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَیْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

”ان مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے؟--- بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا' تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے..... مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔

کسی مومن کے معاملہ میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ پس اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لئے ہم اپنے احکام واضح کئے دیتے ہیں۔ اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔“

سابقہ آیات میں' میں اسلامی حکومت اور جزیرۃ العرب کے دوسرے معاشروں اور مشرکین جزیرۃ العرب کے مابین تعلقات کی آخری شکل کو منضبط کیا گیا تھا۔ اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی حکومت اور ان دوسرے گروپوں کے درمیان معاہدے اور امن کی حالت ختم ہو جائے اور ان میں سے بعض کو چار ماہ کی مہلت دے دی جائے اور بعض کو انتہائے مدت معاہدہ تک کی مہلت دی جائے اور ان حالات اور میعاد کے ختم ہونے کے بعد تعلقات کی صرف دو صورتیں رہ جائیں یا تو اسلام قبول کر کے نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں یعنی اسلام قبول کر کے تمام فرائض کے پابند ہو جائیں اور یا قتال' قیدی اور مورچہ بندی کے لئے تیار ہو جائیں۔

جب صورت حالات ایسی ہو جائے تو پھر اگلی آیات میں بطور استفہام انکاری اور سخت الفاظ میں یہ تنبیہ کی جاتی ہے کہ یہ بات اب نہ مناسب ہے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہئے کہ کسی مشرک کے ساتھ رسول اللہ کوئی معاہدہ کریں یعنی اصولاً ایسا ہونا ہی نہ چاہئے۔ یہ بات بنیادی طور پر اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ (۹ : ۷) ”ان مشرکین کے لئے

اللہ اور رسول اللہ کے پاس کوئی عہد آخر ہو کیسے سکتا ہے) موجودہ آیات کے اندر استفہام انکاری سے یہ متبادر ہو سکتا تھا کہ پہلی آیات میں جن لوگوں کے معاہدات کے لئے مدت معاہدہ تک مہلت دی گئی تھی' جنہوں نے معاہدات کی پاسداری کی تھی اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہ کی تھی' شاید موجودہ آیات اور حکم سے وہ مہلت بھی واپس لے لی گئی ہے اس لئے یہاں بتکرار یہ کہا گیا کہ ایسے لوگوں کی مہلت باقی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۷) "بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا' تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔" لیکن اس جدید تاکید میں ایک اضافہ بھی آگیا ہے۔ پہلے حکم میں یہ تھا کہ ان کو مہلت دے دی گئی ہے کیونکہ انہوں نے ماضی میں نقض عہد نہ کیا تھا۔ یہاں یہ شرط عائد کر دی گئی کہ نزول آیت سے لے کر مدت معاہدہ تک بھی وہ عہد کا پاس رکھنے کے پابند ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بین الاقوامی معاملات کو منضبط کرنے میں بڑی باریکی سے کام لیا ہے۔ محض ضمنی اشارے اور قیاس کے بجائے صریح نص کو لانا ضروری سمجھا گیا۔

اس سورت کے تعارف اور اس سبق کے تعارف میں ہم نے جو کچھ کہا اور نزول سورت کے وقت جو حالات اور جو مظاہر اسلامی معاشرے کے اندر موجود تھے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہ فیصلہ کن قدم کیوں اٹھایا گیا' اب یہاں سے آگے کی آیات میں مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات اور تردد اور پریشانی کو دور کرتے ہوئے انہیں اس حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں اور اسلامی نظام کے سلسلے میں خود ان مشرکین کے خیالات اور نیات کیسی ہیں؟ وہ مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے کسی عہد کا کوئی پاس نہیں رکھتے۔ اس معاملے میں وہ ہر کارروائی کرنے کو جائز سمجھتے ہیں اور ان معاہدات کی خلاف ورزی کے لئے وہ ہروقت تیار رہتے ہیں' وہ کبھی وفا نہیں کرتے' وہ کبھی اپنے عہد کے مطابق اپنے آپ کو پابند نہیں کرتے اور جب بھی وہ قدرت پائیں وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے ہروقت تیار ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ سالمیت' امن کی صورت حال پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ان پر اس سلسلے میں کوئی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ الا یہ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ (۹ : ۷) "ان مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد آخر کیسے ہو سکتا ہے؟" مشرکین صرف ایک اللہ کی بندگی نہیں کرتے۔ وہ رسالت محمدی کا اعتراف بھی نہیں کرتے۔ تو کیسے ممکن ہے رسول اللہ کے نزدیک ان کا کوئی عہد ہو۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے بندوں کی حیثیت کا انکار نہیں کر سکتے' نہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کا انکار کر سکتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ اپنے خالق اور رازق حقیقی کا انکار کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور رسول کے ساتھ عداوت کرتے ہیں لہذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کے ہاں ان کا کوئی عہد ہو۔

اس استفہام انکاری میں اس مسئلے کو اٹھایا گیا ہے اور یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ یہ اصولاً اس بات ہی کو رد کر دیتا ہے کہ کسی مسلمان اور اللہ اور رسول اور مشرک کے درمیان سرے سے کوئی معاہدہ ہو۔ قطع نظر موجودہ معاہدات سے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت تو عملاً مشرکین کے ساتھ معاہدات موجود تھے۔ اور ان میں سے بعض معاہدوں کے بارے میں تو خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کو اپنی مدت تک پورا کیا جائے اور مدینہ میں اسلامی مملکت کے قیام کے ساتھ ہی کفار کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے۔ یہودیوں کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے، مشرکین کے ساتھ معاہدات ہوئے تھے۔ چھٹی صدی ہجری میں معاہدۂ حدیبیہ ہوا تھا اور سابقہ آیات میں ایسے معاہدات کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ اگرچہ ان آیات میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اگر خیانت کا اندیشہ ہو تو ان معاہدات کو منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ اگر آیت زیر بحث میں اصولاً اس بات ہی کو مستبعد قرار دیا گیا ہے کہ مشرکین کے ساتھ معاہدہ کیسے ہو سکتا ہے تو پھر ان معاہدات کی اجازت کیوں دی گئی اور یہ معاہدات طے کیوں پاگئے اور پھر ان پر یہ استفہام انکاری کیوں آیا؟

اگر اسلام کے تحریکی منہاج کو اس طرح سمجھا جائے جس طرح ہم نے سابقہ صفحات کے اندر سمجھانے کی سعی کی ہے۔ اس سورت کے آغاز میں اور سورت انفال کے آغاز میں تو یہ اشکال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ درحقیقت یہ معاہدات ایک متعین وقت میں، بعض عملی حالات کی وجہ سے طے پائے تھے اور یہ موزوں وقت پر موزوں وسائل جنگ تھے۔ عبوری دور کے لئے تھے۔ آخری اور انتہائی اور فائنل ہدایت بہرحال یہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ کوئی عہد نہ ہو اور اللہ اور رسول اللہ کے ہاں اب کوئی عہد مشرکین کے لئے نہیں ہونا چاہئے۔ تحریک اسلامی کا آخری ہدف یہی تھا کہ اسلامی نظام کے سوا کوئی نظام نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کرۂ ارض پر کوئی شریک نہ ہو لیکن یہ معاہدات عبوری دور کے لئے کئے گئے۔ جہاں تک اسلام کا آخری ہدف ہے تو اس کا اعلان تو اول روز سے کر دیا گیا تھا۔ ابتدائی اور عبوری دور کا تقاضا یہ تھا کہ جو مشرک مسلمانوں کے ساتھ نہ لڑتے تھے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان سے نمٹا جائے جو لڑتے تھے۔ اور یہ کہ جو لوگ تحریکی ادوار میں سے کسی دور میں دوستی چاہتے ہیں تو ان سے دوستی کی جائے۔ جو معاہدے کرنا چاہئے ان سے معاہدے کئے جائیں جو غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں ان کو رہنے دیا جائے لیکن آخری ہدف تو بہرحال یہ تھا کہ اور اس سے تحریکی حضرات کسی وقت بھی غافل نہیں رہے کہ پورے کرۂ ارض اور خصوصاً جزیرۃ العرب سے شرک کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ خود مشرکین نے جو معاہدات اہل اسلام سے کئے وہ بھی وقت مقرر کے لئے تھے اور یہ بات لازی تھی کہ میعاد ختم ہونے کے بعد وہ حملہ آور ہو سکتے تھے۔ وہ کیسے حضور ﷺ کو چھوڑ سکتے تھے جبکہ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ کے اہداف کیا ہیں' وہ حضور سے امن کی حالت اس لئے قائم کرتے تھے کہ وہ اس دوران آپ کے خلاف تیاریاں کرلیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دائمی ہدایت تو دے دی تھی اور وہ کسی زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲ : ۲۱۷) اور وہ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں اپنے دین سے لوٹا دیں اگر وہ ایسا کر سکیں) یہ ایک دائمی قول ہے' دائمی نصیحت ہے' جو کسی زمانے' کسی معاشرے اور کسی بھی دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

اصولاً تمام معاہدات کے انکار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے معاہدات کو مدت معاہدہ تک باقی رکھا

جنھوں نے نہ تو معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لیا تھا' بشرطیکہ وہ آئندہ بھی ایسا ہی طرز عمل جاری رکھیں' یہ شرط یہاں نئی عائد کی گئی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۹ : ۷) "بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔"

یہ لوگ جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جنھوں نے مسجد حرام کے پاس آپ سے معاہدہ کیا' وہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۹ : ۷) "بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کئے' پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی' تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت میں ان کے سوا کوئی اور مراد نہیں ہے جس طرح بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر آیت چار میں عمومی براءت سے استثنائی کے لئے ہوا تھا' اور دوسری مرتبہ ان کا تذکرہ اس لئے ہوا کہ اللہ نے کیف یکون کے ساتھ اصولاً بھی ہر مشرک کے ساتھ معاہدے کی نفی کر دی۔ تو دوبارہ استثناء کی گئی کہ اس اصولی آیت سے کہیں سابقہ استثناء کو منسوخ تصور نہ کر لیا جائے۔ یہاں بھی تقویٰ کا ذکر ہوا اور اظہار کیا گیا کہ اللہ متقین کو پسند کرتا ہے اور وہاں بھی ایسا ہی اظہار کیا گیا تھا' اشارہ یہ مطلوب تھا کہ مضمون ایک ہے' موضوع آیت وہی ہے جبکہ دوسری آیت میں استثناء میں یہ اضافہ کر دیا گیا کہ جس طرح ماضی میں وہ رویہ درست رکھے ہوئے تھے اسی طرح مستقبل میں بھی انہیں اپنا رویہ درست رکھنا ہو گا۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ نہایت ہی باریک قانونی عبارت یعنی (Proviso) ہے اور دونوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے یہ لازم آتا ہے کہ جس طرح وہ پہلے وفائے عہد کرتے رہے اسی طرح مہلت تب جاری رہے گی جب وہ آئندہ بھی درست رہیں یعنی دوران مہلت۔

اب یہ بات بتائی جاتی ہے کہ اصولاً مشرکین کے ساتھ اب معاہدے کیوں ممنوع کر دیئے گئے؟ اس کے تاریخی اسباب یہاں گنوائے جاتے ہیں۔ عملی ضرورت بتائی جا رہی ہے اور فریقین کے درمیان نظریاتی اور ایمانی جدائیاں اور تضادات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ (۸) اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ

اِنَّھُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَ اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰) (۹:۸ تا ۱۰) "مگر ان کے سوا دوسرے مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔ کسی مومن کے معاملہ میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔"

مشرکین کے ساتھ اللہ اور رسول اللہ کا کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو عہد کرتے بھی اس وقت ہیں جب وہ تمہارے مقابلے سے عاجز ہو جائیں اور اگر وہ تم پر غالب آ جائیں اور فاتح ہو جائیں تو تمہارے ساتھ وہ کام کریں جن کا تم تصور ہی نہیں کر سکتے۔ پھر وہ کسی معاہدے کا بھی خیال نہ رکھیں' اپنی کسی ذمہ داری کا کوئی پاس نہ رکھیں' وہ تمہارے خلاف مذموم افعال کے ارتکاب سے بھی نہ ہچکچائیں کیونکہ وہ فطرتاً کسی عہد اور کسی رشتہ داری کا کوئی پاس نہیں رکھتے اور ظلم و زیادتی میں حدیں پار کر جاتے ہیں اور تمہارے معاملے میں تو اپنے ان مذموم افعال کو بھی مذموم نہیں سمجھتے جو عموماً وہ اپنے معاشرے میں بہت ہی مذموم سمجھتے ہیں اور ان کا ارتکاب نہیں کرتے۔ ان کے دل میں تمہارے خلاف اس قدر بغض بھرا ہوا ہے کہ وہ تم پر ہر ظلم کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ قدرت پا لیں اگرچہ معاہدے قائم ہوں۔ یہ نہیں کہ وہ محض معاہدوں کی وجہ سے تمہارے خلاف ایکشن نہیں لیتے بلکہ وہ قدرت ہی نہیں رکھتے۔ آج جبکہ تم طاقتور ہو' وہ بظاہر تم سے نرم بات کرتے ہیں اور اظہار وفا کرتے ہیں لیکن ان کے دل تمہارے عناد کی وجہ سے کھول رہے ہیں اور وہ عہد پر قائم رہنے کا کوئی داعیہ نہیں رکھتے کیونکہ ان میں نہ وفاداری ہے اور نہ محبت ہے۔ ان کی حالت یہ ہے

وَاَكْثَرُھُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّھُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) (۹:۸ — ۹) "ان میں سے اکثر فاسق ہیں' انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی ہے۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔" ان کے دلوں میں تمہارے خلاف حسد اور کینہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس کی یہی حقیقی وجہ ہے اور اسی وجہ سے وہ تمہارے ساتھ طے پا جانے والے معاہدات کے معاملے میں وفا کرنے والے نہیں ہیں۔ اور جس وقت بھی وہ قوت محسوس کریں وہ تم سے انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ کوئی خلجان اور کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ ان وجوہات سے وہ فاسق قرار پاتے ہیں اور اللہ کی ہدایت سے خارج متصور ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اللہ کی آیات آئیں اور انہوں نے چند ٹکوں کے عوض انہیں پس پشت ڈال دیا۔ یہ دنیا جس میں وہ رہتے ہیں انہیں اس قدر عزیز ہے کہ اس کے مفادات کو آیات الٰہیہ پر انہوں نے ترجیح دی۔ ان کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ اسلام کے اصلاحی نظام کی وجہ سے ان کے مفادات پر زد پڑ جائے گی۔ یا انہیں کچھ مزید ادائیگیاں کرنی پڑیں گی۔ اس لئے وہ

دوسرے لوگوں کو بھی اسلام کی طرف آنے سے روکتے تھے اور خود بھی اس طرف نہ آتے تھے۔ اسی طرح یہ لوگ آئمہ کفر بن گئے تھے۔ اس لئے ان کے اس کرتوت کو اللہ نے اصل برائی یا برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ اِنَّھُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۹: ۹) "بہت برے کرتوت ہیں جو یہ کرتے ہیں۔" ان لوگوں کے دلوں میں پایا جانے والا بغض اور حقد تمہاری ذات تک محدود نہیں ہے اور ان کا یہ مکروہ منصوبہ صرف تم تک محدود نہیں ہے۔ یہ حسد انہوں نے تمام مومنین کے لئے چھپا رکھا ہے۔ ہر مسلم کے ساتھ وہ یہی مکروہ سلوک کرتے ہیں۔ دراصل ان کا یہ سلوک تمہاری صفت کے ساتھ ہے یعنی صفت ایمان و اسلام کے ساتھ' اور صفت ایمان اور اسلام۔ اسلامی تاریخ میں جن لوگوں کے اندر پائی گئی ہے ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا اور اس بات کا اظہار ان ایمان لانے والے جادوگروں نے کیا تھا جو فرعون کے جذبہ انتقام اور غضب کا شکار بن گئے تھے۔ انہوں نے کہا وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا "اور تم ہم سے یہ انتقام جو لے رہے ہو تو یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اپنے رب کی آیات کو مان لیا۔ جب وہ ہمارے سامنے آگئیں۔" اور رسول اللہ نے اپنے رب کی ہدایت کے مطابق اہل کتاب سے یہی کہا قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ ھَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ (۵: ۵۹) "اے اہل کتاب تم جو ہم سے انتقام لیتے ہو تو یہ صرف اس لئے ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔" اور اللہ نے اصحاب الاخدود کے بارے میں یہی کہا تھا' جب ان کو جلایا گیا تھا۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْھُمْ اِلَّآ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ "اور ان لوگوں سے انتقام صرف اس لئے لیا کہ وہ اللہ عزیز و حمید پر ایمان لے آئے تھے۔" غرض مشرکین کی طرف سے انتقام کا سبب ماسوائے صفت ایمان کے اور کوئی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنان اسلام نے صرف ایمان کی وجہ سے ہر مومن سے دشمنی رکھی اور اس بارے میں کسی عہد و پیمان اور رشتہ داری کا کوئی خیال نہ رکھا۔

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۹: ۱۰) "یہ لوگ تمہارے بارے میں کسی قرابت داری اور کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے اور یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔" ان کے اندر زیادتی کرنے کی صفت رچی بسی ہے۔ اور اس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایمان کو ناپسند کرتے ہیں۔ ایمان سے لوگوں کو روکتے ہیں اور ایمان کی تحریک کے سامنے دیوار بن رہے ہیں۔ اور وہ ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ مومنین پر وار کرنے کا موقعہ مل جائے۔ اور وہ اہل ایمان سے نہ رشتہ داری کا تعلق رکھتے ہیں اور نہ معاہدے کی پرواکرتے ہیں بشرطیکہ ان کو غلبہ نصیب ہو جائے اور موقع مل جائے اور ان کو یہ خطرہ نہ ہو کہ مسلمان ان پر حملہ کریں گے۔ اور اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کے اندر قوت نہیں ہے تو یہ ان کے ساتھ کیا کیا کر گزریں۔ صرف موقعہ ہاتھ آنے کی دیر ہے' پھر نہ حقوق کا پاس ہے نہ رشتہ داری کا لحاظ ہے اور نہ کوئی معاہدہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ بڑے سے بڑا فعل کرنے کے لئے یہ لوگ تیار ہیں بشرطیکہ خود مامون ہوں۔

اب تفصیلاً بتایا جاتا ہے کہ ان حالات میں اہل ایمان مشرکین کے حوالے سے کیا طرز عمل اختیار کریں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۱) وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (۱۲) (۹: ۱۱ — ۱۲))

"پس اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لئے ہم اپنے احکام واضح کئے دیتے ہیں اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کردیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے ۔"

مسلمانوں کا مقابلہ ایسے دشمنوں سے ہے جو ہر وقت تاک میں بیٹھا ہے اور وہ مسلمانوں پر بے رحم وار کرنے کے لئے محض اس لئے رکے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر وار کرنے کی سکت نہیں ہوتی ۔ یہ وجہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی عہد و پیمان کا لحاظ کرنے والے ہوتے ہیں یا کسی ذمہ داری کا احساس کرنے والے ہوتے ہیں یا ان پر کسی ملامت کرنے والے کی ملامت و مذمت کا کوئی اثر ہوتا ہے ' نہ وہ کسی رشتہ داری یا تعلق کا خیال رکھتے ہیں ۔ دین اور لادینی کی کشمکش کی یہ ایک طویل تاریخ ہے اور یہ تاریخ اسی راہ پر چلتی رہی ہے ۔ اس شاہراہ سے اگر کوئی انحراف ہوا ہے تو وہ محض عارضی اسباب کی وجہ سے اور جلدی تاریخ اپنے اسی خط پر رکتی ہے جو مقرر و مرسوم رہا ہے ۔

ایک تو ہمارے سامنے یہ عملی تاریخ ہے ' دوسرے یہ کہ اسلامی نظام حیات کے اہداف کی نوعیت ہے کہ اس کے پیش نظر لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں دینا ہے ' جبکہ اسلامی نظام حیات کے مقابلے میں تمام جاہلی نظام ہائے حیات کے اہداف یہ ہیں کہ لوگ لوگوں کے غلام رہیں ۔ ایسے حالات میں اسلامی نظام حیات کا تحریکی عمل دنیا کو اس طرح خطاب کرتا ہے ۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۹: ۱۱) "پس اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور جاننے والوں کے لئے ہم اپنے احکام واضح کئے دیتے ہیں ۔"

وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (۹: ۱۲) "اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کردیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے ۔"

پھر صورت یہ ہوگی کہ یا تو وہ اس دین میں داخل ہو جائیں گے جس میں مسلمان داخل ہوئے ہیں اور سابقہ گناہوں سے تائب ہو جائیں گے اور شرک اور ظلم کو چھوڑ دیں گے ۔ تو مسلمان ان کے شرک اور ظلم سے صرف نظر کر دیں گے ۔ اور ان کے درمیان نظریاتی تعلق قائم ہو جائے گا ۔ اور یہ جدید مسلمان بھی قدیم مسلمانوں کے بھائی بن جائیں گے اور ان کا تمام ماضی بھلا دیا جائے گا ۔ تاریخ سے بھی اور دلوں سے بھی ۔ اور یہ کہا کہ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

دو یعنی ان احکام کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں اور ان کی حکمت تک وہی لوگ رسائی حاصل کر سکتے ہیں جو اہل علم ہوں۔ یا پھر یہ صورت ہوگی کہ وہ دین اسلام سے روگردانی کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اس کا عہد کیا تھا۔ اور دین اسلام پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں تو یہ کفر کے علمبردار ہوں گے۔ اور ان کے دلوں میں نہ ایمان ہوگا نہ ان کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار ہوگا۔ اور اب ہمارے لئے ماسوائے اس کے کہ ان کے ساتھ جنگ شروع کر دیں اور کوئی راستہ ہی نہ ہوگا۔ شاید بزور تلوار یہ باز آجائیں۔ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ اسلامی کیمپ کی قوت اور اس کا جنگی غلبہ بعض اوقات لوگوں کو اس بات پر مائل کر دیتا ہے کہ وہ سچائی کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ حق غالب ہے لہٰذا وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور ان کا استدلال یہ ہوتا ہے چونکہ یہ نظام غالب ہے لہٰذا برحق ہے۔ اور یہ کہ اس کی پشت پر قوت الٰہیہ ہے اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر کار اللہ اور اس کے رسولوں نے غالب ہونا ہے۔ اس طرح یہ لوگ ذہناً قائل ہو کر ہدایت کو قبول کر لیں گے اور توبہ کر لیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ جنگ کی وجہ سے ان کا دین زبردستی تبدیل کر دیا جائے گا۔ بلکہ وہ اس طرح مطمئن ہو جائیں گے کیونکہ دین اسلام کامیاب شکل میں ان کے سامنے چل رہا ہوگا اور بسا اوقات کسی بات کا عملی تجربہ ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے۔

---○○○---

اب ہم یہاں اس نکتے کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس پالیسی کا دائرہ عمل کیا ہے؟ تاریخ کے کس دور میں یہ پالیسی روبعمل تھی، کس خاندان میں کس معاشرے میں اسے چلایا گیا۔ آیا یہ پالیسی آغاز اسلام کے زمانے میں جزیرۃ العرب کے باشندوں کے ساتھ مخصوص تھی یا کہ اس کا دائرہ عمل اور میدان نفاذ تاریخ میں اور کسی زمان و مکان میں بھی ہوا ہے۔

ابتدا میں تو یہ آیات جب نازل ہوئی تھیں تو ان کا نفاذ جزیرۃ العرب میں اسلام اور شرک کی کشمکش کے آخری دور میں ہوا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان احکام کا اطلاق پہلے پہل اسی صورت حالات پر ہوا تھا۔ اور ان آیات میں مشرکین سے مراد وہی مشرکین ہیں جن سے حضور کو واسطہ تھا۔

یہ بات تو بالکل برحق ہے کہ تاریخی پس منظر تو یہی تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی ان آیات کا آخری دائرہ تھا اور یہ آیات اسی تک محدود ہیں؟

یہاں مناسب ہے کہ ہم مسلمانوں کے حوالے سے مشرکین کے موقف اور طرز عمل کا تاریخی جائزہ لیں، تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ان آیات میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے اس کے اغراض و مقاصد اور حدود کیا ہیں اور ان کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔ ہمیں چاہئے کہ تاریخ کے اوراق الٹ کر ذرا دیکھیں۔

جہاں تک جزیرۃ عربیہ کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں فی ظلال القرآن کے اسی حصے میں کافی مواد موجود ہے۔ سیرت کے واقعات مشہور ہیں۔ مکہ میں مشرکین نے دین اسلام کے ساتھ جو سلوک کیا پھر مدینہ طیبہ کی اسلامی حکومت کے خلاف وہ جو کچھ کرتا رہے۔ ایمان لانے والوں پر انہوں نے جس قدر مظالم ڈھائے جن کا تفصیلی تذکرہ ان نصوص کے اندر مفصل آگیا ہے۔

یہ بات بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام اور شرک کی کشمکش اس قدر طویل اور شدید نہیں رہی ہے جس قدر اسلام اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے درمیان یہ کشمکش شدید رہی ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ مشرکین نے

بھی اسلام کے خلاف ہمیشہ وہی موقف اختیار کیا جس کی تصویر ان آیات میں کھینچی گئی ہے :

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰)(۹: ۸ تا ۱۰)) "مشرکین کے ساتھ کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔ کسی مومن کے معاملہ میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوئی ہے۔"

مشرکین اور اہل کتاب کی طرف سے مسلمانوں کے مقابلے میں یہ دائمی اور طے شدہ موقف رہا ہے۔ اہل کتاب نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا تذکرہ ہم اس سورت کے دوسرے سبق کے ضمن میں کریں گے اور جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں کے مقابلے میں پوری اسلامی تاریخ میں اسی پالیسی پر گامزن رہے۔

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے شروع نہیں ہوا بلکہ دعوت اسلامی کا خاتمہ آپ پر ہوا ہے اور پوری انسانی تاریخ میں مشرکین کا موقف دین رب العالمین کے مقابلے میں ایک ہی رہا ہے تو پوری اسلامی تاریخ کے ڈانڈے' باہم مل جائیں گے۔ اور اس طرح یہ موقف اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گا اور یہ اسی طرح ایک حقیقت کی طرح ثابت ہو گا جس طرح ان نصوص میں اسے بیان کیا گیا ہے اور پوری اسلامی اور انسانی تاریخ اس پر گواہ ہو گی۔

مشرکین نے حضرت نوح' حضرت ھود' حضرت صالح' حضرت ابراہیم' حضرت شعیب' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ علیہم صلوات اللہ کے خلاف کیا کارروائیاں کیں' پھر ان کی امتوں کے ساتھ کیا سلوک وہ کرتے رہے' اپنے اپنے ادوار میں' پھر آخر کار مشرکین نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا سلوک کیا' اور آپ کے بعد اہل ایمان کے ساتھ انہوں نے کیا کیا سلوک کیا' حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے حوالے سے کسی رشتہ داری' اور کسی معاہدے کی کوئی پروا نہیں کی۔ جب بھی انہیں موقعہ ملا اور جب بھی انہوں نے قوت پکڑی انہوں نے دین رب العالمین کے ماننے والوں پر حملہ کیا۔

مشرکین نے تاتاریوں کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف دوسری بار حملہ کیا تھا۔ اس کے حالات و واقعات کو ذرا ذہن میں رکھئے اور آج چودہ سو سال کے بعد تک بھی وہ مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ نہیں کر رہے اور زمین کے کس حصے میں نہیں کر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے حوالے سے کسی رشتے اور کسی معاہدے کا کوئی پاس نہیں رکھتے۔

اور یہ آیات الٰہیہ دائمی حقیقت سے پردہ کشائی کرتی ہیں۔

جب بت پرستوں نے بغداد پر غلبہ حاصل کیا تو اس وقت جو الیہ پیش آیا تاریخ کی کتابوں میں اس کی بعض جھلکیاں قلم بند ہو چکی ہیں۔ ہم تاریخ ابو الفداء سے کچھ جھلکیاں دیتے ہیں۔ ابو الفداء نے البدایہ والنہایہ میں ۶۵۶ ھ کے واقعات میں لکھا ہے :

"یہ لوگ اس شہر (بغداد) پر ٹوٹ پڑے جس قدر بچوں' عورتوں اور مردوں' بوڑھوں اور معمر افراد کو وہ قتل کر سکتے تھے انہوں نے قتل کئے۔ بہت سے لوگ ڈر کے مارے کنوؤں میں چھپ گئے' جھاڑیوں میں پناہ گزین ہو گئے' گندے تالابوں میں۔ یہ لوگ ایک عرصے تک ان جگہوں میں پوشیدہ رہے اور ظاہر نہ ہوئے۔ بعض لوگ دکانوں میں اپنے آپ کو بند کر لیتے تھے' دروازے بند کر دیتے' تاتاری دروازے توڑتے یا آگ لگا دیتے اور اندر داخل ہوتے' یہ لوگ چھتوں پر چڑھ جاتے چنانچہ مکان کی سطح پر یہ لوگ ان کو قتل کر دیتے اور ان کا خون پرنالوں سے بہہ کر گلیوں میں بہتا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مساجد' مدارس اور سراؤں میں لوگوں کا قتل عام جاری رہا اور ماسوائے اہل ذمہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اور کوئی شخص زندہ نہ رہا یا وہ لوگ زندہ رہے جنہوں نے تاتاریوں کی پناہ لے لی یا وہ لوگ زندہ رہے جنہوں نے ابن علقمی وزیر کے ہاں پناہ لی جو رافضی تھا' بعض تاجروں کو بھی بھاری رشوتوں کے عوض امان مل گئی تھی۔ اس طرح وہ اور ان کی دولت بچ گئی تھی اور اس حادثے کے بعد وہ بغداد جو شہروں کا سرتاج تھا اس طرح ہو گیا کہ گویا وہ ایک ویرانہ ہے' چند لوگ اس میں رہ گئے۔ وہ بھی حالت خوف میں۔ بھوک اور ذلت اور افلاس میں ڈوبا ہوا۔"

"اس واقعہ میں بغداد میں جو مسلمان تہہ تیغ کئے گئے ان کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ آٹھ لاکھ انسان قتل ہوئے۔ بعض نے یہ تعداد دس لاکھ بتائی ہے اور بعض نے اسے بیس لاکھ بتایا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ تاتاری بغداد میں محرم کے آخری دنوں میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ پورے چالیس دنوں تک لوگوں کو تہہ تیغ کرتے رہے۔ خلیفہ معتصم امیر المومنین کو بروز منگل ۱۴ صفر قتل کیا گیا اور اس کی قبر کو بھی مٹا دیا گیا۔ ان کی عمر اس وقت ۴۶ سال چار ماہ تھی اور ان کی مدت خلافت پندرہ سال آٹھ ماہ اور کچھ دن تھی۔ ان کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے ابوالعباس کو بھی قتل کیا گیا۔ یہ سولہ سال کے تھے۔ پھر ان کے دوسرے بیٹے ابو الفضل عبدالرحمٰن کو قتل کیا گیا۔ یہ تیرہ سال کے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے مبارک اور تین بیٹوں فاطمہ' خدیجہ اور مریم کو قیدی بنا لیا گیا۔"

"دار الخلافہ کے استاذ محی الدین یوسف ابن شیخ الفرج ابن الجوزی کو بھی قتل کیا گیا۔ یہ وزیر کے دشمن تھے۔ ان کے تین بچوں کو بھی قتل کیا گیا جن کے نام عبدالرحمٰن' عبدالکریم اور عبداللہ تھے۔ اور حکومت کے اکابرین کو ایک ایک کر کے قتل کیا گیا۔ جن میں دو یدار صغیر مجاہد الدین ایبک' شہاب الدین سلیمان شاہ اور اہل سنت کے اکابرین اور شہر کے معززین شامل تھے۔ ان لوگوں کا طریقہ واردات یہ تھا کہ یہ لوگ دار الخلافت سے لوگوں کو ان کے اہل و عیال کے ساتھ بلاتے۔ ان کے ساتھ ان کے بچے اور عورتیں بھی ہوتیں۔ اسے مقبرہ خلال کی طرف لے جایا جاتا۔ المنظرہ کی جانب اور انہیں اس طرح ذبح کیا جاتا جس طرح بکری کو ذبح کیا جاتا ہے۔ ان کی لڑکیوں اور لونڈیوں سے جسے وہ پسند کرتے اسے قیدی بنا لیتے۔ خلیفہ کے مودب اور شیخ الشیوخ صدر الدین علی ابن النیار کو بھی قتل کیا گیا۔ خطباء' ائمہ اور حافظین قرآن

سب کو قتل کر دیا گیا۔

"جب نوشتہ دیوار پورا ہوا اور چالیس دن پورے ہو گئے تو بغداد مکمل تباہی سے دوچار ہو چکا تھا۔ پورے شہر میں خال خال لوگ نظر آتے تھے۔ راستوں میں کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ اس پر بارش ہو گئی۔ لوگوں کے اجسام پھول گئے۔ پورا شہر بدبو اور تعفن میں ڈوب گیا۔ ہوا بدل گئی اور علاقے میں شدید وبا پھیل گئی۔ یہ وباء علاقہ شام تک پھیل گئی اور خلق کثیر لقمہ اجل بن گئی۔ پورے علاقے کے عوام وبا اور قحط میں گرفتار ہو گئے۔ تلوار اور طاعون کے ذریعے راہ عدم کو روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

"اور جب چالیس دنوں کے بعد بغداد میں امان کا اعلان ہوا اور لوگ تہ خانوں، کمین گاہوں اور قبرستانوں سے نکلے تو وہ ایسے تھے جس طرح مردے قبروں سے نکل آئے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے یہاں تک کہ باپ نے بیٹوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ بھائی بھائی کو پہچان نہ سکا۔ لوگوں میں شدید وبا پھیل گئی اور اس طرح وہ بھی اس راہ پر چل بسے جس پر مقتولین گئے تھے۔" وغیرہ وغیرہ

یہ ایک تاریخی واقعہ کی صورت حالات تھی کہ جب مشرکین مسلمانوں پر غالب آ گئے تو انہوں نے کسی رشتہ داری اور کسی معاہدے کا کوئی خیال نہ رکھا اور کسی ذمہ داری کا کوئی ثبوت نہ دیا۔ تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ ماضی بعید کی ایک تاریخی صورت حالات تھی اور اس کا ارتکاب مشرکین میں سے صرف تاتاریوں نے کیا۔ اور ان کا خاصہ تھا؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جدید دور کے واقعات بھی اپنے خدوخال کے لحاظ سے اس سے مختلف نہیں ہیں۔ جب تشکیل پاکستان کے وقت مسلمانوں کا علاقہ ہند سے علیحدہ ہوا تو اس وقت کے دلدوز واقعات کسی طرح بھی تباہی بغداد کے واقعات سے کم نہ تھے۔ اس موقعہ پر آٹھ ملین مسلمانوں نے ہجرت کی۔ ہندوستان کے اطراف و اکناف میں وہاں بسنے والے مسلمانوں پر حملے کئے گئے۔ اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ پاکستان کی طرف ہجرت کر جائیں۔ ان میں سے صرف تین ملین لوگ پاکستان پہنچ سکے اور باقی پانچ ملین کو راستے ہی میں تہ تیغ کر دیا گیا۔ ان پناہ گیروں اور راہ گیر پر حکومت ہند کو معلوم ہندو دستوں نے حملے کئے اور یہ دستے حکومت ہند کے اکابرین کے زیر نگرانی یہ قتل عام کرتے رہے۔ ہجرت کے اس پورے راستے میں ان مسلمانوں کو مویشیوں کی طرح ذبح کیا گیا اور ان کے جسموں کو کھلے پرندوں کے لئے چھوڑ دیا گیا جبکہ قتل کے بعد ان پر بدترین تشدد کیا گیا اور ان لوگوں پر جو مظالم ڈھائے وہ تاتاریوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ اس سے بڑھ کر مظالم اس وقت ہوئے جب ایک ریل گاڑی پر ہوئے جو ہندوستان سے مسلمان مہاجر ملازمین کو لے کر پاکستان جا رہی تھی۔ یہ لیاقت نہرو معاہدے کے تحت ان ملازمین کو لے جا رہی تھی جنہوں نے پاکستان جانا پسند کیا تھا۔ اس گاڑی پر پچاس ہزار افراد سوار تھے۔ اور جب یہ گاڑی بعض حدود (پنجاب کے علاقے) تک پہنچی تو تجربہ کار ہندو سکھ دستے اس پر حملہ آور ہوئے اور جب وہ پاکستان پہنچی تو اس کے اندر لاشوں اور کٹے ہوئے اعضاء کے سوا کچھ نہ تھا۔ اللہ نے کیا خوب کہا ہے کَیْفَ وَاِنْ یَّظْهَرُوْا عَلَیْكُمْ لَا یَرْقُبُوْا فِیْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) "یہ کیسے ہو سکتا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جب غالب ہو جائیں تو وہ تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری اور ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہ رکھیں۔" مختلف انداز میں مطابق اور مختلف صورتوں میں یہ قتل عام ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس زمانے میں فسادات پنجاب اس کی واضح مثال تھے۔

اس کے بعد تاتاریوں کے خلفاء نے کمیونسٹ روس اور کمیونسٹ چین میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا انہوں نے

نے ان علاقوں میں صرف پچیس سال کے عرصے میں ۲۶ ملین مسلمانوں کو نیست و نابود کیا۔ گویا وہ ایک سال میں دس لاکھ مسلمانوں کو قتل کرتے رہے۔ اور یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔ اور مظالم و تشدد کے وہ واقعات اس کے علاوہ ہیں جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں چین میں اس قسم کے واقعات رونما ہوئے جن کے سامنے تاتاریوں کے مظالم بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے ایک لیڈر کو پکڑ کر لایا گیا۔ شارع عام پر ایک گڑھا کھودا گیا اور مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ انسانی غلاظت کو ٹوکریوں میں لے کر آئیں۔ ان علاقوں میں یہ رواج ہے کہ کھاد بنانے کے لئے لوگوں سے غلاظت اور کوڑا کرکٹ جمع کرایا جاتا ہے۔ و س کے بدلے ان کو روٹی دی جاتی ہے تاکہ اس سے کھاد تیار کی جا سکے۔ غرض ان لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ یہ غلاظت اس مسلم لیڈر پر پھینکیں۔ یہ عمل تین دن تک جاری رہا یہاں تک کہ اس طرح اس کی موت واقع ہو گئی۔

کمیونسٹ یوگوسلاویہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا اور جب دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں کمیونسٹ نظام جاری ہوا تو کئی ملین مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض مقامات پر مسلمان مردوں اور عورتوں کو قیمہ بنانے کے کارخانوں میں پھینکا گیا تاکہ دوسری جانب سے ہڈیاں اور گوشت برآمد ہو اور یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔

یوگوسلاویہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، مسلمانوں کے خلاف تمام اشتراکی ممالک میں یہ عمل رات دن جاری ہے۔ ابھی تک اور اس دور جدید میں یہ ہو رہا ہے۔ اور اس سے باری تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ مومنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) ”یہ کیسے ہو سکتا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جب غالب ہو جائیں تو وہ تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری اور ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہ رکھیں۔“ اور لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) ”وہ کسی مومن کے معاملے میں رشتہ داری اور ذمہ داری کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے۔“ جزیرۃ العرب میں یہ نہ تو کوئی وقتی صورت حالات تھی اور نہ عارضی۔ نہ بغداد میں یہ کوئی وقتی حادثہ یا حالت تھی۔ یہ ایک دائمی اور مستقل طرز عمل ہے۔ جب بھی اہل شرک کسی مومن پر قابو پائیں ایسا مومن جو صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرتا ہو تو ان کا طرز عمل اس مومن کے ساتھ یہی ہوتا ہے، ہر جگہ اور ہر زمانے میں۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ؀ ۲ ع۱۰

"کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا ۸
تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ ان سے لڑو' اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا' توبہ کی توفیق بھی دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔ کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا' جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے۔"

آیات کا یہ حصہ اس لئے نازل ہوا؟ کہ پہلے ٹکڑے میں اصولاً اس بات کا انکار کر دیا گیا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مشرکین اور اللہ و رسول کے درمیان کوئی عہد باقی رہ سکے اور یہ کہ اب جزیرۃ العرب میں مشرکین یا تو اسلام میں صحیح طرح داخل ہو جائیں اور یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں' ماسوائے اس شخص کے جو فہم قرآن و سنت کے لئے اسلامی مملکت میں پناہ لے تو اس کی حفاظت کی جائے گی اور پھر اسے دارالاسلام کے باہر اس کی جائے سکونت تک امن و امان کے ساتھ بحفاظت پہنچایا جائے گا اور یہ عمل اس لئے ہوا کہ یہ لوگ مومنین کے بارے میں کسی رشتے داری اور معاہدے کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ جب بھی ان کو غلبہ حاصل ہو۔

تو یہ پیراگراف اس لئے آیا ہے کہ اس وقت اسلامی سوسائٹی میں مختلف سطح کے لوگ تھے اور بعض لوگوں کے دلوں میں یہ کھٹک تھی کہ وہ اس قدر فیصلہ کن اور سخت اقدام کیوں کریں۔ اس نکتے کے بارے میں ہم اس سے قبل تفصیل سے بحث کر آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش تھی اور وہ یہ امید بھی رکھتے تھے کہ شاید بقیہ مشرکین بھی اسلام قبول کر لیں گے اور شاید یہ قتال اور سختی ضروری نہ ہو۔ اس کے علاوہ دوسری مصلحتیں بھی ان کے پیش نظر ہوں گی اور وہ یہ ہی سمجھتے ہیں کہ آسان راستہ کیوں اختیار نہ کیا جائے۔

ان آیات میں انہی تصورات' اندیشوں اور وجوہات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ماضی قریب و بعید کے واقعات سامنے لاکر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے اور مسلمانوں کے دلوں کو صاف کیا گیا ہے اور سمجھایا گیا ہے کہ جب مشرکین کے ساتھ معاہدے کئے گئے تو ان کا حشر کیا ہوا۔ جو قسمیں وہ کھاتے تھے وہ کس قدر کچی تھیں پھر رسول اللہ کو انہوں نے کس بے دردی کے ساتھ ملک بدر کیا۔ ت آپ کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ پھر مدینہ پر پہلے انہوں ہی نے چڑھائی کی۔ اس کے بعد ان کو شرم دلائی گئی ہے اور ان کی خودی کو جگایا گیا اور پوچھا گیا کہ تم ان لوگوں سے ڈرتے ہو۔ اگر تم مومن ہو تو صرف اللہ سے ڈرو۔ اس کے بعد ان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جنگ کرو شاید اللہ کو منظور یہ ہو کہ وہ تمہارے ہاتھوں ان کو عذاب دینا چاہتا ہے۔ یوں تمہیں دست قدرت کا آلہ بننے کا اعزاز حاصل ہو گا۔ اور تمہارے ذریعے اللہ اپنے دشمنوں کو ذلیل کرے گا۔ اور وہ ذلت اور اللہ کے قہر کے مستحق بنیں گے۔ اور ان مومنین کے دل خوش ہوں گے جن کو اللہ کے راستے میں اذیت دی گئی۔ اس کے بعد ان لوگوں کی تمناؤں کو غلط بتایا جاتا ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ

شاید بغیر قتال کے یہ لوگ دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی پالیسی یہ ہے کہ وہ انہیں شکست دلا کر اور ذلیل کر کے اسلام میں داخل کرائے۔ شکست کی صورت میں جس کے مقدر میں لکھا ہوا ہو وہ توبہ کر لے گا اور غالب اسلام کے سامنے سرنگوں ہو گا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ اپنی اس سنت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی نیک جماعتوں کو ایسی آزمائشوں میں ڈالتا رہتا ہے اور سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۹: ۱۳) "کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔"

مسلمانوں اور مشرکین کے تعلقات کی تاریخ میں دو الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے' ایمان سے روگردانی اور معاہدوں کی خلاف ورزی۔ اور زیر بحث آیات کے وقت قریب ترین مثال صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الہام ربانی اور ہدایت ربانی کے تحت اس صلح کو مشرکین کے شرائط کے مطابق تسلیم کیا تھا۔ اور جسے بعض مقتدر اصحاب رسول اللہ نے نہایت ہی ذلت آمیز شرائط قرار دیا تھا۔ اور اس میں مشرکین نے جو سخت شرائط عائد کی تھیں حضور صلعم نے ان کی سختی سے پابندی کی اور نہایت ہی شریفانہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ لیکن خود انہوں نے اس صلح کی مخالفت کی۔ اور صرف دو سال کے بعد ہی اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ پھر یہ مشرکین ہی تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر سے نکالا اور ہجرت سے پہلے مکہ میں انہوں نے آپ کے قتل کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ انہوں نے بیت الحرام میں کیا جہاں قاتل کو بھی پناہ ملتی تھی۔ اور جہاں قاتل کا خون اور مال بھی محفوظ ہوتے تھے اور یہ قانون اس قدر محترم تھا کہ ایک شخص بیت الحرام میں اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کو پاتا لیکن وہ اسے وہاں کوئی گزند نہ پہنچاتا۔ رسول اللہ کا جرم کیا تھا۔ آپ تو لوگوں کو دعوت ایمان دیتے تھے کہ اللہ وحدہ کی بندگی کرو لیکن انہوں نے بیت اللہ کا بھی کوئی احترام نہ کیا۔ انہوں نے رسول اللہ کو وہاں سے نکالنے کی سعی کی۔ پھر آپ کے قتل کی سازش کی اور یہ حرکت انہوں نے بے دھڑک اور بغیر کسی جھجک کے کی۔ پھر انہوں نے مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے۔ انہوں نے ابوجہل کی سرکردگی میں یہ فیصلہ کیا کہ رسول اللہ سے جنگ ضرور کریں گے چاہے ہمارا قافلہ بچ کر نکل گیا ہے۔ پھر جنگ احد اور جنگ خندق میں تو واضح طور پر جارح تھے پھر حنین میں بھی وہ پوری طرح جنگ کے لئے تیار ہو گئے تھے اور نزول آیات کے وقت یہ سب تازہ واقعات تھے جو ان کی یادوں کا حصہ تھے۔ اور ان سب واقعات میں اس رویہ کی تصدیق تھی جو قرآن نے بیان کیا۔ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (۲: ۲۱۷) "اور وہ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے پھر دیں اگر وہ ایسا کر سکیں۔" اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو محاذ صرف اللہ وحدہ کی غلامی کرتا ہے اور جو اللہ کے سوا کئی اور الٰہوں کی بندگی اور شرک کرتا ہے ان دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت ہمیشہ کیا رہی ہے؟

واقعات اور تلخ یادوں کی اس فہرست کو نہایت ہی اختصار اور سرعت اور نہایت ہی موثر انداز کے ساتھ پیش کرنے

کے بعد اللہ تعالیٰ آخر میں ان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں اتخشونھم کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم مشرکین کے خلاف جنگ اور جہاد نہیں شروع کرتے تو تمہارا یہ بیٹھا رہنا بغیر خوف اور کسی وجہ سے تو ہو نہیں سکتا۔ اور اس کے بعد اس سوالیہ فقرے کا جواب خود ہی دے دیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے لئے نہایت ہی حوصلہ افزا ہے۔ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹: ۱۳) "حالانکہ اللہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔" مومن ہوتا ہی وہ ہے جو بندوں سے نہیں ڈرتا لہذا مومن وہی ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ تو یہ لوگ اگر مشرکین سے ڈرتے ہیں تو اللہ سے انہیں بہت زیادہ ڈرنا چاہئے۔ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ لوگ اس سے ڈریں اور اللہ کے سوا کسی اور کا کوئی ڈر کم از کم مومنین کے دل میں نہیں ہونا چاہئے۔

غرض مسلمانوں کے اسلامی شعور کو جگایا جاتا ہے اور ان واقعات اور ان کی یادوں کو تازہ کر کے ان کے اندر جوش پیدا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ یہ مشرکین وہی ہیں جنھوں نے ذات نبی کے خلاف سازش کی۔ پھر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاہدے بھی کیے انہیں توڑا اور جب بھی مسلمانوں کو غافل پایا یا ان کی صفوں کے اندر کوئی سوراخ دیکھا۔ انہوں نے وار کرنے کی کوشش کی۔ پھر انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کرنے اور جارحیت کرنے میں پہل کی۔ اور چنانچہ ان وجوہات اور اسباب کی بنا پر مسلمانوں کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے خلاف جنگی کارروائی کریں۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۴) وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ------ (۹: ۱۴ — ۱۵) "ان سے لڑو' اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا۔"

تم ان کے ساتھ جنگ کرو' تم دست قدرت کے لئے پردہ بنو گے اور اللہ کی مشیئت کی صورت بنو گے۔ اس طرح تمہارے ہاتھوں اللہ ان پر عذاب نازل کرے گا۔ ان کو ہزیمت دے کر ذلیل کرے گا جبکہ وہ اپنے آپ کو نہایت ہی قوی سمجھتے ہوں گے لیکن اللہ ان کے مقابلے میں تمہاری نصرت کرے گا' تمہارے دلوں کو شفا دے گا کیونکہ اہل ایمان کو انہوں نے بہت ہی اذیتیں دی تھیں اور مسلمانوں کے دلوں میں وہ غیظ و غضب ابھی تک موجود تھا۔ اس طرح کفار و مشرکین کی شکست سے ان کے دل ہلکے ہو جائیں گے کیونکہ مشرکین نے ان کو اذیت دی گھروں سے نکالا۔ صرف یہی نہیں' بلکہ اس سے بڑا انعام ان کے انتظار میں ہے۔

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹: ۱۵)
"اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق بھی دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔" مسلمانوں کی فتح کے نتیجے میں کئی لوگوں کے دل اسلام کی طرف مائل ہو سکتے ہیں اور ان کی بصیرت انہیں اس طرف لا سکتی ہے کہ مستقبل اسلام کا ہے کیونکہ مسلمانوں کو فتح نصیب ہو رہی ہے اور ظاہر ہے کہ انسانوں کی قوت سے اوپر کوئی اور قوت ہے جو مسلمانوں کی تائید میں ہے اور عملاً ایسا بھی ہوا کہ بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے اور اسی طرح مجاہدین کو دو

اجر ملے۔ ایک اجر ان کے جہاد فی سبیل اللہ کا اور دوسرا اجر ان گمراہ لوگوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا اور گمراہوں کو ہدایت دینے کا جو جہاد کی وجہ سے ہوا اور ان لوگوں سے اسلام کی افرادی اور جنگی قوت میں اضافہ ہوا۔

کہا گیا کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ ان اقدامات کے اچھے نتائج کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ حکیم ہے وہ جن اقدامات کا حکم دیتا ہے وہ گہری حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

اسلام جب زوردار شکل میں سامنے آتا ہے تو وہ زیادہ پرکشش ہوتا ہے' اس اسلام کے مقابلے میں جس کی قوت لوگوں کو معلوم نہ ہو یا وہ ضعیف و ناتواں نظر آئے لیکن اسلامی جماعت جب قوت اور زور سے سامنے آئے اور وہ اپنے نظریہ و عمل پر سختی سے جمی ہو تو تحریک اسلامی کا نصف راستہ خود بخود طے ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جو مکہ مکرمہ میں اسلامی جماعت کی تربیت اور نگرانی کر رہا تھا' وہاں اس نے جماعت مسلمہ کے ساتھ صرف جنت کا وعدہ کیا تھا' جبکہ مکہ میں جماعت قلیل تھی اور اس میں ضعیف لوگ تھے اور یہاں مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی ہدایت تھی وہ یہ کہ صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑو اور جب جماعت نے کماحقہ صبر کیا اور صرف جنت کی طلبگار بن گئی تو اللہ نے اسے نصرت عطا کی اور وہ فاتح ہو گئی تو اللہ نے اسے سیاسی غلبے اور جہاد کے لئے ابھارا' اس لئے کہ یہ سیاسی غلبہ اس جماعت کا غلبہ نہ تھا بلکہ اللہ کے دین کا غلبہ تھا اور اس کی وجہ سے اللہ کا کلمہ بلند ہو رہا تھا۔

اس وقت صورت حال بھی ایسی تھی کہ اس میں مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ تمام مشرکین کے خلاف جنگ کریں اور مشرکین کے تمام معاہدوں کو منسوخ کر دیں اور ان کے مقابلے میں صف واحد بن کر کھڑے ہو جائیں۔ اور یہ اس لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے خلاف پائے جانے والے خفیہ پیکٹ ختم ہو جائیں اور جن لوگوں کی نیت میں فتور تھا وہ کھل کر سامنے آ جائیں اور وہ پردے دور کر دیئے جائیں جن کے پیچھے منافق لوگ کھڑے ہو کر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے تھے اور ان کاروباری عذرات کو ختم کر دیا جائے جو بعض لوگ کاروبار کے بہانے سے تعلق رکھنے کے سلسلے میں کرتے تھے اور ان تعلقات کو بھی ختم کر دیا جائے جو رشتہ داری اور قرابت داری کے عنوان سے بعض لوگوں کے ساتھ قائم رکھے ہوئے تھے۔ ان پردوں کو گرانا ضروری تھا اور ان عذرات کو یکسر ختم کر دینا ضروری تھا۔ اس لئے اس قسم کے تمام لوگوں کے ساتھ تعلقات ختم کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ ان لوگوں کا انکشاف ہو جائے جن کے دلوں میں کوئی خباثت خفیہ تھی اور جو اللہ اور رسول اللہ کے سوا اور لوگوں کو بھی دوست بنا رہے تھے اور ان عذرات کے نتیجے میں وہ مخالف اسلام کیمپ کے لوگوں کے ساتھ روابط رکھے ہوئے تھے اور ان روابط کی نوعیت واضح نہ تھی' بلکہ مشکوک تھی اس لئے یہ حکم دیا گیا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۹:۱۶) "کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا' جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے۔"

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا' جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے۔"

جیسا کہ بالعموم ہوا کرتا ہے' اسلامی معاشرے میں بھی ایسے لوگ تھے جو چلتے پھرتے تھے' جو حدود سے آگے نکلتے تھے اور ان کے پاس بہت زیادہ عذرات ہوتے تھے' وہ جماعت کے علم و مشورہ کے بغیر اس کے دشمنوں سے بھی ملتے تھے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرتے تھے اگرچہ اس میں اسلامی تحریک کا نقصان ہو۔ اور یہ لوگ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان پائے جانے والے تعلقات سے فائدہ اٹھاتے تھے کیونکہ ابھی تک مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مکمل قطع تعلق نہ ہوا تھا لیکن جب واضح طور پر اعلان کر دیا گیا کہ اب مشرکین عرب کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو گا اور اب رابطے کٹ گئے ہیں' اب ایسے لوگوں کے لئے کوئی بہانہ نہ رہا اور ان کی خفیہ ریشہ دوانیاں سامنے آ گئیں۔

اسلامی جماعت اور اسلامی نظریہ حیات کے مفاد میں یہ بات ہے کہ پردے اٹھ جائیں اور تعلقات بالکل علی الاعلان ہوں اور چور دروازے ختم کر دیئے جائیں تاکہ مخلص جدوجہد کرنے والوں اور ہر طرف پھرنے پھرانے والوں کے درمیان اچھی طرح امتیاز ہو جائے اور دونوں کیمپوں کے لوگ اچھی طرح معلوم اور معروف ہو جائیں اور ان کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو جائے اگرچہ اللہ تو علیم و خبیر ہے۔ اسے تو پہلے سے معلوم ہے کہ کون کیا ہے' لیکن اللہ لوگوں کو تب پکڑتا ہے جب ان کی حقیقت تمام دیکھنے والوں پر واضح ہو جائے۔ یہی ہے سنت الہیہ کہ اللہ تعالیٰ کھرے اور کھوٹے کو جدا کرنے کے لئے دونوں کے درمیان اچھی طرح امتیاز کر دیتا ہے اور کھرے اور کھوٹے کا امتیاز اس طرح ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو مصائب و شدائد میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ
خٰلِدُوْنَ ﴿١٧﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا
مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿١٨﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ
عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ

جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝۲۱ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝۲۲

"مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں در آں حالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانیں' اور نماز قائم کریں' زکوۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لئے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔"

اعلان براءت کے بعد کسی کے لئے اب کوئی حجت باقی نہ رہی کہ کیوں وہ مشرکین کے ساتھ نہ لڑے۔ اب لوگوں کے ذہن میں یہ خلجان بھی نہ رہے کہ مشرکین زیارت حرم سے محروم ہوں گے الا یہ کہ وہ اب مسجد حرام کی عمارت میں حصہ نہ لے سکیں گے جبکہ جاہلیت میں یہ مشرکین ان کاموں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کہ مشرکین کا حق ہی نہیں ہے کہ وہ مسجدیں تعمیر کریں۔ یہ صرف اہل ایمان کا حق ہے کہ وہ مساجد تعمیر کریں اور ان میں فرائض دینی ادا کریں۔ دور جاہلیت میں تو وہ یہ کام کرتے تھے۔ مسجد حرام کی تعمیر اور حاجیوں کو پانی پلانے کا تو اب اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ان آیات میں ان خلجانات کو رفع کیا گیا ہے جو بعض مسلمانوں کے دلوں میں تھیں کہ اسی اصول نے ایک نیک کام سے لوگوں کو روک دیا ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (۹ : ۱۷) "مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور و خادم بنیں در آں حالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔"

یہ نہایت ہی مکروہ امر ہے اور اصول فطرت سے متضاد ہے کہ مشرکین مساجد کی تعمیر میں حصہ لیں۔ مساجد تو صرف ذکر الٰہی کے لئے ہوتی ہیں اور اللہ کے سوا ان میں کسی اور کا نام نہیں لیا جاتا۔ لہٰذا تعمیر مساجد میں وہ لوگ کیسے حصہ لے

سکتے ہیں جن کے دل میں توحید ہی نہ ہو اور وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہوں۔ پھر ان کی زندگی بھی شہادت حق کے بجائے شہادت کفر دے رہی ہو اور زندگی کی عملی شہادت ایسی شہادت ہوتی ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کا تو اقرار ہی کرنا پڑتا ہے۔

أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ (۹:۱۷) "ان کے تو سارے اعمال ضائع ہو گئے اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔" ان کے تو سب اعمال باطل ہیں۔ تعمیر مساجد پر بھی ان کو کوئی اجر ملنے والا نہیں ہے 'کیونکہ انہوں نے عقیدۂ توحید قبول کرنے کے بجائے کفر و شرک کو اختیار کیا ہے۔

عبادات و اعمال میں سے معتبر وہ ہوتے ہیں جو عقائد صحیحہ پر مبنی ہوں۔ اگر عقیدہ ہی ٹھیک نہ ہو تو اعمال کیسے ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جب تک ایمان و عقیدہ درست نہ ہو گا مسجد حرام کی تعمیر اور اس میں مراسم عبودیت بجالانا کوئی معنی نہیں رکھتے۔ لہٰذا اعمال کو خالص عقیدۂ توحید پر مبنی ہونا چاہئے اور یہ اعمال خالص اللہ کے لئے ہونے ضروری ہیں 'تب قبول ہوں گے۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ (۹:۱۸) "اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و غلام) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانیں 'اور نماز قائم کریں 'زکوۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔

یہاں دو شرائط 'یعنی ایمان باللہ جو باطنی صفت ہے اور اعمال ظاہریہ کے ساتھ ایک شرط یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی چیز سے خائف نہ ہو 'لازمی شرط ہے۔ یہ نفلی شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے لئے خالص ہونا لازمی ہے۔ اور انسان کے شعور 'اس کے طرز عمل میں شرک کا شائبہ تک نہ ہونا چاہئے۔ غیر اللہ سے ڈرنا بھی دراصل شرک خفی کا ایک رنگ ہے۔ اور یہاں قصداً اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ شعور و اعتقاد اور عمل اور سلوک میں انسان مکمل طور پر خالص اور پاک وصاف ہو۔ اس خلوص کے بعد اب مومن اس بات کا مستحق ہو جاتا ہے کہ وہ مساجد کی دیکھ بھال اور تعمیر کرے اور ایسے ہی لوگ ہدایت کی امید کر سکتے ہیں۔

فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ (۹:۱۸) "انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔" اسی لئے کہ قلب متوجہ ہوتا ہے 'تب اعضاء عمل کرتے ہیں اور یہ سب کچھ تب ہو سکتا ہے کہ اللہ راضی ہو' اللہ کی مشیئت ہو تو توجہ بھی ہو گی اعمال بھی ہوں گے اور ہدایت و کامیابی بھی ہو گی۔

یہ ہے اصول تعمیر مساجد کا اور یہ ہے اصل ذریعہ عبادات اور مراسم کی درستگی کا۔ اور مسلمانوں اور مشرکوں دونوں کے سامنے یہ اصول رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو جاہلیت میں خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے تھے اور اس میں حاجیوں کو پانی پلاتے تھے 'لیکن ان کے عقائد خالص نہ تھے اور انہوں نے نیک اعمال اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ بھی نہیں لیا اور وہ لوگ جنہوں نے بیت اللہ کی تعمیر میں حصہ لیا اور جن کا ایمان صحیح کیا اور اس صحیح ایمان پر انہوں نے اچھے اعمال بھی کئے اور

اللہ کی راہ میں جہاد بھی کیا باہم برابر نہیں ہو سکتے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

وَجٰهَدَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ (۹ : ۱۹) "کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرالیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔"

بے شک برابر نہیں، کیونکہ اللہ کے میزان اور پیمانوں کے مطابق نہیں اور پیمانے اور اقدار تو اللہ ہی کی ہوتی ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۹ : ۱۹) "اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔" وہ مشرک جو دین حق کو قبول نہیں کرتے اور جو اپنے عقائد کو شرک سے پاک نہیں کرتے۔ اگرچہ وہ بیت اللہ کے معمار ہوں اور حاجیوں کے ساقی و خادم ہوں۔

یہ مضمون اب اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ مومنین، مہاجرین اور مجاہدین بلند مرتبہ لوگ ہیں۔ اللہ کی رحمت اور رضامندی ان کے انتظار میں ہے اور ان کے لئے جنت میں نعیم مقیم ہے۔ اور اس کے علاوہ اجر عظیم بھی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ

دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰) يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ

وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ (۲۱) خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ

عَظِيْمٌ (۲۲) (۹ : ۲۰ تا ۲۲) "اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا، وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لئے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔

یہاں افضل تفضیل کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اَعْظَمُ دَرَجَةً اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے لوگوں کے درجے اسفل ہیں بلکہ اس سے مطلق فضیلت مراد ہے کیونکہ ان لوگوں کے بالمقابل وہ لوگ جن کے اعمال اکارت گئے اور جہنم میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے درمیان اعمال و درجات کا کوئی تناسب نہیں ہے۔ ایک طرف کافر ہیں اور دوسری جانب مومنین مہاجرین اور مجاہدین ہیں جو اعلیٰ درجوں میں اور دائمی نعمتوں میں ہوں گے۔

---○○○---

اب اگلی آیات میں مسلمانوں کی سوچوں، شعور اور باہمی روابط کو پاک و صاف کر دیا جاتا ہے اس طرح کہ وہ دین

رب العالمین کے لئے یکسو ہو جائیں چنانچہ تمام رشتہ داریوں کی محبت' ہر قسم کے مفادات اور تمام انسانی لذات اور خوشیوں کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جاتا ہے اور اللہ' رسول اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کو دوسرے پلڑے میں رکھا جاتا ہے اور مسلمانوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اب جو چاہیں' پسند کر لیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا
الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ
اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ
اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ ۳
ع ۸

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں ۹
سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ اے نبی صلعم' کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور
تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ
کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے' اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' تم کو اللہ اور اس کے رسول صلعم اور
اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے' اور اللہ فاسق
لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔"

اسلامی نظریہ حیات بھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ قلب مومن میں کوئی شریک ہو' یا تو ہم اپنے دل میں صرف اسلامی نظریہ حیات کو جگہ دیں گے اور یا پھر ہم اسے ترک کر کے دوسری محبتوں کو دل میں جگہ دیں گے۔ لیکن یہاں مطلوب یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمان اپنے اہل و عیال' اپنے خاندان' اپنی بیوی خاوند' اپنے مال و اولاد' اپنے کاروبار و سامان اور دنیاوی لذتوں سے قطع تعلق کر لے اور وہ رہبان اور تارک الدنیا بن جائے' یہ ہرگز نہیں ہے' لیکن اسلامی نظریہ حیات کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اسلام کو عزیز و محبوب رکھے' اس کے دل اور اس کی سوچ پر فکر انقلاب اسلامی غالب ہو۔ یہ نظریہ اس کے لئے محرک اور حقیقی نصب العین بن جائے۔ اگر یہ صورت حال حاصل ہو جائے تو پھر ایسا مومن دنیا کی تمام سرگرمیوں میں شریک ہو سکتا ہے لیکن معیار یہ ہے کہ جب اسلامی انقلاب کا تقاضا ہو تو وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ کر اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔

ان دو پوزیشنوں میں کیا لائن ہے' جو فرق و امتیاز کرتی ہے؟ یہ کہ آپ کے دل و دماغ اور زندگی پر نظریہ چھایا ہوا ہے یا دنیا کا سازوسامان۔ آپ کا پہلا نعرہ اور پہلی گفتگو اسلام کے لئے ہے یا اس دنیا کے اغراض و مطالبات میں سے کسی

غرض کے لئے ہے۔جب ایک مومن مطمئن ہو جائے کہ اس کا دل اور اس کی سوچ پر اسلامی نظریہ حیات چھا گیا ہے تو اس کے بعد اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔اگر وہ بچوں' بھائیوں' بیوی خاوند' خاندان اور مال و دولت اور سازوسامان سے لطف اندوز ہو اور زندگی کے تمام کاروبار میں شریک ہو' وہ زیب و زینت بھی اختیار کر سکتا ہے اور اچھا کھا پی بھی سکتا ہے' بغیر اسراف کے اور بغیر تکبر کے۔بلکہ ایسے حالات اور ایسے تصورات کے درمیان اس کے لئے یہ تلذذ اور متاع کا استعمال مستحب ہے۔اس طرح کہ یہ بھی شکر الٰہی کا ایک رنگ ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو یوں بھی نوازتا ہے جبکہ ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ رازق منعم اور وہاب ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (۹:۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ' اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔"

یوں خالص خون اور نسب کے رابطوں کو توڑ دیا جاتا ہے۔اگر ایسے افراد کے درمیان نظریاتی روابط ٹوٹ جاتے ہیں' اگر اللہ کی قرابت داری ختم ہو جائے تو خاندانی رشتے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔اصل دوستی اللہ کی ہے اور اللہ ہی کے نام پر پوری انسانیت جمع ہو سکتی ہے اور اگر نظریاتی اتحاد نہ ہو تو تمام اتحاد اور رابطے ٹوٹ جاتے ہیں۔رسی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹:۲۳) "تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔" یہاں ظالمون سے مراد ہے مشرکون۔اگر قوم اور خاندان ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کرتا ہو تو اس قوم اور خاندان کی دوستی کرنا کفر اور شرک ہے۔یہ صورت حال ایمان کی کیفیات کے ساتھ لگا نہیں کھاتی۔

یہاں سیاق کلام میں یہ نہیں کہا گیا کہ اس اصول کو بیان کر دیا جائے بلکہ محبتوں کی مثالیں اور رنگ بھی بتا دیئے جاتے ہیں۔کون سے تعلقات' کون سے روابط اور اور کون سے لذائذ ایمان کے خلاف ہوں گے تاکہ انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ایمان اور اسلام کے تقاضوں کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر مشخص اور ممثل انداز میں بتایا جائے۔مثلاً اباء' ابناء' اخوان' میاں بیوی اور خاندان یعنی عام خون اور نسب کے رشتے اور قرابت داریاں اور اموال تجارت جن کے ساتھ فطری رغبت ہوتی ہے اور مکانات اور کوٹھیاں جہاں آرام کیا جاتا ہے اور زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے ان سب کو ایک پلڑے میں رکھ کر اور حب خدا' حب رسول اور جہاد کی دلچسپیوں کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر دعوت انتخاب دی جاتی ہے یہاں جہاد کے معنی اس قدر سادہ نہیں ہیں۔جہاد میں مشقتیں ہوتی ہیں اور اس کے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔اس میں مشکلات اور واماندگیاں ہوتی ہیں' اس میں تنگی اور ترشی ہوتی ہے اس میں قربانیاں اور محرومیاں بھی ہوتی ہیں اور اس میں زخم بھی کھائے جاتے ہیں اور جان بھی دینی ہوتی ہے۔یہ سب کچھ جہاد کے لفظ میں آتا ہے اور یہ سب کچھ اس کیفیت کے ساتھ ہو کہ اس میں شہرت اور نمود و نمائش کا شائبہ تک نہ ہو' جس میں فخر و غرور اور تکبر کا شائبہ تک نہ ہو۔اس میں ملک گیری اور منصب گیری کا بھی کوئی شائبہ اور اشارہ نہ ہو۔اگر ان بیماریوں میں سے کوئی بیمار بھی ہو تو مجاہد اجر اخروی سے محروم ہو گا۔ذرا دوبارہ غور سے پڑھئے :۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (۹: ۲۴) "اے نبی صلعم 'کہ دو کہ اگر تمہارے باپ 'اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے 'اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' تم کو اللہ اور اس کے رسول صلعم اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔"

خبردار! یہ نہایت ہی مشقت آمیز راہ ہے' یہ نہایت ہی عظیم ذمہ داری ہے! لیکن بات یہی ہے' اگر یہ ذمہ داری پوری نہ کرو گے تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے۔" اور وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۹: ۲۴) "اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔" صرف ایک فرد ہی سے مطالبہ نہیں ہے کہ وہ اس قدر خلوص کا مظاہرہ کرے۔ پوری جماعت مسلمہ سے اس قسم کے خلوص کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ اسلامی مملکت کو بھی اسی طرح مخلص ہونا چاہئے۔ اس لئے اسلامی معاشرے میں کوئی ترجیح اور کوئی نصب العین اسلامی نظریہ حیات اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقتضیات سے اہم نہیں ہونا چاہئے۔

کیا فطرت انسانی اس معیار پر جا سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ نے جب اہل ایمان سے اس معیار کا تقاضا کیا ہے تو ایسا معیار پیش کرنا ممکن ہے تبھی تو کیا ہے۔ کیونکہ اللہ کسی بھی نفس سے وہ مطالبہ نہیں فرماتے جو اس کے دائرہ طاقت میں نہ ہو۔ یہ اللہ کی نہایت کریمی ہے کہ اس نے اس ضعیف انسان کے اندر اس قدر صلاحیت اور طاقت رکھی ہے کہ وہ اس قدر مخلصانہ معیار پیش کرے اور اس قدر مشکلات برداشت کرے اور اس کو اس شعور اور خلوص کے اندر اس قدر لذت دی ہے کہ وہ اس کے لئے تمام لذات ارضی کو خیر آباد کہہ سکتا ہے۔ خدا کے ساتھ اتصال اور خدا رسیدگی کا شعور۔ اللہ کی رضا کے حصول کا شعور۔ انسان کو انسانی ضعف گراوٹ اور خون اور گوشت و پوست کی لذتوں سے بلند کر دیتا ہے اور اس کی نظر دور افق پر کسی بلند مقام پر مرکوز ہوتی ہے۔ جب بھی اس دنیا کی سفلی لذات اس کا دامن کھینچتی ہیں تو وہ نظریں بلند افق پر ایک روشن نصب العین پر مرکوز کر دیتا ہے اور اس طرح وہ دامن چھڑا لیتا ہے۔

---ooo---

اب ذرا ماضی قریب کی یادوں کی ایک جھلکی ملاحظہ فرمائیں۔ مسلمان قریب ہی کے زمانے میں ان حالات سے ہو کر گزرے تھے۔ ان حالات میں اللہ کی خاص نصرت نے کرشمہ دکھایا تھا۔ یہ کرشمہ ان کی قوت اور تعداد کا نہ تھا۔ حنین کے دن تو وہ بڑی تعداد میں تھے اور بڑی قوت رکھتے تھے مگر شکست کھا گئے۔ بعد میں اللہ کی نصرت جب آئی تو حالات کا نقشہ بدل گیا۔ اس دن فتح مکہ کے دو ہزار طلقاء اسلامی لشکر میں گھل مل گئے تھے۔ چند لمحے مسلمانوں پر ایسے آ گئے تھے جب وہ قوت اور کثرت کے نشے میں غافل ہو گئے تھے۔ محض تعداد اور ساز و سامان کی وجہ سے۔ یہ سبق تھا اہل ایمان کے لئے کہ

خلوص اور للہ فی اللہ جہاد کے کیا معنی ہوتے ہیں کہ جب اللہ سے رابطے ہوں تو قلت تعداد میں بھی فتح ہے لیکن اگر اعتماد سازو سامان اور غیر مخلص بڑی تعداد پر کر لیا جائے تو میدان مارنا مشکل ہو گا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ۝۲۵ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۝۲۶ ثُمَّ یَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۲۷

"اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں۔ پھر (تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے' اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بے شمار مقامات و ایام میں مسلمانوں کی نصرت کی تھی اور ان ایام کی یاد میں ان کے ذہن میں تازہ تھیں۔ حنین کی جنگ شوال آٹھ ہجری میں فتح مکہ کے بعد پیش آئی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے معاملات سے فارغ ہوئے اور فتح مکہ کے امور درست ہو گئے اور عام اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو معاف کر دیا اور اس طرح وہ "طلقاء" کے نام سے مشہور ہو گئے۔اس موقعہ پر آپ کو یہ اطلاع ملی کہ قبائل ہوازن آپ کے خلاف جنگی کاروائی کرنے والے ہیں اور ان کے امیر مالک ابن عوف نضری قبائل ثقیف بنو جشم و بنو سعد ابن بکر اور کچھ لوگ بنی ہلال اور کچھ لوگ بنی عمر ابن عامر اور عوف ابن عامر کے' اس کی تائید میں ہیں۔یہ لوگ عورتوں اور بچوں اور مال مویشی کو بھی ساتھ لائے ہیں اور سب کے سب اس لشکر میں نکل آئے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لشکر کو لے کر ان کے مقابلے میں نکلے۔یہ لشکر دس ہزار انصار و مہاجرین پر مشتمل تھا۔اور کئی عرب قبائل اس میں شریک تھے۔اور ان لوگوں میں وہ لوگ بھی تھے جو کل ہی مکہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ جنہیں طلقاء کہا جاتا تھا اور ان کی تعداد دو ہزار تھی۔ اس لشکر کو لے کر حضور دشمن کی طرف نکلے۔مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی میں ان دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔اس وادی کو وادی حنین کہا جاتا تھا۔یہ مڈ بھیڑ دن کے آغاز ہی میں صبح کی سیاہی میں ہو گئی۔ مسلمان جب اس وادی میں اترے تو آگے ہوازن کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے۔جب مسلمان وادی میں اترے تو انہیں پتہ چلا کہ ہوازن حملہ آور ہو گئے۔ انہوں نے تیروں کی بارش کر دی اور تلواریں سونت لیں اور اس طرح حملہ کیا جس طرح ایک انسان حملہ

کرتا ہے ۔ یہ یکبارگی حملہ تھا اور اس کی پلاننگ ان کے بادشاہ نے کی تھی ۔ پہلے حملے میں مسلمان بھاگ گئے جیسا کہ اللہ نے نص میں فرمایا۔ حضور صلعم شہبا خچر پر سوار تھے ۔ آپ اپنی جگہ سے نہ ہلے ۔ حضور صلعم کے خچر کا دایاں لگام حضرت عباس نے پکڑا ہوا تھا اور بائیں جانب سے ابو سفیان لگام کو تھامے ہوئے تھے ۔ یہ لوگ اس خچر کو روک رہے تھے کہ وہ جلدی دشمن کے درمیان تک نہ پہنچ جائے ۔ حضور صلعم نے اپنا نام لے کر لوگوں کو پکارا اور دعوت دی کہ لوٹ آؤ ۔ "اے لوگو میری طرف آؤ میں رسول اللہ ہوں ۔" اور ایسے ہی حالات میں آپ نے رجز پڑھا انا النبی لاکذب انا ابن عبد المطلب ۔ تقریباً سو افراد آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اسی افراد تھے ۔ ان میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، عباس، علی، فضل ابن عباس، ابو سفیان ابن الحارث، ایمن ابن ام ایمن، اسامہ بن زید وغیرہ رضی اللہ عنہم ۔ اس کے بعد حضور صلعم نے حضرت عباس سے کہا، یہ بہت بلند آواز تھے کہ بلند آواز سے پکاریں ۔ اے درخت کے نیچے بیعت رضوان کرنے والو! اس درخت کے نیچے مسلمانوں نے بیعت کی تھی کہ وہ جنگ میں فرار اختیار نہ کریں گے ۔ اس طرح اس نام سے بھی ان کو پکارا گیا، اے اصحاب سمرہ، اے اصحاب سورت بقرہ، اس طرح لوگ سنتے اور یا لبیک یا لبیک کہتے ہوئے لوٹتے ۔ چنانچہ سب لوگ واپس ہوئے اور رسول اللہ کے پاس جمع ہو گئے ۔ لوگ اس طرح لوٹے کہ اگر کسی کا اونٹ واپس نہ ہوتا تو وہ اپنی زرہ پہن کر کود پڑتا اور اونٹ کو چھوڑ دیتا ۔ اور اپنی ذات کو رسول اللہ تک پہنچاتا ۔ جن لوگوں کی ایک تعداد حضور صلعم کے پاس جمع ہو گئی تو آپ نے ان کو سچائی کے ساتھ لڑنے کا حکم دیا ۔ چنانچہ کفار کو شکست ہوئی اور وہ بھاگنے لگے ۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو قتل کیا اور گرفتار کیا اور لوگ تب واپس ہوئے کہ رسول اللہ کے سامنے قیدیوں کی ایک فوج جم گئی ۔

یہ تھی وہ جنگ جس میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے پاس ۱۲ ہزار کی ایک عظیم تعداد جمع ہو گئی تھی ۔ یہ تعداد انہیں ناقابل شکست نظر آئی ۔ وہ پہلی فتح یابیوں کی وجہ سے غافل ہو گئے ۔ اللہ کے اس معرکے کے آغاز میں ان کو شکست سے دوچار کر دیا ۔ اس طرح ان کی غفلت دور ہوئی اور اس کے بعد جب حضور صلعم کے پاس ایک نسبتاً قلیل تعداد جمع ہوئی تو اللہ نے کامیابی عطا کی کیونکہ یہ تعداد حضور کے ساتھ جم گئی تھی ۔

آیت میں اس معرکے کے بعض مناظر کو دہرایا گیا ہے اور اس کے شعوری تاثرات یہاں نقل کیے ہیں ۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (۹ : ۲۵) "اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے ۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے ۔"

پہلا تاثر یہ کہ ہم بہت زیادہ ہیں، پھر روحانی شکست کہ جب انسان پر عرصہ زمین تنگ محسوس ہونے لگتا ہے، پھر وہ مشکل وقت کہ جس میں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر ہمہ جہت دباؤ ہے ۔ پھر حسی شکست کہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے ان تمام تاثرات کے بعد یہ تاثر

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۹ : ۲۶) وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲۶) "پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی ۔" گویا سکینہ ایک چادر ہے جو آسمان سے اتری ۔ اس نے دلوں کو مضبوط کر دیا اور اس نے ان عارضی تاثرات کو ٹھنڈا کر دیا ۔

وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۹ : ۲۶) "اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے ۔" یہ کیسے لشکر تھے 'ان کی ماہیت اور طبیعت سے ہم واقف نہیں اور اللہ کی قوتوں اور افواج کو اللہ ہی جانتا ہے ۔

وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۹ : ۲۶) "اور منکرین حق کو سزا دی ۔" ان کو قتل ہونے ' لٹنے اور شکست کے ذریعے سزا دی گئی ۔ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۲۶) "کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لئے جو حق کا انکار کریں ۔"

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹ : ۲۷) "پھر (تم یہ دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے ' اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔" کیونکہ مغفرت کا دروازہ اللہ کے ہاں ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور خطا کار جس وقت چاہیں توبہ کر کے واپس آ سکتے ہیں ۔

یہاں غزوہ حنین کی اس جھلکی کو اس لئے پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ بتایا جائے کہ جو لوگ اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں اور اللہ کے بجائے دوسری قوتوں پر اعتماد کرنے لگتے ہیں اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں ۔ لیکن اس واقعہ سے ہمارے سامنے ایک دوسری ضمنی حقیقت بھی آ جاتی ہے ۔ اور یہ دوسری حقیقت یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جس پر کوئی نظریہ اعتماد کر سکتا ہے ۔ نظریاتی تحریکات میں تعدادی کثرت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ ثابت قدم اور نظریات کے جاننے والے مخلص لوگوں کی ایک چھوٹی تعداد ہی اہمیت رکھتی ہے ۔ بعض اوقات بڑی تعداد ہزیمت کا سبب بنتی ہے کیونکہ بعض وقتی قسم کے لوگ اس میں داخل ہو جاتے ہیں اور انہوں نے نظریہ حیات کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ حالات کے دھارے میں بہہ نکلے ہوتے ہیں ۔ ایسے لوگوں پر جب مشکل حالات آتے ہیں تو ان کے قدم متزلزل ہو جاتے ہیں ۔ ایسے لوگ نظریاتی صفوں میں اضطراب پیدا کر دیتے ہیں اور ہزیمت اور شکست کا باعث بنتے ہیں پھر ایک بھیڑ قیادت کے لئے بھی دھوکے کا سبب بنتی ہے ۔ اور بھیڑ میں لوگوں کا باہم مضبوط روابط اور تعلقات نہیں ہوتے نہ وہ اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق رکھتے ہیں اور یوں قیادت کو دھوکہ ہوتا ہے کہ نصرت اور کامیابی تعداد کی وجہ سے ہے ' حالانکہ راز یہ ہے کہ فتح و نصرت ' اخلاص اور تربیت کی وجہ سے ہوتی ہے ۔

ہمیشہ یوں ہوا ہے کہ مخلصین کی ایک چھوٹی سی پاکیزہ تعداد کسی نظریہ کو لے کر اٹھتی ہے ۔ عوام کی بھیڑ جو پانی پر جھاگ کی طرح ہوتی ہے کسی نظریہ کی حامل نہیں ہو سکتی اور گھاس اور کوڑا کرکٹ مشکلات کی آندھیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں ۔

جب بات یہاں تک آ پہنچی ہے اور مسلمانوں کے شعور میں قرآن تاریخ واقعات بٹھا دیئے جاتے ہیں تو اب مشرکین کے بارے میں فائنل پالیسی کو آخری الفاظ دے دیئے جاتے ہیں جو پالیسی قیامت تک رہے گی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۸﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مشرکین ناپاک ہیں' لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے' اللہ علیم و حکیم ہے۔“

مشرکین نجس عین ہیں' ان کی روح اس قدر ناپاک ہے کہ یہ ناپاکی ان کے خون اور گوشت میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ لہٰذا وہ کلیۃً نجس ہیں۔ پاکیزہ احساس ان کا تصور کرتے ہی ابا کرتا ہے۔ کراہت محسوس کرتا ہے اور پاکیزہ مزاج لوگ ان سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ معنوی نجاست ہے جو حسی نجاست سے زیادہ تیز ہے۔ ان کے اجسام نجس نہ ہوں گے یہ قرآن کریم کا نہایت ہی موثر انداز تعبیر ہے جو روحانیات کو بھی حسی بنا دیتا ہے۔ جب نجس ہیں تو پھر کیا حکم ہے؟

یاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوْا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (۹: ۲۸) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' مشرکین ناپاک ہیں' لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔“ چونکہ مسجد حرام پاک ہے اور یہ ناپاک ہیں اس لئے ان کو مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے دیا جائے۔ حکم کو ان کی شخصیت سے متعلق کر دیا گیا۔

لیکن اس اقدام کے معاشی نتائج بھی تو بھیانک تھے۔ موسم حج اور موسم تجارت آنے ہی والے تھا' جس پر ان کا سالانہ بجٹ چلتا تھا۔ جزیرۃ العرب کے اکثر لوگ اس میں تجارت کرتے تھے اور ان کی گرمیوں اور سردیوں کے سفر بھی اسی نظام پر موقوف تھے۔ اور یہ ان کی معاشی زندگی کا خلاصہ تھا۔ اگر مشرکین کو یوں یکلخت منع کر دیا جائے تو پوری زندگی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ پھر جب کفار اور مشرکین کے خلاف اعلان جنگ بھی کر دیا جائے۔

یہ سب واقعات و حقائق درست ہیں لیکن اس مسئلے کا تعلق نظریات سے ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم اس نظریے کے لئے مخلص ہو جاؤ اور قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ--- رہا رزق اور تجارتی مفادات تو اس کا کفیل کوئی نظام نہیں ہے' اللہ ہے اور اللہ ایسے اسباب کے ذریعے رزق پہنچاتا ہے جو عادی اور معروف نہیں ہوتے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ عَیْلَةً فَسَوْفَ یُغْنِیْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ

(۹: ۲۸) "اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے ' اللہ علیم و حکیم ہے۔" اللہ جب چاہتا ہے ' اسباب بدل دیتا ہے اور وہ ایک دروازہ بند کرنے دوسرے دروازے کھول دیتا ہے ' وہ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنے علم اور اپنی حکمت کی وجہ سے اور اپنے اندازے اور حساب کی وجہ سے یہ انتظامات کرتا رہتا ہے۔

---ooo---

غرض اب اسلامی نظام ایک ایسے معاشرے میں کام کر رہا تھا جو فاتح تھا اور اس کے اندر مختلف درجات ایمانیہ کے لوگ شامل ہوگئے تھے اور جیسا کہ اس پورے سبق میں ہم نے بتایا کہ اس معاشرے میں مختلف مقامات پر کمزور پہلو موجود تھے اور قرآن کریم ان کمزوریوں کو دور کر کے اس سوسائٹی کی تربیت کر رہا تھا۔ اس طرح قرآن کریم امت مسلمہ کی اصلاح میں اپنے منہاج کے مطابق مسلسل جدوجہد کر رہا تھا تاکہ یہ کمزور پہلو مضبوط ہو جائیں۔

قرآن کریم اس امت کو پاکیزگی اور اخلاص کے اعلیٰ ترین مقام اور بلندی تک لے جانے کی جدوجہد کر رہا تھا تاکہ وہ اس دین اور اس نظام کے لئے مخلص ترین امت بن جائے۔ اس کی محبتیں ' اس کے روابط اور اس کی ترجیحات مکمل طور پر اس نظام کے لئے علیحدہ ہو جائیں اور یہ کام صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ ایک ایسا سیاسی نظام قائم کیا جائے جس میں لوگ اپنے جیسے انسانوں کی بندگی کے نظام سے نکل کر اسلامی نظام میں داخل ہو جائیں جس میں صرف رب ذوالجلال کی بندگی ہو اور لوگ مکمل طور پر دو کیمپوں میں تقسیم ہو جائیں چونکہ ان دو کیمپوں کے درمیان ملاپ ممکن ہی نہیں ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۸۸ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ دوسرا سبق ہے۔ اس دوسرے حصے میں اسلامی مملکت اور اہل کتاب کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی آخری شکل بتائی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے حصے میں اسلامی مملکت اور جزیرۃ العرب کے مشرکین کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی آخری نوعیت کی حد بندی کی گئی تھی۔

پہلے حصے کی آیت کا تعلق جزیرۃ العرب کے مشرکین کے ساتھ تھا اور ان آیات میں ان صفات کا ذکر تھا جو مشرکین میں پائی جاتی تھیں۔ وہ واقعات اور حادثات جو عملاً اس وقت جزیرۃ العرب میں واقع ہوئے تھے پہلے سبق کے موضوع بحث تھے اور یہ آیات ان پر براہ راست منطبق تھیں جبکہ اس حصے کی آیات کا تعلق عموماً اہل کتاب کے ساتھ ہے۔ اور اس حصے کی آیات لفظاً اور معنی عام ہیں خواہ اہل کتاب جزیرۃ العرب میں ہوں یا اس سے خارج کسی جگہ ہوں۔

ان نصوص کے ذریعے ان تعلقات میں بنیادی تبدیلی کر دی گئی ہے جو اس سے قبل مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان قائم تھے، خصوصاً نصاریٰ کے ساتھ۔ یہودیوں کے ساتھ تو جنگی حالت اس سے پہلے بھی کئی بار قائم ہو گئی تھی لیکن نصاریٰ کے ساتھ اعلان جنگ کی حالت نہ تھی۔

کیا تبدیلی ہوئی؟ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ حکم دیا گیا منحرف اہل کتاب کے ساتھ جنگ کی جائے جو دین الہی کے منکر ہیں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھی جائے جب تک وہ چھوٹے ہو کر جزیہ ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اب وہ وقت گزر گیا کہ ان کے ساتھ معاہدے کئے جائیں یا دوستی اور امن کے تعلقات قائم ہوں ان کے ساتھ اب یا جنگ ہے اور یا ان کی جانب سے قبول جزیہ ہے۔ اور ان کے لئے صرف یہ حق محفوظ ہے کہ وہ اسلامی مملکت کے تحت ذمی ہو کر رہیں اور ان کے اور مسلم رعایا کے درمیان امن قائم ہو۔ ہاں جب وہ اسلامی نظریہ کو قبول کر لیں اور پوری طرح اسلام میں داخل ہو جائیں تو پھر وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح مسلمان ہیں۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ اسلامی ریاست کے تحت وہ اپنا عقیدہ آزادانہ رکھ سکتے ہیں اور انہیں اسلام لانے پر مجبور نہ کیا جائے گا کیونکہ اسلام کا محکم اور طے شدہ اصول یہ ہے لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ "دین قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔" لیکن وہ اپنا دین صرف اس صورت میں عالم اسلام میں جاری رکھ سکتے ہیں جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کے اور اسلامی ریاست کے درمیان معاہدہ طے ہو جائے۔

اسلامی معاشرے اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی اس تبدیل شدہ نوعیت کو تب ہی سمجھا جا سکتا ہے جب اسلامی نظام حیات اور جاہلی نظاموں کے درمیان تعلقات کی اس حتمی شکل کو اسلام کے تحریکی مزاج کے مطابق سمجھنے کی سعی کی جائے۔ اچھی طرح سمجھ کر بصیرت کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کی جائے۔ خصوصاً اس زاویہ سے کہ ان بین الاقوامی تعلقات کے قوانین کو کئی مراحل سے گزر کر اس آخری شکل تک پہنچنا پڑا ہے۔ اور اس میں عملی حالات کی وجہ سے اور

نئے نئے مراحل کی وجہ سے ترمیم اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔

یہ آخری شکل کیا ہے؟ وہ یہ کہ اسلامی نظام حیات اور جاہلی نظامہائے حیات چند مخصوص شرائط کے تحت باہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ایک یہ کہ یہ جاہلی نظام اسلامی نظام کے اس ہدف کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا نہ ہو کہ اس کرۂ ارض پر کوئی شخص دوسرے اشخاص کا غلام اور بندہ نہ ہو گا۔کوئی انسان اپنے جیسے انسان کی غلامی نہ کرے گا۔اور اس کرۂ ارض پر کوئی نظام کوئی حکومت اور کوئی معاشرہ ایسا نہ ہو گا جو اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنے۔اس لئے کہ اسلام کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ غالب ہونا چاہتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرے۔اور یہ اسلام کا اعلان عام ہے جبکہ جاہلی نظامہائے حیات کا اولین ہدف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا دفاع کریں کیونکہ یہ اعلان ان کے لئے اعلان موت ہے اور اس لئے وہ اس قسم کی ہر تحریک کو ختم کرنا چاہتے ہیں جبکہ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر جاہلی نظام اسلام کی راہ نہ روکیں۔

اسلامی نظام حیات اور اسلامی تحریک کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ جاہلیت کے مقابلے میں ایسے ہتھیار لے کر آئے جو جاہلیت کے ہتھیاروں کے ساتھ ہم پلہ ہوں یا اس ہتھیار سے زیادہ موثر ہتھیار ہوں اور اسلامی نظام جاہلیت کے مقابلے میں مرحلہ وار پروگرام کے تحت مناسب رویہ اور طرز عمل اختیار کرے۔اور جب آخری مرحلہ ہو تو اس مرحلے میں وہ حتمی ضوابط اور قوانین پر عمل کرے جو اسلام نے آخری مراحل کے لئے وضع کر دیئے ہیں۔

اس سورت کے اس حصے میں قرآن کریم نے مسلمانوں اور اسلامی ریاست اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی آخری اور فائنل صورت متعین کی ہے۔اہل کتاب کی بھی آخری پوزیشن بتائی گئی ہے۔اور یہ کہا ہے کہ وہ شرک 'کفر اور باطل پر عمل پیرا ہیں۔اور ان واقعات اور اسباب کی نشاندہی کی ہے۔جن کی وجہ سے یہ حکم دیا گیا ہے۔چاہے وہ سبب یہ ہو کہ ان کے معتقدات کفریہ ہیں جس طرح کہ دوسرے کفار کے عقائد تھے اور دونوں کے درمیان مکمل مماثلت پائی جاتی ہے یا ان کا طرز عمل ' ان کے تصرفات اور ان کی حقیقی صورت حالات ایسی ہے۔درج ذیل وجوہات یہاں گنوائی گئی ہیں۔

۱۔ یہ کہ یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

۲۔ یہ کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کے حرام کردہ امور کو حرام نہیں سمجھتے۔

۳۔ یہ کہ وہ دین حق (اسلامی نظام) کے مطیع نہیں ہیں۔

۴۔ ان اہل کتاب میں سے یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عزیر ابن اللہ ہیں۔اور نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ ابن اللہ ہیں۔اور ان دو اقوال میں یہ اہل کتاب دوسرے کفار اور مشرکین کے مشابہ تھے۔چاہے وہ یونانی بت پرست ہوں یا رومی بت پرست ہوں ' یا ہندو بت پرست ہوں یا فرعونی بت پرست ہوں یا دوسرے اہل کفر ہوں۔ (بعد میں ہم یہ توضیح کریں گے کہ نصاریٰ کے نزدیک تثلیث اور ابنیت کا دعویٰ یا یہودیوں کی طرف سے ابنیت کا دعویٰ سابقہ بت پرستیوں سے ماخوذ ہے۔اصل نصرانیت اور اصل یہودیت کے اندر یہ عقیدہ ہرگز نہ تھا۔

۵۔ یہ کہ ان لوگوں نے اپنے احبار اور رہبان کو اللہ کے سوا رب قرار دے دیا تھا۔جیسا کہ انہوں نے مسیح کو رب قرار دے دیا تھا حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی توحید پر قائم رہیں اور دین صرف اللہ کے لئے خالص کریں

ورنہ وہ مشرک ہوں گے۔

۶۔ یہ کہ وہ اللہ کے دین کے خلاف بر سرپیکار ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اس نئے چراغ کو اپنی منہ کی پھونکوں سے بجھا دیں لہٰذا یہ کافر ہیں۔

۷۔ اکثر احبار و رہبان لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کے دین سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

ان اوصاف کی وجہ سے اور اہل کتاب جس موقف پر قائم تھے اس کی وجہ سے قرآن کریم نے اہل کتاب کے حوالے سے درج بالا آخری موقف متعین کیا۔ اب اس آخری ضابطے کے مطابق اسلامی مملکت اور اسلامی معاشرہ اور اہل کتاب کے درمیان بین الاقوامی ضابطہ مرتب ہوا ہے۔

یہاں یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کے سابقہ فیصلوں کے برعکس یہ فیصلہ بالکل مختلف نوعیت کا حامل ہے۔ اور مستشرقین اور عیسائی مشنریوں نے یہ کہا بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ ان کی تحریک زور پکڑ گئی ہے تو آپ نے "اپنے" سابقہ احکام کو بدل دیا۔ یعنی اہل کتاب کے بارے میں پہلے اور رویہ تھا اور حصول قوت کے بعد اب یہ احکام آگئے۔

ہم یہ کہیں گے کہ اہل کتاب کے بارے میں تمام مکی آیات اور مدنی آیات پر اچھی طرح غور کر لیجئے۔ اس سے اچھی طرح معلوم ہو گا کہ اہل کتاب کے موقف اور نظریات کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسلام ان کو اب آخری مرحلے میں اسی طرح گمراہانہ نظریات سمجھتا ہے جس طرح ابتدائی مراحل میں ان کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر تھا۔ یعنی یہ کہ یہ مشرکانہ عقائد ہیں اور دین حق کے انکار کے مترادف ہیں۔ اور اس دین کے بھی خلاف جس کے متبع ہونے کے وہ خود مدعی ہیں۔ جو تبدیلی ہوئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ بحیثیت بین الاقوامی کمیونٹی ان کے ساتھ اسلامی ریاست کا آئندہ سلوک کیا ہو گا' اور بین الاقوامی تعلقات ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے احکام اور پالیسی کسی بھی وقت کے موجودہ حالات کے مطابق ہوتی ہے اور حالات ظاہر ہے کہ بدلتے رہتے ہیں۔ رہے وہ عقائد جو اہل کتاب رکھتے ہیں تو ان کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر وہی تھا جو پہلے روز سے تھا۔

اب ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ اہل کتاب کے عقائد و نظریات کے بارے میں قرآن کریم کے بعض تبصرے پیش کریں۔ پھر ہم اسلام کے بارے میں ان کے عملی طرز عمل کو پیش کریں گے جس کے نتیجے میں ان کے بارے میں یہ آخری اور فائنل پالیسی طے کی گئی۔

مکہ میں تو یہودی کمیونٹی موجود ہی نہ تھی نہ نصرانی بڑی تعداد میں موجود تھے نہ کوئی زور ہی رکھتے تھے۔ چند افراد نصرانی ضرور تھے۔ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ مکہ کے نصرانیوں نے بڑی خوشی سے اسلام کو قبول کر لیا تھا۔ وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور انہوں نے اس کی صداقت کی شہادت دی کہ یہ دین اور یہ رسول برحق ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو نصاریٰ میں سے اہل توحید تھے۔ اور ان کے پاس انجیل کی اصل تعلیمات بھی موجود تھیں۔ ان کے بارے میں قرآن مجید نے یہ تبصرے کئے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۵۲) وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا

بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ (۵۳) (۲۸ : ۵۲ – ۵۳)) "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔"

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (۱۰۷) وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (۱۰۸) وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (۱۰۹) (۱۸ : ۱۰۷ تا ۱۰۹)) "اے نبی تم لوگوں سے کہہ دو کہ اسے مانو یا نہ مانو جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے۔ انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں "پاک ہے ہمارا رب، اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا، اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔"

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۴۶ : ۱۰) اے نبی ان سے کہو "کبھی تم نے سوچا بھی کہ یہ قرآن اگر اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا؟ اور اس جیسے کلام پر بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے اور ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (۲۹ : ۴۷) "ہم نے اسی طرح تمہاری طرف یہ کتاب نازل کی ہے، اس لئے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔"

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۶ : ۱۱۴)) "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو"

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ اِلَيْهِ مَاٰبِ (۱۳:۳۶) ”اے نبی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی' وہ اس کتاب سے جو تم پر ہم نے نازل کی ہے' خوش ہیں اور مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے ۔ تم صاف کہہ دو کہ ”مجھے تو صرف اللہ کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراؤں اور اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے ۔“

یہ تو تھے مکی نصاریٰ' مدینہ میں بھی بعض نصاریٰ نے دعوت اسلامی کو قبول کیا اور مدنی سورتوں میں قرآن نے ان کے شواہد کو نقل کیا ہے ۔ بعض آیات میں منصوص طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ نصاریٰ تھے ۔ اس لئے کہ مدینہ میں یہودیوں نے وہ موقف اختیار نہ کیا جو ان کے بعض افراد نے مکہ میں کیا تھا ۔ اس لئے کہ مدینہ میں اسلام ان کے دنیاوی مفادات کے لئے خطرہ بن گیا تھا ۔

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۹۹) ”اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں اور اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی ۔ اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت نہیں کر دیتے ۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا ۔“

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۸۲) وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۸۳) وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (۸۴) فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ (۸۵) (۵ : ۸۲ تا ۸۵) ”تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے

زیادہ سخت یہود و مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں ہے جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ "پروردگار' ہم ایمان لائے' ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔" اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں جبکہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔" ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے نیک رویہ اختیار کرنے والوں کے لئے۔"

لیکن یہ چند افراد کا رویہ تھا اور یہ جزیرۃ العرب میں بسنے والے اہل کتاب کی اکثریت کے رویے کی عکاسی نہیں کرتا۔ خصوصاً یہودیوں کے رویے کی۔ ان لوگوں نے مدینہ طیبہ کے اندر جب محسوس کیا کہ ان کے مفادات اور ان کا دین خطرے میں ہے تو انہوں نے اسلام کے خلاف زبردست حملہ شروع کر دیا۔ اور وہ اسلام کے خلاف وہ تمام اوچھے ہتھیار استعمال کرنے لگے جن کی تفصیل قرآن نے دی ہے۔ اسلام میں داخل ہونا تو بہت بڑی بات تھی۔ انہوں نے ان پیش گوئیوں کا بھی صاف صاف انکار کر دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی کتابوں میں موجود تھیں۔ حالانکہ قرآن کریم ان کے پاس موجود کتابوں کی تصدیق کر رہا تھا۔ اور یہ اس حقیقت کے باوجود کہ خود ان میں سے پاک فطرت لوگوں نے اسلام کی حقانیت کا اعتراف کیا تھا' اور منکرین اور مخالفین کے سامنے علی الاعلان انہوں نے اسلام کا اقرار اور اعلان کیا تھا۔ چنانچہ اسلام نے ان کے اس عام رویے اور طرز عمل کو بھی قلم بند کر دیا اور متعدد سورتوں میں یہ تبصرہ کیا کہ اہل کتاب کس قدر فسادی' کس قدر باطل پرست اور خود اپنے دین سے کس قدر منحرف ہوگئے ہیں بلکہ عام اہل کتاب کے رویے کو بھی قرآن مجید نے بھی لیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۶۳) إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ (۶۴) فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۶۵) (۴۳ : ۶۳ تا ۶۵)) "اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لئے ہوئے آیا تو اس نے کہا تھا کہ "میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی تم عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔" مگر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی۔"

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓئٰتِكُمْ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۱٦۱) فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۱٦۲) وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۱٦۳) (۷: ۱٦۱ تا ۱٦۳) "یاد کرو وہ وقت جب ان سے کہا گیا تھا کہ "اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور حطہ حطہ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو' ہم تمہاری خطائیں معاف کریں گے اور نیک رویہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔" مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی' بدل ڈالا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا۔ اور ذرا اس بستی کا حال پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔ انہیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت (ہفتہ) کے دن احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لئے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷: ۱٦۷) "اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ "وہ قیامت تک ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔" یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے اور یقیناً وہ درگزر اور رحم کرنے والا ہے۔"

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷: ۱٦۹) "پھر اگلی نسلوں کے بعد ناخلف ان کے جانشین ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اس دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاع دنیا سامنے

آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لیتے ہیں کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں گے جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ آخرت کی قیام گاہ خدا ترس لوگوں کے لئے ہی بہتر ہے۔ کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟"

مدنی دور کی آخری سورتوں میں پھر اہل کتاب کے بارے میں آخری اور فیصلہ کن پالیسی بتا دی گئی۔ اور تفصیلاً بتایا گیا کہ اسلام کی جنگ میں یہ لوگ کس قدر برے اور اوچھے ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور ان سورتوں میں ان کے کردار پر مفصل تبصرے کئے گئے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ' آل عمران' سورت نساء' مائدہ وغیرہ میں اور ان کے بارے میں آخری اور دائمی پالیسی' پھر سورت توبہ میں بتائی گئی۔ ان کے بارے میں احکام اور تبصرے یہ ہیں :

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (٧٥) وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (٧٦) أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (٧٧) وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (٧٨) فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ (٧٩) (٢: ٧٥ تا ٧٩) "اے مسلمانو' اب کیا ان لوگوں سے تم توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی۔ ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی انہیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیے کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بیوقوف ہو گئے ہو؟ ان لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمہارے رب کے پاس تمہارے مقابلے میں انہیں حجت میں پیش کریں؟ اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں' اللہ سب باتوں سے باخبر ہے؟ ان میں سے ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں ہیں بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لئے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں یہ لکھا بھی ان کے لئے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لئے موجب ہلاکت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۖ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۷) وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۗ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸) وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۸۹) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۹۰) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹۱) (۲: ۸۷ تا ۹۱) ”ہم نے موسیٰ کو کتاب دی‘ اس کے بعد پے درپے رسول بھیجے‘ آخر کار عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔ پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی کی‘ کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔ وہ کہتے ہیں ہمارے دل محفوظ ہیں۔ نہیں‘ اصل بات یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے‘ اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے‘ مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر‘ کیسا برا ذریعہ ہے جس پر وہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے‘ اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے اپنے بندے کو خود چاہا نواز دیا۔ لہٰذا یہ اب غضب بالائے غضب کے مستحق ہوگئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ‘ تو وہ کہتے ہیں ”ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں‘ جو ہمارے ہاں اتری ہے۔“ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے‘ اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس کی تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی۔ اچھا ان سے کہو: ”اگر تم اس تعلیم

ہی پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمہارے ہاں آئی تھی تو اس سے پہلے اللہ کے ان پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے؟

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ (۹۸) قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۹) (۳: ۹۸ تا ۹۹) ''کہو اے اہل کتاب، تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کہو اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم خود گواہ ہو۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں۔''

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (۵۱) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا (۵۲) (۴: ۵۱ — ۵۲) ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا مددگار نہیں پاؤ گے۔''

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۷۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۳) اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷۴) مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۷۵) (۵:۷۲ تا

۷۵)) ”یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ ”اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔“ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے۔ اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ پھر کیا یہ اللہ سے توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے؟ اللہ بہت درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ مسیح ابن مریمؑ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول تھا اس سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔ اس کی ماں ایک راستباز عورت تھی۔ اور وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم کس طرح ان کے سامنے حقیقت کی نشانیاں واضح کرتے ہیں پھر دیکھو یہ کدھر الٹے پھرے جا رہے ہیں۔“

ان جیسی دوسری قرآنی آیات مکی اور مدنی قرآن کے اندر بے شمار ہیں' جو واضح طور پر یہ بتاتی ہیں کہ اہل کتاب نے اپنے حقیقی دین سے انحراف اختیار کر لیا ہے اور اہل کتاب کے بارے میں قرآن کا جو نقطہ نظر پہلے روز سے تھا اس میں آخر میں نازل ہونے والی سورتوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ اگرچہ ان پر انحراف' فسوق' شرک اور کفر کے جو الزامات لگائے گئے ہیں ان میں کوئی بات بھی جدید نہیں ہے۔ جہاں تک ان کے عقائد و نظریات کا تعلق ہے اس کے بارے میں پہلے دن سے قرآن کریم نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ ہے کہ ان میں سے جو لوگ اچھے اور صالح تھے اور صحیح عقائد پر قائم تھے اس کا بھی قرآن نے اعتراف کیا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات پر غور کریں:

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷: ۱۵۹) ”موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا تھا اور حق کے مطابق ہی انصاف کرتا۔“

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۳: ۷۵) ”اہل کتاب میں سے کوئی ایسا ہے کہ اگر اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ یقیناً تمہارا مال ادا کر دے گا اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ”امیوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں“ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں' حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔“

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ

يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۱۱۲) لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ (۱۱۳) يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۱٤) وَ مَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۵) (۳ : ۱۱۲ تا ۱۱۵) "یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔ مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں۔ راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے ان کی ناقدری نہ کی جائے گی۔ اللہ پرہیز گار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔"

جس بات میں تبدیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ اب اسلامی مملکت کا طرز عمل اور سلوک کیا ہو گا۔ یہ طرز عمل اور سلوک حالات کے ساتھ بدلتا رہا ہے۔ مختلف مراحل میں اس میں تبدیلی آتی رہی ہے اور یہ تبدیلی ان کی جانب سے پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے آتی رہی ہے۔ کیونکہ دین اسلام کا قیام ایک تحریک کی شکل میں تھا اور اس تحریک کے ساتھ اہل کتاب نے جو عملی رویہ اختیار کیا، اسلامی ریاست نے بھی اسی کے مطابق ان کے ساتھ طرز عمل اختیار کیا۔

ایک وقت یہ تھا کہ اہل کتاب کے ساتھ طرز عمل یہ تھا

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(٤٦) (۲۹ : ٤٦) "اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے ----- سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ "ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے مسلم ہیں۔"

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ

يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ

بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶) فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۳۷)

(۲: ۱۳۶ تا ۱۳۷) مسلمانو! کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم' اسماعیل' یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی اور ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔ پھر اگر وہ اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اطمینان رکھو کہ ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ

بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا

مُسْلِمُوْنَ (۲: ۶۴) "اے نبی کہو" اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے' یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے وہ منہ موڑیں تو صاف صاف کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔"

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ

اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲: ۱۰۹) "اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے مقابلے میں تم عفو و درگزر سے کام لو تو یہاں تک کہ اللہ کو خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

اور ان حالات اور پالیسیوں کے بعد وہ احکام آئے جن پر اللہ نے اہل ایمان کو مامور کیا۔ چنانچہ کئی واقعات پیش آئے۔ ان واقعات کی وجہ سے طرز عمل کے بارے میں احکام بدلتے رہے اور اسلام کا مثبت اور تحریکی عمل اپنی نہج پر جاری

رہا اور وہ آخری احکام نازل ہوئے جن کے بارے میں اس سورت میں ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔

اہل کتاب کے جو عقائد و نظریات تھے 'ان کے بارے میں قرآن کا نظریہ اول روز سے ایک ہی تھا۔ کہ یہ کفریہ اور شرکیہ نظریات ہیں۔ جو تبدیلی آئی ہے وہ صرف یہ کہ اہل کتاب کے مشرکین اور کفار کے ساتھ ہمارا سلوک کیا اور اسلامی ریاست کا سلوک کیا ہو۔ اس سورت کے تعارف میں ہم نے اسی کے بارے میں جو محا کمہ پیش کیا تھا' اس پر ذرا دوبارہ نظر ڈالیں۔

"یہ آخری تبدیلی جو اسلامی معاشرے اور اہل کتاب کے درمیان محض سلوک اور طرز کے بارے میں آئی ہے۔ اسے صرف اس صورت میں سمجھا جا سکتا ہے کہ اسے اسلامی ریاست اور اہل کتاب کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کے زاویہ سے دیکھا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اسلامی نظام کا قیام ایک عملی تحریکی عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔ اور اس میں جدید وسائل کے مقابلے میں جدید وسائل اختیار کئے گئے اور سوسائٹی کی بدلتی ہوئی تحریکی صورت حال کے مختلف مراحل میں مختلف طرز ہائے عمل اختیار کئے گئے....."

اب ہم تفصیل سے یہ بتائیں گے کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت اور اہل کتاب کے درمیان مستقل نظریاتی مواقف کیا ہیں اور تاریخی اعتبار سے مختلف مواقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اسلام نے آخری احکام کیا دیئے ہیں۔

اسلامی ریاست اور اہل کتاب کے درمیان حقیقی موقف کے بارے میں اگر کوئی تحقیقات کرنا چاہے تو اسے درج ذیل حدود کے اندر یہ تحقیق کرنا چاہئے۔ اولاً یہ کہ اس سلسلے میں اللہ نے جو تصریحات کی ہیں وہ فائنل ہیں اور محفوظ ہیں اور برحق ہیں۔ ان میں کسی باطل کی آ ش نہیں ہے۔ اور یہ تصریحات چونکہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہیں تو ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی تصریحات کی طرح ان میں کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ یا ان کے بارے میں انسانی ..تحقیق کی طرح کوئی تاویل اور استنباط اور استدلال کیا جا سکتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ اہل کتاب کے بارے میں اور ان کے حوالے سے مسلمانوں کی جو تاریخ رہی ہے' اس کی روشنی میں ان دونوں کے درمیان طرز عمل' سلوک اور ضوابط کا تعین کیا جائے۔

پہلے یہ دیکھئے کہ خود مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے بارے میں اہل کتاب کا موقف کیا رہا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد آیات میں اس کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ کبھی تو صرف اہل کتاب کے بارے میں بات کی گئی ہے اور کبھی ان کے اور مشرکین کے مشترکہ موقف کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ ان دونوں کا طرز عمل اور موقف مسلمانوں کے بارے میں یکساں رہا ہے۔ مسلمانوں کی مخالفت میں اہل کتاب و مشرکین چونکہ اکٹھے رہے ہیں۔ اس لئے قرآن نے اپنے تبصرے میں بھی ان کو یکجا کیا ہے اور کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ ہر ایک کا موقف مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے بارے میں علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے لیکن آیات قرآنیہ نے نہایت ہی دو ٹوک انداز میں ان کے موقف اور ارادوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس قدر وضاحت کے ساتھ کہ اس پر مزید کسی تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

مِّنْ رَّبِّكُمْ ——— (۲: ۱۰۵) "یہ لوگ جنہوں نے دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے' خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرک ہوں ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو۔"

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ (۲: ۱۰۹) "اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔"

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲: ۱۲۰) "یہ یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔"

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ (۳: ۶۹) اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔"

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷۲) وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ (۳: ۷۲ تا ۷۳) "اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہو رہا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو' شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (۳: ۱۰۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پھر لے جائیں گے۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ (۴۴) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا (۴۵) (۴: ۴۴ — ۴۵)) "تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کر دو۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا (۵۱)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ اجبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔"

بطور نمونہ یہ چند آیات اس بات کے تعین کے لئے کافی ہیں کہ اہل کتاب کا رویہ اور موقف مسلمانوں کے مقابلے میں کیا رہا ہے؟ وہ اس بات کی زبردست خواہش رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو دوبارہ کافر بنا دیں اور یہ رویہ ان کی جانب سے کینہ پروری کی وجہ سے تھا۔ جبکہ ان پر اسلام کی حقیقت ظاہر ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کا موقف صرف یہ تھا کہ مسلمان یہودی ہو جائیں یا عیسائی ہو جائیں اور وہ اس موقف میں کوئی تبدیلی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے وہ مسلمانوں کے ساتھ نہ دوستی کرتے اور نہ پرامن حالات پیدا کرتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ان کے بغض و عداوت کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں بت پرستوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔

اگر ہم درج ذیل آیات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اہل کتاب اور مشرکین کا رویہ بعینہ ایک جیسا ہے۔

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲: ۲۱۷)

"اور وہ تم سے لڑتے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہارے دین سے تمہیں پھیر دیں۔"

وَدَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِکُمْ وَاَمْتِعَتِکُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْکُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً (۴: ۱۰۲) "کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔"

اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً وَّیَبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ وَاَلْسِنَتَھُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ (۶۰: ۲) "اگر وہ تم پر قابو پا جائیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمہیں آزار دیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔"

کَیْفَ وَاِنْ یَّظْھَرُوْا عَلَیْکُمْ لَا یَرْقُبُوْا فِیْکُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۸) "اگر یہ تم پر غالب آ جائیں تو تمہارے معاملہ میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا۔"

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹: ۱۰) "وہ کسی مومن کے بارے میں کسی قرابت داری اور نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری کا کوئی لحاظ کرتے ہیں۔" جب ہم ان ربانی فیصلوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو مشرکین کے بارے

میں ہیں' تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حوالے سے ان کے جو مقاصد ہیں وہ وہی مقاصد اور پالیسیاں ہیں جو مسلمانوں کے بارے اہل کتاب کی بھی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ لہذا مشرکین اور اہل کتاب دونوں کا اسلام کے بارے میں بالکل ایک ہی رویہ اور موقف ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے بارے میں اللہ نے مسلمانوں کو ہدایات دی ہیں اور ان کا مسلمانوں کے حوالے سے جو موقف قرآن نے ہمیں بتایا ہے وہ موقف دائمی اور ابدی نوعیت کا ہے۔ اور یہ آخری اور دائمی موقف اللہ نے کسی زمان و مکان سے مقید نہیں کیا ہے۔ مثلاً ان دو فریقوں کے بارے میں یہ دو آیات قابل غور ہیں:

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (۲: ۲۱۷)

"اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں' اگر ان کا بس چلے۔"

اور اہل کتاب کے بارے میں

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲: ۱۲۰) "اور تم سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ تو ان کے دین کے تابع ہو جائے۔" ان دو آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات کسی تاویل اور کسی توڑ موڑ کو قبول ہی نہیں کرتیں۔ یہاں لوگوں کے اصل مزاج کی نشاندہی ہے جو ان کا دائمی مزاج ہے اور رویہ ہے اور اس میں کسی زمان و مکان کی قید نہیں ہے' نہ مخصوص حالات کا ذکر ہے۔

اس کے بعد اگر ہم ان تعلقات کو تاریخی زاویہ سے دیکھیں کہ حضور اکرم صں کے بعد ان مشرکین اور اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا رہی ہے تو اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ان آیات اور نصوص کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور یہ کہ اللہ کے کلام صادق میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ کس طرح عملاً تاریخ اسلام میں ہوتا رہا اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ان کفار اور مشرکین کا مسلسل اور ناقابل انفکاک خاصہ تھا اور ان کی فطرت میں اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی بھری ہوئی تھی۔ یہ کوئی وقتی لاحقہ یا عارضہ نہ تھا۔

اگر اہل کتاب میں سے بعض انفرادی واقعات کو مستثنیٰ کر دیا جائے یا بعض جماعتوں اور گروہوں کے رویہ سے صرف نظر کیا جائے جس کے بارے میں قرآن نے بھی ہمیں بتایا ہے کہ بعض لوگوں اور بعض گروہوں نے مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور بعض لوگ دین اسلام کی سچائی اور رسول اللہ کی سچائی کے قائل ہوئے ہیں اور وہ اسلام اور جماعت مسلمہ میں داخل بھی ہوئے ہیں اور ان حالات کی طرف ہم اس سے قبل اشارہ بھی کر آئے ہیں۔ ان انفرادی رویوں اور بعض گروہوں کے رویے سے صرف نظر کر کے اگر اسلام اور مشرکین و اہل کتاب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دشمنی و عداوت کی تاریخ ہے۔ یہ سازشوں اور مسلسل جارحیت کی تاریخ ہے اور اسلام کے خلاف عناد کبھی اور کسی بھی وقت ان اقوام کے دلوں سے نہیں نکلا۔ یہ ہمیشہ اسلام کے خلاف جارح رہے۔

رہے یہودی تو ان کے کرتوتوں' سازشوں اور مکر و فریب سے قرآن نے بار بار پردہ اٹھایا ہے۔ یہودیوں نے تو اول روز سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے' آج تک اسلام دشمنی میں ایک دن کے لئے بھی وقفہ نہیں کیا۔

کیا ہم فی ظلال القرآن میں پوری اسلامی تاریخ کا خلاصہ پیش کر سکتے ہیں؟ یہ تو ممکن نہیں لیکن بہرحال ہم اسلام کے خلاف تاریخی یہودی سازشوں کی طرف اشارہ ضرور کر سکتے ہیں۔

جب حضورؐ ہجرت کر کے وارد مدینہ ہوئے تو یہاں کے یہودیوں نے اچھی طرح جانتے ہوئے کہ یہ رسول برحق ہے' آپ کی تصدیق نہ کی حالانکہ وہ اہل کتاب تھے۔

اس کے برعکس انہوں نے سازشوں اور جھوٹے پروپیگنڈے اور شبہات پھیلا کر اسلام کا استقبال کیا۔ انہوں نے مدینہ میں اٹھنے والی اسلامی جمعیت میں ہر قسم کے فتنے اور فساد برپا کرنے کی سعی کی۔ اور اس کام میں انہوں نے ہر قسم کی یہودی مہارت اور سازش کے عنصر کو استعمال کیا۔ انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلائے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ برحق نبی ہیں۔ انہوں نے منافقین کو تحفظ دیا۔ جو شبہات' الزامات اور جھوٹی خبریں وہ گھڑتے تھے' چپکے سے ان منافقین تک پہنچا دیتے تھے اور پھر وہ ان کو پھیلاتے تھے۔ مثلاً تحویل قبلہ کے موقعہ پر' افک کے واقعہ کے بارے میں اور ان بڑے واقعات کے علاوہ ہر موقعہ اور ہر مرحلہ پر وہ اپنی اس بدنیتی کا اظہار کرتے تھے۔ یہودیوں کے اس نظریاتی اور ثقافتی جنگ کے جوابات سورت بقرہ' آل عمران' نساء' مائدہ اور سورت حشر میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۸۹) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

(۹۰) (۲: ۸۹ تا ۹۰) "اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے' اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے' جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے مگر جب وہ چیز آگئی ہے جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر کیسا برا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنے نفس کی تسلی کرتے ہیں کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے اس کو قبول کرنے سے صرف اس ضد کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے اپنے جس بندے کو خود چاہا' نواز دیا۔ لہٰذا اب یہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں اور ایسے کافروں کے لئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔"

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

الْکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲:۱۰۱) ”اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول ‘ اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں ۔“

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۲:۱۴۲) ”نادان لوگ ضرور کہیں گے : انہیں کیا ہوا کہ پہلے یہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے ‘ اس سے یکایک پھر گئے ؟“ اے نبی ان سے کہو : ”مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں ‘ اللہ جسے چاہتا ہے ‘ سیدھی راہ دکھا دیتا ہے ۔“

یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۷۰) یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۷۱) (۳: ۷۰ تا ۷۱) ”اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اے اہل کتاب کیوں حق کو باطل کا ر چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟“

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاکْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۳:۷۲) ”اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو ‘ شاید اسی ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں ۔“

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْکِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْکِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ (۳:۷۸) ”اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ وہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی ‘ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا ۔ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ۔“

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ (۹۸) قُلْ

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۹) (۳: ۹۸ تا ۹۹) ”کہو اے اہل کتاب ‘ تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حرکتیں تم کر رہے ہو ‘ اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے ۔ کہو اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم گواہ ہو ۔ تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ۔“

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ ——— (۴: ۱۵۳) ”اے نبی اہل کتاب اگر آج تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر ان پر نازل کر دو تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبے یہ پہلے موسیٰ سے کر چکے ہیں ۔ اس سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اس سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر بجلی ٹوٹ پڑی تھی ۔ پھر انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنایا ‘ حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے ۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۹: ۳۲) ”یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو وہ اپنی پھونکوں سے بجھا دیں ۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے ‘ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو ۔“

تاریخ نے دیکھا کہ یہودی یکے بعد دیگرے اپنے کئے ہوئے معاہدوں کو توڑ رہے ہیں اور دھوکہ دے رہے ہیں اور ان کی اسی پالیسی کی وجہ سے بنی قینقاع ‘ بنی قریظہ وغیرہ کے واقعات رونما ہوئے اور جنگ احزاب میں یہودیوں نے جس طرح قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف جمع کیا وہ تو معلوم ہی ہے ۔

اس کے بعد بھی یہودی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے ۔ یہ لوگ اس عظیم فتنے کے پیچھے بھی درپردہ کام کر رہے تھے ۔ جس میں حضرت عثمان شہید ہوئے اور اس کے بعد اسلامی معاشرے کا اتحاد و اتفاق بڑی حد تک ختم ہو گیا ۔ پھر حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جو فتنہ برپا ہوا ‘ یہی لوگ اس کے بھی محرک تھے ۔ پھر انہوں نے اسلامی احکام کو مشکوک بنانے کے لئے وضع حدیث کا فتنہ شروع کیا جس کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں نے علم جرح و نقد ایجاد کیا ۔ پھر انہوں نے تاتاریوں کو بغداد کی خلاف اسلامیہ کے خلاف حملہ کرنے پر آمادہ کیا ۔

دور جدید کی تاریخ کا حال تو یہ ہے کہ مسلمانوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے اس کے پیچھے یہودیوں کا ہاتھ رہا ہے ۔ اور اسلامی تحریکات کو جہاں جہاں بھی مٹانے کی سعی کی گئی ہے ان کے پیچھے بھی یہودی سازش کارفرما رہی ہے اور عالم اسلامی کے اندر اسلام کے خلاف تحریک بھی ہوتی ہے ۔ اس کی پشت پر ان ہی کا ہاتھ ہوتا ہے ۔ یہ تو تھی یہودیوں کی

حالت ۔ رہے دوسرے ' یعنی اہل کتاب کا دوسرا گروہ نصاریٰ تو وہ ان سے زیادہ مسلمانوں کی دشمنی پر ہروقت تلے ہوئے ہیں اور یہودیوں کے مقابلے میں زیادہ مسلمانوں کے خلاف جنگجو ہیں ۔ ہروقت حالت جنگ میں رہتے ہیں ۔

رومیوں اور فارسیوں کے درمیان صدیوں پرانی عداوت تھی لیکن جونہی اسلام جزیرۃ العرب میں غالب ہوا اور کنیسا نے محسوس کیا کہ ان کے لئے یہ دین نہایت ہی خطرناک ہے ۔ اور اس کے مقابلے میں ان کا خود ساختہ دین کنیسا نہ ٹھہر سکے گا کیونکہ اس میں پرانی بت پرستی اور اہل کنیسا کی سب گمراہیاں جمع ہو چکی ہیں اور ان کے اس دین میں حضرت مسیح کے حالات آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھے ۔ تو ہم نے دیکھا کہ صدیوں کے یہ دشمن اپنی دشمنیاں بھلا گئے ۔ ان کی عداوتیں مٹ گئیں اور ایک دوسرے کے خلاف بقایا حق انتقام ختم کر دیئے گئے اور یہ دونوں قوتیں اسلام کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں ۔ شمال میں رومی اور ان کے عمال غسانی اکٹھے ہو رہے تھے تاکہ اس نئے دین کا خاتمہ کر دیں ۔ انہوں نے حارث ابن عمیر اروی کو قتل کر دیا ۔ یہ رسول اللہ کے ایلچی تھے اور ان کو حاکم بصریٰ کے پاس حضور ؐ نے بھیجا تھا ۔ بصریٰ کے حاکم رومیوں کے تحت تھے ۔ مسلمان تمام ایلچیوں کو مکمل امن فراہم کرتے تھے لیکن اسلام اور عیسائیت کے اس پہلے رابطے ہی میں عیسائیوں نے غداری کی اور حضور کے ایلچی کو قتل کر دیا ۔ اس پر آپ نے تین شہید امراء کا لشکر بھیجا ۔ اس لشکر کے امراء یکے بعد دیگرے زید ابن حارثہ ' جعفر ابن ابی طالب اور عبداللہ ابن رواحہ مقرر ہوئے تھے ۔ یہ جنگ غزوہ مؤتہ کے نام سے مشہور ہے ' جب یہ لشکر اپنی منزل تک پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ رومیوں نے عظیم جمعیت اکٹھی کی ہوئی ہے یعنی ایک لاکھ رومی جمع ہیں اور ان کے حامی قبائل کے مزید ایک لاکھ افراد ان کی حمایت میں آئے ہوئے ہیں ۔ مسلمانوں کا لشکر صرف تین ہزار افراد پر مشتمل تھا ۔ یہ ماہ جمادی الاخریٰ سن آٹھ ہجری کا واقعہ ہے ۔

اس کے بعد غزوۂ تبوک ہوا جس کے ارد گرد سورت توبہ کے تمام موضوعات چل رہے ہیں ۔ اس کے بارے میں تفصیلات اپنی جگہ آئیں گی انشاء اللہ ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل جیش اسامہ بھی تیار کیا تھا ۔ جسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے روانہ فرمایا تھا ۔ یہ لشکر بھی شام کی طرف گیا تھا اور یہ بھی ان افواج کی تیاری کے متعلق سن کر روانہ کیا گیا تھا جو رومی اسلام کو ختم کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے ۔

یرموک کے کامیاب معرکے اور اس رومی نو آبادیوں کی آزادی شام ' مصر اور شمالی افریقہ کے فتوحات اور پھر اندلس میں اسلام کے مرکز کے قیام کے بعد اسلام کے خلاف عیسائی صلیبیوں کے سینے کینہ کے مارے کھولتے رہے ۔

تاریخ میں معروف صلیبی جنگیں ہی وہ پہلی جنگیں نہ تھیں جب عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف شروع کیں بلکہ وہ روز اول سے اسلام کے خلاف تمام کارروائیوں کی پشت پر رہے ۔ اور ظہور اسلام کے بعد ہی انہوں نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا ۔ اور یہ کارروائی انہوں نے اس وقت سے شروع کر دی تھی جب سے انہوں نے ایرانیوں کے ساتھ صلح کر لی اور صدیوں کی عداوت کو بھلا دیا ۔ جزیرۃ العرب کے جنوب میں رومیوں نے ایرانیوں کی کارروائیوں کی حمایت کی ۔ پھر مؤتہ میں انہوں نے ایک دوسرے کی امداد کی اور پھر یرموک میں بھی باہم معاون رہے ۔ پھر اندلس میں جب صلیبیوں نے جنگ کا آغاز کیا اور وہاں انہوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کیے وہ تاریخ انسانیت کا مشہور المیہ ہے ۔ اور آج تک انسانی تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ہے ۔ بعد کے ادوار میں مشہور صلیبی جنگوں میں (حالانکہ ان کی سب جنگیں صلیبی تھیں) مسلمانوں کے خلاف ان جرائم کا ارتکاب کیا جن کی کوئی مثال نہیں ہے اور ان کارروائیوں میں انہوں نے اسلام کے

ساتھ کیئے ہوئے کسی معاہدے کا کوئی لحاظ نہ رکھا۔

لیبان اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھتے ہیں :

"برطانوی جنرل ریکار رو نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اس نے مسلمانوں کی فوج کے سامنے تین ہزار قیدیوں کو ذبح کر دیا۔ ان قیدیوں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے کیونکہ اس نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ان کو قتل کر دے گا۔ اس کے بعد اس نے لوٹ مار اور قتل کا بازار گرم کیا' جس کی وجہ سے شریف النفس صلاح الدین مشتعل ہو گئے۔ جنہوں نے قدس کے عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا۔ اور انہوں نے ان کو کوئی ازیت نہ دی تھی۔ اور وہ صلاح الدین جنہوں نے فلپ اور قلب الاسد کو ان کی بیماری کے دوران دوائیں اور دوسری ضروریات بطور تحفہ بھیجی تھیں۔"

ایک دوسرے مسیحی مصنف "یورجا" لکھتے ہیں :

"صلیبوں نے بیت المقدس کی طرف اپنا سفر نہایت ہی برے حالات میں شروع کیا۔ ان لوگوں کا ایک گروہ راستے میں آنے والے مسلمانوں کو قتل و غارت کرتا ہوا جاتا۔ انہوں نے جن علاقوں کو فتح کیا۔ ان پر ناقابل تصور مظالم ڈھائے۔ یہ مقتولوں کے پیٹ پھاڑ کر آنتوں میں بھی اشرفیاں تلاش کرتے۔ ان کے مقابلے میں صلاح الدین کا رویہ یہ تھا کہ جب انہوں نے بیت المقدس واپس لیا تو اس نے تمام صلیبوں کو عام معافی دے دی۔ اور ان کے ساتھ جو معاہدے بھی ہوئے وہ اس نے پورے کیئے۔ مسلمانوں نے دشمنوں کے ساتھ نہایت ہی حسن سلوک کا مظاہرہ کیا اور ان کے ساتھ نہایت ہی نرمی اور شفقت سے معاملہ کیا۔ یہاں تک کہ صلاح کے بھائی ملک عادل نے ہزار قیدیوں کو چھڑایا اور تمام آرمینیوں پر احسان کیا اور بطریق کو اجازت دی کہ وہ صلیب لٹکا کر چلے اور کنیسہ کے جامے زیب تن کرے اور شہزادیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنے شوہروں اور بادشاہوں سے ملیں۔"

یہاں فی ظلال القرآن میں ہم صلیبی جنگوں کی تمام تاریخ نہیں دہرا سکتے کیونکہ یہ بہت طویل ہے۔ لیکن ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ طویل جنگ صلیبوں کی طرف سے موقوف نہ کی گئی البتہ یہاں مناسب ہے کہ ہم زنجبار کے حالیہ واقعات دے دیں جہاں ۱۲ ہزار افراد کو تہ تیغ کیا گیا اور بقیہ لوگوں کو سمندر کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیا گیا اور ملک سے سمندر میں پھینک دیا گیا اور حالیہ قبرص کے واقعات بھی ذرا دیکھیں کہ قبرص کے مسلمان علاقوں پر پانی اور راشن بھی بند کر دیا گیا کہ لوگ بھوک ہی سے مر جائیں۔ اریٹریا میں حکومت حبشہ جو کچھ رہی ہے اور کینیا میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے جو صومالی نسل کے ہیں اور جو اپنے حقیقی ملک صومالی کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں اور جنوبی سوڈان میں عیسائیوں کے جو منصوبے ہیں وہ کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔

موجودہ دور کے صلیبوں کا اسلام کے بارے میں جو نقطہ نظر ہے وہ درج ذیل اقتباس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ یہ اقتباس جس کتاب سے لیا گیا ہے وہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف لکھتے ہیں :

"ہمیں مختلف قوموں سے ڈرایا جاتا رہا ہے۔ لیکن تجربے نے بتایا کہ ہمارا یہ خوف بے جا تھا۔ اس سے قبل ہمیں یہودی خطرے سے ڈرایا گیا۔ پھر جاپان کے خطرے سے' پھر سوشلسٹ روس کے خطرے سے' لیکن یہ تمام ڈراوے غلط ثابت ہوئے۔ ہم نے پایا کہ یہود ہمارے دوست تھے' لہٰذا یہودیوں کا دشمن ہمارا سخت دشمن ہو گا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ روسی ہمارے دوست ہیں۔ رہے مشرق بعید کے لوگ تو وہاں تو بڑی بڑی جمہوریتیں پائی جاتی ہیں۔ جبکہ ہمارے لئے

حقیقی خطرہ اسلامی نظام میں پوشیدہ ہے۔جس میں توسیع اور چھا جانے کی قوت موجود ہے اور اس میں زندگی کے عنصر موجود ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ یورپی استعمار کے مقابلے میں صرف اسلام ایک مضبوط دیوار ہے۔" (دیکھئے جارج براؤن کی کتاب بحوالہ تبشیر و استعمار در بلاد عربیہ۔مصنف ڈاکٹر معصر۔)

---○○○---

اس سرسری جائزے سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں جو احکام نازل ہوئے ہیں وہ ان حقائق کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھ کر نازل ہوئے ہیں اور ان وجوہات میں سے اہم وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی نظام اس پورے کرۂ ارض کے انسانوں کے لئے ایک اعلان آزادی ہے اور اس کے مقابلے میں جاہلیت کا مشن یہ ہے کہ وہ اس پورے کرۂ ارض پر اسلامی تحریکات کے قلع قمع کرنے کے لئے رات دن سرگرم عمل ہے۔کیونکہ یہ تحریکات انسان کی آزادی کی تحریک کی حامل ہیں۔لہٰذا یہ آخری احکام کسی زمان و مکان کے ساتھ محدود نہیں ہیں۔اگرچہ یہ آخری احکام مراحل ماقبل میں وارد احکام کو منسوخ نہیں کرتے۔اور ان احکام پر ویسے ہی حالات اور مراحل میں عمل کیا جا سکتا ہے۔جن میں وہ نازل ہوئے تھے۔کیونکہ ہر دور میں تحریک احیائے اسلام کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مختلف مراحل سے ہو کر گزرتی ہے کیونکہ تحریک اسلامی ایک عملی تحریک ہوتی ہے اور اسے انسانی معاشرے کے عملی حالات سے گزرنا ہوتا ہے۔جس کے متعدد مراحل ہوتے ہیں اور جس کے لئے جدید سے جدید وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سورت میں جو احکام وارد ہیں یہ بھی جزیرۃ العرب کے ایک عملی مرحلے میں نازل ہوئے تھے۔غزوہ تبوک کے مرحلے میں تحریک اسلامی کو جن حالات سے سابقہ تھا ان حالات کے لئے یہ قانون بنایا گیا تھا۔اس وقت جزیرۃ العرب کے شمال میں رومی ایک عظیم لشکر تیار کر رہے تھے تاکہ اسلام کی تحریک کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا جائے۔سورت توبہ کے تمام مضامین میں اسی غزوہ کے ارد گرد گھومتے ہیں لیکن اہل کتاب نے اسلام کے ساتھ جو سلوک کیا یا اسلام کے مقابلے میں انہوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ کسی مرحلے اور زمان و مکان تک موقوف نہ تھا۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل کتاب کی اسلام دشمنی تحریک اسلامی کے تمام مراحل میں علانیہ تھی اور ہمیشہ اعلانیہ رہے گی۔الا یہ کہ مسلمان اسلام کو پوری طرح خیر آباد کہہ دیں۔ان لوگوں کا عناد اسلام کے ساتھ بہت شدید ہے۔انہیں اس پر اصرار ہے کہ اسلام ختم ہو اور یہ نہایت ہی گہرا عناد ہے۔وہ اسلام کے خلاف ہر وسیلہ کام میں لاتے ہیں' لاتے رہے ہیں اور رہیں گے۔لہٰذا یہ احکام جو اس سورت میں دیئے گئے ہیں یہ وقتی نہیں ہیں اور نہ مرحلہ وار ہیں۔لیکن ان احکام پر عمل ایسے ہی مرحلے میں ہو گا جن میں وہ نازل ہوئے اور ان احکام کو ان کے مرحلی حالات کے دائرے میں سمجھنا چاہئے۔اور ان احکام کو ان حالات سے علیحدہ کر کے نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ ہی ان ضعیف مسلمانوں کو اس پر کلام کرنا چاہئے جن میں اسلام کی صرف یہ بات رہ گئی کہ انہیں مسلمانوں کی اولاد کہا جا سکتا ہے اور جو ذہنا اور جسما ضعیف و ناتواں ہیں اور اپنا ضعف و ناتوانی اسلام کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام میں فقہی احکام تحریک اسلامی کی عملی ضروریات کے تحت دیئے گئے۔لہٰذا ان احکام کو صرف ان حالات کے فریم ورک میں رکھ کر اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔نصوص و آیات کو حالات سے علیحدہ کر کے سمجھنے میں اور ان کو اسلام کی تحریکی حالات کے دائرے میں رکھ کر سمجھنے میں بہت بڑا فرق ہے۔لہٰذا اسلامی نظام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام

کے تحریکی منہاج عمل کو سمجھا جائے۔ کیونکہ اسلامی تحریک اور اسلامی نظام ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہم اسلام کو واقعی صورت حال کے تابع نہیں کر سکتے الا یہ کہ کسی واقعی حالات کو اسلام نے تخلیق کیا ہو' ایسی واقعیت عین اسلام ہوگی۔

اس نکتے کی روشنی میں ہم ان احکام کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو اسلامی معاشرے کے ساتھ اہل کتاب کے بین الاقوامی تعلقات کی ضابطہ بندی کے سلسلے میں دیئے گئے ہیں جبکہ اسلامی تحریک عملاً جاری تھی اور وہ ایک زندہ تحریک اور مثبت عمل کی شکل میں تھی محض فلسفہ نہ تھا۔

اس تمہید کے بعد اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں آیات کی تشریح کی طرف آنا چاہئے۔

---ooo---

درس نمبر ۸۸ تشریح آیات

۲۹ --- تا --- ۳۵

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۵
۱۰

"جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔"

یہ آیت اور سیاق کلام میں اس کے پیچھے آنے والی آیات 'غزوۂ تبوک کی تمہید تھیں۔ اور عربوں میں عیسائی شمال کے غسانی تھے۔ یہ رومیوں کے مقرر کردہ حاکم تھے۔ ان آیات میں جن صفات کا ذکر ہے وہ اس قوم کی دائمی اور واقعی صفات ہیں جن کے لئے اعلان قتال ہو رہا ہے۔ یہ ایک قائم اور دائم صورت حال ہے جس کے خدوخال ہمیشہ سے ایسے ہی رہے ہیں۔ ایسے مواقع پر قرآن کریم جو انداز کلام اختیار کرتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دائمی صورت حال ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس لئے مذکور نہیں ہوئیں کہ یہ آغاز قتال کے لئے اسباب یا شرائط ہیں بلکہ ان شرائط و صفات کو بطور امر واقعہ یہاں گنوایا ہے۔ ہاں یہ صفات ان کے ساتھ جنگ کرنے کا وجہ جواز ضرور ہیں۔ لہٰذا جن لوگوں کے اندر یہ صفات پائی جائیں ان کے ساتھ جنگ کا جواز ہو گا۔

یہاں ان صفات کی تحدید ان امور میں کی گئی ہے۔

۱۔ کہ یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔

۲۔ انہوں نے ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔

۳۔ یہ کہ وہ سچے دین کو نہیں اپناتے۔

اور اس کے بعد آنے والی آیات میں یہ تفصیل دی گئی ہے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر کس طرح ایمان نہیں لاتے۔ اور وہ کس طرح اللہ اور رسول کے حرام کئے ہوئے امور کو حرام نہیں قرار دیتے اور کس طرح دین حق پر عمل پیرا نہیں ہوتے؟ یوں کہ

۱۔ یہودیوں نے کہا کہ حضرت عزیر ابن اللہ ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح ابن اللہ ہیں۔ اور ان لوگوں کا یہ نظریہ ان نظریات سے ملتا جلتا ہے جو ان سے پہلے بت پرستوں نے اپنائے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے ان اعتقادات کی وجہ سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے تصور نہ ہوں گے۔ (آگے ہم حقیقتاً ثابت کریں گے کہ یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے)۔

۲۔ ان لوگوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے۔ اسی طرح یہ مسیح ابن مریم کو بھی رب سمجھتے ہیں اور یہ عقیدۂ دین حق سے متضاد ہے۔ دین حق یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔ اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور یہ لوگ اس قسم کا اعتقاد نہیں رکھتے۔

۳۔ ان لوگوں کا ارادہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی اس نئی روشنی کے چراغ کو گل کر دیں۔ اس طرح یہ لوگ ہر وقت دین اسلام کے خلاف بر سرپیکار ہیں۔ اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والا ہو وہ دین حق کے چراغ کو گل کرنے کی سعی کبھی نہیں کرتا۔

۴۔ احبار و رہبان کی اکثریت ایسی ہے' جو لوگوں کے اموال کو باطل طریقے سے کھاتی ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اس چیز کو حرام نہیں قرار دیتے جسے اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ یہاں رسول سے مراد عام ہے۔ چاہے وہ ان کا رسول مراد ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ وہ اپنی شریعت پر نہیں چلتے یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے تو مطلب ہو گا وہ اسلامی نظام کو تسلیم نہیں کرتے۔

نصارائے شام و روم میں یہ صفات واقعی اور حقیقی تھیں اور دوسرے نصاریٰ کے معاملے میں بھی یہ درست تھیں جنہوں نے دین مسیح علیہ السلام میں تحریف کر دی تھی۔ اور اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ حضرت عیسیٰ ع اللہ کے بیٹے ہیں اور اقانیم ثلاثہ کے قائل ہو گئے اور پھر ان کے درمیان مختلف فرقوں کے درمیان اس مسئلے پر شدید اختلافات پیدا ہوئے۔

لہٰذا یہ ایک عام حکم ہے اور اہل کتاب کے ساتھ معاملات طے کرنے کے سلسلے میں یہ ایک اصولی قاعدہ ہے۔ جن اہل کتاب پر یہ صفات منطبق ہوں گی جو شام و روم کے ان اہل کتاب میں موجود تھیں تو ان کے ساتھ یہی معاملہ ہو گا۔ اس آیت کے عموم کو ان احادیث نے مخصوص نہیں کر دیا۔ جن میں بعض افراد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان سے نہ لڑا جائے۔ مثلاً بچے' عورتیں اور عاجز بوڑھے اور وہ عبادت گزار راہب جنہوں نے اپنے آپ کو صرف عبادت کے لئے عبادت گاہوں میں بند کر لیا ہے۔ بشرطیکہ ایسے لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں۔ کیونکہ اسلام نے تمام ملل کے ایسے لوگوں سے ساتھ جنگ کرنے سے منع کیا ہے جو نہیں لڑتے۔ جن لوگوں کو احادیث میں مستثنیٰ کیا ہے' ان کو اس لئے مستثنیٰ نہیں کیا گیا کہ وہ لوگ جنگ نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ وہ جنگ کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان استثنائی نصوص سے یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی پالیسی یہ ہے کہ جو لڑتا ہے اس سے لڑو۔ یہ رائے رکھنے والے لوگ ذہناً شکست خوردہ

ہیں اور بزعم خود اسلام کی مدافعت کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اہل کتاب کی جانب سے جارحیت بہرحال قائم ہوتی ہے۔ انہوں نے اللہ کی بادشاہت پر دست درازی کی ہوتی ہے۔ نیز انہوں نے پوری انسانیت پر بھی دست درازی کی ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کو انسانوں کا غلام اور بندہ بناتے ہیں اور اسلام نے اپنے اوپر یہ فریضہ لیا ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت پر دست درازی کرنے والوں کا ہاتھ روکے اور پھر انسان کی آزادی پر دست درازی کرنے والوں کا بھی ہاتھ روکے۔ یہ ہوتی ہے جاہلیت اور جاہلیت کا مقابلہ جنگ' قوت اور اسلحہ سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے حقیقی صورت حال اور اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں ہے۔

یہ آیت اہل اسلام کو حکم دیتی ہے کہ وہ اہل کتاب کے خلاف جنگ کریں۔ اَلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے۔" اور جو لوگ حضرت عزیر کو ابن اللہ سمجھتے ہیں اور حضرت مسیح کو ابن اللہ سمجھتے ہیں ان لوگوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ حضرت مسیح کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ابن اللہ ہیں' وہ بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ یا جو کہتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ ---- یا ---- اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ یا وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے مسیح کی صورت میں جسمانی شکل اختیار کی۔ اور وہ تمام عقائد جو مسیحی مجالس مذہبی نے از خود طے کئے اور پھر بھی وہ ان کے بارے میں مختلف الرائے رہے۔ یا وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ وہ تو دوزخ میں صرف چند دنوں کے لئے داخل ہوں گے اگرچہ وہ عظیم گناہوں کا ارتکاب کریں کیونکہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ یا اس کے پسندیدہ ہیں۔ یا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مسیحی بننے سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں یا عشائے مقدس کے کھانے میں شریک ہونے سے معاف ہو جاتے ہیں۔ اور یہ کہ مغفرت کا یہی واحد طریقہ ہے۔ تو ایسے تمام لوگوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے والے ہیں۔

یہ آیت اہل کتاب کی یہ صفت بیان کرتی ہے کہ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (۹ : ۲۹) یہاں رسول سے مراد خود ان کی طرف فرستادہ رسول ہو یا حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوں' معنی ایک ہی ہے۔ آیت نے اس مفہوم کی تشریح اگلی آیت میں کر دی ہے کہ یہ لوگ دوسروں کے اموال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں اور دوسروں کا مال باطل طریقے سے کھانا تمام رسولوں نے حرام قرار دیا ہے اور لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانے کی ایک مثال سودی کاروبار ہے۔ اور اہل کنیسا نے اس سودی کاروبار کی اجازت دے کر سود خواروں کے نام بخشش کا چیک جاری کر دیتے تھے۔ یوں وہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روکتے تھے۔ اور دین پر عمل کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتے تھے اور اہل ایمان کو فتنے میں ڈالتے تھے۔ یوں وہ لوگوں کو غیراللہ کی بندگی میں داخل کرتے تھے اور ان کو ایسے احکام و قوانین کے تابع بناتے تھے جن کو اللہ نے نازل نہ کیا تھا۔ ان تمام امور پر یہ آیت صادق آتی ہے وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (۹ : ۲۹) اور یہ تمام باتیں اہل کتاب کے اندر پوری طرح پائی جاتی تھیں اور آج بھی ان میں یہ امور اسی طرح موجود ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ آیت میں آگے ان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (۹ : ۲۹) یہ

ان کے سابقہ مذکور بالا رویہ کی مزید تشریح ہے کیونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنا دین حق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اللہ کے قوانین کو چھوڑ کر کسی اور قانون پر چلنا دین حق نہیں ہو سکتا۔ اللہ کو چھوڑ کر احکام و ہدایات کسی اور منبع سے لینا صحیح دین نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے سوا کسی اور کے اقتدار اعلیٰ کی اطاعت کرنا بھی دین حق نہیں ہو سکتا اور یہ صفت اہل کتاب میں جس طرح اس وقت قائم تھی آج بھی قائم ہے۔

یہ شرط نہیں کیا گیا کہ جب تک وہ مسلمان نہیں ہو جاتے ان سے لڑا جائے۔ کیونکہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا اصول اپنی جگہ قائم ہے بلکہ یہ شرط لگائی گئی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس شرط میں کیا راز ہے۔ اور اس انتہا پر پھر قتال کیوں رک جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا صفات کے ساتھ اہل کتاب کا وجود ہی اسلام کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اسی طرح وہ جہاں بھی ہوں اسلامی نظام کے خلاف اور اسلام کے معاشرہ کے خلاف عین جنگ میں ہیں کیونکہ اسلامی نظام اور اہل کتاب کے نظریات کے درمیان عین تضاد ہے جیسا کہ مذکور بالا آیات کے اندر اس کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر ہم نے تاریخی واقعات اور تاریخی طرز عمل سے بتایا کہ اہل کتاب اسلامی نظام کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ عملاً دین اسلام کی راہ روکتے ہیں اس کے خلاف جنگ کرتے ہیں' مسلمانوں کے خلاف وہ ہر وقت برگرم رہتے ہیں۔ ان آیات کے نزول کے بعد آج تک ان کی حالت یہی رہی ہے۔

اسلام اس کرۂ ارض پر ایک دین برحق ہے۔ اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی راہ سے ناجائز مادی رکاوٹوں کو دور کرے۔ اور تمام انسانوں کو دین حق (اسلام) کے علاوہ تمام دینوں سے آزاد کر کے چھوڑے کہ وہ جبری حالت سے نکل کر آزادانہ' جو دین چاہیں اختیار کریں۔ ہر انسان کو آزادانہ طور پر یہ اختیار ہو کہ وہ جو دین چاہے اختیار کرے۔ کوئی بھی دین اختیار کرنے کے سلسلے میں اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

یہ حق کہ کوئی انسان کسی مادی رکاوٹ کے ہاتھوں مجبور نہ ہو اور اسلام یا غیر اسلام کوئی بھی دین قبول کرنے کے لئے آزاد ہو' تب ہی محقق ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کی قوت اور شوکت کو توڑ دیا جائے۔ تمام غیر اسلامی قوتیں اسلامی مملکت کے تابع ہوں اور اسلامی نظام کی باج گزار ہوں۔

باج گزاری کے عمل سے انسان کی آزادی اپنی تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ ہر فرد جس دین کو چاہے اختیار کرتا ہے جو فرد اسلام پر مطمئن ہو وہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص مطمئن نہ ہو وہ اپنے دین پر باقی رہتا ہے۔ لیکن اس آزادی کی فیس اسے بطور جزیہ ادا کرنی ہوگی اور اس سے درج ذیل مقاصد حاصل ہوں گے :۔

۱۔ جزیہ دے کر وہ اعلان کر رہا ہو گا کہ اب وہ اسلام کی دشمنی میں کوئی مادی قوت بطور رکاوٹ کھڑی نہ کرے گا اور دعوت اسلامی کا سدراہ نہ ہو گا۔

۲۔ وہ اپنے مال اور عزت کے دفاع اور آزادی کے حق جس کی ضمانت اسے اسلام دیتا ہے' کے عوض اخراجات میں مملکت میں اپنا حصہ ادا کرے گا۔ کیونکہ جو لوگ جزیہ دیتے ہیں اسلامی نظام مملکت ان کے مال اور جان اور آبرو کا محافظ ہوتا ہے۔ اور ان کی جانب سے دفاع کرتا ہے۔ خواہ خارجی حملہ ہو یا داخلی امن و امان ہو۔

۳۔ پھر یہ کہ وہ بیت المال میں اپنا حصہ ادا کرے گا جس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی کفالت کا بندوبست ہوتا

ہے۔ تمام ایسے لوگوں کو بیت المال سے وظیفہ دیا جاتا ہے جو کسب و عمل پر قادر نہ ہوں خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہو جبکہ غیر مسلموں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

ہم اس سے آگے فقہی اختلافات میں نہیں پڑتے کہ کن کن غیر مسلموں سے جزیہ لیا جائے گا اور یہ کہ جزیہ کی مقدار کیا ہو گی اور یہ کہ اس کی وصولی کا طریقہ کار کیا ہو گا؟ کیونکہ آج ہمارے سامنے کوئی عملی مسائل اس قسم کا درپیش نہیں ہے۔ فقہاء کے دور میں یہ مسئلہ عملاً درپیش تھا اس لئے انہوں نے اپنے دور کے لئے احکام جاری کئے اور فتوے دیئے اور ان مسائل پر اجتہادی کلام کیا۔

آج یہ مسئلہ ایک تاریخی مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ واقعی سوال نہیں ہے اس لئے کہ آج مسلمان عمل جہاد میں سرگرم نہیں ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ حقیقی مسلمان ہمارے دور میں کمیاب ہیں۔ آج ہمارے سامنے حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ آج اسلام موجود ہے یا دنیا میں موجود ہیں یا نہیں۔

اسلامی نظام حیات کیا ہے؟ جیسا کہ ہم نے بار بار اس سوال کا جواب دیا کہ وہ ایک سنجیدہ اور عملی نظام ہے۔ یہ نظام محض ہوائی باتوں پر بحث و جدال نہیں کرتا۔ نہ وہ ایسے فقہی مباحث میں دماغ سوزی کو ضروری سمجھتا ہے جو عملاً موجود نہ ہوں کیونکہ عالم واقعہ میں مسلمانوں کی کوئی سوسائٹی موجود نہیں ہے۔ جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو۔ اور اسلامی فقہ اس کی عملی زندگی پر متصرف ہو۔ اسلام ایسے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جو مفروضے گھڑتے ہیں اور پھر ان پر مباحث کے سلسلے اٹھاتے ہیں۔ ان کو اسلامی اصطلاح میں "ارئیتی" کہا جاتا ہے جو اس طرح سوال کرتے ہیں "دیکھو' اگر یوں صورت حالات واقعہ ہو جائے تو کیا حکم ہو گا؟"

آج ہمیں احیاء اسلام کے کام کا آغاز اسی مقام سے کرنا ہے جس سے حضور اکرم ؐ نے کیا تھا اور وہ یہ کہ دنیا میں کوئی ایسی سوسائٹی وجود میں آئے جو حکومت الہیہ قائم کر کے اس میں دین اسلام نافذ کر دے۔ وہ پہلے شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے اور محمد رسول اللہ ہیں' شارع ہیں۔ لہذا ہماری سوسائٹی میں اللہ حاکم اور شارع ہے۔ اور ہم اللہ و رسول کے احکام کو اس سوسائٹی میں نافذ کرنے والے ہیں اور پھر وہ اس نظر کو لے کر پوری دنیا میں آزادی انسان کا بیڑا اٹھائیں اور پھر جب حکومت الہیہ قائم ہو گی اور کسی اسلامی سوسائٹی میں نافذ و جاری ہو گی تو تب جا کر یہ سوال اٹھے گا کہ اس سوسائٹی کے تعلقات دوسری ملل و نحل کے ساتھ کیا ہوں گے اور اسی وقت ان فقہی تحقیقات کی ضرورت ہو گی اور اس وقت پھر ماہرین اور اہل فکر و نظر اس وقت کے متعین حالات میں یہ فیصلہ کریں گے کہ اب دوسری ملتوں کے افراد اور حکومتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کیا ہوں گے؟"

ہم نے اصولی طور پر اس آیت کی تشریح یہاں کر دی ہے جس اصول اعتقاد اور اسلامی نظام کے منہاج کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اور اسی پر ہم یہاں اپنی بات کو روک دیتے ہیں۔ آج ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ یہاں فروعی مباحث پر کلام شروع کر دیں کیونکہ اسلامی نظام حیات ایک حقیقت پسندانہ اور عملی نظام ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن

قَبْلُ ۚ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾

”یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے‘ اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے۔ خدا کی مار ان پر‘ یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں۔“

جب اللہ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ جنگ شروع کر دیں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دے کر اپنے آپ کو چھوٹا ثابت نہیں کرتے۔ تو اس وقت مدینہ طیبہ کی اسلامی حکومت کو کچھ عملی حالات درپیش تھے اور اس سورت کے آغاز میں ہم نے ان پر تفصیلی بحث کی ہے۔ پھر ان کے بارے میں سورت کے حصہ اول پر اجمالی تبصرے میں بھی ہم نے بحث کی ہے۔ یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ان حالات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے نیز ان اسباب کو بھی اچھی طرح متعین کرنا چاہئے جن کی وجہ سے وہ حالات پیدا ہوئے. تاکہ ان تمام شبہات و خلجانات کو رفع کر دیا جائے جو بعض لوگوں کے اذہان میں پیدا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حکم پر تعمیل کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان رومیوں کے مقابلے میں نکل آئیں جو اس وقت اطراف شام پر قابض تھے۔ اسلام سے پہلے بھی رومی عرب قبائل سے خوف کھاتے تھے کیونکہ یہ لوگ ایک طویل عرصے سے عرب کے شمالی علاقوں پر قابض تھے۔ عرب قبائل کے اندر بھی ان کی دوستیاں اور تعلقات تھے۔ شمال میں غسانیوں کی حکومت ان کی باجگزار تھی۔ لہذا مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان یہ پہلی مڈبھیڑ نہ تھی۔ یعنی جب عربوں کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ سے عزت بخشی اور وہ ایک عظیم قوم کی شکل میں فارس اور روم جیسی عظیم قوتوں کے مقابلے میں اتر آئے اور اس سے پہلے تو وہ منتشر قبائل تھے اور ان کی بہادری اور جنگجوئی کے قصے صرف باہم قتل و قتال‘ ڈاکوں اور لوٹ مار کی کہانیوں پر مشتمل تھے لیکن اس کے باوجود رومیوں کے دلوں میں عربوں کا خوف بہرحال بیٹھا ہوا تھا۔ خصوصاً ان لوگوں کا خوف جنہوں نے ابھی تک پوری طرح اسلامی رنگ اختیار نہ کیا تھا۔ رومیوں کے ساتھ آخری ٹکراؤ اور جھڑپ غزوہ مؤتہ کی شکل میں ہوا تھا جس میں روایات کے مطابق دو لاکھ سے زیادہ رومی جمع ہوئے تھے اور اس غزوہ کا نتیجہ مسلمانوں کے مقاصد کے مطابق برآمد بھی نہ ہوا تھا۔

ایک تو یہ حالات تھے کہ اسلامی معاشرے کے اندر ابھی تک تطہیر افکار کا کام مکمل نہ ہوا تھا‘ دوسرے یہ کہ رومیوں کی جانب سے ایک عام خوف بھی مسلمانوں کے دلوں میں تھا اور پھر یہ غزوۂ تبوک جن حالات میں درپیش تھا‘ معاشی لحاظ سے اور دوسرے حالات کے لحاظ سے بھی یہ بہت ہی تنگی کا وقت تھا۔ اسی لئے اسے غزوۂ عسرت کہا گیا ہے۔ تفصیلی حالات بعد میں بیان ہوں گے۔ پھر مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات بھی تھی کہ رومی اور ان کے ایجنٹ عرب بہرحال اہل کتاب میں سے تو ہیں۔ یہ تھے وہ وجوہات جن کی بنا پر یہاں اس بارے میں زیادہ سے زیادہ وضاحتیں کی گئیں اور فیصلہ کن اور دوٹوک انداز بیان اختیار کیا گیا۔ اور تمام ذہنی خلجان اور نفسیاتی الجھنوں کو دور کر دیا گیا۔ اور ان احکام کے حقیقی اسباب اور عوامل بھی بتائے گئے۔

چنانچہ آیت زیر بحث میں قرآن کریم ان اہل کتاب کی فکری ضلالت کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کا نظریہ اور عرب

گمراہوں کا نظریہ اور بت پرستوں کا نظریہ باطل باہم مماثل اور ہم رنگ ہے۔ عرب بت پرستوں اور قدیم رومی بت پرستوں اور ان عیسائیوں کے درمیان کوئی نظریاتی فرق نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کو جو صحیح عقیدے دیئے تھے اس پروہ ثابت قدم نہیں ہیں لہٰذا ان کی حیثیت اہل کتاب محض نام کی رہ گئی ہے۔ ان کی کتابوں کے اندر ان کو جو صحیح اور درست نظریات و اعتقادات دیئے گئے تھے وہ انہوں نے ترک کر دیئے ہیں۔

یہاں یہودیوں کے اس قول کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں حالانکہ روئے سخن اور عملاً مقابلہ صرف رومیوں کے ساتھ تھا جو عیسائی اور نصاریٰ تھے۔ یہاں یہودیوں کو دو وجوہات سے بیچ میں لایا گیا ہے۔

۱۔ یہ کہ پہلی آیت عام تھی۔ کیونکہ اہل کتاب کا اطلاق یہودی و عیسائی دونوں پر ہوتا تھا۔ اور آیت سابقہ میں لڑنے کے بارے میں اور جزیہ وصول کرنے اور ان کو چھوٹا بنا کر رکھنے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ تمام اہل کتاب کے برخلاف تھا۔ لہٰذا یہاں اہل کتاب کی نظریاتی اور اعتقادی ضلالت کے ذکر میں بھی دونوں کو شامل کیا گیا کہ نظریاتی اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ عرب کے تمام یہودی نے ہجرت کر کے اطراف شام میں آباد ہو گئے تھے۔ جب سے رسول اللہ اور مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، یہودیوں نے اسلام کے خلاف جنگ جاری رکھی تھی جس کے نتیجے میں بنی قینقاع اور بنی نضیر اطراف شام کی طرف جلاوطن ہو گئے تھے۔ بنی قریظہ کے بعض افراد بھی۔ لہٰذا شام کی طرف اسلامی انقلاب کی وسعت کی راہ میں یہودی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا اس حکم میں یہودیوں کو شامل کرنا بھی ضروری تھا۔

نصاریٰ کا قول کہ مسیح ابن اللہ ہیں' مشہور و معروف ہے۔ اور جب سے پولوس نے ان کو گمراہ کیا ہے' اس کے بعد آج تک وہ اسی عقیدے پر قائم ہیں۔ پھر پولوس کے بعد ان کی مذہبی کانفرنسوں نے پولوس کے عقائد کو سرکاری شکل دے کر ان کو مکمل گمراہ کر دیا۔ لیکن یہودیوں کا یہ عقیدہ کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں' بہت مشہور ہے۔ یہودیوں کی کتب مقدسہ میں ایک شخص عزرا کے نام سے مذکور ہے۔ اور اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کی تورات کا ماہر کاتب تھا۔ یہ کہ اس نے اپنے دل کو شریعت ربانی کی تلاش کی طرف متوجہ کیا لیکن قرآن نے ان کی جانب سے جو عقیدہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی اس کے قائل تھے خصوصاً وہ یہودی جو اطراف مدینہ میں بستے تھے۔ قرآن کریم مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ عملاً ہمکلام تھا۔ اس نے یہ عقیدہ نقل کیا ہے۔ اگر یہودیوں کے اندر یہ عقیدہ نہ ہوتا تو وہ فٹ کہہ دیتے کہ قرآن نے یہ غلط کہا ہے، 'ہمارا تو یہ عقیدہ نہیں ہے۔ لیکن مدینہ کے یہودیوں کی جانب سے اس موضوع پر مکمل سکوت ہے۔ لہٰذا کم از کم اس وقت کے یہودیوں میں یہ عقیدہ مروج تھا۔

تفسیر منار کی ج ۱۰ میں مرحوم رشید رضا نے ص ۳۸۵ تا ۳۸۷ عزرا کے بارے میں یہودیوں کے نظریات پر مفید بحث کی ہے۔ یہاں ہم اس سے چند فقرات نقل کرتے ہیں جو نہایت ہی مفید رہیں گے۔ وہ کہتے ہیں۔

"جیوس انسائیکلوپیڈیا طبع ۱۹۰۳ء میں ہے کہ عزرا کا زمانہ یہودیوں کی تاریخ کا موسم بہار تھا۔ جس میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے' اسے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس نے شریعت کی گاڑی چلائی۔ اگر موسیٰ علیہ السلام پر شریعت

نازل نہ ہوئی ہوتی۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد شریعت کو بھلا دیا گیا تھا۔ عزرا نے شریعت کو دوبارہ پیش کیا اور زندہ کیا۔ اگر بنی اسرائیل غلطیاں نہ کرتے تو وہ اسی طرح کے معجزات دیکھتے جس طرح انہوں نے حضرت موسیٰ کے عہد میں دیکھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آشوری رسم الخط میں شریعت کو لکھا۔ جن الفاظ میں انہیں شک نظر آتا ان پر وہ علامت ڈال دیتا۔ یہودیوں کی تحریری تاریخ کے لئے ان کا عہد ماخذ ہے۔"

جارج لوسٹ کتاب مقدس کی ڈکشنری میں لکھتے ہیں: عزرا یہودی کاہن ہے اور مشہور اہل قلم تھا جو طویل القامت ارتخششتا کے دور میں بابل میں رہائش پذیر تھا۔ اس بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کے ساتویں سال عزرا کو اجازت دی کہ اپنی قوم کی ایک بڑی تعداد کو لے کر یروشلم چلا جائے۔ یہ تقریباً ۴۵۷ ق م کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ چار ماہ میں وطن پہنچے۔"

"اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں کے عقائد کے مطابق عزرا کا مقام موسیٰ اور ایلیاہ کے برابر ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک بہت بڑی اکیڈمی قائم کی اور کتاب المقدس کے مختلف اسفار کو جمع کیا اور قدیم عبرانی حروف کے بجائے اسے کلدانی حروف میں لکھا۔ انہوں نے الایام اور عزرا اور نحمیاہ کے اسفار تالیف کئے۔"

"مزید کہتے ہیں کہ "عزرا" کی زبان ص ۴ : ۸ - ۶ : ۱۹ کلدانی ہے اسی طرح ص ۷ : ۱۲ - ۲۷ یہ لوگ غلامی سے واپس آنے کے بعد عبرانی مقابلے میں کلدانی زبان اچھی طرح سمجھتے تھے۔"

"میں کہتا ہوں کہ تمام اقوام اور خصوصاً اہل کتاب کے درمیان مشہور یہ ہے کہ جس تورات کو حضرت موسیٰ نے لکھا تھا اور جسے تابوت میں یا اس کے پاس رکھا تھا۔ وہ عہد سلیمان سے گم ہو گئی تھی۔ کیونکہ ان کے زمانے میں جب تابوت کھولا گیا تو اس میں صرف وہ دو تختیاں تھیں جن میں دس وصیتیں تحریر تھیں۔ جیسا کہ سفر ملوک (۱) میں درج ہے۔ اور دراصل بعد میں تورات وغیرہ کو عزرا نے لکھا اور یہ بابل کی غلامی کے دور کے بعد کلدانی رسم الخط میں تحریر ہوئی۔ کلدانی زبان میں کچھ عبرانی الفاظ بھی شامل تھے جسے یہودیوں نے بھلا دیا تھا۔ اہل کتاب کہتے ہیں کہ عزرا نے اسے اس طرح لکھا کہ گویا وہ اللہ کی طرف سے وحی ہے یا الہام ہے لیکن غیر لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں بہت بڑے شکوک و شبہات اور اعتراضات کیے گئے ہیں جو تفصیل کے ساتھ ان کتابوں میں مذکور ہیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ خود اہل کتاب کی کتابوں میں بھی یہ مذکور ہیں مثلاً کیتھولک دین وغیرہ) جو فرانسیسی میں لکھی گئی جس کے فصل گیارہ اور بارہ میں خصوصاً یہ اعتراضات تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں کہ آیا موسیٰ کے اسفار خمسہ اس میں سے ہیں یا نہیں۔"

"سفر عزرا میں ہے (۴ ف ۱۴ نمبر ۲۱) کہ تمام مقدس اسفار آگ میں جل گئے تھے اور یہ بخت نصر کے دور میں۔ اس میں ہے "آگ نے تمہاری شریعت کو باطل کر دیا ہے' اس لئے کسی کے لئے یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ تم نے کیا کیا۔ (میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کلام صادق ہے' اور اس نے یہ خبر دی ہے کہ تابوت میں بقیہ تھا) مزید یہ کہ عزرا نے روح القدس کی وحی کے ذریعے ان اسفار مقدسہ کو دوبارہ جمع کیا جنہیں آگ نے جلا دیا تھا۔ اور ان کی تالیف میں' ان کے معاصر پانچ لکھنے والوں نے ان کی امداد کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ پادری ترتلیانوس' پادری ایریناؤس' ایرونیموس اور پادری یوحنا' پادری باسلیوس وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ عزرا معروف اسفار مقدسہ کا ترمیم کنندہ ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں۔"

''میں سمجھتا ہوں یہاں اس قدر کافی ہے لیکن یہاں ہم دو باتیں عرض کریں گے 'ایک کہ یہ تمام اہل کتاب اس عزرا کے مرہون منت ہیں جس نے ان کے دین کی اساس کو قائم کیا۔ اور ان کے دین کے کتب مقدسہ کو مرتب کیا۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ مستند کتب نسیاں اور غلطی سے محفوظ نہیں ہیں اور یہ بات آزاد یورپین محققین نے تسلیم کی ہے۔

(ہم فی ظلال القرآن میں محمد عبدہ کی مدرسہ فکر کے اس طریقہ اظہار کی طرف تنبیہہ کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ مغرب کی آزاد فکر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جو اسلامی طرز فکر سے اجنبی ہے۔ یہ لوگ اپنی اس طرز فکر کی وجہ سے یورپ کے آزاد خیال مفکرین کو اہمیت دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ مغرب کے جمہوری اداروں' بنیادی حقوق اور طرز حیات کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ ہم نے بارہا اس طریقے اور طرز عمل کی خطرناکیوں کی طرف فی ظلال القرآن میں قارئین کو متنبہ کیا ہے۔ ہمیں مغربی افکار کا نہایت ہی عمیق نظر سے جائزہ لینا چاہئے۔)

برٹش انسائیکلوپیڈیا میں ان کی سوانح اور ان کے ''سفر'' اور نحمیاہ کے سفر میں لکھا ہے کہ انہوں نے تلف شدہ اسفار کو بھی لکھا اور اس کے علاوہ ستر جعلی اسفار بھی تحریر کئے۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے ان کے بارے میں لکھا۔ ''جب حال یہ ہو کہ عزرا کی کہانی کو بعض مورخین نے اپنی جانب سے لکھا ہو اور اسے کسی دوسری کتاب کی طرف منسوب بھی نہ کیا ہو تو جدید دور کے اہل قلم یہ سمجھیں گے کہ ان اسفار کو راوی نے از خود گھڑ لیا ہے۔ (دیکھئے ج ۹' ص ۱۴)

''غرض یہودی پہلے بھی حضرت عزیر کا احترام کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض نے اسے ابن اللہ بھی کہا۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے ان کے لئے ابن اللہ کا لقب بطور احترام اس طرح استعمال کیا جس طرح انہوں نے سلیمان اور داؤد کے لئے استعمال کیا تھا یا اس معنی میں استعمال کیا جو ان کے ایک فیلسوف (فیلو) سمجھتے ہیں جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ جو ہندوستانیوں کا اصل فلسفہ ہے اور جو عقائد نصاریٰ کی بنیاد ہے۔ البتہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام یہودی عزیر کو ابن اللہ نہ سمجھتے تھے بلکہ بعض لوگ ایسے تھے۔''

''ان کے بارے میں ابن اللہ ہونے کا عقیدہ کون لوگ رکھتے تھے۔ مدینہ کے بعض یہودیوں کا یہی عقیدہ تھا۔ جیسا کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صراحت کی۔ اور جس طرح وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے۔ یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ اور یہ عقیدہ لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ یہ بات وہ لوگ قرآن کی اس آیت کے جواب میں کہتے تھے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدینہ کے یہودیوں کے علاوہ بھی کوئی فرقہ ان کو ابن اللہ سمجھتا ہو' لیکن ان کا عقیدہ ہم تک نہ پہنچا ہو۔''

''ابن اسحق نے اور ابن جریر نے ابن ابو حاتم' ابو الشیخ' وابن مردویہ نے ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور صلعم کے پاس سلام ابن مشکم' نعمان بن اوفیٰ اور ابو انس' مالک ابن الضیف اور شاس ابن قیس آئے اور کہا: ہم کس طرح تمہاری اطاعت میں آجائیں۔ تم نے ایک تو ہمارا قبلہ ترک کر دیا دوسرے یہ کہ تم حضرت عزیر کو ابن اللہ نہیں سمجھتے۔''

''یہ بات بھی معلوم ہے کہ بعض نصاریٰ جو حضرت مسیح کو ابن اللہ سمجھتے تھے وہ یہودی الاصل تھے (فیلو) اسکندریہ کا معروف فلسفی جو مسیح کے معاصر تھے' یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کا ایک بیٹا ہے اور یہ بیٹا اس کا وہ کلمہ ہے جس کے ذریعے اس نے تمام اشیاء کی تخلیق کی۔ لہٰذا یہ بعید از امکان نہیں ہے کہ بعثت محمدی کے وقت یہودیوں میں کچھ ایسے لوگ ہوں

جنہوں نے عرب کے بارے میں ابنیت کا عقیدہ اپنایا ہوا ہو۔ اگرچہ اس مفہوم میں۔"

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے یہودیوں کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ سمجھتے ہیں' ان کا پس منظر کیا ہے' اس موقع پر سیاق کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے لہٰذا قرآن کریم نے جس حوالے سے بات کی ہے وہ یہ ہے کہ بعض یہودی یہ عقیدہ رکھتے تھے اور ان میں سے بعض لوگوں کا عقیدہ اس قدر فاسد ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اس عقیدۂ ابنیت کے ساتھ ساتھ مومن نہ کہلا سکتے تھے اور نہ ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ دین حق پر تھے۔ اور اہل کتاب کے ساتھ یہاں قتال کا جو حکم دیا گیا کہ اس کی بنیادی صفت اور سبب بھی یہی فساد عقیدہ ہے۔ قتال کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انہیں اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور کیا جائے اور پھر اسلام میں داخلے پر مجبور کیا جائے۔ بہرحال مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی قوت اور شوکت کو توڑ کر ان کو ایک ایسے نظام مملکت کا تابع کر دیا جائے جس میں ہر انسان کے لئے مکمل حریت اور آزادی ہو اور وہ مملکت اسلامی کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو سکے۔ اور ان کے سامنے حریت اختیار عقیدہ کے حوالے سے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور نہ ان پر کسی جانب سے کوئی دباؤ ہو کہ وہ کیا عقیدہ اختیار کریں۔

رہا نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ مسیح ابن اللہ ہیں اور وہ تینوں میں سے ایک ہیں۔ تو یہ ان کا مشہور عقیدہ ہے۔ جب سے پولس نے عیسائیت کو رسولوں کے عام عقیدۂ توحید سے نکال کر انہیں ترکیبہ عقائد دیئے اور اس کے بعد ان کی مختلف مجالس نے اس تحریف کو مکمل کر کے عیسائیت کے نظام تصور سے عقیدہ توحید کو مکمل طور پر نکال دیا ہے۔ تب سے وہ عقیدہ تثلیث پر قائم ہیں اور ان کے تمام مذاہب نے اس عقیدے کو اپنا رکھا ہے۔

میں یہاں پھر استاد محمد رشید رضا کی تفسیر کے اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ وہ تثلیث (Trinity) کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"یہ لفظ عیسائیوں کے ہاں اقانیم ثلاثہ پر بولا جاتا ہے۔ ان کے لاہوتی مباحث میں اب' ابن اور روح القدس کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ مشرقی کیتھولک کنیسا کے عقائد ہیں اور عموماً تمام پروٹسٹنٹ بھی اسی کے قائل ہیں۔ شاذ و نادر افراد ہی اس کے خلاف ہوں گے جو لوگ اس عقیدے پر جمے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کتاب مقدس کے نصوص پر یہ عقیدہ قریب تر ہے۔ لاہوتی علماء نے اس عقیدے کے حوالے سے نہایت ہی پیچیدہ فلسفیانہ تشریحات کا اضافہ بھی کیا ہے جو ان کی قدیم مجالس اور بڑے بڑے علماء کی تحریروں پر بنی تھیں۔ اکثر مباحث کا تعلق اقنوم ثانی کی پیدائش کے طریقوں اور پھر اس سے اقنوم ثالث کے پھوٹنے کے طریق کار سے متعلق ہیں۔ پھر ان تین اقانیم کے درمیان جو نسبت ہے۔ اس پر مباحث ہیں۔ پھر ہر اقنوم کی صفات اور القاب کے بارے میں کلام ہے۔ لیکن لفظ "ثالوث" انجیل میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح عہد قدیم میں کوئی آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں تثلیث کی تصریح کی گئی ہو۔ قدیم مسیحی مولفین نے ایسی آیات نقل کی ہیں جن میں اس عقیدے کی اجتماعی صورت نظر آتی ہے لیکن ان تمام آیات کی مختصر تفسیر اور تشریح بھی کی جا سکتی ہے لہٰذا ان آیات کو عقیدۂ تثلیث پر قطعی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا' بلکہ وہ واضح وحی کی طرف اشارہ ہے جو ان کے عقیدے کے مطابق عہد جدید میں موجود ہے۔ عہد جدید آیات کے دو بڑے مجموعے اس عقیدے کے ثبوت کے لئے نقل کیے گئے ہیں۔ ایک مجموعہ ان آیات کا ہے جن میں اب' ابن اور روح القدس کا یکجا ذکر ہے۔ اور

دوسرا مجموعہ ان آیات کا ہے جن میں ہر ایک کا ذکر علیحدہ علیحدہ ہوا ہے اور جن میں ان کی اہم خصوصی صفات کا ذکر ہے اور ان کے باہم نسبت کا ذکر ہے۔"

"ذات باری میں اقانیم کا تنازعہ رسولوں کے زمانے میں پیدا ہوا۔ یہ ہیلانی اور غنوسطی فلسفوں کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ دوسری صدی میں تھیوفیلوس اسقف انطاکیہ نے یونانی کا لفظ تریاس استعمال کیا۔ اس کے بعد ترتلیانوس نے لفظ ترینیتاس استعمال کیا۔ یہ لفظ ثالوث کے مترادف تھا۔ اس عقیدے کے بارے میں نیقیا کی پہلی مجلس سے ماقبل کے زمانے میں زبردست جدل و جدال رہا۔ خصوصاً مشرقی کلیسا میں۔ اور مشرقی کلیسا نے ان تمام آراء کو بدعتی آرا قرار دیا۔ ان میں ابیونیوں کی آرا شامل ہیں۔ جن کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح انسان محض ہیں۔ اس طرح سا بیلیوں کے عقاید بھی اسی میں شامل تھے جو یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ اب' ابن اور روح القدس تینوں مختلف اوصاف جن کا اطلاق اللہ نے اپنی ذات پر کیا ہے۔ اسی طرح اریوسی بھی تھے جن کے عقائد یہ تھے کہ بیٹا ازلی نہیں ہے بلکہ باپ کی مخلوق ہے۔ لیکن اس کی تخلیق 'تخلیق عالم سے پہلے ہوئی ہے۔ لہذا اس کا درجہ رب سے کم ہے۔ بلکہ یہ رب کے تابع اور مطیع ہے۔ ان میں مقدونی بھی تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ روح القدس سرے سے اقنوم ہی نہیں ہے۔"

آج کل کلیسا کے جو عقائد ہیں انہیں ۳۲۵ میں نیقیائی مجلس نے وضع کیا ہے۔ اس کے بعد قسطنطنیہ کی کانفرنس نے ۳۸۱ء میں اس کی توثیق کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ابن اور روح القدس دونوں خدائی اور الوہیت میں باپ کے برابر ہیں اور ابن ازل ہی میں باپ کے ساتھ ہی پیدا ہوا۔ جبکہ روح القدس رب سے نکلا۔ پھر طلیطلہ کی مجلس نے ۵۸۹ میں یہ فیصلہ کر دیا کہ روح باپ کے ساتھ بیٹے سے بھی پھوٹا۔ چنانچہ پورے لاطینی کلیسا نے اس ترمیم کو قبول کر لیا۔ رہا یونانی کلیسا تو وہ پہلے خاموش رہا۔ لیکن بعد میں اس نے یہ دلائل دیئے کہ یہ ترمیم بدعتی ہے۔

"عقائد کی کا فقرہ (اور بیٹے سے بھی) یونانی اور کیتھولک کلیسا کے درمیان ہمیشہ باعث اختلاف رہا۔ لوتھرین اور دوسرے اصلاح پسند کلیساؤں کیتھولک کلیسا کے اصل عقائد کو جاری رکھا لیکن تیرہویں صدی کے جمہور اہل کلیسا نے ان کی مخالفت کی اور بعض جدید علمائے الہیات اور بعض جدید فرقوں مثلاً سوسینین' جرمانین 'محمدین' عمومیوں وغیرہ نے یہ قرار دیا کہ یہ عقائد کتاب مقدس اور عقل دونوں کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔ مسٹر سویڈ تیرگ نے حضرت مسیح کے اوپر تثلیث کے لفظ کا اطلاق بطور نشان کیا۔ یعنی انہوں نے مختلف اقنونوں کی تثلیث کے بجائے ایک اقنوم کی تثلیث کا نظریہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا مسیح کی ذات میں جو الوہیت تھی' وہ رب تھا۔ اور مسیح کی طبیعی ذات کے ساتھ جس کا تعلق تھا وہ ابن تھا اور اس سے جو پھوٹا وہ روح القدس تھا۔ لوتھریں کلیسوں میں جو خیالات ایک عرصے تک پھیلے ان کی وجہ سے جرمانی علماء الہیات کے اعتقادات میں بڑا تزلزل پیدا ہوا اور ایک عرصے تک رہا۔"

"کنٹ کا نظریہ یہ تھا کہ الہٰہ میں جو تین صفات تھیں ان کا نام رب' ابن اور روح القدس ہے۔ ان سے مراد قدرت' حکمت اور محبت ہے۔ یا ان سے مراد تین اعلیٰ افعال ہیں یعنی تخلیق' حفاظت اور کنٹرول ہیں۔ ہیجیں اور شلنگ نے ایک تخیلاتی اساس دی ہے اور متاخر جرمانی علمائے الہیات نے اس کی تقلید کی ہے۔ انہوں نے نظریہ تثلیث کا دفاع تخیلاتی اساس پر کیا۔ بعض علماء لاہوت جو وحی پر اعتماد کرتے ہیں وہ تحقیق کی بنیادوں پر اہل کلیسا کی آراء کو درست نہیں سمجھتے۔ یعنی ان آراء کو جن کا فیصلہ مجالس نیقیا' قسطنطنیہ' ماضی قریب میں سا بیلیوں کی حمایت بہت لوگوں نے کی ہے۔"

اس اجمالی بحث کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ اہل کنیسا کے تمام فرقے اور مذاہب دین حق پر نہیں ہیں - کسی کے ہاں عقیدۂ توحید صحیح معنوں میں نہیں پایا جاتا - جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جیسا کوئی نہیں ہے اور یہ کہ اللہ لم یلد ولم یولد کا مصداق ہے -

اریوسی بارہا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ موحد ہیں ' ان لوگوں کا یہ دعویٰ گمراہ کن ہے کیونکہ وہ اس طرح موحد نہیں جس طرح مسلمان موحد ہیں بلکہ انہوں نے اپنے عقائد کے اندر اختلاط کر دیا ہے - وہ ایک طرف یہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرت مسیح اللہ کی طرح ازلی نہیں ہے اور ان کی یہ بات درست بھی ہے - لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ابنیت کے بھی قائل ہیں اور اس کے بھی قائل ہیں کہ حضرت مسیح عالم سے بھی پہلے کی مخلوق تھے - لہذا یہ عقیدہ ' عقیدۂ توحید نہیں کہلایا جا سکتا -

اللہ نے تو ان لوگوں کو صریحاً کافر کہہ دیا ہے کہ مسیح ابن اللہ ہے یا وہ تینوں میں سے ایک ہے - لہذا کفر کی صفت اور ایمان کی صفت ایک ہی عقیدے میں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں جبکہ یہ متضاد صفات اور متضاد امور ہیں -

قرآن کریم نے یہودیوں کے قول (عزیر ابن اللہ ہیں) اور عیسائیوں کے قول کہ (عیسیٰ ابن اللہ ہیں) پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی بات دوسرے کفار کے تصورات اور معتقدات کے برابر ہے -

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ (۹ : ۳۰) "یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے ' اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے - یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں - ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے -"

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ان سے صادر ہوئی تھی ' محض ان کی طرف منسوب ہی نہیں ہے - اور یہاں (افواھھم) کے لفظ کو بے مقصد نہیں لایا گیا بلکہ جب وہ یہ قول کر رہے تھے تو اس وقت ان کے چہرے کی جو حسی کیفیت تھی اس کی طرف بھی اشارہ مقصود تھا لہذا یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ افواھھم کا لفظ زائد ہے اور بے مقصد ہے کیونکہ اللہ کے شایان شان یہ نہیں کہ وہ کوئی بے مقصد بات کرے - نہ یہ طوالت ہے - کیونکہ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ تصویر کشی میں حقیقی صورت حال کو سامنے لاتا ہے - پھر اس لفظ سے یہ اشارہ دینا بھی مطلوب ہے کہ یہ ان کی جانب سے محض ہوائی بات ہے - اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے - یہ صرف قول ہی قول ہے - اس کا کوئی مفہوم نہیں ہے -

پھر قرآن مجید کے اعجاز کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے جو اس بات پر شاہد ہے کہ اس کا سرچشمہ ذات ربانی ہے - اللہ فرماتے ہیں :

يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ (۹ : ۳۰) "یہ باتیں ان لوگوں کے دیکھا دیکھی یہ کر رہے ہیں جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے -" مفسرین یہ کہتے تھے کہ ان لوگوں کا عقیدۂ ابنیت اسی طرح ہے جس طرح مشرکین کا عقیدۂ ابنیت ملائکہ تھا - اور ملائکہ کی ابنیت کے عرب قائل تھے - یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے - لیکن آیت کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے - اور اس کی وضاحت اچھی طرح تب ہوئی جب لوگوں تک ہندو بت پرستوں کے عقائد

پہنچے۔ یہ عقائد قدیم مصری بت پرستوں اور یونانیوں کے عقائد سے ملتے جلتے ہیں۔ اور یہی عقائد اہل کتاب کے اندر سرایت کر گئے۔ خصوصاً نصاریٰ کے عقائد کے اندر۔ سب سے پہلے "پولوس رسول" کے عقائد میں یہ تصورات داخل ہوئے اور اس کے بعد نصاریٰ کی نظریاتی مجالس میں غلبہ پاکر یہ پھیل گئے۔

مصری تثلیث کے اجزاء اوزوریس (رب) ایزیس اور موریس (ابن) فرعون بت پرستی کا اصل الاصول ہے۔

حضرت مسیح کی پیدائش سے بھی پہلے جو فلسفہ الہیات اسکندریہ میں پڑھایا جاتا تھا اس میں "کلمہ" کو دوسرا الٰہ کہا گیا تھا۔ اور اسے "اللہ کا کنوارا بیٹا" بھی کہا جاتا تھا۔

ہندو بھی تین اقانیم کے قائل تھے یا وہ ان کو اللہ کے تین حالات سے تعبیر کرتے تھے جن میں اللہ تجلی فرماتا ہے۔ تخلیق و تکوین کی حالت میں اسے برہما کہا جاتا ہے۔ حفاظت اور قیم کی حیثیت سے وہ "وشنو" ہے اور ہلاک کرنے اور برباد کرنے کی حالت میں "وسیقا" کہا جاتا ہے۔ اس عقیدے کے مطابق وشنو (ابن) ہوتا ہے اور وہ برنیا کی الوہیت سے پھوٹتا ہے۔

اشوری بھی کلمہ کے قائل تھے۔ اسے وہ "مردوخ" کہتے تھے اور وہ مردوخ کو "اللہ کا کنوارا بیٹا" کہتے تھے۔

یونانی بھی مثلث الاقانیم الٰہ کے قائل تھے۔ جب ان کے کہاں ذبیح کرتے تو ان پر تین بار مقدس پانی چھڑکتے اور اسی طرح وہ خوشبو کے برتن سے تین انگلیوں میں خوشبو لیتے۔ اور اس ذبیحے کے ارد گرد جتنے لوگ ہوتے۔ ان پر اس خوشبو کو تین بار چھڑکتے اور یہ سب اشارات وہ تثلیث کی طرف کرتے تھے۔ کنیسہ نے یہی اشارات اخذ کر کے اپنے ہاں رسوم و عبادات کو اس طرح منظم کیا کہ وہ دوسرے کفار کے اقوال سے مشابہ ہو گئے۔

نزول قرآن کے وقت قدیم مشرکین کے یہ عقائد عام نہ تھے لیکن اس کے باوجود علیم و خبیر نے فرمایا یُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (۹: ۳۰) "یہ لوگ یہ باتیں ان لوگوں کی دیکھا دیکھی کرتے ہیں جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے۔" نیز ان عقائد سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب دین حق پر نہیں ہیں اور ان کا ایمان' ایمان صحیح نہیں ہے اور اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے قرآن مجید علیم و خبیر کی جانب سے ایک کلام معجزنما ہے اور اس کا سرچشمہ صرف ذات باری ہے۔

اس فیصلے اور وضاحت کے بعد آیت کے آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب شرک و کفر کے کس موقف پر قائم ہیں؟ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۹: ۳۰) "خدا کی مار ہو ان پر' کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔" ان کو خدا تباہ کرے' کس طرح وہ حق سے روگردانی کرتے ہیں حالانکہ وہ سیدھا سادھا اور واضح ہے اور بت پرستی کو اپنانے میں جو نہایت ہی پیچیدہ اور گنجلک ہے اور کوئی عقلمند اور ذی ہوش انسان بت پرستی کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

اب قرآن کریم اہل کتاب کی گمراہیوں اور انحرافات کا ایک دوسرا ورق الٹتا ہے۔ یہاں اب ان کی گمراہی محض اعتقاد اور اقوال تک محدود نہیں ہے بلکہ اس فاسد اعتقادات و تصورات پر ان کی جو عملی صورت حال بنتی ہے اس کے اعتبار سے بھی وہ گمراہ اور منحرف ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ

ابۡنَ مَرۡيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ
سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۱﴾

"انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی ۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا' وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں' پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ۔

اس آیت میں بھی یہی بات جاری ہے جو اس سبق کا اصلی موضوع یعنی یہ کہ یہ لوگ دراصل اہل کتاب ہی نہیں ہیں ۔ لہٰذا اس حوالے سے ان کو دین حق پر نہیں سمجھا جا سکتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ دین اسلام پر نہیں ہیں ۔ اس بات کی شہادت ان کی عملی زندگی دے رہی ہے ۔ اس کی شہادت ان کے تصورات دے رہے ہیں' ان کو حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کریں مگر انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا الٰہ بنا دیا جیسا کہ انہوں نے حضرت مسیح کو رب بنایا جو ان کی جانب سے صریح شرک ہے ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے شرک سے پاک ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے اعتقادات و تصورات کے اعتبار سے اور اپنے اعمال اور واقعی زندگی کے اعتبار سے دین حق پر نہیں ہیں ۔

ان لوگوں نے اپنے احبار و رہبان کو کس طرح' اللہ کے مقابلے میں رب قرار دیا تھا؟ اس کی تشریح کرنے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیری روایات یہاں نقل کر دیں ۔ کیونکہ خود حضور ؐ کی تفسیر قول فیصل ہے ۔

احبار لغت کے اعتبار سے حبر یا حِبر کی جمع ہے ۔ یعنی حاء کے کسرے یا فتح کے ساتھ ۔ یہ اہل کتاب کے علماء کا لقب ہے ۔ اور علمائے یہود پر اس کا اطلاق زیادہ ہے ۔ رہبان راہب کی جمع ہے ۔ یہ عیسائیوں کے نزدیک اس شخص کو کہا جاتا ہے جو عبادت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے اور تمام دوسری سرگرمیوں سے کٹ جائے ۔ بالعموم ایسا شخص شادی نہیں کرتا' نہ کوئی روزگار کرتا ہے ۔ لہٰذا وہ معاشی تکلفات سے بے غم ہوتا ہے ۔

در منثور میں امام ترمذی کی روایت ہے جسے انہوں نے حدیث حسن کہا ہے ۔ نیز ابن منذر' ابن ابی حاتم' ابو الشیخ اور ابن مردویہ اور بیہقی وغیرہ نے بھی اسے روایت کیا ہے ۔ یہ روایت حضرت عدی ابن حاتم کی ہے ۔ کہتے ہیں کہ میں حضور ؐ کے پاس آیا تو آپ سورۂ توبہ پڑھ رہے تھے ۔ آپ نے یہ آیت پڑھی اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (۹ : ۳۱) تو حضور ؐ نے فرمایا "یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ وہ ارباب و رہبان کی عبادت نہ کرتے تھے لیکن یہ بات تھی کہ جب وہ ان کے لیے کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو یہ اسے حلال سمجھتے اور جس چیز کو وہ حرام قرار دیتے تو یہ اسے حرام سمجھتے" ۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت عدی ابن حاتم کی یہ روایت نقل کی ہے ۔ کہتے ہیں کہ جب ان تک حضور اکرم ؐ کی دعوت پہنچی تو وہ شام کی طرف بھاگ نکلے ۔ یہ صاحب جاہلیت میں عیسائی بن گئے تھے ۔ چنانچہ ان کی بہن اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ گرفتار ہوئی' تو حضور اکرم ؐ نے ان کے ساتھ بہت ہی کریمانہ برتاؤ کیا اور اسے عطیات دیئے ۔ یہ اپنے

بھائی کے پاس واپس گئی اور اسے اسلام کی طرف رغبت دلائی اور اس پر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ جائیں ۔چنانچہ حضرت عدی مدینہ گئے ۔یہ اپنی قوم طی کے رئیس تھے اور ان کے والد حاتم الطائی جود و کرم میں مشہور زمانہ تھے ۔لوگوں کے اندر مدینہ میں اس کی آمد کا چرچا ہوا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ۔ ان کے گلے میں سونے کی صلیب تھی۔ حضورؐ یہ آیت پڑھ رہے تھے اتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَ رُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (۹ : ۳۱) تو وہ کہتے ہیں کہ میں نے سوال کیا کہ حضورؐ عیسائی تو احبار و رہبان کی عبادت نہیں کرتے ۔تو حضورؐ نے فرمایا یہ درست ہے کہ وہ ان کی عبادت نہیں کرتے ۔ لیکن انہوں نے ان کے لیے حلال اور حرام کی حدود خود متعین کی ہیں اور لوگ اس معاملے میں ان کی اطاعت کرتے ہیں لہٰذا یہ ان عوام کی طرف سے ان کی بندگی ہے"۔

امام سدی کہتے ہیں کہ انہوں نے انسانوں کو اپنا مقتدا بنا لیا تھا اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا تھا ۔یہی وجہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے: وَمَآ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا (۹ : ۳۱) "حالانکہ ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ صرف اللہ کی بندگی کریں"۔ یعنی اللہ جس چیز کو حلال قرار دے اسے حلال سمجھیں اور اللہ جسے حرام قرار دے اسے حرام سمجھیں ۔یعنی اللہ نے جو قانون بنایا اس کی اطاعت ہو اور جو حکم دیا وہ نافذ ہو۔

امام آلوسی اپنی مشہور تفسیر میں کہتے ہیں "مفسرین کی اکثریت نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ احبار و رہبان کو الہ العالم سمجھتے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ان کے اوامر و نواہی میں ان کی اطاعت کرتے تھے"۔

اس واضح ترین آیت اور پھر حضور اکرمؐ کی توضیح و تشریح پھر قدماء مفسرین اور متاخرین مفسرین کی تشریحات سے ہمارے سامنے دین اسلام کے اصلی تصورات و عقائد کے حوالے سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں ۔اور یہ نتائج نہایت ہی اہم اور مختصر ہیں

نص قرآن اور تشریحات رسول کے مطابق عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کا اتباع کیا جائے ۔کیونکہ یہود و نصاریٰ اپنے احبار اور رہبان کو عقیدۃ الٰہ نہ سمجھتے تھے اور نہ ان کے سامنے مراسم عبودیت بجالاتے تھے لیکن اس حقیقت کے باوجود اللہ نے ان پر کفر کا الزام لگایا۔ محض اس لیے کہ یہ لوگ شریعت کو اپنے مذہبی مقتداؤں سے اخذ کرتے تھے اور پھر اس کی اطاعت کرتے تھے ۔ لہٰذا اگر کوئی کسی کو الہ نہیں بھی سمجھتا اور اس کے سامنے مراسم عبودیت نہیں بھی بجالاتا لیکن اگر اس سے قانون و شریعت اخذ کرتا ہے کہ تو یہ شخص مشرک و کافر ہے اور جس سے وہ قانون اخذ کرتا ہے وہ بمنزلہ رب ہے ۔

یہود جو اپنے احبار سے قانون اخذ کرتے تھے اور نصاریٰ جو مسیح کو الہ بھی سمجھتے تھے اور رہبان سے قانون لیتے تھے دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی درجے میں رکھا ہے اور دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں فرمایا کیونکہ دونوں ارتکاب شرک میں برابر ہیں اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں ۔

جونہی ایک شخص اللہ کے سوا کسی اور کو حق قانون سازی دیتا ہے وہ مشرک ہو جاتا ہے ۔اگرچہ وہ اسے الٰہ یا معبود نہ سمجھتا ہو اور اس کے سامنے مراسم عبودیت بجا نہ لاتا ہو۔ جیسا کہ درج بالا تشریحات سے واضح ہو گیا ہے ۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس نکتے کی مزید تشریح کریں ۔

یہ حقائق جب مسلمانوں کے سامنے پیش کیے گئے تو اس وقت امت مسلمہ کو مخصوص حالات درپیش تھے ۔اس میں رومیوں کے ساتھ جنگ کا مسئلہ درپیش تھا ۔اور بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تردد اور خلجان تھا کہ رومی بہرحال اہل

کتاب تو ہیں' اس لیے اس تردد اور شبہ کو دور کرنے کے لیے یہ آیات اتریں اور یہ بتایا گیا کہ اگرچہ اہل کتاب مومن باللہ ہیں اور یہ کہ ان کے ایمان کی حالت یہ ہے لیکن مخصوص حالات میں نزول کے باوجود ان آیات میں دین اسلام کے عام اصول اور مطلق حقائق بتائے گئے ہیں۔

اللہ کے نزدیک دین حق صرف اسلام ہے اور اللہ تعالیٰ دین اسلام کے سوا لوگوں کی جانب سے کوئی اور دین قبول نہیں کرتا۔ اور دین اسلام دنیا میں مکمل طور پر قائم تب ہو گا جب اس زمین پر اللہ کی شریعت نافذ ہو جائے اور اس شریعت کے نفاذ سے بھی پہلے یہ کہ لوگ اللہ وحدہ کو الٰہ سمجھیں اور مراسم عبودیت بھی صرف اس کے سامنے بجا لائیں۔ تو اگر لوگ اللہ کی شریعت کے سوا کسی اور قانون کے متبع ہوں تو ان میں وہ شرط موجود ہوگی جو یہود و نصاریٰ میں موجود تھی اور اس وجہ سے ان کو غیر مومن قرار دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ بار بار مومن ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ کے سوا کسی انسان کی شریعت کو قبول کرتے ہی وہ لوگ مشرک ٹھہرے۔ الا یہ کہ کوئی ایسی صورت حال ہو کہ وہ غیر اسلامی قانون نظام میں مجبوراً رہ رہے ہوں اور مجبوراً اس کا اتباع کر رہے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اس نظام کو دور کرنے کی جدوجہد بھی کر رہے ہوں۔

لفظ دین کا مفہوم اس قدر سکڑ گیا ہے کہ لوگ اسے صرف دینی عقیدے کے مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ مراسم عبودیت اور پرستش تک وسیع کرتے ہیں۔ اس حد تک تو یہودی بھی اپنے دین کے متبع تھے اور اس محدود معنی میں اپنے آپ کو دین دار کہتے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح تو یہ بتاتی ہے کہ حقیقی معنوں میں وہ نہ مومن تھے اور نہ دیندار تھے کیونکہ انہوں نے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا رب بنا لیا تھا۔

دین کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے اور اس کا تحقق تب ہو سکتا ہے جب کوئی خدا کے قانونی نظام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ لہٰذا یہ معاملہ بہت ہی سنجیدہ ہے اور یہ مفہوم ان لوگوں کے اہل دین ہونے کو تسلیم نہیں کرتا جو شریعت کے علاوہ دوسرے قانونی نظاموں کے متبع ہیں' الا یہ کہ وہ مجبور ہوں۔ نہ اسلام میں ایسے لوگ مسلم اور مومن ہیں صرف اس لیے کہ وہ اللہ کو الٰہ واحد سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ ہمارے دور میں عوام کو جو ڈھیل دے دی گئی ہے یہ دین اسلام کے لیے بہت ہی خطرناک ڈھیل ہے۔ یہ دراصل ایک خطرناک ہتھیار ہے جو اسلام کے دشمن اسلام کی بیخ کنی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان حالات اور ان افراد پر اسلام کی تختی نصب کرتے ہیں جن کے بارے میں اور ان جیسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہ اہل دین نہیں' یہ تو مومن نہیں۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے لوگوں کو رب بنایا ہوا ہے۔ جب دشمنان دین کو یہ اصرار ہے کہ ایسے لوگوں کو وہ دیندار ثابت کریں جو درحقیقت دیندار نہیں ہیں۔ تو اسلام کے حامیوں کا بھی یہ فرض ہے کہ ایسے حالات کو غیر اسلامی حالات ثابت کریں۔ ایسے افراد اور ایسے معاشروں کو غیر اسلامی افراد اور معاشرے ثابت کریں۔ اور اس مسئلے کی حقیقت کو کھول کر بیان کریں کہ ایسے لوگوں نے دوسرے افراد کو رب بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا:

اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ

أُمِرُوٓا اِلَّا لِيَعۡبُدُوٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ (۹ : ۳۱)

"انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا' وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں' پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

اس کے بعد سیاق کلام یوں بڑھتا ہے:

يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّطۡفِــُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَيَاۡبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنۡ يُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۳﴾ النصف

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

یعنی اہل کتاب کا قصور صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے حقیقی دین سے منحرف ہو گئے ہیں جو سچا دین تھا اور ان کا جرم صرف یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ کے سوا اور شخصیات کو رب بنا رکھا تھا اور آخرت پر ایمان نہ لاتے تھے جیسا کہ آخرت کے صحیح مفہوم کے تقاضے ہیں بلکہ اس کے علاوہ ان کا ایک اور ناقابل معافی جرم بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے دین حق کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دین حق کی شکل میں جو نئی روشنی پھیلا رہے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اس چراغ کو بجھانا بھی چاہتے اور اس دعوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اور اس نظام زندگی کو برباد کر کرنا چاہتے ہیں جو اس جدید دعوت کے مطابق تشکیل پایا ہے۔

يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّطۡفِــُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ (۹ : ۳۲) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں"۔

لہٰذا یہ لوگ اللہ کے نور کے دشمن ہیں۔ وہ اپنے جھوٹ' سازش اور فتنہ پردازی کی وجہ سے اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں یا وہ اپنے متبعین اور اپنی جماعتوں اور اہالی و موالی کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اس دین کے خلاف جنگ کریں اور اس کی راہ روکیں۔ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت یہی صورت حال تھی اور آج بھی یہی صورت حال ہے۔

ان آیات سے اس وقت غرض و غایت یہ تھی کہ مسلمان اپنے دفاع کی تیاری جوش و خروش سے کریں لیکن اس وقت کے حالات کے بعد آج تک اسلام کے بارے میں اہل کتاب کا موقف یہی ہے۔ وہ اسلام کی روشنی کو ہر وقت بجھانے کی سعی کرتے ہیں لیکن اللہ کا موقف یہ ہے:

وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۹ : ۳۲) "مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور یہ وعدہ اللہ کی ناقابل تغیر سنت پر مبنی ہے کہ اگرچہ کافر اس بات کو ناپسند کریں گے لیکن اللہ اپنی روشنی کو پوری طرح چمکائے گا۔

یہ وعدہ ایمانداروں اور اسلامی انقلاب کے کارکنوں کے لیے باعث اطمینان ہے۔ انہیں اپنی پسندیدہ راہ پر مزید آگے بڑھنا چاہئے اور قدم بڑھاتے چلے جانا چاہئے اور مشکلات راہ کو انگیز کرنا چاہئے اور دشمن کی سازشوں اور دشمن کی مسلسل جنگ کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ ابتدا میں مراد تو اہل کتاب تھے لیکن مراد عام دشمن ہیں جو اسلام کی راہ روکنا چاہتے ہیں۔ چاہے جس عنوان سے روکیں اور چاہے جس کی امان میں روکیں۔

اب اس مضمون کی مزید تاکید کی جاتی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹ : ۳۳) "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دین حق سے مراد وہ دین ہے جو آیت قتال میں دین مراد ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۹ : ۲۹) "لڑو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے، جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، جو اللہ اور رسول کے حرام کیے ہوئے کو حرام نہیں کرتے۔ جو دین حق کی پیروی نہیں کرتے، ان میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں"۔ اور یہ دین حق وہی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس دین حق کو قبول نہیں کرتے ان کے ساتھ قتال لازم ہے۔

اس آیت کی جو تاویل بھی ہم کریں یہ بات درست ہے۔ کیونکہ دین کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اللہ کی مکمل اطاعت کرے اور وہ مراسم عبادت اور قانون بھی اللہ کا تسلیم کرے۔ پورے دین میں شمولیت کا یہی اصول ہے۔ اور اس دین حق کی آخری صورت وہ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اللہ کے دین، اس کے مراسم عبودیت اور اس کی شریعت کو قبول نہیں کرتا، اس پر اس بات کا اطلاق ہو گا کہ دین کو قبول نہیں کرتا۔ اور اس پر آیت قتال مذکورہ کا اطلاق ہو گا لیکن آیت قتال کے انطباق کے وقت اسلام کے تحریکی اور تدریجی مراحل کو ضرور مدنظر رکھنا ہو گا کیونکہ اسلام میں بھی ہر اقدام کے لیے وقت مقرر ہے جس کی تشریح ہم نے بار بار کی ہے۔

یہ آیت ہے یعنی هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى ---- (۹ : ۳۳) آیت سابقہ کے مضمون کی

تاکید ہے جس میں کہا گیا تھا وَيَأْبَى اللّٰهُ اِلَّا اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۹ : ۳۲) مطلب یہ تھا کہ جس نور کو اللہ تعالٰی مکمل کرنا چاہتے ہیں وہ اسلامی نظام حیات کا قیام اور غلبہ ہے بلکہ قیام کے بعد عالم میں قائم تمام نظاموں پر اس کے غلبے کی صورت میں یہ روشنی مکمل ہوگی۔ اب دین حق کیا ہے؟ جیسا کہ اس سے قبل ہم بار بار کہہ چکے ' دین حق ہے اللہ وحدہ پر اعتقاد رکھنا' اللہ وحدہ کی بندگی اور پرستش کرنا' اور اللہ کی نازل کردہ شریعت کی اطاعت کرنا اور اسے نافذ کرنا۔ اور یہ اجزا ان تمام ادیان کا حصہ تھے جو رسولان برحق نے انسانوں کے سامنے کبھی پیش کیے۔ لہٰذا دین حق میں وہ بت پرستانہ منحرف ادیان شامل نہیں ہیں جن کا اصل اگرچہ درست عناصر ان کی موجودہ شکل مسخ شدہ شکل ہے۔ اور وہ درحقیقت بت پرستانہ ادیان ہیں مثلاً عالمی یہودیت اور عیسائیت۔

نیز دین حق میں وہ ادیان و مذاہب بھی شامل ہیں جنہوں نے دین کی تختی تو لگا رکھی ہے لیکن دراصل ان نظاموں میں اربابا من دون اللہ کی پرستش ہوتی ہے۔ یوں کہ ان میں انسان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور جن قوانین کو اللہ نے نازل نہیں فرمایا۔

جبکہ اللہ کا صریح حکم یہ ہے کہ اس نے اپنے رسول کو دین حق اور ہدایت دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اس دین حق کو تمام ادیان پر غالب کر دے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم دین کو اس کے وسیع مفہوم میں لیں تاکہ اللہ کے عہد کی وسعت ہمیں معلوم ہو۔

دین دراصل ایک نظام زندگی ہے۔ لہٰذا لوگ جس کسی نظام کو تسلیم کرتے ہوں' اس کی اطاعت کرتے ہوں' جن کے تصورات کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور جس کی اتباع کر کے اس کی وفاداری کا دم بھرتے ہوں وہی ان کا دین ہے۔

پھر اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں بھی دین کا یہی وسیع مفہوم مراد ہے یعنی نظام زندگی۔ نظام زندگی صرف اللہ کا نظام زندگی ہے۔ اور تمام لوگوں نے اس کی اطاعت کرنی ہے۔ اور غالب بھی صرف اسی نظام کو کرنا مطلوب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ تو یہ کام کر کے دکھایا۔ آپ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے غلبہ دین کو قائم رکھا۔ ان ادوار میں دین حق غالب اور ممتاز رہا۔ اور تمام وہ ادیان جن میں اطاعت خالصتاً اللہ کے لیے نہ تھی' وہ اس کے مقابلے میں لرزہ براندام تھے۔ اس کے بعد دین حق کے حاملین نے خود ہی اس دین کو چھوڑ دیا۔ آہستہ آہستہ وہ دین سے دور ہوتے گئے اور اسلامی نظام اور اسلامی معاشرے کے خلاف صلیبی اور بت پرستانہ ادیان کی مسلسل ریشہ دوانیوں اور کفار اور اہل کتاب کی مشترکہ کارروائیوں کے نتیجے میں اس نظام کو ختم کیا گیا۔

لیکن معرکہ ختم نہیں ہو گیا۔ اللہ کا وعدہ اپنی جگہ قائم ہے۔ اللہ مومنین کو دیکھ رہا ہے۔ انتظار میں ہے۔ وہ مومنین جنہوں نے اللہ کے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے کام کا آغاز نکتہ آغاز سے کیا ہے۔ جہاں سے حضور اکرم نے کام کا آغاز کیا تھا اور دین حق کے احیاء کی یہ تحریک اب نور ربانی کی روشنی میں جادہ پیما ہے۔

اب اس سورہ کے اس سبق کی آخری یونٹ پر ہم پہنچ چکے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب اللہ کے حرام کیے ہوئے کو کس طرح حرام نہیں کرتے۔ جبکہ اس سے پہلے کہا تھا کہ وہ اپنے احبار و رہبان کو رب سمجھتے ہیں۔ اللہ کے سوا رب قرار دیتے ہیں اور جس کی تفسیر رسول اللہ ؐ نے یہ فرمائی تھی کہ یہ اہل کتاب احبار و رہبان کے حلال کردہ کو حلال اور حرام

کردہ کو حرام سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ بتایا گیا کہ یہ احبار و رہبان اللہ کے حرام کردہ کو حرام نہیں سمجھتے۔ اللہ کے حلال کردہ کو حلال نہیں سمجھتے۔

اس آخری نکتے میں اہل کتاب کی حقیقت کھولتے ہوئے خطاب اہل ایمان سے ہے کہ ان اہل کتاب کی حقیقت پر اچھی طرح غور کرو۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں۔ اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو“۔

آیت میں احبار و رہبان کے کردار کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عوام نے تو ان کو اللہ کے علاوہ رب بنا رکھا ہے۔ اور یہ لوگ نتیجتاً لوگوں کے لیے حلال و حرام کے قوانین بنانے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو لوگوں کے لیے بطور رب پیش کیا ہے اور لوگوں نے اسے قبول کیا ہے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اموال باطل طریقے سے کھاتے پیتے ہیں۔ اور لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں۔

لوگوں کے اموال کھانے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ جو ابھی تک رائج ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ فیس ہے جو حرام کو حلال قرار دینے یا حلال کو حرام قرار دینے کے عوض لی جاتی تھی اور اس قسم کے فیصلے بالعموم مالداروں کے حق میں ہوتے تھے۔ یا بادشاہوں کے حق میں جاری ہوتے تھے۔ ان میں وہ فیس بھی شامل ہے جو مذہبی پیشوا ایک معترف گناہ سے لیتے تھے اور پھر اسے بخش دیتے تھے اور ان مذہبی پیشواؤں کے زعم میں وہ یہ اختیارات ازروئے شریعت رکھتے تھے اور اس میں مشہور مسئلہ رہا ہے کہ وہ اسے حلال قرار دے دیتے تھے۔

اس میں وہ اموال بھی شامل ہیں جو وہ لوگوں سے دین حق کے مقابلے کے لیے لیتے تھے۔ احبار اور رہبان اسقف

اور دوسرے مذہبی پیشوا صلیبی جنگوں کے لیے لاکھوں روپے جمع کرتے رہے ہیں اور اب وہ مستشرقین اور مبشرین کے لیے اربوں روپے جمع کر کے عالم اسلام میں خرچ کرتے ہیں' یوں وہ لوگوں کو گمراہ کر کے اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

قرآن کریم کی درج ذیل آیت بڑے گہرے غور و فکر کی مستحق ہے۔اس میں بات کس قدر عدل و انصاف کے ساتھ کہی گئی ہے۔

انَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ (۹: ۳۴) "یعنی احبار و رہبان میں سے بیشتر لوگ"۔اس سے ان لوگوں کی وہ قلیل تعداد نکل جاتی ہے جو اس غلطی کا ارتکاب نہیں کرتی۔اس لیے کہ دنیا کے مختلف فرقوں اور جماعتوں میں اچھے لوگوں کا پایا جانا ایک فطری امر ہے۔اور ذات باری تعالیٰ بہرحال ہر کسی کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔

اکثر احبار و رہبان لوگوں سے حاصل کردہ اموال کو جمع کرتے تھے۔یہود و نصاریٰ کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ لوگوں کے اموال کنیسوں میں جمع کرتے اور ان کے تکیوں پر بے حد شکرانے جمع ہوتے تھے۔اور بعض اوقات مذہبی لیڈروں کے پاس بادشاہوں اور راجوں و مہاراجوں کے مقابلے میں بھی زیادہ دولت جمع ہو جاتی تھی۔

اس لیے یہاں سیاق کلام میں قیامت کے دن ان کی اس جمع کردہ دولت ہی کو ان کے لیے باعث عذاب بنایا ہے۔اور یہی سزا ان تمام لوگوں کو ملے گی جو دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور اس بات کی تصویر کشی نہایت ہی خوفناک انداز میں کی گئی ہے۔

...وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴) يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹: ۳۴ — ۳۵)

"دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں۔اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو"۔

تعذیب کے اس منظر کی یہاں بہت سی تفصیلات دے دی گئی ہیں اور تعذیب کے ابتدائی مراحل سے لے کر آخری مراحل کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے تاکہ حس و خیال میں یہ منظر اچھی طرح بیٹھ جائے لہٰذا تعذیب کی تفصیلات دینا بامقصد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ (۹: ۳۴) "دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔" اس کے بعد سیاق کلام پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے اور اجمال اور ابہام کے بعد تفصیلات دوسری آیت میں دی جاتی ہیں۔

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ (۹: ۳۵) "ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔" .... اب اس کے بعد سامع دیکھتا ہے کہ ان دھاتوں کو کس طرح گرم کیا جاتا ہے۔ اب اگلے منظر میں ہاتھوں میں گرم سلاخیں لئے ہوئے کارندے نظر آتے ہیں۔ سلاخیں تیار ہیں اور دردناک عذاب کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اب ان مجرموں کے ہاتھوں اور چہروں کو داغا جاتا ہے اور جب ان کے چہروں کو اچھی طرح داغ دیا جاتا ہے تو اب ان کے پہلوؤں پر داغ لگائے جاتے ہیں اور جب ان کے پہلو داغ دیئے جاتے ہیں تو ان کی پیٹھوں پر داغ وہی کا عمل شروع ہوتا ہے اور جب یہ جسمانی عذاب ختم ہوتا ہے تو اب ان کو سرزنش کی جاتی ہے تاکہ ان کی روحانی تذلیل ہو۔

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (۹ : ۳۵) "یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔" یہ تو تم نے لذت کے لئے جمع کیا تھا لیکن یہ اب تمہارے لئے عذاب الیم کا آلہ بن گیا ہے۔

فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (۹ : ۳۵) "اب اپنی اس سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔" بذاتہ وہی دولت ہے۔ اب دیکھو کہ تمہارے چہروں' تمہارے پہلوؤں اور تمہاری پیٹھوں کے ساتھ اس کا صرف مس ہی موجب اذیت ہے۔

غرض یہ ایک نہایت ہی خوفناک منظر ہے اور اس میں ہر ہر حرکت کی تفصیلات دی گئی ہیں اور ان تفصیلات سے دوچار ہوں گے احبار و رہبان کی اکثریت۔ پھر وہ لوگ جو بلاضرورت مال و دولت جمع کرتے اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ یہ بات یہاں پیش نظر رہے کہ یہ آیات غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئیں جسے غزوۃ العسرۃ بھی کہا جاتا ہے۔

---ooo---

میں سمجھتا ہوں یہاں ہمیں قدرے رکنا چاہئے اور اس پوری بحث کا از سر نو جائزہ لینا چاہئے اور ذہن میں اس پوزیشن کو مستحضر کر لینا چاہئے جو ان ربانی ہدایات کے مطابق اہل کتاب کی فی الحقیقت ہے کہ ان کے عقائد کیا ہیں؟ ان کے اخلاق کیا ہیں ان کا طرز عمل کیا ہے؟ خصوصاً ان اشارات کی روشنی میں جو ہم نے ان آیات کی تشریح کے دوران دیئے۔

اہل کتاب کے بارے میں اس شبہ کو صاف کر دینا کہ آیا وہ دین حق پر ہیں' نہایت ہی ضروری تھا۔ صریحاً مشرک لوگ تو بہرحال مشرک ہوتے ہیں اور سب کو نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد' اعمال اور مراسم عبودیت کے اعتبار سے نظر آتے ہیں کہ وہ مشرک ہیں لیکن اہل کتاب کے نام سے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید وہ **دیندار** ہیں۔ یہ شبہات دور کرنا اس لئے ضروری تھا کہ مسلمان اس جاہلیت کے مقابلے کے لئے اچھی طرح تیار ہو جائیں جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے تو یہ بات ہر کسی کو معلوم ہے کہ وہ جاہلیت کے پیروکار ہیں لیکن اہل کتاب کے بارے میں پوزیشن واضح نہ تھی کیونکہ اہل کتاب کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ پہلے سے مسلمانوں کی طرح ایک دین سماوی کے پیرو ہیں۔ جس طرح آج کے نام نہاد مسلمانوں کی اکثریت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔

اس سورت کے آغاز ہی سے مشرکین سے مکمل بائیکاٹ اور ان کے مکمل مقابلے کی بات تفصیلاً اس سورت کا موضوع رہی ہے اور ان حالات کا بھی تقاضا تھا جس کی تشریح ہم نے اس سورت کے مقدمے میں کر دی ہے۔ جہاں اللہ

تعالیٰ نے فرمایا تھا:

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُولِهٖۤ اِلَّا الَّذِينَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷) كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ (۸) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ (۱۰) (۹: ۷ تا ۱۰)

”مشرکین اور اللہ اور رسول کے درمیان عہد کیسے ہو سکتا ہے؟ بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا تو جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو کیونکہ اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ ان مشرکین کا حال یہ ہے کہ تم پر قابو پا جائیں تو نہ تمہارے معاملے میں کسی قرابت کا لحاظ کریں نہ کسی معاہدے کی ذمہ داری؟ وہ اپنی زبانوں سے تم کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دل ان کے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت قبول کر لی۔ پھر اللہ کے راستے میں سد راہ بن کر کھڑے ہو گئے' بہت برے کرتوت تھے جو یہ کرتے رہے۔ کسی مومن کے معاملے میں نہ یہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہدے کی ذمہ داری کا۔ اور زیادتی ہمیشہ انہی کی طرف سے ہوتی ہے۔“

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۳) قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۴) وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۵) (۹: ۱۳ تا ۱۵)

”کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جو اپنے عہد توڑتے رہے ہیں اور جنہوں نے رسول اللہ کو ملک سے نکال دینے کا قصد کیا تھا اور زیادتی کی ابتدا کرنے والے وہی تھے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ ان سے لڑو' اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے قلوب کی جلن مٹا دے گا اور جسے چاہے گا توبہ کی توفیق دے گا۔ اللہ سب کو جاننے والا اور دانا ہے۔“

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (۹ : ۱۷) ”مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور اور خادم بنیں۔ درآں حالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ ان کے تو سارے اعمال ضائع ہوگئے اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔“

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹ : ۲۳) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔“ مشرکین کے خلاف جہاد کے لئے اٹھنے کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ ان پر تنقید کی جائے اور ان کا کیس بھی سادہ تھا۔ کیونکہ اس وقت اسلامی جماعت کو جس قسم کے حالات درپیش تھے اس میں اسلامی معاشرے کے مدمقابل مشرکین تھے لیکن اہل کتاب کے خلاف جہاد کرنے کے لئے مشرکین سے بھی زیادہ شاید تنقید کی ضرورت تھی۔ اور اس بات کی ضرورت تھی کہ اہل کتاب پر اہل کتاب اور اہل دین ہونے کا جو بورڈ لگا ہوا تھا انہیں اس سے محروم کر دیا جائے۔ اور ان کی اصل حقیقت کو ظاہر کیا جائے کہ وہ مشرکین کی طرح مشرکین ہیں اور ان میں اور دوسرے مشرکین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے کفار کی طرح وہ بھی کفار ہیں اور کفار و مشرکین دونوں کی طرح یہ بھی دین اسلام کے خلاف شب و روز جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ گمراہ ہیں اور لوگوں کے اموال نہایت ہی باطل طریقوں سے کھاتے ہیں۔ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے دو ٹوک موقف نازل فرمایا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۹) وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۳۰) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳۱) يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ

هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۳۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ------ (۳۴) (۹ : ۲۹ – ۳۴) "جنگ کرو، اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے، اسے حرام نہیں کرتے۔ اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبان سے نکالتے ہیں۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے خدا کی مار ان پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے۔ خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو، اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ ان اہل کتاب کے اکثر علماء درویشوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔"

دوسری مکی اور مدنی سورتوں میں ان اہل کتاب کے بارے میں جو دوٹوک فیصلے کئے گئے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ تمام مکی اور مدنی سورتوں میں ان کے بارے میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ یہ لوگ مکمل طور پر کفر اور شرک میں داخل ہوگئے ہیں اور پوری طرح دین حق سے نکل چکے ہیں۔ انہوں نے اس دین کو پوری طرح چھوڑ دیا ہے جو ان کے نبی ان کے پاس لائے تھے۔ نیز انہوں نے نہ صرف یہ کہ موجودہ دین حق کو قبول نہیں کیا بلکہ وہ اس کی راہ روکنے کے لئے کمربستہ ہیں۔ لہٰذا دین جدید کے حوالے سے اپنے موقف کی بنا پر بھی یہ مکمل طور پر کافر اور مشرک ہیں۔

اس سے پہلے آیات گزر چکی ہیں جن میں اہل کتاب کو یہ خطاب کیا گیا تھا کہ وہ دین سماوی اور دین الٰہی سے مکمل طور پر نکل چکے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۵ : ۶۸) "صاف صاف کہہ دو کہ "اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر

نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں ۔" ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے ۔ مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو ۔"

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ---- (۵ : ۷۲) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے ۔"

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْآ اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵ : ۷۳) "یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے ۔"

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ

(۹۸ : ۱) "اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ اپنے کفر سے باز آ جانے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس دلیل روشن نہ آ جائے ۔"

یہ اور اس قسم کی دوسری کثیر آیات جن کو ہم نے اس سے پہلے نقل کیا ۔ یہ آیات مکی قرآن میں بھی ہیں اور مدنی میں بھی ہیں اور کافی تعداد میں ہیں ۔

صورت حال یہ تھی کہ قرآن کریم نے اہل کتاب کو بعض معاملات میں امتیازی پوزیشن دی تھی ۔ مثلاً مسلمانوں پر ان کا کھانا حلال کیا تھا ۔ اور ان کی پاک دامن عورتوں کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا تھا ۔ لیکن یہ امتیازی پوزیشن ان کو اس لئے نہ دی گئی تھی کہ وہ دین حق کے کسی حصے پر عمل پیرا تھے ۔ بلکہ یہ مراعات ان کو اس لئے دی گئی تھیں کہ اصلاً وہ دین حق کے حامل تھے اور تاریخ طور پر وہ تحریک اسلامی کا حصے تھے ۔ اگرچہ حالا وہ خود اپنے دین پر بھی قائم نہ تھے ۔ اس طرح ان کے ساتھ مکالمے میں یہ بات ممکن تھی کہ ہمارا اور تمہارا اصل دین تو ایک ہے ۔ لہٰذا قرآن نے ان کو بت پرستوں اور مشرکوں کے مقابلے میں یہ امتیازی پوزیشن دے دی جبکہ بت پرستوں کے ہاں کوئی ایسا اصول نہ تھا جس کو ہاتھ میں لے کر اسلام ان کے ساتھ کوئی مکالمہ کر سکے ۔ رہی یہ بات کہ خود اہل کتاب کی دینداری کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے عقائد کیا ہیں؟ ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟ تو اس معاملے میں قرآن کریم نے کوئی اجمال نہیں چھوڑا بلکہ دو ٹوک بات کی ہے کہ وہ بالکلیہ دین سے خارج ہیں ۔ انہوں نے اپنے اصل دین عقائد و اعمال کو چھوڑ دیا ہے اور اب ان کے عقائد و اعمال وہ ہیں جو ان کے لئے ان کے احبار اور رہبان نے تصنیف کئے ہیں اور ان کو باقاعدہ مجالس عقائد و قانون میں طے کیا گیا ہے ۔ اس موضوع پر کلام الٰہی فیصلہ کن اور واضح ہے ۔

اس مقام پر اہم بات یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس دو ٹوک فیصلے کے نتائج سے بحث کریں کہ اہل کتاب کے موجودہ نظریات اور دینی حالت کے ہوتے ہوئے ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟

یہ عنوان اور بورڈ جو ان پر لگا ہوا ہے 'غلط فہمی کا باعث ہے ۔ اس بورڈ کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ اس بورڈ

کی وجہ سے ان لوگوں کی جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی تحریک سامنے نہیں آتی ۔ لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس بورڈ کو اتار پھینکا جائے اور اس خطاب سے جو غلط فہمی ہوئی ہے اسے اچھی طرح دور کر دیا جائے اور ان لوگوں کی اصل حقیقت اور ان کے اصل چہرے سے لوگوں کو شناسا کیا جائے ۔ اس سے پہلے ہم اس بات کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں اس وقت ایسے حالات پائے جاتے تھے کہ اسلامی معاشرے کے بعض عناصر ان کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے خصوصاً غزوہ تبوک کے وقت بعض مخصوص حالات بھی تھے ۔ نیز اس وقت عربوں کے دلوں پر روما کا رعب بھی چھایا ہوا تھا' لیکن جیسا کہ اس سے قبل ہم تفصیلات دے آئے اصل بات یہ تھی کہ بعض مسلمان رومیوں کے ساتھ ایسی ہمہ گیر جنگ کو محض اس لئے سمجھ نہ پائے تھے کہ رومی بہرحال اہل کتاب تھے ۔

آج دین کے دشمن جو اس وقت احیاء اسلام کے لئے چلنے والی تحریکات پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں' یہ لوگ ان تحریکات کا مطالعہ نہایت ہی مہارت سے کرتے ہیں' یہ لوگ ماہر نفسیات ہوتے ہیں' ان کا اسلامی تحریکات کے بارے میں وسیع مطالعہ ہوتا ہے ۔ یہ لوگ اسلام کے خلاف بھی اگر کوئی اسکیم تیار کرتے ہیں تو اس پر بھی اسلامی بورڈ لگا دیتے ہیں' یہ لوگ جدید حالات' نئی تحریکات' نئے رجحانات اور افکار و تصورات پر اسلامی لیبل لگاتے ہیں اور اس اسلامی لیبل کے ساتھ وہ عالم اسلام میں حقیقی اسلامی تحریکات کے خلاف کام کرتے ہیں ۔ یہ کاروبار انہوں نے پورے عالم اسلام میں شروع کر رکھا ہے ۔ یہ کام وہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ جس جاہلیت کو عالم اسلام میں رائج کرنا چاہتے ہیں' اس کے خلاف مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ نہ ہوں اور لوگوں پر یہ بات کھل نہ جائے کہ اس جھوٹے اسلامی لیبل کے تحت وہ اسلام کے خلاف کیا کیا سازشیں کرتے ہیں ۔

انہوں نے بعض حالات سے مجبور ہو کر اسلامی تاریخ میں صرف ایک بار کھل کر جاہلیت کے نام اور عنوان سے اسلام کے خلاف کام کیا اور اپنے سیاہ چہرے کو کھول کر اسلام پر حملہ آور ہوئے یہ ماضی قریب میں مصطفیٰ کمال کی تحریک تھی جو ترکی میں کھلی بے دینی اور جاہلیت کی شکل میں نمودار ہوئی ۔ اس معاملے میں وہ مجبور یوں ہوئے کہ ان کے لئے اسلام اجتماعیت کی آخری نشانی یعنی خلافت اسلامیہ ترکیہ کو مٹانا ضروری ہو گیا تھا ۔ یہ نظام خلافت بھی دراصل حقیقی خلافت نہ تھا ۔ ایک قسم کا صرف نام اور عنوان ہی تھا لیکن یہ اسلامی اجتماعیت کی آخری رسی اور رابطہ تھا اور ان کے لئے اس کا توڑنا لازم تھا ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :"اسلام ایک ایک تار ہو کر ٹوٹ جائے گا ۔ اس کا پہلا تار اس کا نظام حکم ہے اور آخری تار صلوٰۃ ہے ۔"

یہ عیار دشمنان اسلام جو اہل کتاب میں سے بھی ہیں اور ملحدین اور کافرین کی صورت میں بھی ہیں اور یہ آپس میں بھی کبھی اکٹھے نہیں ہوتے' یہ آپس میں تب ہی اکٹھے ہوتے ہیں جب ان کو اسلام کے ساتھ کوئی معرکہ درپیش ہوتا ہے ۔ لیکن اتاترک کی تحریک کے بعد ان لوگوں نے اضطرار کے حدود سے تجاوز نہیں کیا ۔ اب وہ نہایت ہی سختی سے اپنی ریشہ دوانیوں کو چھپاکر سرانجام دیتے ہیں ۔ اتاترک کی تحریک کے سوا ان کی تمام تحریکات دوبارہ اسلامی لیبل اور اسلامی بورڈ کے تحت ہی چل رہی ہیں ۔ یہ خفیہ ریشہ دوانیاں دراصل مصطفیٰ کمال کی علانیہ تحریک لادینی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہیں ۔ ان کے ذریعے وہ ایسے حالات کو پیدا کرنا اور قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ان اجتماعی حالات کو قائم رکھنے کے لئے وہ اقتصادی اور سیاسی امداد بھی دیتے ہیں ۔ ان کے خفیہ ادارے اپنے تجربات' خفیہ رپورٹوں اور پروپیگنڈے کے ذریعے

ایسے اجتماعی حالات کے مد و معاون ہوتے ہیں۔ اس کام میں وہ تمام وسائل اور تمام مہارتیں صرف کرتے ہیں۔ عالم اسلام میں ایسے حالات قائم رکھنے کے لئے ملحد اور اہل کتاب دست بدست ہمقدم ہو کر چلتے ہیں اور ہم سفر ہیں۔ حقیقت ہے کہ اسلام کے خلاف قدیم صلیبی جنگوں کو یہ لوگ نئی شکل اور عنوان کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ جنگ قدیم جنگ سے اس لئے زیادہ خطرناک ہے کہ صلیبی جنگ بہرحال علانیہ تھی اور یہ خفیہ ہے۔

ان سادہ لوح جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ اس عنوان اور لیبل سے خوب دھوکہ کھائے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض داعیان اسلام بھی اس لیبل سے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں۔ یہ داعی بھی یہ کوشش نہیں کرتے کہ اس ننگی جاہلیت کے چہرے پر سے یہ پردہ اتار پھینکیں۔ بعض داعیان اسلام جو اس حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ بھی یہ جرأت نہیں کرتے کہ ان نام نہاد اسلامی عنوانات کے تحت کام کرنے والوں کی حقیقت کو اجاگر کریں۔ حالانکہ اسلامی لیبل کے تحت یہ لوگ کفر اور شرک کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ داعی لوگوں کو صورت حالات کی صحیح تصویر نہیں دکھاتے حالانکہ عام لوگ دھوکہ کھا کر ان حالات پر راضی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دور جدید میں عوام الناس اسلام کی جانب آگے اس لئے نہیں بڑھ رہے کیونکہ وہ موجودہ حالات ہی کو اور موجودہ جاہلیت ہی کو اسلام سمجھتے ہیں۔ اور اس کے باقی رہنے میں کوئی شرعی حرج محسوس نہیں کرتے۔ نہ وہ موجودہ حالات میں زندگی بسر کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں حالانکہ درحقیقت ہم سب کافرانہ اور مشرکانہ زندگی کے تحت چل رہے ہیں۔

غرض یہ لیبل اسلامی تحریکات کے احساس کی شدت کو کم کر دیتا ہے اور ان کے احساسات کو سلا دیتا ہے۔ اسلام کی حقیقی سمجھ لوگوں میں پھیلنے نہیں دیتا۔ اور اس جاہلیت کے مقابلے میں مسلمانوں کے اٹھنے کی راہ میں بھی حائل ہے حالانکہ جاہلیت اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ اسلام کے باقی آثار کو بھی مٹا کر رکھ دے اور اس کی جڑیں بھی اکھاڑ پھینکے جو ابھی تک بچی ہوئی ہیں۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے کتاب جاہلیۃ القرن العشرین' محمد قطب)

اس قسم کے سادہ لوح داعیان اسلام' میرے خیال میں اسلام کے کھلے دشمنوں کے مقابلے میں' اسلام کے لئے زیادہ مضر ہیں' جو ان حالات' ان تحریکات' ان رجحانات ان افکار اور ان اقدار پر اسلامی لیبل لگاتے ہیں' جن کو دشمنان اسلام' اسلام کی بیخ کنی کے لئے رائج کر رہے ہیں۔

جب بھی مسلمان اس دین کی حقیقت اور اس کے بالمقابل جاہلیت کی حقیقت کو سمجھ جاتے ہیں' اسلام دنیا میں غالب ہو جاتا ہے۔ جب اور جہاں بھی یہ صورت پیدا ہو جائے۔ اسلام کے لئے کبھی یہ امر خطرناک نہیں بنا کہ اس کے دشمن طاقتور ہیں اور تجربہ کار ہیں' البتہ اسلام کے لئے زیادہ خطرہ' ان نادان دوستوں سے ہوتا ہے جو سادہ اور فریب کھانے والے ہوتے ہیں' وہ غیر مضر چیزوں سے تو سختی سے بچتے ہیں لیکن اسلام کے لیبل میں ان کے سامنے جو زہر پیش کیا جاتا ہے اسے آسانی سے نگل جاتے ہیں۔ اور پھر اس لیبل کے تحت وہ اسلام کے خلاف بر سرپیکار ہوتے ہیں اور انہیں خبر نہیں ہوتی۔ اس لئے احیائے اسلام کے لئے کام کرنے والوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اقدار جاہلیت کی بوتلوں سے اسلامی لیبل اتار پھینکیں جبکہ یہ اقدار اسلامی لیبل کے تحت اسلام کی بیخ کنی کے لئے رائج کی جا رہی ہیں اور یہ عمل پوری دنیا میں رائج ہے۔ کسی اسلامی تحریک کا پہلا اقدام یہ ہونا چاہئے کہ وہ جاہلیت کے چہرے سے اس جھوٹے لیبل کو اتار پھینکے۔ اور اس کی اصل حقیقت لوگوں پر کھول دے کہ یہ شرک ہے اور کفر ہے۔ اور واقعات کی ایسی تعبیر کرے جو حقیقت حال سے مطابق ہو۔ وہ اپنا جائزہ

بھی اسی طرح لے جس طرح اس کا حال ہے جس طرح قرآن نے اہل کتاب کی حقیقت کو کھول کر بیان کر دیا کہ اگر چہ وہ اہل کتاب تھے مگر اب وہ کافر اور مشرک ہیں۔ حالات کی اس حقیقت کو اسلامی تحریکات اگر اچھی طرح سمجھ لیں تو شاید وہ اپنے آپ کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ کس حد تک اسلامی تحریکات ہیں تاکہ وہ اپنی موجودہ بدحالی' تکلیفات اور اس عذاب الیم سے نجات پالیں جس میں وہ خود مبتلا ہیں۔

کسی بھی اسلامی تحریک کے آغاز کے لئے دو امور رکاوٹ بنا کرتے ہیں' ایک یہ کہ تحریک اپنے موقف میں غیر ضروری سختی کرے دوسرے یہ کہ وہ ظاہری صورت حال سے دھوکہ کھا جائے اور معاملات کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ ان دو غلطیوں کی وجہ سے دشمن کے منصوبے کامیاب ہوتے ہیں' ان کی سازشوں کو تقویت ملتی ہے۔ کیونکہ دشمن نے اپنا کام جعلی اسلامی لیبل کے تحت شروع کیا ہے۔ جب سے اسے معلوم ہوا ہے کہ اسلام کی تاریخ جدید میں اتاترک کا تجربہ بری طرح فیل ہو چکا ہے۔ اس نے اب اسلامی لیبل سے کام شروع کیا ہے۔ ترکی میں اسلام کی نظریاتی علامت نظام خلافت کو ختم کرنے کے بعد لادینیت کے لیبل کے تحت اس کے لئے کام کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ زمانہ حال کے ایک مکار' صلیبی مصنف ولفرڈ سمتھ اپنی کتاب "اسلام تاریخ جدید میں" میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اتاترک کی تحریک کو ایک بار پھر اسلامی رنگ میں پیش کریں اور اس میں سے علانیہ الحاد کے عناصر کی نفی کر دیں۔ اور یہ باور کرائیں کہ اسلام کے احیائے جدید کے باب میں یہ نہایت ہی موزوں اور اچھی تحریک تھی۔ بہت خوب! ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ دشمنان اسلام اب کس انداز اور کس لباس میں آتے ہیں؟

---○○○---

درس نمبر ۸۹ ایک نظر میں

سیاق کلام اپنے منطقی انداز میں، رومیوں اور شمالی عرب میں ان کے حلیف نصرانی قبائل کے خلاف جنگ کی تیاریوں کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ تیاریاں اور لشکرکشی بظاہر رجب کے مہینے میں ہو رہی تھی۔ لیکن دراصل یوں نہ تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ اس سال ماہ رجب اپنی حقیقی جگہ پر نہ تھا۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے حساب وکتاب کے لئے النسی کا جو نظام جاری کر رکھا تھا (تفصیلات آگے آ رہی ہیں) تو اس کے مطابق ماہ ذوالحجہ اپنی جگہ پر نہ تھا۔ یہ ذوالقعدہ کی جگہ تھا اور رجب جمادی الاخری کی جگہ آ رہا تھا اور اس اضطراب کا اصل راز یہ تھا کہ جاہلیت کا نظام خود اپنے اصول و قواعد کی پابندی بھی نہ کرتا تھا۔ وہ قانون اور اصولوں کا احترام محض ظاہرداری کے طور پر کرتا تھا۔ ہر جاہلی نظام میں چونکہ حلال و حرام کے حدود و قیود خود انسان ہی مقرر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے بنائے ہوئے حدود میں تاویلات کر کے خود حدود شکنی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں۔

اس کی کہانی یوں ہے کہ اللہ نے تو چار مہینوں کو حرام قرار دیا تھا۔ ان میں تین ملے ہوئے تھے یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا منفرد تھا یعنی رجب۔ یہ تحریم حج کے مشہور مہینوں میں تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے تھی۔ اگرچہ عربوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں بے حد تحریف کر دی تھی اور جو دین صحیح بھی تھا، اس سے انہوں نے انحراف کر لیا تھا لیکن حرام چار مہینوں کی حرمت کو وہ بہرحال حضور کے دور تک ملحوظ رکھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کا تعلق موسم حج سے تھا اور حجازیوں کی معاشی زندگی کا تو دارومدار ہی ان مہینوں پر تھا۔ خصوصاً اہل مکہ کے سکان کا۔ کیونکہ موسم حج میں تجارت کی کامیابی کا دارومدار ہی اس پر تھا کہ لوگوں کی نقل و حرکت آزادانہ طور پر جاری رہے اور تجارت ہوتی رہے۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ بعض عربی قبائل کی ذاتی ضروریات کا ٹکراؤ اس تحریم سے ہوا، اور ان کی خواہشات نے بھی اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے ان لوگوں کو باور کرایا کہ حرام مہینوں کے اندر اپنی خواہشات کے مطابق تقدیم و تاخیر کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کہ کسی مہینے کو کسی سال میں مقدم کر دیا جائے اور کسی سال میں موخر کر دیا جائے۔ مہینوں کی تعداد تو چار ہی رہے لیکن ان مہینوں کے نام بدل دیئے جائیں۔ "اس طرح وہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کو حلال بھی کر دیں۔ لہٰذا جب ۹ ہجری کا سال آیا تو اس میں ماہ رجب حقیقی رجب نہ تھا۔ اسی طرح ماہ ذوالحجہ بھی حقیقی ذوالحجہ نہ تھا۔ رجب دراصل جمادی الاخریٰ تھا اور ذوالحجہ دراصل ذوالقعدہ تھا اور فی الحقیقت یہ لشکرکشی درحقیقت تو جمادی الاخری میں تھی لیکن نام کے اعتبار سے یہ رجب میں تھی اور یہ ان لوگوں کے نسئ کے تصرفات کی وجہ سے ایسا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کی وجہ سے عمل نسئ کو آئندہ کے لئے موقوف قرار دے دیا۔ اور اس بات کی وضاحت کی کہ اس عمل نسئ کے ذریعے یہ

لوگ چونکہ خود مہینوں کو حلال قرار دیتے ہیں یا حرام قرار دیتے ہیں اور یہ عمل چونکہ اصول دین کے خلاف ہے۔کیونکہ دین کا یہ اصل الاصول ہے کہ حلال و حرام کے حدود کا تعین صرف اللہ تعالیٰ کر سکتا ہے۔یہ اللہ کا مخصوص حق ہے۔ اور اس حق اور اختیار کو اللہ کے اذن کے بغیر استعمال کرنا کفر اور شرک ہے۔بلکہ یہ عمل کفر کے میدان میں آخری حدود تک بڑھ جانے کے مترادف ہے۔اس طرح ان آیات کے ذریعے لوگوں کے دلوں سے خلجان کو دور کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی واضح کر دیا گیا کہ اسلامی نظام زندگی میں حرام و حلال کے تعین کا اختیار صرف اور صرف اللہ کو ہے۔اور اس عقیدے کا تعلق اس عظیم حقیقت سے ہے جو اس پوری کائنات کے ناموس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اندر ودیعت کی ہے اور تخلیق کے پہلے دن سے۔اس طرح اللہ کی جانب سے لوگوں کے لئے قانون سازی دراصل اس اصول پر مبنی ہے جو اللہ نے اس کائنات کے لئے ودیعت کیا ہے۔اس لئے لوگوں کے لئے کسی شخص کی جانب سے قانون سازی کا کام کرنا گویا کفر میں آگے بڑھنا ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہے۔

آیات کے اس حصے میں اس حقیقت کو بھی دوبارہ ذہن نشین کرانا مطلوب ہے۔جو ان آیات سے متصلا پہلے بھی بیان کی گئی ہیں۔وہ یہ کہ اہل کتاب بھی مشرکین ہیں اور دشمنی اور جہاد کے زاویہ سے وہ مشرکین کے محاذ میں شامل ہیں اور حکم یہ ہے کہ ان سب کے ساتھ جنگ کی جائے یعنی مشرکین اور اہل کتاب دونوں کے ساتھ۔اس لئے کہ یہ سب کے سب اہل اسلام کے خلاف جہاد اور جنگ کرتے ہیں اور پوری اسلامی تاریخ سے ان کا یہ طرز عمل پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور قرآن کے الفاظ تو اس معاملے میں بالکل واضح ہیں کہ اہل کتاب اور مشرکین دونوں کا مشترکہ ہدف یہی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہروقت بر سر پیکار رہتے ہیں۔اور جب بھی ان کا سامنا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ اپنے درمیان کی عداوتوں کو بھول جاتے ہیں' چاہے یہ اختلافات باہم عداوتوں کے حوالے سے ہوں یا عقائد و نظریات کے حوالے سے ہوں چنانچہ اسلام کی راہ روکنے کے لئے پھر ان کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور وہ اسلام کی بیخ کنی کے لئے متحد اور متفق ہو جاتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ اہل کتاب دوسرے مشرکوں کی طرح مشرک ہیں اور یہ کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مشرکوں کی طرح لڑتے ہیں۔اس بات کی متقاضی ہے کہ مسلمان بھی ان تمام مشرکوں کے خلاف لڑیں چاہے ان کا تعلق مشرکین اہل کتاب سے ہو یا مشرکین عرب سے ہو۔اور دوسری یہ کہ نسئ کا عمل کفر کی ایڈوانس شکل ہے کیونکہ ایک غلط کام ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں اللہ کے اختیار قانون سازی پر دست درازی بھی ہے اس لئے یہ سادہ کفر سے زیادہ کفر ہے۔یہی وہ مناسبت ہے جس کی وجہ سے سابقہ مضمون کے ساتھ ان آیات کا تعلق پیدا ہوتا ہے۔کیونکہ سابقہ آیات میں ان رکاوٹوں کا ذکر تھا جو جہاد کے لئے نکلنے میں حائل ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جہاد اہل کتاب اور مشرکین دونوں کے خلاف تھا۔

---OOO---

درس نمبر ۸۹ تشریح آیات

۳۶ ---- تا ---- ۳۷

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ

”حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اللہ کے نوشتے میں بارہ ہی ہے اور ان میں سے چار مہینے حرام ہیں۔یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔اور مشرکوں سے سب سے مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔“ یہ آیت زمانے کو اس معیار اور قانون کی طرف لوٹا دیتی ہے اور زمانے کا دوران اس نظام کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے یعنی زمانے کا تعین تخلیق کائنات کے مطابق ہو گا۔اس آیت میں اسی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس کائنات میں زمانے کا ایک نہایت ہی مستحکم دور کام کرتا ہے اور اس دوران میں سال کو بارہ مہینوں کے اندر تقسیم کیا گیا ہے۔اس مستحکم دوران میں کمی و بیشی نہیں پیدا کی جا سکتی۔اور یہ دوران زمان اور حولان حول میں نہایت ہی منضبط ہے اور یہ اس قانون قدرت کے مطابق ہے جس کے تحت اس کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔یہ نظام اور ضابطہ یا ناموس یا قدر اس قدر دقیق اور مستحکم ہے کہ اس میں کوئی کمی و بیشی نہیں کی جا سکتی۔کیونکہ زمانے کا دوران نہایت ہی دقیق معیار کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔اور آغاز تخلیق کائنات سے اس ضابطے کو جاری و ساری کیا گیا ہے اور یہ کبھی موقوف نہیں ہوا ہے۔

زمان و مکان کے قانون حرکت کے اس استحکام کو یہاں اس لئے لایا گیا ہے کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ حرام و حلال کے حدود و قیود کا تعین کائنات کے اس مستحکم اصول پر مبنی ہے۔لہذا حلال و حرام کا تعین محض وقتی خواہشات اور میلانات کی اساس پر نہیں ہو سکتا۔نہ اس کی حرکت میں تقدیم و تاخیر کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ نہایت ہی غیر معمولی امر ہے۔

ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (۹:۳۶) ”یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔“ پس یہ دین اس کائنات کے مضبوط ضابطے کے مطابق ہے اور کائنات کا مضبوط ضابطہ وہ ہے جس کے مطابق یہ کائنات روز اول سے چل رہی ہے جب سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔

یہ ایک مختصر آیت ہے لیکن اس میں معانی و مدلولات کا ایک لامتناہی سلسلہ رکھ دیا گیا ہے۔ یہ معانی و مدلولات پے در پے چلے آرہے ہیں۔ بعض 'بعض کے لئے تشریح اور توسیع کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ بعض کی وجہ سے دوسرے مطالب قوی ہوتے ہیں۔ وہ تمام علمی اور سائنسی انکشافات اس کے مفہوم میں داخل ہیں جو جدید انسان اس دنیا میں سائنس کے ذریعے سامنے لاتا ہے اور مسلسل تجربات کر کے مزید حقائق کو سامنے لا رہا ہے۔ اس طرح اصول دین اور اصول کائنات کے درمیان مسلسل تطابق کا اظہار ہوتا ہے اور دینی اصول دور جدید میں اچھی طرح ذہنوں میں بیٹھ رہے ہیں اور اس کے اصول اور اس کی بنیادیں مضبوط ہو رہی ہیں۔ یہ تمام مدلولات صرف ۱۲ الفاظ کے ذریعے منضبط کئے گئے ہیں اور یہ الفاظ بھی بظاہر نہایت ہی معمولی اور سادہ ہیں اور عام فہم اور سادہ ہیں۔

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ

"ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔" ان چار مہینوں میں ایک دوسرے کے اوپر ظلم نہ کرو کیونکہ یہ اصول اس اصول سے مربوط ہے جس کے اوپر کائنات کو منظم کیا گیا ہے اور یہ اصول اعظم یہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کا قانون ساز اللہ ہے' اسی طرح لوگوں کے لئے بھی ضابطہ بندی کرنے والا اللہ ہے۔ لہٰذا ان ضوابط کی خلاف ورزی ظلم ہو گا لہٰذا تم ان حرام مہینوں کو اپنے لئے حلال کر کے امن و سلامتی کے خلاف اقدام مت کرو۔ یہ اللہ کے ارادے اور مشیئت کی خلاف ورزی ہو گی اور یہ خلاف ورزی ظلم ہے اور یہ ظلم کر کے اپنے آپ کو دنیا و آخرت کے عذاب کے لئے مستحق نہ ٹھہراؤ اور اپنے معاشرے کے اندر قلق و اضطراب نہ پیدا کرو اور اس دنیا کو اس جنگ کا شکار نہ بناؤ جس کا کوئی مقصد نہیں ہے جو امن و سلامتی سے متضاد ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

"اور مشرکوں سے سب سے مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔" یعنی حرام مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں الا یہ کہ مشرکین حرام مہینوں میں تم پر حملہ کر دیں۔ اگر وہ حرام مہینوں میں تم پر دست درازی کریں تو تم ان مہینوں میں بھی اپنا دفاع کر سکتے ہو کیونکہ اگر یکطرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا جائے تو اس طرح اچھے اخلاق کی حامل قوتیں کمزور پوزیشن میں چلی جائیں گی اور انسانی اخلاق کی حامل قوتیں اشرار کا مقابلہ نہ کر سکیں گی اور دنیا میں شر و فساد کا دور دورہ ہو جائے گا اور دنیا پر طوائف الملوکی کا غلبہ ہو جائے گا۔ لہٰذا حرام مہینوں میں جارحیت کا مقابلہ کرنا بھی دراصل ان مہینوں کی حرمت کو بچانا ہے تاکہ آئندہ ان کا احترام کیا جائے اور کوئی کسی کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہ کرے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (۹: ۳۶) "اور مشرکوں سے سب مل کر

لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔" یعنی تم سب ان کے ساتھ لڑو' بلا استثناء' سب کے سب' اس حکم سے کوئی جماعت بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ سب تم سے لڑتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اور وہ بھی تم میں سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتے۔ لہٰذا معرکہ جہاد در حقیقت شرک اور توحید کے نظریات کے درمیان معرکہ ہے۔ یہ ایمان اور کفر اور ہدایت و ضلالت کے درمیان معرکہ آرائی ہے۔ یہ ایسے دو بلاکوں کے درمیان محاذ آرائی ہے جن کے درمیان کسی بھی وقت امن قائم نہیں ہو سکتا' نہ ان کے درمیان کوئی مکمل اتفاق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اختلاف کوئی عارضی اور جزوی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ دائمی اور بنیادی اختلاف ہے۔ یہ ایسے مصالح اور مفادات کا اختلاف نہیں ہے جن کے درمیان یگانگت پیدا کی جا سکتی ہو۔ نہ زمین کے کسی رقبے پر اختلاف ہے جسے تقسیم کر کے اس کی حد بندی کی جا سکتی ہو' اگر امت مسلمہ یہ سمجھے کہ اس کے اور کفار اہل کتاب اور بت پرستوں کے درمیان برپا جنگ اقتصادیات کی جنگ ہے یا کوئی قومی جنگ ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہوگی یا اگر اسے کوئی یہ بات سمجھاتا ہے تو وہ اسے دھوکہ دیتا ہے۔ یہ معرکہ محض وطنی یا پالیسی کا معرکہ نہیں ہے' یہ تو ایک ہمہ گیر نظریاتی معرکہ ہے۔ اور یہ اس نظام اور دین اسلام اور کفر کے درمیان معرکہ ہے۔ اس ہمہ گیر معرکے کا فیصلہ انصاف اور کچھ لے اور کچھ دے کے اصول پر نہیں ہو سکتا' نہ مذاکرات کے ذریعے اسے حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا حل تو صرف عمل جہاد میں مضمر ہے۔ مسلسل جدوجہد اور پیہم عمل میں اس کا حل مضمر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ہے جو کسی طرح بھی نہیں ٹل سکتی۔ یہ وہ نظام اور قانون ہے جس کے اوپر نظام کائنات کھڑا ہے۔ آسمان و زمین اسی ناموس اکبر کے مطابق قائم اور رواں دواں ہیں۔ دنیا کے ادیان اور نظریات بھی اس ناموس کے مطابق چل رہے ہیں۔ دل اور دماغ کا نظام بھی یہی تکوینی نظام ہے اور یہ اسی روز سے قائم ہے جس روز سے اللہ نے زمین و آسمان کی تخلیق کی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۳۶) "اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔" لہٰذا کامیابی ان متقین کے لئے لکھ دی گئی ہے جو اللہ کی حدود کا احترام کرتے ہیں' اللہ جسے حرام قرار دے اسے حرام قرار دیتے ہیں اور اللہ کے قوانین سے انحراف نہیں کرتے۔ لہٰذا قانون قدرت یہ ہے کہ مسلمان مشرکین کے خلاف عمل جہاد کو لمحہ بھر کے لئے بھی موقوف نہ کریں' اس سے انحراف نہ کریں اور اس مسلسل جہاد میں وہ حدود اللہ کو پامال نہ کریں اور حدود اللہ کا احترام کریں اور عمل جہاد کو اس کے پورے قوانین اور آداب کے مطابق جاری رکھیں اور اس جہاد میں ان کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی ہو' دل میں بھی اور علانیہ طور پر بھی۔ اگر وہ ان اصولوں کے مطابق جہاد میں داخل ہوں تو فتح ان کے قدم چومے گی کیونکہ اس صورت میں اللہ ان کے ساتھ ہوگا اور جس کا ساتھی اللہ ہو' اس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں رہتا۔

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِيَادَةٌ فِی الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ

اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ۳۷

"نسی تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں 'تاکہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری بھی کر دیں اور اللہ کا حرام کیا ہوا حلال بھی کر لیں..... ان کے برے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے گئے ہیں اور اللہ منکرین حق کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

حضرت مجاہد کا کہنا ہے کہ "بنی کنانہ کا ایک شخص اپنے گدھے پر سوار ہوکر ہر سال موسم حج میں آتا اور یہ اعلان کرتا: "لوگو! مجھ پر نہ کوئی عیب جوئی کی جا سکتی ہے اور نہ میں ناکام ہوتا ہوں۔ نہ میری بات کو رد کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے محرم کو حرام قرار دیا ہے اور صفر کو موخر کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ دوسرے سال آتا اور یہی بات کہتا۔ ہم نے صفر کو حرام قرار دیا ہے اور محرم کو مؤخر کر دیا ہے اور یہی مطلب ہے۔ لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ (۹ : ۳۷) "تاکہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری کر دیں۔" یعنی چار ماہ کی تعداد پوری کر دیں۔ اس طرح وہ حلال مہینوں کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیں۔ عبدالرحمن ابن زید ابن اسلم کا کہنا ہے کہ یہ شخص بنی کنانہ میں سے تھا اور اس کا نام قلمس تھا۔ جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے پر حرام مہینوں میں ڈاکہ نہ ڈالتا تھا۔ بعض اوقات یہ ہوتا کہ ایک شخص کے سامنے اس کے باپ کا قاتل آ جاتا لیکن وہ اس پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ اگر حرام مہینوں میں کوئی شخص مقاتلہ کے لئے دوسروں سے امداد طلب کرتا تو لوگ کہتے' دیکھتے نہیں حرام مہینہ ہے تو امداد طلب کرنے والا یہ کہتا کہ اسی سال ہم اسے ملتوی کر دیں گے۔ چنانچہ اس سال محرم کے بجائے دو صفر ہوں گے اور دوسرے سال ہم دو محرم کر دیں گے۔ اس طرح وہ لوگ کر لیتے۔ اور اگلے سال وہ صفر کے مہینے کو بھی محرم کی طرح حرام قرار دیتے۔ اس طرح دو مہینے حرام قرار پاتے۔

اس آیت کی تفسیر میں یہی دو اقوال ہیں اور یہی نسئ کی دو صورتیں رائج تھیں۔ پہلی صورت میں وہ محرم کے بدلے صفر کو حرام قرار دیتے۔ اور چار کی تعداد پوری کرتے لیکن اللہ نے منصوص طور پر جن مہینوں کو حرام قرار دیا تھا یہ چار بعینہ وہ نہ ہوتے کیونکہ ان میں محرم نہ ہوتا۔ اور دوسری صورت میں ایک سال میں تین مہینے حرام ہوتے اور دوسرے میں پانچ حرام ہوتے اور اس طرح دو سالوں کی اوسط آٹھ کی تعداد پوری ہو جاتی۔ لیکن اس طرح بھی محرم کا احترام بہرحال ٹوٹ جاتا۔ اور اس کی جگہ صفر حرام ہو جاتا۔

ان دونوں صورتوں میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا جاتا جو اسلامی شریعت کے خلاف عمل تھا۔ اسے زیادۃ فی الکفر قرار دیا گیا کیونکہ نظریاتی کفر کے ساتھ یہ از خود قانون سازی کر کے کفر کا ارتکاب کیا گیا۔

يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۹ : ۳۷) "جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔" وہ دھوکہ دیتے ہیں، دین کو کھیل بناتے ہیں اور نصوص میں تاویل و تحریف کرتے ہیں۔

زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ (۹ : ۳۷) "ان کے برے اعمال ان کے لئے خوشنما بنا دیئے گئے ہیں۔"

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو برائی اچھائی نظر آتی ہے' وہ بدزیبی کو زیبائش سمجھتے ہیں۔اس طرح وہ گمراہی کو گمراہی سمجھتے ہی نہیں اور کفریہ اعمال میں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۹: ۳۷) "اور منکرین حق کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔" کیونکہ انہوں نے خود اپنے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔انہوں نے دلائل ہدایت پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔لہذا انہوں نے اپنے آپ کو اس بات کا مستحق بنا لیا ہے کہ وہ جس حال میں ہیں' اللہ انہیں اس میں چھوڑ دے۔

درس نمبر ۹۰ ایک نظر میں

آیات کا یہ حصہ 'بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر حکم نفیر عام کے بعد نازل ہوا ہو گا۔جب حضورؐ کو معلوم ہوا کہ رومی جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے شام کی حدود پر جمع ہو گئے ہیں۔ الا یہ کہ ہرقل نے اپنے ساتھیوں اور فوجیوں کو ایک سال کا راشن فراہم کر دیا ہے اور ان افواج کے ساتھ قبائل لخم 'جذام' عاملہ اور غسان بھی شامل ہو گئے ہیں جو شمالی عربی قبائل تھے۔ ان کے ہراول دستے مقام بلقا تک آ پہنچے ہیں۔ ان حالات میں حضورؐ نے بھی مسلمانوں کو عام لشکر کشی کی تیاری کا حکم دے دیا۔حضورؐ جب بھی کسی غزوے کے لئے نکلتے تو آپ جنگی چال کے طور پر تیاریوں کا رخ دوسری جانب پھیرتے۔ پتہ نہ ہوتا کہ آپ نشانہ کہاں لگائیں گے مگر آپ نے غزوہ تبوک میں اس اصول کو چھوڑ دیا چونکہ یہ دور کا سفر تھا اور موسم نہایت ہی سخت تھا۔ اس لئے حضور نے اس سفر کی بات صاف صاف بتا دی تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ چھاؤں خوشگوار تھی۔ باغات پک چکے تھے۔ اور لوگوں کے لئے سفر کے مقابلے میں گھروں پر قیام بہت ہی محبوب تھا۔ ان حالات میں اسلامی معاشرے میں ان کمزوریوں کا ظہور ہوا جن کے بارے میں ہم نے اس سورت کے مقدمے میں تفصیلاً بتایا ہے۔ ان حالات میں منافقین کے لئے بھی اپنی ذلیلانہ حرکات کے لئے مواقع پیدا ہو گئے 'انہوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ گرمی میں لشکر کشی نہ کی جائے۔ انہوں نے طویل سفر کی صعوبتوں کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کو رومیوں کی قوت سے بھی خوب ڈرایا۔ اور اس پروپیگنڈے کا اثر بھی اسلامی معاشرے پر پڑا۔ چنانچہ آیات کے اس حصے میں ان تمام باتوں کے خلاف متنبہ کیا گیا۔

---ooo---

درس نمبر ۹۰ تشریح آیات

۳۸ ---- تا ---- ۴۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۳۸ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۹ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ
اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ
فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۴۰
اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۱

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سرو سامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور

گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے' وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں' اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا' جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا' جب وہ دونوں غار میں تھے' جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ ''غم نہ کر' اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے' اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے۔ نکلو' خواہ ہلکے ہو یا بوجھل' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے' اگر تم جانو۔''

پیچھے رہ جانے والوں کے لئے یہ آغاز عتاب ہے' ان کو یہاں سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر انہوں نے جہاد کے معاملے میں سستی کی تو اس کے نتائج سخت ہوں گے۔ اس موقع پر انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ تم حضرت محمد ؐ کو اکیلا اور محتاج نہ سمجھو۔ ان کے ساتھ اللہ کی نصرت اور مدد ہر وقت موجود رہتی ہے۔ غار میں اس کے ساتھ تم میں سے کوئی نہ تھا اور تمہارے بغیر بھی اللہ نے اپنی قدرت سے ان کو بچایا۔ حضور ؐ کو تو تمہارے تخلف سے کوئی نقصان ہو گا یا نہ ہو گا' تمہیں بہرحال گناہ ہو گا اور تم سے ایک بڑی کوتاہی کا صدور ہو جائے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى

الْاَرْضِ (۹ : ۳۸) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟''

یہ سب زمین کے بوجھ ہیں' زمین کے لالچ' زمین کے تصورات' زندگی کے چلے جانے کا خوف' مال کے نقصان کا خوف' دنیاوی لذتوں اور مال و متاع کے ضائع ہو جانے کا خوف' عیاشی' آرام اور امن و سکون کے تباہ ہو جانے کا خوف۔ فنا ہونے والی لذتوں' زندگی کے مختصر اور عارضی مقاصد اور خود اس کرۂ ارض کی مختصر زندگی کے ساتھ چمٹ جانے کی رکاوٹ۔ غرض تمام رکاوٹیں' خون' گوشت اور مٹی سے متعلق ہیں۔ اور ان تمام رکاوٹوں کو ایک نہایت ہی زمزمہ انگیز لفظ اثاقلتم کے ذریعے بتایا گیا۔ اس میں ایک قرات تثاقلتم بھی آئی ہے لیکن حفص کی عام قراءت نہایت ہی موثر ہے۔ یہ لفظ جس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک جثہ ہے جو زمین پر گرنے کے لئے ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ لوگ اسے مشکل سے اوپر کی طرف اٹھانے کی سعی کرتے ہیں لیکن وہ اس قدر بوجھل ہو چکا ہے کہ وہ زمین پر گر جاتا ہے۔ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (۹ : ۳۸) ان الفاظ میں سے اظہار ہوتا ہے کہ زمین اسے اپنی جانب کھینچ رہی ہے لیکن روحانی قوت اور تحریک اور شوق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اوپر اٹھے۔ جہاد کے لئے اٹھنے کا عمل دراصل اپنے آپ کو اس زمین کی کشش ثقل سے آزاد کرنا ہے۔ زمین کے اندر پائی جانے والی گوشت و پوست کی آلودگیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کا عمل ہے۔ انسان کو روحانی دنیا اور بلند مقاصد کی دنیا کی طرف مشتاق کرنے کا عمل ہے۔ انسانی روح کو دنیاوی قید و بند سے آزاد کر دینے کا عمل ہے۔ اس عارضی اور مختصر زندگی کو ترک کر کے دائمی اور طویل زندگی میں داخل ہونے کا عمل ہے۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ

۳۸) ”کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔“ کسی عقیدے اور نظریے کے پیروکار اگر جہاد فی سبیل اللہ سے رکتے ہیں یا اپنے نظریات کی خاطر جنگ نہیں کرتے تو اس کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے نظریہ اور عقیدہ کے اندر فتور اور کمزوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من مات و لم یغزو و لم یحدث نفسه بغزو و مات علی شعبة من شعب نفاق ”جو شخص مر گیا اور اس نے نہ تو جہاد میں حصہ لیا اور نہ ہی اس کو کبھی اس کا خیال گزرا تو ایسا شخص نفاق کے شعبوں میں سے ایک شعبے پر مرا۔“ لہٰذا نفاق جب کسی عقیدے میں داخل ہوتا ہے تو وہ اسے بلندی اور کمال سے روکتا ہے۔ یہ نفاق ہی ہے جو انسان کو موت سے ڈرا کر، فقر و فاقے سے ڈرا کر جہاد سے روکتا ہے حالانکہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور رزق ہر شخص کا اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آخرت کے مقابلے میں اس پوری زندگی کا مال و متاع شیئ قلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے یہ بیان آتا ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹: ۳۹) ”تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا، اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“ یہ خطاب ایک متعین واقعہ میں ایک متعین جماعت کو ہے۔ لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ ہر صاحب عقیدہ اور نظریہ کے لئے عام ہے۔ یہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے صرف آخرت کا عذاب ہی نہیں ہے۔ یہ دنیاوی عذاب بھی ہے۔ جو لوگ جہد و جہاد سے پہلوتہی کرتے ہیں اور غلبہ و سربلندی کے لئے جہد مسلسل نہیں کرتے وہ محروم رہتے ہیں اور ذلت کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھلائی کے کاموں میں حصہ لینے سے محروم رہتے ہیں۔ اور یہ میدان وہ اپنے دشمنوں کے لئے خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اسلام کی راہ میں جدوجہد کی راہ چھوڑ دینے کے نتیجے میں نظریاتی لوگوں کا جانی اور مالی نقصان جہاد و قتال میں حصہ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جہاد کا شریفانہ عمل ان سے جس قربانی کا مطالبہ کرتا، اس کے مقابلے میں ذلت اور پست ہستی ان سے زیادہ قربانی کا مطالبہ کرتی ہے۔ غرض جس قوم نے بھی جہاد کے عمل کو ترک کیا، اس کے مقدر میں ذلت لکھ دی جاتی ہے۔ وہ دشمن کے لئے لقمہ تر بن جاتی ہے اور دشمن اسے بڑی آسانی کے ساتھ غلام بنا لیتا ہے۔

وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۹: ۳۹) ”تمہاری جگہ اور گروہ اٹھائے گا۔“ یہ دوسرا گروہ ایسا ہو گا جو اپنے نظریات پر مضبوطی سے قائم ہو گا، وہ اپنی عزت اور وقار کے لئے قربانی دینے والا ہو گا اور وہ اللہ کے دشمنوں پر سربلندی حاصل کرنے والا ہو گا۔“

وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا (۹: ۳۹) ”تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔“ پھر تمہاری کوئی حیثیت نہ ہوگی اور نہ صف اول میں تمہاری حیثیت ہوگی اور نہ صف آخر میں۔“

وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۹ : ۳۹) "اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔" وہ اس بات سے عاجز نہیں ہے کہ تمہیں ختم کر دے اور تمہاری جگہ دوسری اقوام کو اٹھا لائے اور تمہیں نظرانداز کر کے گوشہ گم نامی میں ڈال دے ۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیاوی مفادات سے بلند ہونا اور نفس انسانی کی کمزوریوں پر قابو پانا' دراصل مقام شرافت و کرامت کو پانا ہے ۔ اس کے نتیجے میں بلند ترین زندگی عطا ہوتی ہے لیکن ذلت کو اختیار کر کے زمین سے چمٹ جانا اور دشمن سے خائف ہونا کرامت اور شریعت اور عظمت کی زندگی کی نفی ہے ۔ اور اللہ کے معیار کے مطابق یہ فنا اور ذلت ہے اور روحانی اقدار کی تباہی ہے ۔

اب اللہ تعالیٰ ایک تاریخی واقعہ کو ذکر کر کے ایک مثال بیان فرماتے ہیں ۔ یہ مثال ان کے علم میں تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ بعض حساس مواقع پر دست قدرت نے کس طرح رسول اللہ اور اسلامی تحریک کی دستگیری فرمائی ۔ اس میں افراد تحریک کا کوئی دخل نہ تھا ۔ یہ خالص غیبی امداد تھی اور مہاجرین و انصار میں سے کوئی ایک شخص بھی اس وقت امداد کے لئے موجود نہ تھا ۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَ اَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰی وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۹ : ۴۰) "تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں' اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا' جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا' جب وہ دونوں غار میں تھے' جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر' اللہ ہمارے ساتھ ہے ۔" اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکون قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا ۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے' اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے ۔"

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قریش کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ سرکش قوتوں کو جب کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ تشدد پر اتر آتی ہیں ۔ چنانچہ قریش نے بھی حضور کے خلاف تشدد کی سازشیں شروع کر دیں ۔ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ حضور ؐ کو قتل کر کے ان سے جان چھڑائی جائے ۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ؐ کو ان کی خفیہ سازشوں کی بابت اطلاع کر دی ۔ اور حکم دیا کہ آپ اب مکہ سے نکل جائیں ۔ آپ کے ساتھ صرف ابوبکر صدیق رفیق تھے ۔ آپ کے پاس نہ تو کوئی لشکر تھا اور نہ سامان جنگ تھا ۔ آپ کے دشمن ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور وہ بہت ہی طاقتور تھے ۔ یہاں سیاق کلام میں اس کی نہایت ہی خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے ۔

اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ (۹ : ۴۰) "جب وہ دونوں غار میں تھے ۔" اور قوم ان کا پیچھا کر رہی تھی ۔ حضرت صدیق سخت گھبرائے ہوئے تھے ۔ وہ اپنی جان کے بارے میں فکرمند نہ تھے ۔ ان کو قائد کی فکر تھی کہ وہ ان کے آثار نہ پا لیں اور ان کے حبیب تک رسائی حاصل نہ کر لیں ۔ کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی اپنے پاؤں کی جگہ سے نظر ڈالتا تو ہم اسے اس کے پاؤں کے نیچے نظر آ جاتے ۔ اس موقع پر حضور ؐ کے قلب پر اللہ کی جانب سے سکون و ثبات کی کیفیت نازل

ہو چکی تھی ۔ آپ نے صدیق اکبر کے خوف کو کم کرنے کی کوشش کی اور فرمایا :"ابوبکر تمہارا ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا ساتھی اللہ ہو"

نتیجہ کیا نکلا؟ حالات ایسے ہیں کہ ایک طرف پوری مادی قوتیں ہیں اور حضورؐ اور ان کے اکیلے ساتھی ہر قسم کی مادی قوتوں سے محروم ہیں ۔ اب اللہ کی افواج میدان میں آتی ہیں ۔ ان میں سے کوئی فوج اور کوئی قوت نظر نہیں آتی ۔ اس منصوبے میں کفار کو بری طرح شکست ہوتی ہے اور وہ ذلیل ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى (۹ : ۴۰) "اور اللہ نے کافروں کا بول نیچا کر دیا۔" اور اللہ کا کلمہ اپنی جگہ سربلند رہا جیسا کہ وہ ہمیشہ سربلند رہتا ہے 'قوی ہوتا ہے اور اسے نفوذ حاصل ہوتا ہے ۔

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا (۹ : ۴۰) بعض قراءتوں کے مطابق

وَكَلِمَةَ اللّٰهِ (۹ : ۴۰) نصب کے ساتھ بھی آیا ہے ۔ لیکن وَكَلِمَةُ اللّٰهِ (۹ : ۴۰) رفع کے ساتھ زیادہ قوی ہے ۔ مفہوم کے اعتبار سے بات زوردار ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں تاکید اور دوام کا مفہوم ہوتا ہے ۔ یعنی وَكَلِمَةُ اللّٰهِ (۹ : ۴۰) کا مزاج اور اس کی حقیقی پوزیشن ہی یہ ہے کہ وہ سربلند ہوتا ہے ۔ اس کی سربلندی کسی ایک واقعہ اور حادثہ میں محدود نہیں ہے ۔ اللہ عزیز ہے اور اس کے دوست کبھی ذلیل نہیں ہوتے اور وہ بہت بڑا حلیم ہے ۔ اس لئے وہ اپنے دوستوں کے لئے کامیاب پالیسی وضع فرماتا ہے اور اس نے ان کے مقدر میں کامیابی لکھ دی ہے ۔

یہ ایک مثال تھی کہ کس طرح اللہ نے اپنے رسول اور اپنے کلمات کو کامیابی عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ ایسی مثالیں دہرا سکتا ہے لیکن اس قسم کی امداد صرف ان لوگوں کو پہنچ سکتی ہے جو سستی نہیں کرتے اور بیکار نہیں بیٹھے ۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں گے تو اللہ دوسرے گروہ پیدا کر سکتا ہے ۔ یہ ایک واقعی اور عملی مثال تھی اور اس کو سمجھانے کے لئے کسی بڑی دلیل اور منطقی استدلال کی ضرورت ہی نہ تھی ۔

اس مثال کی فضا میں اور اس گہرے تاثر کی حالت میں اب اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں کہ تمام مسلمان اس مہم میں نکل کھڑے ہوں 'کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں 'کوئی عذر ان کی راہ میں حائل نہ ہو' نکل کھڑے ہوں اگر وہ دنیا میں کامرانی اور فتح مندی چاہتے ہیں اور آخرت میں دائمی فلاح چاہتے ہیں ۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۹ : ۴۱) "نکلو' خواہ ہلکے ہو یا بوجھل' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ' یہ تمہارے لئے بہتر ہے 'اگر تم جانو۔" ہر حال میں نکلو' جانی اور مالی قربانی دو' حجتیں نہ گڑھو اور عذرات نہ پیش کرو' مشکلات اور رکاوٹوں کو پاٹتے جاؤ ۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۹ : ۴۱) "تمہارے لئے یہ بہتر ہے 'اگر تم جانتے ہو۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مخلص مومنین ان حقائق کو پا گئے ۔ وہ تمام رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود نکل کھڑے ہوئے ۔ ان

کے پاس عذرات موجود تھے لیکن انہوں نے عذرات سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو اللہ نے ان کے سامنے زمین کے دروازے کھول دیئے۔ ان کے لئے لوگوں کے دل بھی کھل گئے۔ اور ان مخلصین کے ذریعے اللہ نے اپنے کلمے کو بلند کر دیا۔ اور اللہ کے کلمات کے ذریعے خود ان کو بلند اور ممتاز کر دیا۔ اور ان کے ہاتھوں وہ وہ کارنامے وجود میں آئے کہ آج بھی وہ تاریخ انسانی کا اعجوبہ ہیں۔

حضرت ابو طلحہ سورت توبہ پڑھ رہے تھے' جب وہ اس آیت پر آئے تو انہوں نے فرمایا: "ہمارے رب نے ہمیں نکلنے کا حکم دیا ہے' خواہ ہم بوڑھے ہوں یا نوجوان! بیٹو! مجھے تیار کرو' اس کے بیٹوں نے کہا: "ابو تم پر اللہ کا رحم ہو' تم نے تو رسول اللہ کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے' تم نے حضرت ابوبکر کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے' تم نے حضرت عمر کے ساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ وہ فوت ہوگئے۔ اب تو ہم آپ کی طرف سے جہاد کریں گے۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بحری بیڑے میں چلے گئے۔ سمندر میں آپ کو موت نے آلیا۔ بحریہ کو کوئی جزیرہ نہ ملا کہ اسے دفن کر دے۔ نو دنوں کے بعد انہیں جزیرہ ملا۔ ان نو دنوں میں ان کے جسم میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے اس جزیرے میں دفن کر دیا۔"

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ وہ ابو راشد حرانی سے روایت کرتے ہیں' کہتے ہیں: "میں نے رسول اللہ کے سوامقداد ابن اسود رضی اللہ عنہ سے ملا۔ یہ ایک صراف کے تابوت پر بیٹھے ہوئے تھے اور جہاد کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا: چچا آپ تو عند اللہ ور ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم پر سورت البحوث نازل ہوئی ہے (یعنی توبہ)۔

انْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا (۹ : ۴۱) "نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل۔" حبان ابن زید الشرعی سے روایت ہے کہ ہم صفوان ابن عمرو کے ساتھ جہاد پر نکلے' یہ حمص کے گورنر تھے۔ ہم افسوس کی جانب جراجمہ کی طرف گئے۔ میں نے ایک ایسے بوڑھے کو دیکھا جس کی بھنویں اس کی آنکھوں پر گری ہوئی تھیں اور یہ اہل دمشق کے لوگوں سے تھا اور گھوڑے پر سوار تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اے چچا تم تو اللہ کے نزدیک رہو۔ کہتے ہیں اس بوڑھے نے اپنی دونوں بھنویں اوپر کو اٹھائیں اور کہا: بھتیجے اللہ نے تو ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں ہلکے ہو یا بوجھل۔ یاد رکھو' جسے اللہ محبوب رکھتا ہے اسے مشکلات سے دوچار کرتا ہے اور پھر اسے صحیح و سلامت واپس لاتا ہے لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے صرف اس شخص کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے جو صبر کرے' شکر کرے اور اسے یاد کرے اور اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرے۔

یہ تھی وہ جدوجہد اور جہاد مسلسل جس کے ذریعے اللہ نے اسلام کو دنیا میں پھیلایا اور اللہ کے ان بندوں نے تمام انسانیت کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ وحدہ کی بندگی میں داخل کر دیا۔ اور اسلام کی مدوجزر کی تاریخ میں وہ معجزہ رونما ہوا جس کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۹۱ تشریح آیات

۴۲ ---- تا ---- ۹۳

یہاں سے ان لوگوں کے بارے میں تبصرہ شروع ہوتا ہے۔ جن سے اس موقعہ پر کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ظہور ہوا۔ اس پورے سبق میں ان منافقین کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو اسلام کے نام پر اسلامی صفوں میں گھسے ہوئے تھے، خصوصاً اس وقت جب اسلام غالب ہو گیا تھا اور ان لوگوں کی سلامتی اور ان کے مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ اسلام کے سامنے سرنگوں ہو جائیں اور اسلامی صفوں میں داخل ہو کر اسلام کے خلاف سازشیں کریں کیونکہ ظاہری حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اسلام سے باہر رہ کر وہ اسلام کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے۔

اس سبق میں وہ تمام حالات ہمارے سامنے آئیں گے جن کی طرف سے ہم نے اس سورت کے مقدمے میں اشارہ کیا تھا، ان حالات کی تصویر کشی قرآن کے الفاظ میں ہوگی۔ سورت کے آغاز میں ہم نے جو اصولی بحث کی تھی اس کی روشنی میں اب ان نصوص کو سمجھنا کوئی زیادہ مشکل کام ہرگز نہ ہو گا جیسا کہ پہلے ہم کہہ آئے ہیں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ
بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ
٥ع ٦ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٤٢﴾ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ
١٢ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٤٣﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٤﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ

فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقٰعِدِينَ ﴿٤٦﴾ لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَّا زَادُوكُمْ
إِلَّا خَبَالًا وَّلَأَوْضَعُوا خِلٰلَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ
وَاللّٰهُ عَلِيمٌۢ بِالظّٰلِمِينَ ﴿٤٧﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ
الْأُمُورَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُونَ ﴿٤٨﴾

"اے نبی" اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے' مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔ اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اے نبی" اللہ تمہیں معاف کرے' تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی؟ (تمہیں چاہئے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے ہو۔ جو لوگ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے' جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔

اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ تیاری کرتے۔ لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا۔ اس لئے اس نے انہیں ست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی ان میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں' اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لئے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آگیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔"

اگر یہ معاملہ دنیاوی مفادات کا ہوتا اور ہوتا بھی سہل الحصول' یا کوئی مختصر اور نفع بخش سفر ہوتا جس کے نتائج یقینی ہوتے تو یہ لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے۔ لیکن یہ سفر دور کا سفر ہے اور پر مشقت ہے اور ہمت شکن سفر ہے۔ کمزور ہمتوں اور ضعیف العزم لوگ جراءت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ سفر اس عظیم اور بلند نصب العین کی طرف ہے جس کو دیکھ کر کمزور ارواح کے لوگ ڈر جاتے ہیں' کمزور دل والوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اور کم ظرف لوگ اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

یہ مہم دراصل ایک مثالی مہم تھی اور انسانیت کی تاریخ میں ایسی مہمات ہمیشہ مثالی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی بھی ملک کے لئے فخریہ حکایات و روایات فراہم کرتی ہیں۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ (۹ : ۴۲)

"اے نبی ! اگر فائدہ سہل الحصول ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمہارے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتے مگر ان پر تو یہ راستہ بہت کٹھن ہو گیا۔"

اگر مقام شرف و منزلت کی طرف بسہولت آگے بڑھا جا سکتا ہو' تو امیدواران منزل بکثرت سامنے آ جاتے ہیں لیکن اگر راستہ دشوار گزار ہو تو لوگوں کی بڑی تعداد پہلوتہی کرتی ہے۔ اور راستے کی مشکلات کی خاطر لشکر سے پیچھے رہ جاتی ہے اور ان کے پیش نظر دنیا کا نہایت ہی بے قیمت اور بے حقیقت مقصد ہوتا ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں اور مشہور و معروف ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ شاذ و نادر نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ تو ہر زمانے میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ زندگی کے ایک کنارے پر بے وقعت مقام کے مکین ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے زعم میں یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے قیمتی مفادات حاصل کئے' انہوں نے اعلیٰ دنیاوی مقاصد پا لئے اور وہ کسی بھی مقصد کے لئے اعلیٰ قربانیاں دینے سے بچ گئے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ کوئی جس قدر قیمت دے گا' اسے اس کی قیمت ہی کے مطابق مقام ملے گا۔ اس دنیا میں بھی کسی کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ قیمت ادا کرتا ہے۔

وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ (۹ : ۴۲) "اب وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم چل سکتے تو یقیناً تمہارے ساتھ چلتے۔" یہ وہ جھوٹا عذر ہے جو ہمیشہ کمزور لوگ پیش کیا کرتے ہیں۔ عذرات پیش کرنے والے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر عذرات پیش کرنے والے قوی اور بہادر نظر آئیں لیکن درحقیقت یہ کمزور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بہادر وہ ہوتا ہے جو مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور ضعیف وہ ہوتا ہے جو پہلوتہی کرتا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ یہ اصول ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (۹ : ۴۲) "وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔" یہ جھوٹ بول کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر' وہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے نزدیک گویا کامیاب ہو گئے' حالانکہ حقیقت حال کا علم تو اللہ کو ہے کہ یہ کامیاب نہیں ہیں اور اللہ ان کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے کھول بھی سکتا ہے' لہٰذا یہ لوگ دنیا میں بھی اپنے جھوٹے عذرات کی وجہ سے بے وقعت ہوں گے اور آخرت میں بھی کیونکہ آخرت میں تو کوئی بہانہ نہ چلے گا۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۹ : ۴۲) "اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔"

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۹ : ۴۳)

"اے نبی ! اللہ تمہیں معاف کرے' تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی؟ (تمہیں چاہئے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر اس قدر مہربان ہے کہ عتاب سے پہلے ہی معافی کا اعلان فرماتا ہے۔ جب ان لوگوں نے جھوٹے عذرات پیش کئے تو رسول اللہ نے ان کے عذرات قبول کر لئے اور ایسے لوگوں نے ان عذرات کی اوٹ میں اپنے آپ کو

چھپایا۔ حضور ؐ نے ان لوگوں کے عذرات کو اس لئے قبول کر لیا تھا کہ اس وقت سچے اور جھوٹے عذرات کی تحقیقات کا موقعہ نہ تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ بعض لوگ لشکر سے بلا کسی عذر کے پیچھے رہ جائیں اور اس طرح ان کی حقیقت عامۃ الناس پر کھل جائے اور پردۂ نفاق بھی گر جائے۔ اور ننگے ہو کر رہ جائیں اور لوگوں کے سامنے ان کی حقیقت کھل جائے اور ان کے لئے اذن رسول کا بہانہ بھی نہ رہے۔

حضور ؐ نے چونکہ منافقین کے نفاق کا انکشاف نہ کیا تھا' اس لئے اللہ نے یہاں ایسے اصول اور ایسی صفات کو بیان کر دیا جن کی روشنی میں منافقین کو اچھی طرح پہچانا جاسکے۔ اور یہ صفات مومنین اور منافقین کے درمیان امتیازی صفات ہوں۔

لَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ (۹: ٤٤) "جو لوگ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔"

اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ (۹: ٤٥) "ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے' جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔"

یہ وہ اصول ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جو لوگ صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لے آتے ہیں اور جن کو یقین ہوتا ہے کہ ایک دن انہوں نے اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ وہ جہاد سے پیچھے رہنے کی اجازت لیں۔ اور جب بھی ان کو اللہ کی راہ میں جان اور مال قربان کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ ایک منٹ کے لئے بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ہلکے ہوں یا بوجھل ہوں' اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں' اطاعت امیر کرتے ہیں اور ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ان کو پوری پوری جزا دے گا اور ان سے راضی ہو گا۔ وہ جہاد کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ از خود اس عمل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کی ضرورت نہیں پڑتی کہ کوئی انہیں اس کے لئے جوش دلائے' جہاد سے پیچھے رہنے کے لئے عذرات پیش کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ عذرات تو صرف وہ لوگ پیش کرتے ہیں جن کے دل ایمان و یقین کی دولت سے خالی ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ پس و پیش کرتے ہیں اور عذرات تلاش کر کے چھٹیاں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس عقیدے کا انہوں نے اظہار کیا ہے اس کے تقاضے پورے کرنے سے ان کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ در حقیقت وہ شک کے مریض ہوتے ہیں اور متردد ہوتے ہیں۔

اللہ کی طرف جو راستہ جاتا ہے وہ واضح ہے اور بالکل سیدھا ہے۔ اس سلسلے میں تردد اور پس و پیش وہی شخص کر سکتا ہے جو دولت یقین سے محروم ہو یا وہ شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ رسول برحق ہیں۔ لیکن ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے وہ مشکلات راہ سے گھبرا جاتا ہے۔

اس موقعہ پر جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے وہ لشکر کشی کی قدرت رکھتے تھے۔ ان کے پاس وسائل سفر موجود تھے ' سازو سامان بھی موجود تھا۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً (۹ : ۴۶) "اگر واقعی ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو وہ اس کے لئے کچھ تیاری کرتے۔" ایسے لوگوں کے سرخیل عبداللہ ابن ابی ابن سلول تھے ' جد ابن قیس بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ یہ اپنے قبائل کے معتبرین میں سے تھے اور بااثر اور مالدار تھے۔

وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ (۹ : ۴۶) "لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا پسند ہی نہ تھا ' اس لئے انہوں نے انہیں سست کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو ' بیٹھنے والوں کے ساتھ۔"
اللہ کو ان لوگوں کے مزاج اور ان کے نفاق کا علم تھا اور ان لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت جس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔ اس لئے اللہ نے انہیں اس موقع پر بٹھا دیا اور ان کی ہمت ہی ختم کر دی۔ یہ لوگ وروں اور عورتوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بچوں اور ناداروں کے ساتھ وہ پیچھے رہ گئے جو حقیقتاً اس لشکر میں جانے کی طاقت و وسائل نہ رکھتے تھے۔ لہذا گری ہوئی ہمتوں اور کمزور یقین رکھنے والوں کے لئے بہتر یہی تھا کہ وہ بیٹھے رہیں اور اس اعزاز سے محروم رہیں۔ اور اس میں دعوت اسلامی کی بھلائی تھی۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (۹ : ۴۷) "اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی ان میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں ' اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔"
پست ہمت اور بزدل پوری فوج کو پست ہمت اور بزدل بنا دیتے ہیں اور خیانت کار پوری سوسائٹی کو خائن بنا دیتے ہیں۔ اگر یہ منافقین مسلمانوں کے ہمراہی بن بھی جاتے تو اسلامی صفوں کے اندر بے چینی ' بددلی اور انتشار پیدا کر دیتے اور اسلامی فوج کے اندر فتنہ و فساد اور تفرقہ اور خذلان پیدا کر دیتے ' یہ اس لئے کہ مسلمانوں کے اندر بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کے ان سابقہ قائدین کے ساتھ سماجی تعلقات تھے اور ابھی تک مسلمان ان لوگوں کی باتوں پر کان دھرتے تھے لیکن اللہ اپنی دعوت کا محافظ خود تھا اور وہ داعیوں کی نگہبانی بھی اپنی نگرانی میں کر رہا تھا۔ اللہ نے مومنین کو فتنے سے اس طرح بچایا کہ منافقین اور ذلیل لوگ بیٹھے ہی رہ گئے۔

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (۹ : ۴۷) "اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔" یہاں ظالموں سے مراد مشرک ہیں۔ زیر بحث لوگوں کو بھی اللہ نے مشرکین کے زمرے میں ڈال دیا ہے۔ ان کا ماضی ان کے دلوں کا غماز ہے۔ اور ان کی بدفطرتی پر ان کی تاریخ گواہ ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے رسول خدا ﷺ کی راہ روکی۔ اور تحریک اسلامی کی مخالفت میں انہوں

نے وہی کچھ کیا جو ان لوگوں کے بس میں تھا۔ لیکن جب تحریک اسلامی غالب ہوئی تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا البتہ ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری موجود رہی۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۹ : ۴۸) ''اس سے پہلے بھی ان لوگوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کی ہیں اور تمہیں ناکام کرنے کے لئے یہ ہر طرح کی تدبیروں کا الٹ پھیر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ان کی مرضی کے خلاف حق آگیا اور اللہ کا کام ہو کر رہا۔''

یہ واقعہ اس وقت ہوا جب حضورؐ عوامی تائید کے ذریعے مدینہ تشریف لائے اور حالات یہ تھے کہ ابھی تک انہیں اپنے دشمنوں پر فیصلہ کن غلبہ حاصل نہ ہوا تھا اور مدینہ میں جب حضورؐ کو کامیابیاں نصیب ہوتی رہیں تو ان اعداء نے بھی سر جھکا دیئے لیکن دل سے وہ تحریک جدید کو بدستور ناپسند کرتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ اسلام پر کوئی برا وقت آئے اور انہیں ریشہ دوانیوں کا موقعہ ملے۔

---ooo---

اب قرآن کریم ان لوگوں کی مختلف اقسام کی طرف اشارات کرتا ہے اور ان کے جعلی عذرات پر بھی کلام ہوتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہ کے خلاف ان کے سینوں میں کیا کیا عناد اور بغض بھرے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف وہ کس قدر کینہ رکھتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

''ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ ''مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالئے۔'' سن رکھو! فتنے ہی میں

تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔

تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا۔ ان سے کہو "ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے ' اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

ان سے کہو، "تم ہمارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔ اور ہم تمہارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ساتھ دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔"

محمد ابن اسحاق نے زہری وغیرہ سے روایت کی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے (تبوک کے موقع پر) تو آپ نے بنو سلمہ کے بھائی جد ابن قیس سے کہا کہ جد کیا تم کو بنی اصغر (رومیوں) کے ساتھ جہاد میں دلچسپی ہے؟ تو اس نے کہا حضور ' آپ مجھے اجازت ہی دے دیں اور فتنے میں نہ ڈالیں؟ خدا کی قسم میری قوم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ عورتوں کے ساتھ دلچسپی لینے والا کوئی نہیں ہے۔ اور مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں نے بنی الاصغر (رومیوں) کی عورتوں کو دیکھا تو میں صبر نہ کر سکوں گا۔ رسول اللہ نے اس سے منہ پھیر لیا اور کہا = "میں نے تمہیں اجازت دے دی۔" تو اس جد ابن قیس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تمام منافقین اسی قسم کے عذرات پیش کرتے اور اللہ نے ان کو یہی جواب دیا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۹ : ۴۹) "ان میں سے کوئی ہے جو کہتا ہے کہ "مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالئے..... سن رکھو! فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔" منظرکشی اس طرح ہے کہ گویا جہنم ایک فتنہ ہے۔ اور یہ لوگ اس میں گرتے جا رہے ہیں۔ جہنم ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ان کے بچنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اور جہنم کا واحد راستہ کھلا ہے اور یہ لوگ آتے جاتے ہیں اور گرتے جاتے ہیں۔ یہ انداز تعبیر اس بات سے کنایہ ہے کہ انہوں نے پیچھے رہ کر ایک عظیم غلطی کا ارتکاب کر لیا ہے اور اب عذاب جہنم ان کے لئے حتمی ہے۔ اور یہ جزاء ان کے لئے جہاد سے پیچھے رہ جانے ' گرا ہوا موقف اپنانے اور بھونڈے عذرات پیش کرنے کی وجہ سے مقدر ہو چکی ہے۔ اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ اظہار اسلام کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ منافق ہیں اور کافروں سے بدتر ہیں۔

ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ یہ رسول اللہ اور مسلمانوں کی بھلائی نہیں چاہتے اور اس بات پر بہت کڑھتے ہیں کہ رسول اللہ اور مسلمانوں کو کوئی برتری نصیب ہو۔

إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ أَخَذْنَآ أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ

یَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ (۹ : ۵۰) "تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ منہ پھیر کر خوش خوش پلٹتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کر لیا تھا" اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئے تو یہ خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے سے احتیاطی تدابیر اختیار کر لی تھیں اس لئے ہم بچ گئے اور ہمیں ان مشکلات سے دوچار ہونا نہ پڑا اور اپنی جگہ یہ خوشیاں مناتے ہیں۔

لیکن یہ بہت ہی کم عقل ہیں۔ صرف ظاہری باتوں پر ان کی نظر ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ مصائب ہر حال میں برے ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ گھروں میں بیٹھ کر اور جہاد سے پیچھے رہ کر انہوں نے بھلائی کما لی۔ حالانکہ ان کے دلوں میں اطاعت الٰہی نہ رہی اور انہوں نے رضائے الٰہی کے مقصد عظیم کو گنوا دیا۔ حالانکہ ان کی بھلائی تو تسلیم و رضا اور جہاد میں تھی۔ ایک سچا مسلمان تو ہوتا ہی وہ ہے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتا ہے' آگے ہی بڑھتا ہے اور ڈرتا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ خیر و شر تو اللہ کی طرف سے آتا ہے اور اللہ ہی ناصر اور معین ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

(۹ : ۵۱) "ان سے کہو "ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے' اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔" اور اللہ نے تو مومنین کے حق میں فتح لکھ دی ہے اور ان کے ساتھ آخری فتح کا وعدہ بھی کر رکھا ہے۔ ان کو چاہئے جس قدر مشکلات بھی پیش آئیں' وہ عظیم ابتلاؤں کے ساتھ دوچار کیوں نہ ہوں' آخر کار ان کو فتح نصیب ہوگی اور یہ مشکلات اس فتح کی تمہید ہیں تاکہ مسلمانوں کو جب فتح نصیب ہو تو نظر آئے کہ وہ اس کے مستحق ہیں۔ اور یہ کہ وہ ان کی صفوں کو چھان کر صاف کر دیا جائے اور یہ فتح و نصرت' دنیاوی ذرائع اور وسائل کے اندر ہو اور مشکلات کے بعد ہو تاکہ مسلمان اس قدر و منزلت کا احساس کریں' اور یہ فتح بلند ہمت لوگوں کی عظیم قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہو۔ ابتلاؤں کے بعد حاصل ہو اور لوگوں نے اس کے لئے قربانیاں دی ہوں۔ اور حقیقی و ناصر چونکہ اللہ ہی ہے اس لئے مسلمان ہمیشہ اسی پر بھروسہ کرتے ہیں' اپنی قربانیوں پر نہیں کرتے۔ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۹ : ۵۱) لیکن اللہ کی تقدیر پر ایمان اور اللہ پر بھروسہ اس بات کے منافی نہیں ہیں کہ کوئی کسی کام کے لئے تیاری کرے اور ضروری وسائل جمع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد کے بارے میں اللہ کا صریح حکم ہے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ "کہ تیار رکھو دشمنوں کے لئے اس قدر قوت جو تمہاری استطاعت کے اندر ہو۔" اور جو شخص اللہ کے احکام کو نافذ نہ کرے گا' اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ متوکل ہے۔ پر توکل بازو استرمید اور جو شخص حکم الٰہی کے مطابق اسباب مہیا نہیں کرتا وہ سنت الٰہی کے ادراک سے قاصر ہے جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یہ سنت اٹل ہے اور وہ کسی کی رو و رعایت نہیں کرتی۔

مومن پر تو ہر حال میں وارے نیارے ہیں' اگر اسے فتح ملے تو بھی کامیاب شہادت ملے تو بھی کامیاب۔ رہا کافر تو وہ ہر طرح ناکام ہے۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں دنیا ہی میں عذاب پا لے اور جہنم رسید ہو تو بھی ناکام اور طبعی موت مرنے کے بعد جہنم رسید ہو تو بھی ناکام۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ (۹ : ۵۲) "ان سے کہو "تم ہمارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہے۔ اور ہم تمہارے معاملہ میں جس چیز کے منتظر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ خود تم کو سزا دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں دلواتا ہے؟ اچھا تو اب تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔"

آخر منافقین مسلمانوں کے بارے میں کس بات کا انتظار کریں۔ مسلمانوں کو ہر حال میں بھلائی اور کامیابی کی توقع ہے۔ یا تو فتح مند ہوں گے اور اللہ کا کلمہ بلند کر دیں گے اور یہ کامرانی اس جہاں کی ہے۔ یا انہیں شہادت نصیب ہوگی اور شہید اعلیٰ درجات پر فائز ہوتا ہے۔ ہاں مومنین ضرور انتظار کریں کہ منافقین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ان کو اس طرح عذاب سے دوچار ہونا ہوگا۔ جس طرح تمام مکذبین عذاب سے دوچار ہوئے یعنی آخرت میں اور یا یہ ہوگا کہ وہ اس دنیا ہی میں پکڑے جائیں گے جس طرح تمام اہل باطل پکڑے جاتے ہیں۔ لہٰذا دونوں گروہوں کا انجام مشہور و معروف ہے۔

پیچھے رہنے والوں میں سے اور انتظار کرنے والوں میں سے بعض ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنا مالی تعاون پیش کر دیا تھا لیکن ذاتی طور پر جہاد میں شرکت سے وہ وری کا اظہار کر رہے تھے اور یہ رویہ وہ اس لئے اختیار کر رہے تھے کہ وہ بدنام بھی نہ ہوں اور بین بین رہیں نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ ان جیسے لوگوں کے مالی تعاون کو مسترد کر دیں کیونکہ یہ لوگ مالی تعاون کی پیشکش خوف اور دکھاوے کے لئے کرتے ہیں۔ ایمان کے تقاضوں اور اللہ پر بھروسے کی وجہ سے وہ یہ انفاق نہیں کر رہے۔ خواہ وہ یہ کام دکھاوے کے لئے کر رہے ہوں اور اہل ایمان کو دھوکہ دے رہے ہوں یا مشرکین کے ڈر کی وجہ سے کر رہے ہوں۔ دونوں صورتوں میں ان کا یہ فعل اللہ کے نزدیک مردود ہے اور اللہ کے ہاں اس کا کوئی اجر نہیں ہے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝

"ان سے کہو "تم اپنے مال خواہ راضی خوشی خرچ کرو یا بکراہت، بہرحال وہ قبول نہ کئے جائیں گے۔ کیونکہ تم فاسق لوگ ہو۔ ان کے دیئے ہوئے مال قبول نہ ہونے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے، نماز کے لئے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادل ناخواستہ خرچ کرتے ہیں"۔

ہر دور میں منافقین کے یہی خدوخال ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت خوف اور پیچ و تاب میں ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی خالی اور ضمیر اور ان کی سوچ یکسوئی سے تہی دامن ہوتی ہے۔ ان کے مظاہر میں حقیقت کی روح نہیں ہوتی اور ان کا ظاہر

ان کے باطن سے بالکل جدا ہوتا ہے۔

ذرا قرآن کے انداز تعبیر کو دیکھو وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى (۹: ۵٤) (نماز کے لئے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے)۔ وہ نماز دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں وہ ظاہراً تو نماز ہوتی ہے لیکن ان کے اندر نماز کی روح نہیں ہوتی۔ وہ نماز کو درست کر کے استقامت کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ کیونکہ نماز پڑھنے پر جو جذبہ مجبور کرتا ہے وہ ان کے دل اور اندرون میں نہیں ہوتا بلکہ بعض بیرونی اسباب کے دباؤ کی وجہ سے وہ اس طرف مجبور ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں یہ فعل مجبوراً کرنا پڑ رہا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے وہ بھی محض ظاہر داری کے لئے کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مقبول نہیں ہیں کیونکہ اللہ کسی بھی عبادت کو قبول نہیں کرتا جو دلی جذبہ اور شعوری ایمان کے نتیجے میں نہ ہو۔ لہٰذا معیار یہ ہے کہ اچھا عمل ہو اور اچھی نیت سے کیا جائے۔

یہ منافقین اصحاب مال و اولاد تھے لیکن یہ جہاد کو ناپسند کرتے تھے اور بڑے بااثر لوگ تھے۔ لیکن اللہ کے نزدیک مال و دولت اور جاہ و شرف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا رسول اور اہل ایمان کے نزدیک بھی مال و دولت اور جاہ و شرف کی کوئی اہمیت نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ چیزیں اللہ کے ایسے انعامات نہیں ہیں کہ وہ ان کے ذریعے مزے لوٹتے رہیں اور ان سے کوئی باز پرس نہ ہو بلکہ یہ تو ایک فتنہ اور آزمائش ہے۔ اس پر ان سے باز پرس ہوگی اور ان کو سزا ہوگی۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

"ان کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکار حق ہی کی حالت میں دیں"۔

مال و اولاد تو کبھی ایک نعمت ہوتے ہیں اور اس سے اللہ اپنے بندوں میں سے کسی کو نوازتے ہیں اور پھر اسے توفیق دیتے ہیں کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔ اور اپنی اس قوت کو اصلاح فی الارض کے لئے استعمال کرے۔ اس کے ذریعے اللہ کی طرف متوجہ ہو اور اس طرح اس کا ضمیر مطمئن ہو۔ اس کے نفس میں سکون و اطمینان ہو اور اسے اپنے انجام، اچھے انجام کا پورا پورا یقین ہو۔ اور اس کا طرز عمل ایسا ہو کہ وہ نہایت اخلاص کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کرتا ہو اور آخرت کے لئے توشہ جمع کرتا ہو اور جب اسے مالی یا جانی نقصان ہو تو بھی وہ اسے اللہ کی طرف سے سمجھے اور اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے اور یہی مال و اولاد کبھی اللہ کی جانب سے سزا ہوتے ہیں اور یہ سزا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو دنیا ہی میں دے دیتا ہے۔ چنانچہ یہ اموال اور اولاد اس کے لئے موجب قلق اور اذیت ہوتے ہیں اور اس قلق اور پریشانیوں کی وجہ سے وہ جہنم میں ہوتا ہے اور زیادہ مال و دولت کو مزید بڑھانے کے لئے اس کی راتوں کی نیند ختم ہو جاتی ہے اور وہ اعصابی طور پر شل ہو جاتا ہے۔ اب اسے انفاق مال اتلاف مال کے برابر نظر آتا ہے۔ اگر اس کی اولاد بیمار ہو تو بھی وہ کڑھتا ہے اور اگر اولاد تندرست ہو تب بھی اس کے لئے باعث اذیت ہوتی ہے۔ بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں کہ ان کے لئے خود ان کی اولاد وبال جان ہوتی ہے۔

اس قسم کے لوگ رسول اللہ کے دور میں موجود تھے ۔ اب بھی یہ موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے ۔ ان کے پاس دولت ہوگی ' ان کی اولاد ہوگی ' لوگ ان کی ظاہری پوزیشن کو دیکھ کر ان سے متاثر ہوں گے لیکن در حقیقت یہ سب کچھ ان کے لئے عذاب ہو گا ' اس دنیا میں عذاب اور ان کے اندرون اور انجام سے چونکہ اللہ خوب واقف ہے ۔ اس لئے وہ جہنم کے لئے پابہ رکاب ہوتے ہیں ۔ پس حالت کفر پر ان کی موت کی دیر ہوتی ہے ۔ جان دیتے ہی وہ جہنم رسید ہو جاتے ہیں ۔

قرآن کا انداز تعبیر و تزھق انفسھم (۹: ۵۵) سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ لوگ نفسیاتی طور پر فرار اور ہلاکت کی حالت میں ہیں ۔ ان کی حالت کچھ اس طرح ہے کہ وہ سکون ' ٹھہراؤ اور اطمینان کی دولت سے محروم ہیں ۔ لہذا جس طرح وہ آخرت میں سخت عذاب میں ہوں گے ' اسی طرح یہ دنیا بھی ان کے لئے جہنم سے کم نہیں ہے ۔ تو گویا دنیا و آخرت دونوں میں وہ عذاب میں ہوں گے ۔ اور اس قسم کے مال و دولت اور ایسی اولاد کی ' ظاہر ہے ' کہ کوئی معقول شخص خواہش مند نہ ہو گا جس کے اندر عذاب ہی عذاب پوشیدہ ہو ۔

---ooo---

اس قسم کے منافقین اسلامی صفوں میں اپنے لئے مقام پیدا کر رہے تھے ۔ وہ اسلامی صفوں میں اپنے اعتقادات اور اپنے ایمان کی وجہ سے نہیں گھس رہے تھے بلکہ وہ نفاق کے مرض میں مبتلا تھے اور خوف کی وجہ سے بھی وہ مسلمانوں کے ساتھ ہاں میں ہاں ملاتے تھے ۔ ان کے کچھ مفادات تھے اور حالات سے بھی وہ مجبور تھے ۔ یہ لوگ قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنے اسلام کا یقین دلاتے تھے کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور انہوں نے اپنے اعتقادات اور نظریات کی وجہ سے ایمان کا اظہار کیا ہے ۔ لیکن اس سورت نے ان کے اندرون کو ظاہر کر دیا ہے ۔ اسی وجہ سے اسے "کاشفہ" اور "فاضحہ" بھی کہا جاتا ہے ۔ اس نے منافقین کا پردہ چاک کر کے انہیں اچھی طرح شرمندہ کر دیا ہے ۔

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

"وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہی میں سے ہیں ' حالانکہ وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں ۔ اصل میں تو وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے خوفزدہ ہیں ۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ ' تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں"۔

یہ پرلے درجے کے بزدل ہیں اور انداز بیان ایسا ہے کہ یہ لوگ مجسم طور پر بھاگتے اور سہمے ہوئے کھڑے نظر آتے ہیں ۔ ان کے نفس اور دل میں فرار ہے ۔ ان کے رویے میں فرار اور خوف ہے ۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۹: ۵۷)

"اگر وہ کوئی جائے پناہ پالیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ ' تو بھاگ کر اس میں جا چھپیں"۔ یہ ہر وقت چھپ جانے کی جگہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور جائے امن کی تلاش میں رہتے ہیں ۔ قلعہ بند جگہ یا غار اور تہ خانہ ۔ یہ خوفزدہ اور فرار کی

حالت میں ہوتے ہیں۔ گویا کوئی ان دیکھی قوت یا اچانک آنے والی مصیبت ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ یہ روحانی طور پر شکست خوردہ اور بزدل ہیں۔

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ (۹:۵٦) ”وہ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہی میں سے ہیں“۔ بہت بہت تاکیدوں کے ساتھ حلف اٹھاتے ہیں تاکہ یہ لوگ وہ باتیں چھپا دیں جو ان کے دلوں میں ہیں اور ان کا کسی طرح انکشاف نہ ہونے پائے اور ان کی جان و مال محفوظ رہ جائیں۔ ان کی صورت حال نہایت ہی قابل رحم ہے۔ بزدل، ریاکاری اور چاپلوسی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور قرآن ان کے لئے ایسے ہی اسالیب استعمال کر رہا ہے۔ عجیب تصویر کشی ہے جس کے ذریعے ان کے خفیہ بھیدوں کا ایکسرے ہو جاتا ہے اور نہایت ہی موثر انداز میں۔

---○○○---

اس سے آگے بھی منافقین پر تبصرہ جاری ہے۔ اور ان کے اقوال اعمال اور نیات پر کلام ہے۔ ان کی نیتوں کے بارے میں انکشافات ہیں جن کو چھپانے کا انہوں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی چھپا نہ سکے۔ کیونکہ وہ حضور ؐ کی جانب سے تقسیم صدقات کے بارے اعتراض کرتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت پر نکتہ چینی آخر ایک مسلمان کیسے کر سکتا ہے۔ آپ ؐ تو معصوم ہیں اور خلق عظیم کے مالک ہیں۔ پھر ان میں سے بعض حضور ؐ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ ہر شخص کی بات سنتا ہے اور ہر شخص کو سچا سمجھتا ہے۔ حالانکہ حضور نبی اور صاحب بصیرت ہیں، مفکر و مدبر ہیں اور ان کو حکمت کے خزانے دیئے گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اپنے کافرانہ اور فاجرانہ عقائد و اعمال کو اچھی طرح چھپاتے ہیں لیکن جب ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے تو جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں تاکہ اپنے معاملات و اعمال کو چھپا سکیں۔ اور بعض تو ایسے سہمے اور ڈرے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے بارے میں نبی پر سورت ہی نازل نہ ہو جائے۔

ان جیسے لوگوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا جاتا ہے کہ منافقین کے یہ خدوخال ہیں اور ان میں اور ان سے پہلے گزرے ہوئے منافقین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جس طرح اللہ نے ازمنہ سابقہ کے منافقین کو ہلاک کیا تھا ان کو بھی ہلاک کر دے گا اور جس طرح اللہ نے ان کو مہلت دی تھی ان کو بھی دی جا رہی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جھوٹے منافقین کون ہوتے ہیں اور سچے مومنین کیسے ہوتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا
وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ
اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا ع
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ ۱۳

السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

"اے نبی ؐ، ان میں سے بعض لوگ صدقات کی تقسیم میں تم پر اعتراضات کرتے ہیں ' اگر اس مال میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں ' اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں ۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول ؐ نے جو کچھ بھی انہیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ "اللہ ہمارے لئے کافی ہے ' وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا' ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں"۔

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں' اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں ۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے ۔

یعنی بعض منافقین ایسے جری ہیں کہ وہ علانیہ یا اشاروں سے آپ کے انتظام تقسیم صدقات کے بارے میں نکتہ چینی کرتے ہیں ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انصاف کے بجائے آپ اپنی پسند کے مطابق تقسیم کرتے ہیں اور یہ نکتہ چینی وہ قیام عدل یا سچائی کی حمایت یا دینی غیرت کے پاک جذبوں کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ ذاتی مفادات ' طمع و لالچ اور اپنے منافع اور خودداری کی وجہ سے وہ ایسا کرتے ہیں ۔

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (۹: ۵۸) "اگر اس مال میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جائیں ' اور نہ دیا جائے تو بگڑنے لگتے ہیں"۔ اگر ان کو دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں پھر انہیں عدل و انصاف کی کوئی پروا نہیں ہوتی اور نہ ان کی دینی غیرت جاگتی ہے ۔ ان آیات کے نزول کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں جن میں بعض متعین لوگوں کے واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے جنہوں نے حضور ؐ کے منصفانہ تقسیم صدقات پر اعتراضات کئے تھے ۔

بخاری اور نسائی نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ حضور ؐ صدقات کی تقسیم میں مصروف تھے کہ ذوالخویصرہ تمیمی آئے اور کہا رسول اللہ! انصاف کیجئے ۔ حضور ؐ نے فرمایا تم ہلاک ہو جاؤ ' اگر میں نے انصاف نہ کیا تو پھر کون کرے گا ۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے کہا حضور مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں ۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا = چھوڑ دو اسے ' اس کے کچھ ساتھی ایسے ہیں جن کی نمازوں کے ساتھ تم میں سے ایک شخص اپنی نماز کو حقیر بناتا ہے اور اپنے روزوں کو ان کے روزہ کے ساتھ حقیر بناتا ہے ۔ وہ دین سے اس طرح نکل جاتے ہیں جس طرح تیر اپنی کمان سے تیزی سے نکل جاتا تھا ۔ ابو سعید کہتے ہیں اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ (۹: ۵۸) ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے "جب حضور ؐ نے حنین کا مال غنیمت تقسیم کرنا شروع کیا تو میں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا "یہ تو ایسی تقسیم ہے جو خدا کے لئے نہیں ہے ۔ میں حضور ؐ کے پاس آیا اور ان سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا = "اللہ حضرت موسیٰ پر رحم فرمائے ' ان کو اس سے بھی زیادہ اذیت دی گئی اور انہوں نے صبر کیا" اور اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ (۹: ۵۸) سند

اور ابن جریر نے داؤد ابن عاصم سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ؐ کے پاس صدقات آئے تو آپ نے وہیں ان کو تقسیم کر دیا۔ کسی کو کچھ دیا اور کسی کو کچھ دیا۔ ایک انصاری نے انہیں دیکھا اور کہا یہ منصفانہ تقسیم نہیں ہے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قتادہ کہتے ہیں کہ آیت وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹:۵۸) کے معنی یہ ہیں کہ ان میں سے بعض لوگ صدقات کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں۔ روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص تازہ تازہ دیہات سے وارد ہوا تھا اور اس نے دیکھا کہ حضور ؐ سونا اور چاندی تقسیم کر رہے ہیں۔ تو اس نے کہا حضور اگر اللہ نے آپ کو عدل کا حکم دیا ہے تو پھر آپ نے عدل نہیں کیا۔ اس پر حضور ؐ نے فرمایا: تم ہلاک ہو جاؤ اگر میں نے عدل نہ کیا تو پھر کون عدل کرے گا۔

بہرحال آیت اس بات پر منصوص ہے کہ یہ قول منافقین کا تھا۔ اور یہ بات وہ دینی غیرت کی وجہ سے نہ کہتے تھے بلکہ وہ اپنے آپ کو زیادہ کا مستحق سمجھتے تھے یا اگر ان کو کسی موقع پر کچھ نہ دیا گیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ اور یہ بات ان کے نفاق پر واضح دلیل تھی۔ کیونکہ اگر کوئی شخص دین اسلام پر سچا مومن ہو اور یقین رکھتا ہو تو وہ رسول اللہ کے بارے میں اس قدر سوء ظن نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو رسالت سے قبل ہی صادق و امین کے نام سے معروف تھے۔ خصوصاً جبکہ عدل تمام اہل ایمان کا فریضہ ہے چہ جائیکہ رسول اللہ عدل نہ کریں۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ان واقعات اور ان باتوں پر تبصرہ ہوا ہے جو واقعہ ہو چکی تھیں اور غزوۂ تبوک سے بھی پہلے واقعہ ہو چکی تھیں مگر ان کو یہاں بھی لایا گیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ منافقین کے دائمی خدوخال کیا ہوتے ہیں اور ان کی ذہنیت کیا ہوتی ہے۔ اس موقع پر قرآن کریم اہل ایمان کو بتاتا ہے کہ ان کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (۹:۵۹) ”کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول ؐ نے جو کچھ بھی انہیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ ”اللہ ہمارے لئے کافی ہے‘ وہ اپنے فضل سے ہمیں اور بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی ہم پر عنایت فرمائے گا‘ ہم اللہ ہی کی طرف نظر جمائے ہوئے ہیں“۔

یہ ہے اسلام کی سوچ کا طریقہ اور یہ ہیں اسلام میں انداز گفتگو اور یہ ہیں اسلام میں آداب ایمان۔ یہ کہ انسان اللہ اور رسول اللہ کی تقسیم پر راضی ہو۔ وہ اللہ اور رسول کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ محض دباؤ کی وجہ سے یا ماحول کے غلبے کی وجہ سے بات مانے۔ اللہ پر بھروسہ کرنا ادب اسلامی ہے کیونکہ اپنے بندوں کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ انسان کو اللہ اور رسول اللہ کی دین کا امیدوار رہنا چاہئے اور وہ ہر کام محض رضائے الٰہی کے لئے کرے اور اس کے سامنے کوئی مادی مفاد نہ ہو۔ کوئی دنیوی لالچ اس کے پیش نظر نہ ہو۔ یہ ہیں ایمانی آداب جن کی وجہ سے انسان کا قلب و ضمیر تر و تازہ اور سرشار ہوتا ہے۔ منافقین کے دل اور ان کا طرز عمل ان آداب سے خالی اور نابلد ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی ارواح میں ایمان کی تازگی اور خوشی داخل ہی نہیں ہوا کرتی اور ان کے دل نور یقین سے خالی ہوتے ہیں۔

اللہ اور رسول اللہ کی بارگاہ کے لائق آداب کے بیان کے بعد یعنی مکمل اطاعت، مکمل تسلیم و رضا اور مکمل سپردگی کے بیان کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کرتے ہیں وہ خود اپنی مرضی سے نہیں کرتے۔ وہ امر اللہ

سے ہر کام کرتے ہیں۔ اللہ کے احکام بابت تقسیم صدقات یہ ہیں اور رسول ان احکام کی پیروی کرتے ہیں اور یہ احکام رب العالمین کی طرف سے ہیں یعنی صدقات اور زکوٰۃ ایک فریضہ ہے جو اغنیاء سے لیا جاتا ہے اور یہ بھی فرض ہے کہ اسے فقراء میں تقسیم کیا جائے۔ اس کی تقسیم چند قسم کے لوگوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی صوابدید پر اسے تقسیم کرے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ بھی اسے ان مدات کے علاوہ اپنی صوابدید سے تقسیم نہیں کر سکتے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

(۹ : ۶۰) "یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافرنوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے"۔

اس آیت کے ذریعے اسلامی شریعت میں زکوٰۃ کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اب زکوٰۃ محض نفلی صدقہ اور رضاکارانہ چندہ نہیں رہی۔ اب یہ حتمی فریضہ اور واجبی ٹیکس ہے۔ نیز زکوٰۃ کے تقسیم کنندگان کی جانب سے بھی یہ کوئی عطیہ تصور نہ ہوگا نہ دینے والوں کی جانب سے عطیہ ہوگا بلکہ معلوم فریضہ ہوگا۔ اسلامی حکومت کا یہ ایک اہم مالی فریضہ ہے۔ اس کی وصولی کا ایک نظام ہوگا اور تقسیم کا بھی ایک ضابطہ جاری ہوگیا ہے۔ غرض زکوٰۃ دینے والوں پر فریضہ ہے اور لینے والوں کے لئے ان کا حق ہے۔ یہ خیرات اور سوال نہیں ہے کیونکہ اسلام یہ اجازت نہیں دیتا کہ کوئی زکوٰۃ گداگری کے تصور سے وصول کرے۔

اسلامی نظام میں زندگی کو عملی اور سعی پر استوار کیا گیا ہے۔ عمل کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اسلامی حکومت کا یہ فرض اور اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر اس شخص کے لئے روزگار کا بندوبست کرے جو عمل اور محنت پر قدرت رکھتا ہو' وہ اسے کام کے لئے ہنرمندی سکھائے اور اس کے لئے موقع فراہم کرے۔ اور پھر یہ مزدور اور محنت کش کو یہ ضمانت دے کہ اس کو اس کی محنت کی پوری اجرت ملے۔

اسلامی نظام کے ضوابط کی رو سے عمل پر قدرت رکھنے والوں کا زکوٰۃ میں کوئی حق نہیں ہے۔ زکوٰۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جو اہل ثروت سے لیا جاتا ہے اور محتاجوں کو دیا جاتا ہے اور اس کی وصولی اور تقسیم کا انتظام حکومت کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ بشرطیکہ حکومت اسلامی اصولوں پر قائم ہو' نظام شریعت کو نافذ کرنے والی ہو اور زکوٰۃ کو بھی وہ مکمل اسلامی ضوابط کے مطابق وصول کرتی ہو اور خرچ کرتی ہو۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا لاتحل الصدقة لغني ولا لذي مرة سوی "زکوٰۃ غنی کے لئے حلال نہیں ہے اور نہ تندرست و توانا کے لئے"۔ (احمد' ابوداؤد' ترمذی)

عبداللہ ابن عدی ابن خیارؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے مجھے بتایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے زکوٰۃ کے لئے درخواست کی تو حضور ؐ نے ان کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ وہ دونوں تندرست و توانا ہیں تو فرمایا: "اگر تم چاہو تو میں تمہیں زکوٰۃ دیئے دیتا ہوں لیکن ضابطے کی رو سے اس میں غنی اور ایسے شخص کا حصہ نہیں ہے جو قوی ہو اور کمائی کر سکتا ہو۔ (احمد 'ابوداؤد' نسائی)

اسلام کے اجتماعی نظام نے اسلامی سوسائٹی کے لئے سوشل سیکورٹی کا جو نظام تجویز کیا زکوٰۃ اس کا ایک حصہ ہے۔ یہ نظام زکوٰۃ سے زیادہ وسیع اور جامع ہے کیونکہ اسلام کے سوشل سیکورٹی کے نظام کے کئی شعبے ہیں۔ یہ شعبے پوری انسانی زندگی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ بہرحال اس نظام کا ایک اہم حصہ ہے۔

زکوٰۃ کی شرح دسواں' بیسواں اور چالیسواں حصہ ہے۔ مختلف اموال میں اس کی شرح مختلف ہے۔ جو شخص ۲۰ مصری دینار سے زیادہ مال رکھتا ہو اور مال اس کی ضروریات سے زیادہ ہو تو وہ صاحب نصاب تصور ہو گا اور اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اس طرح اس مد میں دینے والوں کی ایک بڑی تعداد فراہم ہو جاتی ہے اور اس کو ان مدات میں خرچ کیا جاتا ہے جن کی تصریح اس آیت میں کر دی گئی ہے۔ اس کا پہلا مستحق فقیر و مسکین ہیں۔ فقراء وہ ہیں جن کے پاس بقدر ضرورت سے کم ہو' مساکین بھی ایسے ہی ہوتے ہیں' لیکن یہ فقراء کے مقابلے میں سفید پوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتے اور سوال بھی نہیں کرتے۔

یہ اس قدر وسیع ٹیکس ہے کہ ایک سال جو زکوٰۃ دیتا ہے وہ دوسرے سال اس کا مستحق بھی بن جاتا ہے جبکہ زکوٰۃ دینے والے کی آمدن اس کی ضروریات سے کم ہو جائے۔ اس اعتبار سے یہ ایک بہترین اجتماعی فنڈ ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ کبھی بھی اس فنڈ میں ادائیگی نہیں کرتے لیکن مستحق ضرور ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اجتماعی ضمانت ہے۔ لیکن اجتماعی فنڈ یا ضمانت ہونے سے پہلے یہ اللہ کی جانب سے ایک فریضہ ہے۔ اس سے تزکیہ نفس اور تزکیہ اموال ہوتا ہے۔ انسان اللہ کی بندگی کرتا ہے اور دل کا بخل اس سے دور ہوتا ہے اور انسان دے کر خوشی پاتا ہے اور اس کے اندر احساس برتری پیدا ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کی مدات

۱۔ الفقراء و المساکین — فقیر اور مسکین کی تعریف اور فرق ہم بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ و العاملین علیھا — (جو صدقات کے کام پر مامور ہیں)

۳۔ و المؤلفۃ قلوبھم — (جن کی تالیف قلب مطلوب ہو)

مولفتہ القلوب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اس مد سے ان کی امداد کی غرض و غایت یہ تھی کہ وہ اسلام پر ثابت قدم ہو جائیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی تالیف قلب کر کے ان کو اسلام میں داخل کرنا مطلوب ہو۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں کہ جو اسلام پختگی کے ساتھ داخل ہو گئے لیکن ان کو انعامات اور اعزازات دے کر ان کے اہل قوم کو یہ تاثر دینا مطلوب تھا کہ وہ بھی اسلام کی طرف راغب ہو جائیں۔ جب وہ دیکھیں کہ ان کے بھائی اسلامی نظام کے برکات سے فائدے اٹھا رہے ہیں لیکن اس مد کے بارے میں فقہاء کے درمیان فقہی اختلافات پائے جاتے ہیں کہ آیا مولفتہ القلوب کی مد غلبہ اسلام کے بعد باقی

رہی تھی یا نہیں ۔ لیکن اسلام کا تحریکی مزاج اس بات کا متقاضی ہے کہ یہ مد جاری رہے کیونکہ مختلف حالات میں تحریک اسلامی کو مختلف تقاضے پیش آسکتے ہیں اور بعض لوگوں کی تالیف قلب کی ضرورت ہوتی ہے ۔ کیونکہ بعض اوقات تحریک اسلامی کے کارکنوں کو تحریک کی وجہ سے مالی نقصانات ہوتے ہیں اور ان کا مداوا ضروری ہوتا ہے اور بعض اوقات بعض لوگوں کی تالیف قلب سے اسلام کو فائدہ ہوتا ہے ۔ یہ ایک عظیم حکمت ربانی ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو اپنے مسائل حل کرنے کے لئے یہ خصوصی فنڈ فراہم کیا ہے تاکہ مختلف ظروف و احوال میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے ۔

۵۔ وفي الرقاب (گردنوں کے چھڑانے میں) یہ اس وقت کی بات ہے جب غلامی ایک عالمی نظام تھا ۔ اور یہ نظام بیک وقت مسلمانوں اور ان کے مخالفین میں رائج تھا ۔ کیونکہ جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جاتا تھا ۔ اور اسلام اس وقت کے بین الاقوامی حالات میں مجبور تھا کہ وہ قیدیوں کے معاملے میں وہ فیصلے کرے جو اس کے قیدیوں کے ساتھ ہو رہا تھا ۔ اس مد میں ان لوگوں کی امداد بھی ہوتی تھی جو اپنے آقا کے ساتھ آزادی کا معاوضہ طے کر کے مکاتبت کرتے تھے ۔ ایسے لوگوں کو اقساط مکاتبت ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ سے رقم دی جاتی تھی ۔ نیز اس مد کی رقم سے غلاموں کو خرید کر آزاد بھی کر دیا جاتا تھا یعنی اسلامی حکومت کی طرف سے ۔

۶۔ والغارمين (قرض داروں کی مدد میں) وہ قرضدار جو بدکاریوں کی وجہ سے مقروض نہ ہوئے ہوں' ان لوگوں کو زکوٰۃ سے رقم ادا کی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے قرضے ادا کر سکیں ۔ آج کل کے جدید معاشی نظام جو نام نہاد مغربی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں اس قدر ظالمانہ ہیں کہ لوگوں کے قرضے لے کر کھا جاتے ہیں اور بڑی آسانی کے ساتھ اپنے آپ کو دیوالیہ کر دیتے ہیں اور لوگوں کی رقومات ڈوب جاتی ہیں ۔ لیکن اسلام ایک متکافل اور ضامن نظام ہے ۔ اس میں شرفاء کو آسانی کے ساتھ لوٹا نہیں جا سکتا اور نہ اس میں امانت داروں کو اس طرح تباہ کر کے دیوالیہ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور نہ لوگوں کو یہ اجازت دی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مال کھا جائیں ۔ اور قوانین ان کے لئے خود راستہ ہموار کریں جب کہ آج کل دنیا کے تمام مالی قوانین کی رو سے ایسا ہوتا ہے ۔

۷۔ وفي سبيل الله (اور راہ خدا میں) یہ ایک وسیع مد ہے ۔ اس میں سے ہر اس موقع پر خرچ کیا جا سکتا ہے جس میں اسلامی معاشرے کی بھلائی ہو جیسا کہ لفظ فی سبیل اللہ کی وسعت سے معلوم ہوتا ہے ۔

۸۔ وابن السبيل (مسافر نوازی میں) یعنی وہ مسافر جو اپنے مال سے دور ہو اگرچہ اپنے مقام پر وہ غنی ہو ۔

یہ ہے نظام زکوٰۃ جس پر آج کے دور میں بعض لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں ۔ اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ گداگری اور احسان کرنے والے اور دوسروں کی دست نگری کا نظام ہے ۔ حالانکہ یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے ۔ اور اسے بطور اسلامی فرض اور عبادت ادا کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے مال پاک ہوں اور لوگوں کے دلوں سے کنجوسی کا زنگ صاف ہو ۔ اور یہ نظام لوگوں کی بھلائی اور افراد امت کے درمیان محبت اور بھائی چارے کا سبب بنے ۔ انسانی سوسائٹی کی فضا اس سے تروتازہ ہو اور انسانیت کے زخموں کے لئے مرہم کا کام کرے ۔ اور ان برکات کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر سوشل سیکورٹی کا بھی انتظام کر دے ۔ لیکن اس کا حقیقی رنگ عبادت اور تقرب الی اللہ رہے ۔ اور اللہ اور لوگوں کے درمیان ایک رابطہ ہو ۔ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ (۹ : ۶۰) (اللہ کی طرف سے ایک فریضہ ہے) اور یہ احکام اللہ نے عائد کئے کیونکہ

وہ حکیم و دانا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹ : ۶۰) (اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا اور بینا ہے۔

---ooo---

زکوٰۃ و صدقات کے اصول وضع کرنے کے بعد' اور ان کے مصارف کی نشاندہی کے بعد اب سیاق کلام پھر منافقین کے اعمال و افعال کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اور یہاں آیت صدقات کو اس لئے لایا گیا کہ جو لوگ تقسیم صدقات کے سلسلے میں رسول اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کرتے تھے ان کے موقف کی کمزوری واضح ہو جائے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ
قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۶۱
يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ
كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۶۲ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ
لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝۶۳ يَحْذَرُ
الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ
اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝۶۴ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ
تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶۵ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ
۸ ع ۷ ۱۴ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۶۶

"ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہو "وہ تمہاری بھلائی کے لئے ایسا ہے' اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو تم میں سے ایماندار ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے"۔

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں' حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں۔کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے' اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا' یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔

یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔اے نبیؐ' ان سے کہو ''اور مذاق اڑاؤ' اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو''۔ اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے' تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔ان سے کہو ''کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو۔تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر بھی دیا تو دوسرے گروہ کو تو ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہے''۔

یہ رسول اللہ کے بارے میں سوء ادب' ایک صریح گستاخی' معلوم ہوتا ہے کہ یہ گستاخی صدقات کے معاملے کے علاوہ ہے۔یہ دیکھتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی باتیں کس قدر سلیقے' شرافت اور سنجیدگی کے ساتھ سنتے ہیں اور یہ کہ حضورؐ شریعت کے قانون کے مطابق لوگوں کی ظاہری حالت کے مطابق ان سے معاملہ کرتے تھے۔لوگوں کی طرف اچھی طرح متوجہ ہوتے تھے اور ان کے ساتھ دل کھول کر بات فرماتے تھے۔لیکن ان نکتہ چینی کرنے والوں نے حضورؐ کی اس شائستگی کو آپ کی کمزوری سے تعبیر کیا اور اچھائی کو برائی کہہ دیا۔کہنے لگے کہ حضورؐ کان کے کچے ہیں۔یعنی ہر کسی کی بات سنتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ کوئی آپ سے جھوٹ کہے' دھوکہ دے اور چرب لسانی سے کام نکالے اور آپ بات کو سمجھ نہ سکیں۔وہ یہ باتیں اپنی اس خام خیالی کی وجہ سے کہتے تھے کہ حضورؐ ان کے معاملے کو کس طرح کھول سکتے ہیں یا یہ کہ حضورؐ ان کے نفاق کو کس ذریعے سے معلوم کر لیں گے۔اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان منافقین کے اعمال و اقوال کے بارے میں مخلص مومنین آپ کو جو اطلاعات فراہم کرتے تھے اور آپ ان پر یقین کرتے تھے تو یہ لوگ اس صورت حال پر نکتہ چینی کرتے تھے۔اس آیت کے سبب نزول کے سلسلے میں اس قسم کی بعض روایات بھی وارد ہیں۔یہ دونوں امر یہاں اس آیت کا پس منظر ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ دونوں امر منافقین میں موجود تھے۔

قرآن کریم پہلے ان کا قول نقل کرتا ہے 'یَقُولُونَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ (۹:۶۱)) (کہتے ہیں کہ یہ شخص کان کا کچا ہے ہاں یہ درست ہے لیکن کہو تمہاری بھلائی کے لئے ایسا ہے) کیا اس میں تمہاری بھلائی نہیں ہے کہ وہ غور سے وحی سنتا ہے اور پھر تم تک اسے پہنچاتا ہے جس میں تمہاری بھلائی ہے اور تمہاری اصلاح ہے۔پھر کان کا کچا ہونا تمہارے لئے یوں بھی بہتر ہے کہ تمہاری بات کو غور سے سنتا ہے اور شرافت سے سنتا ہے اور تمہیں یہ تاثر نہیں دیتا کہ تم تو منافق ہو۔یہ اشارہ بھی نہیں دیتا کہ تم دھوکہ دیتے ہو اور تم اس کے ساتھ جو ریاکارانہ برتاؤ کرتے ہو جانتے ہوئے بھی وہ تمہاری سرزنش نہیں کرتا۔

یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ (۹:۶۱)) (وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے) اور اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے بارے میں جو اطلاع دیتا ہے اس پر اسے پورا پورا یقین ہے۔دوسرے لوگوں کے بارے میں اس کو جو اطلاع دی جاتی ہے' اس پر بھی اسے یقین ہے)

وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ (۹:۶۱) (اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے) وہ پورے اطمینان سے ان کی باتوں کو سچ تسلیم کرتا ہے۔کیونکہ اسے معلوم ہے کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور ان کا ایمان اس قدر مضبوط ہے کہ جھوٹ ' ریاکاری اور بہانہ سازی سے انہیں روکتا ہے۔

وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ اٰمَنُوْا (۹:۶۱) (اور تم میں سے ایماندار لوگوں کے لئے سراسر رحمت ہے) اس لئے کہ وہ تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں بھلائی کی طرف کھینچتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۹:۶۱) (اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے"۔ اس لئے کہ اللہ غیور ہے۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ لوگ اس کے رسول کو اذیت دیں حالانکہ وہ ان تک اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ

(۹:۶۲) (یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کریں ' حالانکہ اگر یہ مومن ہیں تو اللہ اور رسول اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں) یہ لوگ خدا کی قسمیں کھا کر تم کو راضی کرنا چاہتے ہیں اور منافقین کا ہر دور میں یہی وطیرہ رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ سامنے ان کا رویہ اور ہوتا ہے اور پیٹھ پیچھے ان کا رویہ اور ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومنین صادقین کے ساتھ آنکھیں بھی نہیں ملا سکتے۔ نہ ان کے ساتھ بات کر سکتے ہیں چنانچہ پھر وہ قسموں کا سہارا لے کر چاپلوسی اور ذلت اختیار کر کے لوگوں کی رضامندی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن "اگر یہ سچے مومن ہیں تو اللہ و رسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ یہ ان کو راضی کرنے کی فکر کریں" کیونکہ لوگوں کا مقام ہی کیا ہے؟ لوگوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر ایمان نہیں لاتا اور اس کے سامنے نہیں جھکتا' وہ لوگوں پر ایمان لاتا ہے اور اپنے جیسے انسان سے ڈرتا ہے۔ ان کے لئے بہتر تو یہ تھا کہ یہ لوگ اللہ کے سامنے سرنگوں ہوتے جو سب کا خدا ہے۔ اس میں ان کے لئے کوئی ذلت نہیں ہے ' ذلت تو اس میں ہے کہ کوئی اپنے جیسے انسان کے سامنے جھکے جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے۔ وہ چھوٹا نہیں ہوتا بلکہ جو شخص اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتا ہے وہ چھوٹا ہوتا ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ذٰلِكَ

الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ (۹:۶۳) (کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے ' اس کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا؟ یہ بہت بڑی رسوائی ہے) یہ استفہام انکاری ہے اور مخاطبین کو جھڑکنا اور متنبہ کرنا مطلوب ہے 'کہ یہ لوگ دعوائے ایمان کرتے ہیں اور پھر بھی اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ محاربت اور جنگ کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ جنگ کرنا ایک عظیم گناہ ہے اور جو شخص اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے ' جہنم اس کے انتظار میں ہے۔ اور ان کے اس غرور اور سرکشی کے بدلے انہیں

ذلت اور رسوائی کی سزا دی جائے گی۔ اگر وہ سچے مومن ہیں' جیسا کہ وہ دعوائے ایمان کرتے ہیں تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوں۔

یہ اللہ کے بندوں سے تو ڈرتے ہیں اور ڈر کر جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ ان کو راضی کریں اور ان خبروں کی تردید کریں جو ان بندوں تک ان کی بابت پہنچ رہی ہیں۔ لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ خالق کائنات سے نہیں ڈرتے کہ وہ اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں اور اس کے دین کی دشمنی کرتے ہیں۔ گویا وہ اللہ سے لڑتے ہیں اور اس کی طاقت اس قدر برتر ہے کہ اس سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ بلکہ وہ شرمناک گناہ کا ارتکاب کرتے اور یہ ایک عظیم غلطی ہے جو یہ کر رہے ہیں اور یہ بات ان کے لئے بہت ہی خطرناک ہے کہ وہ دین کے خلاف سازشیں کریں اور رسول اللہ کو اذیت دیں۔

یہ لوگ بزدل اس قدر ہیں کہ یہ دین اور اہل دین اور رسول اللہ کے مقابلے میں کھل کر نہیں آ سکتے۔ پھر یہ اس سے بھی ڈرتے ہیں کہ اللہ ان کے راز اہل ایمان پر بھی کھول نہ دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خفیہ نیتوں سے مطلع نہ کر دیا جائے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ (٦٤) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (٦٥) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (٦٦) (٩ : ٦١ تا ٦٦))

(یہ منافق ڈر رہے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھید کھول کر رکھ دے۔ اے نبیؐ' ان سے کہو "اور مذاق اڑاؤ' اللہ اس چیز کو کھول دینے والا ہے جس کے کھل جانے سے تم ڈرتے ہو"۔ اگر ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے' تو جھٹ کہہ دیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے۔ ان سے کہو "کیا تمہاری ہنسی دل لگی اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ تھی؟ اب عذرات نہ تراشو۔ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم نے تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر بھی دیا تو دوسرے گروہ کو تو ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہے"۔

یہ آیت تمام منافقین کے عمومی رویے پر تبصرہ ہے کہ وہ اس بات سے ہروقت ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کے دلوں میں جو کھوٹ ہے اس کے بارے میں کہیں آیات نازل نہ ہو جائیں۔ اور ان کی دلی کیفیات کا انکشاف نہ ہو جائے۔ ان کے راز لوگوں پر کھل نہ جائیں۔ اس موضوع پر کئی روایات میں متعدد واقعات متعین طور پر بھی نقل ہوئے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ان آیات کا سبب نزول یہ خاص واقعات ہیں۔

ابو معشر مدینی نے محمد ابن کعب قرظی سے روایت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ منافقین میں سے ایک شخص نے یہ کہا کہ میرے خیال میں ہم سے جو لوگ زیادہ قرآن پڑھتے ہیں وہ ہم سے پیٹ کے بارے میں زیادہ لالچی ہیں اور بات میں ہم سے زیادہ

جھوٹے ہیں اور جنگ کے وقت بزدل ہیں (ان کا تبصرہ ان لوگوں کے بارے میں تھا جو قاری قرآن تھے)۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ تو یہ منافق رسول اللہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ سفر پر روانہ ہونے کے لئے ناقہ پر سوار ہوگئے تھے۔ اس منافق نے کہا رسول خدا ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کیا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کی بابت گپ شپ لگا رہے تھے۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں قُلْ اَبِاللّٰہِ تا کَانُوْا مُجْرِمِیْنَ اس شخص کے پاؤں پتھروں پر رگڑے جا رہے تھے اور رسول اللہ اس کی طرف دیکھ بھی نہ رہے تھے اور یہ شخص رسول اللہ کی تلوار کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ محمد ابن اسحاق نے یہ نقل کیا ہے کہ منافقین کی ایک جماعت تھی جن میں ودیعہ ابن ثابت بنی امیہ کے بھائی، ولد زید ولد عمرو، ولد عوف تھے اور ایک شخص مخشی ابن حمیر بھی تھا جو اشجع قبیلے کا فرد تھا اور اشجع بنی سلمہ کا حلیف تھا۔ یہ جماعت حضورؐ کے ساتھ تبوک کی طرف جا رہی تھی۔ ان میں سے بعض نے دوسروں سے کہا کیا تم سمجھتے ہو کہ رومی اس طرح لڑتے ہیں جس طرح عرب عربوں کے ساتھ لڑتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم تو دیکھتے ہیں کہ کل ہم رسیوں میں بندھے ہوں گے۔ یہ لوگ اہل ایمان کے اندر خوف و ہراس پھیلانے کے لئے کہتے تھے۔ اس موقع پر مخشی ابن حمیر نے کہا خدا کی قسم میں تو اپنے لئے یہ سزا تجویز کرتا ہوں کہ ہم میں ہر شخص کو سو کوڑے مارے جائیں مگر ہمارے بارے میں تمہاری ان باتوں کی وجہ سے قرآن مجید نازل نہ ہو جائے، مجھ تک جو اطلاعات بھی پہنچی ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے عمار ابن یاسر کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی مدد کو پہنچو یہ تو جہنم رسید ہوگئے ہیں۔ اور ان سے پوچھو کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ اگر وہ انکار کر دیں تو پھر بتا دو کہ تم نے تو یہ کہا تھا۔ عمار ان تک گئے اور ان سے یہ بات کی۔ یہ لوگ رسول اللہ کے پاس آئے اور معذرت کرنے لگے۔ رسول اللہ اپنی سواری پر بیٹھ چکے تھے اور ودیعہ ابن ثابت پہنچے۔ اس نے سواری کا کجاوا پکڑا ہوا تھا اور اور کہہ رہا تھا کہ ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے۔ مخشی ابن حمیر نے رسول اللہ سے کہا فعدبی اسمی اور اسم ابی چنانچہ اس آیت میں جسے معافی ملی وہ مخشی ابن حمیر تھے۔ بعد اس نے اپنا نام عبدالرحمن رکھ دیا تھا۔ اور اس نے خدا سے سوال کیا تھا کہ وہ خدا کی راہ میں اس طرح شہید ہوں کہ اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ ہو۔ چنانچہ یمامہ کی جنگ میں وہ شہید ہوا اور اس کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔

ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ غزوہ تبوک کے لئے پابہ رکاب تھے کہ آپ کے ساتھ ایک گروہ منافقین بھی تھا۔ جنہوں نے کہا: کیا یہ شخص یہ امید لگائے بیٹھا کہ شام کے محلات اور قلعے اس کے لئے کھل جائیں گے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے حضورؐ کو اس کی اطلاع دے دی تو حضورؐ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کی سواریوں کو روک دو۔ حضورؐ نے ان لوگوں سے جاکر دریافت کیا کہ کیا تم نے یہ کہا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ہم تو ہنسی مذاق کر رہے تھے تو ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

ہم ہنسی مذاق کر رہے تھے یعنی جن موضوعات پر وہ بات کر رہے تھے ان کا تعلق تو اصل ایمان سے تھا اور یہ ایسے مسائل نہ تھے جن کے بارے میں محض گپ شپ کے انداز میں بات کی جائے۔ قُلْ اَبِاللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ وَرَسُوْلِہٖ کُنْتُمْ تَسْتَھْزِءُوْنَ (۹: ۶۵) (کیا تم اللہ، اس کے رسول اور اس کی آیات کے بارے میں ہنسی مذاق کرتے ہو) چونکہ انہوں نے ایک عظیم جرم کا ارتکاب کیا تھا، اس لئے ان پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا کہ انہوں نے کفریہ کلمات کہے ہیں۔ اور ایمان کے اظہار کے بعد انہوں نے کفر کیا ہے۔ چنانچہ ان کو خوفناک انجام سے ڈرایا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ جلدی توبہ کر لیں

اور صحیح ایمان لے آئیں تو یہ عذاب ان سے ٹل بھی سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ نفاق پر قائم رہے اور بدستور استہزائیہ انداز ان کا باقی رہا تو وہ عذاب کے مستحق ہوں گے کیونکہ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (٦٦) (یہ مجرم تھے)۔ ۔ ۔ ۔

منافقین کے تصورات ' اعمال اور اقوال پر یہاں تک تبصرہ کرنے کے بعد اب یہاں منافقین کی عمومی حقیقت کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ان کی وہ عمومی صفات بیان کر دی جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ مومنین صادقین سے جدا تصور ہوتے ہیں۔ اور بتایا جاتا ہے کہ ان کے لئے کس قسم کا عذاب انتظار میں ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾

(منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ خیر سے روکتے ہیں۔ یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ یقیناً یہ منافق ہی فاسق ہیں۔ ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لئے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ' وہی ان کے لئے موزوں ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے)

منافقین اور منافقات کی ایک ہی فطرت اور خمیر ہے۔ ان کا مزاج بھی یکساں ہے۔ ہر زمان و مکان اور ہمیشہ ان کے یہی خدوخال رہے ہیں۔ ان کے اقوال و اعمال اگرچہ مختلف ہیں لیکن وہ ایک ہی مزاج اور ایک ہی سرچشمے سے ماخوذ ہوتے ہیں یعنی کینہ پروری اور بدفطرتی' خفیہ سازشیں کرنا اور بے جا تنقیدیں کرنا اور کھل کر سامنے آنے سے کترانا اور کھل کر بات کرنے کی جرات نہ کرنا۔ یہ ہیں منافقین کی اصل علامتیں۔ اب ان کا طرز عمل کیا ہے۔ وہ منکر کا حکم دیتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں اور وہ پرلے درجے کے بخیل ہیں۔ اور اگر خرچ کرتے ہیں تو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور وہ جب امربالمنکر اور نہی عن المعروف کرتے ہیں۔ تو یہ کام وہ چھپ چھپا کر کرتے ہیں' اشاروں کنایوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں کیونکہ ان کے اندر اس قدر جراءت نہیں ہے کہ یہ لوگ کھل کر کام کریں یہ کھل کر کام اس وقت کرتے ہیں جب ان کو یقین ہو کہ حالات درست ہیں اور ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے اللہ اور اس کی رضا کو بھلا دیا ہے نَسُوا اللّٰهَ (٩ : ٦٧) لہٰذا ان کے ہر کام کی غرض و غایت لوگوں کی رضا یا مالی مفاد ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب خدا سے نہیں ڈرتے تو پھر یہ زمین کے زور آور لوگوں سے بہت ہی ڈرتے ہیں۔ یہ ان کے سامنے ذلیل ہو کر رہتے ہیں اور ان کی خوشامد کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا فَنَسِيَهُمْ (٩ : ٦٧) لہٰذا اب ان کا کوئی وزن و اعتبار نہیں ہے۔ یہ دنیا میں لوگوں کے سامنے بھی بے وزن اور بے اعتبار ہوں گے اور آخرت میں بھی اللہ

کے ہاں بے وزن اور بے اعتبار ہوں گے ۔کیونکہ دنیا میں لوگ تو جاندار اور زور آور لوگوں کو اہمیت دیتے ہیں جو صاف صاف بات کرتے ہیں اور علی الاعلان بات کرتے ہیں جو اپنے نظریات پر رہتے ہیں اور جو اپنے نظریات کے معاملے میں لوگوں کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ وہ اگر جنگ کرتے ہیں تو پھر بھی علانیہ اور اگر صلح کرتے ہیں تو پھر بھی علانیہ ۔ یہ لوگ لوگوں کو بھول جاتے ہیں اور لوگوں کے الہ العالمین کو یاد رکھتے ہیں لہٰذا وہ حق کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے اور وہ چونکہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اس لئے لوگ انہیں یاد کرتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں ۔

بے شک منافق ہی فاسق ہوتے ہیں اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۹: ۶۷) لہٰذا وہ دائرۂ ایمان سے خارج ہوتے ہیں ۔ یہ اصل راہ سے منحرف ہیں اور اللہ نے ان کے لیے ایسا انجام تجویز کر دیا ہے جو کفار کے لیے تجویز ہوا ہے ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۹: ۶۸) ”ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ، وہی ان کے لیے موزوں ہے ۔ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے“ ۔بس یہ انجام ان کے لیے اور ان کے اس مجرمانہ طرز عمل کے لیے کافی ہے ۔اس انجام اور جہنم کے ساتھ ساتھ ان پر لعنت بھی ہوتی رہے گی اور اس عذاب میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔

---ooo---

منافقوں کا بے عمل ، منحرف اور گمراہ طبقہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ رہتا ہے ۔ یہ کسی بھی وقت انوکھا نہیں رہا ہے ۔ اسلام سے قبل بھی انسانی تاریخ میں اس کے نمونے موجود رہے ہیں اور ادوار سابقہ کے منافقین کا انجام بھی ان کے فسق و فجور کے مطابق ایسا ہی رہا ہے ۔کیونکہ ان لوگوں کی فطرت میں کجی آ جاتی ہے اور وہ صحیح راہ پر نہیں چلتے ۔اس سے قبل جو کافر اور منافق گزرے ہیں وہ حضور کے دور کے منافقین سے زیادہ مالدار اور زیادہ افرادی قوت کے مالک تھے ۔ لیکن یہ مالی اور افرادی وسائل انہیں نہ بچا سکے ۔

قرآن کریم امم سابقہ کے منافقین کی طرف اشارہ کر کے انہیں بتاتا ہے کہ دیکھو تم ان لوگوں ہی کے راستے پر تو چل رہے ہو ۔ آخر کیوں تمہارا انجام ان سے مختلف ہو گا ۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْۤا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

”تم لوگوں کے رنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمہارے پیش رووں کے تھے ۔وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر

مال' اور اولاد والے تھے ۔پھر انہوں نے دنیا میں اپنے حصہ کے مزے لوٹ لیے اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹے جیسے انہوں نے لوٹے تھے' اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے' سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی خسارے میں ہیں"۔

قوت کا فتنہ بھی خطرناک فتنہ ہوتا ہے ۔مالی قوت اور افرادی قوت سے انسان فتنے میں پڑ جاتا ہے ۔جن لوگوں کا رابطہ بڑی قوت سے ہوتا ہے وہ چھوٹی قوتوں کو خاطر میں نہیں لاتے ۔وہ صرف قوی تر قوت سے ڈرنے والے ہوتے ہیں ۔لہٰذا وہ سمع و اطاعت اس بڑی قوت کی کرتے ہیں اور اس بڑی قوت کی بات کو اونچا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں ۔ایسے لوگوں پر مالی قوت اور افرادی قوت اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مال و دولت اور انصار و اولاد دینے والا تو اللہ ہے جو برتر قوت ہے ۔لہٰذا اگر ان کے پاس نعمت آجائے تو وہ شکر ادا کرنے میں بہت حریص ہوتے ہیں اور وہ مالی قوت اور افرادی قوت کو بھی اللہ کی اطاعت میں کھپا دیتے ہیں اور جن لوگوں کی فطرت میں انحراف ہوتا ہے اور وہ نہیں جانتے کہ اس قوت کا سرچشمہ کیا ہے ۔تو وہ تکبر' غرور اور سرکشی اختیار کر لیتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کو کھانے پینے تک محدود کر دیتے ہیں جس طرح مویشی کھاتے پیتے ہیں ۔

أُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ اُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

"سو' ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی خسارے میں ہیں"۔ (۹ : ۶۹)

حبط اعمال کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال بنیاد ہی سے باطل ہو گئے ۔کیونکہ وہ ایک ایسے پودے کے مانند تھے جس کی جڑیں نہ تھیں ۔اس قسم کا پودا نہ سرسبز ہوتا ہے اور نہ پھلتا پھولتا ہے ۔اور ایسا پودا لگانے والے آخر کار گھاٹے میں ہوتے ہیں اور ان کا گھاٹا ہمہ گیر ہوتا ہے ۔

اب منافقین کو چھوڑ کر روئے سخن عام ہو جاتا ہے ۔یہ عام خطاب تعجب کرتے ہوئے کیا جاتا ہے کہ عجیب ہیں یہ لوگ کہ سابقہ لوگوں کے انجام کو دیکھتے ہوئے اور جانتے ہوئے یہ لوگ اس راہ پر بدستور چلتے ہیں ۔

اَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾

"کیا ان لوگوں کو اپنے پیش رووں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوح کی قوم' عاد' ثمود' ابراہیم کی قوم' مدین کے لوگ اور وہ

بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا۔ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے ' پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے"۔

یہ لوگ اس دنیا کے مزے لوٹ رہے ہیں اور اس کو اپنی حالت کا اچھی طرح شعور نہیں ہے ۔ یہ لوگ ہلاکت کی راہ پر مسلسل چل رہے ہیں اور کسی نصیحت کو پلے نہیں باندھتے ۔

اَلَمْ یَاْتِہِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ (۹: ۷۰) "کیا ان لوگوں کو اپنے پیش رووں کی تاریخ نہیں پہنچی؟" جو اسی راہ پر چلے جس پر یہ چلتے ہیں ۔ ذرا قوم نوح کی تاریخ کو پڑھیں کہ کس طرح انہیں طوفان نے گھیر لیا اور ہلاک کیے گئے اور یہ سخت خوفناک ہلاکت تھی ۔ قوم عاد جسے ایک شدید آندھی نے آ لیا۔ قوم ثمود جسے ایک زبردست چیخ اور آواز نے ہلاک کر دیا۔ قوم ابراہیم ؑ جو بڑے بڑے جباروں پر مشتمل تھی ' اسے ہلاک کر کے اللہ نے حضرت ابراہیم کو معجزانہ طور پر نجات دی ۔ اصحاب مدین جن کو شدید زلزلے نے آ لیا۔ اور قوم لوط جن کی نسل کو اللہ نے کاٹ کر رکھ دیا اور چند لوگ ہی اس عذاب سے بچے ۔ کیا ان لوگوں کو ان تاریخی واقعات کا علم نہیں ہے ۔ ان اقوام کے پاس بھی رسول روشن دلائل دے کر بھیجے گئے تھے ۔ لیکن ان اقوام نے ناحق ان کی تکذیب کی اور اللہ نے ان کو پکڑا۔

فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظْلِمَہُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ (۹: ۷۰) "پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے"۔ ایک منحرف انسان کو قوت اور اقتدار مزید سرکش بنا دیتا ہے ۔ پھر مال و دولت کی وجہ سے ایسے لوگ اندھے ہو جاتے ہیں ۔ لہٰذا ماضی کے تاریخی واقعات صرف ان لوگوں کو فائدے دیتے ہیں جن کی چشم بصیرت وا ہوتی ہے اور وہ لوگ سنت الٰہی کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں کیونکہ سنت الٰہی اٹل ہوتی ہے ۔ اور ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے ۔ اور وہ کسی شخص کی کوئی رعایت بھی نہیں کرتی ۔ اکثر لوگ جو قوت و اقتدار اور انعام و اکرام سے نوازے جاتے ہیں اور ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ' اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت بصارت و بصیرت پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ حقائق کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں ۔ وہ دیکھ نہیں سکتے کہ تاریخ میں بڑی بڑی قوتیں کس طرح سرنگوں ہوئیں ۔ اکثر لوگ ان باغیوں اور سرکشوں کے انجام پر غور نہیں کرتے ۔ جب انسان اپنے آپ کو اس طرح اندھا اور بہرا بنا دے تو پھر وہ اللہ کے عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے ۔ اب سنت الٰہیہ اپنا کام کرتی ہے اور مکافات عمل کا اصول سامنے آتا ہے اور ایسے لوگ اور اقوام پکڑی جاتی ہیں ۔ ان کو اپنی قوت پر غرہ ہوتا ہے اور انعامات و عیاشیوں میں سرکش ہو کر غفلت میں ہوتے ہیں اور اچانک اللہ کے گھیرے میں آ جاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ غفلت ' نادانی اور نابینی مال و دولت کے ساتھ چمٹی رہتی ہے اور اس کا انجام ہر دور میں اچھا نہیں ہوتا اور اس برے انجام سے جو لوگ بچ نکلتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جن پر اللہ کا خصوصی کرم ہو۔

---○○○---

اور کفار و منافقین کا محاذ بالمقابل کیا ہے ' اور اس کا انجام کیا ہو گا یہ مومنین صادقین ہیں ۔ ان کا مزاج منافقین اور کفار سے یکدم مختلف ہے ۔ ان کا طرز عمل ان سے بالکل الٹ ہے ۔ اور ان کا انجام بھی ان کے انجام سے بالکل مختلف ہے ۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۹
ع ٦ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ ۱۵

”مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہو گی۔ یہی بڑی کامیابی ہے“۔

اگر منافقین ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک ہی فطرت رکھتے ہیں اور ایک ہی مزاج رکھتے ہیں تو مومنین و مومنات بھی ایک ہی مزاج اور ایک ہی نظریات کے قائل ہیں اور ایک دوسرے کے محب اور دوست ہیں۔ لیکن منافقین باوجود ہم طبع اور ہم جنس ہونے کے مومنین اور مومنات کی طرح شیر و شکر نہیں ہیں کیونکہ دوست تو وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو بہادر ہوں، جو ایک دوسرے کی مدد کو پہنچنے والے ہوں اور باہم معاون و انصار ہوں جبکہ منافقت کا مزاج ہی ان باتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ بہادری کے مقابلے میں منافق بزدل اور ذلیل ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد نہیں ہوتے اور نہ ہی باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور نہ باہم معاون و کفیل ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کے خیالات اور ان کا طرز عمل ایک دوسرے کے ساتھ ملتا جلتا ہوتا ہے۔ قرآن کریم دونوں کے لیے قدرے مختلف اسلوب اختیار کرتا ہے۔ منافقین کے لیے صرف یہ لفظ ہیں بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (۹ : ۷۱) (وہ ایک دوسرے سے ہیں اور اہل ایمان کے لیے الفاظ ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹ : ۷۱) ایک مومن کا مزاج امت مومنہ کا مزاج ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی ذہن رکھتا ہے۔ وہ اتحاد، باہم متکافل اور مددگار ہوتا ہے اور اس کا یہ اتحاد اور باہم نصرت حصول خیر اور دفع شر کے لیے ہوتی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ (۹ : ۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں' یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں' بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں"۔ اور یہ مقاصد یعنی خیر کو حاصل کرنا اور شر کی مدافعت کرنا اس قدر اونچے اور مشکل مقاصد ہیں جن کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو یک جان دو قلب ہو۔ اس کے افراد باہم محبت کرنے والے اور مدد کرنے والے ہوں اور وہ شر کے مقابلے میں ایک صف میں صف آرا ہونے والے ہوں اور ان میں تفرقہ اور جدائی اور عدم اتفاق کا کوئی عامل موجود نہ ہو۔ اور جب جماعت مسلمہ کے اندر تفرقہ پیدا ہو جائے تو وہاں لازماً جماعت کے اندر کوئی ایسا عنصر داخل ہو گا جو اس کے مزاج کے خلاف ہو گا' جو اس کے نظریات کے ساتھ لگا نہ کھاتا ہو گا اور اسی عنصر کی وجہ سے تفرقہ جماعت کے اندر داخل ہو گا۔ تفرقے کی وجہ سے جماعت کے اندر پھر امراض اور اعراض پیدا ہوں گی اور اب اس کے پیش نظر نہ وہ مقصد رہے گا جو اس کا اصل مقصد ہے اور نہ اس کے اندر امت کی صف اول موجود رہے گی یعنی بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹ : ۷۱) غرض اس صفت کی وجہ سے یعنی صفت ولایت ہی کی وجہ سے جماعت مسلمہ اپنا فرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور وہ دنیا کے اندر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ (۹ : ۷۱) اقامت صلوۃ اس کی علامت ہوتی ہے۔

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (۹ : ۷۱) ادائے زکوۃ وہ فریضہ ہے جو افراد جماعت کو باہم مربوط کرتا ہے اور اس کے ذریعے افراد جماعت کے اندر روحانی اور جسمانی رابطے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے ہیں۔

وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۹ : ۷۱) "وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں" اور یہ ہے ایک مومن کا اصلی ہدف۔ لہٰذا حکم الٰہی اور حکم رسول کے سوا ان کے لیے کوئی اور حکم قانون نہیں ہوتا۔ اور اللہ کی شریعت اور رسول کی سنت کے سوا ان کے لیے کوئی دستور نہیں ہوتا۔ اور اللہ اور رسول کے دین کے سوا ان کے لیے کوئی اور نظام نہیں ہوتا اور جب کسی قضیے کا فیصلہ اللہ اور رسول اللہ کر دیں تو وہ چون و چرا نہیں کرتے۔ ان کے سامنے ایک ہی راہ' راہ مستقیم ہوتی ہے اور وہ ادھر ادھر کی پگڈنڈیوں کی طرف نہیں نکلتے۔ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ (۹ : ۷۱) "یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو گی"۔ اور یہ رحمت صرف عالم آخرت تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس رحمت کا آغاز اس جہاں سے ہی ہو جاتا ہے اور یہ رحمت اس فرد پر بھی ہوتی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اور نماز کی اقامت اور زکوۃ کی ادائیگی کرتا ہے۔ اور ایسے افراد سے جو جماعت تشکیل پاتی ہے اس پر بھی رحمت کی بارش ہوتی ہے۔ یہ رحمت اطمینان قلب کی شکل میں بھی ہوتی ہے' تعلق باللہ کی شکل میں بھی ہوتی اور حادثات اور فتنوں سے بچانے کی شکل میں بھی ہوتی ہے اور جماعت کی اصلاح' اس کی ثابت قدمی اور اطمینان اور اس کے افراد کے درمیان باہم محبت اور تکافل کی شکل میں بھی ہوتی ہے اور جذبہ اخلاص اور رضائے الٰہی پیدا ہو جانے کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔

مومنین کی یہ چار صفات منافقین کی چار صفات کے بالمقابل ہیں۔ مومنین کی صفات امر بالمعروف' نہی عن المنکر' ادائے صلوۃ' اداء زکوۃ ہیں اور منافقین کی صفات نہی عن المعروف' امر بالمنکر' اللہ کو بھلانا اور بخل کرنا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی جانب سے مومنین پر نزول رحمت ہوتا ہے۔ اور منافقین کے لیے اس کے بدلے میں لعنت ہوتی ہی اور ان صفات کے نتیجے ہی میں اللہ نے مومنین کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ انہیں فتح و نصرت اور زمین کے اوپر اقتدار و برتری ملے گی اور

اس طرح وہ پوری انسانیت کے صالح اور مصلح نگران ہوں۔

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۹:۷۱) "یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے"۔ وہ اس پر قادر ہے کہ جماعت مومنین کو ایک دوسرے کا دوست بنائے اور ان کو اعزاز بخشے اور وہ پھر اللہ کے احکام و فرائض ادا کریں۔ اور وہ حکیم ہے اور اپنی حکمت کے ذریعے اس جماعت کی نصرت کرتا ہے اور اسے اعزاز دیتا ہے تاکہ یہ جماعت بر سر اقتدار آکر زمین میں اصلاح کا کام کرے اور لوگوں کے درمیان اللہ کے کلمے کی حفاظت کرے۔

ایک طرف جہنم کا عذاب منافقین اور کافرین کے انتظار میں ہے۔ اور اللہ کی جانب سے لعنت و ملامت ان کے گھات میں بیٹھی ہے۔ اور یہ وعید بھی ان کے لیے سوہان روح ہے کہ اللہ ان کو نسیا منسیا کر دے گا تو دوسری جانب اہل ایمان کے لیے خوشیوں کے سامان ہیں اور یہ دائمی خوشیاں ان کے انتظار میں ہیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

(۹:۷۲) "ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے"۔

یہ لوگ ان جنات میں باعزت طور پر رہیں گے --- لیکن ان کے لیے ان اعلیٰ رہائش گاہوں سے بھی بڑا انعام اللہ کی رضامندی ہے اور جنت اپنی تمام آسائشوں کے ساتھ اس بڑے انعام کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اور یہ خوشی یعنی رضائے الٰہی کی خوشی سب سے بڑی خوشی ہے۔

اللہ کے ساتھ رابطے کا اعلیٰ مقام انسان کو اس وقت ملتا ہے کہ جب وہ اللہ اپنی آنکھوں سے نظر آئے یعنی حالت شہود۔ اس مقام میں انسان دنیا کی کثافتوں' اس کی پریشانیوں اور اس کی دلچسپیوں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس مقام میں انسان کے دل کی گہرائیوں سے ایک روشنی نکلتی ہے۔ انسانی آنکھیں اس نور کو نہیں دیکھ سکتیں اور یہ نور' نور الٰہی ہوتا ہے اور اس کا تعلق روح اللہ سے ہوتا ہے۔ یہ مقام انسانوں میں سے نہایت ہی قلیل تعداد کو نصیب ہوتا ہے۔ اس مقام کا ایک لحظہ اور ایک چمک ہی پوری زندگی کے مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ کی رضامندی کا مقام تو اس سے بھی بلند مقام ہے اور اس میں انسان کی روح کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور انسان تسلسل کے ساتھ اس کا شعور اپنے اندر پاتا ہے۔

---ooo---

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ

وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٣﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا
قَالُوْا ۖ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا
لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ
يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِى
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٧٤﴾

"اے نبی' کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بد ترین جائے قرار ہے۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی' حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے۔ یہ ان کا سارا غصہ اسی بات پر ہے تاکہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے! اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آئیں تو انہی کے لیے بہتر ہے' اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا۔ ایک عرصے تک آپ ان سے صرف نظر کرتے رہے اور چشم پوشی فرمائی۔ لیکن اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ خوش اخلاقی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ خداوند قدوس کی طرف سے اب حکم آ جاتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اپنے رویے میں اب ذرا سنجیدگی پیدا کریں۔ اور اب ان کے ساتھ وہی سلوک اختیار کیا جائے جو کفار کے ساتھ ہوتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اب جہاد کا اطلاق دونوں پر کیا جائے اور ان کے ساتھ ایسا سخت رویہ اختیار کیا جائے جس میں کوئی نرمی نہ ہو۔

تحریک اسلامی کو کئی مراحل درپیش ہوتے ہیں۔ بعض مواقع پر نرمی ضروری ہوتی ہے اور بعض حالات میں سختی مفید ہوتی ہے۔ جب نرمی کا دور ختم ہو اور سختی کا تقاضا ہو تو سختی ضروری ہے۔ صبر بھی ایک دور کے لیے ہوتا ہے جس صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے تو پھر سختی کا دور شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ تحریک کو مختلف حالات درپیش ہوتے ہیں اور مختلف حالات کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں۔ نرمی اور مہلت پر مہلت دیئے چلے جانے سے بعض اوقات حالات اور خراب ہوتے ہیں۔

منافقین کے ساتھ سختی اور جہاد کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف رائے واقعہ ہوا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ان کے ساتھ سختی کی جائے جس طرح حضرت علی سے روایت ہے اور ابن جریر نے اسے ترجیح دی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ان کو معاشرے میں ننگا کر دیا جائے اور ان کے ساتھ رویے میں سختی کی جائے جیسا کہ حضرت ابن عباس سے نقل ہے کہ حضور نے کسی منافق کو قتل نہیں کیا۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا

بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (۹: ۷۴) "یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کی، حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے"۔

یہ آیت منافقین کی عمومی حالت کو ریکارڈ کرتی ہے۔ ان کا عمومی موقف کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہروقت رسول اللہ اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے لیکن بعض روایات میں ان آیات کے نزول کا ایک خاص سبب اور واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

قتادہ نے کہا ہے کہ یہ عبداللہ ابن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک جہنی اور انصاری کے درمیان جنگ ہوگئی اور جہنی نے انصاری پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس پر عبداللہ نے انصاریوں سے کہا کہ تم اپنے بھائی کی مدد نہیں کرتے ہو۔ خدا کی قسم ہماری اور محمد کی مثال اس طرح ہے جس طرح کسی نے کہا ہے کہ اپنے کتے کو خوب موٹا کرو تاکہ تمہیں کاٹے۔ اس نے اس پر مزید یہ بھی کہا کہ ہمیں مدینہ کی طرف لوٹنے دیں، وہاں ہم میں سے معزز لوگ ذلیل لوگوں کو نکال دیں گے۔ یہ بات کسی مسلمان نے رسول اللہ تک پہنچا دی۔ حضور نے عبداللہ سے دریافت کیا تو وہ قسمیں کھانے لگا کہ اس نے یہ بات نہیں کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

امام ابو جعفر ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ رسول اللہ ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے تھے۔ تو آپ نے فرمایا "تمہارے پاس ایک شخص آئے گا اور وہ تمہیں شیطان جیسی نظروں سے دیکھے گا۔ جب وہ آئے تو اس سے کوئی شخص بات نہ کرے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ایک شخص نیلی آنکھوں والا سامنے آیا۔ اسے رسول اللہ نے بلایا اور کہا تم اور تمہارے ساتھی کس پر چلتے ہو" یہ شخص گیا اور اپنے ساتھیوں کو بلا کر لایا اور سب قسمیں کھانے لگے کہ ہم نے یہ باتیں نہیں کی ہیں۔ چنانچہ حضور نے ان سے درگزر فرما دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا (۹: ۷۴) عروہ ابن الزبیر وغیرہ سے روایت ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت جلاس ابن الصامت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا ایک پروردہ تھا جو اس کی بیوی کا بیٹا تھا۔ اس کا نام عمیر ابن سعد تھا۔ جلاس نے کہا کہ اگر محمد پر جو کلام نازل ہوا ہے یہ برحق ہے تو ہم ان گدھوں سے زیادہ بدتر ہیں جن پر ہم سوار ہیں۔ اس پر عمیر نے کہا: جلاس میں تمام لوگوں کے مقابلے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میرے نزدیک تم بہت بڑے بہادر ہو اور مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ تمہیں کوئی دکھ پہنچے لیکن تم نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر میں اسے افشا کرتا ہوں تو اس سے مجھے شرمندگی ہوگی اور اگر اسے چھپاتا ہوں تو خود ہلاک ہوتا ہوں۔ ان دونوں صورتوں میں سے ایک میرے لیے قابل برداشت ہے۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ کو اس بات کی اطلاع کر دی۔ لیکن جلاس نے اس کا انکار کر دیا اور قسم اٹھالی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس پر جلاس نے کہا میں نے بے شک یہ بات کہی ہے لیکن اللہ نے میرے لیے توبہ کی گنجائش رکھ دی ہے۔ اس لیے میں توبہ کرتا ہوں چنانچہ اس کی توبہ قبول ہوگئی۔

لیکن یہ تمام روایات قرآن مجید کی عبارت وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا (۹: ۷۴) "اور انہوں نے کچھ کرنے کا ارادہ کیا مگر نہ کر سکے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روایات پیچیدہ ہیں۔ اور اس سے مراد وہ حادثہ ہے کہ جو غزوۂ تبوک سے واپسی پر پیش آیا۔ بعض منافقین اچانک چھپ کر رسول اللہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک روایت یہ

ہے جسے ہم یہاں اختیار کرتے ہیں۔

---000---

امام احمد نے یزید، ولید ابن عبداللہ ابن جمیع، ابو طفیل کے ذریعے روایت نقل کی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ تبوک سے واپس ہو رہے تھے تو حضورؐ نے منادی کو حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں کہ حضور تنگ گھاٹی سے گزرنے والے ہیں۔ لہٰذا اس راہ پر کوئی نہ گزرے۔ حضورؐ کی سواری کی لگام حضرت حذیفہ کے ہاتھ میں تھی اور حضرت عمار اسے ہانک رہے تھے کہ کچھ لوگ اپنی سواریوں پر نقاب پہنے ہوئے آئے۔ انہوں نے عمار کو دبالیا۔ یہ حضورؐ کی سواری کو چلا رہے تھے۔ عمار پہنچے اور انہوں نے ان سواریوں کا منہ پھیر لیا۔ رسول اللہ نے حذیفہ سے کہا (روکو روکو) یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتر گئے اور عمار واپس آگئے تو حضورؐ نے عمار سے پوچھا کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا۔ انہوں نے کہا میں نے تمام سواریوں کو تو پہچان لیا ہے لیکن لوگ نقاب پوش تھے۔ تو حضورؐ نے دوبارہ پوچھا تمہارا کیا خیال ہے یہ کیا چاہتے تھے؟ تو عمار نے کہا اللہ اور رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ رسول اللہ کی سواری کو بھگا کر رسول اللہ کو گرانا چاہتے تھے۔ عمار نے رسول اللہ کے ساتھیوں میں سے ایک ایک سے دریافت کر کہ عقبہ کے دن سوار کتنے تھے؟ تو انہوں نے کہا کہ چودہ تھے تو عمار نے کہا کہ اگر تم ان میں سے تھے تو وہ پندرہ تھے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ نے ان میں سے تین آدمیوں کی نشاندہی کی تو انہوں نے قسم اٹھائی کہ ہم نے رسول اللہ کی منادی کا اعلان نہیں سنا۔ اور نہ ہمیں علم ہے کہ لوگ کیا چاہتے تھے۔ اس پر عمار نے کہا کہ باقی ۱۲ افراد اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ بر سرپیکار تھے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ حادثہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے ارادے کیا تھے؟ بہرحال اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہو یا کسی دوسرے واقعہ کی طرف، بہرحال ابھی تک مسلمانوں مین ایسے کینہ پرور موجود تھے۔ اس لیے آیت میں ان کے رویے پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔

وَمَا نَقَمُوٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِه (۹: ۷۴) "یہ ان کا سارا غصہ اسی بات پر ہے تاکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے"۔ غرض اسلام نے ان کے ساتھ کوئی دشمنی نہ کی تھی جس کی وجہ سے وہ اسے یہ بدلہ دینا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ اگر کوئی برائی کی گئی تھی تو صرف یہ تھی اسلام کے بعد ان کو مالدار بنا دیا تھا اور وہ آسودہ حال ہو گئے تھے اور اس آسودہ حالی کی وجہ سے یہ بدمستیاں کر رہے تھے۔

اور اس تعجب اور معنی خیز تعجب کے بعد اور فیصلہ کن بات کی جاتی ہے۔

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۹: ۷۴) "اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آئیں تو انہی کے لیے بہتر ہے، اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت

میں بھی‘ اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو"۔

ان حرکات کے باوجود توبہ کا دروازہ پوری طرح کھلا ہے۔ لہٰذا جو اپنا بھلا چاہتا ہے تو وہ دوڑ کر اندر داخل ہو جائے اور جو ٹیڑھی راہ پر چلنا چاہے تو انجام واضح ہے۔ دنیا اور آخرت میں اسے دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور اس دنیا میں بھی اس کا کوئی ناصرو مددگار نہ ہو گا۔ لہٰذا اگر کوئی یہ راستہ اپناتا ہے تو وہی خود ملامت زدہ ہو گا۔

---ooo---

سیاق کلام بدستور آگے بڑھ رہا ہے اور منافقین کے خدوخال سامنے آرہے ہیں۔ ان کے افعال و اقوال پر تبصرہ ہو رہا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

"ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دولتمند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پرواتک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی‘ اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے‘ اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا‘ جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا"۔

منافقین میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اللہ کے ساتھ یہ عہد کر رکھا تھا کہ اگر اللہ نے ان کو مال و دولت سے نوازا تو وہ راہ خدا میں خوب خرچ کریں گے اور اچھے اعمال کریں گے۔ لیکن یہ عہد فقرو فاقہ کے حالات میں تھا۔ اور اس وقت تھا جب کچھ ملنے کی امید تھی لیکن جب اللہ نے ان کی آرزو کو پورا کر دیا تو یہ لوگ اپنے وعدوں کو بھول گئے۔ ان لوگوں نے بخل اور کنجوسی کو اپنا لیا اور ہاتھ روک لیا۔ بلکہ وفائے عہد سے سرکشی کرنے لگا گویا اس نے کوئی عہد کیا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وعدہ خلافی اور پھر جھوٹ کی وجہ سے اللہ نے ایسے لوگوں کے دلوں میں نفاق کو اچھی طرح بٹھا دیا۔ یہ لوگ آخر تک منافق رہے اور برے انجام تک پہنچے۔

نفس انسانی بہت ہی بخیل ہے۔ اس سے صرف وہ لوگ بچ نکلتے ہیں جنہیں اللہ بچاتا ہے۔ صرف وہی لوگ بخل سے بچ سکتے ہیں جن کا دل ایمان سے لبریز ہو۔ وہ دنیاوی ضروریات سے اپنے آپ کو سربلند کر دیں۔ اور تمام لالچوں اور مفادات پر لات مار دیں اور ان کی آنکھیں آخرت کے عہد پر ہوں۔ اور رضامندی خالق ان کا نصب العین ہو۔ اور ان کے دل ایمان کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں اور انفاق کی وجہ سے وہ مسکین ہونے سے نہ ڈرتے ہوں کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور اللہ کے خزانے میں جو کچھ ہے‘ وہ باقی رہنے والا ہے۔ یہی وہ

نظریہ ہے جو انسان کو راہ خدا میں خرچ کرنے پر ابھارتا ہے اور انسان خوشی خوشی سے مال خرچ کرتا ہے۔ ایک مومن یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے اگر مال چلا بھی جائے تو بھی آخرت کا اجر اجر عظیم ہے۔

لیکن جب کسی کا دل ایمان سے تہی دامن ہو تو وہ فطرتاً بخیل ہو جاتا ہے جب بھی اسے پکارا جائے کہ راہ خدا میں انفاق کی ضرورت ہے تو وہ فقر کے ڈر کے مارے بخل کرتا ہے اور ہاتھ روک لیتا ہے لیکن اسے کبھی بھی چین و قرار نصیب نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ بے قرار رہتا ہے۔ جو شخص اللہ کے ساتھ عہد کرتا ہے اور پھر اسی کی خلاف ورزی کرتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ جھوٹ کرتا ہے وہ کسی کے ساتھ کبھی سچ نہیں کر سکتا۔ اور اس کا دل نفاق سے پاک نہیں ہو سکتا' جس کی تین علامات جو رسول نے متعین کی ہیں۔ ''جب بولے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو توڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے''۔

چنانچہ عہد شکنی اور اللہ پر جھوٹ بولنے کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے لوگوں پر نفاق مسلط ہو جائے اور وہ آیت کے فیصلے کے مطابق اس انجام تک پہنچیں۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ (۹ : ۷۷) ''نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی' اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے' اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا''۔

---ooo---

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ

''کیا یہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو ان کے مخفی راز اور ان کی پوشیدہ سرگوشیاں تک معلوم ہیں اور وہ تمام غیب کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے''۔

کیا ان کے دعوائے ایمان کے باوجود ان کو اس قدر علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں سے خبردار ہے' ان کے دلوں میں جو خیالات گزرتے ہیں وہ باہم جو گفتگو کرتے ہیں' جو وہ خفیہ باتیں کرتے ہیں' ان سے خبردار ہے کیونکہ اللہ پوشیدہ سے پوشیدہ امور کا بھی عالم ہے۔ دلوں کی نیات سے بھی باخبر ہے۔ ان کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے پھر بھی چھپاتے ہیں۔ اور پھر بھی وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ یہ خود ان کے علم کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ان کے علم کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ نہ کوئی بات چھپاتے اور نہ وعدہ خلافی کرتے اور اللہ پر کوئی جھوٹ نہ باندھتے۔

اس آیت کے نزول کے بارے مین متعدد روایات وارد ہیں۔ ان میں سے ہم ابن جریر کی روایت نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے اور ابن ابو حاتم نے معان سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے ابو امامہ باہلی سے انہوں نے ثعلبہ ابن حاطب انصاری سے کہ انہوں نے حضورؐ سے یہ درخواست کی کہ ان کے حق میں بہت سے مال کی دعا کریں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ثعلبہ وہ تھوڑا مال جس کی تم شکرگزاری کر سکو۔ اس زیادہ سے بہتر ہے جس کی تم شکرگزاری نہ کر سکو''۔

کہتے ہیں کہ اس نے دوبارہ درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم اللہ کے نبی کے مانند ہو۔ خدا کی قسم اگر میں چاہتا کہ میرے لیے پہاڑ سونے چاندی کے ہو جائیں تو ہو جاتے"۔ اس نے پھر درخواست کی کہ خدا کی قسم اگر آپ نے میرے حق میں دعا کی اور اللہ نے مجھے مال کثیر دے دیا تو میں اس میں سے ہر صاحب حق کو حق دوں گا۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا "اے اللہ ثعلبہ کو مال دے دے"۔ کہتے ہیں کہ اس نے بکریاں پالنا شروع کیں اور وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح بڑھنے لگیں۔ یہاں تک کہ مدینہ میں ان کا سمانا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ وہ مدینہ سے ہٹ کر ایک وادی میں چلا گیا اور ظہر و عصر کی نماز باجماعت پڑھتا اور باقی نمازیں ترک ہو گئیں۔ اس کے بعد اس کے مال میں اور اضافہ ہو گیا اور وہ اس قدر دور چلا گیا کہ صرف جمعے کی نماز کو حاضر ہوتا۔ یہ مال اس طرح بڑھتا رہا جس طرح کیڑے بڑھتے ہیں یہاں تک کہ جمعے کی نماز بھی چھوٹ گئی۔ اب وہ ان سواروں سے راستے میں ملتا جو جمعہ پڑھنے جاتے تھے تا کہ حالات دریافت کرے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا کہ "ثعلبہ کا کیا ہوا؟" حضور کو بتایا گیا کہ اس نے بکریاں پالیں۔ مدینہ میں ان کا سمانا مشکل ہوا اور اس طرح وہ دور چلا گیا اور اس کے حالات انہوں نے بتائے۔ حضورؐ نے فرمایا "ثعلبہ ہلاک ہوا ثعلبہ ہلاک ہوا ثعلبہ ہلاک ہوا"۔ اس کے بعد اللہ کا یہ حکم نازل ہوا خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کرو) اور زکوٰۃ کے احکام نازل ہوئے۔ تو حضورؐ نے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے دو مسلمان بھیجے۔ ایک جہینہ سے تھا اور دوسرا سلیم سے۔ آپ نے ان کو تحریری احکام دیئے کہ وہ مسلمانوں سے کس حساب سے زکوٰۃ وصول کریں گے اور خصوصاً فرمایا کہ ثعلبہ اور فلاں کے پاس ہوتے ہوئے جاؤ (یہ فلاں بنو سلیم کا ایک شخص تھا) اور ان سے زکوٰۃ وصول کرو۔ یہ لوگ پہلے ثعلبہ کے پاس آئے اور اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پڑھ کر سنایا تو ثعلبہ نے کہا یہ تو فقط جزیہ ہے۔ اگر نہیں تو جزیہ کی بہن ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا ہے۔ تم جاؤ اور دوسرے لوگوں سے فارغ ہو کر میرے پاس آؤ۔ دوسرے شخص سلیمی نے یہ حکم سنا تو اس نے اپنے اونٹوں میں سے بہت اچھے اونٹ زکوٰۃ کے لیے علیحدہ کیے اور رسول اللہؐ کے تحصیلداروں کا انتظار کیا۔ جب انہوں نے ان اونٹوں کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ تم پر اس قسم کے اچھے اونٹوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے ہم ان کو وصول نہیں کر سکتے۔ اس شخص نے کہا تم لوگ ان اونٹوں کو وصول کر لو۔ میں بطیب خاطر یہ دے رہا ہوں۔ یہ ان کے لیے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اونٹ لے لیے اور دوسرے لوگوں سے وصولی کرتے ہوئے دوبارہ پھر ثعلبہ کے پاس آئے۔ اس نے کہا تم اپنا حکم مجھے دکھاؤ۔ اس نے رسول اللہ کا حکم پڑھا تو پھر کہا کہ یہ تو جزیہ ہے یا جزیہ کی بہن ہے۔ تم جاؤ میں سوچ کر فیصلہ کروں گا۔ یہ لوگ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور جب حضورؐ نے ان کو دیکھا تو فرمایا "وہ ہلاک ہو گیا"۔ حضورؐ نے ان کی بات سے پہلے ہی بتا دیا اور سلیمی کے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ ان لوگوں نے حضورؐ کو ثعلبہ اور سلیمی دونوں کی روئیداد سنائی۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ اس وقت رسول اللہ کے پاس ثعلبہ کے رشتہ داروں میں سے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ سن لیا۔ وہ مدینہ سے چلا۔ اس سے ملا۔ اسے کہا ثعلبہ تم تباہ ہو جاؤ۔ تمہارے بارے میں تو یہ آیات نازل ہو گئی ہیں۔ ثعلبہ حضورؐ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میری زکوٰۃ قبول کریں۔ تو حضورؐ نے فرمایا مجھے تو اللہ نے آپ کی زکوٰۃ لینے سے منع کر دیا ہے۔ ثعلبہ اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا تو حضورؐ نے فرمایا یہ تو تمہارا اپنا کرنا ہے۔ میں نے تو تمہیں مشورہ دیا تھا مگر تم نے میری بات نہ مانی۔ جب رسول اللہؐ نے اس سے زکوٰۃ لینے سے انکار کر دیا تو وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف

واپس ہوا۔ تو حضور فوت ہو گئے اور اس سے زکوۃ وصول نہ کی۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کا دور آیا تو ثعلبہ نے ان سے درخواست کی کہ تم رسول اللہ ؐ کے ساتھ میرے تعلق سے بھی واقف ہو اور انصار میں میرا جو مقام ہے اس سے بھی واقف ہو' میری زکوۃ وصول کیجئے۔ اس پر ابوبکرؓ نے فرمایا چونکہ حضورؐ نے آپ کی زکوۃ کو قبول نہیں فرمایا اس لیے میں نہیں لے سکتا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے زندگی بھر ان سے زکوۃ نہ لی۔ پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے اور ان کے پاس بھی ثعلبہ زکوۃ لے کر آئے اور درخواست کی امیرالمومنین میری زکوۃ قبول فرمائیں تو انہوں نے فرمایا کہ رسول نے قبول نہ کی' حضرت ابوبکرؓ نے قبول نہ کی میں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ بھی فوت ہوئے اور ثعلبہ سے زکوۃ نہ لی۔ جب حضرت عثمان خلیفہ بنے تو ان کے پاس ثعلبہ آئے تو ان سے بھی درخواست کی کہ میری زکوۃ وصول کریں۔ چنانچہ انہوں نے بھی یہی کہا کہ رسول اللہ نے قبول نہ کی ابوبکرؓ نے قبول نہ کی' عمرؓ نے قبول نہ کی کیا میں اسے لوں؟ چنانچہ انہوں نے بھی وصول نہ کی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں وہ فوت ہو گیا۔

ان آیات کے نزول کا تعلق اس واقعہ کے ساتھ ہو یا کسی دوسرے واقعہ کے ساتھ' آیت بہرحال عام ہے اور ایک عام حالت کی نشاندہی کر رہی ہے۔ یہ آیت ایک ایک شخص کی نفسیاتی تصویر کشی کرتی ہے جو بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہو اور ان کے دل و دماغ میں ابھی تک ایمان متمکن نہ ہوا ہو۔ اگر ان آیات کا شان نزول یہی ہو تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ علم تھا کہ ثعلبہ قیامت تک منافق رہے گا اس لیے اس کی جانب سے زکوۃ کو قبول نہ کیا گیا اور اس کے ساتھ عام شرعی اصول کے مطابق معاملہ نہ فرمایا۔ عام شرعی اصول یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ ان کے ظاہر کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ ثعلبہ کے معاملے میں چونکہ اللہ کی جانب سے حضور کو خصوصی معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ اس لیے ان کے ساتھ حضورؐ نے سخت تادیبی معاملہ کیا تاکہ دوسروں کے لیے عبرت ہو۔ چنانچہ ان کو مرتد بھی قرار نہ دیا گیا تاکہ انہیں ارتداد کی سزا دی جائے اور مسلمان تصور کر کے ان سے زکوۃ بھی قبول نہ کی گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ازروئے شریعت منافقین پر زکوۃ واجب نہیں ہے' کیونکہ شریعت ان لوگوں کے ساتھ ان کے ظاہر کے مطابق معاملہ کرتی ہے' کیونکہ زیر نظر معاملے میں ایک نبی کو خصوصی علم تھا۔ اس پر کوئی دوسرا شخص قیاس کر کے ایسا طرز عمل اختیار نہیں کر سکتا۔

ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دور اول کے مسلمان زکوۃ کو کن نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان پر اللہ کی جانب سے ایک رحمت ہے۔ جو شخص اس کے ادا کرنے سے محروم ہوا یا جس کی طرف سے قبول نہ کی گئی وہ گویا عظیم بھلائی سے محروم رہا۔ وہ اس قدر محروم اور گھاٹے میں رہا کہ اس پر رحم کیا جانے لگا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان اس آیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا "ان کے اموال سے زکوۃ وصول کرو جو تم ان کی تطہیر کرتے ہو اور جس کے ذریعے تم ان کا تزکیہ کرتے ہو"۔ ان کے نزدیک زکوۃ ایک غنیمت تھی ٹیکس نہیں تھا جس سے ان کا تاوان ہوتا۔ لہٰذا جو مال فرض اللہ کی جانب سے عاید ہوتا ہے اور اس سے اللہ کی رضامندی مطلوب ہوتی ہے اس میں اور اس مالی فریضے میں جو لوگوں پر بطور جبر عاید ہوتا ہے' بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

منافقین زکوۃ کے بارے میں کیا تصورات رکھتے تھے اور سچے اہل ایمان زکوۃ و صدقات کے بارے میں کیا سوچتے تھے ۔ان دونوں تصورات کی ایک جھلکی ملاحظہ ہو ۔منافقین مخلص اور غریب اہل ایمان کے انفاق کا مذاق اڑاتے تھے ۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

(وہ خوب جانتا ہے ان کنجوس دولت مندوں کو) جو برضا و رغبت دینے والے اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کر کے دیتے ہیں ۔اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔

اس آیت کے نزول کا بھی ایک خاص قصہ ہے ۔جس سے اظہار ہوتا ہے کہ منافقین کی بگڑی ہوئی طبیعت انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں کیا سوچتی تھی؟

ابن جریر نے بواسطہ یحیٰی ابن کثیر اور سعید ابن قتادہ اور ابن ابی حاتم' حکم ابن ابان سے' عکرمہ سے نقل کیا ہے (روایت کے الفاظ مختلف ہیں) کہتے ہیں کہ حضورؐ نے تبوک کے موقعہ پر چندے کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا۔ عبدالرحمٰن ابن عوف نے چار ہزار دیئے ۔انہوں نے کہا حضورؐ میری کل جائیداد آٹھ ہزار ہے اس میں سے نصف لایا ہوں ۔نصف چھوڑ رکھا ہے ۔تو حضورؐ نے فرمایا اللہ اس میں بھی برکت دے جو تو نے دیا اور اس میں بھی برکت دے جو پس انداز کر دیا ہے ۔ ابو عقیل ایک صاع کھجوریں لائے اور کہا رسول خداؐ میں دو صاع کھجور کما کر لایا ہوں ۔ایک صاع میں اللہ کو قرض دیتا ہوں اور ایک اپنے بچوں کے لیے چھوڑ دیا ہے ۔ان دونوں کے ساتھ منافقین نے مذاق کیا۔ عبدالرحمٰن ابن عوف کے بارے میں کہا کہ اس نے دکھاوے کے لیے اتنا مال دیا اور ابو عقیل کے بارے میں کہا کہ اللہ اور رسولؐ کو ایک صاع کی ضرورت ہی کیا تھی ۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے ابو عقیل کے بارے میں کہا کہ یہ شخص خواہ مخواہ اپنے آپ کو یاد کرانا چاہتا ہے' حالانکہ اس نے ساری رات مزدوری کی اور دو صاع کمائے تھے اور ایک صاع حضورؐ کے سامنے پیش فرمایا۔

منافقین اہل ایمان کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے تھے حالانکہ وہ دل و جان سے فدا ہو رہے تھے اور بطیب خاطر خرچ کر رہے تھے اور جس کے مقدر میں جس قدر تھا وہ جہاد میں حصے کے طور پر فنڈ میں دیتے تھے لیکن منافقین کی سمجھ میں مسلمانوں کا اخلاص اور ان کے پاکیزہ جذبات نہ آتے تھے ۔ان کے دل بجھے ہوئے تھے اس لیے وہ مسلمانوں کے حساس دلوں کا ادراک نہ کر سکتے تھے ۔وہ مسلمانوں کی بے تابی کو نہ پا سکتے تھے جو وہ راہ خدا میں انفاق کے لیے دکھا رہے تھے ۔وہ داعیہ ایمانی کے نتیجے میں تھوڑا یا بہت ملا کر پیش کرتے تھے اور یہ لوگ داعیہ ایمانی سے محروم تھے ۔چنانچہ وہ اس کے سوا اور کہہ کیا سکتے تھے کہ اگر زیادہ دیا جائے تو ریاکار ہے اور اگر قلیل دیا جائے تو نام لکھوا رہا ہے ۔اگر کوئی زیادہ دیتا

تو وہ بھی مجرم اور اگر کوئی تھوڑا دیتا تو بھی مجرم ۔ لہٰذا ان کی اس تنقید کو صالح ذہن قبول ہی نہ کرتا تھا ۔ اس لیے کہ وہ ذاتی طور پر جہاد سے پیچھے رہنے والے تھے 'پشت کی طرف سے نقب لگانے والے تھے اور ایک پیسہ جہاد میں دینے کے لیے تیار نہ تھے ۔ وہ اگر کچھ دیتے بھی تو محض ظاہرداری کے قیام کے لیے اور بری نیت سے اور حقیر اور ذلیل اسباب کی وجہ سے ۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی ان کو خوب جواب دیتا ہے سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٩: ٧٩) "اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔ کس قدر ہولناک انجام ہے یہ ۔ اور کس قدر ہولناک مذاق ہو گا خالق کی جانب سے ۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی جماعت 'ضعیف و ناتواں' ذلیل اور فانی اور اس کے مقابلے میں خالق کائنات اور اس کا دردناک عذاب کس قدر خوفناک عذاب کے لیے یہ ضعیف و ناتواں انسان اپنے آپ کو پیش کرتا ہے ۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۗ ١٠
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ع ٨
١٦

"اے نبی' تم خواہ ایسے لوگوں کے لیے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو' اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کرنے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ کفر کیا ہے 'اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا"۔

یہ منافقین جو مخلص اور رضاکار مومنین کا مذاق اڑاتے تھے 'کہ یہ لوگ اس کا کیوں مال لٹاتے ہیں ان کا انجام یہ ہے کہ خود حضورؐ کی جانب سے طلب مغفرت بھی ان کے لیے مفید نہ ہو گی ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شفقت کی وجہ سے ان خطاکاروں کے لیے بھی مغفرت طلب کرتے تھے شاید کہ اللہ معاف کر دے ۔

لیکن ان لوگوں کے بارے میں اللہ نے صاف صاف بتا دیا کہ ان منافقین کا انجام طے شدہ ہے ۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے ۔ ان لوگوں نے صحیح راہ سے انحراف کر لیا ہے 'لہٰذا ان کا اب اچھے انجام تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے ۔ ان کے دل اس قدر فاسد ہو چکے ہیں کہ ان کی اصلاح ممکن ہی نہیں ہے ۔

لہٰذا حضورؐ کو کہا جاتا ہے کہ اب اگر ستر مرتبہ بھی طلب مغفرت کریں 'کوئی فائدہ نہ ہو گا ۔ ستر مرتبہ سے مراد کوئی متعین عدد نہیں ہے ۔ اس سے مراد کثرت ہوتی ہے یعنی اب ان کی مغفرت کی کوئی امید نہیں ہے ۔ کیونکہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے ۔ کیونکہ انسانی دل اگر فجور اور فساد کی ایک حد سے آگے بڑھ جائے تو پھر اصلاح کی کوئی امید نہیں رہتی اور انسان جب گمراہی میں حد سے گزر جائے تو پھر راہ راست پر واپس آنے کی کوئی امید نہیں رہتی ۔ اور اللہ تو دلوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے ۔

---ooo---

اب سیاق کلام ایک بار پھر ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو رسول اللہ ؐ سے پیچھے رہ گئے تھے یعنی غزوۂ تبوک کے اہم مرحلے میں۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا
اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا
فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا
قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ
اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا
وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا
مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى
قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ
اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ
تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾

"جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو"۔ ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہیے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ، اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہیے)۔ اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو، تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو"۔

اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا، کیوں

کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے۔ ان کی مالداری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں"۔

یہ لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے ان سے یہ جرم دنیا پرستی کی وجہ سے سرزد ہوا۔ انہوں نے آرام اور راحت کو پسند کیا۔ انہوں نے انفاق فی سبیل اللہ سے پہلوتہی کی۔ کم ہمتی اور بے حمیتی اور بے ایمانی اور دلی کمزوری نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ یہ موقف اختیار کریں۔ ان کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت ہی حقارت آ ہے یعنی یہ کوئی سامان ہے جو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ کو چھوڑ کر اس کے مقابلے میں امن و سکون اور عیش و راحت کو قبول کیا۔ انہوں نے رسول اللہ اور مجاہدین کو اکیلے چھوڑ کر سخت ترین گرمی کی مشقتوں کے لیے چھوڑ دیا اور اس بات کو پسند نہ کیا کہ اپنی جان و مال کے ذریعے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ انہوں نے کہا کہ اس "جھلسا دینے والی گرمی میں مت نکلو" یہی اقوال ان تمام لوگوں کے منہ سے نکلتے ہیں جو عیش کوش ہوتے ہیں۔ یہ پست ہمت زنانہ چال والے لوگ ہوتے ہیں اور ان کو کسی صورت میں بھی مرد نہیں کہا جا سکتا۔

یہ لوگ ضعف ہمت کا نمونہ ہیں۔ یہ کمزور ارادے کے لوگ ہیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مشکلات سے گھبراتے ہیں اور جدوجہد سے نفرت کرتے ہیں اور جہد و مشقت کے مقابلے میں ذلت آمیز راحت کو پسند کرتے ہیں۔ اور جہد و مشقت کی باعزت زندگی انہیں گوارا نہیں ہوتی۔ وہ شیر کی زندگی کے مقابلے میں گیدڑ کی زندگی کے خوگر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آگے بڑھنے والی صفوں کے پیچھے تھکے ماندے پڑے رہتے ہیں۔ لیکن باہمت لوگوں کی یہ اگلی صفیں پر خطر اور کانٹوں والی راہوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی فطرت زندہ ہوتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ مشکلات کو انگیز کرنا اور آگے ہی بڑھتے چلے جانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ پیچھے رہنے اور گھروں میں بیٹھنے کے مقابلے میں ایسے لوگوں کو دشمن کا سامنا کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۹: ۸۱) "انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو"۔ ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے 'کاش انہیں اس کا شعور ہوتا'"۔

دنیا میں تو وہ گرمی سے جان بچا کر چھاؤں میں بیٹھ جائیں گے لیکن آخرت کی گرمی کا کیا علاج کریں گے۔ وہاں تو وہ دائماً آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی جانب سے یہ ایک حقیقت پسندانہ طنز ہے۔ دنیا میں اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنا تو بہت قلیل مدت کی مشقت ہے۔ بمقابلہ جہنم کی گرمی کے جہاں جو بھی جائے گا ایک طویل عرصہ تک رہے گا۔ اور معلوم نہیں کہ کس قدر وہاں رہے گا۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹: ۸۲) "اب

چاہئے کہ یہ لوگ ہنسا کم کریں اور روئیں زیادہ' اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہئے)"۔ یہاں اگر کوئی ہنسے گا تو اس کی ہنسی مختصر ہوگی کیونکہ دنیا کی زندگی محدود ہے۔ اور آخرت میں پھر اسے ہمیشہ کے لیے رونا ہوگا' اور جیسا کرے گا ویسے بھرے گا۔ یہ نہایت ہی منصفانہ جزا ہے۔

یہ لوگ جنہوں نے جہاد کے مقابلے میں آرام کو پسند کیا اور اپنایا۔ اور مشکل حالات میں قافلہ اسلام سے پیچھے رہ گئے۔ یہ کسی بھی مشکل مہم کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ یہ جہاد کے قابل ہی نہیں رہے۔ اس لیے ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا اب کسی بھی موقعہ پر انہیں شریک جہاد کر کے ان کو عزت نہ دی جائے کیونکہ اس اہم موقعہ پر انہوں نے خود اس اعزاز کو لات مار دی۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِىَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِىَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ

(۹: ۸۳) "اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا" اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو' تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا تو اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو"۔

دعوت اسلامی اور اسلامی تحریکات کو نہایت ہی مضبوط' نہایت ہی سلیم الفطرت اور نہایت ہی راست باز لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے' جن کے ارادے مصمم ہوں' جو مشکلات کو انگیز کرنے والے ہوں' دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونے والے ہوں اور ایک طویل اور پر مشقت جدوجہد کے لیے تیار ہوں۔ لیکن جب اسلامی تحریکات کی صفوں میں عیش پسند' راحت طلب اور کمزور یقین کے لوگ گھس آئیں تو وہ مشکل وقت میں اس کی شکست کا باعث بنتے ہیں۔ مشکل وقت وہ اضطراب اور انتشار کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے لوگ جن سے تحریک کے دوران ضعف وکمزوری کا صدور ہو جائے ان کو تحریک سے دور پھینکنا چاہئے تاکہ مشکل اوقات میں وہ کمزوری اور انتشار کا باعث نہ بنیں۔ اور یہ نہ ہو کہ جب خوشحالی کا دور دورہ ہو اور فتح و کامرانی کا دور ہو تو یہ لوگ لوٹ کر مزے لوٹتے رہیں۔ صاف صاف کہہ دو" اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے۔ نہ تم میری معیت میں کسی دشمن کے ساتھ لڑ سکتے ہو۔ تم نے خود پہلے بیٹھے رہنے کو پسند کیا۔

اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۹: ۸۳) تم نے جنگ تبوک کے لیے نکلنے کا شرف کھو دیا ہے۔ لشکر تبوک میں شمولیت کے اعزاز سے تم محروم ہو چکے ہو' کیونکہ یہ شرف وہی حاصل کر سکتا تھا جو اس کے لیے اہل تھا۔ لہٰذا اس معاملے میں تمہارے ساتھ کوئی نرمی نہیں برتی جا سکتی۔ اور نہ تم حسن سلوک اور معافی کے مستحق رہے ہو۔ لہٰذا اب تم انہی لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو جو تمہارے ہم جنس اور ہم محفل اور ہم مشرب تھے۔ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ (۹: ۸۳) " لہٰذا پیچھے رہنے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو"۔ یہ تھی وہ راہ جو اللہ نے اپنے نبی کے لیے تجویز کی تھی اور آج بھی نبی کے نقش قدم پر جو دعوت و تحریک برپا ہوگئی ہے' اس کی بھی یہی راہ و روش ہوگی۔ لہٰذا تحریک اسلامی کے

داعیوں اور کارکنوں دونوں کو یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے۔ ہر دور میں اور ہر جگہ۔

جس طرح حضورؐ کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ ان لوگوں کو دوبارہ اسلامی صفوں میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے مشکل حالات میں ساتھ چھوڑا' اسی طرح یہ حکم بھی دیا گیا۔ آئندہ کے لیے ان کو اسلامی معاشرے میں کوئی اعزاز و امتیاز نہ دیا جائے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (۹ : ۸۴) "اور آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ بھی تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا' کیوں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ مرے ہیں اس حال میں کہ وہ فاسق تھے"۔

اس آیت کے پس منظر کے بارے میں بھی مفسرین نے متعین واقعات ذکر کیے ہیں لیکن اس آیت کا مفہوم ان واقعات سے عام ہے۔ یہاں اسلامی نظریہ حیات کی راہ میں جدوجہد کرنے والے گروہ کے بارے میں ایک اصول وضع کیا گیا ہے۔ یہ کہ اس جدوجہد کے معاملے میں جو لوگ عیش کوش' آرام پسند ہیں اور مشکلات کو انگیز نہیں کرتے اور مشکل مہمات میں شامل نہیں ہوتے' اسلامی قیادت کی طرف سے ایسے لوگوں کے ساتھ نہ نرمی برتی جائے اور نہ ایسے لوگوں کو اعزاز دیا جائے۔ اسلامی صفوں سے ایسے لوگوں کو دور رکھا جائے یا نہایت ہی پچھلی صفوں میں اور اس معاملے میں کوئی نرمی' حسن سلوک یا رواداری نہ برتی جائے۔

یہاں اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور ان کی قبر پر آپ کھڑے نہ ہوں کیونکہ انہوں نے اللہ اور رسولؐ کے ساتھ کفر کیا اور یہ لاعمل فاسق تھے اور منافق تھے۔ لیکن اس حکم سے جو عمومی اصول نکلتا ہے وہ زیادہ عام ہے۔ کیونکہ نماز جنازہ اور قبر پر کھڑے ہونے سے میت کو اعزاز ملتا ہے اور اسی اعزاز کے یہ لوگ مستحق نہیں ہیں۔ خصوصاً جو لوگ نہایت ہی مشکل وقت میں مجاہدین کی صفوں میں کھڑے نہیں ہوتے ان کو اعزاز نہ دیا جائے تاکہ لوگوں کو اسلامی جدوجہد کی اہمیت معلوم ہو۔ اور کارکنوں کو معلوم ہو کہ اس معاملے میں اعزاز کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جو عملی جدوجہد کریں گے' مشکلات کو انگیز کریں گے۔ مشکلات میں ثابت قدم رہیں گے۔ تب جاکر وہ اسلامی صفوں میں معزز' مکرم اور ممتاز ہوں گے۔ اسلامی تحریک میں ایسے لوگوں کو نہ ظاہری اعزاز دیا جائے اور نہ باطنی۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (۹ : ۸۵) "ان کی مالداری اور ان کی کثرت اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے اللہ نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ اس مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں"۔

تحریک اقامت دین کے لیے یہ ہمہ گیر ہدایت ہے کہ کسی کے مال و دولت کی وجہ سے اسے اعزاز نہ دیا جائے۔ نہ دل اور شعور میں ایسے لوگوں سے کوئی تاثر لیا جائے۔ یہ مال خود ان کے لیے وبال جان ہوں گے۔ کیونکہ اگر کوئی ان کے

ظاہری مال سے متاثر ہو گا تو یہ بھی ان کے لیے اکرام ہو گا۔ دل کے اندر بھی ایسے لوگوں کی تکریم کا شعور نہ آنے پائے۔ ان کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جائے۔

وَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَجَٰهِدُوا۟ مَعَ رَسُولِهِ
ٱسْتَـْٔذَنَكَ أُو۟لُوا۟ ٱلطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا۟ ذَرْنَا نَكُن مَّعَ ٱلْقَٰعِدِينَ ﴿٨٦﴾
رَضُوا۟ بِأَن يَكُونُوا۟ مَعَ ٱلْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا
يَفْقَهُونَ ﴿٨٧﴾ لَٰكِنِ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ جَٰهَدُوا۟ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَ
أَنفُسِهِمْ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلْخَيْرَٰتُ ۖ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ﴿٨٨﴾ أَعَدَّ ٱللَّهُ
11 لَهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ ٱلْفَوْزُ
ع ٱلْعَظِيمُ ﴿٨٩﴾ ع
17

"جب کبھی کوئی سورة اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحب مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انہیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا' اس لیے ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا۔ بخلاف اس کے رسول' نے اور ان لوگوں نے جو رسول کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں انہی کے لیے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی"۔

یہاں دو مزاجوں کا ذکر ہے۔ ایک ہے مزاج نفاق' کمزوری اور ذلت کا اور دوسرا مزاج ہے ایمان' قوت آزمائش کا۔ ایک مزاج کی منصوبہ بندی چالاکی' پیچھے رہ جانے اور ذلت قبول کرنے کے خطوط پر ہوتی ہے اور دوسرے مزاج کی منصوبہ بندی استقامت' خرچ اور عزت و شرف کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔

جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے اور اس میں جہاد کا حکم ہوتا ہے تو بعض لوگ جو استطاعت رکھتے ہیں جن کے پاس جہاد کے اخراجات کے لیے مناسب وسائل ہوتے ہیں' وہ اپنی پوزیشن کے مطابق آگے نہیں بڑھتے۔ اس طرح اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ ذلت' شرمندگی کی روش اختیار کرتے ہیں' یہ لوگ عورتوں اور دروں کے ساتھ بیٹھے رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی عزت اور اپنے مقام کی مدافعت نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو یہ شعور ہی

نہیں ہوتا' نہ وہ یہ احساس کرتے ہیں کہ ان کی اس روش کی وجہ سے وہ کس قدر ذلیل و خوار سمجھے جاتے ہیں۔بس وہ یہی چاہتے ہیں کہ ہر قیمت پر زندہ رہیں۔کیا وہ نہیں سمجھتے کہ ہر قیمت پر زندہ رہنا ذلیلوں کا کام ہے۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۹:۸۷)

"ان لوگوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا گیا' اس لیے ان کی سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا"۔اگر یہ سمجھتے تو اس حقیقت کو پا لیتے کہ جہاد میں قوت' عزت اور باعزت زندگی کا راز ہے اور جہاد سے پیچھے رہنے میں کمزوری' ذلت اور ذلت کی موت ہے۔

"یاد رہے کہ ذلت کے لیے بھی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے اور عزت و شرف کے لیے بھی انسان کو قیمت دینا ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان شرف کے مقابلے میں ذلت کے لیے بڑی قیمت ادا کرتا ہے۔بعض کمزور مزاج کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عزت کے لیے بہت بڑی قیمت دینا پڑتی ہے اور ہم اس قدر قیمت کی ادائیگی نہیں کر سکتے۔اس لیے یہ لوگ ذلت کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں اور مشکلات اور تکالیف دیکھ کر بھاگ نکلتے ہیں۔ایسے لوگ نہایت ہی ذلیلانہ اور حقیرانہ اور خوفناک زندگی بسر کرتے ہیں۔خود اپنے سائے سے ڈرتے رہتے ہیں۔خود اپنی آواز سے کانپ اٹھتے ہیں۔ہر آوازے کو یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر ہے۔ان لوگوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ زندگی انہیں بہت محبوب ہوتی ہے۔لیکن یہ لوگ عز و شرف کے مقابلے میں اس ذلت کی زیادہ قیمت ادا کرتے ہیں۔پوری پوری قیمت جان کی قیمت' عزت و آبرو کی قیمت' شہرت کی قیمت' اطمینان کی قیمت اور خوف اور دولت کی قیمت۔لیکن ان بدبختوں کو اس کا شعور نہیں ہے"۔ایسے ہی لوگوں میں وہ لوگ شامل تھے جو مدینہ میں عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہے' ان کے دلوں پر مہر لگ گئی اور ان کی فہم و ادراک نے کام کرنا چھوڑ دیا۔

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے تھے وہ دوسرے طرز کے لوگ تھے۔جاھدوا باموالھم وانفسھم (انہوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا)۔انہوں نے ایمان کے تقاضے پورے کیے اور نظریات کی قیمت ادا کی۔اور وہ عزت کمائی جو بیٹھنے والے نہ کما سکے۔یہی لوگ ہیں جو اس زمین کا کریم ہیں۔دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ان کے سامنے سب خزانے کھلے ہیں اور ان کا نام اور ان کی شہرت دور دراز تک ہے۔یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں نہ دنیا میں بھی جبکہ وہ باعزت زندگی بسر کر رہے ہوں گے اور آخرت میں بھی جن کے لیے اللہ نے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی فوز عظیم ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

"بدوی عربوں میں سے بھی بہت سے لوگ آئے جنہوں نے عذر کیے تاکہ انہیں بھی پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے۔اس طرح بیٹھ رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے ایمان کا جھوٹا عہد کیا تھا۔ان بدویوں میں سے

جن لوگوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا ہے عنقریب وہ دردناک سزا سے دوچار ہوں گے"۔

پہلے لوگ تو وہ ہیں جن کے عذرات حقیقی ہیں۔ لہٰذا ان کو اجازت دے دی گئی اور وہ مجبوراً رہ گئے' رہے دوسرے تو وہ بلاعذر رہے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ اور رسول اللہ کے سامنے جھوٹے عذرات پیش کیے۔ ان میں سے جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا وہ تو عذاب الیم سے دوچار ہوں گے۔ ہاں جن لوگوں نے توبہ کر لی تو ان کا ذکر یہاں نہیں ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔

---ooo---

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اس لشکر میں خروج کا حکم اندھیرے کا سوٹا نہ تھا بلکہ اس میں وروں کا خیال رکھا گیا تھا۔ کیونکہ اسلام تو ایک معقول اور سہولت کا دین ہے۔ اس میں کسی سے اس کی استطاعت سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا وروں سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

"ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے زاد راہ نہیں پاتے' اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جب کہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔ ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے' اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنہوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں' اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انہیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انہوں نے گھر بیٹھنے والوں میں

رہنا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا' اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے ۔)

جو لوگ ضعیف ہیں' بوڑھے ہیں' ور ہیں اور بیٹھے ہیں ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہے ۔ وہ بیمار جو عارضی طور پر اس مہم میں شریک نہ ہو سکتے تھے' قابل ملامت نہیں ہیں ۔ وہ لوگ بھی ور تصور ہوں گے جو سواری اور زاد راہ نہیں رکھتے ۔ یہ لوگ اگر میدان معرکہ سے دور رہے تو ان کا کیا قصور ہے ۔ لیکن ان کے دل اور ضمیر اور ان کے جذبات اللہ اور رسول کے ساتھ ہیں ۔ ان لوگوں نے کسی بات کو چھپا نہیں رکھا' دھوکہ نہیں کرتے اور مدینہ میں رہ کر وہ حفاظت' چوکیداری اور دارالاسلام کی دوسری خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو اسلامی ریاست کے لیے مفید اور ضروری ہیں ۔ ایسے لوگ ور ہونے کے ساتھ محسن بھی ہیں ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا اور نہ وہ قابل ملامت ہوں گے ۔

اس طرح جنگی قوت رکھنے والے لیکن سواری نہ رکھنے والے بھی ور ہوں گے جو پیادہ اس دور دراز سفر پر نہیں جا سکتے تھے ۔ ایسے لوگ مجبوراً رہ گئے لیکن ان کے دل پھٹے جا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ وہ مجبوراً اس اعزاز سے محروم ہو رہے ہیں ۔

جہاد کی سچی چاہت کی یہ کس قدر اچھی تصویر کشی ہے ۔ دلی رنج و الم کو کن خوبصورت الفاظ میں ادا کیا گیا ہے ۔ رسول اللہ کے زمانے میں بعض عملی واقعات کی یہ اس آیت میں تصویر کھینچی گئی ہے ۔ مختلف روایات میں مختلف فدایان اسلام کا ذکر ہے لیکن یہ سب اس آیت کا صحیح مصداق ہیں ۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (٩ : ٩٢) "اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے جنہوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں' اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے ۔

عوفی نے ابن عباس سے روایت کی ہے "یہ کہ رسول اللہ نے حکم دیا کہ لوگ آپ کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں ۔ ایک جماعت آپ کے پاس آئی جن میں عبداللہ ابن مغفل ابن مقوی المازنی بھی تھا ۔ تو انہوں نے مطالبہ کیا کہ رسول خدا ہمیں سواری عنایت کیجئے ۔ تو حضورؐ نے فرمایا خدا کی قسم میرے پاس کچھ نہیں ہے کہ میں تمہاری سواری کا بندوبست کروں ۔ یہ لوگ واپس ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ ان کے لیے یہ بات بہت ہی گراں تھی کہ وہ جہاد سے پیچھے رہ جائیں لیکن کوئی نفقہ اور سواری نہیں ہے ۔ جب اللہ نے دیکھا کہ ان کو اللہ اور رسول اللہ سے کس قدر محبت ہے تو ان کے اعزاز میں' یہ آیت نازل ہوئی ۔

مجاہد کہتے ہیں کہ یہ مزینہ کے بنی مقرن کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ محمد ابن کعب فرماتے ہیں کہ یہ سات آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ بنی عمرو ابن عوف کے سالم ابن عوف' بنی واقف سے حرمی ابن عمر' بنی مازن ابن نجار سے عبدالرحمن ابن کعب جس کی کنیت ابولیلیٰ ہے' بنی معلی سے فضل اللہ بنی سلمہ سے عمر ابن عتبہ اور عبداللہ ابن عمرو المزنی ۔

ابن اسحاق نے واقعات غزوۂ تبوک میں کہا ہے "اس کے بعد مسلمانوں میں سے بعض لوگ رسول اللہ کے پاس آئے ' یہ لوگ انصار وغیرہ کے سات آدمی تھے۔بنی عمر ابن عوف سے سالم ابن عمیر اور علیہ ابن زید بنی حارثہ کے بھائی اور ابولیلی عبدالرحمٰن ابن کعب بنی مازن کے بھائی اور عمرو ابن حمام ابن جموح بنی سلمہ کے بھائی ' عبداللہ ابن مغفل مزنی ' بعض نے اسے عبداللہ ابن عمر مزنی بتایا ہے۔حرمی ابن عبداللہ ' بنی واقف کے بھائی اور عیاض ابن ساریہ الفزاری تو ان لوگوں نے رسول اللہ سے سواری کا مطالبہ کیا اور یہ لوگ فی الواقع غریب تھے تو حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں کہ میں تمہاری سواری کا بندوبست کروں۔یہ لوگ واپس ہوگئے اور حال یہ تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ واری نہ ملنے پر یہ لوگ دکھیا تھے۔

یہ روح اور یہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے اسلام غالب ہوا۔اور ان قربانیوں کی وجہ سے اسلام کا جھنڈا بلند ہوا۔ہمیں وچنا چاہئے کہ ان لوگوں کے مقابلے میں ہماری حالت کیا ہے۔ہمیں اپنے جذبہ اسلام کا جائزہ لینا چاہئے۔ہمیں اگر اپنی زوری نظر آئے تو ہمیں اللہ کے سامنے دست بدعا ہونا چاہئے کہ ہماری یہ کمزوری دور کر دے۔اور ہمیں اسلامی جہاد کے جذبے سے اس طرح سرشار کر دے جس طرح صحابہ کرام تھے۔واللہ المستعان

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ---------------- ١١

سورۃ التوبہ — ٩

آیات ٩٣ --- تا --- ١٢٩

سورۃ یونس — ١٠

آیات ١ --- تا --- ١٠٩

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پارہ ۱۱ ایک نظر میں

یہ پارہ سورت توبہ کے بقیہ حصہ اور سورت یونس پر مشتمل ہے۔ سورت توبہ کا بڑا حصہ پارہ دہم میں گزر چکا ہے۔ یہاں ہم سورت توبہ کے بقیہ حصہ پر تبصرہ کریں گے اور سورت یونس پر تبصرہ اس کے آغاز میں ہو گا۔ ان شاء اللہ۔

سورت توبہ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے چند فقرے کہے تھے' کہ اس سورت کا موضوع اور اس کے مضامین کی نوعیت کیا ہے۔ پھر یہ کہ کن حالات میں اس کا نزول ہوا' اور یہ کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت کے دوسرے معاشروں اور حکومتوں کے ساتھ بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کے تعین کے حوالے سے اس سورت کی اہمیت کیا ہے اور اس سورت سے اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو تحریکی منہاج انقلاب سمجھ میں آتا ہے وہ کیا ہے۔ لہٰذا ان اہم فقرات کا یہاں دہرانا فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔ "یہ مدنی سورت ہے اور نزول قرآن کی آخری جھلکیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ اسے آخری قرآن نہیں کہہ سکتے۔ آخری جھلکیاں اس لیے کہ اس میں امت مسلمہ اور دوسری اقوام عالم کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کے ضوابط کو آخری شکل دی گئی ہے۔ نیز اس کے اندر خود اسلامی سوسائٹی کی تشکیل اس کی اقدار کا تعین' اس میں مختلف طبقات کی قدر و قیمت کا تعین اور مجموعی طور پر اس میں کسی اسلامی معاشرے کے بنیادی خدوخال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پائے جانے والے تمام طبقات اور ان کے اوصاف کی بڑی گہری تصویر کشی کی گئی ہے"۔

اس زاویہ سے یہ سورت تو بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں اسلامی نظام کے قیام کے منہاج کے تحریکی عمل کے خدوخال کو اور اس کے تمام مراحل کو بڑی تفصیل کے ساتھ متعین طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں اس موضوع پر اس سورت میں آخری اور فائنل احکام دیئے گئے ہیں۔ اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منہاج کس قدر ٹھوس ہے اور کس قدر فیصلہ کن ہے۔ اس جائزے کے بغیر احکام شریعت و قواعد شریعت کی اصل تصویر سامنے نہیں آتی۔ اگر اس مجموعی جائزے کے بغیر آیات کو اپنے سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو عبوری دور کے لیے جو احکام نازل ہوئے تھے وہ دائمی اور فائنل احکام نظر آئیں گے۔ اور پھر جو شخص چاہے ان آخری آیات و ہدایات کی تاویل کر کے بھی انہیں عبوری دور کے لیے آنے والے احکام کے تابع اور مطابق کر دے۔ خصوصاً جہاد اسلامی کے موضوع پر اس قسم کی مساعی عملاً بھی کی گئیں اور اسلامی معاشرے اور دوسرے جاہلی معاشروں کے باہم تعلقات کے سلسلے میں بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا۔

اس سورت کے تعارف میں ہم نے یہ بات بتائی تھی کہ باوجود اس کے کہ اس سورت کا موضوع ایک ہے اور وہ ایک جیسے حالات میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے کئی حصے ہیں اور ہر حصے میں آخری اور فائنل احکام بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے پہلے حصے میں کسی مسلم معاشرے اور دوسرے جاہلی معاشروں اور حکومتوں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی حد بندی کی گئی ہے جبکہ دوسرے حصے میں مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کی حد بندی کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں ان لوگوں کے حالات پر تبصرہ ہے جنہیں غزوۂ تبوک میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور انہوں نے اس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی اور سستی کی تھی۔ یہ غزوہ ان اہل کتاب کے خلاف تھا جو جزیرۃ العرب کے مغربی کنارے پر بستے تھے اور جو اس نئی اسلامی مملکت پر فیصلہ کن وار کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے' چوتھے حصے میں اسلامی معاشرے میں رہنے والے منافقین کی سازشوں اور کرتوتوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ ان کی نفسیاتی اور عملی کیفیات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ نیز غزوۂ تبوک سے قبل اس غزوے کے دوران اور اس کے بعد ان کے رویے کو قلم بند کر کے ان کی اصل نیتوں' حیلہ سازیوں اور ان عذرات لنگ کی نقاب کشائی کی گئی جو وہ غزوۂ تبوک کی عدم شمولیت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ نیز یہ لوگ اسلامی صفوں میں جو فتنے پھیلاتے تھے' فساد برپا کرتے تھے' جو انتشار پھیلاتے تھے اور حضور ؐ اور مخلص مومنین کے لیے جس اذیت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ یہ تمام حالات اس میں ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مومنین کو ان کے رویے سے متنبہ بھی کیا گیا اور مومنین اور منافقین کے درمیان سماجی تعلقات کی نوعیت کو بھی متعین کیا گیا اور بتایا گیا کہ ان کے ساتھ سماجی بائیکاٹ ہونا چاہیے تاکہ ہر طبقہ اپنی صفات کی وجہ سے متمیز ہو جائے۔

○○○

یہ چار حصے اپنے مضامین کے ساتھ پارہ دہم میں گزر چکے ہیں۔ البتہ آخری حصے کے کچھ مضامین جو جنگ سے پیچھے رہ جانے والے لوگوں کے متعلق ہیں اور جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی سزا اور ان کے انجام کے بارے میں اس حصے میں آگئے ہیں۔

دسویں پارے کی آخری آیت یہ تھی:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۱) وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (۹۲) ((۹: ۹۱ — ۹۲))

"ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے زاد راہ نہیں پاتے' اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔ ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقعہ نہیں ہے جنہوں نے خود آکر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس ہوگئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر جہاد میں شریک ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے"۔

اور وہ تکملہ جس سے اس پارے کا آغاز ہوتا ہے' وہ یہ ہے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۹۳) يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹۴) سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹۵) يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۹۶) (۹:۹۳ تا ۹۶)

"البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواستیں کرتے ہیں کہ انہیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے۔ انہوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں رہنا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا' اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے۔ تم پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے۔ اللہ نے ہم کو تمہارے حالات بتا دیئے۔ اب اللہ اور رسول تمہارے طرز عمل کو دیکھے گا۔ پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔ تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرف نظر کرو۔ تو بے شک تم ان سے صرف نظر ہی کر لو کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصل مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوگی۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہو گا"۔

یہ تو اللہ کی جانب سے اطلاعات تھیں جو اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیں کہ مدینہ واپسی پر پیچھے رہنے والے کیا کیا عذرات پیش کریں گے۔ یہاں بتا دیا گیا ہے کہ جب آپ صحیح و سالم واپس ہوں گے تو آپ رہ جانے والوں کے ساتھ یہ اور یہ سلوک کریں۔

○○○

اس کے بعد سورت کا حصہ پنجم آتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی تشکیل میں کیسے کیسے عناصر موجود ہیں یعنی فتح مکہ سے جنگ تبوک تک کیسے کیسے عناصر اسلامی صفوں میں جمع ہو گئے ہیں' جیسا کہ ہم نے اس سورت کے ابتدائی تبصرے میں واضح کیا کہ ایک تو وہ لوگ تھے جو سابقین اولین تھے اور جو اسلامی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی

تھے اور انہی لوگوں پر اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیاد تھی لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے گروہ بھی اسلامی صفوں میں جمع ہو گئے تھے۔ اعراب اور بدوی لوگ جن میں مخلصین بھی تھے اور مفاد پرست منافقین بھی تھے۔ اہل مدینہ میں بھی منافقین کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا۔ کچھ ایسے لوگ تھے کہ جن کے بعض اعمال اچھے تھے اور بعض باتیں خلاف شریعت تھیں۔ اور ابھی یہ لوگ اچھی طرح اسلامی سانچے میں نہ ڈھلے تھے اور نہ پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگے گئے تھے اور کچھ ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں کچھ نہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد تھا۔ بعض ایسے سازشی تھے جو اسلام کے نام کے پردے میں سب کچھ کرتے تھے' سازش تیار کرتے تھے۔ بیرونی دشمنان اسلام سے بھی ان کا رابطہ تھا۔ قرآنی آیات نے بڑے اختصار کے ساتھ ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان سب اور مختلف الاقسام لوگوں کے ساتھ اسلامی نظام حکومت میں کس طرح کا سلوک کیا جائے گا۔ اللہ نے اس حصے میں رسول اللہ اور مخلص مسلمانوں کو ہدایات دی ہیں کہ انہوں نے ان طبقات کے ساتھ کیا اور کس طرح معاملہ کرنا ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیں :

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹۷) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹۸) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۹) (۹ : ۹۷ تا ۹۹) یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے۔ ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی چٹی سمجھتے ہیں۔ اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں حالانکہ بدی کا چکر خود ان پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول کی طرف سے رحمت کی دعا لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ

الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۹: ۱۰۰) ”وہ مہاجر اور انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے“۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۹: ۱۰۱)

”تمہارے گرد و پیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں۔ اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دہری سزا دیں گے۔ پھر وہ دوبارہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۰۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۰۳) (۹: ۱۰۲ — ۱۰۳)

”اور کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبی تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی، اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۰۶)

”کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے، چاہے انہیں سزا دے اور چاہے تو ان پر از سر نو مہربان ہو جائے۔ اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم و دانا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۰۷) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ

اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

(۱۰۸) ’’کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں‘ اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں‘ اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں‘ اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول م کے خلاف بر سرپیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو‘ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں‘‘۔ تشریح آیات کے وقت ہم تفصیلاً بتائیں گے کہ ان گروہوں سے کون کون لوگ مراد ہیں:

اس سورت کے آخری اور چھٹے حصے میں اسلام کے نظریہ بیعت جہاد فی سبیل اللہ کی نوعیت بتائی گئی ہے۔ اس جہاد کی حقیقت اور اس کے حدود و کیفیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اہل مدینہ‘ مدینہ کے ارد گرد بدوی آبادی کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ذہناً اور عملاً ہر لحاظ سے اہل کفر سے دور کر لیں۔ اور اپنے تمام روابط اسلامی نظریہ حیات کے عقیدے پر استوار کریں اور دوسرے تمام روابط کاٹ دیں۔ خون اور قرابت کے رشتوں کو نظرانداز کر دیں۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ جو لوگ سازشی نہ تھے اور نہ منافق تھے مگر دوسری وجوہات سے وہ اس غزوہ میں شریک نہ ہوئے تھے ان کا انجام کیا ہو گا۔ منافقین کے بعض خدوخال بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا رویہ احکام الٰہیہ کے ساتھ کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ
اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(۹ : ۱۱۱) ’’حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال‘ جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے مرتے ہیں۔ ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے‘ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے‘‘۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۱۳) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ

اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاہُ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗٓ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنْہُ اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیْمٌ

(۱۱۴)(۹:۱۱۳ — ۱۱۴)) "نبی اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں' جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب' خدا ترس اور بردبار آدمی تھا"۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ وَالْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ

مِنْۢ بَعْدِ مَا کَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْھُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْھِمْ اِنَّہٗ بِھِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ

(۱۱۷) وَّعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ

ضَاقَتْ عَلَیْھِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّآ اِلَیْہِ ثُمَّ تَابَ عَلَیْھِمْ لِیَتُوْبُوْا اِنَّ

اللّٰہَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۱۱۸)(۹:۱۱۷ — ۱۱۸)) "اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے مگر اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بے شک اس کا معاملہ اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کر دیا تھا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا' جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

مَا کَانَ لِاَھْلِ الْمَدِیْنَةِ وَمَنْ حَوْلَھُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ

وَلَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِھِمْ عَنْ نَّفْسِہٖ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ لَا یُصِیْبُھُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَطَئُوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْکُفَّارَ وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ

بِہٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲۰) وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِیْرَةً

وَّلَا کَبِیْرَةً وَّلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

(۱۲۱) وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ

(۱۲۲)(۹: ۱۲۰ تا ۱۲۲)) "مدینہ کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کے لیے یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے کوئی انتقام وہ لیں اور ان کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔ اور کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے 'مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ پرہیز کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں۔ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔

وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۹: ۱۲۷) "جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں"۔

اس سورت کا خاتمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف پر ہوتا ہے اور آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ..... اپنے رب پر بھروسہ کریں اور اسی کی طرف متوجہ ہوں۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۱۲۹)(۹: ۱۲۸ — ۱۲۹) "دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک

رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے - ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق و رحیم ہے - اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا ہے' کوئی معبود نہیں مگر وہ' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا'' - اب اس مختصر تشریح کے بعد ہم آیات کی تفصیلی تشریح کی طرف آتے ہیں -

---ooo---

درس نمبر ۹۱ تشریح آیات

۹۳ ـــ تا ـــ ۹۶

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ
قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ
اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ
بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ
رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ
لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

"البتہ اعتراض ان لوگوں پر ہے جو مالدار ہیں اور پھر بھی تم سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں شرکت جہاد سے معاف رکھا جائے ۔ انہوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا' اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے (کہ اللہ کے ہاں ان کی اس روش کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے)۔

تم جب پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے ۔ مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے ۔ اللہ نے ہم کو تمہارے حالات بتا دیے ہیں ۔ اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے طرز عمل کو دیکھے گا' پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے ۔ اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔ تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرف نظر کرو ۔ تو بے شک تم ان سے صرف نظر ہی کر لو' کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوگی ۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ ۔ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہو گا"۔

ضعیفوں، مریضوں اور فقیروں سے کوئی مواخذہ نہیں ہے اور نہ ان کو دل میں اپنی کوتاہی کا احساس کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جن کے پاس زادِ سفر اور سواری کے لیے کچھ نہیں، حضور اکرم ؐ یا اسلامی حکومت بھی ان کو ضروریات مہیا نہیں کر سکتی تاکہ وہ میدان جنگ تک پہنچ سکیں۔ یہ مواخذہ ان لوگوں سے ہے اور وہ لوگ قابل مواخذہ ہیں جو حضورؐ سے چھٹیاں لیتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں، تومند و توانا ہیں اور ان کے پاس کوئی حقیقی عذر نہیں ہے۔ یہ لوگ سخت قابل مواخذہ ہیں کیونکہ انہوں نے قدرت شرکت جہاد کے باوجود پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ بیٹھنا پسند کیا، گھروں میں عیش کرتے رہے۔

ان لوگوں سے مواخذہ کیوں ہو رہا ہے، اس لیے کہ یہ لشکر اسلام سے پیچھے رہ گئے، اس لیے کہ انہوں نے جھوٹے عذرات کی بنا پر چھٹی لی۔ انہوں نے عہد شکنی کی، ان کو اللہ نے غنی بنایا لیکن انہوں نے حق نہ ادا کیا، ان کو اللہ نے اسلامی نظام سے نوازا لیکن انہوں نے اسلامی نظام کا حق ادا نہ کیا، کیونکہ اسلام نے ان کو تحفظ دیا اور عزت بخشی اور انہوں نے اس سوسائٹی کا حق نہ ادا کیا حالانکہ اس سوسائٹی نے بھی انہیں عزت بخشی تھی اور مکرم بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ قابل شرم فقرہ استعمال کیا:

رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ (۹:۹۳) "انہوں نے گھر بیٹھنے والیوں میں شامل ہونا پسند کیا"۔ جو پرلے درجے کی پست ہمتی ہے، کمزوری ہے، اور اس ذلت آمیز پوزیشن کو قبول کرنا ہے کہ ہمت و مردانگی کے مقام پر کوئی عاجزوں، عورتوں، بچوں کے ساتھ بغیر عذر کے بیٹھ جائے اور گھروں میں رہ جائے اور ناحق معذوروں کے زمرے میں شامل ہو جائے اور واضح طور پر نظر آ رہا ہو کہ وہ معذور نہ ہو۔

وَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۹:۹۳) "اور اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا، اس لیے اب یہ کچھ نہیں جانتے (کہ اللہ کے ہاں ان کی اس روش کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے)۔

یہ پوزیشن انہوں نے اس لیے اختیار کی اللہ نے علم و شعور کے دروازے ان پر بند کر دیئے۔ اور ان کے فہم و ادراک کے ادوات معطل کر دیئے گئے کیونکہ انہوں نے خود اپنے لیے بلادت، کم ذہنی اور ذلت کو پسند کیا اور اپنے آپ کو زندہ اور متحرک اور فعال ہونے سے محروم کیا اور ان کے اندر آگے بڑھنے، جرأت کرنے اور جارح ہونے کا جذبہ ہی نہ رہا۔ دنیا میں جو انسان بھی عافیت کوش ہو جائے، آرام طلب ہو جائے اور کند ذہن بن جائے تو وہ ذوق انکشاف، ذوق تجربہ اور ذوق علم سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنی سوسائٹی میں ایک عضو معطل کی طرح بن جاتا ہے جو نہ کسی کو متاثر کر سکتا ہے اور نہ اچھا اثر کسی اور سے قبول کر سکتا ہے اور اظہار ذات سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

عیش و عشرت اور سلامت کوشی ایک ایسی بیماری ہے جو انسان پر شعور و آگہی کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ اور انسانی فہم و ادراک کی قوت مر جاتی ہے جبکہ حرکت اور آگے بڑھنا زندگی کی دلیل ہے، حرکت زندگی کا سبب اول ہے، اور مشکلات و چیلنج کرنے سے نفس انسانی اور عقل انسانی کے چند گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں۔ انسان کے اعصاب قوی ہو جاتے ہیں اور وہ خفیہ قوتیں سامنے آ جاتی ہیں جو ہمیشہ خطرات کے وقت وجود میں آ کر مدافعت کرتی ہیں۔ اور انسانی قوتوں کو عمل اور کسی پکار پر لبیک کہنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ سب گوشے علم اور ادراک کے مختلف پہلو ہیں اور ان سے وہ لوگ محروم ہو

جاتے ہیں جو ذلت اور سلامتی اختیار کر لیتے ہیں اور عافیت کوش ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص عافیت کا طلبگار ہوتا ہے لیکن یہ ذلت آمیز عافیت ہے، باوقار عافیت نہیں ہے۔

انہی مالداروں اور جہاد پر قدرت رکھنے والوں کے امور پر بحث جاری ہے جنہوں نے عورتوں کے ساتھ رہنے کو پسند کیا کہ عیش کوشی، دوں ہمتی، پست ہمتی اور مشکلات سے فرار کے علاوہ یہ کس قدر ذلیل ہیں اور کہتے کیا ہیں:

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ (۹: ۹۴) "تم جب پلٹ کر ان کے پاس پہنچو گے تو یہ طرح طرح کے عذرات پیش کریں گے"۔ یہ اللہ کی جانب سے رسول اللہ کو پیشگی کے طور پر بتایا جا رہا ہے اور مخلصین اہل ایمان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جب تم اس مہم سے واپس لوٹو گے تو تمہارے ساتھ ان کا طرز عمل کیا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات مدینہ کو پہنچنے سے پہلے دوران سفر یا اس سے بھی پہلے نازل ہو گئی تھیں۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ تمہارے پہنچتے ہی عذرات پیش کرنا شروع کر دیں گے۔ کیونکہ وہ محسوس کریں گے کہ ان کی یہ حرکت ایک ننگا نفاق ہے۔ اور ان کی اس حرکت کے اسباب بھی واضح تھے کہ ان کا ایمان ضعیف تھا، انہوں نے عافیت کوشی کی، اور مشکلات جہاد سے گھبرا گئے۔

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (۹: ۹۴) "مگر تم صاف کہہ دینا کہ "بہانے نہ کرو، ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار نہ کریں گے" اللہ نے ہم کو تمہارے حالات بتا دیئے ہیں"۔

تم جس قدر بھی عذرات پیش کرو، ہم تمہارے بارے میں اب *مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہم تمہاری تصدیق نہیں کر سکتے*، اب تمہارے ساتھ وہ معاملہ جاری نہیں رہ سکتا جو ہم منافقین کے ساتھ اس سے قبل ان کے ظاہری اسلام کے مطابق رکھ رہے تھے۔ کیونکہ اللہ نے اپنی مہربانی سے تمہارے حالات ہم پر منکشف کر دیئے ہیں۔ تمہارے دلوں میں جو گندگی بھری ہوئی ہے اس کا بھی اللہ نے انکشاف کر دیا ہے اور تمہارے اعمال کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا ہے۔ وہ بھی اب واضح ہو گیا ہے۔ اللہ نے تو تمہارے سب حالات طشت از بام کر دیئے ہیں۔ اب تم چھپ نہیں سکتے ہو، چاہے جو رنگ اختیار کرو۔

قرآن کریم نے ان پر اعتبار نہ کرنے، ان کی جانب سے عدم اطمینان اور ان کے عذرات کو قبول نہ کرنے کا حکم جن الفاظ میں دیا ہے۔

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ (۹: ۹۴) "ہم ہرگز اعتبار نہ کریں گے" اس کا ایک خاص مفہوم ہے 'تصدیق' 'اعتبار' 'اعتماد' اور اطمینان کے لیے ایمان کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل میں رب پر یقین و اعتماد ہو، اور انسانی شعور اس پر مطمئن ہو۔ زبان سے ایمان کا اظہار ہو اور تصدیق و تسلیم اور عقل و ضمیر اس کی تصدیق کر رہی ہو۔ قرآن تعبیرات میں ہمیشہ اس قسم کے اشاراتی مفہوم پائے ہیں۔

اے پیغمبر تم کہہ دو کہ اب عذرات پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب صرف باتوں سے یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اب ضرورت عمل کی ہے۔ اگر تمہارے اعمال نے تمہارے اقوال کی تصدیق کی تو تب معاملہ بنے گا۔ خالی خولی باتیں اب بیکار ہیں۔

وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهٗ (۹ : ۹۴) "اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے طرز عمل کو دیکھے گا" - اور اللہ کی ذات تو ایسی ہے کہ نہ اس سے بندوں کے اعمال پوشیدہ ہیں اور نہ وہ داعیہ پوشیدہ ہے جو ان اعمال کی پشت پر ہے - اور رسول اللہ تمہاری بات کو تمہارے عمل کے ترازو میں پرکھے گا - اب اس اصول کی بنیاد پر اسلامی سوسائٹی تمہارے ساتھ معاملہ کرے گی -

لیکن یاد رکھو کہ تمہارے تمام معاملات صرف اس دنیا ہی میں طے نہیں ہو جاتے - یہاں تو زندگی کا نہایت ہی مختصر حصہ گزرتا ہے - حقیقی اور طویل زندگی اور سزا و جزاء تو آنے والے ہیں جہاں ہر بات کا فیصلہ اللہ کے تیار کیے ہوئے ریکارڈ پر ہو گا۔

ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹ : ۹۴) "پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو" -

غیب کیا ہے، وہ جو انسانی ذرائع ادراک سے ورا ہے، عالم شہادت وہ ہے جس کا انسان علم و ادراک کر سکتا ہے - اس معنی کے اعتبار سے اللہ عالم الغیب بھی ہے اور عالم الشہادہ بھی ہے - مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعتبار سے عالم الشہادہ اور عالم الغیب ہے - ان دونوں کا اللہ کو علم ہے، یہاں جو اللہ نے فرمایا۔

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹ : ۹۴) "وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو" - اس میں بظاہر بتانے کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ خود اپنے اعمال کو تو جانتے ہی تھے لیکن اشارہ یہ ہے کہ تمہارے اعمال کی بابت بہ نسبت تمہارے اللہ کو زیادہ علم ہے - ان کی حقیقت وہ تمہیں بتائے گا۔ انسان کے اعمال کے بعض اسباب و علل ایسے بھی ہیں جو خود صاحب عمل پر بھی عیاں نہیں ہوتے - اور ان کی نسبت اللہ کا علم انسان سے زیادہ ہوتا ہے - پھر انسان کے اعمال کے بعض اثرات اس قدر دور رس ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں خود انسان کو بھی علم نہیں ہوتا لیکن اللہ کو ان کا علم ہوتا ہے - لہٰذا اصل مقصد یہ ہے کہ اس علم و اطلاع کے نتیجے میں تمہارے اعمال کا حساب و کتاب عمل میں آئے گا - اور یہ نہایت ہی سچا حساب و کتاب ہو گا - لیکن یہاں جزاء و سزا کا ذکر نہیں صرف یہ بتا کر آیت خاموش ہو گئی ہے کہ اللہ تم کو اصل صورت حالات بتا دے گا۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹ : ۹۵) "تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرف نظر کرو - تو بے شک تم ان سے صرف نظر ہی کر لو کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہو گی"۔

یہ دوسری پیشگی اطلاع ہے جو اللہ اپنے رسول کو دے رہا ہے کہ جب تم اور تمہارے ساتھی مخلص مومنین صحیح و سلامت مدینہ لوٹو گے جبکہ منافقین کو سو فیصدی یقین تھا کہ رومیوں کے ساتھ مڈبھیڑ کے بعد ان میں سے ایک بھی واپس نہ

ہو گا۔

تو اللہ رسول اللہ کو اطلاع کرتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے عذرات کو مؤکد بنانے کے لیے بیان حلفی دیں گے تاکہ مسلمان ان کے ان برے کرتوتوں سے صرف نظر کرلیں۔اس طرح عفو و درگزر کے نتیجے میں یہ لوگ محاسبے سے بچ جائیں اور ان معاملات سے چشم پوش ہو جائے۔حکم دیا جاتا ہے کہ عملاً تو ان سے منہ موڑلو' لیکن معافی اور درگزر کے طور پر نہیں بلکہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے دور رہو' جس طرح گندگی سے ایک آدمی دور رہتا ہے اور اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ (۹ : ۹۵) "ان سے صرف نظر ہی کرو کیونکہ یہ گندگی ہیں"۔یعنی یہ لوگ بذات خود ہی مجسم گندگی ہیں' اگرچہ ان کا جثہ عطر بیز ہے 'گندہ اور بدبودار نہیں ہے لیکن ان کی حقیقت اور ان کے اعمال اور ان کی روح گندی ہے لیکن ان کے جسم کو گندگی کہہ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ لوگ قابل نفرت ہیں اور حقیر ہیں اور ان سے دور رہنا ہی عین فطرت ہے۔

وہ تحریک جو اسلامی انقلاب کے لیے قائم کی گئی ہو' اس کے وہ کارکن جو جہاد اور قتال اور عملی جدوجہد سے محض اس لیے اپنے آپ کو دور رکھیں کہ وہ کہیں ہلاک نہ ہو جائیں تو یہ لوگ گندگی ہیں۔اس حقیقت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔اس گندگی نے ان کی روح کو گھیر رکھا ہے۔ان کا شعور اور ان کے تصورات گندے ہیں جس طرح ایک گندی مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے' یہی ان کی مثال ہے۔

وَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹ : ۹۵) "ان کا اصلی مقام جہنم ہے جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوگی"۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیچھے رہ کر وہ کمائی کر رہے ہیں اور فائدے میں ہیں اور آرام اور سلامتی اور عافیت میں ہیں اور وہ مالی تاوان سے بھی بچ گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں وہ گندگی ہیں اور آخرت میں جو صلہ ان کو ملے گا وہ حسرت ناک ہو گا کیونکہ یہ بہر رنگ و بہر قدر خسارہ ہو گا۔یہ ہے بات اللہ کی اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ سچا ہو سکتا ہے۔

تمہاری واپسی پر ان بیٹھنے والوں کا طرز عمل کیا ہو گا؟

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (۹ : ۹۶) "یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہو گا"۔

ان کی اسکیم یہ ہے کہ پہلے تو یہ لوگ یہ چاہیں گے کہ مسلمان ان کے اس جرم کو معاف کر کے درگزر کر دیں اور اس کے بعد یہ کوشش کریں گے کہ یہ مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرلیں تاکہ مسلمان ان کے ساتھ اسلامی سوسائٹی میں وہی معاملہ جاری رکھیں جو ان کی ظاہرداری پر اس سے قبل تھا۔اور یہ لوگ ان امکانات کی زد سے بچ جائیں جو اس

سورت میں مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں کہ کفار اور منافقین دونوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور اس طرح سکھوں اور غیر مسلموں کے باہم تعلقات کے لیے یہ آخری شکل طے کر دی گئی یعنی منافقین کو غیر مسلموں میں شامل کر دیا گیا۔

لیکن یہاں یہ تصریح کر دی گئی کہ یہ لوگ اس جہاد سے پیچھے رہ کر فاسق ہو چکے ہیں اور اللہ ایسے فاسقوں سے کبھی راضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ چند بار قسمیں کھائیں اور مسلمانوں کو راضی کرنے کی سعی کریں۔ پس ان کے بارے میں اللہ کا حکم ہی صحیح حکم ہے اور بشمولیت مسلمین اگر تمام دنیا بھی ان سے راضی ہو جائے تو اللہ کے نزدیک ایک کوڑی کے برابر بھی ان کے لیے مفید نہ ہوگی۔ اللہ و رسول اللہ اور مسلمانوں کو راضی کرنے کی واحد سبیل ہے کہ یہ لوگ اس فسق سے ہٹ کر اور تائب ہو کر عمل جہاد میں شرکت کریں اور دین اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بغیر عذر کے جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی حقیقت کو طشت از بام کر دیا۔ اور جماعت مسلمہ سے ان کو دور کر دیا اور مسلمانوں اور منافقوں کے باہمی تعلق کے بارے میں بھی فیصلہ کر دیا جس طرح اس سے قبل مسلمانوں اور مشرکین کے باہم تعلق کی ضابطہ بندی کی گئی تھی یا مسلمانوں اور اہل کتاب کے باہم تعلقات کو منضبط کیا گیا تھا اور اس موضوع پر یہ آخری اور فائنل احکام تھے۔

---ooo---

درس نمبر ۹۳ ایک نظر میں

یہ سبق غزوۂ تبوک سے قبل اسلامی معاشرے کے عناصر ترکیبی سے بحث کرتا ہے۔ نیز اس وقت اسلامی معاشرے میں جس قدر طبقات اہل ایمان شامل تھے۔ ان کی تفصیلات بتاتا ہے اور اس میں اسلامی معاشرے کی عضویاتی تشکیل سے بحث کی گئی ہے۔ مختلف طبقات کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے خدوخال بیان کیے گئے ہیں۔

اس سورت کے آغاز میں ہم نے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ وہ کیا تاریخی اسباب تھے جن کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں اس قسم کے مختلف مزاج کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ یہاں مناسب ہے کہ چند پیراگراف یہاں دوبارہ نقل کر دیئے جائیں تا کہ وہ حالات ذہن کے سامنے آ جائیں جن سے اس وقت اسلامی معاشرہ گزر رہا تھا۔ ”جزیرۃ العرب میں اسلام کے پھیلاؤ کی راہ میں قریش ایک دیوار اور بند کی طرح کھڑے تھے کیونکہ دینی اور دنیاوی معاملات میں قریش کو ایک بڑا مقام حاصل تھا۔ پھر ادبی، ثقافتی اور علمی و اقتصادی اعتبار سے بھی وہ دوسرے عربوں کے لیے قابل تقلید تھے۔ اس وجہ سے ان کا مقابلے پر اتر آنا اور اس دین کی راہ روک دینا اس بات کا باعث ہوا کہ تمام عرب نے اس دین سے منہ پھیر لیا۔ اور اسلام میں داخل نہ ہوئے، یا اگر انہوں نے صرف نظر نہ کیا تو کم از کم یہ صورت حالات ضرور تھی کہ لوگ تردد میں رہے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ انتظار کیا جائے، تاکہ مسلمانوں اور قریش کی کشمکش کا کوئی فیصلہ ہو جائے۔ جب فتح مکہ کے بعد قریش سرنگوں ہوئے تو ہوازن و ثقیف بھی سرنگوں ہو گئے۔ مدینہ میں جو قوی یہودی قبائل تھے، ان کی قوت اس سے پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی۔ بنی قینقاع اور بنو نضیر شام کی طرف جلاوطن ہو گئے۔ بنو قریظہ بھی ختم ہو کر خیبر کا معاملہ بھی صاف ہو گیا تھا۔ ان واقعات کی وجہ سے اب پورے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل گیا اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہونے لگے اور صرف ایک سال کے عرصے میں لوگ دین اسلام میں داخل ہو گئے۔

اسلام کا گراف افقی طور پر بلند ہونے کی وجہ سے وہ کمزوریاں اسلامی صفوں میں در آئیں جو جنگ بدر کی حیران کن کامیابی کی وجہ سے آ گئی تھیں۔ اب یہ کمزوریاں بہت بڑے پیمانے پر تھیں۔ بدر الکبریٰ کے بعد جو کمزور عناصر اسلامی صفوں مین در آئے تھے۔ ان کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قدر پاک و صاف کر دیا گیا کہ بدر الکبریٰ کے بعد فتح مکہ تک سات سالوں میں قریب تھا کہ مدنی معاشرہ تمام کمزوریوں سے پاک ہو جائے اور اہل مدینہ اسلامی انقلاب کے لیے مضبوط بیس اور مضبوط بنیاد بن جائے۔ یہاں اولین، مہاجرین و انصار کی ایک ایسی جمعیت تیار بیٹھی تھی کہ وہ ہر وقت اسلامی نظام کے لیے امین تھی۔ اگر یہ جمعیت نہ ہوتی تو اس عظیم انقلاب کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن بدر الکبریٰ کے بعد اس جمعیت نے جو مہاجرین و انصار کے سابقین اولین پر مشتمل تھی اس عظیم انقلابی امانت کی مسلسل نگہبانی کی۔ ان سات سالوں میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کی اس جمعیت کو اس کام کے لیے تیار کیا اور تربیت دی کہ یہ لوگ فتح عظیم کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے انسانوں کے سیلاب کو کنٹرول کر سکیں۔ اللہ خوب جانتا تھا کہ وہ اپنی اس رسالت اور انقلابی رسالت کی

حفاظت کا کام کس کے سپرد کرے۔

ان کمزوریوں کا سب سے پہلے ظہور یوم حنین میں ہوا۔اس کا تذکرہ سورت توبہ میں ان الفاظ میں ہوا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (۲۵) ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶) ((۹: ۲۵ — ۲۶)) ”اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز۔اس روز تمہیں اپنی کثرت تعداد کا غرور تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اس وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کا جو حق کا انکار کریں“۔

اس جنگ میں ابتدائی شکست کا پہلا سبب یہ تھا کہ دس ہزار اسلامی لشکر میں دو ہزار طلقاء شریک تھے۔یہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے اور اسلامی لشکر کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے تھے۔چنانچہ اسلامی لشکر کے ساتھ ان دوسرے افراد کا وجود بھی اس انتشار کا سبب بنا۔دوسرا سبب یہ تھا کہ ہوازن نے بالکل اچانک حملہ کیا۔اور لشکر اسلام چونکہ صرف مدینہ طیبہ کی حقیقی تربیت یافتہ فوج پر مشتمل نہ تھا' جن کی تربیت گزشتہ سات سالوں میں مکمل ہو چکی تھی اور جو اس تحریک کی اصل اساس اور سرمایہ تھے' اس لیے انتشار پیدا ہو گیا۔

غزوۂ حنین میں جو کمزوریاں سامنے آئیں وہ اسلام کی عددی قوت کے گراف اچانک عمودی بلندی کی وجہ سے تھیں۔جدید لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے' جو ایمان اور اخلاص کے اعتبار سے مختلف درجات کے لوگ تھے۔جن کے درمیان تفاوت درجات تھا اور سورت توبہ میں ان کمزوریوں سے بحث کی گئی ہے اور پھر مختلف زاویوں سے اور مختلف پہلوؤں سے سخت تنقید کی گئی ہے جن کے تفصیلی اقتباسات ہم اس سے قبل دے آئے ہیں“۔

اس اجمال کی تفصیل میں اب ہم آیات کی تشریح کرتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۹۳ تشریح آیات

۹۷ ـــ تا ـــ ۱۱۰

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ
اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ
مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ
مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ ۱۲
سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ع ۱۰

"یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور حکیم و دانا ہے۔ ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں (کہ تم کسی چکر میں پھنسو تو وہ اپنی گردن سے اس نظام کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں جس میں تم نے انہیں کس دیا ہے۔ حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول ؐ کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

یہاں سے بدوی عربوں کی انواع و اقسام پر تبصرہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بدوی عرب مدینہ کے اردگرد سکونت پذیر تھے۔ اسلام لانے سے قبل ان لوگوں نے اسلام کے خلاف ہر کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسلام لانے کے بعد وہ عموماً دو قسم کے تھے جن کا تذکرہ ان آیات میں ہوا ہے۔ یہاں ان دونوں اقسام کے بیان سے قبل ان بدوی لوگوں پر ایک

عمومی تبصرہ ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹: ۹۷) "یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔ اللہ سب کچھ جانتا اور حکیم و دانا ہے"۔

ان عمومی الفاظ میں بدویوں کی تعریف کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بدویت کی صفات کیا ہوتی ہیں' لہٰذا ہر بدوی کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ سخت کافر اور پرلے درجے کے منافق ہوتے ہیں اور ان کے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں وہ زیادہ جاہل اور حدود اللہ سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اور ان تعلیمات سے دور رہتے ہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں۔

یعنی ان کے عدم علم اور ناواقفیت کی اصل وجہ ہی ان کے ظروف و احوال ہیں۔ مشکل حالات میں رہ رہ کر یہ لوگ سخت جان' اجڈ اور دین کے راہ و رسم سے ناواقف رہتے ہیں۔ ان کا تعلق چونکہ ہروقت حسی مادی اشیاء سے ہوتا ہے' اس لیے وہ اعلیٰ اقدار اور اخلاقی اصولوں سے زیادہ مادی اشیاء کو اہمیت دیتے ہیں۔ اگرچہ ایمان ان کے مزاج میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان کی اقدار اور ترجیحات کو بلند کر دیتا ہے اور حسی افق سے ان کو بلند کر کے معنوی آفاق پر ان کی نظریں مرکوز کر دیتا ہے۔

بدویوں کی سنگدلی کے بے شمار واقعات' احادیث و روایات میں نقل ہوئے ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے ان میں اکثر واقعات کو نقل فرمایا ہے۔

○○○

"اعمش نے ابراہیم سے نقل کیا ہے' کہتے ہیں کہ ایک بدوی زید ابن صوحان کے پاس آکر بیٹھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ ان کا ہاتھ جنگ نہاوند میں زخمی ہو گیا تھا۔ تو بدوی نے کہا تمہاری باتیں تو مجھے عجیب لگ رہی ہیں لیکن تمہارا ہاتھ مجھے شبہے میں ڈال رہا ہے تو زید نے کہا تم میرے ہاتھ کی وجہ سے شک میں کیوں پڑ گئے؟ دیکھتے نہیں کہ یہ تو بایاں ہے؟ اس پر بدوی نے کہا: خدا کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں کہ مجرمین کا بایاں ہاتھ کاٹا جاتا ہے یا دایاں۔ اس پر زید ابن صوحان نے فرمایا

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

(۹: ۹۷) "یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کے حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے"۔ امام احمد روایت کرتے ہیں عبدالرحمٰن ابن مہدی سے' سفیان نے' ابوموسیٰ سے' وھب ابن منبہ نے' ابن عباس نے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے' فرماتے ہیں

کہ جو شخص دیہات میں رہائش رکھتا ہے' وہ خشک ہو جاتا ہے اور جو شکار کا پیچھا کرتا ہے وہ غافل ہو جاتا ہے' اور جو بادشاہوں کے ہاں جاتا ہے' فتنے میں پڑتا ہے۔ شدت اور ظلم چونکہ بدوی لوگوں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے بدویوں میں سے کبھی رسول نہیں بھیجا۔ تمام رسول قصبوں اور شہروں سے مبعوث ہوئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (۱۲:۱۰۹)

"اور آپ سے پہلے بھی اہل قریہ میں سے مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا گیا جن کی طرف وحی کی گئی"۔ "ایک بار جب ایک بدوی نے رسول اللہ کو ہدیہ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے جواب میں کئی گنا دیا' چنانچہ وہ راضی ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں کسی قریشی' ثقفی' انصاری اور دوسی کے سوا کسی اور کا ہدیہ قبول نہ کروں" کیونکہ یہ لوگ شہروں میں رہتے تھے یعنی مکہ' طائف' مدینہ اور یمن میں رہتے تھے۔ یہ لوگ نہایت نرم مزاج تھے جبکہ بدوی لوگوں کے مزاج میں درشتی ہوتی ہے۔

امام مسلم نے ابوبکر ابن ابوشیبہ سے اور ابوکریب سے' انہوں نے ابو اسامہ سے اور ابن نمیر سے' ہشام سے' اس کے باپ سے انہوں نے' عائشہ سے' فرماتی ہیں: "بعض دیہاتی حضور ﷺ سے ملاقات کے لیے آئے تو انہوں نے کہا "کیا تم لوگ اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو تو لوگوں نے کہا: "ہاں" تو انہوں نے کہا: "خدا کی قسم ہم تو بوسہ نہیں دیتے" اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "میں کیا کر سکتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دلوں سے شفقت نکال دی ہے"۔

غرض بے شمار روایات میں عرب دیہاتیوں کی درشت مزاجی اور سنگدلی کے واقعات نقل ہوئے ہیں۔ اور بعض واقعات کا تعلق ان واقعات سے ہے جو اسلام کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ صفت بجا طور پر اسلام کے بعد بھی ہو سکتی ہے کہ بعض بدوی کفر میں اور نفاق میں زیادہ شدید ہوں' اور ان کے بارے میں زیادہ امکان اس بات کا ہو کہ وہ حدود اللہ سے لاعلم ہوں' جو رسول اللہ پر نازل ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے پوری زندگی دیہاتوں میں درشتی اور سختی کے ماحول میں گزاری تھی' جس میں وہ دوسروں کو کنٹرول میں رکھتے تھے اور جب کمزور زیر دست ہوتے تھے تو وہ اظہار نفرت میں نفاق اور عیاری سے کام لیتے تھے۔ یہ لوگ چونکہ دین جدید کی راہ و رسم سے واقف نہ تھے اس لیے وہ بسا اوقات حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۹:۹۷) "اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے"۔ اسے اپنے بندوں کے حالات کا اچھی طرح علم ہے۔ ان کی صفات اور ان کے مزاج کا اچھی طرح علم رکھتا ہے۔ اور وہ حکیم دانا ہے' اس نے مختلف لوگوں کو مختلف خصوصیات' صفات اور استعدادات سے نوازا ہے اور اس نے لوگوں کو مختلف نسلوں' جنسوں اور خاندانوں اور اقوام کی شکل میں منقسم کر رکھا ہے۔

بدوی لوگوں کی عمومی صفات کے بیان کے بعد اب اسلامی تحریک اور اسلامی تربیت کے نتیجے میں جو تغیرات ہوئے' اس زاویہ سے ان کے درمیان جو فرق پیدا ہو گیا ہے' اس کی تفصیلات دی جا رہی ہیں۔ بعض دل بہرحال ایسے تھے جن میں حقیقی ایمان داخل ہو گیا تھا' اور بعض ایسے تھے جو ابھی تک اپنی سابقہ حالت پر قائم تھے اور حالت کفر و نفاق ان کے اندر موجود تھی۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹:۹۸) "ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے ہیں (کہ تم کسی چکر میں پھنسو تو وہ اپنی گردن سے اس نظام کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں جس میں تم نے انہیں کس دیا ہے۔ حالانکہ بدی کا چکر خود انہی پر مسلط ہے اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

چونکہ اس سے پہلے کے پورے سبق میں منافقین مدینہ کا ذکر تھا اس لیے یہاں مومنین سے بھی پہلے منافقین کا ذکر کیا گیا تاکہ بدوی منافقین اور مدینہ کے منافقین کا ذکر ایک جگہ ہو جائے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹:۹۸) "اور ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں"۔ اپنے ظاہری اعلان ایمان کی وجہ سے یہ لوگ مجبور ہیں کہ زکوٰۃ ادا کریں اور مسلمانوں کی جنگی مہمات کے لیے مالی امداد دیں کیونکہ اس ظاہرداری کے بغیر وہ اسلامی معاشرے میں پر امن زندگی کے ثمرات سے متمتع نہ ہو سکتے تھے۔ نیز مدینہ میں' چونکہ اسلامی حکومت قائم تھی اور اس کے ساتھ بھی انہیں ہاں میں ہاں ملانا تھی۔ لیکن درحقیقت وہ ان تمام اخراجات کو زبردستی کی چٹی سمجھتے تھے' وہ دل کی خوشی سے یہ اخراجات نہ کرتے تھے کیونکہ ان کو مسلمانوں کی فتح اور نصرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ (۹:۹۸) "اور تمہارے حق میں زمانہ کی گردشوں کا انتظار کر رہے تھے"۔ وہ انتظار کرتے تھے کہ مسلمان کسی چکر میں پھنس جائیں اور ان کو شکست ہو اور ان کے غازی صحیح سلامت واپس نہ لوٹیں"۔

اب یہاں ان کے حق میں اللہ کی جانب سے بددعا آ جاتی ہے۔ اللہ کی جانب سے بددعا کا مفہوم تو یہ ہے کہ بددعا کا مفہوم عملاً ان پر واقعہ ہو جاتا ہے۔

عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ (۹:۹۸) "حالانکہ بدی کا چکر ان پر مسلط ہے"۔ گویا بدی ایک دائرہ ہے جس نے انہیں گھیرے میں لے لیا ہے' اور اس سے وہ کسی طرح بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ مکمل گھیرے میں ہیں۔ یہاں یہ معنی و مفہوم کو مجسم شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ خیالی تجسیم ہے جس کے ذریعے مفہوم زیادہ موثر اور زندہ نظر آتا ہے۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹:۹۸) "اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ یہاں اللہ کی صفات سمع اور علم کو لایا گیا ہے' جو زیر بحث صورت حال میں نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ یہ لوگ دلوں میں خفیہ خواہشات بسائے اور چھپائے ہوئے ہیں کہ کوئی مصیبت مسلمانوں پر نازل ہو' نیز کفر کو چھپا کر ایمان کو ظاہر کر رہے تھے اس لیے اللہ ان کی خفیہ باتوں کو سنتا ہے اور چھپائے ہوئے بھیدوں اور کفر کا علم رکھتا ہے۔ اور دوسرا گروہ جن کے دلوں کے اندر ایمان کی چمک پیدا ہو گئی:

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(۹ : ۹۹) "اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسول ﷺ کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا' یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اللہ پر ایمان اور جزائے یوم آخرت کی امیدواری کی وجہ سے یہ لوگ خرچ کرتے ہیں' عوام الناس کے خوف کی وجہ سے نہیں اور نہ اہل اقتدار کو خوش کرنے کے لیے۔ نہ ان لوگوں کے پیش نظر دنیا کا سود و زیاں ہے۔ بلکہ یہ فریق اللہ اور یوم آخرت پر پختہ ایمان رکھتا ہے اور جو کچھ خرچ کرتا ہے محض رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اور اس بات کا طلبگار ہے کہ رسول خدا ان کے حق میں دعائے خیر کر دیں اور حضور ﷺ کسی کے لیے تب ہی دعا کرتے ہیں جب وہ کسی سے راضی ہوں اور جب آپ ﷺ کسی کے لیے دعا کر دیں تو یقینی ہے کہ وہ شخص مفہوم دعا کو پا گیا۔ کیونکہ حضور ﷺ کی دعا ہی ان کے ایمان' بعد' ایمان بالآخرت اور طلب رضائے الٰہی اور خلوص کی گارنٹی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فوراً اعلان کر دیا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی یہ سعی مشکور ہوئی۔

اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ (۹ : ۹۹) "بے شک' وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے"۔ اور ساتھ ہی اعلان ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ مقصد کو پا گئے۔

سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ (۹ : ۹۹) "اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا"۔ یہاں قرآن کریم اللہ کی رحمت کو بھی مجسم شکل میں پیش کرتا ہے کہ وہ گویا ایک محل ہو گا جس میں یہ لوگ داخل ہو جائیں گے' جس طرح اس سے قبل فریق مخالف کے ان منافقین اور کفار کے لیے مصیبت کو ایک دائرے کی شکل میں مجسم کر کے انہیں اس میں گھیرے ہوئے دکھایا تھا' جو مسلمانوں کے لیے دل میں کینہ رکھتے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۹ : ۹۹) "یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔ وہ توبہ بھی قبول کرتا ہے' نفقہ بھی قبول کرتا ہے' اور جو تقصیرات اسلام کی راہ میں ہو گئی ہوں ان کو بھی معاف کرتا ہے اور جو رحمت کا طلبگار ہے' اسے مایوس نہیں کرتا۔

○○○

بدوی معاشرے کے اس تجزیے کے بعد اب اگلی آیات میں اس وقت کے پورے اسلامی معاشرے کی پوزیشن کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس وقت اسلامی سوسائٹی میں چار طبقات تھے۔ انصار و مہاجرین کے سابقین اولین مسلمان اور وہ لوگ جو صحیح معنوں میں ان کے تبع تھے۔ دوسرے وہ منافقین جو مدینہ کے باشندوں میں سے بھی تھے

اور مدینہ کی اردگرد کی آبادیوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے اور عمل نفاق میں خوب طاق ہو گئے تھے، تیسرے وہ لوگ تھے جن کے کچھ کام اچھے تھے اور کچھ برے تھے اور چہارم وہ تھے جن کے بارے اللہ نے اپنا فیصلہ محفوظ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کا انتظار تھا۔

پہلا گروہ:۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

"وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے"۔

دوسرا گروہ:۔

وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ؕۛ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ؔۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

"تمہارے گردوپیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دوہری سزا دیں گے، پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے"۔

تیسرا گروہ:۔

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ

سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ
مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ
صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ
يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ
وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے' کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے نبی ﷺ تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہو گی' اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے؟ اور اے نبی ﷺ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو' اللہ اور اس کا رسول ﷺ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے' پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

چوتھا گروہ :-

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

"کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے' چاہے انہیں سزا دے اور چاہے ان پر از سرنو مہربان ہو جائے۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے"۔

بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ اس وقت کے اسلامی معاشرے کے عناصر ترکیبی پر یہ تبصرہ تبوک کی واپسی کے بعد اور

لوگوں کے عذرات سننے کے بعد نازل ہوا۔ یہ عذرات ان منافقین نے بھی پیش کیے تھے جو اس غزوے کے باوجود تاکیدی حکم کے پیچھے رہ گئے تھے اور بعض مخلص مومنین نے بھی پیش کیے تھے۔ ان میں بعض لوگ وہ تھے جنہوں نے سچے عذرات پیش کیے، بعض نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستون سے باندھ لیا تھا اور وہ اس وقت تک بندھے رہنے پر مصر تھے جب تک رسول اللہ انہیں نہیں کھولتے۔ اور بعض ایسے تھے جنہوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا تھا اور امید رکھتے تھے کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا۔ اور یہ وہ تین افراد تھے جو پیچھے رہ گئے تھے تو ان کے بارے میں حضورؐ نے کوئی فیصلہ ہی نہ فرمایا تھا، یہاں تک کہ ان کے بارے میں اللہ نے معافی نازل کر دی اور ان کی توبہ قبول کر لی۔ جیسا کہ عنقریب ان کے بارے میں تفصیلات آ جائیں گی۔ یہ لوگ اس وقت تحریک اسلامی میں شامل ہونے والے مختلف اصناف میں سے تھے اور غزوۂ تبوک کے مابعد یہ سب قسم کے لوگ اسلامی صفوں میں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت کی تحریکی صفوں سے اچھی طرح آگاہ فرما رہے تھے کہ اسلامی تحریک کے شب و روز کیا ہیں اور تحریک اسلامی کے اس پہلے مرحلے کے اختتام پر یعنی جزیرۃ العرب میں تکمیل انقلاب کے اختتام پر اور عالمی انقلاب کے مرحلے کے آغاز کے موقعہ پر آپ کو بتایا جا رہا تھا کہ اگلے مرحلے میں کام کے لوگ کون ہوں گے تاکہ اسلامی تحریک ان کو لے کر عالمی سطح پر اللہ وحدہ کی بندگی کا نظام قائم کر دے اور اس طرح تمام کرۂ ارض پر ہر انسان کو کسی بھی انسان کی غلامی سے آزاد کر دے اور زمین پر کوئی انسان بھی کسی طرح کسی دوسرے انسان کا غلام نہ رہے۔

تحریک اسلامی کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ اسے کس گراؤنڈ پر کھیلنا ہے۔ ہر مرحلے اور ہر قدم پر اسے کیا کرنا ہے۔ اور یہ معلومات اس کے لیے ضروری تھیں تاکہ لوگ یہ جان سکیں کہ ان کی پوزیشن کیا ہے اور اگلے مرحلے کے لیے اس نے کیا اقدامات کرنے ہیں؟

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹: ۱۰۰) ”وہ مہاجر و انصار جنہوں نے سب سے پہلے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی، نیز وہ جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم الشان کامیابی ہے“۔

مسلمانوں کا یہ طبقہ جو تین عناصر پر مشتمل تھا، سابقون اولون از مہاجرین، سابقون اولین از انصار اور وہ لوگ جو ان کے بعد راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، یہ تین طبقات اس وقت کی تحریک اسلامی کی ریڑھ کی ہڈی تھے اور فتح مکہ کے بعد جزیرۃ العرب میں یہی لوگ حقیقی حاملین دعوت تھے۔ دسویں پارے میں اس سورت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے اس کی تفصیلات دے دی ہیں۔ غرض یہی لوگ تھے جنہوں نے اس دعوت کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس سوسائٹی پر ان کو پورا کنٹرول حاصل تھا۔ اور یہی لوگ ہر اچھی حالت اور ہر بری حالت میں اس سوسائٹی کو تھامے ہوئے تھے اور یہ بات ہر تحریک کو

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مشکلات کی آزمائشیں بمقابلہ خوشحالی اور فتح کی آزمائش کے بہت ہی آسان ہوتی ہیں۔

مہاجرین میں سے سابقون اولون کون لوگ ہیں؟ ہماری رائے میں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدر سے قبل ہجرت فرمائی۔ اسی طرح انصار سے سابقون اولون وہ لوگ ہیں جو جنگ بدر سے قبل ایمان لائے' رہے وہ لوگ جو ان کے بعد راست بازی کے ساتھ ایمان لائے' وہ وہی لوگ ہیں جو غزوۂ تبوک کی آزمائش میں پورے اترے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلامی نظام زندگی اختیار کیا' پوری طرح ایمان لائے اور اس کے بعد ایمانی تقاضے پورے کیے۔ اور اعلیٰ ایمانی معیار تک پہنچ گئے۔ اگرچہ ان پر ان لوگوں کو سبقت حاصل ہے جنہوں نے نہایت ہی شدید حالات میں اسلام کے دامن کو تھاما۔

روایات اس بارے میں مختلف ہیں کہ انصار اور مہاجرین میں سے سابقون اولون کون ہیں؟ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدر سے قبل ہجرت کی اور نصرت کی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دو قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اہل بدر ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ سے قبل ہجرت کی اور نصرت کی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بیعت رضوان والے ہیں۔ ہماری رائے وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور اس رائے کو ہم نے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے مختلف مراحل اور اہل ایمان کے مختلف طبقات کی تشکیل کے مراحل کے گہرے مطالعے کے بعد قائم کیا ہے۔ واللہ اعلم!

بہتر ہو گا کہ ہم یہاں دسویں پارے سے چند فقرے نقل کر دیں جو ہم نے وہاں اسلامی معاشرے کی تشکیل اور اس کے اندر اہل ایمان کے مراتب کے تعین کے بارے میں وہاں لکھے تھے تاکہ قارئین کے ذہن میں وہ نکات دوبارہ تازہ ہو جائیں اور اسے دوبارہ پارۂ دہم کی ورق گردانی نہ کرنی پڑے۔ اور ان نکات کی روشنی میں قارئین اسلامی معاشرے کی طبقاتی تقسیم (Classification) کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ یہ اسلامی معاشرے کی آخری تقسیم تھی کیونکہ زیر بحث آیات قرآن کریم کی آخری دور کی آیات ہیں۔

○○○

"تحریک اسلامی مکہ مکرمہ میں نہایت ہی شدید حالات میں ابھری' اس کا مقابلہ قریش کے جاہلی نظام اور جاہلی معاشرے سے تھا۔ تحریک اسلامی کا کلمہ دعوت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو قریش کے اس جاہلی معاشرے نے اپنے لیے ایک خطرہ سمجھا' اس لیے کہ یہ کلمہ در حقیقت ان تمام معاشروں اور ان کے اقتدار اعلیٰ کے لیے ایک گونہ بغاوت کا اعلان تھا جن کا اقتدار اعلیٰ اللہ کے اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی حکومت سے ماخوذ نہ تھا۔ یہ کلمہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ کلمہ گو نے تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے اور وہ صرف اللہ کی حکومت اور اقتدار کا وفادار ہے۔ پھر قریش کے جاہلی معاشرے نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ یہ نئی دعوت ایک نئی قیادت' قیادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت ایک منظم تحریک کی شکل میں ابھر رہی ہے اور اس نئی تحریک کا شعار پہلے دن سے تھا کہ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کی جائے اور قریش کی جاہلی اور سرکش اور ظالم قیادت کی اطاعت کا انکار کر دیا جائے"۔

"جونہی قریش نے درج بالا خطرہ محسوس کیا کہ موجودہ نظام' اس کے مفادات اور اصولوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو اس جاہلی معاشرے نے تحریک اسلامی کے افراد کے خلاف تشدد اور ظلم کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے ایک جدید تحریک اور اس جدید سوسائٹی اور اس جدید قیادت کے خلاف وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے جو ان کے بس میں

تھے۔ جن میں ایذا رسانی، سازشیں اوچھے ہتھیار اور فتنہ پردازیاں سب کچھ شامل تھے"۔

"قریش کا جاہلی معاشرہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا دفاع شروع کر دیا اور اس معاشرے نے بعینہ اسی طرح اپنا بچاؤ شروع کر دیا جس طرح ایک زندہ انسان اپنے آپ کو موت کے خطرات سے بچانا چاہتا ہے اور قریش میں اس جاہلی معاشرے کا ردعمل بالکل فطری تھا، اور جب بھی کوئی دعوت لوگوں کو صرف رب العالمین کی بندگی، ربوبیت اور اقتدار اعلیٰ کی طرف بلانا شروع کرتی ہے، اس وقت کی قائم جاہلی سوسائٹی کا ردعمل ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ جاہلی سوسائٹی میں انسان، انسانوں کے غلام ہوتے ہیں اور اسلامی دعوت صرف رب العالمین کی بندگی کی طرف ہوتی ہے۔ جب بھی دعوت اسلامی ایک عضویاتی تحریک کی شکل میں اٹھے گی جاہلیت اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوگی جس طرح نقیض نقیض کے مقابلے میں ہوتا ہے"۔

اور اس قسم کی تحریک کا ہر کارکن جاہلی معاشرے کی زد میں آجاتا ہے اور اسے ہر قسم کے فتنوں اور مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور بسا اوقات اس تشدد کے نتیجے میں کارکنوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے، جب ایسے حالات ہوتے ہیں تو تحریک اسلامی کی صفوں میں آکر شہادت حق دینے والے صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اللہ کی راہ میں جان تک کا نذرانہ پیش کریں گے۔ اس دعوت اور تحریک اور اس جدید سوسائٹی کی رکنیت ایسے سرفروش ہی اختیار کرتے ہیں جو اذیت، فتنہ سامانیوں، بھوک، افلاس اور شدائد و مصائب برداشت کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات انہیں قید و بند اور موت کے لیے بھی تیار ہونا ہوتا ہے"۔

مکہ مکرمہ کے عربی معاشرے میں ایسے ہی مضبوط، طاقتور اور اولوالعزم لوگ اسلامی قیادت کی بنیاد بنے۔ وہ لوگ جو مشکلات برداشت کر کے اور شدائد و مصائب انگیز نہ کر کے تحریک میں فوج در فوج داخل ہو گئے تھے۔ وہ دوبارہ جاہلیت کی طرف مرتد ہو کر لوٹ گئے تھے۔ یہ اولوالعزم لوگ تعداد میں بہت ہی کم تھے۔ اور یہ بات بالکل معروف اور کھلی ہے۔ اس لیے کہ ابتدا جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام کی مشکل اور پرخطر راہ کو اپنانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ ماسوائے ان ممتاز اور مختار اور برگزیدہ لوگوں کے جن کو اس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا"۔

سابقین مہاجرین ایسے ہی لوگوں میں سے تھے جو نادرۂ روزگار تھے اور یہ اس دین کا بنیادی اثاثہ تھے اور مضبوط بنیاد تھے اور انہوں نے ابتدائی دور میں لبیک کہا۔ یہی لوگ جب مدینہ پہنچے تو یہ اس تحریک کے روح رواں اور دین کے مرکزی ستون تھے۔ ان کے ساتھ مدینہ میں انصار میں سے ایسے ہی اولوالعزم افراد مل گئے۔ ان لوگوں نے اگرچہ وہ مشکلات برداشت نہ کی تھیں جو مہاجرین نے کیں لیکن ان لوگوں نے چونکہ نہایت ہی مشکل حالات میں عقبہ کے مقام پر حضورﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اس لیے یہ لوگ بھی پاک طینت اور اصلی مزاج کے لوگ تھے اور ان کے اندر وہ بنیادی اوصاف موجود تھے جو اس دین کے حاملین اولین میں ضروری تھے۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں کہتے ہیں: "محمد ابن کعب قرظی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے بیعت عقبہ کے موقعہ پر حضور اکرمﷺ سے کہا: آپ اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو شرط ہم پر عائد کرنا چاہیں، عائد کر دیں۔ تو اس پر حضورﷺ نے فرمایا میں رب کے لیے تو یہ شرائط عائد کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور اپنے لیے یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم میری مدافعت اس طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی مدافعت کرتے ہو۔ اس پر لوگوں نے کہا اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے لیے کیا اجر ہو گا؟ تو حضورﷺ نے فرمایا "الجنۃ" تو انہوں نے کہا یہ بہت ہی اچھا سودا ہے، نہ ہم اقالہ

کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اقالہ کرے"۔

"یہ لوگ جو حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے' یہ جنت کے علاوہ اور کچھ نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑے وثوق کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ نہ تو وہ اس سودے کو واپس کریں گے اور نہ ہی فریق دوئم کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ اس سودے کو لوٹا دیں۔ اور یہ جانتے تھے کہ یہ بیعت کوئی معمولی بیعت نہ تھی' وہ جانتے تھے کہ اب قریش ان کے پیچھے پڑیں گے۔ اور نہ صرف قریش بلکہ تمام عرب ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور وہ اب جاہلیت کے ساتھ مل کر پر سکون زندگی بسر نہ کر سکیں گے جو ان کے ارد گرد خیمہ زن ہے۔ اور جزیرۃ العرب اور مدینہ کے اطراف اکناف پر حکمران ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ انصار کو یہ علم تھا اور یہ یقینی علم تھا کہ اس بیعت کے نتائج کیا ہوں گے اور انہوں نے یہ بات بھی اچھی طرح جان لی تھی کہ حضورؐ نے ان کے ساتھ اس دنیا کے اندر کسی اجر و صلہ کا وعدہ نہیں فرمایا' یہاں تک کہ حضورؐ نے ان کے ساتھ یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ تمہیں اس دنیا میں اس مقصد میں کامیابی نصیب ہوگی ماسوائے جنت کے' ان کے ساتھ کوئی اور وعدہ نہ تھا۔ یہ تھی ان کے فہم دین کی انتہا اور یہ تھی ان کی چاہت جو وہ اس دین کے ساتھ رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ سابقون اولون کے مقام بلند پر فائز ہوئے اور یہ لوگ مہاجرین کے اولین ساتھیوں میں قرار پائے جنہوں نے تعمیر دین کی بنیادوں میں حصہ لیا اور اس عمارت کو تیار کیا۔ یہ لوگ مدینہ کی سوسائٹی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے"۔

لیکن مدینہ کا معاشرہ اور جماعت اسی طرح مخلص اور صاف رہی۔ اسلام کا ظہور مدینہ سے ہوا۔ وہ اس کے اندر دور تک پھیل گیا اور بہت سے لوگ خصوصاً ان میں سے صاحب مرتبہ اور سربراہ قسم کے لوگوں نے بھی اپنی قوم کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا تاکہ ان کی لیڈر شپ قائم رہے۔ جب جنگ بدر کا عظیم واقعہ پیش آگیا تو اس قسم کے لوگوں کے سرخیل عبداللہ ابن ابی ابن سلول نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ یہ معاملہ تو اب بہت آگے نکل گیا ہے اس لیے اس نے نفاق کے طور پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ بات ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو اسلام کا سیلاب بہا کر لے گیا اور انہوں نے دوسروں کی تقلید میں اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ یہ مقلد قسم کے لوگ منافق نہ تھے لیکن ان لوگوں نے اسلام کو ابھی تک اچھی طرح نہ سمجھا تھا اور نہ وہ اسلامی قالب میں اچھی طرح ڈھل گئے تھے' اس کی وجہ سے مدینہ کی اسلامی سوسائٹی میں افرا تفری تھی کیونکہ مختلف لوگ ایمان کے مختلف درجات پر فائز تھے۔

قرآن کریم نے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اس قسم کے لوگوں کی تربیت شروع کی۔ چونکہ ایمان و اخلاق کے مختلف درجات کے لوگ اس سوسائٹی میں داخل ہوگئے تھے' اس لیے ضروری تھا کہ ان مختلف عناصر کے اندر توازن اور توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جائے اور جدید سوسائٹی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔

"جب ہم مدنی سورتوں کا مطالعہ ترتیب نزولی کے مطابق کریں (اگرچہ یہ ترتیب اندازاً معلوم ہے) تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے' اسلامی معاشرے میں مسلسل داخل ہونے والے جدید عناصر کی ترتیب اور تطہیر کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رکھی' کیونکہ آنے والے لوگ مختلف خاندانوں اور مزاجوں کے تھے اور مسلسل آ رہے تھے۔ اگرچہ قریش لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے تھے اور تمام عرب قبائل کو وہ اس دین کے خلاف آمدہ جنگ کرتے تھے۔ اسی طرح یہودی بھی اس دین کی راہ میں رکاوٹ تھے اور وہ بھی رات دن لگے ہوئے تھے کہ تمام اقوام اس دین جدید پر حملہ آور

ہوں اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں ۔ اس لیے جدید آنے والے لوگوں کی تربیت کی بہت ضرورت تھی"۔ "تربیت اور تطہیر کی اس مسلسل جدوجہد کے باوجود کبھی کبھار خصوصاً مشکل اور شدید وقت میں' اسلامی صفوں میں کمزوریوں کا ظہور ہو جاتا تھا۔ بعض گوشوں میں نفاق ابھرتا' بعض میں تردد اور غیر یقینی صورت حال ہوتی' بعض لوگ دین جدید کی راہ میں مال خرچ کرنے میں بخل کرتے' بعض لوگ خطرات کا سامنا کرنے سے ڈرتے ۔ بعض اوقات لوگ یہ نہ سمجھ سکتے کہ ان کے مابین اسلامی رابطے اور تعلق کا کیا مقام ہے اور ان کی سابقہ جاہلی رشتہ داریوں اور روابط کی حیثیت اب کیا ہے؟ وہ اسلامی بھائی چارے کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے ۔ اس سورت کی آیات سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ مختلف طریقوں سے اور مختلف زاویوں سے ایسے لوگوں کی تربیت کس طرح کرتی ہیں اور اس کے لیے کیا کیا اسلوب اختیار کرتی ہیں ۔ ان آیات میں سے ہم بعض آیات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں"۔

"لیکن مدینہ طیبہ میں مسلم معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ درست تھا' اس لیے کہ اس ڈھانچے میں بنیادی اہمیت صرف ان لوگوں کو حاصل تھی جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین تھے اور جو نہایت ہی مضبوط لوگ تھے ۔ نیز اس معاشرے کی تعمیر و تربیت میں اتحاد و اتفاق اور اس کے ڈھانچے میں اس قدر پختگی تھی کہ اس نے ان کمزوریوں اور عوارض اور انتشار پر قابو پالیا تھا اور وہ عناصر جو خوف اور پریشانی سے متاثر ہو جاتے تھے اور جن کی ابھی تک پوری تربیت نہ ہوئی تھی اور وہ اس جدید معاشرے میں ابھی تک ڈھل نہ گئے اور ان کے اندر پوری ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی تھی ۔ ان کو بھی اجتماعی معاشرتی نظام سنبھالا دیتا تھا"۔

"بہرحال آہستہ آہستہ یہ جدید عناصر تربیت پا رہے تھے' اس معاشرے میں ڈھل رہے تھے اور ان کی تطہیر مسلسل ہو رہی تھی اور وہ اسلامی معاشرے کی اصل قوت کے ساتھ ملتے رہتے تھے اور ضعیف القلب' نافرمانی کرنے والوں اور ڈھل مل یقین قسم کے لوگوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی تھی ۔ مفادات سے ڈرنے والے اور ایسے لوگ جن کے دلوں میں ابھی تک اسلامی نظریہ حیات پوری طرح نہ بیٹھا تھا کہ وہ اپنے سوشل روابط بھی اسی نظریہ کی اساس پر استوار کریں ۔ یہاں تک کہ فتح مکہ سے پہلے حالت یہ ہوگئی تھی کہ اسلامی معاشرے تعلیم و تربیت اور اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے مقام کمال کے قریب پہنچ گیا تھا اور اکثر لوگ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کے نقش قدم پر چل پڑے تھے اور یہ معاشرہ اس قدر پاک اور تربیت یافتہ ہو گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام حیات کے پیش نظر مطلوبہ معیار کے قریب تر تھا"۔

"یہ بات درست ہے کہ ابھی تک اس معاشرے میں ایسی قدریں نشو و نما پا چکی تھیں کہ جن کا تعلق براہ راست اسلامی نظریات کے ساتھ تھا ۔ ان اقدار کی وجہ سے تحریک کے اندر کچھ لوگ زیادہ ممتاز تھے اور زیادہ ثابت قدم تھے اور تحریک کی صفوں میں آگئے تھے ۔ مثلاً مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین' اہل بدر حدیبیہ میں بیعت رضوان کرنے والے ۔ پھر جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل جہاد انفاق اور قتال میں حصہ لیا اور جنہوں نے بعد میں لیا ۔ نصوص کتاب اللہ' احادیث نبوی اور تحریک کے بعض عملی اقدامات سے یہ تفاوت مراتب اور اقدار کا ثبوت ملتا ہے ۔ یہ اسلامی اقدار اور یہ درجات اسلامی نظریہ حیات کو آگے بڑھانے کے نقطہ نظر سے متعین ہوئے"۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ انصار و مہاجرین میں سے جو لوگ سابقون اولون تھے ان کے ایمانی معیار اور ان کی تحریکی آزمائشوں نے انہیں کس مقام بلند تک پہنچایا اور اس سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہو ۔

جاتا ہے کہ تعمیر اسلام اور عملاً اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں صحابہ کرام کا کردار پوری انسانی تاریخ میں کس قدر اہم ہے اور مبنی بر حقیقت ہے۔ اور اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) کا حقیقی مفہوم کیا۔

اللہ ان سے راضی ہوا اور اللہ کی رضا کا نتیجہ ہوتا ہے اللہ کی طرف اجر و ثواب۔ اللہ کی رضامندی بذات خود بھی بڑا انعام ہے۔ اور لوگوں کی طرف سے اللہ سے راضی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ سے مطمئن ہوتے ہیں، اللہ کے فیصلوں پر راضی ہوتے ہیں اور اللہ کے فیصلوں کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں۔ اور اللہ نے انہیں جو انعامات دیئے ہیں ان پر وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اگر اللہ کی جانب سے ان پر کوئی آزمائش آجائے تو اس پر صبر کرتے ہیں۔ لیکن یہاں جن الفاظ اور جس انداز میں رضامندی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مختار زمانہ گروہ اور ذات باری کے درمیان ایک عمومی 'گہری' دو طرفہ' وسیع الاطراف اور دونوں جوانب سے رضامندی کا تبادلہ ہو گا' اور اللہ تعالیٰ نے اس برگزیدہ گروہ کو یہ مقام عطا فرمایا ہے کہ وہ بھی اس قابل ہو گئے کہ وہ اللہ سے راضی ہوں حالانکہ اللہ رب اور حاکم ہے اور یہ لوگ اس کی مخلوق اور بندے ہیں۔ فریقین کے درمیان یہ تعلق اس قدر گہرا اور اس قدر شاندار ہے کہ انسانی الفاظ میں اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ صحابہ کرام کی یہ شان نصوص قرآنی کے بین السطور سے صرف اس شخص کے سامنے کھلتی ہے جو روحانی تڑپ رکھتا ہو اور جس کا سینہ معانی قرآن کے لیے کھلا ہو اور جس کا حس اور شعور عالم بالا کے ساتھ جڑا ہوا ہو۔

یہ ہے ان کا دائمی اور مخصوص تعلق اپنے رب کے ساتھ کہ وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ ان سے راضی ہو گیا۔
اس رضامندی کی علامت کیا ہے؟ یہ کہ!

وَاَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

(۹: ۱۰۰) "ان کے لیے ایسے باغات مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی عظیم الشان کامیابی ہے"۔

○○○

یہ تو ہے ایک معیار اور اس کے مقابلے میں دوسری سطح کے لوگ بھی ہیں:

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ (۹: ۱۰۱)

"تمہارے گردوپیش جو بدوی رہتے ہیں ان میں بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی منافق موجود ہیں جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے' ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دوہری سزا دیں گے' پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے"۔

اس سے قبل منافقین کے بارے میں عمومی بات ہو چکی ہے اور ان کے احوال کا انکشاف کر دیا گیا ہے۔ ان کا تعلق اہل مدینہ سے بھی تھا اور اہل مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے بدوی منافقین سے بھی تھا۔ یہاں منافقین کی ایک خاص صنف کا تذکرہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہنر نفاق میں طاق ہوگئے ہیں اور اس آرٹ میں انہوں نے بہت ہی اچھا تجربہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ عمل نفاق میں ڈوب چکے ہیں اور وہ اس قدر فنکار بن گئے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیغمبرانہ بصیرت کے باوجود ان کو نہیں پہچان سکے حالانکہ آپ نے اس دور تک ان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں اور تجربات کے ایک طویل دور سے گزر چکے تھے۔

اللہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے منافقین اہل مدینہ اور اردگرد کی آبادی میں اب بھی موجود ہیں۔ اس قسم کے منافقین کی سازشوں اور نیش زنیوں سے حضورؐ اور اہل ایمان مطمئن ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف حضورؐ کو فرماتے ہیں کہ آپ کے علم میں ان کی ریشہ دوانیاں نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو بھی سخت تنبیہہ کر دی جاتی ہے کہ وہ اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ ان کی مکاری اور ہوشیاری اور شاطرانہ چالیں اللہ کے مقابلے میں کارگر نہیں' اللہ ان کو اس دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل و خوار کرے گا جبکہ آخرت میں ان کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ

(۹ : ۱۰۱) "تم انہیں نہیں جانتے' ہم ان کو جانتے ہیں۔ قریب ہے وہ وقت جب ہم ان کو دو ہری سزا دیں گے' پھر وہ زیادہ بڑی سزا کے لیے واپس لائے جائیں گے"۔ دنیا میں ان کو دوگنا عذاب دیا جائے گا؟ قریب الفہم مفہوم یہ ہے کہ ایک تو ان کو اس بات پر سخت قلق ہو گا کہ اسلامی سوسائٹی میں ان کی شاطرانہ چالوں کے باوجود ان کی حقیقت لوگوں پر واضح کر دی گئی اور دوسرا عذاب یہ کہ ان کو موت اس حالت میں آئے گی کہ ان کی روح کو سختی سے قبض کیا جائے گا اور قبض روح کی حالت میں ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر ضربات رسید کی جائیں گی یا یہ عذاب کہ وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ مسلمانوں کو فتح پر فتح نصیب ہو رہی ہے اور وہ دل ہی دل میں جلتے ہیں اور دوسرا عذاب یہ کہ یہ لوگ ہر وقت اس ڈر میں رہتے ہیں کہ ان کی حالت کا انکشاف مسلمانوں پر نہ ہو جائے اور یہ کہ وہ عمل جہاد کا نشانہ نہ بن جائیں۔

یہ تو تھے دو انتہائی معیار اور ان کے درمیان کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بین بین ہیں ۔ ان میں سے پہلا گروہ یہ ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۰۲) خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۰۳) اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

(۱۰۴) وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۰۵) (۹: ۱۰۲ — ۱۰۵)

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے' کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔ بعید نہیں کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے نبیؐ' تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی' اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے؟ اور اے نبیؐ' ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو' اللہ اور اس کا رسولؐ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے' پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

اور اللہ نے اس گروہ کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک متعین سلوک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ چند متعین افراد پر مشتمل تھا اور یہ لوگ حضورؐ کے علم میں تھے۔

بعض روایات مین آتا ہے کہ یہ آیات چند متعین افراد کے بارے میں نازل ہوئیں۔ یہ لوگ غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ پھر انہوں نے محسوس کیا کہ انہوں نے تو گناہ کا ارتکاب کر لیا ہے اور ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا رہا۔ انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ ان کو امید تھی کہ ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی۔ انہوں نے جنگ میں شرکت اختیار نہ کی اور یہ ان کی جانب سے سخت کوتاہی تھی۔ لیکن انہوں نے گناہ کا اعتراف کیا۔ سچی توبہ کی اور ندامت کا اظہار کیا تو یہ ان کی جانب سے اچھا طرز عمل تھا۔

ابو جعفر ابن جریر طبری کہتے ہیں مجھے حسین ابن الفرج کے ذریعے معلوم ہوا کہ انہوں نے ابو معاذ' انہوں نے عبیداللہ ابن سلام سے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے ضحاک سے سنا جو کہتے تھے کہ آیت:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا (۹: ۱۰۲) ابولبابہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ رسول اللہ سے غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ جب حضورؐ واپس آئے اور آپ مدینہ کے قریب پہنچ گئے تو انہیں اپنی پسماندگی پر سخت ندامت ہوئی کہ ہم لوگ چھاؤں اور کھانے پینے میں آرام سے رہے اور اپنی بیویوں کے پاس رہے اور اللہ کے نبی جہاد میں تکلیف برداشت کرتے رہے۔ خدا کی قسم ہم لوگ اپنے آپ کو ستونوں سے باندھیں گے اور ہم اپنے آپ کو اس وقت تک نہ کھولیں گے جب تک رسول اللہ ہمیں نہ کھولیں اور ہمارا عذر قبول نہ کریں۔ تین اشخاص ایسے رہ گئے جنہوں نے اپنے آپ کو ستونوں سے نہ باندھا۔ جب حضورؐ اس غزوہ سے واپس آئے تو آپ مسجد میں تشریف لائے اور آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ اکثر مسجد میں تشریف لاتے۔ آپ نے جب دیکھا تو پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ ابولبابہ اور ان کے ساتھی ہیں۔ آپ سے پیچھے رہ گئے ہیں اور

اب انہوں نے اپنے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے جو آپ دیکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت تک نہ کھولیں گے جب تک آپ ان کو نہ کھولیں گے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ میں ان کو اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک مجھے ان کے کھولنے کا حکم نہ دیا جائے اور میں ان کی معذرت اس وقت تک قبول نہ کروں گا جب تک اللہ ان کی معذرت قبول نہیں کرتا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ غزا کرنے کے مقابلے اپنی جانوں کو ترجیح دی ہے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ (۹:۱۰۲) اور عسی کا فاعل جب اللہ ہو تو وہ فعل گویا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبیؐ نے انہیں کھول دیا۔

بعض دوسری روایات بھی وارد ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ صرف ابولبابہ کے بارے میں ہے کہ جب غزوہ بنی قریظہ میں انہوں نے اشارتاً بنو قریظہ کو بتا دیا تھا کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ انہوں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کر کے یہ کہا تھا کہ تمہارے بارے میں 'تمہارے قتل کا فیصلہ ہونے والا ہے لیکن یہ نہایت مستبعد روایت ہے اس لیے کہ ان آیات کا تعلق بنی قریظہ سے کیسے ہو سکتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے یہ اعراب اور بدویوں کے بارے میں ہو سکتا ہو۔ ان سب روایات کے نقل کرنے کے بعد ابن جریر نے یہ تبصرہ کیا ہے:

"ان سب اقوال میں سے بہتر قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنے اس قصور کا برملا اعتراف کر لیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مہم سے پیچھے رہ کر انہوں نے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ انہوں نے رسول اللہ کی معیت میں فریضہ جہاد ادا کرنے میں کوتاہی کی اور حضورؐ رومیوں کے مقابلے میں ان کے سوا نکلے۔ یہ قصور ایک جماعت سے ہوا تھا' جن میں ابولبابہ بھی شامل تھا"۔

"ہم نے جو رائے اختیار کی ہے وہ اقرب الی الصواب بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ (۹:۱۰۲) "کچھ دوسرے لوگ وہ تھے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا تھا"۔ گویا کوتاہیوں کا اعتراف کرنے والی ایک جماعت تھی۔ ابولبابہ کے سوا کوئی ایک شخص نہ تھا جس نے اعتراف قصور کرتے ہوئے اپنے آپ کو حصار میں بعینہ ستون کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ جب حقیقت یہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ (۹:۱۰۲) کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ متخلفین ایک جماعت تھے۔ صرف ایک شخص نہ تھا۔ نیز مورخین' محدثین اور مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف غزوۂ تبوک کے متخلفین نے اپنے آپ کو ستونوں کے ساتھ باندھا تھا اور ان میں ابولبابہ بھی تھے لہٰذا یہ اجماعی قول ہو گا۔ کیونکہ تمام مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ عمل غزوۂ تبوک کے موقع پر ہوا۔

پیچھے رہنے والوں اور توبہ کر کے معذرت کرنے والوں کا تذکرہ کر کے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ تبصرہ بھی فرمایا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹:۱۰۲) "بعید نہیں کہ اللہ ان پر

مہربان ہو جائے کیونکہ وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

ابن جریر نے کہا ہے' اللہ کی جانب سے لفظ عسی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ کام ایسا لازماً ہو گا۔کیونکہ یہ لفظ اس ذات سے امیدواری کو منسوب کرتا ہے جو امیدوں کو پورا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور اختیار بھی ۔اور جس انداز میں ان لوگوں نے اعتراف گناہ کیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل زندہ تھے اور ان کے اندر ایمان کا احساس پوری طرح موجود تھا۔اس لیے امید واثق تھی کہ ان کی توبہ قبول ہوگی ۔اور اللہ غفور و رحیم ان کی تقصیرات کو لازماً معاف کر دے گا۔چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کو معاف کر دیا۔

اب اللہ حضرت نبیؐ سے کہتے ہیں:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹:۱۰۳) "اے نبیؐ' تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہو گی' اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

ان لوگوں کے دل میں جو شدید احساس تھا اور جس کی وجہ سے وہ نادم ہو کر توبہ پر مائل ہوئے' یہ احساس ہی اس بات کا مستحق تھا کہ وہ مطمئن ہو جائیں کیونکہ انہوں نے رجوع کر لیا ہے اور ان کے لیے حقیقتاً امید کے دروازے کھل چکے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ایک تحریک کی قیادت کر رہے تھے اور ایک امت کی تربیت کر رہے تھے اس لیے آپ نے ان کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کرنے میں احتیاط سے کام لیا اور اس بات کا انتظار کیا کہ ان کے بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی صریح حکم آجائے۔

○○○

ابن جریر' ابن سعد' ان کے چچا' ان کے والد کی روایت سے حضرت ابن عباس نے نقل کیا ہے۔کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابولبابہ اور اس کے دو ساتھیوں کو رہا کر دیا (بعض روایت میں ان کی تعداد ۳' بعض ۷' بعض ۱۰ بتائی جاتی ہے جن میں سے تین نے اپنے آپ کو باندھا نہ تھا) تو ابولبابہ اور ان کے ساتھی اپنی پوری دولت لے کر حضورؐ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ ہمارے اموال میں سے جو چاہیں لے لیں اور ہماری طرف سے صدقہ کر دیں اور ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہمارے لیے طلب مغفرت کریں اور ہمیں پاک کریں۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک اللہ کا حکم نہ آجائے میں تمہاری دولت میں سے کچھ بھی نہیں لے سکتا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی

خُذْ مِنْ (۹:۱۰۳) "اے نبیؐ' تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو' کیوں کہ تمہاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہو گی"۔تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ نے ان کے اموال میں سے ایک حصہ لیا اور اسے راہ خدا میں ان کی طرف سے خرچ کر دیا۔

اس طرح' اللہ نے ان پر احسان فرمایا' اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ وہ دل سے سچے ہیں انہوں نے صدق دل سے

ہ کی ہے 'تب ہی تو حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کا صدقہ قبول کر لیں 'ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں ۔لفظ صلی ہم کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ ان پر نماز پڑھو لیکن صلوۃ کا حقیقی مفہوم دعا ہے۔

مالی صدقہ اس لیے لیا گیا کہ ان کے دلوں میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ وہ اب جماعت مسلمہ کے مکمل ارکان بن ۓ ہیں 'اب اسلامی سوسائٹی کی اجتماعی ذمہ داریوں میں حصہ دار ہیں ۔اب وہ اس سوسائٹی سے نکلے ہوئے یا متروک لوگ نہیں ہیں جبکہ یہ صدقہ ان کے لیے روحانی تطہیر کا بھی سبب ہے ۔ان کے دل سے یہ احساس ختم ہو جائے گا کہ انہوں نے جہاد میں حصہ نہیں لیا اور حضورؐ کی دعا سے ان کو مزید اطمینان قلب نصیب ہو گا۔

وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹ : ۱۰۳) "اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ وہ دعاؤں کو خوب سنتا ہے' دلوں ں باتوں کو جانتا ہے اور وہ اپنے علم کے مطابق فیصلے کرتا ہے ۔اپنے بندوں کے حق میں فیصلے وہ اپنے ذاتی علم کی بنا پر کرتا ہے ۔ س طرح اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے 'ان سے صدقات لیتا ہے ۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بندوں کے بارے میں اللہ کے احکام بجالاتے ہیں 'وہ ان کے بارے میں از خود کوئی فیصلہ نہیں فرماتے ۔اس حقیقت کو اگلی آیت میں یوں بیان کیا جاتا ہے ۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۹ : ۱۰۴) "کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو قبولیت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے ؟"

اس آیت میں استفہام تقریری کا انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کو اس حقیقت سے آگاہ ہونا چاہئے ' کہ توبہ قبول کرنے والا صرف اللہ ہے ' اور صدقہ لینے والا بھی اللہ ہی ہے اور وہی معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔ اور یہ اختیارات اس نے اپنے کسی بندے کے سپرد نہیں کیے ۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو باندھنے والوں کے کھولنے سے اجتناب فرمایا' جو جہاد سے پیچھے رہ گئے تھے اور اپنے آپ کو ستونوں سے باندھ لیا تھا' اور ان کا صدقہ بھی قبول کرنے سے انکار کیا تھا' یہ اس لیے کہ حضورؐ کو بھی یہ اختیارات حاصل نہ تھے کہ وہ خود کسی کی توبہ قبول کر لیں ۔یہ اختیارات صرف اللہ کے تھے ۔حضورؐ نے اس سلسلے میں وہی کچھ کیا جو حکم ہوا' ان کو کھولا تو اللہ کے حکم سے 'ان کا صدقہ قبول کیا تو اللہ کے حکم سے 'سب کام اللہ کے حکم کے بعد سرانجام دیئے"۔

اب براہ راست خطاب ہے پیچھے رہنے والوں سے :

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹ : ۱۰۵) "اور اے نبیؐ 'ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو' اللہ اور اس کا رسولؐ اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل اب کیا رہتا ہے ' پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے ' اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔یہ کیوں؟ اس لیے کہ اسلامی نظام زندگی کا طریقہ کار ہی یہ ہے کہ اس میں نظریات اور نظریات کے بعد پھر طرز عمل کو دیکھا جاتا ہے ۔

انسان کا طرز عمل ہی اس کے نظریات کی تصدیق کر سکتا ہے ۔ان کی توبہ کی ظاہری کسوٹی ان کا طرز عمل ہو گا۔ مومنین او رسول تو ظاہری عمل ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔رہی آخرت تو اس میں فیصلہ وہ ذات کرے گی جو ظاہری حالت کے سوا اندرونی حالات سے بھی باخبر ہے ۔وہ ظاہری حرکات اعضاء کو بھی جانتی ہے اور دلوں میں جو کچھ ہے اس کو بھی ۔

حرف ندامت اور رجوع اور توبہ ہی آخری بات نہیں ہے ۔اس کے بعد طرز عمل میں مثبت تبدیلی کی بھی ضرورت ہے ۔ انسان کا طرز عمل ہی اس کے اندرون کی غمازی کرتا ہے ۔تصدیق اور تکذیب طرز عمل سے ہوتی ہے کہ انسان کا اندرونی شعور اور میلان کیا ہے ۔اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کے شعور اور عقیدے میں عمل کی وجہ سے مزید پختگی آتی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک عملی نظام زندگی ہے ۔اس میں صرف شعور اور نیت اور خیال پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ شعور اور نظریات کو عملی شکل دی جاتی ہے ۔اچھا میلان اور اچھا شعور اور جذبہ بھی اپنی جگہ اہم چیز ہے ۔ لیکن صرف شعور اور جذبات اور نیات پر اسلام میں مدار حکم و فیصلہ نہیں ہے ۔نہ اس پر جزاء و سزا ہوتی ہے ۔جب تک کہ یہ شعور اور نیت عملی شکل اختیار نہ کرے اور یہی مفہوم ہے

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کا کہ صرف نیت ہی درکار نہیں نہ مفید جب اس کے ساتھ عمل نہ ہو (جبکہ عمل کی پشت پر نیت بھی ضروری ہے)۔

یہاں سے آگے اب دوسرے فریق کی بات چلتی ہے ۔اس فریق نے اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیا۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۹ : ۱۰۶) ”کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کے حکم پر ٹھہرا ہوا ہے ' چاہے انہیں سزا دے اور چاہے ان پر از سرنو مہربان ہو جائے ۔اللہ سب کچھ جانتا ہے اور حکیم و دانا ہے“۔

یہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے والوں کی آخری قسم ہے ۔یہ لوگ منافقین 'عذرات پیش کرنے والوں اور غلطی کے بعد تائب ہونے والوں سے مختلف لوگ ہیں۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اس آیت کے نزول تک اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ اسلامی سوسائٹی نے بھی ان لوگوں کے بارے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ ان کا فیصلہ اللہ کے سپرد تھا۔ نہ ان کو اپنے انجام کا پتہ تھا اور نہ لوگوں کو ان کے انجام کا پتہ تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت ان تین افراد کے بارے میں نازل ہوئی جن کی معافی ملتوی کر دی گئی ۔یہ حضرات مرارہ ابن الربیع 'کعب ابن مالک اور ھلال ابن امیہ تھے ۔ یہ لوگ محض سستی' آرام طلبی اور عیش کوشی کی وجہ سے رہ گئے تھے ۔کیونکہ زمانہ سخت گرمی کا تھا۔ ان لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک مخصوص تعلق بھی تھا جس کی تفصیلات اگلے سبق میں آرہی ہیں ۔

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جب آیت :

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (۹ : ۱۰۳) نازل ہوئی تو حضورؐ نے ان لوگوں کے اموال کا ایک حصہ وصول کر لیا۔ یعنی ابولبابہ اور اس کے دو ساتھیوں کے اموال سے۔ تو حضورؐ نے یہ اموال ان کی جانب سے صدقہ کر دیئے اور وہ تین افراد رہ گئے جنہوں نے ابولبابہ سے مخالف رویہ اختیار کیا اور اپنے آپ کو ستونوں سے نہ باندھا اور انہوں نے مزید کوئی عذر بھی پیش نہ کیا۔ ان کی معافی کا حکم بھی نہ آیا۔ ان لوگوں کی حالت یہ ہوگئی کہ اپنی وسعت کے باوجود زمین ان پر تنگ ہوگئی اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۹ : ۱۰۶) یہ آیت نازل ہوتے ہی لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ بس یہ تو ہلاک ہوئے کیونکہ ان کی معافی نہ آئی۔ بعض نے کہا کہ شاید اللہ ان کو بھی معاف کر دے۔ چنانچہ یہ لوگ امیدوار ہوگئے اللہ کی معافی کے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ

(۹ : ۱۱۷) یعنی وہ لوگ جو حضورؐ کے ساتھ شام کی طرف نکل گئے تھے۔

مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

(۹ : ۱۱۷) اور اس کے بعد یہ کہا

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا (۹ : ۱۱۸) یعنی وہ لوگ جو اپنے بارے میں کسی حکم کے نزول کے امیدوار تھے۔ مگر عام معافی کا اعلان ہوا تو یہ بھی معاف ہوگئے اور آیت

حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ

اَنْفُسُهُمْ (۹ : ۱۱۸) سے لے کر اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۹ : ۱۱۸) تک۔ ایسی ہی روایت عکرمہ، مجاہد، ضحاک اور قتادہ سے منقول ہے۔ نیز ابن اسحاق نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔ یہی روایت راجح ہے۔

اور اللہ نے چونکہ ان کے معاملے کو ملتوی کر دیا تھا اس لیے ہم بھی اس کی تفسیر کو اگلے سبق میں ان لوگوں کے معاملے تک ملتوی کرتے ہیں۔

ooo

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ

الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ
اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ
رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ
بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى
شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ
۱۳ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ؑ
۱۱ ع
۲

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں' اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں' اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں' اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف برسرپیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو' اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔ پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے"۔

غزوۂ تبوک کے دور میں مسجد ضرار کا قصہ مشہور و معروف قصہ ہے۔ منافقین میں بعض منافقین نے مسجد ضرار کی سازش تیار کی تھی۔ اس دور میں اسلامی سوسائٹی میں پائے جانے والے مختلف عناصر کے تذکر کے بعد ان کی کہانی کو دوسروں سے علیحدہ کر کے بیان کیا گیا۔ علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مدینہ میں حضور اکرمؐ سے قبل ایک

شخص تھا جس کا نام ابو عامر راہب تھا۔ زمانہ جاہلیت ہی میں اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی' یہ اہل کتاب کے علوم و فنون سے واقف تھا۔ دور جاہلیت میں یہ بڑا عبادت گزار تھا۔ یہ قبیلہ خزرج سے تھا اور اپنے قبیلے میں بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ جب حضورؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور آپ کے ارد گرد مسلمانوں کا اجتماع ہو گیا اور اسلام کی بات چل نکلی اور پھر بدر کے دن اللہ نے اسلام کو غالب کر دیا تو ابو عامر ملعون جل بھن گیا اور اس نے اسلام سے اپنی دشمنی اور بغض کا اظہار کرنا شروع کر دیا اور مدینہ سے بھاگ کر اس نے کفار قریش کے ہاں پناہ لی اور یہ قریش کو رسول اللہ کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرنے لگا۔ چنانچہ انہوں نے عربوں کے دوسرے قبائل کی مدد سے احد کے دن مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ احد میں جو حالات پیش آئے وہ تاریخ کا حصہ ہیں' اللہ نے مومنین کو آزمایا اور انجام بہرحال اہل تقویٰ کے ہاتھ میں رہا۔ اس شخص نے دونوں لشکروں کے درمیان خفیہ خندقیں کھدوا رکھی تھیں جن میں سے ایک میں حضورؐ بھی گر پڑے تھے۔ اس دن رسول اللہ کو بھی زخم آئے۔ آپؐ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا۔ اور چار بڑے دانتوں میں نچلا دایاں دانت بھی ٹوٹ گیا۔ آپ کے سر پر بھی زخم آئے۔ ابو عامر جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنی قوم خزرج سے مخاطب ہوا اور اس نے ان کو دعوت دی کہ وہ اس کے ساتھ آ ملیں۔ جب انہوں نے اس کو پہچان لیا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا اے فاسق اللہ تجھے بھلا نہ کرے۔ تم اللہ کے دشمن ہو۔ انہوں نے اسے خوب برا بھلا کہا بلکہ اسے گالیاں دیں۔ یہ شخص یہ کہتے ہوئے لوٹا کہ افسوس ہے کہ میرے بعد میری قوم بری طرح بدل گئی ہے۔

اس شخص کو رسول اللہؐ نے اسلام کی طرف آنے کی خصوصی دعوت دی تھی اور اس کو قرآن پڑھ کر سنایا تھا لیکن اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور سرکشی اختیار کی اور مدینہ کی طرف بھاگ گیا۔ چنانچہ حضورؐ نے اسے بددعا دی کہ یہ شخص اپنے علاقے سے دور بطور پناہ گزیں غربت کی موت مرے۔ چنانچہ اس کو یہ بددعا لگ گئی' وہ اس طرح کہ جب لوگ احد کے صدمے سے فارغ ہوئے اور دنیا نے دیکھا کہ اسلام کی دعوت روبعروج ہے اور غالب ہو رہی ہے تو یہ شخص ہرقل بادشاہ روم کے پاس پہنچ گیا اور اس سے مدد طلب کی۔ اس نے اس کے ساتھ امداد کا وعدہ کیا' اس پر بہت احسان کیا اور اسے اپنے پاس ٹھہرایا۔ اس نے اپنی قوم کے منافقین کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی۔ یہ خط و کتابت انصار میں سے اہل نفاق اور ڈھل مل یقین لوگوں کے ساتھ کی۔ اس نے ان کو یقین دلایا کہ وہ جلد ہی ایک عظیم لشکر لے کر رسول اللہ کے خلاف اٹھے گا اور یقیناً وہ اس جنگ میں غالب رہے گا اور حضرت محمدؐ کے موجودہ حالات بدل دے گا۔ اس شخص نے ان لوگوں کو یہ مشورہ دیا کہ یہ لوگ اپنے لیے ایک مرکز بنالیں تاکہ میرے نمائندے ان کے پاس اس مرکز میں رابطہ رکھیں اور پیغام لائیں اور لے جائیں اور یہ مرکز ان کے لیے کمین گاہ ہو خصوصاً جب وہ خود ان کے پاس آئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے مسجد قبا کے پاس ہی ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ جب حضورؐ تبوک کے لیے نکلنے لگے تو ان لوگوں نے یہ مسجد تیار کر لی تھی۔ ان لوگوں نے اس موقع پر حضورؐ سے درخواست کی کہ آپ تشریف لائیں اور اس مسجد میں نماز کا افتتاح فرمائیں۔ اس طرح ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ حضورؐ کی امامت سے اس مسجد کو متبرک کر کے اس کو مسلم الثبوت کر دیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے اپنے لوگوں میں سے مریض اور ضعیف لوگوں کے لیے یہ مسجد بنائی ہے خصوصاً سردیوں کی مشکل راتوں میں ایسے لوگوں کے لیے مسجد نبوی میں جانا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اللہ نے آپ کو اس مسجد میں نماز پڑھنے سے بچا لیا۔ حضورؐ نے فرمایا"میں اب سفر پر جا رہا ہوں لیکن جب واپس ہوں گا تو ان شاء اللہ نماز

پڑھوں گا"۔ جب حضور تبوک سے مدینہ واپس ہوئے اور سفر اس قدر رہ گیا کہ قافلہ دو روز میں مدینہ پہنچنے ہی والا تھا کہ حضرت جبرئیل نے حضورؐ کو اس مسجد کے بارے میں اطلاع دے دی اور بتا دیا کہ اس مسجد کی اساس کس جذبے پر رکھی گئی' یہ تو کفر تفریق بین المسلمین اور اس مسجد کے خلاف بطور ایک سازش رکھی گئی جس کی بنیاد اول روز سے تقویٰ کی اساس پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے لوگوں کو بھیجا کہ میرے مدینہ پہنچنے سے قبل ہی اس مسجد کو منہدم کر دیا جائے۔ اسی قسم کی روایت ابن عباس' سعید ابن جبیر' مجاہد اور عروہ ابن زبیر سے منقول ہے۔

یہ تھا قصہ مسجد ضرار کا جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اس میں ہرگز کھڑے نہ ہوں اور آپؐ اب کے بھی مسجد قبا میں قیام فرمائیں جو اول روز سے تقویٰ و طہارت کے جذبات پر مبنی ہے۔ اور اس کے اندر ایسے لوگ نماز پڑھتے ہیں جو طہارت کو بہت ہی پسند کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (۹ : ۱۰۸) "اور اللہ پاک لوگوں کو بہت ہی پسند کرتا ہے"۔ یہ مسجد ضرار جو حضورؐ کے دور میں تعمیر ہوئی تھی اسلام اور مسلمین کے خلاف ایک گہری سازش تھی' اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ کفر کو تقویت دی جائے اور اسلامی تحریک کے خلاف سازش کرنے والوں کے لیے ایک کمین گاہ مہیا کی جائے تاکہ وہ اندھیروں میں اسلام کے خلاف منصوبہ بندی کر سکیں اور اس طرح وہ دین کے پردے میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش کر سکیں۔

آج بھی دشمنان دین مختلف شکل و صورت میں مساجد ضرار بناتے رہتے ہیں اور دور جدید میں جدید وسائل کے مطابق اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص خالصتاً اسلام کے لیے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً وہ اسلام کی بیخ کنی کے لیے کام کرتا ہوتا ہے۔ اگر وہ اسلام کی بیخ کنی نہیں کر سکتا تو اس کی شکل بدلنے' اس کی چولیں ڈھیلی کرنے اور اسے پھلدار بنانے کا کام کرتا ہے۔ یہ مساجد ضرار ایسی ہوتی ہیں جن کے اوپر خدمت دین کا بورڈ لگایا جاتا ہے اور خدمت دین کے بورڈ کے نیچے سے دین پر تیر پھینکے جاتے ہیں۔ یہ مساجد ضرار انجمنوں' جماعتوں' کتابوں' تحقیقاتی اداروں اور ایسے کلبوں کی صورت میں ہیں جہاں لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ شکی اور کمزور ایمان لوگوں کو شکار کرتے ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اسلام ذبح ہوتا ہے لیکن ان کے ماتھے پر بل بھی نہیں آتا۔ ایسے لوگ کمزور ایمان والے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اسلام تو بالکل خیریت سے ہے اور یہ کہ ان کو کوئی خوف نہیں کھانا چاہئے۔ غرض دشمنان اسلام نے مختلف شکل و صورت میں مساجد و ضرار بنا رکھی ہیں۔

ان مساجد ضرار کی پردہ دری کرنا مسلمانوں کے لیے بہت ہی ضروری ہے اور ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم دشمنان اسلام کی ان کمین گاہوں کے اوپر سے خدمت اسلام کے بورڈ اتار دیں کیونکہ یہ بورڈ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے دور کا یہ فریضہ ہے کہ ہم ایسی مساجد ضرار کی اصل حقیقت لوگوں پر عیاں کر دیں۔ اور ہمارے لیے رسول اللہ کے دور میں مسجد ضرار کے ساتھ ہونے والے سلوک اور اس پر قرآن کریم کے عظیم تبصرے کی صورت مین ایک گائیڈ لائن موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ

حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَ اللّٰہُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ (۱۰۷) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ
اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ، فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰہُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (۱۰۸)
اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰی شَفَا
جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَ اللّٰہُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰۹) لَا يَزَالُ
بُنْيَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِيْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَ اللّٰہُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

(۱۱۰)(۹:۱۰۷ تا ۱۱۰)) ”کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف برسر پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔ پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے“۔

اب میں، ان آیات کے انداز بیان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں۔ یہاں ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ منظر کے اندر ہر طرف تگ و دو ہے۔ یہ تگ و دو بتاتی ہے کہ مساجد تقویٰ کے مقابلے میں جو مساجد ضرار بنائی جاتی ہیں ان کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو دور نبوی کی مسجد ضرار کے ساتھ کیا گیا۔ اس طرح اسلام کے خلاف ہر بری سازش کا مقابلہ اہل تقویٰ کرتے ہیں اور پاکباز کارکن ہر سازش کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگرچہ سازش کرنے والے نہایت ہی پاکباز لوگوں کے جامہ میں آئیں کیونکہ مخلص لوگ دانشمند بھی ہوتے ہیں اور

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰی

جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۹ : ۱۰۹) ''پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جاگری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا''۔ ہم ان آیات میں دو مناظر کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ایک میں اخلاقی عمارت تقویٰ کی مضبوط اساس پر قائم اور وہ اپنی پختہ بنیادوں پر کھڑی ہے اور دوسرا منظر ہمارے سامنے ایک ایسی اخلاقی عمارت کا ہے جو وادی کی کھوکھلی کگر پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ دریائے جہنم کے ایسے کٹاؤ شدہ کنارے پر قائم ہے جو گرنے ہی والا ہے۔ مٹی کے اس تودے میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور اس کی حالت یہ ہے کہ آج گرا یا کل۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ گرنے کے لیے متحرک ہے' متزلزل ہے اور پھسلنے ہی والا ہے۔ یہ گرا' وہ گرا ایک خوفناک فضا ہے اور لوگ ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں اور ضروری سامان گویا اس زمین بوس ہونے والی عمارت سے نکال رہے ہیں۔ آخر یہ عمارت دریائے جہنم میں گر جاتی ہے' اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا' ظالموں سے مراد کافر اور مشرک ہیں کیونکہ انہوں نے ایسی ناپختہ یعنی کفر و شرک کی ناپختہ بنیادوں پر اپنی اخلاقی عمارت کو استوار کیا۔ درحقیقت اپنے طور پر تو انہوں نے اس عمارت کو بہت ہی پختہ بنایا تھا مگر وہ بودی اساس پر تھی۔

○○○

یہ ایک عجیب منظر ہے۔ ڈر اور افرتفری کے اس خوفناک منظر کو چند کلمات کے اندر قرآن نے ادا کر دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ داعیان حق کو معلوم ہو جائے کہ ان کی اخلاقی عمارت مضبوط بنیادوں پر ہے۔ کفر اور نفاق اور سازشیوں کی مساجد ضرار کی عمارت کے نیچے نہایت ہی بودی بنیادیں ہیں اور جب اسلام کی اخلاقی بنیادوں کا مقابلہ کفر کی اخلاقیات سے ہو گا تو وہ مقابلے میں نہ ٹھہر سکیں گی۔

ایک دوسرا منظر جس میں مسجد ضرار کے شرپسند معمار دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں ان کی حالت ان کی نفسیات کی یوں غمازی کرتی ہے۔

لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۹ : ۱۱۰) ''یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے' ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے''۔

وہ کگر تو گر گیا' کیونکہ وہ تو شاخ نازک تھی جس پر تہذیب کی عمارت اٹھائی گئی تھی اور نیچے وادی جہنم تھی اور یہ عمارت ضرار اپنے منافق معماروں کے ساتھ وادی جہنم میں جاگری جو نہایت ہی بری جائے قرار ہے۔ لیکن ان بانیوں کے دلوں میں اس عمارت کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ ان کے دلوں میں شک' قلق اور حیرانی و پریشانی بدستور موجود ہے۔ اور یہ بے یقینی قائم و دائم رہے گی' اس لیے ایسی اخلاقی عمارت کے معماروں کے دل کبھی مطمئن' پرسکون اور پروقار نہ ہوں گے' الا یہ کہ یہ دل ریزہ ریزہ ہو جائیں' اور کسی زندہ انسان کے دل ہی میں نہ رہیں۔

غرض گرتی ہوئی دیواروں کے معمار ہمیشہ حیران و پریشان رہتے ہیں۔ اہل کفر و نفاق کی نفسیاتی اور روحانی کیفیت کی اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں حسی اور مادی تصویر کشی نہیں کی جا سکتی' اس تصویر کشی میں قرآن نے کس قدر خوبصورت رنگ بھرے ہیں' یہ تو قرآن کا معجز انداز بیان ہے جو صدیوں سے منفرد ہے۔ یہ تصویر صدیاں گزرنے کے بعد بھی پرانی نہیں ہوتی۔ نہ اس کے رنگ مدھم پڑتے ہیں کیونکہ منافق' سازشی اور مکار منکر حق کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔ اس کا وجدان حیران' اس کا دل غیر مطمئن اور اس کا جسم متزلزل ہوتا ہے۔ وہ دائمی قلق اور بے یقینی کا شکار ہوتا ہے۔ جب روح بے قرار ہو تو جسم کو کیسے قرار ملے۔

یہ قرآنی قلم کا اعجاز جس میں الفاظ کے ذریعہ فنی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ تصویر کے رنگ نہایت ہی مناسب لیکن سہل ممتنع رنگ' سادہ الفاظ اور مفہوم دونوں ہی سہل۔

لیکن ان ادبی الفاظ کے اندر قرآن کریم کی حکیمانہ تعلیمات کی قدر و قیمت اور زیادہ ہوتی ہے کہ جب قرآن اس وقت کے اسلامی معاشرے کی اس طرح Classification کرتا ہے' اور یوں ابد الآباد تک اسلامی تحریکات کے لیے نشاندہی کرتا ہے کہ ان کے لیے راہ حقیقت کیا ہے اور اس میں کارکنوں کو کس قدر چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم دراصل اسلامی معاشرے کے قیام کی تحریک کے لیے ایک گائیڈ بک تھا۔ وہ تحریک کی ذہنی پرورش کر رہا تھا۔ تحریک کے سامنے جو عظیم انقلابی نصب العین تھا اس کے لیے اسے تیار کر رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس قرآن کو تحریکی انداز میں نہ پڑھا جائے گا' اس وقت تک اسے صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور صرف وہی لوگ اس قرآن کو سمجھ سکتے ہیں جو اسلامی انقلاب کے لیے برپا کی جانے والی تحریک کے کارکن ہوں۔ جب لوگ دعوت اسلامی کو تحریکی انداز میں لے کر اٹھیں گے تو پھر قرآن صحیح معنوں میں ان کی سمجھ میں آ جائے گا۔

○○○

درس نمبر ۹۴ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری حصہ یا آخری سبق ہے ۔ اس میں اسلامی سوسائٹی اور غیر اسلامی سوسائٹیوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تعین کیا گیا ہے ۔ آغاز میں ایک مسلمان کے تعلق باللہ کی نوعیت کی نشاندہی ہے ۔ پھر یہ جتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان جب اسلام کا اعلان کرتا ہے تو اس کے کیا تقاضے اس پر عائد ہوتے ہیں ۔ وہ کیا دینی فرائض ہیں جو کسی شخص پر اعلان اسلام کے ساتھ ہی عائد ہو جاتے ہیں یعنی انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ۔

یعنی اسلام میں داخل ہونے کے لیے جو معاہدہ ہوتا ہے اس میں ایک فریق یعنی مسلم بائع ہوتا ہے ۔ اور دوسرا فریق یعنی اللہ مشتری ہوتا ہے ۔ سودا کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک مومن اپنی کل جائیداد یعنی اپنی ذات ' اپنا مال اور سب کچھ اللہ کے ہاں فروخت کر دیتا ہے ۔ ایک مومن اپنا مال اور جان جہاد فی سبیل اللہ کے لیے حاضر کر دیتا ہے تاکہ اللہ کا دین غالب ہو اور اللہ کا حکم بلند ہو ۔ اس سودے میں ایک معلوم قیمت کے عوض مومن اپنی جان و مال فروخت کر دیتا ہے ۔ ثمن بیع جنت ہے ۔ انسان کی جان اور اس کا مال جنت کے مقابلے میں قیمت کے لحاظ سے کچھ نہیں ہے لیکن یہ اللہ کی ذرہ نوازی ہے کہ وہ یہ سودا کرتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

(۹ : ۱۱۱) ” حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں ۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے مرتے ہیں ۔ ان سے جنت کا وعدہ اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات ' انجیل اور قرآن میں ۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو ؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے “ ۔

جن لوگوں نے یہ سودا کیا وہ تھے کون لوگ ؟ وہ تو ممتاز اور برگزیدہ لوگ تھے اور ان کی صفات نہایت ممتاز تھیں ۔ ان کی صفات کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ وہ شعور اور عمل میں اللہ کے معاملے میں بہت ہی سچے تھے ۔ اپنی انفرادیت میں بھی وہ ممتاز تھے اور ان کے اوپر اسلامی نظام کے قیام کے لیے جو ذمہ داریاں عائد کی گئیں ، ان میں بھی وہ لاثانی تھے ۔ وہ ہر وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہتے تھے ۔ وہ خود بھی حدود اللہ کی رعایت کرنے والے تھے

اور دوسروں سے بھی حدود للہ کی پابندی کراتے تھے۔

التَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (٩ : ١١٢) "اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے' اس کی بندگی بجالانے والے' اس کی تعریف کے گن گانے والے' اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے' اس کے آگے رکوع و سجدے کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے' اور اے نبی ان مومنوں کو خوش خبری دے دو"۔

اب اگلی آیات میں یہ بزنس کرنے والے ایک فریق پر ایک خاص شرط عائد کی جاتی ہے کہ جن لوگوں نے یہ سودا کر لیا ہے' وہ تمام دوسرے لوگوں سے جنہوں نے یہ سودا نہیں کیا وہ قطع تعلق کر لیں گے۔ اگرچہ سودا نہ کرتے والے سودا کرنے والوں کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ دونوں کی زندگی کے اہداف اور رخ مختلف ہیں۔ دونوں کا انجام مختلف ہے۔ کیونکہ جنہوں نے سودا کیا وہ اصحاب جنت ہیں اور جنہوں نے یہ سودا نہ کیا وہ اصحاب جہنم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان نہ آخرت میں ملاپ ہو گا نہ دنیا میں ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ رابطے نسب اور خون کے رابطے نہیں اور نہ اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان کسی قسم کے رابطے ہو سکتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (١١٣) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (١١٤) (٩ : ١١٣ — ١١٤) "نبی اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ چاہے وہ ان کے رشتہ داری کیوں نہ ہوں' جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ ابراہیم بڑا رقیق القلب' خدا ترس اور بردبار آدمی تھا"۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک مومن کی وفاداری اس اللہ کے لیے خالص ہو جائے جس پر ایک مومن نے اپنا سب کچھ فروخت کر دیا ہے اور نئی سوسائٹی میں تمام رابطے اور تمام تعلقات صرف اس نئی سوچ کی اساس پر قائم ہوں۔ اللہ تعالیٰ یقین دہانی فرماتے ہیں کہ وہ مومنین کا ولی و نگہبان رہے گا۔ ان کو ہر گمراہی سے بچائے گا اور یہ کہ ان کے لیے اللہ کی نصرت اور نگہبانی کافی ہے' اس نصرت کی وجہ سے وہ پوری دنیا سے مستغنی ہو گئے ہیں' اللہ مالک الملک ہے اور اس

کے سوا کوئی حقیقی معنوں میں قادر نہیں ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۱۵) اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ (۱۱۶) (۹: ۱۱۵ — ۱۱۶) "اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک کہ انہیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہئے۔ در حقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں آسمان و زمین کی سلطنت ہے اور اسی کے اختیار میں زندگی اور موت ہے اور تمہارا کوئی حامی و مددگار ہی نہیں ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے"۔

مومن اور اللہ کے درمیان جو سودا طے پایا ہے اس کی نوعیت یہ تھی جس کا اوپر ذکر ہوا تو ایسے معاہدے کی موجودگی میں گویا جہاد سے پیچھے ہٹنا ایک عظیم بات تھی۔ اس جہاد کے بارے میں تردد اور تخلف کے بعد جن لوگوں کی نیت اچھی تھی اور وہ صدق دل سے نادم تھے ان کو اللہ نے محض اپنی رحمت اور مہربانی سے معاف کر دیا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۱۷) وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۱۸) (۹: ۱۱۷ — ۱۱۸) "اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے مگر اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ بے شک اس کا معاملہ اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کر دیا تھا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا' جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

مدینہ کے باشندوں اور مدینہ کے ارد گرد دیہاتی لوگوں کو نئے انقلابی دور کے لیے متعین ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ ان پر بہت زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار بھی ہیں اور قریب کے رہنے والے بھی ہیں اور یہ اسلامی انقلاب کے لیے مرکز ہیں اور انقلاب کی وسعت کے لیے مرکز عمل ہیں۔ اگر

یہ لوگ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں غفلت کریں گے تو اس کے نتائج بہت ہی برے ہوں گے اور اگر یہ اپنی ڈیوٹی پوری طرح ادا کریں گے تو اس کا اجر بھی ان کو پورا پورا ملے گا۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (١٢٠) وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

(١٢١) (٩: ١٢٠ — ١٢١)) "مدینہ کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کے لیے یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں اور کسی دشمن سے کوئی انتقام وہ لیں اور ان کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ راہ خدا میں تھوڑا یا بہت کوئی خرچ وہ اٹھائیں اور کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے"۔

جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کے ان احکام اور فضیلت کے ساتھ ساتھ یہ بھی متعین کر دیا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے تمام لوگوں کا گھروں سے نکل کھڑے ہونا ضروری نہیں ہے۔ بعض لوگ لازماً دوسرے مقاصد اور اہداف میں بھی مصروف ہوں گے مثلاً صنعت و حرفت کیونکہ اسلامی مملکت کی حدود وسیع ہو گئی ہیں اور لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ کچھ لوگوں کو دوسری مشغولیات میں رہ کر اجتماعی مقاصد کے لیے کام کرنا ہو گا اور اپنے آخری ہدف کے اعتبار سے تمام مشغولیات کے مقاصد باہم آکر ملیں گے (مثلاً بعض لوگ علمی کاموں میں مشغول رہیں گے)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (٩: ١٢٢) "اور کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ پرہیز کریں"۔

اگلی آیات میں تحریک جہاد کی ضابطہ بندی کی گئی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ جزیرۃ العرب کو تحریک اسلامی کا

مرکز اور مخصوص و محفوظ علاقہ قرار دے دیا گیا تھا اور اب اس مرکز سے اسلامی انقلاب کو پھیلایا جانا مطلوب تھا۔ اور پالیسی یہ قرار پائی تھی کہ تمام مشرکین سے جنگ کی جائے یہاں تک کہ دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور دین صرف اللہ کا غالب ہو جائے۔ نیز پالیسی یہ قرار پائی کہ تمام اہل کتاب کے ساتھ اس وقت تک جنگ کی جائے گی جب تک کہ وہ زیر دست ہو کر جزیہ ادا نہیں کرتے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹ : ۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تم سے قریب ہیں۔ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔

اسلامی بیعت' اس کے تقاضوں اور اس کے فرائض اور اس کی پالیسی کے طے کر لینے کے بعد اب آخر میں قرآن کریم کے حوالے سے دو تصورات کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ ایک سوچ منافقین کی ہے اور دوسری سوچ اہل ایمان کی ہے۔ قرآن کریم ایمانی اور تصوراتی ہدایات اور عملی ہدایات دے رہا ہے۔ اس میں عقائد و نظریات بھی ہیں اور فرائض و اعمال بھی ہیں لیکن یہ نظریاتی اور عملی ہدایات منافقین کو کوئی فائدہ نہیں دے رہی ہیں۔ یہ نصیحت اور آزمائشیں ان کی آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہیں ہیں۔

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۱۲۴) وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۲۵) اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۱۲۶) وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۱۲۷) (۹ : ۱۲۴ تا ۱۲۷) "اور جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ کہو تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا؟" جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں فی الواقعہ اضافہ ہی کیا ہے۔ اور وہ اس سے دلشاد ہیں البتہ جن لوگوں کے دلوں کو روگ لگا ہوا تھا ان کی سابق نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا' پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے ہیں کیونکہ یہ نادان لوگ ہیں"۔

اب یہ سبق بھی ختم ہوتا ہے اور سورت بھی ختم ہوتی ہے۔دو آیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے بارے میں آتی ہیں اور آپؐ کی شخصیت کا تعارف کراتی ہیں کہ آپؐ مؤمنین کے بارے میں بے حد فکر مند ہیں اور اہل ایمان کے لیے نہایت ہی مہربان اور رحیم و شفیق ہیں ۔اور دوسری آیت میں آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور جو لوگ دعوت سے منہ موڑتے ہیں ان کو نظرانداز کر دیں ۔ان لوگوں کے نصیب میں ہدایت نہیں ہے ۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۱۲۹)(۹:۱۲۸ — ۱۲۹)) ”دیکھو تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے ۔ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق و رحیم ہے ۔اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا ہے 'کوئی معبود نہیں مگر وہ' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا“۔

اس سبق پر ایک اجمالی نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں جہاد فی سبیل اللہ پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا کہ اسلامی سوسائٹی کو نظریاتی بنیادوں پر تمام دوسری سوسائٹیوں سے مکمل علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے ۔اور پورے کرۂ ارض پر قرآن و سنت کی دعوت کو پھیلانا چاہئے ۔اور یہ کام ان کے لیے اس بیعت کے نتیجے میں ان پر ایک لازمی فریضہ ہے تاکہ دنیا میں حدود اللہ کو قائم کیا جائے اور پھر ان کو قائم رکھا جائے ۔تاکہ دنیا میں اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام قائم ہو اور اللہ کے نظام کے مقابلے میں جتنے جاہلی نظام کہیں بھی قائم ہیں ان کا پیچھا کیا جا سکے جن میں لوگوں کے حقوق بھی غصب ہوتے ہیں اور اللہ کی حاکمیت پر بھی دست درازی ہوتی ہے ۔

اس اجمالی تبصرے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دور جدید کے بعض مفکرین کی سوچ کس قدر بودی ہے اور ان کی ذہنیت کس قدر شکست خوردہ ہے کہ وہ اللہ کی ان واضح ہدایات 'جہاد کی تشریح' زمانے کے مروجہ نظریات سے متاثر ہو کر کرتے ہیں ۔یہ لوگ بالخصوص جہاد اسلامی کو ایک دفاعی جنگ کے محدود دائرے میں بند کرتے ہیں اور ان کے نظریات یہ ہیں کہ اسلام تو اسلامی حدود و مملکت کے دفاع کا نظریہ رکھتا ہے حالانکہ یہ آیات صراحت کے ساتھ حکم دیتی ہیں کہ اسلامی حدود کے پاس پاس بسنے والے کفار کے ساتھ بھی جہاد جاری رکھا جائے اور اس میں کوئی ایسی شرط نہیں لگائی گئی کہ ان کے ساتھ صرف اس صورت میں جہاد کیا جائے جب وہ حملہ آور ہوں ۔اس لیے کہ جب انہوں نے اللہ کے حق حاکمیت کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر لیا تو یہ جارحیت ہی ان کے خلاف آغاز جہاد کے لیے کافی وجہ جواز ہے ۔کیونکہ ایک تو وہ اللہ کی حاکمیت سے بغاوت کرتے ہیں دوسرے یہ کہ انسانوں کو اللہ کا غلام اور بندہ بنانے کے بجائے اپنا غلام اور بندہ بناتے ہیں ۔پس ان لوگوں کی یہی جارحیت ان کے خلاف جہاد کے لیے کافی وجہ جواز ہے بشرطیکہ مسلمان قوت رکھتے ہوں ۔یہاں اس سبق کے مشمولات کی طرف یہی مختصر اشارہ ہی کافی ہے 'تفصیلات کا انتظار کریں تشریح آیات کے وقت ۔

○○○

درس نمبر ۹۴ تشریح آیات

۱۱۱ ـــ تا ـــ ۱۲۹

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ
الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا
فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا
بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾ التَّائِبُونَ
الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ
بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۗ وَ
بَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے 'تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے' یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے' اس کی بندگی بجا لانے والے' اس کی تعریف کے گن گانے والے' اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے' اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے' (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے بیع کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبی' ان مومنوں کو خوشخبری دے دو"۔

میں اس سے قبل بارہا اس آیت کی تلاوت کرتا رہا ہوں' جبکہ میں قرآن مجید حفظ کر رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی اسے بارہا پڑھا اور بارہا اس کی تلاوت سنی۔ پھر ایک چوتھائی صدی تک میں اس کی تدریس اور تلاوت بھی کرتا رہا۔ لیکن یہی آیت جسے میں نے لاتعداد مرتبہ پڑھا تھا' جب میں نے فی ظلال القرآن میں اس پر غور کیا تو مجھ پر وہ حقائق واشگاف ہوئے

جو اس سے قبل میرے پردۂ خیال پر کبھی نمودار نہ ہوئے تھے۔ پوری زندگی میں میں ان حقائق کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہ سکا تھا۔

یہ نہایت ہی خوفناک آیت ہے! اس میں ایک سچے مومن اور اللہ کے ساتھ اس کے رابطے کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام قبول کر کے ایک مسلمان اللہ کے ساتھ کیا معاہدہ کرتا ہے اور پوری زندگی میں پھر اس پر کیا فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔

اگر گویم مسلمانم بلرزم — کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

جن لوگوں نے فی الواقعہ اس قسم کی بیعت کی اور پھر انہوں نے پوری زندگی میں اس بیعت کو پورا کیا تو وہی سچا مومن ہے جس پر مومن کے تمام اوصاف منطبق ہوتے ہیں اور اس کے دل میں حقیقت الحال بیٹھ جاتی ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر دعوائے ایمان محض دعویٰ ہوتا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے شہادت درکار ہوتی ہے۔

اس بیعت کی حقیقت کیا ہے؟ یا اس سودے کی حقیقت کیا' اللہ نے ازروئے عنایت اسے سودا کہا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان کی جان و مال کا مالک ہی اللہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سودے کے بعد تو مسلمانوں کی جان اور مال ان کا نہیں رہتا۔ لہٰذا ایک مومن اپنے مال اور جان میں سے کسی چیز کو بھی انفاق فی سبیل اللہ سے بچا کر نہیں رکھ سکتا' نہ اسے یہ اختیار رہتا ہے کہ وہ خرچ کرے یا نہ کرے۔ ہرگز نہیں' اس نے تو اپنی جان اور مال اللہ کے ہاں فروخت کر دیا ہے۔ اب یہ اللہ کی مرضی ہے کہ جان مومن اور مال مومن کو جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اور اس کے لیے اللہ نے فرائض و حدود مقرر کر دیے ہیں۔ فروخت کنندہ کو اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ وہ اللہ مشتری کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے اور بالکل ادھر ادھر نہ دیکھے۔ نہ حیران و پریشان ہو' نہ جھجک اور جدل کرے۔ بس اس کا کام اطاعت ہے' مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنا ہے۔ کیونکہ اس سودے کا عوضانہ اس نے جنت کی صورت میں لکھوا لیا ہے۔ اب راستہ کیا ہے' راستہ جہاد و قتال کا ہے اور انجام منزل کیا ہے یا شہادت اور یا نصرت و فتح۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ (۹ : ۱۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں"۔

غرض جس نے اس پر بیعت کی' اس نے اس سودے کو پورا کیا۔ اور جو اس سودے کے زر ثمن پر راضی ہو گیا تو وہی حقیقی مومن ہے۔ کیونکہ مومنین وہی لوگ ہیں جن سے اللہ نے ان کی جان و مال کو خرید لیا اور انہوں نے بیچ دیا۔ جہاں تک زر بیع کا تعلق ہے تو یہ تو اللہ کی خاص مہربانی اور شفقت ہے کہ اس نے اس سودے میں قیمت بھی لگائی۔ ورنہ جان و مال تو اللہ ہی کے تھے' جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی۔ یہ اس کا بڑا کرم ہے کہ اس نے انسان کو صاحب عزم و ارادہ بنایا' پھر اسے یہ اختیار دیا کہ وہ اللہ کے ساتھ معاہدہ کرے۔ یہ خالص ذرہ نوازی ہے۔ چنانچہ اللہ نے اس عہد اور معاہدے میں وفاداری کو مقام انسانیت قرار دیا اور جو لوگ اس عہد کو وفا نہ کریں ان کے بارے میں قرار دیا کہ وہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔

اس کا فرمان ہے :

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۸: ۵۵) "بے شک برے جانور اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے ' وہ لوگ جن سے تم نے عہد کیا تو انہوں نے ہر بار اس عہد کو توڑا اور وہ خدا سے نہیں ڈرتے" چنانچہ اللہ نے حساب و کتاب کا دارومدار بھی اس سودے میں وفا اور عدم وفا پر رکھا۔

بے شک یہ نہایت ہی خطرناک سودا ہے لیکن یہ سودا تو ہر مومن نے کر لیا ہے اور کوئی مومن جب تک کہ وہ مومن ہے اس سودے کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ یہ ہے وہ خوف جو اس وقت مجھ پر طاری ہے جبکہ میں یہ کلمات لکھ رہا ہوں۔ ذرا غور سے پڑھیں اور دوبارہ پڑھیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (۹ : ۱۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں"۔

اے اللہ! مدد فرمانا' یہ تو بہت ہی بھاری ذمہ داری ہے۔ آج اطراف عالم میں جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور بڑے مزے سے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس دنیا میں اللہ کی حاکمیت کے قیام کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کرتے اور ان طاغوتی قوتوں کے دفاع کے لیے جدوجہد نہیں کرتے۔ جنہوں نے اللہ کے حق حاکمیت پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور اللہ کے بجائے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے' حالانکہ حق حاکمیت اللہ تعالیٰ کا مخصوص حق ہے۔ یہ لوگ جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں کرتے اور قتال فی سبیل اللہ بھی نہیں کرتے اور پھر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔

یہی الفاظ حضور اکرمؐ کے دور میں جب سنے جاتے تھے تو یہ عملی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ صحابہ کرام کے نزدیک یہ الفاظ محض تصورات نہ دیتے تھے جن کے بارے میں صرف یہ کہ سوچا جاتا اور یہ کلمات صحابہ کرام کو محض نظریات عطا کرتے تھے۔ بلکہ یہ حضرات سنتے ہی ان معانی کو عملی جامہ پہنا دیتے تھے۔ یہ الفاظ شعور کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں ایک تحریک پیدا کر دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن رواحہ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر یہی کہا تھا۔ محمد ابن کعب قرظی کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن رواحہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو چاہیں شرط لگا دیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں رب کے لیے شرط کرتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو اور اپنے لیے میں یہ شرط کرتا ہوں کہ تم میری مدافعت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی مدافعت کرتے ہو تو اس پر عبداللہ ابن رواحہ نے کہا: اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے لیے کیا اجر ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: الجنتہ۔ تو انہوں نے کہا یہ بہت مفید سودا ہے' نہ تو ہم اقالہ کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق کو اقالہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں

اس طرح صحابہ کرام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان یہ سودا طے ہوا اور یہ قطعی اور ناقابل منسوخی سودا تھا۔ یہ طے ہوا۔ اس پر عمل ہو گیا اور اس میں اقالے اور منسوخی کا کوئی موقعہ ہی نہ رہا۔ کیونکہ سودا قطعی تھا۔ اس میں کسی فریق کے لیے خیار رجوع

نہ تھا۔ جنت اس کا زرِ ثمن تھا۔ جس کا پختہ وعدہ کر دیا گیا تھا اور یہ وعدہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ وعدہ اللہ نے اپنی تمام کتابوں میں کیا ہے۔ تورات میں بھی اور انجیل میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر وفائے عہد کرنے والا ہو۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

(٩ : ١١١) ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟"

جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ہر مومن نے ایمان کے لازمی تقاضے کے طور پر بیعت کی ہوئی ہے۔ اور یہ عہد اس کی گردن میں باندھا ہوا ہے۔ مطلق مومن اس عہد کا پابند ہے' چاہے وہ جس نبی کے دین پر ایمان لانے والا ہو۔ یہ ایک سنت جاریہ ہے۔ انسانی زندگی کی اصلاح اس کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اس بیعت کے ترک کرنے کی صورت میں کبھی انسانی زندگی میں اصلاح ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (٢ : ٢٥١) (اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعہ روکتا نہ تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا۔

اور دوسری جگہ ہے

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ——— (٢٢ : ٤٠) "اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعہ روکتا نہ تو صومعے' گرجے' عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے' منہدم کر دی جائیں"۔

سچائی نے لازماً اپنی راہ پر گامزن رہنا ہے اور باطل نے لازماً اس کی راہ روکنا ہے بلکہ برائی نے اس پر حملہ آور ہونا ہے۔ دین اسلام نے یہ فریضہ ادا کرنا ہے کہ ان لوگوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے اور طاغوت نے دین اسلام کی راہ کو روکنا ہے' بلکہ طاغوت نے دین اسلام کے مقابلے میں راہ زنی کرنی ہے۔ دین اسلام کو پورے کرۂ ارض پر پھیلانا ہے تاکہ تمام انسانیت کو آزادی بخشی جائے۔ سچائی نے سیدھی راہ لینا ہے اور کسی جگہ بھی ٹیڑھ اختیار نہیں کرنا تاکہ باطل کے لیے کوئی راستہ نکلے۔ جب تک دنیا میں کفر ہے' جب تک باطل موجود ہے' جب تک زمین میں غیر اللہ کی بندگی ہے۔ جس میں انسانیت ذلیل ہو رہی ہو' تب تک جہاد جاری رہے گا اور ہر مسلمان پر معاہدہ جہاد لازم ہے۔ اس نے جہاد میں حصہ لینا ہے' ورنہ دعوائے ایمان جھوٹا ہے۔ حدیث میں آتا ہے

من مات و لم يغز و مات على شعبة من النفاق "جو اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ کی راہ میں غزا نہیں کی تو وہ گویا نفاق کے ایک شعبے پر مرا"۔

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۱۱) ”پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے“۔

پس خوشیاں مناؤ، اپنی جان و مال سے دست بردار ہو جاؤ اور اس کے عوض جنت کو خوشی خوشی قبول کرو، ایک مومن کا نقصان کیا ہے اگر وہ اپنی جان و مال دے دے اور جنت قبول کر لے۔ یہ جان و مال تو اللہ ہی کے تھے اور جان تو بہرحال جانی ہے اور مال تو بہرحال فنا ہونے والا ہے۔ مال تو فنا ہوتا ہے چاہے اسے راہ خدا میں خرچ کیا جائے یا راہ دنیا میں۔ اور جنت تو مفت میں مل رہی ہے۔ حقیقی منافع ہے۔ جنت دائمی ہے اور جو چیز اللہ مانگتا ہے وہ فانی ہے اس لیے خوشیاں مناؤ اس سودے پر۔

ذرا ایمان کی سربلندی کو تو دیکھو! ایک انسان جو اللہ کے لیے جیتا ہے وہ اگر کامیاب رہتا ہے تو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کامیاب ہوتا ہے، اپنے دین کو آزاد کرتا ہے، سربلند کرتا ہے، اور پوری انسانیت کو غیراللہ کی غلامی سے چھڑاتا ہے۔ اور اگر وہ شہید ہو جاتا ہی تو اپنے دین کی راہ میں شہید ہوتا ہے، وہ اپنے دین کے حق میں شہادت حق دیتا ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے دین کی قدر و قیمت اس کی زندگی سے زیادہ ہے۔ وہ اپنی تمام حرکات و سکنات میں یہ بات ثابت کرتا ہے کہ وہ زمین کی آلودگیوں سے بلند ہے، اس کا ایمان ہر قسم کے رنج و الم کو برداشت کرتا ہے۔ اس کے نظریات اس کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہیں۔

یہ ہے اصل کمائی۔ یہ ہے اعلیٰ انسانیت جو دنیا کی ضروریات و مفادات سے بہت بلند ہے۔ اس میں ایمان، دنیاوی مشکلات اور تکلیفات کو برداشت کرتا ہے اور اس انسانیت، بلند انسانیت کے ساتھ جب جنت بھی ملے تو بلا ریب یہ عظیم کامیابی ہے۔

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۱۱) ”پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے“۔

اور پھر یہ الفاظ قابل غور و تدبر ہیں

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ (۹ : ۱۱۱) ”ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے، تورات، انجیل اور قرآن میں“۔

اب ہم اللہ کے اس فرمان پر قدرے غور کرتے ہیں۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ (۹ : ۱۱۱) ”ان سے اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے، تورات، انجیل اور قرآن میں“۔

قرآن کریم میں تو یہ وعدہ مشہور اور مکرر ہے اور اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کے سلسلے میں جہاد ایک بنیادی عنصر ہے اور احیائے اسلام کا ربانی طریقہ کار یہی ہے۔ کیونکہ انسانی سوچ اور انسانوں کی عملی صورت حال میں یہی طریقہ کار کارگر ہو سکتا ہے۔ اور یہ طریقہ کار کسی مخصوص زمان و مکان تک محدود

نہیں ہے' کیونکہ جاہلیت سے ہمارا مقابلہ محض نظریاتی نہیں ہوتا بلکہ جاہلیت ایک ٹھوس عملی معاشرے اور ایک رائج سوسائٹی کی شکل میں ہوا کرتی ہے اور اس کے پاس ٹھوس مادی قوت ہوا کرتی ہے اور جب بھی کوئی دینی تحریک اس دنیا میں اٹھی ہے' جاہلیت نے اس کا عملی مقابلہ کیا ہے اور اس کے مقابلے میں وہ پورے مادی وسائل لے کر میدان میں آئی ہے اور جاہلیت نے ہمیشہ لوگوں کو روکا ہے کہ وہ دعوت اسلامی کی طرف کان لگا کر سنیں بلکہ جاہلیت کا طریقہ واردات ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو آزادی دینے کے بجائے وہ لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں کا غلام بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اور دینی اور اسلامی تحریک جب لوگوں کے سامنے دعوت اسلامی پیش کر کے ان کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرنے اور صرف اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل ہونے کے کام کا آغاز کرتی ہے تو جاہلیت اپنی پوری قوت کے ساتھ راستہ روک لیتی ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اسلام کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ جاہلیت کے مقابلے میں قوت استعمال کرے اور اس قوت کو پاش پاش کر دے جو جاہلیتوں کی سرپرستی کرتی ہی اور مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزادی دلائی جائے جبکہ جاہلیت کا ہدف ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو انسانوں کا غلام رکھتی ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل میں بھی مسلمانوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا تو اس کی قدرے تشریح کی ضرورت ہے۔

اس وقت یہود و نصاریٰ کے ہاں جو کتابیں تورات اور انجیل کے نام سے پائی جاتی ہیں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی کتابیں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھیں بلکہ خود یہود و نصاریٰ اس بات کے قائل ہیں کہ ان کتابوں کا اصلی نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہ کتابیں ان انبیاء کے عرصہ بعد مرتب ہوئیں اور ان سے اسلام کے اصلی اصول غائب ہو گئے۔ صرف وہ باتیں ان میں موجود ہیں جن کا تعلق لوگوں کی یادداشت سے تھا اور اس پر لوگوں نے بار بار اضافہ بھی کیا۔

لیکن اس کے باوجود عہد قدیم کی کتابوں میں جہاد کی طرف اشارات موجود ہیں اور یہودیوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے بت پرست مخالفین کے خلاف جنگ کریں اور اپنے دین اور اللہ کی مدد کریں۔ اگرچہ بار بار کی تحریفات نے ان کے نظریہ جہاد میں کافی تبدیلیاں کر دیں۔

رہیں اناجیل جو اس وقت عیسائیوں کے ہاں مروج ہیں تو ان میں جہاد کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ عیسائیوں کے ہاں جو تصورات رائج ہیں ان کو بدلا جائے۔ کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ تصورات ان انجیلوں کی وجہ سے رائج ہوئے جو حضرت عیسیٰ کے بعد لکھی گئیں اور اس حقیقت کو خود عیسائی محققین تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس بات پر قرآن کریم بھی شہادت دیتا ہے جو کتب سماوی میں سے ایک محفوظ کتاب ہے اور اس کے اندر باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اللہ نے خود اس کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ وہ آگے اور پیچھے سے محفوظ ہے۔

اللہ کا فرمان یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ صفت تورات' انجیل اور قرآن میں موجود ہے اور تینوں کتابوں میں ان کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ ایک فیصلہ کن بات ہے کہ اگر ان کتابوں میں یہ حکم نہیں ہے تو وہ منحرف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس بارے میں ایک مومن اور خدا کے درمیان عہد ہو چکا ہے ہر مومن کے ساتھ مطلقاً" مومن کے ساتھ جب سے اللہ نے رسول بھیجے ہیں تمام مومنین پر جہاد فرض رہا ہے۔

لیکن جہاد فی سبیل اللہ محض جنگ و جدال اور قتل و قتال ہی نہیں ہے ۔ یہ وہ فریضہ ہے جسے اہل ایمان سرانجام دیتے ہیں اور اہل ایمان کے کچھ اصول ہوتے ہیں ان کے اندر کچھ لازمی صفات ہوتی ہیں ان کا ایک مخصوص طرز عمل ہوتا ہے ۔ وہ مومنین جن کے ساتھ اللہ نے سودا کیا ہے وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر درج ذیل صفات ایمانی مذکور ہوتی ہیں ۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (۹: ۱۱۲) "اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے ' اس کی بندگی بجالانے والے ' اس کی تعریف کے گن گانے والے ' اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے ' اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے ' نیکی کا حکم دینے والے ' بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ' (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں ۔)

اَلتَّآئِبُوْنَ (۹: ۱۱۲) وہ اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ توبہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے کیے پر ندامت محسوس کرے اور اپنی بقیہ زندگی میں اللہ کی طرف لوٹ جانے کا عزم کرے اور آئندہ گناہوں سے بچنے کا عزم کرے ۔ توبہ کی حقیقت کی شکل عمل صالح دیتا ہے اور برائی کے ارتکاب سے رک جانے سے توبہ حقیقت کی شکل اختیار کرتا ہے ۔ تو درحقیقت پاکیزگی ' اصلاح ' توجہ اور صفائی کا نام ہے ۔

الْعٰبِدُوْنَ (۹: ۱۱۲) وہ لوگ جو صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہوں ' مراسم عبادت ' بندگی اور اقرار ربوبیت صرف اسی کا کریں ' یہ صفت ان کی زندگیوں میں رچی بسی ہو اور ان کی عملی زندگی میں اس کا شعور ہو ' ان کی زندگی ان کے اس شعور اور صفت کی ترجمان ہو ' یوں کہ وہ اپنے قول ' فعل اور ہر عمل اور ہر سوچ میں اللہ کے مطیع فرمان ہوں ۔ غرض عابدوں کی صفت عملی شکل میں الوہیت اور ربوبیت کے اقرار کا نام ہے ۔

الْحٰمِدُوْنَ (۹: ۱۱۲) ان کے دلوں میں صفت اعتراف موجود ہو کہ اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے اور اس نے انسانوں پر بے شمار انعامات کر رکھے ہیں ۔ ان کی زبانوں پر بھی حمد باری ہو ' خوشی میں بھی اور مشکلات میں بھی ۔ خوشی میں تو وہ حمد اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ کے انعامات ظاہری طور پر موجود ہیں اور مشکلات میں وہ اس لیے شکر کرتے ہیں اور حمد کرتے ہیں کہ مومنین کے لیے ابتلا بھی اللہ کی رحمت ہوتی ہے ۔ ظاہری انعامات میں تو وہ اللہ کی حمد میں رطب اللسان ہوتے ہی ہیں لیکن مشکلات میں بھی وہ اللہ کی حمد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ نے مشکلات میں بھی ان کے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا ' اگرچہ فی الحال وہ اس کو نہیں سمجھتے ۔

السَّآئِحُوْنَ (۹: ۱۱۲) سائحون کے مفہوم میں مختلف روایات ہیں ۔ بعض میں ہے کہ ان سے مراد مہاجرین ہیں ' بعض میں ہے کہ وہ مجاہدین ہیں ' بعض میں ہے کہ طلب علم میں پھرنے والے ہیں ' بعض میں ہے کہ اس

سے صائمون مراد ہیں۔ ہماری رائے میں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے اس کارخانہ قدرت میں غور و فکر کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں دوسری جگہ قرآن مجید کہتا ہے :

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (۱۸۹) اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۰)

(۳:۱۸۹ — ۱۹۰) "زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں 'ان ہوش مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ پروردگار' یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے 'پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

تو یہ عبادت اور حمد کی صفت کے بعد یہاں سائحون کا مفہوم یہی مناسب ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو آسمان و زمین کی ساخت میں فکر کرتے ہیں۔ تو یہ عبادت اور حمد کے بعد اللہ کی کائنات میں غور و فکر ہی انسان کو اللہ کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اس غور و فکر کے ذریعے انسان حکمت تخلیق کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس سچائی کا ادراک کر سکتا ہے جس پر حق قائم ہے۔ صرف ادراک اور علم ہی نہیں بلکہ اس غور و فکر کی اساس پر وہ اپنی سوسائٹی اور اپنے تمدن کی تعمیر کر سکتا ہے۔

الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (۹:۱۱۲) یعنی وہ نماز کے پابند ہیں بلکہ نماز ان کی مخصوص صفت ہے۔ رکوع اور سجدہ ان کی خاص نشانی ہے۔ اور دوسرے لوگوں سے وہ اس صفت کی وجہ سے ممتاز ہیں۔

الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹:۱۱۲) جب ایک ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے جس میں اسلامی شریعت نافذ ہو جائے تو ایسا معاشرہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتا۔ ایسے معاشرے کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام جاری ہوتا ہے۔ اور ایسے معاشرے میں اسلامی شریعت سے جو انحرافات ہوتے ہیں یہ عمل ان کو درست کرتا ہے' لیکن اگر کسی ملک میں اسلامی معاشرہ ہی موجود نہ ہو اور ایک ایسا نظام حکومت موجود نہ ہو جس میں حاکمیت صرف اللہ کی ہو۔ لہٰذا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام صرف یہ ہوگا کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام پر تمام تر توجہات مرکوز کر دی جائیں۔ اور سب سے پہلے اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کو قائم کیا جائے اور نہی عن المنکر کے فریضے کو نہی عن المنکر الاکبر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے یعنی سب سے بڑے منکر کی طرف یہ کہ کوئی طاغوتی حکومت چلائے اور لوگوں پر اللہ کی شریعت کے بجائے انسانوں کی شریعت کے ذریعے حکومت چلائے۔ جو لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے' انہوں نے سب سے پہلے ہجرت اور جہاد کیا اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس میں شریعت رائج کی گئی اور اس میں شریعت کے ذریعے پھر ایک اسلامی معاشرہ قائم کیا جب یہ کام تمام ہوا تو انہوں نے پھر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام شروع کیا اور یہ کام انہوں نے ان شاخوں اور شعبوں میں کیا جس کا تعلق خدا اور رسول کی اطاعت سے تھا۔ ان حضرات نے اسلامی مملکت کے قیام سے قبل اپنی قوت کو کسی اور کام میں صرف نہیں کیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اسلامی حکومت کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی برائیوں سے روکنا اور یہ فریضہ اسلامی مملکت کے قیام سے قبل سرانجام دیا ہی نہیں جا سکتا' اس لیے کہ اسلامی مملکت کا قیام معروف اکبر ہے اور غیر اسلامی حکومت کا وجود ہی منکر اکبر ہے۔ جب تک طاغوتی قوتیں موجود ہوں جو اسلامی شریعت کے سوا کسی اور نظام و قانون کے تحت چلتی ہیں۔ یہ فریضہ سرانجام دیا ہی نہیں جا سکتا ہے اور صحابہ کرام نے یہی طریقہ کار اپنایا۔

وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (۹ : ۱۱۲) یعنی اپنے نفس اور ذاتی زندگی میں اور تمام عوام الناس میں اور پوری سوسائٹی میں اللہ کے حدود کو قائم کرنے والے اور ان قوتوں کا مقابلہ کرنے والے جو ان حدود کو توڑتے ہیں یا ان سے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ فریضہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرح صرف اسلامی حکومت کے بعد ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے اور اسلامی حکومت وہ ہوتی ہے جو اسلامی قانون' اسلامی دستور یعنی اسلامی شریعت کو نافذ کرنے والی ہو اور تمام معاملات میں طاغوتی احکام کو منسوخ کر کے اللہ کے احکام کو رائج کرتی ہو۔ جس میں ربوبیت و حاکمیت صرف اللہ کی ہو اور قانون شریعت کا ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سب کاموں سے قبل اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے جب حکومت قائم ہو گئی تو پھر محافظین حدود اللہ کا کام شروع ہو گا۔ جب کہ حضور اکرمؐ کے دور میں اسلامی حکومت کے قیام کا مرحلہ طے ہوا اور اسلامی معاشرہ قائم ہوا۔ یہ ہے اہل ایمان کی جماعت جس کے ساتھ اللہ نے عہد کیا ہے اور یہ ہیں اس کی صفات و خصوصیات۔ یعنی صفت توبہ جو بندے کو اللہ کی طرف لوٹاتا ہے اور اس کو گناہوں سے روکتا ہے اور عمل صالح پر آمادہ کرتا ہے اور دوسری صفت 'صفت بندگی ہے جو انسان کو اس کے معبود کے ساتھ پیوست رکھتی ہے اور اللہ اس کا قبلہ و کعبہ ہوتا ہے اور خوشی و غم ہر حالت میں اللہ کی تعریف کرنا وہ صفت ہے جو انسان کی جانب سے پوری طرح سر تسلیم خم کرنے کو ظاہر کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اس بندے کو اللہ کی رحمت' مہربانی اور عدل پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ اللہ کی کائنات میں غور و فکر اور اس کے انعامات اور اس کی گہری حکمت میں غور و فکر اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صفات اور آخر میں یہ کہ اللہ کی سرحدوں کی حفاظت کہ ان کو کوئی ضائع نہ کرے' دست اندازی نہ کرے اور ان کا احترام نہ کرے۔

یہ ہے وہ جماعت مسلمہ جس کے ساتھ اللہ نے جنت کا سودا کیا ہے اور جنت کے بدلے ان کا مال اور ان کی جان خرید لی ہے تاکہ وہ اس سنت کو پورا کرے جو اللہ نے آغاز کائنات اور اس وقت سے جاری کر رکھی ہے جب سے اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجنا شروع فرمایا ہے۔ سنت یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد و قتال جاری رہے گا۔ اور یہ کہ اس قتال کے ذریعے ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی جائے گی جو دین کے دشمن ہیں اور اس معرکہ حق و باطل میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا جائے۔ یہ معرکہ حق و باطل اور معرکہ اسلام و جاہلیت' معرکہ شریعت و طاغوت اور معرکہ ہدایت و ضلالت آغاز کائنات سے قائم ہے۔

یاد رہے کہ انسانی زندگی محض لہو و لعب کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ یہ محض کھانے پینے کے لیے وجود میں نہیں

لائی گئی کہ انسان دوسرے حیوانات کی طرح کھائے اور پیے۔اسلام کسی ذلت آمیز سلامتی کا قائل نہیں ہے۔ نہ اسلام اندھی عیش کوشی کا قائل ہے۔ نہ وہ سستی' سلامتی اور عافیت کا روادار ہے۔ اسلام حق کے لیے رزم آرائی کا قائل ہے۔ وہ خیر کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا قائل ہے' وہ کلمتہ اللہ کی حمایت کا قائل ہے اور اس کے نزدیک شہادت فی سبیل اللہ مقصود مومن ہے۔

یہی وہ زندگی ہے جس کی طرف اہل ایمان کو بلایا جاتا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا اللّٰه و للرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸: ۲۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور رسول اللہ کی دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں ایسی بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے"۔ صدق اللہ العظیم۔

○○○

وہ مومن جن کے ساتھ اللہ نے مذکورہ بالا سودا کیا ہے کہ ان کی جان اور مال کے بدلے ان کو جنت دی ہے' وہ ایک علیحدہ امت ہیں اور ان کے درمیان اجتماعیت کی اساس صرف ان کا عقیدہ ہے' ان کے باہم روابط کی اساس صرف ان کا عقیدہ ہے۔ یہ سورت جو آخری سورتوں میں سے ہے اور جو امت مسلمہ اور دوسری رسم کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تعین کر رہی ہے۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کے سوا اجتماعی روابط کے تمام دوسری بنیادوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ فتح مکہ کے بعد اسلامی مملکت اور اسلامی سوسائٹی کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا تھا اور ایسے لوگ اور اقوام اور قبائل بھی اسلامی سوسائٹی میں داخل ہو گئے تھے جو پوری طرح اسلامی سانچے میں ڈھل نہ سکے تھے اور ابھی تک اجتماعیت کی دوسری اساسیں موجود تھیں۔

چنانچہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اس وقت موجود تمام اجتماعی روابط کو مسترد کر کے صرف ایک ہی رابطے کو بحال رکھتے ہیں۔ اور وہ رابطہ ہے یعنی اسلامی نظریے اور عقیدہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا دارومدار صرف اس عقیدے پر ہو گا' دوسری اساسوں پر نہ ہو گا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

"نبی ؐ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں' زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں' چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں' جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ ابراہیم ؑ نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا' مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا' حق یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے۔ جب تک کہ انہیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہئے۔ درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں زمین اور آسمانوں کی سلطنت ہے' اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے اور تمہارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے"۔

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل ایمان اپنے مشرک آباؤ اجداد کے حق میں دعا فرمایا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات یہ مطالبہ کرتے تھے کہ رسول اللہ بھی ان مشرکین کے لیے دعا فرمائیں۔ اس لیے یہ آیات نازل ہوئیں کہ صحابہ کرام کے اندر ان کے ماضی کے تعلقات نسب اور قوم میں سے صرف یہی رابطہ باقی تھا کہ وہ اپنے والدین کے لیے دعا کرتے تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ یہ تعلق بھی باقی نہ رکھا جائے اور اپنے ماضی کو بھلا دیا جائے اور نبی اور اہل ایمان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ ان کی موجودہ پوزیشن کے بھی خلاف ہے اور یہ ان کے نظریہ حیات کے بھی منافی ہے۔ یہ کہ یہ کس طرح معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دوزخی ہیں؟ اس لیے کہ وہ حالت شرک پر وفات پا گئے اور اب کوئی امید نہیں ہے کہ وہ ہدایت پالیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریہ اور عقیدہ ہی وہ اعلیٰ رابطہ ہے جس کے اوپر پوری جمع ہو سکتی ہے۔ جب یہ اجتماعی رابطہ وجود میں آجاتا ہے تو تمام دوسرے روابط جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ نظریاتی اور اہل ایمان کی سوسائٹی کے اندر پھر نسب کی اساس پر کوئی اکٹھ نہیں ہوتا۔ کسی رشتہ داری کی اساس پر کوئی اکٹھ نہیں ہوتا' کسی قومیت کی اساس پر سوسائٹی نہیں بنتی' کسی علاقے اور جغرافیہ کی اساس پر کوئی اجتماع نہیں ہوتا۔ یا تو اسلامی نظریہ اور عقیدہ ہو گا اور دوسرے روابط اسی کے تابع اور اس کی شاخ ہوں گے۔ اور یا ایمان و عقیدہ نہ ہو گا تب دوسرے روابط پر کسی انسان اور انسان کے درمیان روابط ہوں گے اور یہ روابط نہایت ہی بودے ہوں گے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ

عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۹ : ۱۱۴) "ابراہیم ؑ نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا' مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا' حق یہ ہے کہ ابراہیم ؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار

آدمی تھا"۔

اس لیے حضرت ابراہیم ؑ کے استغفار کو دلیل نہ بناؤ' حضرت ابراہیم ؑ نے استغفار اس لیے تھا کہ انھوں نے باپ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے استغفار کرے گا۔ شاید کہ اللہ ان کو ہدایت دے کر مغفرت کر دے۔ حضرت ابراہیم ؑ نے فرمایا تھا۔

قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (٤٧) وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا (٤٨) (١٩: ٤٧ — ٤٨)) سلام ہے آپ کو میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ ہوں گا"۔

لیکن جب ان کا باپ شرک پر فوت ہو گیا اور ابراہیم ؑ کو معلوم ہو گیا کہ ان کا باپ کافر مر گیا ہے اور اب اس کی ہدایت کے لیے کوئی موقعہ باقی نہیں ہے تو اس نے ان سے براءت کا اظہار کر دیا اور ان سے تمام روابط کاٹ دیئے۔ "بے شک وہ نہایت ہی رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار تھے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (٩: ١١٤) "حضرت ابراہیم نہایت رقیق القلب اور حلیم تھے"۔ بہت عاجزی سے دعا مانگنے والے تھے اور اگر ان کو مشکلات پیش آئیں اور ان کو تکلیف دی جائے تو حلیم الطبع تھے۔ ان کے باپ نے بھی ان کو بہت ہی اذیت دی تھی' لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے فوراً براءت کا اظہار کر دیا۔

احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ دو آیات نازل ہوئیں تو وہ لوگ بہت ڈر گئے جو اپنے آباء و اجداد کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ وہ تو منشائے الہٰی کے خلاف عمل کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا وہ گمراہ ہو گئے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ مطمئن ہو جائیں اور یہ قاعدہ طے کر دیا گیا کہ کسی نص کی عدم موجودگی میں کسی فعل پر سزا نہیں دی جا سکتی۔ نیز اگر کسی بات کو جرم نہ قرار دیا گیا اور اس کا اعلان نہ کر دیا گیا تو وہ جرم نہیں قرار دی جا سکتی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (٩: ١١٥) "اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے۔ جب تک کہ انہیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا چاہئے۔ درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو صرف ان امور پر سزا دیتا ہے جن کے بارے میں ان کو صاف صاف بتا دے کہ ان باتوں سے بچو اور ان کا ارتکاب ہرگز نہ کرو' نیز اللہ کے لیے یہ بات بھی شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو محض ایک چھوٹے سے فعل کی

وجہ سے گمراہ قرار دے دے جبکہ اس فعل سے ابھی تک اس نے روکا بھی نہ ہو۔ کیونکہ انسان کا علم محدود ہے۔ وہ از خود تو گمراہی کے اسباب کا پتہ نہیں چلا سکتا' یہ بات صرف اللہ کے علم میں ہے۔ لہٰذا تعلیم اور بیان اسی کی جانب سے ہو گا۔

اللہ نے اس دین کو آسان بنایا ہے' اسے مشکل نہیں بنایا ہے۔ اس لیے اس نے ممنوعات کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور ماموارت کو بھی واضح طور پر بتایا ہے۔ بعض چیزوں کے بارے میں اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے اور ان کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں بتائی ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ ان کے بارے میں کچھ کہنا بھول گیا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ دین میں آسانی رہے اور یہ بھی نہیں بلکہ اللہ نے ایسے امور کے بارے میں پوچھنے سے بھی منع فرمایا تاکہ سوال کے جواب میں سخت حکم نہ آجائے۔ اس لیے کسی قانون ساز ادارے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو حرام قرار دے جن کے بارے میں قرآن و سنت خاموش ہیں' ایسی چیزوں کی ممانعت سے بھی اللہ نے منع فرمایا ہے کیونکہ اللہ رحیم و کریم ہے۔

ان آیات کے آخر میں اور ایسی فضا میں جس میں خون اور نسب کے رشتوں کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ کے دین کے سلسلے میں ذات و اموال کو چھوڑ دینے کا حکم بھی دیا ہے۔ اللہ یہ یقین دہانی فرماتے ہیں کہ وہی تمہارا حامی اور ناصر ہے۔ وہ زمین و آسمان کا مالک و مختار ہے اور زندگی اور موت اس کے اختیار میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۹ : ۱۱۶) "اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں زمین اور آسمانوں کی سلطنت ہے' اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے اور تمہارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمہیں اس سے بچا سکے"۔

جان و مال' زندگی اور موت بلکہ زمین و آسمان سب کے سب اللہ کے ہیں لہٰذا حامی اور ناصر بھی اللہ ہے۔ یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس میں تصرف کر سکے۔ لہٰذا اللہ کے ساتھ جس کا رشتہ جڑ جائے۔ اسے اور رشتوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

یہ بار بار کی تاکیدیں' اور یہ قطعی بیانات اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی تک بعض لوگوں کے نزدیک خون اور نسب کے رشتے اہمیت رکھتے تھے کیونکہ اس وقت کے عربی معاشروں میں ان کی اہمیت موجود تھی' اس لیے بعض لوگوں کے دلوں میں ابھی تک یہ خلجان تھا کہ وہ صدیوں کے ان روابط کو چھوڑ کر کس طرح خالص نظریاتی روابط اختیار کر لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں قطعی اور فیصلہ کن انداز بیان اختیار فرمایا اور یہ پوری سورت بھی اسلامی اور غیر اسلامی معاشروں کے درمیان روابط کی فیصلہ کن شکل متعین کرتی ہے۔ یہاں تک کہ کسی غیر مسلم اور مشرک کے لیے استغفار تک جائز نہیں ہے۔ اور اس کے بارے میں سختی کی گئی۔ یہ سختی اس لیے کی گئی کہ لوگ تمام جاہلانہ روابط اور ہمدردیاں چھوڑ دیں۔

صرف نظریاتی بنیادوں پر سوسائٹی کی تشکیل تحریک اسلامی کا اصول اول ہے۔ یہ اعتقادی اور نظریاتی اصول ہے اور حرکت اور پھیلاؤ کے لیے بھی یہی اصول اختیار کیا گیا ہے۔ اس اصول کا اس سورت میں بار بار نہایت ہی قطعی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ اس سودے کا یہ مزاج تھا کہ کوئی بھی چیز تمہاری نہیں ہے۔ تم فروخت کر چکے ہو' تو ایسے حالات میں ایسے لوگوں کے لیے جو جہاد پر قدرت رکھتے ہوں اور وہ جہاد میں شرکت نہ کریں' ایک نہایت ہی مکروہ غلطی تھی' چاہے سبب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس جنگ میں بعض لوگوں سے کمزوریوں کا ظہور ہوا تھا' اس پر غور و فکر کی نہایت ضرورت تھی' چنانچہ

اگلی آیات میں بتایا جاتا ہے کہ جن لوگوں سے غلطیوں کا ظہور ہوا وہ اگرچہ بڑی غلطیاں تھیں لیکن اللہ چونکہ بڑا کریم ہے۔اس نے ان غلطیوں سے درگزر فرمایا۔یہ غلطیاں کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔اس کے ساتھ ساتھ ان تین افراد کی معافی کا بھی اعلان کر دیا گیا جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا' اور انہوں نے اپنا یہ طویل وقت بڑے کرب سے گزارا تھا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ
سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ
عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٧﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا
ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ
لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ ١٤
الرَّحِيْمُ ﴿١١٨﴾ ع ٨
٣

”اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا۔اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے' (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی کا ساتھ دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا' بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے۔اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے“۔

نبی کو معاف کر دینے کا کیا مفہوم ہے؟ اگر غزوۂ تبوک کے تمام واقعات پر نظر ڈالی جائے تو اس کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔اس کا تعلق ایک سابقہ آیت سے ہے جس میں کہا گیا ہے

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ

(٩ : ٤٣) ”اللہ نے آپ کو معاف کر دیا کہ کیوں آپ نے ان کو اجازت دی' تاکہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ کون سچا ہے اور آپ جھوٹوں کو بھی معلوم کر لیتے“۔یہ اس وقت کی بات ہے کہ لشکر کی روانگی کے وقت بعض ایسے لوگ جو اس جنگ میں جانے کی قدرت تو رکھتے تھے مگر انہوں نے بہانہ سازی کی اور جھوٹے عذرات پیش کیے اور آپ نے ان کو

اجازت دے دی۔ یہ حضورؐ کا اجتہادی فعل تھا اللہ نے اسے معاف کر دیا۔ حالانکہ بہتر یہ تھا کہ آپ اجازت نہ دیتے' انتظار فرماتے اور معلوم ہو جاتا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ اور مہاجرین و انصار کی توبہ اور معافی کا کیا مطلب ہے؟ اس کی طرف زیر تفسیر آیت اشارہ کر رہی ہے جس میں ان حالات کی طرف اشارہ جن میں انصار و مہاجرین نے اسلام کے لیے کام کیا۔

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ (۹ : ۱۱۷) "جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت نبی کا ساتھ دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے"۔ ان میں سے بعض نے جنگ کے لیے نکلنے میں سستی کی لیکن بعد میں لشکر کے ساتھ جا ملے اور یہ مخلص ترین مومن تھے۔ بعض منافقین کے اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے کہ رومی بہت بہادر ہیں لیکن ان کے دل بھی بعد میں مضبوط ہو گئے' لیکن ان کو قدرے تردد رہا۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم غزوۂ تبوک کے بعض حالات یہاں درج کر دیں تاکہ اس غزوے کی فضا میں ان آیات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ کیونکہ اس غزوے کے موقعہ کو اللہ نے ساعۃ العسرۃ کہا ہے۔ یہاں تو خلاصہ دیا جا رہا ہے سیرۃ ابن ہشام' المقریزی' بدایہ والنہایہ اور تفسیر ابن کثیر سے دے رہے ہیں تاکہ اس غزوے کے حقیقی تاثرات اور اقدامات ہماری سمجھ میں آجائیں۔

غزوۂ تبوک کا آغاز سورت توبہ کی اس آیت کے نزول سے ہوتا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے' جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے' اسے حرام قرار نہیں دیتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے' یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں"۔

اس آیت کے نزول کے بعد حضور اکرمؐ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ رومیوں کے ساتھ جنگ کی تیاری کریں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اس سے پہلے بھی غزوۂ موتہ کے موقعہ پر رومیوں سے جنگ ہو چکی تھی' اس آیت کا نزول دراصل اس منصوبے کی آخری کڑی تھی جو روز اول سے اسلامی تحریک کے پیش نظر تھا۔ بہرحال یہ حکم بہت مشکل حالات میں آیا۔ بہت شدید گرمی تھی' خشک سالی تھی' باغات اور کھجوروں کے پھل تیار ہو رہے تھے اور لوگ پسند کرتے تھے کہ اپنے ہرے بھرے باغوں کی چھاؤں میں آرام کریں اور پھل کھائیں اور وہ ان حالات اور ایسے اوقات میں سفر کے لیے تیار نہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ جب کبھی کسی مہم کے لیے تیاری فرماتے تو لوگوں کو اپنا اصل

ٹارگٹ نہ بناتے ، مگر غزوۂ تبوک کے بارے میں آپ نے صاف صاف بتا دیا اس لیے کہ حالات نہایت ناساعد تھے ، سفر دور کا تھا اور جس دشمن سے مقابلہ درپیش تھا وہ تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ تاکہ لوگ اچھی طرح تیاری کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لیے تیاری کریں۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ رومیوں کے ساتھ جنگ ہوگی۔

بعض منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ عذر پیش کیا کہ رومیوں کی عورتیں بہت خوبصورت ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ وہ فتنے میں پڑ جائیں گے۔ آپ نے ان کو چھٹی دے دی۔ اس پر حضورؐ سے باز پرس کی گئی کہ آپ نے یہ اجتہادی فیصلہ درست نہیں کیا ، فرمایا :

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ

(۹ : ۴۳) ”اللہ نے آپ کو معاف کر دیا کہ کیوں آپ نے ان کو اجازت دی ، تاکہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ کون سچا ہے اور آپ جھوٹوں کو بھی معلوم کر لیتے“۔

منافقین میں سے بعض نے دوسروں کو یہ مشورہ بھی دیا

لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ ”گرمی میں نہ نکلو“۔ یہ لوگ جہاد کی اہمیت کو نہ جانتے تھے اور انہیں اسلام کی حقانیت میں شک تھا ، اور یہ لوگ رسول اللہؐ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی :

قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ (۸۱)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹ : ۸۱ — ۸۲) ”اور انہوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو جہنم کی گرمی زیادہ شدید ہے ، کاش کہ وہ سمجھتے ، انہیں چاہئے کہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ ، بوجہ ان اعمال کے جو وہ کما رہے ہیں۔ اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ ، اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہئے)“۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی کہ سویلم یہودی کے گھر پر کچھ لوگ اجتماع کر رہے ہیں۔ اور وہ لوگوں کو اس پر آمادہ کر رہے ہیں کہ غزوۂ تبوک کی مہم میں رسول اللہ کو چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ رہیں ، حضورؐ نے حضرت طلحہ ابن عبید اللہ کی سربراہی میں اپنے کچھ ساتھی بھیجے اور حکم دیا کہ ان کو اسی حالت میں سویلم کے گھر میں جلا دیا جائے۔ حضرت طلحہ نے ایسا ہی کیا۔ ان میں سے ایک شخص ضحاک ابن خلیفہ گھر کی پشت سے کودا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور اس کے ساتھی بھی بھاگ کر نکل گئے۔ بعد میں ضحاک نے توبہ کر لی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر کی تیاریوں میں سخت جدوجہد کی اور ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ جلدی کریں اور تیار ہو جائیں۔ مالدار لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اخراجات کا بندوبست کریں۔ آپ نے ان مجاہدین کے لیے سواریوں کا بندوبست فرمایا جن کے پاس سواری نہ تھی۔ چنانچہ بعض اہل ثروت نے فی سبیل اللہ لوگوں کے لیے سواریوں کا بندوبست

کیا۔ حضرت عثمان ابن عفان ایسے لوگوں کے صف اول میں تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے اس قدر خرچ کیا جس کی مثال آج تک نہیں ہے۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمر نے غزوۂ تبوک جیسی مشکل مہم میں ایک ہزار دینار عطا کیے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا "اے اللہ عثمان سے راضی ہو جا کیونکہ میں اس سے راضی ہوں"۔ عبداللہ ابن احمد نے اپنے والد کی مسند میں عبدالرحمٰن ابن خباب سلمی سے روایت کی ہے کہ اس موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر فرمائی اور لوگوں کو اس مشکل مہم پر آمادہ کیا' تو حضرت عثمان نے فرمایا میں سو اونٹ مع سازوسامان دوں گا۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر کی ایک سیڑھی نیچے آگئے اور مزید عطیات کے لیے کہا اور لوگوں کو آمادہ کیا تو حضرت عثمان نے فرمایا میں مزید ایک سو اونٹ مع سازوسامان دوں گا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں (عبدالصمد نے اپنا ہاتھ نکال یوں اشارہ کیا جس طرح کوئی تعجب کرتا ہے) اور فرمایا "اس کے بعد عثمان اگر عمل نہ کرے تو اس پر کوئی گرفت نہیں ہے"۔ (ترمذی نے محمد ابن یسار' ابو داؤد عباسی' سکن ابن مغیرہ سے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ غریب من ھذا الوجہ) نیز است بیہقی نے عمر ابن مرزوق سکن ابن مغیرہ سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حضورؐ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے اور یہ کہ حضرت عثمان نے تین صد اونٹوں کا ذمہ لیا مع سازوسامان کے۔

ابن جریر نے بروایت یحییٰ ابن ابو کثیر' سعید' قتادہ اور بروایت ابن ابو حاتم بواسطہ حکم ابن ابان' عکرمہ سے مختلف الفاظ میں روایت کی ہے کہ حضورؐ نے لوگوں کو اعانت دینے پر آمادہ فرمایا تو عبدالرحمٰن ابن عوف چار ہزار روپے لے کر آئے تو انہوں نے فرمایا میرا کل سرمایہ آٹھ ہزار ہے۔ میں نے نصف صدقہ کر دیا ہے اور نصف باقی چھوڑا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "اللہ اس میں بھی برکت دے جو تو نے صدقہ کیا اور اس میں بھی جو تو نے روک لیا"۔ ایک شخص ابو عقیل ایک صاع کھجور لے کر آیا کہ حضور میرے پاس دو صاع کھجور ہی تھے۔ میں نے ایک صاع اپنے اہل و عیال کو دے دیا ہے اور ایک بطور صدقہ لایا ہوں۔ کہتے ہیں منافقین نے اس پر یہ طعن کیا کہ ابن عوف نے بطور ریاکاری اس قدر مال دیا ہے اور ابن عقیل کے صدقہ سے کیا اللہ اور رسول اللہ کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔

بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے ابن عقیل کے بارے میں کہا کہ وہ اپنا نام لکھوانا چاہتا تھا' حالانکہ اس شخص نے پوری رات ایک یہودی کے ہاں مزدوری کی' اس نے اسے دو صاع کھجوریں دیں جس میں ایک صاع اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی۔

اس کے بعد ایک گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ یہ رونے والوں کا گروہ تھا۔ یہ گروہ سات انصاریوں پر مشتمل تھا۔ یہ غریب لوگ تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ارض جہاد تک ان کو سواری فراہم کی جائے تو حضورؐ نے فرمایا اب تو میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ لوگ لوٹ گئے لیکن ان کی آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں' اس لیے کہ ان کو سواری نہ مل سکی اور خود وہ غریب تھے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ ابن یامین ابن عمیر ابن کعب 'نضری ابویعلی عبدالرحمٰن ابن کعب اور عبداللہ ابن مغفل سے ملا (یہ ان سات آدمیوں میں سے تھے) یہ رو رہے تھے تو اس نے پوچھا تم رو کیوں رہے ہو؟ انہوں نے کہا ہم رسول اللہ کے پاس آئے تھے کہ آپ ہمیں سواری عطا کریں تو آپ کے پاس کوئی گنجائش نہیں رہی اور

خود ہماری مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم بندوبست کر سکیں۔ چنانچہ اس کے پاس پانی کھینچنے والا ایک اونٹ تھا' اس نے ان کو دے دیا۔ یہ دونوں اس پر سوار ہو کر چل پڑے۔ اس نے ان کو کچھ کھجوریں بھی دے دیں اور یہ دونوں رسول اللہ کے ساتھ ہی چل پڑے۔

یونس ابن بکیر نے ابن اسحاق سے مزید یہ روایت کی ہے کہ علیہ ابن زید جو ان سات رونے والوں میں سے ایک تھا' رات کو نکلا اور رات کو نماز پڑھتا رہا اور روتا رہا۔ اور دعا مانگتا رہا۔ اے اللہ تو نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے لیکن یہ آپ ہی ہیں جس نے مجھے غریب پیدا کیا ہے' پھر آپ ہی نے رسول اللہ کو اس قدر مالی وسائل نہ دیئے کہ وہ مجھے سواری عطا کرتے' اے اللہ میں اپنی تمام تکالیف کا اجر خواہ ان کا تعلق میری ذات سے ہو' میرے مال سے ہو' میری آبرو سے' تمام مسلمانوں پر صدقہ کرتا ہوں۔

صبح ہوئی تو یہ شخص بھی تمام اہل اسلام میں آکر بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا آج رات جس شخص نے صدقہ کیا ہے وہ کہاں ہے؟ کوئی شخص نہ اٹھا' پھر حضورؐ نے فرمایا: "کون ہے آج رات کو صدقہ کرنے والا' اسے چاہئے کہ وہ کھڑا ہو جائے' یہ کھڑے ہوگئے اور انہوں نے حضورؐ کے سامنے رات کا واقعہ پیش کیا۔ رسول اللہ نے فرمایا: تمہارے لیے خوشخبری ہے' خدا کی قسم تمہارے لیے آنے والی زکوٰۃ میں لکھ دیا گیا ہے"۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے' آپؐ کے ساتھ مدینہ و اطراف مدینہ سے تقریباً تیس ہزار افراد تھے۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کی نیت سست رہی لیکن کسی شک یا بے یقینی کی وجہ سے نہیں' ان میں کعب ابن مالک' مرارہ ابن الربیع اور ہلال ابن امیہ شامل تھے (یہ وہی تین افراد ہیں جن کے بارے میں تفصیلات آ رہی ہیں) نیز ابوحیثمہ' عمر ابن وھب الجمحی حضورؐ نے ثنیۃ الوداع میں لشکر کا پڑاؤ کیا اور عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین نے اپنے لشکر کو علیحدہ نیچے کی طرف فروکش کیا۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ لوگ دو لشکروں سے کم تھے' لیکن دوسری روایات بتاتی ہیں کہ جو لوگ عملاً رک گئے وہ سو سے کم تھے۔ جب حضورؐ چلے گئے تو عبداللہ ابن ابی اپنے منافقین اور اہل شک ساتھیوں کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر روانہ ہوا۔ بعض لوگ آپ سے پیچھے رہ جاتے' لوگ کہتے حضورؐ فلاں تو راستے میں رہ گیا۔ حضور فرماتے چھوڑو اسے اگر اس میں کوئی بھلائی ہوئی تو ہمارے ساتھ آملے گا اور اگر اس میں کوئی بھلائی نہ ہوئی تو اللہ نے اسے ہٹا کر تمہیں مطمئن کر دیا۔ یہاں تک کہ حضورؐ سے کہا گیا کہ ابوذر بھی پیچھے رہ گئے ہیں حالانکہ ان کا اونٹ سست رفتار تھا تو حضورؐ نے یہی فرمایا: اسے چھوڑو' اگر اس میں کچھ بھی بھلائی ہوئی تو اللہ اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اللہ نے تمہیں اس سے آرام میں کر دیا"۔ ابوذر نے اپنے اونٹ کا انتظار کیا۔ جب اونٹ کی رفتار مزید سست ہوئی تو اس نے اپنا سامان خود اپنے کاندھوں پر لیا اور رسول اللہ کے پیچھے چلتا رہا۔ حضورؐ کسی جگہ فروکش تھے کہ کسی نے خبر دی کہ حضور ایک شخص پیدل چلتا ہوا آ رہا ہے تو حضورؐ نے فرمایا= "خدا کرے ابوذر ہو"۔ جب لوگوں نے اسے اچھی طرح دیکھا تو پکار اٹھے حضور یہ ابوذر ہی ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا= "اللہ ابوذر پر رحم فرمائے کہ وہ اکیلا چل رہا ہے' اکیلا رہے گا اور اکیلا قیامت کے دن اٹھایا جائے گا"۔

پھر ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکلے ہوئے چند دن ہوئے تھے کہ ایک دن سخت گرمی تھی اور ابوحیثمہ گھر آئے' دیکھا کہ اس کے باغ میں اس کی دونوں عورتوں نے اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چھڑکاؤ کیا ہوا ہے۔ پانی ٹھنڈا کیا ہوا

ہے 'کھانا تیار کیا ہوا ہے ' جب وہ اندر آئے تو ایک جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہو گئے ۔ اس نے اپنی دونوں بیویوں کو دیکھا اور انہوں نے اس کے لیے جو تیاری کی تھی اس پر بھی نگاہ ڈالی تو چیخ اٹھے ' اوہ ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو گرمی میں شرابور ہیں اور لو میں چل رہے ہیں اور ابو حیثمہ یہاں ٹھنڈی چھاؤں ' خوبصورت عورتوں مین کھا پی رہا ہے اور اپنے مال میں مقیم ہے ۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہیں ہے ؟ اس کے بعد اس نے کہا : خدا کی قسم میں تم میں سے کسی ایک کی جھونپڑی میں داخل نہ ہوں گا جب تک میں رسول اللہ تک جا نہ پہنچوں ۔ لہٰذا دونوں میرے لیے زاد راہ تیار کرو ' دونوں نے تیار کیا ' پھر اپنے آس پاس کے اونٹ کو تیار کیا اور رسول اللہ کی تلاش میں نکلے ۔ یہ حضورؐ کے پاس اس وقت پہنچے جب حضورؐ میدان تبوک میں تھے ۔ ابو حیثمہ کو ایک دوسرے شخص عمیر ابن وھب الجمحی بھی راستے میں مل گئے تھے ۔ یہ بھی رسول اللہ کی تلاش میں تھے ۔ لہٰذا دونوں ساتھی بن گئے تھے ۔ جب یہ دونوں تبوک کے قریب پہنچے تو ابو حیثمہ نے عمیر سے کہا : بھائی میں تو قصور وار ہوں اس لیے آپ ذرا پیچھے رہ جائیں تاکہ میں حضور کے ہاں حاضری دے دوں ' عمیر ابن وھب ذرا رک گئے جب یہ حضورؐ کے قریب پہنچ گئے ' اس وقت حضورؐ تبوک میں اترنے ہی والے تھے ' تو لوگوں نے کہا راستے میں ایک شخص دوڑتا ہوا آ رہا ہے تو حضورؐ نے فرمایا : "خدا کرے ابو حیثمہ ہو" ۔ تو لوگوں نے کہا : حضورؐ خدا کی قسم وہ ابو حیثمہ ہی ہے ۔ اس نے اونٹ کو بٹھایا اور حضورؐ کو سلام کیا تو حضورؐ نے اسے کہا : "ابو حیثمہ تمہارے لیے بہت اچھا ہوا" ۔ (یہ لفظ سرزنش کا تھا) اس کے بعد ابو حیثمہ نے حضورؐ کو پوری کہانی سنائی تو حضورؐ نے اس کے عمل کو پسند کیا اور دعا فرمائی ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ منافقین کا ایک گروہ ' جس میں ودیعہ ابن ثابت برادر بنی عمرابن عوف اور ایک اشجعی جو بنی سلمہ کا حلیف تھا ' اس کا نام مخشن ابن حمیر تھا اور اسے مخشی بھی کہتے تھے ' یہ کہتا تھا تم رومیوں کے ساتھ جنگ کو عربوں کی باہم لڑائیوں پر قیاس کرتے ہو ۔ ان کا اشارہ رسول اللہ کے سفر تبوک کی طرف تھا ۔ یہ لوگ کہتے خدا کی قسم ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم لوگ رسیوں میں باندھے جا رہے ہو ' یہ لوگ مومنین کے اندر بد دلی پیدا کر رہے تھے ۔ مخشن ابن حمیر نے کہا : "خدا کی قسم تم جو باتیں کر رہے ہو ' اگر ہمارے بارے میں یہ فیصلہ ہو کہ ہمیں سو سو کوڑے لگائے جائیں اور ہمارے بارے میں قرآن نازل نہ ہو تو یہ فیصلہ مجھے پسند ہو گا" ۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضورؐ نے ان کے پاس عمار ابن یاسر کو بھیجا اور کہا : "ان لوگوں کو سنبھالو یہ تو جل گئے ۔ تو عمار ان سے پوچھو کہ تم کیا باتیں کر رہے ہو ؟ اگر وہ انکار کریں تو انسے یہ یہ کہو ۔ عمار ان کے پاس گئے ' ان سے وہ بات کی ' یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے اور معذرت کی ۔ ودیعہ ابن ثابت نے کہا : (اس وقت رسول اللہ اپنی اونٹنی پر کھڑے تھے ' ودیعہ نے اس وقت حضورؐ کے اونٹ کی وہ رسی پکڑی ہوئی تھی جو پیٹ پر باندھی جاتی ہے ' اور یہ کہہ رہا تھا "حضور ہم تو گپ شپ لگا رہے تھے" اس پر یہ آیت نازل ہوئی

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (٩ : ٦٥) "اگر تم ان سے پوچھو تو کہیں گے ہم تو ہنسی مذاق کر رہے تھے ۔ کہہ دیجئے کہ اللہ ' اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ تم مذاق کر رہے تھے" ۔ مخشن ابن حمیر نے کہا اور اس آیت میں جن لوگوں کو

معاف کیا گیا تھا ان میں سے مخشن ابن حمیر بھی تھا۔ اس نے اپنا نام عبدالرحمن رکھ لیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ اسے شہید کے طور پر مارے اور اس کی شہادت یوں ہو کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں مارا گیا۔ چنانچہ جنگ یمامہ میں وہ مارا گیا۔ لیکن کسی کو اس کا کوئی اتا پتہ نہ ملا۔

ابن لھیعہ نے عروہ ابن زبیر سے بواسطہ ابوالاسود روایت کی ہے کہ جب حضور تبوک سے واپس ہوئے' حضور نے دس سے کچھ زیادہ راتیں وہاں گزاریں اور وہاں کوئی جنگ نہ ہوئی تو بعض منافقین نے آپ کے قتل کی سازش تیار کی۔ راستے میں ایک گھاٹی آتی تھی۔ راستہ تنگ تھا' ان لوگوں نے سوچا کہ حضورؐ کو اس گھاٹی سے گرا دیں' اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اطلاع حضورؐ کو دے دی' آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ وادی سے نکلیں اور آپ گھاٹی پر چڑھ گئے اور یہ سازشی آپ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ حضورؐ نے اس موقعہ پر عمار ابن یاسر اور حذیفہ ابن یمان کو حکم دیا کہ یہ دونوں آپ کے ساتھ رہیں' عمار نے لگام تھام رکھی تھی اور حذیفہ پیچھے سے اسے چلا رہے تھے۔ یہ لوگ جا رہے تھے کہ یہ سازشی چڑھ آئے' حضورؐ کو سخت غصہ آیا اور حذیفہ نے بھی حضور کی غضبناکی کو محسوس کر لیا۔ حذیفہ ان لوگوں کی طرف لوٹے اور ان کے پاس ایک ڈھال تھی انہوں نے اپنی ڈھال سے ان کی سواریوں کو روکا تو جب ان سازشیوں نے دیکھا کہ حذیفہ ان کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ان کو معلوم ہو گیا کہ جو عظیم سازش انہوں نے تیار کی تھی وہ تو طشت از بام ہو گئی ہے۔ یہ لوگ بھاگے اور لوگوں میں مل گئے۔ حضرت حذیفہ بھی واپس لوٹے اور حضورؐ کے ساتھ جا ملے' حضورؐ نے دونوں کو حکم دیا کہ جلدی کریں تو انہوں نے اس دشوار گزار راستے کو طے کر لیا۔ اب حضورؐ کھڑے ہو گئے اور لوگوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ پھر حضورؐ نے حذیفہ سے کہا "کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا؟" تو حذیفہ نے کہا کہ میں نے رات کے اندھیرے میں جب انہیں گھیرا تو میں صرف ان کی سواریوں کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کے ارادے کیا تھے؟" دونوں نے کہا نہیں۔ تو حضورؐ نے بتایا کہ یہ لوگ حضورؐ پر برے ارادے سے حملہ کرنا چاہتے تھے' حضورؐ نے ان دونوں کو ان کے نام بھی بتا دیئے تو انہوں نے کہا حضورؐ کیا آپ اجازت نہیں دیتے کہ ہم انہیں قتل کر دیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ کہیں کہ محمدؐ نے اپنے ساتھی قتل کرنا شروع کر دیئے۔

اس قصے کو ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے لیکن اس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے صرف حذیفہ ابن یمان کو ان لوگوں کے نام بتائے تھے اور یہ زیادہ مناسب ہے۔ اس مہم میں مسلمانوں کو جو مشکلات درپیش ہوئیں اس کے بارے میں بعض روایات وارد ہیں۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں اور دوسرے مفسرین بھی فرماتے ہیں کہ یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

(۹ : ۱۱۷) "اللہ نے معاف کر دیا نبیؐ کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبیؐ کا ساتھ

دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے '(مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی کا ساتھ دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کر دیا' بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے"۔

یہ اس طرح کہ مسلمان اس جنگ کے لیے نہایت ہی مشکل حالات میں نکلے تھے' یہ سال خشک سالی کا تھا' سخت گرمی تھی اور راشن اور پانی کی بے حد تکلیف تھی۔ قتادہ کہتے ہیں لوگ شام کی طرف بطرف تبوک نکلے' جھلسا دینے والی دھوپ تھی' اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ لشکر کن مشکلات میں نکلا' راستے میں اس قدر مشکلات پیش آئیں کہ دو افراد ایک کھجور کو نصف کر کے چوستے اور بعض اوقات ایک ہی کھجور کو باری باری چوستے اور اوپر پانی پی لیتے تو اللہ نے ان پر یہ مہربانی فرمائی کہ ان کے لشکر کو تبوک سے واپس کر دیا۔

ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر سے پوچھا گیا کہ جنگ تبوک کی سختیاں کیسی تھیں؟ تو انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تبوک کی طرف نکلے' ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں پانی نہ تھا' لوگ پیاس سے نڈھال ہو گئے' یوں نظر آتا شاید ہماری گردنیں تن سے جدا ہو جائیں گی' ایک شخص پانی کی تلاش میں پھرتا' مایوس ہو کر اسے یوں لگتا کہ شاید اس کا سر تن سے جدا ہو کر گر پڑے گا' لوگ اونٹ ذبح کر کے اس اوجھ سے غلاظت کو نچوڑتے تھے اور اس سے پیاس بجھاتے تھے اور باقی حصہ اپنے جگر پر ملتے تھے۔

ابن جریر لکھتے ہیں کہ ساعة العسرة سے مراد یہ ہے نفقہ' سواری اور پانی کی تنگی تھی اور

مِنۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِّنۡهُمۡ (۹:۱۱۷) سے مراد یہ ہے کہ ان کے دل سچائی سے کجی کی طرف مائل ہونے کو تھے۔ اس سفر میں لوگ اس قدر مشقت سے دوچار ہوئے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے دین میں شک کرنے لگے تھے لیکن اللہ نے ان کی طرف رجوع کیا۔ وہ حق کی طرف مائل ہو گئے اور انہوں نے ثابت قدمی اختیار کی۔ بے شک اللہ کا برتاؤ نہایت ہی مہربانی کا تھا۔ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۹:۱۱۷) ان حوالوں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اس غزوہ میں حالات کس قدر دگرگوں تھے اور اس میں ایک مسلمان کے لمحات کس قدر مشکل سے گزر رہے تھے' انسانوں کی ایمانی کیفیت میں لمحہ بہ لمحہ کس طرح تبدیلی ہو رہی تھی' بعض لوگ تو پختہ یقین کے مالک تھے' بعض لوگ اس غزوے کی مشکلات میں متزلزل ہو گئے' کچھ بیٹھ ہی گئے' بعض دین کو سچا سمجھتے ہوئے سستی کر گئے' بعض نفاق کا شکار ہو گئے' بعض دشمنی پر اتر آئے' بعض سازشیں کرنے لگے۔ ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اسلامی سوسائٹی میں کیسے کیسے لوگ موجود تھے' جبکہ اسلامی سوسائٹی نہایت ہی نامساعد حالات کے باوجود رومیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی' ان مشکل حالات میں اس مہم کا برپا کرنا درحقیقت کھرا کھوٹا معلوم کرنا تھا' اللہ تعالیٰ کی منشاء یہ تھی اسلامی سوسائٹی میں سے کھوٹے لوگ چھٹ کر رہ جائیں اور یہ فیصلہ اللہ نے اس لیے فرمایا تھا کہ کھرے کھوٹے کو صاف صاف جدا کر دیا جائے۔

یہ تھے وہ مشکل حالات جن میں پیچھے رہنے والے پیچھے رہ گئے اور ان میں سے اکثریت منافقین کی تھی جن کی تفصیلات اس سے قبل بیان ہو چکی ہیں اور بعض سچے مسلمان بھی تھے جو شک و نفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ محض سستی' کاہلی اور آرام طلبی کی وجہ سے رہ گئے تھے' یہ لوگ دو گروہ تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جن کے بارے میں فیصلہ پہلے ہو چکا ہے' یہ وہ

لوگ تھے جن کے اعمال خلط ملط تھے' بعض اچھے تھے اور بعض برے تھے۔ انہوں نے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر لیا تھا اور دوسری جماعت وہ تھی۔

مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ (۹ : ۱۰۶) "جن کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا گیا تھا کہ یا ان کو سزا دے دے یا معاف کر دے"۔ اور یہ لوگ تین افراد تھے۔ ان کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا اور فیصلے کا انتظار تھا۔ ان کے معاملے کی تفصیلات درج ذیل ہیں اور یہ فیصلہ بڑی تاخیر سے آیا تھا۔ آیت ان کے حال کی جس طرح تصویر کشی کر رہی ہے' اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سے ایک شخص خود اپنے حالات کو بتائے۔ یہ ہیں حضرت کعب ابن مالک۔ امام بخاری اور امام مسلم نے زہری' عبدالرحمٰن ابن عبداللہ ابن کعب ابن مالک' یہ بنی کعب کے سربراہ تھے اور اندھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے کعب ابن مالک سے خود یہ بات سنی ہے کہ وہ کس طرح رسول اللہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ کعب کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ کے تمام غزوات میں ان کے ساتھ رہا' سوائے تبوک کے۔ ہاں غزوۂ بدر میں بھی میں شریک نہ تھا لیکن اس وقت رسول اللہ اور مسلمان قریش کے قافلے پر حملے کے ارادے سے نکلے تھے اور اچانک دشمن کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی تھی اور اس غزوے میں جو لوگ شریک نہ ہوئے تھے ان میں سے کسی سے حضورؐ نے بازپرس بھی نہ فرمائی تھی۔

میں عقبہ ثانیہ کی رات بھی حاضر تھا جب ہم نے اسلام قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ میں اس بات کی تمنا نہیں کرتا کہ لیلۃ عقبہ کے بدلے میں' میں بدر میں ہوتا' اگرچہ لوگوں میں بدری ہونا زیادہ قابل فخر ہے۔ تو میرے پیچھے رہنے کی کہانی یہ ہے کہ جن حالات میں' میں پیچھے رہ گیا ان میں میرے مالی و جسمانی حالات بہت اچھے تھے اور اس وقت جس قدر میں خوش حال تھا ایسا کبھی نہ تھا۔ اس سے قبل میرے پاس کبھی دو سواریاں نہ تھیں۔ اس غزوہ کے موقعہ پر میں نے دو سواریاں تیار کی تھیں۔ اس سے قبل رسول اللہ جو مہم شروع کرتے اسے نہایت ہی خفیہ رکھتے اور ان کا ظاہری اشارہ دوسری طرف ہوتا۔ یہ مہم حضورؐ نے سخت گرمی میں شروع کی۔ اس میں سفر دوری کا تھا' راستے میں نشیب و فراز تھے اور دشمن کی تعداد زیادہ تھی۔ حضورؐ نے احکامات صادر کر دیئے کہ اس مہم کے لیے تیاری کروں' لوگوں کو صاف صاف بتا دیا گیا کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ اب مسلمان اس قدر زیادہ ہو گئے تھے کہ ان کی تعداد کو کوئی کتاب منضبط نہ کر سکتی تھی۔

کعب فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی چھپنا چاہتا تھا وہ یہی سمجھتا تھا کہ جب تک وحی نازل نہ ہو اس کا حال چھپا ہی رہے گا۔ یہ مہم حضورؐ نے اس وقت شروع کی جب پھل پک گئے تھے' باغوں کے سائے گہرے تھے اور میں ان کا دلدادہ تھا۔ حضورؐ نے اس جنگ کے لیے تیاری کی' تمام مسلمان آپ کے ساتھ تھے' میں بھی روز سوچتا کہ جاؤں اور مسلمانوں کے ساتھ تیاری کروں' مگر میں بغیر کسی فیصلے کے لوٹ آتا۔ میں دل میں کہتا اچھا تیاری کی کیا ضرورت ہے' جب چاہوں گا لشکر کے ساتھ ہو لوں گا۔ وقت یونہی گزرتا رہا یہاں تک کہ تیاریوں میں تیزی آگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوچ فرما گئے' مسلمان آپ کے ساتھ تھے اور میں نے اپنی تیاری کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی نہ کیا تھا۔ وقت یونہی گزرتا رہا۔ قافلہ تیزی سے گزر گیا اور میرے ہاتھ سے یہ غزا نکل گئی۔ میں نے ارادہ کیا کہ نکل جاؤں اور ان کو پالوں' کاش کہ میں

نے ایسا کیا ہوتا' لیکن مجھے توفیق نہ ہوئی' اب میری حالت یہ ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب میں باہر نکلتا تو میں دیکھتا کہ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے نہ میری مثال ہے' صرف وہ لوگ مدینہ میں ہیں جو مشہور منافق ہیں' یا وہ لوگ ہیں جو معذور ہیں۔ رسول اللہ نے تبوک تک جاتے ہوئے راستے میں میرا تذکرہ بالکل نہیں کیا' جب آپ تبوک پہنچ گئے تو دوستوں میں بیٹھے ہوئے آپ نے صرف اس قدر فرمایا: ''کعب نے کیا کیا؟'' بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا حضور اسے اس کی دو چادروں اور غرور نے مصروف رکھا۔ اس پر معاذ ابن جبل نے فرمایا' تم نے بہت بری بات کی ہے۔ رسول خدا! خدا کی قسم ہم نے کعب میں ماسوائے خیر کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ اس پر حضور خاموش ہوگئے۔

کعب کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس ہوئے تو مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ میں جھوٹ یاد کرنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ کل رسول خدا کے غضب سے مجھے کس طرح نجات ملے گی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے خاندان کے تمام اہل الرائے سے مدد لی۔ جب یہ آواز آئی کہ حضور آپہنچے ہیں تو میرے ذہن سے تمام جھوٹے بہانے چھٹ گئے اور مجھے یقین ہوگیا کہ میں اس بحران سے صرف سچائی کے ذریعے نجات پا سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے سچی بات دل میں بٹھا لی۔ جب حضور پہنچے تو آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ مسجد تشریف لے جاتے' دو رکعت نماز پڑھتے اور لوگوں میں بیٹھ جاتے۔ حضور بیٹھے تو پیچھے رہنے والے پہنچ گئے اور عذرات پیش کرتے اور قسمیں کھاتے۔ یہ لوگ اسی افراد سے کچھ اوپر تھے' تو حضور نے ان کے ظاہری عذرات کو قبول کرلیا' ان سے بیعت لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اور ان کی اندرونی حالت کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ میری باری آئی۔ جب میں نے سلام کیا تو حضور کے ہونٹوں پر ایک غضبناک تبسم تھا۔ مجھے کہا ''آؤ''۔ میں چلتا ہوا حضور کے سامنے بیٹھ گیا تو حضور نے پوچھا: بتاؤ تمہیں کس چیز نے روک دیا۔ کیا تو نے سواری نہیں خرید لی تھی؟'' میں نے کہا رسول خدا اگر میں کسی اور شخص کے سامنے بیٹھا ہوتا ایک دنیادار حکمران کے سامنے تو میں سمجھتا تھا کہ میں کوئی بہانہ بنا کر اس کے غضب سے بچ سکتا تھا' آپ کو معلوم ہے کہ میں بات کرنا جانتا ہوں' لیکن خدا کی قسم مجھے یقین تھا کہ آج اگر میں جھوٹے عذرات پیش کر کے آپ کو راضی کرلوں تو اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور اگر میں سچ کہوں تو بے شک آپ تو ناراض ہو جائیں گے لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آخر کار مجھے معاف کر دے گا۔ خدا کی قسم میرا کوئی عذر نہ تھا اور جن حالات میں' میں آپ سے پیچھے رہا' ان جیسے اچھے حالات میرے کبھی نہ تھے۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا: ''اس شخص نے تو سچ کہا ہے' اچھا جاؤ اور تمہارا فیصلہ خود اللہ کرے گا''۔ میں اٹھ گیا' میرے قبیلے بنی سلمہ کے لوگ پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس سے قبل تم نے کوئی گناہ کیا ہو' کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم حضور کے سامنے کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا کہ تمام دوسرے لوگوں نے حضور کے سامنے عذرات پیش کیے۔ کیا یہ کافی نہ تھا کہ رسول اللہ تمہارے لیے اس گناہ پر طلب مغفرت کر دیتے۔ خدا کی قسم مجھے اسی طرح ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ارادہ کرلیا کہ میں دوبارہ حضور کے پاس جاؤں اور اپنے آپ کو جھوٹا کروں۔ یعنی اپنے سابقہ بیان کو واپس لے لوں۔ میں نے برادران قوم سے کہا: کیا میرے ساتھ جو سلوک ہوا وہ کسی اور کے ساتھ بھی ہوا ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں دو افراد کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔ انہوں نے بھی یہی بات کہی جو تم نے کہی۔ میں نے کہا: وہ کون ہیں؟ تو انہوں نے بتایا مرارہ ابن ربیع اور امیہ الواقفی ہیں۔ انہوں نے جن دو آدمیوں کا تذکرہ کیا وہ نیک لوگ تھے' دونوں بدری تھے' میں نے سوچا کہ میں ان کی پیروی کروں گا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے موقف پر قائم

رہوں گا جب ان دو آدمیوں کا ذکر ہوا۔

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہمارے ساتھ بات کرنے سے منع کر دیا۔ یہ حکم ہم تین افراد کے بارے میں تھا۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ اچانک اجنبی بن گئے ہیں۔ ان کا رویہ ہمارے ساتھ ایک دم بدل گیا۔ یہاں تک کہ ہمیں مدینہ کی سرزمین بھی اجنبی محسوس ہونے لگی۔ زمین یوں نظر آتی گویا ہم نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ پچاس شب و روز یوں ہی گزر گئے۔ میرے دو سرے دو ساتھی تو گھروں میں بند ہو کر رہ گئے۔ لیکن میں بہت ہی سخت جان تھا۔ میں گھر سے نکلتا اور مسلمانوں کے ساتھ نماز بھی پڑھتا' بازاروں میں بھی پھرتا مگر کوئی شخص مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں رسول اللہ کے پاس بھی جاتا' سلام کرتا آپ مجلس میں بیٹھے ہوتے۔ نماز کے بعد اور میں سوچتا کہ حضورؐ نے وعلیکم السلام کہتے ہوئے ہونٹ ہلاتے ہیں یا نہیں۔ پھر میں نماز بھی حضورؐ کے قریب پڑھتا اور وزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔ جب میں نماز میں ہوتا تو حضورؐ میری طرف دیکھتے اور جب میں حضورؐ کی طرف متوجہ ہوتا تو حضورؐ منہ موڑ لیتے۔ مسلمانوں کا یہ سوشل بائیکاٹ جب بہت ہی طویل ہو گیا تو میں ابو قتادہ کی دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ میرے چچازاد بھائی تھے اور مجھے ان سے بہت ہی محبت تھی' میں نے سلام کیا۔ خدا کی قسم اس نے بھی سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے اسے کہا: اے ابو قتادہ' خدا کے لیے گواہی دو' کیا میں خدا اور رسول کے ساتھ محبت نہیں رکھتا؟ کہتے ہیں کہ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی اور اسے قسم دی کہ تم سچی بات کرو' تو اس نے صرف یہ کہا اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں' کہتے ہیں کہ میرے آنسوؤں کی لڑیاں لگ گئیں اور میں دیوار پھلانگ کر واپس ہو گیا۔

اور ایک دن یوں ہوا کہ میں مدینہ کے بازاروں میں پھر رہا تھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک نبطی جو بازار میں غلہ فروخت کر رہا تھا' یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے کعب کے گھر کا راستہ کون بتاتا ہے؟ لوگوں نے اشارہ کیا کہ کعب تو وہ رہا۔ وہ آیا اور اس نے مجھے ایک خط دیا۔ یہ بادشاہ غسان کی طرف سے تھا۔ میں نے خط کو پڑھا اس کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد' ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے لیڈر نے تم پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اللہ نے تو تمہیں ذلت اور بربادی کے شہر میں نہیں رکھا۔ آپ ہمارے ساتھ مل جائیں' ہم تمہارے ساتھ ہمدردی کریں گے"۔ جب میں نے خط پڑھا تو کہا یہ ایک دوسری آزمائش ہے۔ چنانچہ میں نے اس خط کو جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیا۔ پچاس راتوں میں سے ابھی چالیس ہی گزری تھیں کہ رسول خداؐ کا ایک پیغام لانے والا آیا اور کہا کہ رسول خداؐ حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لو۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ میں اسے طلاق دے دوں یا انہوں نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا بیوی سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ اس کے قریب نہ جائیں اور دوسرے دو ساتھیوں کو بھی ایسا ہی پیغام دیا گیا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا تم اپنے میکے چلی جاؤ یہاں تک کہ اللہ اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ ہلال ابن امیہ کی بیوی رسول خداؐ کے پاس آئی اور کہا رسول خداؐ ہلال تو بہت بوڑھا ہے اور اس کا کوئی خادم نہیں کیا آپ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ میں اس کی خدمت کروں؟ تو آپؐ نے فرمایا "نہیں کرو' لیکن وہ آپ کے قریب نہ آئے' تو اس نے کہا کہ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کسی چیز کی طرف حرکت ہی نہیں کر سکتا اور خدا کی قسم وہ تو اس وقت سے رو رہا ہے۔ جب سے اس کے بارے میں یہ احکامات صادر ہوئے ہیں۔ تو میرے بعض رشتہ داروں نے کہا کہ اگر آپ بھی رسول خدا سے اپنی بیوی کے بارے میں اس قسم کی اجازت حاصل کر لیں؟ کیونکہ ہلال کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ اس کی خدمت کرے۔ میں نے کہا خدا کی

قسم میں اس بارے میں حضورؐ سے اجازت نہیں مانگوں گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ حضورؐ اجازت دیتے ہیں یا نہیں کیونکہ میں ایک نوجوان آدمی ہوں۔

ایسے حالات میں دس شب و روز مزید گزر گئے۔ پچاس شب و روز مکمل ہو گئے اور لوگوں نے ہم سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ پچاسواں دن تھا کہ میں اپنے گھروں میں سے ایک گھر کے اوپر صبح کی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں ایسے حال میں تھا جس کا ذکر اللہ نے خود فرمایا ہے کہ میرا دل تنگ ہو گیا تھا' اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی تھی کہ اچانک میں نے جبل سلع پر سے ایک اونچی آواز سنی۔ پکارنے والا پکار رہا تھا : اے کعب ابن مالک! خوشخبری ہے۔ میں سجدے میں گر گیا۔ معلوم ہو گیا کہ مشکل دور ہو گئی۔ رسول خدا نے جب صبح کی نماز پڑھی تو ہماری توبہ قبول ہونے کا اعلان کر دیا۔ لوگ مبارک سلامت کرتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ میرے دو ساتھیوں کی طرف بھی خوشخبری دینے والے دوڑ پڑے۔ ایک شخص نے میری طرف گھوڑا سرپٹ دوڑایا اور قبیلہ اسلم کا ایک شخص دوڑتے ہوئے میرے پاس آیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا۔ چنانچہ اس کی آواز گھوڑے سے پہلے پہنچ گئی۔ جب وہ شخص آیا جس کی آواز خوشخبری میں نے سنی تھی تو میں نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور اسے پہنا دیئے' یہ اس کی شہادت کا صلہ تھا۔ خدا کی قسم ان دنوں میرے پاس یہی ایک جوڑا تھا۔ میں نے عاریتاً مانگے اور پہن کر رسول خداؐ سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ لوگ فوج در فوج مجھ سے مل رہے تھے اور قبولیت توبہ پر مبارکبادیں دے رہے تھے۔ خدا کی جانب سے معافی قبول ہو۔ یہاں تک کہ میں مسجد میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ طلحہ ابن عبید کھڑے ہوئے اور دوڑ کر مجھے مبارکباد دی' خدا کی قسم اس کے سوا مہاجرین میں سے کوئی شخص میری طرف نہ اٹھا۔ حضرت کعب طلحہ کی اس محبت کو آخرت تک نہ بھولے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ جب میں حضورؐ کے پاس آیا اور سلام کیا تو حضورؐ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا : "تم کو ایک ایسا دن مبارک ہو' جو تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک اچھا دن ہے۔ میں نے کہا کہ حضور یہ معافی آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟ تو حضورؐ نے فرمایا نہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ حضورؐ جب بھی خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ اس طرح چمکتا جس طرح آفتاب۔ ہم حضور اکرمؐ کی اس خصوصیت کو جانتے تھے۔ جب میں حضورؐ کے سامنے بیٹھا تو میں نے کہا : میں اپنا تمام مال اللہ اور رسول اللہ کے نام صدقہ کرتا ہوں۔ تو حضورؐ نے فرمایا تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ بعض حصہ اپنے لیے رکھ لو' تو میں نے کہا کہ خیبر میں میرا جو حصہ ہے وہ میں اپنے لیے رکھتا ہوں۔ میں نے کہا رسول خداؐ مجھے اللہ نے سچ کہنے کی وجہ سے بچا لیا اور میری توبہ یہ ہے کہ اپنی پوری عمر میں سوچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ جب سے میں نے رسول اللہ سے یہ وعدہ کیا ہے' میں نے مسلمانوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھا کہ محض سچائی کی وجہ سے اس پر کوئی مصیبت آئی ہو۔ اور اس وقت سے لے کر آج تک میں نے جھوٹ کا کوئی لفظ اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ میری جو زندگی باقی ہے اس میں بھی اللہ مجھے جھوٹ بولنے سے بچائے گا۔ اس موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں لَقَدْ تَّابَ ------ (۹ : ۱۱۷) حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد اللہ نے مجھ پر اس سے بڑا انعام نہیں فرمایا کہ میں نے بتوفیق الہی اللہ کے رسول کے سامنے سچ کہہ دیا۔ اگر میں اس دن جھوٹ بولتا تو اس طرح خوار ہوتا جس طرح جھوٹے عذرات گھڑنے والے خوار اور ہلاک ہوئے۔ ان لوگوں پر اللہ

نے ایسی تنقید فرمائی اور اس قدر برے ریمارکس ان کے بارے میں آئے جو کسی کے بارے میں قرآن میں نہیں آئے '
ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ نے فرمایا۔ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ
فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۹۵)
يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ
(۹۶) ((۹: ۹۵ — ۹۶)) "تمہاری واپسی پر یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے صرف نظر کرو' تو بے شک تم ان سے صرف نظر ہی کرو' کیونکہ یہ گندگی ہیں اور ان کا اصل مقام تو جہنم میں ہے' جو ان کی کمائی کے بدلے میں انہیں نصیب ہوئی۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ہرگز ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہ ہو گا"۔

یہ ہے قصہ ان تین افراد کا جن کے بارے میں فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ ان میں ایک حضرت کعب ابن مالک نے اسے تفصیلاً بیان کیا۔ اس قصے کے ہر فقرے میں ایک سبق ہے' اس کے ہر فقرے میں وہ پختہ بنیاد درج ہے جس پر اسلامی معاشرے کو تعمیر ہونا ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیادیں پختہ اصولوں پر ہوتی ہیں اور اس کی تعمیر نہایت ہی پختگی سے کی جاتی ہے۔ اس میں اجتماعیت کا تصور صاف و ستھرا ہوتا ہے۔ اس میں دعوت زندگی میں مشکلات سامنے آتی ہیں۔ اس میں احکامات کی قدر و قیمت ہوتی ہے اور اس میں اطاعت پر زور دیا جاتا ہے۔

کعب ابن مالک اور ان کے دو ساتھیوں کی زندگی پر غور کرو' یہ اس مشکل مہم میں حضورؐ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انسانی کمزوریاں ان پر غالب آ جاتی ہیں۔ پختہ پھل اور چھاؤں سخت گرمیوں میں ان کو اپنی طرف راغب کر لیتے ہیں۔ وہ سخت گرمی میں مشکلات سفر پر آرام کو ترجیح دے دیتے ہیں۔ لیکن حضرت کعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلے جانے کے بعد غلطی کو اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے جانے کے بعد مدینہ کا ماحول ان کے لیے یہ تھا:

"مجھے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ مدینہ میں جن لوگوں کی پیروی میں نے کی وہ مشہور و معروف منافق ہیں یا وہ لوگ ہیں جو عند اللہ معذور ہیں یعنی ضعفاء اور مریض یا وہ لوگ جن کے پاس جانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ غرض اس مشکل مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ان لوگوں نے چھوڑا جو منافق تھے یا معذور تھے یا بہت غریب تھے' باقی مسلمانوں نے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور مہم میں نکلے۔ اگرچہ سفر دور کا تھا' تو معلوم ہوا کہ تحریک اسلامی کے ابتدائی کارکن نہایت ہی تربیت یافتہ اور نہایت ہی جفاکش تھے اور ان کی سخت ترین تربیت کی گئی تھی۔ یہ تو تھی ایک بات۔

دوسری بات یہ کہ یہ لوگ نہایت ہی متقی اور خدا سے ڈرنے والے تھے' یہ تقویٰ ہی تھا جس نے ان لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ سچ کہیں اور غلطی کا اعتراف کر لیں اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں۔ ذرا حضرت کعب کے الفاظ پر غور کریں:

"میں نے کہا اے رسولِ خدا اگر میں آپ کے علاوہ کسی اور دنیوی حکمران کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ میں اس کے غضب سے کوئی عذر تلاش کر کے نکل آتا۔ میں تو ایک قادر الکلام شخص ہوں' لیکن اگر میں آپ کے سامنے جھوٹ بولوں اور جان چھڑا لوں تو ممکن ہے کہ اللہ کا غضب مجھے پکڑ لے۔ اور اگر میں آپ کے سامنے سچ کہوں اور آپ مجھ پر عتاب

کریں تو امید ہے کہ اللہ مجھے معاف کر دے گا۔ خدا کی قسم میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔ میں تو ان دنوں اس قدر قوی اور خوشحال ہوں کہ ایسا کبھی نہ تھا لیکن میں پیچھے رہ گیا"۔ غرض غلطی کے مرتکب اس مومن کے ضمیر میں اللہ موجود ہے اور حاضر ہے' باوجود اس کے کہ یہ شخص رسول اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے بے تاب تھا' لیکن اس کے دل میں خدا کا خوف قوی تھا اور اسے پوری امید تھی کہ اللہ اسے معاف کر دے گا حالانکہ اس وقت رسول اللہ کی ناراضگی کے معنی یہ تھے کہ ایک ذلیل ہو جائے' خوار ہو جائے اور لوگ اشاروں کنایوں سے کہیں کہ یہ ہے منافق' یا لوگ ایسے شخص سے بات کرنا بھی پسند نہ کریں۔

حضرت کعب کے بیان کا یہ حصہ دیکھیں: "حضورؐ نے لوگوں کو ہم سے بات تک کرنے سے روک دیا۔ ہم تینوں سے جو پیچھے رہ گئے تھے' لوگ ہم سے اجنبی ہو گئے' چہرے ہی بدل گئے۔ یہاں تک کہ مدینہ کی زمین ہی ہمارے لیے اجنبی ہو گئی' یوں لگتا کہ شاید یہ زمین ہم نے پہلی مرتبہ دیکھی ہے' ہم سوچتے کہ کیا یہ وہی زمین نہیں ہے' چنانچہ ایسے ہی حالات میں پچاس دن گزر گئے' میرے دو دوسرے ساتھی تو چھپ کر گھروں میں لیٹ گئے۔ لیکن میں بہت ہی سخت جان تھا۔ میں مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ بازاروں میں پھرتا تھا لیکن کوئی بھی مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں رسول اللہ کے پاس آتا' انہیں سلام کرتا' جب آپ نماز کے بعد مجلس صحابہ میں ہوتے' میں دل میں کہتا کہ آیا حضورؐ نے جواب سلام میں اپنے ہونٹوں کو حرکت دی ہے یا نہیں۔ پھر میں آپ کے قریب نماز پڑھتا اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ جب مسلمانوں کی جانب سے یہ بائیکاٹ بہت طویل ہو گیا تو میں ابو قتادہ کی دیوار پھلانگ کر اس کے پاس گیا۔ وہ میرا چچازاد تھا اور مجھے بہت ہی پیارا تھا۔ میں نے اس کو سلام کیا' خدا کی قسم اس نے بھی سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے اسے کہا ابو قتادہ تمہیں خدا کی قسم سچ کہو کیا میں اللہ اور رسول سے محبت نہیں کرتا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے دوبارہ اسے قسم دی' وہ پھر خاموش ہو گیا۔ میں نے سہ بارہ اسے قسم دی تو اس نے فقط یہ کہا اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں واپس ہوا اور دیوار پھلانگ کر چلا گیا"۔

یہ تھا اس جماعت کا ڈسپلن۔ یہ تھی مکمل اطاعت امر' اگرچہ فتح مکہ کے بعد ہر قسم کے لوگ جماعت میں آگئے تھے اور اس مشکل وقت میں یہ جنگ ہوئی تھی' لیکن رسول خداؐ نے جب ان تینوں سے گفتگو کی ممانعت کر دی تو مجال ہے کہ کوئی منہ ان سے ہم کلام ہو۔ کوئی نہیں جو کعب سے محبت کرے' کوئی نہیں جو اس کے ساتھ لین دین کرے' یہاں تک کہ ان کا چچازاد اور محبوب ترین فرد بھی بات کرنے سے انکاری۔ یہ دیوار پھلانگ کر جاتے ہیں' وہ وعلیکم السلام تک نہیں کہتا۔ کسی سوال کا جواب نہیں دیتا اگر دیتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ "اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں"۔

کعب آگ کے انگاروں پر کھڑے ہیں' مدینہ کی سرزمین ان کے لیے انوکھی ہو گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ کسی اجنبی ملک میں ہیں۔ وہ جواب سلام میں حضور کے ہونٹوں کی حرکت کے لیے بھی ترس رہے ہیں۔ وہ حضورؐ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی توجہ ان کے لیے امید کی کرن ثابت ہو اور ان کو امید بندھ جائے کہ وہ اس شجر طیبہ سے کٹ نہیں گئے ہیں اور یہ کہ اس کے لیے خشکی اور مٹنے کا فیصلہ نہیں ہو گیا ہے۔

اس مغضوبیت کی حالت میں کہ کوئی ان سے بات کرنے کا روادار نہیں ہے' محض مہربانی کے طور پر بھی' بادشاہ غسان ان کو خط بھیجتا ہے اور ان کو بلند مقام و مرتبہ دینے کی یقین دہانی کرتا ہے' لیکن وہ فوراً اس سے منہ پھیرتے ہیں

اور اس عظیم پیشکش کو جلتی ہوئی آگ کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس خط کو بھی وہ ایک آزمائش سمجھتے ہیں۔

یہ بائیکاٹ اور طویل ہو جاتا ہے' بیوی سے بھی مقاطعہ کا حکم آ جاتا ہے تاکہ وہ بالکل اکیلے ہو جائیں۔ زمین و آسمان میں ان کا کوئی سہارا نہ رہے' وہ اب بھی حیا کرتے ہیں کہ رسول اللہ کے پاس اپنی بیوی کے بارے میں کوئی اپیل کریں کیونکہ ان کو رسول اللہ کے جواب کے بارے میں کوئی یقین نہیں ہے۔

یہ تو تھا ایک صفحہ' اب ذرا دوسرا ورق الٹئے۔ ان کی توبہ قبول ہوتی ہے' خوشخبری آتی ہے' حکم آ جاتا ہے کہ آپ اب ہماری سوسائٹی کی طرف لوٹ آئے ہیں' توبہ قبول ہو گئی ہے۔ اب آپ کو گویا نئی زندگی مل گئی ہے۔ ذرا ان کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"میں ایسے حالات میں تھا جس کا ذکر خود قرآن نے کیا کہ میں اپنے آپ سے بیزار تھا اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ تھی' کہ میں نے سلع پہاڑ کے اوپر سے ایک پوری آواز سنی "اے کعب تمہیں بشارت ہو"۔ میں فوراً سجدے میں گرا' اب تو آسانیاں آ گئی ہیں' نماز فجر کے وقت رسول اللہ نے اعلان فرمایا کہ ہمیں اللہ نے معاف کر دیا ہے۔ لوگ ہماری طرف مبارکبادی کے لیے دوڑ پڑے' میرے ساتھیوں کی طرف بھی خوشخبری پہنچانے والے دوڑ پڑے۔ ایک شخص نے میری طرف گھوڑے کو ایڑھی دی' ایک شخص میری طرف دوڑا۔ یہ اسلم قبیلے کا تھا۔ یہ پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہاں سے بلند آواز سے پکارا' چنانچہ گھوڑے والے سے آواز پہلے پہنچ گئی۔ جب وہ شخص آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی تو میں نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور اسے خوشخبری کے صلے میں عطا کر دیئے۔ ان دنوں میرے پاس یہی کپڑے تھے۔ میں نے دو کپڑے کسی سے مانگے اور انہیں پہن کر رسول اللہ کی طرف چل پڑا۔ راستے میں لوگ فوج در فوج میرا استقبال کر رہے تھے اور بشارتیں دے رہے تھے۔ تمہیں اللہ کی جانب سے معافی مبارک ہو۔ میں مسجد میں داخل ہوا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ کے ارد گرد لوگ بیٹھے تھے۔ طلحہ ابن عبید میرے استقبال کے لیے اٹھے اور میرے ساتھ مصافحہ کیا اور مبارکبادی دی۔ مہاجرین میں سے کوئی اور نہ اٹھا۔ کعب حضرت طلحہ کے اس احسان کو عمر بھر نہ بھولے"۔

جماعت صحابہ میں واقعات کا یوں جائزہ لیا جاتا تھا اور غلطیوں کو یوں درست کیا جاتا تھا۔ اللہ کی جانب سے معافی کا اس طرح احترام کیا جاتا تھا' اس کی خوشخبری دینے کے لیے گھوڑسوار دوڑ رہا تھا اور دوسرا اونچی جگہ سے آواز دے کر اس پر سبقت لے جا رہا تھا' اور اس مسترد شدہ شخص کی واپسی اور مبارکبادی ایک ایسا واقعہ تھا جسے وہ زندگی بھر نہ بھول سکا۔ جماعت میں واپس آنے کو اس نے بڑا احسان اور مہربانی سمجھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے یہ تاثر دیا کہ یہ دن تمہارے لیے تمہاری پوری زندگی کا بہترین دن ہے' جبکہ حضورؐ کا چہرہ خوشی کی وجہ سے چمک رہا تھا' جیسا کہ حضرت کعب نے فرمایا کہ حضورؐ کا چہرہ خوشی کے وقت چاند کا ٹکڑا نظر آتا تھا اور ان تین افراد کے قبولیت توبہ کے وقت حضورؐ بے حد خوش اور مسرور تھے کہ اس کے تین ساتھی باعزت طور پر بری ہو کر جماعت کی طرف لوٹ آئے۔

یہ تھا قصہ ان تین آدمیوں کا جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا اور بعد میں ان کی معافی کا حکم آ گیا تھا۔ یہ لمحات بتاتے ہیں اس وقت کی تحریک اسلامی ایک زندہ تحریک تھی اور یہ کہ اس کی کچھ قدریں تھیں جن کے لیے وہ زندہ تھی۔

اب اس قصے کی روئیداد پڑھنے کے نتیجے میں یہ آیات اچھی طرح ہماری سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (۹ : ۱۱۸) "جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے"۔

"جب زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی"۔ زمین کیا اگر اس میں مکین نہ ہو۔ محض زمین کیا حقیقت رکھتی ہے اگر اس میں اقدار نہ ہوں۔ ملک کے معنی ہوتے ہیں اہل ملک کے باہم تعلقات و روابط' اگر یہ نہ ہوں تو نہ ملک اور نہ سرزمین۔ یہ انداز بیان اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بھی درست اور معنوی اعتبار سے بھی درست۔ اور اس کی فنی خوبصورتی تو لاجواب ہے۔ نظر یوں آتا ہے کہ تین افراد پر مدینہ کی سرزمین تنگ ہو گئی ہے۔ اس کی تنابیں کھچ گئی ہیں' وہ سکڑ گئی ہے اور وہ اس کے اندر تنگی محسوس کرتے ہیں۔

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ (۹ : ۱۱۸) "وہ ان پر تنگ ہو گئی ہے" گویا وہ ایک برتن ہے جس کے اندر یہ لوگ سما نہیں سکتے' اگر ڈھکنا رکھ دیا جائے تو یہ سانس نہیں لے سکتے۔

وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ (۹ : ۱۱۸) "اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے"۔ ارض و سما کے تمام اطراف اس کی گرفت میں ہیں۔ اس طرح اس کربناک صورت حال میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ یقین ہو جاتا ہے کہ اندوہناکیوں اور کربناکیوں کے بعد خوشخبری صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ وہی ہے جو غم و اندوہ کے بعد خوشیاں عطا کرتا ہے چنانچہ حکم آتا ہے۔

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۹ : ۱۱۸) "تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں' یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اللہ نے ان کی اس عظیم غلطی کو معاف کر دیا تاکہ وہ اپنی تمام دوسری کوتاہیوں سے بھی رجوع کریں اور اپنی آئندہ زندگی میں اللہ کے مطیع فرمان ہو کر رہیں اور حضرت کعب کے قول اور بیان میں اس کا مفہوم موجود ہے کہ انہوں نے کہا کہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنی تمام جائیداد اللہ کے نام صدقہ کر دوں' لیکن رسول اللہ نے فرمایا کہ کچھ حصہ اپنے لیے چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ انہوں نے اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس بحران میں میری نجات محض سچائی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس لیے میری توبہ یہ ہے کہ میں بقیہ زندگی میں سچائی کا دامن نہ چھوڑوں گا۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سچائی میں مجھے جس طرح آزمایا اس طرح سے اچھی آزمائش شاید کسی اور کی نہ کی گئی ہو کیونکہ میں نے جب سے حضورؐ کے سامنے یہ وعدہ کیا ہے میں نے کبھی عمداً جھوٹ نہیں بولا' آج تک۔ اور بقیہ زندگی میں بھی مجھے امید ہے کہ اللہ جھوٹ سے بچائے گا۔

اس قصے کے بارے میں فی ظلال القرآن میں مزید کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی طرف قرآن کریم نے نہایت ہی

بلیغانہ انداز میں اشارہ کیا ہے اور یہاں یہی کافی ہے۔

○○○

جو لوگ پیچھے رہ گئے اور جنہوں نے اس مہم میں تردد کیا ان کے حالات پر تبصرے کی فضا میں ' اور تین افراد جن کے بارے میں فیصلہ موخر کر دیا گیا تھا ' ان کے کردار میں عنصر صداقت کے اظہار کے بعد ' اب تمام اہل ایمان کو پکارا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو ' اور مدینہ اور اس کے ماحول میں جو لوگ اس مہم سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے اس طرز عمل پر سخت تنقید کی جاتی ہے 'کیونکہ اس مہم میں جو مجاہدین شریک ہوئے ان کے لیے عظیم جزاء ہے اور یہ لوگ اس سے محروم ہو گئے ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾ مَا كَانَ لِأَهْلِ ٱلْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ ٱلْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا۟ عَن رَّسُولِ ٱللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا۟ بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِۦ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ ٱلْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِۦ عَمَلٌ صَٰلِحٌ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ ٱللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔ مدینے کے باشندوں اور گرد و نواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں ' اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں ' اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کوئی انتقام وہ لیں ' اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ وہ (راہ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ اٹھائیں اور (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے"۔

اہل مدینہ ہی تھے جنہوں نے تحریک اسلامی کی تعمیر کی اور سب سے پہلے دعوت اسلامی پر لبیک کہا اور اس کی حمایت کی۔ یہ لوگ تحریک اسلامی کے زیادہ قریب اور حقدار تھے۔ وہ اس تحریک کے سپاہی تھے اور یہ تحریک ان کی تھی' یہی لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی۔ سب سے پہلے انہوں نے بیعت کی اور یہ لوگ اس تحریک کے بانی مبانی اور اس کا بنیادی اثاثہ تھے کیونکہ جزیرۃ العرب میں تحریک اسلامی کا پودا انہی نے لگایا تھا۔ اس طرح مدینہ کے اردگرد جو اہم قبائل تھے اور جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا' جو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے' یہ اس تحریک کے بیرونی معاون و مددگار تھے' اس لیے تحریک کے عالمی پھیلاؤ کے وقت ان لوگوں کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ رسول اللہ کو ایک مشکل مہم میں جاتا دیکھ کر پیچھے رہ جاتے' ان کا فریضہ تو یہ تھا کہ رسول اللہ پر اپنی جانیں قربان کر دیتے' یہ تو مناسب نہ تھا کہ اپنی جانوں کو بچانے کی کوشش کرتے۔ ان کو چاہئے تھا کہ رسول اللہ کا ساتھ دیتے۔ گرمی ہو کہ سردی ہو' سختی ہو یا نرمی ہو' آسانی ہو یا مشکل ہو' ان کا فرض تو یہ ہے کہ ہر حال میں تحریکی ذمہ داریاں پوری کریں۔ اہل مدینہ تو اس دعوت کے بانی ہیں اور اس کے اردگرد رہنے والے مسلمان بھی حضور ؐ کے ساتھ اور آپ کو دیکھنے والے ہیں۔ حضور ؐ کی ذات مبارکہ کے قریب ہیں اور پڑوسی ہیں۔ اور جب ان کو معلوم تھا کہ حضور ؐ کس مشکل مہم پر نکلے ہوئے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ وہ پیچھے نہ رہتے اور آپ کے ساتھ تکالیف برداشت کرتے۔

لہٰذا اپنی ان نسبتوں کی وجہ سے ان کا فرض ہے کہ اللہ سے ڈریں اور سچے لوگوں کے ساتھ رہیں' یہ سچے لوگ کون تھے' وہ جو رسول اللہ کو چھوڑ کر گھروں میں نہ بیٹھے اور ان مشکل حالات میں بھی ان کے ایمان میں تزلزل پیدا نہ ہوا۔ ان کی ہمتوں میں کوئی کمی نہ آئی اور جو تحریک اسلامی کے ہراول دستہ تھے یا وہ لوگ تھے جو اس ہراول دستے کے صحیح متبع تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۹:۱۱۹) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو"۔ اس کے بعد اصولاً اس بات کو معیوب قرار دیا جاتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور اپنے قائد کو اکیلا چھوڑ کر بیٹھ جائے خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو' ایمان کے ساتھ یہ عمل لگا نہیں کھاتا۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ

وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ (۹:۱۲۰) "مدینے کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہتے اور اس کی طرف سے بے پرواہ ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے"۔ ان الفاظ میں ایک اشاراتی ملامت ہے' اور رسول اللہ کے ساتھیوں کو اس سے بڑی ملامت کیا ہو سکتی ہے کہ وہ رسول خدا کے ساتھی بھی ہوں' ان کو یہ عظیم اعزاز بھی حاصل ہو اور وہ اپنے نفس کی فکر میں لگ جائیں اور ذات رسول ؐ سے اپنی ذات سے زیادہ محبت رکھیں۔

لیکن یہ اشارہ قیامت تک کے لیے ہے۔ ہر دور میں دعوت اسلامی کے کارکنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی قیادت پر جان نثار کریں۔ ایک مومن کی شان یہ ہرگز نہیں ہے کہ ذات رسول ؐ تو مشکلات سے دوچار ہو اور اپنی ذات کی فکر کریں

اور پھر بھی یہ دعویٰ کریں کہ وہ داعی ہے اور وہ رسول اللہ کا ہمدرد و معاون ہے۔

ایک تو یہ کہ ذات رسول سے حیا چشمی کرتے ہوئے بھی سب کو ساتھ ہو لینا چاہئے، جبکہ اللہ کے صریح احکام بھی موجود تھے اور اس مہم میں آپ کے ساتھ جانے والوں کے لیے اجر عظیم اور ثواب اخروی کے وعدے بھی تھے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲۰) وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲۱) (۹: ۱۲۰ - ۱۲۱)

"اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہو گا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں، اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں، اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کوئی انتقام وہ لیں، اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہو گا کہ وہ (راہ خدا میں) تھوڑا یا بہت کوئی خرچ اٹھائیں اور (سعی جہاد میں) کوئی وادی وہ پار کریں اور ان کے حق میں اسے لکھ نہ لیا جائے تاکہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے"۔

اس راہ میں پیاس پر بھی جزاء ہے، تھکاوٹ پر بھی جزاء ہے۔ بھوک پر بھی جزاء ہے۔ ایک ایک قدم پر بھی جزاء جو کفار کو ناگوار گزرے، دشمن کا جس قدر نقصان بھی ہو جائے اس پر بھی جزاء ہے، اس کے ساتھ ساتھ مجاہد کے لیے عمل صالح بھی لکھا جاتا ہے۔ اور اللہ اس کا نام ایسے محسنین میں لکھ دیتا ہے جن کے اعمال محفوظ ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل ضائع نہیں ہوتے۔

پھر اس راہ میں جو اخراجات اٹھیں گے چاہے کم ہوں یا زیادہ، غرض اس کام میں اجر اعمال کے بجائے کچھ قدم چلنے پر ہے۔ قدموں کے نشانوں پر بھی اجر ہے جس طرح بڑے بڑے کارناموں پر اجر ہے۔

تحریک اسلامی کے کارکنو، یقین رکھو خدا کی قسم ہمارے کام پر اللہ کے ہاں عظیم اجر ہے، کھلے انعامات اور سخاوتیں تم پر ہوں گی اور یہ بڑی شرم کی بات ہو گی کہ اس دعوت کے سلسلے میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تکالیف برداشت نہ کریں اور آپ جیسی مشکلات بھی برداشت نہ کریں حالانکہ ہم رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کے جانشین ہیں اور آپ کے بعد اس دعوت کے امین ہیں۔

ooo

معلوم ہوتا ہے کہ جب اس سورت میں رسول اللہ کو چھوڑ کر پیچھے رہنے والوں کی مذمت کی گئی تو مدینہ کے اطراف و اکناف سے تمام سچے مسلمان مدینہ کی طرف امنڈ آئے تاکہ وہ حضور سے اشارہ پاتے ہی عمل جہاد میں شریک ہو جائیں، اس طرح مدینہ میں لوگوں کو اژدہام ہو گیا ہو گا، اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ نفیر عام کے حدود کا تعین کر دیا جائے کیونکہ اس وقت تمام جزیرۃ العرب دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا، اسلامی حدود میں اچانک وسعت ہو گئی تھی

اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جہاد کے لیے ہروقت تیار تھی۔ تعداد مجاہدین کی کثرت کا اندازہ اس بات سے باآسانی ہو سکتا ہے کہ جنگ تبوک کے موقعہ پر پیچھے رہ جانے والوں کو چھوڑ کر شرکاء کی تعداد تقریباً تیس ہزار تھی۔ اس سے قبل مسلمانوں کے کسی غزوہ میں اس قدر عظیم تعداد شریک نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا ایسے حالات ہوگئے تھے مسلمانوں کی مساعی کو تقسیم کار کے تحت منظم کر دیا جائے' کچھ لوگ اسلامی مملکت کی تعمیر و ترقی میں لگ جائیں' کچھ تجارت میں مصروف ہوں اور وہ خدمات فراہم کریں جو اس جدید مملکت کے لیے ضروری ہیں' کیونکہ عربوں نے پہلی مرتبہ یہ دیکھا تھا کہ ایک سادہ قبائلی نظام سے آگے بڑھ کر ایک عظیم تہذیب اور مملکت کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور اس جدید تہذیب اور نظام مملکت کو مختلف النوع خدمات کی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ
فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا
15 إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾
ع ۴
۴

"اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے' مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے"۔

اس آیت کی تفسیر میں متعدد آیات وارد ہیں اور مفسرین نے اس گروہ کے تعین میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے' جو نکلیں اور تفقہ فی الدین حاصل کر کے واپس آئیں اور اپنی قوم کو ڈرائیں۔ ہمارے خیال میں درست تفسیر یہ ہے کہ تمام مسلمان گو ظاہر ہے گھروں سے نہیں نکل سکتے' بلکہ مسلمانوں کے ہر فرقے سے ایک گروہ ہی نکل سکتا ہے اور یہ لوگ باری باری ایسا کریں گے' یعنی پہلے کچھ لوگ جائیں گے اور دوسرے مقیم رہیں گے۔ پھر دوسرے لوگ اپنی باری پر جائیں گے۔ یہ جو لوگ نکلیں گے تو یہ لوگ جہاد' تحریک اور مہم کی شکل میں اسلامی نظریہ حیات کو لے کر نکلیں گے' اس جہاد اور تحریک کے دوران وہ جو عملی اور علمی تجربات کریں گے ان سے ان لوگوں کو آگاہ کریں گے جو گھروں میں مقیم تھے۔

اس آیت کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے اور حضرت ابن عباس کے قول میں اس طرف اشارہ بھی ہے نیز حسن بصری' ابن جریر اور ابن کثیر نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ دین اپنا ایک تحریکی منہاج رکھتا ہے۔ اس دین کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسے لے کر چلتے ہیں' جو لوگ اس دین کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتے ہیں وہی درحقیقت اس دین کے اصل فقیہ ہوتے ہیں اور اس دین کے اسرار و رموز الٰہی ان پر منکشف ہوتے ہیں' جب کوئی قوم اس دین کو لے کر عملاً چلتی ہے تو اس کے معجزات اور اسرار عملاً اس پر واشگاف ہوتے ہیں۔ جو لوگ بیٹھے رہتے ہیں' تو ان لوگوں کو اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ لوگ تحریکی لوگوں سے اس کو سمجھیں کیونکہ بیٹھنے والے ان اسرار کا مشاہدہ نہیں کر سکتے جو اس کو لے کر چلنے والے کرتے ہیں۔ نہ یہ لوگ تحریکی لوگوں کی طرح اسلام کو سمجھ سکتے

ہیں ۔ پیچھے رہنے والے اور گھروں میں بیٹھنے والے اس دین کے اسرار و رموز کو ان لوگوں کی طرح نہیں پا سکتے ۔ جو اس دین کے لیے حرکت جہاد میں ہوں خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں گھروں سے نکلنا بذات خود انسان میں بیداری اور سمجھ پیدا کرتا ہے ۔

یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل متضاد ہے ' جس کے مطابق لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد ' تحریک اور غزات جو لوگ پیچھے رہتے ہیں اور گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو علمی کاموں کے لیے یکسو کرتے ہیں وہ فقہاء ہوتے ہیں ' یہ خام خیالی ہے ۔ یہ اس دین کے مزاج کے خلاف ہے ۔ اس دین کا بنیادی عنصر اس کی "تحریک" ہے لہٰذا وہ لوگ جو تحریکی نہیں ہوتے وہ اس دین کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو اس دین کو لے کر عملاً لوگوں کے اندر واقعی صورت حالات پر منطبق نہیں کرتے ۔ اور اسے کسی معاشرے میں موجود جاہلیت پر غالب کرنے کی سعی نہیں کرتے ۔

تجربہ شاہد ہے ' بلکہ تجربات شاہد ہیں کہ جو لوگ دینی تحریکات میں ضم نہیں ہوتے وہ اس دین کے حقیقی فہم سے بہت دور ہوتے ہیں ۔ ایسے لوگ اس دین کا صرف خشک مطالعہ کرتے ہیں حالانکہ اس دین کے اسرار و رموز کا ظہور صرف ان لمحات میں ہوتا ہے جب کوئی انسان اس دین کی عملی اقامت کے لیے جدوجہد کرتا ہے جو لوگ کتابوں کے صفحات میں گم رہتے ہیں وہ حقیقی دین سے بہت ہی دور رہ جاتے ہیں ۔

اس کا فقہی نظام اس سرزمین پر رائج ہو سکتا ہے جس میں کسی تحریک کے دین کے قیام کے لئے جدوجہد کی ہو ۔ ایسا فقیہ جو اقامت دین کی تحریک سے علیحدہ بیٹھا ہے اس سے دینی ہدایات نہیں لی جا سکتیں اور جس طرح صلیبی مستشرقین ہدایات دیتے کہ کتابوں اور صفحات میں گم ہو کر اس دین کی تجدید کرو ' اسے ترقی یافتہ بناؤ اور ان اسلامی تحریکات سے دور رہو جن کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کو تمام دوسرے انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور غلامی میں داخل کیا جائے اور ان کے اوپر ایک اسلامی نظام مملکت قائم کی جائے اور ان کے سروں پر سے طاغوتی اقتدار کو اتارا جائے ' تو ایسے لائبریرین قسم کے لوگ دین اسلام کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے ۔

اسلامی فقہ اسلامی تحریک جہاد کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے ' پہلے دینی نظام قائم ہوا ہے اور بعد میں اس کے لئے فقہ و قانون بنا ہے اس کے برعکس نہیں ہوا ' پہلے یہ نظریہ وجود میں آیا کہ دین صرف اللہ کا چلے گا ' پھر وہ معاشرہ وجود میں آیا جس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دین صرف اللہ کا چلے گا ' جس نے تمام جاہلی نظاموں اور جاہلی قوانین کو رد کیا اس نے ان تمام قوانین کو رد کیا جس میں کوئی انسان قانون ساز ہو ' اس معاشرے نے اسلامی شریعت کے اصولی اور دستوری کلیات کے مطابق زندگی بسر کرنا شروع کی اور عملی میدان میں آگے بڑھنا شروع کیا تو اس عملی رفتار کے دوران اصول دین کی روشنی میں جزوی احکام آتے رہے اور قانون سازی ہوتی رہی اور اس طرح فقہ اسلامی تشکیل پاتی رہی ۔ اور فقہ و قانون کی نشوونما شروع ہوئی ۔ غرض تحریک دین نے فقہ اسلامی کو وجود بخشا اور تحریک اقامت دین کے دوران ہی فقہ اسلامی کی ترقی اور نشوونما ہوئی ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ٹھنڈے ماحول میں صرف کتابوں کے اوراق و صفحات سے اور اقامت دین کی تحریک سے علیحدہ کہیں اور فقہ مرتب ہوئی ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ جو فقہاء فہم دین میں گہرے تھے وہ تحریک کی بھٹی سے ہو کر گزرے تھے ۔ وہ ایک زندہ اسلامی معاشرے کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے ' وہ اس دین میں زندگی بسر کرتے تھے ' اس کے لئے لڑتے تھے ' اور تحریک احیائے دین اور اقامت دین کے دوران ہی ان کی فقہ وجود میں آتی تھی ۔ اور وہ فی الواقع ایک

عملی فقہ تھی۔

آج صورت حالات کیا ہے؟ آج وہ معاشرہ کہاں ہے جس نے فیصلہ کیا ہو کہ بندگی اور دستور صرف اللہ کا ہو گا' حاکمیت صرف اللہ کی ہوگی اور اللہ کے سوا کسی انسان کو حق حاکمیت نہ ہو گا' اور یہ نظام قانون اللہ کی شریعت ہوگی اور جس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ تمام قوانین کالعدم ہوں گے جو قرآن و سنت سے ماخوذ نہ ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس وقت ایسا معاشرہ کہیں موجود ہے' لہٰذا جو شخص اسلامی تاریخ' اسلامی فقہ کے مزاج اور اسلامی نظام کی نوعیت سے واقف ہو وہ قبل از وقت اسلامی فقہ کے ارتقاء اس کی تجدید اور ترقی کے لئے کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہم ایسے معاشروں میں زندگی بسر کر رہے ہیں جو سرے سے اس اصول ہی کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہمارا قانونی نظام صرف شرعی ہو گا اور قرآن و سنت پر مبنی ہو گا' ایک حقیقی مسلم کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کا آغاز کر دے' پہلے کسی ملک میں اللہ کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم کرائے اور یہ اصول اور یہ دستور تسلیم کرائے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہ ہو گا اور اللہ کی شریعت کے سوا کوئی قانون نہ ہو گا۔

یہ دین ایک سنجیدہ دین ہے اور اس کے ساتھ مذاق کرنا مناسب نہیں ہے' یہ مذاق ہی ہے کہ کوئی مملکت فقہ اسلامی کو تسلیم ہی نہ کرے اور لوگ بیٹھ جائیں لائبریریوں میں اور فقہ اسلامی کی تجدید اور ترقی کے لئے بزعم خود سعی کریں' حالانکہ جس معاشرے میں وہ یہ سعی کر رہے ہیں وہ سرے سے اسلامی فقہ کو رائج کرنے کا روادار ہی نہیں ہے۔ یہ بھی ایک ننگی جہالت ہے کہ کوئی یہ کہے کہ وہ محض دفتروں میں بیٹھ کر تفقہ فی الدین حاصل کر لے گا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فقہ کو شریعت اسلامی سے مستنبط تب ہی کیا جا سکتا ہے جب شریعت اور دین کو تحریک کی شکل دی جائے اور دین کو غالب کر کے وہاں فقہ نافذ کیا جائے۔

جب دین صرف اللہ کا ہو جائے اور حاکمیت صرف اللہ کی ہو جائے تو اسلامی معاشرہ وجود میں آجاتا ہے' اور اس کے بعد اس معاشرے اور سوسائٹی میں اسلامی قانون نافذ ہوتا ہے۔ یہ ترتیب ضروری ترتیب ہے' جب اسلامی دستور کے نفاذ پر ایک سوسائٹی وجود میں آجائے اور وہ سوسائٹی یہ عہد کر لے کہ اس نے اسلامی شریعت کو نافذ کرنا ہے تو اس کے بعد فقہ اسلامی وجود میں آتا ہے' اس سے قبل نہیں یہ نہیں ہوتا کہ قانون و فقہ کی ایک مفصل کتاب لکھ کر رکھ دی جاتی ہے اور اس کے بعد اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر فقہی حکم دراصل دستور' دین اور شریعت کا نفاذ کنندہ ہوتا ہے اور قانون دستور اور نظام اور شریعت کو عملاً ایک جزوی واقعہ پر نافذ کرتا ہے اور اسے ایک متعین صورت دیتا ہے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ یہ عمل تحریکی صورت میں ہو اور ایک اسلامی دستوری ڈھانچے کے قیام کے بعد اور اس کے اندر ہو' اس سے باہر نہ ہو اور وہ اسلامی سپر سٹرکچر کے دائرے اور اس کے عملی حالات کے اندر ہو' اس دستوری ڈھانچے کے تحت کوئی بھی قانون اس ڈھانچے کے عملی حالات اور سوسائٹی کے تقاضوں کے مطابق ایک عملی قدم ہوتا ہے۔ رہے احکام جو کتابوں میں ہوتے ہیں جو معاشرے اور دستوری نظام سے علیحدہ ہوتے ہیں وہ نافذ نہیں ہو سکتے۔ اسلامی فقہ کی کتب میں جو احکام موجود ہیں وہ کسی وقت ایک اسلامی معاشرے اور عملی اسلامی حکومت کے لیے بنائے گئے تھے وہ اس وقت کے عملی حالات' دستور اور معاشرے سے علیحدہ نہ تھے۔ یہ فقہ کی کتب اس وقت کے زندہ و تابندہ قوانین تھے اور عملاً جاری کرنے کے لیے مرتب کیے گئے تھے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم بھی جدید حالات کے لیے ایسے ہی اسلامی قوانین مرتب کریں۔

لیکن اسلامی قوانین مرتب کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ایک ایسی سوسائٹی موجود ہو جس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ اسلامی نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور اسلامی شریعت پر مبنی قوانین نافذ کرے گی۔

اس مقصد کے لئے ایک سنجیدہ سعی کی ضرورت ہے اور یہ اس دین کا سنجیدہ تقاضا ہے اور اس کے لئے اگر جہاد شروع کیا جائے تو اس سے انسان کے فکر و نظر کو جلا ملے گی اور تفقہ فی الدین حاصل ہو گا۔ اس کے سوا اگر ہم کوئی اور طریقہ کار اختیار کریں گے تو یہ اس سنجیدہ دین کے ساتھ ایک مذاق ہو گا اور یہ اسلامی جہاد سے فرار ہو گا اور بہانہ یہ ہو گا کہ ہم فقہ اسلامی کی تجدید چاہتے ہیں یا اسے ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں اس فرار سے بہتر ہے کہ ہم اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں کا صاف صاف اعتراف کر لیں۔ اور اللہ سے مغفرت طلب کریں کہ ہم جہاد سے عملاً پیچھے رہ گئے ہیں۔

○○○

اگلی آیت میں اسلام کی تحریک جہاد کا ایک دائمی منصوبہ پیش کیا جاتا ہے 'یہ وہ منصوبہ ہے جس پر حضور ؐ نے اپنی پوری زندگی میں جدوجہد فرمائی آپ ؐ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے اس کے مطابق اپنی پوری زندگی میں جدوجہد جاری رکھی اور یہ منصوبہ اسلامی تاریخ میں صرف اس وقت موتوف ہوا جب عملی دشواریاں پیش آئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں۔ اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں 'اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔

یہ ہے اسلامی جہاد کا دائمی منصوبہ۔ "جنگ کرو ان منکرین حق کے ساتھ جو تمہارے قریب ہیں۔

الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ (۹:۱۲۳) سے کیا مراد ہے۔ وہ یہ کہ عمل جہاد سب سے پہلے ان اقوام کے خلاف شروع کیا جائے جو تمہارے قریب اور پڑوس میں ہیں۔ یعنی دارالاسلام سے متصل ہیں اور یوں اس جہاد کو مرحلہ وار آگے بڑھایا جائے۔ جس وقت جزیرۃ العرب فتح ہو گیا اور فتح مکہ کے بعد چند غیر اہم پاکٹوں کے سوا جن سے دارالاسلام کو کوئی خطرہ نہ تھا' اسلامی لشکروں نے جزیرۃ العرب کے شمال میں رومیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا اور اسلامی افواج کو رومیوں کے خلاف تبوک میں جمع کر دیا۔ اس کے بعد اسلامی افواج روم اور فارس کی طرف بڑھیں اور تب بڑھیں کہ جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں اسلامی انقلاب کے خلاف کوئی پاکٹ نہ رہا۔ اسلامی علاقہ ایک مضبوط خطہ بن گیا اور اس کی حدود فارس و شام تک پھیل گئیں اور اسلامی مملکت ایک وسیع و عریض اور متحدہ مملکت بن گئی۔ اس اسلامی مملکت کو ضعف نے اس وقت لیا جب اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے وہ بادشاہتوں 'نوابوں اور شاہی خاندانوں کے قیام کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی یا بعد کے ادوار میں اس نے قومی مملکتوں کی صورت اختیار کی یاد رہے کہ قومیت کا فتنہ بھی دشمن اسلام قوتوں کا ایک گہرا منصوبہ تھا جس کے ذریعے انہوں نے اسلامی قوت کو پاش پاش کر دیا۔ اور دشمنان اسلام

آج تک اس منصوبے پر بڑی کامیابی سے عمل پیرا ہیں - اور آج وہ امت جس نے رنگ و نسل اور قوم اور علاقہ کے تصورات پر مبنی تمام حدود و قیود مٹا دیے تھے اور ایک عظیم قوت تھی وہ آج ایک نحیف و ضعیف امت ہے - آج بھی اس کا یہ ضعف اور وھن تب ہی ختم ہو سکتا ہے جب وہ صرف اسلامی جھنڈے تلے جمع ہو جائے اور وسعت اسلام کے اسلامی اور نبوی منصوبے پر عمل پیرا ہو جائے اور ربانی راہنمائی کے اسرار و رموز کو پالے جس کی وجہ سے اسے اس کرۂ ارض پر عظیم برتری حاصل ہوئی تھی۔

ذرا اس آیت کو ایک بار پھر دہرالیں

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں - اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں 'اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے"۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ان کفار کے ساتھ قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ان کے قریب ہیں - اس میں یہ قید نہیں لگائی گئی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوئے ہوں یا جارحانہ عزائم رکھتے ہوں - نیز اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے پھیلانے کا یہ فائنل حکم ہے اور دین کے پھیلانے کے اس دائمی حکم سے اصول جہاد نکلتا ہے اور جہاد کا یہ فعل اور یہ حکم کوئی وقتی حکم نہیں اور نہ کوئی دفاعی حکم ہے -

بعض ہمعصر مصنفین جب اسلام کے بین الاقوامی قوانین اور روابط پر بحث کرتے ہیں اور پھر اسلام کے نظریہ جہاد کو زیر بحث لاتے ہیں اور پھر قرآن کریم میں آیات جہاد کی تاویل کرتے ہیں وہ اس آیت کو ان آیات کے ذریعے محدود کرتے ہیں جو اس سے قبل عبوری دور کے لئے نازل ہوئی تھیں جن میں یہ کہا گیا کہ تم ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں یا جن سے تمہیں خطرہ ہے کہ تم پر حملہ کر دیں گے - حالانکہ کہ یہ حکم بے قید ہے اور ہے بھی آخری حکم - اس سے قبل ہم اس بات کی وضاحت کر آئے ہیں کہ قرآن کریم کا یہ اصول ہے کہ احکامات صادر کرتے وقت عبارت نہایت جامع اور مانع ہوتی ہے - اس میں ایک جگہ دوسری آیات کا حوالہ نہیں ہوتا بلکہ نہایت جامع الفاظ چنے جاتے ہیں اور اگر کسی حکم کے لئے کوئی تحفظ 'استثناء تخصیص ہو تو آیت کے اندر اسے لایا جاتا ہے -

اس نکتے کو اس سے قبل دسویں پارے کے مقدمے میں بیان کر آئے ہیں جہاں اہل کتاب اور مشرکین کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا تھا' وہاں ہم نے جہاد کے بارے میں عبوری احکام اور جہاد کے بارے میں فائنل احکام اور اسلام کے تحریکی عمل اور تحریکی مزاج کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی تھی - میں سمجھتا ہوں ان صفحات پر دوبارہ نظر ڈالی جائے تو وہ کافی ہیں دیکھئے پارہ دہم کے صفحہ نمبر---------

آج جو لوگ اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں ' اسلام کے قانون جہاد کے بارے میں بات کرتے ہیں اور پھر وہ آیات جہاد کی تفسیر و تاویل کرتے ہیں تو ان کو یہ بات نہایت ہی مشکل نظر آتی ہے اور وہ اس بات سے خائف ہو جاتے ہیں کہ ان احکام کو اسلام کے احکام تسلیم کیا جائے - اور یہ کہ اللہ نے مومنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے قریب کفار سے جنگ شروع کر دیں - اور وہ مسلسل اپنی حدود کو آگے بڑھاتے رہیں اور قتال کو بھی آگے بڑھاتے

رہیں یعنی وسیع سرحد پر بھی اگر کفار ہوں تو انہیں اور پیچھے دھکیل دیا جائے ۔ وہ اللہ کی جانب سے ایسا حکم ماننے سے خائف ہیں لہٰذا وہ شروع ہو جاتے ہیں تاویلات کرنے اور مطلق احکام کو مقید کرنے اور اس میں سے استثناء تلاش کرتے ہیں ۔ یہ لوگ آخری احکام کو عبوری احکام قرار دیتے ہیں ۔

ہم جانتے ہیں کہ وہ اس بات سے کیوں گھبراتے ہیں اور یہ بات انہیں کیوں انہونی لگتی ہے ۔

من خوب می شناسم پیران پارسارا

یہ لوگ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلام میں جہاد 'جہاد فی سبیل اللہ ہوتا ہے یا اس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ اس کرۂ ارض پر سے تمام طاغوتی قوتوں کو ختم کر دیا جائے اور اس پر صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت کا نظام قائم کیا جائے 'اور ان لوگوں کی حکومت ختم کر دی جائے جو اللہ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرتے ہیں ۔ گویا یہ جہادی عمل اس لئے ہے کہ تمام انسانوں کو غیر اللہ کی غلامی اور نظام حاکمیت سے نکال کر صرف اللہ کی حاکمیت کے اندر داخل کیا جائے یوں وہ تمام انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں تاکہ دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ یہ جہاد اس لئے نہیں ہے کہ مذاہب عالم میں سے کوئی مذہب دوسرے مذاہب پر غالب ہو جائے بلکہ یہ جہاد اس لئے ہے کہ اللہ کا نظام انسانی نظاموں پر غالب ہو جائے 'یہ جہاد اس لئے نہیں ہے کہ ایک قوم (مثلاً عرب) دوسری اقوام پر غالب آجائیں بلکہ یہ اللہ کی حاکمیت کو غالب کرنے کے لئے ہوتا ہے 'یہ جہاد اس لئے بھی نہیں ہے کہ کسی ایک انسان (ڈکٹیٹر یا بادشاہ) کی حکومت کو قائم کیا جائے 'یہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے جہاد ہے 'یہی وجہ ہے کہ اس عمل جہاد کا حق بنتا ہے کہ وہ پورے کرۂ ارض پر حکومت الٰہیہ قائم کرے 'تاکہ تمام انسان انسانوں کی غلامی سے آزاد ہوں 'بلاتفریق کے چاہے وہ مذہب اسلام میں داخل ہوں یا نہ ہوں یا کوئی سرزمین حدود اسلام میں داخل ہو یا نہ ہو 'کیونکہ یہ ملک اللہ کا ملک ہے اور تمام انسان اللہ کے بندے ہیں اور حکومت الٰہیہ کے خلاف جو لوگ بھی اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں وہ طاغوت ہیں ۔

جب ان لوگوں کی نظروں میں یہ حقیقت نہیں ہوتی تو پھر ظاہر ہے کہ وہ اس بات کے کہنے سے خوف محسوس کرتے ہیں کہ کوئی نظام اٹھے اور وہ دنیا سے تمام دوسرے نظاموں کو ختم کرنے کی مہم شروع کر دے ۔ یا کوئی قوم اٹھے اور وہ دنیا کی دوسری اقوام کو اپنا تابع بنا کر رکھے ۔ موجودہ حالات میں یہ بات نہیں چل سکتی 'اور عملاً بھی نہیں ملتی ۔ جب تک کہ ہم اسلام کے نظریہ جہاد کی وہ تعبیر نہ کریں جو ہم نے کی ہے ۔ کیونکہ موجودہ نظام ہائے زندگی تمام کے تمام انسان کے بنائے ہوئے نظام ہیں اور ان میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی ایک نظام یہ دعویٰ کرے کہ وہ نظام حق ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا نظام اس قابل نہیں ہے کہ وہ زندہ رہے کیونکہ اسی طرح ان تمام انسانی نظاموں کے درمیان پر امن بقائے باہمی کا اصول نہیں رہتا جو ان کا مسلم اصول ہے 'جبکہ ایک اسلامی اور الٰہی نظام زندگی کا مقابلہ انسانی نظاموں کے ہوتا ہے اور اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ تمام انسانی نظام باطل ہیں اور اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں نیست و نابود کر دیا جائے اور ان کی غلامی میں پسے ہوئے انسانوں کو رہائی دلائی جائے تاکہ وہ اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی میں آجائیں ۔

ان لوگوں کو اس نظریہ کے اعلان میں یہ خوف دامن گیر ہے 'اس لئے ان لوگوں کا مقابلہ ایک منظم اور مکر... ثقافتی یلغار سے ہے ۔ اور یہ مکروہ صلیبی یلغار ان کو یہ باور کراتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے اور یہ کہ جہاد کا عمل اس

لئے شروع کیا گیا ہے کہ دوسروں کو اپنے مذاہب ترک کرکے اسلام میں داخل کرنے پر مجبور کیا جائے اور لوگوں کے عقائد ونظریات کا احترام نہ کیا جائے حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔

اسلام کے نظریہ جہاد کی اگر یہ تعبیر نہ کی جائے تو دَورِ جدید میں اس کی تفسیر اور عمل کوئی آسان کام نہ ہوگا۔کیونکہ اسلام عدم اکراہ کے اصول پر قائم ہے

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے' ہدایت ضلالت سے اچھی طرح ممتاز ہوچکی ہے) ایسے حالات میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام پھر تلوار لے کر کیوں چلتا ہے اور پھر اللہ نے مسلمانوں کے ساتھ یہ سوداکیوں کیا ہے کہ ان کے مال اور جان جنت کے بدلے خرید لئے ہیں اور ان کی ڈیوٹی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے راستے میں قتال کرنا ہے جس میں ماریں گے اور مریں گے۔ظاہر ہے کہ یہ قتال اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنا دین عقیدہ ترک کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ کسی اور غرض کے لئے ہے۔یہ جہاد اس لئے ہے کہ لوگوں کو آزادی رائے کا حق دلایا جائے۔کیونکہ اسلام تو اس اعلان عام کا نام ہے کہ اس کرۂ ارض پر کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہ ہوگا۔کیونکہ اس کرۂ ارض پر ہمیشہ ایسے انسان اور ایسے طاغوتی نظام موجود رہے ہیں جو انسان کو انسانوں کا غلام بناتے ہیں' ایسے نظاموں کی پشت پر حکومتوں کی قوت ہوتی ہے یا کسی نہ کسی صورت میں یہ طاغوتی نظام قوی اور منظم ہوتے ہیں اور یہ نظام لوگوں تک دعوت اسلامی کے پہنچنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور یہ لوگوں کو اپنی مرضی کے عقائد قبول کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں یا مختلف طریقوں سے لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں اور یوں انسان کو حریت عقیدہ اور حریت رائے کی آزادی سے محروم کردیتے ہیں' اب اسلام اپنی قوت سے ایسے نظاموں کو پاش پاش کردینے کا حق لے کر اٹھتا ہے تاکہ ان ظالم اور جابر قوتوں کو تہس نہس کردیا جائے۔اس کے بعد عوام الناس کو آزادانہ ماحول فراہم کیا جائے کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں' اگر چاہیں تو اسلام میں داخل ہوجائیں اور اگر چاہیں تو وہ داخل نہ ہوں۔اگر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو مسلمانوں کو حاصل ہونگے۔اور ان کے ذمے وہی فرائض ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے ذمے ہوں گے۔یہ نئے داخل ہونے والے سابقین کی طرح دینی بھائی ہوں گے۔اور اگر وہ اسلام میں داخل نہ ہوں تو انہیں اختیار ہے کہ وہ اپنے عقائد پر قائم رہیں اور اسلامی حکومت کو جزیہ اداکریں۔اور یہ جزیہ اس بات کا اعلان ہوگا کہ انہوں نے اسلامی نظام کی اطاعت قبول کرلی ہے اور اب وہ اس کے مخالف یا باغی نہیں ہیں اور یہ کہ یہ ان کی جانب سے ایک قسم کی شراکت ہے جو وہ اسلامی مملکت کے بجٹ میں کرتے ہیں اور اسلامی حکومت ان کی جان ومال کی حفاظت کرتی ہے اور ان میں سے جو عاجز' ضعیف اور فقیر ہوں ان کی کفالت بھی اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔تمام اجتماعی سہولیات میں وہ مسلمانوں کے ساتھ برابر ہیں۔

اسلام نے کبھی بھی کسی فرد کو اپنے عقائد تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا۔جس طرح اپنے دور میں عیسائیت نے اقوام وملل پر مظالم ڈھائے اور انہیں جڑ سے اکھاڑ کر نیست و نابود کردیا۔قدیم تاریخ میں اندلس اس کی مثال ہے اور جدید تاریخ میں زنجبار اس کی مثال ہے عیسائیت نے یہاں عوام کو مجبور کیا کہ عیسائی بن جائیں۔اور اس کے علاوہ بھی عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ اس وقت حسن سلوک کیا جب وہ عیسائی بن گئے' بعض اوقات عیسائیوں نے اپنے مخالف عیسائی

فرقوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا خصوصا جبکہ کوئی فرقہ سرکاری مذہب کے خلاف عقائد رکھتا ہو۔ ۱۲ سو سال گزر گئے اور یہ لوگ مصر کے عیسائیوں پر مظالم ڈھاتے رہے کیونکہ وہ رومہ کے کلیسا کے عقائد میں جزوی اختلاف رکھتے تھے مثلاً یہ کہ روح القدس اب یا ابن دونوں سے پیدا ہوا ہے یا مثلاً یہ کہ حضرت عیسیٰ ایک ہی طبیعت لاہوتی رکھتے تھے یا یہ کہ وہ دو طبیعت لاہوتی اور ناسوتی رکھتے تھے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے عقائد۔

آخری اور حقیقی بات یہ ہے کہ روحانی طور پر شکست خوردہ اہل قلم دراصل دیکھتے ہیں کہ ایک جانب قرآن کے یہ قطعی احکام ہیں کہ جہاد کرو اور دوسری طرف وہ دیکھتے ہیں کہ حالات بالکل ناساز گار ہیں تو ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ تو کیا یہ شکست خوردہ لوگ جن کو تو اپنے امور و معاملات میں تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہے' جنہوں نے محض مسلمانوں کی طرح نام رکھ چھوڑے ہیں یہ لوگ مغلوب محکوم ہیں اور انہیں آزادی کے لئے کوئی تدبیر نہیں سوجھتی' کیا ان لوگوں میں کوئی بل بوتا ہے کہ وہ انہیں اور زمین پر موجود بڑی بڑی طوغوتی قوتوں کو چیلنج کریں اور ان کے ساتھ جہاد و قتال شروع کر دیں تاکہ دنیا میں کوئی فتنہ نہ رہے اور ہر قسم کا نظام زندگی اللہ کا ہو جائے یہ بات عقل سلیم ہرگز قبول نہیں کرتی۔ اور عملاً یہ بات ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ لوگ اس قدر بات بھی نہیں سمجھ پاتے کہ اسلام کا عمل جہاد شروع کب ہوا ہے عمل جہاد و قتال کا آغاز اس وقت ہوا جب اسلامی حکومت قائم ہوگئی جس میں اللہ کے احکام بطور دستور و قانون چلنے لگے تھے' پورا جزیرۃ العرب زیر نگیں آگیا اور تمام عرب اسلام کے دائرے میں آگئے اور اس نظام میں پختگی اور تنظیم پیدا ہوگئی' اس سے قبل تو ایک جماعت ہی تھی جس نے اللہ کے ساتھ سچی بیعت کرلی تھی' اللہ نے اس جماعت کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی دی وہ ایک کے بعد ایک لڑائی میں کامراں ہوتے رہے اور ہر مرحلے سے سرفراز ہوکر گزرتے رہے' آج وہی دور لوٹ کر آگیا ہے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دور تھا۔ حضورؐ لوگوں کو کلمہ شہادت کی طرف بلا رہے تھے اور ان کے اردگرد جاہلیت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آپ نے جدوجہد شروع کی یہاں تک کہ مدینہ میں ایک اسلامی مملکت وجود میں آگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد و قتال کے بارے میں احکامات مختلف مراحل سے گزر کر موجودہ مرحلے تک پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ احکام یہ آخری شکل دصورت اختیار کر گئے۔ اس لئے ہمارا طریقہ کار یہ رہنا چاہئے کہ ہم لا الہ اللہ کی دعوت لے کر اٹھیں اور بتدریج آخری مرحلہ جہاد تک پہنچ جائیں' اگر اللہ چاہے۔ اگر تحریک اسلامی کا ارتقاء دور جدید میں بھی اس اسلوب پر کیا جائے تو مسلمان وہ بے کار عنصر نہ رہیں گے جو اس وقت ہیں کہ وہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے مفادات کے لئے اور اپنی اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ان کو قومی' نسلی' اور گروہی روایات نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے بلکہ وہ ایک ایسی جماعت اور امت کے طور پر اٹھیں گے جس کا شعار لا الہ اللہ ہوگا۔ اور کلمے کے جھنڈے اور شعار کے سوا ان کا کوئی اور شعار نہ ہوگا۔ ان کے ہاں نہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظام ہوگا اور نہ ہی انسان کا بنایا ہوا کوئی دستور و نظام ہوگا۔ یہ جماعت اللہ کا نام اور اللہ کا پیغام لے کر اٹھے گی اور دنیا پر چھا جائے گی۔

جن حالات میں اس وقت مسلمان ہیں وہ دین اسلام کی حقیقت و مسائل کو نہیں سمجھ سکتے' یہ غلاموں کا دین نہیں ہے' اس دین میں تفقہ وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلیں اور ان کے جہاد کی غرض و غایت صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ اس کے سوا کچھ نہ ہو۔ اسلامی حکومت کا قیام ہو اور کوئی غرض و غایت نہ ہو۔ طاغوتی قوتوں کو

مٹانا ہو اور کچھ نہ ہو۔

اس دین میں تفقہ ان لوگوں سے حاصل نہیں کی جا سکتی جو عیش و عشرت میں گم ہیں' جن کا شغل صرف اوراق علم سے ہے' اس دین میں تفقہ جدوجہد' حرکت اور پھیلاؤ سے حاصل ہوتی ہے' محض متون کتب کا حفظ کرنا اور ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر نصوص پر بحث کرنا' انسان کو فقیہ نہیں بناتا' کسی وقت بھی مسلمانوں کے فقہاء ایسے نہیں رہے۔

آخر میں یہ سوچنا چاہئے کہ درجہ ذیل آیت آخر نازل کن حالات میں ہوئی۔

يَأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۱۲۳) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے" ان آیات میں سب سے پہلے اشارہ اہل روم کی طرف ہے' یہ اہل کتاب تھے اس سورت میں ان کے اعتقادی کفر اور عملی کفر کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے' ان کا عقیدہ بھی غلط تھا۔ اور ان کا قانون اور دستور نظام بھی اسلام سے منحرف تھا۔

یہ ایک سائن بورڈ ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اسے غور سے پڑھیں کہ اہل کتاب کے حوالے سے دین اسلام نے کیا پالیسی اختیار کی۔ یہ لوگ خود اپنی کتاب سے بھی منحرف ہو گئے تھے اور خدا کی شریعت کے بجائے مختلف بادشاہوں کی شریعت کے نافذ کندہ تھے۔ تمام اہل کتاب چاہے وہ جہاں ہوں اور جس دور میں ہوں وہ انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت کے پیرو کار ہوتے ہیں۔ اللہ کا حکم ہے کہ جہاں بھی اہل کفر ہوں ان کے ساتھ قتال کرو اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ اور اس کے بعد کہا جاتا

اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۱۲۳) (اللہ متقیوں کے ساتھ ہے) اس تعقیب کا خاص مفہوم ہے' یہاں تقویٰ سے مراد وہ تقویٰ ہے جسے اللہ محبوب رکھے' یہ تقویٰ وہ ہے جو انسان کو پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے لئے جنگ کرنے پر ابھارے اور اس تقویٰ کے اندر سختی ہو مریل تقویٰ نہ ہو' اور نرم اور پیچھے ہٹنے والا نہ ہو اور اس وقت تک آگے بڑھے جب تک پورے کا پورا دین اللہ کا نہیں ہو جاتا۔

یہاں ہمیں معلوم ہونا چاہئے اور لوگوں کو بھی معلوم ہونا چاہئے کہ "غلظة" سے مراد کرختگی نہیں ہے بلکہ دین کے اوپر جم جانا ہے۔ اور پھر اس کے لئے لڑنا بھی اسلامی ضابطہ جنگ کے مطابق لڑنا ہے۔ جنگ کے بھی اسلام نے آداب رکھے ہیں' سختی سے مراد بے قید اور بے ضابطہ سختی نہیں ہے۔

اعلان قتال سے قبل الٹیمیٹم ضروری ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یا تو اسلام قبول کرو' یا جزیہ دے کر اطاعت قبول کرو' یا جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر کسی قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے تو اعلان جنگ سے پہلے معاہدے کی منسوخی ضروری ہے بشرطیکہ معاہدے پہ خطرہ لاحق ہو کہ وہ بد عہدی کرے گا۔ (اس سلسلے میں احکام یہ ہیں کہ معاہدہ ان لوگوں کے ساتھ کرنا ہے جو ذمی ہوں اور اسلام کے ساتھ پر امن بقائے باہمی کے اصول پر قائل ہوں یا جزیہ دینے پر راضی ہوں' اس کے سوا کسی کے ساتھ معاہدے کی اجازت نہیں الا یہ کہ مسلمانوں میں کمزوری ہو' اس وقت حسب ضرورت عبوری

معاہدہ کرسکتے ہیں۔)

حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں وہ درج ذیل ہیں :

- حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر یا دستے پر کمانڈر مقرر فرماتے تھے تو اسے خصوصیت کے ساتھ خدا خوفی کی وصیت فرماتے تھے ' اور یہ حکم دیتے تھے کہ وہ اپنے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں ' اس کے بعد آپ فرماتے جنگ کرو اللہ کے نام کے ساتھ ' اللہ کے راستے میں ' صرف ان کو قتل کرو جو منکر خدا ہو ' ------------ ' حد سے تجاوز نہ کرو ' غداری نہ کرو ' مثلہ نہ بناؤ ' بچوں کو قتل نہ کرو ' اگر تم کو دشمن سے آمنا سامنا ہو تو اسے تین باتوں کی طرف دعوت دو ' تو اگر وہ کوئی ایک قبول کرلیں تو ان کے ساتھ جنگ سے رک جاؤ ' ان کو اسلام کی دعوت دو ' اگر مان جائیں تو قبول کرلو ' اور رک جاؤ ' اس کے بعد ان کو دعوت دو کہ وہ اپنا علاقہ چھوڑ کر دار لمہاجرین کی طرف آجائیں اگر وہ ایسا کریں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہوں گے تو اگر وہ دار الحرب کی طرف منتقل نہیں ہوتے تو وہ مسلمانوں کی دیہاتی آبادی ہوگی اور انہیں بھی وہی احکام جاری ہوں گے جو مسلمانوں پر جاری ہوتے ہیں لیکن مال غنیمت اور فے میں ان کا حصہ نہ ہوگا۔ الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد کریں۔ اگر وہ یہ پوزیشن بھی اختیار نہیں کرتے تو ان سے جزیہ طلب کریں اگر جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں تو ان سے قبول کرلیں اور جنگ نہ کرو ' اور اگر وہ یہ صورت بھی قبول نہ کریں تو اللہ سے نصرت طلب کرکے ان کے ساتھ جنگ کریں۔" (مسلم ' ابوداؤد ' ترمذی)

- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض مغازی میں ایک عورت مقتول پائی گئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔ (بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا اور ان کو یہ وصیت فرمائی :

"تم اہل کتاب کے پاس جاؤ ' ان کو کلمہ طیبہ کی شہادت کی طرف دعوت دو ' کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ' اور میں اللہ کا رسول ہوں ' اگر وہ اس بات کو مان لیں تو پھر ان کو بتاؤ کہ اللہ نے تم پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر یہ بات بھی تسلیم کرلیں تو پھر ان کو بتائیں کہ اللہ نے تم پر زکوۃ فرض کی ہے جو اغنیا سے لی جاتی ہے اور فقراء کی طرف لوٹائی جاتی ہے۔ اگر وہ اس بات کو بھی قبول کرلیں تو پھر ان کے بہترین اموال سے پرہیز کرو ' اور مظلوم کی پکار سے بچو ' کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے"

ابوداؤد نے ایک جہینی شخص سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "شاید تمہیں کسی قوم سے لڑنا پڑے اور تم ان پر غالب آجاؤ ' وہ اپنی جان اور اولاد کے بچانے کے لئے تمہارے ساتھ سال کے بدلے کچھ شرائط پر صلح کرلیں تو شرائط صلح سے زیادہ ان سے کچھ نہ لو ' یہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہے"

- حضرت عرباض ابن ساریہ سے روایت ہے ' فرماتے ہیں "ہم رسول ؐ کے ساتھ خیبر میں اترے اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی تعداد تھی ' خیبر کا حکمران بڑا سرکش اور متکبر تھا۔ وہ نبی ؐ کے سامنے آیا اور کہا اے محمد کیا تمہیں اختیار ہے کہ ہمارے گدھوں کو ذبح کردو ' ہمارے پھل کھالو ' اور ہماری عورتوں کو مارو پیٹو؟ اس پر حضور ؐ کو غصہ

آیا آپؐ نے فرمایا اے ابن عوف گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور اعلان کر دو 'یہ جنت صرف مومنین کے لئے ہے اور فوراً نماز کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اس کے بعد آپ نے نماز باجماعت ادا کی اور اس کے بعد کھڑے ہو کر یہ تقریر فرمائی تم میں سے ایک شخص اپنی نشست پر تکیہ لگا کر بیٹھ جائے گا اور یہ گمان کرے گا کہ اللہ نے کسی چیز کو حرام نہیں قرار دیا مگر وہ جو صرف قرآن کریم میں ہے۔ خبردار! میں نے وعظ کیا ہے' بعض چیزوں کا حکم دیا ہے' بعض سے منع کیا ہے' یہ سب احکام قرآن کی طرح ہیں یا اس سے بھی زیادہ۔ اللہ نے تمہارے لیے یہ جائز نہیں قرار دیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں داخل ہو جاؤ' مگر ان کی اجازت سے' نہ ان کی عورتوں کو مارنے کی اجازت دی ہے' نہ ان کے پھل کھانے کی اجازت دی ہے جبکہ وہ حق ادا کر دیں جو ان پر ہے"۔

"یہ روایت مرفوع بیان کی گئی ہے کہ جنگی صفوں کے درمیان ایک بچی کو قتل کر دیا گیا' اس پر حضورؐ بہت ہی دلگیر ہوئے' بعض لوگوں نے پوچھا حضورؐ آپ کو کس چیز نے اس قدر مغموم کر دیا ہے۔ آخر وہ تو مشرکین کی بچی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی غصہ ہوئے' اور فرمایا (مفہوم یہ ہے) یہ بچے تم سے بہتر ہیں۔ یہ فطرت پر ہیں۔ کیا تم مشرکین کی اولاد نہیں ہو؟ لہٰذا بچوں کے قتل سے باز رہو' بچوں کے قتل سے باز رہو۔"

یہ تھیں نبوی تعلیمات جن کی اساس پر خلافت راشدہ کی پالیسی جاری رہی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم ایسے لوگ پاؤ گے جن کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں بند کر لیا ہے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور بچوں' عورتوں اور بوڑھوں کو ہرگز قتل نہ کرنا۔

حضرت زید ابن وھب نے فرمایا کہ ہمارے نام حضرت عمرؓ کا یہ سرکلر پہنچا' حد سے تجاوز نہ کرو' غداری نہ کرو' بچوں کو قتل نہ کرو اور مزارعین کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔

ان کی وصیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے "بہت بوڑھے کو قتل نہ کرو' عورت کو قتل نہ کرو' بچوں کو قتل نہ کرو' جب مڈبھیڑ ہو تب بھی ان کے قتل سے باز رہو اور حملے کے وقت بھی۔

یہ ہیں متواتر احادیث جو دشمنان اسلام کے ساتھ جنگ کے دوران مسلمانوں کے لیے ضابطہ اخلاق متعین کرتی ہیں۔ ان احادیث میں نہایت بلند جنگی اخلاق دیئے گئے ہیں جن میں انسان کی انسانیت کے شرف کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ نیز ان میں جنگی عمل کو صرف ان صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے جن میں انسان کو دوسرے انسانوں کی غلامی سے چھڑانا مقصود ہو۔ نیز یہ جنگ بھی مہذب جنگ ہوتی ہے جس میں سختی' شدت اور وحشیانہ اعمال کی گنجائش نہیں ہے جس کی رو سے بوڑھے' بچے اور عورتیں بالکل محفوظ ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو جنگ نہیں کرتے۔ یہ ایسی جنگ نہیں ہے جو دور حاضر کے نام نہاد مہذب لوگ لڑتے ہیں۔ جس میں کشتوں کے پشتے لگا دیتے اور جس کی زد میں عورتیں اور بچے بھی آتے ہیں بلکہ جوان بھی۔ جبکہ اسلام نے تمام غیر محارب افراد کو جنگ کی زد سے محفوظ رکھا ہے۔ انسانیت کا احترام سکھایا ہے' اسلام نے جنگ میں شجاعت اور جراءت و ثابت قدمی کی تعلیم دی ہے لیکن اس حد تک جس حد تک جنگ میں ضرورت ہو اس نے انتقام' نسل کشی اور مثلہ بنانے کی اجازت نہیں دی۔

○○○

اس سورت میں منافقین کے بارے میں نہایت طویل بات کی گئی ہے۔ اب اس سورت کے اختتام کے قریب بتایا جاتا ہے کہ ان منافقین کا طریقہ واردات کیا ہے؟ وہ نزول آیات کے وقت اور نفاذ احکام و شریعت کے وقت کس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں؟ کس طرح یہ منافقین آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔

وَ إِذَا مَآ أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ إِيْمَانًا
فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ إِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ أَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾
أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ
وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَإِذَا مَآ أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ
هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

”جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پوچھتے ہیں کہ کہو، تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟“ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورت نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دلشاد ہیں، البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق) کا روگ لگا ہوا تھا ان کی سابق نجاست پر (ہر نئی سورت نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں“۔

جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے:

”جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پوچھتے ہیں کہ کہو، تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟“

یہ ایک شکی مزاج کا سوال ہے، جس میں شرارت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسے شخص کا سوال ہے جس کے قلب و نظر پر، نازل ہونے والی کسی سورت کا کوئی اثر بھی نہ ہوا ہو، اگر اس شخص کے قلب و نظر پر کسی سورت کا کچھ اثر ہوتا تو اس کو یہ سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ پھر اس شخص کے سوال میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ یہ شخص اس نازل ہونے والی

سورت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔اس کو سورت کی اثرانگیزی میں شک ہے۔

چنانچہ اس کا جواب دستی دے دیا جاتا ہے۔یہ ایسا جواب جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (١٢٤) وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (١٢٥)(٩: ١٢٤ — ١٢٥)) "جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورت نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دلشاد ہیں' البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق) کا روگ لگا ہوا تھا ان کی سابق نجاست پر (ہر نئی سورت نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے"۔ یعنی اہل ایمان کے لیے دلائل ایمان میں اضافہ ہو گیا اس لیے ان کے ایمان میں تو اضافہ ہو گیا' ان کے دل اللہ کے ذکر کے ساتھ دھڑکنے لگے' یوں ایمان میں اضافہ ہو گیا' ان کے دل میں یہ شعور پیدا ہو گیا کہ اللہ نے ان پر عنایت کی اور اپنی آیات نازل کر دیں تو اللہ پر ان کا ایمان زیادہ ہو گیا۔اور جن لوگوں کے دل میں منافقت کا مرض تھا' جن کے دل میں گندگی تھی تو اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔چنانچہ اس قسم کے لوگ مرتے دم تک ایسے ہی گندے' منافق اور کافر ہی رہے۔یہ اللہ کی طرف سے سچی خبر ہے اور ایسا ہی ہوا۔

اس سے قبل کی قرآن مجید ان کے منافقانہ استعجاب کے ایک متحرک منظر کو پیش کرے۔اللہ تعالیٰ خود ان کی حالت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کی حالت بذات خود تعجب انگیز ہے' اس لیے کہ آزمائش اور ابتلاء کا بھی ان منافقین پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (٩: ١٢٦) "کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ توبہ کرتے ہیں' نہ کوئی سبق لیتے ہیں"۔ مثلاً آزمائش یوں ہوتی ہے کہ بعض اوقات ان کا نفاق طشت ازبام ہو جاتا ہے۔بعض اوقات یہ لوگ جنگ سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور مسلمانوں کو پھر بھی فتح نصیب ہوتی ہے' ان کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے ان کی آزمائش ہوتی رہتی ہے لیکن ان کو پھر بھی توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔

اب ذرا نگاہ ڈالئے اسکرین پر' ان منافقین کی ایک متحرک اور چلتی پھرتی تصویر آپ کو نظر آئے گی جس میں ان کے پورے خدوخال نظر آئیں گے صاف صاف۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (٩: ١٢٧) جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے ' پھر چپکے سے نکل بھاگتے ہیں ۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دے ہیں کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں ۔ نظر آتا ہے کہ جب یہ سورہ نازل ہو رہی تھی تو یہ لوگ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے تھے ' کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟ جب دیکھتے ہیں کہ مسلمان تو کلام الٰہی سننے میں منہمک ہیں تو یہ لوگ چپکے سے بھاگ جاتے ہیں ۔ نہایت ہی خاموشی دبے پاؤں بلکہ پاؤں کی انگلیوں پر چل کر ۔

انْصَرَفُوْا ''یہ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں'' لیکن جو آنکھ غافل نہیں ہے وہ دیکھ رہی ہے کہ وہ تو کبھی غافل اور مشغول نہیں ہوتی ۔۔۔۔ چنانچہ ان کی اس حرکت کے عین مناسب بد دعا آجاتی ہے ۔

صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۹ : ۱۲۷) ''اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے) وہ راہ ہدایت سے بہت دور نکل جائیں اور اپنی اس گمراہی ہی میں مگن رہیں ۔

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ (۹ : ۱۲۷) ''کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں'' انہوں نے اپنے دل و دماغ کو معطل کر دیا ہے اور یہ اس کے مستحق نہیں ہیں ۔ غرض یہ ایک متحرک اور بھرپور منظر کے چند الفاظ میں اس کی منظر کشی کی جاتی ہے اور نظروں کے سامنے تمام کردار پھرتے نظر آتے ہیں ۔

○○○

اس سورہ کا خاتمہ دو آیات پر ہوتا ہے ' بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ مکی آیات ہیں ' بعض میں آتا ہے کہ یہ مدنی آیات ہیں ' ہم سمجھتے ہیں ' کہ یہ مدنی ہیں ' ان آیات کا ربط اس سبق کے ساتھ بھی واضح ہے اور پوری سورہ کے ساتھ بھی ان آیات کا مفہوم مربوط ہے ۔ شاید یوں کہ امت مسلمہ رسول اللہ ؐ کی قیادت اور حمایت میں ' دعوت اسلامی کی راہ میں اور دشمنان دعوت کے ساتھ جنگ و جہاد میں جو مشکلات اٹھا رہے ہیں اس پر رسول ؐ کو سخت تکلیف ہوتی ہے ' جبکہ دوسری آیت میں رسول اللہ ؐ کے فرائض یہ بتائے گئے ہیں کہ اگر ایسے جانفشاں ساتھی نہ بھی ہوتے تو بھی آپ کو یہ کام تن تنہا کرنا تھا ۔ صرف اللہ کے بھروسے پر لہذا منکرین و منافقین کے رویے سے پریشان نہ ہوں ۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
۱۲ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ
ع ۱۷ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾
۵

دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے ' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے ' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے ' ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے ۔ اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی ؐ ' ان سے کہہ دو کہ ''میرے لیے اللہ بس کرتا ہے ' کوئی معبود نہیں مگر وہ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ ۱۲۸

ہے عرش عظیم کا"۔

یہاں تم میں سے نہیں کہا ہے بلکہ یہ کہا کہ تمہارے نفسوں میں سے۔ نفس کے لفظ سے گہرے تعلق کا اظہار ہوتا ہے اور یہ لفظ زیادہ حساس ہے' اس سے تعلق اور رابطے کی گہرائی ظاہر ہوتی ہے' یعنی رسول تمہاری جانوں کا ٹکڑا ہے' تمہارے وجود کا ایک حصہ ہی ہے' یعنی اس کا نفس تمہارے نفسوں سے ملا ہوا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۹: ۲۸) "دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے"۔

تمہارا نقصان میں پڑنا اور مشقت میں گرفتار ہونا اس پر شاق گزرتا ہے۔

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (۹: ۲۸) "تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے"۔ اور وہ تم پر حریص ہے۔ تمہیں وہ ہلاکت و بربادی سے دوچار نہیں کرتا۔ اس نے تمہیں جہاد و قتال کا سبق سکھایا اور مشکلات میں تمہیں جو عظیم مہم پر لے گیا ہے' یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے نزدیک تمہاری کوئی وقعت نہیں ہے یا وہ سنگدل ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک قسم کی رحمت اور مہربانی ہے۔ یہ درحقیقت تمہیں ذلت سے نکال کر عزت کا مقام دیا جا رہا ہے' اور گناہوں سے بچا کر تم پر رحم کیا جا رہا ہے اور رسول اس بات پر حریص ہیں کہ تم دعوت اسلامی کے حامل ہونے کا شرف پاؤ اور تمہیں اللہ کی رضامندی حاصل ہو اور تمہارے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو' اس طرح تم جنت کے مستحق بن جاؤ۔

اب آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جاتا ہے کہ اگر تمام لوگ بھی منہ موڑ لیں تو تمہارا طریقہ یہ ہو گا کہ تم پھر بھی اللہ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو۔ وہی تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔

حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۲۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۱۲۹) (۹: ۱۲۸ – ۱۲۹) "تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے' ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے --- اب اگر یہ لوگ تم سے منہ پھیرتے ہیں تو اے نبی' ان سے کہہ دو کہ "میرے لیے اللہ بس کرتا ہے' کوئی معبود نہیں مگر وہ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ مالک ہے عرش عظیم کا"۔

تمام قوتوں' تمام بادشاہتوں اور تمام عظمتوں کا مالک تو وہی ہے جو شخص اس کے دربار میں پناہ لے اور اس کا دوست بن جائے وہ اس کے لیے کافی ہے۔

قتال و جہاد کی صورت کا یہ خاتمہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جنگی قوت اور ساز و سامان کے باوجود بھروسہ صرف اس پر کیا جانا چاہئے' اس سے مدد طلب کرنا چاہئے کیونکہ وہی رب عرش عظیم ہے۔

○○○

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل کہ یہ سورت محکم اور قانونی آیات پر مشتمل ہے اور اس میں اسلامی سوسائٹی

اور تمام جاہلی سوسائٹیوں کے درمیان روابط و تعلقات کی ایک مستقل صورت بتائی گئی ہے جب کہ ہم نے تفصیلات دی ہیں۔ اس لیے اس سورت کی آیات کو اس موضوع کو آخری حکم اور آخری قانون تصور کرنا چاہیے اور ان آیات و ضوابط کو ان کے لیے مخصوص نہ ماننا چاہیے جو اس سے بہت پہلے نازل ہوئی تھیں۔ کیونکہ سابقہ آیات اور احکام عبوری آیات و احکام تھے اور اس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ نزول کے اعتبار سے وہ آیات پہلے نازل ہوئیں' نیز دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی جن مراحل سے گزری اسی سورت میں اس کا آخری مرحلہ بیان ہوا ہے۔ تیسری بات یہ کہ دعوت اسلامی کا مزاج اور منہاج جو ہم نے اس سورت کے آغاز میں بیان کیا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اور یہ منہاج وہ ہے جو صرف ان لوگوں کی سمجھ میں آسکتا ہے جو اس تحریک کو ایک عملی اور جہاد فی سبیل اللہ کی تحریک سمجھ کر اٹھتے ہیں تاکہ اس کرۂ ارض پر دین کا وجود قائم کیا جائے اور لوگوں کو اللہ کی ربوبیت کی طرف لوٹایا جائے اور انہیں لوگوں کی بندگی اور غلامی سے باہر نکالا جائے۔

یاد رہے کہ تحریکی فہم و ادراک اور لائبریریوں کے فہم و ادراک میں بہت بڑا فرق ہے' جو لوگ صرف لائبریری میں کتابوں کے اوراق سے دین کو سمجھتے ہیں وہ اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ لائبریری میں نہ اسلام پر عمل ہو سکتا ہے اور نہ عملاً اسے چکھا جا سکتا ہے۔ رہی تحریکی فقہ اور تفقہ تو اس میں انسان جاہلیت کے بالمقابل بھی کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہے' مرحلہ وار چلتا ہے' ایک ایک موقف سے عملاً دوچار ہوتا ہے۔ وہ عملی واقعات کے سامنے آگے احکام پاتا ہے' عملی مسائل میں اس کے سامنے احکام آتے ہیں اور وہ انہیں قبول کرتا ہے۔ اور واقعات کے بدلنے سے احکام بدلتے رہتے ہیں۔

اس سورت میں جو آخری احکام وارد ہوئے ہیں جس وقت یہ وارد ہوئے تو اسلام و جاہلیت آمنے سامنے تھے اور کشمکش برپا تھی۔ ان عملی صف بندیوں میں یہ آخری احکام تھے' رہے وہ احکام جو اس سے پہلے طویل تحریکی مرحلوں میں آئے تھے تو وہ عبوری تھے۔

اب اگر کوئی اسلامی تحریک از سرنو کام کا آغاز کرے تو اس کے عبوری ادوار کے لیے عبوری احکام ہوں گے۔ لیکن اسے بھی جاننا چاہیے کہ یہ عبوری احکام ہیں اور نئی تحریکوں کا بھی فرض ہے کہ وہ جہاد کے احکام کو عملی جامہ پہنانے آخری مرحلے تک جا پہنچیں اور ان آخری احکامات و مراحل تک تحریک کو پہنچا دیں جو اس سورت میں وارد ہیں۔ واللہ ھوالموفق۔

○○○

سورۂ یونس ایک نظر میں

ایک بار پھر ہم مکی دور نزول قرآن میں آگئے ہیں۔ مکی دور کی ایک خاص فضا ہے۔ اس کی فضا اور اس کے اثرات اور اشارات بالکل جدا ہیں۔ سورہ انفال' سورہ توبہ میں ہم مدنی دور کی فضاؤں میں گھومتے رہے۔

قرآن کریم کا مکی حصہ بھی قرآن کا ہی حصہ ہے اور وہ قرآن کے عمومی خواص میں پورے قرآن کے ساتھ شریک ہے۔ لیکن وہ مدنی قرآن اور تمام انسانی اقوال کے مقابلے میں ایک منفرد اسلوب رکھتا ہے۔ اس کی یہ انفرادیت مضمون اور ادا ہر اعتبار سے ہے۔ البتہ مکی قرآن کی ایک خاص فضا ہے۔ ایک خاص ذوق اور انداز ہے۔ اور یہ انداز مکی موضوعات کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ وہ کیا موضوعات ہیں' مختصراً یہ کہ مکی قرآن میں حقیقت الوہیت' حقیقت عبودیت اور ان کے درمیان تعلق کی نوعیت لوگوں کے سامنے اس رب کی ذات و صفات کی وضاحت جو واحد مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے' اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے اور اسلامی نظریات و عقائد میں جو میل کچیل اور جو انحراف اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے اسے صاف کرنا اور لوگوں کو اللہ کی الوہیت اور ربوبیت اور اطاعت کی طرف لوٹا کر واپس لانا بالعموم مکی قرآن کا موضوع کلام ہے۔ ان موضوعات کے لیے نہایت ہی موزوں اور مناسب انداز اظہار اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ اسلوب حد درجہ موثر' اشاراتی اور ساحرانہ ہے۔ اس کے اندر معجزانہ اسالیب کلام کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ الفاظ کی خوبصورتی' موضوع کا حقیقت پسندانہ اور منطقی ہونا جس طرح ہم نے سورہ انعام میں اس پر قدرے بحث کی ہے اور آئندہ بھی کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

اس سے قبل ہم نے سورہ انعام اور سورہ اعراف کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ دونوں سورتیں باہم ترتیب میں پیوست بھی تھیں اور مکی تھیں۔ اگرچہ ان کی زمانہ نزول قریب نہ تھا۔ پھر سورہ انفال اور توبہ کا ہم نے مطالعہ کیا۔ ان کے مضامین اور حالات نزول مدنی تھے اور ان کا بھی ایک خاص مزاج اور اپنے اپنے موضوعات تھے۔ اب سورہ یونس اور سورہ ہود ترتیب مصحفی میں باہم پیوست مکی سورتیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کا ترتیب نزولی بھی قریب ہے۔ ان دونوں سورتوں کے درمیان بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے موضوعات بھی ایک جیسے ہیں اور ان میں اسلوب کلام بھی باہم مماثل اور ہم آہنگ ہے۔ سورہ انعام کا موضوع یہ ہے کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کو لیتی ہے اور جاہلیت کے سامنے اسے پیش کرتی ہے' اور وہ جاہلیت کے نظریات اور اس کے شعور اور سوچ پر طنزیہ تبصرہ کرتی ہے۔ اہل جاہلیت کے اعمال اور عبادات کو ایک مذاق قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ سورہ اعراف اس نظریہ کو ایک تحریک کی شکل میں لے کر چلتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں جاہلیت کے مقابلے میں اسلامی تحریک اسی طرح کام کرتی رہی ہے جس طرح موجودہ تحریک کام کر رہی ہے۔ یہاں سورہ یونس اور ہود کی صورت حالات بھی یہی ہے۔ ان کے درمیان بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔ سورہ انعام اور سورہ یونس کے درمیان اگر مقابلہ کیا جائے تو سورہ انعام اپنی ضربات اور سرعت رفتار کے اعتبار سے

بہت ہی بلند اور ضخیم ہے۔ اور اس کے مضامین بڑی تیزی سے چلتے ہیں۔ رفتار و تصویر کشی میں وہ نہایت ہی روشن اور واضح ہے جبکہ سورہ یونس میں واقعات کی رفتار دھیمی ہے۔ اس کی نبض نہایت ہی نرمی، سلاست اور باقاعدگی سے چلتی ہے۔ ہود اعراف کے ساتھ مماثل ہے۔ موضوع، طرز ادا اور رفتار واقعات کے اعتبار سے لیکن ہر سورہ کی پھر اپنی امتیازی خصوصیات بھی ہیں اور ہر ایک کے اپنے خدوخال بھی ہیں جو دوسری سورتوں سے ملتے جلتے بھی ہیں اور مخالف بھی ہیں۔

جس طرح ہم نے سابقہ پیراگراف میں بتایا سورہ یونس کا بنیادی موضوع وہی ہے جو تمام مکی قرآن کا بنیادی موضوع ہے۔ اس سورہ نے جو مضامین لیے ہیں وہ اس سورہ کے خدوخال اور اس کی شخصیت کے مطابق ہیں۔ اس سورہ کے مضامین و مشمولات کی یہاں ہم صرف تلخیص ہی دے سکتے ہیں۔ تفصیلات تشریح آیات کے وقت آئیں گی۔ درج ذیل نکات یہاں پیش نظر رکھیں۔

سب سے پہلے اس میں یہ موضوع لیا گیا ہے کہ مشرکین مکہ کو حقیقت وحی کے بارے میں کیا کیا شبہات لاحق ہیں اور نتیجتاً یہی شبہات ان کے ذہنوں میں اس کتاب کے بارے میں بھی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اپنی طرف سے قرآن جیسا کلام کس طرح لا سکتا ہے؟

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۱) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۲) (۱۰: ۱ — ۲) "ال ر، یہ اسی کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے۔ کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت و سرفرازی ہے؟ منکرین نے کہا کہ یہ کھلا جادوگر ہے"۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵) قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۷) (۱۰: ۱۵ تا ۱۷) "جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں،

کہ ”اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو“۔ اے محمدؐ ان سے کہو ”میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر اور تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے“۔ اور کہو ”اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہ پائیں گے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷) اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۸) (۱۰ : ۳۷ - ۳۸) ”اور قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو ”اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو“۔

اب ان کے مطالبہ معجزہ' ماسوائے قرآن' کا جواب دیا جاتا ہے۔ اور اس مطالبے کا بھی جواب دیا جاتا ہے جو وہ جلد عذاب لے آنے کے سلسلے میں مطالبہ کرتے تھے۔ پہلے سوال کے بارے میں جواب یہ دیا جاتا ہے کہ سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے۔ وہ ایک منفرد انداز میں دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ اور منکرین کو چیلنج بھی دیتا ہے کہ اگر وہ اسے معجز کلام الٰہی نہیں مانتے تو ایسا کلام لے آئیں۔ اور یہ کہ ظہور معجزات صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور یہ کہ انہیں سزا تو ملے گی مگر کب یہ اللہ کے نظام قضا و قدر سے متعلق ہے۔ نبی کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جب چاہے معجزہ صادر کر دے۔ وہ تو اللہ کے بندوں میں سے ایک عاجز بندہ ہے۔ یہ سوال کا جواب ہونے کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ کی تعریف اور تعارف بھی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صدور معجزات کا محل و منبع ذات الوہیت ہے' یہ اختیارات عبودیت کے دائرے میں نہیں ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴) (۱۰ : ۱۳ - ۱۴) ”لوگو، تم سے پہلے

کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا' جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (٤٧) وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (٤٨) قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (٤٩) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ (٥٠) اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ

(٥١) (١٠ : ٤٧ تا ٥١) " ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ ظلم نہیں کیا جاتا۔ کہتے ہیں اگر یہ تمہاری دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہو گی؟ کہو' میرے اختیار میں خود اپنا نفع ضرر بھی نہیں ہے' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات یا دن کو آ جائے؟ آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں"۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (١٠ : ٢٠) "اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی تو ان سے کہو' غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے' اچھا انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

یہ سورہ حقیقت الوہیت اور حقیقت عبودیت کے بارے میں ان کے مضطرب تصورات پر بھرپور انداز میں بحث کرتی ہے۔ اس کے بارے میں حضور ان کے ساتھ ہم کلام ہیں اور انہیں دعوت حق دیتے ہیں لیکن وہ وحی کا انکار کرتے ہیں یا اس کے بارے میں شک کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ حضور موجودہ قرآن کو بدل دیں' یا یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کے سامنے کوئی مادی معجزہ پیش کریں جو ان کے دلوں میں صحت رسالت کی دلیل بن جائے حالانکہ وہ خود رات اور دن ایسے خداؤں کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے اور نہ نفع۔ پھر وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں سفارشی ہوں گے۔ پھر ان لوگوں کے بغیر کسی علم اور ثبوت کے یہ عقیدہ گھڑ لیا ہے کہ اللہ کی [illegible] بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ حق کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے

آثار قدرت کیا ہیں اور یہ کہ ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں آثار قدرت الہیہ موجود ہیں بلکہ خود ان کے اپنے وجود کے اندر قدرت الہیہ کے آثار موجود ہیں۔ اس کائنات کے اندر نمایاں تبدیلیاں اور گردش لیل و نہار اور پھر وہ بدلتے ہوئے خطرناک حالات جن سے وہ کبھی کبھار جب دوچار ہوتے ہیں تو ان میں خود ان کی فطرت پکار اٹھتی ہے کہ ایسے حالات میں صرف اللہ وحدہ ہی بچا سکتا ہے۔ اس سورہ کے مختلف ٹکڑوں میں اس موضوع یعنی موضوع توحید کو لیا گیا ہے۔ یہ اس کا اصل موضوع ہے اور دوسری باتیں اسی کی فرع اور شاخیں ہیں۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳) اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (۴) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۵) اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۶) (۱۰: ۳ تا ۶) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر تخت حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے۔ کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔ اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدائش کی ابتدا وہی کرتا ہے' پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے۔ اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے' وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھاک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بچنا چاہتے ہیں"۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ

اللّٰہِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۱۰ : ۱۸) "یہ لوگ اللہ کے سوا ان لوگوں کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے اور نہ نفع اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔اے محمدؐ ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو' جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟" پاک ہے وہ اور بالاو برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ (۲۲) فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۳) (۱۰ : ۲۲ - ۲۳) "وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے۔اس وقت سب اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے" مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔لوگو! تمہاری بغاوت الٹی تمہارے خلاف پڑ رہی ہے۔دنیا کے چند روزہ مزے لوٹ لو' پھر ہماری طرف پلٹ کر آنا ہے' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۳۱) فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ (۳۲) (۱۰ : ۳۱ - ۳۲) "ان سے پوچھو' کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔کہو' پھر تم (اس حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز

نہیں کرتے؟ تب تو پھر یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے ـ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو)"۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۵) وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۳٦) (۱۰: ۳۵ ـ ۳٦) "ان سے پوچھو، تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ کہو، وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی ـ پھر تم یہ کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو؟ ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟ کہو، وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے ـ پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ اس سے زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی راہنمائی کی جائے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو ـ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ قیاس وگمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کچھ بھی پورا نہیں کرتا ـ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے"۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (٦٦) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (٦٧) (۱۰: ٦٦ ـ ٦٧) "آگاہ رہو! آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم وگمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں ـ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا ـ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے، جو سنتے ہیں"۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِيُّ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٦٨) قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (٦٩) مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ

نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (۷۰) (۱۰:۶۸ تا ۷۰)) "لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' سب اس کی ملک ہے' تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں؟ اے محمد' کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کر لیں۔ پھر ہماری طرف ان کو پلٹنا ہے۔ پھر ہم اس کفر کے بدلے جس کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۵) هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۵۶) (۱۰:۵۵ - ۵۶))

"سنو' آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ سن رکھو' اللہ کا وعدہ سچا ہے' مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے' وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے"۔

یہ انسانوں کے سامنے اللہ کا یہ تصور پیش کرتی ہے کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور انسان کا ہر اہم معاملہ اس کی نظروں میں ہے۔ ان کی نیات سے بھی وہ باخبر ہے اور ان کے اعمال بھی اس کے سامنے ہیں۔ اس تصور سے انسان کی ذات میں اللہ کا حق اور اس کا ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ اللہ کے بارے میں انسان محتاط اور بیدار ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَمَا تَكُوْنُ فِىْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۱۰:۶۱) "اے نبی تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور لوگو' تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے' نہ چھوٹی نہ بڑی' جو تیرے رب کی نظر میں پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو"۔

اس سورہ میں انسان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے اور اسے یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہروقت خوف خدا دل میں رکھو اور ہر لحظہ عذاب الٰہی کی توقع کرو' خوشحالی اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے آنے والی غفلت سے تم صرف اسی صورت میں نجات پا سکتے ہو۔ دنیا کی سرسبزی اور شادابی اور زندگی کی ریل پیل تمہیں عذاب الٰہی سے غافل نہ کر دے جو اکثر اوقات اچانک آ لیتا ہے:

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰىٓ اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ

اِنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْھَآ اَتٰھَآ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَھَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِیْدًا کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ

کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۱۰ : ۲۴)) "دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار 'جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں' خوب گھنی ہوگئی' پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں' یکایک رات کو یا دن کو' ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے غارت کر کے رکھ دیا۔ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں"۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُہٗ بَیَاتًا اَوْ نَھَارًا مَّاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْہُ الْمُجْرِمُوْنَ

(۵۰) اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِہٖ اٰلْئٰنَ وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۵۱)(۱۰ : ۵۰ -

۵۱)) "ان سے کہو' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آجائے (تو تم کیا کر سکتے ہو) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا جب وہ تم پر آپڑے اس وقت تم اسے مانو گے؟--- اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے"۔

یہ سورہ انہیں متنبہ کرتی ہے کہ تم اس دنیاوی زندگی اور آخرت پر اسے ترجیح دینے پر خوش و خرم اور مطمئن ہو' اور تم اس عقیدے کو جھلاتے ہو کہ ایک دن اللہ کے حضور سب انسانوں کو حاضر ہونا ہے۔ یاد رکھو کہ تمہارا یہ اطمینان جھوٹا اور دھوکہ دینے والا ہے اور تمہارا یہ سودا خسارے کا ہے۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے اور آخرت جزا و سزا کی جگہ ہے۔ اس موقع پر مشاہد قیامت میں سے بعض مشاہد لوگوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں' خصوصاً یہ منظر کہ یہاں دنیا میں لوگ جن معبودوں کی عبادت کرتے تھے وہاں وہ معبود ان کی عبادت کا صاف صاف انکار کر دیں گے۔ وہ اللہ کے سامنے اپنی براءت کا اظہار کر دیں گے۔ اور یہ منظر کہ وہاں لوگ اگر بڑے بڑے کفارے اور عوض اور فدیے پیش کریں' کچھ بھی قبول نہ ہو گا' عذاب ٹل نہ سکے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ (۷) اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۸) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (۹) دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَتَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰)(۱۰ : ۷ - ۱۰)) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی

توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں' ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا' ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ کرتے رہے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے' انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ پر چلائے گا' نعمت بھری جنتوں میں' ان کے نیچے نہریں بہیں گی' وہاں ان کی صدا یہ ہو گی "پاک ہے تو اے خدا"۔ ان کی دعا یہ ہو گی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہربات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے"۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۴) (۱۰: ۱۳ — ۱۴) "لوگو' تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے' تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو؟

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۵) لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۶) وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷) (۱۰: ۲۵ تا ۲۷) "اور اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے' جس کو وہ چاہتا ہے' سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا' ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل۔ ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی۔ وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی بدلہ پائیں گے' ذلت ان پر مسلط ہو گی' کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہو گا' ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہو گی' جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں۔ وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (۲۸) فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (۲۸) فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (۲۹) هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْآ اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۳۰)(۱۰:۲۸ تا ۳۰)) "جس روز ان سب کو ہم ایک ساتھ اکٹھا کریں گے، پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے، کہیں گے ٹھہر جاؤ تم بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی۔ پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا، سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیرے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْآ اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۰:۴۵)) "اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا، گویا (دنیا میں) یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے، فی الواقعہ سخت گھاٹے میں رہے، وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راہ راست پر نہ تھے"۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِى الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَقُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۱۰:۵۴) "اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا روئے زمین کی دولت بھی ہو، تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی میں پچھتائیں گے مگر ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا، کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا"۔

اس کے بعد ان کے ناقص تصور الوہیت پر بحث کی جاتی ہے، خصوصاً انکار قیامت کی وجہ سے اور وحی و رسالت کے انکار کی وجہ سے وہ جس فکری ژولیدگی کا شکار ہو گئے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں اپنے لیے خود قوانین بناتے ہیں اور حلال و حرام کا تعین کرتے ہیں اس طرح وہ خود اللہ بن بیٹھتے ہیں۔ انکار خدا واحد اور اس کے بعد مختلف قسم کی بت پرستیوں کی جانب سے، مذہبی لیڈروں اور کاہنوں اور جادوگروں نے جو چاہا، ان کے لیے حرام کر دیا اور جو چاہا حلال کر دیا، کیونکہ کوئی بھی غلط اعتقاد اپنانے کے بعد انسانی زندگی کا یہ ایک اہم مسئلہ ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۵۹) وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ (۶۰)(۱۰: ۵۹ - ۶۰))

"اے نبیؐ ان سے کہو ' تم لوگوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا ' اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرالیا ہے"۔ان سے پوچھو 'اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟ جو لوگ اللہ پر یہ جھوٹا افترا باندھتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہو گا؟ اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے مگر اکثر انسان ایسے ہیں ' جو شکر نہیں کرتے"۔

یہ سورہ جن حقائق کو قاری کے ذہن میں منتقل کرتی ہے انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرانا چاہتی ہے اور انسانی دل و دماغ میں یہ سورہ جن حقائق کے لیے جوش و جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے ' وہ اس غرض کے لیے نہایت ہی موثر تدابیر اختیار کرتی ہے ' یہ موثرات قرآن کے مخصوص اور منفرد طرز ادا سے بھی متعلق ہیں ' اور نفس موضوع اور مضمون سے بھی - یہ نہایت ہی گہرے ' زندہ اور متحرک موثرات ہیں اور اس سورہ کے موضوع اور مضمون کے مزاج کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں - اس سورہ کے مزاج کے بارے میں ہم اس تبصرے کے پہلے ہی پیراگراف میں بات کر آئے ہیں - یہاں ان موثرات کے بارے میں ہم اجمالی اشارات کرتے ہیں - تفصیلات کا انتظار کیجئے تشریح آیات کے موقعہ پر -

اس سورہ میں جگہ جگہ اس کائنات کے ان مناظر اور مظاہر کا بار بار ذکر کیا گیا ' جو حقیقت الوہیت پر دلالت کرتے ہیں - جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدبر و حکیم اس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے اور یہ کہ یہ کائنات ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق بنائی گئی ہے اور اسی کے مطابق چلائی جا رہی ہے - پھر اس کائنات میں تمام زندہ مخلوقات اور خصوصاً اس کی اہم مخلوق انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے بے شمار سہولیات اور موافقات رکھی گئی ہیں - مسئلہ وجود باری کو قرآن مجید ' حقیقت پسندانہ اور نہایت ہی موثر انداز میں پیش کرتا ہے ' فلسفیانہ پیچیدگیوں اور منطقی جدلیات کی صورت میں نہیں - اللہ تعالیٰ انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی خالق ہے اور اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ فطرت کائنات اور فطرت انسان کے درمیان ایک خاص تعلق اور ربط ہے - اس کائنات کے مظاہر کے اندر وہ دلائل ہیں جو خشک ذہنی منطق کے اندر نہیں پائے جاتے - لہٰذا مناسب یہی ہے کہ انسانی فطرت سب سے پہلے مظاہر کائناتی پر غور کرے ' اس طرح فطرت انسانی اس بات کے لیے تیار ہوگی کہ وہ حقیقت کو پا سکے - جب فطرت انسانی اخذ حقیقت کے لیے تیار ہو جائے تو پھر وہ پھڑ پھڑاتی ' کھل جاتی ہے اور وہ حقائق کو قبول کرتی ہے اور ہر کسی دعوت کا جواب دیتی ہے - چنانچہ قرآن مجید بکثرت فطرت انسانی کو اس زبان میں خطاب کرتا ہے جسے وہ جانتی ہے ' اس گہری فطری ہمکلامی اور خطاب کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِہٖ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ

(۱۰: ۳)) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ' پھر تخت حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے - کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے - الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد

شفاعت کرے ۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے ۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو ۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے"۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۵) اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (۶) (۱۰: ۵ ـ ۶) "وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو ۔ اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے ۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں ۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے 'نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غلط بینی اور غلط روی سے بچنا چاہتے ہیں"۔

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۳۱) فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ (۳۲) (۱۰: ۳۱ ـ ۳۲) "ان سے پوچھو 'کون تم کو آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ ۔ کہو 'پھر تم (اس حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ پس تو پھر یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے ۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا باقی رہ گیا ہے؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو)۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ (۱۰: ۶۷) وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا ۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے 'جو کھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت کو سنتے ہیں"۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا

یُؤْمِنُوْنَ (۱۰:۱۰۱) "ان سے کہو' زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو' اور جو لوگ ایمان لانا نہیں چاہتے' ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں"۔

وہ تاریخی واقعات اور تاریخی تجربے جو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور جن میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے بکثرت اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن ان واقعات اور حادثات کو وہ غافل آنکھوں سے دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ اور یہ نہ سوچتے تھے کہ ان کی پشت پر کیا تدبیر و تقدیر کام کر رہی ہے۔ قرآن کریم ان کے سامنے خود ان کی عملی زندگی کے واقعات و مناظر پیش کر کے ان کو ان سبق آموز واقعات کی تہہ تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے سامنے خود ان کے نفس کا آئینہ بھی رکھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ وہ کیا ہیں؟ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں' قرآن کریم کے مخصوص اسلوب کلام میں:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(۱۰:۱۲) "انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے' مگر جب بھی ہم اس کی مصیبت کو ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں"۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۲۱) هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (۲۲) فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۳) (۱۰:۲۱ تا ۲۳)

"اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملے میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے کہو "اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے' اس کے

فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں"۔ وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے ۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو' اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے ۔ اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے"۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں ۔ لوگو' تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے ۔ دنیا کے چند روزہ مزے ہیں پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

امم سابقہ میں سے ان لوگوں کی تباہی کے نقشے بھی اس سورہ میں کھینچے گئے ہیں جنہوں نے حق کو جھٹلایا' یہ نقشے بعض اوقات اخبار کی شکل میں ہیں اور بعض اوقات انبیاء کی صورت میں ۔ دونوں میں مشترک بات یہ ہے کہ ان میں جھٹلانے والوں کی تباہی اور بربادی کا ذکر ہے ۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ تم اپنی چند روزہ زندگی پر مست نہ ہو جاؤ' تمہارا انجام بھی یہی ہو سکتا ہے جو ان کا ہوا ۔ اس دنیا کی زندگی دراصل آزمائش ہے ۔ اس کی مثال تو اس طرح ہے کہ ان کے ایک حصے میں کچھ لوگ باہم ملیں اور متعارف ہو جائیں اور پھر سب اپنی اپنی اقامت گاہوں کی طرف لوٹ جائیں' جنت میں یا جہنم میں ۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱٤) (۱۰: ۱۳ - ۱٤) "تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا' جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا ۔ اسی طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں ۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِىْ وَتَذْكِيْرِىْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَىَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۷۱) فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۷۲) فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَانْظُرْ

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۷۳) (۱۰: ۷۱ تا ۷۳) ''ان کو نوح کا قصہ سناؤ' اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ''اے برادران قوم اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے' تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو اس کو خوب سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے' پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا۔ میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہ تھا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود مسلم بن کر رہوں''۔ انہوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے' بچالیا اور انہی کو زمین میں جانشیں بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا' بس دیکھ لو جنہیں متنبہ کیا گیا تھا ان کا کیا انجام ہوا؟''

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۷۵) فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۷۶) قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ اَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ

(۷۷) ''پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا' مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا: ''تم حق کو یہ کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے سامنے آگیا؟ کیا یہ جادو ہے حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے''۔

اور پورا مضمون قصہ کے آخر تک اس کی مثال ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۹۰) اٰۗلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۹۱) فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ

(۹۲) (۱۰: ۹۰ تا ۹۲) ''اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: ''میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے

ہوں ---- "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۱۰۲) ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰۳) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(۱۰۴) (۱۰:۱۰۲ تا ۱۰۴) "اب یہ لوگ اس کے سوا اور کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی برے دن دیکھیں جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ ان سے کہو "اچھا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں"۔ ہمارا یہی طریقہ ہے۔ ہم پر حق ہے کہ مومنوں کو بچائیں"۔

پھر اس سورہ میں قیامت کے مناظر و مشاہد کو بڑی کثرت سے لیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مومنین کا انجام کیا ہوا اور مکذبین کا انجام کیا ہوا ہے۔ اور یہ منظر نہایت ہی زندہ اور متحرک انداز میں اس طرح کہ مناظر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور نہایت ہی پر تاثیر ہیں۔ اس طرح دنیا میں مکذبین کی بربادی اور مومنین کی نجات کے مناظر کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی دونوں طبقوں کے انجام کے بارے میں تفصیلات دی گئی ہیں۔ دونوں گروہوں کی سرگرمیوں کا آغاز اور انجام دونوں بتائے گئے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۶) وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷) (۱۰: ۲۶ - ۲۷) "جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل۔ ان چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے 'ایسا ہی وہ بدلہ پائیں گے' ذلت ان پر مسلط ہو گی' کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہو گا' ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہو گی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے

ہوئے ہوں، وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ (۲۸) فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ (۲۹) هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۳۰)(۱۰: ۲۸ تا ۳۰)) "جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ اکٹھا کریں گے، پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے، کہیں گے کہ ٹھہر جاؤ تم بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی۔ پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا، سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیے جائیں گی اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۵۴) "اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے روئے زمین کی دولت بھی ہو، تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے مگر ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا، کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا"۔

اس سورہ میں ان مشرکین کو بار بار چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر وہ قرآن کریم کو کلام الٰہی نہیں مانتے تو وہ قرآن کریم کی طرح ایک آیت لے کر آ جائیں۔ پھر رسول اللہ ؐ کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ ان کو دعوت دے کر اور چیلنج دے کر چھوڑ دیں کہ وہ اپنے منطقی انجام تک جا پہنچیں اور انسانی تاریخ میں تمام جھٹلانے والوں اور ظالموں اور مشرکوں کا انجام یہی رہا ہے۔ آپ ان کی کوئی پروا نہ کریں اور اپنی راہ پر گامزن رہیں اور ان کو کوئی اہمیت بھی نہ دیں۔ اس طرح تحدی دینا اور پھر ان کو چھوڑ کر اپنی راہ پر چلنا اور دشمن کی پروا بھی نہ کرنا ایک ایسا طرز عمل ہے جس سے مخالفین کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ حضور ؐ کو اپنے اچھے انجام کا پوری طرح وثوق ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ اس سے مخالف خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے دل میں سے عناد کم ہو جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَىٰ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَ

تَفْصِيلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷) اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۸) بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۳۹) (۱۰:۳۷ تا ۳۹) "اور قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو' مدد کے لیے بلا لو"۔

اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا اس کو انہوں نے جھلا دیا۔ اسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھلا چکے ہیں۔ پھر دیکھ لو' ان ظالموں کا کیا انجام ہوا؟

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰۴) وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۰۵) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰۶) وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۰۷) قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (۱۰۸) وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ (۱۰۹) (۱۰:۱۰۴ تا ۱۰۹) "اے نبیؐ کہہ دو کہ لوگو' اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو' میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے اور ہرگز ہرگز مشرکوں سے نہ ہو' اور

اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکارو جو تجھے فائدہ نہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان ۔ اگر تو ایسا کرے گا ' تو ظالموں میں سے ہو گا ۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا کوئی بھی نہیں ہے ۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے" ۔ اے محمد کہہ دو کہ "لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے ۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اس کے لیے تباہ کن ہے ۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالدار نہیں ہوں" ۔ اور اے نبیؐ تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی فیصلہ کرنے والا ہے" ۔

اب دو ٹوک بات پر یہ سورہ اختتام کو پہنچتی ہے اور وہ موثرات اور دلائل بھی یہاں ختم ہوتے ہیں جن کے اقتباس اور نمونے یہاں ہم دینا چاہتے تھے ۔ قرآن کریم انسانی دل و دماغ کو جن زاویوں سے مخاطب کرتا ہے اس کے عجائب کا احاطہ تو ممکن نہیں ہے ' بہرحال ہم یہاں انہی پر اکتفا کرتے ہیں ۔

○○○

یہ سورہ ' سورہ اسراء کے بعد نازل ہوئی ہے ۔ اس دور میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان وحی کی صداقت اور قرآن کے کتاب حق ہونے کے موضوع پر سخت مکالمہ شروع تھا اور قرآن زوردار انداز میں مشرکین کے عقاید کی تضحیک کر رہا تھا اور ان کی جاہلیت پر سخت ترین تنقید اور گرفت کر رہا تھا ۔ اور یہ واضح کر رہا تھا کہ ان کے نظام فکر و عمل میں سخت تضاد ہے اور ان کی ہر بات دوسری بات کی تردید کرتی ہے ۔ ایک طرف تو وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ خالق ' رازق ' زندہ کرنے والا ' مارنے والا ہے ۔ اس کائنات کا مدبر ' تمام اشیاء میں متصرف اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۔ یاد رہے کہ یہ وہ درست عقائد تھے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی تعلیمات کی وجہ سے ان میں ابھی تک باقی تھے لیکن دوسری جانب سے وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ اللہ کی اولاد بھی ہے ۔ اور وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے ۔ اور ان کو اللہ کے ہاں سفارشی تصور کرتے تھے ۔ اور اس اعتبار سے فرشتوں کے بت بنا کر پوجتے تھے ۔ چنانچہ ان متضاد خیالات کی وجہ سے ان کی زندگی کے اندر تضاد رونما ہو گیا تھا ۔ چنانچہ ان کے کاہن اور پیشوا ان کے لیے حلال و حرام کا تعین کرتے تھے اور ان کے لیے انہوں نے بعض مویشیوں کو حرام قرار دیا تھا اور بعض قسم کے پھلوں کو بھی حرام قرار دے دیا تھا ۔ چنانچہ پھر ان مویشیوں میں سے بعض کو اللہ کے لیے خالص کر دیا تھا اور بعض کو اپنے بتوں کے لیے" ۔

چنانچہ ایسے حالات میں مشرکین کو قرآن کریم کے زبردست تنقیدی حملے کا سامنا کرنا پڑا ۔ جس میں قرآن نے ان کے ازکار رفتہ عقائد اور متضاد اور متناقض نظام جاہلیت پر تنقید کی کہ تم لوگ حضورؐ اور آپؐ پر نزول وحی میں شک کرتے ہو ' یہ کہ تم حضورؐ کو ساحر کہتے ہو ۔ یا تم حضورؐ سے خارق عادت معجزے کے طلبگار ہو جو نبوت پر ثبوت ہو ' وغیرہ وغیرہ ۔ اس سے قبل قرآن کریم نے سورہ اسراء میں ان اعتراضات کو بڑی تفصیل سے نقل کیا تھا :

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰىٓ اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا
(۸۹) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا (۹۱) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (۹۲) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۳) وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۴) (۱۷: ۷۹ تا ۹۴) ”ہم نے قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر مُصر رہے اور انہوں نے کہا ”ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو ان میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو ”پاک ہے پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں“۔ لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ ”کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا“۔

اور اس سورہ میں بھی اس مضمون کو یوں ادا کیا گیا :

وَ يَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۱۰: ۲۰) ”اور جو یہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی تو ان سے کہو کہ غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے۔ اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں“۔

اسی طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے یہ مطالبہ بھی کرتے تھے کہ آپ اس قرآن کے بدلے کوئی اور قرآن لے کر آئیں جو ان کے الٰہوں اور خداؤں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ ان کے عقائد کی تضحیک نہ کرے اور ان کے نظام جاہلیت کو بدلنے کا حکم نہ دے۔ ایسی صورت میں وہ بھی اسے قبول کر لیں گے اور ایمان لے آئیں گے۔ اس سورت میں ان کے اس مطالبے پر بھی بحث کی گئی ہے اور ان کے اس مطالبے کو سختی سے مسترد کر دیا گیا ہے :

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰: ۱۵) ”جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ”اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو“۔

اور ان کی اس احمقانہ رائے کا رد یہی ہو سکتا تھا جو کر دیا گیا۔

قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓى اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۵) قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۶) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۷) (۱۰: ۱۵ تا ۱۷)

"اے محمدؐ ان سے کہو "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر اور تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔ اور کہو "اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہ پائیں گے۔

غرض اس ماحول میں یہ سورہ نازل ہوئی، اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی خطبہ ہے اور ایک مخصوص ماحول میں دیا گیا ہے جو واقعات کے تسلسل سے عبارت ہے۔ یہ خطبہ اس قدر مربوط اور متحد ہے کہ دوسری سورتوں کی طرح اسے مختلف اسباق اور قطعات میں تقسیم کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔ اس پوری سورہ کا ایک ہی مربوط خطبہ ہونا اس بات کی نفی کر دیتا ہے جو بعض مصاحف میں کہی گئی ہے کہ اس کی آیات ۴۰، ۹۴، ۹۵ اور ۹۶ مدنی ہیں کیونکہ یہ آیات سیاق کلام میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کے سوا اصل مضمون مربوط اور متصل نہیں رہتا۔

اس سورہ کے مربوط مضامین و سیاق سورت کے آغاز اور انجام کو بھی باہم مربوط کرتا ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ (۱) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ (۲) (۱۰: ۱ ـ ۲) "ال ر، یہ اسی کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے۔ کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت و سرفرازی ہے؟ لیکن منکرین حق نے کہا کہ یہ تو کھلا جادوگر ہے"۔

اور خاتمہ اس آیت پر ہوا:

وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓى اِلَیْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ

"اور اے نبیؐ تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔

یعنی سورہ کے آغاز و اختتام دونوں پر بات وحی کے بارے میں اور دعوت و تبلیغ کے بارے میں ہے' لہٰذا آغاز و اختتام دونوں باہم مربوط اور موضوع سورہ سے پیوست ہیں۔

سورہ کے اندر بیان کردہ مختلف دلائل میں بھی باہم گہرا ربط ہے۔ مثلاً وہ لوگ اس مطالبہ میں جلد بازی کرتے تھے کہ پیغمبران کو جس عذاب سے ڈراتے ہیں وہ ان پر نازل کیوں نہیں کر دیتے' تو ان کو اس بات پر متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ جب عذاب الٰہی آتا ہے تو وہ اچانک آجاتا ہے اور اس وقت ان کے لیے ایمان لانا یا توبہ کرنا مفید نہ ہو گا اور اس رد کے بعد پھر سورہ میں متواتر قصے آتے ہیں اور اس میں قیامت کا منظر اور ان لوگوں کی حالت کی تصویر پیش کی جاتی ہے جن پر اس دنیا میں اللہ کا عذاب آیا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (٤٨) قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (٤٩) قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ (٥٠) أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنتُم بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ (٥١) ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ (٥٢) (١٠:٤٨ تا ٥٢)

"کہتے ہیں اگر یہ تمہاری دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہو گی؟ کہو' میرے اختیار میں خود اپنا نفع یا ضرر بھی نہیں ہے' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات یا دن کو آجائے تو تم کیا کر سکتے ہو؟ آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں۔ کیا جب وہ تم پر آپڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟--- اب بچنا چاہتے ہو' حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ پھر ظالموں سے کہا جائے گا اب ہمیشہ کے لیے عذاب کا مزہ چکھو جو کچھ تم کماتے رہے ہو' اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟

اور اس سورہ میں قصہ موسیٰ علیہ السلام کے آخر میں یہ منظر آتا ہے اور نظر آتا ہے کہ یہ منظر ایسا ہی ہے:

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ

(۹۰) آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۹۱) فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۹۲) (۱۰ : ۹۰ تا ۹۲) ''اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: ''میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔۔۔ ''اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں''۔

اس کے بعد اس سورہ میں مختلف قصوں کے بیان کے درمیان بعض مناظر ایسے آتے ہیں جو اچانک مکذبین کو پکڑ لیتے ہیں۔ ایسے حالات میں کہ وہ کسی عذاب کی کوئی توقع نہیں رکھتے۔ نہ ان کو کسی قسم کے عذاب کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ یہ تمام مناظر اس طرح ادا کیے جاتے ہیں کہ پوری سورہ کا موضوع و مضمون ایک ہی نظر آتا ہے اور پوری سورہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی خطبہ نظر آتی ہے۔

سورہ کے آغاز میں مشرکین مکہ کی جانب سے حضورؐ کی بابت یہ قول نقل کیا گیا تھا۔

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰ : ۲) (کافروں نے کہا بے شک یہ ایک کھلا جادوگر ہے) اور فرعون کے قصے کے آخر میں فرعونی اور فرعون کہتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰ : ۷۶) (پس جب وہ ان کے پاس ہماری طرف سے سچائی لے کر آیا تو کافروں نے کہا' بے شک یہ ایک کھلا جادوگر ہے)

اس سورہ کا نام سورہ یونس رکھا گیا ہے' لیکن اس میں حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کی طرف ایک مختصر سا اشارہ ہے' مثلاً کہا گیا ہے:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰ : ۹۸) ''پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا''۔

لیکن قصہ یونس دراصل وہ واحد مثال ہے جو ان لوگوں کی راہنمائی کرتی ہے جو اپنے آپ کو اچانک عذاب الٰہی آ

جانے سے پہلے سنبھالنا چاہتے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں جبکہ لوٹنے کی مہلت ہو۔ کیونکہ حضرت یونس ؑ کی قوم کی مثال نبیوں اور قوموں کی تاریخ میں واحد مثال ہے جس میں کسی پیغمبر کی جانب سے وقوع عذاب کے اعلان کے بعد بھی کوئی قوم بچ نکلی ہو کیونکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ تکذیب کرنے والوں کو جب بتا دیا جائے کہ تم پر فلاں وقت میں عذاب نازل ہو گا تو وہ عذاب نازل ہو کر رہتا ہے۔

غرض اس سورہ کے مضامین کے درمیان لفظی ' معنوی اور اندازبیان کا ربط موجود ہے ' اول سے اختتام تک اس کا ایک مضمون اور ایک ہی رنگ ہے۔ لہٰذا یہ سورہ ایک ہی خطبہ ہے۔

---ooo---

اس سے قبل ' اس سورہ کے جو اقتباسات ہم نے دیئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا بنیادی مضمون اللہ کی بندگی اور اس کی حاکیت کا قیام ہے۔ اللہ کی الوہیت اور اس کی حاکیت کے تقاضوں کو اس میں بیان کیا گیا ہے یہ کہ اللہ کی بندگی اور حاکیت کو تسلیم کرنے کے بعد انسان کی عملی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں لانی ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو بھی مضامین وارد ہیں مثلاً وحی الٰہی کے بارے میں توضیحات ' آخرت کے مناظر اور واقعات ' سابق رسالتوں اور ان کی اقوام کے واقعات وغیرہ تو یہ سب مضامین دراصل اسی مسئلہ کی توضیح کی خاطر لائے گئے ہیں تاکہ یہ عظیم حقیقت لوگوں کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے۔ لوگوں کے تصورات ' ان کی عملی زندگی اس حقیقت کبریٰ کے مطابق ڈھل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عظیم مسئلہ ہی پورے قرآن کا مسئلہ ہے ' خصوصاً مکی قرآن میں تو اسی مسئلے کی مختلف اسالیب سے وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً اللہ کی الوہیت کی تعریف اور اس کے اہم خصائص ' یعنی ربوبیت ' قیومیت ' حاکیت اور عبودیت اور اس کے حدود و قیود اور اس کے بعد لوگوں کو اللہ کا حقیقی بندہ بنانے کے لیے عملی جدوجہد اور یہ کہ لوگوں کی جانب سے صرف اللہ کی ربوبیت ' قیومیت اور حاکیت کا اقرار ' یہ اس سورہ کا حقیقی موضوع ہے۔ اس کے علاوہ جو امور لائے گئے ہیں وہ اس مقصد اعلیٰ کے عملی تقاضے ہیں جن کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔

یہ عظیم حقیقت اس قابل ہے کہ اگر ہم اس پر گہرا غور و خوض کریں ' تو یہ پورے قرآن کریم کی دعوت کا اصلی موضوع قرار پاتی ہے۔ اس غرض کے لیے تمام رسولوں کو بھیجا گیا اور اسی ہدف کی طرف تمام کتابیں اور رسالتیں آگے بڑھتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ' اس کی طرف یہ وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی حاکم نہیں ہے ' اس لیے تم لوگ میری ہی بندگی اور اطاعت کرو"۔

یہ بات پلے باندھ لو کہ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی اصلاح ہرگز نہیں ہو سکتی الا یہ کہ لوگوں کے ذہن میں یہ حقیقت یعنی حاکیت الٰہیہ کا یہ نظریہ بیٹھ نہ جائے ' ان کے نظریات میں ' ان کے تصورات میں اور ان کی زندگی میں بھی اور حتیٰ کہ ان کی پوری سوسائٹی عملاً اس پر استوار نہ ہو جائے۔

لوگوں کی زندگی اگر ان زندہ اور ان مردہ اشیاء کو الٰہ سمجھتے ہیں جو اوہام کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور جب تک وہ اپنا تصور الٰہ عبادت کی حقیقت اور اللہ کی حاکیت کی حقیقت کو اپنے ذہنوں میں اچھی طرح بیٹھا نہیں لیتے ' نیز وہ جس

کائنات میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کائنات کی مردہ اور زندہ اشیاء کے حوالے سے ان کے تعلقات حقیقت پسندانہ نہیں ہو سکتے ـ لوگ ان اشیاء بلکہ توہمات کی پوجا کرتے ہیں اور ان کا یہ فعل مضحکہ انگیز ہوتا ہے اس لیے کہ جن اشیاء کی وہ پوجا کرتے ' ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی ـ پھر ان باطل خداؤں کی چوکھٹ پر وہ اپنی محنت و مشقت کے نتیجے میں کمائی ہوئی دولت پیش کرتے ' محض اس لیے کہ اس میں مفاد پرست کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کا فائدہ ہوتا ہے ـ بعض اوقات ان باطل معبودوں کے نذرانے کے طور پر اپنی جان اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو پیش کرتے ہیں ـ حالانکہ جن لوگوں کے سامنے یہ مراسم عبودیت پیش کیے جاتے ہیں وہ ہم جیسے اشخاص ہیں یا بے جان چیزیں ہوتی ہیں اور ان کے اندر قوت اور تصرف کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور وہ نہ کوئی ضرر دے سکتے ہیں اور نہ نفع دے سکتے ہیں ـ پھر لوگوں کی زندگی ان بے جان چیزوں اور ان اوہام سے خوف و خطر میں گزرتی ہے اور لوگ اپنی جیسی مخلوق یا بے جان اشیاء کا تقرب حاصل کرنے کے لیے حیلے بہانے تلاش کرتے ہیں اور ان کی ایسی بندگی کرتے ہیں جس طرح اللہ کی بندگی کی جاتی ہے ـ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۱۳۶) وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (۱۳۷) وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۳۸) وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۳۹) قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۴۰) وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ

الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۱۴۱)(٦: ۱۳٦ تا ۱۴۱))" ان لوگوں نے اللہ کے لیے خود اس کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے لیے ہے' بزعم خود' اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے' پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے' وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے' کیسے برے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ ۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں ۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہیں کرتے' لہٰذا انہیں چھوڑ دو' کہ اپنی افتراء پردازیوں میں لگے رہیں' کہتے ہیں کہ یہ جانور اور کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے' پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کر دی گئی ہے ۔ جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انہوں نے اللہ پر افترا کیا ہے ۔ عنقریب اللہ انہیں ان کی افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا ۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے' یہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے' اور ہماری عورتوں پر حرام ہے' لیکن اگر وہ مردہ ہے تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں ۔ یہ باتیں جو انہوں نے گھڑی ہیں ان کا بدلہ اللہ انہیں دے کر رہے گا یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے ۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا' اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو' اللہ پر افترا پردازی کر کے حرام ٹھہرا لیا ۔ بالیقین وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہ راست پانے والوں میں سے نہ تھے" ۔

یہ ہیں چند نمونے اللہ کے سوا اور الہوں کی بندگی کے' اپنے مال اور اولاد میں ۔ یہ بندگیاں اللہ کے سوا اور الہوں کے سامنے بجا لائی جاتی ہیں ۔ یہ الٰہ بعض اوقات زندہ مخلوقات میں سے ہوتے اور بعض اوقات بے جان مخلوق میں سے ۔ اور ان کی جدائی کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں نازل فرمائی ۔

نیز جب تک لوگوں کے قلب و نظر میں اللہ کی الوہیت اور اس کی بندگی کا تصور درست نہ ہو' اور اس بارے میں ان کے تصورات صاف نہ ہوں ان کے باہم تعلقات بھی درست نہیں ہو سکتے' اور نہ ایسی سوسائٹی کے لیے کوئی مستحکم بنیاد فراہم ہو سکتی ہے ۔ انسان کی انسانیت' اس کی آزادی اور اس کا شرف اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک انسان اللہ کی وحدانیت' اس کی مکمل بندگی اور اس کی سیاسی حاکمیت پر پختہ یقین نہ رکھے ۔ اور اللہ کو یہ حق نہ دے دے کہ انسانوں کی زندگی پر دنیا اور آخرت دونوں میں صرف اللہ کنٹرول کرنے والا ہے ۔ اور یہ اسی کا حق ہے کہ وہ کنٹرول کرے ۔ خفیہ طور پر بھی علانیہ امور میں بھی ۔ اور یہ کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے ۔

یہ وہ حقیقت ہے جو انسان کی صدیوں کی تاریخ کے مطالعے سے اچھی طرح ثابت ہوتی ہے ۔ جب بھی لوگوں نے نظریہ اور عمل کے اعتبار سے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا جوا اپنی گردنوں سے اتارا ہے' وہ دوسری قوتوں کے غلام ہو گئے ہیں' اللہ کی حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ یہ اعتقاد' مراسم عبودیت اور نظام حکومت کے اعتبار سے اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے ۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو ہمیشہ یہ ہوا کہ انسان نے اپنی انسانیت' اپنا شرف اور اپنی آزادی گنوا دی ہے ۔

انسانی تاریخ کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ جو اقوام طاغوتی قوتوں کے تحت ذلیل ہو کر رہتی ہیں اور ان پر طاغوتی قوتوں کا غلبہ ہو جاتا ہے 'اس کا بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ یہ اقوام فاسق اور فاجر اور بدعمل ہوتی ہیں - اور ان کا فجور اور بدعملی یہ ہوتی ہے کہ یہ اقوام اللہ کو مالک ' رازق اور حاکم تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں - فرعون اور قوم فرعون کے بارے میں قرآن کا تبصرہ یہ ہے :

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (۵۲) فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (۵۳) فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۵۴) (الزخرف ۵۱ تا ۵۴)

"فرعون نے اپنی قوم کو پکار کر کہا 'لوگو 'کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا - اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی - درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ"-

جو لوگ اللہ کی غلامی 'بندگی اور حاکمیت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار کر فاسق ہو جاتے ہیں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا حاکم بنا لیتے ہیں جو ان پر اللہ کی شریعت کے بجائے اپنی شریعت چلاتے ہیں تو ایسے لوگ آخرکار دوسری اقوام کے غلام بن جاتے ہیں - اس غلامی میں پھر ان کی انسانیت 'ان کی عزت نفس اور ان کی آزادی ختم ہو جاتی ہے 'اگرچہ ان کی یہ غلامی مختلف اوقات میں مختلف النوع رہی ہے - بعض اوقات اس غلامی میں غلاموں کا ضمیر اس قدر بدل جاتا ہے کہ وہ اس غلامی کو اپنے لیے شرف اور آزادی سمجھنے لگتے ہیں -

یورپ نے خدا کو چھوڑا 'یہ خدا دشمنی اس کے اندر کلیسا نے پیدا کر دی تھی کیونکہ کلیسا بھی صحیح معنوں میں خدا پرست نہ تھا 'کلیسا نے جس انداز میں مغربی اقوام پر حکمرانی کی وہ نہایت ہی جابرانہ اور ظالمانہ نظام تھا 'جب کلیسا کے خلاف ردعمل سامنے آیا تو لوگوں نے سرے سے خدا سے بغاوت کر دی - اب لوگ یہ سمجھنے لگے کہ وہ لادین مغربی نظاموں کے تحت آزاد 'باعزت اور مفید زندگی بسر کر رہے ہیں - انہوں نے یہ سمجھا کہ مغربی نظام جمہوریت اس کے تحریری دستور اور اس کے بنیادی حقوق 'ان کے ہاں ہر قسم کی آزادی اور آزادی صحافت 'ان کے پارلیمانی نظام اور ان میں اکثریت کی حکومت یہ سب کچھ ان کی آزادی اور شرافت کے ضامن ہیں - وہ اپنے ان تصورات کے خول میں بند رہے - لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ —— ایک ظالم سرمایہ دارانہ نظام اس جمہوریت کے بطن سے نمودار ہوا - اس سرمایہ دارانہ نظام نے مغربی جمہوریت کے تمام نعروں کو بالکل بے معنی بنا دیا - بلکہ یہ باتیں محض خیالات و تصورات رہ گئیں - ایک نہایت ہی قلیل گروہ نے جو دولتمند تھا 'حق حاکیت حاصل کر لیا اور پوری کی پوری اقوام جمہوری نظام کے تحت غلام بن کر رہ گئیں - یہ اقوام باوجود اپنی پارلیمانی اکثریت کے

باوجود اچھے دساتیر کے' باوجود آزاد صحافت کے' اور باوجود وسیع بنیادی حقوق کے ایک مختصر مگر مالدار لوگوں کی غلامی سے اپنے آپ کو نہ چھڑا سکیں۔اور انسانیت آزادی اور شرافت اور عزت نفس سے محروم کر دی گئیں۔

اب اس نظام کے ردعمل میں ایک دوسرا نظام سامنے آیا' انہوں نے اس ظالم سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی۔ان ظالم طبقات کے خلاف مظلوم طبقات کو اٹھایا۔انہوں نے سرمایہ داروں کے ایک محدود طبقے کی غلامی سے اپنے آپ کو چھڑا کر مفلوک الحال لوگوں کے ایک محدود طبقے کی غلامی میں اپنے آپ کو قید کروالیا۔اب یہ لوگ چند سرمایہ داروں کے مقابلے میں چند غرباء کی غلامی میں آگئے۔اور ان لوگوں کی ڈکٹیٹرشپ اب سرمایہ داروں کی جمہوریت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

غرض ہروہ نظام' ہروہ حکومت اور ہروہ سوسائٹی جس میں انسان' انسان کا غلام ہو تو اس کے باشندے اپنے مال' اپنی آزادی اور اپنی شرافت کو قربان کر کے قسم قسم کے خداؤں کی غلامی میں پھنس جائیں گے۔

انسان تو بہرحال غلام رہے گا' ایک عام انسان بہرحال زیردست رہے گا۔اگر یہ خدا کی غلامی نہ اختیار کرے گا تو کسی اور کا غلام ہو گا۔صرف ایک اللہ کی غلامی کا فائدہ یہ ہو گا کہ انسان تمام انسانی خداؤں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔انسان آزاد' شریف اور سربلند ہو گا۔جبکہ کسی بھی غیراللہ کی غلامی میں انسان سے اس کی اعلیٰ صفات سلب ہو جاتی ہیں اور آخر کار وہ مالی فوائد اور مصالح ومفادات سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ کی وحدانیت کا مسئلہ اور اللہ کی حاکمیت اور لوگوں کی غلامی کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر پوری انسانی تاریخ میں تمام رسولوں نے توجہ دی ہے۔ابتدائی ادوار میں نہایت ہی سادہ بت پرستی کے دور میں بھی اللہ کی عبودیت اور حاکمیت کے مسئلے پر پیغمبر نے زور دیا ہے' یعنی زمانہ ماقبل تاریخ میں' پھر تحریری تاریخ کے دور میں بھی ہر جگہ اور ہر زمانے میں یہ مسئلہ انسان کا اہم مسئلہ رہا ہے۔عقیدۂ توحید میں حاکمیت غیراللہ کی نفی کو شامل کیا گیا ہے اور آج بیسویں صدی کی جاہلیت میں بھی اس مسئلے کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ بیسویں صدی کی جاہلیت انسانوں کو دوسرے انسانوں کا غلام بنانے اور تسلیم کرنے کے اصول پر قائم ہے۔(تفصیلات کے لیے دیکھئے' کتاب اسلام اور جاہلیت' مصنفہ مسلم عظیم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی' امیر جماعت اسلامیہ پاکستان' اور کتاب جاہلیۃ القرن العشرین' محمد قطب)

یہی وجہ ہے کہ تمام رسالتوں اور تمام آسمانی کتابوں کی تعلیمات کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ' حاکم' رب نہیں ہے۔اللہ حاکم ہے اور تمام انسان صرف اللہ کے غلام ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی غلامی اور عبادت کریں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے' اس کی طرف یہ وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی حاکم نہیں ہے' لہذا میری ہی بندگی کرو"۔

اور اس سورہ کا خاتمہ بھی اسی تعلیم پر ہوا:

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰۴) وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۱۰۵) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّٰلِمِينَ (۱۰۶) وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۱۰۷) قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ (۱۰۸) وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰٓ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَٰكِمِينَ (۱۰۹)

(۱۰ : ۱۰۴ تا ۱۰۹) "اے نبی کہہ دو کہ لوگو' اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو' میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے اور ہرگز ہرگز مشرکوں سے نہ ہو' اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکارو جو تجھے فائدہ نہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا' تو ظالموں میں سے ہو گا۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اے محمدؐ کہہ دو "لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اس کے لیے تباہ کن ہے۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں"۔ اور اے نبی تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے اور وہی فیصلہ کرنے والا ہے"۔

اس سورہ کا اس قدر تعارف کافی ہے اب آیئے تشریح آیات کی طرف۔

---OOO---

درس نمبر ۹۵ ایک نظر میں

جس طرح ہم نے اس سورہ کے دیباچے میں کہا ہے یہ پوری سورہ ایک ٹکڑا ہے۔اس کو مختلف اسباق میں تقسیم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔یہ اسی طرح ہے جس طرح پارہ ہفتم میں سورہ انعام اور جس کے بارے میں یہی رائے ہم نے دی تھی کہ ہر سورہ کا اپنا مزاج اور اپنی شخصیت ہوتی ہے اور اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ سورہ بھی اسی طرح آگے بڑھتی ہے جس طرح سمندر میں ایک لہر کے بعد دوسری لہر اٹھتی ہے۔ ہر لہر انسان کے دل و دماغ پر ایک خاص اثر چھوڑتی ہے اور ایک خاص سبق پڑھاتی ہے۔یہ سورہ مشرکین کے دل و دماغ اور ان کی بصیرت پر تعجب کا اظہار کرتی ہے کہ ان پر وحی الہی کا کوئی اثر نہیں ہوتا' ان کے سامنے اس کائنات کے مختلف مناظر پیش کیے جاتے ہیں جن سے اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کا اظہار ہوتا ہے' پھر قیامت کے خوفناک مناظر ان کے سامنے لائے جاتے ہیں' پھر لوگوں پر جو مصیبتیں آتی ہیں اور جو عذاب اس دنیا میں آتے رہتے ہیں وہ پیش کیے جاتے ہیں' پھر امم سابقہ کی ہلاکت اور بربادی کے واقعات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔یہ اور اس قسم کے بے شمار دلائل اور اثر آفریں وجدانی مشاہد جو سورہ پیش کرتی ہے اور دیباچے میں تفصیلات دی گئی ہیں۔

اگر ہم اس سورہ کو تقسیم کریں بھی تو اس کے دو حصے ہو سکتے ہیں۔حصہ اول میں وہ لہریں ہیں جو پے در پے آتی ہیں اور جن کا ہم نے ذکر کیا' حصہ دوئم میں چند قصے ہیں مثلاً قصہ نوح' قصہ موسیٰ علیہما السلام۔قصہ یونس ؑ کی طرف اشارہ' اور اس کے اختتامیہ ہے۔

ہم اس سورہ کو بھی لہروں کی صورت میں لیتے ہیں جو باہم مربوط ہیں۔جس طرح امواج دریا علیحدہ بھی ہوتی ہیں اور ایک بھی۔سورہ کا پہلا سبق تین حروف سے شروع ہوتا ہے :الف' لام' را۔سورۂ بقرہ' سورۂ آل عمران اور سورۂ اعراف بھی ایسے ہی حروف سے شروع ہوئیں۔ان کی تفسیر میں وہاں مختلف آراء سے جو رائے ہم نے اختیار کی تھی اس کا تذکرہ میں نے وہاں کر دیا تھا۔یہ حروف مبتداء ہیں اور۔

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ (۱۰ : ۱) کا جملہ اس کی خبر ہے۔

اس کے بعد پھر اس سبق میں ان متعدد امور کا ذکر کیا گیا ہے جو حکیمانہ امور ہیں اور کتاب کی صفت حکمت کی تشریح کے طور پر ان امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً رسول اللہ کی طرف نزول وحی تاکہ آپ لوگوں کو انجام بد سے ڈرائیں اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دیں' پھر اس بات کا ذکر ہے کہ لوگوں کا یہ اعتراض عقل پر مبنی نہیں ہے کہ اللہ نے وحی ایک انسان پر کیوں اتاری ہے؟ اگر وحی انسان پر نہ اتاری جاتی اور کسی اور مخلوق کو وحی دے کر بھیجی گئی ہوتی تو یہ امر حکمت کے خلاف ہوتا۔پھر یہ بتایا گیا ہے کہ تخلیق کائنات اور زمین و آسمان کے فزیکل نظام میں کس قدر گہری حکمت ہے کہ اس میں سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نورانیت عطا کی گئی اور پھر چاند کے لیے منازل طے کی گئیں تاکہ لوگ ماہ و سال کا حساب رکھ سکیں۔پھر رات اور دن کا اختلاف اور اس کی حکمتیں۔

اس کے بعد آیات کائناتی سے روئے سخن ان لوگوں کی طرف پھر جاتا ہے جو غافل ہیں؟ جو اس عظیم مرحلے سے غفلت میں پڑے ہیں جس میں انسان کو برائے جوابدہی اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہو گا' باوجود اس کے کہ ایک نہایت ہی برا انجام ان کے انتظار میں ہے اور دوسری جانب یہ کہ ایک نہایت ہی اچھا انجام اہل ایمان کے لیے منتظر ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے مہلت کے لیے جو ایک وقت مقرر فرمایا ہے اس میں کس قدر حکمت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے مطالبے کے مطابق ان کو پکڑ لیتا' جس طرح وہ بہت ہی جلد بازی کے ساتھ اللہ سے مطالبہ کرتے تھے تو اللہ ان کو پکڑ لیتا اور ان کا قصہ اس جہاں سے تمام ہو جاتا اور وہ بغیر کسی مہلت کے یہاں دھر لیے جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ حکیم ہے' اس لیے اس نے لوگوں کو پوری پوری مہلت دینا مناسب سمجھا۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ انسان کی فطرت یہاں بھلائی کا استقبال کس طرح کرتی ہے اور مشکلات کے وقت اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ جب مشکلات آتی ہیں تو وہ اللہ کے سامنے بڑی عاجزی سے دست بدعا ہوتا ہے لیکن جب مشکلات دور ہو جاتی ہیں تو وہ اچانک برے دنوں کو بھول جاتا ہے اور اسی طرح حرکت اور جھگڑالو بن جاتا ہے جس طرح پہلے تھا۔ نیز وہ امم سابقہ کی تاریخ سے بھی کوئی عبرت نہیں لیتا جو اسی راہ پر چلیں اور جن کو ناقابل عبور مشکلات پیش آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے مخاطب عرب تھے' ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے ارد گرد کی امم سابقہ کس طرح ہلاکت سے دوچار ہوئیں لیکن اس کے باوجود ان کا مطالبہ یہی رہا کہ حضور اکرم جو کلام اور جو دعوت پیش کر رہے ہیں' اس کو تبدیل کر دیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ یہ کلام تو اللہ کا ہے اور یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ کسی بات کو بدلے یا نہ بدلے پھر یہ کہ یہ کلام ایک محکم حکیمانہ نظام پیش کرتا ہے اور اس نظام کے ایک پرزے کو اگر بدل دیا گیا تو پورا نظام ختم ہو گا۔ نیز قرآن تو اللہ کی بندگی اور حاکمیت کی دعوت دیتا ہے لیکن وہ جس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ بتوں کی پوجا کرو اور ان کو الٰہ مانو' جو نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ اور ان کی الوہیت پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اللہ کی بندگی کو وہ چھوڑ رہے ہیں جو وحی الٰہی پر مبنی ہے۔ پھر یہ لوگ خوارق کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن یہ قرآن ان کو خارق عادت معجزہ نہیں نظر آتا۔ اس کی آیات بذات خود عظیم معجزات ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کے مقابلے میں انسانی رد عمل کیسا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں انسانی نفسیات کے چند نمونے دیئے جاتے ہیں اور انسان کا یہ نفسیاتی تجزیہ نہایت ہی زندہ اور متحرک منظر کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لوگ بحری جہاز پر سوار ہوتے ہیں' وہ خوب چلتا ہے' اچانک اسے موجوں کے تھپیڑے آ لیتے ہیں اور یہ موجیں ہر طرف سے جہاز کو آ لیتی ہیں۔

ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی سراسر دھوکہ ہے۔ اس کی رونقیں اور اس کی ترو تازگیاں تو ایک لحظہ میں ختم ہونے والی ہیں۔ لوگ غفلت میں ہوتے ہیں کہ اچانک کوئی آفت آتی ہے اور سب کچھ ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے تم لوگ غور نہیں کرتے کہ اللہ دارالسلام کی طرف بلاتا ہے۔ وہ ایک ایسے نظام کی طرف بلاتا ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں امن و اطمینان کا گہوارہ ہوں گے۔ جس میں کوئی خوف نہ ہو گا۔

كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ "ہم آیات کو مفصل طور پر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں" اور اللہ کی تخلیق اور اس کے نظام کی تدبیر کے لیے اس کی ہدایات کی حکمت کو پا لیتے ہیں"۔

درس نمبر۹۵ تشریح آیات

۱---تا---۲۵

سورۃ یونس (۱۰) مکیۃ (۵۱) آیاتہا ۱۰۹ رکوعاتہا ۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ ۝۱

"اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ ال ر' یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے"۔ اس کتاب کی آیات حکمت' انہی حروف سے مرکب ہیں' جن کے بارے میں اہل کفر انکار کرتے ہیں کہ من جانب اللہ وحی ہیں۔ کیا یہی حروف تہجی ان کے پاس موجود نہیں۔ پھر کیوں نہیں وہ ان حروف سے ایک آیت تک بنا سکتے؟ آگے سورہ میں واضح الفاظ میں بھی ان کو یہ چیلنج دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ان کو اس امر کے سمجھنے میں مدد و معاون ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے اور رسول خدا کے درمیان فرق ہی اس وحی کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ وحی نہ ہوتی تو رسول بھی تمہاری طرح قرآن کی ایک آیت لے آنے سے عاجز ہوتا حالانکہ یہ حروف سب کے دست رس میں ہیں اور عام کلامی حروف ہیں۔

حکیم وہ ہوتا ہے جو لوگوں کے ساتھ ان کے مزاج اور ان کے دائرۂ ادراک کے اندر بات کرتا ہے۔ اس سورہ میں حکمت قرآن کے بعض اہم پہلو بیان کیے گئے ہیں جو آج تک سچے' محکم ہیں اور آئندہ کی نسلوں کے لیے بھی وہ آیات حکمت باقی اور مستحکم رہیں گی۔

حکیم وہ ہے جو لوگوں کو دعوت فکر دیتا ہے کہ وہ اس کائنات کے صفحات میں پوشیدہ حکمتوں پر غور کریں۔ آسمانوں کی پنہائیوں میں کس قدر راز ہیں' زمین کی تہوں میں کس قدر بصائر ہیں۔ چاند و سورج' رات اور دن' امم سابقہ کی ہلاکت و بربادی اور زوال' رسولوں کے قصوں' اور اس پوری کائنات کے اندر موجود ظاہرو باہر آیات اس حکیم نے عوام کے سامنے پیش کیں۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ۝۲

''کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی پر وحی بھیجی کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کی موجودگی میں سچے قدم ہیں۔ منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے''۔

سخت تنبیہہ آمیز سوال ہے۔ اللہ ان لوگوں کے عجیب و غریب رویے پر ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں' جو یہ لوگ رسول کے منصب اور حقیقت وحی کے بارے میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔

تمام رسولوں کو ہمیشہ اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ کیا اللہ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا؟ لوگوں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ ان کے نزدیک خود انسان اور مقام انسانیت کی کچھ قدر و قیمت نہ تھی۔ وہ خود اپنی نظروں سے گرے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ آیا رسول بھی انسان ہو سکتا ہے۔ اور براہ راست خدا سے رابطہ کر سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ ایک انسان کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائے کہ وہ تمام انسانوں کی ہدایت کا بیڑا اٹھائے۔ ان کا خیال تھا کہ رسول کوئی فرشتہ ہو یا کوئی اور مخلوق ہو' اور اس کا درجہ انسان سے اونچا ہو۔ ان کے خیال میں یہ پہلو نہ آیا کہ انسان کو مقام رسالت عطا کر کے اللہ نے انسان کو شرف دیا۔ اور پھر اسے رسالت کے بوجھ کے اٹھانے کے قابل بنا کر اسے عزت بخشی اور انسانوں میں سے بعض انسانوں کو مزید بلندی مراتب عطا کر کے اپنے ساتھ رابطے قائم کرنے کے اہل بنایا۔

یہ تو تھا شبہ ان لوگوں کے ذہنوں میں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے۔ اور قرون اولیٰ کے باشندے تھے۔ لیکن دور جدید میں بسنے والے انسانوں کے ذہنوں میں بھی ایسے ہی شبہات پائے جاتے ہیں۔ دور جدید گمراہوں کا شبہ یہ ہے کہ اللہ جیسا تو کوئی ہو نہیں سکتا' اس لیے ایک خالص مادی ذات انسان کا اللہ کے ساتھ رابطہ کیسے ہو سکتا ہے جو غیر مادی ہے اور لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ہے۔

لیکن یہ سوال وہی شخص کر سکتا ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ اس نے ذات الٰہی کی ماہیت اور حقیقت کا احاطہ کر لیا ہے اور اسے معلوم کر لیا ہے جس طرح کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے انسانوں کی ماہیت اور حقیقت کا ادراک کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جس شخص کے اندر ذرہ بھر عقل ہے وہ ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کی قوت مدرکہ ذات باری کی ماہیت و حقیقت کے ادراک کے قابل ہی نہیں ہے۔ باوجود اس حقیقت کے خود انسان کی قوت مدرکہ کی پوری ماہیت کو بھی انسان پوری طرح معلوم نہیں کر سکتا' خود انسانی قوت کے بارے میں بھی نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں' انسانی نفسیات کے بارے میں بھی انسانی علم کی آخری سرحد نہیں آئی کہ کوئی یہ دعویٰ کر سکے کہ انسان اور ذات باری کا رابطہ ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی علم کے سامنے ابھی جہالت کے ناقابل عبور میدان حائل ہیں جن میں اس نے کام کرنا ہے۔ اور اپنے علمی افق کو وسعت دینی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود ذات انسان کے اندر وہ خصوصیات رکھی ہوئی ہیں جن کے بارے میں صرف اللہ کو علم ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ انسانوں میں سے کس انسان کو منصب رسالت عطا کر دے اور کون ہے جو اس کے قابل ہے؟ لوگ نہیں جانتے۔ خود ایک رسول بھی بعض اوقات نہیں جانتا کہ اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت موجود ہے۔ لیکن اللہ نے انسان کے اندر خود اپنی روح پھونکی ہے۔ خود اللہ کو معلوم ہے کہ انسان کا ہر ہر خلیہ کیا خصوصیات رکھتا ہے؟ اس کا ہر ہر عضو کیا کمالات رکھتا ہے اور اس کی دوسری مخلوق کیا خصوصیات رکھتی ہے اور اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان کو یہ مخصوص

صلاحیت دے دے' اس قدر مخصوص کہ دوسرے انسان اس کی حقیقت کے ادراک ہی سے قاصر ہوں۔

کئی محدثین اور مفسرین نے علم و سائنس کے ذریعے حقیقت وحی کو انسانی ذہن کے قریب تر کرنے کی سعی کی ہے۔ میں سرے سے اس منہاج بحث کا قائل ہی نہیں ہوں' کیونکہ سائنس کا ایک محدود میدان ہے' سائنس اپنے دائرۂ کار میں کام کرنے کے وسائل بھی رکھتی ہے۔ سائنس کی جو علمی سرحدیں ہیں ان میں آگے جانے کے لیے اس کے پاس وسائل آلات بھی ہیں' لیکن آج تک سائنس نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ روح کے بارے میں کوئی حقیقی ادراک رکھتی ہے کیونکہ روح اور روحانی دنیا سائنس کا موضوع ہی نہیں ہے۔ کیونکہ سائنس کے وسائل صرف مادی دنیا کے اندر محدود ہیں۔ چنانچہ سائنس ہمیشہ روحانی دنیا سے دور رہتی ہے۔ رہے وہ علوم جن کو روحانی علوم کہا جاتا ہے تو وہ ایسی کوششیں ہیں جن کے آگے شکوک و شبہات کا ایک سیلاب ہے اور ماہرین روحانیات نے اس کو عبور نہیں کیا ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر محمد حسین کا مقالہ جدید روحانیت اور اس کی حقیقت اور مقاصد)

روحانی دنیا میں انسان کسی بھی یقینی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا' الا یہ کہ کوئی بات قرآن اور حدیث جیسے یقینی اور سچے ماخذ سے لی گئی ہو لیکن قرآن و حدیث میں بھی ہمیں ان ہی حدود کے اندر رہنا ہے جن کو قرآن و حدیث نے متعین کر دیا ہے' بغیر تصرف اور بغیر کسی زیادتی کے اور بغیر مزید قیاسات کے۔ کیونکہ زیادتی' قیاس اور تصرف ہماری عقل کا فعل تصور ہو گا اور عقل اس میدان میں پائے چوبیں کی مالک ہے' اس میدان میں چلنے کے لیے اس کے پاس پاؤں ہی نہیں ہیں۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ (۱۰: ۲) "کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی پر وحی بھیجی کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کی موجودگی میں سچے قدم ہیں"۔

یہ ہے خلاصہ وحی۔ یعنی لوگوں کو اس بات سے ڈرانا کہ وہ مخالفت نہ کریں ورنہ انجام برا ہو گا۔ اور جو لوگ مخالفت ترک کر کے ایمان لاتے ہیں ان کو یہ خوش خبری دینا کہ ان کے لیے رب کے ہاں سچی عزت ہے۔ انذار اور تبشیر میں وہ حدود عمل بھی آجاتے ہیں جن پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے اور وہ حدود ممانعت بھی آجاتے ہیں جن سے آگے بڑھنا حرام ہے یعنی انذار اور تبشیر میں ان کے تقاضے بھی آجاتے ہیں۔

انذار تمام انسانوں کے لیے ہے' کیونکہ تمام انسان تبلیغ' بیان اور ڈرانے کے محتاج ہیں' لیکن خوش خبری صرف اہل ایمان کے لیے ہے۔ خوش خبری اللہ اس لیے دیتا ہے کہ وہ مطمئن رہیں' اپنی راہ پر گامزن رہیں اور ثابت قدم رہیں۔ لفظ "صدق" کے مفہوم میں یہ سب کچھ داخل ہے۔ اس کی اضافت قدم کی طرف کی گئی ہے یعنی ایسا سچا قدم جو راسخ' ثابت' پر یقین ہو' جس کے اندر کوئی اضطراب' تزلزل' تردد اور خوف نہ ہو' یعنی خوف' ڈر اور مشکل حالات میں یہ سچا اور قابل اعتماد قدم ہو۔ عِندَ رَبِّهِمْ (۱۰: ۲) یعنی رب کی موجودگی میں۔ رب کی موجودگی میں ایک مومن کو زیادہ قوت ملتی ہے جبکہ دوسرے لوگوں کے اقدام تزلزل ہوتے ہیں اور دل مردہ ہوتے ہیں۔

یہاں اشارہ کیا گیا۔ رَجُلٍ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک آدمی کی طرف جسے وہ جانتے ہیں اور وہ ان کو جانتا ہے' وہ اس

پر مطمئن ہیں' اس کے ساتھ لین دین کرتے رہے ہیں اور ان کے درمیان کوئی تکلف اور کوئی دوری نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے۔ جہاں تک رسولوں کے بھیجنے کا معاملہ ہے تو وہ تو بہت ہی واضح ہے۔ کیونکہ اپنے مزاج کے اعتبار سے انسان بھلائی اور برائی دونوں کا تحمل ہو سکتا ہے' انسانی عقل خیر و شر میں تمیز کرنے کا آلہ ہے لیکن بعض اوقات اس پر بھی امور مشتبہ ہو جاتے ہیں کیونکہ انسان کے میلانات اور رجحانات مختلف معاشروں اور مختلف حالات میں بدلتے رہتے ہیں اس لیے ایک ایسے معیار کی ضرورت تھی جو متبدل نہ ہو' اور جو وقتی حالات و رجحانات سے بالاتر اور جو کسی شخص' علاقے اور قوم اور زمان و مکان کی قید میں مقید نہ ہو اور یہ دائمی معیار وہ ہے جو پیغمبروں نے شریعت کی شکل میں پیش کیا۔

یہ وجہ ہے کہ اللہ کے دین کو ایک ایسے ابدی اور دائمی معیار کی ضرورت ہے تاکہ فہم انسانی اس کی طرف رجوع کرے اور عقل انسانی کے اخذ کردہ نتائج کو اس معیار اور کسوٹی پر پرکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں سے صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دین خداوندی وہ ہے جسے انسان سمجھیں کہ یہ دین خداوندی ہے' یہی وجہ ہے' کہ دین بھی ایک ترقی پذیر سوچ کا نام ہے تو یہ خیال خام خیالی ہے اور یہ خیال وحی الٰہی کے مقام و مرتبے کو یکسر بدل دیتا ہے' اس کے مطابق پھر اصل چیز عقل ہے اور دین وہ ہے جو عقل سمجھے۔ اس طرح دین اسلام اور اس کے اصول کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتے۔ دین اور اس کے اصول متعین نہ ہوں گے۔ اس طرح تو دین کا کوئی معیار ہی نہ رہے اور نہ عقل کی صحت اور نص کو پرکھنے کے لیے کوئی معیار ہو گا۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین وہی ہے جسے فہم انسانی کوئی مفہوم دے اور جو یہ کہتے ہیں کہ دین سرے سے انسانی مصنوعات میں سے ہے' ان کے اقوال کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں رہتا۔ دونوں قسم کے خیالات کی منزل ایک ہے' انجام دونوں کا خطرناک ہے بلکہ گمراہی ہے اور اس قسم کے خیالات سے ہمیں بروقت محتاط رہنا چاہئے۔

بہرحال وحی الٰہی کو یہ مقام اور مرتبہ دینے کے لیے کافر تیار نہ تھے اور وہ تعجب کرتے تھے کہ اس طرح کی وحی انسان پر کیسے آ سکتی ہے۔

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ (۱۰ : ۲) "کافروں نے کہا' بے شک یہ کھلا جادوگر ہے"۔ یہ جادوگر اس لیے ہے کہ جو کلام یہ پیش کرتا ہے وہ معجزہ ہے' حالانکہ ان کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص بے شک نبی ہے اس لیے کہ وہ جو کلام پیش کرتا ہے وہ معجزہ ہے کیونکہ جادو میں کوئی کائناتی حقیقت نہیں ہوتی' اس کے اندر کوئی نظام زندگی نہیں ہوتا' جادوگر دنیا میں اصلاحی تحریکات نہیں اٹھایا کرتے۔ نہ جادوگر ہادی ہوتے ہیں وہ ایسی قانون سازی کرتے ہیں جن کی اساس پر کوئی ترقی یافتہ سوسائٹی تشکیل پائے اور اس کے نتیجے میں ایک مکمل نظام زندگی وجود میں آ جائے جو انفرادی حیثیت رکھتا ہو۔

ان لوگوں نے وحی الٰہی کو جادو اس لیے کہا کہ تمام بت پرست معاشروں میں دین اور جادو کے درمیان دامن چولی کا ساتھ رہا ہے اور جس طرح اہل اسلام پر دین اور بت پرستی کی حقیقت ظاہر ہو گئی تھی اور انہوں نے بتوں اور اوہام و خرافات کو ترک کر دیا تھا اس طرح ان پر ابھی یہ حقیقت منکشف نہیں ہوئی تھی۔ دین اور جادو میں فرق کیا ہے؟

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ
اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ
بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳ اِلَیْهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ لِیَجْزِیَ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ
شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۝۴ هُوَ الَّذِیْ
جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ
السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ
لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ
فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝۶

"حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا' پھر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا انتظام چلا رہا ہے۔ کوئی شفاعت "سفارش" کرنے والا نہیں ہے۔ الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے۔ اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدائش کی ابتدا وہی کرتا ہے' پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے۔ اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے' وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ برحق ہی پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غلط بینی و غلط روی سے بچنا چاہتے ہیں"۔

اسلامی نظریہ حیات کا یہ ایک نہایت ہی اساسی مسئلہ ہے یعنی اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کا مسئلہ۔ جہاں تک خدا کی خدائی کے مسئلے کا تعلق ہے کسی مشرک نے سنجیدگی کے ساتھ خدا کا انکار نہیں کیا۔ وہ خدا کے وجود کا اقرار کرتے تھے

کیونکہ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان جب اس عظیم کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ لازماً اس کے بنانے والے کو مانتا ہے ۔ الا یہ کہ انسان کی فطرت میں ' کبھی کبھی بہت زیادہ بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اس لیے بعض اوقات انسان نے خدا کا انکار بھی کیا ہے مگر یہ شاذو نادر ہی رہا ہے ۔ جہاں تک مشرکین کی بڑی بے راہ روی کا تعلق ہے وہ یہ رہی ہے کہ انہوں نے خدا کے سوا بعض دوسرے الٰہ بنا رکھے تھے ' وہ ان الٰہوں کی عبادت کرتے تھے اور یہ عبادت بھی وہ اس عنوان سے کرتے تھے کہ یہ بت اور الٰہ ہمیں خدا کے قریب کرتے ہیں اور یہ کہ یہ الٰہ خدا کے ہاں سفارشی ہوں گے ' اس کے علاوہ یہ کہ یہ مشرکین اپنے ضابطے اور قوانین بھی خود بناتے تھے اسی لیے یہ لوگ مشرک قرار پائے ۔

قرآن کریم مسئلہ ربوبیت اور حاکمیت کو ذہن نشین کرانے کے لیے خشک منطقی انداز کلام اختیار نہیں کرتا جیسا کہ بعد کے ادوار میں یونانی منطق کے رواج کے نتیجے میں مسلمانوں میں علم الکلام کے نام سے مدون ہوا۔ اس مسئلے کو قرآن نہایت ہی سادہ اور فطری انداز میں پیش کرتا ہے ۔ براہ راست فطرت کے سامنے سادہ حقائق رکھتا ہے ۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ انداز زیادہ موثر ہے مثلاً : اللہ وہ ذات ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور اس کائنات میں سورج کی روشنی پیدا کی ' پھر رات کو چاند کی نورانیت پیدا کی اور چاند کے لیے منازل اور مدار مقرر کیے ' اور رات دن کے اختلاف اور بڑے چھوٹے ہونے کے لیے ایک صحیح اندازہ مقرر کیا ۔ یہ کائناتی مظاہر براہ راست احساس میں آتے ہیں ' انسانی فکر پہ یہ مناظر اثر انداز ہوتے ہیں بشرطیکہ انسان اپنی فکر و نظر کے دروازے بند نہ کر دے ' پس جس خدا نے یہ کائنات بنائی ہے اور وہ اس کی تدبیر کر رہا ہے ' اسے چلا رہا ہے ' وہی اس لائق ہے کہ لوگ اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں ۔

اس دلیل پر ذرا غور کریں کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کس قدر منطقی ہے اور انداز کس قدر سادہ ہے ۔ ایک زندہ دلیل جسے سمجھنے کے لیے کسی منطقی رد و قدح کی ضرورت نہیں پڑتی ' نہ ذہن بوجھ محسوس کرتا ہے اور یہ دلیل اس خشک منطق صغریٰ و کبریٰ کی شکل میں بھی نہیں ہے کیونکہ منطقی دلائل میں قلب کی گرمی اور وجدان کا جوش و خروش نہیں ہوتا ۔

یہ عظیم کائنات ' اس کے آسمان اور اس کی زمین ' اس کا چاند اور سورج اس کے رات اور دن ' اور آسمان کے اندر مخلوقات ' مختلف قسم کی جاندار چیزیں اور مختلف تکوینی قوانین ' نباتات و حیوانات اور تمام دوسری مخلوقات اللہ کے مقرر کردہ سنن کے مطابق چل رہے ہیں ' ۔ گندم از گندم بروئد جو از جو یہ رات جو پوری کائنات کو ڈھانپ لیتی ہے اور لوریاں دے کر سلا دیتی ہے ' مکمل سکوت طاری ہو جاتا اور ماسوائے تاریکی کے کچھ نظر نہیں آتا ۔ اور یہ صبح جو ایک خوبصورت اور مطمئن بچے کی ہنسی اور تبسم کی صورت میں رات کے گہوارے سے نمودار ہے ۔ صبح کے نمودار ہوتے ہی زندگی حرکت کرنے لگتی ہے اور دوڑ دھوپ شروع ہو جاتی ہے ۔ یہ گھنے سائے جنہیں دیکھنے والا ساکن سمجھتا ہے لیکن یہ چلتے ہیں نہایت لطف کے ساتھ ' اور یہ پرندے جو اچھلتے کودتے نظر آتے اور ہر وقت ادھر ادھر اڑتے ہیں ' اور یہ نباتات جو ٹھہرے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن یہ دراصل ہر وقت بڑھوتری میں ہیں ۔ اور یہ لوگ جو آتے ہیں ' جاتے ہیں ' دوڑتے ہیں ' کھیلتے ہیں اور سرگرم ہیں ۔ اور رحم مادر جو زندگی عطا کر رہی ہے اور یہ قبریں جو لوگوں کو نگلتی چلی جا رہی ہیں او زندگی ایک سمت میں محو حرکت ہے اس کے لیے کوئی جائے قرار نہیں ہے ۔

البتہ کائنات کی یہ تصویریں اور یہ سائے ' یہ رنگ اور شکلیں ' یہ فرصت اور سکون اور ماحول ' یہ آنا اور یہ جانا ' یہ بڑھاپا

اور یہ جوانی ' یہ روئیدگی اور یہ خزاں کی تباہ کاریاں ' یہ زندگی اور یہ موت ' یہ مسلسل حرکت اور یہ مہیب سکوں ' اور یہ ٹھہراؤ اور سکون بھی دائمی اور یہ حرکت بھی ایسی مسلسل کہ سکون محال نظر آئے 'لیکن در حقیقت شب و روز حرکت۔

یہ تمام حقائق انسان کی رگ رگ کو سوچنے اور متاثر ہونے پر مجبور کرتے ہیں بشرطیکہ دل زندہ ہو اور اس کائنات میں بکھری ہوئی علامات و آیات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ ہے انداز قرآن مجید کا جو براہ راست فطرت انسانی پر نشانہ باندھتا ہے۔ اور عقل تو بہرحال غور و فکر اپنی جگہ کرتی ہی رہتی ہے۔ کیونکہ آیات و معجزات اور دلائل و علامات کے ان بے پناہ مواقع کو عقل کس طرح نظرانداز کر سکتی ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (۱۰ : ۳) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا"۔ تمہارا وہ رب جو بندگی اور حاکمیت کے لیے استحقاق رکھتا ہے وہ تو ایسا خدا ہے ' جو خالق ہے 'جس نے اس زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور ان کو نہایت ہی حکیمانہ انداز میں پیدا کیا اور ان میں کوئی فتور نہیں ہے۔

فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (۱۰ : ۳) چھ دنوں میں) یہ اس کی حکمت کا تقاضا تھا 'جس میں اس کائنات کی ترتیب کو درست کرنا اس نے چاہا۔ یہ دن کیسے تھے ؟ یہاں ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی تحدید کریں کیونکہ اللہ نے یہاں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے تاکہ ہم تشریح کریں اور ان کی نوعیت بتائیں۔ ان کی تعداد کا تذکرہ اس لیے کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کی تخلیق میں اللہ کی جو حکمت پوشیدہ ہے اس کا اظہار کر دیا جائے۔ جو مقصد کائنات ہے اور جو مقصد تخلیق ہے اسے کس طرح حاصل کیا جائے۔

بہرحال یہ چھ دن کیسے تھے ' یہ ایک غیبی حقیقت ہے ' اس کی حقیقت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ علم ہمارے پاس ماسوائے وحی کے نہیں ہے ' لہٰذا جب وحی خاموش ہے تو ہمیں بھی خاموش رہنا چاہئے۔ یہاں ذکر اس لیے کر دیا گیا کہ اللہ اپنی تقدیر اور تدبیر کی حکمت بتانا چاہتے ہیں اور اس نظام کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جس کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے۔ ابتدا سے انجام تک اس کے مطابق چلے گی۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۱۰ : ۳) "پھر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا" تخت پر جلوہ گر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اس کائنات پر پورا کنٹرول ہے۔ اور یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ لوگ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل قرآن کریم مجرد معانی اور مفاہیم کو بھی حسی انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ عام لوگوں کے فہم و ادراک کے قریب ہو جائیں۔ ہم نے کتاب (التصویر الفنی فی القرآن) میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے کہ قرآن کریم کس طرح تخیل کو حسی تصویر دیتا ہے"۔

پھر لفظ ثم بھی یہاں اس کے لغوی مفہوم میں یعنی "اس کے بعد" میں نہیں ہے۔ یہ معنوی اعتبار سے بعد میں ہے ' اللہ پہلے بھی استوا میں تھا اور بعد میں بھی۔ یہاں اللہ کا اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۱۰ : ۳) اور اصل قید زمان و مکان سے باہر ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ اللہ پہلے نہ تھا اور پھر ہوا۔ کیونکہ زمان و مکان کے خیال سے جو نئے حالات پیدا ہوتے ہیں اللہ ان حالات سے پاک ہے۔ انسانی سوچ کے لیے ایک محفوظ اور مامون دائرہ ہے۔ اس سے آگے ہم نہیں جا سکتے

اور نہ جاتے ہیں کیونکہ اسلام نے یہ اصول وضع کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات شکل و ہیئت اور حدوث اور حالات سے منزہ ہے۔ اسی طرح زمان و مکان کے تصور سے وہ وراء ہے کیونکہ زمان و مکان نہ تھا اور وہ تھا۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ (۱۰: ۳) "کائنات کا انتظام چلا رہا ہے"۔ وہ تمام امور کو چلاتا ہے، ان کے آغاز اور انجام کا تعین کرتا ہے، ان کے حالات اور تقاضوں کا تعین کرتا ہے، اسباب و نتائج کا تعین فرماتا ہے اور وہ قانون قدرت بناتا ہے جو ہر امر کے مراتب اور نتائج کو کنٹرول کرتا ہے۔

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ (۱۰: ۳) "کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں ہے الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے"۔ کیونکہ ہر قسم کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے، اور کوئی ایسا سفارشی نہیں ہے جو کسی کو اللہ کا قریبی بنا سکے۔ اور اس کی مخلوق میں سے صرف وہی کوئی سفارش کر سکے گا جس کو اجازت ہوگی اور یہ اللہ کی تدبیر اور تقدیر کا مسئلہ ہے کہ وہ کس کو اجازت دے گا۔ اور مومنین میں کون اور اعمال صالحہ میں سے کس عمل کی برکت سے سفارش ہو سکے گی، یہ نہیں ہے کہ سفارشیوں کو وسیلہ بنا کر خدا کا درجہ دے دیں، کیونکہ مشرکین مکہ جن فرشتوں کی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے ان کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کی شفاعت مسترد نہیں ہوتی۔

یہ ہے تمہارا خدا خالق، مدبر جس کے ہاں کوئی سفارش نہیں چلتی۔ الا یہ کہ وہ خود اجازت دے۔ یہ رب اس قابل ہے کہ اسے تم معبود، مالک اور حاکم سمجھو اور یہی اس قابل ہے کہ اسے رب تسلیم کیا جائے اور یہی اس بات کے قابل ہے کہ اس کی اطاعت اور فرمان برداری کی جائے۔ کیا تم ہوش کے ناخن نہیں لیتے۔ یہ معاملہ تو نہایت ہی واضح اور سادہ ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے کسی بڑی مقدار علم و معرفت کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کے اس قول پر قدرے غور کریں۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۱۰: ۳) "یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ لہذا تم اسی کی عبادت کرو۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے"۔ اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ کفار مکہ وجود باری کا سنجیدگی کے ساتھ انکار نہ کرتے تھے۔ وہ ذات باری کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ وہ خالق رازق، زندہ کرنے والا اور مارنے والا ہے اور وہی اس کائنات میں متصرف ہے اور ہر چیز پر وہی قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اس قدر اعتراف کرنے کے بعد وہ اس اعتراف کے تقاضے پورے نہ کرتے تھے کیونکہ اس اعتراف کرنے کے بعد وہ سمجھتے اور انہیں ایسا سمجھنا چاہئے تھا کہ رب بھی اللہ ہے اور یہ کہ ان کی پوری زندگی میں حاکم بھی وہی ہو گا کیونکہ الوہیت اور ربوبیت کا اظہار صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ لوگ اللہ کو اپنا بادشاہ اور حاکم سمجھیں۔ اس کے سامنے مراسم عبودیت بجا لائیں۔ اور اپنی پوری زندگی میں اللہ کی شریعت کو نافذ کریں۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۱۰: ۳) "یعنی یہ ہے تمہارا رب لہذا اس کی بندگی کرو"۔

کیونکہ عبادت اور بندگی کا مفہوم ایک ہے اور اللہ کے دین پر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے نظام زندگی کا اتباع

کیا جائے اور یہ کہ اللہ کی ان خصوصیات میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ کیونکہ اگر ان میں ہم کسی اور کو شریک کریں گے تو مفہوم یہ ہوگا کہ ہم صرف اللہ کو حاکم تصور نہیں کرتے۔

تمام جاہلی تصورات میں یہ ہوتا ہے کہ الوہیت کے دائرے کو محدود کیا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وجود ذات باری کو مان لیا تو ایمان مکمل ہوگیا۔ اور جن لوگوں نے اللہ کو الہ مان لیا تو ان کا ایمان مکمل ہوگیا اور وہ مراد کو پہنچ گئے۔ چاہے وہ زندگی میں اس ایمان اور اعتراف کے تقاضے پورے کریں یا نہ کریں اور اس کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کو رب اور حاکم بھی سمجھا جائے۔ اور اس کے سوا کسی اور کو حاکم نہ تصور کیا جائے۔

اسی طرح جاہلیتوں میں عبادت کا مفہوم بھی محدود ہوتا ہے۔ اس میں صرف مراسم عبودیت داخل ہوتے ہیں یعنی مذہبی فرائض۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر عبادت کی جائے تو صرف اللہ کی کی جائے بتوں وغیرہ کی نہ کی جائے۔ حالانکہ خود عبادت کا لفظ عبد سے نکلا جس کے معنی ہیں اطاعت کرنا اور حکومت ماننا ہے۔ مذہبی مراسم عبودیت بجا لانا تو اللہ کی حاکمیت کے تسلیم کرنے کی ایک علامت ہے۔ پوری خدا پرستی رسم عبودیت میں محدود نہیں ہے، یہ تو اس کا ایک مظہر ہے۔ پھر جاہلیت کسی دور کا نام نہیں ہے، نہ انسانی تاریخ کا کوئی مرحلہ جاہلیت ہے۔ جاہلیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت کو صرف عبادات تک محدود کر دیا جائے حالانکہ ربوبیت الٰہ کو محدود کرنے کے نتیجے میں انسان شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس وقت پورے عالم انسانیت کا یہی حال ہے، اس میں وہ علاقہ بھی شامل ہے جس میں لوگ مسلمانوں کی طرح نام رکھتے ہیں اور ان میں بعض مراسم عبودیت بھی بجا لاتے ہیں جبکہ ان کے رب اللہ کے سوا کچھ اور لوگ ہیں کیونکہ رب تو وہی ہوتا ہے جس کی شریعت اور حکومت کو نافذ کیا جائے جس کا قانون اور دستور نافذ ہو، اور جس کے اوامر و نواہی کے لوگ پابند ہوں اور اس کے قانون کے پابند ہوں جو بھی وہ بنا دے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عیسائیوں کے ارباب و رہبان ان کے لیے قانون بناتے ہیں۔ اور یہ بے چون و چرا اسے قبول کرتے ہیں تو یہ ان کی بندگی ہے۔ (ترمذی حدیث عدی)

عبادت کے مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے اس سورہ میں آیا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۱۰ : ۵۹) "بتاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے رزق اتارا ہے، پس تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال قرار دیا ہے، کہہ دیجئے کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے یا تم اللہ پر افترا باندھتے ہو"۔ اور آج ہم اسی حالت میں ہیں جس میں اہل جاہلیت تھے، جن کو اللہ نے فرمایا تھا کہ

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۰ : ۳) "یہ ہے تمہارا رب، پس اسی کی بندگی کرو، کیا تم نصیحت نہیں لیتے"۔ یعنی اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم نے اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اس کے سامنے حساب دینا ہے، وہی مومنوں اور کافروں کو جزا و سزا دے گا۔

اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا (۱۰: ۴) "اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے' یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے"۔ یعنی تم سب کو صرف اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے' یہ جن کو تم شریک سمجھتے ہو' ان کے سامنے تم نے نہیں پیش ہونا۔ اور یہ حق بات ہے۔

اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ (۱۰: ۴)

بے شک پیدائش کی ابتداء وہی کرتا ہے' پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے۔ اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں۔ اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے"۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ اٹھانے کا ذمہ اٹھایا ہے' اس لیے اٹھانے کا عمل لازمی واقعہ ہو گا۔ نیز تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو آزمایا جائے اور اچھے لوگوں کو اچھا اور بروں کا برا صلہ دیا جائے اور یہ عین عدل ہو گا لہٰذا اقتضائے تخلیق ہو گا۔

اس کے علاوہ ایسی نعمتوں کا حصول جن کے استعمال میں کوئی رکاوٹ نہ ہو' جس کے استعمال کے نتیجے میں برے اثرات نہ ہوں اور یہ نعمتیں دائمی ہوں' تخلیق کائنات کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ یعنی انسان کے لیے انتہائی کمال اور سربلندی تک پہنچ جانا اور اس کمال تک انسان اس زمین پر نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس دنیا میں خوشی کے ساتھ غم بھی موجود ہے۔ سہولت کے ساتھ مشکلات بھی موجود ہیں۔ اگر دنیا میں ہر کمال حاصل کر لیا جائے لیکن یہی ایک شعور اس کی ناتمامی کے لیے کافی ہے کہ یہ دنیا چھوٹنے والی ہے۔ لہٰذا انسانیت اس دنیا میں بھی اعلیٰ مراتب کمال تک نہیں پہنچ سکتی مثلاً وہ ہر نقص ' ہر ضعف ' ہر کام کے تبعات After effects سے پاک ہو اور بغیر کدورت ' بغیر خوف ناکامی اور بغیر خوف انقطاع عشرت انسان یہاں لذت کام و دہن کو جاری رکھ سکے۔ لہٰذا انسان کو من کل الوجوہ کمال صرف آخرت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ پس اس کائنات کی تخلیق کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ یہاں آزمانے کے بعد اسے اٹھایا جائے اور پھر وہ لوگ جو اس آزمائش میں کامیاب ہو جائیں وہ دائمی کامیابی پا کر ہر قسم کا کمال حاصل کر لیں۔ اور وہ انسانیت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جائیں۔

اور جو لوگ کفر کریں اور اس آزمائش میں ناکام ہو جائیں اور وہ انسانی کمال تک نہ پہنچ سکیں اور نہ وہ اس راہ کو اختیار کریں لہٰذا ان کے بارے میں مناسب فیصلہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ انصاف کے مطابق مرتبہ کمال کو نہ پہنچیں کیونکہ انہوں نے خود کمال تک پہنچانے والے راستے کو چھوڑا۔ اور یہ بھی جائز بات ہے کہ وہ اس انجام تک جا پہنچیں جس تک ان کو پہنچنا چاہئے۔ مثلاً جو مریض صحت کے اصولوں کی پیروی نہیں کرتا وہ قبل از وقت اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ اور بیمار اور ضعیف ہو جاتا ہے اور یہ شخص زوال اور نہایت ہی تلخ زندگی تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں جنت کے دائمی لذائذ کے مقابلے میں تلخیاں ہی تلخیاں ہوں گی۔

یہ ہے مفہوم اس آیت کا۔

الَّذِينَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ

(۱۰ : ٤) ”اور جنھوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں گے اور دردناک سزا بھگتیں گے' اس انکار حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے“۔

اس کائنات میں سے وہ دلائل پیش کرنے کے بعد صرف اللہ وحدہ بندگی کے لائق ہے اور جزاو سزا کا مالک بھی وہی ہے۔ اب سیاق کلام اس طرف آتا ہے کہ اس کائنات کی ضخامت اور اس کی افادیت پر ذرا غور کرو اور دیکھو کہ اس میں کیا کیا نشانات و معجزات ہیں۔

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ

(۱۰ : ۵) ”وہی ہے جس نے سورج کو اجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ برحق ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں“۔

سورج اور چاند اس زمین کے مشاہد و مظاہر میں سے جو اہم مشاہدے ہیں' جو ہر وقت کھلے ہیں۔ ہم رات اور دن دیکھتے دیکھتے ان کی اہمیت کو کھو دیتے ہیں۔ اور بار بار کی گردش لیل و نہار کی وجہ سے ہم پہ ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی انسان کسی غار میں پڑا ہو جائے اور وہ اچانک اس کائنات میں نمودار ہو اور وہ دیکھے کہ یہاں سورج چمک رہا ہے اور پھر رات کو چاند طلوع ہو رہا ہے تو وہ دہشت زدہ ہو جائے گا اور اس کے تعجب اور حیرانی کی انتہا نہ ہو گی۔

یہ دو مظاہر اور حقائق جو پیش پا افتادہ ہیں اور بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں' قرآن ہمیں ان پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے' تاکہ ہمارے اندر ایک حیرانی اور غور کرنے کا شعور پیدا ہو' ہمارا احساس ذرا تیز ہو' اور ان مظاہر کے تکرار پر بھی ہم تامل کریں اور ان کی تخلیق' ان کی افادیت اور ان کی گردش کی محکمی اور تسلسل پر غور کریں۔

ذرا سورج کی تخلیق' اس کا مسلسل ایٹمی اشتعال' چاند کی روشنی دھیمے انداز میں --- پھر مدار میں ان کی مسلسل گردش --- آج جس مدار میں چاند ہے' کل اس میں نہ ہو گا --- آج جس قدر ہے کل اس سے کم یا زیادہ نظر آئے گا۔ ماہرین فلکیات کے علاوہ ایک عام آدمی بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔ وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ (۱۰ : ۵) منزلیں مقرر کر دی گئیں۔

لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (۱۰ : ۵) ”تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کا حساب معلوم کرو“۔ آج تک تمام تاریخیں اور حساب شمس و قمر کی گردش سے متعین ہیں تمام انسان ایسا ہی کرتے ہیں۔

کیا یہ سب کچھ ایک عبث کھیل ہے' کیا یہ ایک حقیقی معاملہ ہے۔ محض ایک اتفاق ہے جو گزر رہا ہے۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۰ : ۵) ”اللہ نے یہ سب کچھ برحق پیدا کیا ہے“۔ اس کی اساس حق ہے' حق اس کا ذریعہ ہے' اور حق اس کا مقصود ہے۔ اور سچائی اہم اور مضبوط ہے اور اس سے جو دلائل و حقائق معلوم ہوتے ہیں وہ مستقل ہیں۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۰ : ۵) "وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ یہ مشاہد جو یہاں پیش کیے جا رہے ہیں ان کو معلوم کرنے کے لیے غور و فکر اور گہرے علم کی ضرورت ہے تاکہ ان کی غرض و غایت اور مقصد تخلیق کو معلوم کیا جا سکے۔

زمین و آسمان کی تخلیق' سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنانے اور ان کے منازل و مدار مقرر کرنے کے نتیجے ہی میں' دن اور رات پیدا ہوئے اور اس کائنات میں جو شخص کھلے دل سے غور و فکر کرے اس کے لیے یہ اس کائنات کا عجیب و غریب منظر ہے۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۱۰ : ٦) "یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہیں' نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غلط بینی و غلط روی) بچنا چاہتے ہیں"۔ رات اور دن کے اختلاف سے مراد ان کا آگے پیچھے آنا ہے۔ نیز اس سے ان کے درمیان لمبائی اور اختصار کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ دونوں ایسے مظاہر ہیں کہ جو رات دن دہرائے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے مالوف اور معتاد ہو جاتے ہیں۔ الا یہ کہ بعض لمحات میں جب نفس انسانی متوجہ ہو اور اس کائنات کی بوقلمونیوں پر غور کرنے کے لیے انسانی وجدان تیار ہو تو انسان کے لیے طلوع و غروب اور شب و روز بالکل ایک نئے اور عجیب مظاہر بن جاتے ہیں۔ اور انسان ان کو اس طرح دیکھتا ہے کہ گویا یہ مناظر اس کے لیے بالکل نئے ہیں۔ اور وہ انہیں عجیب انداز میں محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جن میں انسان زندہ ہوتا ہے' اور ان لمحات میں وہ خشکی ختم ہو جاتی ہے جو ان مظاہر کے ساتھ عادی ہونے کی وجہ سے انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور ان مظاہر کی اصل حقیقت کو دیکھ سکتا ہے۔

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۰ : ٦) "اور جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کیا ہے"۔ اگر انسان چند لمحات بھی ان چیزوں پر غور کر سکے جو اللہ نے آسمانوں اور زمین کے درمیان پیدا کی ہیں اور یہ انواع و اقسام کی اشیاء ہیں' عجیب و غریب شکلیں اور عجیب و غریب احوال جو اس عظیم کائنات کے اندر بکھرے پڑے ہیں تو یہ چند لمحات اسے وہ کچھ عطا کر سکتے ہیں جو اس نے پوری زندگی میں نہ پایا تھا۔ اور پھر یہ تاثر اس کی پوری زندگی کے لیے ایک مشعل راہ بن سکتا ہے۔ اور اس پوری کائنات اور زمین و آسمان کی تخلیق تو ایک نہایت ہی بڑی چیز ہے اور اگر صرف ایک اشارہ کے طور پر بھی دل اس کی طرف متوجہ ہو جائے تو اس کی چمک اس کی زندگی کو بھر دے گی۔ پوری زندگی کو۔ بے شک ان میں ان لوگوں کے لیے آیات و دلائل ہیں جن کے دل میں ذرہ بھر خوف خدا بھی ہو۔

یہ متقی کون لوگ ہیں لِقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ وہ ہیں جن کے دلوں میں اسی قسم کی وجدانی چمک پیدا ہو۔ یہ خدا خوفی کا وجدان ہے اور اس کے نتیجے میں دلوں میں یقین و ایمان کا لاوا ابل پڑتا ہے۔ دل حساس ہو جاتے ہیں' ان پر بات کا اثر ہوتا ہے اور وہ قدرت الٰہیہ سے متاثر ہو کر حق کو قبول کر لیتے ہیں' وہ اللہ کی قدرت کی ان بوقلمونیوں سے متاثر ہو رہے ہیں' اس کائنات میں ان کے قلب و نظر اور ان کے احساس اور سننے کے لیے بہت کچھ مضمرات ہوتے ہیں۔

انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں جو آیات و علامات اللہ نے پیدا کر رکھی ہیں ان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے قرآن کا یہ منہاج اور اسلوب کلام ہے۔ اللہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے اور اس کائنات کو بھی اور اس کو معلوم ہے کہ فطرت انسانی اور فطرت کائنات کے درمیان ہمکلامی کے لیے انسان کے اندر ایک خاص صلاحیت ہے۔ انسان فطرت کی پکار کو سن سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔

قرآن کریم نے اس سلسلے میں وہ اسلوب کلام اختیار نہیں کیا جو ازمنہ مابعد میں یونانی فلسفے اور منطق سے متاثر ہو کر متکلمین نے اختیار کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ یہ اسلوب دل کی گہرائیوں کو نہیں چھوتا اور اس کی منطق اور طرز استدلال خشک ہے اور کسی انسان کو یہ اسلوب عمل کے لیے آمادہ نہیں کرتا۔ نہ اس طرز استدلال پر کوئی زندگی اور تہذیب استوار کی جا سکتی ہے۔ ہاں اسی طرز استدلال سے ذہن انسانی ضرور حرکت میں آتا ہے اور بہت سی ہوائی باتیں بنا لیتا ہے۔

لیکن وہ دلائل و براہین جو قرآن مجید اپنے اس منفرد طرز استدلال کے ذریعے پیش کرتا ہے یہ قوی ترین دلائل ہوتے ہیں' یہ انسان کے دل و دماغ کو مطمئن کر دیتے ہیں اور یہ اس طرز استدلال کا خصوصی امتیاز ہے کیونکہ سب سے پہلے اس کائنات کا وجود ہی ایک دلیل ہے۔ اس کے بعد اس کی منظم حرکت' نہایت ہی مستحکم نظام گردش اور اس کے نتیجے میں کائنات کے اس ماحول میں جو عجیب و غریب تغیرات پیدا ہوتے ہیں' جو ایک واضح قانون اور متعین اثرات و نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس وقت سے پیدا کرتے چلے آ رہے ہیں جب سے انسان نہ تھا یا جانتا ہی نہ تھا۔ ان سب امور اور سوالات کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مدبر ہے۔

جو لوگ اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے یا اس میں شک پیدا کرتے ہیں وہ آج تک اس سے قوی' منطقی یا فلسفیانہ دلیل نہیں لا سکے۔ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکے کہ یہ کائنات اپنے ان قوانین کے ساتھ یوں پائی گئی ہے اور اس کے وجود کے لیے کسی علت کی تلاش ضروری نہیں ہے' اس کے وجود کے اندر ہی یہ قوانین ودیعت ہیں۔ سوال یہ کہ ان لوگوں کی یہ بات کیا کوئی معقول بات ہے؟

سب سے پہلے یورپ میں یہ انداز کلام اختیار کیا گیا جبکہ یورپ تصور خدا سے فرار اختیار کرنے کے موڈ میں تھا کیونکہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اللہ سے فرار کے سوا کلیسا کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتے' اس کے بعد دوسرے علاقوں میں بھی یہ بات مقبول ہو گئی کیونکہ اس کے سوا خدا کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ دنیا کی تمام جاہلیتیں اپنی تمام خرابیوں کے باوجود منکر خدا نہ تھیں۔ ہاں خدا کو خالق تسلیم کرنے کے بعد وہ صرف اللہ کو رب اور حاکم تسلیم کرنے سے منکر تھیں اور اسی مسئلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور مشرکین عرب کے درمیان اختلاف تھا۔ چنانچہ قرآن کریم کے اس طرز استدلال نے ان لوگوں کو بالکل بے بس اور لاجواب کر دیا جبکہ بنیادی طور پر وہ اللہ کی ذات و صفات کے قائل تھے۔ قرآن کریم کا مطالبہ یہ تھا کہ تم جس اللہ کے قائل ہو' وہی اکیلا رب اور حاکم بھی ہے۔ لہٰذا مراسم عبودیت کے ساتھ سیاسی اور تشریعی حاکمیت بھی اسی کی تسلیم کرو۔ لیکن بیسویں صدی کی جاہلیت نے یہ رویہ اختیار کیا کہ سرے سے ذات باری کا انکار کر دو تاکہ تم سے کوئی اس کی حاکمیت اور شریعت کے اتباع کا مطالبہ ہی نہ کر سکے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ممالک جو اپنے آپ کو اسلامی ممالک کہتے ہیں' ان میں تمام وسائل عالم و ادراک اور میڈیا کے ذریعے تصور خدا سے اس فرار کو بڑی حکمت کے ساتھ رائج کیا جا رہا ہے اور یہ کام علم اور سائنس کے نام سے

کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس کے ہاں عالم الغیب کی کوئی گنجائش نہیں ہے' وہ صرف علم شہادت کو تسلیم کرتی ہے اور الوہیت اور ربوبیت کے جو تصورات ہیں' وہ عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں خدا کے تصور سے فرار اختیار کرنے والے اس چور دروازے سے نکل بھاگنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ سے تو نہیں ڈرتے البتہ عوام الناس سے ضرور ڈرتے ہیں' اور اس طرح عوام الناس کو دھوکہ دیتے ہیں۔

لیکن آج تک ان مغروروں کو اس کائنات کا یہ عظیم وجود' اس کی حرکت اور نہایت ہی منضبط قوانین گھیر رہے ہیں اور ان کا دل' ان کی عقل اور ان کا فطری احساس اور شعور اور ان کا وجدان ہر طرف سے ان کا پیچھا کرتے ہیں اور ان کو گھیرتے ہیں اور ان سے جواب طلب کرتے ہیں۔ اور قرآن کریم کا یہی فطری اسلوب استدلال ہے جو ان سے مخاطب ہے۔ اس کا یہ استدلال نہایت ہی سادہ اور مختصر ہے۔ نہایت ہی وسیع اور انسان کے ماحول پر چھایا ہوا ہے۔ اور نہایت ہی گہرا ہے۔ انسان کے دل کی گہرائی تک چلا گیا ہے اور اس کائنات کے قلب میں بھی موجود ہے۔

○○○

جو لوگ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور پھر بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں گزرتا کہ ان کو ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے اور وہ یہ ادراک نہیں کر سکتے کہ اس کائنات کا منطق اور اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ آخرت میں حساب و کتاب ہو گا' اور یہ کہ یہ دنیا ہی انجام نہیں ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں انسانیت معراج انسانیت تک نہیں پہنچ سکی' غرض وہ لوگ جو اللہ کی ان نشانیوں پر سے غفلت کے ساتھ گزرتے ہیں یا گزرنا چاہتے ہیں' ان کے دل میں تدبر کی تحریک نہیں ہوتی' ان کی عقل متفکر نہیں ہوتی' تو یہ لوگ' اس قسم کے لوگ کبھی بھی انسانی کمال اور عروج کے راستے پر نہیں چلتے اور نہ چلیں گے۔ اور یہ لوگ کبھی بھی جنت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ جنت تو مومنین اور صالحین کی منزل ہے۔ جو اس دنیا کی تھکاوٹوں اور محنتوں سے آزاد ہو کر اللہ کی حمد و ثنا کے لیے فارغ ہوں گے اور اللہ کی رضامندی کے حصول کے بعد خوش و خرم ہوں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ
اطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ﴿٧﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ
النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ
النَّعِيمِ ﴿٩﴾ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ
وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾ ۱ ۱۰ع ۲

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں' اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں' ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ

(اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے ۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنہوں نے ان صداقتوں کو قبول کر لیا جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا' نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی' وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ "پاک ہے تو اے خدا!" ان کی دعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

جو لوگ اس عظیم کائنات اور اس کی بوقلمونیوں پر غور و فکر کر کے اس نتیجے تک نہیں پہنچتے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے' ان کے ذہن میں یہ بات نہیں بیٹھتی کہ اس نظام کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کا یوم الحساب برپا ہو' جس میں ایک طرف تو دنیا کی بے انصافیوں اور مظالم کا انصاف ہو دوسری طرف انسانیت اس دنیا میں جس عروج تک نہیں پہنچ سکی وہاں وہ عروج حاصل کرے اور وہ اللہ کے سامنے حاضری کا کوئی یقین بھی نہیں رکھتے اور ان کی پوری اور تمام سرگرمیاں اس دنیا کی اسی زندگی تک محدود ہیں' باوجود اس کے کہ اس میں بے شمار نقائص اور پستیاں موجود ہیں اور وہ اسی دنیا میں غرق ہیں' ان کو اس میں کوئی نقص نظر نہیں آتا' اور وہ اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے کہ یہ حقیر دنیا انسان کی آخری منزل مقصود نہیں ہو سکتی' وہ دیکھتے ہیں کہ وہ اس دنیا کو چھوڑتے جا رہے ہیں حالانکہ ان میں سے ظالموں کو ان کے مظالم پر سزا نہیں دی گئی اور اچھے کام کرنے والوں کو ان کے کیے کا صلہ نہیں ملا' پھر انسان جس عروج و کمال کا متلاشی ہے وہ ابھی اسے حاصل نہیں ہوا ہے ۔ اور پھر وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو اقوام صرف دنیا کو ہی اپنا منتہائے مقصود بنا لیتی ہیں وہ اخلاقی لحاظ سے گرتی ہی چلی جا رہی ہیں کیونکہ وہ دنیا کی گندگیوں میں سر جھکائے ہوئے جا رہے ہیں' انسانیت کے ارفع مقام کے لیے انہوں نے کبھی سربلند ہی نہیں کیا' نہ ان کی نظریں کبھی افق بلند کی طرف اٹھی ہیں ۔ ان کے سر اور ان کی نظریں اس دنیا کی گندگیوں ہی کی طرف جھکے ہوئے ہیں اور اور جمی ہوئی ہیں ۔ وہ اس کائنات میں موجود آیات الٰہیہ سے غافل ہیں جو دل کو جگانے والی ہیں' احساس و شعور کو اٹھانے والی ہیں اور انسان کو ایک بلند نصب العین دینے والی ہیں ۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہے اور وہ بہت ہی برا انجام ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ (۷) اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸) (۱۰:۷ - ۸)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں' اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں' ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہو گا ان برائیوں کی پاداش مین جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے"۔

دوسری جانب وہ لوگ ہوں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے' انہوں نے یہ پا لیا کہ ایک جہاں ایسا بھی آنے والا ہے جو اس دنیا کی زندگی سے اعلیٰ و ارفع ہے' پھر انہوں نے اپنے اس ایمان کے تقاضے بھی پوری کیے' جس طرح اللہ نے اہل ایمان کو عمل صالح کرنے کا حکم دیا تھا اور ان اعمال کا اجر وہ آخرت میں چاہتے تھے تو

ایسے لوگوں کا انجام یہ ہو گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِىْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۱۰ : ۹) "اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنہوں نے ان صداقتوں کو قبول کر لیا جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا' نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی"۔

ان کے اس ایمان کی وجہ سے' جو ان کے اور ان کے خدا کے درمیان رابطے کا نام ہے' اللہ ان کو ہدایت دے گا' ان کی آنکھیں کھلی ہوں گی اور وہ صاحب بصیرت ہوں گے' ان کے تقویٰ' ان کے احساس اور ان کے ضمیر کی بیداری کی وجہ سے ان کو ہدایت ملے گی اور یہ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور جنت میں نہریں بہتی ہوں گی' پانی ہو گا اور پانی ہمیشہ سرسبزی اور تروتازگی کا ذریعہ رہا ہے' اب بھی ہے اور قیامت میں بھی ہو گا۔

یہ لوگ اس جنت میں کیا دلچسپیاں رکھیں گے اور ان کے مشاغل وہاں کیا ہوں گے؟ نہ مال اور نہ جاہ' نہ دفع مضرت کے لیے کوشاں ہوں گے اور نہ جلب منفعت کے لیے' ان چیزوں سے تو وہ نجات پا چکے ہوں گے۔ وہاں تو وہ سب کچھ پا چکے ہوں گے۔ ان کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ ہر شخص غنی ہو گا اور ان چیزوں سے ان کی سطح بلند ہو چکی ہو گی' ان کے مشاغل وہاں یہ ہوں گے۔ خوشی سے وہ ایک دوسرے کو پکاریں گے کہ اے اللہ تو پاک ہے اور ایک دوسرے پر سلامتی بھیجتے ہوں گے' اور سب کی آخری بات یہ ہو گی کہ سب تعریفوں کا مستحق اللہ ہی ہے جو رب العالمین ہے۔

دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۰ : ۱۰) "وہاں ان کی صدا یہ ہو گی کہ "پاک ہے تو اے خدا"' ان کی دعا یہ ہو گی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

یہاں دنیا کے مشاغل اور پریشانیوں سے مطلق رہائی ہو جائے گی' انسان دنیا کی ضرورتوں اور محتاجیوں سے بالا ہو گا' بے نیاز ہو گا' اور اللہ کی رضامندی' تسبیح اور حمد کے ترانوں میں مگن ہو گا اور ہر پہلو سے انسان مقام کمال کو چھو رہا ہو گا' اخلاقی' روحانی اور جسمانی پہلوؤں سے۔

○○○

اب قرآن ایک دوسرا موضوع لیتا ہے' منکرین کی طرف سے بار بار چیلنج دیا جاتا تھا کہ حضورؐ جس برے انجام سے ڈراتے ہیں وہ ہم پر لاتے کیوں نہیں؟ بتایا جاتا ہے کہ نزول عذاب اس لیے مؤخر ہو رہا ہے کہ اس کے لیے سنت الٰہیہ میں ایک وقت مقرر ہے اور یہ اللہ کی نہایت ہی مہربانی ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے۔ لیکن جب یہ آئے گا تو منظر کیسا ہو گا؟ جب عذاب آتا ہے تو انسان کی فطرت سے غبار دھل جاتا ہے' زنگ صاف ہو جاتا ہے اور یہ فطرت اپنے خالق حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ مشکلات دور ہو جاتی ہیں تو انسان بدستور غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کو ام

سابقہ کی بربادیوں کی طرف بھی متوجہ کیا جاتا ہے ۔ جن کے قصے زبان زدعام تھے اور بتایا جاتا ہے کہ تمہارا انجام بھی ایسا ہو سکتا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ دنیا تو دارالابتلاء ہے ' دارالجزاء آنے والی ہے ۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۚ
فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا مَسَّ
الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ
ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾
ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ برا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ دنیا کی بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مہلت عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی ۔ (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لیے ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوٹ دے دیتے ہیں ۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے ' مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا ۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں ۔ لوگو ' تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا ۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں ۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے ' تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔

مشرکین عرب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ چیلنج دیتے رہتے تھے کہ اگر وہ سچے ہیں تو ان پر وہ عذاب نازل کر دیں ' جس سے وہ ہمیں ڈراتے رہتے ہیں ۔ اور اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبے کو صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے ۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اور وہ کہتے تھے کہ یہ وعدہ کب ہو گا اگر تم سچے ہو؟) اور دوسری سورتوں میں یہ چیلنج یوں آیا ہے ۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ (اور یہ لوگ

اچھائی سے پہلے تم سے برائی کا مطالبہ کرتے ہیں' حالانکہ ان سے پہلے کئی مثالیں گزر چکی ہیں) اور قرآن کریم نے ان کی اس بات کو ان الفاظ میں بھی نقل کیا ہے۔ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۸: ۳۲) (جب انہوں نے کہا اے اللہ اگر یہی حق پر ہے آپ کی طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ"۔ یہ تمام باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اللہ کی اس ہدایت سے کس قدر عناد رکھتے تھے لیکن اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان کو مہلت دے۔ لہٰذا اللہ ان پر ایسا عذاب نازل نہیں فرما رہا تھا جو ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا اور ان کو ہلاک کر دیتا۔ جس طرح اللہ نے ان سے قبل دوسری اقوام کے ساتھ کیا۔ کیونکہ اللہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی اکثریت آخر میں دین کو قبول کرنے والی ہے۔ اس کی خدمت کرنے والی ہے' اور اسے لے کر اس پورے کرۂ ارض پر پھیلانے والی ہے۔ اور فتح مکہ کے بعد عملاً ایسا ہوا بھی۔ لیکن چیلنج دیتے وقت لوگوں کی نظروں میں تو یہ بات نہ تھی' ان کو پتہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر خیر و برکت کا کس قدر فضل عظیم کرنے والا ہے' جبکہ وہ شر کا اس طرح مطالبہ کر رہے ہیں جس طرح انسان بھلائی کے لیے جلدی میں کرتا ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۰: ۱۱) "اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ برا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ دنیا کی بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مہلت عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی۔ (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لیے ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوٹ دے دیتے ہیں"۔

یعنی وہ عذاب کا مطالبہ کرنے میں جلدی کر رہے ہیں' اس طرح کہ جس طرح انسان بھلائی کے لیے جلدی کرتا ہے اور اللہ بھی اگر ان کے معاملے میں ایسی ہی جلدی کرتا اور ان کے چیلنج کو منظور کر لیتا تو ان کا کام کبھی کا تمام ہو چکا ہوتا۔ لیکن اللہ نے اپنی تقدیر میں ان کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا ہے' ان کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اللہ ان کو متنبہ بھی کرتا ہے کہ یہ جو مہلت انہیں دی جا رہی ہے اس کے پیچھے جو خطرہ ہے اس سے وہ غافل نہ ہوں کیونکہ جن لوگوں نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا' اپنی سرکشیوں ہی میں بھٹکتے پھریں گے اور جب ان کا وقت اس حالت میں آگیا تو وہ خسارے میں رہ جائیں گے۔

اب یہاں ایک نفسیاتی تصویر دی جاتی ہے کہ انسان شر کا مطالبہ کرنے میں تو بڑا دلیر ہے لیکن جب مصیبت آ جاتی ہے تو اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت وہ نہیں ہوتی جس میں وہ مصیبت کا مطالبہ کر رہا تھا اور جب یہ مصیبت دور کر دی جائے تو یہ پھر کس طرح فوراً بدل جاتا ہے۔ ذرا اس کے مزاج کے اس تضاد کو دیکھو۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(۱۰ : ۱۲) "انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے 'مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں"۔

یہ نہایت ہی بدیع اور انوکھی تصویر ہے۔ان انسانی نمونوں کی جو ہماری سوسائٹی میں رات اور دن دکھائے جاتے ہیں اور چلتے پھرتے ہیں۔ درحقیقت انسان زندگی کے حالات میں بہتا چلا جاتا ہے 'غلط کاریوں 'گناہوں' سرکشیوں اور اسراف میں ڈوبا ہوا 'کیونکہ وہ صحت مند ہوتا ہے 'حالات اس کے لیے سازگار ہوتے ہیں 'خوشحالی اسے سب کچھ بھلا دیتی ہے ' مالداری کا احساس سرکش بنا دیتا ہے۔لیکن جب اس پر کوئی مصیبت آ جاتی ہے تو یہ یک دم جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ راتوں کو دست بدعا ہوتا ہے۔اس کی امیدوں کا میدان وسیع ہو جاتا ہے ' مصیبت میں بہت تنگدل ہوتا ہے اور جلدی سے آسانیاں چاہتا ہے۔لیکن جب اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے ' مصیبت دور ہو جاتی ہے تو اب آپ دیکھیں گے کہ وہ اسی سابقہ روش کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بالکل پیچھے کی طرف نہیں دیکھ رہا ہے 'کوئی غور و فکر نہیں ہے 'کوئی نصیحت آموزی نہیں ہے اور پھر برائی کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔الا یہ کہ بعض اللہ کے بندے اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ جن پر اللہ کا رحم ہو چکا ہوتا ہے۔وہ قوت اور مالداری کے وقت بھی غربت اور ضعیفی کو یاد کرتے ہیں۔

سیاق کلام میں بری حالت کو بیان کرتے وقت ذرا طوالت اختیار کی گئی ہے۔اور یہ اس نمونے کی نفسیاتی حالت کی صحیح تصویر ہے۔کیونکہ وہ بھی برے دنوں کو بہت ہی طویل محسوس کرتا ہے۔اس لیے قرآن کریم بھی اس کا بیان قدرے طویل کرتا ہے۔

دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا (۱۰ : ۱۲) "تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے"۔
یوں اس کی ہر حالت ' ہر ہیئت اور ہر منظر کو سامنے تفصیل کے ساتھ لایا جاتا ہے تاکہ انسان کے اس موقف کی تصویر کشی کی جائے ' اس وقفے میں اس کی جسمانی رفتار رک گئی ہے 'اس کے مالی معاملات اور اس کی قوت کے مظاہر موقوف ہیں 'اس طرح جب سیلاب کی رفتار کو کوئی بند روک دیتا ہے ' یہ سیلاب اور یہ موج دریا رک جاتی ہے یا واپس ہو جاتی ہے اور جب یہ رکاوٹ دور ہو جائے تو یہ موج پھر رواں دواں ہوتی ہے۔اب صرف ایک لفظ استعمال ہوا ہے (مر) لیکن یہ اس حرکت رفتار اور تسلسل کا اظہار کر دیتا ہے جو ایک غافل انسان اس وقفے سے قبل اور بعد جاری رکھ رہا ہوتا ہے 'اب وہ چل پڑتا ہے 'نہ شکر خداوندی ہے۔نہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور نہ غور و فکر کر کے کوئی عبرت لیتا ہے۔

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ (۱۰ : ۱۲) "ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا"۔یہ زندگی کی موجوں کے ساتھ آگے بڑھتا جاتا ہے 'اس کی رفتار کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے 'نہ کوئی منع کرنے والا راستے میں ہے 'نہ از خود اس کے ذہن میں کوئی پرواہ ہے۔

اس مزاج کے لوگ ' جو مصیبت کے وقت تو عاجزی و زاری کرتے ہیں اور جب مصیبت ٹل جائے تو اکڑ کر پھر سابقہ

روش پر چل پڑتے ہیں - یہ مسرفین ہیں اور یہ اپنے اسراف میں آگے جا رہے ہیں اور ان کو احساس نہیں ہوتا کہ وہ حد سے گزر رہے ہیں - ایسے لوگوں اور مسرفین کی روش ایک جیسی ہوتی ہے -

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۰: ۱۲) (اسی طرح حد سے گزرنے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں)

ذرا غور کرو کہ ان مسرفین کا انجام قرون اولیٰ میں کیا ہوا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۰: ۱۳) "لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں"۔

اسراف کی وجہ سے یہ لوگ حد سے گزر گئے اور انہوں نے ظلم اور شرک شروع کر دیا۔ اس لیے ہلاک کر دیئے گئے اور جزیرۃ العرب میں ان کے آثار اب بھی موجود ہیں - قوم عاد، ثمود اور قوم لوط کی بستیاں۔ ان بستیوں کے پاس ان کے رسول روشن دلائل لے کر آئے تھے جس طرح اے اہل عرب تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ واضح دلائل لے کر آئے ہیں، لیکن انہوں نے مان کر نہ دیا۔ نہ انہوں نے ایمان لانا تھا؟ کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے ایمان کی راہ ہی نہ اپنائی، انہوں نے تو اپنے اختیار سے سرکشی کی راہ اختیار کی۔ اس لیے وہ ایمان کے لیے اہل ہی نہ رہے اور ان کو مجرموں کے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

اہل مکہ کو بتایا جاتا ہے کہ جب اقوام سابقہ کا انجام ایسا رہا تو لازماً تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہو گا کیونکہ تم لوگ ان لوگوں کے صحیح جانشین ہو، لہٰذا تمہارا بھی وہی انجام ہو گا جو ان کا ہو چکا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰: ۱۴)

"اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ یہ بات اور یہ تصور انسان کے دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کہ انسان یہ بات پالے کہ وہ اس زمین پر بطور جانشین آیا ہے۔ اس سے قبل اس زمین کے مالک و مختار کچھ اور لوگ تھے، ان کو زوال نصیب ہوا اور وہ اسی طرح ان کی جگہ اقتدار میں آیا ہے، اور یہ کہ یہ اقتدار اس سے بھی جانے والا ہے۔ یہ تو چند دن ہیں جو اسے دیئے گئے ہیں بطور آزمائش، اس کی آزمائش ہو رہی ہے اس کا بھی محاسبہ ہونے والا ہے اور بہت ہی جلدی ہونے والا ہے۔

یہ ہے وہ قیمتی تصور جو اسلام ہر انسانی دل میں بٹھانے والا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اسلام یہ حقیقت انسان کے قلب میں بٹھانا چاہتا ہے، اس لیے اسے دھوکہ نہیں دیتا۔ اسلام لوگوں کے دل میں ایک احساس بیدار کر دیتا ہے۔ یہ خدا خوفی کا احساس ہے اور یہی احساس اس سوسائٹی کے امن و امان اور خوشحالی اور خوش اسلوبی کا ذمہ دار ہوتا ہے جس میں

ایک مومن رہتا ہے۔

یہ شعور کہ اس دنیا میں انسان نے مقرر دن گزارنے ہیں اور جس طرح گزارنے ہیں اس کے بارے میں اس سے باز پرس ہونے والی ہے' اس کی ہر مملوک چیز کے بارے میں' اس کے تمام مال و متاع کے بارے میں اور اس کی جان و اولاد کے بارے میں بھی' اس احساس و شعور کی وجہ سے ایک انسان پیدا ہو جاتا ہے' اور وہ کسی کے بھلاوے میں نہیں آتا۔ اس احساس کی وجہ سے وہ دنیا کے عیش و عشرت میں مست نہیں ہو جاتا' بلکہ وہ عیش و عشرت اور اس دنیا کے لیے حرص و لالچ سے بھی بچ جاتا ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کو امتحان سمجھتا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے والا دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۰ : ۱۴) (تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو) اس طرح انسان چوکنا ہو جاتا ہے' ڈرنے لگتا ہے' اچھائی کی طرف شدت سے مائل ہو جاتا ہے' اور وہ ہروقت نجات اخروی کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ یہ ہے فرق اس نظام تربیت کا جو اسلام کے پیش نظر ہے اور ان تصورات کا جو اسلام نہایت ہی موثر اشارات اور موثر یاد دہانیوں کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ اور اس سیکولر نظام تربیت کا جو انسان کو ان تصورات سے غافل بناتی ہیں' اور لوگوں کے دل سے احساس جوابدہی اور آخرت کے حساب و کتاب سے منکر بناتی ہیں۔ یہ دونوں نظامہائے تربیت ایک دوسرے سے اس قدر دور ہیں کہ ان کے درمیان باہم ملنے کا کوئی مقام نہیں ہے۔ دونوں تصورات اور نظام دو مختلف قسم کے انسان تیار کرتے ہیں۔

انسانی زندگی کا اسلامی تصور ایک جامع اور باہم پیوست نظام ہے۔ جس کی تمام بنیادوں اور جس کے تمام اصول باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں' یہاں ہمارے لیے یہ بات کافی ہے کہ ہم اسلامی تصورات حیات کے اس اساسی فرق کو واضح کر دیں اور اس اساسی تصور کے اوپر جو عمارت اٹھتی ہے' جو سوسائٹی تیار ہوتی ہے' جو افراد اور جو معاشرہ تیار ہوتا ہے اس کے فرق کو واضح کر دیں۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ دو قسم کے معاشرے باہم پیوست ہو جائیں اور مل جائیں۔ نہ دونوں کے نتائج ایک طرح کے ہو سکتے ہیں۔

جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اسلامی طرز زندگی میں کسی دوسرے نظام کے متعین کردہ طرز زندگی کا پیوند لگایا جا سکتا ہے اور یہ سمجھتے نہیں کہ اسلامی طرز زندگی کی عمارت جن بنیادوں پر رکھی ہوئی ہے وہ ان بنیادوں کے سراسر متضاد ہیں جن کی اساس پر کوئی بھی جاہلی نظام استوار ہوتا ہے وہ لوگ دراصل اسلامی نظام کی نوعیت اور جاہلیت کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں ہوتے۔

○○○

اب یہاں سیاق کلام ایک کروٹ لیتا ہے' بات کا رخ ان کے بعض اعمال کی طرف مڑ جاتا ہے کہ جب ہلاکت یافتہ اقوام کی جگہ تمہیں آباد کیا گیا تھا تو تم نے کیا کیا؟ کیا تم نے حق خلافت ادا کر دیا؟

وَ إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ

أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾
قُلْ لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ
عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ
كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ
اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ ۚ
قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ وَ
تَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَ
لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾ وَ
يَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا
إِنِّي مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ ع ۲/۱۰/۷

"جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ "اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو"۔ اے نبیؐ، ان سے کہو "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے" اور کہو "اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے"۔

یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے نبیؐ، ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟" پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے ۔ بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیے ' اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہو تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا ۔

اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس نبیؐ پر اس کی رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی ' تو ان سے کہو "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے ' اچھا انتظار کرو ' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں" ۔

اس زمین پر ان لوگوں کو ہلاک شدہ لوگوں کا وارث بنانے کے بعد ان کا طرز عمل کیسا رہا ' وہ ایسا تھا اور رسول کے اللہؐ کے ساتھ وہ کیا سلوک کر رہے تھے ' وہ یہ تھا:

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰:۱۵) "جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ' کہتے ہیں کہ "اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو" ۔ ان کی جانب سے یہ ایک عجیب مطالبہ تھا ' یہ کوئی سنجیدہ مطالبہ نہ تھا ۔ یہ محض مذاق اور کھیل تھا ۔ نیز اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ کرنے والے لوگ قرآن مجید کی سنجیدہ تعلیمات سے بے خبر تھے اور قیامت کے منکر تھے ۔ کیونکہ ایسے مطالبات وہی شخص کر سکتا ہے جو قیامت کے دن پر یقین نہ رکھتا ہو ۔

یہ قرآن تو دراصل مکمل دستور حیات ہے ' یہ اس قدر جامع ہے کہ انسانوں کی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرتا ہے خواہ وہ مسائل انفرادی ہوں یا اجتماعی ۔ یہ دستور انسانوں کی استطاعت کے مطابق اس زندگی میں بھی انسانوں کو ترقی دیتا اور آخرت میں تو یہ نظام مکمل کامیابی کا ضامن ہے ' جو شخص اس قرآن کو اس کی حقیقت کے مطابق سمجھ لے وہ پھر اس دستور حیات سے آگے کسی اور چیز کا طالب نہیں رہتا ' نہ اس کے اجزاء کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کر سکتا ہے ۔

غالب گمان یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے سامنے پیش ہونے کا یقین نہیں رکھتے ' وہ اس کو مہارت کا مسئلہ سمجھتے تھے ' جاہلیت میں وہ اپنے بازاروں اور میلوں میں فصیح ترین کلام پیش کرنے کے مقابلے کیا کرتے تھے ' اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک ماہر فن شخص ہیں جو اس قرآن کی جگہ دوسرا لا سکتے ہیں ' ان کے لیے کیا مشکل ہے ۔ ورنہ اس میں ترمیم کرنا تو کوئی مشکل کام ہی نہیں ہے ۔

قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآیِٔ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۰:۱۵) "اے نبیؐ ' ان سے کہو "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں ۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے ۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے" ۔

مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن کوئی کھیل تماشا نہیں ہے ' نہ یہ کسی ماہر فن کا کلام ہے ' یہ تو مدبر کائنات کی جانب سے ایک مکمل دستور حیات ہے ۔ یہ مکمل اس لیے ہے کہ خالق کائنات انسان کی ضروریات اور مصلحتوں سے زیادہ واقف

ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی جانب سے اس میں تبدیلی کر دیں۔ رسول اللہ کا مقام تو صرف یہ ہے کہ آپ پر جو کلام نازل ہوتا ہے آپ اسے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں اور اگر وہ اس میں کوئی بھی تبدیلی کریں گے تو وہ یوم عظیم کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰: ۱۶) "اور کہو اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں' کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟" یہ تو اللہ کی جانب سے وحی ہے' اور تم تک اس کا پہنچانا بھی اللہ کا حکم ہے' اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ میں نہ پڑھوں تو میں نہ پڑھتا' اگر اللہ چاہتا کہ میں تمہیں اس کی تعلیم نہ دوں تو ہرگز نہ دیتا' غرض اس قرآن کے نازل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کے تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اے پیغمبرؐ ان سے یہ باتیں کہہ دیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ اس تلاوت و تبلیغ سے پہلے بھی میں ایک عرصہ تک تمہارے اندر زندگی بسر کر چکا ہوں' پورے چالیس سال تک اور میں نے اس قرآن کا کوئی حصہ تمہارے سامنے نہیں پڑھا کیونکہ تم ایسا نہیں کر سکتے تھے' تمہارے اوپر یہ نازل ہی نہ ہوا تھا۔ اگر تم بذات خود ہی یہ بنانے والے تھے تو کیوں نہ تم نے ایسا کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وحی من جانب اللہ ہے اور آپ کا فریضہ اور کردار یہی ہے کہ آپ اسے لوگوں تک پہنچائیں گے۔

اے پیغمبر ان سے کہہ دے کہ میں اللہ پر یہ افترا کیسے باندھ سکتا ہوں کہ اس نے میری طرف وحی بھیجی ہے اور درآں حالیکہ کہ اس نے نہ بھیجی ہو۔ یہ تو اللہ پر جھوٹ ہو گا اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ

(۱۰: ۱۷) "پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے"۔ یہ کیسے ہو سکتا؟ میں تو تمہیں منع کرتا ہوں کہ اللہ کی آیات کی تکذیب نہ کرو' خود میں اللہ پر جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں کیونکہ ہر جھوٹ بولنے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب سیاق کلام ان کے اعتقادات اور مقولات میں سے چند یہاں پیش کرتا ہے کہ اللہ نے دوسری اقوام کو ہلاک کر کے زمین پر ان کو آباد کیا اور یہ اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ قرآن کی تکذیب کر کے اسے بدل دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا

یُشْرِکُوْنَ (۱۰:۱۸) "یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع' اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے نبی' ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟" پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

جب ایک انسان کی سوچ غلط راہوں پر پڑ جاتی ہے تو وہ پھر کسی حد پر بھی جا کر رکتی نہیں۔ یہ لوگ بتوں کو پوجتے ہیں جو ان کے ارباب ہیں' ان کی حالت یہ ہے کہ وہ ان کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان لیکن ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں یہ بت شفاعت کریں گے۔

یَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (۱۰:۱۸) (یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہوں گے) اللہ کے علم میں تو یہ بات نہیں ہے کہ اس کے ہاں کوئی شفاعت کرنے والا ہے۔ یعنی دراصل کسی شفیع کا کوئی وجود نہیں ہے' اگر ہوتا تو اللہ کو اس کا علم ہوتا۔

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ (۱۰:۱۸) (کہہ دو تم اللہ کو اس بات کی اطلاع دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں) یہ ایک مذاقیہ انداز کلام ہے' اور ان لوگوں کی گھٹیا سوچ کے عین مطابق ہے' لیکن آخر میں اللہ کی ذات کی پاکی کی سنجیدہ وضاحت کر دی جاتی ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۱۰:۱۸) (پاک ہے وہ اور بالاتر اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں) اس سے قبل کہ ان کے قول و فعل پر تبصرہ کیا جائے یہاں بتا دیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت اصل میں توحید پر ہوتی ہے۔ شرک اس پر عارضی طور پر لاحق ہونے والی بیماری ہے۔ عقائد کے اختلاف بعد کی پیداوار ہے' اصل میں لوگ عقیدہ توحید پر تھے۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰:۱۹) (ابتداء سارے انسان ایک ہی امت تھے' بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیے)۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کو ایک مقررہ وقت تک مہلت دی جائے تاکہ وہ مہلت کے وقت کو پورا کر لیں اور یہ فیصلہ اللہ نے پہلے چونکہ کر دیا ہے' اس لیے اب اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے' کیونکہ اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہے۔

وَلَوْلَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ (۱۰:۱۹) "اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا"۔

اب بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا موقف کیا ہے؟

وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَکُمْ

مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (۱۰: ۲۰) "اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس نبیؐ پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی' تو ان سے کہو "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے' اچھا انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔
کیا ان لوگوں کے لیے وہ معجزات اور دلائل کافی نہیں ہیں جن سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔کیا اس عظیم کائناتی نظام اور کارخانہ قدرت میں جو دلائل و براہین ہیں وہ ان کے لیے کافی نہیں ہیں۔ یہ لوگ ایسے خوارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں جس طرح امم سابقہ کو دکھائے گئے حالانکہ یہ لوگ امت محمدیہ کی نوعیت سے خبردار نہیں ہیں۔ یہ لوگ ان معجزات کو سمجھ نہیں پا رہے جن کا ظہور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعے ہو رہا ہے۔ یہ تو کوئی وقتی معجزہ نہیں ہے کہ اسے فقط ایک نسل دیکھ لے' یہ ایک دائمی معجزہ ہے' جو ہر آنے والی نسل کے عقل و خرد کو خطاب کر رہا ہے اور قیامت تک یہ معجزہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کے حوالے کر دے جو غیب کو جانتا ہے اور وہی اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ان کے لیے کسی معجزے کا صدور کر دے یا نہ کرے۔کہو :"غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے' اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

یہ ایک ایسا جواب ہے جس کے اندر مہلت بھی ہے اور دھمکی بھی ہے۔ اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک بندے کو کیا آداب اختیار کرنے چاہئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کے سردار ہیں' ان کو غیب کا علم نہیں دیا گیا' غیب کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے' لوگوں کے معاملات کے اختیارات ان کو نہیں دیئے گئے۔ تمام امور تو اللہ کے حوالے ہیں۔ یوں دربار الوہیت میں بندے کی حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے اور اللہ اور بندے کے درمیان ایک واضح خط فاصل کھینچ دیا جاتا ہے کہ یہ ہے بندے کا مقام اور یہ ہے اللہ کا مقام۔

ooo

قرآن کے مخاطبین اولین کے اقوال و افعال پر تبصرے کے بعد اب بعض انسانوں کے خصوصی مزاج پر تبصرہ کیا جاتا ہے' کہ جب ایسے لوگوں کو مشکلات کے بعد فراخی نصیب ہوتی ہے' اس سے قبل یہ کہا گیا تھا کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے تو وہ کیا کرتے ہیں' یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب مصیبت کے بعد آسانیاں آ جاتی ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ انسان کی اس کمزوری کو انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی تمثیل سے سمجھایا جاتا ہے' لیکن یہ تمثیل بھی قرآنی اسلوب کے عین مطابق زندہ اور متحرک تمثیل ہے۔ ذرا غور سے پڑھیں :

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ
مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا
يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا
كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ

عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ۬ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

"لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے کہو "اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے' اس کے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں"۔ وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر باد موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے' اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے"۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو' تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔ دنیا کی زندگی کے چند روزہ مزے ہیں (لوٹ لو)' پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو"۔

انسانی زندگی کا تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ انسان خدا کو مشکل اوقات میں یاد کرتا ہے۔ وہ ان مشکل اوقات میں فطرت کی طرف لوٹتا ہے۔ جب وہ کربناک حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی فطرت پر جو پردے پڑ چکے ہوتے ہیں وہ ہٹ جاتے ہیں' لیکن جب وہ پرسکون حالات میں ہوتا ہے تو یا تو وہ بھول جاتا ہے اور یا پھر وہ سرکشی کرتا ہے یعنی یا غافل ہے اور یا سرکش۔ وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے ہدایت نصیب ہو جائے تو یہ لوگ ہر وقت امتثال حکم کے لیے تیار رہتے ہیں' ان کا ایمان ہر وقت تر و تازہ رہتا ہے۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِیٓ

اٰيَاتِنَا (۱۰ : ۲۱) "لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالبازیاں شروع کر دیتے ہیں"۔ قوم فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ جب بھی ان پر کوئی مصیبت آئی' انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دعا کرائی اور وعدہ کیا کہ اگر اللہ نے مشکلات دور کر دیں تو وہ کافرانہ رویہ ترک کر دیں گے اور جب مشکلات دور ہو گئیں اور ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہونے

لگیں اور وہ مزے میں ہو گئے تو انہوں نے اللہ کی ان رحمتوں اور انعامات کی کوئی اور تاویل کرنا شروع کر دی' انہوں نے یہ کہا کہ یہ تو اس وجہ سے اور فلاں وجہ سے یہ مصیبت ٹل گئی ہے۔ اسی طرح جب قریش پر مصیبت آگئی اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اب لوگ مرنا شروع ہو جائیں گے تو یہ پورا قبیلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آیا اور برادرانہ تعلقات کا واسطہ دے کر کہا کہ آپ خدا سے رحم کی اپیل کریں اور جب آپ نے دعا فرمائی اور مشکلات دور ہوئیں تو اہل قریش اپنی سابقہ روش پر اتر آئے اور وہی کافرانہ اور ظالمانہ رویہ جاری رکھا۔

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۱۰ : ۲۱) "ان سے کہو" اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے' اس کے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں"۔ اللہ کے پاس بہت سی تدابیر ہیں' وہ ان کی تدابیر اور سازشوں کو باطل کر سکتا ہے' اس کی نظروں میں ہیں وہ تمام سازشیں' جو یہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ریکارڈ بھی تیار ہو رہا ہے۔

اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ (۱۰ : ۲۱) (تم جو مکاریاں کرتے ہو ہمارے نمائندے لکھ رہے ہیں) لہٰذا کوئی چیز مخفی نہیں ہے' کوئی چیز بھلائی بھی نہیں جا سکتی اور یہ کہ اللہ کے یہ نمائندے کون ہیں اور کس طرح لکھتے ہیں' تو یہ ایک غیبی معاملہ ہے' ہمیں اس کی حقیقت صرف اس قدر معلوم ہے جو اس آیت میں آئی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہئے کہ ہم کسی تاویل کے بغیر اسے قبول کر لیں۔

اب ایک زندہ اور متحرک منظر آتا ہے' یہ منظر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا ابھی نظروں کے سامنے واقعہ ہو رہا ہے' آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں' شعور اس کا پیچھا کر رہا ہے' دل واقعات کے ساتھ ساتھ دھڑکتا ہے۔ اس کا آغاز اس اعلان سے ہوتا ہے کہ اس کائنات کی حرکت اور سکون دونوں پر قدرت الٰہیہ کنٹرول کرتی ہے' وہی تمہیں خشکی و تری میں چلاتی ہے' بحروبر پر اسی کا کنٹرول ہے۔

هُوَ الَّذِىْ يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۱۰ : ۲۲) (وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے) اس پوری سورہ میں اس قسم کے مناظر جابجا بتائے گئے ہیں کہ یہ پوری کائنات اللہ کے کنٹرول میں ہے اور اس کنٹرول میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔

حَتّٰى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ (۱۰ : ۲۲) (چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر چلتے ہو) اب ہم اس منظر کے قریب ہیں اور کشتی سفر کے لیے تیار ہے۔

وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ (۱۰ : ۲۲) (باد موافق سفر کر رہے ہوتے ہو) اب یہ کشتی نہایت سکون کے ساتھ سطح سمندر کو چیرتی ہوئی جا رہی ہے۔

وَّفَرِحُوْا بِهَا (۱۰ : ۲۲) (اور وہ شاداں اور فرحاں ہیں) لیکن اس خوشی اور مسرت کے ماحول پر

ایک سرپرائز آتی ہے اور ان خوشیوں میں مست لوگوں کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔

جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ (۱۰ : ۲۲) (اور پھر یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے) اور ایک خوفناک افراتفری ماحول پر چھا جاتی ہے۔

وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (۱۰ : ۲۲) (اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں) اب یہ کشتی ڈول رہی ہے' اس کے سواروں کے درمیان عظیم اضطراب برپا ہے' موجوں کے تھپیڑے اسے مار رہے ہیں اور موجیں اسے اوپر چڑھاتی اور نیچے گراتی ہیں اور یہ سمندر کے آگے اس طرح ہے جس طرح سطح سمندر پر ایک چھوٹا سا پر۔ اور سوار اب اس قدر پریشان ہیں کہ ان پر یقین ہو چلا ہے کہ مارے گئے۔

وَّ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ (۱۰ : ۲۲) (اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے) اور اب نجات کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ اب ایسے حالات ہیں جبکہ مسافر امواج کے تلاطم میں گھرے ہوئے ہیں' ہولناک حالات ہیں' اب ان کی فطرت پر پڑے ہوئے تمام پردے یکلخت اتر جاتے ہیں اور ان کے دل و دماغ پر غلط افکار کا چڑھا ہوا زنگ یکلخت صاف ہو جاتا ہے اور اب خالص انسانی فطرت کے سامنے' اور صرف اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتی ہے۔ اب سب لوگوں کے چہرے آسمانوں کی طرف ہیں اور ہاتھ بلند ہیں:

دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ

(۱۰ : ۲۲) "اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے"۔ اچانک سخت ہوا تھم جاتی ہے۔ موجیں آہستہ آہستہ اتر جاتی ہیں' لوگوں کے چہروں پر اب اطمینان کے آثار لوٹ رہے ہیں۔ پھڑپھڑانے والے دل اب نارمل ہوتے جا رہے ہیں اور کشتی پھر سے ساحل کی طرف رواں دواں ہے۔ لوگوں کو یقین ہو چلتا ہے کہ زندگی بچ گئی' اب وہ قدم رکھتے ہیں ساحل پر' قدم رکھتے ہی ایک اور انقلاب:

فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۱۰ : ۲۳) (مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں) یہ ہے اچانک انقلاب قلب و نظر۔ یہ ایک مکمل منظر ہے' اس منظر کی کوئی حرکت اور اس کے کرداروں کی کوئی سوچ ہم سے پوشیدہ نہیں رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہے' لیکن زندہ واقعہ۔ اور یہ ایک ایسا منظر ہے کہ ہر دور میں اس قسم کے انسان اس کے کردار ہوتے ہیں اور یہ منظر پیش آتا رہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پر تبصرہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (۱۰ : ۲۳) (لوگو' تمہاری یہ بغاوت تمہارے ہی

خلاف پڑ رہی ہے) یہ بغاوت و سرکشی خود تمہارے خلاف پڑے گی - خود تمہارے اپنے نفس کے خلاف کہ تم اسے ہلاکت میں ڈال رہے ہو اور اس کو ایسی مصیبتوں میں ڈال رہے ہو کہ انجام شرمندگی ہو گا' یا تمام معاشرے ' تمہارے اپنے معاشرے پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے 'کیونکہ بغاوت کرنے والے اور اس کی اجازت دینے والے دونوں اس کی زد میں آئیں گے اور نتائج بھگتیں گے -

بغاوت اور سرکشی کی بدترین صورت وہ بغاوت ہے جس کا علم خدا تعالیٰ کے حق حاکیت کے خلاف بلند کیا جائے اور اس کرۂ ارض پر اللہ کو حاکم اور اس کی شریعت کو نظام اور قانون تسلیم نہ کیا جائے -

جو لوگ اللہ کی حاکیت اور اس کی ربوبیت اور شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں' وہ آخرت کے عذاب جہنم سے بھی پہلے یہاں اس دنیا کو بھی اپنے لیے جہنم بنا لیتے ہیں - وہ اس دنیا کو اس طرح جائے فساد بنا لیتے ہیں کہ جس سے کوئی شخص مامون اور محفوظ نہیں رہتا - اور انسانی سوسائٹی سے ...... انسان کی شرافت اور اس کا وقار ختم ہو جاتا ہے -

لوگ یا تو اپنا نظام زندگی خالص اللہ کی شریعت کے مطابق بنا کر اللہ کی حکومت کو تسلیم کریں گے ورنہ ان پر اللہ کے نافرمانوں کی حکومت مسلط ہو گی --- اور جو لوگ اس کرۂ ارض پر اللہ کی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں وہ دراصل انسان کی انسانیت ' اس کی کرامت اور اس کی خیریت اور وقار کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں - وہ ان اعلیٰ اقدار کے لیے لڑ رہے ہیں جن کے قیام سے انسان کی انسانیت بلند ہوتی ہے اور انسان گندگیوں ' ناپاکیوں اور آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے اور انسانی معاشرہ بھی ان گندگیوں سے پاک ہوتا ہے -

لوگو ' یہ تمہاری بغاوت خود تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے اور یہ حرکت تم دنیاوی زندگی کی خاطر کرتے ہو جبکہ

مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۰ : ۲۳)

" دنیا کی زندگی کے چند روزہ مزے ہیں (لوٹ لو) ' پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے ' اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو" - تو اس دنیا کی بدبختی اور تلخیوں کے بعد آخرت میں بھی تمہیں حساب و کتاب دینا ہو گا - اور ناکامی پر دائمی تلخی تمہارے نصیب میں ہو گی -

---ooo---

اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ اس پوری دنیاوی زندگی کی حقیقی قیمت کیا ہے؟ اس زندگی کے ساز و سامان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بھی قرآن کریم ایک ایسی تصویر کشی کی صورت میں پیش کرتا ہے ' جو زندگی اور حرکت سے مالا مال ہے ' قرآن اپنے اسلوب کے مطابق ' روز مرہ واقعات کو زیر غور لاتا ہے - یہ مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے ہیں مگر ہم ان کے دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا -

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ط

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَ ازَّیَّنَتۡ وَ ظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَیۡهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا لَیۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِیۡدًا کَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

”دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار' جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں' خوب گھنی ہو گئی' پھر عین اس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں' یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں“۔

یہ دنیاوی زندگی' جس میں لوگوں کا حصہ صرف سامان زندگی ہے' جب لوگ اس میں مگن ہو جاتے ہیں' پس اسی کے لیے ان کا قیام و قعود ہوتا ہے اور اس سے اعلیٰ و ارفع مراتب کے لیے وہ کوئی جدوجہد نہیں کرتے جو زیادہ باعث عزت اور زیادہ باقی رہنے والے ہوتے ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے' کہ آسمان سے سے پانی برستا ہے۔ اس سے ہری بھری فصلیں گھنی ہو جاتی ہیں اور یہ زمین اس قدر خوبصورت ہو جاتی ہے جس طرح دلہن کا کمرہ۔ اور لوگ خوش و خرم ہوتے ہیں اور اس امید میں ہوتے ہیں کہ انسانوں اور جانوروں کے کھانے کی فصل' اب وہ اٹھالیں گے اور شاید یہ سب کچھ ان کے دست قدرت کا کمال ہے اور اب یہ پوری طرح ان کے کنٹرول میں ہے اور وہ جس طرح چاہیں تصرفات کر سکتے ہیں اور نہ اس میں کسی کا حق ہے اور اس حق کا کوئی طلبگار ہے۔

اس تروتازہ اور ہرے بھرے کھیت اور اس خوشی اور پرامیدی کی حالت میں انسان نہایت اطمینان سے رہ سہہ رہا ہوتا ہے کہ اچانک ایک عذاب آتا ہے۔ چند لحات میں آنکھ جھپکتے ہی کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۰ : ۲۴) ”یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں“۔

یہ ہے وہ اصل مقصود اس منظر کے پیش کرنے سے' یعنی زندگی کا چراغ اس طرح اچانک گل ہو جاتا ہے جس طرح یہ سرسبزی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ ناپائیدار دنیا جس میں بعض لوگ غرق ہیں اور آخرت کو چھوڑ کر لوگ اس کے ناپائیدار سازوسامان کو لے لیتے ہیں۔

یہ ہے دنیا جس میں کوئی امن و اطمینان نہیں ہے' جس میں کوئی ثبات و قرار نہیں ہے' جس میں لوگوں کے اختیارات اور ان کی استطاعت بہت ہی محدود ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

”(تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ (ہدایت اس کے اختیار میں ہے) جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے“۔

کس قدر طویل مشقت کرتے ہیں۔ ہم اس دنیا کے لیے جو ایک لمحہ میں فنا کی جا سکتی ہے' حالانکہ بظاہر وہ نہایت ہی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ بہت ہی خوبصورت نظر آتی ہے' اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب بس پھل ان کی جھولی میں گرنے ہی والا ہے لیکن اچانک وہ کیا دیکھتے ہیں کہ دنیا کا یہ کھیت کسی آگ بگولے کی وجہ سے کٹ جاتا ہے اور چشم زدن میں وہ یوں ہو جاتی ہے کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں...... لیکن اس کے مقابلے میں اللہ انسانوں کو دارالسلام کی طرف بلاتا ہے اور وہ ہر مفہوم میں دارالسلام ہے۔ اور اس دعوت کے بعد یہ اللہ ہی ہے جسے وہ چاہتا ہے' راہ راست بھی دکھا دیتا ہے۔ جب کوئی اپنی بصیرت کی آنکھیں کھول دے اور اس دارالسلام کی طرف آگے بڑھے۔

---○○○---

درس نمبر ۹۶ ایک نظر میں

یہ سبق سب کا سب وجدانی احساسات پر مشتمل ہے - یہ احساسات پے درپے آتے ہیں - ان سب کا ہدف ایک ہی ہے یعنی اللہ کی توحید اور رسول اللہ کی صداقت کے بارے میں لوگوں کی فطرت کو براہ راست جگانا' یعنی یہ ثابت کیا جائے کہ قیام قیامت اور حساب و کتاب برحق ہے -

یہ وجدانی احساسات نفس انسان کو ہر طرف سے گھیرتے ہیں' انسان کو اس کائنات کا مشاہدہ کراتے ہیں - اس کائنات کی نہایت ہی وسیع سیر کراتے ہیں - کونے کونے میں پھراتے ہیں' زمین سے آسمانوں تک لے جایا جاتا ہے' اور آسمانوں سے اتار کر خود ذات انسان کی گہرائیوں میں اسے پھرایا جاتا ہے' ماضی کے دور دراز زمانوں سے حالات حاضرہ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور پھر دنیا سے نکال کر اسے آخرت کی سیر کرائی جاتی ہے - لیکن یہ سب کچھ ایک مسلسل بیانیہ انداز میں -

درس سابق میں بھی ایسے ہی احساسات اور ایسے ہی اسباق تھے لیکن اس معاملے میں یہ سبق ذرا زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے' ابھی ہم حشر کے میدان میں ہیں' ابھی ہم اس کائنات کی وسعتوں میں خیال کے گھوڑے دوڑا رہے ہیں' وہاں سے اچانک اپنے گریباں میں اپنے نفس کی دنیا میں پھر رہے ہیں' اب ہم قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ تو معجز کتاب ہے - اس جیسا کلام لانا ممکن نہیں ہے' اب ہم دور دراز زمانوں کی اقوام و ملل کی تاریخ کا فلسفیانہ جائزہ لے رہے ہیں اور اب ایک جدید اور نئے منظر میں ہم واقعات حشر دیکھ رہے ہیں اور اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کہیں اچانک عذاب ہم پر ٹوٹ نہ پڑے' اب ہمارا موضوع ذات باری کی وسیع قدرت ہے اور وسیع علم ہے - اور آیات کائناتی اور آخرت کا عذاب ہمارے سامنے ہے جو منکرین اور افتراپردازی کرنے والوں کے انتظار میں ہے - یہ ہیں وہ وجدانی احساسات -

غرض یہ گہرے احساسات اور سچے وجدانی لمحات کا ایک ہجوم ہے اور فطرت سلیمہ اور احساس رکھنے والی نفسیات کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ وہ اسے قبول کریں' اس کی پکار پر لبیک کہیں - یہ ممکن نہیں ہے کہ احساسات کے اس حملے کے بعد فطرت سلیمہ اور حقیقت کے درمیان کوئی پردہ رہ جائے یا کوئی رکاوٹ حائل ہو - کیونکہ موثرات اور احساسات کا یہ ایک سیلاب ہے جو اللہ تا چلا آتا ہے' جس میں کائناتی حقائق' فطری حقائق' انسانی نفسیات کے رجحانات اور میلانات بہتے چلے آئے ہیں -

حقیقت یہ ہے کہ اہل کفر قرآن کریم سے جو خطرہ محسوس کرتے تھے اور لوگوں کو اس بات سے روکتے تھے کہ وہ اس قرآن کو نہ سنیں' یہ اس لیے تھا کہ اس قرآن کے اثرات ان کی ذہنی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیتے تھے' ان کے افکار کی دنیا میں بڑے بڑے سلائڈ واقع ہو جاتے تھے - اور ان کے دل و دماغ کی دنیا میں زلزلہ آ جاتا تھا - چونکہ وہ اپنے شرکیہ عقائد پر قائم رہنا چاہتے تھے اس لیے وہ لوگوں کو بجا طور پر قرآن سننے سے روکتے تھے' کیونکہ وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ قرآن سنا نہیں' ایمان لایا نہیں -

---ooo---

درس نمبر ۹۶ تشریح آیات

۲۶ ـــــ تا ـــــ ۷۰

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۗ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا
ذِلَّةٌ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۶ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا
السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۗ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ
عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۗ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷

"جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل ـ ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی ـ وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے ' ذلت ان پر مسلط ہوگی 'کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہو گا ' ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں ' وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے" ـ
سابقہ سبق کی آخری آیت یہ تھی ـ

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۰ : ۲۵) "اللہ دار السلام کی طرف دعوت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے" ـ تو اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں جزاء و سزا کے اصول کیا ہیں ـ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کس قدر رحیم ہے اور مخلوق پر فضل کرنے والا ہے ' وہ نہایت ہی منصف اور عادل ہے اور جزاء و سزا دونوں میں عدل کو ملحوظ رکھتا ہے ـ

وہ لوگ جنہوں نے احسان کیا ' نیکیاں کیں ' عقاید درست رکھے ' اعمال درست رکھے اور انہوں نے صراط مستقیم کے معلوم کرنے میں سعی کی ' اور انہوں نے وہ قوانین فطرت معلوم کر لیے جو دار السلام تک پہنچانے والے ہیں ' تو ایسے لوگوں کے لیے بھلائی ہے ' اس لیے کہ انہوں نے بھلائی کی راہ اختیار کی ـ اس بھلائی پر مزید اللہ کے فضل کرم اور رحمت سے ان کو استحقاق سے زیادہ انعامات ملیں گے جو غیر محدود ہوں گے ـ

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَى وَزِيَادَةٌ (۱۰: ۲٦) "جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل"۔ یہ لوگ حشر کے غموں سے محفوظ ہوں گے' اور ان ہولناک مشکلات سے بھی بچے رہیں گے جو حساب و کتاب سے قبل ہوں گے۔

وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ (۱۰: ۲٦) (ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی) قتر سے مراد وہ غبار' سیاہی' رنگ کی کدورت ہے جو پریشانی اور تنگی کی وجہ سے چہرے پر نظر آتی ہے۔ نیز اس سے مراد ذلت 'ٹوٹ پھوٹ' درجے میں کمتری اور توہین آمیز سلوک۔ تو ان چہروں پر نہ سیاہی ہوگی اور نہ مرتبہ و مقام کے اعتبار سے ان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر کے میدان میں اس قدر ہولناک اور کربناک حالات ہوں گے کہ انسان کے چہرے پر درماندگی' خوف اور ذلت کی وجہ سے سیاہی ہوگی اور جو شخص ان ہولناکیوں سے نجات پا جائے گا اور اس پر مزید فضل کا بھی حقدار ہو جائے گا تو وہ بہت ہی کامیاب رہے گا۔

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰: ۲٦) "وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ یہ اور ان کے ساتھی بلند مرتبوں والے ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ (۱۰: ۲۷) "اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں گے' ذلت ان پر مسلط ہوگی' کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا"۔

یعنی زندگی کے سودے میں انہوں نے یہ کمائی کی۔ ان کے ساتھ بھی عادلانہ برتاؤ ہوگا۔ ان کی جزاء و سزا میں اضافہ نہ ہوگا اور نہ ان کی کمائی سے زیادہ ان کے ساتھ بدسلوکی ہوگی' برابر کی سزا ہوگی' ہاں ان کے چہروں پر مارے خوف کے ذلت چھائی ہوئی ہوگی اور کوئی ان کو بچانے والا نہ ہوگا جو ان کو ان کے مقررہ انجام سے بچائے۔ یہ ان کی حتمی سزا ہوگی اور سنت الٰہیہ کے مطابق ہوگی اور ان کے لیے ہوگی جو راستہ چھوڑ کر اور ناموس الٰہی کو توڑ کر زندگی بسر کریں۔

یہاں سے آگے اللہ تعالیٰ نہایت ہی حسی انداز میں ان کی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہیں کہ اس دن جہنمیوں کے ظاہری خدوخال کیسے ہوں گے۔

كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰: ۲۷) "ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں' وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

یعنی سیاہ رات کو کاٹ کر اس سے ایک ٹکڑا لیا گیا اور اس سے ان کے اصلی چہروں کو ڈھانپ دیا گیا' اب فضا پر رات کی تاریکی چھا جاتی ہے اور رات کی تاریکی میں قدرتی خوفناکی چھا جاتی ہے اور اس خوفناک منظر میں تاریک پردوں کے اندر

ان کے چہرے خوفناک نظر آتے ہیں۔

یہ خوفناک چہرے' تاریکی کی اس ہیبت ناک فضا میں' جہنم کے مستقل دوست ہیں اور یہ ہمیشہ اس میں رہیں گے گویا یہ ان کی مملوکہ چیز ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا
مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا
تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ
لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ ۳
۱۰ع مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾ النصف

۸ "جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ (اپنی عدالت میں) اکٹھا کریں گے' پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے' کہیں گے کہ ٹھہر جاؤ تم بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی' پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو) ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا' سب اپنے حقیقی مالک کی طرف سے پھیر دیئے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔

یہ ہو گا قصہ سفارشیوں اور شریکوں کا' قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی شکل میں اسے یہاں لایا گیا ہے۔ یہ منظر بتاتا ہے کہ عملاً یہ سفارشی اور شریک وہاں بے بس کھڑے ہوں گے اور یہ نہ کسی کو چھڑا سکیں گے اور نہ بچا سکیں گے۔

کفار اور ان کے ٹھہرائے ہوئے شریک سب اٹھائے جائیں گے' یہ لوگ ان کو بزعم خود اللہ کا شریک تصور کرتے تھے' یہ لوگ ان لوگوں کو "اللہ کا شریک" سمجھتے تھے اور اللہ ان کو "ان کے شریک" کہتے ہیں' اس لیے کہ اللہ کا تو کوئی شریک ہے نہیں' یہ تو انہوں نے خود بنائے ہیں' یہ ان کی اپنی صنعت کاری ہے' لہٰذا ان کے ہیں۔

چنانچہ ان سب کو کہا جائے گا: "ٹھہر جاؤ تم خود بھی اور تمہارے بنائے ہوئے شریک بھی" جہاں ہو رک جاؤ' تو وہ لازماً سٹینڈ ٹو ہوں گے کیونکہ اس دن تو احکام کی خلاف ورزی نہ ہو سکے گی۔ اب ان کے اور ان کے مزعومہ شریکوں کو جدا کر دیا جائے گا' ان کے درمیان پردہ حائل ہو گا۔

اب کافر تو بات نہ کر سکیں گے اور نہ ان کے پاس کوئی بات ہو گی' البتہ یہ دوسرے لوگ جن کو وہ ناحق شریک بناتے تھے' اپنی براءت میں عرض کریں گے کہ وہ اس جرم میں شریک نہیں ہیں۔ یہ جرم کہ کفار نے اللہ کے ساتھ ان کی بھی بندگی کی۔ یا اللہ کو چھوڑ کر صرف ان کی بندگی کی۔ وہ اعلان کریں گے کہ ہمیں تو ان لوگوں کی طرف سے اس عبادت اور شرک کا سرے سے نہ علم ہے اور نہ شعور ہے اور وہ اس جرم میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہیں' وہ اپنی

اس براءت پر اللہ کو گواہ ٹھہرائیں گے۔

---قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (۲۸) فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (۲۹) (۱۰:۲۸ - ۲۹) "اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو) ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔ یہ وہی شریک ہوں گے 'جن کی عبادت اس دنیا میں کی جاتی تھی۔ یہ لوگ اس بات کی صفائی پیش کر رہے ہوں گے کہ ان کے متبعین ان کے حوالے سے اس عظیم گناہ کا ارتکاب کرتے تھے۔ یہ لوگ اللہ کو شہید اور گواہ ٹھہرائیں گے اور اپنے آپ کو اس جرم سے لاتعلق ثابت کر دیں گے کہ وہ اس جرم میں ہرگز شریک نہیں ہیں۔

اس وقت 'اس کھلی کچہری میں ہر شخص کا امتحان ہو گا اور یہ امتحان اس کے دنیاوی اعمال کی تفتیش اور تنقیح پر ہو گا اور سب کو سنا دیا جائے کہ ان کا انجام کیا ہے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۰:۳۰) "اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا 'سب اپنے حقیقی مالک کی طرف سے پھیر دیئے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے"۔ تبی اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ اللہ اور رب تو ایک ہی ہے۔ آج تمام لوگ اس کی طرف لوٹ آئے ہیں اور اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔ اس دن "مشرکین کے تمام دعوے 'تمام مزعومات اور تمام الٰہ غائب ہوں گے کیونکہ یہ تو ان پر دعویٰ ہی تھے۔

لیکن قرآن کا انداز بیان اسے یوں پیش کرتا ہے کہ یوم حشر برپا ہے 'اس میں حساب و کتاب ہو رہا ہے۔ تمام حقائق و واقعات کا ریکارڈ پیش ہو رہا ہے۔ تمام موثرات اور تمام سوال و جواب کو قرآن کریم چند الفاظ میں ریکارڈ کر دیتا ہے۔ یہ منظر تمام حقائق کو ذہن نشین کرا دیتا ہے۔ مجرد بیانیہ انداز یا مجرد استدلالی انداز حقائق کو اس طرح ذہن نشین نہیں کر سکتا۔

---()()()---

میدان حشر کا منظر پیش کرنے کے بعد جس میں ان کے تمام دعاوی اور تمام خرافات کی عمارات زمین بوس ہو گئیں ' اور یہ معلوم ہو گیا کہ وہاں تو منظر پر صرف اللہ کا حکم چلے گا 'اب اگلی آیات میں ان کو ان کے موجودہ حالات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا تم اپنے ان حالات پر خود ہی غور کرو 'خود اپنی نفسیاتی کیفیات پر غور کرو جے تم خوب جانتے ہو ' اپنی سوسائٹی کے کوائف کا مشاہدہ کرو 'خود اپنے تصورات پر بھی غور کرو کہ تم خود بھی اللہ کی خالقیت اور حاکمیت کو مانتے ہو کہ اللہ ہی مالک اور خالق ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَ

مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

"ان سے پوچھو' کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو' پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟"

اس سے قبل یہ بات آگئی ہے کہ عرب اللہ کے وجود کے منکر نہ تھے' اس کے بھی منکر نہ تھے کہ خالق اور رازق صرف وہ ہے۔ اس کے بھی منکر نہ تھے کہ اس کائنات کا مدبر صرف وہی ہے۔ خرابی یہ تھی کہ وہ اللہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کچھ دوسرے اشخاص کو اللہ کا شریک بناتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی قدرت کے ساتھ ان کے پاس بھی قدرت ہے' لہٰذا اللہ ان کا مواخذہ اس طرح فرماتے ہیں کہ خود تم ان باتوں کو تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا تم اپنے بقیہ غلط تصورات کے اندر تصحیح کر لو' ذرا آنکھیں کھولو' ذرا غور و فکر کرو' ذرا منطقی انداز اختیار کر کے اس گمراہی اور مخبوط الحواسی سے نکلو۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۱۰ : ۳۱) (ان سے پوچھو' کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے) یہ پہلا سوال ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے ذریعے بذریعہ بارش اور فصلات اور حبوبات تمہیں کون رزق دیتا ہے' زمین کا رزق نباتات حبوبات' چرندوں اور پرندوں' مچھلیوں اور بحری حیوانات' پھر زمین کے اندر پوشیدہ وہ تمام خزانے جو وہ خود اپنے لیے اور اپنے حیوانات کے لیے نکالتے ہیں یہ سب کس نے پیدا کیے ہیں' یہ تو تھے اس وقت جو عملاً وہ حالات کے مطابق نکال رہے تھے جبکہ اللہ کے خزانے ان سے بہت ہی وسیع ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک انسان مزید انکشافات کر رہے ہیں اور آسمانوں اور زمین دونوں سے اپنے لیے رزق کے وسائل تلاش کر رہے ہیں۔ یہ سب اس آیت میں شامل ہیں۔ ہاں انسان ان جدید انکشافات کو کبھی تو خیر میں استعمال کرتا ہے اور کبھی شر میں یہ اس کی اپنی سوچ کی راستی اور کجی پر موقوف ہے' زمین کی سطح پر بھی رزق ہیں' اس کی سطح کے اندر بھی رزق ہیں' سمندر کی سطح پر بھی رزق ہیں اور اس کے اندر بھی رزق ہیں۔ سورج کی کرنوں کے اندر بھی رزق ہے اور چاند کی نورانی ضوپاشیوں کے اندر بھی رزق ہے۔ غرض زمین کے تعفن میں بھی دوا اور تریاق دریافت ہوا ہے۔

اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ (۱۰ : ۳۱) "یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں"۔ یہ دوسرا سوال ہے۔ کون ہے جو کان اور آنکھ کو اپنے فرائض سرانجام دینے کی قدرت دیتا ہے اور کون ہے کہ ان کو محروم کر دیتا ہے۔ کون ہے جو ان اعضاء کو صحت دیتا ہے یا بیمار کر دیتا ہے۔ کوئی ہے جو ان کو کام میں لگاتا ہے اور کون ہے جو معطل کر دیتا ہے۔ کون ہے جو ان کو دکھاتا اور سنتا ہے خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ یہ تو تھیں وہ چیزیں جو اس وقت آنکھ اور کان کے بارے میں سنتے تھے۔ ان کے لیے اس سوال اور اس کی تشریح کے لیے یہ کافی تھا۔ لیکن زمانہ مابعد کے

لوگوں نے مسلسل قوت سامعہ اور قوت باصرہ اور آنکھ اور کان کے بارے میں بے شمار انکشافات کیے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اور ان دو آلات کے اندر اللہ نے جو نہایت ہی پیچیدہ صنعت کاری فرمائی ہے تو ان جدید انکشافات کی روشنی میں یہ سوال مزید وسیع سوال بن جاتا ہے۔ آنکھ کی ساخت' اس کے اعصاب اور دیکھی ہوئی چیزوں کا ادراک کرنا' کان کی ساخت' اس کے اجزا اور طریقہ سماعت اور ہوا کی لہروں کو محسوس کرنا' یہ ایک جہاں معلومات ہے جس پر غور کرنے سے سر چکرا جاتے ہیں' اللہ کے بنائے ہوئے ان آلات اور دور جدید کے حساس ترین آلات جن کو دور جدید کے معجزات کہا جاتا ہے' کا اگر باہم تقابلی مطالعہ کیا جائے تو باوجود اس کے کہ لوگوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے آلات حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ یہ وقت صنعت میں خدا کے بنائے ہوئے ان آلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے بنائے ہوئے ان عجیب و غریب آلات کو دیکھ کر یوں ہی گزر جاتے ہین اور ان کی تہہ تک نہیں پاتے۔

وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (۱۰ : ۳۱) "کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے"۔ قدیم زمانے کے لوگ ساکن کو مردہ اور متحرک کو زندہ تصور کرتے تھے' مثلاً سوال ان سے یہ تھا کہ کون ہے جو ایک مردہ دانے سے نباتات نکالتا ہے' اور پھر نباتات سے ایک مردہ دانہ نکالتا ہے۔ انڈے سے بچہ اور مرغی سے انڈہ نکالتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے مشاہدات۔ یہ بات ان کے نزدیک بھی عجیب تھی اور اب اس سے بھی زیادہ تر عجیب ہیں کہ جب یہ معلوم ہو گیا دانے' انڈے اور اس قسم کی دوسری چیزیں بھی مردہ نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اس طرح زندہ ہیں کہ ان کے اندر خفیہ زندگی ہے اور بعض میں زندگی کی استعداد ہے۔ کیونکہ زندگی کی خفیہ استعداد' پھر اس کی وراثتی صفات' علامات اور خصوصیات جن پر دور جدید میں تحقیق ہوئی۔ وہ اس سے زیادہ عجیب چیزیں اور انکشافات ہیں اور یہ ان آیات کے مفہوم کو زیادہ وسعت دیتی ہیں اور قدرت الہیہ کا اظہار مزید ہیں۔

صرف دانے اور گٹھلی کا مطالعہ اگر کیا جائے کہ کس طرح اس سے نباتات اور کھجور جیسا درخت نکلتا ہے' انڈہ یا وہ چھوٹا بیضہ جن سے مرغی کا بچہ اور پورا انسان نکل آتا ہے اگر انسان صرف ان دو چیزوں پر غور و فکر کرے اور پوری زندگی لگا دے تو وہ ان چیزوں کے عجائبات و کمالات کا شمار نہیں کر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ دانے میں خوشہ کہاں تھا' اور پھر اس کا دوبارہ اسی طرح دانوں کی شکل اختیار کرنا اور پھر جڑیں' ان کی نال اور پتے اس پر مستزاد۔

ایک کھجور کی ایک گٹھلی کو لیجیے۔ اس میں گودا' اس میں ریشے' اور طویل تنا کہاں تھا؟ اس کی طویل ٹہنیاں اور ان کے باریک پتے اس میں کہاں تھے؟ اس میں ذائقہ' اس کی خوبصورتی' اس کا رنگ اور اس کی خوشبو یہ سب چیزیں گٹھلی میں کہاں تھیں' پھر کھجور کی مختلف اقسام تازہ' خشک وغیرہ۔

اب ذرا انڈے پر غور کریں' کیا اس میں بچہ موجود تھا' گوشت پوست اور ہڈیاں اس میں کہاں تھیں' بال و پر' رنگ و روغن اور اس کی اڑان اور اس کے نرم پر اور پشم۔

پھر ذرا اس چھوٹے سے بیضہ پر غور کریں جس کے اندر انسانی مخلوق پرورش پاتی ہے۔ کیا عجیب چیز ہے۔ اس کے

اندر انسانی خدوخال کہاں تھے ' انسان کی خصوصیات اور دور دراز کی موروثی صفات کہاں تھیں ' اس کی آواز ' اس کی بصارت ' اس کا چہرہ مہرہ ' اس کے اعصاب ' اس کی جنس اور صنف ' والدین سے موروثی صفات خصوصیات اور دوسری خصوصیات اس کے اندر کہاں پوشیدہ تھیں ؟

کیا بظاہر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وسیع و عریض حقائق و صفات سب کی سب دانے 'گٹھلی' انڈے اور بیضے کے اندر موجود تھیں تاکہ ہمارا یہ تعجب اور حیرانی ختم ہو سکے ۔ یہ حیرت اور تجسس صرف اس صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ ہم ان تمام امور کو اللہ کی قدرت کے سپرد کر دیں اور اسے اللہ کی تدبیر کے حوالے کر دیں ۔

انسان لگے ہوئے ہیں اور رات اور دن موت و حیات کے بارے میں نئے نئے اسرار و رموز کے انکشفات کرتے رہتے ہیں ۔ وہ سوچتے رہتے ہیں کہ کس طرح مردے سے زندہ اور زندہ سے مردے نکل آتے ہیں ' اور کس طرح مختلف عناصر مختلف طبیعی مراحل میں موت و حیات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں ' یہ آئے دن کے انکشافات ' ماسوائے اس کے کہ موت و حیات کے بارے مین کچھ اور سوالات پیدا کر دیں اور حیرت و اعجاب کے دائرے کو قدرے اور وسیع کر دیں اور کچھ نہیں کر سکتے ۔ ہر لحظہ کے انکشافات سوالات کو اور گہرا کر دیتے ہیں ۔ ہم کھانے کو پکاتے کے عمل اور آگ سے گزار کر مار دیتے ہیں لیکن یہ خوراک ایک زندہ خون کی شکل اختیار کر لیتی ہے ' اور یہ خون جل کر مردہ فضلات کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے ۔ غرض یہ ایسے عجوبے ہیں کہ ان میں جس قدر انسانی علم آگے بڑھتا ہے ' حیرت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ان اعجوبوں کا وقوع رات اور دن ہر لمحے ہوتا رہتا ہے ۔ غرض زندگی ایک ایسا اعجوبہ ہے جو نہایت غامض ہے ' جو انسانی فہم و ادراک پر ایسے سوالات کرتی رہتی ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہے ' اور صرف یہی کافی و شافی جواب ہے ' وہ یہ کہ ایک اللہ رب العالمین ہے جو یہ تصرفات کرتا رہتا ہے ۔

وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ (۱۰ : ۳۱) "کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے ؟" ۔ یعنی ان امور کا جن کا ذکر کیا گیا اور تمام دوسرے امور کا مدبر کون ہے ؟ وہ قانون قدرت جس کے مطابق یہ پوری کائنات اور سیارے ستارے چل رہے ہیں ۔ کون ہے جو اس کو چلاتا ہے اور کون ہے جو اس قانون کی اس قدر وقت کے ساتھ پابندی کراتا ہے ۔ پھر وہ کون ہے جو قافلہ حیات کو ایک نہایت ہی لطیف اور باریک ضابطے کے مطابق رواں دواں رکھے ہوئے ہے ۔ پھر انسانی زندگی کے اجتماعی اصول اور عمرانی قاعدے کس نے چلائے ؟ یہ اصول اور قاعدے کبھی بھی غلط نتائج نہیں دکھاتے ۔ صراط مستقیم پر رواں ہیں ۔

فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ (۱۰ : ۳۱) (وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ) یہ لوگ دراصل اللہ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ اس بات کے منکر تھے کہ ان بڑے بڑے امور میں صرف اللہ کا دست قدرت کارفرما ہے ۔ لیکن اس اعتراف کے باوجود ان کی فطرت میں جو کجی آگئی تھی اس کی وجہ سے وہ شرک میں مبتلا ہو گئے تھے ' اس لیے وہ اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کرتے تھے جس طرح وہ ایسے لوگوں کے قوانین کو تسلیم کرتے تھے جس کو قانون سازی کا کوئی اختیار اللہ نے نہ دیا تھا ۔

فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (۱۰ : ۳۱) "کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے" ۔ تو کیوں تم اس ذات سے نہیں ڈرتے جو تمہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے ' جو تمہاری بصر اور تمہارے کانوں کا بھی مالک ہے '

جو زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالتا ہے اور ان کے علاوہ بھی تمام دوسرے کائناتی امور کی تدبیر کرتا ہے ۔ جو ذات ان امور کو سرانجام دیتی ہے وہی اللہ اور رب ہے ' وہ حق ہے اور اس کے سوا کوئی حق نہیں ہے ۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ (۱۱ : ۳۲) (تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے) اور حق صرف ایک ہوتا ہے 'حق میں تعدد ممکن نہیں ہے ۔ جو شخص حق سے آگے بڑھ گیا تو سمجھو کہ وہ باطل کی حدود میں داخل ہو گیا اور گمراہ ہو گیا ۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۱۱ : ۳۲) "پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر تم کدھر پھرائے جا رہے ہو" ۔ تم کس طرح سچائی سے دور جا پڑے ہو حالانکہ سچائی بالکل واضح اور بین ہے اور سامنے نظر آ رہی ہے ۔ چشم بینا اسے دیکھ رہی ہے ۔

اور دوسرا سچائی جس کا اعتراف مشرک بھی کرتے تھے ' لیکن اصولاً سچائی کو تسلیم کریں کے اس کے نتائج کا انکار کرتے تھے ۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ (۱۱ : ۳۲) (تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے) اور حق صرف ایک ہوتا ہے 'حق میں تعدد ممکن نہیں ہے ۔ جو شخص حق سے آگے بڑھ گیا تو سمجھو کہ وہ باطل کی حدود میں داخل ہو گیا اور گمراہ ہو گیا ۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۱۱ : ۳۲) "پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا

کرے ؟ ـــ کہو وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی ' پھر تم یہ کس الٹی راہ پر چلائے جارہے ہو؟ ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے ؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے ' کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو؟"

یہ چند امور کے بارے میں سوالات ہیں ' یہ کہ کون پیدا کرتا ہے اور کون اعادہ کرے گا؟ کون ہدایت دینے والا ہے ؟ یہ امور ان کے ہاں سابقہ امور کی طرح مسلم نہ تھے لیکن یہاں بھی سابقہ امور کی طرز پر ان سے ایسے سوالات کیے گئے کہ گویا یہ مسلم امور ہیں ۔ کیونکہ اگر تھوڑا سا غور و فکر بھی کیا جائے تو یہ امور مسلمات کے تقاضوں میں سے ہیں ' ان امور کا جواب ان سے طلب نہیں کیا جاتا ' بلکہ خود ہی جواب دے دیا جاتا ہے ۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۱۰:۳۴) "ان سے پوچھو ' تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تمہاری تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے" ۔ یہ لوگ تسلیم کرتے تھے کہ اللہ نے ابتدا میں کائنات کی تخلیق کی لیکن یہ لوگ یہ بات تسلیم نہ کرتے تھے کہ تخلیق کا اعادہ بھی وہی کرے گا ۔ نہ وہ بعث بعد الموت ' حشر اور حساب و کتاب اور جزاء و سزا کے قائل تھے ۔ لیکن اگر یہ تصور کیا جائے کہ خالق نے اس دنیا میں انسان کی تخلیق کی اور یہاں وہ اس کا قصہ تمام کر دے گا اور کوئی حساب و کتاب نہ ہو گا ' یہ کوئی حکیمانہ اور عادلانہ تصور نہ ہو گا ' کیونکہ نیکوکاروں کو جزاء نہ ملے اور بدکاروں کو سزا نہ ملے تو اس طرح عدل مکمل نہ ہو گا کہ صراط مستقیم پر چلنے والوں اور انحراف کرنے والوں دونوں کا ایک ہی انجام ہو ۔ لہذا حکمت خداوندی ' اور اللہ کے عدل و انصاف کا یہ ضروری تقاضا ہے کہ آخرت برپا ہو ۔ لہذا اگر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ آغاز میں تخلیق کرنے والا اللہ ہے ' اگر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکالنے والا وہی ہے ' تو ان کو جزاء و سزا اور حشر و نشر کو بھی تسلیم کرنا چاہئے ۔ آخرت میں حشر و نشر بھی تو مردہ سے زندہ نکالنے کے عین مشابہ امر ہے ۔ جسے وہ تسلیم کرتے ہیں ۔

قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۱۰:۳۴) "کہو صرف اللہ ہی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی" ۔ لہذا یہ عجیب بات ہے کہ وہ اس قدر واضح حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں ۔ حالانکہ وہ اس کے مقدمات کو تسلیم کرتے ہیں ۔ ان مقدمات کے تسلیم کے بعد تو انہیں اسے سمجھ لینا چاہئے ۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۱۰:۳۴) "پھر تم کس الٹی راہ پر چلائے جارہے ہو" ۔ تم حق سے دور ہو کر جھوٹ کی طرف متوجہ ہوتے ہو اور اس طرح گمراہ ہو رہے ہو ۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ (۱۰:۳۵) (ان سے پوچھو تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہو؟) جو قرآن کی طرح کتابیں نازل کرتا ہو ' جو رسول بھیجتا ہو ' جو ایک مکمل نظام زندگی وضع کرتا ہو ' جو شرعی قانون بتاتا ہو ' جو انجام بد سے ڈراتا ہو ' جو بھلائی کی طرف متوجہ کرتا ہو ' جو نفس

انسانی کے اندر موجود نشانیوں اور اس کائنات کے اندر موجود نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہو' جو غافل دلوں کو جگاتا ہو' جو معطل کردہ قوائے مدرکہ کو از سرنو جگاتا ہو' جبکہ حقیقی اللہ یہ سب کام کرتا ہے اور وہ تمہارے سامنے موجود ہیں اور یہ کام بذریعہ رسول کیے جارہے ہیں تاکہ تم ہدایت پالو' چنانچہ فیصلہ کن انداز میں رسول اللہ کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے ۔

قُلِ اللّٰهُ يَهْدِىْ لِلْحَقِّ (۱۱:۳۵) "کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے"۔ جب اللہ ہی ایسا کرتا ہے اور کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے تو پھر تمہیں اگلی حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہونا چاہئے ۔

اَفَمَنْ يَّهْدِىْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى (۱۱:۳۵)
"پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا اِلّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے"۔ اس کا جواب بھی طے شدہ ہے' جو لوگوں کو ہدایت دیتا ہے وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے بمقابلہ اس کے جو خود دوسرے کی راہنمائی کا محتاج ہو۔ یہ اصول تمام شرکاء پر منطبق ہوتا ہے' چاہے وہ پتھر ہوں' درخت ہوں' ستارے ہوں یا انسان ہوں کیونکہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرکاء میں شامل ہیں۔ کیونکہ وہ بشر تھے اور اللہ کی ہدایت کے محتاج تھے۔ اگرچہ انہیں ہادی بناکر بھیجا گیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ جو انسانی شرکاء ہیں ان پر تو بطریق اولیٰ یہ اصول صادق آتا ہے ۔

فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۱۱:۳۵) "آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے" کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو"۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے' تمہیں کیا بیماری لاحق ہوگئی ہے۔ تم حقائق کا کس طرح جائزہ لیتے ہو کہ صحیح نتائج اخذ کرنے کے بجائے الٹے گمراہ ہورہے ہو۔

سوال و جواب سے فراغت کے بعد اور اپنی طرف سے وہ جوابات دینے کے بعد جو ہدایت پر مبنی تھے اور جو ان مقدمات پر مبنی تھے' جو ان کے نزدیک بھی مسلم تھے۔ اس کے بعد ان کے موقف کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جاتا ہے جو فکر و نظر اور دلیل و برہان کے پیمانوں کے مطابق فی الواقع ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے مزعومات پر ان کے پاس کوئی علمی اور یقینی سند نہیں ہے۔ وہ جو فیصلے کرتے ہیں وہ وہم و ظن پر مبنی ہوتے ہیں' وہ ایسے مسلمہ حقائق پر مبنی نہیں ہوتے جن کو دیکھ کر عقل انسانی مطمئن ہو جائے اور فطرت سلیمہ ان کو تسلیم کرے۔ ان کے اعتقادات اور نظریات اوہام و خرافات پر مبنی ہیں۔ اور انہی اوہام اور ظنیات پر ان کی زندگی کا دارومدار ہے اور ظاہر ہے کہ ظن و گمان اور ثابت شدہ سچائی کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔـا ۭ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

"حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس و گمان کے پیچھے چلے جارہے ہیں' حالانکہ گمان حق کی ضرورت

کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے"۔

ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ کے کچھ شریک ہیں اور اپنے اس گمان کو وہ عقل کی کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہتے' نہ عملاً اس کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ بس یہی کہہ کر رہ جاتے تھے کہ اگر ان بتوں میں اور شریکوں میں کچھ کمال نہ ہوتا تو ہمارے آباؤ اجداد ان کی پوجا ہرگز نہ کرتے ۔ لیکن آباء کے طرز عمل کو چھوڑ کر یہ لوگ ان خرافات پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور یہ لوگ ظنیات کی اساس پر مبنی اپنے آباء کی تقلید سے جان نہیں چھڑاتے ۔ پھر ان کا مزید گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک شخص کی طرف وحی کیسے بھیج سکتا ہے' اور دلیل ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے کہ کیوں اللہ انسانوں میں سے کسی کو رسول نہیں بنا سکتا ۔ یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید حضرت محمدؐ نے بنایا ہے اور یہ سوچتے نہیں کہ محمدؐ جو ایک انسان ہیں اگر قرآن جیسی کتاب بنا سکتے ہیں جبکہ خود ان کو بار بار چیلنج دیا گیا ہے تو خود یہ لوگ ایسی کتاب لے کر کیوں نہیں آتے ۔ غرض یہ اور اس قسم کے کئی دوسرے مزعومات ہیں جن میں یہ لوگ غرق ہیں اور یہ وہم اور خرافات ان کے کسی کام کے نہیں ہیں ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۱۰ : ۳۶) (جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے) صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ ان لوگوں کے کرتوت کیا ہیں اور اللہ ہی کا علم یقینی ہے ۔ اس تبصرے کے بعد اب قرآن مجید کے بارے میں ان کے ردعمل پر تبصرہ کیا جاتا ہے' سب سے پہلے اس خیال کو رد کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی جانب سے بطور افترا باندھا ہوا ہو' اگر وہ ایسا خیال کرتے ہیں تو پھر قرآن کی طرف سے چیلنج ہے کہ تم بھی ایسا فصیح و بلیغ کلام و نظام پیش کرو' دوسرے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ لوگ ایسا کلام پیش کریں' ان کی یہ عادت ہے کہ یہ ان معاملات میں بھی ایسے فیصلہ کن الزامات عائد کرتے ہیں جن کے بارے میں ان کو کوئی علم ہی نہیں ہے ۔ نہ وہ ان موضوعات پر کوئی کلام کر سکتے ہیں ۔ تیسرے یہ کہ یہ لوگ قرآن مجید کے مقابلے میں ہٹ دھرمی اختیار کیے ہوئے ہیں لہٰذا رسول اللہ اور اہل اسلام کو بھی اپنے موقف پر جم جانا چاہئے ۔ چاہے وہ مان کر دیں یا نہ دیں ۔ آخر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہئے اور اپنی راہ پر آگے بڑھنا چاہئے کیونکہ یہ لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور کان رکھتے ہوئے نہیں سنتے ۔ لہٰذا وہ اپنے اس انجام تک پہنچنے والے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں' اپنی اس ضلالت کی وجہ سے جس پر وہ جمے ہوئے ہیں ۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا

يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظَّالِمِينَ ﴿٣٩﴾ وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُم مَّن لَّا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ
أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾ وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم
بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ
إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ
إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ
النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾

"اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور کتاب کی تفصیل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو' مدد کے لیے بلا لو"۔ اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا' اس کو انہوں نے خواہ مخواہ اٹکل پچو جھٹلا دیا۔ اسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں' پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا؟ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں گے اور کچھ نہیں لائیں گے اور تیرا رب ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ "میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے' جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں"۔

ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تیری باتیں سنتے ہیں' مگر کیا تو بہروں کو سنائے گا' خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں' مگر کیا تو اندھوں کو راہ بتائے گا خواہ انہیں کچھ نہ سوجھتا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا' لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں"۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَن يُفْتَرَىٰ مِن دُونِ اللَّهِ (۱۰:۳۷) "اور قرآن وہ چیز نہیں ہے کہ اللہ کی وحی اور تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے"۔ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اور اپنے مضامین اور انداز بیان کے اعتبار سے نہایت ہی کامل اور مربوط اور ہم آہنگ کتاب ہے۔ جو عقائد اور نظریات وہ پیش کرتا ہے وہ کامل اور ٹھوس ہیں۔ انسانی زندگی کے لیے جو نظام تجویز کرتا ہے وہ نہایت ہی کامیاب اور حق ہے' وہ خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہی خدا

کے لائق ہے اور اس سے حقیقت الوہیت کا اظہار ہوتا ہے' وہ انسان کی وہی تصویر پیش کرتا ہے جس طرح فی الواقع انسان ہے' وہ زندگی کو اس کی حقیقت کے مطابق لیتا ہے' وہ اس کائنات کو اس طرح لیتا ہے کہ آج تک اس کا کوئی نظریہ باطل نہیں ہوا' لہٰذا یہ کلام ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ اللہ کے سوا کسی اور کی تصنیف ہو' ایسے کلام کو صرف قدرت الٰہیہ ہی وجود میں لا سکتی ہے۔ کیونکہ قدرت الٰہیہ ہی ہے جو اولین اور آخرین کے علوم کو محیط ہے' جو ظاہر اور باطن سے واقف ہے' جو ایسا نظام تجویز پیش کر سکتی ہے جو نقص' جہل اور ناکامی سے محفوظ ہو۔

مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۰:۳۷) "قرآن وہ چیز نہیں ہے کہ اللہ کی وحی اور تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے"۔ اس کی حقیقت بذات خود اس کی نفی کرتی ہے' نہ صرف یہ افتراء نہیں بلکہ یہ کہ قرآن کے بارے میں اس کی نسبت ہی ناجائز ہے' یعنی قرآن کی طرف افتراء کا استناد ہی ممکن نہیں یہ نہایت بلیغانہ نفی ہے۔

وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ (۱۰:۳۷) (بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا' اس کی تصدیق اور کتاب کی تفصیل ہے) یعنی ان کتابوں کی تصدیق ہے جو حضور اکرمؐ سے قبل رسولوں پر اتاری گئیں۔ اصل عقیدے اور نظریہ میں ان کی تصدیق کرتی ہے' بھلائی کی طرف دعوت دینے میں بھی ان کی تصدیق کرتی ہے اور یہ الکتاب کی تفصیلات پیش کرتی ہے۔ الکتاب دراصل ایک ہے' جس سے مختلف رسولوں کو ہدایات دی گئیں۔ اس کے اصول تمام رسولوں کے ہاں ایک ہیں۔ تفصیلات مختلف ہیں۔ قرآن کریم نے الکتاب کے اصول کو ذرا مفصل طریقے سے پیش کیا۔ بھلائی کے مختلف وسائل بتائے اور ان کو محفوظ کیا۔ مثلاً اللہ پر ایمان تمام رسولوں کے ہاں ایک ہے' تمام رسولوں کی دعوت بھلائی اور سچائی کی طرف تھی' مثلاً خیر کی شکل کی مختلف تفصیلات ہو سکتی ہیں اور اس کے حصول کے لیے قانون سازی اور ضابطہ بندی مختلف ہو سکتی ہیں۔ اور جوں جوں انسان ترقی کرتا ہے' وسائل خیر بھی ترقی کرتے جاتے ہیں اور جب انسانیت بلوغ کو پہنچ گئی تو اسے قرآن کی شکل میں آخری ضابطہ دیا گیا۔ اور اسے عقل و خرد استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی۔ قرآن نے خارق العادت معجزات پیش نہیں کیے کیونکہ خارق العادت معجزے سے تعقل و تفکر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۰:۳۷) (اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے) یہ اس بات کی تاکید ہے کہ قرآن مجید حضرت نبی کریم کی طرف سے گھڑا نہیں گیا بلکہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ (۱۰:۳۸) (کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے) تصنیف کرنے کی نفی کرنے اور پھر مثبت طور پر یہ کہنے کے بعد کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے' کیا پھر بھی اس بات کی گنجائش ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اپنا بنایا ہوا ہے۔ حضرت تو وہی زبان بولتے ہیں جو یہ بولتے ہیں۔ وہی حروف تہجی و کلمات ہیں جو ان کی میں ہیں (الف لام میم) (الف لام را) (الف لام میم صاد) وغیرہ۔

تو آئیں ' یہ خود اور جس قدر مددگار بھی یہ لا سکتے ہیں لائیں اور جس طرح محمدؐ نے کلام پیش کیا ہے ' یہ بھی ایسا کوئی کلام پیش کر دیں ۔ پورا قرآن تو دور کی بات ہے ' ایک سورہ ہی بنا لائیں ۔

قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(۱۰ : ۳۸) "کہو "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو ' مدد کے لیے بلا لو"۔ قرآن کا یہ چیلنج سچا ثابت ہو چکا ہے اور یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ یہ لوگ آج تک اس قسم کی صرف ایک سورہ بنانے سے بھی عاجز آ چکے ہیں اور آئندہ بھی صورت حال میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے ۔ جو لوگ قرآن کریم اور عربی زبان کی فصاحت و بلاغت سے ذرا بھی تعلق رکھتے ہیں اور اس کی فنی خوبیوں اور اس کے اسالیب بیان کی ہم آہنگی سے واقف ہیں تو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی طرح نظم کلام ممکن ہی نہیں ہے اور کسی انسان کی طرف سے ایسا کلام پیش ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ اسی طرح جو لوگ اجتماعی نظاموں کے طالب العلم ہیں ' جو اصول قانون اور دساتیر عالم کو جانتے ہیں وہ اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن کریم نے جو نظام پیش کیا ایسا نظام کسی انسان یا انسانی گروہ کے لیے ممکن نہیں ہے ۔ کسی انسانی سوسائٹی کی شیرازہ بندی اس طرح نہیں کی جا سکتی جس طرح قرآن نے کی ہے ۔ اس نظام میں اللہ تعالیٰ نے ایسی لچک چھوڑی ہے کہ قیامت تک آنے والے نئے نئے حالات کے لیے بھی اس میں گنجائش ہے اور بدلتے ہوئے حالات کے بدلتے ہوئے جوابات اس میں موجود ہیں ۔ اور نہایت ہی مہارت سے ہر مسئلے کا حل اس کے اندر موجود ہے ۔ یہ صورت حالات ایسی ہے کہ کسی ایک انسان کے دماغ میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ یہ کام کر سکے ۔ نہ کوئی گروہ یہ کام کر سکتا ہے اور نہ نسلیں یہ کام کر سکتی ہیں ۔ اسی طرح جو لوگ نفس انسانی کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہیں اور پھر قرآن مجید کی طرف سے نفس انسانی کے ساتھ ڈیلنگ کو دیکھتے ہیں وہ بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کارنامہ نہیں ہے ۔

غرض قرآن مجید کا اعجاز فقط الفاظ ' طرز ادا ' اور حسن تعبیر تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ عام اور مطلق اور بے قید اعجاز ہے ' ان امور کے ساتھ ساتھ مضامین ' انسانی نفسیات کے ساتھ ڈیلنگ اور اپنے دستوری اور قانونی اور معاشی اور معاشرتی نظام کے پہلو سے بھی قرآن معجزہ ہے ۔

جو لوگ فن تعبیر اور حسن ادا میں کسی قدر تجربہ رکھتے ہیں اور جو لوگ فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے واقف ہیں ' وہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم غایت درجے کا فصیح و بلیغ کلام ہے اور اس میں طرز ادا کی فنی خوبیاں اپنی انتہا پر ہیں ۔ اسی طرح جو لوگ اجتماعی علوم اور سوشیالوجی ' نظام قانون اور انسانی نفسیات کے موضوعات پر شدبد رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے موضوع سخن کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے ' اور یہ اعجاز اپنی آخری انتہا پر ہے ۔

میں یہاں یہ حقیقت برملا کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم قرآن کریم کے اعجاز کا احاطہ کر سکیں ۔ نہ انسانی اسالیب کلام میں قرآن کا اعجاز بیان ہو سکتا ہے ۔ اور اگر ہم اس پر مفصل کلام کرنا چاہیں بھی تو بھی اس کے لیے ایک مستقل کتاب کے صفحات درکار ہیں ۔ بہرحال یہاں میں سرسری نظر ڈال کر مختصر نکات قارئین کے سامنے رکھتا ہوں ۔

قرآن کا اسلوب بیان انسانی اسلوب بیان سے بنیادی طور پر مختلف ہے ۔ قرآن کا انداز بیان ایسا ہے کہ وہ دل و دماغ پر مکمل طور پر حاوی ہو جاتا ہے ۔ اس کے الفاظ اور تراکیب سے ایک ایسا شخص بھی مسحور ہو جاتا ہے جو سرے سے عربی زبان جانتا بھی نہیں ۔ بعض واقعات ایسے ہیں کہ انسان ان کی تفسیر اور تعبیر اس کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا کہ یہ قرآن کا اعجاز ہے جو اپنا اثر دکھاتا ہے ۔ اگرچہ یہ کوئی اصول نہیں ہے لیکن ایسے واقعات کا تجزیہ ضروری ہے ۔ میں یہاں دوسرے لوگوں کے واقعات ذکر نہیں کرتا البتہ ایک واقعہ یہاں قارئین کے لیے پیش کرتا ہوں جو کہ خود میرے ساتھ ہوا ۔ (۱)

پندرہ سال قبل کا واقعہ ہے کہ ہم نام نہاد چھ مسلمان ایک مصری بحری جہاز کے ذریعے بحراوقیانوس میں امریکہ کی طرف جا رہے تھے ۔ اس جہاز میں کل ۱۲۰ افراد مرد و زن سوار تھے جن میں سے مسلمان ہم صرف ۶ تھے ۔ ہمارے دل میں یہ بات آئی کہ ہم اس جہاز کے عرشے پر نماز جمعہ ادا کریں ۔ ہمیں نماز پڑھنے کا کوئی زیادہ شوق نہ تھا لیکن یہ نماز ہم نے دینی حمیت کے جذبے کے تحت ادا کی ۔ کیونکہ جہاز میں ایک عیسائی مبلغ تھا اور وہ رات دن جہاز پر تبلیغی کام کرتا تھا' اس نے ہمارے سامنے بھی عیسائیت کی تبلیغ کی ۔ جہاز کا کپتان انگریز تھا ۔ اس نے ہمیں نماز پڑھنے کی سہولت فراہم کی اور اجازت بھی دے دی ۔ اس نے جہاز کے عملے کو بھی اجازت دی کہ وہ بھی نماز میں شریک ہو سکتے ہیں ۔ یہ سب نوجی مسلم تھے ۔ بشرطیکہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہ ہوں ۔ یہ مسلمان بھی اس پر بہت خوش ہوئے کہ انہیں نماز جمعہ ادا کرنے کا موقعہ ملے گا ۔ اور یہ کہ کسی جہاز کے اوپر یہ پہلا جمعہ تھا ۔ میں نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز کی امامت کرائی ۔ جب ہم نماز پڑھنے لگے تو جہاز کے مسافر حلقہ باندھ کر ہمارے ارد گرد کھڑے تھے اور اس کے بعد سب ہمارے پاس آئے اور انہوں نے اس مذہبی تقریب کی کامیابی پر ہمیں مبارکباد دی ۔ کیونکہ ہماری نماز کے بارے میں وہ یہی کچھ سمجھ سکتے تھے ۔ لیکن ایک عورت جس کی بارے ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یوگوسلاویہ کی سوشلسٹ جہنم سے بھاگی ہوئی ہے اور عیسائی ہے ۔ وہ ہماری نماز سے بے حد متاثر ہوئی ۔ وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ آئی اور اس نے نہایت ہی گرم جوشی سے ہمارے ہاتھ پکڑ لیے ۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہی تھی : "کہ تمہاری نماز کے اندر جو خضوع و خشوع اور جو روحانیت ہے اس سے وہ بے حد متاثر ہوئی ہے' اس قدر کہ وہ اپنے تاثرات پر کنٹرول نہیں کر سکتی" ۔ یہ بات تو ہمارے موضوع سے متعلق نہیں جو بات ہمارے موضوع سے متعلق ہے وہ اس کا یہ قول ہے : "یہ کہ تمہارے یہ پادری صاحب کس زبان میں دعا پڑھ رہے تھے"' وہ تو یہی سمجھ سکتی تھی کہ پادری کے بغیر نماز کیسے ہو سکتی ہے یا کسی مذہبی پیشوا کے بغیر نماز کس طرح ہو سکتی ہے ؟ عام مسیحی گرجوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ سبق پادری پڑھتا ہے ۔ ہم نے اس کی غلط فہمی کو دور کر دیا ۔ اس نے کہا : "پھر یہ زبان کون سی تھی 'کیونکہ یہ زبان ایک خاص موسیقی اپنے اندر رکھتی ہے ۔ اور موسیقی بھی عجیب ہے ۔ اگرچہ میں سمجھتی نہیں" ۔ اس کے بعد اس نے ایک اور بات کی جو ہمارے لیے حیرانی کا باعث تھی ۔ اس نے کہا : "یہ کہ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ امام جو خطبہ دے رہا تھا اس کے خطبے کے اندر جگہ جگہ موسیقی والا یہ انوکھا کلام آ رہا تھا ۔ اس کی عام تقریر علیحدہ تھی' لیکن بعض اوقات اس کے اندر وہ مخصوص کلام بھی آتا تھا جو ایک خاص

---

(۱) ہندوستان میں ایسے واقعات بکثرت ہوتے ہیں' لوگ قرآن کریم کا مفہوم نہیں سمجھتے لیکن مجرد براءت سے متاثر ہوتے ہیں ۔ بعض علماء کی تلاوت ہندو مسلم سنتے رہتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے ۔ مترجم

موسیقی اثر اپنے اندر رکھتا تھا۔ دوسرے فقروں سے یہ چند فقرے ممتاز ہوتے تھے ۔وہ کانپتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ یہ کلام ایک عجیب اور موثر کلام تھا اور دوسرے کلام سے بالکل جدا تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ گویا امام روح القدس سے بھرا ہوا ہے"۔ یہ اس کا سیچی انداز گفتگو تھا۔ ہم نے اس کی گفتگو پر غور کیا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ خطبے کے درمیان جو آیات قرآنی جگہ جگہ آتی ہیں اس کی مراد ان آیات سے تھی' خطبہ جمعہ میں اور نماز کی قراءت میں ۔ہمارے لیے حیرانی یہ تھی کہ ایک ایسی عورت جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہے لیکن اس پر کلام الہی کا ایسا اثر ہوتا ہے۔

یہ کوئی اصول نہیں ہے لیکن ایسے واقعات جن کا ذکر میرے سامنے بہت سے لوگوں نے کیا ہے اپنے اندر ایک اہمیت ضرور رکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی محض تلاوت سے بھی سامعین متاثر ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عورت کے پختہ ایمان اور اپنے ایمان کی وجہ سے سوشلسٹ جہنم سے فرار کی وجہ سے وہ کلام الہی سے اس قدر متاثر ہو گئی ہو۔ لیکن مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ لاکھوں کی تعداد میں قرآن سنتے ہیں۔ وہ اسے سمجھتے نہیں لیکن ان کے دلوں پر قرآن کریم کی تلاوت کا اثر ہوتا ہے ۔یہ لوگ فہم قرآن میں اس طرح ہیں جس طرح یہ یوگوسلاوی عورت' لیکن قرآن کا کلامی اعجاز ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے ۔یہ اثر کیسے ہوتا ہے ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

یہ تو تھی قرآن کی وہ خفیہ اور ناقابل تعبیر اثر آفرینی جس کی ہم وضاحت نہیں کر سکتے ۔میں نے یہاں اس کا ذکر ان نکات سے قبل کیا جن کو ہم سمجھ سکتے ہیں ۔اب میں ان نکات کی طرف آتا ہوں جن کو اسالیب کلام کو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں اور غور و فکر کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم کے طرز ادا کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ عظیم اور بڑے بڑے مسائل و معانی کو اس قدر مختصر عبادت میں ادا کر دیتا ہے کہ انسان کے لیے ایسے مقاصد و مفہومات کو اس مختصر سی جگہ میں بیان کرنا محال نظر آتا ہے۔ مفہوم کو نہایت وسعت اور وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے ۔تعبیر نہایت ہی لطیف و دقیق ہوتی ہے اور حسن و جمال کی تو انتہا نہیں ہوتی ۔پھر مفہوم اور الفاظ و عبارت اور اس کے اثرات میں مکمل ہم آہنگی اور تناسق بھی ہوتا ہے ۔ماحول 'فضا' خوبصورتی اور حسن تعبیر اور حسن الفاظ سب کے سب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ ضروری ہوتا ہے اور لفظی خوبصورتی کی وجہ سے مفہوم متاثر ہوتا ہے اور نہ مفہوم کی وجہ سے فنی کمال۔ اور یہ حسن ایک ایسے اعلیٰ مقام تک پہنچتا ہے کہ اس مقام اعجاز تک رسائی ممکن نہیں ہے ۔قرآن کریم کی اس خوبی کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو اسالیب تعبیر کا کسی قدر علم ہو' کیونکہ فصاحت و بلاغت اور اسالیب تعبیر کو جاننے والے پھر یہ بھی جانتے ہیں کہ اس میدان میں انسان کہاں تک جا سکتا ہے ۔اور یہ کہ قرآن کا اسلوب کلام انسانی طاقت و قدرت سے وراء ہے۔

اس خصوصیت کے نتیجے میں قرآن کریم کی ایک دوسری صفت سامنے آتی ہے کہ ایک ہی آیت میں کئی قسم کے مفہوم اس طرح بیان کر دیئے گئے ہیں کہ وہ باہم نہایت ہی ہم آہنگ اور مربوط ہوتے ہیں ۔ایک ہی آیت میں ہر مضمون اور مفہوم اس طرح وضاحت اور صفائی کے ساتھ بیان ہوتا ہے کہ کسی دوسرے مفہوم سے کوئی صورت نہیں ہوتا اور ہر مفہوم کے لیے اس کی حسب حال عبارت اور جگہ تجویز ہوتی ہے ۔چنانچہ ہم ایک ہی آیت سے مختلف موضوعات اور مختلف مقاصد کی خاطر استدلال کرتے ہیں اور جس موضوع پر بھی کسی آیت سے استدلال کیا جائے۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ شاید اس آیت کا اصل موضوع ہی یہ ہے ۔گویا یہ آیت ابتداء اس مقصد کے لیے بیان ہوئی ہے ۔یہ قرآن کریم کی وہ

خصوصیت ہے اور اس قدر مکرر ہے کہ اس کی طرف یہاں یہ اشارہ ہی بس کرتا ہے۔اس سورہ کے مقدمے میں ہم نے قرآن کریم کے جو ٹکڑے دیئے ہیں اگر قاری ان پر نظر دوڑائے تو اسے نظر آئے گا کہ یہ خصوصیت قرآن میں کس قدر مکرر ہے کہ ایک ہی آیت میں متعدد مضامین درج ہیں اور اس سے استدلال مختلف مواقع پر ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے طرز ادا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن ایک منظر کو اپنی تمام جزئیات کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔یوں نظر آتا ہے کہ یہ منظر نظروں کے سامنے موجود ہے اور یہ منظر کشی ایسے انداز میں کی جاتی ہے جو کسی انسانی کلام میں موجود نہیں ہے' نہ پہلے اور نہ بعد میں۔پھر یہ کہ آج تک کوئی ادیب اس طرز ادا کی نقالی بھی نہیں کر سکا۔اگر کوئی کرتا بھی ہے تو وہ قرآن کا مربوط اور ہم آہنگ انداز قائم نہیں رکھ سکتا اور اس کے اندر اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔مثلاً ایک مثال پر غور کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے موقع پر یہ طرز ادا اختیار کرے مثلاً

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَ جُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّ عَدْوًا حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۱۰:۹۰) (یہاں تک تو ایک قصہ تھا اس کی حکایت ہوگئی لیکن اس کے بعد متصلاً ایک تقریر آ جاتی ہے جو حاضر منظر میں پیش کی جاتی ہے)

آٰلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۹۱) فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً (۹۲)(۱۰: ۹۱ - ۹۲)) (اب اس منظر پر ایک تبصرہ آ جاتا ہے' منظر آنکھوں کے ابھی سامنے ہے)

وَ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰:۹۲)

ایک دوسری مثال

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (۶:۱۹) یہاں تک تو حضورؐ کو ہدایت کی جاتی ہے اور حضورؐ ہدایت لیتے ہیں۔اب آگے اچانک کلام کا رخ مڑ جاتا ہے۔رسول اللہؐ قوم سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى (۶:۱۹) اگلی آیت میں اللہ کی طرف سے اس سوال کا جواب آتا ہے جو خود انہوں نے قوم سے کیا تھا اور انہوں نے گویا جواب دے دیا تھا کہ "ہاں"

قُلْ لَّآ اَشْهَدُ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۶ : ۱۹) قرآن میں موجوں کی طرف روئے سخن مڑتا رہتا ہے اور یہ عمل بار باریوں ہوتا ہے کہ کلام کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ایک دوسری مثال :

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۲۸) وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۲۹) يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (۱۳۰) ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (۱۳۱)(۶:۱۲۸ تا ۱۳۱)) غرض اس کی کئی مثالیں قرآن کریم سے دی جا سکتی ہیں۔یہ انداز کلام انسانوں کے انداز گفتگو سے بالکل مختلف ہے۔اگر کسی ادیب کو اس میں شک ہے تو اسے چاہئے کہ وہ مشق سخن کر کے اس اسلوب پر کوئی پارۂ ادب لے آئے۔ اور اس کا یہ پارہ ایسے کلام پر مشتمل ہونا چاہئے کہ ایک بامقصد اور قابل فہم اور معقول کلام ہو۔اس طرح خوبصورت بھی ہو اور موثر بھی ہو اور اس کے اندر وہ موسیقی بھی ہو جو اس کلام میں ہے۔

یہ تو ہیں قرآن کے اعجاز بیان کے بعض پہلو جنہیں ہم نے یہاں محض سرسری طور پر بیان کر دیا ہے۔اب رہا قرآن کا موضوعاتی اعجاز اور قرآن کی وہ ربانی خصوصیات جو انسانی کلام سے اسے جدا اور ممیز کرتی ہیں تو وہ اور ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے قرآن کریم پوری انسانیت اور انسان کی پوری شخصیت سے ہمکلام ہوتا ہے۔یہ نہیں کہ وہ کبھی انسان کے ذہن کے بارے میں بات کرے' یا اس کا موضوع سخن انسان کا قلب ہو' یا وہ انسانی احساسات کے بارے میں بات کرے بلکہ انسان کی شخصیت بحیثیت مجموعی قرآن کا موضوع ہے اور اس کا خطاب نہایت ہی مختصر طریقے سے ہوتا ہے۔وہ جب بھی انسان سے مخاطب ہوتا ہے وہ انسان کے قوائے مدرکہ کو ایک ہی بار جھنجوڑتا ہے۔اور سب کو ایک ہی بار خطاب کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے خطاب سے انسانی دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑتا ہے' انسان سوچنے لگتا ہے اور وہ بے حد متاثر ہوتا ہے۔ آج تک انسان اس قسم کا اثر آفریں کلام یا کوئی اور ذریعہ ایجاد نہیں کر سکا' جو انسان پر اس طرح کا گہرا' ہمہ گیر اور اس طرح کا دقیق اور اس طرح کا واضح اثر چھوڑتا ہو۔خصوصاً اس انداز اور اس اسلوب میں جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

میں اپنی کتاب (خصائص التصور ومقوماتہ) سے بعض فقرے یہاں نقل کرتا ہوں' امید ہے کہ ان سے قرآن کریم کا موضوعی اعجاز کا کچھ تصور ذہنوں میں بیٹھ جائے گا۔اس کتاب میں ایک باب کا عنوان ہے (المنہج القرآنی فی عرض خصائص

التصور الاسلامی) یعنی قرآن کریم اسلامی تصورات کو کس طرز پر پیش کرتا ہے' اس کا طرز ادا کس قدر خوبصورت ہے اور اس کے واضح ترین خدوخال کیا ہیں؟ یہ قرآن کا طرز ادا انسانی اسالیب کلام سے چند پہلوؤں سے ممتاز ہے۔

(۱)"وہ حقائق کو اسی طرح پیش کرتا ہے جس طرح وہ عالم واقعہ میں ہوتے ہیں اور اس کا انداز بیان اس قدر جامع ہے کہ اس حقیقت کے تمام زاویے نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ موضوع کے تمام پہلو اور اس کے متعلق تمام امور اور اس کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں لیکن قرآن کا اسلوب کلام نہ موضوع میں کوئی پیچیدگی پیدا کرتا ہے نہ کلام میں' بلکہ مخاطب کے مختلف درجات فہم کے اعتبار سے بھی یہ کلام اس قدر معجز ہے کہ فہم و ادراک کے اعتبار سے ہر سطح کا آدمی اسے بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ جہاں تک انسانی کلام کا تعلق ہے ہر ادیب ایک متعین سطح کے لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے اور اس نچلی سطح کے لوگ اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و مہربانی کی وجہ سے یہ فرض کر کے بات نہیں کی کہ اس کلام کو فلاں فلاں درجے کا علم' فہم اور ادراک رکھنے والے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ عقیدہ اور نظریہ ہر انسان کی ضرورت ہے خواہ وہ عالم ہو یا جاہل ہو۔ اس کائنات کے بارے میں عقیدہ اور نظریہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کے طرز عمل اور اس پوری کائنات کے ساتھ اس کے تعلق اور معاملے کو ایک متعین شکل دیتا ہے۔ پھر انسان کا نظریہ اور اس کی فکر ہی انسان کو وہ سمت عطا کرتی ہے کہ وہ اس کائنات کے بارے میں علم و معرفت کی متعین راہیں تلاش کرے اور طریقہ تعلیم و ترقی متعین کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی عقیدے اور بنیادی تصور کے سیکھنے کے بارے میں کوئی سابق علم بطور شرط نہیں رکھا ہے' بلکہ علم و معرفت کا نکتہ آغاز ہی اسلامی عقیدے اور تصور کو قرار دیا ہے۔ اس عقیدے کی روشنی میں انسان نے اس پوری کائنات کی تشریح و توضیح کرنی تھی۔ کائنات کی حرکت اور خود انسان کی ذات کی حرکت کو اس نے اسی عقیدے اور تصور کی روشنی میں دیکھنا ہوتا ہے تاکہ انسانی علم و معرفت ایک ایسی ٹھوس اور مستحکم اساس پر ترقی کرے جس کے سوا کوئی اور ٹھوس اور مستحکم حقیقت نہیں ہے کیونکہ اس عقیدے کی عطا کردہ سمت کے علاوہ اگر انسان علم و معرفت کی کسی اور سمت میں جا نکلے گا تو وہ ظنیات' احتمالات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے گا اور کبھی بھی قطعیت تک نہ پہنچ سکے گا۔ یہاں تک کہ آج کل کا علم جسے ہم تجربی علم کہتے ہیں' یہ بھی ایک ظنی علم ہے کیونکہ تجربی علم اور سائنس کی بنیاد قیاس پر ہے۔ کسی نکتے پر انسان استقراء کرتا' تمام جزئیات کو جمع کرتا ہے اور پھر وہ فرض کر لیتا ہے کہ ہر تجربے کا نتیجہ یہی ہوگا جو ان جزئیات میں ہے جو اس نے جمع کی ہیں۔ اس میں ایک تو یہ مفروضہ ہے کہ ہم نے تمام جزئیات کا تجربہ اور استقراء درست کیا ہے' لہٰذا ایسے تجربوں کا رزلٹ یہ آنا چاہئے۔ ہمارے علم کی منتہا یہ ہے کہ وہ چند جزوی تجربات پر مبنی ہے۔ اس کے بعد کے تمام نتائج قیاسی ہوتے ہیں' لیکن خود سائنس اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ یہ تمام تجربات ظنی ہوتے ہیں اور تجربے میں یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ الٹ ہو۔ لہٰذا یقینی ذریعہ علم وحی ہے' جو انسان کے پاس اللہ علیم و خبیر کے ذریعے سے آتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ حقائق پر مبنی باتیں بیان کرتا ہے اور وحی بہترین فیصلے اور نتائج بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان بحیثیت انسان ان تصورات کو معجزانہ طور پر قبول کرتا ہے اور کسی اور ذریعہ علم کو اس طرح یقین اور بھروسے سے قبول نہیں کرتا جس طرح قرآنی تصورات کو قبول کرتا ہے اور یہ ہے قرآن کا موضوعاتی اعجاز"۔

(۲)"قرآن کریم کا اسلوب انسانی علمی انداز سے مختلف ہے' انسان کی علمی بحث کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کسی مسئلے کے

ایک ہی پہلو پر بحث کرتا ہے' وہ علم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی تقسیم و تبو یب کرتا ہے ۔ فلسفیانہ انداز کلام اور فنی انداز مختلف ہوتے ہیں ۔ لیکن قرآن مجید بغیر تقسیم و ترتیب ہے ۔ اس پوری کائنات اور انسان کے موضوع پر کلام کرتا ہے' یہ کلام نہایت مستقل اور حقیقی ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ جامع بھی ۔ اس میں عالم شہادت اور عالم غیب کی باتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں ۔ اس میں کائناتی حقائق' انسان کی ذات کے ساتھ متعلق حقائق اور خدا تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے مضامین ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ ایک طرف دنیا کی بحث ہے اور ساتھ ہی آخرت کی بحث ہے ۔ یہاں انسان کی ارضی زندگی سماوی زندگی کے ساتھ ساتھ موضوع سخن ہے' اور ایسے اسلوب میں کہ انسان کے لیے اس کا اختیار کرنا ہی ممکن نہیں ہے کیونکہ انسان اگر اس اسلوب کی نقالی بھی کرنا چاہے تو وہ ایک دو قدم بھی نہیں چل سکتا ۔ قدم ڈگمگاتے ہیں اور وہ اپنا کوئی مقصد قرآنی اسالیب کی طرح کے اسلوب میں بیان ہی نہیں کر سکتا"۔

"یہ درست ہے کہ قرآن کا موضوع یہ کائنات اور اس کا خالق و مخلوق ابطور کل ہے اور وہ بحیثیت مجموعی اس کل سے مخاطب ہوتا ہے' لیکن بعض اوقات مقصد کے اعتبار سے قرآن اپنے بعض پہلوؤں پر زیادہ ارتکاز کرتا ہے ۔ مثلاً قرآن کریم اگر اللہ اور انسان کے باہم تعلق کے موضوع پر ہمکلام ہو اور انسان کو رب تعالیٰ سے متعارف کرا رہا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ کارخانہ قدرت اور انسان کی ذات اور اس کے نفس سے متعلق حقائق کی روشنی میں یہ تعارف کراتا ہے ۔ پھر عالم شہادت کے ساتھ ساتھ عالم غیب میں قدرت الٰہیہ کے کرشمے بھی وہ پیش کرتا ہے اور اگر قرآن کائناتی حقائق اور ان کے آثار سے بحث کر رہا ہو تو بھی وہ قدرت الٰہیہ اور اس کائنات میں اس کی فعالیت کی تمثیلات سے بحث کرتا ہے ۔ اور پھر عموماً قرآن کریم اس کائنات میں زندگی اور اس کے آثار کو پیش کرتا ہے ۔ خصوصاً انسان کو اور پھر کائنات کے قوانین طبیعت اور اس کے اندر جاری سنن الٰہیہ کو بھی پیش کرتا ہے ۔ اگر ذات انسانی زیر بحث ہو تو اس بحث کے دوران کائنات اور اس کائنات میں حیات انسانی کے موضوعات و مشاہدات بھی سامنے لائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عالم غیب و عالم شہادت دونوں مربوط ہو جاتے ہیں ۔ قرآن عالم شہادت سے عالم غیب کی طرف رخ پھیر دیتا ہے اور اگر دار آخرت کا ذکر ہو تو اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی زندگی پر بھی تبصرہ ہوتا ہے اور دنیا و آخرت کو دوسرے حقائق کے ساتھ بھی ملا دیا جاتا ہے اور یہی صورت ہے کہ خالص دنیاوی بحث کے ساتھ بھی آخرت کو جوڑ دیا جاتا ہے"۔

(۳) "قرآن کریم کے موضوعات کے اختلاف اور تنوع اور ان پر کلی بحث کے باوجود قرآن کریم اپنے اندر ہر حقیقت اور ہر موضوع کو صرف اسی قدر جگہ دیتا ہے جس قدر اس کا حق ہو' اور اللہ کے اس موضوع کی جس قدر اہمیت ہو' اسی قدر اس پر کلام ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی الوہیت' لوگوں کی طرف سے اللہ کی بندگی اور اطاعت اور اس کائنات اور انسان پر اللہ کے اقتدار اور حاکمیت کے قیام کے مضامین قرآن پر چھائے ہوئے ہیں اور یوں نظر آتا ہے کہ توحید' اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت وہ مسئلہ ہے جو قرآن کا اصل موضوع ہے ۔ اسی طرح عالم غیب' دار آخرت' قیامت کے حالات و مناظر کو قرآن کریم نے بہت ہی جگہ دی ہے ۔ اس کے بعد حقیقت انسان اور حقیقت کائنات' اس کائنات میں زندگی وجود میں لانے اور اسباب حیات کی فراہمی کے موضوع کو نہایت ہی بسط سے لیا گیا ہے کیونکہ اللہ کے نزدیک ان امور کی بہت اہمیت ہے ۔ غرض حقائق کائنات قرآن میں ملے جلے آئے ہیں ۔ کسی بھی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاتا اور کسی حقیقت کو اس مجموعی غرض اور بیان میں بالکل قلم زد نہیں کیا جاتا ۔ ہر حقیقت کو اس کی اہمیت کے مطابق پیش کیا جاتا

ہے۔ اس طرح کہ کسی حقیقت اور موضوع کا کوئی پہلو دوسرے کے ساتھ متضاد نظر نہیں آتا۔ اور اس کتاب کی فصل "توازن" میں ہم نے اس پر کلام کیا ہے۔ یوں کہ اگر قرآن کریم اس کائنات کی وسعت، اس کے عجائبات اور اس کے آثار اور انسانی زندگی کے لیے اس کی افادیت کے بیان سے یہ تاثر نہیں دیتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے نوامیس ہی اللہ اور رب ہیں، جب کہ قدیم اور جدید مادیت پرستوں نے کائنات کی وسعت اور عظمت کو دیکھ کر یہ تاثر قائم کیا۔ اسی طرح اس کائنات میں آثار حیات اور حیات انسانی اور اس کی دقیق حکمتوں اور پیچیدہ عملیات کو سامنے لاکر قرآن نے یہ تاثر نہیں دیا کہ زندگی ہی دراصل اللہ ہے اور حیات ہی کو الوہیت کا درجہ حاصل ہے، اسی طرح ذات انسان اور اس کی شخصیت اور صلاحیتوں کو بیان کر کے قرآن یہ تاثر نہیں دیتا کہ یہ انسان ہی خدا ہے جیسا کہ قدیم و جدید انسان پرستوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا۔ اسی طرح اللہ العالمین اور اس کی قوتوں اور قدرتوں کو بیان کرنے کے بعد قرآن یہ تاثر نہیں دیتا کہ اس کائنات میں بس اللہ ہی ہے، مادہ انسان اور دوسرے حقائق کچھ بھی نہیں، سب دوسری چیزیں حقیر ہیں مثلاً ہندو اور بدھ مت وغیرہ میں ہے یا تحریف کردہ عیسائیت میں ہے۔ غرض اسلامی تصور حیات میں یہ ایک حکیمانہ توازن ہے، اس طرح اس متوازن موضوع کے نتیجے میں قرآن کریم کے اسلوب ادا میں بھی ایک خاص توازن ہے اور قرآن تمام حقائق کو ان کی اہمیت کے مطابق اپنے اندر جگہ دیتا ہے۔ تمام حقائق اپنی حقیقی جگہ پر نظر آتے ہیں۔ اور جس قدر اہم وہ فی الحقیقت ہوتے ہیں وہی نظر آتے ہیں اور یہ قرآن کریم کا ایک مخصوص انداز ہے جو کسی انسانی کلام میں نہیں ہوتا، انسانی کلام میں عموماً موضوع کا ایک پہلو غالب آجاتا ہے"۔

(۴) یہ زندہ موثر، پر جوش اور اشاراتی خصوصیات کے ساتھ جب قرآن ان حقائق کو پیش کرتا ہے تو وہ زندہ، موثر اور حسن و جمال سے بھرپور حقائق ہوتے ہیں اور یہ انداز تعبیر نہایت ہی لطیف، جامع اور متعین اور فیصلہ کن ہوتا ہے۔ انسانی انداز کلام اپنے اسلوب بیان، اور تمام انسانی اسالیب کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس بیانی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ حقائق کو نہایت ہی گہرائی اور فیصلہ کن انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ بیان کی فلسفیانہ گہرائی کلام کے حسن و جمال کو ذرہ بھر متاثر نہیں کرتی۔ اور بات کا واضح تعین اس کے اثر اور حسن کو بھی متاثر نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے انسانی اسلوب کلام میں قرآنی منہاج بیان کی خوبیوں کو قلم بند بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح کہ ہم اپنے ذوق اور احساسات کو پوری طرح قلم بند کر سکیں۔ نیز ہم اپنی شوخی بیان کے باوجود اسلامی تصور حیات اور اس کے بنیادی عناصر کو اس طرح بیان بھی نہیں کر سکتے جس طرح ان کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ یہ مباحث ہم لوگوں کے سامنے اس لیے پیش کرتے ہیں کہ لوگ درحقیقت قرآنی زندگی سے بہت دور ہو گئے ہیں اور اس وقت دنیا میں ویسی فضا موجود ہی نہیں ہے، جو نزول قرآن کے وقت موجود تھا۔ نہ وہ قرآنی ماحول موجود ہے اور نہ لوگوں کے اندر قرآن کے بارے میں وہ ذوق و شوق موجود ہے، جس طرح صحابہ کرام کے اندر موجود تھا۔ جس وقت یہ قرآن نازل ہو رہا تھا اور صحابہ کرام اس وقت موجود حالات کے علی الرغم قرآنی ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں لوگوں کے اندر قرآن کے منہاج کا ذوق ہی نہیں رہا ہے اور نہ وہ ہمارے دور میں خصوصیات قرآن کے بارے میں سنتے ہیں اور نہ ہی اس کا ذوق ان کے اندر موجود ہے"۔

قرآن عقیدے سے متعلق حقائق بعض اوقات ایسے میدانوں میں بھی بیان کر دیتا جن میں فکر انسانی بالعموم دلچسپی

نہیں لیتی کیونکہ یہ ایسا میدان ہوتا ہے کہ عادتاً لوگ اس کے بارے میں گہرائی کے ساتھ نہیں سوچتے اور نہ ایسے میدان میں نظریاتی سوچ کی جاتی ہے ۔

مثلاً سورہ انعام میں علم الہی کی وسعت کی تصویرکشی اس طرح کی گئی ہے :

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ

((۶ : ۵۹)) "اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں ان کو اس کے ماسوا کوئی نہیں جانتا ۔ وہ جانتا ہے جو خشکی میں ہے اور جو سمندر میں ہے ۔ نہیں گرتا کوئی پتہ مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ بھی ' جو خشک ہے یا تر ہے مگر ایک کھلی کتاب میں درج ہے" ۔

یہ خفیہ اور ظاہر دور افتادہ مقامات ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں انسان عموماً نہیں سوچتا' خصوصاً اس طرز پر ۔ انسان اللہ کے علم کی ہمہ گیری کے بارے جس قدر بھی سوچے اور اس کی تصویرکشی اور وسعت کے بارے میں وہ جو کچھ بھی کہے وہ اس قدر وسعت کو بیان نہیں کر سکتا' جیسا کہ سورہ انعام میں اس آیت کی تفسیر کے موقع پر میں نے عرض کیا تھا' اگر انسان اللہ کی وسعت علمی بیان کرتا تو وہ اپنی دلچسپی کے دوسرے میدانوں سے مثالیں تلاش کرتا ۔ جلد ہفتم میں ہم نے کہا تھا :

"اس مختصر آیت کا جائزہ ہم جس پہلو سے بھی لیں ہمیں قرآن کا اعجاز نظر آتا ہے اور یہ بات ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے کہ قرآن کریم کا مصدر کیا ہے" ۔

"موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو بھی بادنیٰ تامل یہ بات معلوم کی جا سکتی ہے کہ یہ موضوع ایسا ہے کہ انسان اس طرز پر اس پر کوئی کلام نہیں کرتا ۔ انسان جب علم کی عمومیت اور احاطہ علمی کے موضوع کو بیان کرتا ہے تو اس کی نگاہ ان وسعتوں تک جاتی ہی نہیں جو اس آیت میں اختیار کی گئی ہیں ۔ انسانی ذہن جب علمی وسعت بیان کرتا ہے تو وہ ان حدود میں جاتا ہے جن کو وہ اہم سمجھتا ہے ۔ انسان جب اللہ کے علم کلی کو بیان کرتا ہے تو اس کا دوسرا ہی رنگ ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ انسان کا ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں کہ اقطار عالم میں موسم خزاں و بہار میں رطب و یابس اور گرنے والے پتوں کو شمار کیا جائے ؟ اس لیے انسان اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا اور نہ اس میں دلچسپی لیتا ہے ۔ اس لیے انسانی طرز تعبیر بالعموم ایسی نہیں ہوتی کہ کلی علم کی تعبیر کے لیے یہ انداز اختیار کرے ۔ یہ کام چونکہ اللہ تعالیٰ کا ہے اس لیے وہی اس کا ذکر کر سکتا ہے ۔

"اسی طرح رطب و یابس کے بارے میں بھی انسان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کے رطب و یابس سے استفادہ کرے ۔ لیکن رطب و یابس سے اللہ کے علم کلی کا استدلال کرنا بھی انسان کا طرز استدلال نہیں ہے ۔ یہ صرف اللہ کا کام ہے کہ تمام رطب و یابس کو شمار کرے ۔

"اسی طرح انسان اس بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ ہر گرنے والا پتہ' ہر وہ دانہ جو زمین کی تاریکیوں میں پڑا ہے اور ہر رطب و یابس ایک کتاب میں ریکارڈ ہوتے ہوں ۔ کیونکہ انسانوں کو اس بات کی ضرورت ہی کیا پڑتی ہے ۔ ان کو اس

شمار میں فائدہ کیا ہے ۔ پھر اس کا ریکارڈ تیار کرنا انسان کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ اپنی کائنات کے اندر جس قدر بھی چیزیں ہیں ان کا شمار کرے ' ریکارڈ کرے ' خواہ وہ چھوٹی چیزیں ہوں یا بڑی چیزیں ہوں ' پہاڑ ہوں یا رائی ہو ۔ کیونکہ اس کے علم میں سب چیزیں حاضر ہیں اور اس کے نزدیک دور قریب برابر ہیں ۔

یہ وسیع ' عمیق اور کلی منظر اور نہایت ہی خوبصورت منظر کہ ایک درخت سے بے شمار پتے گر رہے ہیں اور پورے کرۂ ارض پر یہ پتے گر رہے ہیں ' پھر مختلف قسم کے دانے اور بیج جو اس کے اطراف و اکناف میں پیدا ہوتے ہیں اور گرتے ہیں ۔ اور پھر پورے عالم اور اس کرۂ ارض کی سطح پر جو بھی رطب و یابس ہے وہ سب کے سب یہ ایک وسیع منظر ہے ۔ اور نہ صرف یہ کہ اس منظر کی طرف عادتاً انسانی سوچ متوجہ ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانی فکر و نظر کے احاطے سے بھی یہ منظر باہر ہے ۔ صرف اللہ کا علم اس کا احاطہ کر سکتا ہے جس کا علم کلی ہے ۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔ اور ہر چیز اس کے احاطے میں ہے ۔ اس کے علم کے سامنے چھوٹا و بڑا ' چھپا اور ظاہر ' معلوم اور مجہول بعید اور قریب یکساں ہیں ۔

جو لوگ انسانی شعور کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہیں جو لوگ انسانی طرز تعبیر کے مختلف اسالیب سے واقف ہیں وہ انسانی تصور کے حدود سے بھی واقف ہوتے ہیں اور وہ انسانی تعبیرات کی حدود سے بھی واقف ہیں اور وہ لوگ اپنے انسانی تجربے سے بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ اس قسم کے مناظر انسانی ذہن میں نہیں آتے اور نہ انسان اس انداز سے بات کرتا ہے اور جن لوگوں کو اس بارے میں شک ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ آج تک کے تحریر شدہ انسانی کلام کو پڑھیں کہ انسان کبھی بھی ان جیسی باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ہو سکتا ہے "۔

"قرآن کریم میں یہ آیات اور اس قسم کے جو بے شمار مناظر دکھائے گئے ہیں جو انسانی فکر اور سوچ کی جولانگاہ سے بھی بہت دور ہیں ' یہی اس بات کے لیے کافی ہیں کہ یہ کلام خدا کا کلام ہے "۔

"بذات خود تعبیر کے پہلو سے اس آیت کے اندر فنی خوبیاں موجود ہیں ۔ اس میں خوبصورتی اور سلاست کا ایک جہاں آباد ہے ۔ اس طرح انسان ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اس بلند سطح پر کہ

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ((٦ : ٥٩)) "اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اور جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا "۔ آفاق اور گہرائیاں اور عالم مجہول مطلق میں سربستہ راز ہیں ' زمان و مکان میں اور کسان میں ' ماضی میں ' حاضر میں اور مستقبل کے اندھیروں میں ' واقعات زندگی میں اور تصورات اور وجدان میں ۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَحْرِ ((٦ : ٥٩)) "بر و بحر میں جو کچھ ہے وہ جانتا ہے "۔ طویل فاصلے میں ' طویل و عریض آفاق ہیں ۔ بلندیوں پر بھی اور گہرائیوں میں بھی ' وسیع اور شامل و کامل اور اس پورے عالم شہود میں بھی اور یہ عالم غیب میں بھی ہیں جو نظروں سے اوجھل ہے ۔

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا ((٦ : ٥٩)) "نہیں گرتا کوئی پتہ مگر وہ اسے جانتا ہے "۔ ہر وقت موت اور نابودی رواں دواں ہے ۔ انسان اور پتے گر رہے ہیں ' زندگی بطرف عدم چل رہی ہے ' اللہ اسے جانتا ہے ۔

وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ "زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ بھی ہے تو اسے وہ جانتا ہے"۔ یہ نباتات کی زندگی ہے، بیج مسلسل اگ رہے ہیں اور گہرائیوں سے سطح پر آ رہے ہیں۔ ایک دانہ پردے سے ظہور کی طرف آتا ہے اور آگے بڑھتا ہے، اسے وہ جانتا ہے۔

وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۶:۵۹) "جو رطب و یابس ہے، وہ کتاب میں درج ہے"۔ یہ ایک عام جامع اور مانع عمومیت ہے، جو زندگی اور موت، جو بہار و خزاں اور ہر قسم کی ذی حیات کو شامل ہے۔

اب ذرا غور فرمائیں اس طرز کی دقت اور شمولیت کا تصور کوئی انسان کر سکتا ہے پھر نہایت ہی خوبصورتی اور حسن کے ساتھ اور جامع و مانع عمومیت کے ساتھ، ماسوائے اللہ علیم و بصیر کے اس قدر دقیق نظر کس کی ہو سکتی ہے۔

اسی طرز کی ایک دوسری آیت کا ٹکڑا ملاحظہ کریں

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا

وَ هُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ (۳۴:۲) "جو چیزیں زمین میں گھستی ہیں اور جو اس سے نکلتی ہیں، جو آسمانوں سے نازل ہوتی ہیں اور جو اس میں سوار ہوتی ہیں وہ جانتا ہے، وہ نہایت رحیم اور غفور ہے۔" ذرا غور کیجئے، یہ چند الفاظ ہیں، لیکن پوری صفحہ ہستی کو نظروں کے سامنے پھیلا دیتے ہیں، ایک عظیم تعداد ہے مختلف اشیاء کی، ان اشیاء کا حجم شکل اور تعداد بھی مختلف ہے، ان کا فہم، ہیئت اور تصور بھی رنگا رنگ ہے۔ کیا اس قدر قلیل الفاظ میں انسان اس جہاں کو گھیر سکتا ہے۔

انسان اگر اس مفہوم کو ریکارڈ کرنا شروع کر دیں اور یہ ریکارڈ بھی چند منٹوں میں تیار کرنا ہو تو کیا وہ یہ ریکارڈ تیار کر سکتے ہیں کہ ان منٹوں میں کیا کچھ زمین میں گیا اور کیا نکلا اور کیا اترا اور کیا آسمان کی طرف چڑھا؟ ممکن نہیں کیونکہ کتنی ہی چیزیں ہیں جو زمین کے اندر جاتی ہیں، کتنی ہیں جو باہر آتی ہیں اور کتنی ہیں جو نازل ہوتی ہیں اور کتنی ہیں جو آسمانوں کی طرف عروج کرتی ہیں۔

کس قدر چیزیں زمین میں گھستی ہیں؟ کس قدر بیج زمین کی پہنائیوں میں گرتے ہیں؟ کس قدر ذرے، کیڑے مکوڑے زمین کے اندر گھسے جا رہے ہیں، کس قدر پانی کے قطرے کس قدر گیس کے ذرات، کس قدر سورج کی شعاعیں، کیا کیا چیزیں اور کس قدر چیزیں؟ لیکن اللہ کی آنکھ دیکھ رہی ہے، وہ غافل نہیں ہے۔

کس قدر چیزیں نکلتی ہیں؟ نباتات کے پودے پھوٹتے ہیں، چشمے ابلتے ہیں، کس قدر آتش فشاں بنتے ہیں، کس قدر ذرات گیس نکلتے ہیں، کس قدر مستور چیزوں کا ظہور ہوتا ہے، کس قدر حشرات نکلتے ہیں، کس قدر جراثیم جو نظر آتے ہیں اور جو نہیں آتے اور وہ جہاں جن سے انسان کا علم دور ہے اور وہ پردۂ جہالت میں مستور ہیں جبکہ اللہ جانتا ہے۔

کتنی چیزیں ہیں جو آسمانوں سے نازل ہو رہی ہیں، بارش کے کتنے قطرے نازل ہوتے ہیں؟ کس قدر شہاب ثاقب اترتے ہیں؟ کس قدر جلانے والی شعاعیں اترتی ہیں؟ کس قدر روشنی پھیلانے والی شعاعیں نازل ہو رہی ہیں؟ کس قدر فیصلے ہیں جو نفاذ کے لیے آتے ہیں اور کس قدر تقدیریں ہیں جو مقدر رہیں اور ظاہر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ کتنی ہی رحمتیں ہیں

جو انسانی وجود پر نازل ہوتی ہیں؟ اور کتنی ہیں جو بعض بندوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں اور کتنے ہی ارزاق ہیں جن کو اللہ بعض بندوں کے لیے پھیلا دیتا ہے۔ غرض اس کائنات کے عالم بالا سے کیا کچھ ہے جو اترتا ہے اور اسے صرف اللہ ہی گن سکتا ہے۔

اور کیا کیا اوپر چڑھتا ہے؟ کتنی روح ہیں خواہ وہ نباتات کے ہیں' انسانوں کے ہیں' یا دوسری مخلوقات کے ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کتنی ہی پکاریں ہیں' خفیہ بھی ہیں یا علانیہ ہیں جو اللہ کے دربار میں اوپر لے جائی جاتی ہیں؟ اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنتا اور نہ سن سکتا ہے؟

اس عظیم مخلوقات کی ارواح کا شمار کیا ہے جن میں سے بعض کو تو ہم جانتے ہیں اور بعض کو سرے سے جانتے ہی نہیں اور کتنے ہی فرشتے ہیں جو روح الامین کے احکام لے کر چڑھتے ہیں اور اترتے ہیں اور کتنی ہی ارواح ہیں جو اس کائنات میں پھڑپھڑا رہی ہیں اور اللہ کے سوا کوئی انہیں جانتا ہی نہیں؟

ذرا سوچو تو سہی! سمندروں سے کس قدر بخارات اور ان کے ذرات اٹھتے ہیں؟ گیس کے کس قدر ذرات اٹھتے ہیں اور کس قدر جراثیم و اشیاء ہیں جنہیں ہم ابھی تک نہیں جانتے؟

اور ذرا وقت کو دیکھو! ایک لحظہ! پھر علم انسانی نے لحظہ کا تجزیہ کر کے اس کے اندر کس قدر بے شمار عمریں اور کس قدر اجزاء و تعداد نکالی ہے۔ جبکہ اللہ کا علم کلی محیط' ہر آن اور ہر لحظہ اور ہر مکان' ان سب لحظات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر ایک ایک دل کو لیجیے۔ اس میں بے شمار نیات' خیالات' اور امنگیں اور پھر اس کے مطابق انسان کے اعضاء کی حرکات یہ سب کچھ اللہ کی نگاہ میں اور ان میلان اور امنگوں میں اچھی بھی ہیں اور بری بھی اور سب کی سب اللہ نے پردے میں رکھ دی ہیں اور وہ ہروقت غفور و رحیم ہے۔

قرآن کی ایک ہی آیت جیسا کہ آیت زیر بحث ہے اپنے اندر مفاہیم کی یہ وسعتیں اور معانی کا یہ سمندر اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ کیا انسان ایسا کر سکتا ہے اور اس طرح سوچ سکتا ہے۔

مَا هٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ ایسے خیالات و تصورات انسان کی قوت مخیلہ میں سما ہی نہیں سکتے۔ اور نہ انسانی میلانات میں ایسے تصورات کا کوئی داعیہ ہے۔ اور پھر چند الفاظ میں اور پلک جھپکتے ہی یہ مفاہیم و معانی کے اس سمندر کو چند الفاظ کے کوزۂ محدود میں بند کر دینا صرف باری تعالیٰ کی صفت کاری ہو سکتی ہے اور انسانی الفاظ کی بازی گری یہ کام نہیں کر سکتی!

ایک اور پہلو بھی اعجاز لیے ہوئے' قرآن کریم بعض اوقات بظاہر نہایت ہی چھوٹے واقعات سے ربانی طرز استدلال کرتا ہے۔ بظاہر چھوٹا سا واقعہ ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت عظیم ہوتی ہے اور اس سے ایک عظیم حقیقت کو ثابت کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کے کلام میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں مثلاً:

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ (۵۷) اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ (۵۸) ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (۵۹) نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ

(٦٠) عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٦١) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ

النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ (٦٢)(٥٦: ٥٧ تا ٦٢)) ''ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ کبھی تم نے غور کیا' یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو' اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا ہے' اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل دیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے اپنی پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو' پھر کیوں سبق نہیں لیتے؟''

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ (٦٨) ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ

الْمُنْزِلُوْنَ (٦٩) لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ (٧٠) اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ

تُوْرُوْنَ (٧١) ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (٧٢) نَحْنُ جَعَلْنٰهَا

تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (٧٣) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (٧٤)(٥٦: ٦٨ تا

٧٤)) ''کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا' یہ پانی جو تم پیتے ہو' اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا کر رکھ دیں' پھر کیوں تم شکر گزار نہیں ہوتے؟

کبھی تم نے خیال کیا' یہ آگ جو تم سلگاتے ہو' اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے' یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کے لیے سامان زیست بنایا ہے پس اے نبیؐ' اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو''

قرآن کریم کا کمال یہ ہے کہ یہ انسان کے عادی اور مالوف امور کو عظیم کائناتی مسائل بنا دیتا ہے اور ان کو اس قدر عظیم تکوینی امور ثابت کر دیتا ہے جن کے اندر فی الواقع محیر العقول تکوینی ضوابط پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل انسان ان پر بالکل سرسری نظر ڈالتا تھا۔ قرآن ان کو روز مرہ کے واقعات کے لیے قابل غور و فکر موضوعات بنا دیتا ہے اور ایک طرز فکر عطا کرتا ہے۔ اور یہ غور و فکر اور نقطہ نظر ایک عظیم عقیدے اور ایک مکمل تصور کائنات کی شکل میں سامنے آتا ہے اور یوں انسان کو ایک خاص سوچ اور شعور اور حکمت و دانائی ملتی ہے۔ پہلے بھی یہ مناظر انسان کی نظروں سے روز گزرتے تھے اور انسان کبھی ان پر گہرا غور کرنے کی زحمت ہی نہ کرتا تھا۔ لیکن قرآن کی اس حقیقت افروز تعلیم کی وجہ سے انسان اپنے اندر اور اپنے ماحول کے اندر ان عجائبات پر غور کر کے ایک بیدار انسان بن جاتا ہے۔

قرآن کریم انسان کو فقط معدودے چند خارق عادت معجزات دکھا کر مبہوت نہیں کرتا۔ اسی طرح قرآن کریم انسان کو صرف ان معجزات و دلائل کی طرف متوجہ نہیں کرتا جو اس کی ذات سے باہر ہیں' یا جو انسانوں کے روز مرہ واقعات سے دور ہیں اور کبھی انہوں نے دیکھے نہیں ہیں مثلاً پیچیدہ فلسفیانہ مسائل عقلی صغریٰ و کبریٰ یا ایسے سائنسی تجربے جن تک عام انسان کی پہنچ نہیں ہے۔ اس غرض کے لیے کہ انسان کو کوئی عقیدہ و تصور دے یا اس کائنات اور انسانی زندگی کے بارے

میں انسان کو کوئی سوچ دے بلکہ قرآن انسان کے روز مرہ واقعات سے گہری سوچ پیدا کرتا ہے ۔

انسان کا نفس بھی اللہ کی مصنوعات میں سے ایک صنعت ہے ۔ انسان کے ارد گرد ماحول میں جس قدر مظاہر ہیں وہ بھی بہرحال اللہ کی قدرت ہی کے کرشمے ہیں ۔ اور اللہ کی صنعت میں سے ہر ایک صنعت کے اندر ایک معجزہ ہے ۔ اور ان تمام معجزات کی کتاب یہ کتاب اللہ ہے ۔ لہٰذا قرآن مجید لوگوں کو اس کائناتی معجزات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو انسان کے ارد گرد اللہ کی مخلوقات کے اندر پوشیدہ ہیں ۔ یہ معجزات روز کے واقعات کی شکل میں ہمارے سامنے ہروقت موجود رہتے ہیں ۔ اس سے پہلے انسان ان معجزات کو دیکھتا تھا مگر وہ ان کے اندر اعجاز کے پہلو کا ادراک نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ روز مرہ واقعات ہوتے تھے اور دیکھتے دیکھتے انسان کے لیے ان کا اعجاب واعجاز ختم ہو جاتا تھا لیکن قرآن انسان کی آنکھیں کھولتا ہے اور ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان پر غور کرے تاکہ وہ ان کے اندر پائے جانے والے عظیم اعجاز کو پا سکے کہ ان واقعات کے اندر قدرت معجزہ کیا ہے ۔ ان کے اندر اللہ وحدہ کی حکمت وحدانیہ کس طرح کارفرما ہے ۔ اور یہ کہ کاریگر ازل کی صنعت کاری خود ان مشاہدات اور انسان کی ذات کے اندر کس طرح کارفرما ہے ۔ اور ان کے اندر کیا کیا دلائل ایمان موجود ہیں اور کیا دلائل ہیں جو انسان کو عقیدۂ توحید عطا کرتے ہیں اور کس طرح فطرت انسانی کی بیداری کا باعث بنتے ہیں ۔

اسی منہاج پر قرآن کریم آگے بڑھتا ہے ۔ لوگوں پر وہ نشانیاں پیش کرتا ہے جو خود ان کی تخلیق میں پوشیدہ ہیں ' ان کے نفس کے اندر موجود ہیں ۔

اس نظام زراعت اور نباتات میں موجود ہیں جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چلاتے اور اگاتے ہیں ' پھر یہ آیات قدرت اس پانی میں موجود ہیں جسے وہ رات اور دن پیتے ہیں ' یہ آگ جو وہ جلاتے ہیں ' اس میں بھی اللہ کی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں اور ان کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ان کے مالوفات میں سے ہیں ۔ پھر قرآن کریم ان کے سامنے ان کی زندگی کی انتہا کو پیش کرتا ہے ۔ آخری لمحات ہوتے ہیں ان کے اس زمین پر ۔ ہر فرد ان لمحات سے دوچار ہوتا ہے ۔ تمام حیلے اور تمام تدابیر ختم ہو جاتی ہیں اور اب انسان کو اللہ کی قدرت کا براہ راست آمنا سامنا کرنا ہوتا ہے ۔ تمام تدابیر اور حیلے بہانے یہاں ختم ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا ہے ۔

قرآن کریم کا یہ طریقہ کہ وہ انسانی فطرت سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے ' یہ بتاتا ہے کہ اس کا مصدر اور منبع کہاں ہے ؟ یہ وہی سرچشمہ ہے جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے ۔ لہٰذا قرآن کریم کا تعمیر شخصیت کا طریقہ وہی ہے جو اس کائنات کی تعمیر کا ہے ۔ کائنات کی تعمیر میں ایٹم چھوٹا ہونے کے بجائے خود معجزہ ہے ' ایک خلیہ چھوٹا ہونے کے باوجود ایک معجزہ ہے ۔ لہٰذا قرآن کریم اس دنیا کی معمولی اور عادی چیزوں کو لے کر ان سے وہ عظیم نظریاتی نتائج اخذ کرتا ہے اور اس کائنات کا ایک وسیع تصور پیش کرتا ہے ۔ مشاہدات ایسے لیتا ہے جو ہر انسان کے زیر تجربہ ہوتے ہیں مثلاً نسل ' فصلیں ' پانی ' آگ ' زندگی اور موت ۔ اب بتائیے کہ اس زمین میں رہنے والا کوئی انسان ہے جو ان امور کے تجربے سے نہ گزرا ہو ۔ اگر کوئی غار میں زندگی بسر کرتا ہے تو زندگی کے جنین کو دیکھتا ہے ' نباتات کو دیکھتا ہے ۔ پانی کو بہتا دیکھتا ہے ' آگ کو دیکھتا ہے ' اور موت اس کی نظروں کے سامنے واقعہ ہوتی ہے ۔ یہی مشاہدات ہیں جن کو نہایت ہی گہرائی سے قرآن مشاہدہ کراتا ہے اور اس سے عظیم عقیدہ اور نظریات اخذ کرنے کی تربیت دیتا ہے ۔ کیونکہ قرآن ہر انسان سے مخاطب ہے خواہ وہ جس ماحول اور جس سوسائٹی میں رہتا ہو ' جبکہ یہ سادہ حقائق جو قرآن پیش کرتا ہے اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم حقائق ہیں ۔ اور نظام ربوبیت

کے اعلیٰ ترین اسرار ہیں' یہ نہایت ہی سادہ ہیں اور ان سادہ حقائق کے ذریعہ قرآن کریم فطرت انسانی کے قریب ہوتا ہے' لیکن یہ حقائق ہی اعلیٰ درجے کے علماء سائنس کا موضوع تحقیق اور موضوع تعلیم و تحقیق ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے مزاج سے اس کے سرچشمے کو معلوم کرنے کے موضوع پر اس قدر بات کافی ہے اور اس سورت کو سمجھنے کے سلسلے میں اس قدر بحث کافی ہے۔ صدق اللہ العظیم۔

مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۰: ۳۷) "قرآن کریم کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اللہ کی وحی کے بغیر اسے تصنیف کر لیا جائے"۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۰: ۳۸) "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو' اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورت اس جیسی تصنیف کر لاؤ' اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو' مدد کے لیے بلا لو"۔

یہاں قرآن مجید مخالفین کو صرف ایک چیلنج دے دیتا ہے اور اس موضوع پر کسی مزید جدل و جدال سے احتراز کرتا ہے اور یہ فیصلہ دے دیتا ہے کہ یہ لوگ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے معاملات کے بارے میں فیصلہ کن رائے دیتے ہیں جن کے بارے میں انہیں کوئی علم ہی نہیں ہے۔ حالانکہ فیصلہ کن رائے دینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ رائے دینے والا اس موضوع پر وافر مقدار علم رکھتا ہو' محض رائے پسندی اور ظن و تخمین پر بات نہ کرتا ہو' یہاں وہ جو فیصلہ کرتے ہیں' وہ قرآن کا وحی من جانب اللہ ہونا ہے اور اس بات کی تکذیب کہ اس میں جو وعدہ وعید ہے وہ سچی نہیں ہے' حالانکہ تکذیب کا یہ حکم کسی علم پر مبنی نہیں ہے اور جب وعدہ وعید کا فیصلہ ہو گا اور قیامت آ جائے گی تو ان کے سامنے حقیقت تب آئے گی۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ (۱۰: ۳۹) "اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا' اس کو انہوں نے (خواہ مخواہ) جھٹلا دیا"۔

ان کی پوزیشن اس معاملے میں ویسی ہی ہے جیسے ان سے قبل کے جھٹلانے والوں کی تھی' جو ظالم بھی تھے اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے بھی تھے۔ لہٰذا سوچنے والا سوچ لے اور دیکھ لے کہ ان سابقہ مکذبین کا انجام کیا ہوا اور ان کا کیا ہونے والا ہے؟

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰: ۳۹)
(اسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا)۔

جب ان کی اکثریت محض ظن کی متبع ہے اور ایک ایسی حقیقت کی تکذیب کر رہی ہے جس کا انہیں علم نہیں ہے'

لیکن بعض لوگ اس کتاب کی سچائی پر یقین بھی رکھتے ہیں ' سب کے سب ہی تکذیب کرنے والے نہیں ہیں ۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ

(۱۰ : ۴۰) (ان میں سے کچھ ایمان لاتے ہیں اور کچھ نہیں لاتے ' اور تیرا رب ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے) ۔ اور ظاہر ہے کہ مفسد وہی ہیں جو ایمان نہیں لاتے ۔ اس کرۂ ارض پر اس سے بڑا اور کوئی فساد نہیں ہے کہ لوگ ایمان نہ لائیں اور صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی نہ کریں ۔ تمام فسادوں کی جڑ یہ ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کریں اور حاکمیت اللہ وحدہ کی نہ رہے اور وہ فسادات رونما ہو جائیں جو غیر اللہ کی حاکمیت کے نظام کی وجہ سے دنیا میں چلتے ہیں ۔ یہ فساد اتباع نفس اور اتباع غیر اللہ کی وجہ سے رونما ہوتا ہے ۔ اور پھر زمین میں کئی قسم کے خدا اگ آتے ہیں اور وہ اپنی ربوبیت کے قیام کے لیے شر و فساد برپا کرتے ہیں ۔ لوگوں کی روحانی زندگی کو برباد کرتے ہیں ' ان کے خیالات کو برباد کرتے ہیں ' ان کی اقدار اور تصورات کو بگاڑ دیتے ہیں ۔ پھر وہ ان کی دولت کو برے کاموں اور برے طریقوں سے خرچ کرتے ہیں اور ان کی معیشت کو تباہ کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنا جھوٹا اقتدار قائم کرتے ہیں ۔ جاہلیت کی قدیم اور جدید تاریخ اس فساد پر شاہد ہے جو ایمان نہ لانے والے مفسدین نے اس جہاں میں برپا کیا ۔

کتاب اللہ کے بارے میں ان کا موقف بیان کرنے کے بعد اب روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو جاتا ہے ۔ آپ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ مکذبین کی تکذیب کی وجہ سے متاثر نہ ہوں ' ان سے اپنا دامن جھاڑ لیں اور اعلان کر دیں کہ آپ ان سے بری الذمہ ہیں اور آپ کے ساتھ جو سچائی ہے اس کی بنا پر یہ ان سے علیحدہ ہو جائیں اور ان سے دو ٹوک بات کریں ۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ

مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۰ : ۴۱) (اگر یہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لیے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لیے ' جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو ' اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں)

یہ ان کے وجدان کو جگانے کی آخری کوشش ہے کہ بس اب ہم نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو چھوڑ دیا ہے ' تم جانو اور تمہارا انجام ۔ جبکہ اوپر بتا دیا گیا کہ انجام کیا ہو گا ۔ یہ بعینہ اسی طرح ہے کہ بعض اوقات انسان ایک نافرمان بچے کو بیچ راہ کے چھوڑ دیتا ہے کہ اچھا جاؤ تم جس راہ پر چلتے ہو ' اور یہ اسلوب عتاب بسا اوقات کامیاب رہتا ہے ۔

اب یہاں رسول اللہ کے حوالے سے ان میں سے بعض لوگوں کے مخصوص رویے کے بارے میں یہاں بتایا جاتا ہے کہ بعض لوگ سنتے ہیں مگر غور نہیں کرتے ۔ اور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ان کی حقیقی حالت ایسی ہے گویا ان کی آنکھوں میں بینائی ہی نہیں ہے یعنی یہ سننا اور یہ دیکھنا ان کے لیے مفید نہیں ہے ۔ وہ راہ راست پر نہیں آتے ۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ (۴۲) وَ

مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ (۴۳)(۱۰: ۴۲ ـ ۴۳)) (ان میں سے بہت سے لوگ ہیں جو تیری باتیں سنتے ہیں مگر کیا تو بہروں کو سنائے گا خواہ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں ـ ان میں سے بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں مگر کیا تو اندھوں کو راہ راست بتائے گا خواہ انہیں کچھ نہ سوجھتا ہو) ـ

یہ لوگ ایسے ہیں کہ سنتے ہیں لیکن جو کچھ وہ سنتے ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے' وہ دیکھ رہے ہیں لیکن اپنے مشاہدات سے کچھ سبق نہیں لیتے ـ اور ہر زمان و مکان میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہی ہوتی ہے ـ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایسے لوگ موجود تھے اور حضورؐ کا بس نہ چلتا تھا کہ ان کو تبدیل کر دیں کیونکہ ان کے اعضائے مدرکہ اس طرح مسخ ہو گئے تھے کہ وہ کوئی حقیقت ان کی عقلوں تک منتقل ہی نہ کرتے تھے ـ گویا یہ اعضاء معطل تھے اور اپنے فرائض طبیعی ادا نہ کرتے تھے اور رسول اللہ کی قدرت میں یہ بات نہ تھی کہ وہ بہرے کو سنائیں یا اندھے کو دکھائیں ـ یہ قدرتی کام تھا اور خالق کائنات ہی یہ کر سکتے تھے ـ اللہ نے تو اپنی مخلوق کے لیے ایک سنت مقرر کی ہے اور لوگوں کو سنن الہیہ کے مطابق آزاد چھوڑ دیا ہے ـ ان کو کان' نظر اور دوسری قوتیں دی ہیں تاکہ وہ حقائق کا ادراک کریں ـ تو اگر وہ جان بوجھ کر اپنی قوائے مدرکہ کو معطل کرتے ہیں تو یہ ان کا اپنا قصور ہے اور اس کے نتائج بھی انہی کو بھگتنا پڑیں گے اور وہ منصفانہ ہوں گے ـ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰: ۴۴) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا' لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں" ـ ان آخری آیات میں رسول اللہؐ کے لیے تسلی ہے' کیونکہ جب آپ لوگوں پر سچائی پیش کرتے تھے اور لوگ نہ مانتے تھے تو اس پر آپ بے حد پریشان ہوتے تھے اور بار بار کی یاد دہانی پر بھی وہ نہ مانتے تھے تو آپ دل تنگ ہوتے تھے ـ چنانچہ اللہ کی طرف سے تسلی آئی کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے اور اس سچائی میں کچھ کمی نہیں ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں ـ بلکہ یہ خود اندھے اور بہرے ہو رہے ہیں اور کان اور آنکھیں کھول کر بات پر غور نہیں کرتے ـ لہٰذا انکار کا سبب نہ داعی میں ہے اور نہ دعوت میں ـ یہ قصور خود ان لوگوں کا ہے جن کو دعوت دی جا رہی ہے ـ

ان آیات میں عبودیت اور اللہ کی حاکمیت کی ایک قطعی صورت بتائی گئی ہے ـ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بھی دیکھا جائے تو آپ بھی اللہ کے بندوں میں سے بندے ہیں' دائرہ بندگی سے باہر آپ کی کوئی قدرت اور طاقت نہیں ہے ـ تمام امور کے فیصلے اللہ کے اختیار میں ہیں ـ

اب اچانک ان کے سامنے قیامت کا ایک منظر پیش کر دیا جاتا ہے' یہ منظر انسان کی قوت مدرکہ کو چھوتا ہے ـ اس منظر میں دنیا کی پوری زندگی کو چشم زدن میں لپیٹ لیا جاتا ہے' اب دنیا کا احساس ختم ہے' اب وہ مشغولیت ختم ہے کہ رات اور دن ہم دنیا کے پیچھے پڑے تھے اور ہمارے سب منصوبے اس دنیا کے لیے تھے ـ یہ زندگی اچانک ختم ہو جاتی ہے ـ لوگ اب اپنے اصلی' دائمی اور مستقل گھر میں چلے جاتے ہیں ـ

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ

بَيْنَهُمْ ۖ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝٤٥

" (آج یہ دنیا کی زندگی میں مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی انہیں ایسی محسوس ہو گی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھہرے تھے (اس وقت تحقیق ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راہ راست پر نہ تھے"۔

اس منظر میں جو اچانک نظروں میں آتا ہے 'ہم دیکھتے ہیں کہ قبروں سے اٹھنے والے اچانک پکڑے جاتے ہیں' اب ان کو احساس ہوتا ہے کہ ان کا یہ دنیاوی سفر بہت ہی مختصر تھا۔ گویا وہ اس قدر مختصر تھا کہ شاید ایک دن کے کسی پروگرام میں ان کا باہم تعارف ہو گیا ہو' اور بس یہ سفر ختم۔

دنیاوی زندگی کی یہ ایک تشبیہ ہے۔ ایک مثال ہے کہ لوگ دنیا میں آئے اور گئے۔ یہاں وہ صرف باہم ملے' تعارف ہوا اور کچھ انہوں کیا ہی نہیں۔

بظاہر تو یہ محض ایک مثال اور تشبیہ بیان ہوئی ہے لیکن یہ حق الیقین ہے' بلکہ اس جہاں میں لوگوں کا باہم تعارف ہی مکمل نہیں ہو پاتا کہ وہ چلے جاتے ہیں' نہ انفرادی تعارف ختم ہوتا ہے اور نہ اجتماعی تعارف ختم ہوتا ہے اور وہ چل نکلتے ہیں۔

اور یہ لوگ جو ہر وقت باہم نزاع میں رہتے ہیں' ایک دوسرے کے خلاف معرکے برپا رکھتے ہیں اور یہ تمام تنازعات اور معرکے دراصل غلط فہمی کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ درحقیقت ان کا باہم حقیقی تعارف نہیں ہوا ہے۔

یہ پسماندہ ممالک' یہ باہم برسرپیکار ممالک' یہ جو باہم دست و گریبان ہیں' ان کا جھگڑا کسی عمومی حق پر نہیں ہے اور نہ یہ کسی اچھے نظام زندگی کی خاطر باہم لڑتے ہیں' یہ محض عزت کے لیے لڑتے ہیں بلکہ جہنم کے لیے لڑتے ہیں۔ کیا ان لوگوں میں سے بعض نے بعض کو پہچان لیا ہے نہیں۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جھگڑے سے نکلتے ہیں اور دوسرے میں پھنس جاتے ہیں۔

یہ ایک تمثیل ہے کہ دنیا کی زندگی نہایت ہی مختصر ہے لیکن یہ تمثیل لوگوں کے درمیان جاری حیات زندگی کے نہایت ہی گہرے حقائق بیان کرتی ہے کہ لوگ کس طرح اس دنیا سے جا رہے ہیں۔

بہرحال اس حقیقت کے ہوتے ہوئے وہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں جو نہایت ہی مختصر اس دنیاوی زندگی پر اپنا پورا وقت خرچ کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اس بات کی تکذیب کرتے ہیں کہ انہوں نے اللہ سے ملنا ہے۔ اللہ کو ایک طرف چھوڑ کر ان کے تمام اہتمامات اس مختصر مرحلے کے لیے ہیں۔ یہ مرحلہ نہیں ہے بلکہ پلک جھپکنے کے برابر ایک لمحہ ہے' یہ لوگ بھی عجیب ہیں کہ انہیں اللہ کے سامنے پیش ہونے کی کوئی فکر نہیں ہے اور نہ دار آخرت طویل زمانوں کی کوئی فکر ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (۱۰ : ۴۵) "فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہرگز وہ راہ راست پر نہ تھے"۔

---ooo---

ایک تیزی سے گزرنے والا یہ منظر اب ختم ہوتا ہے ' یہ ایک جھلکی تھی کہ دنیا کی زندگی کس قدر مختصر ہے اور اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ آپ کو مکذبین کے انجام کے بارے میں تسلی دی جاتی ہے ۔ ان کا انجام مستقبل کے پردوں میں پوشیدہ ہے ' معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے 'کل کیا پیش آنے والا ہے ۔ یہ اس دنیا میں پکڑ لیے جائیں گے یا ان کو قیامت تک مہلت ہے ۔ یہ تلوار بہرحال ان کے سروں پر لٹک رہی ہے ۔ کفار کو وعید کی یہ بات آگے بڑھتی ہے اور اب ہم میدان قیامت میں ہیں جہاں تقصیرات کا کوئی کفارہ نہ ہو گا اگرچہ کوئی پورے کرۂ ارض کی پیشکش کرے اور یہ انداز سخن قرآن کا خاص طریقہ ہے کہ وہ دنیا کو آخرت سے جوڑ دیتا ہے ۔ دنیا و آخرت کے یہ ڈانڈے چند کلمات و الفاظ کے ذریعہ ملا دیئے جاتے ہیں ۔ اور ان مختصر کلمات میں اس قدر دلچسپ تصویر کشی کر دی جاتی ہے کہ بات دل تک اتر جاتی ہے اور دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی باہم مل جاتے ہیں اور ایک اس طرح کی طرز زندگی پیش کر دی جاتی ہے جو قدیم اسلامی زندگی ہو۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ
فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ
رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَ
يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ
ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۗ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۗ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا
يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٤٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ
بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٠﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ
بِهٖ ۗ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا
عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ
اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَلَوْ اَنَّ
لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا

رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

"جن برے نتائج سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں ان کا کوئی حصہ ہم تیرے جیتے جی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اٹھالیں' بہرحال انہیں آنا ہماری طرف ہی ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے۔

ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔

کہتے ہیں اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہوگی؟

کہو "میرے اختیار میں تو خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے' جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ ان سے کہو' کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آ جائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا جب وہ تم پر آ پڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟--- اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے! پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو' جو کچھ تم کماتے رہے ہو' اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟

پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو "میرے رب کی قسم' یہ بالکل سچ ہے' اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو"۔ اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے' روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں گے مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا' کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا۔

یہ پیرا اس بات سے شروع ہوتا ہے کہ تمام لوگوں نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے' چاہے وہ سزا جس سے رسول انہیں ڈرا رہے تھے' اس دنیا ہی میں ان پر نازل ہو جائے اور رسول اللہ کی زندگی میں نازل ہو جائے یا ان کی وفات کے بعد نازل ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں ان لوگوں نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ کو وہ بھی معلوم ہے جو یہ لوگ حضورؐ کی زندگی میں کر رہے تھے' جو آپ کی وفات کے بعد انہوں نے کرنا تھا۔ لہٰذا اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے اور حضورؐ کی وفات کی وجہ سے اللہ کی وعید ان سے ٹل نہ جائے گی۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (۱۰ : ۴۶) "جن برے نتائج سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں ان کا کوئی حصہ ہم تیرے جیتے جی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اٹھالیں' بہرحال انہیں آنا ہماری طرف ہی ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے"۔

تمام امور منصوبہ تقدیر الٰہیہ کے مطابق چل رہے ہیں۔ تقدیر کا ایک حرف بھی بدلتا نہیں اور نہ ظروف و احوال میں تقدیر بدل جاتی ہے۔ ہر قوم کو صرف اس وقت تک مہلت ملتی ہے جب تک اس کا رسول نہیں آ جاتا۔ جب رسول آ جاتا

ہے تو وہ انہیں ڈراتا ہے' یوں ان کا یہ حق پورا ہو جاتا ہے جو اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ وہ اس حق کو پورا کرے گا اور یہ کہ وہ کسی قوم کو سوائے ارسال رسالت کے عذاب نہ دے گا اور یہ کہ رسول کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ وہ پیغام ان تک پہنچا دے اور سمجھا دے ۔ اور اس کے بعد اب جو فیصلہ بھی اللہ کرے وہ برحق ہو گا۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(۱۰ : ۴۷) "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے ۔ پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا"۔

ان دو آیات پر ذرا غور کرنا چاہئے' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصور حیات کے مطابق حقیقت الوہیت کیا ہے اور مقام بندگی کیا ہے؟ اور یہ کہ قرآن کریم ہر موقعہ پر حقیقت الوہیت اور مقام بندگی کی وضاحت ضروری سمجھتا ہے ۔ اور ہر صورت میں اور مختلف انداز میں اس کو بیان کرتا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ اس عقیدے اور اس قوم کا معاملہ سب کا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دین کے معاملے میں اے پیغمبر آپ کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے ۔ آپ کا فریضہ صرف اس قدر ہے کہ آپ نے پیغام صحیح طرح پہنچانا ہے ۔ پیغام پہنچا دینے کے بعد اب تمام امور کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ اس دنیا سے چلے جائیں اور وہ لوگ جو آپ کو اذیت دیتے رہے' تکذیب کرتے رہے اور سخت دشمنی کرتے رہے وہ یونہی رہ جائیں ۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ اللہ اس دنیا ہی میں ان لوگوں کا انجام آپ کو دکھا دے یا یہاں ہی ان کو سزا و جزاء دے دے ۔ یہ اختیارات صرف اللہ کے ہیں ۔ اے پیغمبر آپ کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیں ۔ پیغام پہنچا کر انجام اللہ پر چھوڑ دیں ۔ یہ اس لیے کہا گیا کہ بندے ذرا اپنا مقام پہچان لیں اور نیز داعی جلد بازی نہ کرنے لگیں ۔ اگرچہ ایک طویل عرصے تک دعوت کیوں نہ دینی پڑے اور دعوت کی راہ میں انہیں ایک طویل عرصے تک مشکلات سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے ۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۰ : ۴۸) "کہتے ہیں کہ اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہو گی؟" اہل مکہ یہ سوال نہایت ہی عجلت میں چیلنج کے طور پر کرتے تھے ۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس عذاب سے ڈراتے ہیں وہ واقع کیوں نہیں ہوتا؟ اللہ ان کا فیصلہ اسی طرح نہیں کر دیتا جس طرح اس نے امم سابقہ کا کیا تھا جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی' ان کو تو اللہ نے پکڑ لیا تھا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ

فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰ : ۴۹) کہو "میرے اختیار میں تو خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں' سب کچھ اللہ کی مشیئت پر موقوف ہے ۔ ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے' جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔

اگر حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کے لیے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے تو ان کے لیے لازماً وہ اختیار

نہیں رکھتے۔ یہاں اس آیت میں مضرت کو پہلے لایا گیا ہے اگرچہ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ اپنے نفس کے بارے میں بات کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مضرت طلب کہاں کرتے تھے لیکن یہاں مناسبت کلام کی وجہ سے مضرت کو پہلے لایا گیا تھا' جبکہ دوسرے مقامات پر مثلاً سورۂ انعام میں خیر کا ذکر پہلے کیا گیا۔ جہاں اپنی ذات کے لیے طلب خیر کی بات ہو رہی تھی۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (۷:۱۸۸)

بہرحال یہاں کہنا یہ مقصود ہے کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں' یہ اللہ کا اختیار ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے' عذاب لے آئے۔ اللہ کی ایک سنت ہے جو جاری و ساری ہے۔ اور اس میں تخلف نہیں ہوتا۔ اس کی ایک میعاد ہے۔ اس سے پہلے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جب وقت آتا ہے تو پھر گھڑی کی مہلت بھی نہیں ہوتی اور وقت سے پہلے اس گھڑی کو ایک لمحہ کے لیے بھی پہلے نہیں لایا جا سکتا۔

اور جب میعاد پوری ہوتی ہے تو کبھی تو ایک قوم حسی طور پر ہلاک ہوتی ہے اور لوگ اسے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اس قوم کا نام و نمود ہی نہیں رہتا۔ انسانی تاریخ میں ایسی متعدد اقوام ہو گزری ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ معنوی لحاظ سے اور روحانی لحاظ سے ایک قوم ہلاک ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا میں مغلوب اور شکست خوردہ ہوتی ہے۔ یہ شکست بعض اوقات ایک مدت متعین کے لیے ہوتی ہے اور بعض اوقات دائمی ہوتی ہے اور اس صورت میں اس امت کی شخصیت اور اس کے آثار مٹ جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کے افراد باقی رہیں۔ اقوام کا یہ اٹھنا اور بیٹھنا اللہ کی سنت الٰہیہ کے عین مطابق ہے۔ یہ سنت اس کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کے قوانین کبھی بدلتے نہیں۔ اقوام کا عروج و زوال نہ اتفاقی ہے' نہ بے مطلب ہے' نہ ظلم کے طور پر ہے اور نہ اس میں اللہ کو کسی سے رو رعایت کرنی ہے۔ جو اقوام زندگی اور ترقی کے اصولوں پر عمل کرتی ہیں' وہ زندہ رہتی ہیں اور جو اقوام زندگی اور ترقی کے اصولوں کے خلاف چلتی ہیں وہ مرجاتی ہیں یا کمزور پڑ جاتی ہیں۔ اور سب کچھ ان کے طرز عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ جہاں تک امت اسلامیہ کا تعلق ہے اس کی زندگی کا سامان اتباع رسول میں ہے۔ رسول کی دعوت ہے ہی اس لیے کہ ان کو زندہ کیا جائے' صرف عقیدہ کے اعتبار سے زندہ نہیں' بلکہ اس عقیدے کے مطابق عمل بھی ضروری ہے' اور اس نظام زندگی کا قیام بھی ضروری ہے جس کے لیے اس امت کو برپا کیا گیا ہے۔ اگر یہ امت اپنے مقاصد پورے نہ کرے گی تو پھر اس کا مرنا ضروری ہو گا' یہ ہے سنت الٰہیہ۔

اب سیاق کلام ان کو وجدانی طور پر جھنجوڑتا ہے۔ ذرا ان کی پوزیشن کو بدل کر بات کی جاتی ہے' اس سے قبل تو وہ استہزا کرنے والے اور چیلنج دینے والے تھے۔ اب ان کو دھمکی دی جاتی ہے۔ انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ کسی بھی وقت ان پر عذاب آ سکتا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰:۵۰) "کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آ جائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟" عذاب تو پردۂ غیب کے پیچھے ہے اور تیار

ہے' صرف ہمیں اس کے نزول کا وقت معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم مزے سے سو رہے ہو اور وہ آ جائے' یا دن کو تم کام و کاج میں مصروف ہو اور وہ آ جائے' بیدار ہوتے ہوئے بھی تم اسے رد نہ کر سکو۔ تعجب ہے کہ آخر تم لوگ اس عذاب کی شتابی کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو؟

اس دھمکی کے نتیجے میں اور استفہام انکاری کے نتیجے میں انسانی شعور نے وقوع عذاب کا تصور کیا ہی تھا کہ اگلی آیت میں بتا دیا گیا کہ عذاب تو واقع ہو گیا--- یہ عذاب تو اہل مکہ پر واقع نہیں ہوا لیکن قرآن کریم اسے واقع تصور کر کے اب بتاتا ہے کہ ان کی حالت کیا ہے؟ گویا عذاب واقعہ ہو گیا اور انسانی احساس و شعور اسے محسوس کرتا ہے۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ اٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۰:۵۱) "کیا جب وہ تم پر آ پڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟--- اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے!" گویا یہ عذاب آ چکا' عذاب کو دیکھ کر وہ ایمان لا چکے اور اب ان کو شرمندہ کیا جا رہا ہے کہ اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

اس منظر کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ

(۱۰:۵۲) "پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو' جو کچھ تم کماتے رہے ہو' اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟" یوں ہم سیاق کلام میں میدان حشر میں پہنچ جاتے ہیں جبکہ چند فقرے قبل ہم دنیا میں تھے اور رسول اللہ کا خطاب سن رہے تھے۔

اس مکالمے کے اختتام پر حضورؐ کے ساتھ ان کے ایک مکالمے کا ذکر ہے۔ اس مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اندر سے متزلزل ہیں' اب حضورؐ سے کچھ یقین دہانیاں چاہتے ہیں۔ جواب قرآن کے دو ٹوک انداز میں دیا جاتا ہے۔

وَيَسْتَنْبِئُوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ (۱۰:۵۳)

"پھر پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو "میرے رب کی قسم' یہ بالکل سچ ہے' اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو"۔ میں تو جانتا ہوں کہ اللہ کی شان الوہیت کیا ہے؟ اس لیے میں اسی کے نام سے جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔ اللہ کے نام کی قسم سنجیدہ اور یقینی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سچائی تمہارے سامنے آ جائے گی' تم اس کے حساب و کتاب سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ ضرور سزا دے گا۔

ابھی تو ہم اس دنیا میں سوال و جواب میں مشغول تھے لیکن قرآن کریم کے انداز گفتگو کے مطابق اچانک ہم میدان حشر میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہ تصویر سازی یوں کی جاتی ہے کہ بطور فرض اگر ہم میدان حشر میں پہنچ گئے تو کیا ہو گا۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ (۱۰:۵۴) "اگر ہر اس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے' روئے زمین کی دولت بھی ہو تو اس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیہ میں دینے پر آمادہ ہو

جائے گا"۔ لیکن اس سے یہ بھی قبول نہ کیا جائے گا' اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دولت اس کے پاس آگئی ہے۔

لیکن اگلی آیت میں گویا یہ دولت اس شخص کے پاس آگئی' اس نے پیش کش کر دی اور فدیہ قبول نہ ہوا اور اب وہ شرمندگی چھپا رہا ہے۔ قرآن کریم کا انداز کلام بتا رہا ہے کہ وہاں ایسا شخص بے حد مشقت میں ہے۔

وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۱۰: ۵۴) (مگر ان کے درمیان پورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا' کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا) اب یہ منظر اختتام کو پہنچتا ہے۔ تقریباً نصف آیت قبل تو یہ فرض تھا مگر آخر میں بطور واقع بیان ہوا اور یہ قرآن کریم کا ایک نہایت موثر انداز ہے۔

---○○○---

اب آخری تاکیدی تبصرہ ہے کہ حشر اور حساب و کتاب حق ہے اور ذرا آسمانوں اور زمین میں قدرت خداوندی کا ملاحظہ کرو' ذرا حیات و ممات کے رازوں پر غور کرو' ان سب حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بے مقصد نہیں ہے۔ لوگو' قرآن کریم جو روشنی تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس پر غور کرو' اس سے فائدہ اٹھاؤ' یہ وعظ ہے۔ یہ ہدایت ہے اور تمام روحانی اور نفسیاتی مسائل کا حل ہے جبکہ سیاسی مسائل تو عین دین ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

"سنو' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ سن رکھو! اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔

لوگو' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبیؐ' کہو کہ "یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی' اس پر تو لوگوں کی خوشی منانی چاہئے' یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں"۔

سنو' خبردار! اس جری اعلامیہ کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۰: ۵۵) (آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے) وہ ان سب چیزوں کا مالک ہے۔ وہ ایسا مالک ہے کہ وہ اپنے وعدے کو سچا ثابت کر سکتا ہے' لہٰذا حشر اور نشر کی راہ میں کوئی قوت رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور اس سچائی کی راہ میں کوئی

حائل نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۱۰ : ۵۵) "اللہ کا وعدہ سچا ہے"۔ لیکن اکثر لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے نہیں مانتے اس لیے وہ اس سچائی کی تکذیب کرتے ہیں۔

وَهُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (۱۰ : ۵۶) "وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے ' وہی ہے جو موت دیتا ہے"۔ وہی موت وحیات کا مالک ہے ' اس لیے وہی ہے جو حشر و نشر کا بھی مالک ہے۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۰ : ۵۶) "اس کی طرف پلٹنا ہے"۔ چنانچہ موثر انداز کلام کے بعد یہ فقرہ تاکید مزید ہے۔ اب ایک جامع پکار آتی ہے ' تمام انسانوں کے لیے :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّ

رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰ : ۵۷) "لوگو ' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے"۔ یہ کتاب تمہارے پاس آگئی ہے ' تم اس میں شک کر رہے ہو ' یہ تمہارے رب کی طرف سے وعظ ہے۔ یہ از خود گھڑی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کے مضامین انسانوں کی طرف سے نہیں ہیں۔ یہ نصیحت تمہارے دلوں کو زندہ کرنے کے لیے ہے۔ تمہارے دلوں کی بیماریوں اور خلجانوں کو رفع کرتی ہے ' اور تمہارے دل و دماغ میں جو غلط تصورات جمع ہو چکے ہیں ' ان کو دور کرتی ہے ' ان میں جو فکری کجی ہے ' اس کو دور کرتی ہے ' حیرانی اور پریشانی سے نجات دیتی ہے ' صحت ' عافیت اور یقین کی دولت سے دلوں کو بھر دیتی ہے ' ایمانی اور سلامتی کی راہ بتاتی ہے اور جن لوگوں کو ایمان لانا نصیب ہو جائے ان کو ایمان واثق دیتی ہے اور گمراہی اور عذاب سے نجات ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰ : ۵۸)

"اے نبیؐ ' کہو کہ "یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی ' اس پر تو لوگوں کی خوشی منانی چاہئے ' یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں"۔ یعنی اس کا یہ فضل تھا اور رحمت تھی کہ اس نے یہ قرآن اتارا اور لوگوں کو اس کے ذریعے ایمان نصیب ہوا ' لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس پر خوش ہوں اور یہ بات اس کی مستحق ہے کہ اس پر خوشیاں منائی جائیں۔ رہا اس دنیا کی عزو جاہ اور مال و دولت تو وہ چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ عالم بالا سے نزول رحمت کی خوشی ہی ہے جو انسان کو دنیا کی آلودگیوں اور ایسی باتوں سے سربلند کر دیتی ہے جو زوال پذیر ہیں۔ جہاں تک دنیا کے عزو جاہ اور مال و دولت کا تعلق ہے یہ تو اس دنیا کی زندگی گزارنے کے لیے اسباب ہیں ' انسان دنیا کے خادم ہیں ' مخدوم نہیں ہیں۔ انسان کو دنیاوی اسباب سے سربلند ہونا چاہئے۔ اس کے ماتحت نہیں ہونا چاہئے۔ اسلام یہ تعلیم نہیں دیتا کہ دنیاوی سازوسامان کو ترک کر دیا جائے بلکہ انسان کے زاویہ سے توازن اختیار کرتا ہے اور دنیاوی معاملات کو

اسی قدر اہمیت دیتا ہے جس قدر اہمیت کے وہ مستحق ہیں ۔ انسانوں کو اسلام دنیا کی پرستش اور غلامی سے بھی آزاد کرتا ہے ۔ ان کا نصب العین اور مطمح نظر دنیا سے بلند ہو جاتا ہے ۔ ان کے آفاق نظر دنیا سے وسیع تر ہوتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ایمان بڑی نعمت ہے ' ایمان کے تقاضے پورے کرنا ان کے نزدیک اولیت رکھتا ہے ۔ دنیا ان کی غلام ہوتی ہے ۔ وہ دنیا کے غلام نہیں ہوتے ۔ پس یہ ہے کہ باعث فرحت بات اور اسی پر لوگوں کو خوش ہونا چاہئے ۔

عقبہ ابن ولید بواسطہ صفوان ابن عمرو سے روایت کرتے ہیں ۔ میں نے ایفع ابن عبداللہ الکلاعی کو یہ کہتے سنا کہ جب عراق کا خراج حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو حضرت عمرؓ اور ان کے ایک غلام آزاد کردہ نکلے ۔ حضرت عمرؓ نے اونٹ گننا شروع کیے ' جب گنے تو وہ اس سے زیادہ تھے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا الحمدللہ ۔ اور ان کے مولیٰ نے کہا کہ یہ اللہ کا فضل و رحمت ہے ۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا تم نے جھوٹ بولا ہے ۔ اللہ کا فضل و رحمت اس کو نہیں کہا جو تم کہتے ہو ۔ وہ تو ہے ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۱۰:۵۸)

یوں یہ سمجھتے تھے قرون اولیٰ کے مسلمان ۔ وہ اللہ کے فضل اور رحمت قرآن کو سمجھتے تھے ۔ جس میں ان کے لیے نصیحت و ہدایت اتری تھی ۔ رہا مال و دولت ' اور فتح و سربلندی تو یہ تابع چیزیں تھیں ان کے نزدیک ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو فتح نصیب ہوتی تھی ' ان پر دولت کی بارش ہو رہی تھی ۔ مال ان کو ڈھونڈتا پھرتا تھا ' لیکن وہ دولت ایمانی کے گرویدہ تھے ۔ یہ تھا طریق حیات صحابہ کرام کا ۔ اور یہی ہے زندگی گزارنے کا طریقہ اور راہ ہدایت ۔

مادی اقدار ' سامان زیست ' اور دولت و ثروت ان کے ہاں سامان عظمت نہ تھا ۔ یہ سامان زیست ' یہ مادی اقدار اور دولت و ثروت تو اقوام کی تباہی کا سامان بھی ہو جاتے ہیں ۔ صرف آخرت میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی یہ سامان ہلاکت ہو جاتے ہیں ۔ اور آج مغربی دنیا اس کا پورا نقشہ پیش کرتی ہے ۔

حیات انسان پر حکمرانی کے لیے کچھ اور اقدار درکار ہیں ۔ یہ اقدار سامان زیست اور مادی اقدار اور مال و دولت کو بھی ایک قیمت عطا کرتی ہیں ۔ یہ اعلیٰ اقدار انسان کے لیے ان چیزوں کو باعث سعادت بھی بنا سکتی ہیں لیکن حکمرانی قرآنی اقدار کی ہونا چاہئے ۔

اصل اہمیت ان اقدار کی ہے جو حکمران ہیں ۔ یہ اعلیٰ حکمران اقدار مادی اقدار ' سامان اہمیت اور دولت و ثروت کو یا انسان کی کامیابی کا ذریعہ بنا دیتی ہیں اور یا ان کو لغزش اور گمراہی کا ذریعہ بنا دیتی ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اصل نصب العین دینی اقدار کو بنایا گیا ہے ۔ ذرا غور سے پڑھو : "لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے ۔ اے نبی کہو ' کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی ' اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہئے ' یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں یہ لوگ سمیٹ رہے ہیں" ۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے اس باران رحمت کو پا رہے تھے وہ اس کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جان رہے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ مال اور دولت کو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ سمجھتے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ کا اصل فضل و رحمت قرآن مجید ہے ۔ رہا مال و دولت تو وہ قرآن کے مقابلے میں بہتر نہیں ہے ' نہ خیر ہے ' نہ اس پر خوشی منانا چاہئے ۔

حضرت عمرؓ اپنے دین کو بہت اچھا سمجھتے اور جانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ فضل و رحمت قرآن ہے۔ اسلامی نظریہ حیات ہے' جو اللہ کی طرف سے وعظ اور ہدایت اور روحانی مسائل کا حل ہے۔ جہاں تک گائے اونٹ کا تعلق ہے۔ اس پر صرف الحمدللہ کہا جا سکتا ہے۔

وہ جانتے تھے کہ دین اسلام اور قرآن نے ان کے دل و دماغ میں کس قدر انقلاب فکر پیدا کر دیا ہے۔ قرآن نے جاہلی اقدار بدل دی ہیں اور ہر زمانہ جاہلیت میں قرآن یہی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اور بیسویں صدی کی جاہلیت کو بھی اسلام اسی طرح بدلتا ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب اسلام اور جاہلیت)

اس دین کا بنیادی انقلابی کام یہ ہے کہ یہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالتا ہے۔ انسانی غلامی سے انسانوں کو آزاد کر کے وہ ان کو اللہ وحدہ کی غلامی میں داخل کرتا ہے اور ان کی پوری عملی زندگی کو اس آزادی کے تصور پر استوار کرتا ہے جس کی وجہ سے انسانوں کے خیالات و تصورات' ان کی اقدار اور پیمانے' ان کے اخلاق اور قوانین حیات بدل جاتے ہیں اور ان میں کسی جگہ غلامی نہیں پائی جاتی۔

اس کے بعد سامان زیست اور مادی سہولیات کا مقام آتا ہے۔ مادی برتری اور مادی استقلال اس ایمانی حریت کے نتیجے میں خود بخود حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ دور اول کے مسلمانوں کو حاصل ہوا۔ جبکہ انہوں نے اپنی جاہلیت کے علاوہ اپنے اردگرد دنیا سے تمام جاہلیتوں کی کھال اتار کر پھینک دی۔ اور اس وقت وہ پورے کرۂ ارض پر برتر حکمران بن گئے۔ اور اس اعلیٰ فضل کے زیر سایہ تمام دوسری فضیلتیں بھی انہیں حاصل ہو گئیں۔

جن لوگوں نے مادی اقدار ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہے' جو صرف مادی پیداوار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ان اعلیٰ قدروں کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ دین کے دشمن ہیں بلکہ انسانیت کے بھی دشمن ہیں۔ وہ انسانوں کو اعلیٰ مقام سے گرا کر حیوانات کے مقام ذلیل پر لا کر باندھنا چاہتے ہیں۔

یہ لوگ مادی اقدار کی پیروی میں بھی مخلص نہیں بلکہ مادی اقدار کی دعوت کے ذریعے یہ دینی قدروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان عقائد و نظریات کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو انسان کو حیوان سے اونچا مرتبہ عطا کرتی ہیں۔ یاد رہے کہ دین اسلام اعلیٰ اقدار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی انسانی ضروریات اور میلانات کو بھی نظرانداز نہیں کرتا' بلکہ اسلام انسان کو سامان زیست' مکان اور کپڑے کے علاوہ کچھ اعلیٰ قدریں بھی دیتا ہے۔

ہر طرف سے یہ مسلسل واویلا کہ مادی ترقی پر سب کچھ موقوف ہے' سب سے بڑی چیز مادی پیداوار ہے' لوگوں کے تصورات' ان کی سوچ اور ان کی پوری زندگی کو متاثر کر رہا ہے۔ انسان اپنی انسانیت سے گر کر محض ایک آلہ پیداوار بن گیا ہے۔ پیداوار کی کثرت ہی کو انسان اعلیٰ زندگی تصور کرتا ہے۔ کثرت پیداوار کے لیے اس مسلسل چیخ و پکار نے انسان کی اخلاقی اور روحانی قدروں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ انسان کی تمام قوتیں صرف حصول پیداوار کے لیے صرف ہو رہی ہیں۔ مادی ترقی اور صنعتی پیداوار نے دراصل جاہلیت اولیٰ میں پوجے جانے والے بتوں کی حیثیت اختیار کر لی اور اس طرح مادی ترقی اور صنعتی پیداوار کو اعلیٰ و ارفع مقام دیا جا رہا ہے اور اسی کی قیادت و سیادت تسلیم کی جا رہی ہے۔

جب مادی پیداوار ایک بت بن جائے اور تمام انسان رات دن اس کی بندگی کرنے لگیں اور اس کے آگے جھکنے لگیں تو پھر تمام دوسری اخلاقی اور دینی قدریں اس بت پر نچھاور کر دی جاتی ہیں اور روندی جاتی ہیں۔ نہ پھر کسی قوم کا اخلاقی

نظام رہتا ہے' نہ خاندانی نظام قائم رہتا ہے' نہ اس قوم میں عصمت اور پاکیزگی رہتی ہے' نہ آزادی رہتی ہے اور نہ سوشل سیکورٹی - کیونکہ ان میں سے جو چیز بھی مادی پیداوار کی راہ میں رکاوٹ بنے اسے ختم کر دیا جاتا ہے - یہ ہے مطلب ہمارے اس نظریے کا کہ مادی پیداوار کو جدید دنیا نے معبود بنا دیا ہے - یہ ضروری نہیں ہے کہ جس چیز کی پوجا کی جائے اسے بت کی طرح سامنے کھڑا کر دیا جائے' اصل بات یہ ہے کہ دور جدید میں مادی ترقی اور صنعتی پیداوار کو ایک بت کی شکل دے دی گئی ہے اور اس اعتبار سے وہ معبود ہے -

ایک اسلامی معاشرہ میں اعلیٰ قدر اللہ کا وہ فضل و رحمت ہے' جو دلوں کی کدورت اور بیماری کے لیے شفاء ہے' جو انسان کو انسانوں کی غلامی سے چھڑاتا ہے' جو مادی اقدار کے مقابلے میں اعلیٰ انسانی اقدار کو پروان چڑھاتا ہے اور یہ ہے قرآن اور قرآنی تعلیمات' اس کی روشنی میں انسان اس کرۂ ارض پر صحیح اور متوازن زندگی بسر کر سکتا ہے' اس میں صنعتی ترقی بھی ہوگی' اس میں مادی سہولتوں کی اہمیت بھی ہے اور اس میں وہ تمام جاہلی سہولیات بھی ہوں گی جن کے لیے جاہلیت جدیدہ کے پیروکار مرے جا رہے ہیں -

لیکن قرآنی اقدار فضل و رحمت کی برتری کے سوا تمام مادی سہولیات اور صنعتی پیداوار انسان کے لیے لعنت' مصیبت اور مشکلات کا باعث ہوتی ہیں - کیونکہ قرآن کی اعلیٰ اقدار کی عدم موجودگی کی صورت میں انسان پھر ایک وحشی درندے اور حیوان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور انسان کے اس وحشی پن اور حیوانیت کی خوراک بھی اعلیٰ انسانی اقدار ہوتی ہیں -

صدق اللہ العظیم

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۵۷) قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۵۸) (۱۰:۵۷ - ۵۸))

اس حقیقت کے بیان کے ضمن میں کہ قرآن اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اور یہ لوگوں کے لیے وعظ اور ہدایت کا ذریعہ اور دلوں کی بیماریوں کے لیے ایک شفاء اور علاج ہے - یہاں بتایا جاتا ہے کہ جاہلی نظام کون سا ہوتا ہے اور اس کی بڑی علامت کیا ہوتی ہے - یہ کہ جاہلی نظام کی عملی زندگی قرآن کے مطابق نہیں ہوتی' وہ لوگوں کی اپنی خواہشات کے مطابق ہوتی ہے اور اس میں وہ اللہ کے حق اقتدار اعلیٰ اور حق قانون سازی اور حلال و حرام کی حدود مقرر کرنے کے حق پر دست درازی کرتے ہیں - اپنی مادی زندگی کے لیے حلال و حرام کی حدود خود متعین کرتے ہیں -

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَ مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

"اے نبیؐ ان سے کہو "تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہارے لیے اتارا تھا' اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرالیا"۔ ان سے پوچھو' اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟ جو لوگ اللہ پر یہ جھوٹا افتراء باندھتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہو گا؟ اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے۔ مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو شکر نہیں کرتے"۔

اللہ نے تمہارے لیے یہاں جو سامان زیست بھیجا ہے' اس کے بارے میں تمہارا خیال کیا ہے؟ اللہ بلند ہے اور اس نے اس کائنات کے اندر جو سامان بھیجا ہے' گویا یہ اس کے مقام بلند سے آیا ہے' اس کے استعمال کا ضابطہ تم خود بناؤ گے یا اللہ نے اس کے لیے کوئی ضابطہ کار اور حدود استعمال بھی متعین کیے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ تم خود بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے ہو' یہ حلال کرنا اور حرام کرنا تو قانون سازی ہے اور قانون سازی کا اختیار صرف رب ذوالجلال کو حاصل ہے۔ اور تم خود قانون سازی کا کام کرتے رہو۔

قُلْ آللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۱۰:۵۹) (اللہ نے تم کو اجازت دی ہے یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو) یہ وہ سوال ہے جس کا ذکر قرآن میں بار بار ہوتا ہے۔ اور یہ جاہلیت کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت کلمہ طیبہ کا لازمی تقاضا ہے' بلکہ یہ عین کلمہ طیبہ ہے اور کلمہ طیبہ عملی شکل حلال و حرام کی صورت ہی میں اختیار کرتا ہے۔

یہ اعتراف کہ اللہ خالق و مالک ہے اپنے اندر یہ اعتراف بھی رکھتا ہے کہ معبود اور رب بھی اسی کو ہونا چاہئے۔ اور پھر نظام مملکت بھی اسی کے احکام کے مطابق ہونا چاہئے۔ اور نظام مملکت کے اندر مالیاتی پالیسی سب سے اہم پالیسی ہوتی ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ اور یہ سب چیزیں چونکہ آسمان سے نازل ہوئی ہیں' اور اس بات کا اعتراف مکہ کے مشرکین بھی کرتے تھے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کے لیے آسمانوں سے یہ چیزیں نازل کی ہیں اور آج کے جدید جاہلیت پرست بھی یہ اعتراف کرتے ہیں۔ جس طرح تمام وہ لوگ یہ اعتراف کرتے ہیں جو مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں' لیکن اس اعتراف کے ساتھ ساتھ وہ اپنے لیے حلال و حرام کی حدود و قیود خود متعین کرتے ہیں۔ قرآن کریم ان لوگوں کو متوجہ کرتا ہے کہ تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو' اور اس کے باوجود رزق الٰہی میں سے ازخود بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے ہو' تم رزق کے علاوہ دوسرے شعبوں میں ازخود قانون سازی کرتے ہو۔ حالانکہ قانون بنانا رب العالمین کا کام ہے۔ لہٰذا تم شرک میں مبتلا ہو' لہٰذا دور اول کے زمانے کے بعد جب بھی کوئی سوسائٹی یہ کام کرے گی وہ مشرک سوسائٹی ہوگی۔ اگرچہ نام اور عنوان لوگوں نے اچھے رکھ رکھے ہوں۔ کیونکہ اسلام حقائق کا نام ہے۔ محض نام اور عنوان سے کیا بدلتا ہے۔

عرب جاہلیت کے پیروکار بھی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ جس طرح آج کے نام نہاد مسلمان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں' جاہل عرب جو حلال و حرام مقرر کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ اللہ نے ہمیں یہ اجازت دے دی

ہے یا ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ (بذریعہ اجتہاد) شریعت ہے۔

سورہ انعام میں بصراحت بتایا گیا کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ حلال و حرام جو وہ خود قرار دیتے ہیں۔ یہ اللہ کی شریعت ہے۔ سورہ انعام میں صراحت کے ساتھ آیا ہے

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۚ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (٦ : ١٣٨) (اور وہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور فصل ہیں ممنوع' اسے وہی شخص کھا سکے گا جسے ہم اجازت دیں گے' یہ بات وہ بزعم خود کرتے تھے اور بعض مویشی ایسے ہیں جن کی پیٹھ حرام ہے' اور بعض مویشی ایسے ہیں جن کے اوپر وہ اللہ کا نام لینا ضروری خیال نہیں کرتے' اللہ پر افتراء باندھتے ہوئے' عنقریب اللہ ان کو ان کے اس افتراء کی سزا دے گا) یہ لوگ یہی دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ یہ چاہتا ہے اور یہ نہیں چاہتا۔ اور یہ اپنی جانب سے افترا پردازی کرتے تھے جس طرح آج بعض لوگ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں' از خود قانون بناتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے شریعت ہے' اس کے جواب میں اللہ ان کو کہتا ہے کہ تم افتراء باندھ رہے ہو' اس کے بعد اللہ خود ان سے پوچھتا ہے کہ قیامت کے دن تمہارا کیا حال ہو گا' تم قیامت کو کیا سمجھتے ہو؟

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (١٠ : ٦٠) "جو اللہ پر جھوٹا افترا باندھتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہو گا"۔ یہاں غائب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو اللہ پر افترا باندھتے ہیں ان کا یہی حال ہو گا۔ وہ کیا سمجھتے ہیں؟ قیامت کے دن ان کا کیا حال ہو گا' اس کا اصل تصور درحقیقت ان کے ذہن میں نہیں ہے۔ یہ اس قدر خوفناک سوال ہے کہ سخت سے سخت انسان بھی اس کے سامنے پگھل جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ (١٠ : ٦٠) (اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو شکر نہیں کرتے) اللہ لوگوں پر فضل کرتا ہے' اس کا ایک فضل تو یہ ہے کہ اس نے اس کائنات میں لوگوں کے لیے سامان زیست کے وسیع ذخائر رکھے ہیں۔ پھر اللہ نے انسان کو یہ قدرت اور علم و ہنر دیا ہے کہ وہ اس کائنات سے یہ وسائل رزق نکال رہے ہیں۔ پھر انسانوں نے وہ سائنسی اصول دریافت کر لیے ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں جاری رکھے ہیں۔ پھر اللہ نے انسان کو یہ قدرت دی ہے کہ وہ ان مفید اشیاء کو مختلف صورتوں کی شکل دیتا ہے اور ان کا تجزیہ اور تحلیل کرتا ہے۔ اور یہ سب چیزیں اس کے لیے مفید ہیں اور سامان حیات ہیں۔

پھر اللہ کا فضل یہ ہے کہ اس نے ایک نظام زندگی اور منہاج حیات پر مشتمل ایک کتاب اتاری جس میں ہدایت و رحمت ہے اور وہ دلی روگوں اور بیماریوں کا علاج ہے تاکہ اللہ لوگوں کو ایک صحیح اور متوازن نظام زندگی بھی عطا کر دے جسے وہ اپنی زندگیوں میں نافذ کریں۔ اور ان کو جو قوتیں' جو فکر' سوچ اور شعور دیا گیا ہے وہ اس کے مطابق ان سے

استفادہ کریں اور اس کے ذریعے وہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی پائیں ہیں اور اس طرح ان کی زندگی اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی فطرت میں ہم آہنگی پیدا ہو۔

لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی اس رحمت روحانی پر اور فضل مادی پر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے' وہ اللہ کے نظام سے روگردانی اختیار کرتے ہیں' اللہ کی شریعت سے دور بھاگتے ہیں' اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں' اور اس طرح وہ اپنے آپ کو مشکلات میں ڈال کر اپنی دنیا کو تلخ کرتے ہیں اور آخرت کو خراب کرتے ہیں۔ اور اس ہدایت نامہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے جو شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے۔

ایک گہری حقیقت کی یہ عجیب تصویر کشی ہے کہ یہ قرآن دلی بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔ شفاء کا یہ بھی ایک مفہوم ہے۔ یہ شفاء انسانی دلوں میں اتری چلی جاتی ہے جس طرح ایک بیمار جسم کو شفایابی حاصل ہوتی ہے اور یہ قرآن اپنی خفیہ قوتوں کی وجہ سے دلوں کو شفا بخشتا ہے۔ یہ انسان کے دل و دماغ کے دروازے کھول دیتا ہے اور انسان کی قوائے مدرکہ عظیم حقائق کا ادراک کرتی چلی جاتی ہیں اور ان کو نہایت ہی کیف و سرور اور وجد حاصل ہوتا ہے اور وہ ایک ایسا نظام زندگی عطا کرتا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اگر اسے نافذ کر دیا جائے تو انسانی زندگی کے اندر پائے جانے والے تمام تضادات ختم ہو جائیں' پھر اس کے اندر ایک ایسی شفاء ہے کہ انسان اللہ کی طرف رخ کر کے نہایت ہی مطمئن زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے اللہ کے عدل' انصاف اور جزاء و سزا پر یقین ہو جاتا ہے۔ وہ غلبہ خیر کا طالب ہوتا ہے اور اپنے اچھے انجام کے لیے ساعی اور کوشاں ہوتا ہے۔

غرض یہ مختصری عبارت ہے لیکن اس کے پیچھے حقائق و معانی کا ایک سمندر ہے۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس کا استیعاب کر سکے۔ جس قدر غور کیا' جائے معانی کا ایک نیا سمندر سامنے آتا ہے۔

----ooo----

لوگ شکر نہیں کرتے' لیکن اللہ تو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ وہ تو ظاہر و باطن سے خبردار ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی ذرہ بھی اس کے علم و قدرت سے باہر نہیں ہے۔ اب انسانی ضمیر اور اس کے شعور کو ایک دوسرے زاویہ سے جگانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ انسان حساس ہو کر اس اطمینان کی دنیا میں داخل ہو جائے جو حضور اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ کو حاصل تھا' جو پورے کے پورے یکسو تھے۔ جو کسی سے نہ ڈرتے تھے اور نہ کسی کے سامنے جھکتے تھے' نہ اللہ کے ساتھ کسی وہمی رب کو شریک کرتے تھے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝۶۱ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾
لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا
يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَ
إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَ
النَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾

"اے نبیؐ، تم جس حال میں بھی ہوتے ہو، اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو، اور لوگو، تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔ سنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں۔ عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے، اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

آگاہ رہو! آسمانوں کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خود ساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (کھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت) سنتے ہیں۔

اس حصے کی پہلی آیت ذہن انسان کو اللہ کا جو شعور دیتی ہے، وہ نہایت ہی اطمینان بخش بھی ہے اور نہایت ہی خوفناک بھی ہے۔ بیک وقت خوش کن بھی ہے اور ڈرانے والا بھی ہے۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِن قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ

شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ (۱۰ : ۶۱) "اے نبیؐ، تم جس حال میں بھی ہوتے ہو، اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو، اور لوگو، تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں"۔ انسان کی حالت

کیا سے کیا ہو جائے گی جب وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اسے اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہ گواہ ہے' وہ حاضر ہے اور اللہ اپنی تمام برائیوں کے ساتھ ساتھ حاضر و ناظر ہے۔ اپنی تمام قوتوں اور لشکروں کے ساتھ ساتھ خود بھی شاہد ہے۔ اللہ اس کائنات کا خالق ہے اور اس کے لیے یہ کام بہت ہی آسان ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر چھوٹے بڑے امر کا مدبر ہے۔ اور وہ اپنی پیدا کردہ انسانی مخلوق کے ساتھ ہے۔ ایک چھوٹا سا ذرہ جو اس کائنات کی وسعتوں میں تیرتا ہے' وہ اللہ کے کنٹرول میں ہے۔ یہ ہے وہ حقیقی شعور جو قرآن ایک مومن کے دل میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ شعور بیک وقت خوفناک بھی ہے اور امید افزا بھی۔ امید افزا یوں کہ جب اللہ ایک چھوٹے سے ذرے کو بھی بغیر کسی مونس اور دوست کے نہیں چھوڑتا' اس کی تدبیر بھی کرتا ہے تو اپنے دوست انسان کو کس طرح چھوڑ دے گا۔ اپنے دوستوں کی حمایت و ولایت کس طرح نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ ان کے ساتھ ہو گا۔

وَ مَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ

شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ (۱۰ : ۶۱) "اے نبی' تم جس حال میں بھی ہوتے ہو' اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو' اور لوگو' تم بھی جو کچھ کرتے ہو' اس سب کے دوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں"۔ یہ صرف اس حد تک محدود نہیں ہے کہ اللہ کا علم وسیع اور شامل ہے بلکہ اللہ کی نگرانی اور نگہبانی بھی وسیع ہے وہ رقیب بھی ہے۔

وَ مَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصْغَرَ

مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۱۰ : ۶۱) "کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے' نہ چھوٹی نہ بڑی' جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو"۔

اب اس وسیع کائناتی فضا میں تیرنے والے ہر ذرے کے ساتھ ہمارا راہوار خیال دوڑتا ہے۔ ان سب ذرات کے ساتھ علم الٰہی وابستہ ہے' چھوٹے اور بڑے سب ذرات اور کرات اس کے علم و نگہبانی میں ہیں۔ اللہ کی نگہبانی کی وسعتوں کے بارے میں سوچتے ہی انسان خوف کے مارے کانپ اٹھتا ہے۔ اللہ کا خوف دل پر چھا جاتا ہے اور انسان بیم و رجاء کے درمیان محصور ہو جاتا ہے اور اس کا دل ڈرتے ڈرتے اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔

اب اس انس اور اطمینان اور قرب الٰہی کے تصورات میں اللہ کی جانب سے یہ اعلان آتا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۶۲) الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ

كَانُوْا یَتَّقُوْنَ (۶۳) لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ

اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۶۴) (۱۰ : ۶۲ تا ۶۴) "سنو! جو اللہ کے دوست ہیں' جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا' ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں

زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے ۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں ۔ یہی بڑی کامیابی ہے"۔

سوال یہ ہے کہ اللہ کے دوست کس طرح ڈر سکتے ہیں اور کیوں ان کو خوف لاحق ہو سکتا ہے جبکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے ۔ ہر حال ' ہر عمل ' ہر حرکت اور ہر سکون میں اللہ ان کے ساتھ ہے ' وہ اللہ کے دوست ہیں اور اللہ سے ڈرنے والے ہیں ۔ کیوں نہ اللہ ان کی حمایت کرے گا۔

ان کے لیے ڈر اور حزن و ملال کا مقام ہی نہیں ہے ۔ وہ تو اللہ کے دوست ہیں ' وہ اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں ۔ دنیا و آخرت میں ان کے لیے خوشخبریاں ہی خوشخبریاں ہیں اور یہ اللہ کا وعدہ اور اللہ کا قول ہے اور اللہ کا قول اور اللہ کا وعدہ بدلتا نہیں ہے ۔ لہٰذا اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے ۔

یہاں قرآن کریم جن اولیاء اللہ کا ذکر کر رہا ہے وہ سچے مومن ہیں ' وہ صحیح معنوں میں خدا سے ڈرنے والے لوگ ہیں ۔ ایمان کی حقیقت کیا ہے ؟ یہ کہ وہ دلی یقین ہے جس کی تصدیق و تائید عمل سے ہوتی ہے اور عمل کا مفہوم کیا ہے ؟ یعنی ان باتوں کو نافذ کرنا جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے رکنا جن سے رکنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ۔ یہ ہے وہ طریقہ جس کے ذریعے سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ کے دوست کون لوگ ہوتے ہیں ۔ عوام الناس اولیاء اللہ کا جو مفہوم سمجھتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو مخبوط الحواس ہوتے ہیں اور حواس باختہ ہوتے ہیں ۔

یہاں اللہ کے دوستوں کے بیان کے ضمن میں اللہ کے دوستوں کے سرخیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور تسلی چند کلمات سے خطاب کیا جاتا ہے کہ آپ ان مکذبین کے رویہ سے پریشان نہ ہوں اور نہ آپ ان افتراپردازوں کے افتراء کی پروا کریں ۔ یہ لوگ حضورؐ کے زمانے میں نہایت ہی معتبر اور طاقتور لوگ تھے ۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۰ : ۶۵) "اے نبیؐ' جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں ۔ عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے ' اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے عزت کی نسبت صرف اپنی ذات کی طرف کی ہے اور اس میں رسول اور مومنین کو شریک نہیں کیا جس طرح دوسرے مقام پر لفظ عزت کی نسبت سب کی طرف کی تھی ۔ کیونکہ بات یہ ہو رہی ہے کہ اللہ اپنے دوستوں کو بچانے والا ہے ' اس لیے لفظ عزت کی نسبت صرف اللہ کی طرف کی گئی اور در حقیقت بھی عزیز حقیقی تو اللہ ہی ہے ۔ اور اہل ایمان اور رسول اللہ کی عزت اللہ کی وجہ سے ہے تاکہ نافرمان اہل قریش کو معلوم ہو کہ وہ جو اپنے آپ کو بڑا اور عزیز سمجھتے ہیں وہ کچھ نہیں ہیں ۔ اصل عزت اور غلبہ اللہ کے لیے ہے اور اہل ایمان اور رسول اللہؐ اللہ کی حفاظت میں ہیں ۔ لہٰذا پیغمبر کو ان نافرمانوں کی باتوں پر پریشان نہیں ہونا چاہئے ۔ اللہ اس کے ساتھ ہے جو سمیع و علیم ہے ۔ وہ ان کی باتوں کو سنتا ہے ۔ ان کی سازشوں سے باخبر ہے اور اپنے دوستوں کے بچانے کی تدابیر کرتا ہے ۔ آسمانوں اور زمینوں کی سب قوتیں اس کے ہاتھ میں ہیں ۔ انس و جن اور ملائکہ اس کے قبضے میں ہیں ' نافرمان اور فرمانبردار بھی اس کے دائرہ قوت میں ہیں ۔ اللہ کی مخلوقات میں سے قوی سے قوی تر بھی اس کے قبضے میں ہے ۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (۱۰ : ۶۶) (آگاہ رہو ' آسمانوں کے بسنے

والے ہوں یا زمین کے 'سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں) یہاں مَافِی السَّمٰوٰتِ کے بجائے مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ اس لیے کہا گیا ہے کہ مقصود ذی قوت چیزوں کا ذکر ہے اور ذی قوت خواہ ضعیف ہوں یا قوی وہ زندہ ہوتی ہیں' یعنی سب قوتیں اللہ کے دست ملک و تصرف میں ہیں۔ اور من کے مفہوم میں بھی ہر قوت شامل ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۱۰: ۶۶) "اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خود ساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کر رہے ہیں"۔ یہ شریک حقیقی شریک نہیں صرف وہمی شریک ہیں۔ حقیقت واقعہ میں وہ اللہ کے کسی کام میں شریک نہیں ہیں اور خود یہ شرک کرنے والے بھی اپنے عمل کے بارے میں زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔

اب یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بعض کائناتی کرشمے ذکر کیے جاتے ہیں۔ وہ کرشمے جن سے لوگ غافل ہیں اور ان میں ان شریکوں کا کوئی دخل بادی النظر میں نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ (۱۰: ۶۷) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (کھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت) سنتے ہیں"۔ اس کائناتی حرکت و سکون کا مالک وہ ہے' اس نے رات بنائی جس میں وہ پرسکون رہیں اور دن کو روشن بنایا تاکہ لوگ اس میں حرکت کریں اور دیکھیں اور اللہ بھی ان کو دیکھے۔ یہ اللہ ہی ہے جو حرکت و سکون کی کنجیاں لیے ہوئے ہے۔ یہ اس پوری کائنات پر قدرت رکھتا ہے' وہ اپنے دوستوں کو بچا سکتا ہے۔ وہ اپنے رسول کو بچانے پر قادر ہے۔ اور رسول! وہ تو اس کے دوستوں کے قائد ہیں--- دیکھو! سننے والوں کے لیے اس میں نشانات راہ موجود ہیں' بشرطیکہ وہ سنیں اور تدبر کریں۔

قرآن میں جب اللہ کی ربوبیت اور انسانوں کی بندگی کا موضوع آتا ہے تو اس موضوع پر بطور دلیل اللہ تعالیٰ کائناتی مشاہد کو ضرور پیش فرماتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ کائنات اپنے وسیع و عریض مشاہد کے ساتھ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کا ایک مدبر ہے اور فطرت کے اس گہرے منطقی استدلال کی کوئی دلیل رد نہیں کر سکتی۔ اسی طرح قرآن مجید لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ دیکھو تمہاری زندگی اور اس کائنات کے اندر گہرا ربط ہے۔

لوگو' تم تو دلیل ہدایت کے اندر رہتے ہو' یہ رات جس میں تم رہتے ہو' یہ دن جس میں تم دیکھتے اور پھرتے ہو' یہ دو مظاہر تمہاری حیات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ رات اور دن کا نظام تمہاری زندگی کے ساتھ گہری ہم آہنگی رکھتا ہے۔ یہ ایک مکمل دلیل ہے' اس کے ہوتے ہوئے تمہیں کسی گہرے علمی اور سائنسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ انسانی فطرت اس کائنات کی زبان کو سمجھتی ہے۔

انسان کبھی بھی منطق فطرت کی زبان سے غافل نہیں رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ کائنات کے استدلال پر غور کیا ہے۔

یہاں تک کہ وہ دور جدید کے سائنسی زمانے میں داخل ہو گیا۔ لیکن علیم و خبیر نے تو انسان کو پہلے سے ہی خبردار کر دیا۔ ہاں منطق فطرت علوم و فنون کی تجدید سے جدید ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں انسان علوم اور سائنس میں ترقی کرے گا' وہ اس فطری استدلال کو مزید اچھی طرح سمجھتا رہے گا۔ بشرطیکہ ان کے دل و دماغ کو ایمان کے ذریعے اور اللہ کی نورانیت کے ذریعے وسعت حاصل ہو جائے۔

---o o o---

اللہ کے ساتھ شرک کی ایک شکل یہ تھی کہ اللہ کی اولاد ہے اور عرب مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ اس سبق کے خاتمے پر اس مخصوص قسم کے شرک کو بھی رد کر دیا گیا کہ یہ بھی اللہ پر ایک افتراء ہے۔ اس شرک کو اس دنیا میں استدلال کے ذریعے رد کیا جاتا ہے اور آخرت میں تو اس کے لیے سزا ہی ہوگی :

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾
مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ
ع ۱۰ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ الثلثة

۱۲ "لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سبحان اللہ! وہ تو بے نیاز ہے' آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی ملک ہے۔ تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں؟ اے نبی' کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کر لیں' پھر ہماری طرف ان کو پلٹنا ہے' پھر ہم اس کفر کے بدلے جس کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں' ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔

یہ عقیدہ کہ اللہ کی کوئی اولاد ہے۔ یہ نہایت ہی سادہ لوحی پر مبنی ہے اور یہ ان معاشروں میں پھیلا ہے جن میں سوچنے کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔ ایسے لوگ اس پر یقین رکھتے رہے ہیں جو اللہ کی ربوبیت' ازلیت اور ابدیت اور انسان کی مخلوق اور فانی فطرت کو نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح وہ اس سنت الٰہیہ کے ادراک سے بھی عاجز ہیں۔ فانی تو مرنے والی مخلوق اولاد عطا کرنے کے اندر مضمر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ سلسلہ توالد ہی انسان کے نقص پر دلیل ہے۔ اور اللہ کی طرف کسی نقص کی نسبت نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے وہ مرتا ہے' لیکن زندگی کا سلسلہ وقت معلوم تک باقی ہے' جب تک قیامت نہیں آ جاتی۔ سلسلہ حیات و ممات جاری رہے گا۔ اور سلسلہ توالد امتداد حیات کا ایک ذریعہ ہے۔

انسان بوڑھے ہوتے ہیں' ضعیف ہوتے ہیں اور بچے اس ضعف کا عوض بنتے ہیں اور اس زمین پر اپنا فرض ادا

کرتے ہیں اور اس طرح ضعفاء اور بوڑھوں کے مرنے کے بعد ان کے جانشین ہوتے ہیں۔

انسان اپنے ماحول میں جدوجہد کرتے ہیں۔ وہ اپنے دشمن انسانوں اور حیوانوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں سہاروں اور اولاد کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے حالات میں اولاد انسانوں کے لیے مناسب سہارا ہوتی ہے۔ انسان یہاں اپنے لیے دولت جمع کرتے ہیں اور اس جدوجہد میں اولاد ان کے لیے مفید ہوتی ہے۔ یہ اور اس قسم کی تمام دوسری حکمتیں جن کے مطابق اللہ نے یہاں سلسلہ انسانیت جاری اور ساری فرمایا یہ قیامت تک جاری رہے گا۔

مذکورہ بالا امور میں سے کوئی امر بھی اللہ کے ساتھ متعلق نہیں ہے' نہ مقام ربوبیت کے ساتھ مناسب ہے' نہ اللہ کو اپنی الوہیت کے نظام کو چلانے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہے' وہ بوڑھا نہیں ہوتا کہ اسے اولاد کی ضرورت ہو' نہ وہ محتاج ہوتا ہے کہ اسے نصرت لینے کی حاجت ہو' اسے مال کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ غنی ہے۔ اسے ان اشیاء میں سے کسی کی ضرورت نہیں ہے جس کے بارے میں انسان ضرورت مند ہوتا ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر اللہ کی اولاد کا عقیدہ رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے' کیونکہ الوہیت کی ماہیت ہی یہ ہے کہ اسے خارج کے ساتھ کوئی احتیاج نہیں ہے۔ نہ ان اغراض سے حقیقت الوہیت وابستہ ہے جو بیٹے کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سلسلہ تولید اس لیے جاری فرمایا ہے کہ امتداد حیات کے لیے یہ سلسلہ ضروری تھا۔ نظام انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ اس میں سلسلہ تولید جاری ہو۔

جن لوگوں نے کہا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (۱۰ : ۶۸) ان کے جواب میں صرف یہ کہا گیا

سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِیُّ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۰ : ۶۸) وہ غنی ہے' یعنی سلسلہ تولید کا تعلق تو احتیاج کے ساتھ ہے اور اللہ غنی ہے۔ اس لیے اس کو اولاد کی ضرورت ہی نہیں ہے اور وہ غنی بھی وسیع معنوں میں غنی ہے۔ اس کو ان ضروریات میں سے کوئی ضرورت لاحق نہیں ہے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ لہٰذا اللہ کے لیے اولاد کا تصور ہی عبث ہو گا۔

قرآن کریم طبیعت الٰہیہ اور طبیعت ناسوتیہ جیسی منطقی اور کلامی مباحث میں نہیں پڑتا۔ یہ مباحث متکلمین اور فلاسفہ کے ہاں عام ہیں کیونکہ قرآن کریم عوام الناس کو فطری انداز اور عمومی اسلوب میں مخاطب کرتا ہے۔ قرآن کریم کے موضوع پر جدلیاتی انداز کلام اختیار نہیں کرتا بلکہ ڈائریکٹ انداز میں اور فطرت کے عین مطابق پھر قرآن موضوع پر کوئی بات فرض کر کے کلام نہیں کرتا۔

انسان اپنے آپ کو اولاد کی طرف محتاج سمجھتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم اللہ کی ذات کے حوالے سے ہر قسم کے احتیاج کی نفی کر کے اسے زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک قرار دیتا ہے تاکہ لوگ اس بات پر مطمئن ہو جائیں کہ اللہ کی اولاد کا تصور دراصل ایک لغو تصور۔ یہ ایک فطری انداز کلام ہے اور انسانی فطرت اس سے مطمئن ہو جاتی ہے نہایت آسانی کے ساتھ۔

لیکن قرآن کریم ان کو بھی ایک مشکل صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے جب ان کے عقائد پر خود ان سے استدلال پوچھتا ہے کہ تم جو یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ اللہ کی اولاد ہے تو اس پر تمہارے پاس کیا برہان ہے۔ سلطان بمعنی برہان اس

لیے آتا ہے کہ صاحب دلیل بادشاہ کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔

اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۰:۶۸)

(تمہارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہتے ہو جو تمہارے علم میں نہیں ہیں؟)

ظاہر ہے کہ ان کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہے اور یہ لوگ وہ بات کہتے ہیں جو ان کے ہاں علمی درجہ نہیں رکھتی۔

انسان کے لیے کسی اور کے بدلے میں ایسی بات کا عقیدہ رکھنا جو علمی حیثیت سے ثابت نہ ہو' ایک نقص ہے۔ اور اگر انسان اللہ کے بارے میں کوئی ایسا عقیدہ رکھے تو یہ بڑا نقص اور جرم عظیم ہے۔ یہ بات اللہ کی ذات کے حوالے سے بھی نقص ہے اور انسان کے لیے بھی نقص ہے کہ وہ اپنے خالق کی طرف ایسی بات منسوب کرے جو موجب نقص ہو' جبکہ اللہ تعالیٰ اس نقص سے برتر ہے۔ اللہ کی طرف نقص کا منسوب کرنا' خدا اور بندے کے تعلق کے حوالے سے گمراہی ہے۔ اگر کوئی اللہ کے بارے میں ناقص تصور رکھے گا تو اس کے تمام تصورات دنیاوی امور کے بارے میں بھی ناقص ہوں گے کیونکہ انسان کے تمام تصورات اس کے تصور اللہ کے تابع ہوتے ہیں۔ کاہنوں اور پادریوں نے جو الہیاتی عقائد گھڑے ہیں وہ اسی ناقص تصور اللہ کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً اللہ اور حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلط تصورات' یا ارتکاب گناہ کی کہانی اور اس کا کفارہ وغیرہ تمام عقائد باطلہ ان کے اس اصل عقیدۂ تصور الہٰ کی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر اللہ کے بارے میں ان کے عقیدے میں غلطی نہ ہوتی تو یہ عقائد نہ گھڑے جاتے۔

لہٰذا یہ مسئلہ صرف ایک لاہوتی تصور کا نہیں ہے' بلکہ اس کے نتیجے میں زندگی کے تمام تصورات غلط ہو جاتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں لہٰل کنیسہ نے جس عقل دشمنی اور علوم طبیعیہ کی دشمنی کا بودھا مظاہرہ کیا وہ اسی غلط تصور الہٰ کا نتیجہ تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ تمام انسانی زندگی نے جہاد کر کے اپنے آپ کو کنیسہ کی غلامی سے آزاد کرا لیا۔ بلکہ اس کے نتیجے میں مطلق دین سے پوری انسانیت دور ہو گئی۔ یہ تمام فساد اس لیے برپا ہوا کہ کنیسہ نے اللہ اور عبد کے درمیان تعلق کا ایک غلط تصور دیا' اور اس کے نتیجے میں نہایت ہی غلط تصورات ابھرے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں پوری انسانیت پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بندے اور خدا کے تصور کو نہایت ہی صاف اور شفاف انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں چھوڑا ہے۔ اللہ خالق' ازلی غیر محتاج' صمد' اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ تمام مخلوقات اللہ کی پیدا کردہ اور اس کی غلام ہیں۔ یہ کائنات بھی اللہ کی پیدا کردہ ہے اور اس کے سائنسی ضابطے بھی اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس دنیا میں رہنے والوں نے اگر ان سائنسی ضابطوں کے مطابق زندگی بسر کی تو وہ کامیاب ہوں گے۔ یہ سنت الٰہیہ ہیں اور سنت الٰہیہ کبھی نہیں بدلتی۔ جو شخص سنت الٰہیہ کے مطابق چلے گا' کامیاب ہو گا' جو سنت الٰہیہ کی خلاف ورزی کرے گا' نقصان اٹھائے گا۔ سب انسان برابر ہیں اور سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کے ہاں حساب و کتاب ہو گا اور وہاں کوئی سفارشی نہ ہو گا' اللہ کا کوئی شریک نہ ہو گا' قیامت کے دن ہر شخص انفرادی طور پر جوابدہ ہو گا۔ ہر شخص کے لیے وہی ہو گا جو اس نے کمایا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔

یہ نہایت ہی سادہ عقیدہ ہے۔ اس میں نہ فساد ہے اور نہ تاویل ہے اور پیچیدگی ہے اور نہ انحراف ہے اور نہ گمراہی

اور کجی ہے۔ اس عقیدے کے نتیجے میں انسان کا یہ تصور سامنے آتا ہے کہ سب انسان اللہ کے سامنے جوابدہ ہیں' سب شریعت کے تابع ہیں' سب ذمہ دار ہیں' یہی وجہ ہے کہ سب کے سب باہم بھائی بھائی ہیں اور ان کے آپس میں تعلقات بہت ہی اچھے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا تصور الٰہ اور عقیدہ' عقیدۂ توحید درست ہے۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ (۱۰ : ۶۹) "کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے"۔ وہ کسی معنی میں بھی فلاح نہیں پا سکتے۔ وہ کسی راہ پر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ نہ دنیا میں کامیاب ہوں گے نہ آخرت میں۔ مکمل کامیابی اس قوم کو حاصل ہوتی ہے جو سنن الٰہیہ پر قائم ہو جس میں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ جس میں انسانیت کی رفعت ہوتی ہے' جس میں انسانی سوسائٹی کی بھلائی ہوتی ہے' جس میں زندگی ترقی پاتی ہے' جس میں زندگی آگے بڑھتی ہے۔ وہ ایسی زندگی نہیں ہوتی جس میں محض صنعتی اور مادی پیداوار کے لیے تمام اخلاقی اور روحانی اقدار کو قربان کر دیا جاتا ہو۔ اور انسان کو انسانی مرتبے سے گرا کر حیوان بنا دیا جاتا ہو۔ یہ تو وقتی کامیابی ہوتی ہے' اور اس میں انسانیت کو جزوی فلاح تو حاصل ہوتی ہے لیکن کلی فلاح حاصل نہیں ہوتی۔

مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ نُذِیْقُھُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ (۱۰ : ۷۰) (دنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کر لیں' پھر ہماری طرف ان کو پلٹنا ہے' پھر ہم اس کفر کے بارے جس کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں' ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے)۔

یعنی یہ مزہ صرف مزہ ہے اور نہایت ہی مختصر وقت کے لیے ہے۔ یہ کٹ جانے والا مزہ ہے' کیونکہ یہ دائمی فلاح پر مبنی نہیں ہے جو انسانیت کے شایان شان ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر آخرت میں وہ عذاب شدید سے دوچار ہوں گے۔ ان کا تصور الٰہ' الٰہ کے شایان شان نہ تھا' اس لیے ان کی فلاح انسان کے شایان شان نہیں ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۹۷ ایک نظر میں

اس سورہ کے آغاز میں ازمنہ گزشتہ کے بارے میں اشارہ کیا گیا تھا کہ ان میں کئی اقوام نے انبیاء کی تکذیب کی تھی اور وہ انجام ناسور سے دوچار ہوئے تھے اور اللہ نے ان کو ہلاک کر کے دوسری اقوام کو ان کی جگہ بسایا تھا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (١٣) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (١٤) (١٠ : ١٣ – ١٤) "تم سے قبل ہم نے قوموں کو ہلاک کیا جب انہوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول آئے دلائل کے ساتھ، لیکن وہ مان کر دینے والے نہ تھے۔ اس طرح ہم قوم مجرم کو جزاء دیتے ہیں۔ ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو"۔

اس سے قبل یہ بات بھی اسی سورت میں آئی تھی کہ ہر امت کے پاس رسول بھیجے گئے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(١٠ : ٤٧) (ہر امت کے لیے ایک رسول ہوتا ہے، جب ان کا رسول ان کے پاس آتا ہے تو ان کے معاملے کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا)

اب اس سبق میں انہی دو موضوعات پر بات آگے بڑھتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے قصے کا ایک پہلو یہاں لایا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ اور فرعون کے قصے کا بھی ایک پہلو لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ تکذیب کا انجام کیا ہوتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ جب رسول آ جاتا ہے اور پیغام سنا دیا جاتا ہے تو پھر انجام یوں ہوتا ہے :

ایک اشارہ حضرت یونس ؑ کی قوم کی طرف بھی یہاں آتا ہے کہ اس قوم پر عذاب آنے ہی والا تھا کہ وہ ایمان لے آئی۔ اور اس کا ایمان قبول ہوا اور اسے نجات مل گئی۔ یہ مکذبین کے لیے ایک اشارہ ہے کہ وہ وقت کو غنیمت سمجھیں اور فیصلہ سے قبل ہی ایمان لے آئیں اور جس عذاب سے انہیں ڈرایا جاتا ہے اس سے بچ جائیں اور اس کا انجام ایسا نہ ہو جس طرح قوم نوح یا قوم فرعون کا ہوا۔

اگلے سبق کا خاتمہ اس بات پر ہوا تھا کہ حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ ان لوگوں کو متنبہ کریں جو اللہ پر افترا باندھتے

ہیں۔اور وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور کہا گیا تھا۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ (۶۹) مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ نُذِیْقُھُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ (۷۰) (۱۰:۶۹

— ۷۰)) ”کہہ دو‘ جو لوگ اللہ پر جھوٹ کا افترا باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے‘ دنیا کے مزے ہیں۔پھر ہماری طرف لوٹنا ہے‘ پھر ہم ان کو چکھائیں گے شدید عذاب‘ اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے) اور یہ دھمکی ان کو رسول اللہ نے اس لیے دی کہ ان کو مطمئن کر دیا جائے۔

وَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُھُمْ اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا (۱۰:۶۵) ”اور آپ کو ان کی یہ بات غم میں نہ ڈال دے‘ بے شک عزت سب کی اللہ کے لیے ہے) اور یہ کہ اللہ کے اولیاء کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ حزن کا مقام ہے۔اب حضورؐ کو مزید حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے سامنے قصہ نوح پڑھیں کہ کس طرح مکذبین ہلاک ہوئے اور مومنین نے نجات پائی اور پھر زمین کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا۔اس قوم کے مکذبین نہایت ہی طاقتور اور بڑی تعداد میں تھے۔

اس سورت کے موضوع کے ساتھ ان قصص کی مناسبت ہے۔قرآن مجید میں قصص ہمیشہ سورت کے اصل موضوع کی تائید میں لائے جاتے ہیں۔اور مختلف سورتوں میں موضوع سورت کی مناسبت سے قصص لائے جاتے ہیں‘ یعنی قصص کی وہی کڑی لائی جاتی ہے جو موضوع سخن کے مناسب ہو۔یہاں قصہ نوح ؑ‘ قصہ فرعون اور حضرت یونس ؑ کے قصے کی اس سورت کے موضوع کے ساتھ مناسبت ہے کہ حضورؐ ویسے ہی حالات میں اپنے ساتھیوں کی مختصر اور کمزور جمعیت کے ساتھ کام کر رہے تھے جس طرح حضرت نوح ؑ اور حضرت موسیٰ ؑ کر رہے تھے اور بالمقابل قوت اس طرح تھی جس طرح ان انبیاء کے بالمقابل قومیں تھیں۔لیکن نتائج یہاں بھی ایسے ہی نکلیں گے جیسے ان اقوام کے نکلے۔ قصص کے ربط کے سلسلے میں تفصیلی بات آئندہ ہوگی۔

---○○○---

درس نمبر ۹۷ تشریح آیات

۷۱ ۔۔۔۔ تا ۔۔۔۔۔ ۱۰۳

وَ اتۡلُ عَلَیۡہِمۡ نَبَاَ نُوۡحٍ ۘ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اِنۡ کَانَ کَبُرَ عَلَیۡکُمۡ مَّقَامِیۡ وَ تَذۡکِیۡرِیۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَعَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡتُ فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَکُمۡ وَ شُرَکَآءَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُنۡ اَمۡرُکُمۡ عَلَیۡکُمۡ غُمَّۃً ثُمَّ اقۡضُوۡۤا اِلَیَّ وَ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَمَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۙ وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۷۲﴾ فَکَذَّبُوۡہُ فَنَجَّیۡنٰہُ وَ مَنۡ مَّعَہٗ فِی الۡفُلۡکِ وَ جَعَلۡنٰہُمۡ خَلٰٓئِفَ وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۷۳﴾

"ان کو نوح ؑ کا قصہ سناؤ' اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے برادران قوم' اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے' تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو' اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو' اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے' پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں"۔ انہوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے' بچا لیا اور انہی کو زمین میں جانشین بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ پس دیکھ لو کہ جنہیں متنبہ کیا گیا تھا (اور پھر بھی انہوں نے مان کر نہ دیا) ان کا کیا انجام ہوا"۔

یہاں قصہ نوح ؑ کی آخری کڑی پیش کی گئی ہے۔ طویل ڈرانے اور سمجھانے کے بعد اور طویل تبلیغ و تکذیب کے

بعد اس قصے کا آخری منظر یہاں لایا گیا ہے۔ یہاں سفینے اور اس کے سواروں کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ نہ طوفان کا ذکر ہے' نہ قصے کے اس حصے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہاں مقصد صرف یہ بتانا ہے چیلنج دے کر اللہ پر بھروسہ کیا جائے اور انجام سامنے لایا جائے جس میں رسول کامیاب نظر آئے' اہل ایمان کامیاب و کامران ہوں اور مکذبین ہلاک و برباد ہوں۔ اگرچہ وہ قوی اور کثیر ہوں۔ اس لیے یہاں قصے کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے۔ صرف آخری انجام و تحدی کا ذکر ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۰ : ۷۱) "ان کو نوح کا قصہ سناؤ' اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے برادران قوم' اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے' تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو' اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو' اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے' پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو"۔

اگر تم اس قدر تنگ ہو گئے ہو اور تمہارے اندر میرا کام کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے اور تم میری یاد دہانی کو بالکل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو' اور میں اپنی راہ پر رواں ہوں۔ میرا صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔

فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ (۱۰ : ۷۱) "میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے"۔ صرف اللہ پر اور میرے لیے کافی ہے اس کے سوا مجھے کسی مددگار اور دوست کی ضرورت نہیں ہے۔

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ (۱۰ : ۷۱) "تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو"۔ یعنی اپنے معاملے کے ہر پہلو پر غور کر لو' اپنی تیاریاں مکمل کر لو اور خوب جتھا بنا لو۔

ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً (۱۰ : ۷۱) "اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو' اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے"۔ تمہارا منصوبہ تمہارے دلوں میں واضح ہو' اس میں کوئی التباس نہ ہو' نہ پیچیدگی ہو' نہ تردد ہو اور نہ پھر واپسی پختہ فیصلہ کر لو۔

ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ (۱۰ : ۷۱) "پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لاؤ"۔ یعنی جو عزم تم نے کر لیا ہے اسے نافذ کرو' میرے خلاف جو تدابیر تم نے سوچ لی ہیں' ان کو نافذ کرو' لیکن اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور منصوبے کے ساتھ۔

وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۰: ۷۱) "اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو"۔ یعنی مجھے تیاری کی مہلت بھی نہ دو' کیونکہ میری تیاری صرف یہ ہے کہ میں اللہ وحدہ پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہوں اور اس کے ساتھ تمام وسائل تو محض وسائل ہی ہوتے ہیں - یہ نہایت ہی پر تاثیر تحدی ہے اور اس قسم کا چیلنج وہی شخص دے سکتا ہے جسے اپنی قوت پر پورا پورا اعتماد ہو اور اپنی تیاریاں مکمل نظر آتی ہوں' اور وہ دشمن کو اعتماد دلا رہا ہو کہ وہ بہرحال حملہ آور ہو جائیں - سوال یہ ہے کہ حضرت نوح ؑ کے پاس کوئی جنگی تیاری نہ تھی' نہ اسلحہ نہ تعداد افراد' دنیاوی قوتوں کے اعتبار سے ان کے پاس کوئی قوت نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ایمان تھا۔ ایمان وہ قوت ہے جس کے مقابلے میں کوئی قوت ٹھہر نہیں سکتی - اس کے مقابلے میں افراد کی بڑی تعداد بھی چھوٹی ہو جاتی ہے - ایمان کے مقابلے میں تمام دنیاوی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں ان کی پشت پر خدا کی کوئی قوت تھی اور خدا کی قوت کے مقابلے میں کوئی ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ اللہ اپنے دوستوں کو یکہ و تنہا نہیں چھوڑتا۔

اللہ وحدہ پر ایمان لانا اتنی عظیم قوت ہے' کہ اس کے ذریعے مومن کا رابطہ اس قوت سے ہو جاتا ہے جس کے کنٹرول میں زمین و آسمان ہیں اور وہ تمام افراد و اشیاء ہیں جو زمین و آسمان کے اندر ہیں - حضرت نوح ؑ کا یہ چیلنج محض دھمکی نہ تھی' نہ کوئی جسورانہ اقدام تھا' نہ خودکشی کا اقدام تھا ---------- یہ درحقیقت عظیم الہٰی قوت کی جانب سے چیلنج تھا اور یہ چیلنج ایسی جنگی قوت کو تھا جو الہٰی قوت کے سامنے حقیر تھی۔

انبیاء ؑ کی سیرتوں میں داعیان حق کے لیے نمونے اور نشانات راہ ہیں ان کو چاہئے کہ وہ اللہ پر یقین اور بھروسہ سے اپنے جام قلب کو لبریز رکھیں اور عظیم سے عظیم تر طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں اللہ پر بھروسہ کر کے دیوار بن جائیں -

طاغوت اہل ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا' وہ چھوٹی موٹی اذیتیں ہی دے سکتا ہے - اور یہ اذیت بھی اللہ کی طرف سے بطور ابتلا آتی ہے' اس لیے آتی کہ اللہ نعوذ باللہ اپنے دوستوں کی مدد سے عاجز ہے' یا یہ کہ اللہ اپنے دوستوں کو یکہ و تنہا چھوڑ دیتا ہے - یہ ابتلا اس لیے آئی ہے کہ لوگوں کی اصلاح ہو جائے' ان کے دل و دماغ صاف ہو جائیں - ان کے اندر اخلاص پیدا ہو جائے - اس کے بعد آخری فتح بہرحال اہل ایمان کی ہوتی ہے اور آخر کار اللہ زمین کا اقتدار اعلیٰ اہل ایمان کو دیتا ہے - اللہ تعالیٰ اپنے بندے حضرت نوح ؑ کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ اپنے دور کی طاغوتی قوتوں کو چیلنج دے رہے ہیں' یہ چیلنج نہایت ہی واضح ہے' مناسب ہے کہ ہم دراصل قصے ہی کو پڑھیں :

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ

الْمُسْلِمِيْنَ (۱۰: ۷۲) "تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے - اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں"۔ اگر تم مجھ سے منہ پھیرتے ہو تو تم جانو اور تمہارا کام' میں جو تمہیں راہ راست دکھاتا ہوں تو اس سے میری کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہیں ہے کہ مجھے نقصان ہو گا۔ میرا اجر تو اللہ پر ہے - اس لیے مجھے اپنی راہ اور اپنے نظریہ پر چلنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی - میں اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کروں گا۔ لہٰذا میں اسی قدر مکلف ہوں کہ اپنی زندگی کو تمہارے

سامنے نمونہ بنا کر پیش کر دوں۔

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَهُ وَمَنْ مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَهُمْ خَلَئِفَ فِي الْأَرْضِ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَتِنَا (۱۰ : ۷۳) "انہوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے، بچا لیا اور انہی کو زمین میں جانشین بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا"۔ یہ ہوا مختصراً ان کا انجام۔ حضرت نوح ؑ اور کشتی میں سوار ہونے والے آپ کے ساتھی یعنی اہل ایمان اور باقی غرق ہوئے اور اہل ایمان کو زمین کا اقتدار ملا۔ اہل طاغوت اپنی قوت اور کثرت کے باوجود غرق ہوئے۔

فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ (۱۰ : ۷۳) "پس دیکھ لو کہ جنہیں متنبہ کیا گیا تھا (اور پھر بھی انہوں نے مان کر نہ دیا) ان کا کیا انجام ہوا"۔ یعنی تمام جہاں نے دیکھ لیا کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے اور اہل ایمان کے انجام سے بھی کوئی عبرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو حاصل کرے۔

یہاں نہایت ہی اختصار سے قصہ کی طرف اشارہ کر کے اہل ایمان کی نجات کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ حضرت نوح ؑ اور اس کے ساتھی معدودے چند ہیں اور کافر نہایت ہی مضبوط اور تعداد میں بے شمار ہیں۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ ہلاک ہوئے بلکہ ان چند اہل ایمان کو زمین کا اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا اور انہوں نے اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام حیات کو نافذ کر کے ایک عرصے تک حکمرانی کی اور اپنا کردار ادا کرتے رہے حالانکہ بظاہر وہ کمزور و ناتواں تھے۔

یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر سنت الہیہ، یہ ہے کہ اللہ کا مستقل وعدہ اپنے دوستوں کے ساتھ۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں کو یہ بات پلے باندھ لینا چاہئے کہ وہ اس راہ کی طوالت سے گھبرا نہ جائیں۔ ان کو یقین کرنا چاہئے کہ آخری انجام اہل ایمان کا ہے۔ اور انہی کو فتح نصیب ہونی ہے۔ ان کو اپنی راہ پر چلنا چاہئے، چلتے رہنا چاہئے اور اللہ کے وعدے کے ظہور کے لیے جلدی نہ کرنا چاہئے۔ اللہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہ دھوکہ کرتے ہیں، نہ اللہ ان کی نصرت سے عاجز ہے، نہ وہ اپنے دوستوں کو یکہ و تنہا چھوڑنے کا عادی ہے لیکن اللہ ان کو آزمانا ضرور ہے۔ ان کو تربیت ضرور دیتا ہے اور ابتلاء و آزمائش تو زاد راہ ہیں۔

---ooo---

یہاں حضرت نوح ؑ کے بعد آنے والے رسولوں کی طرف بھی اختصار کے ساتھ اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ دلائل و معجزات لے کر آئے لیکن مکذبین کی روش بھی وہی رہی :

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِ الْمُعْتَدِينَ ﴿۷۴﴾

"پھر نوح ؑ کے بعد ہم نے مختلف پیغمبروں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر جس چیز کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا' اسے پھر مان کر نہ دیا۔ اس طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں"۔

یہ سب رسول اپنی اپنی قوم کے پاس آئے' دلائل لے کر آئے' قرآن کریم کہتا ہے "مگر جس چیز کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا' اسے پھر مان کر نہ دیا" یعنی آیات و معجزات کے صدور سے قبل بھی انہوں نے جھٹلایا' اور آیات و معجزات کے صدور کے بعد بھی جھٹلایا اور آیات کی وجہ سے ان کے عناد میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک تو ہے یہ مفہوم دوسرا مفہوم یہ ہے کہ قرآن طاغوتی قوتوں کو ایک ہی جماعت تصور کرتا ہے کیونکہ ان کا مزاج اور ان کی روش ہی ایک ہوتی ہے۔ اس لیے یہ لوگ اس چیز پر ایمان نہیں لا سکتے جس کی تکذیب ان کے اسلاف نے کر دی تھی یا خود انہوں نے کی جبکہ وہ ان کے اسلاف کی صورت میں متشخص تھے۔ کیونکہ یہ انہی کی اولاد ہیں۔ ان کا مزاج ایک ہے' سوچ ایک ہے اور موقف ایک ہے۔ وہ قرآنی دلائل کے لیے اپنا دل نہیں کھول رہے' وہ اپنی عقل سے کام لے کر ان دلائل پر غور نہیں کرتے' ان لوگوں نے راہ اعتدال اور حد اعتدال سے تجاوز کر لیا ہے اور صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذرائع ادراک کو معطل کر دیا ہے اور اس طرح حق کے نفوذ کی خاطر ان کے دلوں کی تمام راہیں بند ہو چکی ہیں اور یہ اللہ کی سنت ہے کہ "اسی طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔

یہ اللہ کی قدیم سنت ہے کہ اگر صاحب قلب اپنے قلب کو سچائی کے لیے بند کر دے تو وہ منجمد ہو کر پتھر کی شکل اختیار کر لیتا ہے لہٰذا اس کے اندر حق کا نفوذ نہیں ہو سکتا۔ یہ صورت نہیں ہوتی کہ اللہ نے آغاز خلق میں سے کسی کو ہدایت سے محروم کر دیا اور وہ مجبوراً محروم ہوا۔

---ooo---

جہاں تک قصہ فرعون کا تعلق ہے تو وہ چیلنج اور تکذیب کے مرحلے سے شروع ہوتا ہے اور فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے پر وہ ختم ہوتا ہے۔ یہ قصہ نوح ؑ سے قدرے طوالت کے ساتھ بیان ہوا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ مشرکین مکہ نے بھی تحریک اسلامی کے مٹھی بھر کارکنوں کے حوالے سے وہی موقف اختیار کیا ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ اور کمزور بنی اسرائیل کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَ هٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ىِٕهٖ
بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ
عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ مُوْسٰۤى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا
جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا
وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۳﴾

"پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا' مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے ۔پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے ۔موسیٰ نے کہا "تم حق کو یہ کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے سامنے آگیا؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے"۔ انہوں نے جواب میں کہا "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے؟ تمہاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں"۔

یہاں آیات سے مراد وہ معجزات ہیں جن کی تفصیل سورت اعراف میں بیان ہوئی ہے' لیکن یہاں ان کی تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ سیاق کلام میں تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے ۔یہاں اجمالی تذکرہ ہی ضرورت پوری کر دیتا ہے ۔یہاں اصل مقصود یہ ہے کہ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین دعوت کو قبول کریں اور دلائل و معجزات کو سمجھیں ۔

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۱۰ : ۷۵) "مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے"۔ یہاں نہایت ہی تہدید آمیز لہجے میں کہا جاتا ہے

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا (۱۰ : ۷۶) (جب ہمارے پاس سے حق ان کے پاس آگیا) مقصد یہ ہے کہ ان کا جرم بہت ہی ناپسندیدہ اور گھناؤنا ہے کہ ہماری طرف سے بات آجائے تو پھر بھی۔

قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۰ : ۷۶) "تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے"۔ یعنی وہ بات بلا دلیل کرتے ہیں لیکن اسے اس قدر تاکیدی الفاظ میں کہتے ہیں "بے شک یہ تو کھلا جادو ہے"۔ اور یہ انداز کلام ایسا ہے کہ ہر دور میں سچائی کو جھٹلانے والے ایسی ہی بات کرتے ہیں ۔یہی بات اسی انداز میں مشرکین قریش بھی کرتے تھے اور ان سے بہت ہی قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو دیکھ کر فرعون نے بھی یہی بات کہی تھی اور دور جدید کے اسلام دشمن بھی یہی بات کرتے ہیں۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ اَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ

(۱۰ : ۷۷) "موسیٰ نے کہا' تم حق کو کہتے ہو جب وہ تمہارے سامنے آگیا؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے"۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حقیقی فقرہ تو یوں تھا کہ تم حق کو کہتے ہو کہ یہ جادو ہے؟ کیا یہ جادو ہے؟ لیکن دوسرے فقرے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ حق کے بارے میں کیا کہتے تھے ۔اس لیے اسے حذف کر دیا۔ اب پہلے فقرے کا مطلب ہے کہ حق کو جادو کہنا ایک منکر بات ہے اور دوسرے فقرے کا مطلب ہے کہ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ نہایت ہی مکروہ بات کرتا ہے' یہ کیوں ناقابل توقع بات ہے؟ اس لیے کہ جادو اور جادوگروں کے مقاصد یہ نہیں ہوتے کہ وہ لوگوں کو ہدایت دیں' نہ جادوگر کا کوئی نظریہ ہوتا ہے ۔جادوگروں کے کوئی باقی تصورات نہیں ہوتے' نہ ان کا

موضوع حق و باطل میں تمیز کرنا ہوتا ہے۔ نہ جادوگر کوئی نظام زندگی پیش کرتے ہیں اور لوگوں کو اس نظام کی طرف دعوت دیتے ہیں لہٰذا دعوت اسلامی اور جادوگر کا باہم التباس نہیں ہو سکتا۔ جادوگروں کو ان اہداف و مقاصد سے کیا غرض جو حضرت موسیٰ کے سامنے ہیں۔ پھر یہ کہ جادوگر تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ جادوگری اور شعبدہ بازی تو محض تخیل اور ملمع کاری ہوتی ہے۔ آخر کار جادو کا عمل زائل ہو جاتا ہے۔

لیکن فرعون کے عمائدین یہاں اپنے وہ رجحانات بتا دیتے ہیں جن کی بنا پر وہ دعوت حق اور ان معجزات و دلائل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ

(۱۰ : ۷۸) ”انہوں نے جواب میں کہا: کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا تھا اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے، تمہاری بات ہم ماننے والے نہیں ہیں“۔

اصل بات یہ ہے کہ ان کو اپنے موروثی عقائد کی ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ ہے، کیونکہ ان عقائد اور تصورات پر تو ان کا سیاسی اور اقتصادی نظام استوار تھا، بات دراصل یہ تھی کہ ان کو اپنے اقتدار اعلیٰ کے خاتمے کا خطرہ تھا اور یہ اقتدار اعلیٰ قائم بھی ان عقائد پر تھا جو ان کے موروثی خرافات پر قائم تھا۔

انکار حق کا یہی سبب قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ اسی سبب کی بنا پر سرکش لوگ ہمیشہ سچائی کی دعوت کو رد کرتے ہیں اور پھر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف قسم کے عذرات گھڑتے ہیں۔ اور داعیان حق پر قسم قسم کے الزامات عائد کرتے ہیں۔ اور اسلامی تحریکات کے مقابلے میں فسق و فجور اور ظلم و ستم لے کر آتے ہیں۔ اصل بات اَلْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ کی ہے، اصل جھگڑا یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنی قوت کے بل بوتے پر اس کرۂ ارض پر اپنا کھوٹا اقتدار اعلیٰ قائم کر رکھا ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ جن کھوٹے افکار اور تصورات کی وجہ سے ان کا اقتدار قائم ہے اور جو عوام الناس کے دلوں میں رچے بسے ہیں وہ جوں کے توں رہیں۔ اگرچہ وہ محض اوہام و خرافات ہیں۔ اگر لوگوں کا دل و دماغ صحیح عقائد کے لیے کھل گیا اور وہ نئی روشنی سے آگاہ ہو گئے اور ان کا دل و دماغ منور ہو گیا تو اس کے نتیجے میں موروثی اقدار تباہ ہو جائیں گی۔ لوگوں کے دل و دماغ پر سے ان سرکشوں کا رعب جاتا رہے گا اور وہ بنیادیں ہل جائیں گی۔ جن پر ان کا اقتدار قائم ہے۔ صریح الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اوہام و بت پرستی کے تصورات پر ان کا جو اقتدار قائم ہے اس کے لیے خطرہ ہے، کیونکہ ان سرکشوں نے تو عوام الناس کو غیراللہ کا غلام بنا رکھا ہے جبکہ تمام انبیاء کی دعوت یہ رہی ہے کہ لوگوں کو تمام انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے اور اس کرۂ ارض پر سے ان تمام انسانوں کی حکمرانی کو ختم کر دیا جائے جنہوں نے اللہ کی حکمرانی، ربوبیت اور حاکمیت کو غصب کر رکھا ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ کی حاکمیت کو قائم کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غاصب حکمران ہمیشہ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں کہ عوام الناس کے کانوں تک ایسے خیالات نہ پہنچ جائیں۔ اس لیے اس قسم کے سرکش حکمران اس بات کی اجازت کب دے سکتے ہیں کہ لوگوں کی گردنوں کو غلامی سے نجات دے کر صرف اللہ کی غلامی میں داخل کیا جائے۔ اور پھر ان نظریات کی دعوت کھلے بندوں عوام الناس تک پہنچ جائے۔ کیونکہ ایسے حکمران اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ تو ان کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ایک قسم کی

بغاوت ہے۔ اور انقلابی کوشش ہے۔ ان کی حکومت کو ختم کرنا ہے اور انسان جن کو انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے غلام اور مقید رکھا ہوا ہے اسے آزادی کی ایسی فضا فراہم کرنا ہے جو انسانیت کے لائق ہو اور یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

غرض حق و باطل کی کشمکش کے پیچھے یہی حقیقی علت ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی عوام کو رب العالمین کی طرف بلاتا ہے یہ کشمکش جاری ہو جائے گی۔

کیا قریش کے اکابر نہیں سمجھتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچائی اور صداقت اور راستی کی جو دعوت دیتے ہیں اس کی قوت کیا ہے؟ اور ان کے شرکیہ عقائد میں کھوٹ اور فساد کیا ہے؟ وہ بالکل جانتے تھے لیکن وہ ساتھ ساتھ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ جدید دعوت کو قبول کرتے ہیں تو ان کا موروثی مقام و مرتبہ ان سے چلا جائے گا۔ کیونکہ وہ تو انہی خرافاتی عقائد پر قائم ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے جس کا اندیشہ فرعون کے حاشیہ بردار اور افسران نے ظاہر کیا تھا اور کہا تھا وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۷۸) (ہم ہرگز تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں)۔

---o o o---

فرعون اور اس کے درباریوں نے اب یہ سوچا کہ انہوں نے موسیٰ ؑ پر جادوگری کا الزام لگا دیا ہے' لہٰذا مناسب ہے کہ اسے مناظرے اور مقابلے کی شکل میں ثابت کر کے عوام الناس کو اچھی طرح باور کرا دیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے انہوں نے مقابلہ جادوگری کی ایک عظیم مجلس کے انعقاد کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ثابت کریں کہ موسیٰ ایک بڑے جادوگر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس طرح ان کا موجودہ نظام اور ان کے خیالات اس عظیم خطرے سے بچ نکلیں گے جو انہیں درپیش ہے۔ کیونکہ ان کا اقتدار ان خیالات اور ان پر مبنی نظام پر ہی قائم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس تقریب کے انعقاد کی اصل غرض و غایت یہی تھی۔ جب اعیان مملکت نے حضرت موسیٰ ؑ کی تحریک سے یہ محسوس کر لیا کہ وہ انقلاب برپا کر سکتے ہیں تو انہوں نے کہا۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

۸ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

۱۲ ع

۱۳ "اور فرعون نے (اپنے آدمیوں سے) کہا کہ "ہر ماہر فن جادوگر کو میرے پاس حاضر کرو"۔ جب جادوگر آگئے تو موسیٰ ؑ نے ان سے کہا' جو کچھ تمہیں پھینکنا ہے' پھینکو"۔ پھر جب انہوں نے اپنے انچھر پھینک دیے تو موسیٰ ؑ نے کہا "یہ جو کچھ تم نے پھینکا ہے یہ جادو ہے' اللہ ابھی اسے باطل کیے دیتا ہے' مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا اور اللہ اپنے فرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے' خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہے"۔

یہاں معاملے کے بیان میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں مقصد صرف مقابلے کے نتائج کا ذکر

ہے۔حضرت موسیٰ ؑ نے جو کہا

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ (۱۰ : ۸۱) "یہ جو تم نے پھینکا ہے یہ محض جادو ہے"۔ یہ قول در حقیقت اس الزام کا جواب ہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ ؑ پر لگایا تھا کہ حضرت موسیٰ ؑ جادوگر ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جواب میں کہا کہ جادوگری تو وہ ہے جو وہ دکھا رہے ہیں کیونکہ ان کی کارستانی محض تخیل ہے 'محض فریب نظر ہے اور محض خیالاتی شعبدہ بازی ہے 'اس کے اندر دعوت اصلاح نہیں ہے اور تحریک و انقلاب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی یہ کارستانی سحر ہے اور اللہ کے معجزات تو جادو نہیں ہیں۔

حضرت موسیٰ ؑ نے اس کے بعد یہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهُ (۱۰ : ۸۱) "اللہ ابھی اسے باطل کر دیتا ہے"۔ ان الفاظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچا مومن کس قدر اعتماد کے ساتھ بات کرتا ہے 'اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ اپنے معجزات کے مقابلے میں ہرگز ایسی صورت حال وجود میں آنے کی اجازت نہ دے گا کہ جادوگری کامیاب ہو جائے۔ حالانکہ یہ کوئی اصلاحی کام نہیں ہے بلکہ فسادی کام ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ "مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا" کیونکہ جادوگر تو لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور فرعون کے جو سردار ان کو جمع کر کے لائے ہیں فساد و گمراہی کی جڑ ہی وہ ہیں۔ بلکہ و

يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (۱۰ : ۸۲) "اللہ اپنے فرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے"۔ یعنی اس کے وہ تکوینی فرامین جو اس کائنات میں جاری ہیں 'جن سے اس کی مشیت کا اظہار ہوتا ہے اور اللہ کے معجزات اور دلائل کا تعلق اس کے خصوصی کلمات سے ہے جن کی تعبیر ہم کن فیکون سے کرتے ہیں۔

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۱۰ : ۸۲) (خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو) وہ جس قدر چاہیں ناپسند کریں 'اللہ کی مشیت کا راستہ وہ روک نہیں سکتے۔ اور اللہ کے معجزات کی راہ نہیں روک سکتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جادو بالاخر باطل ہو گیا' حق کا کلمہ بلند ہو گیا' یہاں اس پورے واقعہ کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیا گیا۔ کیونکہ مقام و محل کا تقاضا اختصار تھا۔

یہاں پردہ گرتا ہے' یہ منظر اوجھل ہوتا ہے تاکہ موسیٰ ؑ اور ان کے ساتھی مومنین کو سامنے لایا جائے۔ یہ قلیل تعداد میں تھے اور قوم کے نوجوان عنصر پر مشتمل تھے' ان میں شیوخ کی تعداد بہت کم تھی' اس پورے قصے اور اس سورت میں دراصل یہ سبق دینا مقصود تھا جو یہاں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو دینا مقصود ہے جو اس وقت حضرت موسیٰ ؑ اور ان کے نوجوان ساتھیوں کو دیا گیا۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ

الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

(پھر دیکھو کہ موسیٰؑ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا' فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربر آوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنہیں خوف تھا) کہ فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو' اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو' اگر مسلمان ہو"۔ انہوں نے جواب دیا "ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا' اے ہمارے رب ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے"۔

اور ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ "مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرالو اور نماز قائم کرو' اور اہل ایمان کو بشارت دے دو"۔

اس آیت سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا اور اپنے ایمان کو ظاہر کیا وہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ نوجوان تھے' بنی اسرائیل کی پوری قوم ایمان نہ لائی تھی۔ ڈر صرف اس بات کا تھا کہ ان نوجوانوں پر مظالم ڈھا کر انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت و حمایت سے کہیں روک نہ دیا جائے۔ فرعون کی جانب سے اس بات کا قوی خدشہ موجود تھا' خود ان نوجوانوں کے سرپرستوں کی جانب سے بھی خدشہ موجود تھا کیونکہ بڑے اور بوڑھوں کی اپنے مفادات ہوتے ہیں اور وہ اہل اقتدار کے ہاں اپنے مفادات کے ہاتھوں سے مجبور ہوتے ہیں۔ نیز ایسے لوگوں کی جانب سے بھی خدشات تھے جنہوں نے ذلت کی زندگی کو اپنا لیا تھا۔ اور وہ اس کے خوگر ہو گئے تھے اور ایسے لوگ اہل اقتدار کے زیردست ہو جاتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی کیونکہ فرعون کی حکومت نہایت ہی سخت جابرانہ اور سرکشی کی حدود کو چھونے والی تھی بلکہ وہ ظلم میں کسی حدود و قیود کی پابند ہی نہ تھی۔ سخت سے سخت اقدام وہ کر سکتی تھی۔ ایسے حالات میں ایسے ایمان کی ضرورت تھی جس کے مقابلے میں خوفناک طوفان بھی ہلکے ہوں' سخت کے سخت حالات میں بھی وہ دلوں کو اطمینان دے سکے۔ اور اس کی وجہ سے لوگ سچائی پر ثابت قدم ہوں۔ یہی حالات تھے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کے خطاب کی ضرورت پیش آئی:

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ

(اور موسیٰ ؑ نے اپنی قوم سے کہا : لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو' تو اس پر بھروسہ کرو اگر تم مسلمان ہو) ایمان کا تقاضا ہے کہ مومن اللہ پر بھروسہ کرے' بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنا علامت ایمان ہے۔ ایمان ہی وہ سروسامان ہے جو ایک ظالم اور جابر کے سامنے ایک ضعیف اور ناتواں اقلیت کا بہترین ہتھیار ہوتا ہے۔ بڑے بڑے فرعونوں کا مقابلہ صرف ایمان ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے ایمان اور اسلام دونوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ دونوں کا تقاضا ہے کہ تم اللہ پر بھروسہ کرو یعنی تم اللہ پر پورا پورا یقین کرو اور پھر پوری طرح اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دو' اس کے احکام پر چل پڑو۔

اہل ایمان نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کال پر فوراً لبیک کہا :

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۱۰ : ۸۵) "انہوں نے جواب دیا ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا"۔ اور بھروسے کا اعلان کرتے ہی وہ دست بدعا ہو گئے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰ : ۸۵) "اے ہمارے رب ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا"۔

"ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا" کا مقصد یہ ہے کہ ظالموں کو اس قدر قوت نہ دے کہ وہ ہم پر دست درازی کر سکیں۔ مگر ایسا ہوا تو لوگ یہ گمان کریں گے کہ اہل ایمان پر مظالم کیے جاتے ہیں اور اہل کفر غالب ہیں' لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اہل کفر حق پر ہیں' اس لیے تو وہ غالب ہیں اور مومنین مغلوب۔ یہ ان کے لیے تو رسی دراز کرنے کا عمل ہو گا اور اللہ ان پر حجت تمام کرنا چاہے گا لیکن عوام کا تاثر غلط ہو گا۔ اس لیے اہل ایمان دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کی ایسی آزمائش سے بچائے اور اہل کفر کے لیے کوئی اور تدبیر کرے اور دوسری آیت میں صراحت کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ ان کو ان ظالموں سے چھڑایا جائے۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰ : ۸۶) "اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے"۔ ان کی یہ دعا کہ اللہ انہیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنائے اور اپنی رحمت سے کافروں کی ریشہ دوانیوں سے نجات دے' یہ اللہ پر توکل اور اللہ پر بھروسے اور استعانت کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ دعا اس بات پر دلیل ہے کہ دعا کرنے والا اللہ پر زیادہ توکل اور بھروسہ کر رہا ہے۔ مومن کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آزمائش کا مطالبہ نہیں کرتا' اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے۔ لیکن اگر اللہ کی طرف سے آزمائش آ جائے تو وہ ثابت قدم رہتا ہے۔

حق و باطل کی اس پہلی جھڑپ اور حق کی باطل کے مقابلے میں فتح اور امتیازی پہچان اور اگلے مرحلے کے انتظار کے عرصے میں' اللہ نے حضرت موسیٰ' حضرت ہارون ؑ کی طرف یہ وحی بھیجی۔ بنی اسرائیل کے لیے کچھ مخصوص سنٹر مقرر کر دیئے جائیں تاکہ ان کو علیحدہ کر کے ان کی چھان بین کر کے اور انہیں منظم کر کے' اگلے سفر کے لیے انہیں آمادہ اور تیار کیا جائے۔ ان سنٹروں کے بارے ان کو یہ ہدایات دی گئیں کہ ان کے ماحول کو پاکیزہ بنایا جائے' ان لوگوں کے نفوس کو پاک کیا جائے جو ایمان لا چکے ہیں اور انہیں یہ خوشخبری دی جائے کہ اللہ کی تائید تمہارے ساتھ ہو گی۔

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰ : ۸۷) "اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھہراؤ اور نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو بشارت دے دو"۔ یہ انتظامی تیاری کے ساتھ روحانی تیاری ہے۔ افراد اور جماعتوں کے لیے دونوں قسم کی تیاریاں اشد ضروری ہیں۔ ابتلاء اور عملی کشمکش سے پہلے انتظامی تیاری کے ساتھ ساتھ اخلاقی تیاری بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ اخلاقی تیاری کو اہمیت نہیں دیتے لیکن آج تک تمام تجربات یہی بتاتے ہیں کہ اخلاقی اور نظریاتی ہتھیاروں کی اہمیت روایتی ہتھیاروں سے بہت زیادہ ہے۔ اگر نظریاتی اور اخلاقی لحاظ سے تہی دامن فوجی کے پاس جنگی اسلحہ بہت وافر کیوں نہ ہو' وہ کامیابی کا ضامن نہیں ہوتا۔

اہل ایمان کے سامنے اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ ؑ کا تجربہ رکھ رہے ہیں تاکہ ان کے لیے ایک نمونہ ہو' یہ احکام و تدابیر بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں' یہ تو خالص ایمانی تجربہ ہے۔ آج بھی اہل ایمان کو ایسے تجربات کی ضرورت ہے۔ جاہلی معاشروں کے اندر آج بھی جگہ جگہ ان پر تشدد ہو رہا ہے۔ ہر طرف طاغوت کا دور دورہ ہے' لوگوں کے اخلاق بگڑ چکے ہیں اور فرعونیوں کے دور میں بھی یہی تھا' حضور اکرم ؐ کو بھی ایسے حالات درپیش تھے اور ہمارے دور میں بھی ایسے ہی حالات ہیں۔ اس وقت بنی اسرائیل کو یہ ہدایت دی گئی تھی:

(۱) جاہلیت کی گندگی' شر اور فساد سے ایک طرف ہو جاؤ' جہاں تک ممکن ہو' اور جو جو لوگ پاک' صاف اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے تیار ہیں' ان کو منظم کیا جائے۔ ان کو تربیت دی جائے اور جہاد کے لیے تیار کیا جائے تاکہ اللہ کی نصرت آجائے۔

(۲) جاہلیت کے پیروکاروں کی عبادت گاہوں سے دور ہو جاؤ اور اہل ایمان کے لیے علیحدہ مراکز عبادت قائم کرو' جہاں وہ محسوس کریں کہ وہ جاہلی معاشرے سے الگ ہو چکے ہیں اور وہ صحیح خطوط پر اللہ کی بندگی کر رہے ہیں اور علیحدہ اور پاکیزہ ماحول میں اپنے آپ کو منظم کریں۔

---ooo---

ان حالات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' وہ اب فرعون اور اس کے ساتھیوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ان میں کوئی بھی ایسا عنصر موجود ہے جس کی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہو۔ آپ صراحت کے ساتھ فرعون اور فرعونیوں کے لیے بد دعا کرتے ہیں۔ آپ کی شکایت یہ ہے کہ اے اللہ آپ نے ان کو مالی وسائل دیئے ہیں جن سے وہ زیب و زینت کر کے عوام الناس کو مرعوب کرتے ہیں' مالی لحاظ سے اس بااثر طبقے سے اچھے اچھے دین دار لوگ بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور اس طرح پورا معاشرہ جاہ و مال کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور گمراہی کے گڑھے میں گرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بد دعا یہ ہے کہ اے اللہ ان لوگوں کو ہلاک و برباد کر دے۔ اے اللہ ان کے دلوں کو اور سخت کر دے تاکہ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہو جائیں۔ چنانچہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمایا۔

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ
اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى
اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾
قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

"موسیٰ ؑ نے دعا کی "اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔اے رب 'کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب 'ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں"۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے"۔

حضرت موسیٰ کی دعا میں بڑی حقیقت موجود ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۰:۸۸)

"اے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے"۔ یہ لوگ اپنی مالی مرتبے کو لوگوں کے گمراہ کرنے کے نامسعود کام میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں کہ لوگ ان کی حیثیت اور مرتبے کو دیکھ کر ان سے متاثر ہوتے ہیں اور وہی کام کرنے لگتے ہیں جو یہ بڑے لوگ کرتے ہیں۔ نیز اپنے مرتبے اور دولت کی وجہ سے ان کو جو قوت حاصل ہوتی اس کو وہ ظلم میں استعمال کرتے ہیں 'لوگوں کو دباتے ہیں اور ذلیل کر کے گمراہی پر مجبور کرتے ہیں۔ مفسدین کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار اور دولت کے انعامات دیکھ کر سادہ لوح عوام کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس ادراک سے قاصر ہوتے ہیں کہ یہ چیزیں درحقیقت اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہوتی ہیں۔ نیز وہ اس حقیقت کے ادراک سے بھی قاصر ہوتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حقیقی فضل و کرم کے مقابلے میں ان اشیاء کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی عوامی ذہنیت کی بات یہاں بشکل دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ ان باغیوں اور سرکشوں کے ہاتھوں اس قسم کے موثر وسائل کا چھیننا ضروری ہے۔ اس لیے وہ دعا کرتے ہیں۔ اللہ ان کے اموال اور ان کی حیثیت کو نیست و نابود کر دے۔ ان کی یہ حالت کر دے کہ وہ اپنے اموال اور حیثیت کو عوام کے گمراہ کرنے کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔ رہی یہ دعا کہ اللہ ان کے دلوں کو سخت کر دے گا اور ان پر مہر لگا دے کہ وہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ اپنی آنکھوں سے عذاب الیم دیکھ نہیں لیتے۔ تو یہ ایک ایسی داعی کی دعا ہے جو مخاطبین کے بارے میں پوری طرح مایوس ہو گیا ہو' اور اسے کوئی امید نہ رہی ہو کہ ان میں سے کوئی توبہ کرے گا یا مان کر دے گا۔ چنانچہ ایسا داعی آخر کار اپنے لوگوں کو چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے کیے کا مزہ چکھیں۔ جب وہ عذاب الیم دیکھ لیں گے تو

پھر سنت الٰہیہ کے مطابق عذاب نازل ہو جانے کے بعد پھر ایمان قبول نہیں ہوتا۔

قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (۱۰:۸۹) "تم دونوں کی دعا قبول کی گئی"۔ اللہ نے دعا کے مطابق فیصلہ کر دیا ہے۔ اس لیے تم دونوں فَاسْتَقِیْمَا (۱۰:۸۹)

"لہٰذا تم ثابت قدم رہو"۔ اپنی راہ پر چلتے رہو یہاں تک کہ اللہ کا مقررہ فیصلہ اپنے وقت پر ظاہر ہو جائے۔

وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۱۰:۸۹) (اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے) کیونکہ بے علم اور جاہل لوگ عموماً راہ بھول جاتے ہیں۔ ان کے منصوبے اور تدابیر ٹھوس نہیں ہوتیں وہ خود مضطرب ہوتے ہیں اور ان کو شرح صدر نہیں ہوتا کہ وہ سیدھی راہ پر ہیں یا غلط راہ پر۔

اب اگلا منظر وہ ہے جس میں اللہ کا منصوبہ روبعمل آتا ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ

۹ اٰیَةً ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ۱۰ع

۱۴ "اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں"۔ جواب دیا گیا "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو تو نافرمانی کرتا اور فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنے اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"۔

تکذیب اور چیلنج پر مشتمل اس کہانی کا یہ آخری منظر ہے۔ یہاں اس قصے کو نہایت ہی اختصار اور اجمال سے لایا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں مقصد صرف فرعونیوں کے انجام کی طرف اشارہ تھا اور یہ جتانا مضمون سورت کے پیش نظر تھا کہ اللہ اپنے دوستوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا' اللہ اپنے دشمنوں کو بھی ایک حد تک ڈھیل دیتا ہے اور آخرکار اللہ پکڑتا ہے اور دشمنوں پر عذاب نازل کرتا ہے' کون ہیں اللہ کے اعداء؟ وہ جو نہ اللہ کے دلائل تکوینی پر غور کرتے ہیں اور نہ پیغمبروں کے دکھائے ہوئے معجزات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو پھر نہ ندامت کا فائدہ ہوتا ہے اور نہ توبہ مفید ہوتی ہے۔ اس سے قبل اس سورت میں اس مضمون کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَآءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(٤٧) وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ (٤٨) قُل لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِى

ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَآءَ اللَّهُ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَ

لَا يَسْتَقْدِمُونَ (٤٩) قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَتَىٰكُمْ عَذَابُهُ بَيَٰتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

الْمُجْرِمُونَ (٥٠) أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ ءَامَنتُم بِهِ ءَآلْـَٰٔنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ

(٥١) (١٠ : ٤٧ تا ٥١) "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے' پھر جب کسی امت کے پاس اس کا رسول آ جاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔ کہتے ہیں اگر تمہاری یہ دھمکی سچی ہے تو آخر یہ کب پوری ہوگی؟ کہو "میرے اختیار میں خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں' سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے' ہر امت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے' جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی"۔ اس سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آ جائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں"۔

اس سورت میں تمام قصص اسی مضمون اور حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں چنانچہ کہا گیا۔

وَجَٰوَزْنَا بِبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ الْبَحْرَ (١٠ : ٩٠) "اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے"۔ اور ان کا سمندر سے معجزانہ طریقے سے گزرنا ہماری راہنمائی' ہماری ہدایات اور ہماری نگرانی میں ہوا۔ یہاں جاوزنا کی نسبت اللہ کی طرف کرنا اپنے اندر مخصوص مفہوم رکھتا ہے۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُۥ (١٠ : ٩٠) (فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا) اور ان کا پیچھا کرنا کوئی اچھا کام نہ تھا' نہ کوئی مومنانہ حرکت تھی' نہ وہ اپنی مملکت سے کوئی دفاعی کارروائی کر رہا تھا۔ اس کا یہ تعاقب کسی مفہوم میں بھی جائز نہ تھا بلکہ۔

بَغْيًا وَعَدْوًا (١٠ : ٩٠) (ظلم اور زیادتی کرنے کی غرض سے یہ تعاقب کر رہا تھا) سرکشی اور حد سے تجاوز کر رہا تھا۔ کیونکہ اگر کوئی بھاگتا ہے تو تم کیوں اسے پکڑتے ہو۔

چنانچہ وہ اچانک غرقابی کے منظر سے دوچار ہوتا ہے۔ اب وہ ظالم اور سرکش نہیں ہے بلکہ اچانک وہ بے کس اور بے سہارا ہو گیا ہے۔

حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (١٠ : ٩٠) (جب وہ ڈوبنے لگا) موت آنکھوں کے سامنے آگئی۔

نجات کی کوئی صورت نہ رہی تو اب وہ کہتا ہے :

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

(۱۰ : ۹۰) (جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا' میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں سراطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں) اب فرعون کے تن سے وہ تمام لباس اتر چکے تھے جن میں وہ بڑا نظر آتا تھا۔ اور لوگ اس کی شخصیت سے ڈرتے تھے۔ اب وہ نحیف و نزار اور ذلیل و خوار تھا۔ اب وہ نہ صرف یہ کہ اس خدا پر ایمان لا رہا ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لا چکے تھے بلکہ وہ اس پر مسلمان ہونے اور سر تسلیم خم کرنے کا اعلان بھی کرتا ہے۔

آٰلْئٰنَ وَ قَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَ کُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۹۱) ((۱۰ : ۹۱)) "اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو تو نافرمانی کرتا رہا' فساد کرنے والوں میں سے تھا"۔ یعنی اب تو مان رہا ہے کہ نہ تجھے اختیار حاصل ہے اور نہ راہ فرار موجود ہے۔ اب جبکہ سرکشی اور بڑائی کا دور گزر گیا ہے اب!

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ (۱۰ : ۹۲) "اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے"۔ نہ اسے مچھلیاں کھائیں گی اور نہ موجودہ کے ذریعے وہ نامعلوم لاش رہے گی تاکہ تمہارے بعد میں آنے والے عوام کو معلوم ہو کہ یہ ہے وہ فرعون جس کا تاریخ میں یہ انجام ہوا تھا۔

لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً (۱۰ : ۹۲) "تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت ہو"۔ پیچھے لوگ دیکھتے رہیں اور عبرت لیتے رہیں اور یہ دیکھ لیں کہ اللہ کی قوت' اللہ کی تنبیہات کا انکار کرنے والوں کا انجام کیسا ہوتا ہے؟

وَ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰ : ۹۲) "اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری آیات سے غفلت برتتے ہیں"۔ وہ اللہ کی آیات اور اس کے نشانات کی طرف اپنے قلوب اور عقول کو متوجہ نہیں کرتے۔ آفاق اور انفس میں اللہ کے جو نشانات ہیں' ان پر تدبر نہیں کرتے۔

یہاں یہ دردناک منظر اب آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور یکلخت بنی اسرائیل کے انجام کی ایک آخری جھلکی دکھائی جاتی ہے کہ بعد کے زمانوں میں بنی اسرائیل پھر کیا کرتے رہے۔ حالانکہ انہوں نے فرعون کی سرکشی' چیلنج اور نافرمانی کا منظر خود دیکھا تھا۔ اس علم کے باوجود بعد میں انہوں نے یہی کچھ کیا۔

وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا

كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٩٣﴾

"ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا دیا اور نہایت عمدہ وسائل زندگی انہیں عطا کیے۔ پھر انہوں نے باہم اختلاف نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ علم ان کے پاس آ چکا تھا۔ یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں"۔

المبوأ کا مفہوم ہے نہایت ہی امن کی جگہ' اس کو صدق کی طرف مضاف کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ پرامن ہونے کے ساتھ ساتھ سچائی اور صداقت کے اصولوں پر مشتمل ایک ٹھوس سوسائٹی کے مالک تھے۔ ان کی سوسائٹی کے اندر کوئی کمزوری تزلزل اور جھوٹ اور افتراء نہ تھا۔ مصر میں غلامی کے طویل تجربات کے بعد بنی اسرائیل نے ایک عرصے تک نہایت ہی مستحکم نظام قائم کر دیا تھا۔ یہاں اس کی تفصیلات نہیں دی گئیں۔ اس لیے کہ یہاں مضمون اور موضوع کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو اس عرصے میں بہترین معاشی سہولتیں دی گئیں اور ضروریات زندگی کو وافر کر دیا گیا لیکن انہوں نے فسق و فجور کی راہ لی اور اللہ نے دوبارہ ان کو ان سے محروم کر دیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے تفصیلات کو چھوڑ کر صرف ایک بات ذکر کر دی کہ اتفاق کے بعد وہ نفاق کا شکار ہو گئے۔ دینی اعتبار سے وہ فرقے فرقے ہو گئے اور دنیاوی اعتبار سے اس کی مملکت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی' اس لیے نہیں کہ وہ جاہل اور نادان تھے بلکہ علم و دانش کے باوجود انہوں نے ایسا کیا' اور ہر حکم الہی کی وہ باطل تاویلات کرتے رہے۔

یہاں موضوع اور مضمون صرف یہ بتا رہا ہے کہ حب و ایمان کو کامیابی ہوتی ہے اور سرکشی اور ظلم کو آخر کار ناکامی ہوتی ہے' اس لیے سیاق کلام میں وہ تفصیلات ترک کر دی گئی کہ بعد کے ادوار میں وہ کس طرح اجڑے اور کس طرح انہوں نے اختلافات کیے بلکہ یہاں اختصار کے ساتھ اس قصے کو یوں لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

انَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۰ : ۹۳) (یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلافات کرتے ہیں) یوں اس قصے کے اثرات بھی قائم رہتے ہیں اور اس واقع کا رعب بھی دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم میں بیان قصص کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور اس غرض اور موضوع کے لیے قصے کی کڑیوں کا انتخاب کس خوبصورتی سے ہوتا ہے۔ مقصد محض قصہ گوئی نہیں ہوتی بلکہ نہایت ہی موزوں انداز میں مخصوص اشارات اور اثرات چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

اب قصہ فرعون و موسیٰ پر ایک مکمل تبصرہ آتا ہے۔ پہلے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل مکہ کیوں آپ کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ دلائل و معجزات کی کمی ہے۔ بلکہ مکذبین کا ہمیشہ یہی انداز ہوتا ہے اور یہ روز اول سے اللہ کی حکمت تخلیق کا ایک حصہ ہے کہ بعض لوگ ہدایت کی راہ لیتے ہیں اور بعض ضلالت کے مدعی بن جاتے ہیں۔ درمیان میں قصہ یونس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ ان کی قوم ایمان لے آئی۔ ایسے حالات میں کہ ان پر عذاب آنے ہی والا تھا' اللہ نے عذاب روک لیا اور یہ قصہ اس لیے لایا گیا کہ مکہ کے مکذبین کو یہ اشارہ دے دیا جائے کہ

مہلت کی گھڑیاں بہت ہی کم ہیں۔جلدی سے ایمان لے آو' کیونکہ اللہ کی سنت ' پہلی اقوام اور آخری زمانے میں آنے والی اقوام کے بارے میں ایک ہی ہے کہ مکذبین کو ہلاک کیا جاتا ہے۔اور رسولوں اور ان کے متبعین کو بچا دی جاتی ہے اور یہ اصول اور یہ سنت اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر فرض کر دی ہے اور اس میں تخلف ممکن نہیں ہے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝٩٤ وَ لَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝٩٥ اِنَّ الَّذِيْنَ
حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٩٦ وَ لَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى
يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝٩٧ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا
قَوْمَ يُوْنُسَ ۗ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝٩٨ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ
جَمِيْعًا ۗ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝٩٩ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ
اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝١٠٠
قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۗ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ
قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠١ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِهِمْ ۗ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝١٠٢ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٠٣

"اب اگر تجھے اس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے

سے کتاب پڑھ رہے ہیں - فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے تیرے رب کی طرف سے ' لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو ' اور ان لوگوں میں نہ شامل ہو جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھلایا ہے ' ورنہ تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آ گیا ہے ' ان کے سامنے خواہ کوئی نشانی آ جائے وہ کبھی ایمان لاکر نہیں دیتے جب تک کہ دردناک عذاب سامنے آتا نہ دیکھ لیں ۔ پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس ؑ کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو بیشک ہم نے اس پر دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا۔

اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے ۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟ کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا ' اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے ۔

ان سے کہو " زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے ' اسے آنکھیں کھول کر دیکھو " ۔ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں؟ اب یہ لوگ اس کے سوا اور کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی برے دن دیکھیں جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ ان سے کہو " اچھا ' انتظار کرو ' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں " ۔ پھر جب ایسا وقت آتا ہے تو ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو بچا لیا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہوں ۔ ہمارا یہی طریقہ ہے ۔ ہم پر یہ حق ہے کہ مومنوں کو بچا لیں " ۔

اس پوری مدت میں آخری قصہ بنی اسرائیل کا تھا جو اہل کتاب تھے ۔ ان کو حضرت نوح ؑ اور ان کی قوم کا قصہ اور موسیٰ ؑ اور فرعون کا قصہ اچھی طرح معلوم تھا ' وہ تورات دن ان قصص کو پڑھتے تھے ۔ یہاں حضور اکرم ؐ کو خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ اور آپ کی امت میں سے کسی کو ان واقعات میں شک ہے تو جو لوگ آسمانی کتابوں کے حامل ہیں ان سے پوچھ لو ' کہ یہ واقعات درست ہیں یا نہیں ۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۱۰ : ۹۴) " اگر تجھے اس ہدایت سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں ۔ فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے ۔ تیرے رب کی طرف سے ہے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو " ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کی آیات کے بارے میں بہرحال شک نہ تھا ۔ اس سلسلے میں حضور ؐ سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کے نزول کے بعد فرمایا ۔

لا اشك ولا اسئل (نہ میں شک کرتا ہوں اور نہ اہل کتاب سے پوچھتا ہوں) تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ بات کیوں کہی گئی جبکہ اس کے بعد یہ فقرہ بھی آیا ۔

لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ (۱۰: ۹۴) (بے شک تمہارے پاس تو حق آیا ہے) اور اس فقرے کے بعد تو کوئی شک رہتا ہی نہیں۔

لیکن جن حالات میں یہ سورت نازل ہوئی ان کو پیش نظر رکھا جائے تو اس ہدایت کا اصل سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ اس وقت مکہ میں صورت حالات یہ تھی کہ واقعہ معراج کے نتیجے میں کفار نے پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کر دیا تھا' بعض ڈھل مل یقین قسم کے لوگ اسلام کو چھوڑ چکے تھے' حضرت خدیجہ اور حضرت ابوطالب فوت ہو گئے تھے اور حضور اکرمؐ اور اہل ایمان پر سختیاں زیادہ ہو گئی تھیں اور دعوت اسلامی اہل مکہ کے تحت عناد کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ گئی تھی' ان سب حالات کی وجہ سے حضورؐ کے دل پر بھی اثر ہوتا تھا' اس لیے ان قصص میں حضور اکرمؐ کو تسلی دی گئی کہ آپ حق پر ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اہل حق ہمیشہ کامیاب رہے ہیں۔ اب شک کرنے والوں اور تکذیب کرنے والوں کی مذمت اس طرح کی جاتی ہے کہ تم ان کے گروہ میں شامل نہ ہو۔

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۱۰: ۹۵) (لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور ان لوگوں میں نہ شامل ہو جنہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا ورنہ تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا)

اس بالواسطہ ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ شک کرنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ لوٹ آؤ' بہت کم وقت رہ گیا ہے' دیکھو اللہ رسول اللہ کو کہتا ہے کہ اگر شک ہے تو اہل کتاب سے اپنا شک رفع کر لو اور آپ ایسا نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ کو حق الیقین حاصل ہے کہ وہ سچے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اس حق کو قبول کر لو' سوچ لو اور ممترین سے باہر نکل آؤ۔

یہاں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کر کے کہ آپ اہل ذکر سے پوچھ لیں یہ منہاج وضع فرماتے ہیں۔ امت مسلمہ کو چاہئے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات ماہرین دین سے لیں اور اپنے نظریات کے بارے میں سوال و جواب کے ذریعے اچھی طرح چھان بین کر لیں اور اندھی تقلید کسی معاملے نہ کریں۔ اچھی طرح سمجھ کر راہ متعین کریں۔

یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں ایک یہ ہے کہ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور دوسری یہ کہ اگر شک ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو' کیا ان دونوں میں تعارض نہیں ہے؟ تعارض اس لیے نہیں ہے کہ شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا' کا مقصد یہ ہے کہ حالت شک پر باقی نہ رہو اور شک کو دور کرو' یہاں "ممترین" میں سے نہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ دائمی طور پر حالت شک میں نہ رہو۔ یوں کہ شک کو رفع کرنے کی سعی ہی نہ کرو اور سوال و تفتیش اور تحقیق کی جدوجہد ہی چھوڑ دو۔ جو شخص وصول الی الحق کی سعی کر رہا ہو وہ ممترین میں سے خارج ہو جاتا ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام اترا وہ اگر حق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ اس کی تکذیب کرتے ہیں؟ اور مقابلہ کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے اور یہ اس کی سنت کے عین مطابق ہے کہ جو شخص ہدایت کے اسباب و ذرائع اختیار نہ کرے گا اسے ہدایت نہ دی جائے گی۔ جو شخص روشنی کو دیکھنا ہی نہ چاہے اور آنکھیں بند کر دے' وہ نہ دیکھ سکے گا۔ جو شخص فہم و ادراک کے ذرائع کو بند کر دے

وہ حقائق کا ادراک نہ کر سکے گا تو آخر کار گمراہ ہو جائے گا۔ اگرچہ اس کے سامنے آیات و دلائل کا ڈھیر لگا دیا جائے۔ ایسے حالات میں پھر اللہ کا فیصلہ اس کی مشیت کے عین مطابق یہ ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۹۶) وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ (۹۷) ((۱۰: ۹۶ – ۹۷)) ”حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آ گیا، ان کے سامنے کوئی نشانی آ جائے وہ کبھی ایمان لا کر نہیں دیتے جب تک کہ دردناک عذاب سامنے آتا نہ دیکھ لیں“۔ اور جب عذاب آ جائے تو پھر ان کا ایمان ان کے لیے مفید نہ ہو گا کیونکہ یہ ایمان وہ اپنے اختیار اور مرضی سے نہیں لائے۔ اب تو ایمان کی میعاد ختم ہو گئی ہے اور یہ منظر ہمارے سامنے سے تو ابھی گزرا ہے کہ فرعون اس وقت ایمان لے آیا جب اس نے دیکھا کہ غرقابی مقدر ہے۔ اس نے کہا تھا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۱۰: ۹۰) ”میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی الٰہ نہیں ہے ماسوائے اس کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں سرتسلیم خم کرنے والوں میں سے ہوں“۔ ایسے حالات میں تو جواب وہی ہوتا ہے جو فرعون کو دیا گیا۔

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۰: ۹۱) (اب، حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا) ایسے مقامات پر جب کہ سنت الٰہیہ کے مطابق جب حجت تمام ہو جاتی ہے تو ایمان مفید نہیں رہتا، ایسے مقامات پر بھی شمع امید کو روشن رکھا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اگر کوئی ذرا بھی خیال رکھے اور وقوع عذاب سے قبل ہی ایمان لے آئے تو بچ سکتا ہے لیکن جب عذاب آنا شروع ہو گیا تو بچنے کی کوئی امید نہ رہے گی۔ ماسوائے قوم یونس ؑ کے واقعہ کے جو استثنا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِیْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ (۱۰: ۹۸) ”پھر کیا کوئی ایسی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس ؑ کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ ور ہونے کا موقع دے دیا تھا“۔

فلولا کا مفہوم تو یہ ہے کہ کیوں ایسا نہیں ہے؟ یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا اور جن بستیوں کا ذکر ہوا ان میں سے کسی نے بھی مان کر نہ دیا۔ بہت کم لوگوں نے مان کر دیا، اس لیے گویا کسی نے بھی نہ مانا۔ اور غالب بستیاں ایمان سے محروم ہیں۔ ماسوائے یونس علیہ السلام کی بستی کے۔ یہاں قَرْیَةٌ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے پیغمبروں کو بستیوں اور اقوام کی طرف بھیجا گیا، بدوی رہائش گاہوں میں کبھی بھی نبی نہیں بھیجے گئے۔ یہاں حضرت یونس ؑ کے قصے کی طرف مجمل اشارہ کیا جاتا

ہے۔ تفصیلات نہیں دی گئیں کیونکہ مقصد قوم کے انجام کا ذکر ہے۔ تفصیلات کی ضرورت اس مقام پر نہیں ہے۔ بات یہ تھی کہ قوم یونس ؑ پر ایک نہایت ہی توہین آمیز عذاب آنے والا تھا لیکن چونکہ وہ آخری وقت میں مان گئے اس لیے اللہ نے عذاب ٹال دیا اور ایک وقت تک وہ اس زمین میں کھاتے پیتے رہے۔ اور اگر یہ لوگ ایمان نہ لاتے تو عذاب کی لپیٹ میں آ جاتے۔ اور سنت الٰہیہ کے مطابق ان پر عذاب آ جاتا۔ اس آیت کی اسی قدر تشریح کافی ہے اور اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) منکرین کو اس بات سے ڈرانا اور اس طرف متوجہ کرنا کہ اب وقت تھوڑا رہ گیا اور اب بھی اگر مشرکین مکہ مان جائیں تو وہ قوم یونس ؑ کی طرح عذاب دنیا سے بچ سکتے ہیں۔ یہاں اس قصے سے اصل غرض و غایت ہی یہ ہے :

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ خود حضرت یونس کی قوم کے بارے میں بھی سنت الٰہیہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ ایمان لے آئے اور انہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ یہاں بھی سنت الٰہیہ جاری رہی اگر وہ ایمان نہ لاتے تو یہ عذاب نہ ٹلتا، واقع ہو جاتا۔ لیکن چونکہ اس عذاب کے آنے سے قبل انہوں نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر دی تو سنت الٰہیہ نے ان کی اس تبدیلی کے مطابق تبدیلی کر دی۔ لہٰذا لوگوں کے کاموں کی اندر کوئی جبریت نہیں ہے۔ البتہ لوگوں کے اعمال کے اوپر جو نتائج مرتب ہوئے وہ جبری ہیں اور اٹل ہیں۔

اب کفر و ایمان کے سلسلے میں اسی اصول پر یہ قاعدہ سامنے آتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۹۹) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۱۰۰) (۱۰: ۹۹ - ۱۰۰) "اگر تیرے رب کی مشیت ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟ کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے"۔

اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ جنس انسانی کو کسی دوسری حقیقت پر پیدا کر دیتا اور وہ ایسے ہوتے کہ ایمان کے سوا کوئی اور عقیدہ ہی نہ اپنا سکتے مثلاً فرشتے یا ان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دی جاتی کہ وہ لازماً ایمان لاتے۔

اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو اللہ موجودہ انسانوں ہی کو ہدایت اور ایمان لانے پر مجبور کر دیتا کہ کفر کا ارادہ ہی ان سے سلب کر لیتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم انسان بعض اوقات اللہ کی حکمتوں کو پا لیتے ہیں اور بعض اوقات نہیں پا سکتے۔ لیکن اگر ہم کسی حکمت کو نہیں پا سکتے تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم حکمت الٰہیہ کے وجود ہی کا انکار کر دیں۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یوں ہوا کہ اس نے حضرتِ انسان کے اندر ہدایت و ضلالت کی استعداد ودیعت کر دی اور اسے اختیار دے دیا کہ وہ یہ راہ لے یا وہ۔ اللہ نے یہ فیصلہ بھی کر دیا کہ اگر کسی انسان نے اپنے حواس، اپنے میلانات اور اپنے قوائے مدرکہ کو دلائل ہدایت کے سمجھنے میں لگا دیا اور سعی کی اور پیغمبروں کے معجزات اور پیش کردہ دلائل پر غور کیا تو اللہ ایسے ہر شخص کو

ایمان نصیب کرے گا اور وہ نجات کی راہ پالے گا۔ اور اس کے برعکس اگر کسی انسان نے اپنے قوائے مدرکہ کو معطل کر دیا اور اس نے پیغمبروں کے پیش کردہ دلائل و معجزات پر غور نہ کیا تو اس کا دل سخت ہو جائے گا' اس کی عقل منجمد ہو جائے گی اور نتیجۃً وہ جمود و انکار کی راہ پر لگ جائے گا اور آخر کار وہ منکرین اور جاحدین کی راہ لے گا۔

خلاصہ یہ کہ ایمان لانا انسان کے اختیار پر موقوف ہے' رسول اللہ کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ آپ کسی کو ایمان پر مجبور کریں۔ کسی انسان کے نفسیاتی رجحانات پر کوئی کنٹرول نہیں کر سکتا۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰ : ۹۹) "پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں" ۔ یہ استفہام انکاری ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۰ : ۱۰۰) (کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا) اور یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہے جس کا تذکرہ ابھی ہم نے کیا۔ اگر کوئی نفس راہ ایمان پر گامزن نہیں ہوتا تو وہ کیسے منزل ایمان تک پہنچ سکتا ہے کیونکہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے وہ راہ ایمان نہیں ہے۔ یوں نہیں ہے یوں نہیں ہے کہ وہ ایمان چاہتا ہو اور ایمان کی راہ پر چل رہا ہو اور اللہ اس کے اور ایمان کے درمیان حائل ہو جائے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ کوئی نفس منزل ایمان تک نہیں پہنچ سکتا الا یہ کہ وہ اللہ کی سنت کے مطابق راہ ایمان پر چلے اور سنت الٰہیہ کے قوانین عامہ کے مطابق یہ راہ اختیار نہ کرے۔ جب وہ یہ راہ لے گا تو اللہ اسے ہدایت دے گا اور یہ ہو گا مطلب کہ یہ ایمان اللہ کے اذن سے نصیب ہوا۔ اس مفہوم میں یہ بات بھی درست ہے کہ کوئی امر اللہ کی تقدیر کے بغیر واقعہ نہیں ہوتا۔ لوگ کسی راہ کو اختیار کرتے ہیں تو اللہ ان کے لیے اس راہ کو آسان کر دیتا ہے اور پھر اس راہ میں جدوجہد کرنے پر ان کو جزاء و سزا دیتا ہے۔

اس مفہوم کی وضاحت اگلے فقرے سے بھی ہوتی ہے۔

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰ : ۱۰۰) "اور اللہ کا طریقہ ہے کہ جو عقل سے کام نہیں لیتے اللہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے"۔ جو لوگ اپنی عقول کو اچھی تدابیر کرنے سے معطل کر دیتے ہیں تو اللہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے۔ رجس بدترین روحانی نجاست کو کہتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کے تدبر اور تعقل کے ذرائع کو معطل کر دیا ہے۔ اس لیے اللہ ان کو اس قسم کی گندگی میں لت پت کر دیتا ہے اور انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تکذیب کرتے ہیں اور کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اسی مضمون کی مزید وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ دلائل و معجزات اور پیغمبر اور ڈرانے والے بھی ایسے لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو ایمان کی راہ نہیں لیتے اور تعقل و تدبیر سے کام نہیں لیتے۔ باوجود اس کے کہ ان کے سامنے اس کائنات میں بے شمار دلائل بکھرے پڑے ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا

يُؤْمِنُوْنَ (۱۰ : ۱۰۱) "ان سے کہو زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو' اور جو لوگ ایمان لانا نہیں چاہتے' ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہات آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں"۔ یہ انداز بیان استفہام انکاری ہو یا یہ تقریری بیان ہو' دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہو گا کہ زمین و آسمان میں آیات الٰہیہ وافر مقدار میں موجود ہیں' لیکن یہ آیات و دلائل اور رسولوں کی تنبیہات ان لوگوں کے لیے ہرگز نہیں جنہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایمان نہ لائیں گے' کیونکہ انہوں نے سنجیدگی سے غور و فکر ہی نہیں کیا۔

اس بحث کے خاتمے سے قبل ہمیں چاہئے کہ قرآن کریم کی اس آیت پر قدرے مزید غور و فکر کریں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰ : ۱۰۱) "ان سے کہو "زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے' اسے آنکھیں کھول کر دیکھو"۔ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں؟)

جو لوگ قران کریم کے پہلے مخاطب تھے ان کے پاس ان چیزوں کے بارے میں زیادہ علم و معرفت نہ تھا جو آسمانوں میں ہیں' لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی طرف ہم نے بار بار اشارہ بھی کیا ہے کہ انسانی فطرت اور اس کائنات کے درمیان ہمیشہ ایک مکالمہ موجود رہا ہے۔ انسانی فطرت اس کائنات کے زمزمہ زلزلہ کو خوب سنتی ہے' بشرطیکہ یہ فطرت جاگ رہی ہو اور متوجہ ہو اور اس سے بہت کچھ پاتی ہے۔

اسلامی تصورات کی تشکیل کے لیے قرآنی طریقہ کار یہ ہے کہ انسانی قوت مدرکہ ان حقائق کو سمجھے جو آسمان و زمین کے درمیان پیش پا افتادہ ہیں اور ان حقائق کا ادراک کرے۔ انسان کی نظر' اس کا دل اور اس کی عقل اس کائنات کی طرف متوجہ ہو لیکن انسان کا یہ تعقل اور تدبر نہایت متوازن ہو اور یہ نہ ہو کہ وہ اس تعقل اور تدبر کے نتیجے میں خود اس کائنات کو اللہ اور معبود بنا دے اور یہ کائنات ہی انسانی حیات کے اندر حقیقی موثر ہو جائے جس طرح کہ آج کے ملحد مادہ پرست خشک مادیت کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں اور اسے سائنٹیفک دین کہتے ہیں اور اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو اس پر استوار کرتے ہیں اور اس نظام کو انہوں نے سائنٹیفک سوشلزم کا نام دیا ہوا ہے حالانکہ ان کے خیالات کا سائنس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب انسان زمین و آسمان پر تدبر کرتا ہے تو انسان کے قلب و نظر کے سامنے سوچ کے نئے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ وہ نئے تاثرات لیتا ہے اور اس کے سوالات کا اسے نہایت ہی پختہ جواب ملتا ہے۔ اس وجود کے بارے میں اس کے شعور کو جلا اور وسعت ملتی ہے۔ اسے اس کائنات کے ساتھ ایک خاص انس پیدا ہو جاتا ہے اور اس کائنات کی ہر حرکت اور اس کا ہر زمزمہ اسے اللہ کی موجودگی اور اللہ کی قدرت کی برتری' اللہ کی گہری تدبیر' اللہ کے وسیع علم اور اللہ کی عظیم حکمت کا سبق دیتا ہے۔

زمانہ گزرتا ہے' اور انسان کے علوم و معارف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ اس کائنات کے بارے میں اپنے ادراک کو گہرا کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ انسان ہدایت یافتہ ہو' ایک مومن کی حیثیت سے یہ مطالعہ ربانی روشنی میں کر رہا ہو تو اس کی شخصیت کو اس علمی سفر میں اس کائنات کے ساتھ ایک انس' ایک سوچ اور گہری ہم آہنگی ملے گی۔ اس پر مزید علوم و

معارف کھلیں گے اور اسے نظر آئے گا کہ اس کائنات کی ہر چیز ذات باری کی مداح ہے اور انسان کے ساتھ ساتھ وہ بھی اللہ کی پاکی بیان کر رہی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (۱۷ : ۴۴)

"اور اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کر رہی ہے لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس تسبیح کو صرف وہی شخص سمجھتا ہے جو خدا رسیدہ ہو' اس کا دل اللہ سے جڑا ہوا ہو۔ لیکن اگر انسان کے یہ علمی انکشافات نور ایمان اور نور ربانی سے منور نہ ہوں تو وہ اس کے لیے مزید گمراہی کا سبب بنتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسانیت خوفناک مصائب کا شکار ہوتی ہے۔

وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (۱۰ : ۱۰۱) "اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہات آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں"۔ جب دلوں پر پردے پڑ جائیں' جب عقل جمود کا شکار ہو جائے اور جب اخذ اور ادراک کی قوتیں معطل کر دی جائیں اور جب فطری سوچ اور تعقل سے کام نہ لیا جائے تو انسان کو کوئی دلیل دلیل نظر نہیں آتی اور اس کے لیے تنبیہات مفید نہیں رہتیں۔ یہ پوری کائنات اور اس کے راز اور اس کی حکمتیں انسانی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اب نہ وہ سنتا ہے' اور نہ اس کائنات میں کسی چیز کی حمد و تسبیح کا وہ ادراک کر سکتا ہے۔

معرفت الٰہیہ کے موضوع پر قرآن کریم کا منہاج بحث یہ ہے کہ قرآن اس پوری کائنات کو بطور ایک نمائش گاہ اور ایک شفاف اور واضح منظر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس منظر اور نمائش میں قدرت الٰہیہ کے آثار رواں دواں نظر آتے ہیں اور یہ مشاہد انسانی شخصیت کو یقین و معرفت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ اسلامی منہاج بحث خالص منطق صغریٰ و کبریٰ کے انداز میں نہیں ہوتا' بلکہ قرآنی منہاج ان مناظر اور فعال آثار الٰہی کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ قلب بشری ان سے نہایت ہی گہرا تاثر لیتا ہے اور اسے اس قدر یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ جدل و جدال اور بحث و مناظرے کا موقع ہی نہیں رہتا۔ قرآن کریم اس کائنات کی کھلی کتاب سے وجود باری کے آثار پیش کرتا ہے۔ یہ آثار قابل مشاہدہ ہوتے ہیں اور قلب بشری اپنے ضمیر و شعور میں ان آثار کے لازمی نتائج کو شعوری اور لاشعوری طور پر بیٹھا دیتا ہے۔

قرآن معرفت کردگار کے سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت کو اپنے سامنے رکھتا ہے' وہ یہ کہ انسان کی ذات کو بہرحال خدا نے پیدا کیا ہے' اور اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کی نفسیاتی کیفیات کو خوب جانتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ "درحقیقت انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس اس کے اندر کیا کیا وسوسے ڈالتا ہے"۔ انسان کی فطرت میں یہ داعیہ موجود ہے کہ وہ ایک دین کا محتاج ہے۔ وہ فطرتاً خدا کا قائل ہے۔ اور انسانی فطرت اگر صحت مند ہو تو وہ اپنی گہرائیوں میں رب واحد کا شعور رکھتی ہے۔ اس لیے کسی صحت مند عقیدے اور دین اور نظریہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ فطرت انسانی کے اندر اللہ کا کوئی شعور پیدا کرے اور اس کی ضرورت کا احساس دلائے۔ تصور اللہ واحد اور اس کا شعور تو فطرت انسانی کے اندر موجود ہوتا

ہے بلکہ صحیح عقیدے کا یہی کام ہے کہ وہ کسی انسان کے اندر پائے جانے والے شعور باری تعالیٰ کو درست سمت دے۔ درست شکل دے اور حق تعالیٰ کی ایسی معرفت دے کہ اس کے ساتھ کوئی اور شریک نہ ہو۔اس کے بعد یہ شعور دے کہ اگر اللہ موجود ہے تو انسانی زندگی میں اس شعور اور تصور کے مطابق کیا کیا تبدیلیاں ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ اللہ قیوم ہے۔ یہ رب ہے اور یہ حاکم ہے اور یہ شارع ہے۔چنانچہ اگر کوئی وجود باری میں شک کرتا ہے تو سمجھ لیں کہ یہ شخص فطرت سلیمہ سے محروم ہے اور اس کی شخصیت میں نقصان ہے اور یہ شخص نفسیاتی مریض ہے۔اور اس کے تعقل اور اک کے ذرائع اور قوی ناقص ہیں۔ لہٰذا ایسے کج فطرت اور بیمار ذہن شخص کا علاج کسی جدل و جدال سے نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات ایک مومن اور مسلم کائنات ہے۔یہ کائنات اپنے خالق کو پہچانتی ہے۔اور اس کائنات کی ہر زندہ اور غیر زندہ چیز ہر وقت اس کی تسبیح کرتی ہے اور اس کی مطیع فرمان ہے۔ذات باری کا منکر اور اس کی ثنا سے اگر کوئی منکر ہے تو وہ صرف کج فطرت انسانوں میں سے بعض لوگ ہیں۔اگر کوئی انسان سلیم الفطرت ہو کر اس کائنات میں زندگی گزارے تو اس کے ارد گرد خدا کی تسبیح اور سجود کرنے والے اسے نظر آئیں' ایمان اور اسلام کی صدائیں وہ سنے۔ خود انسان کے وجود کے ہر ذرے' اور اس کے جسم کے ہر خلیے اس صدامیں اور اس پکار میں اس کے شریک ہیں۔ انسانی جسم کے تمام ذرات انسان کے ساتھ اور اس کائنات کے ساتھ ساتھ اللہ کے نوامیس فطرت کے مطیع فرمان ہیں اس لیے وہ سب انسان جو فطرت کی ان صداؤں کو نہیں سنتے' جن پر اللہ کے قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔اور وہ خود اپنی فطرت کی صداؤں کو نہیں سنتے اور وہ فطرت کے پیغامات اور سگنلز کو وصول نہیں کرتے' معلوم ہوتا چاہئے کہ ایسے تمام انسانوں کے تعقل و ادراک کے آلات کا کوئی نہ کوئی پرزہ معطل ہے۔ لہٰذا جب تک ان کی فطرت کی تاریں درست نہیں کر دی جاتیں محض منطقی جدل اور فلسفیانہ مباحث کے ذریعے ایسے لوگوں کی فطرت کے تاروں کو درست نہیں کیا جا سکتا' اس لیے سب سے پہلے یہ سعی ضروری ہے کہ ایسے کج فطرت اور بدفطرت انسانوں کی فطرت کو درست کیا جائے' تاکہ وہ فطری انداز میں سوچ سکیں۔ فطرت کے زلزلے کو سن سکیں اور از سر نو صحیح سمت میں سوچ کا آغاز کر سکیں (تفصیلات کے لیے دیکھئے خصائص التصور الاسلامی حصہ دوئم)

انسان کی ان فطری تاروں کو قرآنی منہاج کے مطابق یوں جوڑا جاتا ہے کہ انسان کو اس کائنات میں غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے۔اس طرح اس کی فطرت کی تاریں مل جاتی ہیں اور وہ فطری سگنلز کا ادراک کرنے لگتا ہے اور جب وہ فطرت کے اشارے پاتا ہے تو سوال و جواب فطری انداز میں شروع کر دیتا ہے اور اس کی اصلاح شروع ہو جاتی ہے۔

لیکن جاہل لوگ جس طرح کہ عرب تھے' یا جس طرح دوسرے جاہلی معاشرہ ہوتے ہیں وہ کائنات میں تدبر نہیں کرتے لہٰذا ان کو اپنے اس وافر علم کے باوجود کائنات میں آثار الٰہیہ نظر نہیں آتے۔

اللہ کی سنت دائمی ہے' اس میں تخلف ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا تکذیب کرنے والوں کا انجام ہر دور میں ایک ہی ہو گا۔ ہاں اللہ کے ہاں مہلت کی رسی دراز ہوتی ہے لیکن آخر کار مکذبین کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کا نام و نشان نہیں رہتا۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (۱۰:۱۰۲) "اب یہ لوگ اس کے سوا کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی برے دن دیکھیں جو ان

سے پیچھے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں۔ ان سے کہو اچھا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔

یہ ایک خوفناک الٹی میٹم ہے ۔ یہ مباحثہ کو ختم کر دیتا ہے لیکن ہر شخص خوفناک انجام کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

اب یہاں بات اس آخری نتیجے پر ختم ہو جاتی ہے جو ہر دعوت اور دعوت کی ہر تکذیب کے بعد نکلا کرتا ہے۔ ان تمام قصوں کا خلاصہ اور سبق ہے اور اس آخری تبصرے کا بھی نچوڑ ہے۔

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ (۱۰ : ۱۰۳)

"جب وقت آتا ہے تو ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو بچا لیا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہوں اور ہمارا یہی طریقہ ہے 'ہم پر یہ حق ہے کہ مومنین کو بچالیں"۔

یہ وہ بات ہے جسے اللہ نے اپنے اوپر فرض کر لیا ہے کہ ایمان کا بیج باقی رہے گا' اسے رویدگی نصیب ہوگی اور تمام خطرات' تمام ایذاؤں' تمام سختیوں اور ہر قسم کی تکذیب کے بعد اسے کامیابی نصیب ہوگی۔

پوری انسانی تاریخ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اس سورت میں آنے والے قصص بھی اس کا بین ثبوت ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ اہل ایمان خوشیاں منائیں اور مطمئن رہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۹۷ ایک نظر میں

یہ سبق اس سورت کا خاتمہ ہے اور اس سورت میں ہم نے اس کائنات کے آفاق میں جو سیر و سفر کیے اس کی بھی یہ آخری کڑی ہے ۔ اس سورت میں ' جیسا کہ مطالعہ کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے دور تک سفر کیا ' انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا ۔ فکر ' سوچ اور گہرے تأملات کے مختلف جہانوں کی سیر کی ۔ اس سیر و سیاحت کے نتیجے میں ہم نے بہت کچھ سیکھا ' بہت کچھ پایا اور خوب تھک کر واپس ہوئے ۔

اس سورت کا یہ خاتمہ ہے ' جس میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلام کے عقیدے کے حوالے سے اہم مسائل بیان ہوئے تھے ' مثلاً توحید ذات باری ' اس کی قیومیت ' اس کی حاکمیت ' ہر قسم کے شرک کی نفی ۔ ہر قسم کی سفارش کی نفی اور یہ کہ تمام امور کا آخری فیصلہ اللہ کے ہاں ہو گا اور یہ کہ یہ پوری کائنات اللہ کی سنت کے مطابق چل رہی ہے جس کے اندر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے ' جس کے دھارے کو بدلا نہیں جا سکتا ' یہ کہ وحی ایک سچائی ہے ' قرآن کریم کی تعلیمات حق ہیں ' اور یہ کہ موت کے بعد لوگوں کو اٹھایا جائے گا اور ان سے باز پرس ہو گی اور تمام فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ ہوں گے ۔

اس پوری سورت کا موضوع یہ امور تھے اور انہی کے بارے میں اس میں بات چلتی رہی ہے ۔ اس کے یہ قصے اور امثال بیان ہوئے ۔

لیجئے ' اب یہ تمام امور بطور خلاصہ اس آخری سبق میں دے دیئے گئے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا کہ آپ ان امور کو بطور اعلان عام لوگوں تک پہنچا دیں اور یہ فیصلہ کن آخری خطاب ان کے ساتھ کریں کہ وہ تو اس راہ پر چل پڑے ہیں اور اس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کا آخری فیصلہ نہیں آ جاتا ۔

---O O O---

درس نمبر ۹۷ تشریح آیات

۱۰۴ ــــ تا ــــ ۱۰۹

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِن كُنتُمْ فِى شَكٍّ مِّن دِينِى فَلَآ أَعْبُدُ ٱلَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ ٱللَّهَ ٱلَّذِى يَتَوَفَّىٰكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٤﴾

اے نبیؐ کہہ دو کہ "لوگو' اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو' میں ان کی بندگی نہیں کرتا' بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں"۔

اے لوگو! اور سب لوگو! اس وقت تو خطاب قریش کے مشرکین سے تھا کہ اگر تمہیں اس نظام زندگی کے بارے میں شکوک و شبہات ہیں' تو تمہارے شکوک میرے عمل اور یقین کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ مجھے تو اپنے دین اور نظریہ پر پورا پورا یقین ہے اور میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کر سکتا۔ میں تو اس ذات کی بندگی کروں گا جس کے قبضے میں تمہاری موت اور حیات ہے۔

وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰكُمْ (۱۰ : ۱۰۴) "میں صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے"۔

یعنی تمہاری زندگی اور موت کے اختیارات اس کے پاس ہیں۔ اللہ کی اس صفت کو یہاں بیان کرنے کی خاص حکمت ہے کہ موت و حیات کا مالک اللہ ہے' اس لیے کہ جن الٰہوں کی بندگی وہ کرتے تھے ان میں سے کوئی بھی نہ زندگی عطا کر سکتا تھا اور نہ کسی کو مار سکتا تھا۔

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰ : ۱۰۴) "اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں اس لیے اس ایمان کے حکم سے میں منہ نہیں موڑ سکتا"۔

وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٥﴾

"اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو"۔

یہاں آکر انداز کلام اب بیانیہ انداز کو ترک کر دیتا ہے اور ڈائریکٹ خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطاب لوگوں کے سامنے سن رہے ہیں۔ یہ نہایت ہی موثر انداز کلام ہے۔ خاص طور سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (۱۰:۱۰۵) "اور یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے"۔ یہ خطاب صرف آپ کی ذات کو ہے۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۰:۱۰۵) "اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو"۔ یہ نہایت ہی تاکیدی حکم ہے۔ یعنی مومنین میں ہو جاؤ۔ مشرکین سے نہ ہونے کو یہ بات مستلزم ہے کہ مومن ہو جاؤ۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

"اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہو گا"۔ یعنی مشرکین مکہ نے اللہ کے ساتھ جو خود ساختہ شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں اور ان کو وہ اپنے سفارشی سمجھتے ہیں ان کو ہرگز نہ پکارو۔ ان کو وہ نفع حاصل کرنے اور نقصان سے روکنے کی غرض سے پکارتے ہیں حالانکہ نفع دینے والا اور نقصان سے بچانے والا صرف اللہ ہے۔ اے پیغمبر اگر تم نے بھی ایسا کیا تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ اس میں کسی کی رو رعایت نہیں ہے۔ اللہ کا ترازو ایک ہے، اس کا قانون توحید اٹل ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۗ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

"اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے، اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

اس کائنات میں نفع و نقصان اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اگر انسان اسباب خیر اور نفع اپنائے تو اسے نفع ملے گا۔ اور اگر وہ اسباب نقصان اپنائے تو نقصان ملے گا۔ اگر اللہ اپنے قانون قدرت کے مطابق ' جو اس کائنات میں جاری ہے ' تمہیں نقصان دیتا ہے تو پھر کوئی بھی تمہیں اس نقصان سے بچا نہیں سکتا۔ تم صرف سنت الٰہیہ پر چل کر نقصان سے بچ سکتے ہو۔ صرف اس صورت میں کہ تم اسباب نقصان سے بچو۔ بشرطیکہ تمہیں معلوم ہوں اور اگر تمہیں معلوم نہ ہوں تو پھر اللہ سے دعا اور زاری کے ذریعے تم بچ سکتے ہو کہ اے اللہ ہمیں ایسے ذرائع کی طرف ہدایت فرما کہ ہم نقصانات سے بچ سکیں۔ اور اگر تم اللہ کی سنت کے مطابق چل رہے اور اس کی وجہ سے اللہ تمہیں فائدہ دینا چاہتا ہے تو اس کے اس فضل و کرم کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے تو یہ فضل ربی گویا اس طرح ملتا ہے کہ انسان اللہ کے اسباب کے مطابق اس کائنات میں اس کی جاری کردہ سنت کے مطابق چلتا رہے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۰:۱۰۷) (وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے) یعنی جب انسان غلطیوں کے بعد باز آتا ہے اور تائب ہوتا ہے تو وہ معاف کر دیتا ہے اور نہایت ہی رحیم و شفیق ہے۔ وہ گناہوں کو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ توبہ کر کے اپنے طرز عمل کو تبدیل کر دیں اور صراط مستقیم پر چل پڑیں۔

یہ ہے اس پوری سورت کا خلاصہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس کا کھلا اعلان فرما دیں اور انداز خطاب یوں ہے کہ گویا لوگ کھڑے ہیں اور آپ کو یہ حکم دیا جاتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ حکم ہی ان کو دیا جا رہا ہے اگرچہ مخاطب حضور اکرم ہیں۔ یہ ایک خاص اسلوب ہے اور نہایت ہی موثر انداز کلام ہے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ یہ موقف اپنا لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مخالفین نہایت ہی قوی اور تعداد میں بھی کثیر ہیں۔ آپ کے سامنے جاہلیت کے تہہ بہ تہہ رسم و رواج ہیں اور تاریخی طور پر زیر عمل عقائد شرکیہ ہیں جو لوگوں کے قلب و نظر کی گہرائیوں میں رچے بسے ہیں لیکن حضورؐ نہایت ہی قوت اور صراحت اور معقول انداز میں اسے چیلنج فرماتے ہیں۔ اگرچہ اس دور میں مکہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اور ظاہری قوت و شوکت مشرکین مکہ کو حاصل تھی۔

لیکن یہ فریضہ دعوت اسلامی ہے۔ یہ سچائی ہے اور حق یہ ہے کہ سچائی کو نہایت ہی زوردار انداز میں اور نہایت ہی دو ٹوک انداز میں پیش کیا جائے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٨﴾

"اے محمدؐ ' کہہ دو کہ "لوگو ' تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے اور میں تمہارے اوپر

کوئی حوالہ دار نہیں ہوں"۔

یہ آخری اعلان ہے۔ فیصلہ کن اور دو ٹوک۔ یہاں آکر حق و باطل کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ہر شخص کو اختیار دے دیا جاتا ہے کہ اپنے لیے جو راہ چاہے اختیار کرلے۔ اللہ کی طرف سے سچائی کے راستے کی طرف یہ راہنمائی آگئی ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۰ : ۱۰۸) "اب جو سیدھی راہ اختیار کرے تو اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے) رسول خدا نہ وکیل ہیں اور نہ حوالدار" کہ لوگوں کو زبردستی پکڑ کر راہ راست پر لائیں۔ آپ تو مبلغ ہیں۔ اللہ نے لوگوں کو اختیار دیا ہوا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو راہ چاہیں اختیار کریں۔ اور اپنے اختیار کو استعمال کرنے کے نتائج بھگتیں اور آخر کار اللہ کا آخری فیصلہ سنیں۔

آخری خطاب حضورؐ کو ہے کہ آپ اللہ کے احکام کی اطاعت کریں اور اللہ کے احکام پر صبر کرکے عمل کریں۔ اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے اور اس کا وقت قریب ہے۔

١٠

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع ٦

١٦

"اور اے نبیؐ، تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جا رہی ہے، اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔

یہ خاتمہ کلام ہے، اور آغاز سورت کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور یہ آخری کلمات پوری سورت کے مضامین کے ساتھ بھی مناسب ہیں۔ قرآن کریم کا طرز کلام ہی یہ ہے کہ وہ بات متوازن تصویر کشی کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ صدق اللہ العظیم!

---ooo---

فی ظلال القرآن

پارہ ۔۔۔۔ ۱۱

سورۂ ھود ۔۔۔۔ ۱۱

آیات ۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۵

پارہ ۔۔۔۔ ۱۲

سورۂ ھود ۔۔۔۔ ۱۱

آیات ۶ ۔۔۔۔ تا ۔۔۔۔ ۱۲۳

سورۂ یوسف ۔۔۔۔ ۱۲

آیات ۱ ۔۔۔۔ تا ۔۔۔۔ ۵۳

سورۂ ھود ایک نظر میں

یہ پوری سورت مکی ہے ۔ البتہ مصحف امیری میں آیات ۱۲' ۱۷ اور ۱۱۴ کے بارے میں ہے کہ یہ مدنی ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری سورت مکی ہے اور مذکورہ آیات کو اگر اپنے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ اگر ان آیات کو ان کے مقام سے ہٹا دیا جائے تو ان کے بغیر سلسلہ کلام واضح طور پر منقطع نظر آتا ہے ۔ پھر ان آیات کے اندر جو موضوع بحث ہے وہ بھی ان موضوعات میں سے ہو مکی موضوعات ہیں جن کا تعلق عقیدے اور نظریات کے ساتھ ہے ۔ ان نظریاتی موضوعات پر قریش کے موقف اور اس موقف کا رسول اللہؐ اور اہل اسلام پر اثرات اور پھر قرآن مجید نے اس سلسلے میں جو احکام و ہدایات دیں اور جس طرح ان اثرات کو دور کیا یہ خالص مکی اور مربوط مباحث اور موضوعات ہیں ۔

مثلاً دیکھئے آیت ۱۲

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (۱۱ : ۱۲)

"تو' اے پیغمبر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو (بیان کرنے سے) چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کہ یہ کہیں گے "اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا؟" یا یہ کہ "اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا" تم تو محض خبردار کرنے والے ہو۔ آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے ۔

یہ بات ظاہر ہے کہ قریش کی طرف سے یہ چیلنج اور یہ مطالبے مکہ میں ہو رہے تھے اور یہ اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ حضورؐ ان سے تنگ آگئے تھے اور اللہ کی جانب سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ آپ کو تسلی دی جائے اور آپ کو ہر اس ہدایت پر جم جانے کی تلقین فرمائی جائے جو آپ پر وحی ہو کر آتی ہے ۔ یہ حالات مکہ کے اس دور سے متعلق ہیں جب کہ حضرت ابو طالب فوت ہو گئے تھے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ بھی فوت ہو گئی تھیں اور حضورؐ کو اس دور میں عالم بالا کی سیر کرائی جا چکی تھی ۔ لیکن مشرکین حضورؐ کے خلاف ہر قسم کی کارروائیاں بڑی جرأت کے ساتھ کرتے تھے اور دعوت اسلامی کا پھیلاؤ پوری طرح روک دیا گیا تھا۔ غرض اس دور میں دعوت اسلامی مکہ میں نہایت ہی مشکل حالات سے گزر رہی تھی ۔

آیت ۱۷ یہ ہے ۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا

وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ

مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۱:۱۷) "بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا' اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے آ گیا اور پہلے موسیٰ کی کتاب راہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی ۔ ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے ۔ پس لے پیغمبر تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا ۔ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔

یہ مضمون بھی واضح طور پر مکی مضمون نظر آتا ہے ۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ یہ وحی اللہ کی طرف سے ہے اور مشرکین سے متعلق کیا گیا ہے کہ ان کو بتا دیا جائے کہ یہ کتاب لاریب رب کی طرف سے ہے اور اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل ہوئی تھی اور اس میں بھی نبی آخر الزمان پر شہادت موجود ہے اور بعض اہل کتاب نے بھی شہادت دی ہے اور ظاہر ہے کہ مکہ میں بھی اہل کتاب موجود تھے جن میں سے بعض نے ایمان قبول کر لیا تھا ۔ اور ان کے ایمان لانے کو اہل مکہ کے خلاف دلیل اور تردید کے طور پر یہاں استعمال کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ جو گروہ بھی لے پیغمبر آپ کی وحی کا انکار کریں گے ان کی جگہ جہنم ہے ' لہٰذا آپ اپنی راہ پر ثابت قدم رہیں ۔ کیونکہ آپ حق پر ہیں اور یہ کہ دعوت حق پر جو عارضی جمود طاری ہے یا اکثر اہل مکہ اس کے انکار پر مصر ہیں تو ان باتوں سے آپ پریشان نہ ہوں ۔ یہاں حضرت موسیٰ کی کتاب کا ذکر تو ہوا ہے لیکن آیت میں خطاب بنی اسرائیل کو نہیں ہے ۔ نہ بنی اسرائیل کو یہاں کوئی چیلنج دیا گیا ہے جیسا کہ بعد کے مکی دور کی خصوصیت ہے ۔ بلکہ نزول وحی پر ایک دلیل ہے کہ پہلے بھی وحی کا نزول ہوتا رہا ہے ۔ مکی دور کے جن مشکل حالات میں یہ سورت نازل ہوئی یہ ان میں مناسب انداز کلام ہے کہ اس سے پہلے بھی تو کتاب نازل ہوئی ہے ۔

اب آیت ۱۱۴ کو لیجئے ۔ یہ ایک ایسے سیاق کلام میں وارد ہے جس میں حضور اکرم ؐ کو تسلی دی گئی ہے ۔ آپ کی ڈھارس بندھائی گئی ہے کہ اس قسم کی رکاوٹیں اور مشکلات حضرت موسیٰ کو بھی پیش آئی تھیں اور حضرت موسیٰ ؑ کو بھی یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ثابت قدم رہیں اور یہ کہ آپ ظالموں کی طرف نہ جھکیں اور ان مشکل حالات میں صبر و استقامت سے کام لیں ۔ ذرا ان آیات پر غور کریں ۔ آیت ۱۱۰ سے آیت ۱۱۵ تک سب کا مضمون مسلسل ہے اور مکی حالات خصوصاً جو حالات اس وقت تھے ' کے عین مطابق ہے ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

بَيْنَهُمْ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱۰) وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ

اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱۱) فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۲) وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱۳) وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (۱۱۴) وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۵) ((۱۱: ۱۱۰ تا ۱۱۵)) "اور ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں' اور اس کے بارے میں اختلاف کیا گیا تھا۔ اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔

پس اے نبی تم اور تمہارے وہ ساتھی جو پلٹ آئے ہیں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔

ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی اور سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تمہیں مدد نہ پہنچے گی۔

اور دیکھو نماز قائم کرو' دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں' یہ ایک یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھتے ہیں۔ اور صبر کرو نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوتا"۔

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ پورا بیان مسلسل مکی آیات پر مشتمل ہے۔ موضوع' حالات اور عبارت کی ساخت ہر اعتبار سے۔

یہ پوری سورت یکبار سورت یونس کے بعد نازل ہوئی ہے اور سورت یونس 'سورت بنی اسرائیل (اسرا) کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح ان حالات کے خدوخال کا تعین ہو جاتا ہے جن میں یہ سورت نازل ہوئی تھی۔ یہ کہ اس وقت کے حالات نہایت ہی دلدوز' پریشان کن اور ہمت شکن حالات تھے 'مکہ کی پوری دعوتی زندگی میں اس قدر مشکلات کبھی پیش آئی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ فوت ہو چکے تھے اور مشرکین اب ایسی جرأتیں کرنے لگے تھے جو وہ ابوطالب کی زندگی میں نہ کر سکتے تھے۔ خصوصاً جب معراج کا واقعہ پیش آ گیا۔ حضورؐ نے اس کا اعلان کر دیا۔ بظاہر یہ واقعہ ناممکن الوقوع نظر آتا تھا۔ اس کے نتیجے میں بعض لوگ مرتد بھی ہو گئے تھے۔ مخالفین نے ہنسی و مذاق کا طوفان مچا دیا تھا' خصوصاً جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کی وفات سے بہت ہی پریشان تھے اور قریش آپؐ اور آپؐ کی دعوت کے مقابلے میں سخت زیادتیاں کر رہے تھے اور یہ جنگ نہایت ہی شدت اختیار کر گئی تھی اور اس جنگ اور کشمکش کی وجہ سے دعوت اسلامی پر جمود کی حالت طاری ہو گئی تھی۔ یہ وہ حالات تھے جو بیعت عقبہ اول سے قبل مکہ میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ اس بیعت کے بعد رسول اور دعوت رسول کے لیے مدینہ والوں کے دل اللہ نے کھول دیئے۔

ابن اسحاق واقعات کے بیان کے بعد یہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک ہی سال میں خدیجہ بنت خویلد اور ابوطالب فوت ہو گئے۔ خدیجہ کی وفات کے بعد حضورؐ پر مصائب ٹوٹ پڑے۔ خدیجہ آپؐ کا ایک سچا اور مخلص وزیر تھیں۔ آپ پر جب مشکلیں آ پڑتیں تو آپؐ ان کے سامنے اپنی مشکلات کا اظہار کرتے۔ ابوطالب کی وفات کا اثر یہ ہوا کہ آپؐ ایک

مضبوط اور طاقتور حامی سے محروم ہو گئے ۔ابو طالب ہی تھے جو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح آپؐ کے اور آپؐ کے مخالفین کے درمیان کھڑے تھے ۔ یہ واقعہ مدینہ کی طرف ہجرت کے واقعے سے تین سال قبل پیش آیا۔ ابو طالب جب سامنے نہ رہے تو قریش نے حضورؐ پر وہ زیادتیاں شروع کر دیں جو وہ اس سے قبل نہ کر سکتے تھے ۔ یہاں تک کہ قریش کے بے وقوفوں میں سے ایک بے وقوف نے حضورؐ کے سر پر مٹی ڈال دی ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ہشام ابن عروہ نے اپنے والد عروہ ابن الزبیر کے ذریعے یہ روایت کی ہے کہ جب اس بے وقوف نے حضورؐ کے سر پر مٹی ڈالی تو حضورؐ اپنے گھر میں داخل ہوئے اور آپؐ کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی ۔ آپؐ کی بیٹیوں میں سے ایک اٹھی اور مٹی دھونے لگی اور ساتھ ساتھ روتی بھی تھی اور رسول اللہؐ ان سے کہتے تھے "بچی مت رو، اللہ تمہارے باپ کا مانع (محافظ) ہے"۔ کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر حضورؐ نے فرمایا "میرے ساتھ قریش اس قسم کا مکروہ سلوک تب ہی کر سکے جب ابو طالب فوت ہو گئے"۔

مقریزی امتاع الاسماع میں کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ ان دونوں کی موت کی وجہ سے یہ مشکلات دوچند ہو گئیں ۔ آپ نے اس سال کو عام الحزن قرار دیا اور کہا "قریش نے میرے ساتھ یہ سلوک تب کیا جب ابو طالب فوت ہو گئے" ۔ کیونکہ آپ کے خاندان میں اور آپ کے چچوں میں آپؐ کا ان کے سوا کوئی حامی نہ تھا جو آپؐ سے ان لوگوں کو روکتا ۔

ان حالات میں سورت ھود نازل ہوئی جبکہ اس سے قبل سورت یونس نازل ہو گئی تھی اور اس سے بھی پہلے سورت اسرا (بنی اسرائیل) اور سورت الفرقان نازل ہو چکی تھی ۔ یہ سب سورتیں اس خاص مرحلے کے خدوخال لیے ہوئے ہیں اور ان میں تفصیلا بتایا گیا ہے کہ قریش کس قدر حد سے آگے بڑھ گئے تھے ۔

اس دور کے کیا حالات تھے اور کیا رنگ ڈھنگ تھا اور کیا فضا تھی ۔ یہ سب کچھ اس سورت کے ماحول اور موضوعات سخن سے اچھی طرح واضح ہے ۔ خصوصا ان آیات سے جن میں حضور اکرمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ اپنے موقوف پر جم جائیں اور آپؐ اس دور میں، جس طرح ایک جاہلی معاشرے میں اپنے آپ کو تنہا سمجھتے تھے، دلگیر تھے اور وحشت میں مبتلا تھے، اس پر آپ کی ڈھارس بندھائی گئی ہے ۔

ان حالات میں یہ سورت اپنے اندر چند خصوصیات لیے ہوئے ہے اور میں ان میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کروں گا ۔

○ اس سورت میں حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسلامی نظریات کی تبلیغ اور تحریک کی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں اسلام کے بنیادی عقائد ایک ہی رہے ہیں اور وہ یہ کہ اللہ کی بندگی کی جائے اور اس بندگی میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، پھر اس کی مکمل اطاعت کی جائے اور اس میں بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اس مکمل بندگی اور اطاعت کے سلسلے میں ہر دور میں اس وقت کے رسول سے ہدایات اور طریقے اخذ کیے جائیں اور تمام رسولوں کی ہدایات عقیدۂ آخرت اور آخرت کی جواب دہی کے اعتقاد پر مبنی ہیں ۔ اور یہ کہ رسولوں نے جس راہ ضلالت اور راہ ہدایت کی نشاندہی کر دی اس کے اختیار کرنے میں اللہ نے انسان کو مکمل طور پر خود مختار چھوڑا ہے کہ وہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے ۔ ہدایت کی راہ یا ضلالت کی راہ ۔

حضور اکرمؐ تشریف لائے تو آپ کے ہاتھ میں (کِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ) "ایک فرمان تھا جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے"۔ اور اس کتاب کی اساسی تعلیمات یہ ہیں:

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (۲) وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ (۳) اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴) (۱۱: ۲ تا ۴) "کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو' اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

لیکن یہ بنیادی دعوت بھی کوئی نئی دعوت نہ تھی اور یا یہ ایسی بات نہ تھی کہ اس سے قبل کسی نے یہ نہ کی ہو۔ اس سے قبل حضرت نوحؑ' حضرت ھودؑ' حضرت صالحؑ' حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام جیسے پیغمبر اسی کی طرف دعوت دیتے آئے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۵) اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (۲۶) (۱۱: ۲۵ - ۲۶) "اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا"۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۵۰) يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۵۱) وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۵۲) قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّ

مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۵۳)(۱۱ : ۵۰ تا ۵۳) "اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادران قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' میرا اجر تو اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو وہ تم پر آسمان کے دھانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا تم' مجرم بن کر بندگی سے منہ نہ پھیرو انہوں نے (جواب میں) کہا" تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر نہیں آیا' اور ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہی ہم تجھ کو ماننے والے ہیں"۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۱۱ : ٦۱) "اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ' یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے"۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ (۸۴) وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۸۵) بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۸٦)((۱۱ : ۸۴ تا ۸٦)) "اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا" اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے اور ناپ و تول میں کمی نہ کیا کرو' آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں' مگر مجھے ڈر ہے کہ تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا اور اے برادران قوم ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ بہرحال میں تمہارے اوپر نگران کار نہیں ہوں"۔

غرض تمام انبیاء یہی کلمہ دہراتے رہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے اور یہی تمام انبیاء کی دعوت رہی۔

○ اس سورت میں تمام رسولوں کی ثابت قدمی کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ کہ یہ رسول قوم کی طرف سے تکذیب' روگردانی' مذاق اور استہزا اور ایذا رسانیوں اور دھمکیوں کے مقابلے میں کس طرح برداشت' صبر اور اعتماد و یقین کے ساتھ حق پر جمے رہے اور انہیں پوری نبوی اور تحریکی زندگی میں یہ یقین رہا کہ اللہ کی مدد ضرور آکر رہے گی۔ چنانچہ دنیا میں بھی ان کی پیشن گوئیاں حق ثابت ہوئیں اور آخرت میں بھی ہوں گی۔ چنانچہ ان رسولوں کو پختہ یقین رہا کہ مکذبین تباہ ہوں گے' اور مومنین نجات پائیں گے۔

مثلاً حضرت نوح کے قصے میں یہ منظر قابل دید ہے:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۲۷) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۲۸) وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۲۹) وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳۰) وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۱) قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۳۲) قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ

(۳۳) (۱۱: ۲۷ تا ۳۳) "جواب میں اس کی قوم کے سردار' جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا' بولے "ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے۔ بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو' بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں"۔ اس نے کہا "اے برادران قوم' ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی

خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سرچپک دیں؟ اور اے برادران قوم میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے' وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں' نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں۔ انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا"۔ آخر کار ان لوگوں نے کہا کہ اے نوح' تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو' اگر سچے ہو"۔ نوح نے جواب دیا "وہ تو اللہ ہی لائے گا اگر چاہے گا اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو"۔

اس کے بعد طوفان کا منظر آتا ہے' جس میں جھٹلانے والے ہلاک ہوتے ہیں اور مومن نجات پاتے ہیں اور حضرت ھود کے قصے میں ہم یہ منظر پاتے ہیں :

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۵۳) اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۵۴) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۵۵) اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵۶) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ (۵۷)

(۱۱: ۵۳ - ۵۷) "انہوں نے جواب دیا "اے ھود' تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اور نہ ہی تجھ کو ہم ماننے والے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے"۔ ھود نے کہا "میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں' اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے' اس سے میں بیزار ہوں۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو۔ اور مجھ کو ذرا مہلت نہ دو' میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ اگر تم منہ پھرتے ہو تو پھیر لو' جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمہاری جگہ

دوسری قوم اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے' یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگران ہے"۔

اب اس قوم کا انجام ملاحظہ فرمائیں :

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۵۸) وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۵۹) وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (۶۰) (۱۱: ۵۸ تا ۶۰) "اور پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے' نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انہیں بچا لیا --- یہ ہیں عاد' اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی بات انہوں نے نہ مانی اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے ۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی ۔ عاد نے اپنے رب سے کفر کیا ۔ سنو دور پھینک دیئے گئے عاد ہود کی قوم کے لوگ"۔

اور حضرت صالح کے قصے میں یہ منظر ہے :

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۶۲) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۶۳) (۱۱: ۶۲ تا ۶۳) "انہوں نے کہا: "اے صالح' اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں ۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے ۔ جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"۔ صالح نے کہا: "اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھ کو کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو' سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو"۔ اس کے بعد وہ جن کی جانب سے ناقہ کے پاؤں کاٹ دیئے گئے ان کی تکذیب کی وجہ سے ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (۶۶) وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ

دِيَارِهِمْ جٰثِمِينَ (٦٧) كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ (٦٨) (١١: ٦٦ تا ٦٨) "آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔ بے شک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالادست ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے رہ گئے گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سنو ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا، سنو اور پھینک دیئے گئے ثمود؟"

اب حضرت شعیب کے قصے کا منظر پیش ہوتا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (٨٧) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَ مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ (٨٨) وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ (٨٩) وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ (٩٠) قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَ لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ (٩١) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (٩٢) وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَ ارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ (٩٣) وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (٩٤) كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (٩٥)

(۱۱ : ۸۷ تا ۹۵) ''انہوں نے جواب دیا'' اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنی منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا'' --- شعیب نے کہا ''بھائیو' تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا' اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا ۔ (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں ۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے ۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں ۔ اور اے برادران قوم' میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخرکار تم پر بھی وہی عذاب آکر رہے جو نوح ؑ یا ہود ؑ یا صالح ؑ کی قوم پر آیا تھا ۔ اور لوط ؑ کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے ۔ دیکھو' اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ' بیشک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے'' ۔

انہوں نے جواب دیا ''اے شعیب ؑ' تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں' اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے' تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے' تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو'' ۔

شعیب ؑ نے کہا : ''بھائیو' کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا تو خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے ۔ اے میری قوم کے لوگو' تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا' جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے ۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں'' ۔

آخرکار ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے ۔ گویا وہ وہاں رہے بسے ہی نہ تھے' سنو مدین والے بھی دور پھینک دیئے گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے'' ۔

○ ان تمام قصوں پر ایک جامع تبصرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کا مطلب سمجھایا گیا ہے اور آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان پر ان کو تسلی دی گئی ہے' خصوصاً یہ یاد دہانی کر کے کہ اللہ کی حفاظت اور نگہبانی ان کے شامل حال رہی اور وہ ہر وقت مددگار رہا ۔ اور حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ بھی ان جیسے لوگوں سے اس طرح بائیکاٹ کریں جس طرح آپ سے قبل تمام رسولوں نے اس قسم کے لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ۔ اور اس میں اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ حضورؐ کی رسالت' اور آپؐ پر نازل ہونے والی وحی برحق ہے اور آپؐ سچے رسول ہیں ۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کے اختتام پر یہ کہا گیا ہے ۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا

فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۱۱: ۴۹) "اے نبی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں، اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ پس صبر کرو، انجام کار متقیوں کے حق میں ہے"۔ اور اس سورت کے تمام قصوں کے اختتام پر یہ طویل تبصرہ ہے جو سورت کے اختتام تک چلا گیا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ (۱۰۰) وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۰۱) وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۰۲) ((۱۱: ۱۰۰ تا ۱۰۲)) "یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے، جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا انہوں نے آپ ہی اپنے اوپر ظلم ڈھایا۔ اور جب اللہ کا حکم آ گیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آ سکے۔ اور انہوں نے ہلاکت اور بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ ایسی ہوا کرتی ہے۔ فی الواقعہ اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱۰) وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱۱) فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۲) وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱۳) وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (۱۱۴) وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۵) ((۱۱: ۱۱۰ تا ۱۱۵)) "ہم اس سے قبل موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا۔ اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان بھی کا فیصلہ چکا دیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔ پس اے نبی، تم، اور تمہارے وہ ساتھی جو پلٹ آئے ہیں،

ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو' جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو' جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے - ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے - اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا' جو خدا سے نہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی اور دیکھو نماز قائم کرو' دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر در حقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں - یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں اور صبر کرو نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوتا" -

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ جَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۲۰) وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۲۱) وَ انْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۲۲) وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۲۳) (۱۱: ۱۲۰ تا ۱۲۳) "اور اے نبی پیغمبروں کے یہ قصے' جو ہم تمہیں سناتے ہیں' یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں - ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا - اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی - رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے' تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں' انجام کار تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں - آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے - سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے - اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے - پس اے نبی' تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ' جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو' تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے" -

ان تمام قرآنی ہدایات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کس تحریک پر زور دیا گیا ہے - چنانچہ تحریک کے ہر مرحلے اور ہر موقف پر قرآن کریم پوری پوری ہدایات دیتا ہے - تحریک اسلامی جاہلیت کے عملی مقابلے میں جس مقام پر ہوتی ہے قرآن حکیم اس مقام و محل اور ظروف و احوال کے مطابق عملی حکمت بتاتا جاتا ہے اور یہ حکمت قصص انبیاء کی شکل میں سمجھائی جاتی ہے - اس طرح یہ قصے تحریک کے حالات اور سورت کی فضا میں نہایت ہی برمحل اور موزوں اور سیاق کلام میں مربوط اور متناسق ہوتے ہیں اور ہدایات و احکام اور اشارات اور حکمتوں سے لبریز بھی -

---ooo---

گیارہویں پارے میں سورت یونس کے تعارف میں ہم نے یہ کہا تھا :

"اس سے قبل ہمارے مطالعے میں جو آخری مکی سورتیں تھیں وہ سورت انعام اور سورت اعراف تھیں - موجود مصحف کی ترتیب میں وہ باہم پیوست تھیں - اگرچہ ترتیب نزول کے مطابق ان کا زمانہ نزول ایک نہیں ہے - اس کے بعد سورت انفال اور سورت توبہ آتی ہیں اور یہ محل نزول اور موضوع کے اعتبار سے مدنی سورتیں ہیں - اب ہم دوبارہ مدنی

دور میں ہیں ۔ سورت یونس اور سورت ہود دونوں ترتیب مصحفی اور ترتیب زمانہ نزول کے اعتبار سے ایک محل اور ایک زمانے کی ہیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورتوں کے اس جوڑے اور اس جوڑے کے درمیان کئی باتیں مشترکہ ہیں ۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اور موضوع کی ادائیگی کے اعتبار سے بھی ۔ سورت انعام اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کو لیتی ہے اور اسے جاہلیت کے بالمقابل پیش کرتی ہے ۔ جاہلیت پر تنقید کرتی اور جاہلیت کے نظریات کے عقائد' نظام عبادات اور نظام اعمال پر حقارت آمیز نظر ڈالتی ہے ۔ جبکہ سورت اعراف ان عقائد و نظریات کو عملی اور تحریکی انداز میں سامنے لاتی ہے ۔ اور پوری انسانی تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا نقشہ پیش کرتی ہے ۔ یہاں سورت یونس اور سورت ہود کا کچھ یہی حال ہے ۔ یہاں بھی اس جوڑے اور اس جوڑے کے درمیان مکمل مشابہت ہے ۔ ماسوا اس قدر فرق ہے کہ

دور میں ہیں ۔ سورت یونس اور سورت ہود دونوں ترتیب مصحفی اور ترتیب زمانہ نزول کے اعتبار سے ایک محل اور ایک زمانے کی ہیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورتوں کے اس جوڑے اور اس جوڑے کے درمیان کئی باتیں مشترکہ ہیں ۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اور موضوع کی ادائیگی کے اعتبار سے بھی ۔ سورت انعام اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کو لیتی ہے اور اسے جاہلیت کے بالمقابل پیش کرتی ہے ۔ جاہلیت پر تنقید کرتی اور جاہلیت کے نظریات کے عقائد' نظام عبادات اور نظام اعمال پر حقارت آمیز نظر ڈالتی ہے ۔ جبکہ سورت اعراف ان عقائد و نظریات کو عملی اور تحریکی انداز میں سامنے لاتی ہے ۔ اور پوری انسانی تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا نقشہ پیش کرتی ہے ۔ یہاں سورت یونس اور سورت ہود کا

مثلاً وہ اساسی مقاصد کیا ہیں، جن کے لیے اس سورت کو لایا گیا ہے؟ درج ذیل نکات کا غور سے مطالعہ فرمائیں۔

○ یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو تعلیمات دیتے ہیں اور جو ہدایات ان کے پیش نظر ہیں، وہ آپ سے پہلے آنے والے رسولوں کی تعلیمات و ہدایات تھیں۔ وہ یہ کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور وہی حاکم ہے۔ اور اسی سے ہم نے اپنی زندگیوں کا نظام اخذ کرنا ہے اور یہی وہ نظریہ ہے اور یہی وہ معیار ہے جس کے مطابق انسانوں کے اندر صف بندیاں ہوتی رہی ہیں۔ سورت کے آغاز ہی میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کے بارے میں یہ حقائق سامنے لائے گئے ہیں:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (۲) ((۱۱ : ۱ - ۲)) "ال ر، فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں، ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی"۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۳) فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۴) ((۱۱ : ۱۳ تا ۱۴)) "کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو "اچھا یہ بات ہے۔ تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اب اگر وہ تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو"۔

قصص میں بھی انبیاء کی دعوت کی تعریف جابجا موجود ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ انبیاء اپنی قوم اور اپنے اہل و عیال سے مکمل بائیکاٹ کر دیں اور یہ صف بندی صرف نظریات کے اصول پر ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۵) اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (۲۶) ((۱۱ : ۲۵ تا ۲۶)) "اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا"۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ

عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۱۱ : ۲۸) ”اس نے کہا‘ اے برادران قوم‘ ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی ایک خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپک دیں؟“

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ (۴۵) قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صٰلِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (۴۶) (۱۱ : ۴۵ تا ۴۶)

)) ”اور نوح ؑ نے اپنے رب کو پکارا‘ کہا: ”اے میرے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے۔ اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے“۔ جواب میں ارشاد ہوا: ”اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔ لہذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا‘ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنالے“۔

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۱۱ : ۵۰) ”اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو‘ تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں“۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ (۱۱ : ۶۱) ”اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا‘ اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو‘ اللہ کی بندگی کرو‘ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا‘ لہذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ یقیناً میرا رب قریب ہے‘ اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے“۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ اٰتٰىنِیْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَیْتُهٗ فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ (۱۱ : ۶۳) ”صالح نے کہا‘ اے برادران قوم‘ تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ

سکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو"۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ -----

(۱۱: ۸۴) "اور مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا

(۱۱: ۸۸) "شعیب نے کہا' بھائیو' تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک مکمل شہادت پر تھا اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا"۔ ان تمام قصص اور مباحث سے جو نتائج اس سورت میں اخذ کیے گئے ان کے بارے میں یہ آیات قابل ملاحظہ ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ نظریات کی اساس پر مکمل صف بندی کی ضرورت ہے :

وَ لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱: ۱۱۳) "ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں ایسا کوئی ولی اور سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی"۔

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۱: ۱۲۳) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے نبی' تو اللہ کی بندگی کر اور اس پر بھروسہ رکھ' جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

اس طرح اس سورت کے مذکورہ بالا تینوں حصے ایک دوسرے سے پیوستہ اور مربوط ہو جاتے ہیں۔

○ اس غرض کے لیے کہ لوگ اللہ وحدہ کے نافذ کردہ نظام زندگی کو اپنا لیں اور صرف اس کی بندگی کریں۔ اس سورت میں اللہ کی بزرگی اور کبریائی کو بھی بیان کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ پوری کائنات اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور یہ کہ تمام انسانوں نے قیامت کے دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے اور تب صرف اللہ ہی جزا و سزا کے بارے میں فیصلے کرے گا۔ سورت کے مذکورہ بالا تینوں حصوں میں اس مضمون کو لیا گیا ہے۔

سورت کے آغاز میں کہا گیا ہے :

اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۵) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا

عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٦) وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْآ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (٧) وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهُ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (٨)

(۱۱ : ۵ تا ۸) " دیکھو یہ لوگ سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں' خبردار جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں' زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو' اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔ اور وہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اب اگر اے نبی تم کہتے ہو کہ لوگو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے۔ اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو' جس روز اس سزا کا وقت آگیا تو وہ کسی کے پھیرے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں"۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (١٥) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (١٦) (۱۱ : ۱۵ تا ۱۶) " جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں' ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے اس دنیا میں بنایا وہ سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے"۔

اسی طرح جس حصے میں نبیوں کے جو قصے ہیں اس میں بھی اللہ کی کبریائی کے نمونے موجود ہیں :

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٥٦) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَ

يَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (٥٧)

[redacted]

مختلف طریقوں پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جس پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی کے لیے تو اس نے انہیں پیدا کیا تھا' اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

اس طرح اس سورت کے تینوں حصوں میں حقیقت الوہیت اور آخرت کی جواب دہی کے مضمون کو مسلسل لایا جا رہا ہے۔ اس میں اس سورت کا زور اس نکتہ پر نہیں ہے کہ آیا اس کائنات کا کوئی الٰہ ہے یا نہیں ہے' اصل زور اس پر ہے کہ انسانوں کے لیے الٰہ واحد ہی اللہ رب العالمین ہے اور وہی حاکم مطلق ہے' کیونکہ نفس وجود باری میں مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان اختلاف نہ تھا۔ نبیوں اور ان کے مخاطبین کے درمیان اکثر و بیشتر نکتہ اختلاف یہ رہا ہے کہ رب العالمین صرف الٰہ واحد ہے یا اور بھی کوئی ہے۔ اور یہی اختلاف مشرکین مکہ اور خاتم النبیین کے درمیان بھی تھا۔ پس حضور اور مشرکین مکہ کے درمیان نکتہ اختلاف یہی تھا کہ اطاعت صرف اللہ العالمین کی کرنی ہے یا کسی اور کی بھی۔ آیا دنیا میں اللہ کا دین اور اللہ کا نظام اور اس کی شریعت اور اس کے فیصلے نافذ ہوں گے یا کسی اور کے بھی ہوں گے۔ ان مذکورہ اقتباسات میں یہی مرکزی نکتہ اختلاف مذکور ہے۔

---○○○---

عوام الناس کے ذہنوں میں یہ نظریاتی عقائد و تصورات جاگزیں کرنے کی غرض اور انہیں انسانی شخصیت کی سوچ و عمل کا حصہ بنانے کی خاطر اور ان تصورات کو ایک مضبوط اور متحرک اور مثبت قوت بنانے کے لیے اس سورت میں' ان تصورات کو مختلف اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ عقائد و تصورات اس قدر مضبوط اور موثر ہو جائیں کہ انسان کی پوری شخصیت پر چھا جائیں اور انسان ان تصورات کے لیے ہر وقت پر جوش ہو اور اس کے لیے وہ بر وقت جدوجہد کرتا ہو۔

○ چنانچہ اس سورت میں ترغیب اور ترہیب کی آیات بہت زیادہ ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ دعوت اسلامی کو قبول کریں گے۔ انہیں دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب ہوگی۔ جو قوم بھی اسلامی نظام قبول کرے وہ اس دنیا میں بھی خوب ترقی کرے گی اور آخرت میں بھی فلاح پائے گی اور جو قوم اس نظام سے منہ پھیرے گی وہ دنیا میں بھی خوار ہوگی اور آخرت کی دائمی بھلائیوں سے بھی محروم ہوگی۔ کیونکہ جو شخص داعی حق کی دعوت سے منہ موڑے گا وہ طاغوت کا پیرو ہوگا اور طاغوت اسے واصل جہنم کر دے گا۔ اس لئے کہ طاغوتی قوتوں کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ لوگوں سے اپنی پیروی کرائیں یا لوگ ان کی پیروی کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے نظام زندگی کو ترک کر دیں۔ اس ترغیب اور ترہیب کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ (٢) وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ (٣) إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (٤) ((١١: ٢ تا ٤)) "کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار

کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (۱۵) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱٦) (۱۱: ۱۵ تا ۱٦) "جو لوگ بھی اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۷) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۲۰) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۱) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۲۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ

فِيهَا خٰلِدُونَ (٢٣) مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيرِ وَ السَّمِيعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُونَ (٢٤) (١١: ١٧ تا ٢٤) "پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا' اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آگیا' اور پہلے موسیٰ ؑ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے پیغمبرؐ' تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر--- ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں' اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں' اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھو دیا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر رہے' تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے؟

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ (١١: ٥٢) "اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کر دے گا۔ مجرم بن کر منہ نہ پھیرو"۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّونَهٗ شَيْئًا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (١١: ٥٧) اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو۔ جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگران ہے"۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ (٩٦) اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ

فِرْعَوْنَ وَ مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۹۷) يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۹۸) وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ (۹۹) (۱۱: ۹۶ تا ۹۹) "اور موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی سند ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے پاس بھیجا مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی ' حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور اپنی پیشوائی میں وہ انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گا' کسی بدترین جائے ورود ہے یہ جس پر کوئی پہنچے"۔

---ooo---

○ اسلامی نظریہ حیات کی طویل تاریخ اس سورت میں بیان کی گئی ہے ' ان تاریخی قصص کے درمیان بھی جابجا ترغیب و ترہیب وارد ہے۔ ان قصص میں مجرمین کی ہلاکت اور مومنین کی کامیابیاں مذکور ہیں۔ جن کے بہت سے اقتباسات ہم نے اس سے قبل دیئے ہیں خصوصاً طوفان نوح کی جو منظرکشی کی گئی ہے وہ اس کی واضح مثال ہے۔ اس منظر کے درمیان جو قدرتی مناظر پر مشتمل ہے رفتار واقعات تیز ہو جاتی ہے۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۶) وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۳۷) وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (۳۸) فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۳۹) حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ وَ مَا اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ (۴۰) وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۴۱) وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَ نَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (۴۲) قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا

الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ (٤٣) وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

(٤٤) (١١: ٣٦ تا ٤٤) ”نوح ؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے‘ بس وہ لا چکے‘ اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا‘ یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں۔ نوح ؑ کشتی بنا رہا تھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے کہا ”اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہو‘ عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلاٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا ”ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو‘ اپنے گھر والوں کو بھی --- سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں“۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح ؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوح ؑ نے کہا ”سوار ہو جاؤ اس میں‘ اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی‘ میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔ کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا: ”بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا‘ کافروں کے ساتھ نہ رہ“۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا: ”میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا“۔ نوح ؑ نے کہا: ”آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے“۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔ حکم ہوا ”اے زمین‘ اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا“۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا‘ فیصلہ چکا دیا گیا‘ کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم!“

○ اس سورت میں بعض لوگوں کی نفسیاتی تصویر کشی بھی کی گئی ہے‘ جو بدبختی کی گرفت میں ہیں اور اندھوں کی طرح اس کائنات کے مشاہد سے غیر متاثر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ جھٹلانے والوں کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے‘ جس کے لیے وہ بار بار بے صبری سے مطالبہ کرتے تھے اور جو لوگ ان کو عذاب سے ڈراتے تھے ان کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ اور جب خود ان کا طلب کردہ یہ عذاب ان پر نازل ہوتا تھا تو اس وقت ان کی جو نفسیاتی کیفیت ہوتی اس کی بھی خوب تصویر کشی کی گئی ہے اور ان حسرتوں کا خوب نقشہ کھینچا گیا ہے جو ان کی نفسیات کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اب وہ تمام انعامات اور عیاشیاں ختم تھیں جن کے مزے وہ لوٹ رہے تھے۔ اور اگر ان سے عذاب ایک لمحے کے لیے بھی ہٹا دیا جائے تو پھر غافل!

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (٨) وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ

مِّنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ (۹) وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ (۱۰) اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (۱۱) (۱۱: ۸ تا ۱۱) ''اور اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو' جس روز اس سزا کا وقت آگیا تو وہ کسی کے پھیرے سے نہ پھر سکے گا۔ اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے' اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی ہم اسے نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے۔ پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی''۔

○ اس سورت میں مناظر قیامت میں سے بعض مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں اور ان میں جھٹلانے والوں کی ایک جھلک بھی دکھائی گئی ہے۔ اس وقت جب کہ وہ اس رب کے سامنے پیش ہوں گے جس کا وہ انکار کرتے تھے اور جس کے رسولوں سے وہ منہ پھیرتے تھے۔ اس وقت ان کو جو شرمندگی لاحق ہو گی اس کا ذکر ہے اور اس وقت صورت یہ ہو گی کہ جن لوگوں کو وہ رب بناتے تھے اور اپنے سفارشی سمجھتے تھے وہ اس وقت کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۲۰) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۱) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۲۲) (۱۱: ۱۸ تا ۲۲) ''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر --- ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں' اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں' اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ

تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھو دیا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں"۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۰۳) وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ (۱۰۴) یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ (۱۰۵) فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ (۱۰۶) خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (۱۰۷) وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۰۸) (۱۱: ۱۰۳ تا ۱۰۸)

"حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے۔ وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا۔ ہم اس کے لانے میں کچھ بہت زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہو گی' الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے۔ پھر کچھ لوگ اس روز بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اس حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں' الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ منقطع نہ ہو گا"۔

○ اور بعض اثر انگیز مناظر وہ ہیں کہ جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔ اور وہ انسان کے تمام خفیہ معاملات جانتا ہے کھلے ہوں یا پوشیدہ' جبکہ انسان کو پتہ نہیں ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے اور اس کا علم محیط ہے اور انسان اس قدر غافل ہے اور بے حس ہے کہ اس کو یہ احساس ہی نہیں ہے کہ اللہ کے کنٹرول میں ہے سب کچھ اور وہ محیط ہے۔ اور خود اللہ کو جھٹلانے والے بھی دراصل اس کے قبضہ قدرت کے اسیر ہیں لیکن ان کو شعور نہیں ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ یَعْلَمُ مَا

يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (٥) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٦) (١١: ٥ تا ٦)) دیکھو یہ لوگ سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں' خبردار جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں' زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو' اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے ۔سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے"۔

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (١١: ٥٦) "میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی ۔کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو' بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے"۔

○ دوسری اثر انگیزیوں اور سحر آفرینیوں کے علاوہ اس سورت میں قافلہ ایمان کو مسلسل سفر کرتا ہوا دکھایا گیا ہے ۔ اس قافلے کی قیادت رسولوں کے ہاتھ میں ہے اور یہ صدیوں سے اس سیدھی راہ پر رواں دواں ہے' اور اس قافلے نے ہر دور اور ہر زمانے اور ہر جگہ یہی دو ٹوک اور فیصلہ کن کلمہ حق بلند کیا ہے' بڑی صفائی اور بے باکی کے ساتھ' پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ ۔

گذشتہ اقتباسات و آیات میں اس کی مثالیں ناظرین نے اچھی طرح دیکھ لی ہیں ۔ تفصیلات تفسیر کے دوران آئیں گی ۔ اس میں شک نہیں کہ تمام رسولوں کا موقف جاہلیت کے مقابلے میں لیک رہا' ایک ہی حقیقت رہی جس کے وہ داعی تھے اور تقریباً ایک ہی انداز کلام میں وہ بات کرتے رہے اور اس سے ہر قاری کے دل میں وثوق و اطمینان پیدا ہوتا ہے اور وہ گہرے اثر قبول کرتا ہے' ان اشارات کے بعد اب تفصیلات !

---ooo---

درس نمبر ۹۹ ایک نظر میں

یہ پہلا سبق ایک مقدمے کی شکل میں ہے۔اس کے بعد قصص کا حصہ اور آخر میں نتائج اور تبصرے ہیں۔اس تمہیدی حصے میں وہ تمام اساسی باتیں کی گئی ہیں جو اسلامی نظریۂ حیات کی اساسی باتیں ہیں اور بنیادی حقائق ہیں۔یعنی اطاعت اور بندگی صرف اللہ وحدہ لاشریک کی ہوگی اور دین صرف اللہ کا ہوگا۔اور یہ اعتقاد رکھنا لازم ہوگا کہ ایک دن ہم نے جزاء وسزا اور حساب وکتاب کے لیے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔اور یہ حساب وکتاب دنیا میں اچھے اور برے اعمال کی اساس پر ہو گا۔کیونکہ دنیا دارالامتحان ہے۔اس ابتدائیہ میں اللہ کی معرفت اور اللہ کی صفات کو اس زاویہ سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی ذات وصفات اس کائنات میں کس قدر موثر ہیں۔نیز اس سبق میں ذات باری کی حقیقت اور اس کی حکمرانی' انسان کی جانب سے اس کی بندگی اور اطاعت اور اس کے تقاضوں سے مومنین کو آگاہ کیا گیا ہے۔اور انسان کی بندگی کے تقاضے یہ ہیں کہ جس طرح دنیا میں انسان اس کا بندہ ہوگا۔اسی طرح آخرت میں بھی انسان اس کا بندہ ہوگا۔

اس مقدمے میں قیام رسالت اور حقیقت رسول پر بھی بحث ہے۔اور رسول کو مخاطب کر کے انہیں تسلی دی گئی ہے کہ آپ کی دعوت کے مقابلے میں منکرین جس طرح اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' چیلنج دے رہے ہیں اور بلاوجہ عناد کر رہے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔اور جیسا کہ ہم نے کہا مکہ میں پوری دعوتی تاریخ میں نبی اکرم ؐ کے لیے یہ مشکل ترین دور تھا۔اور مشرکین قرآن کو کلام الہی تسلیم نہ کرتے تھے۔اس کے جواب میں مشرکین سے کہا گیا کہ اگر وہ اس قرآن کو کلام الہی تسلیم نہیں کرتے تو وہ اس جیسی دس سورتیں تو پیش کر دیں' جیسا کہ ان کا زعم تھا۔اس طرح حضور ؐ کو تسلی دی گئی کہ وہ ہرگز اس قرآن جیسا کلام نہیں پیش کر سکتے۔اس طرح ان لوگوں کے لیے یہ چیلنج باعث تسلی تھا' جو ایمان لا چکے تھے۔

اس تسلی کے ساتھ منکرین حق کو دوٹوک دھمکی بھی دی گئی ہے کہ وہ جس عذاب کے آجانے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں وہ بہت ہی دردناک ہے اور ان کا انتظار کر رہا ہے۔ان کی حالت یہ ہے کہ جب دنیا میں ان پر کوئی معمولی تکلیف آجاتی ہے تو وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے حالانکہ آخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کی ہر تکلیف معمولی ہے۔

اس دھمکی کو مناظر قیامت کے ایک منظر کی صورت میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔اس منظر میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ مشرکین اور مکذبین اور ان کے شرکاء اور سفارشی قیامت کے دن ان کو کسی طرح بھی عذاب سے نہ بچا سکیں گے۔جبکہ اہل ایمان جنتوں میں ہوں گے اور انعامات واکرامات ان کا حصہ ہوگا۔یہ منظر قرآن کے مخصوص انداز کے مطابق نہایت ہی مجسم اور مصور ہے اور چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور قرآن کہتا ہے۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۲٤) "اور ان دو فریقوں کی مثال اس طرح ہے کہ ایک آدمی اندھا اور بہرا ہو۔ دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو' کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم اس بات سے نصیحت نہیں پکڑتے؟"

---ooo---

درس نمبر ۹۹ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۴

سُوْرَةُ هُوْدٍ (۱۱) مَكِّيَّةٌ (۵۲)
آیاتها ۱۲۳ رکوعاتها ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا
اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ
فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾

"ال ر ۔ فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوتی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی ۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں' اور بشارت دینے والا بھی ۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا ۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے" ۔

ان آیات میں درج ذیل حقائق بیان ہوئے جو دین اسلام کے بنیادی حقائق ہیں :

- وحی اور رسالت کا ثبوت ۔
- صرف اللہ وحدہ کی بندگی کا اثبات ۔
- جو لوگ اس وحی اور ہدایت کی اتباع کریں گے دنیا اور آخرت میں ان کے لیے انعام ہو گا بشرطیکہ وہ اس

ہدایت کو بطور نظام زندگی اپنائیں۔

○ وہ لوگ جو اسے جھٹلائیں گے وہ مستوجب سزا ہوں گے چاہے کوئی مطیع فرمان ہو یا منکر ہو' اسے ایک دن اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہو گا۔

○ اللہ کی قدرت اور سلطنت غیر محدود ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ال ر' یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر آگے پورا جملہ کتاب اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (۱۱ : ۱) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب ایسے ہی حروف سے بنی ہے جو لوگوں کی دسترس میں ہیں اور یہ لوگ اس کی تکذیب کرتے ہیں' اگر ان سے کہا جائے کہ ان حروف سے تم ایسی ہی کتاب بناؤ تو یہ عاجز رہ جاتے ہیں۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱۱ : ۱) "فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوتی ہیں۔ ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے"۔

اس کی آیات محکم ہیں یعنی وہ مضبوط ترکیب رکھتی ہیں' گہرا مفہوم رکھتی ہیں' ان کا ہر حرف اور ہر حکم بامقصد ہے' ہر مفہوم اور ہر ہدایت مطلوب اور بامقصد ہے۔ اس کا ہر اشارہ ایک ٹارگٹ کی طرف ہے اور یہ نہایت ہی ہم آہنگ اور مربوط ہیں' تمام آیات کا نظم اور تصور ایک ہے۔ ان آیات کی پھر تفصیلات ہیں اور موضوع اور مطلب کے مطابق وہ منقسم ہیں اور ان کی تبویب کی گئی ہے اور ہر آیت کو اس کے لیے موزوں جگہ پر رکھا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان آیات کو اس طرح مستحکم ترکیب اور نہایت ہی بلیغ مفہوم میں کس نے مرتب فرمایا ہے۔ تو یاد رہے کہ اللہ جل شانہ' نے یہ کام خود کیا ہے' ان آیات کی تشکیل و تسوید میں رسول اللہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱۱ : ۱) ہیں یہ کتاب اللہ کے احکام بتاتی ہے اور ان کی ضروری تفصیلات بھی دیتی ہے۔ اور یہ اسی طرح اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور جس طرح ہمارے سامنے ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل کسی جگہ نہیں ہوا ہے۔

○ اور ان آیات میں کیا بنیادی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی تعلیمات کی اساس یہ کلمہ ہے۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۱۱ : ۲) "کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی"۔ یعنی نظام زندگی اللہ کا ہو' عبادت اللہ کی ہو اور اطاعت و حکمرانی اللہ کی ہو صرف اور صرف اللہ کی۔

اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (۱۱ : ۲) "میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی"۔ یہ تصور رسالت ہے اور رسالت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے انعام کی خوشخبری دے اور برے انجام سے ڈرائے۔

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ (۱۱ : ۳) "اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ"۔ یعنی شرک و کفر اور نافرمانی کو چھوڑ کر اللہ کی طرف پلٹ آؤ اور توحید اور اسلامی نظام زندگی کو قبول کر لو۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلَىٰٓ اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۱۱ :

۳) "تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا" - یہ توبہ و استغفار کرنے والوں کے لیے جزاء ہے -

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ (۱۱ : ۳) "لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں" - یہ ان لوگوں کے لیے ڈراوا ہے جو دعوت سے منہ موڑتے ہیں -

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ (۱۱ : ٤) "تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے" - اس میں اس عقیدے کا اظہار ہے کہ آخر کار سب کو اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے" -

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۱ : ٤) "اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے" - اور اس میں اللہ کی قدرت مطلقہ کا ذکر ہے - اور یہ کہ وہ ہر کام پر قادر ہے -

یہ ہیں کتاب اللہ کے مقاصد اور اس کی آیات انہی کی طرف اشارہ کرتی ہیں - یہ ہیں وہ بنیادی عقائد اور تصورات جن کے اوپر اسلامی نظام حیات کی عمارت کو اٹھایا گیا ہے -

یہ بات ہر شخص کو اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس کرۂ ارض پر کوئی دین اور کوئی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا اور کوئی تہذیب اور کلچر دنیا میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان اساسی سوالات کا جواب نہ دے - دنیا میں ہر فلسفے اور نظام فکر کو ان سوالات کا جواب دینا لازمی ہے -

یہ عقیدہ کہ دنیا میں ہر قسم کی بندگی صرف اللہ وحدہ کی ہو گی' ان تمام راستوں کو بند کر دیتا ہے جن پر انسان جا کر انتشار کا شکار ہوتا ہے اور وہ نظریاتی اور فکری بے راہ روی میں مبتلا ہوتا ہے - انسانیت کو خام خیالی' وہم پرستی اور کھوٹے نظریات اور جھوٹے خداؤں کی بندگی اور غلامی سے صرف اس صورت میں نجات دلائی جا سکتی ہے کہ اسے اللہ وحدہ کا غلام بنا دیا جائے - دنیا میں کچھ ایسے لوگ اور چیزیں ہم نے تجویز کر رکھی ہیں - جن کو ہم اللہ اور بندے کے درمیان رابطے کا مقام دیتے ہیں' اور یہ لوگ روحانی طور پر لوگوں کو بدراہ کرتے ہیں' کوئی لوگ اور ادارے ایسے ہیں جن کو ہم نے حاکم اور مقتدر اعلیٰ تصور کر لیا ہے اور یہ لوگ انسانوں کی دنیاوی زندگی کو اپنی منشاء کے مطابق چلاتے ہیں - اور اللہ کی مختص ترین خصوصیات یعنی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کے اختیارات وہ خود اپنے لیے حاصل کر لیتے ہیں - اس طرح وہ لوگوں کو ان کھوٹے اور جھوٹے خداؤں کا غلام بناتے ہیں جو شرک جلی ہے -

دنیا میں جب تک عقیدۂ توحید کو اس وسیع مفہوم میں نکھار کر قائم نہ کیا جائے گا اس وقت تک کوئی ایسا اجتماعی' سیاسی' اقتصادی' اخلاقی' قومی اور بین الاقوامی نظام قائم نہیں ہو سکتا جس میں انسان بعض دوسرے انسانوں کی خواہشات' ان کی تاویلات اور ذاتی مقاصد کا آلہ کار بننے سے نجات پا سکے -

ماسوائے قیام عقیدۂ توحید کے' انسان وہ آزادی اور شرف حاصل نہیں کر سکتا جو اللہ نے انسان کے لیے تجویز کیا ہے اور نہ انسان ذلت' خوف اور بے چینی سے نجات پا سکتا ہے جس سے وہ ہمیشہ دوچار رہتا ہے عقیدۂ توحید بھی صرف ان معنوں میں کہ اللہ کو رب' معبود' تکوینی حاکم و مدبر اور تشریعی حاکم و قانون ساز تسلیم کیا جائے اور اس دائرہ اختیار سے انسان کو بالکل بے دخل کر دیا جائے اور انسان کا کوئی عمل دخل ان امور میں نہ رہے' صرف اس صورت میں مکمل عقیدۂ توحید قائم ہو سکتا ہے۔

پوری انسانی تاریخ میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان جو کشمکش رہی ہے اور حق اور طاغوت کے درمیان تاریخی معرکہ آرائی اور مقابلہ اس موضوع پر نہیں رہا ہے کہ اللہ اس کائنات کا الٰہ اور رب ہے' اور اس کائنات کو وہی اپنی تدبیر اور اپنے تکوینی قوانین کے ساتھ چلا رہا ہے بلکہ یہ معرکہ اور یہ اختلاف اس بات پر تھا کہ رب الناس کون ہو؟ لوگوں پر نظام اور شریعت کس کی نافذ ہو؟ اور لوگ کس کی اطاعت کریں اور کس کے احکام خصوصاً سیاسی احکام قبول کریں؟

اس دنیا کی طاغوتی قوتیں اللہ کے اس حق کو غصب کر کے لوگوں کی زندگیوں میں اپنے قوانین و فرامین نافذ کرتی رہیں اور اس طرح لوگوں کو اللہ کی حاکیت سے نکال کر اپنی حاکیت کے دائرے میں داخل کرتی رہی ہیں۔ تمام انبیاء' تمام رسالتوں اور تمام اسلامی تحریکات کا ہدف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ لوگوں کو ان طاغوتی قوتوں کے غصب کردہ اختیارات کے دائرے سے نکال کر اللہ کی حکومت' اللہ کی بادشاہت اور اللہ کی حاکیت میں داخل کیا جائے۔

اللہ تو تمام جہانوں سے بے نیاز بادشاہ ہے۔ لوگوں کی نافرمانی اور سرکشی اس کی حکومت میں پرکاہ کی نہیں کر سکتی اور اگر تمام مخلوقات اس کی بندگی پر متفق ہو جائے اور اس کی حکومت کو تسلیم کر لے تب بھی اللہ کی مملکت میں پرکاہ کا اضافہ نہیں ہو سکتا لیکن جب لوگ اللہ کے سوا کسی اور ذات یا ادارے کی حاکیت کو قبول کر لیں تو خود وہ ذلیل و خوار اور غلام ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ اللہ وحدہ کی سیاسی اور نظریاتی حاکیت کو قبول کر لیں تو خود ان کے لیے یہ بات باعث عزو شرف ہے۔ وہ غلامی کی جگہ آزادی اور پستیوں کی جگہ سربلندی حاصل کر لیتے ہیں کوئی انسان کسی انسان یا غیر انسان کا غلام نہیں رہتا۔ اللہ چونکہ اپنے بندوں کو معزز شرف اور سربلند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے رسولوں کو بھیجا تاکہ وہ ان کو یہ عزت اور شرف عطا کریں۔ اور ان کو اپنے جیسے بندوں کی غلامی سے نجات دیں۔ غرض اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام میں اگر کوئی بھلائی ہے تو وہ خود انسانوں کے لیے ہے اللہ تو تمام جہانوں سے غنی اور مستغنی ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کو جس قدر معزز دیکھنا چاہتا ہے' اور اسے جس سطح تک بلند کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس وقت تک بلند نہیں ہو سکتی جب تک تمام انسان اس بات کا عزم نہ کر لیں کہ وہ اپنے گلوں سے غیر اللہ کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں گے کیونکہ غیر اللہ کی غلامی کا یہ پٹا انسان کے لیے باعث ذلت ہے' چاہے اس کی صورت جو بھی ہو۔

دین صرف اللہ کے لیے تب ہو گا جب لوگ صرف اللہ وحدہ کو رب تسلیم کر لیں اور اللہ کی ربوبیت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ اللہ کا نظام' اللہ کا دستور اور اللہ کے قوانین و فرامین کو اپنا لیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جو اس سورت کے آغاز ہی میں منضبط کی گئی ہے۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ

(۱۱ : ۱ - ۲)) "فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوتی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی"۔

یہ ہے عبادت کا مفہوم جس طرح اسے عرب اچھی طرح سمجھتے تھے جن کی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اب دوسرا اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ کی اس حاکمیت کو قائم کس طرح کیا جائے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ انسان رسالت کا اقرار کریں 'کیونکہ حاکمیت الہیہ کا یہ نظریہ اور نظام صرف اللہ نے پیش کیا ہے اور رسالت کو تسلیم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ رسول جو کچھ دیتا ہے وہ من عند اللہ دیتا ہے۔ اگر کسی رسول کی تعلیمات کو من عند اللہ تسلیم نہ کیا جائے تو انسانی ضمیر میں ان تعلیمات کا جو تقدس اور احترام ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اگر یہ تعلیمات کسی رسول اللہ کی جانب سے تصور ہوں تو رسول کا کوئی چاہے جس قدر بھی احترام کرے 'ان تعلیمات کی وہ قدر و قیمت انسان کے دل و دماغ میں جگہ نہیں پکڑتی اور نہ انسان چھوٹے بڑے معاملات میں ان تعلیمات کا احترام کرتا ہے۔ جب انسان کے قلب و نظر میں یہ شعور جاگزیں ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات اللہ کی طرف سے ہیں تو پھر یہ شعور ہروقت انسان کا پیچھا کرتا ہے۔ اور انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ شعور ہی ہے جو متقیوں اور اطاعت شعاروں کو صراط مستقیم سے ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتا۔

نیز اقرار بالرسالت کے ذریعے ہی وہ سرچشمہ اور ضابطہ متعین ہوتا ہے جس سے انسان وہ تمام ہدایات اخذ کر سکتا ہے جن کا تعلق اسلامی نظام اور دین سے ہے۔ صرف یہی ایک راستہ ہے جس کے ذریعے طاغوتی قوتوں کو ختم کیا جا سکتا ہے جن کا طریقہ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ ازخود کوئی قانون اور ضابطہ اور نظریہ و عقیدہ گھڑ لیتی ہیں اور پھر کہتی ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ یہ سب کچھ انہوں نے ازخود تصنیف کیا ہوتا ہے۔

ہر جاہلیت کی تاریخ یہ ہے کہ کچھ لوگ کھڑے ہوئے 'انہوں نے اپنی جانب سے کوئی قانون اور ضابطہ بنایا' لوگوں کے لیے اقدار اور رسم و رواج وضع کیے اور پھر کہا کہ یہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ اللہ کے نام پر یہ انتشار تب ہی ختم ہو سکتا ہے کہ ایک رسول پر ایمان لاکر اس کے اقوال کو من جانب اللہ تسلیم کر لیا جائے۔

یہاں شرک سے استغفار اور توبہ کو اس لیے لایا گیا ہے کہ استغفار اس بات کی دلیل ہے کہ دل کے اندر احساس موجود ہے۔ وہ برائی کے خلاف فعال ہے اور اسے گناہ کا شعور ہے اور رجوع اور لوٹنے کی طرف مائل ہے۔ لیکن احساس و شعور کے ساتھ ساتھ حقیقی توبہ یہ ہے کہ انسان عملاً اس گناہ کو ترک بھی کر دے اور برے اعمال کے مقابلے میں اچھے کاموں پر عمل پیرا بھی ہو جائے۔ ترک معاصی اور عمل صالح کے بغیر توبہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ توبہ کے لیے دو عملی علامات ہیں۔ یہ دونوں تہ میں توبہ کی ترجمان ہوتی ہیں اور توبہ کا عملی وجود صرف ان دو صورتوں میں متحقق ہوتا ہے اور صرف ایسی ہی توبہ کے بعد مغفرت کی امید کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی یہ گمان رکھے کہ وہ شرک سے تائب ہو گیا اور اسلام میں داخل ہو گیا ہے لیکن اس کے بعد وہ عملاً اللہ کی اطاعت نہیں کرتا' اسلامی نظام کو قبول نہیں کرتا اور زندگی کی اقدار اور ترجیحات اسلام سے اخذ نہیں کرتا تو اس قسم کے زعم اور گمان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس اقرار کی تکذیب اس کا عمل کر رہا ہے کہ عملاً وہ طاغوتی نظام کو قبول کرتا ہے۔

رسالت کا بنیادی ذریعہ دو چیزوں سے مرکب ہے۔ بشارت و نذارت' نیکوں کے لیے اچھا اجر اور بروں کے لیے برا انجام دکھانا' رسالت کا بنیادی کام ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسانی نفسیات سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے' اس

لیے برے انجام سے ڈرانا اور اچھے انجام کی خوشخبری دینا انسان پر گہرے اثرات چھوڑتا ہے اور اس کے اندر داعیہ عمل پیدا کرتا ہے۔

آخرت کی جواب دہی کا عقیدہ بھی ضروری اور حق ہے اور اس کے نتیجے میں اس زندگی کے بارے میں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک بامقصد اور حکیمانہ زندگی ہے اور وہ بھلائی جس کی طرف تمام رسول دعوت دیتے چلے آئے ہیں۔ وہ زندگی کا اصل مقصد اور مدعا ہے۔ لہٰذا انسان کو دعوت رسل کے قبول کرنے کا اجر ضرور ملے گا' اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اگر اس دنیا میں اسے کوئی صلہ نہ ملا تو آخرت میں ضرور ملے گا۔ جہاں اس زندگی کی تکمیل ہوگی۔ وہ لوگ جو اسلامی نظام سے کج روی اختیار کرتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں بے راہ روی اختیار کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو عذاب کا مستحق ٹھہراتے ہیں۔ اس تصور کے ساتھ فطرت سلیمہ سیدھی راہ پر چل نکلتی ہے اور وہ بے راہ روی اختیار نہیں کرتی۔ اور اگر وہ کبھی بے راہ روی پر چل نکلے تو توبہ کا دروازہ کھلا ہوتا ہے' اس لیے یہ نہیں ہوتا کہ وہ نافرمانی میں ڈوب ہی جائے۔ توجہ اور رجوع الی اللہ کے نتیجے ہی میں انسان کی زندگی کا سدھار ہے۔ اور زندگی کا رخ خیر اور بھلائی کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ عقیدۂ آخرت بذات خود آخرت کے اجر کا باعث نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے بلکہ یہ عقیدہ انسان کو اس دنیا میں عمل پر آمادہ کرتا ہے اور اسے صالح اور پاکبازی کی زندگی پر قائم کرتا ہے۔ اور اس طرح انسان وہ زندگی حاصل کر لیتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ یہ طرز زندگی انسان کے لائق ہے اور اسی کے ذریعے انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کو جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اسے بطور خاص بنایا ہے۔ پھر اس کے اندر اپنی خاص روح پھونکی ہے اور اسے اپنی تمام مخلوقات پر ترجیح دی ہے۔ اور اس طرح اسے حیوانیت کے مقام سے اوپر اٹھایا ہے تاکہ اس کی زندگی کے مقاصد حیوانوں سے بلند ہو سکیں اور اس کے میلانات اور مقاصد محض حیوانی میلانات اور مقاصد سے ذرا برتر ہو جائیں۔

یہ وہ غرض و غایت ہے جس کی وجہ سے اس کتاب محکم میں عقیدۂ توحید' اسلامی نظام کے قیام و اطاعت' عقیدۂ رسالت اور اتباع رسول کے بعد یہ دعوت دی گئی ہے کہ لوگو' شرک سے توبہ کرو اور اللہ کی طرف لوٹ آؤ یہی عمل صالح اور پاکیزہ زندگی کے قیام کی سبیل ہے۔ عمل صالح کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان کوئی اچھا عمل کرے اور بس بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اس کرۂ ارض پر اصلاح کے ہر مفہوم کے مطابق جدوجہد کی جائے' اس زمین کی آبادی اور تعمیر کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اس کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور جب کوئی قوم اصلاح کے اس مقام پر فائز ہو جائے تو پھر اسے یہ انعام دیا جاتا ہے۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۱۱ : ۳)

"تو ایک مدت خاص تک تم کو سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا"۔ اس دنیا میں متاع حسن کبھی تو نوعیت کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی کمیت کے اعتبار سے۔ اور آخرت میں تو نوعیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے ہو گا اور اس قدر ہو گا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ البتہ ہم چاہتے ہیں کہ اس دنیا کے متاع حسن پر کچھ بات کریں۔

اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے پاکباز اور نیکوکار اور توبہ و استغفار کرنے والے 'اس دنیاوی زندگی میں بڑی تنگی اور ترشی سے جسم اور روح کا رشتہ جوڑے ہوئے ہوتے ہیں ' حالانکہ ان آیات میں اللہ کی جانب سے متاع حسن کا صریح وعدہ ہے ۔یہ سوال ہم بے شمار لوگوں کی زبان سے سنتے ہیں ۔

اس آیت میں جو معنویت پائی جاتی ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زندگی کو اسکے وسیع تر مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کریں ۔ زندگی کے ظاہری حالات سے ہٹ کر اور وسیع اور گہرے مفہوم کے مطابق سمجھنے کی سعی کریں ۔

حقیقت یہ ہے کہ جس سوسائٹی میں بھی ایک صالح نظام رائج کیا جائے 'جو ایمان باللہ کی اساس پر تشکیل پایا ہو 'جس میں اطاعت و فرمانبرداری صرف اللہ کی ہو' صرف اللہ کو اس میں شارع اور قانون ساز تسلیم کیا گیا ہو' اور اس میں لوگ اچھے اعمال اور کردار کے مالک ہوں' تو لامحالہ وہ سوسائٹی ترقی یافتہ ہو جاتی ہے' اس میں زندگی کی سہولیات وافر ہو جاتی ہیں' اور وہ سوسائٹی عمومی طور پر پاک وصاف زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے ۔ایسی سوسائٹی میں ہر فرد کو اس کی جدوجہد کے مطابق اجرت ملتی ہے ۔ اس سوسائٹی کے افراد مطمئن ہوتے ہیں اور انہیں خوشحالی نصیب ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی سوسائٹی میں صالح اور پاک طینت لوگ بڑی مشکل سے وقت گزار رہے ہیں اور وہ سازوسامان اور وسائل رزق کے اعتبار سے محروم لوگوں میں شمار ہوتے ہیں تو لازماً صورت حال یہ ہوگی کہ اس سوسائٹی کی عمارت ایمان باللہ پر تعمیر نہ ہوگی اور اس کا نظام عادلانہ نہ ہو گا اور اس پوری سوسائٹی میں کسی بھی شخص کو اس کی جدوجہد کے مطابق معاوضہ نہ ملتا ہو گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صالح اور نیکوکار لوگ اگر مالی وسائل اور رزق کے اعتبار سے تنگ و ترش زندگی بسر کر رہے ہوں بھی 'اور ان پر موجود سوسائٹی کی طرف سے مظالم بھی ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کا ہر طرف سے پیچھا کیا جا رہا ہو' جیسا کہ مکہ کے مشرکین اس سورت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت پر مظالم ڈھا رہے تھے' اور جس طرح ہر جاہلیت اسلام کے علم بردار داعیوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی سلوک کرتی رہتی ہے' تب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔یہ بات محض خیال یا دعویٰ ہی نہیں ہے 'کیونکہ تعلق باللہ ' اطمینان قلب اور آخرت کی جانب سے اطمینان اور اللہ کے فضل و کرم کی امید بھی درحقیقت بہتر سازوسامان ہے ۔ اور جن لوگوں کی نظریں حسی اور مادی زندگی سے ذرا اونچی ہوتی ہیں ۔یہ روحانی دولت ان کے لیے زیادہ متاع حسن ہوتی ہے ۔

ہم یہ بات اس لیے نہیں کہتے کہ جن لوگوں کو ان کی محنت کے مطابق اجرت اور متاع حسن عادلانہ اور منصفانہ طور پر نہیں ملتا وہ متاع حسن کی جدوجہد ترک کر دیں ۔کیونکہ اسلام کبھی ظلم پر راضی نہیں ہوتا۔ اور اس قسم کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک مومن کبھی خاموش نہیں ہو سکتا' ایک مومن فرد اور ایک مومن جماعت سے اسلام تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات کو بدلنے کی سعی اور جدوجہد جاری رکھیں تاکہ نیکوکار اور صالح کارکن اپنی محنت کے مطابق متاع حسن حاصل کر سکیں ۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک صالح فرد کو اپنے حقوق کا احساس کرنا چاہئے اور یہ صورت قبول نہ کرنا چاہئے کہ وہ عمل تو کرتا رہے' محنت کرتا رہے لیکن اسے اس کا بدلہ اور مزدوری نہ ملے ۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں جن میں نیک اور خدا ترس لوگوں کو ان کے پورے پورے حقوق ملیں ۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ (۱۱ : ۳) "اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا ہو"۔ بعض مفسرین نے اسے آخرت کے فضل سے مختص کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق ہے۔ جس طرح ہم نے المتاع الحسن کی تفسیر کی ہے۔ ہر صاحب فضیلت اپنی فضیلت کا اظہار کرتے ہی جزا پا لیتا ہے۔ اسے نفسیاتی اور شعوری خوشی نصیب ہوتی ہے۔ یہ فضل عملی ہو یا مالی..... اگر فی سبیل اللہ ہو تو اس وقت جزا ملتی ہے۔ اس پر اللہ کی جانب سے جو جزاء ملے گی وہ فضل پر فضل ہو گا اور احسن الجزاء ہو گی۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ (۱۱ : ۳) "اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ یہ قیامت کے دن کا عذاب ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یوم بدر کا عذاب ہے۔ لیکن یہ رائے درست نہیں ہے کیونکہ یوم کبیر کا لفظ اگر مطلقاً بولا جائے تو اس سے مراد قیامت کا دن ہوتا ہے اور اس رائے کو تقویت اگلے فقرے سے ملتی ہے۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ (۱۱ : ٤) "تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے"۔ اگرچہ دنیا و آخرت دونوں میں مرجع اللہ ہے اور ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لیکن قرآنی تعبیرات کی رو سے مراد اس دنیا کی زندگی کے بعد کی حالت ہے"۔

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۱ : ٤) "اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔ اور یہ فقرہ بھی بتاتا ہے کہ اس یوم کبیر سے مراد یوم القیامت ہے کیونکہ اس میں لوگوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا جسے مشرکین عرب مستبعد سمجھتے تھے، اس لیے کہا گیا کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

---ooo---

اس اعلان کے بعد کہ یہ کتاب ایک فرمان الٰہی ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ہیں۔ اور ایک دانا اور باخبر خدا کی طرف سے ہیں۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود جب ڈرانے والے اور بشارت دینے والے نبی ان کو سناتے ہیں تو ان آیات کے حوالے سے بعض لوگوں کا ردعمل کس قدر غلط ہے۔ قرآن کریم ان کے ردعمل اور ان کی جسمانی حرکت کو یکجا کر کے پیش کرتا ہے کہ یہ لوگ سر جھکا لیتے ہیں اور اپنے سینوں کو ایک طرف موڑ لیتے ہیں تاکہ چھپ جائیں اور پہلوتہی کر جائیں۔ کیا خدا سے یہ چھپ سکتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش کس قدر عبث ہے۔ خدا تو اس وقت بھی سب کچھ جانتا ہے جب یہ بزعم خود کپڑے اوڑھ کر چھپے ہوتے ہیں بلکہ اللہ تو اس کرۂ ارض پر ہر چلنے اور رینگنے والی چیز کو بھی جانتا ہے۔ وہ تو لطیف و خبیر ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٥﴾

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ط كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦﴾

"دیکھو ' یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں - خبردار ' جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں ' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی ' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں - زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے ' اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے ' سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے"-

یہ دو آیتیں وہ منظر پیش کرتی ہیں کہ اگر اسے اچھی طرح ذہن میں لایا جائے اور اس پر غور کیا جائے تو انسان مارے خوف کے کانپ اٹھے - یہ منظر کس قدر خوفناک ہے اور لرزا دینے والا ہے ' ذرا سوچو تو سہی کہ بندۂ ضعیف اللہ سے چھپنا چاہتا ہے جبکہ اللہ کا علم اسے گھیرے ہوئے ہے - جب ان کو اللہ کی آیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ چھپتے ہیں لیکن کب چھپ سکتے ہیں؟

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۱ : ۵) "دیکھو ' یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں - خبردار ' جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں ' اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی ' وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں"-

شاید اس آیت میں بعض واقعات کی تصویرکشی کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو کلام الٰہی سنانا چاہ رہے ہیں اور یہ لوگ روگردانی کر کے اس سے چھپنا چاہتے ہیں اور اپنے سر لٹکائے گزرنا چاہتے ہیں اور اپنی طرف سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ گویا وہ چھپ گئے ہیں اور انہوں نے نظر بچا کر اپنے آپ کو گزار لیا - ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات انہوں نے ایسی حرکت کی ہو -

ایک مختصر فقرے میں بتا دیا جاتا ہے کہ ان کی یہ حرکت کس قدر بھونڈی ہے - اللہ جس نے یہ آیات نازل کی ہیں ' ہر حال میں ان کے ساتھ ہے ' یہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوں - قرآن کریم ایسے مخصوص انداز میں یہاں ان کی اس حرکت کو ان کی خفیہ ترین حسی صورت کو سامنے لا کر غلط بتاتا ہے کہ جب وہ رات کے وقت اپنے گھروں کے اندر ' رات کی تاریکی میں اپنے بستروں پر لیٹے ہوتے ہیں اس وقت بھی اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ نہیں چھپ سکتے - وہ تو حاضر و ناظر اور قاہر ہے - ہر ظاہر اور چھپی بات کو جانتا ہے -

اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۱۱ : ۵) "خبردار ' جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہیں اس وقت اللہ ان کی سری اور علانیہ باتوں سے واقف ہے"- بلکہ اللہ اس سے بھی زیادہ خفی باتوں سے واقف ہے - ان کے پردے علم الٰہی کے سامنے کیا رکاوٹ بنیں گے؟ البتہ ایسے حالات میں صرف انسان خود یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اکیلا ہے اور اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہوتا - یہ انداز تعبیر انسان کے وجدان کو چھوتا ہے '

اسے جگاتا ہے اور اسے جھنجوڑتا ہے کہ وہ ذات باری کے بارے میں ذرا غور کرے اور سمجھے کہ ایک آنکھ ہر وقت اسے دیکھتی رہتی ہے۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۱ : ۵) "وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں"۔ جو راز دلوں میں چھپے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے۔ حالانکہ یہ راز ابھی دل میں ہوتے ہیں اور دل کے ساتھ اس طرح جڑے ہوتے ہیں۔ جس طرح مالک اپنی ملک سے جڑا ہوتا ہے یا دوست 'دوست کے ساتھ۔ یعنی انتہائی رازداری کی وجہ سے ان کو ذات الصدور کہا گیا۔ جب اللہ ایسے دلی بھیدوں سے بھی واقف ہے 'تو پھر اور کیا ہے جو اس سے مخفی رہ سکتا ہے۔ غرض انسان کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی سکون اس سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۱۱ : ٦) "زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے 'اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے 'سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے"۔

اللہ کے علم محیط کی یہ ایک دوسری شکل ہے۔ نہایت ہولناک 'ذرا زمین پر چلنے والے حیوانات اور رینگنے والے کیڑے مکوڑوں پر غور کریں 'ہر وہ چیز جو زمین پر حرکت کرتی ہے وہ دابہ ہے۔

زمین پر حرکت کرنے والے لاتعداد اور بے شمار دواب (جانداروں) میں سے جو کچھ بھی ہے 'زمین کے اطراف و اکناف میں سے جہاں بھی ہے 'اوپر ہے یا اندر ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔ صرف علم بھی نہیں بلکہ اللہ ان کو رزق بھی فراہم کرتا ہے اور اللہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کہاں قرار و سکون حاصل کرتے ہیں اور کہاں سونپے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ سب دواب اللہ کے علم محیط کے ضبط اور کنٹرول میں ہیں۔

یہ اللہ کے علم الٰہی کی نہایت ہی واضح مثال ہے۔ یہ علم ہر وقت مخلوقات کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ جب انسان اس وسیع علم کے بارے مین سوچتا ہے اور اسے اپنے محدود تصور میں لانا چاہتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے اور اس کے تصور ہی سے عاجز آجاتا ہے۔

اب صرف علم کی بات نہیں ہے۔ دواب ارض کی اس ناقابل تصور تعداد کے ہر فرد کے لیے اللہ نے رزق کی کفالت بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اس زمین میں ہر مخلوق کے لیے وسائل رزق پیدا کیے ہیں اور ہر چیز کو یہ قوت دی کہ وہ بقدر ضرورت رزق حاصل کرے۔ بعض کا رزق بہت سادہ ہے۔ بعض اپنے لیے رزق پیدا کرتے ہیں' بعض مصنوعات اور مرکبات اپنے لیے تیار کرتے ہیں اور اب دور جدید میں تو ذرائع رزق بہت ہی پھیلے ہوئے اور متنوع ہیں۔ بعض مخلوق ایسی ہے کہ وہ زندہ مخلوق کے خون پر پلتی ہے مثلاً مچھر اور پسو وغیرہ۔

اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح پیدا کیا اور جس طرح اس کے اوپر ہیں نے متنوع مخلوقات کو وجود بخشا' اسی طرح ان کے وسائل رزق بھی مہیا کیے۔ اور ہر ایک مخلوق کو اس کی تکنیک تخلیق کے مطابق استعداد اور وسائل بھی فراہم کیے۔

خصوصاً دواب ارض میں سے انسان ہماری توجہ اور مطالعہ کا زیادہ مستحق ہے جو خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ ہے ۔ جسے تحلیل و تجزیہ اور ترکیب اور صنعت کی استعداد بھی دی گئی ہے ۔ وہ ترقی اور پیداوار میں بھی آگے جا سکتا ہے ۔ وہ اس کرۂ ارض کے چہرے کو بھی بدل سکتا ہے ۔ زندگی کے رنگ ڈھنگ بدلتا رہتا ہے ۔ وہ اپنے لیے متنوع وسائل رزق مہیا کرتا ہے لیکن وہ کسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتا ۔ اللہ نے اس زمین کے اندر جو وسائل ودیعت کر دیئے صرف انہی میں رد و بدل کرتا ہے اور یہ رد و بدل اور تحلیل و ترکیب بھی وہ ان قوانین فطرت کے مطابق کرتا ہے جو اللہ نے اس کائنات کے اندر وضع کیے ہیں ۔ اس طرح یہ زمین اپنے زندہ دواب کے لیے ہر قسم کی ضروریات فراہم کرتی ہے ۔

اللہ کے ذمے رزق ہے' اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سعی کے بغیر کسی کو کوئی رزق مل سکتا ہے یا اگر کوئی بیٹھ جائے تو بھی اسے ضرور ملے گا یا سستی اور منفی رویے سے وہ ضائع نہیں ہو سکتا ۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے غلط طور پر سمجھا ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اسباب اور وسائل اللہ نے کیوں مقرر فرمائے ۔ اور یہ کیوں لازم کیا کہ اسباب کو اختیار کیا جائے اور اسباب وسائل کو قوانین قدرت کا حصہ پھر کیوں بنایا اور پھر اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں کیوں دیں اور ان وسائل و اسباب کے کام میں لانے کے سوا دنیا کی تعمیر و ترقی کیسے ممکن ہو گی حالانکہ یہ سب کچھ اللہ کے علم میں تھا اور اللہ نے اس غرض کے لیے انسان کو اس کرۂ ارض پر خلیفہ بنایا تاکہ وہ اپنا کردار ادا کرے ۔

ہر مخلوق کے لیے رزق مقرر ہے' یہ حق ہے ۔ لیکن یہ رزق اس کائنات کے اندر ودیعت شدہ ہے اور اللہ کی سنت کے مطابق ہر مخلوق کے لیے مقدر اور متعین ہے ۔ اور سنت الٰہی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے مقدر کے لیے جدوجہد کرے گا ۔ لہٰذا سعی و جدوجہد کو کوئی شخص ترک نہ کرے جبکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ آسمانوں سے سونے اور چاندی کی بارش نہیں ہوا کرتی بلکہ پانی کی بارش ہوتی ہے اور ہر قسم کا رزق زمین کے اندر پوشیدہ ہے ۔ اور تمام مخلوقات کے لیے یہ کافی ہے ۔ بشرطیکہ یہ مخلوق خدا سنن الٰہیہ کے مطابق اس کی تلاش کرے اور سنن الٰہیہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتیں ۔

دنیا میں معاملہ کسب اور عمل پر ہے ۔ کسب و عمل یا طیب ہو گا یا خبیث اور گندہ ہو گا ۔ دونوں کے لیے جدوجہد ضروری ہے ۔ دونوں کی نوعیت میں فرق ہے اور نتائج جدا جدا ہیں ۔ حلال' حلال ہے اور حرام' حرام ہے ۔

یہاں دواب کے لیے لفظ رزق کا لفظ استعمال ہوا ہے جبکہ اس سے قبل مومنین کے لیے رزق حسن کہا گیا ہے ۔ انسانوں اور حیوانوں کے لیے سیاق میں بہترین الفاظ کا انتخاب کرنا قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے ۔ الفاظ کا انتخاب موقعہ و محل اور ماحول کے مطابق ہوتا ہے ۔

یہ دو آیات اس رب کی تعریف اور شان کے بیان کا آغاز ہیں جس کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ لوگ صرف اس کی بندگی اور غلامی کریں ۔ کیونکہ وہی عالم ہے' محیط ہے' رزاق ہے' کوئی شخص اس کی ریاست میں بھوکا نہیں رہتا اور یہ تعریف باری تعالیٰ اور یہ حمد ربی ضروری ہے تاکہ بندے اور مخلوق اور خالق کے درمیان حقیقی تعلق پیدا ہو اور لوگ صحیح طرح علی وجہ البصیرت رب اور خالق کی اطاعت اور بندگی کریں ۔

---ooo---

اب اس سے آگے رب کریم کی شان کا ایک دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے ۔ رب کریم کی قدرت کے بعض آثار اور مظاہر پیش کیے جاتے ہیں ۔ اس کی حکمت اور کارگریوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ دیکھو' اللہ نے زمین اور آسمانوں کو

کس قدر حکیمانہ انداز دیا ہے ۔ یہاں اس کائنات کے ان پہلوؤں کو سامنے لایا جاتا ہے جو عمل ' حساب و کتاب ' اور بعث بعد الموت کے عقائد کے ساتھ متناسب ہوں بلکہ یہ تصور دیتے ہوں :

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَّبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا --- جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا --- تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے ۔ اب اگر اے نبیؐ ' تم کہتے ہو کہ لوگو ' مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے ' تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے"۔

اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا ' اس موضوع پر ہم سورت یونس میں بات کر آئے ہیں ۔ وہاں یہ بات سیاق و سباق میں آئی تھی ۔ وہ یہ تھا کہ اس کائنات کے قوانین فطرت جن کے مطابق زمین و آسمان چلتے ہیں اور اس نظام کے درمیان جن کے مطابق لوگوں کی زندگی چلتی ہے ' ربط اور مطابقت ہے ۔

لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۱۱ : ۷) "تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ یہاں جو نئی بات ہے وہ یہ ہے ' خلق آسمان و زمین کے بیان کے بعد ایک جملہ معترضہ ہے

وَّكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (۱۱ : ۷) "جبکہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے عمل میں وہ جس طرح کہ موجودہ شکل میں ہیں اس تک پہنچنے سے پہلے یہاں پانی تھا اور اللہ کا عرش پانی پر تھا"۔

یہ پانی کیسے تھا ' یہ پانی کہاں تھا اور اس کی حالت کیا تھی ' اور اس کے بعد عرش الٰہی کس طرح تھا ' اس آیت میں ان امور کی کوئی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں ۔ جن مفسرین کو اپنے مبلغ علم کی حدود کا علم ہے ' وہ اس سے زیادہ بہرحال کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ یہ غیبی امور ہیں اور ان کے بارے میں اللہ نے ہمیں فقط یہی معلومات دی ہیں جو اس آیت میں ہیں اور محدود ہیں ۔

ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم قرآنی نصوص کی تائید میں سائنسی نظریات پیش کریں ۔ خواہ کوئی نص کسی سائنسی نظریے کے ساتھ منطبق کیوں نہ ہو اس لیے کہ سائنسی نظریات بار بار بدلتے ہیں بلکہ الٹتے رہتے ہیں ۔ علماء طبیعیات جب کوئی نظریہ پیش کرتے اور سائنسی تجربات کر کے اسے ثابت کرتے ہیں تو وہ اس جدید نظریے کو سابقہ نظریات کے مقابلے میں تکوینی مظاہر سے زیادہ قریب پاتے ہیں جبکہ نص قرآنی بذات خود صادق اور حق ہے ۔ چاہے سائنس اس حق اور حقیقت تک پہنچ سکی ہو یا نہیں ۔ پھر سائنسی حقیقت اور سائنسی نظریات کے درمیان فرق بھی ہے ۔ سائنسی حقیقت وہ ہوتی ہے جو تجربے میں آجائے ۔ اگرچہ تجربات بھی ہمیشہ احتمالی رہتے ہیں ' قطعی نہیں ہوتے ۔ رہے سائنسی نظریات تو وہ مفروضوں پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ

مفروضے بعض کائناتی مظاہر یا چند مظاہر کے مجموعے کی بنا پر قائم کیے جاتے ہیں اور ان میں ہر وقت تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس لیے نہ ہم ان نظریات سے قرآن کی تائید کر سکتے ہیں اور نہ ان نظریات پر قرآن سے استدلال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا طریقہ کار اور ہے اور سائنس کا اور۔ اس طرح قرآن اور سائنس کے موضوعات کار بھی مختلف ہیں۔

ہمارے دور میں قرآن کریم میں بعض سائنسی نظریات پیش کیے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ طرز فکر نصوص قرآن پر ہمارے ایمان کے منافی ہے۔ قرآن کریم حکیم اور خبیر کی طرف سے ہے' یہ غلطی اس لیے کی جاتی ہے کہ ہم سائنس کو اپنے دائرہ کار کے اندر محدود نہیں رکھتے۔ اور اسے اپنے دائرے سے وسعت دیتے ہیں۔ یہ دراصل ہماری اخلاقی اور ذہنی شکست خوردگی ہے' جبکہ ایسا کرنے والے لوگ اپنے اس فعل کو خدمت قرآن سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے ایمان کو ثابت کرتے ہیں۔ وہ ایمان جسے سائنس کے کسی اصول سے ثابت کیا جاتا ہے' میں یہ کہوں گا کہ ایسے ایمان پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ یہ محل نظر ہے۔ قرآن کریم اصل الاصول ہے اور سائنسی نظریات اس کے موافق ہوں یا مخالف' قرآن کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ رہے وہ سائنسی حقائق جو تجربات سے ثابت ہیں تو ان کے دائرہ کار اور قرآن کے دائرۂ کار میں فرق ہے۔ دونوں موضوعات ہی مختلف ہیں۔ قرآن کریم نے سائنسی حقائق کے دریافت کے کام کو عقل انسانی کے لیے چھوڑ دیا ہے اور اسے مکمل آزادی دی ہے کہ وہ اس میدان میں کام کرے اور تجربے کر کے جن نتائج تک پہنچ جا سکتا ہو' پہنچا جائے۔ قرآن کریم نے اپنے ذمے صرف یہ ڈیوٹی لی ہے کہ عقل انسانی کی تربیت صحیح سلامت اور مستقیم انداز میں کرے۔ اور اسے وہم و خرافات اور دیومالائی سوچ سے باہر نکالے۔ اس طرح قرآن نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے کہ انسانی زندگی کے درست چلن کے لیے ایک نظام تجویز کرے جس کے دائرے کے اندر عقل انسانی بھی درست راہ پر آگے بڑھے اور آزاد ہو کر امن و سلامتی کے ساتھ رہے اور اپنے محدود اور مخصوص دائرے میں کام کرے تاکہ اصول کی روشنی میں جزوی حقائق دریافت کرے۔ قرآن کریم نے سائنسی حقائق کا تذکرہ شاذ و نادر ہی کیا ہے مثلاً یہ کہ تمام جاندار پانی سے زندہ ہیں اور پانی ان کی زندگی کا اہم عنصر ہے۔ مثلاً تمام زندہ جانور اور نباتات جوڑے جوڑے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جوڑوں کے ملاپ سے زندگی انسانی' حیوانی اور نباتاتی اشکال میں نشوونما پاتی ہے۔ یہ وہ بعض حقائق ہیں جن کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے پارہ دوم اور پارۂ ہفتم)

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم دوبارہ قرآنی آیات کی طرف آتے ہیں :

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۱ : ۷) "اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا--- جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا--- تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔

آسمان اور زمین کو چھ دنوں کے اندر پیدا کیا۔ اس کے بعد کئی فقرے اور جملے محذوف ہیں۔ ان پر بعد کی عبارت دلالت کرتی ہے یعنی اس عرصے میں اسے پیدا کر کے انسان کی رہائش کے لیے اسے صالح اور کار آمد بنایا گیا۔ زمین میں سب چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کیا اور آسمانوں میں وہ انتظام کیا تاکہ تم یہاں زندہ رہ سکو اور اللہ کی ذات اس پوری کائنات پر حاوی ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۱ : ۷) "تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پوری کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں اس کی کنجیاں اور کنٹرول ہے اور یہ سب انتظام انسان کی آزمائش کے لیے ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ آزمائش ایک اہم معاملہ ہے' اور یہ محض کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد اور سنجیدہ اسکیم ہے ۔اور انسان کی تخلیق ایک بامقصد منصوبے کے تحت ہوئی ہے ۔

جس طرح اللہ نے زمین و آسمان کو اس طرح تیار کیا ہے کہ وہ جنس انسان کے لیے مد و معاون ہوں' اسی طرح جنس انسان کو بھی ایک مخصوص اور عجیب صلاحیت اور قوت دی ہے ۔انسان کی تخلیق بھی اسی قانون فطرت کے مطابق ہوئی ہے' جس کے مطابق اس کائنات کی تخلیق ہوئی ہے ۔لیکن انسان کے اس تکوینی پہلو کے علاوہ اسے ایک صلاحیت اختیار و ارادے کی بھی دی ہے ۔اس اختیاری صلاحیت کی وجہ سے وہ کبھی راہ ہدایت اختیار کرتا ہے اور اللہ اس کے ساتھ معاونت کرتا ہے اور اسے ہدایت مل جاتی ہے اور کبھی وہ راہ ضلالت اختیار کرتا ہے اور اللہ بھی اسے ڈھیل دیتا ہے ۔اور ایسے لوگوں کو چھوڑتا ہے تاکہ وہ عمل کریں اور یہ اس کی جانب سے ایک آزمائش ہے کہ کون اچھی راہ لیتا ہے اور کون بری ۔اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو آزماتا اور ڈھیل دیتا ہے ۔اس لیے نہیں کہ اللہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے ۔وہ تو پہلے سے جانتا ہے ۔آزمائش اور عمل کے ذریعے دراصل لوگوں کے خفیہ اعمال لوگوں پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ان اعمال پر جزا پاتے ہیں ۔اور اس طرح اللہ نے یہ اسکیم تیار فرمائی ۔

اس لیے بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کے عمل کا سرانجام پانے سے انکار اس فضا میں عجیب ہی لگتا ہے ۔کیونکہ قانون مکافات عمل ایک تکوینی قانون ہے ۔اور یہ اس کائنات کے اصول میں سے ایک مستقل اور بنیادی اصول ہے ۔اور جو لوگ اس اصول کی تکذیب کرتے ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رویہ معقول رویہ نہیں ہے ۔ اور ایسے لوگ اس کائنات کے عظیم اصولوں کے ادراک سے محروم ہیں ۔اپنی اس ناقص سوچ ہی کی وجہ سے وہ تعجب کرتے ہیں کہ انسان پھر اٹھے گا' یہ ایک عجیب بات ہوگی :

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۱ : ۷) "اب اگر اے نبی ' تم کہتے ہو کہ لوگو' مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے' تو منکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے"۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ بعث بعد الموت کو عجیب سمجھنے والوں کا یہ قول عجیب و غریب ہے اور مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں اس سے زیادہ جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

وہ جس طرح بعث بعد الموت کی تکذیب کرتے ہیں اور اس کائنات کے اٹل اصولوں کی روشنی میں نہیں سمجھتے' اسی طرح دنیاوی عذاب الٰہی اور تکوینی بابرکت آفرینیوں کو بھی سمجھ نہیں پا رہے وہ یہ پوچھتے ہیں کہ ان پر پھر عذاب الٰہی نازل کیوں نہیں ہوتا؟ حالانکہ اس میں تاخیر بھی بوجہ حکمت ہے ۔اللہ ہر کسی کو مہلت دیتا ہے ۔

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا
يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ ۱
يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٨﴾ ۸ع
۱

''اور اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو! جس روز اس سزا کا وقت آ گیا تو وہ کسی کے پھیرے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آ گھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں''۔

قرون اولیٰ کی اقوام پر ایسے ایسے عذاب نازل ہوئے' جن کی وجہ سے ان اقوام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا لیکن تباہ اور فنا کر دینے والے یہ عذاب اس وقت آئے جب رسول اپنی قوم کے سامنے معجزات پیش کر چکے اور انہوں نے معجزات کے باوجود تکذیب جاری رکھی۔ یہ ہمہ گیر تباہی اس لیے آتی رہی کہ اس وقت کی رسالتیں وقتی رسالتیں تھیں' ایک محدود پیریڈ کے لیے تھیں اور بسا اوقات وہ ایک نسل کے لیے تھیں اور ان معجزات کا مشاہدہ بھی وہی لوگ کر سکتے تھے جو موجود تھے۔ یہ معجزات مسلسل اور جاری اور باقی نہ ہوتے تھے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی انہیں دیکھ سکیں جیسا کہ پہلی نسل نے دیکھا تھا۔

رسالت محمدیؐ کی نوعیت سابقہ رسالتوں سے ذرا مختلف ہے۔ آپ خاتم الرسل ہیں۔ تمام نسلوں کے لیے رسول ہیں اور آپؐ کو جو معجزہ دیا گیا وہ مادی معجزہ نہیں ہے۔ یہ ایسا معجزہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ آنے والی نسلیں بھی اسے دیکھ سکتی ہیں اور اس پر تدبر کر سکتی ہیں اور نسلاً بعد نسل اس پر ایمان لا سکتی ہیں۔ اس لیے اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ آپ کی امت پر ایسا عذاب نازل نہ ہو جس کے ذریعے اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے بلکہ یہ عذاب افراد پر نازل ہو اور یہی صورت اللہ نے ان اقوام کے لیے اختیار کی جن کو کتاب دی گئی تھی۔ کسی کتابی قوم کو جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکا گیا۔

لیکن مشرکین مکہ کی حالت یہ تھی کہ وہ نہ تو اس کائنات کے نظام تخلیق اور اس کے لیے اللہ کے تجویز کردہ قانون قدرت کو سمجھتے تھے اور یہ بات سمجھتے تھے کہ اس کائنات کے اندر اللہ نے انسان کو آزادی اور اختیار کے ساتھ کام کرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں اور اسے نیک و بد اختیار کرنے کی آزادی ہے اور زمین کی تخلیق اس طرح ہے کہ وہ انسان کی آزادی و ارادہ کے لیے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اپنے اس جہل کی وجہ سے وہ بعث بعد الموت کا انکار کرتے تھے اور اپنی اس جہالت ہی کی وجہ سے وہ پوچھتے تھے کہ اللہ نے ان کی تکذیب اور انکار کے باوجود ابھی تک انہیں ہلاک کیوں نہیں کیا۔ وہ نہ جانتے تھے کہ موجودہ رسالت اور سابقہ رسالتوں کے لیے اللہ نے کیا اصول طے کر رکھے ہیں۔ چنانچہ وہ پوچھتے تھے کہ کئی سال گزر گئے اور عذاب نہیں آ رہا ہے۔ یہ لوگ نہ تو اللہ کی حکمت سے واقف تھے اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ جب یہ عذاب آئے گا تو اسے پھر کوئی بھی پھیر نہ سکے گا بلکہ وہ پوری طرح انہیں گھیر لے گا اور یہ ان کے استہزاء اور بدعملی کی سزا ہو گی' اور وہ نہایت ہی خود سری کی صورت میں سوالات کر رہے تھے۔

اَلَا یَوْمَ یَاْتِیْهِمْ لَیْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ

(۱۱ : ۸) "سنو جس روز اس سزا کا وقت آ گیا تو وہ کسی کے پھیرے سے نہ پھر سکے گا اور وہی چیز ان کو آ گھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی سنجیدہ فرد اور صاحب ایمان شخص عذاب الہی کے نزول کے مطالبے میں جلدی نہیں کرتا۔ اگر عذاب الہی نہیں آتا تو اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی اور اللہ کی رحمت اس میں مانع ہوگی تاکہ جو لوگ ایمان کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ ایمان لے آئیں۔

مثلاً قریش پر اللہ نے عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کی۔ ان کو مہلت دی جاتی رہی۔ اس عرصے میں بے شمار لوگ ایمان لائے۔ ایمان لا کر پھر انہوں نے اسلام کے لئے کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اور کفار کے ہاں بھی کئی ایسے بچے پیدا ہوئے جنہوں نے بعد کے ادوار میں اسلام کی خدمات سرانجام دیں۔ یہ اور ایسی ہی دیگر معلوم اور نامعلوم حکمتیں ہو سکتی ہیں، جو جلد باز لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔

---ooo---

یہ لوگ مطالبہ نزول عذاب میں بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں، انسانی مزاج کے اس پہلو پر یہاں مزید روشنی ڈالی جا رہی ہے کہ انسان کسی حالت پر بھی ثابت قدم اور صحیح رائے قائم کرنے میں صحیح الفکر نہیں ہوتا۔ اس کی نفسیات یہ ہیں :

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَیَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾

"اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی، ہم اسے نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو کہتا ہے میرے تو سارے دلدر پار ہو گئے، پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی"۔

انسان فطرتاً جلد باز اور پر تقصیرات ہے اور ان آیات میں اس کی کیا ہی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ اس قدر کوتاہ نظر ہے کہ صرف حاضر حالات ہی کو دیکھ سکتا ہے اور اپنے اوپر وہی حالات طاری کر دیتا ہے جو اس کے ماحول پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ نہ ماضی پر غور کرنے کی تکلیف کرتا ہے اور نہ مستقبل کی فکر کرتا ہے۔ کبھی وہ اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ اسے کسی بھلائی کی اور اچھے حالات کی امید نہیں رہتی۔ اور اگر اچھے دن گزرتے ہیں تو وہ تمام گزشتہ نعمتوں کا انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ تو اللہ کی جانب سے ایک انعام و اکرام تھا۔ اس کا کوئی استحقاق نہ تھا اور مشکلات کے بعد اگر اس کے اچھے دن آ جائیں تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے، غرور کرتا ہے۔ نہ وہ مشکلات برداشت کر کے اللہ کے رحم و کرم کا امیدوار ہوتا ہے اور

نہ اپنی خوشی میں اعتدال اختیار کرتا ہے اور خوشیوں اور نعمتوں کے زوال کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ

(۱۱:۱۱) "اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی"۔ یعنی انہوں نے انعامات و اکرامات پر بھی صبر کیا اور مشکلات پر بھی صبر کیا۔ مشکلات میں تو بیشتر لوگ صبر کرتے ہیں اپنی خودداری اور سفید پوشی کی وجہ سے اور اس لیے کہ ان کی کمزوری اور مشکلات کا لوگوں کو پتہ نہ لگ جائے۔ لیکن کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خوشحالی اور مالداری میں اپنے آپ کو سنبھال سکتے ہیں اور غرور اور سرکشی سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ تاہم جو لوگ اچھی روش بحال رکھتے ہیں' مشکلات میں بھی اور خوشحالی میں بھی اچھے کام کرتے ہیں اور نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں یعنی وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے پیکر ہوتے ہیں ان کے متعلق ارشاد ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (۱۱:۱۱) "وہی لوگ ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی"۔ اس لیے کہ انہوں نے مشکلات میں صبر کیا اور خوشحالی میں انہوں نے سنجیدگی اور اعتدال سے کام لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک سنجیدہ اور مخلص اور سچا ایمان ہی انسان کو نہایت ہی مشکل حالات میں کافرانہ مایوسی سے بچاتا ہے۔ اسی طرح سچا ایمان باللہ ہی انسان کو اس کی خوشحالی اور فراوانی میں کبر و غرور سے بچاتا ہے۔ غرض قلب انسانی کو یہ سچا ایمان ہی اچھے اور برے دونوں حالات میں متوازن اور مستقیم رکھتا ہے۔ اور قلب مومن اچھی طرح بندھا ہوا ہوتا ہے۔ مشکلات و مصائب میں ڈانواں ڈول نہیں ہوتا اور خوشحالی اور مالداری میں پھولتا نہیں اور یوں اہل ایمان کی دونوں حالات اچھے رہتے ہیں اور اہم مقام صرف مومنین کو ملتا ہے جس طرح حضورؐ نے فرمایا۔

اللہ کی مخلوقات میں سے جو لوگ سنن الہیہ سے واقف نہیں ہوتے' اللہ کی حکمت تخلیق سے وہ بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ کم فہم' غافل' مایوس' متکبر اور جھوٹی باتوں پر فخر کرنے والے ہوتے ہیں جن کو معلوم نہیں ہے کہ رسولوں کے بھیجنے کی حکمت کیا ہوتی ہے اور پھر یہ کہ رسول انسانوں میں سے کیوں بھیجے گئے ہیں اس قسم کے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ خود رسول فرشتہ کیوں نہیں ہے یا اس کے ساتھ فرشتہ مامور کیوں نہیں ہے؟ یہ لوگ رسول اور رسالت کے مقام سے اس قدر بے خبر ہوتے ہیں کہ رسول کے لیے مالدار ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ لوگ جھوٹے عقائد میں گم رہتے ہیں اور یہ لوگ تکذیب کے لیے اس قسم کے بھونڈے جواز تلاش کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ متاثر نہ ہوں۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ
يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ

عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ ﴿۱۲﴾

”تو اے پیغمبرؐ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو (بیان کرنے سے) چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کر وہ کہیں گے ”اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتار اگیا؟“ یا یہ کہ ”اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا؟“ تم تو محض خبردار کرنے والے ہو' آگے ہر چیز کا حوالہ دار للہ ہے“۔

لعل کا مفہوم یہاں استفہامی ہے۔ اگرچہ خالص استفہامی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفس انسانی سے شاید متوقع یہی ہے کہ ایسے حالات مین وہ تنگ دل ہو جائے اور اس کام ہی کو چھوڑ دے۔ کیونکہ لوگ جہالت اور عناد اور ہٹ دھری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور اس قسم کی بوگس اور لایعنی تجاویز پیش کر رہے ہیں' جن کا رسالت کے مزاج اور اس کی نوعیت اور منصب کے ساتھ کوئی ہم آہنگی نہیں ہے اللہ تعالیٰ اس صورت حالات کے بارے میں ایک متبادل اور ناقابل عمل صورت پیش کر کے سوال کرتا ہے کہ حالات گو برے ہیں لیکن آپ ان میں کیا اپنی دعوت اور ما انزل اللہ کا کچھ حصہ چھوڑ سکتے ہیں' شاید کہ وہ اس جاہلیت اور بغض و عناد کا مظاہرہ نہ کریں؟ ..... ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ ان باتوں کو تو چھوڑ نہیں سکتے۔

اِنَّمَآ اَنۡتَ نَذِیۡرٌ (۱۱ : ۱۲) ”آپ تو خبردار کرنے والے ہیں“۔ آپ کے فرائض تو یہی ہیں کہ آپ پورا پورا پیغام پہنچا کر لوگوں کو ڈرائیں۔ اور ڈرانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ لوگ ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہ انہیں ڈرانا ضروری ہے۔ لہٰذا آپ اپنے فرائض سرانجام دیتے چلے جائیں۔

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ (۱۱ : ۱۲) ”آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے“۔ اللہ ہی ان سب کا ذمہ دار ہے اور وہ اپنی سنت کے مطابق جس طرح چاہے گا' انہیں پھیر دے گا۔ اور اس کے بعد جو کچھ وہ کمائیں گے اس کی جزاء و سزا دے گا۔ آپ ان کے ذمہ دار یا حوالہ دار نہیں ہیں۔ نہ آپ ان کے کفر کے ذمہ دار ہیں اور نہ ایمان کے۔ آپ تو فقط نذیر ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی تحریک کس قدر مشکل حالات سے گزر رہی تھی اور اس دور میں آپ کے دل پر کس قدر بوجھ تھا۔ خصوصاً جبکہ تحریک کے حامی اور مددگار اور خاندانی معاون فوت ہوگئے تھے۔ حضورؐ کے دل پر پریشانی کا غلبہ تھا۔ اور مسلمانوں کی قلیل تعداد مشکلات میں گھری ہوئی تھی اور ہر طرف مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ کس قدر مشکل حالات تھے اور ان حالات میں حضور اکرمؐ کو اللہ کی جانب سے کس قدر تسلی اور اطمینان دلایا جا رہا تھا اور آپ کے اعصاب کو کس قدر سکون اور تازگی عطا ہو رہی تھی۔

ایک دوسری بات جسے وہ بار بار دہراتے چلے جاتے تھے' یہ کہ حضور نبی کریمؐ اس کتاب کو اپنی جانب سے پیش کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تم اس جیسی دس سورتیں تو بنا لاؤ اور اس مہم میں پورے جہاں سے مدد بھی لے لو۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَیٰتٍ

وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

"کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو "اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو"۔

اس سے قبل سورت یونس میں ان کو چیلنج دیا گیا تھا کہ وہ لوگ اس قسم کی ایک سورت ہی لے آئیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اس کے بعد دس سورتوں کا چیلنج کیوں دیا گیا؟

قدماء مفسرین نے کہا ہے یہ چیلنج علی الترتیب تھا۔ پہلے یہ تھا کہ اس قرآن جیسا قرآن لاؤ' پھر دس سورتوں کا چیلنج تھا' آخر میں ایک سورت کا چیلنج دیا گیا۔ لیکن چیلنج کی اس مخصوص ترتیب پر کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ بظاہر دلیل اس کے خلاف ہے کیونکہ سورہ یونس اس سورت سے پہلے نازل شدہ ہے اور اس میں ایک سورت کا چیلنج دیا گیا ہے اور زیر نظر سورت اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں دس سورتوں کا چیلنج ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آیات کا نزول سورتوں کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی آیت نازل ہوتی تھی لیکن اسے بعض اوقات تو سابقہ سورتوں میں رکھ دیا جاتا تھا اور بعض اوقات ایسی سورت میں جو اس آیت کے بعد نازل ہوئی تھی۔ وقت نزول کی مکمل طور پر نقلی دلیل پر موقوف ہے۔ اسباب نزول میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو یہ ثابت کرے کہ سورہ یونس سورہ ہود کے بعد نازل ہوئی ہے اور اپنی جانب سے قیاسی حکم اس موضوع پر مقبول نہیں ہے۔

علامہ رشید رضا مرحوم نے دس سورتوں کے چیلنج کی ایک خاص وجہ بیان کرنے کی سعی ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں طویل کوشش کی ہے (دیکھئے تفسیر منار' ص ۳۲ تا ۴۱' ج ۱۲) فرماتے ہیں کہ یہاں تحدی سے مراد قصص القرآن کا چیلنج ہے۔ تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوتا ہے کہ جن سورتوں میں طویل قصص نازل ہوئے ہیں' سورت ہود کے نزول تک ان کی تعداد دس تھی' چنانچہ یہاں دس سورتوں کے لیے چیلنج دیا گیا' کیونکہ ایک سورت کا چیلنج ان کے لیے دس سورتوں کے چیلنج سے زیادہ مشکل تھا۔ اس لئے کہ دس سورتوں میں بہرحال زیادہ قصے اور زیادہ اسالیب کلام تھے اور جن لوگوں کو یہ چیلنج دیا گیا تھا' ان کو دس سورتوں جیسی نقل کی ضرورت تھی اگر وہ نقل کرتے ....."

لیکن' حقیقت تو خدا جانتا ہے' یہ بات اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر انہوں نے مشکل بنا دی ہے کیونکہ چیلنج کے معاملے میں اعتراض کرنے والوں کے اعتراض اور حالات نزول دونوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اس لئے کہ قرآن کریم عملی حالات کے پیش نظر نازل ہوتا رہا ہے اور ہر سورت اور آیت کے نزول کے وقت متعین صورت حالات ہوا کرتی تھی۔ اس لیے بعض حالات میں کہا گیا کہ قرآن جیسی کتاب لاؤ' بعض میں کہا گیا' ایک سورت لاؤ اور بعض میں دس سورتوں کا مطالبہ ہوا۔ ان مطالبات میں ترتیب زمانی کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ اصل مقصد چیلنج تھا کہ نفس قرآن جیسا کلام لاؤ۔ کل قرآن یا جزء یا ایک سورت وغیرہ۔ لہذا چیلنج قرآن جیسے کلام کے بارے میں تھا' کسی خاص مقدار کی بات نہ تھی۔ اور مخالفین جو عاجز آئے تو وہ قرآن جیسے کلام سے عاجز آئے۔ یہ نہ تھا کہ وہ کوئی سورت نہ لا سکے' لہذا اس موضوع پر کل اور جزء کا ذکر برابر ہے اور اس سلسلے میں ترتیب لازم نہیں ہے بلکہ بعض مخصوص حالات کی وجہ سے مقدار کا ذکر ہوا۔ یعنی اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کی نوعیت کے اعتبار سے یہ کہا گیا کہ ایک سورت' دس

سورتیں یا پورا قرآن لاؤ ۔ یہ مخصوص حالات کیا تھے؟ آج ہم ان کا تعین بہرحال نہیں کر سکتے ۔

وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۱ : ۱۳) "اور اللہ کے سوا جو جو (تمہارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو"۔ اپنے شرکاء و خصماء کو بلاؤ، شعراء اور بلغاء کو بلاؤ، جنوں اور انسانوں سب کو بلاؤ اور اس چیلنج کو قبول کرو، اور اپنی طرف سے بناوٹی دس سورتیں لاؤ ۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے کہ قرآن حضرت نبی کریم کی طرف سے بنایا گیا ہے اور اللہ کی طرف سے نہیں ہے ۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ

"اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے"۔ اور تم دس سورتیں گھڑ کر نہیں لاتے کیونکہ تمہارے معبود اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور یہ تو کام بھی ایسا ہے جس کا ہونا ناممکن ہے، اور تم خود بھی یہ کام بہرحال نہیں کر سکتے کیونکہ تم اپنے معبودوں کو تب ہی بلاتے ہو جب تم خود عاجز آ جاؤ ۔

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ

"تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے"۔ صرف اللہ ہی اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اسے نازل کرے ۔ اور صرف اللہ کا علم ہی اس انداز میں اس کتاب کو نازل کر سکتا ہے اور اس قسم کے علوم اور دلائل دے سکتا ہے ۔ اور کائنات کے احوال اور سنن بیان کر سکتا ہے اور انسانوں کے ماضی اور حال اور مستقبل کے لیے وہی یہ سب کچھ وضع کر سکتا ہے جو ان کی زلت و معاش کے لیے مفید ہے ۔

وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

"اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے"۔ اگر ان کے الہٰ دس سورتیں نہیں لا سکتے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ یہ کتاب منجانب اللہ ہے اور وہ جو دعوت دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں وہ برحق ہے اور یہ کتاب اسی نے نازل کی ہے ۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

"تو کیا تم سر تسلیم خم کرتے ہو؟" اس چیلنج اور پوری دنیا کی ناکامی کے بعد آخر کوئی معقول آدمی دعوت اسلامی کو تسلیم کرنے کے سوا اور کر کیا سکتا ہے؟ لیکن یہ لوگ اس قدر ظالم ہیں کہ یہ اس عاجزی کے بعد بھی حق کا انکار کرتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں پر سچائی تو بالکل واضح ہو گئی تھی لیکن اسلامی نظام کی وجہ سے ان کے مفادات ختم ہو رہے تھے ۔ موجودہ جاہلی نظام ان کے لیے مفید تھا، پھر اس نظام میں ان کو اقتدار اور سلطنت حاصل تھی ۔ دعوت اسلامی تو

آزادی ' انصاف اور ہر انسان کو عزت اور شرف عطا کرنے کی تحریک تھی ۔ اور ان لوگوں نے دوسرے لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا ۔ لہٰذا الا الہ الا اللہ کی دعوت ان کے مفادات کے خلاف تھی ۔ چنانچہ اب ان کے حسب حال یہ تبصرہ کیا جاتا ہے جو ان کے حالات کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے ۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی ۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے"۔

اس دنیا میں جو لوگ بھی جدوجہد کرتا ہے وہ اس کا ثمرہ پاتا ہے ۔ اب بات اس کے نصب العین پر موقوف ہے ۔ بعض لوگوں کی نظر اعلیٰ مقاصد اور بلند افق پر ہوتی ہے ۔ اور بعض لوگ صرف اپنے قدموں پر نظر رکھتے ہیں اور دنیا کے قریب اور محدود مقاصد ان کے پیش نظر ہوتے ہیں ۔ جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کے کروفر کے متلاشی ہوتے ہیں تو وہ صرف اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں ۔ ان کو ان کے عمل کا نتیجہ اس دنیا ہی میں ملتا ہے ۔ اور پھر وہ اس سے نفع اٹھاتے ہیں جس طرح ان کی مرضی ہوتی ہے ۔ لیکن آخرت میں ان کا حصہ صرف آگ ہوتی ہے کیونکہ ایسے شخص نے آخرت کے لیے کچھ کمائی نہیں کی اور نہ آخرت کو اس نے اہمیت دی ۔ اس لیے وہ دنیا میں جو بھی اچھا عمل کرے گا' اس کی جزاء اسے یہاں ہی مل جائے گی اور آخرت میں وہ عمل باطل ہو گا ۔ وہاں اس کے اعمال کا کوئی وزن نہ ہو گا ۔ آخرت میں ایسے لوگوں کے اعمال حبط ہوں گے ۔ یعنی اس طرح جس طرح کسی مویشی کو زہر آلود گھاس پھلا دیتی ہے جبکہ در حقیقت وہ بیمار ہوتا ہے ' موٹا نہیں ہوتا اور اس کا یہ موٹاپا موجب ہلاکت ہوتا ہے ۔

اس دنیا میں ہمیں بہت سے افراد اور اقوام نظر آتے ہیں جو رات دن اس دنیا کے لیے کام کرتے ہیں اور ان کو ان کی جدوجہد کے ثمرات بھی ملتے ہیں ۔ ان کی دنیا نہایت ہی ترقی یافتہ اور فلاح یافتہ ہوتی ہے ' اور اس طرح پھولی ہوتی ہے جس طرح بیمار جانور ۔ لہٰذا ہمیں ایسے لوگوں سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی پوچھنا چاہئے کہ کیوں؟ کیونکہ زمین میں یہی سنت الٰہی ہے ۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا

يُبْخَسُوْنَ (۱۱ : ۱۵) "جو شخص حیات دنیا اور اس کی زینت کا طلبگار ہے اس دنیا میں ہم اس کے اعمال کا ثمر پورا پورا دیں گے اور ان کا کچھ نقصان نہ کیا جائے گا" ۔ لیکن اللہ کی اس سنت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس کے نتائج کو یقینی مانتے ہوئے ہمیں یہ حقیقت بھولنا نہ چاہیے کہ ایک شخص دنیا کے لیے کام کرتے ہوئے بھی آخرت پر نظر رکھ سکتا ہے اور دنیا کی جدوجہد کے دوران بھی آخرت کے لیے کام کر سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس کی دنیا بھی اچھی اور مزین ہو اور دنیا میں بھی کوئی کمی نہ ہو اور آخرت میں بھی کوئی کمی نہ ہو اور آخرت بھی کامیاب ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے لیے کام کرنا' دنیا کے لیے کام کرنے کے ساتھ تضاد نہیں رکھتا بلکہ دنیا کا کام بھی آخرت کے لیے کام ہے بشرطیکہ توجہ الی اللہ قائم ہو اور اگر ایک انسان دنیا کی جدوجہد میں اللہ کو یاد رکھے تو اس کی جدوجہد میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید برکت ہوتی ہے ۔اس کی کمائی پاکیزہ اور ستھری ہوتی ہے اور دنیا کے ساتھ آخرت بھی اسے ملتی ہے ۔الا یہ کہ جو شخص دنیا میں حرام خواہشات کی پیروی کرے ناجائز شہوات نہ صرف یہ کہ آخرت میں مردود ہیں بلکہ دنیا میں بھی وہ پسندیدہ نہیں ہیں ۔اس کا تجربہ مغربی اقوام کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہو چکا ہے اور انسانی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ بھی اچھی طرح ان نتائج تک پہنچ چکے ہیں ۔

اب سیاق کلام اس رویے کی طرف مڑ جاتا ہے' جو مشرکین نے رسول اللہ کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ کی سچائی منجانب اللہ ہے اور پھر یہ قرآن بھی حضورؐ کی رسالت اور حقانیت پر گواہ ہے ۔ اور یہ کہ حضور مرسل من جانب اللہ ہیں اور اس پر حضرت موسیٰ کی کتاب بھی گواہ ہے ۔چنانچہ رسول اللہؐ اور آپ کی دعوت کے بارے میں تمام براہین اور دلائل بیان کئے جاتے ہیں ۔اس طرح حضورؐ کی تالیف قلب مقصود ہے ۔نیز آپ کے ساتھ جو مختصر جماعت اس عظیم مقصد کے لیے کام کر رہی ہے ۔اس کی ڈھارس بندھانا بھی پیش نظر ہے ۔اور مخالفین اور کفار کو ان کے انجام بد سے ڈرانا بھی مطلوب ہے کہ اگر انہوں نے روش نہ بدلی تو انجام آگ ہے ۔ان کو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس میں وہ شرمندگی' بے عزتی اور ذلت کا شکار ہیں' محض اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں کبر اور غرور کا رویہ اختیار کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو اب ڈینگیں مار رہے ہیں ۔قیامت میں کس قدر ذلیل و خوار اور عاجز ہوں گے اور اللہ کے عذاب سے بچ نکلنے کا کوئی موقعہ نہ ہو گا اور نہ ان کا کوئی ولی اور مددگار ہو گا۔

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ (۱۱ : ۲۲) "یہ لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہی لوگ سخت خسارے میں ہوں گے" ۔ چنانچہ کفار اور مومنین کے درمیان ایک مشاہداتی موازنہ کیا جاتا ہے اور دونوں کے درمیان فرق کو نمایاں کیا جاتا ہے کہ دونوں کا حال اور مآل کس قدر مختلف ہے ۔ ذرا غور سے پڑھئے :

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَ

لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ
يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ
اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٨﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٩﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا
كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٠﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢١﴾
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿٢٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ
اَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ ۲
كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾ ع ۱۶ع
۲

”پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا‘ اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آگیا‘ اور پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کو وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔پس اے پیغمبرؐ‘ تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا‘ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر--- ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں‘ اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں‘ اور آخرت کا انکار کرتے ہیں--- وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر

رہے' تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے"۔

یہ ایک طویل تنقیدی حملہ ہے' اس کے اندر پائے جانے والے اشارات وہدایات' متنوع یاد دہانیوں اور تنبیہات اور موثر ضربات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں مسلمانوں کی قلیل تعداد اور دعوت اسلامی کو کن مشکلات کا سامنا تھا اور یہ کہ اس اشاراتی تقریر کی اس دور میں کیوں ضرورت پیش آئی۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اپنے اندر ایک تحریکی مزاج رکھتا ہے۔ اور وہ ایک واقعی حالات میں ان تھک جدوجہد کی ہدایات دیتا ہے اور قیامت تک کے لیے ایسی تحریکات کے لیے ایک گائیڈ بک ہے۔

اس قرآن کا مزہ وہی شخص چکھ سکتا ہے جو عملاً احیائے اسلام کے معرکے میں کود چکا ہوتا ہے اور اسے انہی حالات سے سابقہ پیش ہوتا ہے جن حالات میں یہ قرآن سب سے پہلے نازل ہوا تھا اور پھر یہ شخص حالات کا مقابلہ کرتا ہے اور ان حالات کو اپنے راستے پر موڑتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو آرام سے گھروں میں بیٹھے ہوں اور قرآن کریم کو سمجھنا چاہیں اور اس کا مطالعہ فنی اور محض علمی انداز میں کریں تو اس قسم کے آرام طلب' سرد مزاج اور امن پسند لوگ اس کتاب کو نہیں سمجھ سکتے' جو زندگی کے عملی معرکے سے دور ہوں اور کسی اسلامی تحریک میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔ غرض اس قسم کے آرام طلب مسند نشینوں پر قرآن کے اسرار کبھی بھی نہیں کھلتے' جو لوگ اللہ کے سوا دوسری قوتوں کے غلام ہوں' امن پسند ہوں اور آرام طلب ہوں اور کسی بھی طاغوتی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں' ان کے لیے اسرار قرآن اسی طرح ہیں جس طرح کور مادر زاد و نور آفتاب۔

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۱:۱۷) "پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا' اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آگیا' اور پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کو وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے پیغمبرؐ' تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔

اس آیت کے بارے میں بے شمار روایات وارد ہیں کہ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ (۱۱:۱۷) کا مطلب کیا ہے اور وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ (۱۱:۱۷) سے مراد کیا ہے۔ نیز رَبِّهِ اور يَتْلُوهُ کے ضمیروں کا مرجع کیا ہے؟ منہ کے ضمیر کا مرجع کون ہے؟ میرے خیال میں اس عبارت کا سب سے راجح اور موزوں مفہوم یہ ہے کہ جو شخص (یعنی رسول اللہؐ) اپنے رب کی طرف سے صاف صاف شہادت اور ثبوت رکھتا ہے اور رسول اللہؐ کے بعد اس سے مراد تمام مسلمان ہوں

گے اور اللہ کی طرف سے مزید گواہ جو آیا جو اس کی نبوت کے لیے ایک ناقابل انکار ثبوت ہے۔ وہ قرآن کریم ہے' جو بذات خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ وحی الٰہی ہے اور اس قسم کا کلام پیش کرنے سے لوگ عاجز آگئے ہیں اور اس گواہ سے قبل یعنی قرآن سے قبل حضرت موسیٰ کی کتاب بھی موجود ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرتی ہے کیونکہ اس کتاب میں رسول اللہ کے بارے میں واضح خوشخبری موجود ہے اور اس کتاب کی تعلیمات اور اس کی تعلیمات بالکل ایک جیسی ہیں۔

اس آیت کی جو تاویل و تفسیر میں نے بیان کی ہے اس پر اس پوری سورت کا انداز کلام بھی دلالت کرتا ہے۔ اس سورت میں تمام رسولوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کے اندر باری تعالیٰ کی طرف سے دلائل پاتے ہیں اور ان کو اس بات پر بھرپور یقین اور مشاہدہ حاصل ہے کہ ان کی طرف اللہ کی جانب سے وحی آتی ہے۔ وہ ذات باری کو اپنی ذات میں نہایت ہی واضح' نہایت ہی یقینی اور نہایت ہی قریب پاتے ہیں اور ان کو ذات باری اور وحی الٰہی کے بارے میں مشاہداتی یقین حاصل ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت نوح ؑ نے فرمایا:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ اٰتٰىنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ (۱۱:۲۸) "اے برادران قوم' ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ پر اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپیک دیں اور حضرت صالح ؑ نے بھی فرمایا"۔

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ اٰتٰىنِىْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِىْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱:۶۳) "اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھ کو کون بچائے گا۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں گا' تم میرے کس کام آسکتے ہو' سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو"۔

اور حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی ایسی ہی بات کہی:

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ رَزَقَنِىْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا (۱۱:۸۸) "اے بھائیو' تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا' اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا"۔

یہ تمام تعبیرات بتاتی ہیں کہ ان میں رسولوں کا خدا کے ساتھ ایک مخصوص تعلق بتایا گیا۔ اور اس کی نوعیت کچھ اس

طرح ہے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسی بصیرت پاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ حقیقت الوہیت کو اپنے اندر واضح شہادت کی طرح پاتے ہیں کیونکہ وحی کے ذریعے ان کے ساتھ رب کا ایسا تعلق ہوتا ہے جس طرح کسی نظر کا مشاہدات کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ انداز تعبیر اور وحدت تعبیر یہ بتاتی ہے کہ ان آیات میں اللہ اور رسول کے ذاتی تعلق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ ہم نے کہا کہ اس بَيِّنَةٍ سے مراد ہے رسول کی اندرونی شہادت جس کی طرف دوسرے رسولوں کے کلام میں بھی اشارہ موجود ہے۔ اور یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کے مشاہدات وہی ہیں جو سابقہ رسل کے تھے۔ لہٰذا مشرکین مکہ کے تمام دعوے باطل ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ اور آپ کے مٹھی بھر ماننے والوں کو یہ تسلی ہو جائے کہ وہ سابقہ رسل کی طرح حق پر ہیں اور یہ کہ مسلمانوں نے جس تعلیم کو قبول کیا ہے وہ تمام نبیوں کی تعلیم ہے۔

اب اس آیت کا اصولی مفہوم یہ ہوگا کہ یہ نبی جس کی صداقت پر بے شمار دلائل و براہین قائم ہوگئے ہیں اس یقین و ایمان اور اس کے نظریات حق ہیں، کیونکہ ایک طرف وہ خود اپنے نفس میں اس ایمان کو مشاہداتی طور پر دیکھ رہا ہے اور اسے یقین ہے۔ اور اس کے اس یقین کے اوپر خدا کی طرف سے بھی ہر وقت قرآن کی صورت میں شواہد چلے آرہے ہیں اور جو اس بات پر بین دلیل ہیں کہ یہ قرآن بھی اسی ربانی .... سرچشمے سے آرہا ہے اور ایک دوسرا بیرونی گواہ کتاب موسیٰ ہے۔ جو بنی اسرائیل کی قیادت کے لیے امام اور راہنما کتاب تھی اور ایک رحمت تھی جس کا نزول بنی اسرائیل پر ان کے رب کی طرف سے ہوا اور وہ کتاب بھی رسول اللہ کی تصدیق کر رہی ہے۔ کیونکہ آپ کے بارے میں اس کے اندر واضح بشارتیں ہیں اور ان بشارتوں کے علاوہ یہ کتاب اپنے بنیادی تصورات اور اصولوں کے اندر بھی قرآن سے مطابقت رکھتی ہے.... تو کیا ایسا شخص اس لائق ہے کہ اس کی تکذیب کی جائے جس طرح تم لوگ کر رہے ہو اور جس طرح مشرکین کے مختلف طبقات اسے لے رہے ہیں۔ یہ گویا نہایت ہی ناپسندیدہ امر ہے اور ایسے ہمہ جہت شواہد و دلائل کے مقابلے میں ایسا طرز عمل نہ اختیار کرنا چاہئے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا موقف بھی بیان کر دیا جاتا ہے جن لوگوں نے قرآنی تعلیمات پر ایمان لاکر اسے تسلیم کیا اور ان لوگوں کا بھی جنھوں نے اس کا انکار کیا اور پھر ان دونوں کے انجام سے بھی خبردار کر دیا گیا۔

أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ (۱۱:۱۷) "ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لائیں گے اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کو وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے پیغمبرؐ، تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا، یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔

بعض مفسرین کے ذہن میں آیت أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ (۱۱:۱۷) کے مفہوم میں اشکال پیدا ہوا ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (۱۱:۱۷) سے مراد رسول اللہؐ کی ذات ہو جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ کیونکہ اس صورت میں أُولَٰئِكَ سے مراد مومنین کی وہ جماعت ہوگی جو حضورؐ پر آنے والی وحی پر ایمان لاتی ہو اور اس وحی سے وہی دلائل مراد ہوں گے جو حضورؐ پر نازل ہوتے ہیں لیکن اس میں کوئی امر مانع

نہیں ہے کیونکہ (اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ) میں ضمیر قرآن کی طرف راجع ہوگی اور من قبلہ کی ضمیر بھی قرآن کی طرف راجع ہو گی۔ معنی یہ ہو گا کہ لوگ اس گواہ یعنی قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور رسول اللہ تو اول مسلمان ہیں اول مومن ہیں ان باتوں پر جو ان کی طرف نازل ہوتی ہیں اور مومنین حضورؐ کے ایمان کا اتباع کرتے ہیں۔ دوسری جگہ سورت بقرہ میں ہے :

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ - كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

وَرُسُلِهٖ "رسول اس پر ایمان لایا ہے جو اس کی طرف اتارا گیا اور مومنین بھی۔ سب اللہ پر ایمان لائے اور اس کے ملائکہ پر ایمان لائے۔ اس کی کتابوں پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے"۔ یہاں رسول اللہ اور ان لوگوں کے ایمان کو یکجا کر کے بیان کیا گیا اور قرآنی تعبیرات میں یہ انداز کلام بالکل مالوف ہے لہٰذا اس آیت کے مفہوم میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ (۱۱ : ۱۷) "اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے"۔ اور یہ ایسا وعدہ ہے جس کی کوئی خلاف ورزی نہ ہوگی کیونکہ اس کی تقدیر اور تدبیر اللہ نے فرمائی ہے۔

فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(۱۱ : ۱۷) "پس اے پیغمبرؐ، تم اس چیز کی طرف سے شک میں نہ پڑنا' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔ یہ تو حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی آ رہی تھی اس میں حضورؐ نے شک نہیں فرمایا' نہ اس میں کبھی ان کو شبہ لاحق ہوا ہے۔ وہ تو اپنے رب کی طرف سے ایک خاص شہادت رکھتے تھے' لیکن ان دلائل و براہین کے بعد حضورؐ کو یہ ہدایت اس لیے دی کہ حضور اپنے دل میں تنگی محسوس کرتے تھے اور تبلیغ کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ اور معاندین کی کثرت اور شدید مخالفتوں کی وجہ سے آپ ڈرتے تھے کہ دعوت پر جمود کی حالت طاری نہ ہو جائے اس لیے آپ کو یہ ہدایات محض تسلی کے لیے دی گئیں تاکہ آپ نہایت ہی ثابت قدمی سے اپنے کام کو جاری رکھیں۔ نیز امت مسلمہ بھی ان دنوں نہایت ہی قلق' کرب اور تنگ دلی میں مبتلا تھی اور اسی طرح ان کے دلوں پر بھی باد یقین کے جھونکے آ گئے۔

ہمارے دور میں اسلامی تحریکات کو ہر جگہ اسی قسم کے حالات درپیش ہیں۔ ہر جگہ ان کو ایسے ہی مشکل حالات سے سابقہ درپیش ہے اور وہ پریشانی اور تنگ دلی کی کیفیات سے دوچار ہیں۔ ان کے خلاف ہر طرف سے استہزاء اور مذاق ہوتا ہے اور لوگ ان کی دعوت سے منہ موڑتے ہیں' ان کو سخت سے سخت ایذائیں دی جا رہی ہیں اور ان کے خلاف تمام فکری اور نفسیاتی اور مادی وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں' ہر طرف سے جاہلیت کی قوتیں ان کے خلاف ٹوٹ پڑی ہیں۔ مقامی غیر اسلامی قوتیں اور عالمی قوتیں ان کے خلاف رات دن سازشوں میں مصروف عمل ہیں اور ان کے خلاف ہمہ گیر جنگ شروع ہے اور اسلامی تحریکات کے خلاف جو لوگ کام کرتے ہیں ان کی ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہو رہی ہے ایسے

حالات میں اسلامی تحریکات کو ایسی ربانی تسلیوں کی بے حد ضرورت ہے۔

تمام اسلامی تحریکات کا فرض ہے کہ وہ ان آیات پر اچھی طرح غور کریں۔ ان کے ہر ہر فقرے کو سمجھیں' ان کے اندر پائی جانے والی ہدایات سے اشارات اخذ کریں اور ان کے خطوط پر آگے گامزن رہیں۔

اللہ تعالیٰ ان آیات میں جس تاکید' یقین دہانی اور جس سچائی کو بیان کر رہا ہے۔ وہ تحریک اسلامی کی پہلی ضرورت ہے۔ ذرا پھر غور کریں۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ

(۱۱ : ۱۷) "پس اے پیغمبرؐ' تم اس چیز کی طرف سے شک میں نہ پڑنا' یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔ اسلامی تحریک کے ہر کارکن پر آج ایسے سایہ عاطفت کی ضرورت ہے جو تمام رسولوں پر ہر وقت سایہ فگن رہتا تھا اور جو خداوند قدوس کی طرف سے ایک گواہ کا مقام رکھتا تھا۔ یہ خداوند کریم کی طرف سے ایک سایہ رحمت ہوا کرتا تھا۔ وہ اس سایہ میں اپنی منزل کی طرف بڑھتے تھے اور اس راہ میں وہ اپنی کامیابی اور اس راہ کی سچائی میں انہیں کوئی شک نہ ہوتا تھا۔ اور اس راہ میں ان کو جو جو مشکلات پیش آتیں وہ ان کو برداشت کرتے' جیسا کہ حضرت صالح نے فرمایا:

يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ

إِنْ عَصَيْتُهُ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ (۱۱ : ۶۳) "اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھ کو کون بچائے گا۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں گا' تم میرے کس کام آ سکتے ہو' سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو"۔

اس وقت عالم اسلام میں احیائے اسلام کے لئے کام کرنے والی تحریکوں کے مقاصد وہی ہیں جن کے لیے پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا یعنی احیائے اسلام اور جن جاہلیتوں اور مشکلات کا واسطہ ان پیغمبروں کو پڑا تھا' آج وہی جاہلیتیں ان تحریکی دستوں کو درپیش ہیں۔ جس طرح رسول اللہؐ نے پوری انسانیت کے سامنے مکمل دین پیش کیا تھا' آج وہی دین انسانیت کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ گویا وہی زمانہ لوٹ کر آ گیا ہے۔ آج اسلامی تحریکات کا مقابلہ اسی جاہلیت سے ہے جس سے حضرت ابراہیمؑ کو واسطہ پڑا تھا' جس سے اسماعیلؑ' اسحاقؑ' یعقوبؑ' اسباطؑ' یوسفؑ' موسیٰؑ' ہارونؑ' داؤدؑ' سلیمانؑ' یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور تمام دوسرے نبیوں کو پڑا تھا۔

بعض جاہلیتیں تو وجود باری ہی کی منکر ہوتی ہیں اور بعض وجود باری کو تسلیم کرتی ہیں۔ لیکن وجود باری کو مانتے ہوئے بھی انہوں نے اس کرۂ ارض پر ایسے لوگوں کو رب اور حاکم بنا رکھا ہوتا ہے جو لوگوں پر ان قوانین کو نافذ کرتے ہیں جو اللہ نے نازل نہیں کیے۔ اس طرح لوگ ان ارباب کے دین پر ہوتے ہیں۔ آج پورے عالم اسلام میں اسلامی تحریکات

کی دعوت یہ ہے کہ لوگ اپنی زندگی کے تمام حالات میں ' اپنے پورے معاشرے سے اپنی اقدار اور قوانین میں سے ان ارباب من دون اللہ کی حکومت اور اقتدار کو ختم کر دیں اور اللہ وحدہ کی ربوبیت میں داخل ہو جائیں اور اس طرح مکمل طور پر داخل ہو جائیں کہ ان کی زندگی میں اللہ کی ربوبیت کے ساتھ کوئی دوسرا رب نہ ہو ۔ وہ صرف اللہ کی شریعت کی تابع داری کریں ۔ صرف اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی کریں ۔ اس نظریاتی جدوجہد کے نتیجے میں اس وقت اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک ہمہ گیر کشمکش برپا ہے اور اس معرکے میں اسلامی تحریکات کے مقابلے میں دنیا کے تمام طاغوت ایک صف میں کھڑے ہیں ۔

لہٰذا اسلامی تحریکات کے ان ہراول دستوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے تمام نظریات اور تمام موقف اور تمام پالیسیاں قرآن سے اخذ کریں ۔ اور یہی ہے مطلب اس بات کا جو ہم بار بار کہتے ہیں کہ "اس قرآن کا مزہ وہی شخص چکھ سکتا ہے جو اس قسم کے معرکے میں کود پڑے ۔ جس میں حضور اکرمؐ کے ساتھی کود ے تھے اور وہ ویسا ہی موقف اختیار کرے اور ویسے ہی حالات سے دوچار ہو جس سے وہ لوگ دوچار تھے اور حالات کے دھارے کو اسی طرح بدلنا شروع کر دے جس طرح ان حضرات نے بدلا تھا ۔ وہ لوگ جو حجروں میں بیٹھ کر قرآن کے معانی تلاش کرتے ہیں اور احیائے اسلام کے لیے عملاً جدوجہد نہیں کرتے اور قرآن کی محض فنی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور محض بیان کی حد تک اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ۔ وہ قرآن کی حقیقت تک رسائی نہیں پا سکتے ۔ ایسے لوگوں کا فہم قرآن محض جامد اور عملی زندگی سے بہت دور ہوتا ہے"۔

---ooo---

اب سیاق کلام ان لوگوں کی طرف رخ کرتا ہے جن لوگوں کا زعم یہ ہے کہ حضور نعوذ باللہ اپنی جانب سے اس قرآن کو پیش کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اللہ اور رسول اللہ دونوں کی تکذیب کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں موجود ہیں اور ایسے افتراء پردازوں کا مقدمہ اللہ کے ہاں پیش ہے ۔ چاہے ان لوگوں کی تکذیب یہ ہو کہ قرآن کریم اللہ کی طرف سے منزل نہیں ہے یا یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ اور لوگوں کو شریک کرتے ہوں ' یا یہ لوگ اللہ کے ساتھ دوسرے انسانی خداؤں کو اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں شریک ٹھہراتے ہوں ۔ آیات عام ہیں تاکہ سب قسم کے افتراء پرداز اس کے مدلول میں شامل ہو جائیں --- غرض ان لوگوں کو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں پیش کیا جاتا ہے ' ان کی تشہیر ہو رہی ہے ' انہیں شرمندہ کیا جا رہا ہے ' سرعام ۔ اسی منظر میں دوسری جانب مومنین ہیں جو مطمئن کھڑے ہیں اور ان کے لیے ان کے رب کی طرف سے انعامات منتظر ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں قسم کے لوگوں کا تقابل اس طرح پیش فرماتا ہے ۔ ایک طرف اندھے اور بہرے ہیں اور دوسری جانب سننے اور دیکھنے والے ہیں ۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَ يَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِيْنَ (۱۸) الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) فَاُولٰٓئِكَ

لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۲۰) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۱) لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۲۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۳) مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۴) ((۱۱:۱۸ تا ۲۴)) اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔ سنو! خدا کی لعنت ہے ظالموں پر --- ان ظالموں پر جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں' اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں' اور آخرت کا انکار کرتے ہیں --- وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انہیں اب دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ وہ نہ کسی کی سن ہی سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا۔ ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب ہی کے ہو کر رہے' تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے؟"۔

جھوٹ باندھنا تو بذات خود ایک بڑا جرم ہے' اور جس پر افترا باندھا جائے یہ اس پر ایک عظیم ظلم ہے۔ لیکن اگر یہ افترا ذات باری پر باندھا جائے تو یہ ایک عظیم جرم ہے' اور نہایت ہی خطرناک جسارت ہے۔ اس لیے کہ

اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ (۱۱:۱۸) "ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے' اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا"۔

کس پر جھوٹ؟ اپنے رب پر جھوٹ' کسی اور پر نہیں۔ اس منظر میں ان جیسے لوگوں کو اچھی طرح شرمندہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس شرمناک جرم کی سزا کے طور پر ان پر لعنت اور ملامت وارد ہوتی ہے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۱:۱۸) "سنو' خدا کی لعنت ہے ظالموں پر"۔ اور گواہ بھی یہ شہادت دے دیں گے۔ یہ گواہ کون لوگ ہوں گے' ملائکہ' رسول' اور اہل ایمان یہ تمام مخلوق خدا سب کی سب گواہ بن

جائے گی۔ یہ نہایت ہی بڑی شرمندگی اور سرعام ملامت ہوگی' مجمع عام ہو گا اور اس کے سامنے ان کو س شرمندگی سے دوچار ہونا ہو گا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۱ : ۱۸) "سنو خدا کی لعنت ہے ظالموں پر"۔ ظالموں سے مشرکین مراد ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ پر افتراء باندھتے ہیں تاکہ عوام الناس کو اللہ کی راہ سے روکیں اور يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا "ان کے راستے کو کجی کرنا چاہتے ہیں"۔ وہ نہ درستگی چاہتے ہیں اور نہ راہ راست کو پسند کرتے ہیں۔ وہ ہر معاملے میں ٹیڑھ' پہلوتہی اور انحراف کے عاشق ہیں' چاہے وہ راستے پر جا رہے ہوں' چاہے وہ زندگی گزارنے کی کوئی حالت ہو یا کوئی اور معاملہ درپیش ہو۔ اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۹) "اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں"۔ هُمْ کے لفظ کو دو بار اس لیے لایا گیا ہے کہ اس سے حصر اور تاکید مقصود ہے اور یہ بتانا مطلوب ہے کہ یہ انکار ان کے رگ وپے میں بسا ہوا ہے اور وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ یہ ان کی علامت ہو۔ وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں وہی ظالم کہلاتے ہیں وہ جب اسلام کے صراط مستقیم اور سواء السبیل سے پھرتے ہیں تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے پورے نظام کو ٹیڑھا کر دیں۔ اسلامی نظام زندگی کو ترک کر کے جو بھی دوسرا نظام اپنایا جائے وہ انسانی زندگی کے ہر کل پرزے کو ٹیڑھا کر دیتا ہے اور انسان کی سوچ کے دھارے پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔

اللہ تو چاہتا ہے کہ انسان راہ مستقیم پر گامزن ہو کر شرف کے مقام تک پہنچ جائے' جبکہ غیر اللہ کی غلامی نفس انسانی کے اندر ذلت پیدا کر دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں سوسائٹی کے اندر ظلم اور تجاوز پرورش پاتا ہے حالانکہ اللہ کا منشا یہ ہے کہ ہر سوسائٹی میں عدل و انصاف قائم ہو۔ اور لوگوں کی جدوجہد کا رخ اس فضول مقصد کے حصول کی طرف مڑ جاتا ہے کہ وہ لئل زمین کو اپنا رب اور الہ بنانا چاہتے ہیں اور انسانوں کے اردگرد ناچتے اور ڈھول پیٹتے ہیں اور ان کو اس قدر بڑھاتے چڑھاتے ہیں کہ یہ انسان حقیقی رب کی جگہ لے لیں حالانکہ یہ بونے اور حقیر لوگ جو خود مخلوق ہیں' خالق حقیقی کے خلا کو کس طرح بھر سکتے ہیں۔ ان ارضی ارباب کے یہ حقیر اور بونے بندے رات دن کوشش کرتے ہیں کہ ان جھوٹے خداؤں کی خدائی قائم ہو' یہ لوگ ان تھک جدوجہد کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت ان ارضی بتوں کو روشن رکھتے ہیں اور ان کی شخصیات کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اردگرد اور ان کے تکیوں اور آستانوں پر میلے اور ڈھول دھماکے برپا رکھتے ہیں اور گانے بجانے اور دوسری دلچسپیوں کے ذریعے ان کی تعریف اور تسبیح بھی کرتے رہتے ہیں لیکن ان تمام دلچسپیوں اور ان تمام انتھک مساعی کے نتیجے میں انسان کے لیے کوئی بھی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس سے زیادہ انسانیت کی بدبختی اور کیا ہوگی کہ انسان کی پوری زندگی کی جدوجہد یوں اکارت جائے۔

(اُولٰٓئِكَ) "یہ لوگ جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اور جو اللہ کے نزدیک قابل ملامت اور لعنت ہیں۔

فَاُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ (۱۱ : ۲۰) ان کی یہ تمام تدبیریں اللہ کو عاجز کرنے والی نہیں ہیں۔ لہٰذا اللہ جس وقت بھی چاہے ان پر اپنا عذاب نازل کر سکتا ہے اور خود اس دنیا میں بھی۔

وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ (۱۱: ۲۰) "نہ اللہ کے مقابلے میں ان کا کوئی حامی تھا"۔ جو ان کو اللہ سے بچا سکتا یا اللہ کے مقابلے میں ان کی نصرت کر سکتا۔ لیکن اللہ نے ان لوگوں کو اخروی عذاب کے لیے یہاں مہلت دے دی ہے تاکہ وہاں ان کو دنیا اور آخرت دونوں کا عذاب دیا جائے۔

يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ (۱۱: ۲۰) "انہیں اب دہرا عذاب دیا جائے گا"۔ اس لیے کہ انہوں نے دنیا میں اپنی ان صلاحیتوں سے کام نہ لیا جن کے ذریعے وہ حقیقت کا ادراک کر سکتے تھے۔ انہوں نے زبردستی اپنی آنکھوں کو بند رکھا۔ وہ اس طرح تھے جیسے وہ نہ سن سکتے ہوں اور نہ دیکھ سکتے ہوں۔

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (۱۱: ۲۰) "وہ نہ کسی کی سن سکتے تھے اور نہ خود ہی انہیں کچھ سوجھتا تھا"۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۱: ۲۱) "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا"۔ یہ بہت ہی عظیم اور تباہ کن خسارہ ہے' اس لیے کہ اس کاروبار میں جو شخص خسارہ اٹھائے کوئی دوسرا شخص اس کی امداد نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے لوگوں نے خسارہ اٹھا کر اپنی دنیا بھی ضائع کر دی' یہاں انہوں نے اپنے انسانی شرف کو بھی گنوایا۔ کیونکہ انسان کو یہاں شرف صرف اسلامی نظام زندگی کے ذریعے مل سکتا ہے اور انہوں نے آخرت بھی گنوا دی کیونکہ انہوں نے آخرت کا انکار کیا جس کی وجہ سے اخروی عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۱۱: ۲۱) "اور وہ سب کچھ ان سے کھو گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا"۔ دنیا میں انہوں نے جو جھوٹے خدا بنا رکھے تھے وہ سب غائب۔ اب کوئی بھی کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ سب ناپید اور گم ہو گئے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۱۱: ۲۲) "ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں گے"۔ اس قدر خسارے میں کہ دنیا و آخرت میں اس سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کر دیا۔

اس کے مقابلے میں اہل ایمان ہیں اور وہ لوگ جو ایمان کے بعد عمل صالح بھی رکھتے ہیں' وہ اپنے رب کی جانب سے بے حد مطمئن ہوں گے' انہیں پورا وثوق ہو گا کہ ان کے اعمال صالح کا پورا پورا اجر ملے گا۔ نہایت ہی پرسکون' ہر قسم کی پریشانیوں اور شکووں سے دور۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۱: ۲۳) "رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب

ہی کے ہو کر رہے 'تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اخبات کے معنی ہیں اطمینان 'استقرار' وثوق اور تسلیم و رضا۔یہ لفظ ایک حقیقی مومن اور اس کے رب کے درمیان پائے جانے والے تعلق کی بہت ہی اچھی تصویر کشی کرتا ہے۔مومن مکمل طور پر اللہ کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔اس کی طرف سے اس پر جو حالت بھی آتی ہے اس پر مطمئن ہوتا ہے اس کے نفس میں ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے' اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اسے امن' قرار اور رضا کی کیفیت مل جاتی ہے اب دونوں پر تبصرہ

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۲۴) "ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا' بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے"۔

یہ ایک حسی تصویر کشی ہے جس کے اندر دونوں فریقوں کو مجسم طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔پہلا فریق ایک نابینا کی طرح جو کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا' بہرے کی طرح ہے جو کچھ سن نہیں سکتا۔جس کے قوائے مدرکہ معطل ہیں اور وہ اعلیٰ مفاہیم کے ادراک سے عاجز ہے۔چونکہ اس کے اعضائے مدرکہ کام نہیں کرتے اس لیے وہ گویا ان اعضا ہی سے محروم ہے جبکہ دوسرا فریق ان سے کام لیتا ہے اور سمیع و بصیر ہے اور ان قوتوں سے اس کی عقل استفادہ کرتی ہے۔

آخر میں سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ دونوں قسم کے لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟ اور اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا کیونکہ جواب کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بلکہ دوسرا سوال کر دیا جاتا ہے' کہ کیا تم لوگ اس مثال سے سبق نہیں لیتے اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۲۴) اس لیے کہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی گہرے غور و فکر کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۰ ایک نظر میں

قصص انبیاء اس سورت کا مرکزی موضوع ہے۔ لیکن، اصل مقصود بذات خود قصہ نہیں ہے بلکہ اصل مقصود وہ حقیقت ہے جسے ان قصص کے ذریعے ثابت کیا جا رہا ہے اور سورت کے آغاز میں مجملاً اس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ (۲) وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّیُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہٗ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ کَبِیْرٍ (۳) اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴) (۱۱: ۱ تا ۴)

"فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں، ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

سورت کے آغاز میں ان حقائق کے بارے میں متعدد اور مکرر بار تبصرہ ہو چکا ہے۔ زمین اور آسمان کے نظام، انسانی نفس کی تخلیق اور حشر کے میدان کے مکالموں کے ذریعے ان حقائق کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب یہاں کرۂ ارض کے اطراف و اکناف میں بسنے والے انسانوں اور ان کی تاریخ کے حوالے سے ان حقائق کو پیش کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کی یہ کشکش ایک تاریخی کشکش ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے یونہی چلی آ رہی ہے۔

یہ قصص اس سورت میں قدرے تفصیل سے آئے ہیں، خصوصاً حضرت نوح ؑ کا قصۂ طوفان۔ اس میں وہی نظریاتی کشکش ہے جس کا سورت کے آغاز میں ذکر ہوا۔ اور وہی حقائق اس میں موضوع جدال ہیں جن کو لے کر ہر دور میں ہر رسول آیا ہے۔ گویا موجودہ مکذبین بھی وہی ہیں جو حضرت نوح ؑ سے ادھر تکذیب کرتے آئے ہیں۔ ان کا مزاج ایک ہے، ان کی سوچ ایک جیسی ہے اور پوری تاریخ انسانی میں جس طرح رسولوں کی دعوت ایک ہے، مکذبین کا جواب بھی ایک ہے۔

اس سورت کے قصے تاریخی ترتیب کے مطابق ہیں۔ آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے' پھر حضرت ہودؑ' پھر حضرت صالحؑ کچھ اشارہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف اور پھر بحث حضرت لوطؑ کی طرف چلی جاتی ہے' پھر حضرت شعیبؑ اور پھر حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات آگے بڑھ جاتی ہے اور تاریخ ترتیب کو اس لیے یہاں بحال رکھا ہے کہ مقصد پچھلوں کو اگلوں کے انجام بد سے ڈرانا ہے اور یہ بتانا ہے کہ پوری انسانی تاریخ کا طرز عمل ایک جیسا ہے۔

قصہ نوحؑ تاریخی اعتبار سے بھی مقدم ہے' سورت میں بھی مقدم ہے تو لیجئے قصہ نوحؑ :

---○○○---

درس نمبر ۱۰۰ تشریح آیات

۲۵ --- تا --- ۴۹

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۙ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌۙ۝۲۵ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ۝۲۶

"(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح ؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا"۔

یہ وہی الفاظ ہیں جو آغاز سورت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ ؐ کے پیغام کے بارے میں کہے گئے ہیں کہ یہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ ہیں اور مفصل ہیں اور ایک حکیم اور خبردار ذات کی طرف سے ہیں اور میں اس کی طرف سے نذیر اور بشیر ہوں۔ دعوت کے مفہوم اور مقصد کو ایک ہی جیسے الفاظ میں ادا کرنے سے یہ ثابت کرنا مطلوب ہے کہ تمام انبیاؑء کا مشن اور ان کی دعوت ایک ہی رہی ہے۔ ان کے نظریات ایک ہی رہے ہیں' اسی وجہ سے انداز تعبیر بھی ایک ہی جیسا اختیار کیا گیا ہے' یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہاں حضرت نوح ؑ کے اپنے الفاظ کو نقل نہیں کیا گیا بلکہ ان کے مفہوم کو عربی میں ادا کیا گیا ہے اور یہی راجح مذہب ہے کیونکہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ حضرت نوح ؑ کی زبان کیا تھی؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۱ : ۲۵) "(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح ؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) "میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں"۔

یہاں متن قرآن میں لفظ "اس نے کہا" نہیں لایا گیا۔ ایک تو اس لیے کہ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ گویا حضرت نوح ؑ ہمارے سامنے کھڑے ہیں اور ایک زندہ اور چلتا پھرتا منظر ہمارے سامنے ہے اور آپ تقریر فرما رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں۔ اس لیے ماضی کا بیانی اور حکایتی انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ یہاں فریضہ رسالت کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں اور مختصر مفہوم میں بتا دیا گیا کہ "میں تم کو صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں"۔ یہ انداز سامعین کے وجدان میں مقاصد رسالت کو اچھی طرح ذہن نشین کر دیتا ہے"۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۱۱ : ۲٦) "کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو" - یہ اہداف رسالت کا تعین ہے کہ پیغمبر تمہارے سامنے صرف یہ ابتدائی حقیقت پیش کرتا ہے اور اگر اسے تسلیم نہ کیا گیا تو عذاب الٰہی آنے کا اندیشہ ہے -

اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ (۱۱ : ۲٦) "ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا" - رسالت اور ڈراوے کی یہ اساسی حقیقتیں ہیں کہ میں تمہیں اس ہلاکت سے ڈراتا ہوں' اور بس اور ان ہی مختصر کلمات میں رسالت کے تمام اہداف کو مختصراً قلم بند کر دیا جاتا ہے -

یَوْمٍ اَلِیْمٍ (۱۱ : ۲٦) دن دردناک نہیں ہے' الیم سے مراد مولم ہے - الیم بمعنی مالوم ہے - دراصل اس دن لوگ مالوم ہوں گے - لیکن زیادہ مبالغے کے لیے یہ انداز تعبیر اختیار کیا گیا ہے کہ اس دن وقت بھی درد کو محسوس کرے گا - دن بھی اس روز کے شدائد کو محسوس کرے گا - اس سے لوگوں کے حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر دردناک ہوں گے -

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

"جواب میں اس کی قوم کے سردار' جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا' بولے :"ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے - اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے' بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے - اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو' بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں" -

یہ ہے اونچے طبقات کے متکبرین کا جواب' جو کسی بھی سوسائٹی کے صدر نشین ہوتے ہیں - اور یہی جواب حضورؐ کو بھی آپ کی قوم قریش کے متکبرین نے دیا تھا - وہ بھی کہتے تھے' ہم تو تمہیں اپنے جیسا انسان سمجھتے ہیں اور ہماری قوم کے کم درجے کے لوگوں نے بغیر سوچے تمہاری دعوت کو قبول کر لیا ہے اس لیے کہ عوام الناس گہری سوچ نہ رکھتے - آخر تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے - اس لیے ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں -

وہی شبہات' وہی الزامات' وہی تکبر و غرور' اور وہی جہالت اور کم فہمی جو قوم نوحؑ نے اختیار کی اور یہ لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں -

انسانوں میں ہمیشہ یہ جہالت پائی جاتی رہی ہے کہ انسان حامل رسالت نہیں ہو سکتا اور اگر کسی انسان کو منصب رسالت عطا ہو سکتا ہے تو پھر یہ منصب کسی بادشاہ یا اس سے بھی کسی برتر مخلوق کو دیا جانا چاہئے - یہ ایک نہایت ہی جاہلانہ

اور احمقانہ تصور ہے کہ وہ انسان جسے اللہ نے اس کرۂ ارض پر خلافت عطا کی' اور جس کو خلافت ارضی کی بھاری ذمہ داری سپرد کی گئی ہے وہ منصب رسالت کا اہل نہیں ہے کیونکہ منصب خلافت ارضی بھی تو ایک عظیم منصب ہے' اور ظاہر ہے کہ انسان کے اندر اللہ نے ایسی صلاحیتیں ودیعت کی ہوں گی جن کے ذریعے وہ اسے ادا کر سکے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جنس انسانی میں سے بعض افراد کو اس سے بھی بڑی صلاحیت عطا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے منصب رسالت کی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور اپنی مخلوق میں سے اللہ جسے چاہے یہ ذمہ داریاں عطا کر دے۔ کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے کس ذات کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے تاکہ اس کے اندر یہ منصب بھی رکھ دے۔

دوسری غلط فہمی انسانوں کو ہمیشہ یہ لاحق رہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو یہ منصب عطا بھی کرتا ہے تو یہ منصب ان بڑوں اور مالداروں کا حق ہے' کیونکہ وہ پہلے سے اپنی قوم پر مسلط ہیں اور ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ یہ درحقیقت ان اقدار سے لاعلمی ہے جو اللہ نے اس مخلوق انسانی کے لیے محترم گردانی ہیں اور جن کی وجہ سے انسان خلافت ارضی کا مستحق ہوا ہے اور پھر ان میں سے مزید اونچے مرتبے والے لوگ منصب رسالت کے اہل گردانے گئے ہیں۔ ان اقدار کا تعلق مال اور مرتبے اور زمین پر قوت سے نہیں ہے۔ ان کا تعلق نفس انسانی سے ہے اور یہ کہ کوئی نفس آیا اپنے اندر وہ مخصوص قوت رکھتا ہے جو عالم بالا سے رابطہ رکھ سکے۔ اس رابطے کے لیے مال و دولت اور عزت مرتبے کی نہیں بلکہ خاص روحانی قوتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس امانت کبریٰ اور منصب دعوت اور اقدار کو قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہوں۔ اور اس راہ میں مشکلات پر صبر کرنے کی صلاحیت بھی اس میں ہو۔ یعنی وہ صفات جو منصب نبوت کے لیے ضروری ہوں۔ ان صفات کا تعلق مال اور جاہ سے نہیں ہے اور نہ سوشل مقام و مرتبے سے ہے۔

لیکن اس کے برعکس حضرت نوحؑ کی قوم کے اونچے طبقات کا خیال یہ تھا جیسا کہ ہر سوسائٹی کے اونچے طبقات یہ خیال رکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اونچے مرتبے کی وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں اور مقام نبوت کے ادراک سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بشر نبی نہیں ہو سکتا اور اگر ہو سکتا ہے' تو پھر اس مقام کے وہ حقدار ہیں۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا "ہماری نظر میں تو تم ہم جیسے انسان ہو"۔ ایک تو یہ بات ہے اور دوسری یہ ہے کہ

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (۱۱ : ۲۷) "اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے' بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے"۔

یہ لوگ غریبوں کو "اراذل" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں اور ہمیشہ متکبرین ان لوگوں کو رزیل سمجھتے ہیں جن کو دولت و اقتدار نصیب نہیں ہوتا۔ حالانکہ رسولوں اور اسلامی تحریکات میں ہمیشہ غریب اور سلیم الفطرت لوگ ہی سب سے پہلے دلچسپی لیتے ہیں اور اونچے لوگوں کے مقابلے میں وہ سچائی کو جلدی قبول کرتے ہیں۔ ان کے دل رب واحد کے ساتھ زیادہ جڑے ہوتے ہیں۔ جو بلند اور قاہر ہے۔ اس لیے کہ مالداری' عیاشی اور سرکشی نے ان کی فطرت کو بگاڑا نہیں ہوتا' اس لیے ان کے ہاں قبولیت حق کی راہ میں رکاوٹیں کم ہوتی ہیں۔ غریب لوگوں کو یہ ڈر نہیں ہوتا کہ اسلام قبول کر کے وہ اس چراے ہوئے مقام کو گنوا دیں گے جو جمہور لوگوں کی غفلت اور نادانی کی وجہ سے انہوں نے حاصل کر لیا ہوتا ہے اور جمہور

عوام کو بت پرستی اور شاہ پرستی میں مبتلا کر دیا ہوتا ہے اور سب سے بڑی بت پرستی تو یہ ہوتی ہے کہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اپنے جیسے لوگوں کو بڑا بنا کر اور انہیں زمین کا اقتدار دے کر ان کا اتباع اور پرستش کریں۔ تمام رسولوں کی دعوت تو دراصل عوام الناس کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزادی کی دعوت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے اس دعوت کا مقابلہ سوسائٹی کے اکابر کرتے ہیں' اور جمہور عوام کو بھی یہ دعوت دی جاتی ہے کہ اسے قبول نہ کیا جائے اور وہ پیغمبری دعوت کو للکارتے ہیں' ان پر الزامات عائد کرتے ہیں اور لوگوں کو اس سے متنفر کرتے ہیں۔

ذرا ان لوگوں کے الفاظ پر تو غور کرو ''ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں اراذل تھے 'بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے''۔ یعنی انہوں نے تمہاری دعوت پر غور و فکر نہیں کیا ہے۔ یہ ہے وہ الزام جو ہر دور میں سوسائٹی کے بلند اور بااثر طبقات اہل ایمان کی خلاف عائد کرتے ہیں' یہ کہ یہ لوگ بھولے بھالے ہوتے ہیں اور ان میں غور و فکر نہیں ہوتا۔ اور بڑے لوگوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہے کہ وہ عوام الناس کے پیچھے چلیں۔ اب چونکہ یہ مومن ہو گئے ہیں اس لیے ہم کیسے مومن ہو سکتے ہیں کیونکہ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کے ایمان اور دعوت کا اتباع کیسے کر سکتے ہیں۔

وَمَا نَرٰی لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱ : ۲۷) ''اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہو''۔ اب یہ لوگ داعی اور متبعین دونوں کے خلاف ایک ہی تبصرہ کرتے ہیں' کہ اہل ایمان کو ہمارے اوپر کوئی برتری حاصل نہیں ہے کہ تم لوگ زیادہ ہدایت یافتہ سمجھے جاؤ' یا تم لوگ ہمارے مقابلے میں زیادہ سچائی کے قریب ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہم تم سے پہلے ہوتے۔ غرض وہ ہدایت کو بھی دنیا پرستی پر قیاس کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کے معاملے میں ہم سے کوئی آگے نہیں ہے تو دین کے معاملے میں کیسے آگے ہو گیا۔ کیونکہ ہم معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ہمارے پاس اقتدار ہے۔ لہٰذا اہل ثروت اور اہل اقتدار ہی افضل ہو سکتے ہیں۔ اور زیادہ سمجھدار ہو سکتے ہیں۔ جب کسی معاشرے سے عقیدۂ توحید غائب ہو جاتا ہے تو اس معاشرے کی ذہنیت وہ بن جاتی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ جب بھی عقیدۂ توحید ختم ہوا' لوگ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے اور انہوں نے مختلف پہلوؤں سے بت پرستی اختیار کر لی۔ اگرچہ بظاہر ایسا معاشرہ نہایت سلجھا ہوا اور ترقی یافتہ نظر آتا ہے لیکن درحقیقت یہ پوری انسانیت کی پسماندگی ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسی سوسائٹی ان اقدار کی تحقیر کرتی ہے جن اقدار کی وجہ سے انسان 'انسان' بنتا ہے۔ اور انہی کی وجہ سے انسان خلافت ارضی کا مستحق ٹھہرا ہے اور انہی کی وجہ سے انسان کو عالم بالا سے منصب نبوت عطا ہوا۔ یہی وہ تصورات ہیں جن کی بنا پر انسان عالم بالا سے دور ہو کر خالص حیوانیت اور مادیت اور جسمانیت کے قریب چلا جاتا ہے۔

بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۱۱ : ۲۷) ''بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں''۔ یہ وہ آخری الزام ہے جو وہ رسول اور آپ کے متبعین کے سر تھوپتے ہیں' لیکن اس میں بھی وہ اپنی متکبرانہ شان سے بات کرتے ہیں کہ ''ہم یہ سمجھتے ہیں ہمیں یہ گمان ہے''۔ یہ محتاط انداز گفتگو ہے جسے یہ مالدار طبقہ اپنایا کرتا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہر بات پر یقین کر لینا اور دو ٹوک بات کرنا ایک عامی بات ہے اور سطحی رائے والے نادان لوگ فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ یہ تو بڑے لوگ ہیں جو مفکرانہ انداز میں تحفظ کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

یہ ہے مزاج ان لوگوں کا جو مالدار ہوتے ہیں' جو فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے ہیں' جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور جن کی گردنیں موٹی اور پیٹ پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔

حضرت نوح عم ان الزامات' اس سرکشی اور استکبار کو نہایت ہی خوش اخلاقی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ وہ یقین' ثابت قدمی اور نہایت ہی ٹھنڈے انداز میں اس سچائی کو ان کے سامنے پیش کرتے ہیں جو اللہ نے ان پر نازل کی ہے۔ وہ نہایت ہی وضاحت سے بات کرتے ہیں' نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں گہرے شعور اور یقین کے ساتھ ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ وہ ان کی زبان میں بات نہیں کرتے' وہ الزام کا جواب الزام سے نہیں دیتے۔ وہ ایسا دعویٰ نہیں کرتے جو وہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں حقیقی تاثر کے بجائے کوئی مبالغہ آمیز تصور نہیں دیتے۔ وہ اپنی رسالت اور منصب رسالت کے بارے میں ان کے سامنے نہایت ہی حقیقی بات کرتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

"اس نے کہا"" اے برادران قوم' ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سر چپک دیں؟ اور اے برادران قوم' میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنھوں نے میری بات مانی ہے' وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں' نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں' نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں

ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا"۔

"اے برادران قوم"کس قدر مہذب، پرخلوص داعیانہ خطاب ہے! ان کی نسبت اپنی طرف اور اپنی نسبت ان کی طرف۔ آپ فرماتے ہیں کہ تم اعتراض یہ کرتے ہو کہ میں تمہارے جیسا ایک آدمی ہی ہوں تو بظاہر تمہاری بات تو درست ہے لیکن اگر میرا میرے رب کے ساتھ پیغمبرانہ اتصال ہو تو ذرا سوچو تمہاری اس رائے کے نتائج تمہارے لیے کس قدر خطرناک ہو سکتے ہیں۔میں تو واضح طور پر اپنے رب کے ساتھ رابطہ رکھتا ہوں۔اور مجھے اس کا شعور بھی ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے تم لوگ محروم ہو۔اللہ نے مجھے اپنا رسول ہونے کا منصب دیا ہے اور یہ اس کی جانب سے میرے لیے رحمت ہے یا مجھے ایسے خصائص عطا کیے جن کی بنا پر میں اس رحمت الٰہی کا حامل ہو گیا ہوں اور یہ بے شک ایک عظیم رحمت ہے۔تم اس پوزیشن پر بھی ذرا غور کر لو کہ اگر مجھ پر یہ رحمت ہو۔اور تم اس کو سمجھ نہ پا رہے ہو'کیونکہ تم عقل کے اس قدر کورے ہو کہ اس عظیم حقیقت کے ادراک ہی سے محروم ہو۔تم اس کو دیکھ نہیں سکتے ہو تو ہمارے پاس اب اور کیا ذریعہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو زبردستی تمہارے ذہن میں ڈال دیں۔نہ میں ایسا کر سکتا ہوں اور نہ ایسا کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔خصوصاً جب کہ تم اس کے تسلیم کرنے کو ناپسند کرتے ہو۔جب نفرت کی خلیج حائل ہے تو تم سمجھ ہی کب سکتے ہو۔

حضرت نوح ؑ نہایت پیار کے ساتھ ان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ فرماتے ہیں اور ان کے احساس کو تیز فرماتے ہیں تاکہ وہ ان بلند حقائق کو سمجھنے کی سعی کریں۔اور رسالت کے بارے میں وہ جس غلط فہمی اور غفلت کا شکار ہیں اس سے باہر نکل آئیں۔ان کو حضرت نوح ؑ یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رسالت کا معاملہ اس قدر سطحی نہیں ہے جس قدر وہ اسے سمجھ رہے ہیں۔لیکن حضرت نوح ؑ اپنے اس نرم کلام میں ان کو یہ عظیم اصول بتا رہے ہیں کہ عقیدے کا معاملہ خالص کسی شخص کی سمجھ پر موقوف ہے اور کسی عقیدے کا اختیار ایک شخص کے ذاتی غور و فکر پر منحصر ہے۔اس باب میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں کی جا سکتی اور نہ کسی پر کوئی عقیدہ ٹھونسا جا سکتا ہے۔خواہ کوئی جس قدر جبر اور تشدد چاہے' اختیار کر لے۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْـهَلُوْنَ (۱۱ : ۲۹) "اور اے برادران قوم' میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا' میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے' وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔

اے برادران قوم' جن لوگوں کو تم "رذیل" کہتے ہو یہ تو وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے دعوت دی اور انہوں نے میری دعوت قبول کر لی اور ایمان لے آئے اور میرا مطالبہ لوگوں سے فقط یہ ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔اس کے سوا میرا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔میں جو دعوت دے رہا ہوں' اس کے عوض میں ان سے کوئی معاوضہ طلب کرنے کا حقدار نہیں ہوں۔اگر ایسا ہوتا تو میں فقراء کے مقابلے میں امراء کے درپے ہو جاتا۔میرے نزدیک تمام لوگ برابر ہیں' فقیر ہوں کہ

امیر۔ جو شخص لوگوں کی دولت میں دلچسپی نہیں رکھتا اس کے نزدیک فقراء اور امراء ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۱۱ : ۲۹) "میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے"۔ صرف اللہ کے ذمہ ' اس کے سوا کسی اور سے میں کسی قسم کے معاوضے کا طلبگار ہی نہیں۔

وَ مَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۱۱ : ۲۹) "اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے والا بھی نہیں ' جو ایمان لائے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے ایسا کوئی مطالبہ کیا تھا یا ایسے اشارات دیئے تھے کہ وہ ان عوام الناس کے ساتھ اکٹھے نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر ان کو دور کر دیا جائے تو وہ ایمان لانے پر غور کر سکتے ہیں کیونکہ وہ مجلس نوحؑ میں ان رذیل لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ نہ وہ یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ ہم جیسے بڑے لوگ ان رذیلوں کے طریقے پر چلیں۔ میں ان لوگوں کو دھکے دینے والا نہیں۔ یعنی مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا وہ تو ایمان لے آئے ہیں۔ اب وہ جانیں اور ان کا رب جانے۔

اِنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ "وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں"۔

وَلٰکِنِّیْٓ اَرٰکُمْ قَوْمًا تَجْھَلُوْنَ (۱۱ : ۲۹) "مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔ یعنی تم ان اقدار کو نہیں سمجھ سکتے جن کے ساتھ اللہ کے ترازو میں لوگ تولے جاتے ہیں۔ اور تم اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھتے کہ سب لوگوں کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (۱۱ : ۳۰) "اور اے قوم ' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟"

اللہ موجود ہے ' وہ فقراء کا بھی رب ہے اور اغنیاء کا بھی رب ہے۔ ضعیفوں کا بھی والی ہے اور طاقتوروں کو بھی سہارا دینے والا ہے۔ اللہ کے ہاں جو اقدار وزن رکھتی ہیں وہ اور ہیں۔ وہاں ایک ہی ترازو ہے ' ترازوئے ایمان باللہ۔ لہٰذا یہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں ' اب اپنے رب کی حفاظت میں ہیں۔

وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ (۱۱ : ۳۰) "اور اے قوم ' اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟" جب میں نے اللہ کی قائم کردہ اقدار کو پامال کر دیا۔ اور اللہ کے ان بندوں پر زیادتی شروع کر دی جو ایمان لے آئے ہیں اور دعوت قبول کر لی۔ یہ لوگ تو اللہ کے ہاں معزز ہیں۔ اس صورت میں تو میں دراصل تمہاری اقدار کو قائم کرنے والا بن جاؤں گا حالانکہ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ میں ان کھوٹی قدروں کو بدل کر رکھ دوں ' اس لیے نہیں کہ میں خود ان کی پیروی کروں۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۱ : ۳۰) "تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی سی بات نہیں آتی"۔ تم جن اقدار کی پیروی کر رہے ہو، وہ کھوٹی ہیں اور انہوں نے تمہیں فطری اقدار بھلا دی ہیں۔

اس کے بعد حضرت نوحؑ ان کے سامنے اپنی شخصیت اور رسالت کی حقیقت نہایت ہی واضح طور پر رکھتے ہیں۔ بالکل سادہ اور غیر مصنوعی حقائق کی شکل میں۔ رسول کی شخصیت اور منصب رسالت کو دنیا کی کھوٹی قدروں سے بالکل الگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ حقیقت کو سمجھ سکیں اور یہ جان سکیں کہ اللہ کے ہاں حقیقی قدریں کیا ہیں تاکہ ان کے سامنے دنیا کی ظاہری قدریں الگ ہو جائیں اور حقیقی قدریں صاف اور ستھری ہو کر واضح ہو جائیں تاکہ رسول اور رسالت اپنی اصلی شکل میں، بغیر کسی ملمع کاری کے ان کے سامنے ہوں چاہے وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (۱۱ : ۳۱) "اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں"۔ اس لیے میں نہ دولت مندی کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ یہ قدرت رکھتا ہوں کہ تمہیں دولت مند بنا دوں۔

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (۱۱ : ۳۱) "نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں"۔ تاکہ میں کسی ایسی قوت کا دعویٰ کروں جو عام انسانوں کے پاس نہیں ہے، ماسوائے تعلق رسالت کے"۔

وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ (۱۱ : ۳۱) "نہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں"۔ تاکہ میں عام انسانوں کے مقابلے میں کسی بلند تر جھوٹی صفت کا دعویٰ کروں اور تمہاری نظروں میں، میں بلند تر ہو جاؤں اور اپنی قیادت اور سیادت تم سے منوا سکوں۔

وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْٓ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا (۱۱ : ۳۱) "اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں، انہیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی"۔ تاکہ اس طرح میں سوسائٹی کے ان مستکبرین کو راضی کر سکوں یا اس طرح میں تمہاری دنیاوی سطحی اقدار اور عارضی رسومات کے ساتھ ہاں میں ہاں ملاؤں۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (۱۱ : ۳۱) "ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے"۔ ان لوگوں کی حقیقت کا حال بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ میں ان کے ساتھ ان کے ظاہری حالات کے مطابق ہی معاملہ کر سکتا ہوں۔ اور ان کا ظاہری حال اس بات کا مستحق ہے کہ میں ان کی قدر کروں اور یہ امید رکھوں کہ اللہ ان کا انجام اچھا کرے گا۔

اِنِّیْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (۱۱ : ۳۱) "اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا"۔ اگر مذکورہ بالا دعاوی میں سے کوئی دعویٰ بھی میں نے کیا۔ اس صورت میں گویا میں سچائی کے ساتھ ظلم کروں گا حالانکہ مجھے حکم یہ دیا گیا ہے کہ میں سچائی کی تبلیغ کروں اور میں اپنے آپ کو غضب الٰہی کا مستحق ٹھہرا کر خود اپنے اوپر بھی ظلم کروں گا اور لوگوں کے ساتھ

بھی ظلم کروں گا کیونکہ میں ان کو وہ مقام دوں گا جو انہیں اللہ نے نہیں دیا ہے۔

اس طرح حضرت نوح عم اپنی ذات اور اپنے منصب رسالت سے ان جھوٹی اقدار کو جھاڑ دیتے ہیں جو ان کی قوم نے تصور رسول اور تصور رسالت کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں۔ اور اپنی قوم کے سامنے رسول اور رسالت کو اپنے حقیقی روپ میں پیش فرماتے ہیں اور ان تمام سطحی اور جعلی تصورات سے ان حقائق کو پاک کر کے پیش فرماتے ہیں کیونکہ کسی بھی حقیقت کو مصنوعی رنگ و روغن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ سچائی کو اپنے حقیقی روپ میں اپنی حقیقی قوت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور نہایت ہی محبت بھری اپیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اگر ان کی قسمت میں کچھ لکھا ہے تو اپنا حصہ وصول کر لیں۔ غرض حضرت نوحؑ کی دعوت میں نہ ہیر پھیر ہے، نہ کوئی کھوٹ ہے، نہ کوئی بناوٹ ہے، نہ کسی حقیقی قدر کی قربانی ہے۔ سیدھی سادی بات اپنے حقیقی روپ میں وہ پیش فرماتے ہیں۔ آپ اللہ کے سوا کسی اور کی رضامندی نہیں چاہتے اور پوری انسانی تاریخ کو دعوت پیش کرنے کا ایک نمونہ دیتے ہیں کہ سچائی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرو، بغیر کسی ہیر پھیر کے، بغیر اس کے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی رضامندی مطلوب ہو۔ البتہ نہایت ہی ترغیبی اسلوب میں ہو۔

اب اس مقام پر قوم نوحؑ، صداقت نوحؑ، دلائل نوح اور اسلوب نوحؑ کے مقابلے سے عاجز آ جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ضد پر اتر آتے ہیں اور محبت اور دلیل کا جواب استکبار اور ہٹ دھرمی سے دیتے ہیں اور اب بحث و مباحثہ اور غور و فکر کی راہ کو ترک کر کے وہ چیلنج دینے پر اتر آتے ہیں۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

"آخر کار ان لوگوں نے کہا کہ "اے نوح، تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، اگر سچے ہو"۔

یہ ایک انوکھا انداز ہے، عاجزی نے قوت کا لباس پہن رکھا ہے۔ ضعیفی توانائی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ درحقیقت یہ لوگ ڈرتے تو ہیں لیکن زبان سے انکار کر کے نیز چیلنج کے الفاظ کا سہارا دے کر بہادری کا جھوٹا مظاہرہ کرتے ہیں۔

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۱: ۳۲) "اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، اگر سچے ہو"۔ وہ دردناک عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے رہے ہو اب ہم پر نازل کر دو، ہم تو کسی صورت میں تصدیق کرنے والے نہیں ہیں اور ہم تمہارے ڈراوے کی اب کوئی پروا نہیں کرتے۔

اب ذرا دیکھیے کہ حضرت نوحؑ کا ردعمل کیا ہے؟ یہ تکذیب اور یہ معاندانہ چیلنج ان کو ایک دینی اور رسول کریم کے جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا۔ وہ حق اور صداقت کی تبلیغ سے ہاتھ نہیں کھینچ لیتے۔ وہ مسلسل ان کے سامنے وہ سچائی پیش کرتے چلے جاتے ہیں، بھلایا ہوا سبق یاد کراتے جا رہے ہیں حالانکہ ان کا رویہ بہت ہی جاہلانہ ہے اور وہ مطالبہ کر رہے

ہیں کہ لے آیئے وہ عذاب! آپ ان کو یہ جواب دیتے ہیں کہ بھائیو! میں تو فقط رسول ہوں اور میری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پیغام تم تک پہنچا دوں۔ رہا عذاب الٰہی تو وہ امر الٰہی کے تابع ہے اور تمام امور کی تدبیر تو اللہ کرتا ہے۔ یہ فیصلہ اللہ کرتا ہے کہ عذاب جلدی لے آئے یا اسے کسی وقت تک موخر کر دے۔ یہ اس کی سنت کے مطابق آئے گا اور سنت الٰہیہ میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ ایک نبی نہ تو سنت الٰہیہ میں تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ اس کا رخ پھر سکتا ہے۔ رسول کا فریضہ اور ذمہ داری فقط یہ ہے کہ وہ آخری لمحے تک تبلیغ کرتا رہے۔ لوگوں کی جانب سے تکذیب اور روگردانی اور چیلنج کی وجہ سے رسول کبھی اپنا کام نہیں چھوڑتا۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ
يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۟ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

"نوحؑ نے جواب دیا" وہ تو اللہ ہی لائے گا' اگر چاہے گا' اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو۔ اب اگر میں تمہاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں' تو میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جب کہ اللہ ہی نے تمہیں بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہو' وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹنا ہے"۔

اگر سنت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ تم اپنی گمراہی کی وجہ سے ہلاک ہو جاؤ تو یہ سنت تم پر جاری ہو کر رہے گی' چاہے میں جس قدر جدوجہد کروں' اس لیے نہیں کہ اللہ تمہیں میری نصیحت سے استفادہ کرنے سے روکتے ہیں' بلکہ اس لیے کہ تم اپنے اختیار تمیزی کو اس طرح استعمال کر رہے ہو کہ سنت الٰہی کے مطابق تم اس انجام تک پہنچ جاؤ گے۔ اور اس سلسلے میں تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ہو۔ تم تو دائماً اس کے قبضہ قدرت میں ہو' اللہ ہی تدبیر امور کرتا ہے۔ اور تقصیرات کا تعین کرتا ہے۔ تم سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے' حساب و کتاب دینا ہے اور جزاء و سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

هُوَ رَبُّكُمْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۱ : ۳۴) "وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹنا ہے"۔

---ooo---

قصے کے اس مرحلے پر روئے سخن اچانک پلٹتا ہے۔ اب ایک بات قریش مکہ اور مشرکین مکہ کی طرف بھی' کیونکہ ان کی حالت بھی ایسی ہی تھی جیسے حضرت نوحؑ کی قوم کی تھی۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت محمدؐ یہ قصے اپنی جانب سے گھڑتے ہیں' تو درمیان میں اچانک بات کاٹ کر ان کے اس اعتراض کا جواب دے دیا جاتا ہے اور بعد میں قصہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَ اَنَا

۳
بَرِيْۤءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝۳۵ ۱۱ع
۳

"اے نبیؐ' کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو "اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمہ داری ہے ' اور جو جرم تم کر رہے ہو' اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں"۔

افتراء پردازی بے شک ایک بڑا جرم ہے ۔اے پیغمبران سے کہہ دیں کہ اگر میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے تو اس کا گناہ مجھ پر ہے۔ جب مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت بڑا جرم ہے تو میں کیسے اس کا ارتکاب کر سکتا ہوں اور تم جو مجرمانہ تہمت مجھ پر لگا رہے ہو تو میں اس سے بھی بری الذمہ ہوں' نیز اس کے علاوہ تم جن دوسرے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہو' یعنی شرک اور تکذیب اس سے بھی۔

یہ جملہ معترضہ سیاق قصہ میں برا نہیں لگتا اس لیے کہ سیاق قصہ کی غرض و غایت بھی تو یہی ہے جس کی اس جملے میں تصریح کر دی گئی۔

---ooo---

اب قصہ نوح دوبارہ شروع ہوتا ہے ۔اس کا دوسرا منظر سامنے آتا ہے ۔حضرت نوحؑ اب اپنے رب کی طرف سے ہدایات پاتے ہیں اور احکام الٰہی یوں وارد ہیں :

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷

"نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے 'بس وہ لا چکے 'اب کوئی ماننے والا نہیں ہے۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں"۔

اب دعوت و تبلیغ کا وقت گزر گیا۔ اب ڈرانے اور دھمکانے کا باب ختم' نمائش بہت ہو چکی۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (۱۱ : ۳۶) "نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے 'بس وہ لا چکے 'اب کوئی ماننے والا نہیں ہے"۔

جو دل ایمان لانے کے لیے آمادہ تھے وہ ایمان لا چکے' جو رہ گئے ان کے اندر ایمان لانے کی استعداد باقی نہیں رہی ہے۔ نہ وہ اس طرف کوئی رجحان رکھتے ہیں۔ یہ تھی اللہ کی جانب سے حضرت نوحؑ کو آخری اطلاع اور یہ اللہ کی جانب سے تھی اور اللہ تو علیم ہے۔ لہٰذا اب دعوتی مہم جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہ رہا۔ اور کہہ دیا گیا کہ اب ان کی جانب

سے کفر تکذیب اور خندہ و استہزاء کی کوئی پروا نہ کرو۔

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۱۱:۳۶) "ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو"۔ آپ اپنی ناکامی پر رنج والم محسوس کرنا چھوڑ دیں۔ اور یہ لوگ جو کرتے رہے' اور جو کر رہے ہیں اس کی کوئی پروا نہ کریں۔ خود اپنی فکر بھی نہ کریں وہ آپ کو کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔ اور نہ ان کے لیے حسرت کریں کیونکہ ان سے خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا معاملہ یہاں ختم کر دیجئے۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا "اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق یہ کشتی بنانی شروع کر دو"۔ ہماری مرضی اور ہدایات کے مطابق۔

وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۱۱:۳۷) "اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں"۔

ان کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے اور ان کا انجام اب متعین ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب آپ ایسے لوگوں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کریں۔ نہ ان کی ہدایات کے لیے دعاء کریں اور نہ ہی بددعا کیونکہ دوسری جگہ قرآن مجید میں یہ آیا ہے کہ حضرت نوح ؑ نے ان کے خلاف بددعا فرمائی۔ لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مایوسی اس کے بعد تھی۔ جب فیصلہ ہو چکا تو اللہ کے ساتھ خطاب ممنوع ہو گیا۔

---ooo---

اب ایک تیسرا منظر سامنے آتا ہے۔ حضرت نوح ؑ کشتی بنا رہے ہیں۔ آپ نے اپنی قوم سے اب علیحدگی اختیار کر لی ہے اور ان کو دعوت دینا بند کر دیا ہے اب ان کے ساتھ کوئی مکالمہ نہیں ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

"نوح ؑ کشتی بنا رہا تھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں' عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلاٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی"۔

ذرا انداز کلام ملاحظہ ہو' حالیہ فعل کو فعل مضارع کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ اس سے کلام میں نہایت ہی سنجیدگی اور سرگرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ہم اپنی تصوراتی دنیا میں گم ہو کر دیکھ رہے ہیں کہ حضرت نوح کشتی بنا رہے ہیں۔

اور ان کی قوم کے لوگ گروہ در گروہ ان کے پاس سے گزر رہے ہیں - اور مذاق کر رہے ہیں - یہ مذاق کس کے ساتھ کر رہے ہیں اس شخص کے ساتھ جو ان سے کہتا تھا کہ وہ رسول رب العالمین ہے - ان کو دعوت دیتا تھا - ان سے ساتھ بحث و مباحثہ کر رہا تھا اور یہ مکالمہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا تھا - لیکن یہ پیغمبر اب بڑھئی کا کام کر رہے ہیں - اور یہ لوگ مذاق اس لیے کرتے تھے کہ یہ صرف ظاہری امور کو دیکھ سکتے تھے - اس فعل کے پیچھے جو اللہ کے احکامات و ہدایات تھیں' وہ ان کی نظروں سے اوجھل تھیں - وہ تو مویشیوں کی طرح صرف ظاہری امور کو دیکھ رہے تھے - ظاہری حالات کے پس پشت جو حکمت ربانی اور جو تقدیر الٰہی کام کر رہی تھی وہ پردے میں تھی - رہے نوح تو وہ پوری طرح مطمئن تھے - اللہ کا جو فرمان ہے وہ ہو کر رہے گا - وہ ان کے مذاق کے مقابلے میں نہایت ہی اطمینان' سربلندی اور بڑی شان سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے - وہ کہتے جاتے :

اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (۱۱ : ۳۸) "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں" - ہم تمہارے ساتھ اس لیے مذاق کر رہے ہیں کہ تم معاملات و واقعات کے پس منظر سے نابلد ہو - اللہ کی تقدیر تمہارے انتظار میں ہے - اور تمہارا انجام تمہارے سامنے آنے والا ہے -

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۱۱ : ۳۹)
"عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی"۔ سوچ لو کہ اس عذاب کے مستحق ہم ہوں گے یا تم - ذرا پردہ گرنے کا انتظار کرو -

---

اور جب مقررہ وقت آجاتا ہے - وہ لمحہ جس کا انتظار تھا تو پھر اس کا منظر کچھ اس طرح ہے :

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو' اپنے گھر والوں کو بھی - سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے - اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں" - اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے - نوح نے کہا "سوار ہو جاؤ اس میں' اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی' میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے" -

یہ تنور کس طرح جوش میں آیا؟ بعض اقوال ایسے ہیں جو تخیلات پر مبنی ہونے کی وجہ سے بہت دور کے نظر آتے ہیں اور بعض کے اندر اسرائیلیات کی بو آتی ہے ۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم بغیر کسی راہنمائی کے غیر آباد وادیوں میں گھومنے کے قائل نہیں ۔ کیونکہ قرآن کریم جو خبریں دیتا ہے وہ عالم الغیب کی خبریں ہیں اور اس سلسلے میں اسی حد پر جاکر رک جانا چاہئے جس کی تصریح قرآن کریم کرتا ہے اور مدلول نص پر مزید کوئی حاشیہ آرائی نہیں کرنا چاہئے ۔

زیادہ سے زیادہ ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تنور سے فوارہ چھوٹنا' خصوصاً جلتے ہوئے تنور سے' یوں ہو سکتا ہے کہ تنور سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑے یا اس کے اندر آتش فشانی کا عمل شروع ہو جائے اور یہ کہ یہ حضرت نوح ؑ کے لیے عذاب الہٰی اور خطرے کی آخری گھنٹی کے طور پر اللہ نے مقرر کیا تھا یا اللہ کے عذاب کی آمد کا یہ ایک حصہ تھا۔ اور بیک وقت زمین سے پانی ابلنا شروع ہو گیا اور آسمان سے موسلا دھار بارش برسنا شروع ہو گئی ۔

جب یہ واقعات شروع ہوئے تو اللہ نے حکم دیا کہ :

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (۱۱ : ۴۰) "ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو" ۔ عملی نظام کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت نوح ؑ کو ہر مرحلے کے لیے اپنے وقت پر احکام دیئے جائیں ۔ پہلے کہا کہ تم کشتی بناؤ تو وہ بنانے لگ گئے اور وہاں سیاق کلام میں یہ نہ بتایا گیا کہ یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے اور یہ بھی نہ کیا گیا کہ خود حضرت نوح کو اس کی اطلاع کر دی گئی ہے ۔

حَتَّى إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ (۱۱ : ۴۰) "یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور ابل پڑا تو" ۔ اور اس کے بعد دوسرے مرحلے کے لیے حکم دیا گیا :

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ

(۱۱ : ۴۰) "ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو' اپنے گھر والوں کو بھی --- سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے ۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں" ۔

اب زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ کے مفہوم میں بھی مفسرین کا اختلاف ہے ۔ اور ان میں بھی زیادہ تر اختلاف ذوق ہے اور اسرائیلی رنگ ہے ۔ اس لیے ہم اس آیت کے بارے میں بھی خیالی گھوڑے نہیں دوڑاتے کہ نوح ؑ نے کس قدر زندہ چیزوں کے جوڑے اپنے ساتھ لیے اور کن کے نہ لیے ۔ یہ محض اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات ہے ۔

وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ (۱۱ : ۴۰) "اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے" ۔ یعنی وہ لوگ جو سنت الہٰی کے مطابق مستحق عذاب ہو چکے ہیں ۔

وَمَنْ آمَنَ "اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے" ۔ یعنی تمہارے اہل و عیال کے علاوہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ۔

وَمَنْ اٰمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِيْلٌ (٤٠) وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا

اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (٤١)(١١: ٤٠ تا ٤١)) "اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح ؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوح ؑ نے کہا "سوار ہو جاؤ اس میں' اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی' میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یوں اللہ کا حکم نافذ ہوا اور جن کو ہلاک ہونا تھا' وہ ہلاک ہوئے۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا (١١: ٤١) کا مفہوم یہ ہے کہ اب یہ کشتی اللہ کی مشیت کے حوالے ہے۔ اس کا چلنا پانی کے اوپر اور پھر کسی مقام پر ٹھہرنا اللہ کے قوانین مشیت کے مطابق ہے۔ جب ناقابل کنٹرول لہریں اٹھتی ہیں تو ان میں انسان کی قوت کے حدود ختم ہو جاتے ہیں اور انسان اور کشتی طوفان کے حوالے ہو جاتے ہیں' پھر اللہ غفور و رحیم ہی فیصلے کرتا ہے۔

اب جو منظر آ رہا ہے وہ نہایت ہی خوفناک ہے یعنی طوفان اور کافروں کا غرق ہونا۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿٤٣﴾

"کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا: "بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا' کافروں کے ساتھ نہ رہ"۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا: "میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا"۔ نوح ؑ نے کہا: "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے"۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا"۔

یہاں دو خوف باہم ملتے ہیں: ایک خاموش طبیعت کا خوف اور ایک نفس بشری کا خوف۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (١١: ٤٢) "کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی"۔

ایسے خوفناک حالات حضرت نوح ؑ دیکھتے ہیں کہ ان کے بچوں میں سے ایک ان سے دور بھاگا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہو رہا۔ یہاں باپ کی خوابیدہ پدری شفقت جاگ اٹھتی ہے اور اس گمراہ بیٹے کو وہ پکار اٹھتے ہیں۔

وَ نَادٰی نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَ كَانَ فِیْ مَعْزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ

(٤٢:١١) ''نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا: ''بیٹا' ہمارے ساتھ ہو جا' کافروں کے ساتھ نہ رہ''۔

لیکن یہ نافرمان بیٹا اپنے شفیق باپ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ یہ نوجوان اور مغرور ہے' یہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ طوفان کس قدر شدید ہے اور کہتا ہے :

قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ (٤٣:١١) ''اس نے پلٹ کر جواب دیا: ''میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچالے گا''۔

لیکن شفیق باپ تو جانتے ہیں کہ یہ عذاب کس قدر ہولناک ہے اور وہ آخری اپیل کرتے ہیں''۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ (٤٣:١١) ''نوح ؑ نے کہا'' آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے''۔

اللہ کے عذاب کو نہ پہاڑ ٹال سکتے ہیں اور نہ غاروں میں کوئی اس سے چھپ سکتا ہے۔ نہ اس کے مقابلے میں کوئی حامی ہے اور نہ کوئی بچا سکتا ہے۔ صرف وہی بچ سکتا ہے جس پر اللہ کا رحم ہو جائے۔

وَ حَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ (٤٣:١١) ''اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا''۔ ہزارہا سال گزر چکے ہیں' آج بھی جب ہم اس ہولناک صورت حالات کا تصور کرتے ہیں۔ تو ہماری سانس رک جاتی ہے اور ہم پر اس قدر ہیبت طاری ہو جاتی ہے کہ گویا یہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ کشتی پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیاں ڈول رہی ہے۔ حضرت نوح ؑ بار بار اپنے بیٹے کو پکارتے ہیں اور ان کا مغرور بیٹا انکار کرتا جاتا ہے اور پہاڑ پر چڑھتا جاتا ہے۔ اچانک ایک عظیم پہاڑ جیسی موج آتی ہے اور چشم زدن میں قصہ تمام ہو جاتا ہے۔ سب کام ختم ہو جاتا ہے اب نہ پکار ہے اور نہ انکار ہے۔

اس خوفناک فضا کا تصور دو پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ پہلو ہے کہ والد اور بیٹے کے درمیان ایک حقیقی اور زندہ تعلق ہوتا ہے۔ اور دوسرا پہلو انسان کا طبعی مزاج ہے کہ طوفان پہاڑوں اور وادیوں کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد اب خود انسان کے بچوں کو لپیٹ میں لے رہا ہے۔ یہ دونوں قسم کے جذبات انسان کی شخصیت کے اندر موجود ہوتے ہیں اور قرآن کریم نے ان کی خوب تصویر کشی کی ہے۔

---o o o---

اب یہ طوفان تھم جاتا ہے۔ تلاطم میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو جاتا ہے اور جس طرح میدان واقعہ میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ اسی طرح الفاظ قرآن میں بھی ایک قسم کا ٹھہراؤ اور سکون آجاتا ہے۔

وَ قِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ الربع

"حکم ہوا" "اے زمین 'اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا"۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا' فیصلہ چکا دیا گیا' کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم!"

اب خطاب زمین و آسمان سے ہے۔ گویا وہ سمجھتے ہیں۔ دونوں تعمیل کرتے ہیں۔ زمین نے پانی کو چوسنا اور نگلنا شروع کر دیا اور آسمان نے برسانا چھوڑ دیا۔

وَ قِيْلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَ كِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۱۱ : ۴۴) "حکم ہوا" "اے زمین 'اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا"۔ چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا' فیصلہ چکا دیا گیا' کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم!" پانی زمین کے پیٹ میں چلا گیا اور سطح زمین معمول پر آگئی۔۔ اللہ نے جو کرنا تھا وہ انجام کو پہنچا اور یہ کشتی جودی پہاڑ پر آکر رک گئی۔۔۔۔ "اور یہ کہہ دیا گیا کہ دوری ہو ظالموں کی قوم کے لیے"۔ یہ ایک مختصر سا جملہ ہے لیکن نہایت ہی دو ٹوک اور فیصلہ کن انجام کا اظہار کرتا ہے۔ جس کے اندر بہت بڑی گہرائی ہے اور یہ اسلوب اظہار "کہہ دیا گیا" کہنے والے کا نام نہ لیا گیا۔ مطلب یہ کہ اس باب کو اب بند کر دیا گیا ہے اور بُعْدًا لِّلْقَوْمِ یعنی اب یہ نیست و نابود ہو گئے 'زندگی سے دور ہو گئے 'اللہ کی رحمت سے بہت دور جا پڑے اور اب وہ عوام کی یاد سے دور ہو گئے اور اقوام کی تاریخ سے ان کو حذف کر دیا گیا۔

---()()()---

جب یہ مصیبت دور ہو جاتی ہے' خوف کی حالت جاتی رہتی ہے اور کشتی جودی پہاڑ پر آکر رک جاتی ہے تو اب ایک حقیقی والد کے دل میں درد اٹھتا ہے اور وہ غم زیادہ ہو جاتا ہے۔

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

"نوح ؑ نے اپنے رب کو پکارا 'کہا" اے رب' میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے"۔ میرا بیٹا میرے خاندان میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے کہ میرے خاندان والوں کو بچایا جائے گا اور تو بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔ تیرے فیصلے حکمت اور تدبیر پر مبنی ہوتے ہیں۔

حضرت نوح ؑ یہ بات اس لیے فرما رہے تھے کہ اللہ نے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا فرمادے اور یہ وعدہ آپ کے اہل خاندان کی نجات کی بابت تھا۔ نیز حضرت نوح ؑ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ وعدے اور فیصلے کی بابت حکمت دریافت کریں۔

اس سوال کا جواب بہت ہی اہم ہے۔ یہ حقیقت حضرت نوح ؑ کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی کہ اللہ کے ہاں نیک و بد کا جو معیار ہے اس میں خون اور رشتہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں نظریاتی قرابت داری کی اہمیت ہے۔ آپ کا یہ لڑکا مومن نہ تھا لہٰذا یہ آپ کے خاندان کا فرد نہ رہا۔ آپ تو نبی اور مومن اول ہیں اور یہ جواب نہایت ہی فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں دیا گیا اور سخت تنبیہی اور باز پرسی کے انداز میں دیا گیا۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۗ اِنِّىْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

"جواب میں ارشاد ہوا "اے نوح ؑ، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے"۔

دین اسلام کا یہ ایک عظیم اصول ہے۔ وہ سررشتہ جس تک تمام تاریں پہنچتی ہیں وہ عقیدے کا سررشتہ ہے۔ اسلام میں ایک فرد اور فرد کے درمیان اصل تعلق عقیدے کا ہے۔ یہاں نسب اور قرابت داری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صٰلِحٍ (۱۱ : ۴۶) "اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے"۔ وہ آپ سے کٹ چکا ہے اور آپ اس سے کٹ چکے ہیں، اگرچہ وہ تمہارا حقیقی بیٹا ہے کیونکہ اسلام میں اصل تعلق اور رابطہ نظریاتی رابطہ ہے، اس کے علاوہ کوئی رابطہ اور قوت جامعہ اسلام میں معتبر نہیں ہے۔

حضرت نوح ؑ نے جن حالات میں دعا کی تھی وہ ایسے تھے کہ ان کی دعا منظور نہ ہوئی اس لیے اس کا جو جواب انہیں دیا گیا اس میں قدرے تہدید اور تنبیہہ بھی ہے۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّىْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۱۱ : ۴۶)

"لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے"۔ میں اس بات سے ڈر کر تمہیں تاکیدی نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں تم اسلامی روابط کی حقیقت اور اسلامی اخوت کی ماہیت کے سمجھنے میں غلطی نہ کر جاؤ یا اللہ نے جو وعدہ کیا تھا اس کے سمجھنے میں غلطی نہ کر بیٹھو۔ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو چکا ہے اور جو تمہارے اہالی و موالی تھے وہ سب نجات پا چکے ہیں اور یہ حقیقت ہے۔

اس تنبیہہ آمیز جواب کو سنتے ہی حضرت نوح ؑ کانپ اٹھتے ہیں جس طرح ایک حقیقی مومن اس وقت کانپ اٹھتا

ہے، جب اسے یہ سوچ آتی ہے کہ بارگاہ الٰہی میں اس سے کہیں غلطی اور گستاخی نہ ہو جائے۔ چنانچہ حضرت نوح فوراً توبہ و استغفار فرماتے ہیں :

قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِكَ أَنۡ أَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِي بِهِۦ عِلۡمٞۖ وَإِلَّا تَغۡفِرۡ لِي وَتَرۡحَمۡنِيٓ أَكُن مِّنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴿٤٧﴾

"نوح ؑ نے فوراً عرض کیا "اے میرے رب، میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا"۔

اللہ کی رحمت نے حضرت نوح ؑ کو ڈھانپ لیا، آپ کا دل مطمئن ہو گیا۔ آپ اور آپ کی نسل اور آپ کے ساتھی نجات پا گئے اور دوسرے لوگ نذر طوفان ہو گئے۔

قِيلَ يَٰنُوحُ ٱهۡبِطۡ بِسَلَٰمٖ مِّنَّا وَبَرَكَٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلَىٰٓ أُمَمٖ مِّمَّن مَّعَكَۚ وَأُمَمٞ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٞ ﴿٤٨﴾

"حکم ہوا "اے نوح ؑ، اتر جا، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں، اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جن کو ہم کچھ مدت سامان زندگی بخشیں گے، پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا"۔

معاملہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت نوح ؑ کو خوشخبری ملتی ہے۔ آپ کے ساتھی مومن نجات پاتے ہیں، اب ان سے ایک مومن نسل چلتی ہے۔ اور ان میں سے جو لوگ صرف بنیادی ترقی اور دنیاوی سازوسامان چاہتے تھے ان کو عذاب الیم کی خوشخبری دی جاتی ہے اور سورت کے ابتداء میں بھی یہی خوشخبری اور یہی ڈراوا تھا جو لوگوں کو بتایا گیا تھا۔ اور اسی مقصد کے لیے یہ قصص یہاں لائے گئے تھے تاکہ مثالوں اور مناظر پیش کر کے لوگوں کو سمجھایا جائے۔

---ooo---

آغاز سورت کے مقدمے اور پھر ان تمثیلات کے بعد نتیجہ یوں اخذ کیا جاتا ہے :

۴
تِلۡكَ مِنۡ أَنۢبَآءِ ٱلۡغَيۡبِ نُوحِيهَآ إِلَيۡكَۖ مَا كُنتَ تَعۡلَمُهَآ أَنتَ وَلَا قَوۡمُكَ
۱۴ع
مِن قَبۡلِ هَٰذَاۖ فَٱصۡبِرۡۖ إِنَّ ٱلۡعَٰقِبَةَ لِلۡمُتَّقِينَ ﴿٤٩﴾
۴

"اے نبی ؐ، یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ

تمہاری قوم - پس صبر کرو، انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے"۔

یہ آخری تبصرہ یہ بتاتا ہے کہ قرآن مجید میں قصص قرآن لانے کے اہداف و مقاصد کیا ہیں :

○ یہ کہ وحی منجانب اللہ ہے، جس کا مشرکین مکہ انکار کرتے تھے اور ان قصص سے وحی کا ثبوت اس طرح ہوتا ہے کہ عربوں یا کسی اور اقوام کے پاس ان نصوص کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ یہ غائبانہ قصے ہیں اور اس سے قبل تمام لوگ جانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کا کوئی ذریعہ علم نہ تھا۔ یہ حکیم اور خبیر کی طرف سے وحی آرہی تھی۔

○ دوسرا مقصد ان قصوں کے لانے سے یہ ہے کہ حضرت نوح ؑ جو انسانوں کے لیے آدم ثانی ہیں، سے لے کر آج تک تمام انبیاء کا نظریہ اور عقیدہ ایک ہی رہا ہے، تمام انبیاء کا عقیدہ بھی ایک رہا ہے اور الفاظ تعبیر بھی تقریباً ایک ہی رہے ہیں۔

○ ان قصص سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام مکذبین کے اعتراضات بھی ایک ہی نوعیت کے رہے ہیں حالانکہ ان کے سامنے آیات و دلائل پیش کیے گئے اور باوجود اس کے کہ پیغمبروں کی تاریخ میں یہ اعتراضات بار بار باطل ثابت ہو چکے ہیں لیکن بار بار انہی کو دہرایا جاتا ہے۔

○ یہ حقیقت بتانا کہ رسول کس بات کی خوشخبری دیتے ہیں اور کس سے ڈراتے رہے ہیں اور آج حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی باتوں کے بارے میں بشارت اور ڈراوا دکھاتے ہیں اور یہ تاریخی شہادت ہے حضور اکرم ؐ کی سچائی پر۔

○ اور یہ بتانا کہ اس کائنات میں وہ کیا سنت الٰہیہ ہے جو جاری و ساری ہے اور وہ کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کرتی اور نہ اس میں کسی رشتہ داری کا لحاظ ہوتا ہے اور خلاصہ یہ کہ انجام متقی لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ آخر کار سنت الٰہی کو کامیاب ہونا ہے۔

○ ان روابط کی حقیقت جو ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان اسلامی نظام میں پائے جائیں گے نیز ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان جو وجود میں آئیں گے یہ ہے کہ وہ صرف اسلامی عقیدہ ہے، جو تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیتا ہے، جن کا الٰہ ایک ہے اور جن کا رب اور حاکم اللہ وحدہ ہے اور اس میں اس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ کوئی مقابل۔

---○○○---

اب طوفان نوح ؑ کے بارے میں چند سوالات ہیں؟ پہلا سوال یہ ہے کہ آیا یہ طوفان پورے کرۂ ارض پر چھایا اس علاقے میں آیا تھا جس میں حضرت نوح ؑ مبعوث ہوئے تھے۔ یہ زمین کہاں تھی، قدیم دنیا میں اس کے حدود کیا تھے اور جدید دنیا میں اس کی حدود کہاں تک ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب محض ظن اور تخمین سے دیا جاتا ہے اور ظن اور تخمین سے یقین اور سچائی کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ یا پھر ان سوالات کا جواب اسرائیلیات سے ملتا ہے۔ اور اسرائیلیات بذات خود ایک مشکوک ریکارڈ ہے۔ نیز قرآن کریم نے جن مقاصد کے لیے قصے بیان کیے ہیں ان مقاصد کے حوالے سے ان سوالات کے جوابات کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے۔

البتہ قرآن کریم کے نصوص سے یہ اشارات ملتے ہیں کہ حضرت نوح ؑ کے زمانے میں تمام آبادی وہی تھی جس کی طرف حضرت نوح ؑ کو بھیجا گیا تھا اور حضرت نوح ؑ کی قوم جس علاقے میں آباد تھی، اس وقت انسانی آبادی اسی علاقے میں تھی اور طوفان نے اس تمام علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جس میں انسان آباد تھے۔ اور اس طوفان

کی زد سے وہی لوگ بچے تھے جو کشتی نوح علیہ السلام میں سوار تھے ۔

یہ عظیم کائناتی حادثہ جس کے بارے میں قرآن کریم نے ہمیں ' اطلاع دی جبکہ قرآن کریم واحد مصدقہ دستاویز ہے ' اور یہ عظیم حادثہ ہے بھی زمانہ ماقبل التاریخ کے دور کا ۔ اس کے بارے میں انسانی تحریری تاریخ خاموش ہے ۔ اس دور میں تو تاریخ کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا ۔ انسانی تاریخ تو دور جدید کی چیز ہے اور پھر تاریخ نے جو ریکارڈ تیار کیا ہے اس میں بھی غلطی کا پورا امکان ہے ' تاریخی واقعہ سچا بھی اور جھوٹا بھی ہو سکتا ہے ۔ ان واقعات کو جرح و تعدیل کے عقلی اصول کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے ۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ اس بارے میں کسی اور ذریعہ سے پوچھا جائے جبکہ ایک سچے خبر دینے والے نے اس بارے میں اطلاع دے دی ہو ۔ کیونکہ اگر ہم ایسے واقعات کے بارے میں کسی اور سے پوچھیں گے تو ہم الٹی گنگا بہائیں گے اور اس بات کو کوئی ایسی عقل تسلیم نہ کرے گی جس کے اندر دین کی حقیقت اچھی طرح بیٹھ چکی ہو ۔

اس وقت دنیا میں جس قدر اقوام آباد ہیں ' ان کی قدیم ' پیچیدہ اور غیر مصدقہ لٹریچر میں بھی طوفان نوح ؑ کا ذکر ملتا ہے ۔ ان تذکروں میں یہ کہا گیا ہے کہ قدیم زمانوں میں کسی وقت اس قسم کا ایک طوفان گزرا ہے ۔ اور یہ عظیم حادثہ ان اقوام کی نافرمانی اور جہالت کی وجہ سے پیش آیا تھا ۔ اور بنی اسرائیل کی مرتب کردہ کہانیوں میں جن کو وہ عہد قدیم کے نام سے پکارتے ہیں ' طوفان نوح کا تذکرہ موجود ہے ' لیکن قرآن کریم نے طوفان نوح ؑ کے بارے میں جو کچھ کہا اس کے ضمن میں ان اسرائیلی کہانیوں کا تذکرہ موزوں نہیں ہے ۔ اور قرآن کریم کی سچی اور صاف کہانیوں کے ساتھ ان مجہول الاصل ' پیچیدہ افسانوں کو نہیں ملانا چاہئے ۔ جن کی پشت پر کوئی سند نہیں ہے ۔ اگرچہ ان تمام کہانیوں سے ایک حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان اقوام کی سرزمین پر بھی طوفان آیا تھا یا یہ کہ اس طوفان سے کشتی نوح ؑ میں جو لوگ بچ گئے تھے اور ان کی اولاد جہاں جہاں بھی گئی تھی انہوں نے اپنے ساتھ ان یادوں کو سینہ بہ سینہ یہاں سے وہاں تک پھیلایا ۔ یوں ان لوگوں نے جہان کے اطراف و اکناف میں پھیل کر زمین کو آباد کیا ۔

یہاں یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لینی چاہئے کہ جس دستاویز کو کتاب مقدس کا نام دیا جاتا ہے ' چاہے وہ یہودیوں کی کتابوں پر مشتمل عہد قدیم یا عیسائی لٹریچر پر مشتمل عہد جدید ہو ' ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کی جانب سے نازل شدہ نہیں ہے ۔ اس لیے کہ تورات کا وہ نسخہ جو اللہ نے نازل فرمایا تھا ' اسے اہل بابل نے برباد کر کے اس کے اندر تحریف کر دی تھی ۔ اس دور میں جب انہوں نے تمام یہودیوں کو غلام بنا کر بابل منتقل کر دیا تھا ۔ حضرت عیسیٰ ؑ کی آمد سے قریباً پانچ صدیاں پہلے تک عہد قدیم کتابی شکل مین بھی دوبارہ مرتب نہ کیا جا سکا ۔ اسے عزرا کاہن نے مرتب کیا اور ممکن ہے کہ عزرا حضرت عزیر ہی ہوں ۔ انہوں نے تورات کے باقی ماندہ حصوں کو جمع کیا ۔ تورات کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ان کی تالیف ہے ۔ یہی حال اناجیل کا ہے ۔ ان میں بھی وہی مضامین مذکور ہیں جو حضرت مسیح ؑ کے شاگردوں کے حافظے میں محفوظ رہے تھے اور ان کو بھی تقریباً حضرت عیسیٰ ؑ کے اٹھائے جانے کے ایک صدی بعد لکھا گیا ۔ اس کے بعد بھی ان میں بے شمار قصے کہانیاں اور افسانے جمع کر دیئے گئے ۔ چنانچہ مسلمانوں کو ہدایت یہی ہے کہ وہ ان کتابوں کی کسی چیز کو بھی ہدایت نہ سمجھیں ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس قصے سے انسان کو کیا نصیحت حاصل ہوتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے اس میں عبرت کے کئی پہلو ہیں ۔ صرف ایک ہی عبرت نہیں ہے ۔ درج ذیل صفحات میں ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے اور اس کے بعد پھر حضرت ہود ؑ کے قصے کی طرف بات چل نکلے گی ۔

---ooo---

حضرت نوحؑ کے قصے سے ان کی قوم کے جو خدوخال معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ لوگ انتہائی درجے کے جاہل ہیں۔ وہ باطل پر سخت اصرار کرتے ہیں اور حضرت نوحؑ کی خالص دعوت کا مسلسل انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی دعوت یہ تھی کہ ہمارا خالق الٰہ واحد ہے۔ اور تمام انسانوں کا فرض ہے کہ وہ صرف اسی الٰہ واحد کی غلامی کریں اور اسے اپنا بادشاہ اور حاکم تصور کریں اور اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم نہ سمجھیں۔

قوم نوحؑ حضرت آدمؑ کی اولاد سے تھی اور حضرت آدمؑ کا قصہ اس سے قبل سورت اعراف میں مذکور ہو چکا ہے۔ اسی طرح سورت بقرہ میں بھی اس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ حضرت آدمؑ کو جنت سے زمین پر اس لیے اتارا گیا تھا کہ وہ اس زمین پر فریضۂ خلافت ادا کریں اور یہ وہ ذمہ داری ہے جس کی تمام صلاحیتیں اللہ نے حضرت آدم کے اندر پیدا کی ہوئی تھیں۔ حضرت آدم سے جنت میں جو لغزش ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کے لیے ان کو تعلیم دے دی تھی۔ انہوں نے اللہ سے کچھ کلمات سیکھے اور ان کی ادائیگی کے بعد اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ اور اس کے بعد اللہ نے ان سے ان کی بیوی سے اور ان کی اولاد سے وعدہ لیا تھا کہ جب بھی اللہ کی طرف سے ان کے پاس کوئی رسول ہدایت لے کر آئے گا تو وہ اس پر ضرور ایمان لائیں گے۔ اور یہ کہ وہ شیطان کی پیروی نہ کریں گے کیونکہ شیطان خود ان کا دشمن ہے' ان کی اولاد کا دشمن ہے اور قیامت تک کے لیے دشمن ہے۔

اب حضرت آدم جنت سے زمین پر ایک مسلمان کی حیثیت میں اترے' اللہ کی ہدایات کی اطاعت کرتے ہوئے اترے اور اس میں شک نہیں ہے کہ حضرت آدم نے نسلاً بعد نسل اپنی اولاد کو اسلام کی تعلیم دینے کا انتظام فرمایا ہو گا۔ اور یہ کہ اسلام ہی وہ پہلا اور حقیقی نظریہ حیات ہے جو انسانیت نے سیکھا اور اسے سکھایا گیا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے بالمقابل نہ کوئی دوسری نسل تھی اور نہ کوئی دوسرا عقیدہ تھا۔ اور جب حضرت آدمؑ کے صدیوں بعد حضرت نوحؑ تشریف لائے' اگرچہ آج ہمارے پاس کوئی ذریعہ علم نہیں ہے کہ حضرت آدمؑ کے کتنے عرصہ بعد حضرت نوحؑ تشریف لائے' تو اس عرصے میں آدم کی تمام اولاد نے اسلام کو ترک کر کے جاہلیت کا عقیدہ اختیار کر لیا تھا۔ اور اس جاہلیت کی تفصیلات اس قصے میں قرآن کریم نے دی ہیں۔ تو ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت کی موجودہ بت پرستیوں' دیومالائی کہانیوں' خرافاتی عقائد' بت پرستیوں' غلط تصورات اور غلط رسم و رواج کو انسان پر اس کے ماحول اور اس کی جاہلیت نے مسلط کی ہے۔ اور انسان پہلے جادۂ مستقیم پر تھا اور وہ شیطان لعین کی سعی نامشکور کی وجہ سے گمراہ ہو کر جاہلیت کا پیرو بنا ہے۔ یہ گمراہی اس پر اس لیے مسلط ہو گئی کہ شیطان کی بیرونی مساعی کے ساتھ ساتھ خود نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے بعض کمزوریاں رکھ دی تھیں اور ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر شیطان نے انسان کو گمراہ کیا جو اللہ کا بھی دشمن ہے اور انسان کا بھی ازلی دشمن ہے۔ اور شیطان انسان ہر اس وقت کامیاب حملہ کرتا ہے۔ جب انسان ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اللہ کی ہدایت کو مضبوطی سے پکڑے نہیں رکھتا۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے کسی قدر اختیار بھی دیا۔ اور انسان کا یہ اختیار تمیزی ہی اس کے لیے سبب ابتلا ہے۔ اگر وہ اپنے اس اختیار تمیزی کو درست طور پر اختیار کر کے صرف اللہ کی رسی اور ہدایت کو مضبوطی سے پکڑ لے تو اس کے دشمن شیطان کا انسان پر کوئی داؤ نہ چلے گا۔ اور انسان کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ اس ہدایت سے انحراف کرے اگرچہ وہ معمولی انحراف ہو اور جب انسان معمولی سا انحراف کر لے تو

شیطان پھر اسے اسلام اور راہ مستقیم سے بہت ہی دور پھینکتا ہے۔ اور آخر کار اسے مکمل طور پر جاہلیت کا پیرو کار بنا دیتا ہے۔ جس طرح حضرت نوح ؑ کی قوم نے جاہلیت کو اختیار کیا۔ اور یہ عمل صدیوں کے تغیرات کے بعد مکمل ہوتا ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

یہ حقیقت کہ اسلام وہ عقیدہ ہے جس سے یہ دنیا سب سے پہلے متعارف ہوئی اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ الہٰ ' حاکم ' مقتدر اعلیٰ ' اور رب صرف اللہ وحدہ ہے ' ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ نام نہاد علماء ادیان اور ان کے درمیان تقابلی مطالعہ کرنے والوں کا یہ نظریہ کہ عقیدۂ توحید در حقیقت ترقی کرتے کرتے اپنی موجودہ شکل کو پہنچا ہے اور اس موجودہ شکل سے پہلے یہ مختلف ادوار سے گزرا ہے۔ محض ایک مفروضہ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان لوگوں کے تصورات یہ ہیں کہ پہلے لوگ کئی راہوں کے قائل تھے۔ وہ طبیعی قوتوں کو الہٰ مانتے تھے ' پھر وہ ارواح کو الہٰ مانتے تھے ' پھر شمس و قمر اور مختلف ستاروں کو الہٰ مانتے تھے۔ ان لوگوں کے نظریات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے ادیان کو لوگوں کے نفسیاتی ' سیاسی اور ماحول کے حالات سے وابستہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ تو درپردہ ادیان سماوی کا انکار کرتے ہیں اور یہ بات لوگوں کے ذہن میں ڈالتے ہیں کہ دینی تصورات بھی مختلف مرحلوں سے گزر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچے ہیں اور ان تبدیلیوں اور ترقی میں زمانے کے ماحول کا دخل ہے۔ اس طرح یہ لوگ دراصل وحی الہٰی ' منصب رسالت کا انکار کرکے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام ادیان اور ان کے بنیادی تصورات بھی انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور انسانی فکر کا شاخسانہ ہیں۔

اب ذرا ان لوگوں کے طرز عمل کا جائزہ لیجئے جو ادیان سماوی کے بارے میں لکھتے ہیں اور جو ان مغربی اہل علم سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اسی لغزش میں مبتلا ہوتے ہیں اور یہ مستشرقین کے وضع کردہ طریقے کے مطابق تحقیقات کرتے ہیں اور وہ لاشعوری طور پر اس غلطی میں پڑ جاتے ہیں جس میں ان کے اساتذہ مستشرقین مبتلا ہوئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے مسلمان مصنفین اپنے زعم میں اسلام کی مدافعت کر رہے ہوتے ہیں اور اسلام کے حامی ہوتے ہیں لیکن در حقیقت یہ لوگ اسلام کی بیخ کنی کرتے ہیں اور اسلام کے ان اصل نظریات اور اعتقادات کی نفی کرتے ہیں جن کا اثبات پورے قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نہایت ہی وضاحت کے ساتھ اور نہایت ہی دو ٹوک الفاظ میں اس عقیدے کو ثابت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام مکمل اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد لے کر جنت سے زمین پر اترے تھے اور پھر صدیوں بعد حضرت نوح ؑ نے اولاد آدم کو اسی اسلام کی طرف دعوت دی جنہیں شیطان نے گمراہ کر کے بت پرستی میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ عقائد و نظریات مکمل توحید پر مبنی تھے۔ اور حضرت نوح ؑ کے بعد دوبارہ یہ شیطانی چکر چلا اور اس نے پھر لوگوں کو جاہلیت کی طرف لوٹا دیا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے رسول آتے رہے اور انسانیت کو پکڑ پکڑ کر پھر جادۂ مستقیم پر ڈالتے رہے۔ اور توحید مطلق پر مبنی نظریہ حیات انہیں عطا کرتے رہے۔ اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ کتب سماوی کے اندر مذکور صحیح اعتقادات کے اندر کسی قسم کی تبدیلی یا ترقی ہوئی ہے۔ البتہ اگر کوئی ترقی اور تبدیلی ہوئی ہے تو وہ ان قانونی نظاموں میں ہوئی ہے جو مختلف اوقات میں اسلامی نظریہ حیات پر قائم ہوئے۔ اگر جاہلیت کے عقائد میں سے کسی عقیدے میں تغیر اور ترقی ہوئی ہے تو اس سے یہ بات کس طرح ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی نظریہ حیات میں بھی ارتقاء کا عمل ہوا ہے۔ اور جاہلیت کے عقائد میں بھی اگر کوئی ارتقائی عمل ہوا ہے تو وہ بھی اسلام کے حقیقی عقیدۂ

توحید کے اثرات کی وجہ سے ہوا ہے' جو وقتاً فوقتاً نسلوں پر اثرانداز ہوتا رہا ہے اور باوجود اس کے کہ بعد کی نسلیں عقیدۂ توحید سے منحرف ہوتی رہی ہیں لیکن وہ تدریجاً عقیدۂ توحید کے قریب آتی رہی ہیں۔ رہا عقیدۂ توحید تو اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تاریخ کا قدیم ترین عقیدہ ہے اور یہ تمام بت پرستانہ عقائد سے پہلے موجود تھا۔ جب سے حضرت آدم نے اسے پیش کیا ہے۔ اسی وقت سے یہ ہمیشہ اپنی اصل شکل میں موجود رہا ہے۔ اس لیے کہ عقیدۂ توحید انسانی دماغ کا ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ جب سے انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور اسے عقیدۂ توحید سکھایا ہے اسی وقت سے یہ عقیدہ موجود ہے اور اسی وقت سے اپنی اس شکل میں موجود ہے۔ یہ سچائی ہے اللہ کی طرف سے آئی ہے اور پہلے ہی دن سے اپنی مکمل شکل میں ہے۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کو قرآن ایک اٹل حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے اور اسی حقیقت پر پورا اسلامی تصور حیات قائم ہے' اس لیے کوئی مسلم محقق خصوصاً وہ شخص جو اسلام کی مدافعت میں قلم اٹھاتا ہے' اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا اور نہ ان خطوط کے علاوہ کسی اور لائن پر تحقیق کر سکتا ہے کیونکہ ادیان کے بارے میں اہل عرب کے ہاں جو تصورات پائے جاتے ہیں وہ غلط ہیں اور ان کو ایک خاص مقصد کے لیے مدون کیا گیا ہے۔

یہاں فی ظلال القرآن میں ہم اس قسم کے غلط تصورات سے تفصیلی بحث نہیں کر سکتے' کیونکہ اس کے لیے میری ایک مستقل کتاب زیر ترتیب ہے جس کا عنوان ہو گا "موجودہ دور میں فکر اسلامی میں ضروری تصحیحات"۔ البتہ یہاں ہم بطور مثال ایک موضوع کو پیش کرتے ہیں کہ بعض محققین کیا کہتے ہیں اور قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ استاد عقاد اپنی کتاب "اللہ" میں لکھتے ہیں :

"انسان نے جس طرح علوم میں ترقی کی ہے اسی طرح عقائد میں ترقی کی ہے۔ اور جس طرح اس نے علوم میں ترقی کی ہے اسی طرح صنعتوں میں ترقی کی ہے۔ ابتدائی دور میں جس طرح اس کی زندگی تھی اسی طرح اس کے عقائد بھی تھے۔ یہی حالت اس کے علوم اور صنعتوں کی ہے۔ لہذا اس کے ابتدائی دور کے علوم اور صنعت اس کے ابتدائی دور کے ادیان اور عبادات سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے اندر حقیقت کے عناصر کسی اور کے اندر پائے جانے والے حقیقت کے عناصر سے زیادہ نہیں ہیں"۔

"یہ بات قرین قیاس ہے کہ دین کے معاملے میں انسانی کاوشیں' علوم اور صناعات کے میدان میں انسانی کاوشوں سے بہت زیادہ رہی ہیں"۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کائنات کی عظیم سچائی تک پہنچنا بہت زیادہ مشکل کام ہے بمقابلہ ان متفرق اشیاء اور مفردات کی حقیقت تک رسائی کے' جن تک رسائی محض علمی یا محض صنعتی مطلوب ہو"۔

"ذرا دیکھیے کہ سورج روز طلوع ہوتا ہے اور یہ اس کائنات کی ان چیزوں میں سے ہے جو بالکل ظاہر ہیں اور جسے انسانی جسم محسوس کرتا ہے اور ماضی قریب تک اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات یہ تھے کہ یہ سورج زمین کے ارد گرد پھرتا ہے اور علماء فلکیات سورج کی حرکات اور اس کے حالات کے بارے میں ایسی تفسیرات بیان کرتے تھے جس طرح پہیلیوں کی تشریح کی جاتی ہے یا محض تخیلات کو بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن کسی شخص کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ سورج کا سرے سے انکار کر دے۔ اس لیے کہ لوگوں کے سورج کے بارے میں جو خیالات تھے وہ تاریکیوں کے تہ بہ تہ پردوں میں

تھے اور شاید اب بھی سورج کے بارے میں لوگ تاریک خیالی میں مبتلا ہوں"۔

"لہٰذا قدیم جاہلیت کے ادوار میں لوگوں کا اصول دین کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ دینداری کی کوئی حقیقت نہیں ہے یا یہ کہ دین داری محالات پر طبع آزمائی کرتی ہے۔ مطالعہ ادیان سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے عظیم سچائی یکبارگی ظاہر نہیں ہوئی اور وہ کسی ایک ہی زمانے میں حقیقت کبریٰ کو نہیں سمجھ سکے۔ لوگ عظیم حقیقت کے سمجھ سکنے کے لیے زمانے گزرنے کے بعد تیار ہوئے اور اس راہ میں انہیں طویل راستے طے کرنے پڑے اور وہ مختلف اسالیب سے غور کر کے اس حقیقت تک پہنچے جیسا کہ وہ دوسرے چھوٹے حقائق تک بھی صدیوں کے غور و فکر کے بعد پہنچے بلکہ انسانی حس اور قوت مدرکہ نے اپنی قوت سے کہیں زیادہ عجیب و غریب حقائق بڑی صبر آزما جدوجہد کے بعد دریافت کیے"۔

"ادیان کے تقابلی مطالعہ کے موضوع نے بے شمار وہ حقائق غلط ثابت کر کے رکھ دیئے ہیں جن پر ابتدائی دور کے انسان ایمان لاتے تھے اور آج بھی دنیا کے پسماندہ قبائل میں ان لوگوں کے بقایا اور نمونے موجود ہیں بلکہ ان متمدن اقوام کے اندر بھی ایسے لوگ پائے جاتے جن کی تہذیب و تمدن کی خاصی طویل تاریخ ہے۔ علم تقابل ادیان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ ابتدائی دور کے ادیان ان جہالتوں اور گمراہیوں سے خالی ہوں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہی وہ معقول نتیجہ ہے جس کی توقع کسی بھی معقول انداز فکر سے کی جا سکتی ہے۔ اس اسلوب فکر کے اندر کوئی ایسی تعجب انگیز بات بھی نہیں ہے جسے کوئی اہل علم بعید از قیاس سمجھے یا دین کی حقیقت اور اصلیت کے بارے میں کوئی نیا نظریہ اپنالے۔ علمائے ادیان کے جو محققین اس تلاش میں ہیں کہ ابتدائی ادیان میں کوئی ایسی حقیقت بھی پائی جاتی تھی یا ان کے ہاں سچائی کا کوئی ایسا تصور بھی موجود تھا جو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک ہو تو ایسے محققین محال کی تلاش میں سرگرداں ہیں"۔

اس کتاب کی فصل "تصور خدا میں ارتقاء" میں وہ لکھتے ہیں:

"علماء تقابل ادیان اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی زمانے کی اقوام کے ہاں جو تصور دین تھا اس میں تصور خدا اور تصور رب تین مراحل سے گزرا۔ پہلے دور میں متعدد الہوں (Poly theism) کا تھا۔ اس کے بعد دوسرے دور میں لوگوں نے ان الہوں اور ارباب کے درمیان فرق و امتیاز کیا اور کسی کو کسی پر ترجیح (Heno therism) دی۔ اور سب سے آخر میں واحدانیت (Mono theism) کا دور آیا"۔

"تعدد ارباب کے ابتدائی دور میں دسیوں بلکہ سینکڑوں ارباب اور الٰہ تھے۔ اس دور میں ہر خاندان اور ہر قبیلے کا اپنا الٰہ ہوا کرتا تھا۔ یہ الٰہ یا تو بذات خود الٰہ تصور ہوتا تھا یا نائب الٰہ ہوتا اور لوگ اس کی پناہ مانگتے تھے اور یہ الٰہ قربانیاں اور عبادات قبول کرتا تھا۔

دوسرا دور جو دور تمیز و ترجیح کہلاتا ہے 'اگرچہ اس میں الٰہ اور ارباب متعدد ہی رہے لیکن ان میں سے بعض ارباب اور الٰہ متعدد اسباب کی وجہ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہو گئے۔ مثلاً یوں کہ اگر کوئی قبیلہ علاقے اور ملک میں سیاسی طور پر چھا گیا تو اس کا معبود بھی علاقے میں چھا گیا۔ اور اس الٰہ سے لوگ معاشی حاجات اور آفات و بلیات سے بچاؤ کی مدد مانگتے تھے۔ بعض الٰہ اس لیے نمایاں ہو گئے کہ لوگوں کے زعم کے مطابق وہ زیادہ لوگوں کے لیے زیادہ

مفید تھے اور دوسرے الٰہوں کے مقابلے میں وہ انسان کے زیادہ مطالبات پورے کرتے تھے۔ مثلاً بارش کا دیوتا' اس علاقے میں بہت مانا جاتا جہاں بارش کی ضرورت ہوتی تھی یا جن سے ڈر زیادہ ہوتا تھا مثلاً مصائب کے الٰہ یا طوفان باد و باراں کا الٰہ' یعنی جہاں ڈر ہوتا لوگ اس سے ڈر کے الٰہ سے ڈرتے اور جہاں امید ہوتی لوگ اس الٰہ سے امید رکھتے' غرض اس کائنات میں دوسرے طبعی مظاہر کے مطابق الٰہوں کا تصور بھی قائم ہوتا"۔

"تیسرے دور میں جب قبائل اقوام و امم کی شکل اختیار کر گئے ہیں تو اب ارباب متفرقہ کے ہوتے ہوئے انہوں نے ایک مشترکہ عبادت کا طریقہ ایجاد کر لیا اور مختلف علاقوں اور مختلف اقوام کے ہاں عبادت کے مختلف طریقے رائج ہو گئے۔ اس دور کی خصوصیت یہ بھی رہی کہ جس طرح ایک قوم دوسری اقوام پر اپنا اقتدار اور قیادت و سیادت اور کلچر مسلط کرتی اسی طرح ان پر اپنا طریقہ عبادت بھی مسلط کرتی۔ بعض اوقات مغلوب کے الٰہوں کو یہ حکمران تسلیم کر لیتے تھے جس طرح کوئی بادشاہ اپنے حاشیہ نشینوں کی کوئی بات مان لیتا ہے اس طرح تابع اور متبوع کا تعلق باہم قائم رہتا"۔

"اس کمزور قسم کے ذہنی اتحاد تک بھی کوئی قوم ایک طویل تہذیبی جدوجہد کے بعد پہنچتی ہے۔ اور اس کے بعد پہنچی جب اس کے اندر علم و معرفت کی ایک وافر مقدار پیدا ہو گئی اور اس علم و معرفت کی بدولت انسان کے لیے خالص جاہلانہ تصورات کا قبول کرنا مشکل ہو گیا۔ اب انسان نے اپنے سابقہ تصورات کے ملبے میں سے اچھے اور اللہ کی پاکی اور قدوسیت کے قریب تر صفات کے ساتھ اللہ کو متصف کرنا شروع کر دیا۔ عبادت کے اندر اس کائنات کے اسرار و رموز کو بھی شامل کر دیا گیا۔ اور اس کائنات کے پیچھے کام کرنے والی گہری حکمت کی بات بھی ہونے لگی۔ اور ان اقوام و ملل کے اندر اللہ کو حقیقی مقام ربوبیت دیا جانے لگا۔ اور دوسرے تمام اچھے درجے کے الٰہوں کو فرشتوں کا مقام دیا جانے لگا یا ان کو ایسے خدا قرار دیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے حظیرۂ قدس سے دھتکارے گئے تھے یعنی جو برے تھے"۔

درج بالا اقتباسات میں مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو یا ان علماء کے خیالات نقل کیے گئے ہیں جو اپنے لیے اپنے عقائد خود ہی گھڑتے ہیں' بہرحال یہ خیالات اسلام کے خلاف ہیں کیونکہ ان لوگوں کے دینی تصورات میں انسان کے عقلی' علمی' تہذیبی اور سیاسی واقعات دخیل نظر آتے ہیں۔ اور ان کے سلسلہ خیال کے مطابق ترقی یوں ہوئی ہے کہ لوگ شرک اور بے شمار الٰہوں کے قائل ہونے کے بعد توحید کی طرف لوٹے ہیں اور یہ بات مؤلف کے مقدمہ کتاب کے پہلے فقرے ہی سے واضح ہے جس میں وہ کہتے ہیں: "اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ انسان نے عقیدۂ الٰہ کس طرح اختیار کیا۔ جب انسان نے اپنے لیے مختلف الٰہوں کو رب تسلیم کیا' پھر اس نے اللہ وحدہ کو دریافت کیا اور پھر وہ عقیدۂ توحید کی پاکیزگی میں داخل ہوا"۔

یہ تو ہیں دور جدید کے علمائے ادیان اور کتاب "اللہ" کے مصنف کے خیالات۔ اس کتاب میں مصنف دور جدید کے علمائے تقابل ادیان سے متاثر نظر آتے ہیں حالانکہ اللہ نے دین کی اصلیت کے بارے میں اس سے بالکل علیحدہ اور دو ٹوک بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت آدم جو ابوالبشر ہیں پوری طرح حقیقت توحید کو جانتے تھے اور ان کا عقیدۂ توحید اسی طرح صاف اور ستھرا تھا جس طرح حضرت محمدؐ کا تھا اور اس میں شرک کوئی آلودگی نہ تھی' اس میں کوئی تعدد اور ثنائیت نہ تھی۔ حضرت آدم براہ راست اللہ سے ہدایت لیتے تھے۔ اور صرف اللہ کی ہدایات کے تبع تھے اور حضرت آدم نے اپنی اولاد کو یہی پاک صاف تعلیم دی۔ لہٰذا انسان کی قدیم ترین تاریخ میں ایسی نسلیں تھیں جو اسلام کے بغیر کسی اور دین سے

واقف ہی نہ تھیں۔ ان کا عقیدہ صرف عقیدۂ توحید تھا۔ ہاں جب آدم کے بعد ان کی اولاد پر ایک طویل عرصہ گزرا تو کی اولاد نے عقیدۂ توحید سے انحراف اختیار کر لیا۔ بعض اوقات انہوں نے دو خداؤں کا اور بعض اوقات متعدد خداؤں کا نظریہ اپنایا۔ اور متعدد الٰہوں کا دین اختیار کر لیا۔ اس کے بعد حضرت نوح ؑ مبعوث ہوئے اور انہوں نے پوری نسل انسانی کو از سرنو عقیدۂ توحید پر قائم فرمایا اور جو لوگ شرک کرتے تھے اور نظام جاہلیت پر مصر تھے' ان سب کو طوفان نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اس طوفان سے صرف ان لوگوں نے نجات پائی جو پاک و صاف توحید کو جانتے تھے۔ اور وہ دو خداؤں یا بے شمار الٰہوں اور متعدد ارباب کے دین سے بیزار تھے۔ اس تاریخ کے مطابق ہم پر فرض ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ ایک عرصے تک کشتی نوح کے سواروں کی اولاد توحید مطلق کے عقیدے پر قائم رہی۔ ایک طویل عرصہ کے بعد انہوں نے پھر عقیدۂ توحید کو ترک کر کے شرک اور بت پرستی کو اپنایا۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں جو رسول مبعوث کیے گئے ان سب کا مشن قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ "اور آپ سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے' اس کی طرف ہم نے وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ و حاکم نہیں ہے اس لیے صرف میری پیروی کرو"۔ اب یہ بات واضح ہے کہ اگر اللہ کی کتاب کسی معاملے کو ایک فیصلہ کن انداز میں بیان کر دے اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اسی بات کو بالکل متضاد صورت میں پیش کرے تو ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ صرف اللہ کے قول کی اطاعت کرے۔ خصوصاً ایسا شخص جو بزعم خود اسلام کی مدافعت کر رہا ہو' اور وہ یہ بتاتا ہو کہ وہ اسلام اور دین کے بارے میں اساسی شبہات کو دور کرنے کے موضوع پر کلام کر رہا ہے۔ یہ بات ہر لکھنے والے کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ اس دین کی کوئی خدمت نہیں ہے کہ اس بات کا سرے سے انکار کر دیا جائے کہ دین اسلام اللہ کی طرف سے بذریعہ وحی آیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ اس دین کو اس حد تک خود انسان نے پہنچایا ہے۔ انسان نے نہیں بلکہ ابتدائے آفرینش سے اللہ نے انسان کو عقیدۂ توحید بذریعہ وحی سکھایا۔ اور اللہ نے انسان کو کسی دور میں بھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ عقیدۂ توحید کے علاوہ کوئی اور عقیدہ اختیار کرے نہ اس مضمون کی کوئی رسالت اللہ نے بھیجی ہے۔ نہ اس قسم کے نظریات کا پیش کرنا کسی معنی میں بھی اسلام کی کوئی خدمت ہے۔ خصوصاً اس حال میں کہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہو کہ علمائے تقابل ادیان اسلام کے خلاف ایک خاص منصوبہ بندی اور ایک خاص لائن پر کام کرتے ہیں اور اسلام کے بنیادی تصورات کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ جبکہ اسلام کا بنیادی تصور ہی یہ ہے کہ اسلام اللہ کی جانب سے وحی پر مبنی ہے اور یہ انسان کے ترقی پذیر فکر کا نتیجہ نہیں ہے جس طرح مادی میدان میں انسان نے آہستہ آہستہ تجربات حاصل کر کے علمی ترقی کی۔

اس نکتے پر یہ مختصر نوٹ' امید ہے کہ اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے کافی ہو گا۔ اس سے زیادہ طویل بحث ہم یہاں فی ظلال القرآن میں نہیں کر سکتے۔ غرض ایسے اساسی تصورات اور موضوعات پر ہم کسی غیر اسلامی سرچشمے سے کوئی ہدایت نہیں لے سکتے اور ہمیں اس مختصر بحث سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو لوگ ایسے حساس موضوعات پر مغربی افکار پڑھتے ہیں اور مغربی مفکرین کی نہج پر تحقیقات کرتے ہیں وہ کس قدر صحیح راہ سے دور چلے جاتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے

ہیں کہ وہ اسلام کا دفاع کرتے ہیں حالانکہ

انَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ "قرآن ہی مضبوط ہدایت و رہنمائی فراہم کرتا ہے"۔ اب حضرت نوح ؑ کے قصے کا ایک دوسرا پہلو ذرا مزید رکیے ۔ نئی بات یہ ہے کہ اللہ حضرت نوح ؑ کے حقیقی بیٹے کے بارے میں فرماتا ہے کہ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔

اسلام کے نظریاتی اور تحریکی سفر کا یہ ایک اہم پڑاؤ ہے ۔ ایک اہم موڑ ہے اور اس پر رک کر غور کرنا نہایت ہی ضروری ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۶) وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ (۳۷) (۱۱:۳۶ - ۳۷) "نوح ؑ پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے بس وہ لا چکے 'اب کوئی ماننے والا نہیں ہے ۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں"۔

حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ وَ مَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ (۱۱:۴۰) "یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا" ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو' اپنے گھر والوں کو بھی --- سوائے ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے ۔ اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں"۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح ؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے"۔

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَ نَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (۴۲) قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (۴۳) (۱۱:۴۲ - ۴۳) "کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی ۔ نوح ؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا ۔ نوح ؑ نے پکار کر کہا :" بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا' کافروں کے ساتھ نہ رہ"۔ اس نے پلٹ کر جواب دیا :" میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا"۔ نوح

نے کہا: "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے" ۔ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا" ۔

وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ
اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ (۴۵) قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صٰلِحٍ فَلَا تَسْـَٔلْنِ
مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ (۴۶) قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ
اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ

(۴۷) (۱۱:۴۵ - ۴۷) "نوح نے اپنے رب کو پکارا" اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے ۔ جواب میں ارشاد ہوا" اے نوح "، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے ۔ نوح نے فوراً عرض کیا "اے میرے رب، میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں ۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا" ۔

وہ تعلق اور اساس جس پر اس دین میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور بکھرتے ہیں وہ ایک منفرد اساس ہے وہ صرف دین اسلام میں پائی جاتی ہے ۔ اور اس کا تعلق ان آفاق و ابعاد سے ہے جن کے اندر وہ وسعتیں ہیں جو اس ربانی نظام حیات کے سوا کسی اور نظام میں نہیں ہیں ۔

یہ رابطہ، خون اور نسب کے رشتے پر مبنی نہیں ہے ۔ یہ رشتہ مشترکہ زمین، مشترکہ وطن کا بھی نہیں ہے، یہ قوم اور خاندان کا رشتہ بھی نہیں ہے، یہ زبان اور رنگ کا رشتہ بھی نہیں ہے ۔ یہ نسل اور طبقے کا رشتہ بھی نہیں ہے ۔ یہ طبقات اور پیشوں کا رشتہ بھی نہیں ہے ۔ یہ سب رشتے بعض اوقات موجود ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے درمیان قطع تعلق اور دشمنی ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندے حضرت نوح سے فرمایا کہ (یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ) "اے نوح یہ تیرے خاندان سے نہیں" اور یہ اس وقت فرمایا جب انہوں نے استفسار فرمایا ۔ (رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ) "اے میرے رب، میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے ہے" ۔ اور اس کی توجیہ یہ فرمائی (اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ) "یہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے" ۔ اس لیے کہ تمہارے درمیان جو حقیقی رشتہ تھا وہ رشتہ ایمان تھا اور یہ رشتہ کٹ گیا ہے ۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۱:۴۶) "لہٰذا مجھ سے ایسے سوال نہ کرنا جن کا تمہیں علم نہیں ہے ۔ تم تو یہ سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے خاندان کا فرد ہے ۔ لیکن تمہاری یہ سمجھ غلط ہے ۔ حقیقی بات یہ ہے کہ وہ تمہارے اہل خاندان میں سے نہیں رہا ہے ۔ اگرچہ صلبی اعتبار سے وہ تمہارا بیٹا ہے ۔

انسانی روابط و تعلقات اور جاہلی روابط و تعلقات کی شاہراہ کے اس اہم موڑ پر یہ نکتہ ایک سنگ میل ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی روابط کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے ۔ یہ جاہلیت کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی انسانی سوسائٹی کے باہم روابط کو خون اور نسب کی بنیاد پر استوار کرتی ہے ۔ کبھی زمین و وطن کی اساس پر رابطے بناتی ہے ۔ کبھی قوم اور خاندان کی اساس پر بناتی ہے ۔ کبھی رنگ اور زبان کی اساس پر بناتی ہے ۔ کبھی نسل اور طبقات کی بنیاد پر استوار کرتی ہے ۔ کبھی ہنر اور پیشہ کی بنیاد پر یہ تعلقات استوار کرتی ہے ۔ اور کبھی یہ تعلقات مشترکہ مفادات پر استوار ہوتے ہیں ۔ کبھی مشترکہ تاریخ پر اور کبھی مشترکہ انجام پر ۔ یہ سب جاہلی تصورات ہیں اگرچہ بظاہر یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ سب کے سب اپنی حقیقت اور مزاج کے اعتبار سے اسلامی تصورات کے خلاف ہیں ۔

اسلامی نظام حیات جو نہایت ہی مستحکم نظام ہے ' اور جس کی دعوت قرآن کریم دیتا ہے اور حضرت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیمات اور احادیث پر وہ نہایت ہی مشرح ہے ۔ یہ نظام امت مسلمہ کو یہ تربیت دیتا ہے کہ وہ اپنے اجتماعی روابط کو صرف عظیم تر سچائی کی اساس پر استوار کرے ۔ اور اس کے لیے نہایت ہی واضح اور مضبوط نشانات راہ متعین کرے ۔

قصہ نوح میں والد اور بیٹے کی مثال دی گئی ہے اور یہی حکم ہے ان تمام دوسرے جاہلی تعلقات کا ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں صرف ایمانی اخوت کی اساس پر قائم ہونے والے تعلقات ہی معتبر ہیں اور تمام دوسری بنیادوں پر استوار ہونے والے تعلقات مسترد ہیں ۔

○ اللہ تعالیٰ نے والد اور اس کے بیٹے کے درمیان پائے جانے والے تعلقات و روابط کی ایک دوسری مثال بھی دی ہے ۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے والد کے درمیان جو واقعہ پیش آیا یعنی ان کی قوم کے نظریات کے حوالے سے اسے قرآن کریم نے یوں کہا ہے :

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۴۱) اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (۴۲) يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (۴۳) يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (۴۴) يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا (۴۵) قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (۴۶) قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (۴۷) وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا (۴۸) فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ

وَ يَعْقُوْبَ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (٤٩) وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا (٥٠) (١٩ : ٤٠ تا ٥٠) "اور کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو' بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ "اباجان' آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں' نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ اباجان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' آپ میرے پیچھے چلیں' میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ اباجان آپ شیطان کی بندگی نہ کریں' شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔ اباجان مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمان کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں"۔ باپ نے کہا: "ابراہیم 'کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا"۔ ابراہیم نے کہا: "سلام ہے آپ کو' میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا' امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر' نامراد نہ ہوں گا"۔ پس جب وہ ان لوگوں سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچی ناموری عطا کی"۔

○ اور اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور اولاد ابراہیمؑ کی مثال بھی دی گئی۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ بات اللہ نے اس وقت سمجھائی جب اللہ اور حضرت ابراہیم کے درمیان عہد طے پا رہا تھا اور اللہ ان کے ساتھ یہ عہد کر رہا تھا کہ ان کو زمین کا اقتدار اعلیٰ دیا جا رہا ہے اور حضرت ابراہیم نے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ یہ منصب اور مقام میری اولاد میں بھی باقی رہے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (٢ : ١٢٤) "یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا' تو اس نے کہا: "میں تجھے سب لوگوں میں پیشوا بنانے والا ہوں' ابراہیم نے عرض کیا: "اور کیا میری اولاد سے بھی یہی عہد ہے" اس نے جواب دیا: "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے؟"

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (٢ : ١٢٦) "اور یہ کہ ابراہیم نے دعا کی' اے میرے رب' اس شہر کو امن کا شہر بنا دے' اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں' انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے"۔ جواب میں اس کے رب نے فرمایا: "اور جو نہ مانے گا چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا' مگر آخر کار اسے عذاب جہنم کی طرف

گھسیٹوں گا اور وہ بد ترین ٹھکانا ہے"۔

○ اس کے لیے خاوند اور بیوی کے درمیان موجود خاص تعلق کی مثال بھی دی گئی ' حضرت نوح ؑ اور ان کی بیوی کا واقعہ ' حضرت لوط اور ان کی بیوی کا واقعہ اور فرعون اور اس کی بیوی کا واقعہ پیش کر کے وضاحت کی گئی :

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ، اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (٦٦ : ١٠ — ١١) "اللہ تعالیٰ کافروں کے معاملے میں نوح اور لوط کی بیویوں کو بطور مثال پیش کرتا ہے ۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں 'مگر انہوں نے اپنے ان دو شوہروں سے خیانت کی اور وہ اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ بھی نہ کام آ سکے ۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ اور اہل ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے جبکہ اس نے دعا کی "اے میرے رب میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے"۔

○ اللہ تعالیٰ نے مومنین اور ان کے خاندانی تعلقات کے بارے میں بھی ایک مثال دی ۔ ان کی قوم اور وطن کے بارے میں بھی تمثیلات دیں ۔ ان کی زمین اور ان کے علاقوں کے متعلق مثالیں بھی دیں ۔ ان کے اموال و مفادات کی بھی تمثیلات پیش کی ۔ ان کی تاریخ اور انجام کے بارے میں بھی مثال دی ۔ مثلاً حضرت ابراہیم اور ان کی قوم کی مثال ' اصحاب کہف اور ان کی قوم کا واقعہ جس میں ایک نظریاتی انسان کا تعلق اپنی قوم اور ملک کے حوالے سے بتایا گیا ہے ۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ ——— (٦٠ : ٤) "تم لوگوں کے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف صاف کہہ دیا "ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو' قطعی بیزار ہیں"۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (٩) اِذْ اَوَى الْفِتْیَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

(۱۰) فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (۱۱) ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (۱۲) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًی (۱۳) وَّ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا (۱۴) هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا (۱۵) وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَی الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۶) (۱۸ : ۹ تا ۱۶)) "کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی نشانیوں میں سے تھے' جب وہ چند نوجوان غار میں مقیم ہوئے اور انہوں نے کہا: "اے پروردگار' ہم کو اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے"۔ تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا۔ پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں کہ دو گروہوں میں سے کون انکی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے اور ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اٹھے اور انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بے جا بات کریں گے' یہ ہماری قوم تو رب کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ ان کے معبود ہونے پر کوئی دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودان غیراللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سرو سامان مہیا کرے گا"۔

یہ تمثیلات' جو انسان کے طویل تاریخی سفر کے نشیب و فراز سے انسانوں کے برگزیدہ گروہ' یعنی جماعت انبیاء کی سیرت اور طرز عمل سے امت مسلمہ کے لیے پیش کی گئیں' ان کے پیش کرنے کا واحد مقصد صرف یہ ہے کہ یہ امت اپنے لیے نشانات راہ متعین کر لے اور ان سنگ ہائے میل میں سے جو نشان زیادہ ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلق اور ربط کیا ہے جس کے ذریعے کسی اسلامی سوسائٹی کو باہم مربوط کیا جا سکتا ہے اور اس کے سوا تمام رابطے اسلامی سوسائٹی میں مسترد اور مردود ہیں۔ چنانچہ ان مثالوں کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت سے اللہ نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس جادۂ مستقیم پر پختگی سے جم جائیں' ان کی یہ علامت ربط بالکل ان کے اندر واضح ہو۔ ان تمثیلات میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں بیان ہوا ہے' یہ تو چند نمونے تھے جو یہاں پیش کر دیئے گئے' مزید نمونے

ملاحظہ ہوں :

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ
كَانُوْآ اٰبَآئَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ
الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(۵۸ : ۲۲) ”تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور ' آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں ' وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے ' خواہ وہ ان کے باپ ہوں ' یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے ۔ اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے ۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں خبردار رہو ' اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں“ ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ
وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ
رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ
وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَ مَآ اَعْلَنْتُمْ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ

(۶۰ : ۱) ”اے لوگو ' جو ایمان لائے ہو ' اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر نکلے ہو ' تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو ' حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کے ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو ۔ تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو ' حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور علانیہ کرتے ہو ' ہر چیز کو میں جانتا ہوں ۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا ۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

بَصِيْرٌ (٦٠ : ٣)) "قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمہاری اولاد۔ اس روز اللہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمہارے اعمال دیکھنے والا ہے"۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (٩ : ٢٣) (٩ : ٢٣)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے"۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (٥ : ٥١) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی انہیں میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی راہنمائی سے محروم کر دیتا ہے"۔

غرض اسلامی سوسائٹی میں اجتماعیت کے قیام کے لیے اس نظریاتی اساس کو دوٹوک انداز میں متعین کر دیا گیا اور یہ نظریاتی عنصر اس سوسائٹی کا وہ بنیادی عنصر ہے جو اسے قدیم جاہلی سوسائٹیوں سے اور جدید جاہلی سوسائٹیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اور یہ اصول قیامت تک کے لیے ثبت ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے معاشرے کے لیے اس اساس کے مقابلے میں کوئی اور اساس رکھے اور پھر وہ ایمان کا بھی دعویٰ کرے۔ اور جو لوگ ایمان کا دعویٰ بھی کرتے ہیں' مسلمان بھی کہلاتے ہیں اور اپنے ہاں اجتماعیت کا مدار ان جاہلی تصورات پر رکھتے ہیں جن کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ ایسے لوگ یا تو سرے سے اسلام کی حقیقت سے ناواقف ہیں یا وہ اسلام کے منکر ہیں۔ دونوں صورتوں میں اسلام ایسے لوگوں کے اس لقب کو تسلیم نہیں کرتا جو یہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اسلامی نظریہ حیات کو نہیں بلکہ جاہلی نظریات کو قائم کرتے ہیں اور ان کا پرچار کرتے ہیں۔

یہ اصول تو اب واضح ہو گیا اور اسے ہم یہاں چھوڑتے ہیں۔ اب ہم ذرا اس حکمت پر بحث کرتے ہیں جو اللہ نے اسلامی سوسائٹی کو نظریاتی بنیادوں پر استوار کرنے کے معاملے میں اختیار کی۔

(ایمان اور نظریہ انسان کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے کیونکہ حیوانات کی تخلیق جن عناصر سے کی گئی ہے عقل و خرد اور سوچ اور نظریہ ان سے ایک زائد عنصر ہے۔ یہ ایک روحانی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان' انسان قرار پایا اور وہ حیوان سے ممتاز ہو گیا۔ مادیت کے اندر گم گشتہ اور پرلے درجے کے ملحدین نے بھی اب اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عقل و خرد اور روحانیت ہی وہ خصوصیت ہے جو انسان کو حیوانات اور دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے (مثلاً جدید ڈاروزم کے جان ہاکسلے نے)

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ کسی بھی ترقی یافتہ انسانی سوسائٹی میں انسانوں کا اجتماع و افتراق عقائد و نظریات کی اساس پر

ہو۔ کیونکہ عقائد و نظریات وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے انسان دوسرے بہائم پر امتیاز حاصل کرتا ہے۔ انسانی سوسائٹی کی تشکیل ایسی خصوصیات کی اساس پر نہیں ہونا چاہئے جس میں انسان اور دوسرے جانور دونوں برابر کے شریک ہوں۔ مثلاً سوسائٹی کی تشکیل زمین' وطن' حدود' علاقہ جات اور جسمانی اور مادی مفادات کی اساس پر نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح رنگ' خون اور نسب کی بنیاد پر بھی اور زبان اور رسم و رواج کے اشتراک پر بھی انسانی سوسائٹی کی تعمیر نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان امور میں انسان اور بہائم برابر کے شریک ہیں اور ان میں عقل و خرد کا وہ عنصر نہیں ہوتا جس میں صرف انسان باہم شریک ہوں۔

○ ایک دوسری خصوصیت ایسی ہے جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور اس سے حیوانات محروم ہیں۔ وہ ہے اختیار اور حرکت بالارادہ' انسانوں میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ سن رشد تک پہنچتے ہی جو عقیدہ اور نظریہ چاہے اختیار کرے۔ اس طرح انسان خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کس معاشرے میں آزادانہ زندگی بسر کرے۔ یا کس نظریاتی منہاج کو اپنائے اور کون سا اخلاقی اور سیاسی نظام پسند کرے یا یہ کہ اس کے لیے کون سا اقتصادی نظام بہتر ہے اور یہ فیصلہ وہ پوری آزادی کے ساتھ کرے۔

لیکن انسان کا یہ اختیار اور یہ آزادی اس کے خون' اس کے نسب' اس کی قوم اور اس کے طبقے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح انسان از خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ کس سرزمین پر پیدا ہو' نہ وہ اپنی مادری زبان کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ غرض وہ تمام بنیادیں جن پر دور جدید کے جاہلی معاشروں کی عمارات تعمیر ہوئی ہیں وہ انسان کے دائرۂ اختیار و ارادہ کے اندر نہیں ہیں۔ ان تمام امور کا فیصلہ اس کرۂ ارض پر انسان کے وارد ہونے سے پہلے کر دیا جاتا ہے۔ ان امور کے بارے میں انسان سے کوئی مشورہ بھی نہیں لیا جاتا۔ بلکہ طوعاً و کرھاً اس پر یہ امور لازم کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر ہم انسان کی قسمت کو ان امور سے وابستہ کر دیں جن کے ہاتھ میں وہ مجبور محض ہے۔ اور ان امور کے بارے میں اس کی آزادی اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے تو اس قسم کے انسان کو ہم انسان کے مخصوص خصائص سے محروم کر دیں گے اور انسان کے عزو شرف اور اس کی برتری کے اہم اصول اور خصوصیت سے اسے الگ کر دیں گے۔ بلکہ اس صورت میں انسان اپنی اس اساسی خصوصیت سے محروم ہو جائے گا جو اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔

چنانچہ انسان کی ان ذاتی اور مخصوص خصوصیات کی حفاظت اور نشوونما کے لیے اور اس شرف و کرم کے تحفظ اور رعایت کی لیے جو اللہ نے انسان کو اپنی تمام دوسری مخلوقات کے مقابلے میں دی ہیں' باری تعالیٰ نے دین اسلام میں یہ قرار دیا کہ انسانی سوسائٹیوں میں اجتماعیت کا دارومدار اس عقیدے اور نظریئے پر ہو جسے کوئی انسان پوری آزادی کے ساتھ سن بلوغت تک پہنچنے کے بعد اختیار کرے۔ اور ہر انسان کے انجام کا مدار اس کے اس ذاتی عقیدے اور فیصلے پر ہو۔ اس طرح انسان کی اجتماعیت کا نظام ایسے ناقابل تغیر و تبدل اصولوں پر نہ ہو جن کو کسی حالت میں بھی انسان بدل نہیں سکتا' ان عوامل کی حیثیت اضطراری ہو اور وہ ایسے ہوں کہ انسان کے دائرے سے کسی طرح بھی باہر نہ نکل سکتا ہو۔

○ انسانی سوسائٹی اور اس کے اجتماعی نظام کی بنیاد صرف عقیدے اور نظریئے پر رکھنے کا فائدہ کیا ہو گا؟ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ۔۔ عالمی' انسانی اور کھلا معاشرہ وجود میں آ جائے گا۔ ایسی سوسائٹی اور معاشرے میں ہر قسم کے لوگ'

مختلف رنگوں اور نسلوں والے، مختلف قوموں اور زبانوں والے، مختلف علاقوں اور خون والے، پوری آزادی کے ساتھ آ کر بس جائیں گے۔ کسی پر کوئی بندش نہ ہوگی۔ ان کے سامنے کوئی مصنوعی پردہ نہ ہو گا، ملکوں اور قومیتوں کی حدود اس کے لیے سرراہ نہ بنیں گے اور تمام ایسے حدود مٹ جائیں گے جو اعلیٰ انسانی معیار سے فروتر ہوں۔ تمام انسانی طاقتیں، تمام انسانی خواص اور صلاحیتیں ایسے معاشرے اور ایسی سوسائٹی میں جمع ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک انسانی تہذیب وجود میں آتی ہے اور یہ تہذیب و تمدن تمام انسانی صلاحیتوں سے مستفید ہوتی ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ کسی ملک کی صلاحیت اور وسائل سے خاص نسل، خاص رنگ اور زبان اور زمین کے لوگ ہی مستفید ہوں۔

میری کتاب "معالم فی الطریق" سے یہ اقتباسات یہاں مفید ہوں گے :

اسلام، امت مسلمہ کو، بنیادی عقیدہ دے کر اپنے مخصوص طریق کار کے تحت، اجتماعی تحریک کے ذریعے اسے خارجی وجود بخش کر اور اس اجتماعی تحریک کے لیے بنیادی عقیدہ کو اساس بنا کر اس لیے برپا کرتا ہے کہ اس کے ذریعے وہ انسان کی انسانیت کو نمودار کر دے۔ اسلام اپنے مخصوص طریق کار کے تحت اپنے بنیادی نظریات اپنی تعلیمات اور اپنے شرائع اور احکام میں انسانیت کی اسی نشوونما کو اصل ہدف بنائے ہوئے ہیں۔

چونکہ انسان تمام حیوانات بلکہ جمادات کے ساتھ بھی وجود میں اشتراک رکھتا ہے اس لیے سائنٹیفک جہالت کے علم بردار کبھی کہتے ہیں کہ انسان ایک حیوان ہی تو ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ اس کا وجود محض ایک مادی وجود ہے لیکن یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ حیوانات اور مادہ کے ساتھ وجود میں اشتراک کے باوجود انسان ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو اسے عام مادیات اور حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے ایک منفرد وجود بخشتی ہیں۔ اب آگر کہیں اس سائنٹیفک جہالت کے علم برداروں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور واقعاتی حقائق اور مشاہدوں اور تجربوں نے ان کی گردن غرور کو توڑ دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اخلاص اور تصریح کے بغیر اشاروں میں اس حقیقت کا اعتراف کریں۔

جن لوگوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ غیر جانبداری سے کیا ہے اور پھر پوری تاریخ انسانی پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات اور اس کے قیام کے طریق کار کے نتائج کس قدر شاندار رہے ہیں۔ اسلام نے جدید معاشرے کی تعمیر، رنگ وطن، قومیت، ملکی مصالح اور علاقائی تعلقات جیسے کمزور رشتوں کے بجائے صرف ایمان و نظریات اور عقائد و تصورات پر کی ہے اور اس نقطہ نظر سے اس نے انسانی وجود کے حیوانی اور مادی پہلو کو نظر انداز کیا اور انسان کی انسانیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ اسلامی سوسائٹی میں داخل ہونے کے دروازے ہر جنس اور ہر طبقہ کے انسانوں کے لیے کھل گئے اور اس طرح محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اور حیوانی بندشوں اور باہمی امتیازات میں سے کوئی بندش اور امتیاز درمیان میں نہ رہا۔ اس طرح انڈیل دی گئیں اور اس کٹھالی میں ان تمام خصائص نے ایک حسین امتزاج کی شکل اختیار کی اور اس خام مواد سے ایک نیا وجود سامنے آیا۔ یہ سب کام نہایت مختصر عرصہ میں ہوا اور اس سے انسانوں کا ایک عجیب یک رنگ و ہم آہنگ گروہ تیار ہو گیا جس نے ایک تابندہ اور عظیم الشان تہذیب کو جنم دیا۔ وہ تہذیب جو اپنے دور میں انسانیت کے استعدادی جوہر کا خلاصہ تھی، حالانکہ اس زمانہ میں آبادیوں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے تھے اور مواصلات کا نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔

اس اعلیٰ ترین معاشرے میں بیک وقت عربی' فارسی' شامی' مصری' مغربی' ترکی' چینی' ہندوستانی' رومی' یونانی' انڈونیشی اور افریقی اور بے شمار دوسری قوموں اور نسلوں کے لوگ شامل ہو کر اس میں ضم ہو گئے تھے - اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرہ کی نشوونما میں ان تمام لوگوں کی قابلیتیں اور ذہانتیں مل کر باہمی تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ مصروف عمل ہو گئیں - تاریخ شاہد ہے کہ کسی وقت بھی یہ عظیم الشان تہذیب صرف عربی تہذیب نہیں رہی اور نہ ہی کبھی معروف معنوں میں قومی تہذیب رہی ہے - بلکہ یہ ہمیشہ سے فکری تہذیب ہی رہی ہے -

یہ سب لوگ اس تہذیب میں خالص مساوات کے اصولوں پر جمع ہوئے - باہمی مروت اور شفقت نے انہیں جوڑا' منزل مقصود کے اتحاد کی وجہ سے وہ باہم ملے اور اس مقصد اور نصب العین کے لیے انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا -

انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر ڈالا اور اپنے تمام قومی اور تاریخی خصائص کو ظاہر کیا اور اپنے ذاتی اور موروثی کمالات کو نئے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں صرف کر ڈالا جو مساوات پر مبنی ان سب کا اپنا ہی معاشرہ تھا' مساوات و اتحاد کی بنیاد پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان سب کا رب حاکم' مالک' اور خالق ایک ہی ہے - اس عقیدہ کے پس منظر میں بلاروک ٹوک انسانیت ابھر آئی - وحدت اللہ کا عقیدہ "وحدت انسان" کے لیے بنیاد بنا --- پوری انسانی تاریخ میں یہ اونچائی کسی اور سوسائٹی کو حاصل نہیں ہوئی کہ وہ انسانی مساوات کی بنیاد پر وحدت انسان کا عقیدہ رکھتی ہو -

اسلامی معاشرے کا دوسرے معاشروں سے تقابل

قدیم انسانی تاریخ میں رومن معاشرہ مشہور ترین معاشرہ رہا ہے لیکن اس میں بھی متعدد رنگ' بے شمار زبانیں اور کئی قومیتیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کا مزاج اور طرز فکر مختلف ہے - اس کے باوجود اس معاشرے کی اساس انسانیت یا بلند تر نظریات پر نہیں رکھی گئی بلکہ یہ ایک قسم کا طبقاتی گٹھ جوڑ تھا جس میں ایک طرف اشراف کا طبقہ تھا اور ایک طرف غلاموں اور کمزوروں کا گروہ تھا - دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ رومن امپائر میں فاتح اور مفتوح اقوام علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں - رومن فاتح ہر لحاظ سے بزرگ و برتر ہیں اور مفتوح اقوام غلام اور زیردست ہیں - یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے رومی معاشرہ ان بلندیوں تک نہ پہنچ سکا - جہاں تک اسلامی معاشرہ پہنچا اور نہ ہی اس نے انسانی تاریخ میں وہ کارنامے سرانجام دیئے جو صحت مند اسلامی معاشرہ کے شایان شان ہوتے ہیں - اس کے بعد بھی کئی معاشرے عالم وجود میں آئے' مثلاً انگریزی تہذیب کا قائم کردہ جدید معاشرہ' یہ معاشرہ بھی دراصل رومی معاشرے کا جانشین اور وارث تھا اور عملی میدان میں آکر یہ بھی طبقاتی اور استحصالی معاشرہ ثابت ہوا اور اس کا اصل الاصول یہ رہا کہ انگریز قوم کو قیادت اور برتری کا مقام حاصل رہے - اس کا بین ثبوت ان نو آبادیوں کے معاشی اور معاشرتی جائزے سے ملتا ہے جو کسی وقت انگریزوں کے زیر نگیں رہے ہیں اور بعینہ یہی طرز عمل یورپ کی دوسری شہنشاہیتوں اور معاشروں کا رہا ہے - انہوں نے بھی اپنی نو آبادیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا - ہسپانوی' پرتگالی اور فرانسیسی معاشروں نے اپنی تمام کالونیوں میں وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا اور ان کے طرز عمل نے خود بتا دیا کہ یہ معاشرے کس قدر گھناؤنے' مہلک اور گرے ہوئے تھے -

اس کے بعد ہمارے سامنے اشتراکی معاشرہ نمودار ہوتا ہے۔اگرچہ اس نے اپنے اساسی اصولوں میں سے رنگ و نسل، قوم و جنس اور زبان و وطن کو خارج کر دیا۔ لیکن اس کی اساس بھی خالص انسانی بنیادوں پر نہ اٹھی بلکہ ان کی نئی طبقاتی کشکش پر اٹھی، یہ معاشرہ بھی رومی طرز کا طبقاتی معاشرہ بن گیا، فرق صرف یہ ہوا کہ رومی معاشرہ اشراف (Lords) کی حمایت پر سامنے آیا اور اشتراکی معاشرہ مساکین (Labours) کی حمایت میں نمودار ہوا۔ اس کی تکنیک یہ تھی کہ مزدوروں کے دلوں میں تمام دوسرے طبقات کے خلاف نفرت کے بیج بو دیئے جائیں۔ چنانچہ خونی کشکش کا ایک طویل دور شروع ہو گیا، اور اس میں انسانیت ایسے ایسے مصائب سے دوچار ہوئی جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کیونکہ اس کی بنیاد انسانیت کے بجائے خالص حیوانی زندگی پر تھی۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ جنسی تعلقات خوراک اور مسکن ہی انسانیت کے بڑے مسائل ہیں اور انہی کے حل میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ اسی طرح اشتراکیت نے تاریخ کا جدلی فلسفہ پیش کر کے اسے تاریخ تلاش معاش قرار دے دیا۔

لیکن دنیا پر اسلامی معاشرہ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنے نظام حیات میں انسان کی صرف ان خصوصیات کو اجاگر کیا جو خالص انسانی ہیں۔ اس طرح اس نے انسان کو محض ایک مادے اور ایک حیوان کی سطح سے بہت اونچا کر دیا اور پوری تاریخ انسانیت میں اس پہلو سے اسلامی نظام حیات بے مثال ہے۔ اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اسلامی نظام حیات کو چھوڑ کر دوسرے نظام اختیار کرتے ہیں وہ دراصل انسانیت کے دشمن ہیں اور وہ اعلیٰ انسانی قدروں کی جگہ قوم، وطن، جنس اور طبقات کی بنیاد پر انسانی زندگی کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان سے زیادہ کمزور اور گھناؤنی ذلیل چیز کوئی اور نہیں ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں اور فطری اصولوں کے مطابق انسانی معاشرہ کی تعمیر، خالص انسانی بنیادوں پر نہیں چاہتے اور نہ ہی یہ انسانی سوسائٹی کو یہ موقعہ دیتے ہیں کہ وہ تمام انسانی تجربوں اور تمام انسانی خصائص و کمالات سے فائدہ اٹھائے۔ (۱) یہاں ہمیں یہ حقیقت اچھی طرح نوٹ کر لینا چاہئے کہ اس دین کے دشمن اس کی قوت کے اصل سرچشموں اور رازوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اس کے مزاج اور اس کی حرکت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ تبصرہ ہے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ "وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عقائد کی اساس اور نظریات کی بنیاد پر اسلامی معاشرے کی تشکیل ہی میں اس کی قوت کا راز مضمر ہے۔ یہ لوگ چونکہ اسلامی معاشرے پر غلبہ چاہتے ہیں اس لیے وہ اس کی قوت کو منہدم کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کہ یہ لوگ اسلام کی نظریاتی اساس کو منہدم کرنے کے درپے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کی غرض یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی ممالک کے خام مال اور صلاحیتوں کا استحصال چاہتے ہیں، چونکہ ان لوگوں کے یہ خطرناک عزائم ہیں اس لیے مسلمانوں کو ان کی قوت کے اصل سرچشموں سے کاٹ پھینکنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اللہ وحدہ کی پرستش اور

---

(۱)(۱) معالم فی الطریق

بندگی سے مسلمانوں کو بدراہ کر کے اس سے بعض خود ساختہ خداؤں کی بندگی کرانا چاہتے ہیں۔ ان خداؤں میں ایک وطن کا دیوتا ہے۔ کوئی نسل کا دیوتا ہے' کوئی قوم کا دیوتا ہے۔ یہ جھوٹے خدا تاریخ کے مختلف مراحل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ کبھی قوم کے نام سے' کبھی عربی نام سے' کبھی تورانی نام سے اور کبھی دوسرے ناموں سے۔ غرض یہ خدا اور ان کے پیروکار امت اسلامیہ کے اندر خود امت کے خلاف برسرپیکار رہے ہیں۔ یہ امت اسلامی شریعت کی اساس پر قائم تھی اور ان کی مسلسل ریشہ دوانیوں اور زہریلے پروپیگنڈے کی وجہ سے اسلامی معاشرے کو ختم کر دیا گیا اور ان جھوٹے خداؤں کی علی الاعلان عبادت کی جانے لگی اور جن لوگوں نے اسلام کی طرف دعوت دی ان کو باغی اور قومی مفادات کے مخالف کہا جانے لگا اور اسلامی معاشرے سے شریعت کے قانون کو ختم کر کے ان خداؤں کی شریعت کو نافذ کیا گیا۔

اس نقطہ نظر سے خبیث ترین محاذ یہودی محاذ ہے۔ جس نے مسئلہ قومیت کو بطور ہتھیار استعمال کر کے اسلام کی ان مضبوط بنیادوں کو گرایا جن پر اسلام کا اجتماعی نظام استوار تھا۔ اس سے قبل یہودیوں نے یورپ میں مسئلہ قومیت کے ذریعے عیسائیت کو تباہ کیا تھا۔ اس نے ان ممالک کے اندر کلیسا کو بھی تقسیم کیا اور ہر ملک کا قومی کلیسا تشکیل دیا۔ اس طرح یہودیوں کے مقابلے میں عیسائیت کا جو گھیرا تھا' اسے انہوں نے توڑ دیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے یہودیوں کے خلاف موجود اسلامی محاذ کو بھی شکست دے دی۔ اس کے بعد ان یہودیوں کے شاگرد صلیبیوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف صدیوں تک یہی ہتھیار استعمال کیا۔ اور وہ طویل عرصے تک اسلامی سوسائٹی کے خلاف لڑتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے اس دین کے خلاف اپنے قومی۔ کینہ اور دشمنی کا انتقام لیا۔ انہوں نے اس پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ قومیت کے اس مہلک تصور کے ذریعے اسلامی سوسائٹی اور مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے غلام بنا لیا اور آج تک کسی نہ کسی طرح عالم اسلام صلیبیوں کا غلام ہے۔ اور اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ ان باطل بتوں کو پارہ پارہ کرنے کا فیصلہ نہیں کر دیتا۔ اور اسلامی معاشرہ اپنی محکم اساس پر از سرنو قائم نہیں ہو جاتا۔

○ آخر میں' میں اس بات کو واضح کروں گا کہ لوگ پوری طرح جاہلیت کے چنگل سے اس وقت تک نکل نہیں سکتے۔ جب تک ان کا اجتماعی نظام عقیدے اور نظریات پر قائم نہ ہو جائے اور عقیدہ یہ نہ ہو جائے کہ حاکم مطلق اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی حاکمیت میں اس کا شریک نہیں ہے۔ جب تک یہ عقیدہ لوگوں کے فکر و عمل میں رچ بس نہیں جاتا اور ان کا اجتماعی نظام اس پر استوار نہیں ہو جاتا' لوگ پوری طرح جاہلیت کے دائرے سے باہر نہیں آ سکتے۔ اس طرح کہ تقدس صرف اللہ وحدہ کو حاصل ہو اور اللہ کے سوا کوئی اور مقدس نہ ہو۔ ایک ہی شعار ہو اور اس کے علاوہ تمام شعاروں کو ختم کر دیا جائے۔ ایک ہی قبلہ ہو اور لوگ تمام دوسرے قبلوں کو ترک کر کے پوری طرح اس کی طرف رخ کر لیں۔

بت پرستی صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ بتوں اور پتھروں کی پوجا کریں' جن کے بارے میں انہوں نے عجیب و غریب قصے گھڑ رکھے ہیں بلکہ بت پرستی کی متعدد اور صورتیں بھی ہیں۔ ان بتوں کے علاوہ اور بھی بہت سے بت انسانوں نے تراش رکھے ہیں اور ان کو ایسی حیثیت دے دی ہے جس طرح الٰہ کی حیثیت ہوتی ہے لیکن یہ محض نام ہیں جو لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں اور ان کے لیے مختلف مراسم اور فرائض مخصوص کر دیئے ہیں۔

اسلام کا ہدف صرف یہاں تک نہ تھا کہ پتھروں کے بتوں اور دیومالائی الٰہوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد

قوم پرستی، نسل پرستی اور وطن پرستی وغیرہ کی اجازت دے دی جائے۔ اور لوگ ان نئے بتوں کے شعار اور مراسم کے تحت زندگی بسر کریں اور اللہ کو چھوڑ کر ان بتوں کے دین اور قانون اور رسم و رواج کو اپنالیں۔

چنانچہ اسلام نے پوری تاریخ میں انسانیت کو صرف دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک امت مسلمہ جو رسولوں کی تعلیمات کی پیروکار رہی ہے اور دوسری امت کافرہ جو رسولوں کی تعلیمات کے علاوہ مختلف قسم کی بت پرستیوں اور گمراہیوں میں مبتلا رہی ہے۔ اس امت کافرہ کی نوعیت مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے اور مختلف زمانوں میں اس کی شکل و صورت بھی بدلتی رہی ہے۔

جب اللہ نے پسند فرمایا کہ امت مسلمہ کو ان کی تاریخی شناخت سے آگاہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے متبعین کا تعارف کرایا کہ یہ ہے تمہاری شناخت جو آدم علیہ السلام سے ادھر پوری انسانی تاریخ میں تمہاری شناخت ہے اور آخر میں فرمایا

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ "یہ ہے تمہاری امت، واحد امت اور میں تمہارا رب ہوں، پس میری بندگی کرو"۔ اللہ نے عربوں سے یہ نہیں کہا کہ تمہاری امت، امت عربیہ ہے اور اس کی حیثیت جس طرح جاہلیت میں تھی، اسی طرح اسلام میں بھی ہے۔ اسی طرح یہودیوں سے بھی یہ خطاب نہیں کیا گیا کہ تمہاری امت، امت بنی اسرائیل اور عبرانی امت ہے اور جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس کا اعتبار ہے۔ حضورؐ نے حضرت سلمان فارسی سے یہ نہیں کہا کہ تمہاری امت، امت فارسیہ ہے اور نہ صہیب سے کہا کہ تمہاری امت امت رومیہ ہے۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ سے یہ نہیں کہا کہ اس کی امت، امت حبشی ہے بلکہ اللہ نے عرب، ایرانی، رومی اور حبشی مسلمانوں سے کہا کہ تمہاری امت مسلمانوں کی امت ہے۔ تم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے دور میں بھی ایمان لائے۔ ابراہیم اور لوط علیہما السلام پر بھی تم ایمان لائے۔ حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت ادریسؑ اور حضرت ذوالکفلؑ پر اور حضرت ذوالنونؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت مریمؑ پر تم ایمان لائے۔ (دیکھئے سورہ انبیاء آیات ۴۸ تا ۹۱)

یہ ہے امت مسلمہ، اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس کی تعریف فرمائی۔ اگر کوئی امت کے سلسلے میں کوئی اور مفہوم اور کوئی دیگر طریقہ اپناتا ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ البتہ ایسے شخص کو پہلے یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ رہے ہم مسلمان تو ہم صرف اس امت کو جانتے اور پہچانتے ہیں جس کی تعریف اللہ نے فرمائی۔ اللہ تو سچی بات کرتا ہے اور اس کے فیصلے بہت ہی دوررس ہوتے ہیں۔

قصہ نوحؑ کے الہامات و اشارات کے بارے میں یہی بات کافی ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دین اسلام کا نقطہ نظر اس مسئلے کے بارے میں کیا ہے؟

اس مقام پر ضروری ہے کہ ہم ایک بار پھر قدرے غور و فکر کریں اور یہ معلوم کریں کہ اللہ کے ترازو میں اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اور اسلامی اقدار کے کس قدر وسیع نکات اس میں ثبت کیے گئے ہیں۔ اسلام کی نظر میں ان مٹھی بھر مسلمانوں کی قدر و قیمت کیا ہے؟

حضرت نوح ؑ کے یہ مٹھی بھر متبعین کیا تھے؟ یہ ساڑھے نو سو سال کی مسلسل دعوت کے نتیجے میں مسلمان ہوئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ صرف گیارہ افراد تھے۔ یہ طویل دعوت جس کی اطلاع قرآن کریم نے دی ہے' اس ابتدائی دور کے بارے میں واحد ذریعہ معلومات ہے۔

جیسا کہ قرآن نے بتایا یہ مٹھی بھر مومنین حضرت نوح ؑ کی طویل ترین جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ لوگ اس قدر اہم تھے کہ ان کی خاطر اللہ نے اس کائنات کی طبعی زندگی کے عادی دھارے کو بدل دیا اور ایک عظیم طوفان برپا ہوا جس نے اس آباد زمین کے اندر پائی جانے والی ہر چیز کو تباہ کر دیا اور ان مٹھی بھر افراد کو از سر نو خلیفہ بنا کر اس زمین کا وارث بنا دیا۔ اور اسے یہ ڈیوٹی سپرد کی کہ وہ اس کائنات کو از سرنو آباد کرے۔

یہ نہایت ہی اہم نکتہ ہے اور اس پر ہمیں غور کرنا چاہئے۔

اس وقت اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ہراول دستے کرۂ ارض پر احیائے اسلام کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ دستے اس کرۂ ارض پر عجیب و غریب لگ رہے ہیں اور اپنے اس انوکھے پن کی وجہ سے بعض اوقات وحشت بھی محسوس کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر وحشت کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے معاشروں میں انہیں اذیت دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے ان کا پیچھا کیا جاتا ہے اور ان پر ظلم اور تشدد کے نئے نئے طریقے آزمائے جاتے ہیں۔ ان ہراول دستوں کو چاہئے کہ وہ قصہ نوح ؑ پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ یہ ایک اہم معاملہ ہے اور اس سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ بڑا دور رس ہے اور تدبر اور تفکر کے بعد ملتا ہے۔

یاد رہے کہ اس کرۂ ارض پر احیائے اسلام کا ایک چھوٹا سا بیج بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جاہلیت' اس کی سرزمین' اس کی تعمیر و ترقی' اس کی نشوونما اور اس کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو تباہ کرتا ہے۔ اور اس تخم کا اللہ پر حق ہے کہ اللہ اس کی نشوونما کرے' اس کی پرورش کرے یہاں تک کہ یہ بیج آخر کار دنیا میں ترقی کرے' کامیاب ہو اور زمین پر اس کا قبضہ ہو اور وہ اسے از سرنو تعمیر کرے۔

حضرت نوح ؑ اللہ کی نظروں میں تھے' اور اللہ کی ہدایات کے مطابق کشتی کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ

(۱۱ : ۳۷) "اور بناؤ کشتی ہماری نظروں میں اور ہماری وحی سے اور مجھ سے مخاطب نہ ہو ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا' بے شک وہ غرق ہونے والے ہیں"۔

اس سے قبل ایک وقت حالات ایسے تھے کہ حضرت نوح ؑ کی پوری قوم آپ کا پیچھا کر رہی تھی' آپ کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں اور آپ پر افتراء کیا جا رہا تھا تو ان مشکل حالات میں حضرت نوح ؑ نے یوں مناجات فرمائی۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ (۹) فَدَعَا رَبَّهٗ

أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ (۱۰) (۵۴ : ۹ - ۱۰) "اس سے قبل نوح کی قوم نے جھٹلایا۔ پس انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ مجنون ہے۔ اسے دھمکیاں دی گئیں تو انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا لہٰذا میرا انتقام لیجئے"۔

جب حضرت نوح عم دربار الٰہی میں دست بدعا ہوئے اور یہ اعلان فرمایا کہ میں مغلوب ہو چکا ہوں اور قوم کے حق میں بددعا کی کہ اے اللہ اس قوم سے انتقام لے۔ تو اس مرحلے پر اللہ نے اپنی عظیم کائناتی قوتوں کو کھول دیا اور یہ کائناتی قوتیں اللہ کے بندے کی مدد کو آ پہنچیں۔

فَفَتَحْنَآ أَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ (۱۱) وَّ فَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى

الْمَآءُ عَلٰٓى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۱۲) (۵۴ : ۱۱ - ۱۲) "پھر ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو پھاڑ کر چشموں میں تبدیل کر دیا اور یہ سارا پانی اس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گیا جو مقدر ہو چکا تھا"۔

جب اللہ کی یہ عظیم قوتیں اپنی سطح پر اپنا کام کر رہی تھیں تو ذات باری اپنی شان کے مطابق اپنے بندے کے ساتھ تھی۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ (۱۳) تَجْرِيْ بِأَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ

(۱۴) (۵۴ : ۱۳ - ۱۴) "اور نوح کو ہم نے تختوں اور کیلوں والی کشتی پر سوار کر دیا جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ یہ تھا بدلہ اس شخص کی خاطر جس کی ناقدری کی گئی"۔ یہ ایک اہم اور عظیم صورت حال ہے اور احیائے اسلام کے لیے کام کرنے والے ہراول دستوں کو اس کے سامنے توقف کر کے ذرا گہرا غور و فکر کرنا چاہئے۔ یہ دستے جہاں اور جس زمانے میں احیائے اسلام کا کام کر رہے ہوں اور ان کا مقابلہ جاہلیت سے ہو اور وہ ان کا پیچھا کر رہی ہو اور خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ جاہلیت کا پلڑا غالب ہو۔

اسلام کے سپاہی اس بات کے مستحق ہیں کہ اس کائنات کی تمام قوتیں ان کے ہمرکاب ہوں۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ قوتیں طوفان ہی کی صورت میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کی مددگار ہوں۔ طوفان تو ایسی قوتوں میں سے صرف ایک قوت ہے۔ اللہ کی اور بھی بے شمار قوتیں ہیں۔

وَ مَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ "اللہ کی افواج کا علم صرف اللہ ہی کو ہے"۔ ہاں اسلامی قوتوں کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ اپنے کام کو جاری رکھیں اور مسلسل جاری رکھیں۔ اپنی راہ پر مسلسل گامزن رہیں۔ پھر اسلامی قوتوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی قوت کے اصل سرچشمے کو سمجھنے کی سعی کریں۔ اور اسی کے ہاں پناہ لیں۔ اور ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس وقت تک صبر سے کام لیں جب تک اللہ کا امر آ نہیں جاتا۔ ان اسلامی قوتوں کو پورا یقین ہونا چاہئے کہ اللہ ان کا دوست ہے اور وہ علیم و قدیر ہے اور اسے اس کائنات میں کوئی قوت عاجز نہیں کر سکتی۔ نہ آسمان میں اور نہ زمین

ہیں - وہ یہ بھی یقین رکھیں کہ اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کی آزمائش اور مشکلات کا دور ایک محدود وقت کے لیے ہوتا ہے اور جب یہ پیریڈ ختم ہوتا ہے تو اللہ اپنے دوستوں کے لیے پھر کارہائے نمایاں کرتا ہے اور پھر ان کے ذریعے زمین کے اوپر انقلاب لاتا ہے -

یہ ہے وہ عظیم سبق جو اس واقعہ میں مضمر ہے - یہ حقیقت ہے کہ جو شخص اسلام کے نظریہ حیات کو لے کر جاہلیت کا مقابلہ کرتا ہے اللہ اسے جاہلیت کے مقابلے میں بے سروسامان نہیں چھوڑتا - بشرطیکہ داعی یہ دعوت دے رہا ہو کہ رب کائنات صرف ایک ہے - اس جنگ میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو اللہ پر یہ بدگمانی نہیں کرنی چاہئے کہ اللہ ان کی مدد کو نہیں پہنچے گا - اسی طرح اسلامی کارکنوں کو یہ خیال بھی نہیں کرنا چاہئے کہ ایک طرف ان کی ذاتی اور چھوٹی قوت ہے اور دوسری جانب جاہلیت کی عظیم قوت ہے - بلکہ اسلامی قوتوں کو ہر وقت نصرت الہیہ کا طلبگار رہنا چاہئے -

بظاہر داعیان اسلام کی قوت اور جاہلیت کی قوتوں کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی - جاہلیت کی قوتیں عظیم نظر آتی ہیں 'لیکن داعی اسلام کا بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے اور اللہ کے ہاتھ میں یہ بات ہے کہ وہ کسی بھی وقت کائناتی قوتوں کو تحریک اسلامی کی خدمت میں لگا دے 'جب چاہے اور جہاں چاہے - اور الہی قوتیں ایسی عظیم ہیں کہ ان میں سے ایک معمولی قوت بھی جاہلیت کا بھرتہ بنا کر رکھ دیتی ہے اور جاہلیت کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس پر یہ وار کہاں سے ہوا؟

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتلا کا دور قدرے طویل ہو جاتا ہے اور یہ اللہ کی مشیت ہوتی ہے - حضرت نوح ؑ اپنی قوم میں پچاس کم ایک ہزار سال تک رہے - لیکن اس قدر طویل عرصے کے بعد اللہ کا حکم آیا اور اس طویل عرصے میں حضرت نوح ؑ صرف گیارہ افراد کو قائل کر سکے - لیکن اللہ کے ترازو میں ان گیارہ افراد کا وزن یہ تھا کہ اسے پوری کائنات کے مساوی قرار دیا گیا اور ان کی مدد کے لیے کائنات کی عظیم قوتوں نے مداخلت کی اور تمام انسانیت کو تباہ کر دیا گیا اور پوری کائنات اور وسیع و عریض زمین کا وارث صرف گیارہ افراد کو بنا دیا گیا اور اس کائنات کی تعمیر از سر نو شروع کی گئی -

میں یقین سے کہتا ہوں کہ معجزات کا دور ختم نہیں ہو گیا ہے - معجزات اور حوادث کا ظہور تو ہر وقت اور ہر لمحہ ہوتا ہی رہتا ہے - البتہ یہ بات ہے کہ یہ خوارق اور معجزات اللہ کی مشیت کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں - ہاں اللہ تعالی معجزات کی شکل و صورت بدلتے رہتے ہیں اور ایسے معجزات صادر فرماتے ہیں جو زمان و مکان کے حالات کے مطابق ہوتے ہیں - ہاں بعض اذہان کے لیے بعض معجزات اس قدر دقیق ہوتے ہیں کہ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتے - لیکن جو لوگ معرفت خداوندی کے مقام پر فائز ہوتے ہی ہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ کام کر رہا ہے - اور اللہ کے دست قدرت کے کمالات کو وہ اچھی طرح پاتے ہیں -

جو لوگ اللہ کی راہ پر چل پڑتے ہیں 'ان کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرتے رہیں 'اپنی پوری قوت اس راہ میں لگا دیں اور پھر پورے یقین و اطمینان اور بھرپور یقین کے ساتھ انجام اللہ پر چھوڑ دیں اور جب وہ حالات پر قابو نہ پا سکیں تو پھر اللہ کے سامنے یوں عاجزی اور تضرع کے ساتھ گڑگڑائیں جس طرح حضرت نوح ؑ گڑگڑائے -

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّی مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ "انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ وہ مغلوب ہو گئے ہیں لہٰذا اب انتقام لیں"۔ اس دعا کے بعد اب اللہ کی طرف سے کشادگی آجاتی ہے۔ اللہ کی جانب سے کشادگی آنے کا انتظار بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے اور اس انتظار کا بھی اجر ملتا ہے۔

میں یہ بات پھر کہوں گا کہ یہ قرآن اپنے راز ہائے دروں کا دروازہ صرف اس شخص پر کھولتا ہے جو قرآن کو لے کر حق و باطل کی کشمکش کے میدان میں اترتا ہے۔ اور اس کو لے کر جہاد عظیم برپا کرتا ہے۔ صرف ایسے ہی لوگ ان فضاؤں کو محسوس کر سکتے ہیں جن میں پہلی بار یہ کتاب نازل ہوئی تھی۔ ایسے مجاہد کارکن ہی قرآن کا ذوق رکھتے ہیں اور اسے سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک مجاہد جب قرآن پڑھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ قرآن صرف مجھ ہی سے مخاطب ہے۔ جس طرح پہلی تحریک اسلامی سے وہ مخاطب تھا۔ اور اس نے اسے چکھا اسے پایا اور اس کے ساتھ حرکت میں آئی۔

---O---

درس نمبر ۱۰ ایک نظر میں

تاریخ کی گزر گاہ سے قوم نوح گزر گئی۔اس کی اکثریت سچائی کو جھٹلانے والی تھی۔طوفان نے اس قوم کو لپیٹ لیا اور پھر تاریخ نے اسے سمیٹ لیا۔وہ جس طرح زندگی سے محروم ہوئے اسی طرح رحمت خداوندی سے بھی محروم ہو گئے۔جن لوگوں کو نجات نصیب ہوئی وہ زمین کے اوپر اللہ کی سنت کے مطابق مقتدر اعلیٰ بن گئے کیونکہ اللہ کا مستقل وعدہ یہ ہے

(وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ) "اچھا انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں"۔اللہ نے حضرت نوح کو حکم دیا:

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۱: ۴۸) "حکم ہوا' اے نوح اتر جا ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جن کو ہم کچھ مدت سامان زندگی بخشیں گے' پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا"۔

غرض ایک بار پھر جاہلیت کا دور دورہ ہو گیا تھا۔جس طرح آدم علیہ السلام کے بعد کئی نسلیں گزر جانے کے بعد جاہلیت کا دور دورہ ہو گیا۔یہ کتنے عرصے بعد ہوا تھا' صرف اللہ ہی جانتا ہے' بہرحال آدم علیہ السلام کے بعد صدیوں تک لوگ بطور مسلم زندہ رہے ہوں گے اور خلافت ارضی کا فریضہ سرانجام دیتے رہے ہوں گے اور اس کے بعد شیطان نے آہستہ آہستہ انہیں گمراہ کر کے جاہلیت میں داخل کر دیا ہو گا اور وہ اپنے حقیقی دین سے منحرف ہو گئے ہوں گے۔اس کے بعد حضرت نوح ؑ تشریف لائے اور حضرت نوح ؑ کی قیادت میں اسلام از سرنو زندہ ہوا۔کفار ہلاک کر دیئے گئے اور مسلمانوں نے نجات پائی اور زمین پر کوئی ایک کافر باشندہ بھی زندہ نہ رہا۔جیسا کہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت نوح ؑ نے اس طرح کی دعا کی تھی۔ظاہر ہے کہ نوح ؑ کے بعد افراد کشتی نوح ؑ اور ان کی ذریت ایک عرصہ تک اسلام کے مطابق زندگی بسر کرتی رہی ہو گی۔یہاں تک کہ شیطان پھر ان پر غالب ہو گیا ہو گا اور پھر وہ جاہلیت کی طرف چلے گئے ہوں گے۔اس طرح قوم عاد جاہلیت کی طرف لوٹی اور ہلاک ہوئی۔پھر قوم ثمود نے جاہلیت کا مظاہرہ کیا اور ہلاک ہوئی۔

جہاں تک عاد کا تعلق ہے تو وہ ایک قوم تھی جو احقاف میں رہتی تھی۔احقاف حقف کی جمع ہے جس کے معنی ریت کے ایسے ٹیلے ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف چلے جاتے ہیں۔یہ علاقے عرب کے جنوب میں ہیں۔ثمود کا قبیلہ حجر کے علاقے میں آباد تھا۔یہ جزیرۃ العرب کے شمال میں تبوک کے علاقے میں ہے۔یہ دونوں اقوام اپنے دور میں

نہایت ہی ترقی یافتہ اقوام تھیں لیکن اپنی ترقی اور فراوانی کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو عذاب الٰہی کا مستحق بنا دیا کیونکہ انہوں نے ترقی کو ذریعہ بغاوت قرار دیا۔ توحید کی جگہ بت پرستی کو اپنایا۔ اللہ کی بندگی کے نظام کو چھوڑ کر انہوں نے انسانوں کی بندگی اور غلامی کا نظام قبول کرلیا۔ اور انہوں نے رسولوں کی سخت تکذیب کی عاد و ثمود کے قصص میں بھی وہی حقائق پوشیدہ ہیں جو قصہ نوح میں تھے۔

---()()()---

درس نمبر۱۰۱ تشریح آیات

۵۰ --- تا ---- ۶۸

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ
اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ
مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝

”اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود ؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادران قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو“۔

حضرت ہود قوم عاد کے فرد تھے۔ گویا ان کے بھائی تھے۔ اس قبیلے کے افراد کے درمیان اجتماعی تعلق اور ربط کی بنیاد محض رشتہ داری پر تھی۔ یہاں اس تعلق کو اس لیے ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک بھائی اور اس کے اخوان کے درمیان شفقت اور محبت کا تعلق ہونا چاہئے لیکن اخوت اور نبوت دونوں مناصب کے ہوتے ہوئے بھی عاد کے لوگوں کا رویہ نہایت ہی مکروہ تھا' انداز کلام اسے ایک مکروہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ اسلامی تصور کے مطابق اگر اتحاد فکر نہ ہو تو بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ جب عقیدہ نہ ہو تو تمام دوسرے روابط کٹ جاتے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں رہتی تاکہ لوگ اس حقیقت کو پا سکیں کہ کسی اسلامی معاشرے کے اندر انسان اور انسان کے درمیان ربط و تعلق صرف نظریہ حیات کے مطابق ہوتا ہے۔ نیز اس سے اس طرف اشارہ بھی مطلوب ہے کہ اسلام کا مزاج تحریکی ہے۔ کیونکہ جب ایک نبی دعوت کا آغاز کرتا ہے تو اس کی قوم کے افراد کے درمیان خون اور نسب کے رشتے موجود ہوتے ہیں اور خاندانی روابط مضبوط ہوتے ہیں۔ بعد میں عقیدے کی بنیاد پر ایک بھائی اور

بھائی کے درمیان خون اور نسب کے رشتے کٹ جاتے ہیں اور عقیدے کی اساس پر ایک قوم دو قوموں کی شکل میں بٹ جاتی ہے ۔ایک قوم امت مسلمہ ہوتی ہے اور دوسری قوم امت مشرکہ اور ان کے درمیان تمام روابط کٹ جاتے ہیں اور جب امت مسلمہ تمام قومی اور خونی روابط کاٹ دیتی ہے ۔تو اس کے بعد پھر وہ اللہ کی تائید اور نصرت کی مستحق ہو جاتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی امداد کر کے مشرکین کی جڑ کاٹ دیتے ہیں ۔اللہ کا یہ عہد اور اسکی یہ نصرت صرف اس وقت آتی ہے جب اہل ایمان مشرکین کے ساتھ تمام ارضی رابطے مکمل طور پر کاٹ نہ دیں اور اہل ایمان اور اہل شرک کے درمیان پوری طرح فرق و امتیاز نہ ہو جائے ۔اور نبی اور اس کے پیروکار اہل ایمان اپنی قوم سے بالکل جدا نہیں ہو جاتے اور اپنے سابقہ جاہلی روابط کو کاٹ نہیں دیتے اور اپنی محبت اور وفاداریاں اپنی قوم اور قومی قیادت سے کاٹ کر اپنے نظریات کے سپرد نہیں کر دیتے ۔اپنی تمام محبتیں اور وفاداریاں امت مسلمہ کے سپرد نہیں کر دیتے ۔جب امت مسلمہ اور امت کافرہ اور مشرکہ کے درمیان اس طرح پوری جدائی ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کی نصرت آتی ہے ۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا (۱۱ : ۵۰) ”اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود ؑ کو بھیجا“۔ ہم نے عاد کی طرف حضرت ہود ؑ کو بھیجا جس طرح قصہ سابقہ میں حضرت نوح ؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا ۔

قَالَ یٰقَوْمِ (۱۱ : ۵۰) ”اس نے کہا' اے برادران قوم!“ نہایت ہی پیارے انداز میں' برادری کے روابط کا واسطہ دیتے ہوئے' تاکہ ان کا اجتماعی شعور جاگ اٹھے' وہ مطمئن ہو جائیں کیونکہ کسی بھی قوم کا لیڈر' اپنی قوم کے سامنے جھوٹ نہیں بولتا اور نہ ہی کوئی ناصح مشفق اپنی قوم اور مخاطبین کو دھوکہ دیتا ہے ۔

اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (۱۱ : ۵۰) ”اللہ کی بندگی کرو تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے“۔ یہ وہی بات ہے جسے تمام رسول ؑ لے کر آئے ۔اس لیے کہ جب بھی کوئی رسول آتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ اس وقت کی قوم راہ حق سے منحرف ہو ۔چنانچہ کشتی نوح ؑ کے سواروں کی اولاد جب گمراہ ہو گئی تو حضرت ہود ؑ آئے ۔ شاید ان لوگوں کی بدراہی کا آغاز اس نکتے سے ہوا کہ انہوں نے ان لوگوں کو نہایت ادب اور تعظیم سے یاد کرنا شروع کر دیا جو کشتی نوح میں سوار تھے ۔یہ تعظیم اکابر یہاں تک بڑھی کہ انہوں نے پتھروں اور درختوں کی صورت میں ان کی ارواح کی پوجا شروع کر دی ۔ اور آخر کار یہ اشیاء بذات خود معبودات کی شکل اختیار کر گئیں ۔اب کاہنوں اور درباریوں کا ایک طبقہ وجود میں آگیا اور وہ مسندوں پر بیٹھ گئے اور ان کا مشن یہ قرار پایا کہ اپنے ذاتی مفادات کے لیے لوگوں سے ان معبودوں کی پوجا کرائیں اور یہ پوجا پھر مختلف نظام ہائے جاہلیت میں مختلف رنگ میں رہی ۔اس لیے کہ انسان جب صحیح عقیدۂ توحید سے انحراف کرتا ہے تو اس کے ابتدائی قدم کے بعد پھر انحرافات شروع ہو جاتے ہیں اور آخر کار انسان اس قدر گمراہ ہو جاتا ہے اور اس قدر دور چلا جاتا ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے ۔

غرض قوم ہود بھی اسی طرح مشرک تھی جس طرح دوسری اقوام تھیں ۔یہ لوگ صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور پرستش نہ کرتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنی قوم کو وہی دعوت دینا چاہی جو ان سے قبل اور بعد ہر رسول نے دی کہ اے برادران قوم' صرف اللہ کی بندگی کرو اور یہ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی رب نہیں ہے ۔

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (۱۱ : ۵۰) "تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں"۔ یعنی اللہ کے سوا' تم جن دوسرے معبودوں کی بندگی کرتے ہو یہ محض افترا ہے۔ اس لیے تم ان کو نہ پکارو' کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔

اس موقعہ پر حضرت ہود اپنی قوم کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ جو دعوت دے رہے ہیں یہ محض خیرخواہی ہے اور تمہارے لیے ہمدردی اور نیک نیتی پر مبنی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی ذاتی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ اس خیرخواہی پر کوئی اجر اور معاوضے کے وہ طلبگار نہیں ہیں ان کا اجر تو اس ذات کے ذمے ہے' جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

(۱۱ : ۵۱) "اے برادران قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے' کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟؟"

یہ جو کہا گیا کہ میں تم سے کسی قسم کا اجر و معاوضہ نہیں چاہتا' یہ محض اس لیے کہا گیا کہ شاید بعض لوگ ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ حضرت ہود دولت جمع کرنا چاہتے ہیں یا کوئی اور مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور (اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) کے ذریعے انہیں یہ سمجھانے کی سعی کی جارہی ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے کہ رسول تو عقیدۂ توحید کی دعوت دے رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مالک و رازق نہیں اور خود تم سے مفادات کا طلبگار ہے' حالانکہ پوری قوم کے فقراء کو اللہ رزق دیتا ہے۔

چنانچہ حضرت ہود ان کو توبہ و استغفار کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور سورت کے آغاز مین جس طرح حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی کہا گیا تھا انہی الفاظ میں حضرت ہود لوگوں کو ڈراتے ہیں یعنی صدیوں بعد بھی انبیاء کی دعوت مین کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ

قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱ : ۵۲) "اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو"۔

یعنی تم لوگ جس شرک و کفر میں مبتلا ہو اور جو خیالات رکھتے ہو اس پر اللہ سے مغفرت طلب کرو' توبہ کرو' اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور نیا طریقہ اپناؤ جس کے پس پشت نیت و ارادہ ہو اور یہ نیت اور ارادہ حقیقی عمل پر منتج ہو۔

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا (۱۱ : ۵۲) "وہ تم پر آسمان کے دھانے کھول دے گا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کو اپنی فصلوں وغیرہ کے لیے بارشوں کی سخت ضرورت تھی۔ نیز مویشیوں کو پانی پلانے اور ان کے چارے کے لیے ان کو پانی اور بارش کی ضرورت تھی۔

وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ (۱۱ : ۵۲) ”تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا“۔ یعنی یہ قوت جسے تم جانتے ہو۔

وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ (۱۱ : ۵۲) ”مجرم بن کر بندگی سے منہ نہ پھیرو“۔ یعنی تکذیب اور روگردانی کے جرم کا ارتکاب نہ کرو۔

یہاں اللہ نے جو وعدہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ تم پر موسلا دھار بارش برسے گی اور تمہاری موجودہ مالی قوت پر مزید اضافہ ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ تو وہ امور ہیں جن میں مقررہ طبیعی قوانین ہیں اور سنت الٰہیہ کے مطابق دنیا میں یہ امور چلتے رہتے ہیں۔ اور یہ کائناتی قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں لہذا یہاں توبہ و استغفار کا ان امور کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ جہاں تک قوت میں اضافے کا تعلق ہے تو یہ بات قریب الفہم ہے اور اس کا سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ دل کی پاکیزگی اور عمل کی پاکی کی وجہ سے پاکبازوں اور متقیوں کی قوت کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی جسمانی صحت بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ خوراک اور تمام دوسرے کاموں میں اعتدال سے کام لیتے ہیں۔ ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور اعصاب میں ٹھہراؤ ہوتا ہے اور پھر ان کو اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت پر یقین ہوتا ہے۔ ان کی معاشرتی اور اجتماعی قوت میں اضافہ یوں ہوتا ہے کہ ان کے معاشرے میں اسلامی شریعت حکمران ہوتی ہے اور شریعت کی روشنی میں وہ آزاد اور معزز ہوتے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی قانون و دستور کے وہ پابند نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان کوئی قہار و جبار نہیں ہوتا جس کے سامنے دوسرے لوگ سجدہ ریز ہوں۔ ان کے معاشرے انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کے لیے آزاد مواقع ہوتے ہیں۔ اور ان صلاحیتوں کی وجہ سے زمین کی تعمیر و ترقی ہوتی ہے اور وہ زمین کے خود ساختہ ارباب کی ماتحتی میں نہیں ہوتے۔ نہ وہ آستانوں اور میلوں ٹھیلوں میں مشغول ہو کر انسانوں کو خدائی کے امور میں شریک کرتے ہیں اور پیروں فقیروں کے تکیوں پر ڈھول ڈھماکے اور خوشبوئیں لگا کر انسانوں کو الٰہوں کا انعام دیتے ہیں۔

یہ بات پیش نظر رہنا چاہئے کہ زمین میں پائے جانے والے خدا اور ان کے پیروکار گدی نشین اور درباری ہمیشہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان خداؤں اور پیشواؤں کی طرف بعض ایسی صفات کی نسبت کریں مثلاً قدرت، نفع و نقصان، مخلوقات کا احاطہ، قہاری اور مہربانی کی صفات تاکہ لوگ اللہ کے سوا ان ارباب کی اطاعت پر آمادہ ہوں۔ کیونکہ رب تو وہی ہو سکتا ہے جس میں کچھ نہ کچھ ایسی صفات پائی جاتی ہوں اور یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب ان الٰہوں کی بندگی کرنے والے اور مذہبی مقامات کے منتظمین اور گدی نشین کی ایک فوج ان کی جلو میں ہو اور لوگ ان ارباب کے تابع ہوں۔ اس مقصد کے لیے ان الٰہوں کے پیروکار رات دن ان تھک جدوجہد کرتے ہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں کے مفادات کا انتظام ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ کی حقیقی ربوبیت کے قیام کے لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں خلافت فی الارض کے مقاصد کے حصول کے لیے دینداروں کو اس قسم کی جدوجہد کرنا چاہئے کہ وہ ایسے کام کریں جو عوام الناس کے لیے مفید ہوں اور لوگ جعلی اور خود ساختہ ارباب کی پرستش کرنے کے بجائے رب حقیقی کی پرستش کریں تاکہ رب العالمین کا حقیقی نظام ان جعلی ارباب کے خود ساختہ نظام کے مقابلے میں عوام الناس کے لیے زیادہ مفید ہو کیونکہ ان جعلی خداؤں کا نظام تو ڈھول ڈھماکے اور گانے بجانے کے چند مراسم کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔

بعض اوقات ایسے لوگوں کے پاس بھی بظاہر بڑی قوت جمع ہو جاتی ہے جو اسلامی شریعت کو نافذ نہیں کرتے۔ شریعت نہ ان کی ذہنی دنیا پر حکمران ہوتی ہے نہ ہی ان کے معاشرے پر لیکن یہ قوت عارضی ہوتی ہے، لیکن جب دنیا کے معاملات اللہ کی حقیقی سنت کے مطابق طے ہونا شروع ہوتے ہیں اور وہ مرکز قوت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے جو مضبوط اساس پر مبنی نہیں ہوتا تو عارضی قوت کا یہ سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ یہ عارضی قوت کائنات کے جزوی اصولوں پر مبنی ہوتی ہے مثلاً جدوجہد، سعی، زیادہ پیداوار کا انتظام، لیکن ان چیزوں کی وجہ سے انسانی کو حقیقی قوت حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ اگر لوگوں کے نظریات اور شعور کی دنیا میں توڑ پھوڑ اور فساد برپا ہو تو آخر کار مادی اور جزوی قوتوں کے سرچشمے بھی ایک وقت کے بعد خشک ہو جاتے ہیں۔

اب رہا یہ کہ زیادہ بارشیں کس طرح ہوں گی۔ بظاہر تو نظر یہ آتا ہے کہ بارشوں کا نظام ایک کائناتی نظام ہے اور یہ بارشیں اپنے مستحکم اصولوں کے مطابق ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن بارشیں ہونے کے باوجود یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جگہ یہ بارشیں پیداواری اثرات کی حامل ہوں اور بعض اوقات بے وقت اور ہلاکت آفریں ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کے لیے تو یہ بارشیں باعث روئیدگی اور حیات ہوں اور دوسری اقوام کے لیے مہلک ہوں اور اللہ تعالیٰ طبعی عوامل کو کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف موڑ دیں۔ کیونکہ قوانین طبعی اور طبعی عوامل کا خالق بھی تو اللہ ہے۔ اور ہر حال میں اسباب کو متوجہ بھی اللہ ہی کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان اسباب کو اس طرح بھی موڑ سکتا ہے جس کے دیکھنے کے لوگ عموماً عادی نہیں ہوتے اور نتائج ظاہری قوانین قدرت کے خلاف نکل آئیں۔ جس طرح چاہے، جہاں چاہے اور جب چاہے کیونکہ سچائی کی قوت ہروقت آسمانوں اور زمینوں میں کام کرتی رہتی ہے۔ اور یہ عظیم قوت ان اصولوں کی پابند نہیں ہے جنہیں لوگ بالعموم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس طرح کائنات کے امور بظاہر چلتے ہیں۔

یہ تھی حضرت ہود ؑ کی دعوت اور بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس دعوت کے ساتھ کوئی خارق العادت معجزہ نہ تھا، کیونکہ حضرت ہود کے زمانے کے قریب زمانے میں طوفان نوح ؑ کا واقعہ پیش آگیا تھا۔ یہ عظیم واقعہ لوگوں کو یاد تھا اور ان کی زبانوں پر بروقت اس کے بارے میں اس کی کہانیاں تھیں۔ نیز دوسری سورتوں میں اللہ نے بتایا ہے کہ ان کو اس واقعہ کی یاد دہانی بھی کرائی گئی تھی۔ رہی قوم ہود تو ان کا رویہ یہ تھا کہ وہ حضرت ہود کی دعوت اور ان کی سچائی کے بارے میں خلجان میں مبتلا تھے۔

قَالُوۡا يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِكِىۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ وَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰٮكَ بَعۡضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوۡٓءٍ ؕ

”انہوں نے جواب دیا“ ”اے ہود، تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے، اور تجھ پر ہمیں یقین بھی نہیں ہے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑگئی ہے“۔

وہ اس قدر گمراہ ہوگئے تھے کہ خود حضرت ہود ؑ کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے تھے - وہ یہ کہتے تھے کہ حضرت ہود مجنونانہ بات کرتے ہیں چونکہ ان کو ان کے الٰہوں میں سے کسی الٰہ کی مار پڑگئی ہے - اس لیے وہ حواس باختہ ہو گئے ہیں - چنانچہ ان کے ریمارکس یہ تھے :

قَالُوْا مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (۱۱ : ۵۳) ''انہوں نے جواب دیا '' اے ہود ' تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے ''- یعنی تم جن خیالات کا اظہار کرتے ہو' ان کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے - لیکن ان کی یہ بات غلط اس لیے تھی کہ عقیدہ توحید کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے - صرف یاد دہانی اور نصیحت کی ضرورت ہے اور صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ فطرت سلیمہ سے اپیل کی جائے اور اس کے ضمیر کو جگایا جائے -

وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (۱۱ : ۵۳) ''اور تیرے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے '' - کیونکہ تم بغیر کسی دلیل اور حجت کے بات کرتے ہو -

وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۱ : ۵۳) ''اور تجھ پر ہمیں یقین بھی نہیں ہے '' - نہ ہم آپ کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ آپ کی بات مانتے ہیں - ہمارے نزدیک تمہاری یہ باتیں ہذیان ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ تمہیں ہمارے الٰہوں کی مار پڑ گئی ہے -

ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ حضرت ہود کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ ان کو آخری چیلنج دے دیں اور اب صرف اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے آخری رپورٹ پیش کر دیں اور اپنی قوم کو آخری وارننگ دے دیں جنہوں نے ہر حالت میں جھٹلانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ اگر تکذیب پر اصرار کرتے ہیں تو حضرت ہود ؑ ان کے ساتھ مکمل بائیکاٹ کا اعلان کر دیں -

قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

''ہود ؑ نے کہا '' میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں - تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور

مجھے ذرا مہلت نہ دو' میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو ۔ بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے ۔ اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو ۔ جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں ۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے ' یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے "۔

حضرت ہود اس قوم سے تھے ' ان کے بھائی تھے لیکن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور قوم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا ۔ انہوں نے چونکہ ہلاکت کا راستہ اختیار کر لیا تھا اس لیے انہوں نے سمجھا کہ اب اس قوم کے ساتھ رہنا نہایت ہی خطرناک ہے ۔ پوری قوم دو گروہ ہو گئی ہے جس کے اتحاد کے لیے کوئی نظریاتی بنیاد موجود نہیں ہے ۔

حضرت ہود اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں کہ وہ اب اس قوم سے بری الذمہ ہیں اور وہ ان گمراہوں سے مکمل طور پر جدا ہو رہے ہیں ۔ وہ ان کے منہ پر یہ اعلان کرتے ہیں تاکہ ان کے دلوں میں یہ غلط فہمی باقی نہ رہے کہ وہ اب بھی اس ملت مشرکہ کے فرد ہیں ۔

حضرت ہود اعلان برأت اور لاتعلقی بھی نہایت ہی شریفانہ انداز میں کرتے ہیں ۔ نہایت اطمینان اور نہایت ہی وثوق سے بات کرتے ہیں ۔ حضرت کا انداز اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے ۔

یہ بات تعجب انگیز ہے کہ ایک طرف ایک فرد ہے ' اور دوسری جانب ایک پوری قوم ہے جو نہایت ہی سخت گیر اور احمق ہے ۔ ان کی حماقت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے یہ بت انسانوں کو پاگل بھی کر سکتے ہیں ' نیز ان کی فکری کجی کی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ پیغمبرانہ دعوت کو ہذیان سمجھتے ہیں ۔ بت اور خود ساختہ اور بے حس الٰہوں کو وہ اس قدر طاقتور سمجھتے ہیں اور انہیں ان پر اس قدر اعتقاد ہے کہ وہ کسی کو پاگل بھی کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ ایک پرعزم فرد پیغمبرانہ شان کے ساتھ اٹھتا ہے اور ان کے ان معتقدات کو چیلنج کرتا ہے ' پھر ان کو چیلنج کرتا ہے ' ان سے کوئی مہلت نہیں مانگتا ۔ ان کو بھی سوچ کا موقعہ نہیں دیتا کہ ان کا یہ غیظ و غضب ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ سوچ لیں ۔

انسان کو ایک فرد واحد کو یوں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ صرف ایک شخص ہے اور وہ اس قدر جسارت کرتا ہے ۔ اس کے بالمقابل طاقتور اور سخت گیر دشمن ہے لیکن جب انسان اس صورت حالات کا حقیقی تجزیہ کرتا ہے تو یقیناً اس کی دہشت دور ہو جاتی ہے ۔

اس جسارت اور جسورانہ اقدام کا حقیقی سبب قوت ایمانی ہے ۔ اللہ پر مکمل بھروسہ اور اطمینان قلب ہی اس جسارت کا اصل سبب ہے ۔ جب انسان کو اللہ کی نصرت اور اس نے وعدوں پر بھروسہ ہو تو پھر وہ ایسے ہی اقدامات کرتا ہے ۔ جب کیفیت ایمانی دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو اللہ کی نصرت کے وعدے دل کو چھوتے ہیں اور وہ محسوسات کی شکل میں یقینی ہو جاتے ہیں ۔ انسان کا دل ' اس کے ہاتھ اور اس کا پہلو اللہ کی نصرت کو محسوس کرتا ہے ۔ یہ وعدہ پھر مستقبل کا وعدہ اور غیب کے پردوں میں مستور وعدہ نظر نہیں آتا ۔ یہ حاضر و موجود وعدہ اور محسوس نصرت ہوتی ہے ۔ آنکھیں اسے دیکھتی ہیں اور دل محسوس کرتا ہے ۔

قَالَ اِنِّیْ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۱۱:۵٤) "ہود ؑ نے کہا "میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں۔ اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں"۔

یعنی میں اس حقیقت پر اللہ کو بھی اور تم کو بھی گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں تمہارے شرک سے بری الذمہ ہوں اور گواہ رہو کہ میں نے اس برأت کا اعلان تمہارے سامنے کر دیا ہے۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اب تم اور تمہارے یہ خود ساختہ الٰہ مل کر میرا کچھ بگاڑنا چاہو تو بگاڑ لو۔ تم دونوں مل کر جو تدابیر بھی کر سکتے ہو کرو۔ مجھے کوئی مہلت نہ دو۔ میں تمہاری کوئی پروا نہیں کرتا اور نہ تم سے خوف کھاتا ہوں۔

اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ (۱۱:۵٦) "میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی"۔ تم جس قدر انکار کرو' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ ایک حقیقت ہے جو اپنی جگہ قائم ہے کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ وہ ہم سب کا پروردگار ہے۔ بلکہ وہ پوری کائنات کا رب ہے' اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا (۱۱:۵٦) "کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو"۔ غضب اور انتہائی قدرت کی یہ ایک مخصوص شکل ہے کہ انسان کسی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اسے قابو کر لے۔ اس مخصوص مثال میں انسان اور جانور سب شریک ہیں۔ چنانچہ اس مختصر فقرے میں قوت غلبہ اور گرفت کو ایک نہایت ہی مخصوص شکل میں پیش کر دیا گیا۔ اللہ کی قوت گرفت کو اس قدر مخصوص انداز میں پیش کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر سخت گیر اور قوی الجسم اور سخت مزاج تھے۔ نیز اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اللہ کی سنت اس کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱:۵٦) "بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے"۔ اللہ صاحب قدرت ہے' اور اس نے جو راہ بتائی ہے وہ سیدھی ہے۔ ان الفاظ میں قوت' سیدھی بات اور پختہ عزم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

یہ فیصلہ کن اور دوٹوک انداز کلام اس راز کو کھول دیتا ہے جو اس سربلندی اور چیلنج میں مضمر ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے جو حضرت ہود علیہ السلام کی شخصیت میں رچی بسی تھی۔ اور بالکل نمایاں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا رب قوی ہے اور قاہر ہے اور وہ ان کے علاوہ تمام عالمین کا رب ہے۔

مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا (۱۱:۵٦) "کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو"۔ اور حضرت ہود ؑ کی قوم کے اجڈ سخت گیر اور کرخت مزاج لوگ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ وہ اس زمین کے دوسرے جانوروں کی طرح جانور ہیں اور ان کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ مکمل طور پر اللہ کے قبضہ

قدرت میں ہیں۔ لہذا حضرت ہود ؑ ان وحشیوں سے نہ ڈرتے ہیں اور نہ ان کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ ان پر مسلط نہیں ہو سکتے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان وحشیوں کو ان پر مسلط کرنا چاہے۔ رہا ان کے ساتھ اکٹھے رہ کر زندگی گزارنے کا مسئلہ تو یہ ممکن نہیں کیونکہ دونوں کا انداز حیات ہی متضاد ہے۔

ایک داعی جب اپنے دل میں اس قسم کی حقیقت کو جاگزیں کر لیتا ہے تو اسے اپنے کام اور دعوت کے انجام کے بارے میں کوئی شک اور شبہ نہیں رہتا اور وہ اپنی جدوجہد میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ حقیقت کیا ہے؟ یہ حقیقت مقام الوہیت کا صحیح تصور ہے اور یہ تصور خالص مومنین کے دل میں صاف و شفاف ہوتا ہے۔ اللہ کی قوت کے بھروسے پر یہ چیلنج دے کر اور اسے ایک واضح اور مجسم شکل میں پیش کرنے کے بعد آپ ان کو اخروی طور پر ڈراتے ہیں :

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ (۱۱ : ۵۷) "اگر منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو' جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں"۔ میں نے اللہ کی طرف سے عائد شدہ فریضہ ادا کر دیا ہے۔ اب میں تمہارے معاملات سے دامن جھاڑتا ہوں اور تمہیں اور اللہ کی قوت قاہرہ کو تنہا چھوڑتا ہوں جس کا اصول یہ ہے :

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۱۱ : ۵۷) "اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا"۔ اور یہ قوم اس قابل ہو گی کہ دعوت اسلامی کو اخذ کر دے' اللہ کی ہدایات پر قائم رہے۔ اور اس کا رویہ تم جیسا باغیانہ' ظالمانہ اور گمراہانہ نہ ہو گا۔

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا (۱۱ : ۵۷) "اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے"۔ کیونکہ تم اس پر قادر ہی نہیں ہو' نیز تمہارے اٹھالے جانے سے دنیا میں کوئی خلا پیدا نہ ہو گا اور نہ نقص واقع ہو گا۔

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِيْظٌ (۱۱ : ۵۷) "یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے"۔ اللہ اپنے دین کا بھی محافظ ہے اور اپنے دوستوں کا بھی۔ وہ اپنے دوستوں کو اذیتوں اور ہلاکت سے بچانے والا ہے اور وہ اس جہاں کا نگراں ہے اور تم اس سے نہ بچ کر نکل سکتے ہو اور نہ اللہ کو عاجز کر سکتے ہو۔

یہ تھی دو ٹوک بات جو انہوں نے کی۔ اب حضرت ہودؑ اور ان کی قوم کے درمیان مکالمہ ختم ہو گیا اور یہ لوگ اللہ کی سرزنش کے مستحق ہو گئے۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

"پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود ؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے'

نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انہیں بچالیا"۔

جب ہم نے فیصلہ کیا کہ اس ڈراوے کو حقیقت کی شکل دے دی جائے اور اب قوم ہود کا حساب چکا دیا جائے تو ہم نے ہود اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات دے دی اور یہ ہماری جانب سے رحمت کا کرشمہ تھا' حالانکہ عذاب عام تھا اور سب لوگوں پر نازل ہو رہا تھا لیکن ہود اور ان کے ساتھیوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ان کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ یہ سخت عذاب صرف مکذبین کے لیے تھا۔ عذاب کی صفت یہاں غلیظ بتائی گئی ہے یعنی جسمانی اعتبار سے موٹا عذاب اور یہ لفظ قوم عاد کی سخت مزاجی اور اس وقت کی فضا کے لیے نہایت ہی موزوں ہے۔

اب قوم عاد تو فنا کر دی گئی ہے لیکن ان کی بربادی کی طرف یہاں سرسری اشارہ ہی کر دیا گیا۔ البتہ یہاں ان کے جرائم کو مفصل طور پر ریکارڈ کر دیا گیا کیونکہ اصل اہمیت عذاب کو نہیں' جرائم کو حاصل ہے۔ اب ان کو لعنت اور مذمت کے ساتھ رخصت کیا جا رہا ہے اور یہ لعنت و مذمت بار بار اور بتکرار کی جاتی ہے۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ
كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۵۹﴾ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا ۵
كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿۶۰﴾ ۱۱ ع
۵

"یہ ہیں عاد' اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا' اس کے رسولوں کی بات نہ مانی' اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیے گئے عاد' ہود کی قوم کے لوگ"۔

"وہ" ہے قوم عاد' بہت دور ہے' حالانکہ ذکر تو ان کا ابھی ہوا ہے اور ان کی لاشیں تو ابھی تک قارئین کی نظروں میں ہیں۔ لیکن فکر و نظر کی دنیا سے وہ دور ہو گئے اور نیست و نابود ہو کر تاریخ کی تنگ و تاریک اور دور دراز وادیوں میں دھکیل دیے گئے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ (۱۱ : ۵۹) "وہ ہیں عاد' اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا' اس کے رسولوں کی بات نہ مانی"۔ ان لوگوں نے صرف ایک رسول کی دعوت کو جھٹلایا تھا۔ لیکن کیا تمام رسولوں کی دعوت ایک دعوت نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی کسی ایک رسول کی دعوت کا انکار کر دے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے تمام رسولوں کی دعوت کا انکار کر دیا کیونکہ دعوت تو ایک ہے یعنی عاد نے تو دراصل ایک رسول حضرت ہود ؑ کی دعوت کا انکار کیا تھا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک جیسی ہے۔ نیز اسلوبی انداز میں بھی لفظ "رسل" کی اہمیت ہے کیونکہ آیات جمع ہے اور اس کے مقابلے میں رسل لایا گیا تاکہ ان کا جرم مزید گھناؤنا نظر آئے یعنی تمام آیات کا انکار اور تمام رسولوں کا انکار۔

وَ اتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱ : ۵۹) "اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے"۔ یہ لوگ ہر اس شخص کے احکام مانتے تھے جو ان پر مسلط ہو جاتا اور جو دشمن حق ہوتا تھا۔ حالانکہ دعوت اسلامی کا براہ راست تقاضا یہ تھا کہ وہ تمام جباروں اور قہاروں کی غلامی سے اپنے آپ کو رہا کرائیں۔ اور وہ خود اسلامی شریعت کے مطابق اپنے معاملات طے کریں۔ وہ دوسرے درجے کے انسان بن کر زندگی نہ گزاریں جس میں ان کی انسانیت کی کوئی قدر و منزلت نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ہود ؑ اور ان کی قوم کے درمیان اصل تنازعہ اللہ وحدہ کی حاکمیت و ربوبیت کا تھا۔ حضرت ہود ؑ کی دعوت یہ تھی کہ حاکم اور مطاع اللہ ہے اور اس کے مقابلے میں کسی بندے کی حاکمیت اور اطاعت و اتباع نہیں جبکہ وہ لوگ ہر دشمن حق کو حاکم اور مطاع مانتے تھے اور ایسے جباروں اور منکرین حق کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ قرآن کے ان الفاظ پر ذرا دوبارہ غور فرمائیں :

"وہ تھے عاد اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا' اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے"۔

گویا وہ رسولوں کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے اور جباروں اور قہاروں کے احکام مانتے تھے جبکہ اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولوں کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے کیونکہ رسولوں کا حکم 'حکم الٰہی ہوتا ہے۔ یہ ہے اسلام اور جاہلیت کا فرق۔ اس ایک پوائنٹ پر اسلام اور کفر کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔ ایمان اور کفر کا امتیاز ہوتا ہے۔ تمام رسولوں اور تمام دعوتوں میں یہ نکتہ دعوت کی بنیاد رہا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دعوت توحید کا پہلا اصرار اور اولین تقاضا یہ ہے کہ غیر اللہ کی ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے اور باطل خداؤں کی خدائی اور بادشاہت کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے۔ یوں اس تصور کے مطابق انسان اگر اپنی شخصیت کو ذلیل کرے اور آزادی کے حق سے دست بردار ہو جائے اور جبار و قہار ڈکٹیٹروں کا اتباع اختیار کر لے تو یہ کفر اور شرک جیسا جرم ہے۔ اور یہ جرم اسلامی نکتہ نظر سے اس قدر عظیم ہے کہ اس پر دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں جہنم کی سزا دی جا/تی ہے اس لیے کہ اللہ نے لوگوں کو آزاد پیدا کیا ہے اور ان کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے دین کو اختیار نہ کریں' اپنی آزادی سے دست بردار نہ ہوں' اور کسی ڈکٹیٹر اور مقتدر اعلیٰ کے سامنے سر نہ جھکائیں 'کیونکہ اسی میں انسان کی انسانیت کا احترام ہے۔ اگر وہ اس قدر و منزلت کا احترام نہ کریں گے تو اللہ کے ہاں ان کو نجات نہ ہوگی۔ یاد رہے کہ انسانوں کی کوئی سوسائٹی غیر اللہ کی بندگی کرتے ہوئے معزز اور محترم سوسائٹی نہیں کہلا سکتی۔ اور جو لوگ غیر اللہ کی غلامی اختیار کرتے ہیں اور ان کے سامنے سر اطاعت خم کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ مجبور ہیں تو اللہ کے ہاں ان کا یہ عذر مسموع نہ ہو گا۔ کیونکہ عوام الناس تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور جبار اور ڈکٹیٹر تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر لوگ آزادی کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو ان کی راہ کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ قربانیاں دے کر جانی اور مالی ذلت سے نجات پا سکتے ہیں۔

عاد کے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے ہر جبار اور دشمن دین کی اطاعت اختیار کی اور دنیا و آخرت' دونوں میں ملعون کر کے ان کو راہ ہلاکت کی طرف رخصت کیا گیا۔

وَ اُتْبِعُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا لَعْنَۃً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (۱۱ : ۶۰) ''آخرکار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی''۔ اب اللہ تعالیٰ ان کے حالات اور ان اسباب کو بھی یہاں ریکارڈ فرماتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس انجام بد تک پہنچے اور بطور سرکاری اعلامیہ بتایا جاتا ہے کہ

اَلَآ اِنَّ عَادًا کَفَرُوْا رَبَّھُمْ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ ھُوْدٍ (۱۱ : ۶۰) ''سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیئے گئے عاد' ہود کی قوم کے لوگ''۔

یہ گویا دور پھینک دینے کے بعد ان کے لیے بد دعا بھی ہے۔ نہایت ہی تاکیدی الفاظ میں کہا گیا کہ لعنت ان کا عنوان ہے اور یہ لوگ جہاں بھی ہوں ان پر لعنت کی بارش ہوتی رہے گی۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ ھُوْدٍ (۱۱ : ۶۰)

---ooo---

اس سورت میں جس انداز سے قصہ قوم ہود بیان کیا گیا ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ذرا ہم یہاں رکیں گے۔ چند لمحات کے لیے آپ بھی رکیے۔ بعد میں ہم قصہ قوم صالح میں داخل ہوں گے' ان شاء اللہ۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیوں اور زمانوں سے دعوت اسلامی اور تحریک اسلامی کے لیے جو ایک ہی لائن قرآن کریم دیتا ہے' اس میں ہمارے لیے نشانات راہ ہیں۔ یہ محض تاریخ فہمی کے لیے نشانات نہیں دیئے گئے اور نہ ہی تاریخ پر غور کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔ بلکہ ان نشانات کی نشاندہی کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ ہمارے لیے مستقبل کا لائحہ عمل ہے۔ یہ لائن صرف اس جماعت صحابہ ہی کو نہیں دی گئی جنہوں نے دنیا میں انقلاب برپا کیا اور اس وقت حضورؐ کے دور میں اور ازمنہ مابعد میں کرۂ ارض سے جاہلیت کو اکھاڑ پھینکا بلکہ یہ لائن ہر اس جماعت اور تحریک کے لیے ہے جو قیامت تک ان خطوط پر کام کرنا چاہتی ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم تاریخی نہیں' دعوتی کتاب بن جاتی ہے اور اس کی راہنمائی یہ ہے کہ تحریک برپا کرو' ہر مکان و زمان میں۔

فی ظلال القرآن میں مختلف آیات کے تحت آیات کی تشریح اور تفسیر کرتے ہوئے مختلف مقامات پر ہم نے اس نکتے کی طرف سرسری اشارات کیے ہیں۔ مختلف مقامات پر سیاق کلام کی مناسبت سے بات کی گئی لیکن یہ بات مختصر تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نکتے کو ہم قدرے تفصیل سے لیں اور وہ تمام نکات یہاں دہرا دیں جو دوسرے مقامات پر مختصراً بیان ہوئے تھے۔

○ تمام رسولوں کے پیغام کا مرکزی اور اساسی نکتہ دعوت توحید ہے۔ تمام رسولوں نے توحید کی طرف دعوت دی ہے اور توحید کے عقیدے کا مفہوم یہ ہے کہ بندگی صرف اللہ کی ہوگی۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس سلسلے میں جو تصریحات کی ہیں وہ ان الفاظ میں ہیں :

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (۱۱ : ۶۱) ''اے برادران قوم صرف اللہ کی

بندگی کرو اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور الہٰ نہیں ہے"۔ہم نے اس پوری تفسیر میں لفظ عبادت کی تفسیریوں کی ہے کہ بندہ اپنے تمام دنیاوی اور اخروی امور میں اللہ کی اطاعت کرے۔اس لیے کہ اس لفظ کا لغوی مفہوم یہی ہے۔کیونکہ لفظ عَبَدَ کا مفہوم یہ ہے کہ "اس نے اطاعت کی' اس کے تابع ہوا اور اس کے لیے جھکا"۔"طریق معبد" کے معنی ہوتے ہیں "ہموار اور جاری راستہ"۔اور عَبَّدَہٗ کے معنی ہیں "اس نے اسے غلام اور تابع فرماں بنایا"۔ابتداء جن عربوں کو خطاب کر کے یہ لفظ استعمال کیا گیا تھا۔وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ عبادت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ مراسم پرستش بجالائے جائیں بلکہ جس وقت اللہ کی عبادت اور بندگی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔اس وقت مراسم عبادت کا تعین ہی نہ ہوا تھا۔بلکہ ابتداء عرب عبادت سے یہی مفہوم سمجھتے تھے کہ تمام امور میں اللہ کی بندگی کی جائے اور اللہ کے سوا تمام شخصیات کی اطاعتیں اور بندگیاں ختم کر دی جائیں اور حضورؐ نے منصوص طور پر عبادت کا مفہوم اتباع بیان فرمایا ہے۔محض مراسم عبودیت تک اسے مخصوص و محدود نہیں کیا گیا۔جب عدی ابن حاتم کی طرف سے یہ سوال ہوا کہ ان لوگوں نے تو احبار و رہبان کو رب نہیں بنایا تو حضورؐ نے فرمایا "ہاں احبار و رہبان نے ان لوگوں کے لیے حلال و حرام مقرر کیا تو ان لوگوں نے ان کا اتباع کیا تو یہ لوگوں کی جانب سے احبار ورہبان کی عبادت تھی"۔پرستش پر لفظ عبادت کا اطلاق تو اس لیے ہوا ہے کہ مراسم پرستش بھی ایک قسم کی اطاعت ہے۔مراسم عبادت میں پوری طرح لفظ عبادت کا مفہوم نہیں سماتا بلکہ مراسم عبادت میں اصالتاً عبادت کا مفہوم نہیں ہے۔بلکہ ان کو بالتبع عبادت کہا گیا ہے۔جب لوگوں کے ذہنوں میں عبادت اور دین کا مفہوم خلط ملط ہو گیا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ جس عبادت اور دین کو ترک کرنے سے لوگ کافر ہو جاتے ہیں وہ صرف مراسم عبادت ہیں کہ جب کوئی یہ مراسم اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے بجالائے تو وہ اسلام سے نکل کر جاہلیت میں داخل ہو جاتا ہے۔مثلاً بتوں کی پوجا کرنا وغیرہ اور جو شخص بتوں کی پوجا نہ کرے' صرف اللہ وحدہ کی نماز پڑھے تو وہ شرک کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا۔اس کے بعد اسے کافر کہنا جائز نہیں ہے۔اس طرح وہ کسی اسلامی سوسائٹی میں وہ تمام حقوق حاصل کر سکتا ہے جو کسی حقیقی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔مثلاً اس کی جان' اس کا مال اور اس کی عزت محفوظ ہوتی ہے۔اور تمام دوسرے اسلامی حقوق بھی اسے حاصل ہوتے ہیں۔

یہ تصور دراصل خام خیالی پر مبنی ہے۔یہ عبادت کے مفہوم میں کمی کرنا ہے اور اسے محدود کرنا ہے۔بلکہ یہ اس لفظ کے مفہوم میں صریح تغیر اور تحریف ہے۔کیونکہ اس لفظ کا اصل مفہوم مکمل اطاعت اور ہمہ گیر نظام زندگی ہے اور اس مفہوم کی تصریح خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ہے۔جب آپؐ نے آیت

اتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ کی خود تشریح فرمائی۔اور حضورؐ کی تشریح اور تفسیر کے بعد کسی کے لیے مزید تفسیر کرنے کی کوئی گنجائش کہاں رہتی ہے؟

(اس سلسلے میں اس قیمتی بحث کو ضرور پڑھیں جو المسلم العظیم سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب "المصطلحات الاربعة فی القرآن" کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔جس میں الٰہ' رب' دین اور عبادت کا مفہوم بیان فرمایا ہے)

ہم نے فی ظلال القرآن میں بار بار اس نکتے کی وضاحت کی ہے۔اور اس کے علاوہ ہم نے اسلام کے تحریکی مزاج کے بارے میں جہاں جہاں لکھا ہے یا اللہ نے ہمیں لکھنے کی توفیق دی ہے۔ہم نے اس نکتے کی بار بار توضیح کی ہے۔اس

زاویہ سے یہاں بھی ہمیں یہ موقعہ مل جاتا ہے کہ حضرت ہود ؑ کے دور میں اسلام و جاہلیت کی جو کشمکش برپا تھی اور جس طرح اس سورت میں اس قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اس کشمکش کا اصل محور اور موضوع کیا تھا۔ اور حضرت ہود ؑ جو ان سے مطالبہ کر رہے تھے کہ

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۱۱ : ۶۱) کا مفہوم کیا تھا۔ حضرت ہود ؑ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ تم بتوں کے سامنے سجدے نہ کرو، ان کی نماز نہ پڑھو جب کہ لوگ اس دین کے مفہوم کو محدود کر کے اور سکیڑ کر سمجھتے ہیں اور اس طرح دین اور عبادت کو صرف مراسم عبادت اور پرستش تک محدود کر دیتے ہیں بلکہ حضرت ہود کا مطالبہ یہ تھا کہ تم پورے کے پورے، اپنی پوری زندگی کو اسلامی نظام میں داخل کر دو۔ اور کسی بھی معاملے میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو پوری زندگی میں۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ جس جرم کی وجہ سے قوم ہود ؑ ہلاک کی گئی۔ وہ صرف بتوں کے سامنے مراسم عبادت اور پرستش بجا لانے کا جرم نہ تھا، یہ تو ان کے ہمہ گیر جرم کا ایک پہلو تھا جس کی وجہ سے وہ مشرک ہو گئے تھے۔ اصل جرم یہ تھا کہ وہ اللہ کی آیات و ہدایات کے منکر تھے، رسولوں کی اطاعت کے بجائے ان کی نافرمانی کرتے تھے اور ان کے مقابلے میں دوسرے جباروں کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱ : ۵۹) اور یہ ہے قول رب العالمین اور اصدق القائلین کا کہ وہ (۱) آیات کا انکار کرتے تھے، (۲) رسول کی اطاعت نہ کرتے تھے، (۳) اور دشمن دین ڈکٹیٹروں کے مطیع فرمان تھے۔

اللہ کی آیات کا انکار تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسولوں کی نافرمانی اور جباروں کی اطاعت کرتے تھے۔ یہ درحقیقت ایک ہی فعل ہے کیونکہ جب کوئی شخص اللہ رسول کے ذریعہ ارسال کردہ قوانین کی مخالفت کرتا ہے تو وہ مجرد اس فعل سے طاغوت کے تابع ہو جاتا ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت سے نکل جاتا ہے۔ ان لوگوں نے چونکہ آیات الٰہیہ اور رسولوں کا انکار کیا اس لیے وہ اسلام سے نکل گئے اور مشرک ہو گئے۔ اس سے قبل ہم یہ بات ثابت کر آئے ہیں کہ اس کرۂ ارض پر سب سے پہلا دین، دین اسلام تھا۔ حضرت آدم جنت سے اترے تو وہ دین اسلام لے کر اترے۔ اور اس کرۂ ارض پر خلیفہ مقرر ہوئے۔ یہی دین ہے جسے حضرت نوح ؑ لے کر آئے اور پھر اسی کو لے کر وہ کشتی نوح ؑ سے اترے۔ اس کے بعد یوں ہوتا رہا کہ لوگ اسلام سے نکل کر جاہلیت میں داخل ہوتے اور اللہ رسول بھیج کر دوبارہ انہیں اسلام میں داخل کرتا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر عبادت کا مفہوم صرف یہی ہوتا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے مراسم عبادت بجا نہ لائے جائیں تو اس کے لیے اس قدر رسول بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی جو تاریخ انسانیت میں مبعوث ہوئے اور پھر اس کے لیے اس قدر جدوجہد اور قربانیوں کی بھی ضرورت نہ ہوتی جو اس مقصد کے لیے تاریخ میں دی گئیں اور تحریک اسلامی کے کارکنوں پر وہ مظالم ڈھانے کی ضرورت نہ ہوتی جو تاریخ کے مختلف ادوار میں اہل ایمان پر ڈھائے گئے۔ رسولوں کے یہ قافلے، اور یہ ان تھک جدوجہد اور راہ حق میں تشدد، مشکلات اور تکالیف ان سب امور کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ لوگوں کو پوری طرح

جاہلیت کے نظام سے نکال کر اسلامی نظام میں داخل کیا جائے اور یہ تبدیلی اور انتقال ان کی پوری زندگی میں ہو۔

الوہیت کی توحید' ربوبیت کی توحید' قیومیت کی توحید' حاکمیت کی توحید' قانون سازی کے مراجع کی توحید' نظام زندگی کی توحید' دین اور نظام حیات کے سلسلے میں ہدایات لینے کے مرجع کی توحید' غرض یہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر توحید ہی وہ مقصد تھا جس کے لیے رسول بھیجے گئے اور اس راہ میں اس قدر ہمہ گیر جہاد کیا گیا اور پوری انسانی تاریخ میں اس کے لیے داعیوں نے مشکلات کو برداشت کیا۔ ورنہ اللہ کی ذات تو غنی ہے اس کو اس کشمکش کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب جدوجہد اس لیے کی گئی کہ انسانوں کی زندگی کی اصلاح اس کے بغیر ممکن ہی نہ تھی۔ اس کے بغیر انسان کے لیے انسان بننا ہی ممکن نہ تھا۔ انسان من کل الوجوہ انسان تب ہی بن سکتا تھا جب وہ پوری طرح من کل الوجوہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ اس موضوع پر ہم انشاء اللہ اس سورت کے آخر میں دوبارہ بات کریں گے۔

ایک دوسری حقیقت جس کا انکشاف حضرت ہود ؑ نے اپنی قوم پر کیا وہ یہ ہے :

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱ : ۵۲) "اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو"۔

یہ وہی بات ہے جس کا تذکرہ میں نے حضور اکرم ؐ کی دعوت کے سلسلے میں اس سورت کے مقدمے میں کیا ہے۔ آغاز سورت میں آیات کتاب کے بارے میں فرمایا گیا تھا :

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ

(۱۱ : ۳) "اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے"۔

ایمانی اقدار اور عملی اقدار کے درمیان رابطے پھر اس کائنات کے طبیعی قوانین اور شرعی قوانین کے درمیان تعلق ان آیات میں بیان کیے گئے ہیں' جو اس دین کے بنیادی حقائق ہیں۔ ان رابطوں اور پوشیدہ حقائق کی نقاب کشائی نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے فکر و نظر کی صفائی کے لیے جو دنیا کے صرف ظاہری اور مادی پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ اور جن کی فکری دنیا اس قدر روشن نہیں ہے کہ جو ان حقائق کا ادراک کر سکیں یا انہیں دیکھ سکیں۔

وہ سچائی جو اس کتاب الہی میں پیش کی گئی ہے۔ وہ اس تکوینی سچائی سے متضاد نہیں ہے جو اللہ نے تخلیق کائنات میں ودیعت کر رکھی ہے۔ جو اس کائنات کے مزاج اور نوامیس فطرت میں بھی بالکل عیاں ہے۔ قرآن کریم بسا اوقات ان

دونوں حقائق کا یکجا ذکر کرتا ہے۔ یعنی وہ حقیقت جو دین اسلام میں ہے اور وہ حقیقت جو نظام کائنات میں ثبت ہے۔ یعنی عقیدۂ توحید اور کائنات کی طبیعت میں۔ قرآن کریم شرعی حکومت اور فطری حکومت میں فرق نہیں کرتا اور بے شمار آیات میں دینی حقائق اور کائناتی حقائق کو باہم مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات قابل غور ہیں:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (١٦) لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (١٧) بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (١٨) وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ (١٩) يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (٢٠) اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ (٢١) لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (٢٢) لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (٢٣) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (٢٤) وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (٢٥) (٢١: ١٦ تا ٢٥)

"ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتا ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹ جاتا ہے اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔

زمین اور آسمان میں جو مخلوق ہے وہ اللہ کی ہے اور جو فرشتے اس کے ہیں وہ نہ اپنے کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، دم نہیں لیتے۔ کیا ان لوگوں کے بنائے ہوئے ارضی خدا ایسے ہیں کہ بے جان کو اٹھا کر کھڑا کرتے ہوں؟

اگر آسمان و زمین میں ایک خدا کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ اس لیے پاک ہے 'اللہ رب العرش' ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے اور سب جوابدہ ہیں۔ کیا اسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے نبی، ان سے کہو کہ "لاؤ اپنی دلیل، یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے ساتھ والوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی"۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ حق سے بے خبر ہیں اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم

سے پہلے جو رسول بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو"۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (٥) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٦) وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (٧) (٢٢: ٥ - ٧) "لوگو اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس کو چاہتے ہیں ایک خاص وقت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی آکر رہے گی۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اور اللہ ضرور ان لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں"۔

---ooo---

وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٥٤) وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (٥٥) اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (٥٦) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (٥٧) وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ

اللّٰہِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۵۸)
لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (۵۹) ذٰلِكَ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا
عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۶۰) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ
الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (۶۱) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۶۲) اَلَمْ
تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ
(۶۳) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶۴) اَلَمْ
تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ يُمْسِكُ
السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۶۵) وَهُوَ
الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ (۶۶) لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا
مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى
مُّسْتَقِيْمٍ (۶۷) (۲۲: ۵۴ تا ۶۷) "اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں ' یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔

انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے یہاں تک کہ یا تو ان پر قیامت کی گھڑی اچانک آ جائے ' یا ایک منحوس دن کا عذاب نازل ہو جائے۔ اس روز بادشاہی اللہ کی ہو گی ' اور وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ جو ایمان رکھنے والے اور عمل صالح کرنے والے ہوں گے وہ نعمت بھری جنتوں میں جائیں گے ' اور جنہوں نے کفر کیا ہو گا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہو گا ' ان کے لیے رسوا کن عذاب ہو گا۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ' پھر قتل کر دیئے گئے یا مر گئے ' اللہ ان کو اچھا رزق دے گا اور یقیناً اللہ ہی بہترین رازق ہے۔ وہ انہیں ایسی جگہ پہنچائے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔ بے شک اللہ علیم و حلیم ہے۔ یہ تو ہے ان کا انجام ' اور جو کوئی بدلہ لے ' ویسا ہی جیسا اس کے ساتھ کیا گیا ' اور پھر اس پر زیادتی بھی کی گئی ہو ' تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اللہ معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے۔

یہ اس لیے کہ رات سے دن اور دن سے رات نکالنے والا اللہ ہی ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے - یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سب باطل ہیں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں اور اللہ ہی بالا دست اور بزرگ ہے - کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ لطیف و خبیر ہے - اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے' بے شک وہی غنی و حمید ہے - کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے' اور اسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے' اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا؟ واقعہ یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے وہی ہے جس نے تمہیں زندگی بخشی ہے' وہی تم کو موت دیتا ہے' اور وہی پھر تم کو زندہ کرے گا - سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی منکر حق ہے -

ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے' پس اے نبیؐ' وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں - تم اپنے رب کی طرف دعوت دو' یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو"۔

ان آیات اور ان جیسی دوسری قرآنی آیات میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ کی یہ کائنات بھی برحق ہے' اس کائنات کی تخلیق بھی سچائی پر ہے اور اس کائنات کی تدبیر بھی سچائی کے ساتھ اللہ کے مقرر کردہ قوانین قدرت کے مطابق ہے - اس کائنات کے تمام مظاہر بھی سچائی کے ساتھ انجام تک پہنچتے ہیں - اور یہ کتاب بھی سچائی کے ساتھ نازل ہوئی ہے اور اس کائنات میں اللہ نے جو انسان پیدا کیے ہیں ان کے درمیان فیصلے بھی اللہ سچائی کے ساتھ کرتا ہے - دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی - یہ سب امور سچائیاں ہیں اور سب کا منبع و مرجع ذات باری ہے جو بڑی سچائی ہے اور تمام قوتیں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ خیر کی قوتوں اور شر کی قوتوں کو جس طرح چاہتا ہے' استعمال کرتا ہے - جس طرح لوگ اس دارالامتحان میں اپنے آپ کو مستحق ٹھہراتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں توبہ و استغفار اور متاع حسن اور بارشوں اور آبادی ارض کا ذکر ایک جگہ آتا ہے - کیونکہ کائنات کی اخلاقی قدریں اور طبعی قدریں باہم مربوط ہیں - اس لیے کہ تمام فیصلے اللہ کے نظام قضا و قدر سے مربوط ہیں - کسی کے حق میں اچھے اور کسی کے حق میں برے فیصلے اللہ کے ہاں ہوتے ہیں لیکن اللہ کے نوامیس قدرت کے مطابق وہ نہایت منصفانہ ہیں -

اس ربط و تعلق کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی نظام میں ایمانی اور نظریاتی اقدار اور زندگی کی عملی اقدار میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا ہے - یہ دونوں اقدار انسانی زندگی میں یکساں موثر ہوتی ہیں - چاہے ان کا تعلق ان اسباب غیبی سے ہو جو انسان کے علم و ادراک سے ماوراء ہوں یا ان کا تعلق ان آثار و شواہد سے ہو' جنہیں انسان دیکھ سکتا ہے اور ان کی ضابطہ بندی کر سکتا ہے - یعنی وہ آثار جو ایمانی اقدار کے وجود کے نتیجے میں بطور لازمی اثرات نمودار ہوتی ہیں -

ایمانی اقدار کے نتیجے میں وجود میں آنے والی محسوس اقدار میں سے بعض کی طرف ہم نے اس سے قبل اشارہ کیا ہے' مثلاً یہ کہ اگر کسی سوسائٹی میں ایمانی تصورات اور شرعی نظام جاری ہو گا تو اس معاشرہ میں ہر فرد کو اس کی سعی کا عادلانہ اجر ملے گا - ہر فرد پر امن اور پر سکون زندگی بسر کرے گا' یہ امن و سکون اجتماعی نظام میں بھی ہو گا اور ایک فرد کی انفرادی زندگی میں بھی ہو گا اور اس کا مجموعی اثر یہ ہو گا کہ لوگ آخرت کی جزاء سے بھی قبل یہاں اس عارضی دنیا میں

بھی بھلائیاں پائیں گے ۔(ظلال ج ۱۰ ' ص ۲۷ ' ۲۹ ۔ ص ۵۱ ' ۔ ج ا ' ص ۱۰ ۔ ص ۱۲) نیز اس بارے میں ہم نے اس سے قبل کہا تھا کہ اسلامی نظام تب قائم ہو گا کہ معاشرے میں لوگوں کی افرادی قوت کو بے کار کاموں میں صرف ہونے سے بچایا جائے مثلاً گانا بجانا' عیش و عشرت اور جھوٹے خداؤں کے آستانوں پر چڑھا دے اور مراسم کو یکسر ختم کر دیا جائے اور لوگوں کو اس کرۂ ارض کی تعمیر اور دنیا میں بھلائی کے کاموں میں لگا کر خلافت فی الارض کے منصب کے تقاضوں کو پورا کیا جائے تاکہ یہاں لوگ اچھی زندگی بسر کر سکیں اور ان کو یہاں شریفانہ اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کے مواقع نصیب ہوں تب یہ دعویٰ درست ہو گا کہ لوگوں کی زندگیوں میں ایمان کے ثمرات نمودار ہو گئے ہیں (اس موضوع پر قدرے تفصیلی بحث اس سورت میں قصص کے اختتام پر کی جائے گی ۔ ان شاء اللہ)

---○○○---

اس قصے میں ہمیں یہ حقیقت بھی ملتی ہے کہ حضرت ہود اپنی قوم کے مقابلے میں دو ٹوک بات کرتے ہیں اور فیصلہ کن موقف اختیار کرتے ہیں ۔ وہ ان سے علانیہ طور پر مقاطعے کا اعلان کرتے ہیں ۔ وہ نہایت ہی شان برتری سے بات کرتے ہیں اور نہایت ہی خود اعتمادی سے اس حق بات پر جمے ہوئے ہیں جو ان کے اور رب کے درمیان طے شدہ ہے ۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۵٤) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۵۵) اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵٦) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَیْكُمْ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْــًٔا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ (۵۷) (۱۱ : ۵٤ تا ۵۷) ” ہود ؑ نے کہا ” میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں بیزار ہوں ۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو' میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو ۔ بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے ۔ اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو ۔ جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں ۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے ' یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے “ ۔

یہ ایک دلفریب منظر ہے ۔ تحریک اسلامی کے کارکن جہاں ہوں اور جس دور میں بھی وہ کام کر رہے ہوں' ان کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اس منظر کے سامنے ذرا طویل وقفہ کر کے غور کریں اور یونہی نہ گزر جائیں ۔ ایک فرد ہے ' داعی فرد ۔ اس پر ایمان لانے والوں کی تعداد معدودے چند ہے ۔ اس کا مقابلہ دنیا کی نہایت ہی ترقی یافتہ اور سرکش قوم سے ہے ۔ اپنے دور کی نہایت ہی مالدار قوم ہے ۔ اور اس قوم کے بارے میں خود قرآن کریم دوسرے مقام پر یوں منظر کشی کرتا ہے ۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ (١٢٣) اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ (١٢٤)
اِنِّي لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ (١٢٥) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (١٢٦) وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ
مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (١٢٧) اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ
(١٢٨) وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (١٢٩) وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ
جَبَّارِيْنَ (١٣٠) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (١٣١) وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا
تَعْلَمُوْنَ (١٢٣) اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ (١٣٣) وَّجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (١٣٤) اِنِّيْٓ
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (١٣٥) قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ
مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ (١٣٦) اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ (١٣٧) وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ

(١٣٨) (٢٦ : ١٢٣ – ١٣٨)) ”عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ ان کے بھائی ہود ؑ نے ان سے کہا تھا کہ کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو' جبار بن کر ڈالتے ہو۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے' اولاد دی' باغ دیئے اور چشمے دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے“۔ انہوں نے جواب دیا' ”تو نصیحت کر یا نہ کر ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یونہی ہوتی چلی آئی ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں“۔

یہ سخت سرکش' ڈکٹیٹر اور ظالم لوگ تھے اور جسے پکڑتے پھر ان کے دل میں رحم نہ ہوتا۔ اور یہ سرکشی ان میں ان کی دولت مندی اور ترقیات کی وجہ سے آگئی تھی یہ لوگ بڑے بڑے کارخانے اور محلات تعمیر کرتے تھے تو ان کا تصور یہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ یونہی رہیں گے۔ یہ لوگ تھے جن سے حضرت ہود کا مقابلہ تھا لیکن دیکھیے یہ کیا مقابلہ تھا۔ وہ کس بہادری کے ساتھ' کس اطمینان کے ساتھ اور کس خود اعتمادی کے ساتھ بات کرتے ہیں اور پھر ان کا چیلنج کس قدر دو ٹوک ہے' حق و باطل کو وہ کس طرح چھانٹ کر رکھ رہے ہیں۔ انہوں نے ان کو چیلنج دے دیا کہ تم جو سازشیں کر سکتے ہو کرو' جو کچھ تمہارے بس میں ہے' سامنے لاؤ۔ مجھے تو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

حضرت ہود ؑ ان کے مقابلے میں اس بہادری اور شجاعت کے ساتھ چیلنج کے انداز میں اس وقت آئے جب انہوں نے تبلیغ اور دعوت پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ اور انہوں نے یہ دعوت نہایت ہی پیار اور محبت کے انداز میں پیش کی

اس کے بعد انہوں نے یہ سخت رویہ اپنایا جبکہ انہوں نے دیکھا کہ مجرمین کفر پر اصرار کر رہے ہیں اور وہ اللہ اور اس کی پکڑ سے ذرہ برابر نہیں ڈرتے ۔

حضرت ہود ؑ نے یہ دوٹوک اور کھلا موقف اس لیے اختیار کیا کہ وہ اپنے نفس کے اندر اپنے رب کی حقیقت کو پاتے تھے ۔ ان کو یقین تھا کہ ان سرکش ' ظالم اور جبار لوگوں کی حیثیت ایسی ہی ہے جسے اس کرۂ ارض پر دوسرے درندے ہوتے ہیں اور ان کو یہ بھی یقین تھا کہ ان سب درندوں کی چوٹی اللہ کے دست قدرت میں ہے ۔ لہٰذا ان درندوں کی نہ اپنی کچھ قوت ہے اور نہ اپنی حیثیت ۔ یہ قوت اور حیثیت تو ان کو اللہ نے دی ہے ان کو جو افرادی قوت ' ٹیکنالوجی کی قوت اور انعامات اور دولت کی وافر مقدار دی گئی ہے تو یہ اللہ نے ان کو بطور آزمائش دی ہے ۔ یہ محض حب ہی نہیں ہے بلکہ آزمائش ہے ۔ اور اگر یہ لوگ آزمائش میں پورے اتر کر ان انعامات کا حق نہ اداکریں گے تو اللہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ ان سے سلب کر لے ۔ اور ان کی جگہ دوسری اقوام کو اٹھا دے جو شکرگزار ہوں اور اللہ جب چاہے ' یہ کر سکتا ہے ۔ اور یہ لوگ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے ۔ نہ یہ اللہ کے فیصلوں کو بدل سکتے ہیں ۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حضرت ہود ؑ ان سے کوئی خوف کھائیں جبکہ داتا اور محروم کرنے والا ان کا رب ہے ۔

میں یہ کہوں گا کہ اسلامی تحریکات کے کارکنوں کو اس نہج پر تربیت کر کے باری تعالیٰ کی حقیقت کو اپنی شخصیات کے اندر بسانا چاہئے اور صرف اسی صورت میں وہ اس کرۂ ارض میں جاہلیت کی جبار و قہار قوتوں کا مقابلہ کر سکیں گے ۔ رہی سائنس اور ٹیکنالوجی کی قوت ' صنعت و حرفت کی قوت ' مال و دولت کی قوت ' انسانی علوم اور تجربوں کی قوت ' انتظامیہ اور مسلح اداروں کی قوت اور مشینری اور صلاحیتوں کی قوت تو ان تمام قوتوں کا مقابلہ ایک مسلم اپنی اس ایمانی قوت کے بل بوتے پر کر سکتا ہے کہ اللہ کے دست قدرت میں سب کی چوٹی ہے ۔ اور اللہ کے مقابلے میں تمام انسان اس طرح بے بس ہیں ۔ جس طرح کسی جانور کو چوٹی سے پکڑ کر قابو کر لیا جاتا ہے ۔

ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اسلام کے داعیوں کو اپنی قوم کے مقابلے میں اس نہج کا دوٹوک انداز اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ اور جب کوئی داعی تحریک اس طرح کا فیصلہ کن موقف اختیار کرتی ہے تو پھر قوم دو حصوں میں بٹ جاتی ہے ۔ ایک امت حزب اللہ ہوتی ہے جو صرف اللہ کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہے اور دوسری امت اللہ کے سوا دوسرے ارباب اور جھوٹے خداؤں کے لیے لڑ رہی ہوتی ہے ۔ اور دشمن دین اور دشمن خدا ہوتی ہے ۔

جب کوئی تحریک یہاں تک آ پہنچتی ہے تو پھر اس وقت اچانک اللہ کی نصرت آ جاتی ہے ۔ اللہ پھر اپنے دوستوں اور اولیاء کی مدد کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کو پاش پاش کر دیتا ہے اور یہ مدد ایک ایسے گوشے سے آتی ہے جس کے بارے میں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایسا ہو سکتا ہے ۔ تحریک اسلامی کی تاریخ ' حضرت آدم ؑ کے بعد آج تک گواہ ہے کہ اللہ کی مدد اس وقت تک نہیں آتی جب تک اولیاء اللہ اور اولیائے جاہلیت کے درمیان مکمل مقاطعہ نہیں ہو جاتا اور جب تک یہ دونوں گروپ آمنے سامنے نہیں آ جاتے اور یہ علیحدگی صرف عقیدے کی اساس پر نہیں ہو جاتی ۔ اور حزب اللہ کے کارکن صرف اللہ پر اعتماد نہیں کر لیتے اور ان کا بھروسہ صرف اللہ پر نہیں ہو جاتا ۔ اور وہ یہ اعلان اور یقین نہیں کر لیتے کہ اللہ کے سوا اب ان کا کوئی ناصر و مددگار نہیں ہے ۔

---○○○---

پارہ نمبر ۱۲

حضرت ہود ؑ کے قصے کے الہامات و اشارات کے بارے میں ' میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر کافی ہے ۔ اب ہم حضرت صالح ؑ کے قصے کی طرف آتے ہیں ۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾

"اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح ؑ کو بھیجا ۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو ' اللہ کی بندگی کرو ' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے ۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسایا ہے ۔ لہٰذا تم اس سے معافی چاہو ' اور اس کی طرف پلٹ آؤ ' یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے" ۔

بنیادی کلمہ اور نعرہ ایک ہی ہے ۔ وہی عقیدہ حضرت صالح ؑ بھی پیش کرتے ہیں جو حضرت ہود ؑ نے پیش فرمایا :

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (۱۱ : ۶۱) "اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو ' اللہ کی بندگی کرو ' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں" ۔ اور نظام اور مقاصد بھی وہی ہیں ' کوئی تغیر نہیں ہے ۔

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ (۱۱ : ۶۱) "لہٰذا تم اس سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ" ۔ پھر ذات باری کی معرفت کا اندازہ بھی وہی ہے ' کیونکہ ذات باری کے بارے میں پیغمبر کی سوچ بھی وہی ہے جس طرح ان کو احساس ہوتا ہے :

اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۱۱ : ۶۱) "یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے" ۔

لیکن حضرت صالح ؑ ان کو یاد دلاتے ہیں کہ ذرا سوچو ' اللہ تعالیٰ نے تمہارے وجود کو اس کرۂ ارض پر کس طرح پیدا کیا ۔ یہ کہ تمہاری نوع کو کس طرح پیدا کیا اور اس جنس و نوع کے افراد کو کس طرح پیدا کیا ۔ تمہارے جسم کے اجزائے ترکیبی وہی ہیں جو اس زمین کے ہیں لیکن تم اس زمین کے خلیفے اور مختار ہو ' اور تمہاری نوع کو جاری رکھ کر اللہ نے تمہارے منصب خلافت کو اس کرۂ ارض پر برپا رکھا ۔ یہاں لفظ ربی کی اضافت ' اور لفظ قریب اور مجیب میں جو تصور دیا گیا ہے ' وہ وہی ہے جو اللہ کے مختار اور برگزیدہ بندوں کے احساس و شعور کا حصہ ہوتا ہے ۔ ان الفاظ سے فضا میں انس اور محبت قرب اور اتصال کی جھلک پیدا ہوتی ہے ۔ اور اس کے اثرات ہر اس شخص پر پڑتے ہیں جو سننا چاہے ' یا اس کے اندر فی الحقیقت قوت سمع موجود ہو ۔

لیکن ان لوگوں کے دل اس قدر مسخ ہو گئے تھے 'اس قدر بگڑ گئے تھے 'اور ان کی ماہیت اس قدر بدل گئی تھی کہ وہ اس کلام کے کمال و جمال کو سمجھنے سے عاجز تھے۔ وہ اس کلام کی جلالت قدر اور بلند تصورات و نظریات کے ادراک سے قاصر تھے۔ یہ کلام کس قدر نرم اور تشفی بخش ہے 'کس قدر صاف اور روشن ہے۔ لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس کو سن کر کس قدر ناموافق ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ذرا سنئے اور غور کیجئے :

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

"انہوں نے کہا "اے صالح " اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"۔

ہماری امیدیں تم سے وابستہ تھیں۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ تمہارا علم 'تمہاری عقلمندی' تمہاری سچائی اور تمہارا حسن تدبیر یہ سب صلاحیتیں ہمارے لیے مفید ثابت ہوں گی لیکن یہ امیدیں سب کی سب اکارت گئیں اور ہم لوگ مایوسی کا شکار ہو گئے۔

اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱ : ۶۲) "کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے"۔ یہ تو ایک تباہ کن بات ہے۔ ہم ہر بات برداشت کر سکتے ہیں مگر یہ بات برداشت نہیں کر سکتے اور ہمیں تم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ یہ بات تمہارے منہ سے نکلے گی۔ تم سے ہمیں جو بلند توقعات تھیں' وہ ڈھیر ہو گئیں۔ اس پر مزید یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ جو بات تم کرتے ہو اس سے ہم گہرے شک میں ہیں۔ یہ شک اس قدر قوی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں ایک مستقل خلجان بیٹھا ہوا ہے۔

وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۱۱ : ۶۲) "تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے"۔ اس طرح یہ لوگ ایک ایسے معاملے میں تعجب کر رہے تھے جس میں تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ وہ ایک لازمی اور فرض بات کو ایک ناپسندیدہ امر تصور کرتے تھے۔ ان کو اپنے بھائی سے محض اس لیے وحشت ہونے لگی کہ وہ انہیں صرف ایک خدا کی بندگی کی طرف بلا رہے تھے اور جو وحشت انہیں کسی دلیل کی بنا پر نہ تھی' نہ انہوں نے اس معاملے پر کوئی تحقیق یا غور و فکر کیا تھا بلکہ محض اس لیے تھی کہ ان کے آباء و اجداد متعدد الٰہوں کی پوجا اور پرستش کرتے تھے۔

آباؤ اجداد کے رسم و رواج پر چلتے چلتے لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ جمود کا شکار ہو جاتے ہیں اور ثابت شدہ اور واضح سچائی پر تعجب کرنے لگتے ہیں۔ عقائد پر دلیل و برہان پیش کرنے کی بجائے عقائد کو اپنے آباؤ اجداد کے عمل سے

ثابت کرتے ہیں۔ ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عقیدۂ توحید دراصل ذہنی جمود کے خلاف بغاوت ہے اور یہ عقیدہ انسان کو فکری آزادی عطا کرتا ہے اور یہ ہدایت کرتا ہے کہ عقل انسانی کو آباؤ اجداد کے رسوم و قیود سے آزاد کیا جائے۔ اسی طرح وہم و خرافات سے بھی، عقل انسانی کو نجات دی جائے اور ایسے عقائد کو قبول کیا جائے جنے عقل تسلیم کرتی ہو اور جس پر کوئی سند موجود ہو۔

اہل ثمود نے صالح ؑ کو جو کہا۔ قَالُوا يَصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا (۱۱: ۶۲) ”انہوں نے کہا ”اے صالح ؑ“ اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں“۔ یہی توقعات اہل قریش درحقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے تھے۔ جب حضورؐ نے ان کو بتایا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے تو ان لوگوں نے حضورؐ سے ایسی ہی وحشت کا اظہار کیا جس طرح قوم صالح ؑ نے حضرت صالح ؑ سے کیا۔ جس طرح انہوں نے کہا کہ تو ساحر ہے اور افترا باندھنے والا ہے۔ اسی طرح انہوں نے بھی یہی کہا اور شہادت حق دینے سے انکار کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت کا ہمیشہ ایک ہی مزاج ہوتا ہے اور پوری اسلامی تاریخ میں پیغمبر اور احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک کیا گیا۔ اور پھر پیغمبروں نے بھی پوری تاریخ میں ایک ہی بات کی۔ چنانچہ حضرت صالح ؑ اور حضرت نوح ؑ کی بات بالکل ایک ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

”صالح ؑ نے کہا ”اے برادران قوم، تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا، اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا، اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ سکتے ہو، سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو“۔

اے میری قوم، تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تو اپنے نفس میں اپنے رب کی حقیقت کو واضح طور پر پاتا ہوں اور یہ ربانی حقیقت مجھے صاف صاف بتاتی ہے کہ جس راہ پر میں چل رہا ہوں وہ بالکل واضح اور حقیقی ہے۔ پھر اس پر مزید فضل مجھ پر یہ ہوا ہے کہ اللہ نے مجھے منصب رسالت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اور اللہ نے مجھے وہ صلاحیتیں دی ہیں جو اس منصب کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی میں اللہ کی نافرمانی کروں اور تبلیغ دین میں قصور کا ارتکاب کروں تو میری مدد کون کرے گا؟ کیا میں تمہاری امیدوں کا پاس رکھوں یا اپنی نجات کی فکر کروں؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے انجام کو محض اس لیے داؤ پر لگا دوں کہ تمہاری امیدیں پوری ہوں۔

فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱: ۶۳) ”تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا، اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ سکتے ہو، سوائے اس کے کہ

مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو"۔ اگر میں تمہاری آرزوؤں کا خیال رکھوں تو میں عظیم خسارے میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں اللہ کے غضب کا مستحق ہو جاؤں گا۔ اور منصب رسالت سے معزول کر دیا جاؤں گا۔ دنیا میں بھی شرمندگی ہوگی اور آخرت میں بھی اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکوں گا۔ اور یہ ایک عظیم اور مسلسل خسارہ ہو گا۔ چنانچہ یہ تباہ کن اور ناقابل برداشت گھاٹا ہو گا۔

وَ يٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾

"اور اے میری قوم کے لوگو' دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے۔ اسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعرض نہ کرنا ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا"۔

یہاں قرآن کریم نے اس ناقہ کے بارے میں تفصیلات نہیں دی ہیں جو ان کے لیے ایک نشانی اور علامت تھی۔ لیکن اس ناقہ کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ "اللہ کی اونٹنی" ہے۔ اور تمہارے لیے یہ ایک نشانی ہے۔ ان ریمارکس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ممتاز اونٹنی تھی اور وہ جانتے تھے کہ یہ ان کے لیے اللہ کی جانب سے ایک نشانی ہے۔ بس ہم بھی یہاں صرف ان باتوں پر اکتفاء کرتے اور ناقہ صالح ؑ کی بارے میں اسرائیلی روایات کے مطابق مفسرین نے جو رطب و یابس جمع کی ہیں ان کے ساتھ یہاں تعرض نہیں کرتے۔

هٰذِهِ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ

(۱۱ : ۶۴) "دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے۔ اسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعرض نہ کرنا"۔ ورنہ اللہ تمہیں بہت جلد پکڑ لے گا اور عذاب دے گا۔ عبارت میں فاء تعجیل کے لیے ہے۔

فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ (۱۱ : ۶۴) "ورنہ کچھ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آ جائے گا"۔ یعنی تم اللہ کی شدید پکڑ میں آ جاؤ گے۔ انداز تعبیر محض عذاب نازل ہونے یا عذاب کے نزول سے کہیں زیادہ کسی چیز کو ظاہر کر رہا ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

"مگر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس پر صالح ؑ نے ان کو خبردار کر دیا کہ "بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔ یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی"۔ انہوں نے ناقہ کی ٹانگیں کاٹ دیں (فعقروھا) اور اس انداز میں اسے قتل کر دیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر مفسد تھے اور کس قدر بے باک تھے۔ سیاق کلام

میں یہاں نزول ناقہ اور قتل ناقہ کے درمیان مدت کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا گیا۔کیونکہ مدت کے ذکر کا دعوت دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔وہ محض ایک تاریخی پہلو ہے۔البتہ قتل ناقہ کے بعد سیاق کلام میں ان کے عذاب کا ذکر آ جاتا ہے۔یہاں واقعات کے تمام مراحل کو فاء تعقیب کے ساتھ لایا جاتا ہے یعنی پس یہ ہوا' پس یہ ہوا۔

فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ أَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ

(۱۱: ۶۵) "مگر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا۔اس پر صالح ؑ نے ان کو خبردار کر دیا کہ "بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی"۔یعنی اب تمہاری مہلت زندگی صرف تین دن رہ گئی اور یہ میعاد ایسی ہے جس میں کوئی تغیر و تخلف نہیں ہو سکتا۔اب یہ فائنل آرڈر ہے۔فاء تعقیب سے یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات آگے پیچھے وقوع پذیر ہوئے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾

"آخرکار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح ؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے' بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔بے شک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالادست ہے۔رہے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے"۔

جب اللہ کے امر کا وقت قریب ہو گیا اور امر یہ تھا کہ یا تو یہ لوگ ڈر جائیں اور ایمان لے آئیں ورنہ پھر انہیں نیست و نابود کر دیا جائے تو اس وقت ہم نے حضرت صالح ؑ اور ان پر ایمان لانے والے ساتھیوں کو اپنی رحمت کی وجہ سے نجات دی۔یہ نجات صرف ان کے لیے تھی اور ان کے ساتھ مخصوص تھی۔یعنی ان کو موت سے بھی نجات دی اور اس دن کی شرمندگی اور ذلت سے بھی نجات دی کیونکہ ان کو زندگی سے معمول کے مطابق محروم نہیں کیا گیا بلکہ بڑی ذلت کے ساتھ ان سے حیات کو چھینا گیا۔اور جب ایک سخت آواز نے ان کو آ لیا تو یہ سب کے سب مر گئے۔اور جو جہاں تھا' وہیں گر گیا اور یہ ان کے لیے ذلت آمیز موت تھی۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (۱۱: ۶۶) "بے شک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالادست ہے"۔وہ نافرمانوں کو خوب پکڑتا ہے اور یہ کام اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔اسی طرح وہ اپنے دوستوں کی خوب رعایت بھی کرتا ہے اور ان پر فضل بھی کرتا ہے۔

اب یہاں قرآن مجید اشارہ بتاتا ہے کہ اس عذاب کے نتیجے میں ان کی حالت کیا ہو گئی ۔ تعجب انگیز اور عبرت آموز طریقے سے بتایا جاتا ہے کہ وہ کس قدر عجلت کے ساتھ نیست و نابود کر دیئے گئے ۔

كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ؕ

"گویا وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے" ۔ گویا ان بستیوں میں کبھی انہوں نے قیام ہی نہ کیا تھا اور نہ عیش و عشرت کی تھی ۔ یہ نہایت مؤثر نظر ہے 'پر تاثیر احساس ہے ۔ یہ منظر زندگی اور موت کے درمیان ایک کھلا منظر ہے ۔ لیکن چشم زدن میں یہ نظر کے سامنے سے گزر جاتا ہے اور نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد گویا زندگی ایک ٹیپ ہے ۔ جو تیزی سے گزر رہی ہے اور نظریوں آتا ہے کہ شاید خواب و خیال تھا ۔

اب اس قصے پر حسب سابق آخری تبصرہ یہ ہے کہ ملامت اور لعنت کے ساتھ اس صفحے کو لپیٹ دیا جاتا ہے ۔ اور یہ منظر جس طرح نظروں سے اوجھل ہوتا ہے 'اسی طرح لوح حافظہ سے بھی مٹ جاتا ہے ۔

٦
أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ﴿٦٨﴾ ٨ ع

"سنو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا ۔ سنو! دور پھینک دیئے گئے ثمود!" ٦

---O O O---

ایک بار پھر ہمارے سامنے 'اس قصے کی صورت میں دعوت اسلامی کی تاریخ کی ایک لڑی موجود ہے ۔ وہی دعوت ہے جو حضورؐ دے رہے ہیں ۔ اسلامی نظام کے وہی خدوخال ہیں جو حضورؐ پیش کر رہے ہیں ۔ دعوت یہ دی جا رہی ہے کہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرو' صرف اللہ کے وضع کردہ نظام زندگی کو اپناؤ ۔ ہمیں نظر آتا ہے کہ جاہلیت اور اسلام کی وہی کشمکش ہے جو مکہ میں برپا ہے ۔ شرک اور توحید کی ٹکر ہے ۔ اہل ثمود بھی ان لوگوں میں سے تھے جو عاد کی طرح کشتی نوح میں بچ گئے تھے ۔ کشتی نوح کے سواروں کی اولاد تھے لیکن وہ اپنے حقیقی دین' دین نوح سے منحرف ہو کر جاہلیت میں ڈوب گئے تھے اور تاریخ کے اس مرحلے میں حضرت صالح ؑ اب ان کی اصلاح کے لیے مامور ہوئے تھے تاکہ ان کو از سر نو اسلام میں داخل کر دیں ۔

اس قصے میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انہوں نے خود ایک خارق عادت معجزے کا مطالبہ کیا تھا ۔ یہ معجزہ انہیں دکھا دیا گیا لیکن انہوں نے اس کا جواب ایمان اور قبول حق کے ساتھ نہ دیا بلکہ انہوں نے صاف صاف انکار کر دیا اور ناقہ کی ٹانگیں کاٹ کر اسے ہلاک کر دیا ۔

مشرکین عرب بھی حضورؐ سے ایسے ہی خارق عادت معجزات کے طلبگار تھے تاکہ وہ ایمان لائیں تو ان کو سمجھایا جاتا ہے کہ قوم صالح ؑ نے بھی معجزات طلب کیے ۔ وہ آگئے انہوں نے نہ مانا اور ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ معجزات طلب نہیں کیا کرتے ۔ اسلام تو ایک سادہ اور فطری دعوت ہے' اس کے قبول کرنے کے لیے کسی معجزے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس لیے محض غور و فکر اور تعقل و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن جاہلیت کی وجہ سے لوگوں کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی عقل مسخ ہو جاتی ہے ۔

اس قصے میں بھی ہمارے سامنے حقیقت باری اپنے اس رنگ میں آتی ہے جس طرح اللہ کے مختار بندوں کے ذہنوں میں وہ موجود ہوتی ہے یعنی اللہ کے رسولوں کے ذہن میں۔ حضرت صالح ؑ کے قول پر ذرا غور فرمائیں :

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (۱۱ : ۶۳) "صالح نے کہا 'اے برادران قوم' تم نے کچھ اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا' اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آ سکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور خسارے میں ڈال دو"۔ اور یہ اظہار حضرت صالح ؑ نے اس کے بعد کیا۔

اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ (۱۱ : ۶۱) "میرا رب قریب ہے اور وہ دعاؤں کا جواب دینے والا ہے"۔ ذات باری کی حقیقت حضرات انبیاء کے اذہان و قلوب میں اس طرح منعکس ہوتی ہے اور اس طرح جمال و کمال کے ساتھ موجود ہوتی ہے کہ اس شان سے وہ کسی اور کے دل میں نہیں ہوتی۔ کیونکہ انبیاء کے دل آئینہ کی طرح صاف ہوتے ہیں اور ان میں ذات باری کا انعکاس نہایت ہی صفائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور نہایت ہی منفرد شان کے ساتھ۔

اس قصے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمیں اس میں نظر آتا ہے کہ جاہلیت اپنے آپ کو ہدایت کی شکل میں پیش کرتی ہے اور ہدایت کو ضلالت کے بارے میں۔ اور وہ نہایت ہی عیاری سے سچائی پر تعجب کرنے لگتی ہے۔ وہ سچائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ صالح علیہ السلام سے ان کی قوم نے بہت امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں' کیونکہ وہ ایک صالح' عقلمند' بااخلاق اور پسندیدہ نوجوان تھے۔ لیکن اب قوم ان کے بارے میں سخت مایوسی کا اظہار کرتی ہے۔ یہ کیوں؟ یہ محض اس لیے کہ وہ ان کو اسلامی نظام زندگی کی طرف بلاتے ہیں' صرف اسلامی نظام کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں اور ان کی دعوت آباؤاجداد کی موروثی ڈگر سے مختلف ہے۔

یاد رہے کہ انسانی فکر و نظر اگر جادۂ مستقیم سے بال برابر بھی ادھر ادھر ہو جائے تو ضلالت و گمراہی کی کسی حد پر وہ رکتی نہیں ہے۔ آخر کار انسانی سوچ کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے نہایت ہی واضح اور سادہ سچائی بھی گمراہی نظر آتی ہے اور وہ سچائی کو سن کر تعجب کرنے لگتا ہے۔ اور انسانی سوچ اور تصور اس قدر محدود ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر سادہ سے سادہ حقیقت بھی نہیں سماتی۔ اور کوئی فطری اور سیدھی منطق بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

دیکھیے! حضرت صالح ؑ ان سے کہتے ہیں کہ اے قوم صرف اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے سوا تمہارا اور کوئی الہ نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور یہاں تمہیں ترقی دی۔ وہ پکارتے ہیں کہ دیکھو تم اس کرۂ ارض پر موجود ہو' یہ وجود تمہیں اللہ نے بخشا ہے' یہ ایک حقیقت ہے جسے تم دیکھتے ہو اور جس کا تم انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو خود نہیں پیدا کیا اور نہ خود اپنے لیے حیات اور رزق کا انتظام کیا ہے۔

یہ بات بالکل واضح بھی تھی' کیونکہ وہ اس حقیقت کا انکار بھی نہ کرتے تھے کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ وہی ہے جس نے انسان کو وہ عقل دی ہے جس کے ذریعے وہ اس کرۂ ارض کو ترقی دے رہا ہے لیکن وہ اس صغریٰ کبریٰ کو تسلیم

کرنے کے بعد اس کا منطقی نتیجہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے کہ اللہ ہی اللہ ہے اور اس نے انسان کو یہاں خلیفہ و مختار بنایا ہے۔ لیکن اس پر لازم کیا ہے اور اس کے لیے مناسب بھی یہی ہے کہ وہ صرف اللہ کی ربوبیت کو تسلیم کرے۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے اور نہ اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کرے۔ یہی سادی حقیقت تھی جس کی طرف حضرت صالح ؑ دعوت دیتے تھے۔

(یٰقَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ) مسئلہ کیا تھا؟ مسئلہ الوہیت و ربوبیت کا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کون حاکم اور مطاع ہو گا۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے گرد تمام انبیاء کے مشن گھومتے ہیں اور اس کے گرد انبیاء کے بعد تمام دعوتی تحریکیں گھومتی ہیں اور یہی ہے آج بھی اسلام اور جاہلیت کی کشمکش کا محور۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۲ ایک نظر میں

اب حضرت نوح ؑ کے دور کے بعد' دوسرے ادوار میں کاروان تاریخ اسلامی میں داخل ہوتا ہے - اب منصۂ تاریخ پر کچھ اور بابرکت اقوام آتی ہیں اور کچھ اور ایسی اقوام آتی ہیں جنہیں عاد وثمود کی طرح ہلاک کیا گیا۔ حضرت ابراہیم ؑ کے واقعات زندگی کے ایک پہلو کو یہاں لیا جاتا ہے - آپ کے قصے میں خیر و برکت کا جو پہلو ہے اس پر ایک نظر ڈال کر ہمیں تاریخ حضرت لوط ؑ کی قوم کی طرف بڑھ جاتی ہے جو مستحق عذاب ٹھہری اور جسے سخت عذاب دیا گیا۔ حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت لوط ؑ کے قصص میں اللہ کا وہ وعدہ حقیقت کا روپ اختیار کرتا ہے جو اللہ نے حضرت نوح ؑ سے کیا تھا۔ کہا گیا تھا۔

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۱ : ۴۸) "کہا گیا اے نوح' ہماری جانب سے سلامتی کے ساتھ اتر جا اور برکتوں کے ساتھ تم پر اور ان اقوام پر جو تمہارے ساتھ ہیں - اور ان اقوام پر جن کو ہم عنقریب متاع دیں گے اور اس کے بعد ان کو ہماری جانب سے عذاب الیم پکڑ لے گا"۔ برکات کے مستحق تو حضرت ابراہیم ؑ اور آپ کی اولاد ہوئی اور آپ کی اولاد حضرت اسحٰق اور حضرت اسماعیل ؑ کی اولاد سے انبیاء آئے اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے آخر میں آئے حضرت ابراہیم ؑ کی اولاد میں سے بعض مستحق عذاب بھی ہوئے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۲ تشریح آیات

۶۹ ---- تا ---- ۸۳

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى

"اور دیکھو، ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوشخبری لیے ہوئے پہنچے"۔ یہاں قرآن کریم نے خوشخبری کے بیان کو بعد میں آپ کی بیوی کی موجودگی کے وقت تک موخر کر دیا کیونکہ یہاں تو ابھی قاری کو معلوم نہیں کہ آنے والے فرشتے ہیں۔ یہاں مفسرین نے ان آنے والوں کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں ہم ان کے ذکر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ تفصیلات بلا دلیل ہیں:

قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ

"کہا تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا (ان کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا"۔

حضرت ابراہیم عراق کے کلدانیوں میں پیدا ہوئے اور یہاں سے انہوں نے ہجرت کر کے دریائے اردن کو عبور کرتے ہوئے کنعان کی صحرائی سرزمین میں بود و باش اختیار کر لی۔ اور جس طرح دیہاتی لوگوں کا رسم و رواج ہوتا ہے، وہ مہمانوں کو دیکھتے ہی گھر گئے اور آنے والوں کو مہمان سمجھ کر ان کے لیے کھانا حاضر کیا۔

کھانا عجل سمین تھا یعنی گرم پتھروں پر بھنا ہوا بچھڑے کا گوشت، لیکن مہمان تو فرشتے تھے اور فرشتے ظاہر ہے کہ کھانا نہیں کھاتے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ تو کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے تو ان کو پریشانی لاحق ہوئی۔ کیونکہ دیہاتی رسم و رواج کے مطابق جو شخص کھانا نہیں کھاتا، اس سے یہ خوف کیا جاتا ہے کہ شاید یہ کسی جنایت، اور دشمنی کا ارادہ رکھتا ہے جبکہ تمام دیہاتی لوگ کھانا کھانے کے بعد اہل خانہ کے ساتھ برائی کا ارتکاب کرنے سے ابا کرتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ مہمان کھانا نہیں کھا رہے تو قدرتی طور پر انہیں خوف دامن گیر ہوا اور طرح طرح کی باتیں سوچنے

لگے ۔ غرض اس صورت حالات کو دیکھ کر انہوں نے مناسب سمجھا کہ اپنا تعارف کرادیں اور اپنی مہم سے ان کو آگاہ کر دیں ۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾

"انہوں نے کہا" ڈرو نہیں' ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں" ۔ حضرت ابراہیم ؑ تو فوراً سمجھ گئے کہ قوم لوط ؑ کی طرف فرشتوں کے بھیجنے کے کیا معنی ہیں' لیکن اچانک روئے سخن ایک ایسے موضوع کی طرف مڑ گیا جو زیر بحث نہ تھا ۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾

"ابراہیم ؑ کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی ۔ وہ یہ سن کر ہنس دی ۔ پھر ہم نے اس کو اسحٰق ؑ کی اور اسحٰق ؑ کے بعد یعقوب ؑ کی خوشخبری دی" ۔

حضرت ابراہیم ؑ کی بیوی کیوں ہنس پڑی ۔ اس لیے کہ اسے بھی معلوم تھا کہ حضرت لوط کس برائی اور غلاظت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں ۔

اور وہ چونکہ بانجھ تھی اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی تھی اور اس طرح وہ معمر ہو گئی تھی اس لیے اس کے لیے یہ خوشخبری ایک عجوبہ تھی اور یہ خوشی اس وقت دوگنی ہو گئی جب ان کو خوشخبری دی گئی کہ حضرت اسحٰق ؑ کی اولاد میں حضرت یعقوب ؑ پیدا ہوں گے ۔ عورت اور پھر بانجھ عورت کو اگر اس قسم کی خوشخبری ملے تو لازمی ہے کہ وہ غیر معمولی اور اچانک خوشی کا مظاہرہ کرے گی ۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

"وہ بولی" ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہو گی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہو گئی اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے" ۔

فی الواقعہ یہ ایک عجیب بات تھی ۔ ایک معین مدت کے بعد عورت کا حیض ختم ہو جاتا ہے ۔ اور اس کے بعد اس کا حمل رک جاتا ہے لیکن اللہ کی قدرت اپنے قوانین کی پابند نہیں ہے ۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

"فرشتوں نے کہا" اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم ؑ کے گھر والو' تم لوگوں پر اللہ کی رحمت اور اس کی

برکتیں ہیں ' اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے "۔

بے شک امر الٰہی میں تعجب کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ کیونکہ اگر ایک روٹین کسی حکم کے مطابق چل رہی ہو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس عادت اور حکم کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن جب اللہ کی حکمت چاہے تو یہ روٹین بدل بھی سکتی ہے ۔ یہاں اللہ نے حضرت ابراہیم ؑ کے گھرانے پر رحم کرتے ہوئے اس کو بدلا لیکن جب ہمیں بظاہر نظر آتا ہے کہ واقعات کی روٹین بدل گئی ہے اور کوئی واقعہ خلاف عادت ہے تو بھی دراصل وہ ایک گہری عادت کے مطابق ہوتا ہے ۔ کیونکہ ہمیں سنن الٰہیہ کا بالاستیعاب علم حاصل نہیں ہے ۔ اس کی حدود بہت ہی وسیع ہیں ۔ ہم تو ایک حد تک حقائق کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ حد بہت ہی مختصر اور محدود ہوتی ہے جبکہ ہم واقعات کی حقیقت کا استقراء اور استیعاب کرنے سے قاصر ہیں ۔

جو لوگ ذات باری کی قدرت و حکمت کو اپنے علم کے محدود پیمانے سے ناپتے ہیں ۔ حتی کہ وہ لوگ جو اللہ کی مشیت کو خود اللہ کے بنائے ہوئے قواعد میں محدود کرتے ہیں ۔ اس قسم کے لوگ ذات باری کی ماہیت اور حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکے ۔ کیونکہ اللہ کی مشیت خود اللہ کے بنائے ہوئے قواعد سے بھی آزاد ہے ' اللہ کی مشیت خود اللہ کے بنائے ہوئے نوامیس قدرت کی پابند بھی نہیں ہے ۔

• یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کو ان قوانین قدرت کے مطابق چلاتا ہے جو اس نے اس جہاں کے لیے تیار کیے ہیں لیکن یہ ایک علیحدہ بات ہے اور یہ کہنا کہ اللہ کی مشیت قوانین طبیعیہ کی پابند ہے تو یہ ایک دوسری بات ہے ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ قوانین طبیعیہ ٹھیک ٹھیک چلتے ہیں اور لیکن ہر مرتبہ ان کا جزئی عمل جو اثرات مرتب کرتا ہے وہ اللہ کے حکم سے کرتا ہے ۔ یہ اثرات خود کار طور پر ظاہر نہیں ہوتے ۔ تو اگر کسی موقعہ پر اللہ تعالیٰ یہ حکم کر دے کہ کوئی جزوی طبیعی عمل وہ اثرات نہیں ظاہر کرے گا تو ایسا نہ ہو گا اور پھر ہم یہ نہ کہیں گے کہ اللہ کا قانون قدرت بدل گیا ہے بلکہ درست یہ ہو گا کہ قانون قدرت اب یہ ہے جو خارق عادت نظر آتا ہے ۔ لہٰذا نوامیس قدرت اور قوانین طبیعت دراصل اللہ کے ارادے کا مظہر ہوتے ہیں جب اللہ کا ارادہ کچھ اور چاہتا ہے تو وہ اور قانون قدرت بن جاتا ہے ۔ اصل قانون قدرت اللہ کا بے قید ارادہ ہے ۔

چنانچہ یہاں حضرت ابراہیمؑ مطمئن ہو گئے کہ یہ اللہ کے نمائندگان قدرت ہیں اور پھر وہ اس پر بھی مطمئن ہو گئے کہ ان کے لیے یہ لوگ جو خوشخبری لائے ہیں وہ بھی لازماً متحقق ہونے والی ہے ۔ لیکن وہ ان حالات میں بھی حضرت لوط اور ان کی قوم کو نہ بھولے ' کیونکہ وہ ان کے بھائی تارخ کے بیٹے تھے اور ان کے قریب ہی رہائش پذیر تھے ۔ اب چونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ اللہ نے جن لوگوں کو بھیجا ہے وہ تو قوم لوط ؑ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں گے اور حضرت ابراہیم نہایت ہی مشفق اور رحم دل تھے ۔ چنانچہ قوم لوط ؑ کے بارے میں فرشتوں سے یہ مکالمہ شروع کر دیا ۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَٰهِيمَ ٱلرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ ٱلْبُشْرَىٰ يُجَٰدِلُنَا فِى قَوْمِ لُوطٍ ۝ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ۝

"پھر جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہو گیا تو اس نے قوم لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔ حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل تھے"۔

حضرت ابراہیمؑ ایسے حلیم الطبع تھے کہ وہ موجبات غیظ و غضب کو برداشت کر لیتے تھے، صبر کرتے تھے اور جوش میں نہ آتے تھے۔ اور اواہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا خوفی کی وجہ سے وہ ہر وقت آہ و زاری فرماتے تھے اور منیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر معاملے میں جلدی سے اپنے رب کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ ان تمام صفات کے باعث حضرت ابراہیم نے فرشتوں کے ساتھ قوم لوط کے حوالے سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اب یہ کہ حضرت نے کیا جھگڑا فرمایا؟ قرآن کریم نے اس کی کوئی تشریح نہیں کی ہے لیکن عین اس وقت اللہ کا حکم آگیا اور فرمایا گیا کہ اس معاملے میں نہ جھگڑو' لہٰذا جھگڑا ختم ہو گیا۔

يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۖ إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿٧٦﴾

"(آخر کار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا) "اے ابراہیم" اس سے باز آجاؤ' تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آکر رہے گا جو کسی کے پھیرے نہیں پھر سکتا"۔

پردہ گرتا ہے' اور یہ خوش کن اور دلربا منظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ سیاق کلام پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ لازمی ہے کہ حکم باری کے سامنے حضرت ابراہیم بھی خاموش ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اچانک آنکھوں کے سامنے ایک دوسرا منظر آجاتا ہے جو ہاؤ و ہو سے پر ہے۔ اردن کے ایک شہر میں قوم لوط سامنے آتی ہے۔ یہ شہر عمورہ اور صدوم ہیں:

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿٧٧﴾

"اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے"۔

آپ اپنی قوم کو اچھی طرح جانتے تھے' ان کی فطرت کے اندر جو بگاڑ اور گندگی پیدا ہو گئی تھی وہ ناقابل تصور اور بے مثل تھی۔ وہ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ شہوانی تعلقات قائم کرتے تھے۔ اور یہ حرکت اس نظام فطرت کے خلاف تھی جس کے مطابق اللہ نے تمام مخلوقات کو نر اور مادہ کی شکل میں پیدا کیا' تاکہ تمام انواع کی بقا اور تسلسل قائم رہ سکے اور جس کے ذریعے نوامیس فطرت نے انسان کے لیے جو لذت اور خوشی ودیعت کی ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ راہ فطرت انسان خود اپنے غور و فکر اور اپنی تدابیر اور محنت سے حاصل نہیں کر سکتا' صرف راہ راست پر استقامت اور ہدایت ربانی سے یہ لذت مل سکتی ہے۔

جنسی بے راہ روی کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کے اندر اس قسم کی شاذ و نادر بے راہ روی تو انسانی تاریخ کا حصہ ہے۔ بعض انسان بیمار ہوتے ہیں لیکن قوم لوط ؑ کی بیماری ایک عجیب اور ہمہ گیر بیماری تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسیاتی بیماریاں بھی اسی طرح پھیل جاتی ہیں جس طرح جسمانی بیماریاں پھیل جاتی ہیں اور اگر کسی سوسائٹی کا معیار حسن و قبح بدل جائے تو اس کے اندر ایسی بیماریاں بھی پھیل جاتی ہیں اور قوم پوری کی پوری اخلاقی بگاڑ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور یہ بگاڑ سوسائٹی کے بگڑے ہوئے تصورات کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بگاڑ انسانی فطرت سلیمہ کے ساتھ متصادم ہوتا ہے' کیونکہ فطرت سلیمہ تو کائنات کے نوامیس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اور وہ موجبات حیات کی مد ہوتی ہے' متصادم نہیں ہوتی۔ جبکہ یہ جنسی بے راہ روی' امتداد حیات کے نظام کے ساتھ متصادم ہوتی ہے۔ انسان تخم حیات کو ایسی سرزمین میں بوتا ہے جہاں سے زندگی کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی جنسی بے راہ روی سے انسانی فطرت نہ صرف یہ کہ اخلاقی طور پر متصادم ہوتی ہے بلکہ قوانین فطرت بھی اس سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ عمل قوم لوط ؑ نہ صرف یہ کہ فطرت کے خلاف ہے بلکہ نظام امتداد حیات اور حقیقی لذت کے بھی خلاف ہے۔

بعض اوقات انسان موت میں وہ لذت محسوس کرتا ہے جو حیات میں نہیں ہوتی لیکن یہ لذت اعلیٰ اقدار اور بلند مقاصد کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ یہ حسی اور جسمانی لذت نہیں ہوتی۔ اور جہاد میں سر قربان کرنا نظام بقائے حیات کے ساتھ متصادم نہیں ہے بلکہ اس طرح زندگی کو کم کرنا دوسرے پہلو سے زندگی کو بلند کرنا ہے۔ اللہ کی راہ میں شہادت سے زندگی ختم نہیں ہوتی بلکہ زندگی ایک دوسرا انداز اختیار کرتی ہے۔

تو حضرت لوط ؑ مہمانوں کو دیکھ کر بہت ہی کبیدہ خاطر ہوئے' کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی قوم ان خوبصورت مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی اور اس طرح انہیں بہت ہی شرمندہ ہونا پڑے گا۔ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ "آج بڑی مصیبت کا دن ہے"۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝

"(ان مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ لوط ؑ نے ان سے کہا' "بھائیو' یہ میری بیٹیاں موجود ہیں' یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟"

(یُھرَعُوْنَ اِلَیْہِ) یعنی اس طرح دوڑے جس طرح بخار میں مبتلا شخص کانپتے ہوئے دوڑتا ہے - بے چینی سے ' ہرع بخار کی حالت میں کانپنا۔

اس سے قبل ان کے ہاں مہمانوں کے ساتھ بدسلوکی عام تھی - اس لیے حضرت لوط ؑ ان فرشتوں کے بارے میں سخت دل تنگ ہوئے اور اس دن کو مصیبت کے دن سے تعبیر کیا۔

حضرت لوط ؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ بدکاری کے لیے اس طرح بے اختیار دوڑے چلے آتے ہیں جس طرح بخار میں مبتلا شخص بے اختیار کانپتا ہے - اور ان کے مہمانوں کی توہین پر تلے ہوئے ہیں تو انہوں نے ان کی ذات کے اندر موجود فطرت سلیمہ کو اپیل کی - ان کو متوجہ کیا کہ دیکھو عورتیں موجود ہیں جن کو اللہ نے اسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے - خود حضرت لوط ؑ کے گھر میں لڑکیاں موجود تھیں اور وہ اسی وقت جائز طریقوں سے ان کے جوش لذت کو تسکین دے سکتی تھیں - جن کو اسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا تھا - وہ اسی وقت ان کو نکاح کر کے ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار تھے تاکہ وہ ان کی جنونی شہوت رانی کے لیے سکون کا سامان فراہم کریں -

قَالَ یٰقَوْمِ ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ ھُنَّ اَطْھَرُ لَکُمْ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ (۱۱:۷۸) "لوط ؑ نے ان سے کہا" "بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں ' یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں - کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو - کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟"

ھُنَّ اَطْھَرُ لَکُمْ (۱۱:۷۸) "وہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہیں" - یعنی وہ ہر لحاظ سے پاکیزہ ہیں - نفسیاتی اعتبار سے پاکیزہ ' حسی اعتبار سے پاکیزہ اور اخلاقی اعتبار سے پاکیزہ ہیں - وہ پاک فطرت ہیں اور پاک جذبات کی تسکین کے لیے تیار ہیں - ان کے اخلاق اور ان کا دین پاکیزہ ہے اور قدرت نے بھی انہیں اس پاک اور عظیم مقصد کے لیے تیار کیا ہے - اور یہ راستہ بھی بمقابلہ اس راہ کے جو وہ اختیار کر رہے ہیں پاکیزہ ہے -

فَاتَّقُوا اللّٰہَ (۱۱:۷۸) "پس اللہ سے ڈرو" - پہلے فقرے میں ان کو سمجھایا گیا کہ فطری طور پر پاکیزہ راہ اختیار کرو ' یہاں کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور اس غلط روش سے باز آجاؤ" -

وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ (۱۱:۷۸) "اور میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے ذلیل نہ کرو" - یہ فقرہ ان کے جذبہ انسانی غیرت کو بیدار کرنے کے لیے کہا گیا اور دیہاتی لوگ مہمان کا عموماً خیال رکھتے ہیں اور مہمانوں کی توہین کو بہت برا سمجھا جاتا ہے -

اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ (۱۱:۷۸) "کیا تم میں سے کوئی بھلا آدمی نہیں ہے" - یہ معاملہ بھی ہدایت ' نیکی اور بھلائی کا ہے - نیز فطرت اور مروت اور اخلاق کا بھی یہی تقاضا ہے - لیکن یہ تمام اپیلیں بدفطرت لوگوں پر

اثرانداز نہ ہو سکیں ۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے دل منحرف ہو گئے تھے ۔ ان کی عقل ماؤف ہو گئی تھی اور ان کا ناقابل مثال شہوانی جوش ان پر غالب تھا ۔

قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿٧٩﴾

"انہوں نے جواب دیا" "تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے ۔ اور یہ تو بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟" انہوں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اگر ہم تمہاری بیٹیوں کا رشتہ چاہتے تو تم ضرور نکاح کر کے ہمارے حوالے کر دیتے اور تم جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ یہ ان کی جانب سے ان کے خبیث اور گندے ارادے کی طرف نہایت ہی خبیثانہ اشارہ ہے ۔

اس موقعہ پر حضرت لوط ؑ نڈھال ہو گئے ۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ اب ان کے مقابلے میں بالکل بے بس ہیں ، وہ اس قوم میں اس طرح ہیں جس طرح ایک مسافر ہوتا ہے ۔ گویا یہاں ان کا کوئی خاندان اور کوئی مددگار نہیں ہے ۔ اور اس مصیبت کے وقت کوئی نہیں ہے جو ان کی دستگیری کرے ۔ ایسے حالات میں وہ جس پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں ، وہ یہ ہے :

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ﴿٨٠﴾

"لوط ؑ نے کہا" "کاش میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمہیں سیدھا کر دیتا ، یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا" ۔

جب حضرت لوط ؑ یہ کلمات کہہ رہے تھے تو روئے سخن ان نوجوانوں کی طرف تھا ۔ یعنی فرشتوں کی طرف جو خوبصورت نوجوانوں کی شکل میں موجود تھے ۔ حضرت لوط ؑ کی نظر میں یہ نوجوان اس قدر مضبوط نہ تھے کہ اپنا دفاع کر سکیں ۔ چنانچہ حضرت لوط ؑ یہ اشارہ دینا چاہتے تھے کہ اگر تم لوگ مضبوط ہوتے تو بھی ان ظالموں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا یا یہ کہ اور کوئی ان کا حامی و مددگار ہوتا تو وہ اس کی مدد اور معاونت طلب کر لیتے لیکن کوئی نہیں ہے ۔

حضرت لوط جن مشکلات سے دوچار تھے اور جس پریشانی میں مبتلا تھے ۔ اس میں ان کی نظروں سے وقتی طور پر یہ حقیقت اوجھل ہو گئی کہ وہ تو ایک مضبوط سہارے کی پناہ میں ہیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب یہ آیت پڑھی ، ایک حدیث میں فرمایا : "اللہ حضرت لوط ؑ پر رحم فرمائے ، وہ تو اس وقت بھی ایک مضبوط سہارے کی پناہ میں تھے" ۔

غرض جب حضرت نوح ؑ کی پریشانی انتہاؤں کو چھونے لگی اور مصیبت کا دائرہ ان پر تنگ ہو گیا ، تو اس وقت اللہ کے رسولوں نے اپنا تعارف کرا دیا اور بتا دیا کہ وہ تو ایک نہایت ہی مضبوط سہارے کی پناہ میں ہیں ۔ خدائی قوت آپ کی پشت پر ہے ۔

قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ

"تب فرشتوں نے اس سے کہا کہ "اے لوط ' ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں ' یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے"۔

چنانچہ انہوں نے اپنے مشن کی بابت بتا دیا اور حکم دیا کہ وہ اپنے پاکیزہ خاندان کے ساتھ نکل جائیں۔ ہاں تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ یہ فاسقین کی جماعت میں شامل ہے۔

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ۖ إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۚ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۚ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ﴿٨١﴾

"بس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل جا۔ اور دیکھو تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ مگر تیری بیوی (ساتھ نہیں جائے گی) کیونکہ اس پر بھی وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرنا ہے۔ ان کی تباہی کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔ صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے!"

اسریٰ ' عربی میں رات کے سفر کو کہتے ہیں اور قطعہ لیل کا مطلب ہے رات کے کسی حصے میں۔ چونکہ صبح کے وقت قوم نے ہلاک ہونا تھا ' اس لیے حکم دیا گیا کہ نہ کوئی پیچھے رہے اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھے۔ کیونکہ پیچھے رہنے والا اور مڑ کر دیکھنے والا بھی ہلاک ہو گا۔

أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ (۱۱ : ۸۱) "کیا صبح کا وقت قریب نہیں ہے"۔ یہ فقرہ اس لیے آیا ہے کہ حضرت لوط کی روح خوش ہو جائے کیونکہ انہوں نے گزشتہ محفل بڑی اذیت کے ساتھ گزاری تھی۔

مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کا انجام بہت ہی قریب ہے۔ صبح ہوتے ہی یہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے۔ اب وہ خواہش اللہ پوری فرمائیں گے جو خواہش حضرت لوط اپنی کم قوت کی بنا پر پوری نہ کر سکتے تھے۔

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ مَّنضُودٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ ۖ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ﴿٨٣﴾ ع ۱۵

"پھر جب ہمارے فیصلہ کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا ' اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں ہے"۔

یعنی جب ان پر عذاب نافذ کرنے کا وقت آیا تو ہم نے ان کی بستی کو اوپر نیچے کر دیا۔ یعنی یہ سزا ان کے لیے اس لیے تجویز ہوئی کہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو مقام انسانیت سے گرا کر مقام حیوانیت تک لے آئے تھے۔ بلکہ وہ حیوانات سے بھی نیچے گر گئے تھے کیونکہ حیوانات بہرحال حیوانی فطرت کے اصولوں کے تابع ہوتے ہیں اور اپنی حدود کے اندر رہتے ہیں۔ لیکن انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فطرت کی حدود کو بھی پار کر لیتا ہے۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ (۱۱: ۸۲) "اور ہم نے ان پر مٹی آلود پتھر برسائے"۔ یعنی ایسے پتھر جن کے ساتھ مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس مقام پر ان کے لیے خاک آلود پتھر ان کے حال اور مقام سے زیادہ مناسب تھے۔ منضود کے معنی ہیں اوپر تلے آنے والے پتھر اور یہ پتھر

مُّسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ (۱۱: ۸۳) "تمہارے رب کے ہاں نشان زدہ تھے"۔ جس طرح مویشیوں پر نشان لگا کر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ پڑھے جا سکیں۔ گویا ان پتھروں کو اللہ نے اس طرح چھوڑا کہ وہ خود کار عمل سے پڑتے تھے اور ضرورت کے وقت اپنا کام کرتے تھے۔ یہ ایک عجیب تصویر کشی ہے۔ ذہن پر اس کے بے پناہ اثرات پڑتے ہیں۔ اس تصویر کشی سے ذہن پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ لمبی لمبی تشریحات سے نہیں پڑتا۔

وَ مَا ھِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ (۱۱: ۸۳) "ظالموں سے یہ سزا کوئی دور نہیں ہے"۔ یہ سزا قریب ہے' تیار ہے اور اللہ کسی بھی وقت نازل کر سکتا ہے۔

یہاں آل لوط کی اس سزا کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے' اس کی تصویر بعض آتش فشاں پہاڑوں کے بالکل مشابہ ہے۔ کیونکہ آتش فشانی کے عمل میں پتھر اور غبار آلود پتھر برستے ہیں اور ظالم اقوام کو اللہ ان کے ظلم کی سزا دیتے ہیں۔

ہم اس مشابہت کا ذکر کر کے یہ کہنا نہیں چاہتے کہ یہ سزا کوئی آتش فشانی تھی اور کسی مخصوص وقت میں عمل واقع ہو گیا۔ نہ ہم اس کی نفی کرتے ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں ان لوگوں کے لیے آتش فشانی کی سزا مقرر کی ہو۔ یہ بھی سزا کا ایک طریقہ ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس قوم کو اللہ نے ایک عام اور معمولی آتش فشانی کے ذریعے سے سزا دی ہو۔ اور روز ازل سے ان کے لیے یہ عمل تجویز ہوا ہو۔ اور یہ بھی اللہ کی قدرت ہے کہ اس نے اس مجرم قوم کے لیے اپنے تصرفات قدرت میں سے ایک عمل کو مخصوص کر دیا ہو۔ اور یہ بھی درست ہو سکتا ہے کہ یہ آتش فشانی عام طبیعی عمل کا حصہ نہ ہو اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے خارق عادت طریقے سے کوئی سنگ باری کی ہو۔ اور اس کا تعلق طبیعی آتش فشانی سے بالکل نہ ہو۔ یہ عمل اسی طرح خارق عادت ہو جس طرح حضرت ابراہیم کے ہاں بچے کی ولادت کا عمل معتاد طریقے کے بالکل برعکس ہو گیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے وہ جس طرح چاہے' کر سکتا ہے۔ اس کی مشیت بے قید ہے اور انسان کے لیے اس کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔

---OOO---

درس نمبر ۱۰۳ ایک نظر میں

اسلامی نظریہ حیات انسانی تاریخ میں ؛ حد ' دائمی اور مسلسل نظریہ ہے ' اب ہم حضرت شعیب ؑ کے دور میں پہنچ گئے ۔ حضرت شعیب ؑ اپنی قوم اہل مدین میں اس کا بیڑا اٹھاتے ہیں ۔ لیکن ان کی دعوت میں اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کا ایک دوسرا اہم مسئلہ بھی سامنے آتا ہے ۔ وہ یہ کہ سوسائٹی میں امانت عدل اور حسن معاملہ کے اصول نافذ کرو ' ان معاملات کا تعلق بھی اسلامی عقائد سے ہے ۔ کیونکہ اللہ وحدہ کے دین میں داخل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ صرف اللہ کی شریعت کا اتباع کیا جائے ۔ لیکن اہل مدین کو حضرت شعیب ؑ کی یہ دعوت سن کر بڑا تعجب ہوا اور یہ بات ان کو انوکھی لگی ۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ دین کے ساتھ ناپ تول جیسے دنیاوی معاملات کا تعلق کیا ہے ؟ نماز اور ترازو کے درمیان کیا نسبت ؟ عبادت اور مالی معاملات بالکل الگ الگ نوعیت کے حامل ہیں ۔

یہ قصہ حضرت ہود ؑ اور ان کی قوم عاد کے قصے اور حضرت صالح ؑ اور ان کی قوم ثمود کے قصے کے بعد آتا ہے ۔ لیکن اس قصے کا انجام اور اس کا اسلوب بیان اور عذاب کی نوعیت قصہ صالح کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتی ہے ۔ ان کا عذاب بھی ایک جیسا ہے اور اس عذاب کا اسلوب تعبیر بھی یکساں ہے ۔

---O O O---

درس نمبر ۱۰۲ تشریح آیات

۸۴ ---- تا ---- ۹۵

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

”اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب ؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو ' اللہ کی بندگی کرو ' اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے“۔

صرف اللہ کی بندگی کرنا دین اسلام کی خشت اول ہے۔ اور اسلامی نظام زندگی کی اساس ہے۔ اسلامی شریعت کا بھی یہ قاعدہ اول ہے۔ اسلامی سوسائٹی کا نظام عمل سب کا سب اسی قاعدے پر مبنی ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جس کے بغیر کوئی عقیدہ ' کوئی پرستش ' کوئی طرز عمل مکمل اور اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝

”اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں ' مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا۔ اور اے برادران قوم ' ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور بہرحال میں تمہارے اوپر کوئی نگران کار نہیں ہوں“۔

ان آیات میں جو اہم معاملہ اٹھایا گیا ہے وہ عدل و انصاف اور امانت و دیانت کا اور معاشی ضابطہ بندی کا مسئلہ ہے۔ اس سے قبل کی آیات میں اسلام کی نظریاتی اساس کا تعین تھا۔ لیکن یہاں جو مالی ہدایات دی گئی ہیں وہ اس نظریہ حیات کا

فطری نتیجہ ہیں ۔ اہل مدین کا علاقہ حجاز سے شام تک جانے والے تجارتی راستے پر تھا ۔ اور ان میں یہ کمزوری پائی جاتی تھی کہ وہ ناپ تول میں لوگوں کا حق مارتے تھے ۔ لوگوں کی چیزوں کی قیمت کم دیتے ۔ یہ وہ کمزوری ہے جو انسان کے قلب و عمل ، دونوں کو گندہ کر دیتی ہے ۔ اور انسان سے مروت اور عزت نفس کے بلند اوصاف جاتے رہتے ہیں ۔ اس رزالت کے علاوہ یہ لوگ شمالی عرب میں شام کی طرف آنے جانے والے قافلوں کو بھی لوٹ لیتے تھے اور آنے جانے والوں پر ناجائز راہداری عائد کر کے ظلم کرتے تھے ۔ اس صورت میں ان کے اس عیب کی تفصیلات دی گئی ہیں ۔

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلامی نظام حیات میں نظریات ، عقائد کا تعلق براہ راست امانت ، دیانت ، عدل و انصاف اور لین دین میں اصول انصاف کے قیام اور سوسائٹی سے چوری ، ڈکیتی اور تمام دوسرے معاشری جرائم کے خاتمے سے ہوتا ہے ۔ یاد رہے کہ کسی معاشرے میں عدل و انصاف تب قائم ہو سکتا ہے جب اس کے افراد کے اندر خدا خوفی اور آخرت کی جوابدہی کا احساس ہو ۔ صرف ایسے عقائد اور ایسے اخلاق کے ذریعے سوسائٹی میں عدل و انصاف اور منصفانہ معاشی نظام اور معاشی روابط قائم ہو سکتے ہیں اور ایک ٹھوس انسانی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے ۔

کسی بھی صحت مند معاشرے میں ، یہ ضروری ہوتا ہے کہ باہم معاملات کا نظام اور معاشرہ کا اخلاقی نظام ایک مستحکم نظریاتی اساس پر مبنی ہوں ۔ اور معاملات اور اخلاق ایسے اصولوں اور تصورات پر مبنی نہ ہوں جو آئے دن بدلنے والے ہوں ۔ اسلامی نظریہ حیات میں یہی خوبی ہے ۔ اسلامی نظام تمام دوسرے نظاموں اور اسلامی سوسائٹی تمام دوسری سوسائٹیوں سے اس پہلو میں منفرد ہے کہ اس میں افراد کی پوری زندگی اسلامی عقائد و تصورات پر استوار ہوتی ہے اس میں محض عارضی اور ظاہری مظاہر و مطالب ہی پیش نظر نہیں ہوتے ۔

جب اسلامی سوسائٹی اپنے اخلاق و معاملات ان اصولوں اور مستحکم بنیادوں پر رکھتی ہے تو پھر وہ گردش دوران کے عارضی موثرات سے بدلتی نہیں اور نہ ہی وہ کسی مروجہ عارضی سیلاب اور تپش سے متاثر ہوتی ہے ۔

لوگوں کے اخلاق ، ان کے باہم معاملات کا اخلاقی رنگ یہ نہیں ہوتا کہ وہ زرعی معیشت پر تکیہ رکھتے ہیں یا وہ جانور پال کر زندگی بسر کرتے ہیں یا ان کا تعلق صنعت و حرفت کے پیشوں سے ہے ، یہ عوامل ان کے اخلاق اور طرز عمل پر اثر انداز نہیں ہوتے ۔ اسلام کے اخلاقی نقطہ نظر میں اور اسلام کے اخلاقی اصولوں میں ان عوامل کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے کیونکہ اسلامی اخلاقیات اور اسلامی شریعت و قوانین کا ماخذ قرآن اور سنت ہیں اور اسلامی قانون اور اخلاق کا نصب العین صرف رضائے الہیٰ کا حصول ہے اور آخرت کے عذاب کا خوف اور ثواب کا حصول اسلامی نظام اور معاشرے میں اصل محرک ہے ۔ دنیا میں انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے قانون و اخلاق چونکہ تجارتی روابط ، اقتصادی حالات اور ذاتی اور قومی مفادات کو پیش نظر رکھ کر بنائے اور وضع کیے جاتے ہیں ، اس لیے یہ تصورات اور یہ اخلاقیات اسلامی زاویہ نگاہ سے بالکل لغو اور بودے ہوتے ہیں ۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے امیر جماعت اسلامی پاکستان سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ''اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر'' اور مولف کی کتاب (نحو مجتمع اسلامی) کی فصل ''نظام اخلاق'')

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ (۱۱ : ۸۴) ''اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو ۔ آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں'' ۔ یعنی اللہ نے تمہیں رزق حسن دیا ہے ۔ اس لیے تمہیں اس قسم کی گھٹیا حرکت کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ مجبور ہے ۔ تم پہلے سے غنی ہو ۔ اگر تم ناپ اور تول کے پیمانوں میں یہ بے

قاعدگی چھوڑ دو تو تم غریب نہ ہو گے اور اگر اسے جاری رکھو تو تم امیر تر نہیں بن سکتے - بلکہ خطرہ یہ ہے کہ اس بے قاعدگی کی وجہ سے تمہارے اچھے دن ختم ہو جائیں اور تمہاری مالی مار دھاڑ کے مواقع ہی ناپید ہو جائیں -

وَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ (۱۱ : ۸۴) "مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا" - یہ عذاب آخرت میں بھی آ سکتا ہے جہاں پر چھوٹے بڑے معاملے کا فیصلہ ہو گا اور اس جہان میں بھی آ سکتا ہے - جب لوگوں پر تمہاری یہ غلط کاری واضح ہو گی اور تمہاری تجارت ماند پڑ جائے گی اور معاشرے کے اندر کشمکش شروع ہو گی اور تم ایک دوسرے کے بر سرپیکار ہو جاؤ گے اور رسہ کشی شروع ہو جائے گی -

حضرت شعیب ؑ دوبارہ ان کو خطاب فرماتے ہیں اور نہایت ہی مثبت انداز میں ان کو صحیح راہ بتلاتے ہیں -

وَ یٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ (۱۱ : ۸۵) "اور اے برادران قوم، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو" - یہاں یہ کہا کہ ناپ اور تول پورا پورا کرو، یعنی کم ناپ تول کے مقابلے میں پورا ناپنے اور تولنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ پورے سے بھی قدرے زیادہ ہو - چنانچہ اس انداز تعبیر یعنی

اَوْفُوا الْمِکْیَالَ (۱۱ : ۸۵) کے اندر وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ (۱۱ : ۸۴) کے مقابلے میں زیادہ خوبصورتی ہے - اس میں یہ اشارہ ہے کہ زیادتی کی طرف مائل ناپ و تول کی راہ لو -

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ (۱۱ : ۸۵) "اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو" - یہ فقرہ ناپ تول کی اشیاء تک محدود نہیں ہے - یہ عام ہے یعنی تمام قیمتی اشیاء خواہ ناپ سے متعلق ہوں، یا تول سے، قیمت سے ہوں یا ویلیو سے - ان سب کی لین دین میں راستی کا موقف اختیار کرو - اس میں لوگوں کی لیبر اور محنت اور ان کی ہنرمندی بھی داخل ہے - کیونکہ "شَیْءٌ" کے لفظ کا اطلاق بہت عام ہے - اس کا اطلاق محسوسات اور غیر محسوسات دونوں پر ہوتا ہے -

لوگوں کی چیزوں کو گھٹانا ایک پہلو سے تو ظلم ہے لیکن اس کے بعض دوسرے مفاسد بھی ہیں - لوگوں کے اندر اس کی وجہ سے نفرت اور دوسرے برے جذبات پیدا ہوتے ہیں - ان کو کوفت ہوتی ہے اور معاشرے کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے - اور جب عدل و انصاف کے اداروں پر لوگوں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے تو معاشرے کے اندر اجتماعی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے دل ایک دوسرے کے خلاف بھر جاتے ہیں اور اجتماعی زندگی سے اصلاح اور نیکی کا اثر ختم ہو جاتا ہے -

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (۱۱ : ۸۵) "اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو" - عثو کے معنی بگاڑ پیدا کرنے کے ہیں - یعنی فساد پھیلانے کے منصوبے نہ بناتے پھرو - اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کے اندر موجود بھلائی کے میلانات کو ابھارتے ہیں کہ اللہ نے ان کو جائز ذرائع سے جو دولت دی ہے وہ اس ناپاک دولت سے بہت ہی بہتر ہے جو ناپ تول میں کمی بیشی کر کے وہ کماتے ہیں اور لوگوں کے حقوق مار کر جمع کرتے ہیں -

بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۱۱ : ۸۶) "اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر

ہے اگر تم مومن ہو" - کیونکہ اللہ کے ہاں جو اجر ہے یا اللہ کی شریعت کے مطابق جائز ذرائع سے آنے والی کمائی زیادہ قیمتی اور زیادہ باقی رہنے والی ہے - اس سے قبل اللہ نے بتایا تھا کہ صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کرو' اور اللہ کے دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ - اور اب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس دین کے مطابق جو منافع وہ کمائیں گے وہ زیادہ نفع بخش کام ہے - دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور معاشی سرگرمیوں میں پاکیزہ راہ اختیار کرنا اس ایمان اور نظریہ کا لازمی تقاضا بھی ہے -

اب حضرت شعیب ؑ ان کو اور ان کے سامنے پیش کی گئی دعوت کو ایک طرف چھوڑتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ بذات خود ان تصرف کے مالک نہیں ہیں' کوئی گارنٹی تمہیں نہیں دے سکتے - اور وہ عملاً شر اور عذاب اور فساد سے تمہیں روک دینے پر قدرت نہیں رکھتے - اور وہ اس بات کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ وہ ہر حال میں تمہیں ہدایت پر لے آئیں اور اگر تم لوگ ضلالت پر اصرار کرتے ہو تو اس بات کی عند اللہ کوئی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے - میرا فرض تو صرف ابلاغ مبین ہے - اور تبلیغ دین کا فریضہ ظاہر ہے کہ میں نے ادا کر دیا ہے -

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۱۱ : ۸۶) "اور بہرحال میں تمہارے اوپر کوئی نگران کار نہیں ہوں" - یہ انداز کلام ایک سننے والے کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ معاملہ بڑا سنگین ہے - اس کے نتائج خطرناک ہوں گے اور اگر وہ غور نہ کریں گے تو برے انجام سے خود وہ دوچار ہوں گے - اور کوئی وہاں نہ رکاوٹ ڈال سکے گا اور نہ کوئی بچانے والا ہو گا -

---ooo---

لیکن قوم بگڑی ہوئی تھی اور وہ فساد اور بے راہ روی کے عادی ہو گئے تھے - اور وہ لوگوں کا استحصال صدیوں سے کرتے چلے آئے تھے - چنانچہ وہ کہتے ہیں :

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝

"انہوں نے جواب دیا" اے شعیب ؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے!"

یہ جواب نہایت ہی توہین آمیز اور خود سری پر مبنی ہے - ایک جاہل اور بگاڑ میں مبتلا اور مسخ شدہ فطرت پر مبنی جاہل شخص کا جواب ہے اور جواب دینے والا مخاطب کے ساتھ سخت عناد اور دشمنی رکھتا ہے' ذرا غور کیجئے :

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱ : ۸۷) "انہوں نے جواب دیا" اے شعیب ؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف

کرنے کا اختیار نہ ہو؟""

وہ اس بات کو نہیں سمجھتے یا اس بات کو وہ سمجھنا نہیں چاہتے کہ نماز اسلامی نظریہ حیات اور ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اور اللہ کی پرستش اور بندگی کا متعین طریقہ ہے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ کوئی عقیدہ و نظریہ' عقیدۂ توحید کے بغیر حق نہیں ہو سکتا اور کوئی نظام اس کے سوا درست نہیں ہو سکتا کہ آباؤ اجداد کے تمام غلط طریقوں کی کلی نفی کر دی جائے۔ نیز اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک اسلامی شریعت قائم نہ کر دی جائے۔ اور اسلامی شریعت بھی زندگی کے تمام شعبوں میں نہ نافذ کر دی جائے۔ تجارت اور مالی معاملات میں' زندگی کے انفرادی معاملات میں اور زندگی کے اجتماعی معاملات میں۔ کیونکہ عقیدہ و عمل اسلامی نظام میں ایک ہی مجموعہ ہیں۔ ان میں تفریق نہیں ہو سکتی اور نہ عمل کے بغیر محض خالی خولی نعرے کی اسلام میں کوئی اہمیت ہے۔

اس سے قبل کہ ہم دین و معاملات کے درمیان افتراق کے اس احمقانہ تصور کی تردید میں مزید بحث کریں۔ یہاں اس بات کو نوٹ کرنا ضروری ہے کہ آج کی جاہلیت کے علم بردار اس سلسلے میں وہی کچھ سوچتے ہیں جو حضرت شعیبؑ کی قوم کی سوچ تھی۔ اور دور جدید کی جاہلیت نے اس غلط سوچ کے لیے قوم شعیب ؑ سے بڑھ کر آگے کوئی دلائل فراہم نہیں کیے۔ جس طرح' اس معاملے میں قوم شعیب مشرک تھی' جدید جاہلیت کے پیروکار بھی اس شرک میں مبتلا ہیں۔ چاہے وہ یہودی ہوں' چاہے عیسائی' چاہے وہ آج کے نام نہاد مسلمان ہوں کیونکہ یہ سب لوگ دور جدید میں ایمان و عقیدے اور اعمال و شعائر کے درمیان افتراق کرتے ہیں' شریعت اور عمل کو جدا کرتے ہیں' یہ لوگ عقائد و عبادات کو اللہ کے لیے مخصوص کرتے ہیں اور معاملات اور دنیاوی امور اپنے دوسرے معبودوں اور لیڈروں کے احکام کے مطابق سرانجام دیتے ہیں اور یہی ہے حقیقی اور اصلی شرک۔

ہاں' اس بات کا اعتراف کرنا بے جا نہ ہو گا کہ جو لوگ یہودی عقائد کے پیروکار ہیں اور ان کے عقائد بارہا کی تحریفات کے عمل سے بھی گزرے ہیں' لیکن اس کے باوجود ان کی اسمبلی میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان کے بحری جہاز بعض مسافروں کو غیر شرعی حرام کھانا پیش کرتے ہیں تو ان کی اسمبلی نے ایسے جہازوں کو حکم دے دیا کہ جس قدر خسارہ بھی ہو' ان کو چاہیے کہ ہر مسافر کو اسرائیلی شریعت کے مطابق صرف حلال کھانا پیش کیا جائے۔ اب ذرا ان لوگوں کو اپنے رویے پر غور کرنا چاہیے جو دعوائے مسلمانی کے ساتھ ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔

آج ہم میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں' جو مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ اخلاقی نیز معاشی اور معاملات کے میدان میں شریعت کی پابندی نہیں کرتے۔

اور بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس دنیا کی مشہور ترین یونیورسٹیوں کی ڈگریاں ہیں' یہ لوگ نہایت ہی تعجب سے پوچھتے ہیں' اسلام کو ہمارے ذاتی اور انفرادی معاملات سے کیا تعلق ہے۔ اسلام کو اس بات سے کیا تعلق ہے کہ کوئی ساحلوں پر ننگا پھرتا ہے یا باپردہ۔ اسلام کو اس سے کیا تعلق ہے کہ کوئی عورت گلیوں میں پھرتے ہوئے کیسا لباس زیب تن کرتی ہے۔ پھر اسلام کو اس سے کیا واسطہ کہ کوئی اپنی جنسی قوت کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی اپنا مزاج درست کرنے کے لیے شراب پیتا ہے تو اسلام کو کیا تکلیف ہے' پھر اس جدید دور کے تقاضے ہیں اور کچھ لوگ ان تقاضوں کو پورا کرتے ہیں تو اسلام کو کیا تکلیف ہے؟ یہ سوالات اور قوم شعیب کے اس سوال میں فرق کیا ہے؟ (اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ) "کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی

ہے کہ ہم اپنے ان تمام معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پوجا ہمارے آباء کرتے چلے آئے ہیں"۔

پھر وہ دوسرا سوال بڑی شدت اور استکبار سے کرتے ہیں کہ اسلام کو اقتصادی معاملات میں دخل اندازی کی کیا ضرورت ہے۔یا یہ کہ اسلام اقتصادی تعلقات میں دخل دے یا ہمارے لیے اقتصادی اخلاقیات کا کوئی نظام وضع کرے۔ دین کا سودی لین دین کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ دین کو اس سے کیا لگی کہ اگر کوئی مہارت اور دھوکے سے لوگوں سے مال جمع کرتا ہے تو وہ ایسا نہ کرے بشرطیکہ یہ چالاکی و عیاری انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے دائرے کے اندر ہو' بلکہ یہ لوگ بڑی ڈھٹائی سے یہاں تک کہتے ہیں کہ جب بزنس میں اخلاق دخل اندازی کرے تو بزنس تباہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بعض مغربی مفکرین کے اخلاقی نظام اقتصاد کو بھی برا سمجھتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ ہمارے دور کے بعض مخلصین کا مغالطہ ہے۔

قدیم جاہلیت کے علم بردار اہل مدین کی مذمت میں ہمیں بہت آگے نہیں بڑھنا چاہئے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دور جدید کی جاہلیت اس کے مقابلے میں کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔اگرچہ جدید جاہلیت علم' ترقی اور تہذیب کی مدعی ہے اور یہ جاہلیت ان لوگوں کو رجعت پسندی اور جہالت' جمود اور تعصب کا الزام دیتی ہے جو لوگ یہ دعوت دیتے ہیں کہ ایمان' شخصی طرز عمل اور بازار کے مادی اور اقتصادی طرز عمل کو باہم مربوط کر دیا جائے۔

کوئی شخص اس وقت تک صحیح موحد نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے شخصی معاملات کو' اپنے اجتماعی معاملات کو اپنے عقیدے کے ساتھ منسلک نہ کرے۔کیونکہ اگر کوئی ایسا نہ کرے تو وہ مشرک ہے اور مشرک اور توحید ایک دل میں کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔یاد رہے کہ شرک کی کئی قسمیں اور کئی رنگ ہیں۔ایک رنگ اس کا وہ ہے جو آج کل رائج ہے اور ہم اس کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں اور اصل اور حقیقی شرک کی طرح اس پر بھی تمام مشرکین کا اتفاق ہے' جدید ہوں کہ قدیم۔جس دور میں ہوں اور جس مقام پر ہوں۔

ذرا ملاحظہ کیجئے اہل مدین حضرت شعیبؑ کے ساتھ کیسا طنز کرتے ہیں اور یہی حرکت آج کے مدعیان توحید بھی کرتے ہیں۔

اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (۱۱:۸۷) "بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے!" ان کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ حضرت شعیب کو فی الواقعہ راست باز سمجھتے تھے' بلکہ وہ اس کے برعکس سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک دانش مندی اور راست بازی یہ تھی کہ وہ ان بتوں کی پوجا کریں جن کی پوجا ان کے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں اور یہ کام بغیر سوچے سمجھے کیا جائے' اور یہ کہ عبادت کے دائرے سے تجارت و معاملات کو آزاد رکھا جائے۔اور یہی تنازعہ آج نام نہاد ترقی پسندوں اور بدنام رجعت پسندوں کے درمیان اسی انداز سے چل رہا ہے۔

---ooo---

اب حضرت شعیب ؑ ایک ایسے داعی حق کی طرح جسے اپنی سچائی پر پورا پورا یقین ہو' ان کے ساتھ نہایت ہی نرمی سے ہمکلام ہوتے ہیں' وہ ان کے اس مذاق کو سنجیدگی کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔اور ان کی جہالت اور ان کے قصور کو خاطر میں نہیں لاتے۔آپ ان کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف سے پوری شہادت رکھتے ہیں اور ان کو اپنے مشن کے بارے میں شرح صدر حاصل ہے۔اور یہ کہ ان کو وہ علم نبوت دیا گیا ہے جس سے یہ لوگ محروم ہیں' نیز جب یہ اپنے معاملات کو اسلامی طریقہ کار کے مطابق استوار کریں گے تو ان کو جلد ہی اسلامی نظام معیشت کے فوائد کا

علم ہو جائے گا۔ جیسا کہ خود حضرت شعیب ؑ اس پر عمل پیرا ہیں اور صاحب مال و تجارت ہیں۔ کیونکہ وہ اس دعوت پر ان سے کسی ذاتی مفاد کے طلبگار نہیں ہیں۔ اور نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو اچھے طرز عمل کی تلقین کر کے خود برے اعمال پر عمل پیرا ہوں اور بازار کو خالی پاکر خود مفاد سمیٹ لیں۔ ان کی دعوت تو ان لوگوں کے لیے اور عوام الناس سب کے لیے عام ہے اور اس میں ان کے لیے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک وہم ہے کہ معیشت میں اسلامی ہدایات کے نفاذ سے شاید ان کو نقصان ہو گا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۸۸

"شعیب ؑ نے کہا "بھائیو، تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں"۔

حضرت اپنی تقریر میں نہایت ہی ہمدردی، محبت اور برادرانہ جذبات کا خیال رکھتے ہوئے خطاب کرتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (۱۱:۸۸) "شعیب ؑ نے کہا "بھائیو، تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا"۔ میرے نفس کے اندر ایک حقیقت موجود ہے اور میں اسے سچ سمجھتا ہوں، پھر میری طرف وحی آتی ہے اور مجھے حکم دیا جاتا ہے کہ تم تبلیغ کرو، اور ان واضح شہادتوں کے بعد میں تمہارے سامنے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعوت پیش کرتا ہوں۔

وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا (۱۱:۸۸) "پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا ہے"۔ میں خود بھی مالدار ہوں اور اپنی دولت میں تمہاری طرح تصرفات کرتا ہوں۔

وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (۱۱:۸۸) "اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں"۔ یعنی میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اس بری حرکت سے تمہیں تو روک دوں اور دکان میں جاکر خود یہ کام کروں اور دولت کماؤں، ہرگز نہیں بلکہ

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ "میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے"۔

اصلاح سے مراد عام اصلاح ہے جس میں پورے معاشرے کی بھلائی ہو، معاشرے کے تمام افراد اور تمام جماعتوں کی بھلائی ہو۔ اگرچہ بعض لوگ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظریہ حیات اپنانے سے مادی لحاظ سے نقصان پہنچتا

ہے اور انسان سے نفع اندوزی کے مواقع جاتے رہتے ہیں' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ صرف حرام اور خبیث اور ناپاک دولت کے سمیٹنے سے بچ نکلتا ہے۔ بلکہ حرام اور ناپاک کمائی کی جگہ رزق حلال اسے ملتا ہے اور اسلامی نظریہ حیات کے نتیجے میں ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں تمام لوگوں کی ضروریات کی ضمانت ہوتی ہے اور جس کے اندر کوئی تعصب نہیں ہوتا اور نہ کوئی جنگ و جدال ہوتا ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۱:۸۸) "اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے"۔ وہی ہے جو میرے اصلاحی کام کو کامیابی تک پہنچا سکتا ہے' کیونکہ اسے خوب علم ہے کہ میری نیت اور میرا ارادہ کیا ہے اور وہی ہے جو اس جدوجہد پر مجھے جزا دے سکتا ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ (۱۱:۸۸) "اسی پر میں نے بھروسہ کیا"۔ یعنی میرا اعتماد صرف اس پر ہے اور اس کے سوا کسی اور پر میں کوئی بھروسہ نہیں کرتا۔

وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۱۱:۸۸) "اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں"۔ میرا رخ اسی کی طرف ہے' اور تمام امور میں میرا رجوع اسی کی طرف ہے۔ میری نیت' میرا ارادہ اور میرا عمل اسی کی طرف متوجہ ہے۔ اور تمام جدوجہد اس کے لیے ہے۔

اب حضرت شعیبؑ ان کو ایک دوسرے میدان میں فہمائش کرتے ہیں۔ ان کو بتاتے ہیں کہ ذرا قوم نوح' قوم ہود' قوم صالح اور قوم لوط کے انجام پر غور کرو۔ تاریخی واقعات کند ذہن افراد پر زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ جامد اور سنگدل لوگوں پر عقلی دلائل کے مقابلے میں واقعات کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٩﴾

"اور اے برادران قوم' میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخر کار تم پر بھی وہی عذاب آکر رہے جو نوح ؑ یا ہود ؑ یا صالح ؑ کی قوم پر آیا تھا۔ اور لوط ؑ کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے"۔

یعنی میری مخالفت اور دشمنی تمہیں اس بات پر مجبور نہ کر دے کہ تم مخالفت اور تکذیب میں بہت آگے چلے جاؤ اور حدوں کو پار کر لو۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ تم پر وہی عذاب نازل ہو جائے گا جو تم سے پہلی اقوام پر نازل ہوا تھا۔ تم ذرا قوم لوط کے حالات کو پڑھو جو ابھی گزرے ہیں اور جس کا مسکن بھی تمہارے قریب ہے۔ کیونکہ مدین کا علاقہ حجاز اور شام کے درمیان تھا۔

اب حضرت شعیب ؑ ان کو بتاتے ہیں کہ دیکھو تم عذاب کے دھانے پر کھڑے ہو اور تمہارے لیے توبہ کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے اور اللہ کی رحمت اور مغفرت تمہارے لیے ہر وقت تیار ہے۔ وہ نہایت ہی نرم اور پرسوز الفاظ میں یہ

دعوت دیتے ہیں۔

وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

"دیکھو' اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ' بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے"۔

حضرت شعیب ؑ ان کو وعظ و نصیحت' یاد دہانی اور تخویف اور اچھے انجام کی یقین دہانی اور تمام دوسرے ذرائع سے راہ راست پر لانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہر حربہ استعمال کرتے ہیں کہ ان کے دل نرم ہو جائیں۔ ان کے اندر خدا خوفی پیدا ہو جائے۔ لیکن ان لوگوں کے دل انتہائی درجے تک بگاڑ اور فساد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کا تصور حیات ہی غلط تھا' اس لیے ان کی روش بھی غلط تھی۔ چنانچہ وہ ان کی پر سوز گفتگو کے نتیجے میں سرکشی کی راہ میں مزید آگے بڑھ جاتے ہیں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

"انہوں نے جواب دیا "اے شعیب ؑ" تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں' اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے' تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے' تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو"۔

حق بالکل واضح ہے لیکن ان کا سینہ اس کے لیے تنگ ہے۔ وہ چاہتے ہی نہیں کہ حق کا ادراک کر سکیں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (۱۱ : ۹۱) "انہوں نے جواب دیا "اے شعیب ؑ" تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں"۔

یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اقدار حیات کا تعین صرف مادی مفادات کے اصولوں کے مطابق کرتے ہیں اور ہر معاملے کے ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں۔

وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا (۱۱ : ۹۱) "اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے"۔ یہ لوگ مادی قوت ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس حقیقت اور قوت کا کوئی وزن نہیں ہے جو حضرت شعیب ؑ ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

وَلَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۱۱ : ۹۱) "اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے"۔ ان کے نزدیک گویا نظریاتی قوت کے مقابلے میں خاندان کی قوت زیادہ اہم ہے۔ دلی جوڑ کے مقابلے میں نسب کا جوڑ زیادہ مضبوط ہے لیکن یہ لوگ دراصل اس بات سے غافل ہیں کہ اللہ اپنے دوستوں پر' ایک بھائی کے حق

میں بھائی کی غیرت سے زیادہ غیور ہے۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ (۱۱ : ۹۱) "تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو"۔ یعنی تم ایک بھائی اور معزز آدمی کی حیثیت سے بھی ہم پر غالب نہیں ہو اور نہ ایک طاقتور شخص کی حیثیت سے تمہارا پلہ بھاری ہے' ہم اگر مجبور ہیں تو خاندانی روابط کی وجہ سے تجھ پر ہاتھ ڈالنے سے مجبور ہیں۔

جب انسان ایک پختہ نظریہ سے محروم ہو جاتا ہے' اس کے پیش نظر اعلیٰ قدریں اور اعلیٰ روایات نہیں ہوتیں تو وہ زمین پر گر پڑتا ہے' اس کے ذہن میں اس دنیا کے مفادات ہی اعلیٰ و ارفع ہو جاتے ہیں اور وہ دنیاوی قدروں کا گرویدہ ہو جاتا ہے لہٰذا وہ اس جیسی قیمتی اور بلند دعوت کی قدر نہیں کرتا۔ وہ اعلیٰ حقائق کے ادراک سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی ذہنیت کے لوگ ایسی بلند دعوت پر اگر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ تو بھی محض دنیاوی قوت کے ڈر سے نہیں اٹھاتے۔ ایسے لوگ محض مادی قوت کو خاطر میں لاتے ہیں۔ رہے بلند عقائد' اعلیٰ خیالات اور بلند اقدار تو یہ وہ چیزیں ہیں جن کی کسی مادہ پرست شخص کے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ گرے ہوئے پست لوگوں کی ذہنیت ہمیشہ کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔

اب حضرت شعیب ؑ کی غیرت ایمانی جوش میں آتی ہے' ان سے اللہ رب العالمین کی یہ توہین برداشت نہیں ہوتی' وہ اپنی قوم اور کنبے کی مادی قوت سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو اس برے انجام کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کائنات میں ایسے لوگوں کے لیے مقدر ہوتا ہے اور اللہ کے بارے میں ان کے توہین آمیز رویے کی مذمت کرتے ہیں اور ان کے سامنے ایک آخری اور فیصلہ کن دعوت پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں میرا عمل میرا ہے اور تمہارا عمل تمہارا۔ اب وہ ان کو خدائی قوتوں کے حوالے کرتے ہیں اور ان کو صاف صاف بتاتے ہیں کہ تم جیسے لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں ایک بہت بڑا عذاب ہر وقت تیار رہتا ہے لہٰذا لو اپنا وہ انجام جو تم نے خود اپنے لیے اختیار کیا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾

"شعیب ؑ نے کہا "بھائیو' کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا تو خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اے میری قوم کے لوگو' تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا' جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں"۔

فرماتے ہیں :

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (۱۱ : ۹۲) "شعیب ؑ نے کہا "بھائیو' کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے"۔ میری برادری تو انسانوں کا فقط ایک مجموعہ ہے۔ جس قدر بھی وہ قوی ہوں بہرحال وہ انسان ہی تو ہیں' ضعیف مخلوق ہی تو ہیں۔ اللہ کے تو بہرحال وہ بندے اور غلام ہیں' کیا چند لوگوں سے تم ڈرتے

ہو' اور اللہ سے نہیں ڈرتے ہو' کس قدر بودی سوچ ہے تمہاری۔

وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا (۱۱:۹۲) "اور اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا"۔ کسی کو چھوڑ دینے اور کسی سے منہ پھیر دینے کا یہ نہایت ہی مخصوص انداز بیان ہے' واضح تصویر کشی کے انداز میں۔ چونکہ یہ لوگ اللہ سے منہ پھیرتے ہیں اور اعراض کرتے ہیں اس لیے ان کا یہ فعل نہایت ہی گھناؤنا ہے۔ کیونکہ اللہ ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ جن اچھے حالات میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں ان کا رازق وہی تو ہے۔ گویا ان کا یہ فعل نہایت متکبرانہ' ناسپاسی اور سفید چشمی ہے اور شرعی اعتبار سے کفر و تکذیب کا حامل ہے اور نہایت ہی برا اندازہ ہے جو انہوں نے لگایا۔

اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ (۱۱:۹۲) "جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے"۔ احاطہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کا احاطہ کیا گیا ہو وہ پوری طرح محیط کے قبضہ اور زیر قدرت ہوتی ہے۔ اس سے مراد قدرت کاملہ ہے۔

ایک مومن کی جانب سے بارگاہ رب العزت میں یہ بڑی جرأت ہے کہ وہ اللہ کی عزت کو ہاتھ ڈالے اور اللہ کے غضب کو دعوت دے۔ اللہ کا عذاب جب نازل ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں قوم' قبیلہ' خاندان اور ملازم بے بس ہو جاتے ہیں۔ حضرت شعیب ؑ کی خاندانی اور قوم قبیلے کی قوت کا تو انہوں نے اعتراف بھی کیا لیکن وہ تو مومن باللہ تھے۔ انہوں نے اس معمولی قوت کی کوئی پروا نہیں کی نہ اسے قابل ذکر سمجھا کہ قوم کی وجہ سے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ نہ انہوں نے قوم اور قبیلے کی قوت پر اکتفاء کیا اور یہی رویہ ایک سچے مومن کا رویہ ہوتا ہے۔ ایک سچا مومن صرف اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ بھی صرف اللہ سے ڈریں۔ ایک مومن قوم اور قبیلے کی قوت اور عصبیت کو بھی اسلام اور رب کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ ہے اسلامی اور غیر اسلامی قومیت کے درمیان فرق۔ ہر دور اور زمانے میں قوم قبیلے کے بارے میں اسلام اور جاہلیت کا یہی تصور اور فرق رہا ہے۔

یہ جذبہ ایمانی اور جوش ایمان ہے جس کی تہہ میں اللہ پر بھروسے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی سے حضرت شعیب ؑ اب اپنی قوم کے لوگوں کو یہ سخت چیلنج دیتے ہیں اور ان کے درمیان جدائی ہو جاتی ہے اور اب دونوں کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔

وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ (۱۱:۹۳) "اے میری قوم کے لوگو' تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ"۔ تم اپنے راستے اور اپنے منصوبے پر عمل کرو میں اپنے پر کر رہا ہوں۔ اب میں نے تم سے اپنے ہاتھ جھاڑ لیے ہیں۔

اِنِّیْ عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَ ارْتَقِبُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ (۱۱:۹۳) "اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا' جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں"۔

تم اپنے طریقے پر کام کرو میں اپنے پر کر رہا ہوں۔ عنقریب تمہیں اپنا انجام معلوم ہو جائے گا اور ہمیں اپنا۔ نیز جو عذاب تمہارے انتظار میں ہے اس کے لیے انتظار کرو۔ (ارتقبوا) میں انہیں جو انتظار کا مشورہ دیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کے دل میں پورا یقین تھا کہ عذاب آنے والا ہے۔ نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب ؑ نے ان سے مکمل جدائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

---ooo---

اب اس منظر کا پردہ گرتا ہے۔ یہ منظر نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے ایک آخری بات یعنی حق و باطل کی مکمل جدائی کی بات کی جاتی ہے۔ دوسرا منظر اب اس قوم کی مکمل تباہی کا منظر ہو گا۔ اس منظر میں یہ لوگ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہیں۔ ان کو ایسی کڑک نے آلیا جیسے قوم صالح ؑ پر آئی تھی۔ چنانچہ دونوں کا انجام ایک جیسا تھا۔ ان کے محلات خالی پڑے تھے گویا کبھی یہاں کوئی بستا ہی نہ تھا گویا کبھی یہ محلات تعمیر ہی نہ ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی قوم صالح ؑ کی طرح تاریخ کا حصہ بن گئے اور ابد الآباد تک ملعون ٹھہرے۔ جس طرح ان کا وجود اس کرۂ ارض سے لپیٹ لیا گیا۔ اسی طرح صفحات تاریخ سے ان کا ذکر بھی مٹا دیا گیا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّيۡنَا شُعَيۡبًا وَّالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوا الصَّيۡحَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دِيَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنۡ لَّمۡ

۱۲ع ۸ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّمَدۡيَنَ كَمَا بَعِدَتۡ ثَمُوۡدُ ﴿۹۵﴾

۸ ”آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب ؑ اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا' ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے گویا کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے۔ سنو! مدین والے بھی دور پھینک دیئے گئے جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے“۔

تاریخ کا ایک دوسرا سیاہ ورق الٹ دیا گیا اور مکذبین پر عذاب الٰہی ایک حقیقت بن کر آیا۔ ان لوگوں پر جو پیغمبروں کے ڈراوے کو جھٹلاتے تھے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۴ ایک نظر میں

یہاں قصص کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس خاتمے میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے تاکہ یہاں قوم فرعون کی ہلاکت کو بھی ریکارڈ پر لایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ قوم فرعون نے بھی اللہ کے پیغمبر کے مقابلے میں فرعون کی اطاعت کی تھی اس لیے ہلاک ہوئی۔ اس اشارے میں قصہ فرعون کی ناگفتہ کڑیوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جبکہ قصے کی بعض اہم جھلکیاں بھی اس منظر میں موجود ہیں۔ ان تمام قصص میں یہی اہم اصول زیر بحث ہے کہ اسلام میں ہر فرد اپنے کیے کا ذمہ دار ہے اور اگر کوئی رؤسا اور کبراء کی اطاعت کرتا ہے تو خدا اور رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

---ooo---

قصہ فرعون کا آغاز اس منظر سے ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو آیات اور دلائل و بینات کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا جاتا ہے جن کے اندر خدائی قوت ہے اس لیے کہ فرعون عظیم مادی قوت کا مالک تھا۔ لہٰذا اس کی قوت کے مقابلے میں قوت کا ہونا ضروری تھا۔

---ooo---

درس نمبر۱۰۴ تشریح آیات

۹۶ ــــ تا ــــ ۹۹

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

"اور موسیٰ ؑ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی سند ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا"۔

یہاں سیاق کلام میں اس قصے کو نہایت ہی اجمال کے ساتھ لایا جاتا ہے کیونکہ یہاں مقصد یہ ہے کہ قصے کا آخری منظر پیش کیا جائے۔ چنانچہ نظر آتا ہے کہ آگے آگے فرعون ہے اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی قوم ہے۔ یہ لوگ اللہ کی حکم عدولی کر کے فرعون کے احکام کو مانتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ فرعون کا حکم جاہلانہ 'احمقانہ اور بودا ہے۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾

"مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی 'حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا"۔

یہ لوگ چونکہ فرعون کے متبعین تھے اس لیے یہ اس کے پیچھے چلیں گے۔ جس طرح یہاں وہ بغیر سوچ اور تدبیر کے اس کے پیچھے چلتے تھے۔ اپنی رائے اور عقل کو استعمال نہ کرتے تھے۔ وہ ذلت پر راضی تھے 'اور اللہ نے عقل 'ارادہ اور آزادی کی جو نعمتیں ان کو دی تھیں 'انہوں نے ان نعمتوں سے دست برداری اختیار کر لی تھی 'اور غلامی کی راہ اختیار کر لی تھی 'یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن یہ عذاب میں بھی اسی غلامانہ شان سے داخل ہوں گے۔ فرعون وہاں بھی ان کا لیڈر ہو گا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

"قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور اپنی پیشوائی میں انہیں دوزخ کی طرف لے جائے گا۔ کیسی بد تر جائے ورود ہے یہ جس پر کوئی پہنچے"۔

ذرا اس منظر کو دیکھئے! آغاز یوں ہوتا ہے کہ قصہ ماضی کا ہے اور مستقبل میں انجام بد کا ڈراوا ہے۔ اچانک یہ منظر عملاً شروع ہو جاتا ہے۔ مستقبل ماضی میں بدل جاتا ہے اور اسکرین پر ماضی کی حالت چلتی ہے۔ فرعون نے گویا قیامت میں

ان کی قیادت کر ہی ڈالی۔

(فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ) ”مویشیوں کی طرح انہیں آگ کے گھاٹ پر لے گیا“۔ جس طرح ایک چرواہا اپنی بکریوں کو پانی پلانے کے لیے گھاٹ پر لے جاتا ہے۔ بے شک یہ لوگ جانوروں کا ایک ریوڑ ہی تو تھے۔ ریوڑ نے کبھی غور و فکر کیا ہے؟ کیا انہوں نے انسانیت کی اعلیٰ صفات یعنی غور و فکر کرنے سے انکار نہیں کر دیا؟ اور حریت و ارادہ سے دست برداری اختیار نہیں کر لی؟ لہٰذا وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ جہنم کے گھاٹ پر پہنچ جائیں' جہاں ان کی پیاس نہ بجھے گی۔ جہاں ان کا سینہ ٹھنڈا نہ ہو گا بلکہ وہاں کا پانی تو ان کی آنتوں اور ہونٹوں کو بھون ڈالے گا' دل جلا دے گا۔

بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۱۱:۹۸) ”کیسی بدتر جائے ورود ہے یہ“۔ یہ تو ایک منظر تھا جس میں فرعون ان کی قیادت کر رہا ہے اور ان کو آگ تک پہنچاتا ہے۔ لیکن اس منظر پر تبصرہ یوں ہے :

وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

”اور ان لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے روز بھی پڑے گی۔ کیسا برا صلہ ہے یہ جو کسی کو ملے!“ یہ ایک توہین آمیز تبصرہ ہے۔ یوں کہ آگ کو تحفے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محنت کا صلہ۔ یہ تھا تحفہ جو فرعون نے ان کو دیا۔ ہاں اس نے جادوگروں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کو عظیم صلہ اور جزاء دے گا۔ یہ ہے اس کی دی ہوئی جزا اور انعام۔ یہ ہے اس کا عظیم انعام۔ کیا ہی برا ہے وہ گھاٹ جس پر اس نے اپنی قوم کو اتارا اور کیا ہی برا ہے وہ صلہ جو اس نے اپنی قوم کو اس کی جانب سے اتباع پر دیا۔

یہاں قرآن کریم کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ انسان عش عش کرنے لگتا ہے اور یہ ہے دراصل اعجاز اس کتاب عزیز کا جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو قرآنی اسلوب کا ذوق رکھتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۵ ایک نظر میں

یہ سبق اس سورت کا اختتامیہ ہے۔ اس میں کافی تبصرے اور متنوع نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ سورت کے تمام مضامین کو پیش نظر رکھ کر ایک مکمل اختتامیہ ہے۔ سورت کے آغاز اور قصص سب کا خلاصہ یہاں آگیا ہے۔ یہ تبصرے اور نتائج سورت کے مباحث کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتے ہیں اور سورت کے اغراض و مقاصد کے ساتھ مکمل مناسبت بھی رکھتے ہیں۔

مثلاً پہلا نتیجہ واضح طور پر قصص القرآن کے ساتھ متعلق ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ (۱۰۰) وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۰۱) وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِىَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۰۲) ((۱۱: ۱۰۰ تا ۱۰۲)) "یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں، ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا، اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آسکے اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہوتی ہے۔ فی الواقعہ اس کی پکڑ سخت اور دردناک ہوتی ہے"۔

دوسرا تبصرہ ہے ان اقوام کی ہلاکت پر جو اس دنیا میں ہلاکت سے دوچار ہوئیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس دنیاوی پکڑ کے بعد آخرت کی پکڑ شدید ہوگی۔ آخرت کے عذاب کا یہ نقشہ اس طرح کھینچا جاتا ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے اسکرین پر چلتا پھرتا نظر آتا ہے جس طرح قرآن کریم مشاہد قیامت کے مناظر کو پیش کرتا ہے۔

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۰۳) وَ مَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ (۱۰۴) يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِىٌّ وَّ سَعِيْدٌ (۱۰۵) فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا

زَفِيرٌ وَّ شَهِيقٌ (١٠٦) خٰلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (١٠٧) وَ اَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ (١٠٨)

(۱۱: ۱۰۳ تا ۱۰۸) "حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے' ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے۔ وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا۔ ہم اس کے لانے میں کچھ زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں۔ بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہوگی الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے۔ پھر کچھ لوگ اس دن بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے' جہاں وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے' جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے' کرے۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو گا"۔

اس کے بعد ان ہلاک شدہ بستیوں کے انجام سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ جو انجام ان بستیوں کا ہوا' وہی انجام اہل مکہ کا بھی ہو گا۔ اگر دنیا میں ان کو ہلاک نہ کیا گیا اور ان کو مہلت دے دی گئی جس طرح قوم موسیٰ کو مہلت دی گئی کہ ان کے باہم اختلافات اور نافرمانیوں کے باوجود ان کو اس دنیا میں ہلاک نہ کیا گیا لیکن قیامت میں یہ لوگ قوم موسیٰ کی طرح ضرور عذاب سے دوچار ہوں گے' لہٰذا اے رسول آپ اور آپ کے ساتھ چلنے والے ساتھی اپنی راہ پر سیدھے آگے بڑھیں اور ان مشرکین اور ظالموں کی طرف ذرا بھی جھکاؤ اختیار نہ کریں' نماز قائم کریں' مشکلات پر صبر کریں کیونکہ اللہ محسنین کے اجر کو ذرہ برابر ضائع نہیں کرتا۔

فَلَا تَكُ فِى مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ (١٠٩) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَفِى شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ (١١٠) وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيرٌ (١١١) فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيرٌ (١١٢) وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ
(۱۱۳) وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ
ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (۱۱۴) وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱۵)

(۱۱: ۱۰۹ تا ۱۱۵) "پس اے نبی! تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ' جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے' اور ہم ان کا حصہ انہیں بھرپور دیں گے بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو۔

ہم اس سے پہلے موسیٰ کو کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے) اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔

پس اے نبیؐ' تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو' جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا' ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے۔ اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔ اور دیکھو' نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔ اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا"۔

اس کے بعد روئے سخن ان ازمنہ قدیمہ کی اقوام کی طرف مڑ جاتا ہے جن میں ایسے لوگ نہ تھے جو لوگوں کو فساد فی الارض سے روکتے۔ ان اقوام کی اکثریت اسی راہ پر چلتی رہی جس پر وہ چل پڑے تھے۔ اس لیے وہ اقوام ہلاکت کی مستحق قرار پائیں۔ اللہ کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ کسی بستی کو ہلاک کر دے اور اس کے باسی مصلح ہوں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱۶)
وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱۷) (۱۱: ۱۱۶

- ۱۱۷) "پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں' ایسے اہل خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا ورنہ ظالم لوگ تو انہی

مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کا سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیا گیا اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں"۔

اس حصے میں اللہ نے ان سنتوں کا بھی ذکر فرمایا ہے جو اللہ نے اپنی مخلوقات کے اندر جاری کی ہوئی ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ لوگوں کے رجحانات اور میلانات مختلف ہوں گے اور ان کے خیالات میں اختلاف ہو گا۔ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی ملت کر دیتا۔ لیکن اللہ نے لوگوں کو فکری اور اختیاری آزادی عطا کر دی اور اس وجہ سے ان کے درمیان اختلافات واقع ہو گئے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (۱۱۸) اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۱۱۹) (۱۱: ۱۱۸ - ۱۱۹) "بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا۔ مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہی لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی (آزادی انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اس نے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہو گئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

آخر میں 'اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ان قصص کے بیان سے غرض و غایت کیا ہے؟ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو مضبوط کیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ کفار کو آخری وارننگ دے دیں اور ان کو بتا دیں کہ کس قدر عظیم عذاب آخرت ان کے انتظار میں ہے' اور یہ کہ آپ اللہ پر توکل کر کے اللہ کی عبادت کریں اور لوگوں کو اللہ کے حوالے کر دیں تاکہ اللہ ان کو ان کے عمل کے مطابق جزا دے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۲۰) وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۲۱) وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۲۲) وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۲۳) (۱۱: ۱۲۱ - ۱۲۳) "اور اے نبیؐ' یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا۔ اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جا رہے ہیں' انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے۔ سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اللہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے نبی تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ' جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو' تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

درس نمبر ۱۰۵ تشریح آیات

۱۰۰ ـــ تا ـــ ۱۲۳

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾
وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾
وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

"یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا' انہوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آسکے اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے' فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے"۔

اس سے قبل جو مناظر پیش کیے گئے وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ پردۂ خیال پر مناظر و تصاویر بڑی تیزی سے آرہی اور گزر رہی ہیں۔ نظر آتا ہے کہ بعض لوگ ایک عظیم طوفان میں موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ بعض لوگ سخت آندھی میں گھرے ہوئے ہیں جو سب کچھ تباہ کرتی آگے بڑھ رہی ہے' بعض لوگوں پر اس قدر شدید آواز اور چیخ آئی وہ دھڑام سے گرے اور ڈھیر ہو گئے۔ بعض لوگ اپنے گھروں سمیت زمین کے پیٹ میں دھنس گئے اور بعض ایسے ہیں کہ جو اپنے متبعین کے جلوس کی قیادت کر رہے ہیں لیکن پورے کا پورا جلوس جا کر جہنم میں گر جاتا ہے' غرض اقوام سابقہ کو پیش آنے والے تمام واقعات نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور بات لوگوں کے دل و دماغ اور ان کے شعور کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے تو اس حالت میں درج ذیل تبصرہ آتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ (۱۱ : ۱۰۰) "یہ چند بستیوں کی

سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے''۔
یہ چند بستیوں کی مختصر سرگزشت ہے' عبرت آموزی کے علاوہ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جو پیغمبر یہ علم پیش کر رہا ہے' مسلمہ طور پر اس سے قبل وہ ان باتوں کو نہ جانتا تھا' لہٰذا اس کے پاس یہ معلومات بذریعہ وحی ہی آ رہی ہیں اور قصص قرآن کے پیش کرنے کے بے شمار مقاصد میں سے یہ بھی ایک مقصد ہے۔
(مِنْهَا قَآئِمٌ) ''یعنی ان کے آثار ابھی تک قائم ہیں' لوگ دیکھ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ یہ کس قدر متمدن اور ترقی یافتہ اقوام تھیں مثلاً علاقہ احقاف میں عاد کے آثار ہیں' اور علاقہ حجر میں قوم ثمود کے آثار ابھی تک موجود ہیں اور ان میں سے بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔یعنی وہ ''زرع محصود'' کی طرح ہیں کہ فصل کٹ جانے کے بعد زمین چٹیل رہ گئی ہے' مثلاً قوم نوح اور قوم لوط جن کے آثار بھی غائب ہیں۔
اقوام اور گروہوں کی حیثیت کیا ہے' کبھی ہم نے غور کیا ہے؟ دراصل وہ بھی انسانوں کی فصلیں ہیں' بوئی جاتی ہیں بڑی ہوتی ہیں اور کٹ جاتی ہیں۔ان میں سے بعض فصلیں اچھی ہوتی ہیں اور بعض بری ہوتی ہیں' بعض فصلیں بڑھتی ہیں اور بعض گھٹتے گھٹتے مر جاتی ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۱ : ۱۰۱) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا' انہوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا''۔انہوں نے اپنے فہم و ادراک کے ذرائع کو معطل کر دیا تھا۔ہدایت سے منہ موڑ لیا تھا' اللہ کی آیات و معجزات کی تکذیب کر دی تھی' اور ان کو جن باتوں سے ڈرایا گیا تھا' اس کے ساتھ انہوں نے مذاق کیا تھا' لہٰذا وہ مظلوم نہ تھے بلکہ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے۔

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۱ : ۱۰۱) ''اور جب اللہ کا حکم آ گیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آ سکے اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا''۔
ان قصص کے لانے کی یہ ایک دوسری غرض ہے۔اس سورت کا آغاز ہی اس بات سے ہوا تھا کہ جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور کے دین اور نظام کی پیروی کرتے ہیں' ان کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔اس کے بعد قصص رسل میں تمام رسولوں نے لوگوں کو باری باری برے انجام سے ڈرایا۔تمام رسولوں نے لوگوں کو کہا کہ تم نے جن خود ساختہ الٰہوں کی پیروی اختیار کر رکھی ہے' وہ تمہیں نہیں بچا سکتے۔چنانچہ تمام قصص کا یہ خلاصہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اور جب اللہ کا حکم آئے گا اور قیامت برپا ہو گی تو وہاں یہ الٰہ کسی بھی پیروکار کو عذاب سے نہ بچا سکیں گے بلکہ ان کی وجہ سے خسارہ اور بربادی ہو گی (یہاں لفظ تتبیب استعمال ہوا ہے۔جو لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے سخت بربادی کا اظہار کرتا ہے) یہ بربادی زیادہ اس لیے ہو گی کہ ان لوگوں نے ان جھوٹے خداؤں پر اندھا اعتماد کیا اور اس وجہ سے یہ اعراض اور تکذیب میں آگے بڑھ گئے' اس وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ سخت عذاب کے مستحق ٹھہرے۔یہ الٰہ تو جس طرح نفع نہیں دے سکتے تھے' اسی طرح نقصان بھی نہ دے سکتے تھے لیکن اس اندھے اعتماد کی وجہ سے خسارہ بڑھ گیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ (۱۱ : ۱۰۲) "اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے"۔ (اسی طرح) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قصص میں بیان ہوا' جس طرح اقوام ملل کو تباہ اور ہلاک کیا گیا' جب انہوں نے ظلم کیا۔ ظالم سے مراد مشرک ہے یعنی جب وہ اللہ کی ربوبیت اور حاکمیت سے روگردانی کر کے کسی اور کو رب اور حاکم بنا لیتی ہیں اس طرح وہ اپنے اوپر ظلم کرتی ہیں کیونکہ شرک و فساد میں مبتلا ہو کر عذاب آخرت کی مستحق بنتی ہیں۔ ایسی اقوام شرک کی وجہ سے دعوت توحید' دعوت اصلاح سے محروم ہو جاتی ہیں اور اس طرح زمین ظلم و فساد سے بھر جاتی ہے۔

اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۱۱ : ۱۰۲) "فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور درد ناک ہوتی ہے"۔ یہ سزائے شدید اللہ تعالیٰ مہلت کے بعد دیتا ہے' جب لوگ خوب عیاشی کر لیتے ہیں' یوں وہ ابتلا میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر ان کے عذرات بھی ختم ہو جاتے ہیں' اس لیے کہ رسولوں کو بھیج کر اللہ تعالیٰ ان پر حجت تمام کر دیتا ہے۔ پھر جب ان اقوام میں ظلم کا دور دورہ ہوتا ہے اور مظلوموں پر ظالموں کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ دعوت حق دینے والے مصلحین نہایت ہی قلیل اور بے اثر رہ جاتے ہیں اور ظالموں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی۔ کیونکہ وہ ظلم میں بہت آگے جا چکے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اہل ایمان ان ظالموں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں جو ظلم میں بہت آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں۔ یہ اہل ایمان پھر اپنے آپ ہی کو امت سمجھتے ہیں' اپنے دین اور اپنے رب کی پیروی کرتے ہیں' ان کا اپنا قائد ہوتا ہے اور اپنے روابط ہوتے ہیں اور امت ظالمہ کو وہ چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے قدرتی انجام تک پہنچ جائے۔ اللہ کی اس سنت کے مطابق جو اس نے اس کائنات کے لیے تجویز کر رکھی ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

---ooo---

یہ دنیاوی پکڑ دراصل آخرت کے لیے ایک علامتی سزا ہوتی ہے اور جو لوگ عذاب آخرت سے ڈرتے ہیں وہ اس پکڑ سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ اسے دیکھ رہے ہوتے ہیں ان کو اللہ نے بہرحال یہ بصیرت دے دی ہوتی ہے کہ جو خدا دنیا میں اس قدر شدید عذاب کسی قوم کو دے سکتا ہے وہ آخرت میں اس سے بھی شدید عذاب دے سکتا ہے۔ اس لیے وہ ڈرتے ہیں۔ یہاں قرآن مجید انسان کو اچانک دنیا کے مناظر سے قیامت کے مناظر کی طرف لے جاتا ہے اور یہ قرآن مجید کا خاص اسلوب ہے کہ وہ دنیا کے مناظر کے بعد اچانک آخرت کا منظر پیش کر دیتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا
الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا
شَآءَ رَبُّكَؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ﴿۱۰۸﴾

”حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ' ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے۔ وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا۔ ہم اس کے لانے میں کچھ زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں۔ بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہو گی الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے۔ پھر کچھ لوگ اس دن بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے ' جہاں وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے ' جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں ' الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے ' کرے۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو گا“۔

یعنی اس دردناک اور شدید پکڑ میں عذاب آخرت کے ساتھ ایک قسم کی مشابہت ہے۔ دنیا کی یہ پکڑ عذاب آخرت کی یاد دہانی کرانے والی اور دل میں خوف بٹھانے والی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ (۱۱:۱۰۳) ”حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ' ہر اس شخص کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے“۔ لیکن حقیقت ہے کہ یہ عبرت وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دل میں آخرت کے عذاب کا ڈر ہو ' ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کے فکر و نظر کو جلا ملتی ہے۔

لیکن جن کے دل میں آخرت کا خوف نہیں ہوتا ' ان کے دل بہرے ہوتے ہیں ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں ' وہ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی نظر قاصر ہوتی ہے اور وہ صرف اس دنیا ہی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس دنیا میں جو عبرت انگیز حالات پیش آتے ہیں وہ ان سے بھی عبرت و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔

اب بتایا جاتا ہے کہ یہ دن کیسا ہو گا؟

ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (۱۱:۱۰۳) ”وہ ایک دن ہو گا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا“۔

یہ ایک منظر ہے جس میں سب لوگ جمع کر دیئے جائیں گے ' اس اکٹھ میں ان کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہ ہو گا بلکہ اس نظر آنے والے منظر میں ان کو چلا کر لایا جائے گا ' تمام کے تمام لوگ یکجا حاضر ہوں گے اور سب کی سب انجام کے منتظر ہوں گے۔

یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۱۱:۱۰۵) ”جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال

نہ ہوگی ' الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے"۔ سب لوگوں پر ہیبت طاری ہوگی اور خوفناک سکوت کا ماحول ہو گا ' لوگ سہمے ہوں گے ' وہاں بات اجازت سے ہوگی مگر اجازت طلب کرنا کارے دارد۔ یہ اللہ ہی ہو گا جو کسی کو اجازت دے دے ' تو کچھ عرض کی جاسکے گی۔

اب لوگوں کو ان کے انجام کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا:

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ (۱۱: ۱۰۵) "پھر کچھ لوگ اس روز بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت"۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ بدبختی کا شکار ہوئے وہ دوزخ میں پڑے ہوئے ہیں ' ان کی سانس پھولی ہوئی ہے اور ہانپ رہے ہیں اور پھنکارے مار رہے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ جنت میں ہیں وہ بھی نظر آتے ہیں اور ان کے لیے ایسے عطیات ہیں جو دائمی ہیں اور ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ (۱۰۶) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (۱۰۷) ((۱۱: ۱۰۶ – ۱۰۷))

"جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے ' جہاں وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے ' جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں ' الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے"۔

یہ سب لوگ جنت و جہنم میں "اس وقت تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان ہیں"۔ یہ عربی محاورہ ہے جو استمرار اور دوام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورات کا اپنا مفہوم ہوتا ہے اور ایک خاص اثر انگیزی ہوتی ہے ' یہاں بھی یہ محاورہ انداز تعبیر کے اعتبار سے بہت ہی خوب ہے۔

لیکن دونوں صورتوں میں اللہ نے دوام جنت اور دوام جہنم کو اپنی مشیت کے ساتھ معلق کر دیا ہے۔ اور آخر کار تمام فیصلے اس کی مشیت کے تابع ہوتے ہیں ' یوں ہو رہا ہے کیونکہ اللہ کی مشیت کا یہ تقاضا ہے لیکن اللہ خود اپنی مشیت کا بھی پابند نہیں ہے جب چاہے اپنی سنت کو بدل دے۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۰۷) "بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے"۔ یہ فقرہ ان لوگوں کے قلبی اطمینان کے لیے ہے جو خوش قسمت واقعہ ہوئے تھے کہ ان کا انعام دائمی ہو گا اور کبھی منقطع نہ ہو گا ' اگرچہ مفروضہ اپنی جگہ ہو کہ اللہ تبدیل کر سکتا ہے لیکن چونکہ اللہ نے ان کے لیے ایسا ارادہ کر لیا ہے ' اس لیے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی مشیت بہرحال آزاد ہے۔

---ooo---

جب بات یہاں تک پہنچ گئی کہ آخرت میں دونوں فریقوں کا انجام کیا ہو گا ' اور یہ بتا دیا گیا کہ دنیا میں بدبخت اقوام کا حشر کیا ہو گا ' اور آخرت میں ان کی حالت کیا ہوگی ' یہاں ان پر کیا کیا عذاب آئے گا اور آخرت میں ان کے ساتھ کیا

سلوک ہو گا اب سیاق کلام میں بات کا رخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے اور خطاب اب آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں سے ہے جو مکہ میں کمزور حالت میں ہیں۔ ان کو تسلی دی جاتی ہے اور ان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ جس راہ پر چل پڑے ہیں' اس پر ثابت قدم رہیں۔ اور مکہ کے منکرین کو مزید ڈرایا جاتا ہے کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو گا جو ان اقوام کا ہوا جن کے قصص بیان ہوئے۔ اگرچہ عذاب الٰہی میں تاخیر ہوئی ہے لیکن اس سے قبل بھی اللہ نے کئی اقوام کو لمبی مہلت دی ہے۔ اور مہلت ختم ہونے کے بعد سب کو ان کے کیے کا اچھا یا برا پورا پورا بدلہ دے دیا گیا لیکن اپنی مقررہ میعاد کے بعد۔ عذاب اور حساب و کتاب میں تاخیر ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اقوام حق پر تھیں' جس طرح ان اقوام کے آباؤ اجداد باطل پر تھے اسی طرح یہ بھی باطل پر تھیں۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۚ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا
يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۚ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿١٠٩﴾ وَلَقَدْ ع ۱۰
اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ ۚ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿١١٠﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ
اَعْمَالَهُمْ ۚ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿١١١﴾

"پس اے نبی' تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ' جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے' اور ہم ان کا حصہ انہیں بھرپور دیں گے بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو۔

ہم اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے) اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے"۔

آپ اپنے دل میں ذرہ برابر شک نہ کریں کہ یہ لوگ جن بتوں کی پیروی کرتے ہیں وہ غلط ہیں۔ خطاب تو حضورؐ کو ہے لیکن ذرا اوا قوم کو ہے' یہ اسلوب بسا اوقات زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہؐ کے درمیان یہ معاملہ طے ہو چکا ہے۔ اللہ نے رسول اللہؐ کو آخری احکامات دے دیئے ہیں۔ اب اس میں کوئی نزاع کا موقعہ نہیں ہے اور جو لوگ مجرم ہیں ان کو ایک طرف چھوڑ دیا گیا۔ گویا وہ بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس طرح ان پر زیادہ اثر ہو گا' بمقابلہ اس کے کہ اگر ان کو براہ راست خطاب کیا جاتا۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ

(۱۱ : ۱۰۹) "پس اے نبیؐ تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ' جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اسی طرح پوجاپاٹ کیے جارہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے"۔

لہٰذا ان کا انجام بھی اقوام سابقہ کی طرح ہو گا' یعنی دائمی عذاب۔ لیکن یہاں صراحت نہیں کی جاتی کیونکہ ان کا انجام معروف و معلوم ہے۔

وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ (۱۱ : ۱۰۹) "اور ہم ان کا حصہ انہیں بھرپور دیں گے' بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کسر ہو"۔ اور ان کا انجام اسی طرح مشہور و معروف ہے جس طرح ان سے پہلے لوگوں کے بارے میں طے شدہ ہے اور سابقہ لوگوں کے کچھ مناظر اس سے قبل پیش کیے بھی جا چکے ہیں۔ ہاں دنیا میں تو یہ بھی ممکن ہے کہ قوم موسیٰ کی طرح انہیں مہلت دے دی جائے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (۱۱ : ۱۱۰) "ہم اس سے پہلے موسیٰ کو کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جارہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے)"

قوم موسیٰ نے اپنی کتاب کے بارے میں بہت سے اختلافات کیے' ان کے اعتقادات کیا سے کیا بن گئے اور وہ فرقے فرقے بن گئے۔ لیکن اللہ کی طرف سے حکم یہ تھا کہ ان کو تباہ نہ کیا جائے اور ان سے پورا پورا حساب قیامت کے دن لیا جائے۔

وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ (۱۱ : ۱۱۰) "اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا"۔

اور اللہ کے اس کلمے اور فیصلے سے بھی پہلے اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ بنی اسرائیل کے مقدمے کو قیامت تک موخر کر دیا جائے کیونکہ بنی اسرائیل اہل کتاب تھے اور تمام ایسے رسول جو اہل کتاب تھے' ان کی امتوں کو قیامت تک کے لیے مہلت دی گئی۔ کیونکہ کتاب اس بات پر دلیل تھی کہ ہدایت باقی ہے اور بعد کی نسلیں بھی ان پر اس طرح غور کر سکتی ہیں جس طرح انہوں نے غور کیا جن کی طرف نازل ہوئی تھی۔ اور مادی معجزات اور خارق عادت امور کا معاملہ بالکل مختلف ہے کیونکہ مادی معجزات کو صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جن کے سامنے وہ معجزات ظاہر ہوئے' لوگوں کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں یا تو ایمان لائیں اور یا پھر ہلاکت کے لیے تیار ہو جائیں۔ تورات اور انجیل دو مستقل کتابیں تھیں جو نزول قرآن تک لوگوں کے سامنے موجود تھیں۔ یہاں تک کہ قرآن مجید نازل ہوا۔ قرآن کریم نے تورات و انجیل کی تصدیق کی اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ اب آخری کتاب ہے اور تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اب قیامت میں تمام انسانوں کا حساب و کتاب قرآنی احکام کی اساس پر ہو گا۔

وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۱۱ : ۱۱۰) "یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک

اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں" سے مراد یہ ہے کہ قوم موسیٰ اس کتاب کے بارے میں سخت خلجان میں ہے کیونکہ یہ کتاب موسیٰ ؑ سے صدیوں بعد لکھی گئی اور اس کی آیات و مضامین کے بارے میں روایات میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ لہٰذا یہ کتاب قابل یقین نہ رہی۔

یہ درست ہے کہ عذاب موخر کر دیا گیا ہے 'لیکن قیامت میں سب کو ان کے اعمال کی جزاء و سزا دی جائے گی اور یہ سزا ان لوگوں کو علیم و خبیر دے گا جو ہرگز کسی چیز کو ضائع نہیں کرتا۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۱ : ۱۱۱) "اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا' یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے"۔

اس میں اس قدر تاکیدی انداز تعبیر اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ کوئی مہلت اور تاخیر کی وجہ سے پوری جزاء و سزا میں شک نہ کرنے لگے۔ کوئی یہ شک نہ کرے کہ اہل مکہ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ باطل ہے اور اس کے باطل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ شرک ہے اور یہ شرکیہ دین اس سے پہلے بھی کئی اقوام نے اختیار کیا ہے۔

یہاں یہ تاکیدی انداز اختیار کرنے کا پس منظر بھی تھا' اس وقت تحریک اسلامی کے حالات و واقعات یہ تھے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں اہل کفر ایک معاند قوت کی طرح کھڑے تھے۔ وہ رسول اللہ کے راستے کو ہر طرف سے روک رہے تھے' مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور ان پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے' دعوت کا پھیلاؤ تقریباً منجمد ہو گیا تھا اور خدا کی طرف سے عذاب کا آنا بھی قیامت تک ملتوی ہو گیا تھا۔ مومنین کو ہر طرح کی اذیت دی جا رہی تھی اور ان کے دشمن بظاہر کامیاب جا رہے تھے۔ ایسے حالات میں بعض کمزور قسم کے دل متزلزل ہو سکتے تھے' نیز ثابت قدم لوگ بھی بہرحال پریشانی کا شکار ہو سکتے تھے' لہٰذا تحریک اسلامی کو اس قسم کی تسلی اور ہمت بندھانے کی ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ مسلمانوں کے دل کسی اور چیز سے حوصلہ نہیں پاتے کہ اللہ ان کے دشمنوں کو اپنا دشمن بتلا دے۔ اور یہ اعلان کر دے کہ بلاشک و بلاریب وہ باطل پر ہیں۔

یوں ہم ان اشارات کو پاتے ہیں کہ کسی طرح قرآن کریم اسلامی نظریہ حیات کو لے کر چلنے والوں کے ساتھ مل کر اس معرکے میں حصہ لیتا ہے اور کس طرح صحابہ کرام کو موقع بموقع نشانات راہ بتلاتا جاتا ہے۔

---ooo---

یہ تاکیدی بیان کہ اللہ کے دشمنوں کا یہ انجام ہو کر رہے گا' نفس انسانی کے اندر قدرتی طور پر یہ بات بٹھاتا ہے کہ سنت الہیہ اس کی مخلوق میں جاری و ساری ہے۔ اس کا دین بھی اس کی سنت کے مطابق غالب ہو گا۔ اس کا وعدہ بھی اور اس کی دھمکی بھی سنت الہیہ کے مطابق روبعمل ہو گی۔ لہٰذا جو لوگ اس دین کو قبول کرتے ہیں اور جو لوگ اس دین کی دعوت دیتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ مسنون طریقے کے مطابق دعوت دیتے رہیں جس طرح کہ ان کو حکم دیا گیا ہے' نہ اس میں کمی کریں' نہ اس میں زیادتی کریں' نہ ظالموں کے سامنے جھکیں' اگرچہ وہ جبار ہوں' وہ غیر اللہ کے دین کو قبول نہ کریں' اگرچہ راستہ طویل ہو جائے' وہ مشکلات راہ کے لیے تیاریاں کریں' اور اس وقت تک صبر کریں جب تک اللہ وہ کام نہیں کرتا جو وہ چاہتا ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا

تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرۡكَنُوۡۤا اِلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ
دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ اَوۡلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَىِ النَّهَارِ وَ
زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾
وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾

"پس اے نبیؐ، تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو' جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا' ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے۔ اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔ اور دیکھو' نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔ اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا"۔

یہ انعام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا اور آپؐ کے ساتھی بن گئے۔

فَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَمَنۡ تَابَ مَعَكَ (۱۱ : ۱۱۲) "پس اے نبیؐ، تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و اطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے"۔

اس حکم کی مشکلات اور شدت اور ہیبت کو حضورؐ نے محسوس فرمایا تھا۔ حضورؐ سے روایت میں آتا ہے کہ "مجھے ہود اور اس کی ساتھی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے"۔ استقامت کا مفہوم ہے کہ اعتدال سے چلو اور اسلامی منہاج کے مطابق سیدھے چلو' کوئی انحراف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس حکم پر صحیح معنوں میں چلنے کے لیے دائمی بیداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ہر وقت غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ہر وقت حدود اللہ پر نظر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور ان انسانی میلانات اور رجحانات کو ضبط کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جو کبھی زیادہ ہوتے ہیں اور کبھی کم' غرض کسی بھی تحریک میں یہ ایک دائمی اور مسلسل ڈیوٹی ہے اور زندگی کی ہر حرکت اور ہر سکون میں اسے ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔

وَلَا تَطۡغَوۡا (۱۱ : ۱۱۲) "اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو"۔ یہاں اس بات کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ استقامت کے حکم کے بعد یہ نہی اس لیے نہیں ہے کہ استقامت میں قصور نہ کرو' بلکہ یہ نہی طغیان اور حد سے گزرنے کی نہی ہے' یہ اس لیے وارد ہوئی ہے کہ استقامت کے مسلسل حکم کے نتیجے میں انسان کے ذہن میں اس قدر بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور انسان اس قدر حزم اور احتیاط کرنے لگتا ہے کہ وہ غلو اور مبالغے کے درجے تک پہنچ جاتا ہے اور اس غلو

اور مبالغے کے نتیجے میں "الدین یسر" کے بجائے "الدین عسر" بن جاتا ہے دین میں افراط وتفریط شروع ہو جاتی ہے - یہ نکتہ بہت اہم ہے اور ایک مسلمان کو معتدل مزاج اور صراط مستقیم پر گامزن رہنا چاہئے' غافل بھی نہیں ہونا چاہئے اور غالی بھی نہیں -

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱ : ۱۱۲) "جو کچھ تم کر رہے ہو' اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے"۔ بصیر' بصیرت کا لفظ یہاں برمحل ہے' یعنی دیکھتا بھی ہے اور اس کا دیکھنا سرسری نہیں ہے - بصیرت اور گہرائی سے دیکھتا ہے لہٰذا اے پیغمبرؐ تم اور تمہارے ساتھی خدا سے ڈرتے ہوئے سیدھی راہ پر گامزن رہو -

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (۱۱ : ۱۱۳) "ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے"۔ یعنی ظالموں پر بھروسہ نہ کرو اور نہ ان کی جانب سے کسی قسم کا اطمینان کرو' ظالموں سے مراد وہ جبار و قہار اور سرکش لوگ ہیں جو زمین پر اپنے مظالم کی بنیاد پر اپنی برتری قائم کرتے ہیں اور عوام الناس سے خدا کے مقابلے میں اپنی بندگی کراتے ہیں ان پر بھروسہ بھی نہ کرو اور ان کی جانب سے اطمینان کا اظہار بھی نہ کرو - کیونکہ اگر تم انکی جانب اسی طرح غیر جانبدار اطمینان و بھروسے کا اظہار کرو گے تو تم گویا بالواسطہ ان ظالمانہ کارروائیوں میں ان کے موئید ہو گے اور اس طرح اس عظیم جرم میں تم بھی حصہ دار بن جاؤ گے' اگر تم نے ایسا کیا تو تم آگ کی لپیٹ میں آجاؤ گے -

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۱۱ : ۱۱۳) "اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی"۔ ایسے مشکل حالات میں جن سے اس وقت تحریک اسلامی کے مٹھی بھر پیروکار گزر رہے تھے - سیدھی راہ پر جم جانا فی الواقعہ ایک مشکل کام ہوتا ہے اور اس کے لیے روحانی زاد راہ کی ضرورت ہوتی ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو اخلاقی اور روحانی تربیت اور تعلق باللہ پیدا کرنے کے لیے اس زاد راہ کی نشاندہی فرماتا ہے :

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱ : ۱۱۴) "اور دیکھو' نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر - درحقیقت نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ وہ زاد سفر ہے جو اس وقت کام آتا ہے جب تمام زاد سفر ختم ہو جاتے ہیں - یہ روحانی قوت کا زاد سفر ہے اور یہ انسان کو ایسی قوت دیتا ہے جو عظیم تر مشکلات کو برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے - اس لیے یہ زاد راہ معراج المومنین ہے اور یہ اہل ایمان کو رب کریم اور رحیم و ودود سے ملاتا ہے جو قریب ہے اور تمام پکاروں کو خوب سنتا ہے اور جب مومن تنہا ہوتا ہے اور پریشان ہوتا ہے تو ایسے حالات میں یہ زاد راہ اس انس و محبت کی باد نسیم چلاتا ہے اور اس طرح اس پر جاہلیت اور کفر کی گھٹن فضا میں قدرے کشادگی پیدا ہو جاتی ہے -

آیت میں دن کے دو سروں کا ذکر کیا گیا ہے' یعنی اول اور آخر کا اور پھر رات کے قریب وقت کا۔ اس میں تمام کے تمام اوقات آ گئے۔ اگر نمازوں کی تعداد کا تعین نہیں ہوا۔ تعداد کا تعین بہرحال سنت رسول سے ہوا ہے اور نیز متعین اوقات کا تعین بھی سنت سے ہوا ہے۔

اس آیت میں نماز کی اقامت کے حکم' یعنی پوری پوری ادائیگی کے حکم کے بعد یہ حکم آیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ عام آیت ہے اس سے تمام نیکیاں مراد ہیں۔ اور نماز بہرحال عظیم ترین نیکی ہے لہذا یہ بھی اس آیت میں شامل ہے۔ بہرحال "الحسنات" نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (۱۱:۱۱٤) "یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں"۔ نماز اپنی حقیقت کے اعتبار سے ذکر الٰہی ہے۔ اس لیے یہ صفت نہایت ہی مناسب ہے۔

استقامت انسان تب ہی اختیار کر سکتا ہے جب اس میں مشکلات پر صبر کرنے کا حوصلہ ہو' نیز اللہ کی سنت کے مطابق منکرین کے انجام بد سے دوچار ہونے کے لیے ایک مہلت ہوتی ہے اور اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور یہ انتظار بھی صبر کا محتاج ہے۔ لہذا استقامت اور تمام پچھلی ہدایات پر کامیابی سے عمل پیرا ہونے کے لیے حکم دیا جاتا ہے کہ صبر کرو۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۱:۱۱٥) "اور صبر کر' اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا"۔ اللہ کی راہ میں استقامت احسان ہے اور وقت پر نماز ادا کرنا بھی احسان ہے' جھٹلانے والوں کی طرف سے جھٹلانے پر صبر کرنا بھی احسان ہے اور اللہ محسنین کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

اقوام و ملل کی ہلاکت اور بستیوں کی بربادی پر جو تبصرہ کیا گیا اس کی تکمیل کی طرف روئے سخن پھر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ان بستیوں میں اہل خیر موجود ہوتے اور وہ نہی عن المنکر اور زمین سے فتنہ و فساد کے دور کرنے کی سعی جاری رکھتے اور زمین سے ظلم مٹانے کی سعی کرتے اور دست درازی کرنے والوں کے ہاتھ روکتے تو ان بستیوں اور قوموں پر ایسا عذاب نازل نہ ہوتا جس نے ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ بستیوں پر ظلم نہیں کرتا جبکہ لوگ صالح ہوں اور مصلح ہوں۔ یعنی خود بھی نیک ہوں اور بقدر طاقت لوگوں کو نیک بنانے میں بھی مصروف ہوں۔ ہاں ان ہلاک شدہ بستیوں میں بھی اہل ایمان کی ایک قلیل تعداد موجود تھی لیکن ان کے پاس بقدر ضرورت قوت اور اثر نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے ان کو نجات دے دی' اکثریت چونکہ مترفین اور مفسدین کی تھی اور دوسرے لوگ ان کے تابع تھے اس لیے اللہ نے پوری کی پوری بستیوں کو ہلاک کر دیا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

"پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہل خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم' جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا' ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے - تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں"۔

یہ مختصر سا اشارہ اس پالیسی کو ظاہر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم کے بارے میں اختیار کی ہوئی ہے - جس قوم کے اندر بگاڑ اور فساد عام ہو جائے' جس میں انسان انسان کا غلام ہو' خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو' لیکن اس میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو اصلاح احوال کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تو یہ قوم بچنے والی قوم ہوتی ہے - اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کو نیست و نابود نہیں فرماتا - لیکن ایسی اقوام جس میں ظالم ظلم کریں اور دندناتے پھریں' فسادی فساد کرتے رہیں اور کوئی روکنے والا نہ ہو' یا ان میں ایسے لوگ ہوں جو ظلم و فساد کو برا سمجھتے ہوں کہ وہ صورت حالات کو بدلنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں - تو ان قوموں کے بارے سنت الٰہیہ اپنا کام کرتی ہے' یا تو اس قوم کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے یا اس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ یہ قوم من حیث القوم بکھر جاتی ہے -

لہٰذا وہ لوگ جو اس زمین پر اللہ کی ربوبیت کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں' ایسا نظام جس میں صرف اللہ حاکم ہو اور وہ لوگ جو زمین میں اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی عدالت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہ چلتا ہو تو ایسے لوگ دراصل زمین کا نمک ہیں اور ان کی وجہ سے اقوام کی ہلاکت رکی ہوئی ہوتی ہے - لہٰذا وہ لوگ جو دنیا میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لیے سعی کرتے ہیں - وہ بڑی قدر و قیمت کے مالک ہوتے ہیں' جو ظلم و فساد کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتے ہیں' نہ صرف یہ کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے عائد شدہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں بلکہ یہ جس قوم میں کام کرتے ہیں وہ قوم کلی ہلاکت اور من حیث القوم ہلاکت کے عذاب سے بچ جاتی ہے - ان کی وجہ سے اقوام پر اللہ کا عذاب موقوف رہتا ہے -

---

آخری تبصرہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے' بعض انسان بھلائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور بعض بگاڑ کی طرف' اس کائنات میں اللہ نے یہ سنت بھی جاری کر دی ہے کہ کچھ لوگ اس طرف ہوں گے اور کچھ اس طرف

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

"بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا' مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے

اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی (آزادی انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اس نے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی فکر و نظر پر پیدا کر دیتا' ایک ہی صلاحیت سب میں ہوتی۔ ایک ہی چھاپ کے لوگ ہوتے۔ ان میں کوئی تفاوت یا تنوع نہ ہوتا۔ لیکن اللہ کو ایسا مطلوب نہ تھا' کہ وہ مخلوق جو اس کی جانشین اور خلیفہ ہے وہ اس قسم کی ہو' اس لیے اس نے لوگوں کو مختلف صلاحیتیں اور میلانات دیئے۔

اللہ کی مشیت ہی ایسی تھی کہ انسان اپنی استعداد اور رجحانات کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ اس کے بعد اللہ نے لوگوں کو یہ اختیار بھی دیا کہ وہ جس رجحان کو چاہیں' اپنائیں' جو راستہ چاہیں اس پر چل پڑیں اور جس راہ پر چلیں اس کے نتائج بھگتیں۔ اگر اچھا راستہ اختیار کریں تو جزاء ملے' اگر برا راستہ اپنائیں تو سزا ملے۔ یہی اللہ کی سنت ہے جو اس کی مشیت کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اس لیے جو ہدایت کی راہ لیتا ہے وہ اور جو ضلالت اختیار کرتا وہ دونوں ہی اللہ کی سنت کے مطابق چل رہے ہیں اور یہ سنت اللہ کی مشیت کے مطابق ہے اور سزاء و جزاء بھی اللہ کی سنت اور مشیت کے مطابق ہے۔

یہ اللہ کی اسکیم تھی کہ لوگ امت جامدہ نہ ہوں' سنت الٰہیہ کا تقاضا ہی یہ ہے کہ لوگوں کی درمیان اختلافات ہوں۔ پھر یہ اختلافات اصل اور بنیادی عقائد میں ہوں اور کامیاب وہ لوگ ہوں جن کو اللہ نے ہدایت کی توفیق دی اور وہ حق پر جمع ہو جائیں' کیونکہ ہدایت اور سچائی ایک ہی ہوتی ہے۔ ان میں تعدد نہیں ہے۔۔۔ اگرچہ وہ اہل ضلال کے خلاف ہوں۔ ہدایت یافتہ لوگوں کے بالمقابل یہ لوگ ہیں:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۱۱:۱۱۹)

"اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہوگئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا"۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو لوگ ہدایت پر جمع ہوئے ان کا انجام اور ہے' وہ جنت ہے اور وہ ان سے بھر دی جائے گی جس طرح جہنم ان لوگوں سے بھر دی جائے گی جو اہل حق سے مختلف ہیں اور آپس میں بھی مختلف ہیں کیونکہ باطل کے انواع و اقسام بہت ہیں۔

اس سورت کا اختتامیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خطاب پر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ کی طرف قصص انبیاء وحی کرنے کا مقصد کیا ہے۔ خصوصاً اہل ایمان کو اس پر غور کرنا چاہئے۔ جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کو آخری وارننگ دے دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب ان کے ساتھ تعلق ختم کر دیں اور ان کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس انجام تک جا پہنچیں جو ان کے لیے منتظر ہے اور پردۂ غیب کے پیچھے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ آپ اللہ کی بندگی اللہ پر بھروسہ کریں اور ان لوگوں کو چھوڑ دیں کہ جو چاہیں' کریں۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَقُل لِّلَّذِينَ لَا

يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ
لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ ۱۰
عَلَيْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ۱۴ع

"اور اے نبیؐ ' یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں ' یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں ۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی ۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ' تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں ' انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں ۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے ۔ پس اے نبیؐ ' تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ ' جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو ' تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے" ۔ ۱۰

خدا کے رسول اللہ صلی اللہ و آلہ وسلم کی ذات بابرکات بھی اپنی قوم کی طرف سے مشکلات کا مقابلہ کر رہی تھی ' بعض لوگ حد درجہ منحرف اور گمراہ تھے ۔ پھر دعوت اسلامی کے سلسلے میں آپ پر بے حد ذمہ داریاں عائد ہو رہی تھیں ۔ اس لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ آپؐ کو تسلی دی جائے اور رب کی طرف سے آپؐ کی حوصلہ افزائی کی جائے ' اگرچہ آپؐ ثابت قدم تھے اور تمام مشکلات کو مستقل مزاجی سے برداشت کر رہے تھے ۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱ : ۱۲۰) "اور اے نبیؐ ' یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں ' یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں ۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی" ۔

تو قصص میں ایک تو تثبیت قلب ہے ' دعوت اسلامی کے بارے میں حقائق اور سچائیاں ہیں ' مختلف انبیاء کے نمونے اور اسوے ہیں ۔ سنن الہیہ کے مختلف نمونے ہیں ' خوشخبریاں ہیں اور ڈراوے ہیں ۔ اور وہ نصیحت آموز واقعات ہیں جو ان قصص میں موجود ہیں ۔

ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا جو اس وعد و نصیحت کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے ۔ ان کے لیے یہ قصص بالکل مفید نہیں ہیں ۔ ان کے لیے ان میں فیصلہ کن بات ہے ۔ ان کو کہہ دیں :

وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ (۱۲۱) وَ انْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۲۲) (۱۱ : ۱۲۱ - ۱۲۲) "رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ' تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں ' انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر

ہیں"۔

اور اے پیغمبر تمہارے ایک دوسرے بھائی نے بھی اپنی قوم کو ایسا ہی کہا تھا جس کا تذکرہ اسی سورت میں ہو چکا ہے اور پھر اپنی قوم کو ایک طرف چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے انجام کا انتظار کرے۔

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۱:۱۲۳) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے"۔ ان تمام امور کے آخری فیصلے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اے پیغمبر تمہارے معاملات اور اہل ایمان کے تمام معاملات۔ اور ان لوگوں کے معاملات جو ایمان نہیں لاتے اور تمام موجودہ مخلوقات کے معاملات اور تمام آنے والی مخلوقات کے معاملات سب کے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

(۱۱:۱۲۳) "اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے نبی" تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ، جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو، تیرا رب اس سے بے خبر نہیں ہے"۔

چونکہ تمام امور اسی کی طرف برائے فیصلہ لوٹتے ہیں اس لیے وہی اس قابل ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ وہی اس قابل ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ وہی ولی ہے وہی جانتا ہے کہ کس کی کیا ضرورت ہے اور وہ ہر خیر اور شر سے واقف ہے۔ اس کے ہاں کسی کی جزاء ضائع نہیں ہوتی اور کوئی سزا سے بچ نہیں سکتا۔۔۔ وہ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں ہے۔

---ooo---

غرض اس سورت کا آغاز بھی عبادت، انابت الی اللہ اور آخر کار رجوع الی اللہ کے مضمون سے ہوا، تو اس کا خاتمہ بھی توحید، عبادت، توبہ و انابت اور آخر کار اللہ کی طرف لوٹنے کے مضامین پر ہوا جبکہ ان مضامین کی وضاحت اس پوری کائنات کے مطالعے، نفس انسانی کے مطالعے اور تاریخ انسانی کے مطالعے کے ذریعے کی گئی۔

اسی طرح قرآن کریم کا فنی حسن کلام کے آغاز و انجام میں یگانگت پیدا کر دیتا ہے اور قرآن کریم کے تمام قصص، مضامین اور ان کا فکری رخ باہم متناسب بن جاتے ہیں اور اگر یہ قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا تو اس میں بے شمار فکری تضادات موجود ہوتے۔

---ooo---

جو شخص اس سورت میں بات کی روانی، بلکہ تمام مکی قرآن مجید کے کلام کا ہدف معلوم کرنے کی کوشش کرے تو اسے آسانی کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پورے کلام میں ایک لائن اختیار کی گئی۔ اس لائن پر پورا کلام آگے بڑھ رہا ہے بلکہ یہ لائن اس کلام کا محور ہے اور پورا کلام اس محور اور موضوع کے گرد گھوم رہا ہے۔ تمام خطوط اس مرکزی نکتے پر آکر ملتے ہیں اور اس کے تمام ریشے اس محور کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یہ محور اس نظریہ حیات اور اس تصور حیات کا محور اور موضوع ہے جس کے ارد گرد کلام گھوم رہا ہے۔ وہ کیا ہے، یہ کہ قرآن انسان کے لیے ایک مکمل

نظام زندگی تجویز کرتا ہے اور اس کا قیام چاہتا ہے۔

مناسب یہ ہے کہ ہم اس مرکزی لائن' اس محور اور اس عمود پر قدرے بحث کریں۔ اس کا اظہار اس پوری سورت میں اچھی طرح ہوتا ہے۔ بعض نکتے تو ہم بیان بھی کر آئے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس تبصرے میں ربط قائم کرنے کے لیے ان کو دوبارہ یہاں لے لیں۔

---○○○---

ایک نہایت ہی اہم حقیقت اس پوری سورت میں بیان کی گئی۔ اس سورت کی ابتدائی تمہیدی آیات میں بھی' اس سورت کے قصص میں بھی جن میں پوری سورت اور پوری تاریخ انسانی کی لائن دی گئی ہے' اور اس سورت کی اختتامی آیات میں بھی جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ مشرکین کو صاف صاف بتا دیں کہ وہ آخری نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں' وہ حقیقت ہے کیا؟

اس پوری سورت میں جس اہم مسئلے کو لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تم لوگ صرف اللہ کی "عبادت" کرو اور اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی "عبادت" کرو' اور یہ کہ عبادت ہی دراصل پورے نظام زندگی یعنی "دین" کا نام ہے۔ اور ہر قسم کی سزا کی دھمکی اور ہر قسم کی جزاء کے وعدے اور حشر کے دن کا حساب و کتاب اور ثواب و عقاب سب کے سب اسی بنیادی عقیدے اور اصول پر مبنی ہیں جیسا کہ ہم نے سورت کے مقدمے میں بھی کہا کہ "عبادت" صرف اللہ کی کرو۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لیے کیا منہاج اختیار کیا ہے اور اس منہاج کی اہمیت کیا ہے؟ صرف اللہ کی "عبادت" کرنے کو قرآن کریم جن صیغوں اور طریقوں میں ادا کیا ہے ایک ان میں سے یہ ہے کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۱۱ : ۵۰) "اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ اور دوسرا طریقہ ہے

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (۱۱ : ۲) "اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' بے شک میں اس کی طرف سے تمہارے لیے نذیر اور بشیر ہوں"۔

ان دونوں انداز ہائے تعبیر میں فرق یہ ہے کہ ایک امر ہے اور دوسرے میں نہی ہے۔ کیا مثبت امر اور منفی اور ممانعتی انداز تعبیر میں کوئی فرق ہے یا ایک ہی مفہوم ہے؟ پہلے انداز تعبیر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے سوا کوئی قابل پرستش قدر ہی نہیں ہے اور دوسرے کا مفہوم یہ ہے کہ کسی غیر اللہ کی بندگی نہ کرو۔

دوسرا مفہوم پہلے مفہوم کا تقاضا ہے۔ پہلا مفہوم تو مثبت مفہوم ہے اور صراحت کے ساتھ حکم ہے اور دوسرا مفہوم اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن اللہ نے صرف پہلے انداز یعنی مثبت حکم ہی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ دوسرے الہوں کی بندگی سے بھی صراحت کے ساتھ ممانعت کر دی حالانکہ اگر دوسرا منفی مفہوم کو مستقلاً بیان نہ کیا جاتا تو بھی وہ پہلے مثبت حکم کا لازمی تقاضا تھا۔ پھر ایک ہی بات کو مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے کیوں بیان کیا گیا اس لیے کہ اللہ کے ہاں یہ بات نہایت ہی اہم ہے اور اس اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر اکتفاء نہیں کیا کہ نہی عبادت غیر اللہ چونکہ حکم عبادت الٰہی کے منطوق کا لازمی نتیجہ

ہے اس لیے اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔اس اہمیت کے پیش نظر اسے منفی صیغوں سے بھی بیان کیا گیا۔

مثبت اور منفی عبادت میں توحید کے عقیدے کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو' یہ مثبت اور منفی انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بعض اوقات انسانیت پر ایسے حالات آجاتے ہیں کہ انسان خدائے بزرگ و برتر کے وجود کے بھی قائل ہوتے ہیں لیکن وہ اللہ کے ساتھ ساتھ دوسری شخصیات اور الٰہوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور ان کی بھی عبادت کرتے ہیں۔یوں لوگ در حقیقت شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن سمجھتے یہ ہیں کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔

صرف اس وجہ سے عقیدۂ توحید کو امر و نہی اور بیک وقت مثبت و منفی انداز میں بیان کیا گیا تاکہ ایک حکم دوسرے کا مؤید اور مؤکد ہو اور تاکہ عقیدۂ توحید کے اندر کوئی جھول اور کوئی سوراخ نہ رہے۔جس سے شرک اندر آسکے۔یہ انداز تعبیر قرآن میں متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے۔اس کے چند نمونے اس سورت سے نیز دوسری سورتوں سے قابل ملاحظہ ہیں :

الر كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (۱) أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ (۲) (۱۱ : ۱ ـ ۲) "یہ کتاب ہے جس کی آیات کو محکم بنایا گیا پھر ان کو مفصل کیا گیا اس ذات کی طرف سے جو حکیم اور خبیر ہے' یہ کہ نہ عبادت کرو ماسوائے اللہ کے' میں تمہارے لیے اس کی جانب سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں"۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۲۵) أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۲۶) (۱۱ : ۲۵ ـ ۲۶) "بے شک ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف' اس نے کہا بے شک میں تمہارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔میں تمہارے بارے میں عذاب الیم سے ڈرتا ہوں"۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ (۱۱ : ۵۰) "اور عاد کی طرف ان کا بھائی ہود' اس نے کہا اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمہارے لیے کوئی الٰہ نہیں ہے' تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں"۔

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (۱۱ : ۵۱) "اور اللہ نے کہا' دو الٰہ نہ بناؤ' یہ حقیقت ہے کہ الٰہ صرف ایک ہے' بس مجھ ہی سے ڈرو"۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳: ۶۷) "ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ یکسو مسلم تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے"۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۶: ۷۹) "میں اپنے چہرے کو یکسو ہو کر اس ذات کی طرف پھیرتا ہوں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں"۔

توحید اور اس کی حقیقت کے بیان میں یہ انداز بار بار قرآن میں آتا ہے اور اس مفہوم میں کوئی شک نہیں رہتا۔ اس انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اس عقیدے کی اہمیت اور عظمت کیا ہے۔ اور یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ اس عقیدے کے ضمنی تقاضوں اور ضمنی مفہومات کو بھی واضح اور منصوص طریقے سے لایا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کو اچھی طرح جانتے تھے اور اللہ نے اس طرح اس انسان کے مفاد میں ضروری سمجھا کہ عقیدۂ توحید کے کسی بھی پہلو میں کوئی اجمال اور کوئی جھول نہ رہے۔ اور اللہ تو حکمت بلیغہ کا مالک ہے' وہ اپنی مخلوق کی کمزوریوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور نہایت ہی باریک بین اور خبردار ہے۔

---ooo---

اب ہم لفظ "عبادت" کے اصطلاحی معنی پر غور کرتے ہیں۔ یہ لفظ اس سورت اور پورے قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ قرآن کریم بار بار کیوں اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ اور یہ کہ اس لفظ کو مثبت اور منفی صیغوں میں تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس سے قبل قصہ ہود اور ان کی قوم کے ساتھ حضرت ہود کے مکالمے کے ضمن میں ہم نے "العبادۃ" کے مفہوم کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس نکتے کو قرآن کریم کیوں بار بار لاتا ہے اور یہ کہ اس نکتے پر کس طرح انسانی تاریخ میں انبیاء اور مصلحین نے زور دیا ہے؟ اور اس راہ میں انہوں نے کیا کیا مشکلات برداشت کی ہیں لیکن اس تشریح کے علاوہ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس کے مفہوم کے بارے چند اور جھلکیاں یہاں دے دیں۔

عبادت کا یہ مفہوم کہ اس کا اطلاق ان مراسم پر ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ہوتے ہیں اور یہ مفہوم بمقابلہ ان معاملات کے ہے جو ایک انسان دوسرے انسان کے درمیان ہوتے ہیں۔ یہ نزول قرآن کے وقت مروج نہ تھے۔ عبادات و معاملات دو الگ اصطلاحات بعد میں درج ہوئی ہیں۔ اسلام کے عہد اول اور دور نزول قرآن میں یہ تفریق نہ تھی۔

اس سے قبل ہم اپنی کتاب (خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ) میں اس کے بارے میں تفصیلات دی ہیں۔ مناسب ہے کہ یہاں چند فقرے نقل کر دیں۔

"انسانی اعمال اور سرگرمیوں کی یہ تقسیم کہ اس کا ایک حصہ "عبادات" پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ معاملات پر مشتمل

ہے۔ اسلامی تاریخ کا اس دور سے متعلق ہے جس میں فقہ کی تدوین ہوئی۔ ابتداء میں اس تقسیم کی غرض و غایت صرف علوم و مضامین کی فنی ترتیب و تدوین تھی۔ جس طرح کسی فن کی کتابوں کی ترتیب و تدوین میں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ محض اس فنی تقسیم کی وجہ سے اسلامی تصورات اور نظریات میں بہت ہی برے نتائج پیدا ہوئے۔ اور اس تصوراتی اور نظریاتی کجی کی وجہ سے اسلامی معاشرے کی عملی زندگی پر بھی برا اثر مرتب ہوا۔ لوگوں کے اندر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ صرف وہی اعمال عبادت ہیں جن کا تعلق خدا کی پرستش کے مراسم سے ہے اور فقہی تقسیم کے مطابق دوسری سرگرمیاں جن کو فقہ میں "معاملات" کے عنوان سے بیان کیا گیا۔ ان پر عبادت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ بات اسلامی تصور حیات کے مطابق اصل بات سے انحراف ہے۔ اور اس تصور کی بے راہ روی کی وجہ سے مسلمانوں کی پوری زندگی میں انحراف پیدا ہو گیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اعمال میں سے کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس پر لفظ عبادت کا اطلاق نہ ہوتا ہو بلکہ اسلامی نظام حیات کا ہر جزو اول سے لے کر آخر تک عبادت الٰہی کے لیے ہے۔ غرض اسلامی نظام کے اجزاء یعنی نظام حکومت و سیاست' اقتصادی نظام' اسلام کا قانون جرائم اور اسلام کا سول لاء' اسلام کا عائلی قانون اور تمام دوسرے قوانین در حقیقت عبادات ہیں اور یہ تمام قوانین لفظ عبادت کے مفہوم کو بروئے کار لانے کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ لیکن انسان کی تمام سرگرمیاں اسلامی نظام کے مطابق اور لفظ عبادت کی تعریف میں تب آئیں گی جب وہ قرآن و سنت اور اسلامی شریعت کے مطابق ہوں۔ اس طرح کہ ایک مسلمان اللہ وحدہ کو الٰہ اور خدا سمجھے۔ صرف اس کی بندگی اور عبادت کا اقرار کرے۔ اور پوری زندگی اس نظام کے مطابق عملاً بسر کرے۔ اور یہی تخلیق انسان اور تخلیق کائنات کی اصل غرض و غایت ہے' اگر ایسا نہ ہو گا تو انسان اسلامی نظام کی اسکیم سے خارج ہو گا اور وہ دین اسلام کے اندر تصور نہ ہو گا۔

وہ مضامین اور شعبے جن کے لیے فقہاء نے لفظ "عبادات" استعمال کیا ہے' اگر ان پر غور کیا جائے اور قرآن کریم میں ان کے بارے میں جو احکام دیئے گئے ہیں' ان کو پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ شعبے اور مضامین قرآن نے ان شعبوں اور مضامین سے علیحدہ نہیں پیش کیے جن پر فقہاء نے لفظ معاملات کا اطلاق کیا ہے بلکہ دونوں قسم کے احکام قرآن اور سنت میں ایک ہی سیاق کلام میں باہم مربوط آتے ہیں اور ان کا ذکر اس طرح ہوا کہ دونوں ہی خدا اور رسولؐ کی اطاعت اور خدا کی بندگی اور عبادت کے مفہوم میں آتے ہیں جس کے لیے اللہ نے زمین و آسمان اور جن و انس کو پیدا کیا ہے اور یہی مفہوم ہے لا الٰہ الا اللہ اور توحید کا ہے۔

تاریخ اسلام میں ازمنہ متاخرہ میں اس تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اگر وہ عبادات کے حصے پر عمل پیرا ہوں اور عبادات احکام خداوندی کے مطابق سرانجام دیں اور اگر معاملات میں وہ کسی دوسرے نظام کے پیرو ہوں اور معاملات میں وہ اللہ کے بجائے کسی اور ذریعے اور ماخذ سے ہدایات لیں تو بھی وہ مسلمان ہو سکتے ہیں' حالانکہ قانون سازی اور زندگی کی ضابطہ بندی کے دوسرے نظام اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے یہ ان کی خالص خوش فہمی ہے۔ اسلام کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسلامی نظام کے حصے بخرے کیے جا سکتے ہیں۔ اسلام کو اس انداز اور اس نہج پر جو بھی تقسیم کرے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گا اور اس کا اس دین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

یہ ہے وہ عظیم حقیقت جس کی فکر ہر مسلمان کو کرنی چاہیے کہ وہ اپنے اسلام کو حقیقی اسلام بنائے۔ بشرطیکہ وہ اللہ کے اس مقصد کو پورا کرنا چاہیے جس کے لیے اللہ نے اس کی تخلیق کی ہے۔

یہ ہیں وہ چند مقصدی فقرے جو ہم نے اپنی کتاب خصائص التصور اسلامی سے نقل کیے۔ ان فقروں پر ہم صرف چند کلمات کا اضافہ ہی کریں گے۔ جو ہم نے اس سے پہلے اس پارے میں مفصل بیان بھی کر دیئے ہیں کہ جن عربوں کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لا الہ الا اللہ کی دعوت پیش کی اور کہا تھا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو' اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے کہ وہ عرب اس لفظ کو صرف پرستش کے معنی میں نہ بولتے تھے اور نہ ان کو فقہاء کی تقسیم عبادات و معاملات کا علم تھا بلکہ مکہ میں جب یہ حکم آیا کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو تو اس وقت اسلامی عبادات ابھی تک فرض ہی نہ تھیں۔ بلکہ ان کے نزدیک عبادت کا مفہوم یہ تھا کہ پوری زندگی اللہ کی اطاعت میں دے دو اور اپنی پوری زندگی کو غیر اللہ کی اطاعت سے نکال دو' اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عدی ابن حاتم سے احبار و رہبان کے بارے میں فرمایا:

(بلی انهم احولهم الحرام وحرموا عليهم الحلال فاتبعوهم فذلك عبادتهم اياهم) "ہاں انہوں نے ان (اہل کتاب) کے لیے حرام کو حلال کیا اور حلال کو حرام کیا۔ اور انہوں نے ان کی اطاعت کی۔ یہ تھی ان کی جانب سے ان کی عبادت"۔ اور مراسم عبودیت پر لفظ عبادت کا اطلاق یوں ہوا کہ یہ بھی عبادت کا ایک جزء ہیں اور انسانی زندگی کی سرگرمیوں کا ایک حصہ ہیں لیکن لفظ عبادت کا پورا مفہوم و مدلول صرف ان مراسم میں منحصر نہیں ہے۔

---ooo---

اس سے قبل ہم اسی پارے میں یہ بات کہہ آئے ہیں "واقعہ یہ ہے کہ اگر عبادت سے مراد صرف مراسم عبادت ہی ہوتے تو پھر رسولوں اور رسالتوں کی سرے سے ضرورت ہی نہ پڑتی' اور رسولوں نے انسانی تاریخ میں اقامت دین کے لیے جو ان تھک کوششیں اور مساعی کیں ان کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اور پوری انسانی تاریخ میں اہل ایمان نے جو عظیم قربانیاں دیں ان کی ضرورت بھی نہ تھی' حقیقت یہ ہے کہ یہ عظیم قربانیاں محض اس لیے دی گئیں کہ لوگوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی اور اطاعت سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت میں داخل کیا جائے اور ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں اللہ کی حاکمیت ہو اور لوگ دنیا و آخرت دونوں کے معاملات میں اللہ کے مطیع ہوں۔

صرف اللہ کی حاکمیت اور صرف اللہ کی اطاعت اور اللہ ہی کی قیومیت اور اللہ ہی کی مالکیت اور اللہ ہی کو ماخذ قانون تصور کرنا اور اللہ ہی سے زندگی کا نظام اخذ کرنا اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنا اور صرف اسے اپنا مرجع بنانا اور ہر معاملے میں اس کی اطاعت اور بندگی کرنا ہی ایک ایسا مقصد اور جامع و مانع توحید ہے جس کے لیے رسالتوں کا طویل سلسلہ جاری کیا گیا۔ اور اس کے لیے تاریخ میں عظیم جدوجہد کی گئی' اسی راہ میں اس قدر قربانیاں دی گئیں اور مشقتیں برداشت کی گئیں اور یہ کام اس لیے نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کہیں اس کی ضرورت تھی' بلکہ اس لیے کہ اس کے سوا انسان کی زندگی نہ درست ہو سکتی ہے' نہ انسان معزز و سربلند ہو سکتا ہے اور نہ اس کا رہن سہن ایک انسان کے لائق ہو سکتا ہے۔ یہ کام صرف اس ہمہ جہت اور ہمہ گیر عقیدہ توحید کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ ایسا عقیدہ جس کی گرفت

میں انسان کی پوری زندگی ہو"۔

جہاں ہم نے مذکورہ بالا اقتباس دیا تھا' وہاں ہم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ آخر میں ہم اس موضوع پر طویل بحث کریں گے۔ لہٰذا ہم یہاں انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات کے بارے میں قدرے بحث کرتے ہیں۔

○ پہلا نکتہ یہ ہے کہ اگر انسان عقیدہ توحید کو اس کے اس جامع و مانع اور مکمل مفہوم کے ساتھ قبول کر لے تو اس کا اس کی ذاتی زندگی کی حد تک کیا اثر ہو گا' اس کی فطری ضروریات' اس کے مادی وجود' اس کے تصورات اور پھر ان تصورات کی وجہ سے اس کی عملی زندگی پر کیا اثر ہو گا۔

"یہ تصور اور یہ سوچ اپنی پوری عمومیت کے ساتھ جب تمام امور حیات کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہے تو یہ تصور انسانی زندگی سے اس کے ہر پہلو سے مخاطب ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کی تمام دلچسپیوں' اس کی تمام ضروریات' اور اس کے تمام رجحانات کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور ان کے رخ کو صرف ایک سمت کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اب اس کا معاملہ صرف اسی سمت کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان سب کچھ اسی جہت سے طلب کرتا ہے۔ انسان اپنی ہر چیز کے ساتھ اسی طرف آگے بڑھتا ہے' اس کی امیدیں بھی اسی سمت سے وابستہ ہوتی ہیں اور اس کے اندیشے بھی اسی سے ہوتے ہیں' وہ صرف اس سمت کی رضاجوئی کا طلبگار ہوتا ہے اور اسی کے غضب سے استغفار کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہی سرکار ہر چیز کی مالک و خالق ہے' اور وہی پوری کائنات کی مدبر ہے۔

"یہ تصور انسانی شخصیت کا رخ ایک ہی مرجع اور منبع کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اسی مصدر سے انسان حقائق و تصورات اخذ کرتا ہے' اسی سے اپنے پیمانے اور اقدار لیتا ہے' اس سے اصول و قوانین حاصل کرتا ہے۔ ہر سوال کا جواب وہ وہیں سے لیتا ہے' اور انسان اور اس کائنات کے حوالے سے جو سوالات بھی اس کے ذہن میں اٹھتے ہیں ان کا حل وہ اسی مصدر اور مرجع سے پاتا ہے"۔

اب انسان کی شخصیت ایک مجتمع شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا شعور' اس کا طرز عمل' اس کے جذبات و میلانات' ان کا تعلق عقیدے سے ہو یا نظام زندگی سے' نصرت و اعانت سے ہو یا ہدایت اخذ کرنے سے ہو' زندگی سے متعلق یا آخرت سے متعلق ہو' زندگی کی جدوجہد اور تحریک سے ہو یا صحت اور رزق سے متعلق ہو' دنیاوی امر ہو یا اخروی امر سے یہ تمام امور باہم مجتمع ہو جاتے ہیں' اب ان میں کوئی تفریق اور جدائی نہیں رہتی اور ان امور میں انسانی شخصیت مختلف راستے اختیار نہیں کرتی اور نہ ہی مختلف اسالیب پر چلتی ہے"۔

"انسانی شخصیت جب اس نہج پر متحد و مجتمع ہو جاتی ہے۔ تو یہ اس کے بہت ہی اچھے دن ہوتے ہیں' کیونکہ یہ وحدت کی حالت میں ہوتی ہے اور سچائی کی پہلی صفت یہ ہے کہ اس کے اندر وحدت ہوتی ہے' وہ ایک ہوتی ہے' اس لئے کہ جب حق تعالیٰ ایک ہے تو حق بھی ایک ہوتا ہے' بلکہ اس پوری کائنات میں یہ وحدت اور یگانگت ایک اہم حقیقت ہے' اگرچہ مظاہر' اشکال اور حالات مختلف نظر آتے ہیں۔ وحدت اور توحید دراصل زندگی کی حقیقت ہے اگرچہ انسان کے انواع و اشکال مختلف ہوں۔ انسان اپنی مختلف صلاحیتوں اور رنگوں اور شکلوں کے باوجود اصل میں ایک ہے۔ توحید اور وحدت دراصل انسانی وجود کا اصل مدعا ہے۔ انسان جب بھی اور جہاں بھی اپنی حقیقت کی تلاش میں نکلے گا' اپنی عادات اور شکلوں کے اختلاف کے باوجود اس کی حقیقت ایک ہی ہو گی"۔

"جب یہ انسانی شخصیت ایسے حالات میں ہوتی ہے کہ وہ حالات ہر میدان میں "حقیقت" کے مطابق اور اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تو اس وقت شخصیت اپنے عروج پر ہوتی ہے وہ قوی تر ہوتی ہے۔ اور وہ اس پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اس کی ذات اور اس کائنات کے درمیان کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں ہوتا جس کے اندر وہ رہتی ہے۔ اس شخصیت اور اس کائنات دونوں کے درمیان ایک ہی حقیقت موثر ہوتی ہے۔ جب انسانی شخصیت اس عظیم کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلتی ہے تو اس ہم آہنگی کے نتیجے میں دنیا میں عظیم انقلابات برپا ہوتے ہیں اور عظیم ادوار وجود میں آتے ہیں۔"

"مثلاً جب مسلمانوں کی پہلی جماعت اپنی شخصیت کے اعتبار سے اس مقام حقیقت تک پہنچ گئی تو اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر دور رس تبدیلیاں کیں اور اس نے تاریخ پر گہرے اثرات چھوڑے اور خود انسانی شخصیت اور سوچ کے دھارے بدل گئے"۔

"اور آئندہ بھی جب کوئی ایسی جماعت اور اس قسم کی مجتمع شخصیت والے لوگ دنیا میں پیدا ہوئے تو انسانیت اور تاریخ پر ایسے ہی گہرے اثرات چھوڑیں گے اور ایسے افراد اور ایسی جماعت ضرور پیدا ہوگی ان شاء اللہ۔ اگرچہ ملت اسلامیہ کے دشمن ایسی جماعتوں کی راہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اس لئے کہ جب ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے تو اس کے اندر ایسی قوت ہوتی ہے جس کا مقابلہ رکاوٹ نہیں کر سکتی کیونکہ ایسی جماعت کی قوت فطرت اور کائنات کی قوت سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور انسانی قوتوں اور کائناتی قوتوں کا مرجع و مبداء ایک ہوتا ہے"۔

"اس توحید اور وحدت کا فائدہ صرف یہ نہیں ہے کہ انسان کا ایمانی تصور درست ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تصحیح اور درستی بذات خود بہت اہم ہے کیونکہ پوری انسانی زندگی کی عمارت اس تصحیح پر قائم اور استوار ہوتی ہے' لیکن اس سے زیادہ اس عقیدے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ عقیدۂ توحید انسان کے اندر حسن ذوق پیدا کر دیتا ہے۔ انسان زندگی کو بڑی خوبی سے گزارتا ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی اور تناسق پیدا ہو جاتا ہے' کیونکہ اس ہمہ گیر توحید کے نتیجے میں انسانی زندگی کا ہر بڑا چھوٹا پہلو' اور ہر بڑا چھوٹا عمل عبادت بن جاتا ہے۔ جب انسان اللہ وحدہ کو اپنا حاکم اور رب قرار دیتا ہے اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں فقط اس کی بندگی کرتا ہے' تو انسان انسانیت کے اعلیٰ ترین مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے' یہی وہ مقام ہے جس کے تمام پہلوؤں پر فقط رسول اللہ فائز ہوئے ہیں۔ یہ مقام' مقام وحی اور اسراء ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (۲۵ : ۱) "بڑی برکت والی ہے وہ ذات جس نے فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والے بن جائیں"۔

اور دوسری جگہ ہے :

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا

الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۱۷ : ۱) "پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو سیر کرائی رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں ' بے شک اللہ سمیع و بصیر ہے"۔

○ اب ہم بندگی کی توحید یعنی اللہ کو حاکم اور رب سمجھتے ہوئے اس کی مکمل بندگی اختیار کرنے کا ایک دوسرا فائدہ قارئین کے سامنے رکھتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں انسانی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

اللہ وحدہ کی بندگی اور غلامی اپنانے کے نتیجے میں انسان غیراللہ کی بندگی اور غلامی سے نکل آتا ہے ' اور ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے جسمیں ایک انسان ' انسان کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے۔ انسان ایک مکمل آزادی حاصل کر لینے کے بعد ایک باعزت مقام بھی حاصل کر لیتا ہے ' یہ آزادی اور یہ شرف انسان کو کسی بھی غیر اسلامی اور جاہلی نظام میں حاصل نہیں ہوتا ہے ' کیونکہ ان دوسرے نظاموں میں انسان ' انسان کا غلام ہوتا ہے ' اور انسانوں پر انسان کی حاکمیت کے رنگ ڈھنگ اگرچہ مختلف ہوتے ہیں ' بعض اوقات انسان ذہناً دوسروں کا غلام ہوتا ہے ' بعض اوقات وہ غیروں کے سامنے سجدے بھی کرتا ہے ' بعض اوقات وہ دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے ضوابط میں بندھا ہوا ہوتا ہے ' غلامی کی یہ مختلف اقسام ہیں اور نوعیت ایک ہی جیسی ہے کہ ان میں انسان ' انسان کے تابع اور ماتحت ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ بندھا ہوا ہوتا ہے۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگ کسی قانون اور ضابطے کے پابند نہ ہوں ' اگر وہ اللہ کے قوانین اور ضابطوں کے پابند نہ ہوئے تو ظاہر ہے کہ کسی اور کے قانون اور نظام کے پابند ہوں گے ' یوں وہ دوسرے انسانوں کی غلامی میں پڑ جائیں گے۔

جب بھی انسان غیر اللہ کی غلامی میں گرفتار ہو جائے تو یہ ہر وقت غیراللہ کی خواہشات اور مرضی کا غلام ہوتا ہے اور اس غلامی کی وجہ سے یہ انسانیت کے مقام سے گر کر حیوانیت کے مرتبے تک جا پہنچتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ

(۴۷ : ۱۲) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا یہ متاع دنیا سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح مویشی کھاتے ہیں۔ آگ ان کے لیے جائے آرام ہے"۔ انسان کے لیے اس سے بڑا خسارہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی انسانیت کھو بیٹھے اور جونہی ایک انسان صرف اللہ کی حاکمیت اور غلامی سے نکلتا ہے وہ پہلے تو اپنی خواہشات اور شہوات کا غلام بن جاتا ہے ' اور یوں وہ حیوانوں کے مرتبے تک جا گرتا ہے جو صرف اپنی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے جیسے بندوں کی غلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایسے انسان پھر حکام اور رؤساء کے غلام بن جاتے ہیں ' یوں کہ یہ حکام اور رؤسا ان کو ایسے قوانین کے شکنجے میں کس دیتے ہیں جو انہوں نے خود اپنے مفاد میں بنائے ہوتے ہیں اور یہ قوانین صرف بنانے والوں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہ قانون ساز بعض اوقات ایک بادشاہ اور ڈکٹیٹر کی شکل میں ہوتے ہیں ' بعض اوقات ایک حاکم طبقے کی صورت میں ہوتے ہیں ' بعض اوقات ایک حکمران نسل کی شکل میں ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت ان تمام نظاموں میں موجود ہوتی ہے جو اللہ کی ہدایات سے ماخوذ نہیں ہوتے یعنی جو اللہ کی شریعت سے ماخوذ نہیں ہوتے۔

انسان کی طرف سے انسان کی غلامی ' یہ صرف حکام رؤسا اور قانون سازوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ یہ غلامی

بظاہر ان طبقات تک [illegible] نظر آتی ہے ' بلکہ اس طرح ہر انسان بعض دوسری خفیہ قوتوں کا بھی غلام ہوتا ہے ۔ بعض اوقات یہ دوسری [illegible] قوتوں سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہیں ۔ مثلاً رسم و رواج اور لباس تک میں انسان جکڑا ہوا ہوتا [illegible] لوگ اپنے آپ کو ترقی پسند ظاہر کر کے اپنے مفادات کے لیے رسومات و لباس وضع کرتے ہیں ۔ یہ لوازمات لباس میں ' گاڑیوں [illegible] بڑی بڑی کوٹھیوں کی شکل میں ' مناظر کی شکل میں اور پھر مخصوص محفلوں کی شکل میں لوگوں پر عائد کیے جاتے ہیں ۔ کوئی جاہلیت پرست مرد یا عورت ان ناجائز طور پر فرض کردہ لوازمات سے نکل نہیں سکتی ۔ بلکہ ان جاہلی رسومات و لوازمات کے گرفتار ان کے دائرے پر ہمیشہ بند اور محدود رہتے ہیں ۔ آج انسان جس طرح ان لوازمات اور رسومات کی اندھی پابندی کرتے ہیں اگر وہ اس قسم کی پابندی اللہ کے چند احکام ہی کی کرتے ہیں تو وہ زاہد شب زندہ دار کے مقام تک جا پہنچتے ۔ یہ اندھی غلامی نہیں ہے ' تو اور کیا ہے ' غیر اللہ کی حاکمیت اگر یہ نہیں ہے تو اور کیا ہو گی کہ ایک انسان دوسرے انسانوں کے رائج کیے ہوئے فیشن کا بھی غلام ہو ۔

بعض اوقات ایک شریف انسان ایک عورت کو دیکھتا ہے کہ وہ ایسا لباس پہنی ہوئی ہے کہ اس سے اس کا رنگ ڈھنگ نظر آتا ہے ۔ یہ لباس نہ اس کی شکل و صورت کے مناسب ہوتا ہے اور نہ اس کی جسمانی ساخت کے مناسب ہوتا ہے اور پھر یہ عورت ایسے اطوار اور ایسی ادائیں اختیار کرتی ہے کہ جس کی جانب ہر طرف سے اشارے ہوتے ہیں اور وہ ایک مذاق بنی ہوئی ہوتی ہے ۔ لیکن فیشن ہاؤسز کی قوت قاہرہ ان لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ لوگ ان کی اطاعت کریں اور ان لوگوں کو اس ذلت میں مبتلا کریں ۔ اس طرح کہ یہ لوگ طاقت نہیں رکھتے کہ اس کا انکار کر دیں ' جبکہ ان کا پورا ماحول اس غلامی میں گرفتار ہوتا ہے ۔ یہ اگر غلامی نہیں ہے تو اور کیا ہے ؟ یہ فیشن ہاؤسز اگر حاکم اور رب نہیں تو اور کیا ہیں ؟

جب لوگ اللہ کی بندگی سے نکلتے ہیں اور غیر اللہ کی بندگی اور غلامی اختیار کرتے ہیں تو وہ کئی قسم کی ذلتوں میں گرفتار ہوتے ہیں ۔ فیشن کی مذکورہ بالا ذلت تو ان میں سے ایک ہے ' اسی طرح امراء اور روساء کی حاکمیت بھی وہ واحد مکروہ صورت نہیں ہے جس میں لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں ' جب انسان ' انسان کا غلام ہوتا ہے اور ایک بندہ بندے کی غلامی کر رہا ہوتا ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی اور خرابیاں ہیں جو ایسے معاشرے میں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

اس بات سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے ' صرف اللہ وحدہ کی بندگی کرنے اور صرف اللہ کو رب اور حاکم مان لینے کے اثرات انسان کی روح ' اس کی عزت اور اس کی ثروت پر کس قدر دوررس ہوتے ہیں ۔ جب ایک انسان ' انسان کا غلام ہو جائے تو اس کے اخلاق ' اس کی عزت اور اس کی دولت محفوظ نہیں رہتی چاہے غیر اللہ کی بندگی کی نوعیت جو بھی ہو ' غیر اللہ کی بندگی قانون سازی کے میدان میں ہو ' یا رسم و رواج کی شکل میں ' یا غلط اعتقادات اور تصورات کی صورت میں ہو ۔

مثلاً اگر کوئی اعتقادات ' خیالات اور تصورات اور نظریات میں غیر اللہ کا غلام ہو جائے تو وہ وہم پرستی ' قصے کہانیوں اور خرافات میں یقین کرتا ہے ۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی بت پرستی کی جاہلیت کا غلبہ ہے ' وہ اس غلط سوچ کی غلامی کے نتیجے میں ہے ۔ ایسی گمراہیوں میں عوام مختلف قسم کے اوہام کا شکار ہوتے ہیں ۔ اور ان سے ڈر کر وہ وہمی خداؤں کے درباروں میں نذر و نیاز گزارتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور قربانیاں بھی دیتے ہیں ۔ بعض اوقات اولاد اور انسانوں کی قربانیاں بھی دیتے ہیں اور یہ محض فاسد اور ناکارہ خیالات کی غلامی کی وجہ سے ہوتا ایسے معاشروں میں لوگ محض وہم و گمان کے خود تراشیدہ خداؤں سے ڈرتے ہیں ۔ پھر یہ لوگ کاہنوں اور پجاریوں سے بھی ڈرتے ہیں جو ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ان کا تعلق ان

خداؤں سے ہے ۔ایسے معاشروں میں لوگ جنوں اور بلاؤں سے بھی ڈرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی بھی قدر کرتے ہیں جو یہ باور کرا دیں کہ ان کے قبضے میں جن ہیں ۔پھر وہ ایسے بتوں اور آستانوں کے مجاور مذہبی پیشواؤں کی اطاعت کرتے ہیں اور ایسے معاشروں کے تمام لوگ ڈرپوک 'کم ہمت ہوتے ہیں اور ہروقت ڈرے سہمے ہوتے ہیں 'اور ہروقت ایک خوف انہیں لاحق ہوتا ہے ۔اور اس طرح تمام انسانی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں ۔

اس سے قبل ہم نے یہ مثال دی تھی کہ محض فیشن اور غلط رسم و رواج کی غلامی اختیار کر کے لوگ کس قدر مصیبتیں جھیلتے ہیں ۔ہمیں ذرا تفصیل سے غور کرنا چاہیے کہ ہم اپنی قوت اور دولت کا کتنا بڑا حصہ ان فضول کاموں میں خرچ کرتے ہیں ۔ اور اس کے لیے ہم کس قدر عظیم قربانیاں دیتے ہیں 'مالی بھی اور عزت و شرف کی بھی ۔یہ محض فیشن اور رسومات کے خداؤں کو خوش کرنے کے لیے ۔

ایک متوسط گھرانا' اوسط درجے کی آمدنی رکھنے والا' تیل 'خوشبو اور سرخی پوڈر پر ایک بڑی رقم صرف کرتا ہے ۔ بالوں کو سنوارنے اور ان کے بنانے پر وہ ایک بڑی رقم خرچ کرتا ہے ۔پھر بدلتے ہوئے فیشنوں کا ساتھ دینے کے لیے ہر سال نئے نئے جوڑے خریدتا ہے ۔ان جوڑوں کے ساتھ ان کے ہم رنگ بوٹ اور دوسرے ملبوسات بھی فراہم کرتا ہے ۔ اور یہ سب کچھ ان خداؤں کی اتباع میں ہوتا ہے جو پس پردہ بیٹھ کر یہ فیشن گھڑتے ہیں ۔تفتیش کرنے سے معلوم ہو گا کہ ایک متوسط آمدنی والا گھرانہ اپنی کل آمدنی کا نصف حصہ فیشن اور رسم و رواج پر خرچ کر دیتا ہے ۔ فیشن اور سرخی پوڈر کے پیچھے بین الاقوامی یہودیت کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس نے تمام انسانوں کو فیشن کے جال میں پھنسایا ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کی بین الاقوامی کمپنیاں چلتی ہیں ۔اور یہ کمپنیاں لوگوں کے مال اور ان کی آبرو اور ناموس پر ڈاکے ڈالتی ہیں اور وہ مجبور محض ہیں ۔

اب سب سے آخر میں دیکھیں کہ جب انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے اور آقا انسان غلام انسان کے لیے قانون بناتا ہے تو غلام انسان کو کس قدر قربانی دینا پڑتی ہے اور اللہ کی غلامی اختیار کرنے میں انسان کو کس قدر قربانی دینا نہیں پڑتی ہے ۔معلوم ہو گا کہ انسان کو غیراللہ کی غلامی میں زیادہ مالی اور جانی قربانیاں دینا پڑتی ہیں ۔

اس کے علاوہ' وطن کا بت' قوم کا بت' طبقات کا بت' پیداوار کا بت اور ان کے علاوہ دوسرے بت جنہوں نے الوہیت کا درجہ اختیار کر رکھا ہے اور جو اس جہاں میں ان مصنوعی بتوں پر ڈھول بجائے جاتے ہیں اور جھنڈے لہرائے جاتے ہیں اور پھر ان کے بندوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان بتوں کے نام پر جانی اور مالی قربانیاں دیں اور وہ دیتے ہیں' بلا تردد دیتے ہیں ۔ اگر وہ نہیں دیتے تو ان پر اس قدر معاشرتی دباؤ ہوتا ہے کہ انہیں غدار سمجھا جاتا ہے اور ان کی توہین ہوتی ہے ۔اگر کسی کے مال اور آبرو اور ان بتوں میں سے کسی بت کا مقابلہ ہو تو مال و آبرو کو ان بتوں پر قربان کر دیا جاتا ہے اور ان مصنوعی بتوں کو اس قدر اونچا مقام دیا جاتا ہے کہ ان کے آستانوں پر خوں بہایا جاتا ہے اور اس پوری اسکیم کے پیچھے ان ارباب من دون اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے ۔

وہ تمام قربانیاں جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے دی جاتی ہیں 'اور اس کے لیے کہ اس کرۂ ارض پر صرف اللہ کی بندگی کی جائے 'اور اس لیے کہ لوگوں کو بتوں اور طاغوت کی غلامی سے نجات دلائی جائے 'اور اس لیے کہ انسان کو اس مرتبہ بلند تک اٹھا دیا جائے اور اس بلند افق تک پہنچا دیا جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے ۔یہ تمام قربانیاں ان قربانیوں

سے بہت کم ہیں جو بعض لوگ انسانوں پر انسانوں کی خدائی کا نظام قائم کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ اگر کم نہیں تو اس کے برابر ضرور ہیں جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے سے کتراتے ہیں اور اس میں شہادت، جان، مال اور اولاد کی قربانی دینے سے ڈرتے ہیں، ان کو ذرا یہ سوچنا چاہئے کہ غیر اللہ کی غلامی کی صورت میں انہیں اس سے کہیں زیادہ قربانیاں دینی ہوں گی۔ بلکہ غیر اللہ کے لیے انہیں جان و مال کے علاوہ عزت و آبرو کی قربانی بھی دینی ہوگی۔

○ یہاں اب آخر میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید اور اللہ وحدہ کی حاکمیت کے قیام اور تمام دوسرے کھوٹے الٰہوں کی حاکیت کا انکار انسانی جدوجہد کے بچاؤ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس طرح انسان کی جو بدنی اور مالی قوت بچتی ہے اسے اس کرۂ ارض کی تعمیر اور ترقی پر خرچ کیا جا سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان کو اس دنیا میں بھی ایک ترقی یافتہ زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔

ایک اہم صفت اور علامت تمام طاغوتی قوتوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی حکمران جب کسی جگہ اپنا طاغوتی نظام قائم کرتا ہے تو وہ لوگوں کو اپنی حکومت اور نظام کی اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے اور لوگوں کو اپنا صحیح بندہ اور غلام بنانے کے لیے زمین پر ہر قسم کے اختیارات اور تمام قوتیں اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ تب ہی لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اس کی اطاعت کریں اور اس کی ذات کو اللہ کا مرتبہ دیں' یہ شخص پھر ایسے متبعین اور ایسے حاشیہ نشینوں کا محتاج ہوتا ہے جو ہر وقت اس کے گن گاتے رہتے ہیں اور اس کی تعریفیں اور حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کی شخصیت کو بڑھاتے ہیں اور یہ بونا شخص ایک عظیم ذات نظر آتا ہے۔ یہ لوگ ہر وقت اس الٰہ کی ذات میں غبارے کی طرح ہوا بھرتے رہتے ہیں۔ اس کی تعریف اور تمجید کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں' لوگ جمع ہوتے ہیں اور میڈیا اور مختلف وسائل و ذرائع سے اس کی شخصیت کا رعب ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک کمزور شخص سے لوگوں کو ڈرا ڈرا کر اسے الٰہ بنا دیا جاتا ہے۔

شخصیت پرستی کا یہ ڈھول رات دن بجایا جاتا ہے اور اس کے لیے یہ ان تھک جدوجہد جاری رہتی ہے' ورنہ اس کمزور شخصیت کے غبارے سے ہوا نکلتی رہتی ہے۔ اس لیے اس کی شخصیت کا امیج قائم رکھنے کے لیے مختلف وسائل و ذرائع رات دن لگے رہتے ہیں۔ حمد و نعت کا ایک دور اور اسلوب ختم ہوتے ہی دوسرا دور اور اسلوب شروع کر دیا جاتا ہے۔ اور اس جھوٹے الٰہ کی خدائی کا رعب بٹھانے کے لیے مسلسل نئے نئے طریقوں سے جدوجہد شروع ہوتی رہتی ہے۔

اس راہ میں انسانی ذات کا ضیاع ہوتا ہے۔ جان و مال کی قربانی بھی دی جاتی ہے' لوگوں کی عزت اور ناموس لٹتی ہے۔ یہ وسائل اور قربانیاں اگر ملک کو ترقی دینے میں صرف کی جاتیں تو ملک کے اندر تعمیر و ترقی میں اضافہ ہوتا اور لوگوں کے لیے ضروری پیداوار بھی بڑھتی اور لوگوں کے لیے خیر کثیر جمع ہوتی۔ لیکن انسانی قوتوں کا یہ ضیاع یوں ہی جاری رہے گا جب تک لوگ غیر اللہ کی غلامی اور حاکمیت کا جُوا گردنوں سے اتار کر پھینک نہیں دیتے اور ان طاغوتی الٰہوں کی بجائے الٰہ العالمین کی غلامی میں داخل نہیں ہو جاتے۔

الغرض جب سے انسان نے اللہ وحدہ کی بندگی اور حاکمیت سے منہ موڑا ہے تب سے وہ مالی اور جانی نقصان اٹھا رہا ہے۔ اس کی تعمیر و ترقی کا نقصان ہو رہا ہے۔ اور وہ خالص دنیاوی نقطہ نظر سے بھی سخت خسران میں ہے۔ روحانی' اخلاقی' عزت اور اعلیٰ قدروں کا خسارہ اس پر مستزاد ہے اور اللہ کے سوا دوسرے خداؤں کی بندگی اور غلامی کر کے انسانیت ذلیل و خوار ہو رہی ہے۔

یہ ذلت اور خواری کسی ایک طاغوتی نظام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ یہ طاغوتی نظام دنیاوی ہوں یا غیر اسلامی دینی نظام ہوں' غرض جیسے بھی ہوں' سب میں انسان خسارے میں رہتا ہے۔

اس موضوع پر ہم گیارہویں پارے میں سورۂ یونس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو بات کر آئے ہیں' اس سے چند اقتباسات یہاں مفید ہوں گے :

"جن لوگوں نے اللہ کی عبادت' بندگی اور حاکمیت سے منہ موڑا اور انہوں نے اپنے میں سے بعض افراد کو یہ اختیارات دیئے کہ وہ ان کے اوپر اللہ کے نظام کے سوا خود اپنے وضع کردہ نظام اور قانون کے مطابق حکمرانی کریں۔ آخر کار یہ لوگ مشکلات اور بدبختی کا شکار ہوگئے اور انسان انسانوں کا غلام بن گیا۔ اس غلامی نے ان کی انسانیت' ان کی عزت اور ان کی آزادی ان سے چھین لی۔ انسانوں کا یہ انجام ان تمام نظاموں میں ہوا جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر لادین تھے حالانکہ لوگوں نے ان نظاموں سے امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں کہ ان سے انسانیت کو آزادی اور عزت و شرف ملے گا"۔

"اس ضمن میں یورپ نے اللہ اور دین سے فرار اختیار کیا۔ حالانکہ یورپ فی الحقیقت خدا سے دور ہونا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل یورپ کا فرار اس کلیسا سے تھا جو ان پر دین کے نام سے حکومت کرتا تھا۔ کلیسا کے خلاف بغاوت کے شور و غوغا میں لوگوں نے اللہ سے بھی فرار اختیار کیا۔ بلکہ یورپ نے تمام انسانی اقدار سے بھی فرار اختیار کیا۔ اور اس انقلابی عمل میں تمام اعلیٰ انسانی اقدار کو پامال کر دیا گیا۔ اس کے بعد لوگوں کا یہ خیال تھا کہ لادین جدید جمہوری نظام میں ان کی انسانیت' شرافت اور آزادی ان کو واپس مل جائے گی اور جدید نظام میں وہ بنیادی حقوق کے علاوہ دوسرے میدانوں میں بھی وہ خوشحال ہوں گے۔ اور جمہوری دستوروں میں جو حقوق انہیں دیئے گئے ہیں عملاً وہ انہیں حاصل ہوں گے۔ پارلیمنٹ کا اقتدار ہو گا۔ اخبارات کو آزادی حاصل ہوگی۔ عدالت میں ان کے ساتھ انصاف ہو گا اور اکثریت کی رائے کے مطابق قانون سازی ہوگی لیکن یہ سب کچھ سراب ثابت ہوا اور انجام یہ ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام نے عوام کو ان سب حقوق سے محروم کر دیا۔ چنانچہ یہ سب دساتیر' پارلیمنٹیں' بنیادی حقوق اور جمہوریت اور آزادیاں محض عنوانات ہی رہ گئے۔ بلکہ محض خام خیالی تصور ہوئے۔ اور عوام الناس کی غالب اکثریت مٹھی بھر سرمایہ داروں کے چنگل میں پھنس گئی اور وہ غالب اکثریت الخ تمام حقوق سے محروم ہوگئی جن کا وعدہ جدید لادین نظام جمہوریت نے ان سے کیا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ حقوق سے محروم ہوئے بلکہ شرافت' انسانیت اور عزت نفس سے بھی محروم ہوگئے"۔

"احمقوں کے ایک گروہ نے مغرب کے جمہوری نظام سے بھی فرار اختیار کیا۔ اب مٹھی بھر سرمایہ داروں کی جگہ بھوکے عوام نے اقتدار سنبھال لیا اور چند سرمایہ دار کمپنیوں کی جگہ حکومت آگئی۔ ان کمپنیوں کے مقابلے میں یہ زیادہ منظم تھی۔ اب چند سرمایہ داروں کی جگہ اور چند انٹرنیشنل کمپنیوں کی جگہ بیوروکریسی کی حکومت نے لے لی۔ بیوروکریسی کی یہ حکمرانی چند سرمایہ داروں کی حکمرانی سے بھی زیادہ شدید تباہ کن ثابت ہوئی"۔ (روس کا ڈرامہ یوں ختم ہوا)

"غرض جو نظام بھی ہو' اور جو شکل بھی ہو' اگر اس میں ایک انسان' انسان کا غلام ہے اور ایک انسان دوسرے انسان کا مطیع فرمان ہے تو وہ اپنی جان' مال اور عزت سب کچھ لوگوں کے حوالے کرتا ہے جو اس کے لیے بمنزلہ رب اور الٰہ ہوتے ہیں"۔

''انسان ایک عام انسان بہرحال غلام رہے گا' یہ یا تو اللہ کا غلام ہو گا' یا غیراللہ کا غلام اور بندہ ہو گا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ صرف اللہ ہی کی غلامی انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دے سکتی ہے۔ اور صرف اللہ ہی کی غلامی میں انسان کی جان' مال اور عزت محفوظ ہو سکتی ہے۔ جہاں تک غیراللہ کی غلامی کا تعلق ہے تو وہ جان و مال کے ساتھ انسان سے اس کا شرف انسانیت اور اس کی دولت بھی چھین لیتی ہے''۔

''یہی وجہ ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت کا یہ بنیادی عنصر رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ 'کوئی رب 'کوئی حاکم نہیں ہے۔ تمام رسولوں کی یہی دعوت رہی ہے۔ حاکمیت الٰہیہ تمام رسالتوں کی دعوت کا بنیادی جزو رہا ہے اور اس سورت میں اسے نہایت ہی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ یعنی حاکمیت الٰہیہ کا مسئلہ محض قدیم بت پرستی کے دور ہی کے ساتھ متعلق نہ تھا' بلکہ حاکمیت کا مسئلہ تمام سوسائٹیوں اور ہر زمان و مکان کا مسئلہ ہے۔ خواہ ان سوسائٹیوں کا تعلق جاہلیات ماقبل تاریخ کے ساتھ ہو' یا تحریری تاریخ کے دور کی جاہلیتوں کے ساتھ یا بیسویں صدی کی جاہلیت کے ساتھ ہو۔ تمام جاہلیتوں کا بنیادی عنصر یہی رہا ہے کہ ان میں انسان' انسان کا غلام ہوتا ہے؟''

غرض مختصربات یہ ہے کہ اللہ کی اتباع' اللہ کی بندگی اور اللہ کی حاکمیت جس پر اس سورت میں ''عبادت'' کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے' ایمان کے اساسی عناصر میں سے ہے۔ یہ کوئی فقہی اور اجتہادی مسئلہ نہیں ہے' نہ سیاست اور نظام حکومت سے اس کا تعلق ہے' یہ ایمانی مسئلہ ہے۔

یہ ایمان اور عقیدے کا مسئلہ ہے۔ ایمان و عقیدہ یا تو موجود ہوں گے یا معدوم۔ یہ عین اسلام کا مسئلہ ہے' اسلام یا ہو گا یا نہ ہو گا۔ اس ایمانی مسئلہ کا ظہور پھر شریعت قانون اور نظام حکومت کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس کا ظہور پھر ایک اسلامی سوسائٹی کے ذریعے ہوتا ہے اور اس سوسائٹی میں اسلامی نظام کے عملی احکام نافذ ہوتے ہیں۔

تو ثابت ہوا کہ عبادت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ چند مراسم عبودیت اللہ کے سامنے بجا لائے جائیں بلکہ عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی مکمل اتباع ہو' اس کی شریعت اور اس کا نظام قائم ہو اور اس کی حاکمیت کو جاری کیا جائے۔ اسلامی قانون' اسلامی فقہ اور اسلامی سوسائٹی کو برپا کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کی تاریخ میں تمام انبیاء نے اللہ کی عبادت اور بندگی کی طرف دعوت دی اور رسولوں کی تاریخ میں اس مقصد کے لیے بے انتہا قربانیاں دی گئیں۔

اب ہم اس نکتے پر آتے ہیں کہ اس سورت میں قصے پے درپے لائے گئے ہیں اور اسلامی نظریہ حیات کو ایک طویل تحریکی تاریخ کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس سے قبل ہم نے قصۂ نوحؑ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ انسانیت کو سب سے پہلے جو عقیدہ حضرت آدم کے ذریعے سکھایا گیا وہ اسلام تھا۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے ذریعے اسے دہرایا گیا۔ حضرت نوحؑ انسانوں کے دوسرے بابا آدم ہیں۔ ان کے بعد جو رسول بھی بھیجے گئے ان کو یہی پیغام دیا گیا۔ اس پیغام کا ملخص یہ تھا کہ اعتقاد و تصور کے پہلو سے بھی اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھا جائے اور عمل اور طرز عمل کے اعتبار سے صرف اللہ وحدہ کی بندگی اور اطاعت کی جائے اور زمین پر اللہ کی حاکمیت کا نظام قائم کیا جائے۔

اس کے بعد ہم نے بتایا تھا کہ اس تعلیم توحید کے بعد لوگ جاہلیت میں گرفتار ہوئے۔ جاہلیت مختلف اقسام و درجات میں رہی۔ کہیں تو اعتقاد اور نظریات کی جاہلیت رہی' کہیں مراسم عبودیت کی جاہلیت رہی اور کہیں بندگی' اطاعت

اور حاکمیت کی جاہلیت رہی اور بعض سوسائٹیوں میں یہ تمام جاہلتیں یکجا بھی چھا گئیں ۔ یہ جاہلتیں بہرحال اسلام کے بعد آئیں ۔ جب بھی کوئی رسول آیا اس نے اسلام کی تعلیم دی تو وہ ایسے حالات میں آیا کہ جاہلیت چھائی ہوئی تھی ۔ جب رسول گیا تو دوبارہ جاہلیت چھا گئی ۔ اور اس نے لوگوں کے تصورات ' ان کی طرز بندگی اور ان کا نظام حکومت فاسد کر دیا ۔ کسی پتھر ' کسی درخت ' کسی حیوان ' کسی ستارے ' کسی سیارے کی روح یا کسی جن یا کسی انسان کی بندگی اور حاکمیت قائم ہو گئی اور اس طرح تمام لوگ اسلام سے خارج ہو گئے ۔

قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو سچائی پر مشتمل ہے اور باطل اس کے قریب تک بھی نہیں پھٹک سکتا ۔ نہ آگے اور پیچھے سے اس پر باطل غالب اور حملہ آور ہو سکتا ہے ' یہ کتاب نہایت ہی تسلسل کے ساتھ اسلام کی تاریخ بتا کر کہتی ہے کہ خدا کی طرف سے اسلام پہلے آتا ہے اور جاہلیت بعد میں ادوار زوال میں طاری ہو جاتی ہے ۔ اور یہی سوچ کی درست لائن ہے ۔ دور جدید میں مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے علماء اسلام اور جاہلیت کے بارے میں نہایت ہی غلط سوچ رکھتے ہیں ۔

جدید علمائے مذاہب کی سوچ کی یہ لائن اور ان کا طرز فکر غلط ہے ۔ یہ لوگ جاہلیت کی تاریخ تو بیان کرتے ہیں ' لیکن اسلام نے رسولوں کی جو تاریخ پیش کی ہے اسے یہ لوگ بیان نہیں کرتے ۔ پھر مذاہب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بھی یہ لوگ صرف ان آثار تک محدود رہتے ' جن آثار کی حفاظت جاہلیت نے کی ہے ۔ حالانکہ جاہلیت تو انسانی تاریخ میں بعد کی پیداوار تھی اور انسان کے بارے میں جاہلیت کے پاس کوئی زیادہ معلومات بھی نہ تھیں اور یہ قلیل معلومات جو جاہلیتوں نے فراہم کیں یہ بھی یقینی معلومات نہ تھیں ۔ یہ بھی محض ظن اور تخمین پر مبنی تھیں ۔ یہاں تک کہ اگر کسی جاہلی نظام میں ان لوگوں کو توحید کے آثار نظر آ جائیں ۔ اگرچہ وہ اپنی مسخ شدہ شکل میں کیوں نہ ہوں ' تو یہ لوگ توحید کے ان آثار کو بھی عمداً چھوڑ دیتے ہیں ۔ مثلاً شاہ مصر اخناتون کے عقیدۂ توحید کو یہ اہمیت نہیں دیتے ۔ اخناتون مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد آیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں توحید کی ہمہ گیر تبلیغ فرمائی تھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ توحید حضرت یوسف علیہ السلام کی تبلیغ کے آثار میں سے تھی ۔ قرآن کریم کہتا ہے :

اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (٣٧) وَاتَّبَعْتُ
مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ
مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (٣٨) يٰصَاحِبَيِ
السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (٣٩) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ
اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (٤٠)

”میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور آخرت سے انکار کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں' ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے۔ہم پر اور تمام انسانوں پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے' اس کو چھوڑ کر تم جس کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اختیار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں“۔ (۱۲ : ۳۷ - ٤٠)

جدید دور کے علماء نے یہ منہاج بحث کیوں اختیار کیا' یہ اس لیے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب وہاں علماء نے سائنسی تحقیقات شروع کیں تو کلیسا نے ان کی شدید مخالفت کی اور یوں سائنس دانوں اور کلیسا کے درمیان عداوت پیدا ہوگئی۔ اس عداوت کی وجہ سے مذہب کے بارے میں سائنس دانوں نے عمداً ایسی لائن اختیار کی جس کے نتیجے میں مذہب غلط ثابت ہو سکے۔ لیکن یہ منہاج بحث اختیار ہی اس لیے کیا گیا کہ اس کے نتائج برے نکلیں۔

سائنس اور مذہب کی اس پوری جنگ کے اختتام اور عیسائیت کی مکمل شکست کے بعد بھی یہ منہاج بحث بدقسمتی سے یورپ میں جاری رہا۔ حالانکہ سائنس دانوں نے کلیسا کی علمی' سیاسی اور اقتصادی گرفت کو ختم کر دیا تھا۔ کیونکہ یہ منہاج بحث جن بنیادوں پر شروع ہوئی تھی' وہ ابھی موجود تھیں اور بعد کے ادوار میں بغیر سوچ کے اس منہاج بحث کو سائنسی منہاج قرار دے دیا گیا اور آج تک مذہب کے بارے میں سوچ اسی لائن پر جاری ہے۔

بہرحال یورپ کا منہاج بحث جو بھی ہو' اور وہ لوگ جن نتائج پر بھی پہنچیں' وہ منہاج اور نتائج بہرحال ان حقائق اور تصریحات کے خلاف ہیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ یورپ والے تو غیر مسلم ہیں اور ان کے لیے جواز بھی ہے کہ وہ ایسے نتائج پر یقین رکھیں جو اسلام کے خلاف ہیں لیکن ایسے محققین جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلاتے' وہ اگر وہی نتائج اخذ کریں تو یہ تعجب کی بات ہے۔ اسلامی تحقیق اور قرآنی تصریح یہ ہے کہ اسلام جاہلیت سے پہلے آیا' توحید کا عقیدہ شرک اور ثنویت سے پہلے آیا۔ اور یہ تحقیق اور تصریح ناقابل رد ہے۔ یہ بداہتہ دین میں ایک معلوم اور طے شدہ حقیقت ہے۔ اب یہ ہر کسی کا اپنا اختیار ہے کہ وہ کس حقیقت کو اختیار کرتا ہے اور کس کو نہیں کرتا۔ اسلامی نقطہ نظر کو اختیار کرتا ہے یا غیر اسلامی لائن پر چلتا ہے۔ کیونکہ کلام الٰہی اس نکتے پر صریح ہے' کوئی ضمنی یا دلالتہ النص سے یہ نکتہ ثابت نہیں ہے بلکہ صریح قطعی ہے۔

یہاں ہم اس موضوع پر مکمل بحث نہیں کرنا چاہتے بلکہ تاریخی منہاج بحث اور اسلامی تحریکی سوچ کے خطوط کی وضاحت چاہتے ہیں کہ اسلام اور جاہلیت کا تاریخی مقابلہ کس طرح ہوا ہے۔ اور ایک مسلمان محقق کی لائن یہ ہے کہ پہلے اسلام آیا' شیطان نے لوگوں کو گمراہ کرتے کرتے مکمل طور پر جاہلیت میں غرق کر دیا۔ پھر اللہ نے نبی بھیجا اور اس نے لوگوں کو دوبارہ اسلام میں داخل کر دیا اور یہ کہ شیطان لوگوں کو جاہلیت میں اس طرح داخل کرتا ہے کہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ارباب متفرقون کے پیروکار بن جاتے ہیں' وہ غیر اللہ کے اقتدار کو قبول کرتے ہیں' گمراہی صرف مراسم عبودیت اور طریقہ پرستش تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس میں سیاسی اور قانونی شرک بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ نقطہ نظر اور یہ طرز فکر ہمیں اس بات میں مدد دیتی ہے کہ ہم آج پوری انسانیت کے موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں اسی طرح اس کی وجہ سے ہم دعوت

اسلامی کے اہداف و مقاصد کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انسانوں کو جس جاہلیت سے نکالا تھا آج انسان پوری طرح دوبارہ اس میں داخل ہوگئے ہیں اور دور جدید کی جاہلیت اب مختلف صورتوں میں سامنے آرہی ہے۔ بعض جاہلیتیں سرے سے خدا کا انکار کر رہی ہیں۔ یہ ملحد اور دہریہ جاہلیت ہے اور اسے ہم نظریاتی جاہلیت کہہ سکتے ہیں مثلاً کمیونزم اور سوشلزم۔

بعض ایسی ہیں کہ وہ خدا کی منکر تو نہیں لیکن ان کا تصور الٰہ غلط ہے' لیکن خدا کو مانتے ہوئے بھی مراسم عبودیت' پرستش' اطاعت اور اتباع میں یہ جاہلیت گمراہ ہے۔ اور اس میں غیراللہ کی پرستش اتباع اور اطاعت کی جاتی ہے' مثلاً ہندوؤں' یہودیوں اور عیسائیوں کی جاہلیت۔

بعض جاہلیتوں میں تصور الٰہ تو درست ہے' البتہ انہوں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں الٰہ کے دائرہ حدود کو محدود کر دیا ہے۔ یہ جاہلیتیں اتباع' اطاعت اور اقتدار اعلیٰ اور قانون سازی کے میدانوں میں شرک کا ارتکاب کرتی ہیں' مثلاً وہ جاہلیتیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتی ہیں' اسلامی صفات اور حقوق سے متصف ہیں' کلمہ شہادت ادا کرتی ہیں لیکن وہ اللہ کے سوا دوسرے اداروں کی حاکمیت اور قانون سازی کو تسلیم کرتی ہوں اور اللہ کے بالمقابل دوسرے اداروں کی مطیع فرمان ہیں۔ یہ سب جاہلیتیں ہیں' یہ سب کفر کے طریقے ہیں اور یہ شرک ہے (دیکھئے کتاب معالم فی الطریق لا الٰہ کا مفہوم)

آج پوری انسانیت پر اگر اس زاویہ سے نظر ڈالی جائے تو انسان واضح طور پر اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ آج انسانیت پوری طرح جاہلیت کا شکار ہے' اور یہ انسانیت کی بدبختی ہے کہ اسلام کو چھوڑ کر وہ دوبارہ جاہلیت کی پرستار ہوگئی ہے حالانکہ اسلام نے بار بار اسے جاہلیت سے نکال کر اسلام میں داخل کیا تھا۔ اور آخری طور پر یہ عمل نبی آخر الزمان خاتم النبیین کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا۔ اس بات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آج دنیا میں جہاں جہاں اسلامی تحریکات اٹھ رہی ہیں۔ ان کے پیش نظر کس قدر اہم کام ہے اور انسانیت کی اصلاح کے لیے انہوں نے کس قدر فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے اور اپنے اصلاحی کام کا آغاز انہوں نے کس نکتے سے کرنا ہے۔

مناسب یہ ہے کہ یہ تحریکات اپنے کام کا آغاز اس طرح کریں جس طرح انہوں نے لوگوں کو از سرنو اسلام میں داخل کرنا ہے۔ اور ان کو دوبارہ اس جاہلیت سے نکالنا ہے جس کی طرف لوگ مرتد ہو کر لوٹ گئے ہیں اور یہ کہ ان تحریکات کو لوگوں کے سامنے اسلام کا مفہوم نہایت ہی واضح طور پر اور نہایت ہی جامع اور مانع انداز میں پیش کرنا ہے' مثلاً یہ کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' بندگی کے مراسم صرف اس کے سامنے بجالانے ہیں۔ نظام زندگی اسی کا اختیار کرنا ہے اور اتباع' اطاعت اور خضوع و خشوع اس کے سامنے کرنا' اور پوری زندگی میں اس کے احکامات کو نافذ کرنا ہے اور یہ کہ اگر لوگ اپنی زندگیوں میں یہ تغیرات پیدا نہ کریں گے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتے' نہ اس کے سوا کسی کو صفت اسلام سے موصوف کیا جا سکتا ہے' نہ وہ اس کے سوا اسلامی حقوق حاصل کرنے کے حقدار ہیں۔ اور یہ کہ اگر مسلمان ان مفہومات میں سے کسی بھی مفہوم کو ترک کریں گے تو وہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ اسلام سے جاہلیت کی طرف لوٹ جائیں گے۔

آج دنیا جس دور سے گزر رہی ہے یہ جاہلیت کے ادوار میں سے ایک دور ہے۔ لہٰذا اس دور کا مقابلہ ہم ایک ایسے

اسلامی دور سے کریں گے جو لوگوں کو جاہلیت سے نکال کر دوبارہ اسلام میں داخل کر دے 'تاکہ لوگ 'لوگوں کی عبادت سے نکل کر اسلام میں داخل ہو جائیں۔

اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دستے جو نظام اسلامی کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور وہ اس راہ میں مشکلات برداشت کر رہے ہیں ان کے فکر و نظر میں یہ نکتہ فیصلہ کن انداز میں بیٹھ جانا چاہئے۔ اگر اسلامی تحریکات کے دل و دماغ میں یہ نکتہ واضح نہ ہو گا تو وہ اس مشکل دور میں اپنا فریضہ اچھی طرح ادا نہ کر سکیں گے۔ ورنہ اس کا موقف متزلزل ہو گا۔ ان کے سامنے ان کا نصب العین واضح نہ ہو گا' اور وہ جاہلیت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور ان کا آغاز ہی غلط سمت میں ہو گا اور ان کا زعم یہ ہو گا کہ وہ راہ راست پر ہیں لیکن مزعومات اور چیز ہوتے ہیں اور حقائق اور ہوتے ہیں۔

---ooo---

اس تبصرے میں اب ہم صرف ایک ہی موقف پر غور کریں گے 'وہ موقف کیا ہے؟ وہ یہ کہ رسولوں نے جب کام کا آغاز کیا تو اپنی قوم کے بارے میں ان کا موقف کیا تھا؟ آغاز میں انہوں نے اپنی قوم کے مقابلے میں کیا موقف اور کیا رویہ اختیار کیا اور اختتام پر اپنی قوم کے ساتھ ان کا رویہ کیا تھا اور یہ غور ہم ان قصص کی روشنی میں کریں گے جو اس سورت میں بیان ہوئے۔

ہر رسول کو اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا۔ آغاز دعوت میں رسول اپنی قوم ہی کا ایک فرد تھا۔ وہ ان کو اسلام کی طرف اسی طرح دعوت دیتا تھا جس طرح ایک بھائی بھائی کو دعوت دیتا ہے اور وہ ان کا اسی طرح خیر خواہ تھا جس طرح ایک بھائی بھائی کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ فقط یہ کہ اسے اپنے رب کی طرف سے ہدایت مل چکی ہوتی ہے اور افراد قوم محروم ہوتے ہیں۔

آغاز کار میں اپنی قوم کے مقابلے میں ہر رسول کا موقف یہی رہا ہے لیکن جب دعوت کا انجام سامنے آتا تو رسول کا موقف وہ نہ رہتا جو آغاز میں ہوتا۔

ہوتا یوں رہا ہے کہ رسول کی قوم میں سے کچھ لوگ رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جس طرح پیغمبر نے ان کو دعوت دی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کریں۔ اور غیر اسلامی نظام کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں۔ کیونکہ اسی طریقے سے وہ مسلمان ہو سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد یہ لوگ امت مسلمہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک دوسرا گروہ رسول کی اطاعت کو قبول نہیں کرتا' ایمان نہیں لاتا اور وہ غیر اسلامی نظام زندگی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اس حالت میں رہتا ہے جو رسول کے آنے سے پہلے تھی یعنی جاہلیت۔ اپنے اس رویے کی وجہ سے یہ دوسرا گروہ ''امت کافرہ'' بن جاتا ہے۔

اب صورت حالات ہمیشہ یہ ہوتی رہی ہے کہ ایک قوم کسی نبی کے حوالے سے دو امتوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک امت مسلمہ اور دوسری امت کافرہ اور یہ قوم ایک امت نہیں رہتی جس طرح پہلے تھی۔ اس کے باوجود کہ نسل اور قوم کے اعتبار سے وہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اب قوم اور نسل کے تعلقات اور علاقے اور معیشت کے مشترکہ مفادات بھی ان کو ایک قوم اور ایک امت کی صورت میں نہیں رکھ سکتے۔ اب اس رسالت کی وجہ سے ایک نیا رابطہ اور ایک نیا تعلق وجود میں آ جاتا ہے اور یہ نیا تعلق اس قوم کو متحد بھی کرتا ہے اور جدا بھی۔ اب اس نئے تعلق اور نظریہ کی وجہ سے

ایک امت دو اقوام کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور ان کے درمیان سوشل اور معیشت کا بائیکاٹ ہو جاتا ہے اور ان دونوں اقوام اور امم کا کسی نکتے پر بھی ملاپ نہیں ہوتا۔

وجہ یہ ہے کہ جب ان دو گروہوں کے درمیان نظریاتی بعد پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں کے عقاید جدا ہو جاتے ہیں۔ وہ امت جو رسول کی دعوت قبول کر لیتی ہے' اس امت سے جدا ہو جاتی ہے جو رسول کی دعوت کو قبول نہیں کرتی۔ پہلی مسلم ہوتی اور دوسری کافر ہوتی ہے' چونکہ دو گروہوں کے نظریات طرز زندگی جدا ہو جاتے ہیں اس لیے دونوں گروہوں کی قومیت اور نسل بھی جدا ہو جاتی ہے۔ اور جب اللہ اس طرح امت مسلمہ کو امت کافرہ سے جدا کر دیتا ہے' تب تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ امت کافرہ کو نیست و نابود کر دیتا ہے جب کہ اس سورت میں ہم نے تاریخی مطالعہ کیا کہ اللہ کا یہ اصول اور یہ قاعدہ پوری تاریخ میں چلتا رہا ہے۔

یہاں اسلامی تحریکات کو یہ نکتہ بھی اچھی طرح پلے باندھ لینا چاہئے کہ اللہ نے اسلامی تحریک کے کارکنوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان اس وقت جدائی اور فیصلہ نہیں فرمایا جب تک وہ جدائی اختیار نہ کریں اور جب تک وہ علانیہ شرک اور غلط نظریات سے اپنی براءت کا علانیہ اظہار نہ کر دیں۔ اور اعلان نہ کر دیں کہ وہ صرف اسلامی نظام زندگی کے مطیع فرمان ہیں اور وہ اللہ کے سوا کسی جھوٹے رب اور جھوٹے حاکم کے مطیع فرمان نہیں ہیں نیز یہ کہ وہ کسی طاغوتی قوت' طاغوتی نظام اور طاغوتی حکمران کے مطیع فرمان ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور وہ اس نظام' اس سوسائٹی میں شرکت کے لیے تیار نہیں ہیں جس پر ان طاغوتوں کی حکمرانی ہو اور ایسا نظام رائج ہو' جو شریعت پر مبنی نہ ہو اور جس کو حقیقی سرچشمہ یعنی اللہ کی ذات سے اخذ نہ کیا گیا ہو۔ چاہے اعتقاد و نظریہ ہو' چاہے نظام بندگی ہو' چاہے نظام قانون و دستور ہو۔

یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ کا عذاب اہل کفر اور کفر کے حامیوں پر اس وقت تک نہیں آتا جب تک اہل اسلام اہل کفر کے ساتھ مکمل جدائی اختیار نہیں کر لیتے۔ اور جب تک مسلمان اپنی اپنی اقوام سے علیحدہ ہو کر ان سے برأت کا اظہار نہ کر لیں' اور جب تک وہ ان سے دینی جدائی اختیار نہ کر لیں جب تک وہ ان سے اپنا طریقہ کار اور منہاج فکر جدا نہیں کریں گے اس وقت تک اللہ کا عذاب اہل کفر پر نہیں آ سکتا' نہ اللہ تعالیٰ ایسی اقوام کو اپنی گرفت میں لیتا ہے' ضروری ہے کہ اقوام کفر کے اندر سے اسلامی عناصر چھٹ کر نکل آئیں اور ان سے بر سرپیکار ہوں' تب اللہ کی مدد آتی ہے' اس سے پہلے نہیں۔

نبیوں کی پوری تاریخ میں یہ قاعدہ جاری و ساری نظر آتا ہے اور اسلامی تحریکات کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنی تحریکات کو اس نکتے کے پیش نظر رکھ کر اٹھائیں۔ دعوت کا آغاز اس نکتے سے کیا جائے کہ لوگ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں اور وہ بلا شرکت غیرے اسلامی نظام زندگی کو اپنا لیں اور تمام دوسرے نظام ہائے زندگی اپنانے سے انکار کر دیں اور اس کے بعد جس قوم میں تحریک کام کر رہی ہے' اس کے اندر دو ٹکڑے ہو جائیں۔ ایک طرف ان لوگوں کی امت کھڑی ہو جو اللہ کے ساتھ شرک کرتی ہو' اور غیر اسلامی اقتدار کی بندگی کرتی ہو' ان کے درمیان جب بھی مکمل جدائی ہو گی' پھر اللہ کی نصرت آ جائے گی اور اہل ایمان اہل کفر پر فتح پائیں گے۔

یہ ممکن ہے کہ مکمل جدائی سے پہلے تحریک کو ایک طویل دور سے گزرنا پڑے لیکن شعوری جدائی روز اول سے ضروری ہے۔

ان دو گروہوں کے درمیان مکمل جدائی کا عمل طویل بھی ہو سکتا ہے اور ایک ہی قوم سے جدا ہو کر دو علیحدہ امتوں کی

تشکیل پر وقت لگ سکتا ہے اور اس عرصے میں داعیوں کی جماعت کو مشکلات بھی درپیش آ سکتی ہیں' ان پر مظالم بھی ہو سکتے ہیں اور نسلوں تک یہ جدوجہد جاری رہ سکتی ہے' لیکن تحریک اسلامی کو یقین رکھنا چاہئے کہ اللہ کی نصرت آئے گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کے وعدے کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔ یہ سنت الٰہیہ ہے اور آدم علیہ السلام کے وقت سے یہ سنت جاری ہے۔

یاد رہے کہ تحریک اسلامی کے لیے سنت الٰہیہ کو اس طرح فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں سمجھنا ضروری ہے۔ صرف اسی صورت میں تحریک اسلامی پوری گمراہ انسانیت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہ ایک جاری سنت ہے اور یہ زمان و مکان کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ جب تک تحریک اسلامی کو پوری جاہلی انسانیت کے ساتھ مقابلہ درپیش ہے' چاہے وہ جس قسم کی جاہلیت بھی ہو' اور تحریک اسلامی یہ مقابلہ اسی انداز اور اسی طریق کار اور انہی نظریات کی قوت سے کر رہی ہے جس سے انبیاء علیہم السلام جاہلیت کا مقابلہ کرتے آئے ہیں' تو تحریک اسلامی کا فرض ہے کہ وہ انبیاء کی طرح واضح سوچ' واضح طریق کار اور نہایت ہی یقین و اعتماد کے ساتھ آگے بڑھے کہ اللہ کی سنت اب بھی قائم ہے اور اس میں تخلف ممکن نہیں' لہٰذا نصرت الٰہی اور تائید الٰہی ان کو حاصل رہے گی۔ اور آخری فتح متقی اور پرہیز گاروں کی ہوگی۔

---○○○---

سب سے آخر میں' میں یہ کہوں گا کہ قصص القرآن اور ان کے اوپر قرآن کریم نے جو تبصرے کیے ہیں' ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دین کا مزاج کیا ہے اور قرآن کریم سے تحریک اسلامی کے لیے کیا منہاج نکلتا ہے۔ اسلامی تحریک کا مزاج یہ ہے کہ اس کارکن عملاً میدان میں نکل آئیں اور وہ جاہلیت کا عملی مقابلہ کریں۔

جب یہ قصص مکہ مکرمہ میں حضورؐ پر نازل ہو رہے تھے تو اس وقت تحریک اسلامی کے مٹھی بھر کارکن مکہ کی پہاڑیوں کے درمیان محصور تھے اور دعوت اسلامی مکہ میں جامد ہو کر رہ گئی تھی۔ راستہ نہایت ہی دشوار گزار اور طویل تھا اور مسلمانوں کو دور تک منزل کے نشانات نظر نہ آرہے تھے اور نہ منزل کا کوئی پتہ تھا۔ ان قصص کے ذریعے ان کو بتایا جا رہا تھا کہ ان کے نشانات راہ کیا ہیں اور منزل کہاں ہے؟ اور اس کو یہ بھی بتایا جا رہا تھا کہ آخری منزل تک پہنچنے کے مراحل کیا ہیں؟ چنانچہ قرآن مجید پہلی تحریک اسلامی کو ہاتھ سے پکڑ کر منزل کی طرف رواں تھا۔ اور ان کو اس اسلامی تحریک کے خطوط بتا رہا تھا جو آغاز انسانیت سے چل کر ان تک پہنچی تھی' پوری انسانی تاریخ کا سفر طے کرتے ہوئے یہ تحریک نہایت محبت' انس اور یگانگت کے ساتھ قافلہ انبیاء کے ساتھ ساتھ قرآن کے سائے میں چل رہی تھی۔ اسے قرآن کے بتائے ہوئے اس راستے سے نہ وحشت تھی اور نہ ہی کوئی ڈر تھا۔ گویا یہ لوگ قافلہ انبیاء میں اس کے طویل سفر میں اس کے ساتھی تھے اور اسی قافلے کی آخری کڑی تھے۔ یہ [illegible] نا سا کی گروہ قافلہ انبیاء سے کٹا ہوا کوئی علیحدہ گروہ نہ تھا جو نشانات راہ کے بغیر کسی صحرا میں گشت کر رہا ہو۔ چنانچہ یہ کی [illegible] وہ نقطہ آغاز سے شروع ہو کر انبیاء کی اسکیم کے مطابق آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی تحریک نہ تھی اور نہ بے مقصد گروہ تھا۔

اسلامی صفوں میں یہ قرآن اس طرح متحرک نظر آتا تھا اور یہ تحریک اپنی اسکیم اور نقشے کے مراحل مطابق مسلسل چل رہی تھی۔ آج بھی یہ ممکن ہے کہ قرآن اسلامی دستور کے اندر متحرک نظر آئے اور کل بھی ایسا ممکن ہے۔ آج بھی یہ ممکن ہے کہ قرآن اپنی اسکیم کے مطابق اسلامی تحریکات کو چلائے اور وہ چلیں۔

آج کی تحریکات اسلامی کی ضرورت یہ ہے کہ وہ قرآن سے الہام اخذ کریں۔ قرآن سے ان کو وحی اور اشارات

ملیں۔ وہ قرآن سے احیائے اسلام کا منہاج اخذ کریں۔ اس کے مختلف مراحل کا تعین کریں' ان کے تقاضوں کو پورا کریں اور انجام کار ان کے لیے جو کامیابیاں متعین ہیں' ان کے ظہور کا انتظار کریں۔

اگر قرآن کریم کو ہم تحریکی مقاصد کے لیے گائیڈ کے طور پر استعمال کریں تو پھر قرآن کی یہ حیثیت نہ ہوگی کہ وہ صرف ایک مذہبی کتاب ہے جو حصول برکت کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ بلکہ وہ ایک زندہ کتاب بن جائے گی گویا کہ وہ ابھی جماعت مسلمہ پر نازل ہو رہی ہے۔

ہم مسلسل فی ظلال القرآن میں یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ قرآن کریم کے اسرار و رموز صرف ان لوگوں پر کھلتے ہیں جو اس کتاب کے ساتھ متحرک ہوں۔ قرآن کریم اپنا سینہ صرف ان لوگوں پر کھولتا ہے جو اس کے مفہوم اور احکام کو عملی شکل دینا چاہتے ہیں اور اسے عالم واقعہ کی طرف لانا چاہیں۔ ان لوگوں پر قرآن کے اسرار نہیں کھلتے جو اسے صرف برکت کے لیے پڑھتے ہوں۔ نہ ان لوگوں پر کھلتے ہیں جو اس کا مطالعہ محض ایک فن کے طور پر کرتے ہیں اور محض علوم القرآن سے واقف ہونا چاہتے ہوں۔ نہ ان لوگوں پر اس کے اسرار کھلتے ہیں جو محض اس کے بیان' اس کی تلاوت اور اس کی قرأت پر زور دے رہے ہوں۔

مذکورہ بالا قسم کے لوگوں پر قرآن کے اسرار و رموز میں سے بہت ہی قلیل چیز کھلتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اس لیے نازل ہی نہیں ہوا کہ اسے محض فنی اور علمی انداز میں پڑھا جائے بلکہ وہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ وہ تحریک اور ہدایت کا ذریعہ بنے۔

جو لوگ باغی اور سرکش جاہلیت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اسلام کو زندہ کرنا چاہتے ہیں' جو لوگ گمراہ انسانیت کو واپس دین اسلام کی طرف لانا چاہتے ہیں' جو لوگ اس کرۂ ارض پر طاغوت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے رہائی دلائیں اور صرف اللہ رب العالمین کی بندگی میں داخل کریں۔ انہیں چاہئے کہ قرآن کے ساتھ اپنے تعلق پر نظرثانی کریں۔

ایسے ہی لوگ دراصل قرآن کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگ ایسی فضاؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں جس فضا میں سب سے پہلے یہ قرآن نازل ہوا تھا۔ اور ان کی جدوجہد دراصل وہی جدوجہد ہے جو وہ لوگ کر رہے تھے جن پر یہ قرآن سب سے پہلے نازل ہوا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ تحریکی لوگ ہوتے ہیں اور یہ لوگ حرکت بالقرآن کے ذریعے وہی ذوق رکھتے ہیں اور وہی مفہوم اپنے اندر پاتے ہیں جو قرآن کے نصوص سے مراد ہے اور اس کو مطلوب ہے اس لئے کہ ان کو قرآن کے معانی اور مفہومات واقعات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یہ ذوق اور فہم ان کے لیے ان مشکلات اور مصائب پر اجر ہے جو یہ لوگ پا رہے ہیں اور ان پر انہیں خوش ہونا چاہئے۔ اللہ فرماتا ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ((۱۰ : ۵۸))

"کہو اللہ کے فضل اور رحمت پر خوشیاں مناؤ' یہ اس دولت سے بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں"۔ والحمد للہ رب العلمین

فی ظلال القرآن

پارہ ——————— ۱۲

سورۂ یوسف –

آیات ۱ ———— تا ———— ۵۳

سورۂ یوسف ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے اور یہ سورت ہود کے بعد نازل ہوئی۔یہ اس مشکل دور میں نازل ہوئی جس کے بارے میں ہم سورت یونس اور سورت ہود کے دیباچے میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں تحریک اسلامی بے پناہ مشکلات سے دوچار تھی۔یہ عام الحزن کا زمانہ تھا' حضرت ابوطالب فوت ہو چکے تھے' حضرت خدیجہؓ فوت ہو چکی تھیں۔یہ دونوں شخصیات حضورؐ کی ذات اور تحریک اسلامی کے لیے بے حد مددگار اور سہارا تھیں۔ لیکن اس دور کے قدرے بعد بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے واقعات پیش آئے جن میں حضورؐ کے لیے اور اسلامی تحریک کے لیے ان مشکلات سے نکل جانے کی راہ فراہم ہوئی۔اور ہجرت الی المدینہ کے اسباب پیدا ہوئے۔بہرحال یہ سورت ان سورتوں میں سے ایک ہے جو اس مشکل دور میں نازل ہوئیں جبکہ حضورؐ اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کے لیے مکہ کی فضا حد درجہ ناساز گار تھی۔

یہ پوری سورت مکی ہے لیکن "مصحف امیری" میں یہ ہے کہ آیت ۱' ۲' ۳' ۴' مدنی ہیں۔یہ بات قرین قیاس نہیں ہے اس لیے کہ پہلی تین آیات یہ ہیں:

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۱) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۳) (۱۲ : ۱ - ۳) "ا' ل' ر۔یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ہم نے اسے نازل کیا ہے' قرآن بنا کر' عربی زبان میں تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ سکو' اے محمد ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو تم بالکل بے خبر تھے"۔

ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ آیات بعد میں آنے والی آیات کے لیے نہایت ہی قدرتی تمہید ہیں جن میں قصہ یوسف علیہ السلام کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ان کے بعد جو آیت آتی ہے وہ یہ ہے:

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ (۱۲ : ۴) "جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا" ابا جان' میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اور اس کے بعد قصہ شروع ہو جاتا ہے اور آخر تک چلتا رہتا ہے ۔ لہذا پہلی تین آیات میں جو یہ آیا ہے کہ "اے محمد ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تم بالکل بے خبر تھے" ۔ یہ اس پورے قصے کی ایک قدرتی تمہید ہے ۔

پہلی آیت میں تین حرف ہیں : ا' ل' ر اور یہ کہ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں' یہ کہ اللہ نے اسے عربی زبان میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے' یہ بھی مکہ والوں سے خطاب ہے جو یہ الزام لگاتے تھے کہ ایک عجمی شخص آپ کو پڑھاتا ہے اور پھر یہ کہ قرآن وحی من جانب اللہ اور اس کی دلیل ہے کہ حضورؐ قرآنی تصورات سے اس پورے عرصے میں آگاہ نہ تھے' نہ آپ نے کبھی ان خیالات کا اظہار کیا تھا ۔

پھر قرآن کریم کا یہ آغاز اس سورت کے اختتام سے بھی ہم آہنگ ہے' اختتام یوں ہوا :

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ (۱۲ : ۱۰۲) "یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو تم پر وحی کر رہے ہیں' ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی" ۔ چنانچہ اس قصے کے آغاز اور انتہا میں یہ ایک ناقابل جدائی ربط ہے ۔ ظاہر ہے کہ قصے کی تمہید اور اس پر آخری سبق اور تبصرے کو ایک ساتھ ہی نازل ہونا چاہئے ۔

رہی ساتویں آیت تو اگر اسے عبارت سے نکال دیا جائے تو عبارت درست ہی نہیں ہوتی ۔ لہذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور یہ آیت اس میں نہ ہو اور مدینہ میں اس کا اضافہ ہوا ہو ۔ ذرا پوری عبارت پر غور فرمائیں :

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (۷) اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ (۸) ((۱۲ : ۷ - ۸))

"حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں ۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا "یہ یوسف اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم پورا جتھا ہیں ۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے اباجان بالکل بہک گئے ہیں" ۔ اس پوری عبارت پر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیات یکبار اتری ہیں اور سیاق کلام اسی طرح مربوط پڑھا جا سکتا ہے ۔

پھر پوری سورت ایک ہی ٹکڑا ہے اور اس کا انداز بھی واضح طور پر مکی ہے ۔ موضوع اور مضمون کے اعتبار سے بھی' انداز گفتگو کے اعتبار سے بھی اور اپنی فضا اور اثرات کے اعتبار سے بھی ۔ بلکہ اس پوری سورت میں ان حالات کی ایک صاف صاف جھلک نظر آتی ہے ۔ جن میں یہ سورت نازل ہوئی تھی ۔ تحریک اسلامی کے لیے یہ نہایت ہی مشکل دور تھا ۔ اس دور میں رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہت ہی وحشت' غربت اور تنہائی محسوس کرتے تھے ۔ اہل قریش نے حضورؐ سے بائیکاٹ بھی کر رکھا تھا اور عام الحزن کے بعد کے دور میں جماعت مسلمہ نہایت ہی دشوار وقت سے گزر رہی تھی ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایک شریف بھائی کا قصہ نازل فرمایا یعنی یوسف ابن

یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام اجمعین کا حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی ایسی ہی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور ان کے خلاف بھی خود ان کے بھائیوں نے ایسی ہی سازشیں کیں۔ان کو کنوئیں میں ڈالا گیا' اور جب کنوئیں کے خوف و ہراس سے نجات ملی تو مال کی طرح انہیں فروخت کیا گیا اور انہوں نے غلامی کا دور دیکھا اور ہاتھوں ہاتھ بکے آپ والدین ' بھائیوں اور خاندان کی حمایت اور ہمدردی سے محروم رہے۔اس کے بعد آپ کے خلاف عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی سازشیں سامنے آئیں اور اس سے قبل انہوں نے آپ کو ورغلانے کی پوری پوری کوشش بھی کی۔پھر عزیز مصر کے گھر کی آرام دہ زندگی کے بعد آپ کو جیل کے شب و روز بھی دیکھنے پڑے۔اس کے بعد آپ پر وہ عظیم آزمائش بھی آئی کہ آپ کو ہر قسم کا اقتدار عطا کر دیا گیا۔وہ لوگوں کے بارے میں فیصلے کرنے لگے اور پوری مملکت کا معاشی نظام آپ کے ہاتھ میں آگیا اور آپ خزانوں کے مالک ہوگئے۔ پوری قوم اور اطراف کی اقوام کی راشن بندی کر دی گئی اور آپ اختیارات کا سرچشمہ بن گئے۔اب اس کے بعد وہ آزمائش کہ آپ کے سامنے وہ بھائی آتے ہیں جنہوں نے آپ کو اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا۔اور بظاہر وہی آپ کی ان تمام مشکلات کے ذمہ دار تھے۔اور حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام مشکلات کو نہایت ہی صبر سے انگیز کیا۔اور یوں پوری مشکلات کے درمیان وہ دعوت اسلامی کا کام مسلسل کرتے رہے۔اور ان مشکلات اور آزمائشوں سے گزرتے رہے۔آپ کی آخری توجہات اور ترجیحات اس وقت سامنے آتی ہیں جب آپ ان مشکلات سے پوری طرح کامیابی سے گزر جاتے ہیں اور فتح پاتے ہیں اور پھر جب آپ کا خاندان آپ کے ساتھ اٹھتا ہے اور پھر وہ لمحہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی خواب کی تعبیر واضح طور پر سامنے آتی ہے۔جب حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے ہیں اور چاند و سورج ہیں اور انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔یہ وقت حضرت یوسف کے لیے نہایت ہی مسرت کا وقت ہے۔اور اس میں وہ اللہ کی طرف پوری طرح رخ کیے ہوئے ہیں اور وہ اس دنیاوی مرتبے اور مقام سے پوری طرح برتر اور بالا ہیں۔اس مقام پر قرآن کریم نے واقعات کا نقشہ یوں کھینچا ہے :

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۹۹) وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۱۰۰) رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۰۱) (۱۲ : ۹۹ تا ۱۰۱) ''پھر جب یہ لوگ یوسف ؑ کے پاس پہنچے 'تو اس

نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور (اپنے سب کنبے والوں سے) کہا "چلو' اب شہر میں چلو' اللہ نے چاہا تو امن و چین سے رہو گے" ــــ (شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے' یوسف نے کہا "ابا جان یہ تعبیر ہے' میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا' اور آپ لوگوں کو صحرا سے بلا کر مجھ سے ملایا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے' بے شک وہ علیم و حکیم ہے' اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے' تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے' میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا"۔

یہ تھی حضرت کی آخری دعا۔ یہ دعا ان حالات میں وہ کرتے ہیں کہ وہ پوری طرح اقتدار پر فائز ہیں۔ عیش اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور پورے خاندان میں اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ان کو ایک مسلم کی طرح مارے اور مرنے کے بعد صالحین کی رفاقت دے۔ یہ ہے ان کی آخری آرزو ابتلاؤں اور مصیبتوں کے بعد' طویل صبر اور مشقت جھیلنے کے بعد عظیم کامیابی کے حالات میں۔

جن حالات میں یہ قصہ وارد ہوا ہے اور اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات جس تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے' اور جس انداز سے پھر اس قصے کے واقعات پر تبصرے ہوئے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ مسلمانوں کی تسلی اور تشفی کے لیے نازل ہوا ہے۔ کیونکہ حضور اکرمؐ اور جماعت مسلمہ اس وقت جن حالات سے گزر رہے تھے وہ ایسے ہی تھے کہ کچھ لوگ ہجرت پر مجبور تھے' کچھ پر مظالم ہو رہے تھے' ان کو تسلی اور اطمینان اس بات کا دیا جا رہا ہے کہ جس طرح یوسف بے بس تھے' ان کو اقتدار اعلیٰ ملا' اسی طرح کے حالات تمہارے لیے بھی ہو سکتے ہیں۔

بلکہ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تم لوگوں کو بھی مکہ سے نکل کر کسی دوسرے علاقے کی طرف منتقل ہونا ہو گا۔ اور پھر اس دوسرے مرکز سے تمہیں عروج نصیب ہو گا' اگرچہ بظاہر یہ خروج اور ہجرت حالات سے مجبور ہو کر عمل میں آئے گی۔ بعینہ اسی طرح جس طرح حضرت یوسفؑ اپنے والد کی سرپرستی سے نکالے گئے اور مختلف مشکلات سے دوچار ہوئے اور بعد میں ان کو اللہ کی تائید حاصل ہوئی اور ان کو زمین کے اندر اقتدار اعلیٰ مل گیا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۲۱) "اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے اس زمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا' اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

یہ عمل اس وقت شروع ہو گیا تھا جب انہوں نے مصر میں' عزیز مصر کے گھر قدم رکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اگرچہ اس وقت وہ ایک نوجوان تھے اور غلاموں کی طرح فروخت ہو رہے تھے۔

اور جو چیز اس وقت میری سوچ پر حاوی ہے' میں اسے محسوس کر رہا ہوں لیکن بیان نہیں کر سکتا' وہ مخصوص تبصرہ

ہے جو اس قصے کے بعد آیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰۹) حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۱۰) لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۱۱) (۱۲ : ۱۰۹ تا ۱۱۱) "اے محمد، تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر آ جاتا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں' یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنھوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے..... یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا' تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ جب ایسا موقعہ آ جاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں' بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا..... اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے"۔

اس تبصرے میں اس سنت الہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب رسول مایوس ہو جاتے ہیں تو پھر سنت الہیہ اپنا کام کرتی ہے' جس طرح حضرت یوسف اپنی طویل مشکلات میں مایوس ہوئے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مشکلات کے بعد آسانی آ جاتی ہے اور انسان پھر اپنا مقصد پا لیتا ہے۔ یہ وہ اشارات ہیں جن تک صرف مومن دل کو رسائی حاصل ہوتی ہے' جبکہ یہ مومن ایسے ہی مشکل حالات میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے حالات سے عملاً دوچار ہو کر نفس مومنہ قرآن کریم کا اصل ذائقہ چکھ سکتا ہے اور پھر اس پر نہایت ہی باریک تلمیحات اور گہرے اشارات القاء ہوتے ہیں۔

یہ سورت بعض منفرد خصوصیات کی حامل بھی ہے وہ یہ کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی پورا موجود ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں قصص کا اسلوب یہ ہے کہ موضوع سخن کے لحاظ سے کسی قصے کا جو حصہ موزوں اور مناسب ہوتا ہے' صرف اس حصے کو لایا جاتا ہے لیکن قصہ یوسف کا معاملہ دیگر قصص کے برعکس ہے۔ یہاں تک سورت ہود میں جو قصص پورے بھی آئے وہ بھی اجمالاً دیے گئے ہیں لیکن قصہ یوسف مناسب حد تک طویل بھی ہے' مکمل بھی اور ایک

ہی سورت میں بھی۔اور یہ خصوصیت قرآن کے دوسرے قصص سے ممتاز ہے۔

اس قصے کی جو نوعیت تھی اس کے ساتھ مناسب یہی تھا کہ پورا قصہ ہی دے دیا جائے اور پوری طرح اس کی تمام کڑیاں یکجا کر کے لائی جائیں۔یوسف علیہ السلام کے خواب سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے اور اس کی انتہا اس خواب کی تاویل پر ہوتی ہے۔کیونکہ قصے کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ایک ہی جگہ ہونا چاہئے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصے ایک جگہ ہوں اور کچھ دوسری جگہ دوسرے موضوع گفتگو کے ساتھ ہوں۔

اس مخصوص نوعیت کی وجہ سے اس پورے قصے کو ایک ہی جگہ لایا گیا۔اور اس طرح وہ مقصد بھی پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے جس کے لیے یہ قصہ بیان ہوا اور اس سے جو نتائج اخذ کیے جانے تھے وہ بھی اخذ ہوئے' اس بارے میں ہمیں عنقریب قدرے مفصل بات کرنی ہوگی جس سے معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کا ایک منفرد طرز ادا ہے۔وباللہ التوفیق!

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جس طرح اسے قرآن کریم میں لایا گیا ہے وہ اسلام کے منہاج قصہ گوئی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔اس قصے میں انسان کے نفسیاتی میلانات' انسانی نظریات اور اسلام کے طرز تربیت اور اسلامی تحریک کے مقاصد کی وضاحت کی گئی ہے۔قرآن کریم میں قصص لانے کا انداز عموماً ایک ہی ہے' لیکن حضرت یوسف ؑ کے قصے کا ایک مخصوص انداز ہے اپنے طرز ادا کے اعتبار سے بھی اور فنی خوبیوں کے اعتبار سے بھی۔

یہ قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار کے ہر پہلو کو سامنے لاتا ہے' ان کی زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کرتا ہے کیونکہ آپ ہی اس قصے کے ہیرو اور اصل کردار ہیں۔زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ردعمل پیش کیا جاتا ہے اور پھر ان پر جو ابتلاء آئے ہیں وہ پوری طرح دکھائے جاتے ہیں۔ان پر جو ابتلاء آئے' اپنی نوعیت اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے مختلف تھے۔مشکلات کا ابتلاء بھی اور خوشحالی کا ابتلاء بھی ہے۔شہوت کے فتنے کا بھی اور حکومت کے اقتدار کا بھی ابتلاء ہے۔غرض مختلف مواقف اور مختلف شخصیات کے مقابلے میں ان کی سوچ اور ان کے تاثرات اس قصے میں موجود ہیں۔یہ ہیرو فی الحقیقت ان تمام ابتلاؤں میں ایک خالص مومن کی طرح سرخرو ہو کر نکلتا ہے اور اللہ کے سامنے دست بدعا ہو کر کھڑا ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل کہہ دیا۔

اس قصے کے مرکزی کردار کے علاوہ دوسرے کرداروں کی تفصیلات بھی اس میں دی گئی ہیں۔ہر کردار کے خدوخال' اس کی اہمیت کے مطابق دیئے گئے ہیں' دیکھنے والے کے مقام سے کسی کو دور رکھا گیا ہے' اور کسی پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ قصہ انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مختلف کرداروں کی صورت میں نہایت ہی حقیقت نگاری کی شکل میں پیش کرتا ہے۔اس میں حضرت یعقوب بطور ایک صابر مطمئن نبی اور ٹوٹ کر اپنے بچوں کے ساتھ محبت کرنے والے انسان کی صورت میں نظر آتے ہیں جن کا عالم بالا کے ساتھ ہر وقت رابطہ قائم ہے۔دوسرا نمونہ اور کردار حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں کا ہے جن کے دلوں میں غیرت' حسد اور کینہ پروری کے جذبات موجزن ہیں' وہ سازشوں میں لگے ہوئے ہیں اور جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور آثار جرم کا سامنا کرتے ہیں اور اس میں وہ کبھی سخت تعجب اور حیرانی میں مبتلا ہوتے ہیں اور کبھی شرمندہ ہو کر ناکام ہوتے ہیں۔ان میں سے بھی ایک شخص جو ممتاز کردار رکھتا ہے اس کی شخصیت اور امتیازی خصوصیات کو بھی قلم بند کر دیا جاتا ہے اور قصے کے مختلف مراحل میں اس کا کردار امتیازی نظر آتا ہے۔پھر اس میں عزیز مصر کی بیوی کا بھی ایک کردار سامنے آتا ہے' یہ اپنی نسوانی خواہشات میں اندھی نظر آتی ہے۔مصر

معاشرے کے بادشاہوں کے حرم کا یہ ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور اس کے ذاتی خدوخال بھی اس کے کردار سے اچھی طرح واضح ہیں - یہ مصر کے اعلیٰ طبقے کی خواتین کا نمونہ ہے - اس قصے میں اس وقت کے معاشرے اور اس میں عورتوں کی سرگرمیوں اور سوچ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح وہ حضرت یوسف ؑ کو ورغلانے کی تدابیر کرتی ہیں اور عزیز مصر کی بیوی سب عورتوں کی موجودگی میں کس طرح حضرت یوسف کو برملا دھمکی دیتی ہے اور پھر کس طرح وہ سازشیں کر کے حضرت یوسف کو جیل تک پہنچا دیتی ہے - اس میں عزیز مصر کا بھی ایک کردار ہے جس پر اپنے طبقے اور اس وقت کے معاشرے کے رنگ ڈھنگ چھائے ہوئے ہیں - اس میں ایک کردار بادشاہ کا بھی ہے جو پس پردہ ہے جو عزیز مصر کی طرح اسٹیج سے دور ہی رہتا ہے - غرض اس قصے میں جو کردار بھی سامنے آتے ہیں وہ اپنی سچی اور واقعی تصویر پیش کرتے ہیں ' جو لوگ بھی مختلف مواقف ' مختلف حالات میں اسٹیج پر آتے ہیں وہ اپنے حقیقی اور قدرتی خدوخال کے ساتھ آتے ہیں -

غرض مختلف حالات ' اور مختلف مناظر میں یہ قصہ اپنے اندر ایک حقیقی واقعیت رکھتا ہے اور یہ اسلام کی فنی طرز ادا کی ایک معیاری اور ممتاز مثال ہے یعنی کسی واقعہ کے محض حقیقی واقعات پر ہی اکتفاء کرنا ' گہری سچائی کو پیش کرنا اور اس کے ساتھ قصے کو مزین کرنا اور ہر مرحلے میں حقیقی اور واقعیت پسندی سے کام لینا - تمام تاثرات کو ظاہر کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس گندگی سے بچنا جو واقعیت اور حقیقت پسندی کے نام سے آج کل ہمارے لٹریچر میں عام ہے -

اس قصے میں انسان کی کمزوری کے مراحل بھی آتے ہیں ' مثلاً جنسی کمزوری لیکن ایسے مواقع کو بھی اس قصے میں بغیر لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت ہی حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے ' ایسے مواقع پر نفس انسانی کی جو کیفیات ہوتی ہیں ' ان کو نظرانداز نہیں کیا گیا لیکن بیسویں صدی کی جاہلیت جس طرح سفلی جذبات کو ان کیفیات کے ذریعے ابھارتی ہے اور اس کو حقیقت پسندی کا نام دیا جاتا ہے اس سے پوری طرح اجتناب کیا جاتا ہے -

غرض یہ قصہ طرز ادا کی واقعیت پسندی کے ساتھ ساتھ اور مختلف النوع کرداروں کی موجودگی کے باوجود اپنے ماحول کو مکمل طور پر پاک و صاف رکھتا ہے - اس قصے میں جو کردار آتے ہیں مناسب ہے کہ ان پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں -

○ حضرت یوسف کے بھائی --- ان کے دلوں میں حسد اور کینے کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے - یہاں تک کہ ان کے دلوں میں اس ہولناک جرم کے ارتکاب کا کوئی خوف نہیں رہتا - یہ جرم ان کے نزدیک اب گھناؤنا ' عظیم اور مکروہ نہیں رہتا - اس کے بعد وہ اس جرم کے ارتکاب کے لیے ایک شرعی جواز بھی ڈھونڈ لیتے ہیں - کیونکہ یہ لوگ ایک دینی گھرانے کے فرزند تھے - حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت اسحاق کے پوتے ' چنانچہ یہاں ان کی حقیقی ذہنیت کو قلم بند کیا گیا ہے - ان کا دینی رنگ ' ان کی فکر ' ان کا شعور اور ان کا رسم و رواج ایک ہی فقرے میں قلم بند کر دیئے جاتے ہیں - وہ جرم کرنا بھی چاہتے ہیں اور نیک رہنا اور اچھا انجام بھی چاہتے ہیں ' ذرا ملاحظہ فرمائیں :

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ (٧) إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَى أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (٨) اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ (٩) قَالَ

قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (۱۰) قَالُوْا يٰاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ (۱۱) اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۲) قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ (۱۳) قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱٤) فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۵) وَ جَآءُوْ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ (۱٦) قَالُوْا يٰاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (۱۷) وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۸) (۱۲ : ۷ - ۱۸) ''حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا ''یہ یوسف اور اس کا بھائی' دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ابا جان' بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ چلو یوسف کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تا کہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہارے ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا''۔ اس پر ان میں سے ایک بولا ''یوسف کو قتل نہ کرو' اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا''۔ اس قرار داد پر انہوں نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جان کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے' کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔ باپ نے کہا ''تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو''۔ انہوں نے جواب دیا ''اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیئے نے کھا لیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں تو ہم بڑے نکمے ہوں گے''۔ اس اصرار کے ساتھ جب وہ اسے لے گئے' انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ ''ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا۔ یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں''۔ شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا ''ابا جان' ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری

بات کا یقین نہ کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی ہوں"۔ اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

اس پورے قصے میں ان کا کردار ایک ہی جیسا ہے' ان بھائیوں میں سے ایک کا موقف قدرے مختلف ہے اور وہ آغاز قصہ سے آخر تک دوسروں سے مختلف ہے۔ اب یہ کنعان سے مصر جاتے ہیں اور یوسف کے مطالبے پر اس کے بھائی کو دوبارہ مصر لے کر جاتے ہیں تاکہ یہ سات سالہ خشک سالی میں مصر سے گندم خرید کر لائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف کو یہ تدبیر سمجھاتا ہے کہ وہ ان کے سامان میں پیمانہ رکھ کر اپنے بھائی کو روک لیں۔ اس بہانے سے کہ اس کے سامان سے پیمانہ برآمد ہوا۔ یہ لوگ تو حقیقت سے بے خبر ہیں لیکن اس موقعے پر ان کا پرانا کینہ جاگ اٹھتا ہے۔ کہتے ہیں :

قَالُوْا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۱۲: ۷۷) "بھائیوں نے کہا" یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی ہے' اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف) بھی چوری کر چکا ہے"۔ یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا' حقیقت ان پر نہ کھولی' بس اتنا کہہ کر رہ گیا" بڑے ہی برے ہو تم لوگ جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔ اور جب یہ لوگ اپنے بوڑھے باپ کو ایک دوسرے صدمے سے دوچار کرتے ہیں تو ان لوگوں کا کردار وہی ہے۔ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس بوڑھے کے دل کے اندر یوسف کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے تو ان کا پرانا کینہ پھوٹ پڑتا ہے' اور وہ اپنے بوڑھے باپ کا لحاظ کیے بغیر یہ ریمارکس پاس کرتے ہیں۔

وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (۸۴) قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ (۸۵) (۱۲: ۸۴ - ۸۵) "پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا" ہائے یوسف"۔ وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔ بیٹوں نے کہا" خدارا آپ تو ابھی یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے"۔

اور جب آخری منظر سامنے آتا ہے کہ حضرت یوسف اپنی قمیص اپنے باپ کی طرف ارسال کرتے ہیں جب وہ اپنا تعارف کر چکتے ہیں تو انہوں نے جب دیکھا کہ ان کے باپ حضرت یوسف کی خوشبو سونگھ رہے ہیں تو انہیں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے درمیان پائے جانے والا یہ باطنی تعلق بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اس وقت بھی یہ لوگ اپنے کینہ پر قابو نہیں پاتے اور حضرت یعقوب کو ملامت کرتے ہیں۔

وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (۹۴)

قَالُوْا تَاللّٰہِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (۹۵) (۱۲ : ۹۴ — ۹۵) ''جب یہ قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا ''میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں' تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا۔ گھر کے لوگ بولے :''خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اس پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں''۔

m عزیز مصر کی بیوی :۔ اس کا کاسہ جسم شہوت سے لبریز ہے اور قریب ہے کہ چھلک جائے' یہ اندھی شہوت ہے' عورتوں کی قدرتی شرم و حیا کا پردہ اس نے چاک کر لیا ہے۔ ذاتی عزت اور مقام و مرتبے کا خیال بھی اس نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ اسے نہ اپنے معاشرتی مقام و مرتبے کا خیال ہے اور نہ خاندانی شرمندگی کی کوئی پروا ہے بلکہ اپنے اس ذلیل مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام نسوانی سازشیں بروئے کار لاتی ہے جو عموماً عورتوں کا وطیرہ ہوتی ہیں۔ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے میں مکاری' اس پر الزام کے لگنے کی وجہ سے خاندان پر جو بدنامی آئی ہے اس سے بچنے کے لیے سازش کرتی ہے اور پھر اپنے آپ کو سزا سے بچاکر ایک بے گناہ شخص کے لیے سزا بھی جلدی سے تجویز کر دیتی ہے۔ یہ دوسری عورتوں کی کمزوریوں سے بھی خوب واقف ہے۔ جس طرح وہ اپنی کمزوریوں سے واقف ہے' اس لیے یہ ایک گہری سازش کے ذریعے اپنی ہم محفل عورتوں کو بھی ننگا کر دیتی ہے۔ اور جب وہ سب ننگی ہو جاتی ہیں تو یہ برملا اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اس شخص کو میری خواہش پوری کرنا ہوگی۔ اب یہ عورت جامہ حیا چاک کر دیتی ہے اور اب اس کے لیے نہ شرم و حیا مانع ہے نہ اس کا مقام و مرتبہ کسی چیز سے مانع ہے جبکہ یہ اب محض ایک عورت ہی ہے۔ باوجود اس کے کہ قرآن مجید اس عورت کی واقعی تصویر کھینچتا ہے' خصوصاً ایک مخصوص شہوانی حالت میں جس میں ذرا سی بے احتیاطی بھی کلام کے معیار کو گرا سکتی ہے۔ لیکن قرآن کا یہ طرز ادا نہایت ہی معیاری ہے اور اسلامی فن و ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نازک ترین مراحل میں بھی اسلام یہ چاہتا ہے کہ طرز ادا پاک و صاف ہو اور اس میں کوئی فحاشی نہ ہو۔ اگرچہ ایسا مفہوم اور مقام زیر بحث ہو جس میں انسان نفسیاتی اور جسمانی لحاظ سے ننگا ہو اور جسمانی و شہوانی حالت اپنے اعلیٰ درجے میں ہو۔ ایسے مقامات اور حالات کو آج کل جدید لٹل فن عریانی اور فحاشی اور گندے انداز میں قلم بند کرتے ہیں اور پھر انہیں واقعیت اور فطرت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ بہرحال جاہلیت جدیدہ کی یہ گندگی ہے اور اسلام واقعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی پاکیزہ فن پیش کرتا ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو قرآنی فن۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۱) وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۲۲) وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔

۲۳) وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ
الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۲٤) وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ
دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ
اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۵) قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ
كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۲٦) وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ
دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۷) فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ
كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۲۸) يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْبِكِ اِنَّكِ
كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ (۲۹) وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ
نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۰) فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ
اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ
فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ
كَرِيْمٌ (۳۱) قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَ
لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ (۳۲) قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ
اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ
الْجٰهِلِيْنَ (۳۳) فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(۳٤) (۱۲: ۲۱ – ۳٤) ”مصر کے جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا“ اس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں گے“۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنے کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا۔ اس طرح ہم نیک

لوگوں کو جزا دیتے ہیں ۔۔۔۔ جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آ جا"۔ یوسفؑ نے کہا "خدا کی پناہ میرے رب نے مجھے اچھی منزلت بخشی ہے ' ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا 'تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں ۔ درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخر کار یوسفؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسفؑ کی قمیص لے کر پھاڑ دی ۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیرے گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے"۔ یوسف نے کہا "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی"۔ اس عورت کے اپنے کنبے والوں میں سے ایک شخص نے شہادت پیش کی کہ "اگر یوسفؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا' اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت جھوٹی اور یہ سچا" ۔ جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں' واقعی بڑی غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں ۔ یوسف اس معاملے سے درگزر کر اور اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ تو ہی اصل میں خطاکار ہے"۔۔۔۔ شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ "عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے' محبت نے اسے بے قابو کر رکھا ہے' ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے"۔ اس نے جو ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لئے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے چھری رکھ دی (پھر عین اس وقت جب پھل کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسف کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اٹھیں "ماشاء اللہ' یہ شخص انسان نہیں ہے' یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"۔ عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا' یہ ہے وہ شخص جس کے معاملے میں تم مجھ پر باتیں بناتی ہو' بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا ۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا۔ یوسف نے کہا "اے میرے رب قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ مجھ سے چاہتی ہیں ۔ اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے رفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شمار ہوں گا۔۔۔۔ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے رفع کر دیں ۔ بے شک وہی ہے جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے"۔

اب حضرت یوسف ان عورتوں کی مکاریوں اور عزیز مصر کی بیوی کی وجہ سے جیل میں چلے جاتے ہیں' ایک بار پھر اس عورت کا کردار سامنے آتا ہے' بادشاہ ایک خواب دیکھتا ہے' اس موقع پر وہ شخص جو جیل میں تھا اور رہا ہو گیا تھا' اسے یاد آ جاتا ہے کہ جیل میں خوابوں کی تعبیر بتانے والا شخص موجود ہے ۔ اس شخص نے بادشاہ کو تفصیلات بتائیں' بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو طلب فرمایا۔ تو انہوں نے رہا ہونے سے اس وقت تک انکار کر دیا جب تک اس الزام کی تحقیقات نہیں ہو جاتی جس کی وجہ سے وہ جیل گئے ۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلایا۔ ان میں یہ زلیخا بھی موجود ہے ۔ اب یہ عورتیں عمر رسیدہ ہیں اور حوادث زمانہ نے ان کو بالغ نظر اور سنجیدہ کر دیا ہے ۔ اور اس عرصے میں یہ عورتیں ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کی ایمانی قوت سے بھی متاثر ہو گئی تھیں ۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِي بِهٖ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ (۵۰) قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۵۱) ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (۵۲) وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۳) (۱۲ : ۵۰ تا ۵۳)

"اور بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ" مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "اپنے رب (آقا) کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے"۔ اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف کو رجھانے کی کوشش کی تھی"۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا "حاشا اللہ ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔ عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے' وہ میں ہی تھی جس نے اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔ (یوسفؑ نے کہا) اس سے میری غرض صرف یہ تھی کہ یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی' اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں' نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

• حضرت یوسفؑ :- اس قصے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی ایک کردار دیا گیا ہے' یہ ایک انسان ہیں لیکن بندۂ صالح ہیں۔ قرآن کریم نے حضرت یوسف کی انسانیت پر ایک لمحے کے لیے بھی کوئی ملمع کاری نہیں کی۔ وہ انسان ہیں مگر ایک نبوت کے گھرانے کے پروردہ ہیں۔ دینی ماحول کے تربیت یافتہ' ان سب باتوں کے باوجود ان کی انسانیت کے بیان میں مکمل واقعیت سے کام لیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ان کی انسانیت معصومیت الٰہیہ کے دھاگے سے بندھی ہوئی تھی ورنہ غلطی کا امکان تھا۔ وہ عورتوں کی مکاریوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا احساس رکھتے ہیں' کہ ایک اونچا معاشرہ ہے' باغ و راغ اور محلات ہیں' شاہی بیگمات میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں اگرچہ جیل ہو۔ غرض بحیثیت انسان حضرت یوسف علیہ السلام کی قرآن مجید حقیقی تصویر کھینچتا ہے۔ لیکن اس واقعیت میں مغربی تہذیب کی قصہ گوئی کی گندگی نہیں ہے جسے وہ واقعیت کا نام دیتے ہیں' بلکہ یہ فطرت سلیمہ کی حقیقت پسندی ہے؟

☆ عزیز مصر:- ان کا بھی ایک خاص مزاج ہے' امیرانہ کبریائی کے ساتھ یہ نخوت و غرور میں بھی مبتلا ہے' ظاہری رکھ رکھاؤ اور معاملات کی پردہ داری اور ہر چیز کو راز میں رکھنا اس وقت کے معاشرے کی اپر کلاس کی خصوصیات اس میں موجود ہیں۔

فَلَمَّا رَاٰقَمِیصَهٗ قُدَّمِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ کَیْدِکُنَّ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیمٌ (۲۸) یُوسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْبِكِ اِنَّكِ کُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِیْنَ (۲۹) (۱۲ : ۲۸ — ۲۹)) جب شوہر نے دیکھا کہ یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں، واقعی بڑی غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں ۔ یوسفؑ اس معاملے سے درگزر کر اور اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ تو ہی اصل میں خطا کار ہے"——

☆ مصری عورتیں :- ان عورتوں میں اس معاشرے کے مکمل رنگ ڈھنگ موجود ہیں ۔ یہ عزیز کی بیوی اور اس کے غلام کے ساتھ اس کی محبت کے بارے میں ہر طرف چہ میگوئیاں کر رہی ہیں، کہ یہ عورت اپنے نوجوان غلام کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے اور اس کی محبت میں اندھی ہو گئی ہے ،ان کی ان چہ میگوئیوں کے پیچھے عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ حسد کا جذبہ زیادہ ہے اور بذات خود اس برے فعل سے نفرت کا جذبہ کم ہے ، پھر یہ عورتیں جب خود یوسفؑ کو دیکھتی ہیں تو ششدر رہ جاتی ہیں ۔ پھر وہ یہ اقرار بھی کر رہی ہیں کہ وہ جو اس عورت کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور اس کے بارے میں داستانیں کہتی پھرتی تھیں اس میں وہ کس قدر حق بجانب ہے ۔ اور اس کے جواب میں زلیخا جرات کر کے اقرار جرم ہی کر لیتی ہے ۔ اس کے بعد یہ سب عورتیں حضرت یوسف کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جاتی ہیں حالانکہ انہوں نے پہلی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ اگر چہ حضرت یوسفؑ صورت میں فرشتہ ہیں لیکن سیرت بھی فرشتوں کی ہے ۔ اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ کَرِیْمٌ (۱۲ : ۳۱) "حاشاللہ، یہ بشر نہیں ہے، یہ تو ایک نہایت ہی شریف فرشتہ ہے"—— اور حضرت یوسف ہر طرف کے ان حملوں سے تنگ آکر یہ دعا کرتے ہیں :

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ (۱۲ : ۳۳) "یوسف نے کہا "اے میرے رب، قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ مجھ سے چاہتی ہیں ۔ اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے رفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا"۔

☆ معاشرہ :- اس پورے قصے سے مصری معاشرے کے خدوخال بھی ظاہر ہوتے ہیں ۔ یوسف کے معاملے میں جو اقدامات کیے گئے، باوجود اس کے کہ وہ بے گناہ ثابت ہو گئے تھے ۔ ان اقدامات سے ان کا مقصد اپنی خاندانی شرمندگی کو دفن کرنا تھا ۔ یہ پروا ان کو نہ تھی کہ حضرت یوسف جیسے بری الذمہ شخص جیل میں جاتے ہیں ۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِیْنٍ (۱۲ : ۳۵) "پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کر دیں وہ صریح نشانیاں (پاکدامنی کی) دیکھ چکے تھے"۔

○ اگر ہم حضرت یوسف کی شخصیت اور کردار کو تلاش کریں تو اس پورے قصے میں وہ ہر جگہ نمایاں ہے - وہ اپنی شخصیت اور اپنے خاندان اور اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک عبد صالح ہیں ' انسان ہیں ' بشر ہیں لیکن خاندان نبوت نے ان کو یہ چمک دمک دی ہے - یہ ان کی دینی تربیت کا نتیجہ ہے -

یہ جیل کے اندھیروں میں ہیں اور جیل کے اندھیرے اور تاریکیاں وہی جانے جس نے دیکھی ہو ' لیکن وہ اپنی دعوت کو نہیں بھولتے - نہایت دانشمندی ' نہایت حکمت اور نہایت ہی نرمی کے ساتھ وہ دعوت دیتے اور فیصلہ کن انداز میں دیتے ہیں - معاشرے کے حالات کو جانتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ کس راہ سے اس معاشرے میں اپنی دعوت داخل کر سکتے ہیں - وہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے - وہ اپنی شخصیت ' اپنے حسن اخلاق ' اپنے طرز عمل کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور اپنے خاندان اور اپنے دین کی پاکیزگی کو بطور برہان سامنے لاتے ہیں :

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ اِنَّا نَرٰكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۳۶) قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۳۷) وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۳۸) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰) يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (۴۱) (۱۲ : ۳۶ - ۴۱)

" قید خانے میں دو اور غلام بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے ' ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا " میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں " - دوسرے نے کہا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور

پرندے اس سے کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتایئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں"۔ یوسف نے کہا "یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا ۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں ' اپنے بزرگوں ابراہیمؑ' اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے ۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں ۔ در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہے تمام انسانوں پر ' مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ' اے زندان کے ساتھیو ' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک جو سب پر غالب ہے ؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں ۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی ۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے ۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو ' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے ' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ۔ اے زندان کے ساتھیو تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (بادشاہ) کو شراب پلائے گا ' رہا دوسرا تو اسے سولی چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے ' فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے"۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حضرت یوسف ایک انسان ہیں ' ایک ضعیف انسان ۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس قید خانے سے باعزت طور پر نجات پائیں ' کم از کم بادشاہ کو خبر تو ہونا چاہیے کہ کوئی بے گناہ قید میں ہے ۔ شاید اس طرف متوجہ ہو کر وہ اس سازش کی تحقیقات کا حکم دے جس کے نتیجے میں ظالم باہر ہیں اور مظلوم اندر ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور یہی تھا کہ آپ کچھ عرصہ قید میں رہیں اور صرف اللہ پر تکیہ کریں ۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ (۱۲ : ۴۲) "پھر ان میں سے جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسف نے کہا کہ "اپنے رب (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا ۔ مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا ' یوسف کئی سال قید خانے میں پڑا رہا"۔

اب چند سال مزید قید خانے میں گزر جاتے ہیں ۔ بادشاہ خواب دیکھتا ہے ' اس کے درباری اور مذہبی پیشوا اس کی تعبیر میں حیران رہ جاتے ہیں ۔ اس موقعے پر زندان کے ساتھی کو حضرت یوسف یاد آ جاتے ہیں ' اب حضرت یوسف ربانی تربیت مکمل کر چکے ہیں اور مکمل بندۂ صالح ہیں ۔ وہ اپنی تقدیر اور انجام پر بالکل مطمئن ہیں ۔ یہاں تک کہ جب بادشاہ خواب کی بہترین تعبیر سن کر انہیں طلب کرتا ہے تو یہ پر اعتماد قیدی قید خانہ چھوڑ کر اس وقت تک باہر آنے کے لیے تیار نہیں جب تک اس پر الزام کے بارے میں مکمل تحقیقات نہیں ہو جاتی اور وہ باعزت طور پر اس سے بری نہیں ہو جاتا ۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ

(۴۳) قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ (۴۴) وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ (۴۵) يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۴۶) قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ (۴۷) ثُمَّ يَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (۴۸) ثُمَّ يَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ (۴۹) وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ (۵۰) قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۵۱) ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (۵۲) وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۳) وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ (۵۴) قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (۵۵) (۱۲ : ۴۳ تا ۵۵) "ایک روز بادشاہ نے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں' اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی ۔ اے اہل دربار' مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ ۔ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو"۔ لوگوں نے کہا "یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کے مطلب نہیں جانتے"۔ ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی' اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں' مجھے ذرا (قید خانے) بھیج دیجئے"۔ اس نے جا کر کہا "یوسف' اے سراپا راستی' مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی

گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ شاید کہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں"۔ یوسف نے کہا "سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے' اس دوران جو فصلیں تم کاٹو ان میں بس تھوڑا سا حصہ جو تمہاری خوراک کے کام آئے نکالو' اور باقی کو بالیوں ہی میں رہنے دو' پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو' اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا' جس میں باران رحمت سے لوگوں کی فریاد سنی جائے گی اور وہ اس میں نچوڑیں گے"۔

بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ' مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "اپنے رب (آقا) کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟" میرا رب تو ان کی مکاریوں سے واقف ہی ہے"۔ اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف کو رجھانے کی کوشش کی تھی؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا' "حاشاللہ ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا"۔ عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے اور وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔

(یوسف نے کہا) اس سے میری غرض یہ تھی کہ عزیز یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی۔ اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

بادشاہ نے کہا انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں اسے اپنے لیے مخصوص کر لوں--- یوسفؑ نے ان سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا پورا بھروسہ ہے"۔ یوسف نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔

اس مقام پر حضرت یوسف ایک کامل' مکمل' پختہ کار' دانشمند' منجھے ہوئے' سنجیدہ' پر اعتماد اور نہایت ہی چھا جانے والی شخصیت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تمام شخصیات صف ثانی میں چلی جاتی ہیں۔ بادشاہ' عزیز مصر' خواتین اور مصری معاشرہ اب اسکرین سے غائب ہے' یہاں سے قصے کا رخ مڑ جاتا ہے لیکن قرآن کریم اسلامی انقلاب کے ہدف کی طرف اشارہ کر دیتا ہے:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (٥٦) وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (٥٧) (١٢: ٥٦ - ٥٧) "اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنے لیے جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں' نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے' جو ایمان لے آئے اور خدا

ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے"۔

اب اس عظیم شخصیت کے سامنے آزمائشوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ پہلے اور قسم کی آزمائشیں تھیں اور اب دوسرے رنگ کی۔ اور وہ ایک پختہ کار شخص کی طرح ان میں سے کامرانی کے ساتھ نکلتے جاتے ہیں' اور نہایت ہی اطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ۔

○ سب سے پہلے ان کا سامنا اپنے ان بھائیوں سے ہوتا ہے جنہوں نے ان کے ساتھ نہایت ہی شنیع سلوک کیا تھا۔ لیکن اب وہ ان کے مقابلے میں بالادستی کے مالک ہیں۔ لیکن وہ ضبط کیے ہوئے ہیں' ان کا ردعمل نہایت ہی کھلا ہے' ان کے اقدام بالکل سیدھے ہیں۔

وَ جَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۵۸) وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِیْكُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (۵۹) فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ (۶۰) قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ (۶۱) وَقَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (۶۲) (۱۲ : ۵۸ تا ۶۲)

"یوسف کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔ پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا: "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے' بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا"۔ انہوں نے کہا ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں۔ اور ہم ایسا ضرور کریں گے"۔ یوسف نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو"۔ یہ یوسف نے اس امید پر کہا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہوا مال پہچان جائیں اور عجیب نہیں کہ پھر پلٹیں"۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ انہیں تدبیر سمجھاتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو روک لیں۔ دیکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت نہایت ہی پختہ کار' دانشمند' پُراعتماد' ضبط کرنے والی' صبر کرنے والی اور نہایت ہی حکیمانہ پالیسیوں والی بن گئی ہے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۶۳) قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَیْرٌ

حِفْظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (٦٤) وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ
اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَ
نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ (٦٥) قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ
اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ
(٦٦) وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَاۤ
اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُتَوَكِّلُوْنَ (٦٧) وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ
مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (٦٨) وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا
اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (٦٩) فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ
فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ (٧٠) قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا
عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ (٧١) قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ
اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ (٧٢) قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا
سٰرِقِيْنَ (٧٣) قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ (٧٤) قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ
رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (٧٥) فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ
اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ
الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (٧٦)
قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۷۷) قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا

كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷۸) قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا

مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (۷۹) (۱۲ : ۶۳ - ۷۹) "جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا ابا جان' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں۔ اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ باپ نے جواب دیا "کیا میں اس معاملے میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر جیسا انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان اور ہمیں کیا چاہئے دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں دے دیا گیا ہے' بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لائیں گے۔ اتنے غلے کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔ ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام سے مجھے کوئی پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور لے کر آؤ گے الا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لے جاؤ"۔ جب انہوں نے اس کو اپنے پیمان دے دیئے تو اس نے کہا "دیکھو ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔ پھر اس نے کہا "میرے بچو' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے"۔ اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آ سکی۔ ہاں یعقوب کے دل میں جو ایک کھٹک تھی' اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کی۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا' مگر اکثر لوگ معاملے کی حقیقت کو جانتے نہیں ہیں ۔۔۔ یہ لوگ یوسف کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ "میں تیرا ہی بھائی ہوں"۔ اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں" ۔۔۔ جب یوسفؑ ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا "اے قافلے والو تم لوگ چور ہو؟ انہوں نے پلٹ کر پوچھا "تمہاری کیا چیز کھو گئی ہے؟" سرکاری ملازموں نے کہا "بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں ملتا"۔ جو شخص لا کر دے گا اس کے لیے ایک بار شتر انعام ہے۔ اس کا میں ذمہ دار ہوں"۔ ان بھائیوں نے کہا "خدا کی قسم تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں"۔ انہوں نے کہا "اچھا اگر تمہاری بات جھوٹی نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟" انہوں نے کہا "اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے' ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے؟ تب یوسفؑ نے اپنے بھائی سے پہلے ان کی خرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ پھر اپنے بھائی کی خرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی۔ اس طرح ہم نے یوسف کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔ اس کا یہ کام نہیں تھا کہ بادشاہ کے دین میں اپنے بھائی کو پکڑتا۔ الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں' بلند کر دیتے ہیں' اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے

بالا تر ہے ۔ان بھائیوں نے کہا" یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے ۔اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے ۔ یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا۔ حقیقت ان پر نہ کھولی 'بس اتنا کہہ کر رہ گیا" کہ بڑے ہی برے ہو تم لوگ 'جو الزام تم لگا رہے ہو 'اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے"۔-- انہوں نے کہا اے سردار ذی اقتدار 'اس کا باپ بہت ہی بوڑھا آدمی ہے 'اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے ۔ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں"۔ یوسف نے کہا" پناہ بخدا' دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے"۔

○ ایک بار پھر ہم ان سے ملتے ہیں' حضرت یعقوب کی مشکلات اور مصیبتیں انتہا کو پہنچ گئی ہیں ۔اب اللہ کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ خاندان یعقوب ؑ کی مشکلات کا دور ختم کر دیا جائے ۔حضرت یوسف ؑ بھی مشتاق ہیں کہ اپنے والدین کو دیکھ سکیں ۔انہوں نے اپنے بھائیوں کو بھی مشکلات میں دیکھا' ان کا دل پسیج گیا۔ چنانچہ ان حالات میں وہ پردۂ راز داری سے باہر آگئے ۔اس وقت انہوں نے بھائیوں کو بہرحال قدرے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور ایک شریف بھائی کی طرح معاف کر دیا۔ جو بات بھی اس قصے' میں سامنے آتی ہے وہ نہایت ہی نیچرل اور ایک کڑی کے بعد متوقع کڑی آتی ہے ' کیونکہ اس عظیم شخصیت سے قاری یہی توقع کرتے ہیں :

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ (۸۸) قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (۸۹) قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۰) قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ (۹۱) قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۹۲) اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا وَ اْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹۳) (۱۲:

۸۸ تا ۹۳) "جب یہ لوگ مصر میں جاکر یوسف ؑ کی پیشی میں داخل ہوئے تو انہوں نے عرض کیا کہ "اے سردار ذی اقتدار ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم کچھ حقیری پونجی لے کر آئے ہیں' آپ ہمیں بھرپور غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں' اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے"۔اس نے کہا تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ جبکہ تم نادان تھے"۔وہ چونک کر بولے "ہائیں !کیا تم یوسف ہو؟" اس نے کہا "ہاں" میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے ۔اللہ نے ہم پر احسان فرمایا' حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے

تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا"۔انہوں نے کہا"بخدا تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطاکار ہی تھے"۔اس نے جواب دیا' آج تم پر کوئی گرفت نہیں 'اللہ تمہیں معاف کرے ۔وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔ جاؤ' میری یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو ان کی بینائی لوٹ آئے گی اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ"۔

○ سب سے آخر میں حضرت یوسف بارگاہ رب العزت میں کھڑے ہیں' جبکہ دنیا میں وہ اقتدار کے عروج پر ہیں۔ روحانی علوم کے ذریعہ وہ خوابوں کی تعبیر کرتے ہیں' خود ان کی اپنی خوابوں کی تعبیر ان کے لیے اقتدار اعلیٰ کی صورت میں سامنے آگئی ہے۔ایسے حالات میں وہ حقیقی مقتدر اعلیٰ کی بارگاہ یوں دست بدعا ہیں۔ دنیاوی اقتدار کو نظرانداز کر کے اب وہ اک دوسرے جہان کا اقتدار طلب کرتے ہیں :

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

(۱۲ : ۱۰۱) "اے میرے رب 'تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔زمین و آسمان کے بنانے والے 'تو ہی تو دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے' میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا"۔

غرض حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت نہایت ہی جامع شخصیت ہے اور خاندان نبوت کی تربیت اور بنیادی خصائص اس میں حقیقت پسندانہ انداز میں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔

☆ حضرت یعقوب :- اس قصے کا ایک اہم کردار حضرت یعقوب ہیں' ان کو اپنے بیٹے سے بے حد محبت ہے' لیکن وہ خدارسیدہ نبی بھی ہیں اور خدا کی طرف سے جو بھی آزمائش آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں۔وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف ؑ کی خوابیں نہایت ہی فرحت بخش ہیں' ان میں ان کے لیے عظیم خوشخبری ہے' لیکن اس ہونہار لڑکے کے درخشاں مستقبل کے بارے میں ان کی مومنانہ بصیرت خطرات کو بھی بھانپ لیتی ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار نہایت ہی نیچرل اور حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہیں :

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤی اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۵) وَ كَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَ یُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤی اٰلِ یَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤی اَبَوَیْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۶) (۱۲ : ۴ — ۶) "جب یوسف ؑ نے اپنے باپ سے کہا' ابا جان میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔جواب میں اس

کے باپ نے کہا "بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے اور ایسا ہی ہو گا، تیرا رب تجھے منتخب کرے گا، اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاق پر کر چکا ہے، یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

اب حضرت یعقوب علیہ السلام دوبارہ اس قصے میں ایک حقیقت پسند اور واقعیت پسند انسان کی شکل میں سامنے آئے کہ جب ان کے بیٹے انہیں حضرت یوسفؑ کے بارے میں ورغلاتے ہیں اور اس کے بعد انہیں ایک نہایت ہی دلدوز خبر سناتے ہیں۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ (۱۱) اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۲) قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ (۱۳) قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱۴) فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۱۵) وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ (۱۶) قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (۱۷) وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۸)

(۱۲ : ۱۱ ـ ۱۸) "انہوں نے کہا "اباجان کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے، کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔ باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔ انہوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑئیے نے کھا لیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں تو ہم بڑے نکمے ہوں گے"۔ اس اصرار کے ساتھ جب وہ اسے لے گئے، انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنوئیں میں چھوڑ دیں تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ "ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا۔ یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں"۔

شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "اباجان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے

چاہے ہم سچے ہی ہوں اور وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے - یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "کہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے 'ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا' اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا' جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

اس کے بعد اس شخصیت عظیمہ سے ہماری ملاقات ہوتی ہے - ان کے بیٹے دوسری بار ان سے وہی مطالبہ کرتے ہیں کہ دل کی تسلی کے لیے یوسف کا جو بھائی باقی تھا اسے بھی ان کے ساتھ کر دیں اور یہ کہ اس کا مطالبہ عزیز مصر نے کیا ہے' جو دراصل یوسف ہی تھے مگر وہ اسے جانتے نہ تھے اور یہ کہ عزیز مصر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک بار شتر گندم ہمیں زیادہ دے گا - جبکہ سخت خشک سالی ہے اور قحط پڑا ہوا ہے -

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (٦٣) قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (٦٤) وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا وَ نَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ (٦٥) قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ

(٦٦) (١٢ : ٦٣ تا ٦٦) "جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا ابا جان' آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے' لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں - اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ باپ نے جواب دیا "کیا میں اس معاملے میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر جیسا انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے - یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے "ابا جان اور ہمیں کیا چاہئے دیکھئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں دے دیا گیا ہے' بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے' اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھی لائیں گے - اتنے غلے کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا"۔ ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک تم اللہ کے نام سے مجھے کوئی پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور لے کر آؤ گے الا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لئے جاؤ"۔ جب انہوں نے اس کو اپنے پیمان دے دیئے تو اس نے کہا "دیکھو ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے"۔ پھر اس نے کہا "میرے بچو' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا - مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے"۔

اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آ سکی۔ہاں یعقوب کے دل میں جو ایک کھٹک تھی 'اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کی' بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب عالم تھا' مگر اکثر لوگ معاملے کی حقیقت کو جانتے نہیں"۔

اس کے بعد اس قصے میں ان کا کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ دوسرے صدمے سے دوچار ہوتے ہیں۔یہ خدا رسیدہ نبی ہیں اور بے پناہ محبت کرنے والے ہیں۔یہ اس وقت جب اللہ نے ایک خاص تدبیر کے ذریعے یوسف کے بھائی کو مصر میں رکوا دیا۔ حضرت یعقوب کے بیٹوں میں ایک صاحب جو معتدل شخصیت کے مالک تھے وہ بھی مصر ہی میں رک جاتے ہیں' ان کی شخصیت کا یہ اعتدال اس پورے قصے میں نمایاں رہا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ میں کن آنکھوں سے باپ کا سامنا کروں یا تو وہ اجازت دیں یا پھر اللہ کوئی اور صورت نکال دے۔

فَلَمَّا اسْتَيْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ (۸۰) اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَ مَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ (۸۱) وَ سْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَ الْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۸۲) قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۸۳) وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (۸۴) قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ (۸۵) قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۶) يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۷) (۱۲: ۸۰ - ۸۷)

"جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر مشورہ کرنے لگے ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا "تم جانتے نہیں کہ تمہارے والد تم سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لے چکے ہیں اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو زیادتی تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے۔اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت

نہ دے دیں یا پھر اللہ ہی میرے حق میں فیصلہ فرما دے کہ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم جاکر اپنے والد سے کہو کہ "ابا جان' آپ کے صاحبزادے نے تو چوری کی ہے' ہم نے اسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو کچھ ہمیں معلوم ہے بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے۔ آپ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجئے جہاں ہم تھے۔ اس قافلے سے دریافت کر لیجئے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں"--- باپ نے یہ داستان سن کر کہا "دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا' اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید کہ اللہ ان سب کو مجھ سے ملا دے' وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں"۔ پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "ہائے یوسف" وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔ بیٹوں نے کہا "خدارا آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جا رہے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاکت میں ڈالیں گے"۔ اس نے کہا "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا' اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچو' جاکر یوسف اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔

یہ ضعیف بوڑھا' اس قصے کے آخری منظر میں بھی نہایت ہی واقعیت پسند ہے۔ اس طویل غم نے اسے توڑ پھوڑ دیا ہے۔ اب وہ دور سے یوسف کی قمیص کو سونگھ لیتا ہے' وہ اپنے بیٹوں کی ملامت کا بھی مقابلہ کرتا ہے لیکن اسے جو امید ہے وہ شک نہیں کرتا کہ وہ پوری نہ ہوگی۔ اسے اپنے رب پر پورا پورا بھروسہ ہے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ (۹۴)
قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (۹۵) فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ
فَارْتَدَّ بَصِيرًا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۹۶) قَالُوا يَا أَبَانَا
اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ (۹۷) قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ
الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۹۸) (۱۲: ۹۴ - ۹۸) "جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں' تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں"۔ گھر کے لوگ بولے "خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں"--- پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کی قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دی اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا "میں تم سے کہتا نہ تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔ سب بول اٹھے "ابا جان آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کریں واقعی ہم خطاکار تھے"۔ اس نے کہا: "میں اپنے رب سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا' وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔

یہ ہے وہ شخصیت جس کے خدوخال یکساں ہیں' جس کا شعور حقیقت پسندانہ ہے' وہ ہر حالت اور ہر صورت میں

ربانی شعور رکھتے ہیں ـ ان کے اندر کوئی ملمع کاری نہیں ہے ' ان کی سیرت میں کوئی جھول نہیں ہے اور ان کے معیار اخلاق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے ـ

---ooo---

اس قصے کے کرداروں میں جو حقیقت پسندی ' صداقت ' پاکیزگی ' صفائی ہے وہ صرف اس قصے کے کرداروں تک ہی محدود نہیں ہے ـ آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں اشخاص کی ایک بڑی تعداد کا ذکر اس قصے میں لایا گیا ہے ' بلکہ اس قصے کے واقعات ' ان کا طرز ادا ' ان کے زمان و مکان اور ظروف و احوال بھی بالکل نیچرل ہیں اور حسن و خوبی سے بھی مالا مال ہیں ' جس معاشرے اور سوسائٹی میں یہ واقعات ہو رہے ہیں ' وہ بھی نہایت ہی قدرتی اور بے ساختہ ہے ـ اس قصے کی ہر حرکت ہر لفظ اور ہر سوچ اپنے قدرتی وقت اور انداز پر آتی ہے اور ایسی شکل و صورت میں آتی ہے جس کی انسان توقع کرتا ہے ـ اور اس وقت آتی ہے جب اس کے لیے اسٹیج تیار ہوتا ہے ـ ہر حرکت ' ہر بات اور ہر شخصیت ضرورت کے مطابق نمایاں کی گئی ہے ـ اور ضرورت کے مطابق اسے پس منظر میں رکھا گیا ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کرداروں کے سلسلے میں تفصیل سے بحث کر آئے ہیں ـ

اس قصے میں جنسی لمحات بھی آتے ہیں لیکن وہ اس رنگ میں ہیں جس قدر پاکیزہ رنگ میں انسان کے ساتھ مناسب ہیں اور قدرتی ہیں ـ کسی قدرتی اور طبیعی انداز میں نہ کمی کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں بے جا مبالغہ ہے ـ ہر بات ' ہر حرکت اور ہر لفظ نہایت ہی متناسب قدرتی اور مکمل ہے ـ لیکن جنس کو اس قصے پر حاوی نہیں کیا گیا کہ گویا انسانی اقدار میں ایک جنس اور سیکس ہی ہے اور تمام باتوں ' تمام مظاہر اور تمام افعال کو صرف اس محور کے گرد گھماتا ہے جیسا کہ آج کی جاہلیت جدیدہ نے قصص کو اس انداز میں پیش کیا ہے اور وہ اس کی داعی ہے اور اسے واقعیت کہتی ہے ـ

حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت انسان کو بحیثیت انسان مسخ کر دیتی ہے ' اسے حیوان بنا دیتی ہے اور یہ کام وہ فنی سچائی اور واقعیت اور حقیقت کے عنوان سے کرتی ہے ـ جاہلیت جب جنسی لمحات کا اظہار کرتی ہے ' وہ ان لمحات کو اس قدر طول دیتی چلی جاتی ہے کہ زمان و مکان اور حرکت میں اسے جنسی لمحات و حرکات ہی نظر آتے ہیں ـ چنانچہ انسانی زندگی کو وہ ایک گندا تالاب بنا دیتی ہے جس کی سطح کو وہ خوب مزین کرتی ہے ـ سطح پر پھول تیر رہے ہوتے ہیں لیکن سطح سے نیچے گند اگڑ ہی ہوتا ہے ـ

جاہلیت کیا فی الواقعہ اس کام کو واقعیت سمجھ کر کرتی ہے ؟ کیا وہ فی الواقعہ ایک حقیقی تصویر کھینچنا چاہتی ہے ؟ نہیں ' ہرگز نہیں ' نہیں یہ صیہونیوں کے پروٹوکولز کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے ـ بین الاقوامی صیہونیت کی اسکیم یہ ہے کہ تمام انسانوں کو ننگا کر کے ' انسانی اقدار سے محروم کر کے دنیا کو یہ بتایا جائے کہ اعلیٰ اقدار کے حامل صرف یہودی ہیں اور وہی سپر انسان ہیں ـ اس اسکیم کے مطابق یہودیت یہ چاہتی ہے کہ تمام انسانوں کو جنس کے اس گندے تالاب میں گرا دے ـ انسانوں کی تمام بلند اقدار جنس کے اندر محدود ہو جائیں ' ان کی پوری قوت جنسی لذتیت کی نذر ہو ' کیونکہ انسانوں کو تباہ کرنے کا یہ تیر بہدف نسخہ ہے تاکہ تمام انسان عظیم صیہونی مملکت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں ـ انسانی اخلاق کو تو ان لوگوں نے اسی طرح تباہ کیا اور انسانی افکار و عقائد کو انہوں نے سیکولر ازم اور مادیت کے اندر محدود کر دیا ـ یہاں تک کہ انسان کو سائنسی طریقے سے باور کرایا کہ وہ دراصل حیوان ہے ـ اس کے نتیجے میں اسے ڈارونزم ' فرائڈ ازم ' مارکسزم ' سوشلزم اور دوسرے لادینی نظریات دیئے جو سب کے سب بوگس تھے اور ان کو ایک اسکیم کے تحت ایجاد کیا گیا اور رائج کیا گیا تاکہ

انسان محض حیوان بن جائے اور اسے چارے اور سیکس کے سوا کسی اور قدر کی کوئی پروا نہ ہو۔

---○○○---

شخصیات اور واقعات کے بعد اس قصے میں کچھ تاریخی اشارات بھی ہیں کہ یہ کس دور کا واقعہ ہے اور اس قصے میں جن کثیر التعداد کرداروں کو پیش کیا گیا ہے اور ان کی جن خصوصیات کو اس میں قلم بند کیا گیا ہے اور جو عمومی خدوخال بیان کیے گئے ان کا تعلق کس دور سے ہے۔ چنانچہ اس قصے کے بعض لمحات قابل غور ہیں اور بعض ایکشن اور اقوال اس طرف راہنمائی کرتے ہیں اور ان سے واضح طور پر اس زمانے کا تعین ہو جاتا ہے۔

○ جس دور کے ساتھ اس قصے کا تعلق ہے اس دور میں مصر پر خاندان فراعنہ کی حکمرانی نہ تھی۔ یہ "گڈریوں" کے خاندان کا دور تھا، جس میں حضرت ابراہیم ؑ، حضرت اسحاق ؑ اور حضرت یعقوب ؑ مصر کے پڑوس کنعان میں تھے۔ اس دور میں مصر کے باشندوں میں دین اسلام کے بارے میں قدرے معلومات تھیں۔ اس لیے کہ اس دور کے بادشاہوں کے لیے قرآن نے "ملک" کا لفظ استعمال کیا ہے اور بعد کے ادوار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بادشاہ کے لئے فرعون کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کس دور میں گزرے تھے۔ یہ "گڈریوں" کا دور تھا اور یہ لوگ تیرھویں اور سترھویں خاندان حکمرانان مصر کے درمیانی زمانے میں گزرے ہیں۔ مصری اس خاندان کو ہیکوس (Heksus) کہتے ہیں، اور یہ لقب ان کو اس لیے دیا گیا ہے کہ مصری اس خاندان سے بہت نفرت کرتے تھے۔ ہیکس کا مفہوم قدیم مصری زبان میں خنزیر ہے یا خنزیر کے چرانے والے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ خاندان ڈیڑھ سو سال تک مصر پر حکمران رہا ہے۔

○ اسی دور میں حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ رہا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دین اسلام کے بنیادی نظریہ یعنی عقیدہ توحید کی طرف دعوت زمانہ قید خانہ ہی سے شروع کر دی تھی۔ قیدیوں کے سامنے تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ یہ میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ حضرت ابراہیم ؑ، حضرت اسحاق ؑ اور حضرت یعقوب ؑ کا۔ جس طرح قرآن کریم نے آپ کی جیل کی تقریر نقل فرمائی ہے اس میں انہوں نے عقیدہ توحید کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ (۳۷) وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَاءِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَن نُّشْرِكَ بِاللَّهِ مِن شَيْءٍ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ (۳۸) يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹) مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۴۰)

(۱۲: ۳۷ - ۴۰) "واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرائیں۔

در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زندان کے ساتھیو بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کی یہ ایک جامع تصویر ہے، اور تمام رسولوں نے اسلام کی یہی تصویر پیش کی ہے۔ اس میں ایک طرف بنیادی عقائد ہیں، یعنی اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، اور اللہ کو وحدہ لاشریک الٰہ سمجھنا اور اللہ کی معرفت اس کی تمام صفات کے ذریعے حاصل کرنا کہ وہ واحد اور قہار ہے۔ اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی نہ حاکم ہے اور نہ مقتدر اعلیٰ ہے۔ اس لیے اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ماننے والا تمام ان ارباب کی نفی کرے جو اللہ کے سوا عوام الناس کو خود اپنا غلام بناتے ہیں اور صرف حکومت الٰہیہ کا اعلان کر دیا جائے کیونکہ اللہ نے حکم ہی یہ دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت اور غلامی نہ کی جائے اور بادشاہت، حکمرانی اور ربوبیت صرف اللہ کی ہو گی، حضرت یوسف کے ہاں عبادت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ حکومت اور اقتدار اعلیٰ اور بندگی اور اطاعت اور قانون اسی کا ہو۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (۱۲: ۴۰) "فرماں روائی صرف اللہ کی ہے"۔

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (۱۲: ۴۰) "اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"۔

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۱۲: ۴۰) "یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے"۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلام کا نہایت ہی جامع اور مانع تعارف کرایا اور خصوصاً اس کے نظریاتی اور سیاسی پہلو کو اجاگر کیا"۔

اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں پورے مصر کا اقتدار آگیا تو انہوں نے دعوت اسلامی کو اسی طرح جامع شکل میں پھیلایا ہو گا۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ان کے ذریعے مصر میں مکمل اسلامی نظام پھیل کر نافذ ہو گیا ہو گا۔ نہ صرف یہ کہ وہ مصر کے حکمران بن گئے تھے بلکہ مصر کے تمام خزانے ان کے ہاتھوں میں دے دیئے گئے تھے اور انہوں نے خشک سالی کے لیے جو ذخائر جمع کر رکھے تھے اور بعد میں وہ خود انہیں تقسیم کر رہے تھے، ان کے پاس دور دور سے لوگ غلہ خریدنے آتے تھے تو ان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا ہو گا اور اس طرح حقیقی دین اسلام دور دور تک پھیل چکا ہو گا۔ جس طرح خود ان کے بھائی کنعان جیسے دور دراز علاقوں سے غلے کے لیے آگئے تھے۔ اس قصے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خشک سالی کس قدر وسیع تھی۔

نیز اس قصے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے دینی نظریات گذریوں کے دور میں مصر تک پہنچ چکے تھے اور ان

کے مشرکانہ نظریات میں کافی اصلاح ہو چکی تھی ۔ اس قصے میں مصر کی اعلیٰ طبقات کی خواتین کے اجتماع کے موقعہ پر جب انہوں نے حضرت یوسف ؑ کو دیکھا تو بے ساختہ کہا

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (۱۲ : ۳۱) "جب انہوں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئیں اور کہا' ماشاء اللہ یہ بشر نہیں یہ تو ایک معزز فرشتہ ہے ۔ اور پھر عزیز مصر اپنی بیوی سے کہتا ہے ۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ (۱۲ : ۲۹) "یوسف اس سے صرف نظر کرو' اور تو (بیوی سے) اپنے گناہ سے استغفار کر' بے شک تو ہی غلط کاروں سے تھی" ۔

نیز اس پر امراۃ العزیز کا یہ کلام بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ بھی حضرت یوسف ؑ کے عقائد کو تسلیم کر کے مومن ہو گئی تھی اور اس کی اصلاح ہو گئی تھی ۔

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۵۱) ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (۵۲) وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۳) (۱۲ : ۵۱ — ۵۳) "عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے' وہ میں ہی تھی جس نے اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے ۔ اس سے میری غرض یہ تھی کہ وہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا ۔ میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ۔ نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے' الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب غفور و رحیم ہے" ۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ عقیدۂ توحید حضرت یوسف ؑ کے برسر اقتدار آنے سے قبل ہی مصر میں پھیل گیا تھا تو ظاہر ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے برسراقتدار آنے کے بعد تو نہایت ہی وسیع پیمانے پر یہ عقیدہ پھیل گیا ہو گا اور "خاندان گڈریاں" کے بعد جب اٹھارویں خاندان کی شکل میں فراعنہ مصر نے دوبارہ حکومت مصر پر قبضہ کر لیا تو اس دور میں ایک تو بنی اسرائیل یہاں پھیل گئے تھے اور دوسرے یہ کہ عقیدۂ توحید کو بھی عروج نصیب تھا پھر فراعنہ نے دوبارہ یہاں بت پرستی کو رائج کیا ۔

یہاں ایک بات سمجھ آتی ہے اور وہ بھی بہت معقول کہ اقتدار پر قبضے کے بعد فراعنہ نے بنی اسرائیل پر ظلم و ستم

شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کی نسل کشی پر اتر آئے۔ اس کی سیاسی اور ثقافتی وجوہات یہ تھیں۔ ایک یہ کہ وہ باہر سے آئے اور مصر میں اقتدار پر قابض ہو گئے اور دوسرے یہ کہ انہوں نے مصر میں ثقافتی انقلاب بھی برپا کر دیا اور تمام لوگ عقیدۂ توحید قبول کر کے اسلام میں داخل ہو گئے' جب مصریوں نے گڈریوں کو شکست دی تو ساتھ ساتھ ان کے حامیوں بنی اسرائیل کو بھی خوب دبا کے رکھا۔ اگرچہ ثقافتی اور نظریاتی اختلاف اس کا اصلی اور حقیقی سبب تھا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات اور عقیدۂ توحید کا اصلی اثر یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی فرعون نہ ہو اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کا ہو۔ چنانچہ عقیدۂ توحید کے ماننے والے تمام فرعونوں اور تمام طاغوتوں کے دشمن ہوتے ہیں۔

جس نکتے کو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں۔ سورت غافر میں "رجل مومن" کی تقریر بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ یہ تقریر اس شخص نے فرعون موسیٰ کے دربار میں کی تھی اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دفاع میں تھی۔ اس وقت فرعون کے دربار میں اس کے تمام حواری موجود تھے اور وہ یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ حضرت موسیٰ کو قتل کر دیں اور وہ قتل محض اس لیے کر رہے تھے کہ حضرت موسیٰ عقیدۂ توحید کی تبلیغ کر رہے تھے جس کے نتیجے میں فرعون کی حکومت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (۲۶) وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ (۲۷) وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۲۸) يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۲۹) وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ (۳۰) مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۳۱) وَيٰقَوْمِ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ (۳۲) يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۳) وَلَقَدْ جَآءَكُمْ

يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ (۳۴) الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۳۵) (۴۰ : ۲۸ تا ۳۵)) ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا "چھوڑو مجھے' میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا' یا ملک میں فساد برپا کرے گا"۔۔۔ موسیٰ نے کہا "میں نے تو ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے"۔ اس موقع پر آل فرعون میں سے ایک مومن شخص' جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا' بول اٹھا "کیا تم ایک شخص کو اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینات لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور آ ہی جائیں گے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو۔ اے میری قوم کے لوگو' آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو' لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا"۔۔۔ فرعون نے کہا میں تو تم کو وہی رائے دے رہا ہوں' جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اس راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے"۔۔۔ اور جو شخص ایمان لایا تھا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آ جائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آ چکا ہے' جیسا دن قوم نوح ؑ اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اے قوم' مجھے ڈر ہے کہ تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آ جائے۔ جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بینات لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب اس کے بعد اللہ کوئی رسول نہ بھیجے گا"۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر اور جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے"۔

غرض اصل جھگڑا تھا عقیدۂ توحید (بایں معنی کہ اللہ واحد ہے' وہی رب اور حاکم ہے' اس کی بندگی فرض ہے) اور فرعونیت کے درمیان جو بت پرستی پر مبنی تھی اور جس میں انسان' انسان پر حکمران تھا۔

"اخناتون" نے مصر میں جس بگڑی ہوئی توحید کو متعارف کرایا وہ بھی شاید حضرت یوسف ؑ کی پھیلائی ہوئی صحیح توحید کے آثار میں سے تھی جیسا کہ پہلے ہم کہہ آئے ہیں خصوصاً جبکہ تاریخ کی یہ روایت درست ہو کہ اخناتون کی والدہ

ایشیائی تھی ' وہ فرعونی نہ تھی ۔

اب آیئے اس طرف کہ اس دور کے لوگوں کا نفسیاتی اور معاشرتی مزاج کیسا تھا؟ تو اس دور کے کرداروں ' ان کے علاقوں ' مصر اور بیرون مصر اس ۔ پورے دور میں لوگ پیشین گوئیوں اور خوابوں کے بارے میں بہت ہی دلچسپی لیتے تھے ۔ یہ ذہنیت کسی علاقے اور قوم تک محدود نہ تھی ۔ خود حضرت یوسف ؑ کی خواب اور اس کی تعبیر' جیل کے دو ساتھیوں کے خوابیں اور حضرت یوسف کی جانب سے تعبیریں ' شاہ مصر کی خوابیں اور ان کی تعبیر غرض جو خواب دیکھتے تھے جو تعبیر کرتے تھے ۔ اہل زمانہ ان کے بارے میں بہت ہی دلچسپی لیتے تھے ۔

میں یہ بات اجمالاً کہہ سکتا ہوں اس قصے میں کئی فنی عناصر بھی موجود ہیں ' مثلاً اس میں انسانی عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں ۔ تاثرات اور حرکات موجود ہیں ' اس انسانی مواد اور تاثرات و حرکات کو نہایت ہی واضح طور پر ادا کیا گیا ہے ۔ قرآن مجید کی مخصوص طرز ادا میں جو نہایت موثر ہوتی ہے اور اپنے مخصوص زیر وبم کے ساتھ ' ہمہ جہت اور ہمہ پہلو ہوتی ہے ۔

اس قصہ میں باپ کی محبت ' مختلف درجوں اور مختلف رنگوں میں ہمارے سامنے آتی ہے ' جس کے خطوط واضح ہیں ۔ ایک رنگ یوسف اور اس کے بھائی کی محبت کا ہے اور دوسرا رنگ دوسرے بھائیوں کا ہے ۔ قصہ کے آغاز سے لے کر انتہا تک یوسف کے بارے میں جو حوادث سامنے آتے ہیں ان کے بارے میں ان کا ردعمل واضح طور پر سامنے آتا ہے ۔

پھر اس قصے میں بھائیوں کے درمیان غیرت ' مسابقت اور حسد کے جذبات کا وجود بھی ایک رنگ لیے ہوئے ہے ۔ خصوصاً جبکہ بھائیوں کی مائیں مختلف ہوں --- جبکہ باپ کی محبت کی مختلف شکلیں بھی ہمارے سامنے ہیں ۔

اس قصے میں غیرت ' حسد اور باہم منافست کی وجہ سے مختلف ردعمل سامنے آتے ہیں ۔ بعض کا ردعمل تو یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے ' بعض کا ردعمل یہ ہے کہ اسے اندھے کنویں میں ڈال دیا جائے شاید کوئی اٹھانے والا اٹھالے جائے ' یہ ردعمل پہلے سے مختلف ہے ۔

اس قصے میں مکاریاں بھی سامنے آتی ہیں ' یوسف کے بھائیوں کی مکاری ' زلیخا کی مکاری ' یوسف کے ساتھ ' خاوند کے ساتھ اور مصر کی اعلیٰ طبقے کی عورتوں کے ساتھ ۔

اس قصے میں سیکس کے لمحات بھی موجود ہیں ' ان کے سامنے ردعمل آمادگی کا ردعمل اور انکار کا ردعمل اور اس میں کسی قدر خوف اور نفرت کا کردار ۔

اس قصے میں ندامتیں اور شرمندگیاں بھی موجود ہیں ' معافیاں بھی موجود ہیں ' خوشیاں بھی موجود ہیں ' جدائیاں بھی اور ملاپ بھی ۔

یہ قصہ بہرحال ایک جاہلی معاشرے کے خدوخال بتاتا ہے ۔ اس معاشرے کے اعلیٰ طبقات کے حالات ' گھر میں ' قید خانے میں ' بازار میں ' مصری معاشرے کے اندر اور عبرانی معاشرے کے اندر جس میں پیش گوئیوں اور تعبیرات خواب کا بہت زور ہے ۔

قصے کا آغاز ایک خواب سے ہوتا ہے جو حضرت یوسف ؑ اپنے باپ کے سامنے بیان کرتے ہیں ' باپ یہ تعبیر بتاتے ہیں کہ مستقبل میں تمہیں بہت ہی اونچا مرتبہ ملنے والا ہے ۔ باپ اسی وقت ان کو نصیحت کر دیتے ہیں کہ یہ خواب وہ ہرگز اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کریں ورنہ وہ تمہارے خلاف کینہ اور حسد کی وجہ سے سازشیں کریں گے ۔ اب اس قصے

کی دوسری کڑیاں سامنے آتی ہیں گویا یہ تمام کڑیاں خواب کی تعبیر ہیں اور حضرت یعقوب ؑ کی توقعات کے عین مطابق ہیں اور قصے کے آخر میں یہی منظر آتا ہے جو اس خواب کی تعبیر سے متعلق ہے۔ اس قصے کو قرآن کریم نے اس انداز میں نہیں لیا جس طرح عہد قدیم لکھنے والوں نے اسے بیان کیا ہے۔ قرآن کریم نے اسے نہایت ہی فنی انداز میں لیا ہے۔ اور اختتام پر وہ مکمل دینی رنگ ہے نہایت ہی فنی انداز میں۔

قصے کے اندر وہ فنی خوبی بھی موجود ہے جسے جدید زبان میں عقدہ یا سسپنس کہتے ہیں۔ اور یہ عقدہ آہستہ آہستہ قصے میں حل ہوتا جاتا ہے۔ جوں جوں قصے کے واقعات آگے بڑھتے ہیں لیکن واقعات قصہ نہایت ہی نیچرل انداز میں آگے بڑھتے ہیں، انداز بیان میں کوئی تصنع نہیں ہے۔

پھر اس قصے کو مختلف کڑیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر کڑی کے اپنے مشاہدات و مناظر ہیں۔ دو مناظر کے درمیان بعض اوقات غیر ضروری کڑیوں کو ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ پڑھنے والے کا تخیل اس خلا کو خود پر کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض وہ ایکشن جو چھوڑ دیئے گئے یا بعض اقوال جو ترک کر دیئے گئے پڑھنے والے کا تخیل خود پڑھتا ہے۔ اس طرح وفور شوق کے ساتھ ساتھ قاری خوب لطف اٹھاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں قصہ یوسف پر اس قدر فنی تبصرہ کافی ہے۔ یہ قصہ دراصل اسلام کے ادبی منہاج ادا کی ایک بہترین مثال ہے۔ یہ قصہ اس شعبے میں انسان کی کوشش کے لیے اور ادب اسلامی پیش کرنے کے لیے ممکنہ راہیں اور طریق کار بھی متعین کرتا ہے تاکہ ہم فنی اور ادبی موضوعات پر مکمل اظہار مطلب بھی کر سکیں اور اس کے اندر واقعیت، صداقت اور صحت مند مواد بھی ہو، اور اسلامی ادب کے یہ فن پارے، اس گندگی، فحاشی اور پستیوں سے بھی پاک ہوں، جو دور جدید کے فن کا لازمہ بن گئے ہیں۔

---ooo---

اب صرف ایک پہلو رہ جاتا ہے کہ اس قصے کا مقصد اور اس میں سبق کیا ہے؟ اور اسلامی تحریک کو اس مرحلے پر یہ قصہ سنا کر کیا سبق دیا گیا ہے؟ اور یہ کہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ نیز وقتی تقاضوں کے علاوہ اس قصے کی دائمی قدر و قیمت کیا ہے؟ نیز وہ حقائق کیا ہیں جو اس قصے میں، اس پوری سورت میں، اور خصوصاً اس سورت کے آخری تبصروں میں۔ مناسب ہے کہ یہاں اس سورت کے اس دیباچے میں ہم مختصر اشارات پر اکتفاء کریں۔

○ اس سورت کے نزول کے وقت مکہ میں تحریک اسلامی نہایت ہی مشکل دور سے گزر رہی تھی۔ اس کی طرف ہم نے اس سے قبل اشارہ بھی کیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اہل ایمان کی قلیل سی تعداد سخت دشواریوں کا سامنا کر رہی تھی۔ چنانچہ بطور تسلی حضرت یوسف کا قصہ پیش کیا گیا کہ وہ کن کن مشکلات سے گزر کر منزل مقصود تک پہنچے اور اس طرح ان کو اس زمین پر اقتدار نصیب ہوا۔

اس وقت تحریک اسلامی کو، اپنی مشکلات کی وجہ سے ایسے حالات اور تاریخی واقعات بتانے کی بے حد ضرورت تھی۔ اور یہ قصہ دعوت اسلامی کے مقاصد و ضروریات کے لیے بہت ہی مفید تھا کیونکہ یہ تحریک پیدا کرتا ہے، اور جماعت مسلمہ کو ایک مثبت سوچ عطا کرتا ہے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ یہی ہے کہ منصب اقتدار تک پہنچ کر دعوت پھیلائی جائے۔

○ اس قصے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اسلام کی ایک واضح، مکمل، گہری اور جامع دعوت پیش کی ہے۔

حضرت یوسف ؑ نے جس طرح دعوت کو پیش کیا ہے اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدہ تمام انبیاء کے ہاں ایک ہی رہا ہے۔ تمام رسالتوں میں اس عقیدے کے بنیادی عناصر موجود رہے ہیں یعنی توحید کامل ' اللہ کی حاکمیت ' اسلامی نظام زندگی کا نفاذ ' اور واضح طور پر آخرت کی جواب دہی کا احساس یقین اور اقرار۔ حضرت یوسف ؑ کی اس تقریر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آج کل کے نام نہاد ماہرین ادیان ' تقابل ادیان نے جو خود ساختہ نظریات پیش کیے اور کہتے ہیں کہ انسان عقیدہ توحید اور عقیدۂ آخرت تک بہت بعد کے زمانوں میں پہنچا۔ اس سے قبل انسان دو یا دو سے زیادہ خداؤں کا قائل تھا۔ اور عقیدۂ آخرت اس نے اس وقت اپنایا جب وہ علمی اعتبار سے کافی ترقی کر گیا۔ یہ سوچ ان لوگوں کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ دین بھی انسانوں ہی کی ایجاد ہے جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

یہ قصہ اور یہ سورت واضح کر دیتی ہے کہ عقیدۂ توحید تمام انبیاء کے ہاں ایک ہی رہا ہے۔ یہ صرف اللہ جل شانہ کی ذات کی توحید نہیں ہے بلکہ ربوبیت اور حاکمیت کی توحید یہ ہے اور حاکمیت کی توحید بھی ہے کہ نظام حکومت بھی اللہ کا ہو گا۔ اور یہ نظریہ اس بات سے نکلتا ہے کہ اللہ نے لوگوں سے کہا کہ وہ صرف اس کی عبادت اور بندگی کریں۔ اس طرح اس سورت میں عبادت کا مخصوص مفہوم بتایا گیا کہ اس کا مفہوم مکمل بندگی اور غلامی ہے معنی اللہ کی حکومت اور بندوں کی جانب سے اس کی مکمل اطاعت ' یہ ہے معنی عبادت کا۔ اور یہی دین قیم ہے یعنی درست اور صحیح دین۔ اگر کسی دین میں اللہ کی مکمل اطاعت نہیں ہے تو وہ دین ہی نہیں ہے۔ جب تک اس میں اللہ کا نظام حکومت شامل نہ ہو۔ اگر لوگ اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں اللہ کی اطاعت اور بندگی سے آزاد ہیں تو وہ گویا اللہ کی عبادت سے خارج ہو گئے۔ لہٰذا ایک اللہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ رب ایک ہے اور رب ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حاکم ایک ہے۔ یہی مفہوم ہے اللہ وحدہ کی عبادت اور بندگی کا۔ عبادت یا بندگی۔ ربوبیت حکومت الٰہیہ ' سب ہی مترادف الفاظ ہیں۔ اگر لوگ تمام امور میں اللہ کے سامنے جھکتے اور سر تسلیم خم کرتے ہیں تو وہ مسلمان ہیں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ غیر مسلم ہیں۔

دین اور عبادت کا یہ مفہوم طے کر دیتا ہے کہ کسی بھی دور میں موجود کوئی سوسائٹی مسلمان ہے یا غیر مسلم ہے۔ وہ دین قیم کی پیروکار ہے یا نہیں ہے۔ یہ خصوصیت دین میں لازماً ملحوظ ہے۔ پس جو غیر اللہ کا مطیع ہو گا اور اپنی زندگی کے معاملات غیر اللہ کے احکام کے مطابق چلائے گا وہ غیر مسلم ہو گا اور جو صرف اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے گا اور غیر اللہ کی اطاعت کا انکار کرے گا وہ مسلمان ہو گا اور دین میں داخل ہو گا۔ اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ محض ملمع سازی ہے اور یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو تاریخ کے کسی بھی دور میں بے دینی سے شکست کھا جاتے ہیں اور واقعات اور عملی صورت حال کے دھارے میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا دین واضح ہے اور اس سورت میں جو ایک آیت آ گئی ہے یہ اس دین کے مفہوم کے تعین کے لیے کافی ہے۔

○ اس قصے میں ایک خالص ایمان کی صورت اور اس کا ماڈل حضرت یوسف اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے ایمان کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

اس سے قبل ہم اس طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ حضرت یوسف اپنے خالص ایمان ' تمام آلودگیوں سے پاک ایمان ' نہایت ہی عاجزی اور انکساری اور خضوع و خشوع کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ

الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

(۱۲ : ۱۰۱) "اے میرے رب تو نے مجھے حکومت عطا کی اور باتوں کی تہہ تک پہنچنے کی تعلیم دی' زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے' تو ہی میرا ولی ہے' دنیا اور آخرت میں' مجھے ایک مسلمان کی طرح موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے"۔

لیکن خدا رسیدگی کے اس پہلو کا ذکر صرف ان کے آخری کلمات ہی میں نہیں جھلکتا بلکہ اس پورے قصے میں وہ ایک خدا رسیدہ پیغمبر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

مثلاً عزیز مصر کی عورت کی طرف سے ورغلانے اور نہایت ہی فتنہ انگیز حالات میں بھی خوف خدا ان کا لبادہ ہے۔ کہتے ہیں

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۲ : ۲۳) "خدا کی پناہ' میرے رب نے مجھے اچھی منزلت بخشی ہے۔ ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔

ایک دوسرے موقع پر جب وہ اپنے آپ کے بارے میں ڈرتے ہیں کہ ان سے کہیں کوئی کمزوری سرزد نہ ہو جائے تو وہ یوں اللہ کو پکارتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ

اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ (۱۲ : ۳۳) "اے میرے رب' قید منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ مجھ سے چاہتی ہیں اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے رفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔

جب وہ اپنے آپ کو بھائیوں سے متعارف کراتے ہیں تو اس وقت اترانے کی بجائے وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان پر اللہ کا بہت ہی بڑا فضل ہوا ہے۔ وہ شکر بجالاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کو یاد کرتے ہیں :

قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ یُوْسُفُ قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا اِنَّهٗ مَنْ

یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲ : ۹۰) "وہ بولے کیا تم یوسف ہو' اس نے کہا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا"۔

یہ ہیں وہ تمام طرز عمل جو مکہ میں تحریک اسلامی کے لیے نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ قیامت تک آنے والی تمام تحریکوں کے لیے سنگ میل ہیں۔ یہ تھے حضرت یوسف۔

اب ذرا حضرت یعقوب ؑ کی خدا رسیدگی کے چند پہلو دیکھیں ' وہ اپنے ہر موقف ہر مرحلے میں واضح طور پر اور نہایت ہی گہرائی کے ساتھ تعلق باللہ قائم رکھے ہوئے ہیں ۔ جوں جوں ان پر مصیبتیں آتی ہیں وہ مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں ۔ ان کے دل میں تعلق باللہ جوش میں آجاتا ہے ۔ وہ ہر مشکل میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور مکمل بھروسہ رکھتے ہیں ۔

آغاز قصہ میں جب حضرت یوسف ؑ ان کے سامنے خواب بیان کرتے ہیں تو جناب خدا کو یاد فرماتے ہیں اور اللہ کے انعامات کا شکر ادا کرتے ہیں ۔ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲ : ٦) "اور ایسا ہی ہو گا تیرا رب تجھے منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق علیہم السلام پر کر چکا ہے ' یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے "۔

اور یوسف ؑ کے بارے میں جب وہ پہلے صدمے سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ صرف اللہ سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں ۔ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۱۸) "یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا ۔ اچھا صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے "۔

لیکن دوسرے موقعہ پر جب ان کے بیٹے سب کے سب مصر کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو جس طرح ایک باپ اپنے جگر گوشوں کے لیے فکر مند ہوتا ہے وہ بھی فکر مند ہیں ۔ ان کو وصیت کرتے ہیں کہ شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہوں بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہوں ۔ لیکن ان کو پورا پورا یقین ہے کہ ان کی یہ تدابیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ نہیں کر سکتیں ۔ جو حکم ہر حال میں نافذ ہو کر رہتا ہے وہ اللہ ہی کا ہے ۔ یہ تو حضرت یعقوب ؑ کے دل کی خواہش تھی اور ان کی کوشش

وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَ مَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

(۱۲ : ٦٧) "اس نے کہا "میرے بچو ' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا ' مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا ' حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا ' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے "۔

اب وہ بہت ہی بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ بڑھاپے اور ضعیفی کے دور میں ان کو ایک دوسرے صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ لیکن وہ پھر بھی مایوس نہیں ہوتے اور ان کا دل ہر وقت رحمت خداوندی کا امیدوار ہے ۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا

اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۱۲ : ۸۳) "اس نے کہا" "دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا ہے' اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے ملا دے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں"۔

اب حضرت یعقوب کے آئینہ دل صافی میں ایک تصویر اور ایک روشنی اور چمک آتی ہے' جبکہ ان کے بیٹے انہیں ان کے حزن و ملال اور گریہ و زاری پر ملامت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غم نے تمہاری آنکھیں تاریک کر دی ہیں۔ تو وہ ان کے مقابلے میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں' کہ میرے آئینہ دل پر جو لکیریں ابھر رہی ہیں ان سے تم بے خبر و محروم ہو' ان کو نبوت کے علوم حاصل ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے حزن و ملال کو صرف بارگاہ رب العزت میں پیش کرتے ہیں اور ان کی امیدیں اللہ ہی سے وابستہ ہیں کیونکہ خود ان کے بیٹے بھی اس حزن کو بلاجواز سمجھتے ہیں۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ

(۸۴) قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ

(۸۵) قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ

(۸۶) يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا

يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۷) (۱۲ : ۸۴ – ۸۷) "پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "ہائے یوسف" وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔۔۔ بیٹوں نے کہا "خدارا! آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے"۔ اس نے کہا "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچو' جا کر یوسف اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو' اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔

انہوں نے ان کو یہ بات یاد دلا دی کہ رب تعالیٰ کی شان کیا ہے اور یہ کہ وہ اللہ کی حقیقت اپنے دل میں کس طرح واضح پاتے ہیں' وہ انہیں ملامت کرتے ہیں کہ یوسف کی خوشبو تمہیں کس طرح آرہی ہے۔ اور اللہ نے ان کی امید اور یقین کو سچ کر دکھایا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (۹۴)

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (۹۵) فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ

فَارْتَدَّ بَصِيرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٩٦) (١٢: ٩٤ تا ٩٦) "جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں"۔ گھر کے لوگ بولے "خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں"--- پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کی قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دی اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا "میں تم سے کہتا نہ تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔

اب اس بحث کے آخر میں ہم ان متنوع نتائج کی طرف آتے ہیں جو قرآن مجید نے آخری تبصرے کے طور پر یہاں نکالے ہیں۔

○ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ قریش جو قرآن کے وحی من اللہ ہونے کا انکار کرتے ہیں یہ بادی النظر میں غلط ہے کیونکہ حضرت یوسف ؑ کے قصے میں بیان کردہ تمام واقعات میں حضور موجود نہ تھے' نہ کسی ذریعہ علم سے یا عربوں سے آپ تک وہ پہنچے ہوئے تھے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ (١٢: ١٠٢) "اے محمد یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی"۔

اور یہ نتیجہ آغاز قصہ کے اس ریمارکس سے ہم آہنگ ہے جس میں یہ کہا گیا تھا

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (١٢: ٣) "اے پیغمبر ہم قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات و حقائق بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو تم ان چیزوں سے بے خبر تھے"۔ یوں آغاز و انجام ایک ہی تاثر دیتے ہیں۔ اور ایک ہی حقیقت کو ذہن نشین کرتے ہیں اور اہل قریش کی تکذیب اور انکار کے مقابلے میں ایک ہی دلیل فراہم کرتے ہیں۔

○ یہی وجہ ہے کہ اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ مکذبین کی باتوں سے اثر نہ لیں۔ کیونکہ یہ عناد میں پڑے ہوئے ہیں اور اپنی جہالت پر اصرار کر رہے ہیں اور اس کائنات میں باری تعالیٰ کے وجود پر جو دلائل بکھرے ہوئے ہیں ان کی طرف سے انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں حالانکہ کسی بھی فطرت سلیمہ کو راہ ہدایت پر آنے کے لیے یہ دلائل کافی و شافی ہیں' اگر یہ لوگ دلائل کائنات کے بارے میں قرآن کا بیان سنیں۔ ان لوگوں کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ اچانک ان کو عذاب الٰہی آئے گا جبکہ وہ غفلت ہی میں پڑے ہوں گے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (١٠٣) وَ مَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ

هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (١٠٤) وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (١٠٥) وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ (١٠٦) اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْتَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (١٠٧) (١٢: ١٠٣ - ١٠٧) "مگر تم خواہ کتنا ہی چاہو ان میں سے اکثر لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔ حالانکہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے ہو۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔ زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔ ان میں سے اکثر لوگ تو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا یہ مطمئن ہیں کہ اللہ کے عذاب کی کوئی بلا انہیں دبوچ نہ لے گی یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آجائے گی"۔

عظیم حقائق لیے ہوئے یہ نہایت ہی موثر ضربات ہیں جو ان لوگوں کے دلوں پر لگائی جارہی ہیں جو ایمان نہیں لاتے اور لاتے بھی ہیں تو اللہ کے ساتھ بے شمار دوسری مخلوقات کو شریک ٹھہراتے ہیں--- یہ ہے نہایت ہی گہری اور باریک تصویر ان لوگوں کی جن کے دلوں میں ایمان باللہ شرک سے ملوث ہوتا ہے کیونکہ وہ عقیدہ توحید کو اس کے فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں نہیں سمجھتے۔

○ اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنے نظریہ حیات کو نہایت ہی فیصلہ کن اور دو ٹوک انداز میں' نہایت ہی تحدید اور امتیاز کے ساتھ پیش کر دیں اور نہایت ہی موثر الفاظ میں :

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (١٢: ١٠٨) "تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دکھا رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں"۔

اب آخری جھلکی میں پورے قصص قرآن سے سبق لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس سورت میں بھی اور دوسری سورتوں کے قصص میں بھی۔ اے پیغمبر تمہارے اور تمہارے مٹھی بھر ساتھیوں کے لیے اس میں بہت بڑی نصیحت ہے۔ اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے اور اچھے انجام کی خوشخبری سنائی جاتی ہے۔ مشرکین اور اسلام کے دشمنوں کے لیے اس میں ڈراوا اور وعظ ہے۔ اس جھلکی میں بتایا جاتا ہے کہ وحی سچ ہے' رسول صادق ہے اور وحی علم کا مصدق ذریعہ ہے لیکن وحی اور اوہام کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ہوگا۔ محض پرانے قصوں کو حقائق سے علیحدہ کرنا ہوگا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا

أَفَلَا تَعْقِلُونَ (١٠٩) حَتَّى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ (١١٠) لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (١١١) (١٢: ١٠٩ – ١١١) "اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے --- یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا، تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ جب ایسا موقعہ آ جاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں، بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا --- اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی یہ تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے"۔

---ooo---

سورت یوسف کے اس دیباچے میں مناسب ہے کہ اس قصے کی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہاں ہم طرز ادا کے کمالات میں سے بعض نمونے اور بعض نکتے قارئین کے گوش گزار کر دیں۔ اس پوری سورت میں طرز ادا کے بعض نہایت ہی اہم نکتے اور لطائف پائے جاتے ہیں۔

○ متعین اور مخصوص انداز کلام، اس سورت میں بھی پایا جاتا ہے۔ متعین انداز گفتگو، سورت اور اس کے کرداروں کے خیالات اور حالات کے مطابق جگہ جگہ موجود ہے۔ مثلاً جگہ جگہ علم کی اہمیت کا ذکر ہے اور اس کے بالمقابل جہالت کی مذمت کی گئی ہے۔

وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (١٢: ٦) "اور ایسا ہی ہو گا، تیرا رب تجھے منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ

وَلَدًا وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۲۱) ”اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس زمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا اور اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں“۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲ : ۲۲) ”اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں“۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲ : ۳۴) ”اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے رفع کر دیں بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کی جانتا ہے“۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ (۱۲ : ۳۷) ”یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا، یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں“۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۴۰) ”فرماں روائی کا اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقہ زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں“۔

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ (۱۲ : ۴۴) ”انہوں نے کہا یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں، اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے“۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِىْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّىْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۴۶) ”یوسف اے سراپا راستی، مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور شاید کہ وہ جانیں“۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِىْ بِهٖ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ

النِّسْوَةِ الّٰتِی قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّی بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ (۱۲ : ۵۰) ''اور بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ' مگر جب شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا'' اپنے رب (آقا) کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے''۔

ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّی لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (۱۲ : ۵۲) ''اس سے میری غرض صرف یہ تھی کہ یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی' اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لاتا''۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ (۱۲ : ۵۵) ''یوسف نے کہا ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں''۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ (۱۲ : ۷۳) ''ان بھائیوں نے کہا خدا کی قسم تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے''۔

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۷۷) ''اس نے کہا' تم بہت ہی برے لوگ ہو جو الزام تم لگا رہے ہو' اللہ اس کی حقیقت خوب جانتا ہے''۔

فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا قَالَ كَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَیْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ (۱۲ : ۸۰) ''جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے والد تم سے خدا کے نام پر کیا عہد و پیمان لے چکے ہیں''۔

وَ مَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ (۱۲ : ۸۱) ''اور جو کچھ تمہیں معلوم ہوا ہے وہی ہم بیان کر رہے ہیں اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے''۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (۱۲ : ۸۳) ''کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے ملائے' وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں''۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْٓ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۸۶) ''اس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو''۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (۱۲ : ۸۹) ”تمہیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا' جبکہ تم نادان تھے“۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۹۶) ”تب اس نے کہا کہ ”میں تم سے کہتا نہ تھا میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو“۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱۲ : ۱۰۱) ”اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا“۔

یہ تمام آیات اور ان میں علم وجاہلت کا ذکر بتاتا ہے کہ اس کتاب کی کس قدر گہری تعلیم ہے اور اس کلام میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔

○ اس سورت میں ”الوہیت“ کے مفہوم کو بھی نہایت ہی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ الوہیت کا ایک مخصوص خاصہ ہے یعنی حکومت اور اقتدار اعلیٰ۔ اس کی وضاحت بھی یوسف علیہ السلام کی زبانی کی گئی ہے۔ اس معنی میں کہ اللہ کا حکم یہ مفہوم رکھتا ہے کہ لوگ بالارادہ اللہ کے نظام حکم اور شریعت کی اطاعت کریں۔ کبھی حاکمیت کا تکوینی مفہوم بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات تکوینی اعتبار بھی اللہ کے زیر نگیں ہے۔ چنانچہ اس سورت میں الحکم کے دونوں مفہوم بیان کیے گئے ہیں تکوینی اور شرعی۔ اور یہ بات بطور موضوع سخن بیان کی گئی ہے محض اتفاقاً دوران کلام نہیں آگئی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصری حکام کی ربوبیت کو اللہ کے خاصہ الوہیت کے خلاف سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں :

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹) مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ــــــ (۴۰) (۱۲ : ۳۹ ــ ۴۰) ”اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے“۔

اور حضرت یعقوب اس موقعہ پر جب وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ اس کائنات پر مشیت صرف اللہ ہی کی چلتی ہے' فرماتے ہیں :

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

۶۷) "پھر اس نے کہا" میرے بچو، مصر کے دار السلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا، حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو بھی بھروسہ کرنا ہے اسی پر کرے"۔

حکم کے مفہوم میں یہ جامعیت ہمیں بتاتی ہے کہ دین قیم اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا جب تک تمام ارادی امور میں اللہ کی اطاعت نہ کی جائے، جس طرح کہ تمام تکوینی امور میں ہم اللہ کے احکام کی اطاعت کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ دونوں امور اسلامی شریعت اور دین کے نظریات میں داخل ہیں، لہٰذا خدا کے حکم میں صرف تکوینی اطاعت ہی داخل نہیں ہے، بلکہ اس میں ارادی اطاعت بھی داخل ہے۔ اور دونوں اسلام کے بنیادی عقائد کا حصہ ہیں۔

یہاں اس سورت میں جب کائناتی تصرفات کے نتیجے میں واقعات سامنے آتے ہیں تو حضرت یوسفؑ اللہ کی صفت لطیف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اللہ معاملات کو نہایت ہی لطیف انداز سے چلاتا ہے۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۱۲:۱۰۰) "اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے، یوسف نے کہا "ابا جان یہ تعبیر ہے، میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا، اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے، بے شک وہ علیم و حکیم ہے"۔

اس سے پہلے ہم کہہ آئے ہیں کہ اس سورت میں قصے کے آغاز و اختتام میں اور پھر سورت کے آخری تبصرے میں پوری سورت کے مضامین میں ایک نہایت ہی لطیف ربط اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ تمام تعقیبات اور تبصرے اور سورت کے آغاز و اختتام مخصوص مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں اس سورت پر اس قدر تبصرہ کافی ہے۔ اب مناسب ہے کہ ہم اس کی آیات کی تشریح و تفسیر کی طرف آئیں۔

---ooo---

درس نمبر۱۰۶ ایک نظر میں

یہ سبق اس پوری سورت اور قصے کا مقدمہ ہے اور اس قصے کا پہلا حلقہ اور پہلی کڑی ہے ۔ یہ پورا سبق چھ مناظر پر مشتمل ہے' اور قصے کا آغاز حضرت یوسف کے خواب سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام برادران یوسف کی سازش کی ناکامی پر ہوتا ہے ۔ اور حضرت یوسف مصر چلے جاتے ہیں ۔ اس میں ہم نصوص پر مفصل تبصرہ دوران تشریح ہی کریں گے اور جو اجمالی تبصرہ ہم نے اس سورت کے دیباچے میں کر دیا ہے' اور وہ کافی ہے ۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے ۔

---○○○---

درس نمبر ۱۰۶ تشریح آیات

۱ ــــ تا ــــ ۲۰

سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ (۵۳) — اٰيَاتُهَا ۱۱۱ — رُكُوْعَاتُهَا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ
مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ا' ل' ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ہم نے اسے نازل کیا ہے' قرآن بنا کر' عربی زبان میں تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ سکو' اے محمد ہم اس قرآن کو تمہارے طرف وحی کر کے بہترین پیرائے میں واقعات و حقائق تم سے بیان کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو تم بالکل بے خبر تھے"۔

الر تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۱۲ : ۱) "ا' ل' ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے"۔ یہ حروف وہی ہیں جن کو لوگ پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں اور انہی حروف سے یہ آیات بنائی گئی ہیں جو بہت بلند ہیں اور انسانوں کے اندر یہ طاقت اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ایسا کلام مرتب کر سکیں۔ یہ آیات ایسی کتاب کی ہیں جس کا مقصد اور مدعا بالکل واضح ہے۔ یہ کتاب عربی ہے اور انہی حروف سے مولف ہے جو عربی کے حروف تہجی ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۲ : ۲) "ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو"۔ یعنی تم اس بات کو سمجھ سکو کہ متداول حروف تہجی اور عام

بولے جانے والے کلمات سے ایک ایسی کتاب مرتب کرنا جو معجز ہو کسی انسان کی استطاعت میں نہیں ہے۔ لہذا عقلاً یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن وحی الہی ہے 'گویا عقل کو دعوت دی جارہی ہے کہ وہ کتاب الہی کے اس اعجازی پہلو پر غور کرے اور اس سے نتائج اخذ کرے۔

چونکہ اس سورت کا بیشتر حصہ ایک قصے پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس کتاب کے موضوعات میں سے قصے کے موضوع کی صراحت کر دی گئی اور یہ فرمایا کہ یہ قصہ احسن القصص ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ (۱۲ : ۳)

"اے نبیؐ 'ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور قصص تم سے بیان کرتے ہیں"۔ یعنی قرآن کریم کی وحی تمہاری طرف کر کے ہم نے بہترین قصص تم پر نازل کیے اور یہ قصہ پھر تمام قصص سے احسن ہے اور یہ بھی وحی الہی ہے۔

وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۱۲ : ۳) "ورنہ اس سے پہلے تو (ان چیزوں سے) تم بالکل ہی بے خبر تھے"۔ کیونکہ آپ بھی اپنی پوری قوم کی طرح خواندہ نہ تھے 'نہ اس قسم کے موضوعات پر کلام کرتے تھے جن پر قرآن کریم نے بات کی ہے اور قرآن کریم کے موضوعات میں سے ایک موضوع اس قسم کے قصے بھی ہیں جو گہری دانشمندی پر مشتمل ہیں۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ۝ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝۵ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ

ع ۱ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝۶

۱۱

"یہ اس وقت کا ذکر ہے جب یوسف ؑ نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان 'میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔ جواب میں اس کے باپ نے کہا "بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے 'حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے اور ایسا ہی ہو گا 'تیرا رب تجھے منتخب کرے گا 'اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت

اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے' یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

اس خواب کے وقت حضرت یوسف ؑ ابھی بچے تھے یا مراہق۔ لیکن یہ خواب جو انہوں نے اپنے باپ کے سامنے بیان کیا یہ بچوں یا نوجوانوں کا خواب نہ تھا' بچے اور نوجوان بچوں جیسے خواب دیکھتے ہیں یا وہ ایسے خواب دیکھتے ہیں جن کے بارے میں وہ کوئی سوچ رکھتے ہوں' مثلاً یہ کہ سورج اور چاند ان کے ہاتھ میں ہوں اور یہ کہ اس نے انہیں پکڑ لیا ہو۔ لیکن یوسف ؑ نے دیکھا کہ شمس و قمر ایک عاقل شخص کی طرح ان کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور ستارے بھی ان کے سامنے سر جھکائے ہیں۔ یہ سجدۂ تعظیم تھا۔ قرآن کریم نہایت ہی وضاحت سے اس بات کو یوں نقل کرتا ہے۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ (۱۲ : ٤) "یہ اس وقت کا ذکر ہے جب یوسف ؑ نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان' میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔

اس آیت میں لفظ "رَاَیْتُ" کا اعادہ بطور تاکید ہے..... غرض حضرت یعقوب ؑ نے خواب کو سن کر معلوم کر لیا کہ یہ خواب بچوں کا خواب نہیں ہے اور حضرت یوسف ؑ کا مستقبل تابناک ہے۔ یہ تعبیر ان کے شعور نبوت نے ان کو بتا دی تھی لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہ کیا اور نہ قصے میں تعبیر کو بیان کیا گیا۔ یہاں تک اس خواب کے آثار بھی قصے کی دو کڑیوں کے پڑھنے کے بعد ہی قارئین پا سکتے ہیں۔ رہا پورا خواب تو وہ قارئین کو پورا قصہ پڑھ لینے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔ خواب چونکہ اہم تھا اس لیے انہوں نے یوسف علیہ السلام کو نصیحت کی کہ وہ اس خواب کا اظہار اپنے بھائیوں کے سامنے نہ کریں' ہو سکتا ہے کہ وہ سمجھ جائیں کہ اس بچے کا مستقبل تو غیر معمولی ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف ؑ ان کے چھوٹے بھائی تو تھے لیکن سگے نہ تھے۔ حضرت یعقوب ؑ کے شعور نبوت نے یہ خطرہ محسوس کر لیا کہ شیطان کہیں ان بھائیوں کے درمیان عداوت' حسد اور دشمنی پیدا نہ کر دے۔ اور وہ ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچا دیں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۱۲ : ۵) "جواب میں اس کے باپ نے کہا "بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے' حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے"۔

حضرت یعقوب ؑ نے خواب کو راز میں رکھنے کا سبب یہ بتایا کہ شیطان انسان کا دشمن ہے اور بعض لوگوں کے دلوں کو دوسروں کے خلاف حسد اور بغض سے بھر دیتا ہے اور وہ لوگوں کو آمادہ کرتا رہتا ہے کہ وہ غلطی کریں' شر کریں اور بڑی بڑی غلطیوں کو وہ لوگوں کے سامنے معمولی کر کے اور خوشنما کر کے پیش کرتا ہے۔

حضرت یعقوب' ابن حضرت اسحاق ابن حضرت ابراہیم علیہم السلام تھے نبوت کا خاندان تھا۔ انہوں نے خواب سنتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ یہ بیٹا ایک تابناک مستقبل کا مالک ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ تابناک مستقبل دین' اصلاح اور علم

و معرفت کے میدان میں ہو گا۔ پھر ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں اس شمع نے روشن رہنا تھا' لہٰذا وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ وارث نبوت یقیناً حضرت یوسف ؑ ہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان کو اس کی بشارت دے دی:

وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲ : ۶) "اور ایسا ہی ہو گا' تیرا رب تجھے منتخب کرے گا' اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے' یقیناً تیرا رب علیم و حکیم ہے"۔

حضرت یعقوب کی سوچ اس اہم خواب کے بارے میں یہ بتا رہی ہے کہ حضرت یوسف ؑ اللہ کے ہاں برگزیدہ بن گئے ہیں اور ان پر اسی طرح کا فضل و کرم ہو چکا ہے جس طرح ان کے باپ اور دادا پر ہو چکا ہے یعنی حضرت اسحاق اور ابراہیم پر۔ عربی میں باپ اور دادا دونوں کے لیے "اب" کا لفظ بولا جاتا ہے۔

البتہ آیت کا یہ حصہ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱۲ : ۶) "تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا"۔ تاویل کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بات کے انجام کا علم ہو جائے۔ احادیث سے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اللہ حضرت یوسف کو نبی کا منصب عطا کرے گا' اسے سچا شعور دے گا' دور رس بصیرت دے گا جس کی وجہ سے وہ ہر بات کے انجام اور نتائج کو پہلے سے معلوم کر لیں گے اور یہ صلاحیت الٰہی صلاحیت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ ان لوگوں کو دیتا ہے جن کو تیز فہم اور ادراک عطا ہوتا ہے۔

دوسرا مفہوم احادیث سے خوابیں بھی ہو سکتی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ حضرت یوسف کو خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں دور رس بصیرت دے گا۔ یہ دونوں مفہوم احادیث کے ہو سکتے ہیں اور دوسرا مفہوم تو عملاً قصے میں موجود ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۲ : ۶) "تمہارا رب علیم و حکیم ہے"۔ وہی علم اور حکمت کا سرچشمہ ہے جسے وہ یہ چیزیں چاہے دے سکتا ہے۔

خوابوں اور احلام کی حقیقت کیا ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں ان پر ایک نوٹ دے دیا جائے کیونکہ اس قصے کی اہم کڑیاں خوابوں پر مشتمل ہیں۔

ایک مسلمان کو یہ عقیدہ لازماً رکھنا پڑتا ہے کہ بعض خوابیں ایسی ہوتی ہیں جو مستقبل قریب یا بعید کے بارے میں صریح پیشن گوئی کرتی ہیں 'کیونکہ اس سورت میں حضرت یوسف کے خواب' حضرت یوسف ؑ کے دو ساتھیوں کے خواب اور شاہ مصر کے خواب اور ان کا ذکر صراحت سے اس بات کو لازم کرتے ہیں کہ خوابوں کے اندر پیشن گوئی آ جاتی ہے --- پھر ہم میں سے ہر شخص اپنی شخصی زندگی میں اس قسم کی خوابیں اور بشارتیں دیکھتا ہے اور وہ سچی ثابت ہوتی ہیں۔ اس قدر یہ کہ انسان خواب کی حقیقت کا انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ عملاً ہر شخص اس حقیقت کو موجود پاتا ہے۔ خواب

پر یقین کرنے کے لیے یہ سورت اور قرآن کی تصریحات ہی کافی ہیں لیکن جس دوسری بات کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ بھی ایک عملی اور تجربی حقیقت ہے اور اس کا انکار کرنا ممکن نہیں۔

سوال یہ ہے کہ پھر خواب کی حقیقت کیا ہے۔ نفسیاتی تجربہ کرنے والوں نے کہا ہے کہ خوابیں دراصل انسان کے خفیہ اور خوابیدہ خواہشات کا عکس ہوتی ہیں۔ بے شک یہ بھی خوابوں کا ایک پہلو ہے' لیکن یہ تمام خوابوں کی تعبیر نہیں ہے۔ فرائیڈ اپنی مکمل بے دینی اور اپنی مکمل ہٹ دھرمی کے باوجود اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ بعض خوابیں یقیناً پیش گوئی کا درجہ رکھتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان مبشرات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ خواب کی حقیقت کو ہم سمجھ سکیں یا نہیں لیکن اس بات میں شک نہیں ہے کہ بعض خوابیں نہایت ہی سچی ہوتی ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کی عجیب و غریب مخلوق ہے اور اللہ نے اس کے وجود کے اندر جو قوانین اور حکمت ودیعت کی ہے ہم اس کے بعض پہلوؤں کو جان سکیں۔

ایسی سچی خوابوں کی حقیقت کو ہم اس انداز سے تعبیر کرتے ہیں کہ ماضی اور مستقبل کے حوادث اور واقعات کو ہم اس لیے نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارے اور ان کے درمیان زمان و مکان کا پردہ حائل ہوتا ہے یا ایک چیز حاضر بھی ہوتی ہے۔ لیکن ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے۔ ماضی اور مستقبل کو تو زمانے کا فیکٹر ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حاضر بعید کو مکان کا فیکٹر ہمارے علم سے دور رکھتا ہے۔ بعض اوقات انسان کے اندر ایسے حواس جاگ اٹھتے ہیں یا قوی ہو جاتے ہیں۔ جو زمانے کے پردوں کو پھاڑ کر آگے دیکھ لیتے ہیں' لیکن ان کی صورت مبہم ہوتی ہے۔ یہ مکمل علم نہیں ہوتا لیکن استشفاف ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو یہ جاگتے ہوئے بھی حاصل ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو یہ احساس سوتے میں ہوتا ہے لیکن ہمیں نہ اس کی حقیقت کا علم ہے اور نہ زمان کی حقیقت کا۔ اس طرح مکان جو مادے سے عبارت ہے یہ بھی ہمیں اچھی طرح معلوم نہیں ہے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا "تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے"۔ بہرحال حضرت یوسف ؑ نے خواب دیکھا اور اس کی تعبیر آ رہی ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں یہ کہوں گا کہ میں ہر چیز کی تکذیب کر سکتا ہوں لیکن میں ایک ایسے واقعہ کی تکذیب نہیں کر سکتا جو خود مجھے پیش آیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میری ایک بھانجی کی آنکھوں میں خون ہے اور اسے نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں نے گھر خط لکھا اور اس میں اس کی آنکھوں کے بارے میں پوچھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ تو انہوں نے لکھا کہ اسے ایک ایسی تکلیف ہے کہ باہر سے نظر نہیں آ رہی۔ بظاہر اس کی آنکھیں درست نظر آتی ہیں لیکن اسے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اور یہ کہ اس کا علاج ہو رہا ہے۔ میری خواب سچی تھی اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

---ooo---

اب پردہ گرتا ہے' حضرت یعقوب ؑ اور حضرت یوسف ؑ پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ایک دوسرا منظر سامنے

آتا ہے۔ برادران یوسف ؑ اس میں متحرک نظر آتے ہیں۔ ان کی حرکات سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ اہم واقعات پیش آنے والے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ﴿٧﴾

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَى أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٨﴾ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿٩﴾ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ﴿١٠﴾

"حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا "یہ یوسف اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل بہک گئے ہیں"۔ چلو یوسف ؑ کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہارے ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا"۔ اس پر ان میں سے ایک بولا "یوسف کو قتل نہ کرو' اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا"۔

حضرت یوسف ؑ اور ان کے بھائیوں کے قصے میں بہت سی آیات اور نشانیاں ہیں اور ان کے ذریعہ انسان بڑے بڑے حقائق تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ افتتاحیہ کلمات قارئین کو متوجہ متنبہ اور بات کی اہمیت کی تحریک کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ کلمات اس طرح ہیں جس طرح اسٹیج پر سے پردہ گرا دیا جاتا ہے اور اسٹیج کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے' وہ سامنے نظر آنے لگتا ہے کیونکہ ان کلمات کے بعد متصلاً برادران یوسف بات کرتے نظر آتے ہیں اور وہ اس مکالمے میں یوسف کے خلاف سازش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کیا یہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے اپنے بھائیوں کے سامنے اپنا خواب بیان کر دیا تھا جیسا کہ کتاب عہد قدیم کہتی ہے یا نہیں' یہاں سیاق کلام سے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ان کا الزام یہ ہے کہ حضرت یعقوب یوسف ؑ اور ان کے سگے بھائی سے زیادہ محبت کیوں کرتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ حضرت یوسف نے خواب دیکھا ہے تو ان کی زبان سے اس کا ذکر ضرور ہو جاتا۔ اور یوں وہ کینہ پروری اور حقد و حسد کے لیے معذور بھی ہوتے' اس لئے کہ حضرت یعقوب ؑ نے یوسف ؑ کو خواب کو پوشیدہ رکھنے کا جو مشورہ دیا تھا تو محض اسی لیے دیا تھا کہ آپ کو دوسرے حالات کے پیش نظر معلوم تھا کہ وہ جل بھن اٹھیں گے اور اس حسد اور کینے نے واقع تو ہونا ہی تھا کیونکہ اس بھٹی سے گزر کر ہی حضرت یوسف ؑ نے اپنے مقررہ مقام تک پہنچنا تھا۔ ان کی زندگی کے حالات' ان کے

خاندانی حالات اور پھر ان کا حضرت یعقوب ؑ کے بڑھاپے میں پیدا ہونا' چھوٹا ہونا' کیونکہ بڑھاپے میں چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت پیار ہوتا ہے' خصوصاً جبکہ چھوٹے بچے سوتیلی اور چھوٹی ماں کے ہوں۔

لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ (۷) اِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِیْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنِ (۸) (۱۲:۷ - ۸)

"حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا "یہ یوسف اور اس کا بھائی دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل بہک گئے ہیں"۔

یہ کہ ہم ایک مضبوط جتھا ہیں' ہم اسلام اور خاندان کی مدافعت کرتے ہیں اور مفید ہیں۔ جبکہ ہمارے والد محترم ہمارے مقابلے میں ایک بچے اور ایک لڑکے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں' باوجود اس کے کہ ان کے مقابلے میں ہماری افادیت بھی زیادہ ہے اور تعداد بھی۔

ان کا غیظ و غضب اور کینہ جوش مارتا ہے' عین اس وقت شیطان ان کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب وہ واقعات کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔ معمولی باتیں ان کو پہاڑ نظر آتی ہیں۔ عظیم جرائم ان کو چھوٹے نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک انسان کا قتل ان کے لیے اب ایک معمولی بات بن جاتی ہے۔ پھر ایک بچے کی وہ جان لینے کے درپے ہیں جو نہ جانتا ہے اور نہ اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ پھر وہ ان کا بھائی بھی ہے اور اس کے باوجود کہ یہ ایک برگزیدہ نبی کے بیٹے ہیں۔ اگرچہ وہ خود نبی نہ تھے۔ ان کے لیے ان کے باپ کی زیادہ محبت ایک عظیم جرم بن گیا ہے' یہاں تک کہ باپ کی زیادہ محبت کرنا قتل کے لیے جواز بن گیا ہے حالانکہ قتل شرک کے بعد سب سے بڑا جرم ہے۔

اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا (۱۲:۹) "چلو یوسف ؑ کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو"۔ دونوں باتیں قباحت اور جرم کے اعتبار سے ایک ہیں' کیونکہ کسی بچے کو ایک ایسی زمین میں پھینکنا جو دور دراز ہو' گویا اسے قتل کرنے کے برابر ہے کیونکہ ایسے حالات میں اکثر موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور کیوں ایسا کرو؟

یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ (۱۲:۹) "تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے"۔ اب یوسف ؑ تمہاری راہ کی رکاوٹ نہ رہیں گے۔ یعنی ان کا دل یوسف ؑ کی محبت سے خالی ہو جائے گا۔ جب وہ دیکھیں گے کہ یوسفؑ موجود ہی نہیں ہے حضرت یعقوبؑ اس سے محبت نہ کریں گے۔ اور ان سے محبت شروع ہو جائے گی۔ اور یہ کس قدر عظیم جرم ہے؟ تو اس کا علاج یہ ہے کہ یہ اس سے توبہ کر لیں گے' صالح ہو جائیں گے اور توبہ و صلاح سے ماضی کے جرائم معاف ہو جائیں گے۔

وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ (۱۲:۹) "یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا"۔ یوں شیطان کو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان تنازعات پیدا کر دے۔ جب لوگ ایک دوسرے پر غصے میں آ جاتے

ہیں تو وہ بعض کو بعض پر حملہ آور ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور غصے کی حالت میں انسان کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کو اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا۔ اور انسان واقعات اور امور کا اچھی طرح جائزہ نہیں لے سکتا۔ چنانچہ جب برادران یوسف ؑ کے دلوں میں کینہ کی آگ بھڑک اٹھی تو عین اس وقت شیطان پردے سے سامنے آیا اور کہا کہ اسے قتل کر دو' اس کے بعد توبہ کا دروازہ کھلا ہے' حالانکہ توبہ ایسی نہیں ہوتی۔ توبہ اس صورت میں ہوتی ہے کہ انسان سے بتقاضائے بشریت کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ اس پر پشیمان ہو جائے۔ یہ توبہ نہیں کہ پہلے توبہ کرنے کے ارادے سے غلطی کرے۔ منصوبے کے تحت جرم کرے۔ درحقیقت یہ توبہ سے غلط فائدہ اٹھانا ہے اور توبہ کو ارتکاب جرائم کے لیے جواز کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ اور یہ انداز انسان کو شیطان سکھاتا ہے' رحمٰن نہیں۔

ہاں اس موقعہ پر ان میں سے ایک شخص کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس ہولناک منصوبے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ شخص ایک ایسا حل پیش کرتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ قتل ہونے سے بھی بچ جائیں اور ان کے لیے ان کے باپ بھی فارغ ہو جائیں۔ وہ یہ تجویز کرتا ہے کہ اسے بیابان میں پھینکنے کی بجائے قافلوں کی آمدورفت والے کنویں میں پھینک دیں' کوئی قافلے والے اسے پکڑ کر لے جائیں گے۔ کیونکہ غیر آباد جنگل میں اس کی ہلاکت کا امکان زیادہ ہے اور شارع عام کے کنویں میں بہت ہی کم ہے کیونکہ کوئی قافلہ آئے گا اور اسے غنیمت سمجھ کر لے جائے گا۔ اور وہ باپ کی نظروں سے اوجھل اور دور ہو جائے گا۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (۱۲ : ۱۰) "اس پر ان میں سے ایک بولا "یوسف کو قتل نہ کرو' اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا"۔

اس شخص نے جو یہ کہا ہے اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ (۱۲ : ۱۰) "اگر کرنا ہی ہے"۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ برادران یوسف ؑ ان کے ساتھ یہ حرکت کریں گے۔ نیز اگر انہوں نے کرنا ہے تو یہ ناپسندیدہ فعل ہے۔ اور خوشی کا باعث نہیں ہے۔ بہرحال یہ تجویز اس کے کینہ کو پوری طرح ٹھنڈا کرنے والی نہ تھی اور انہوں نے قتل یوسف کا جو فیصلہ کیا تھا اس سے وہ واپس آنے کے لیے تیار نہ تھے اور یہ باتیں اگلے منظر سے معلوم ہوتی ہیں۔

---ooo---

اب یہ لوگ اپنے باپ کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور انہیں آمادہ کر رہے ہیں کہ یوسف ؑ کو ان کے ساتھ جانے دیں۔ اب وہ باپ کو دھوکہ دے رہے ہیں' یوسف ؑ کے خلاف سازش کر رہے ہیں' ذرا براہ راست ان کی بات سنیں۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ۝۱۱ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَ یَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۱۲ قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ

تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اس قرارداد پر انہوں نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے' کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔ باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔ انہوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیئے نے کھا لیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں تو ہم بڑے نکمے ہوں گے"۔

ان کے الفاظ اور انداز گفتگو سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوڑھے اور چھوٹے بچے سے محبت کرنے والے والد سے اس کے اس جگر گوشے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کرنے کی خاطر ہر تدبیر بروئے کار لا رہے ہیں' والد کو ان سے بے حد محبت ہے اس لیے کہ وہ نور نبوت کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں کہ باپ دادا کی میراث کا وارث ہونے والے یہی ہیں۔ (یٰاَبَانَا) "اے ہمارے باپ" اس موقعہ پر وہ ابوت اور ابنیت کے نہایت ہی اپیل کرنے والے رشتے کو استعمال کر رہے ہیں۔

قَالُوْا يٰاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ (۱۲ : ۱۱) "کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے"۔ یہ ایک سوال ہے' لیکن اس میں ایک خفیہ خباثت' غصہ اور ناگواری بھی ہے۔ لیکن وہ باپ کو آمادہ بھی کر رہے ہیں کہ وہ ان پر اعتبار کرتے ہوئے یوسف کو ان کے حوالے کر دیں' حضرت یعقوب کی عادت یہ تھی کہ وہ یوسف کو ساتھ ہی رکھتے تھے اور جب ان کے دوسرے بیٹے کسی دور دراز کی مہم پر جاتے تھے تو درازی سفر' مشکلات سفر اور مشقت مہم کی وجہ سے یوسف کو ساتھ جانے نہ دیتے تھے کیونکہ وہ چھوٹا تھا اور یہ بڑے تھے۔ انہوں نے نہایت ہی مکارانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے باپ کو یہ تاثر دیا کہ شاید وہ ہم پر یوسف کے معاملے میں اعتماد نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ ہمارے سب کے باپ ہیں اور یوسف بھائی ہیں۔ نہایت ہی مکارانہ انداز میں وہ بدگمانی کی نفی کر رہے ہیں۔ ذرا ان کی اس خبیث چال پر ایک بار پھر نظر ڈالیں۔

مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ (۱۲ : ۱۱) "کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں"۔ ہمارے دل تو صاف ہیں۔ ان میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ ہماری نیت صاف ہے اور ہم مخلص ہیں' یہاں ان کی جانب سے اخلاص اور صفائی کا دعویٰ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی گہری چال چل رہے ہیں اور حد درجہ کے دھوکہ باز ہیں۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۲ : ۱۲) "کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے' کچھ چر چگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا' ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں"۔

یہ لوگ نہایت ہی تاکیدی الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ اور یوسف کو اس سفر میں جو خوشیاں ملنے والی ہیں ان کی خوب تصویر کشی کر رہے ہیں کہ وہ خوش ہوں گے، ورزش کریں گے، یوں وہ دھوکہ دے کر والد کو آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ یوسف ؑ کو ان کے ساتھ بھیج دیں۔

ان کی اس چرب زبانی کا حضرت یعقوب ؑ بھی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے، کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ اصل خطرہ یہ ہے کہ علاقے میں بھیڑیئے زیادہ ہیں اور میں یہ خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ کہیں اسے کوئی بھیڑیا نہ کھا لے"۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ

(۱۲: ۱۳) "باپ نے کہا "تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو"۔

یعنی تمہارا لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وہ بات جو ان کے دلوں میں کینہ کی آگ دھکا رہی تھی کہ ابا جان یوسف ؑ کو ہروقت ساتھ رکھتے ہیں اور کسی بھی وقت اپنے سے جدا نہیں کرتے اگرچہ ایک دن کے لیے کیوں نہ ہو۔ حالانکہ وہ اسے سیروتفریح کے لیے لیے جا رہے ہیں۔

حضرت یعقوب ؑ نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ کھا لے جبکہ تم غافل ہو۔ دراصل وہ کینہ اور حسد کی وجہ سے اس قدر اندھے ہوگئے تھے کہ وہ سوچتے بھی نہ تھے کہ آخر یوسف ؑ کے قتل کے بعد وہ جواب کیا دیں گے، لیکن حضرت یعقوب ؑ کے اس اندیشے نے ان کو عذر بتا دیا۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۱۲: ۱۴) "انہوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیئے نے کھا لیا جبکہ ہم ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے"۔

اب انہوں نے اس اندیشے کا رد کرنے کے لیے پھر نہایت ہی موثر اسلوب اختیار کیا، کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر جتھے کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بھیڑیا یوسف ؑ کو پھاڑ کھائے۔ یہ کیسے ممکن ہے ورنہ ہم تو بہت ہی نکمے اور خسارے میں ہوں گے۔

اس مکالمے کے نتیجے میں حضرت یعقوب ؑ اپنے تمام اندیشوں کے باوجود مجبور ہو گئے کہ وہ یوسف ؑ کو ان کے ساتھ چھوڑ دیں اور یوں تقدیر الٰہی کے مطابق قصے کی مزید کڑیاں ظہور پذیر ہوں۔

---○○○---

اب یہ لوگ انہیں لے کر جا رہے ہیں، اس مکروہ سازش پر یہ لوگ عمل پیرا ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس بچے کے دل میں یہ بات ڈال رہا ہے کہ یہ ایک آزمائش ہے اور یہ ختم ہونے والی ہے اور یہ کہ ان شاء اللہ وہ زندہ رہے گا اور اپنے غافل بھائیوں کو اس کے بارے میں خود بتائے گا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَیْنَآ

إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُم بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٥﴾

”اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنوئیں میں چھوڑ دیں' تو ہم نے یوسف علیہ السلام کو وحی کی کہ ”ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا' یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں“۔

ان کے درمیان یہ بات طے پا گئی کہ اب یوسف کو کنوئیں میں ڈالنا ہے' جہاں وہ ان کی نظروں سے دور رہے گا۔ اب ہر شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام پر کیا گزری ہوگی کہ یہ سب بھائی مل کر اس کمزور بچے کو کنوئیں میں ڈال رہے ہوں گے۔ جس کو اپنی موت قریب نظر آ رہی ہوگی اور بھائیوں کی نظریں بدل گئی ہوں گی' اس عالم بے بسی و بے کسی میں اب صرف اللہ کی مدد آتی ہے اور اللہ ان کے دل میں اطمینان اور سکینت ڈال دیتے ہیں کہ تم زندہ رہو گے' ان کو بتاؤ گے کہ تم نے کیا کیا تھا' اور ایسے حالات میں جبکہ کنوئیں میں ڈالا جانے والا یہ بچہ اب مملکت کا فرمانروا ہو گا۔

---○○○---

اب ہم یوسف علیہ السلام کو اس اندھے کنوئیں میں چھوڑ کر ذرا کنعان چلتے ہیں۔ یہ اب اللہ کی حمایت اور کفالت میں ہیں جب تک کہ اللہ ان کو وہاں سے نکال نہیں دیتا۔ اب پردہ گرتا ہے اور یہ لوگ اس قدر برا کام کرنے کے بعد اب والد کے سامنے کھڑے ہیں ذرا ملاحظہ کریں ان کی بہانہ سازی۔

وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴿١٦﴾ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوسُفَ عِندَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ﴿١٧﴾ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿١٨﴾

”شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا ”ابا جان' ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف علیہ السلام کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں“۔ اور وہ یوسف علیہ السلام کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا ”بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا' صبر کروں گا اور بخوبی صبر کروں گا' جو بات تم بنا رہے ہو' اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے“۔

ان کے دل میں کینے کی آگ جل رہی تھی اور یہ لوگ جھوٹ پر جھوٹ گھڑ رہے تھے۔ اگر ان کو اپنے اعصاب پر ذرا بھی کنٹرول ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے' وہ اس مکروہ سازش کا آغاز ہی نہ کرتے اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان پر اعتماد کر کے یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ رخصت کر دیا تھا تو ان کو باز آ جانا چاہئے تھا۔ لیکن یوسف علیہ السلام اب ان کی

برداشت سے باہر ہو گئے تھے ۔ اور وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان کے لیے اس سیاہ کارنامے کے سرانجام دینے کے لیے یہ بہترین موقعہ ہے ۔ پھر ان کو خود حضرت یعقوب ؑ کی زبانی بھیڑیئے کا بہانہ بھی مل گیا تھا اور ان کی جلد بازی اور کچے پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے باپ کے اندیشے کے سوا کوئی اور بہانہ بھی نہ بنایا' کہ کل ہی تو حضرت یعقوب ؑ اس بہانے سے انہیں ڈراتے تھے اور یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم تو بڑا جتھا ہیں ۔ اب وہی بہانہ بنا رہے ہیں ۔ بظاہر یہ بہانہ تو معقول نہیں ہے کہ رات کو جس بات سے انہیں متنبہ کیا گیا تھا وہی بہانہ صبح کو وہ پیش کر دیں ۔ پھر ان کے سطحی پن کا اس سے زیادہ اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ یوسف ؑ کی قمیص پر وہ خون لگا کر لے آئے ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بالکل بادی النظر میں ایک جھوٹا بہانہ تھا' لیکن انہوں نے یہ جھوٹ پیش کیا :

وَ جَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ (۱۶) قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ (۱۲ : ۱۷) "شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا "ابا جان' ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف ؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اسے کھا گیا"۔

اور وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ بادی النظر میں نظر آتا ہے کہ یہ بہانہ جھوٹا ہے اور مشکوک آدمی تو نظر ہی یوں آتا ہے کہ چور کی داڑھی میں تنکا ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ (۱۲ : ۱۷) "آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں"۔ یعنی نظر آتا ہے کہ آپ ہماری باتوں سے مطمئن نہیں' اگرچہ وہ سچی ہوں کیونکہ آپ کی نظروں مین ہم مشکوک ہیں ۔

حضرت یعقوب نے حالات کو بھانپ لیا' خود نبوت نے انہیں بتا دیا کہ یوسف ؑ کو کم از کم بھیڑیئے نے نہیں کھایا ۔ انہوں نے کوئی اور ہی سازش کی ہے ۔ یہ جو بتا رہے ہیں وہ واقعہ نہیں ہے جو بتا رہے ہیں' یہ تو نہیں ہے ۔ اس لیے انہوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لیے کوئی بڑا برا کام آسان بنا دیا ہے اور اس کا ارتکاب تم نے کر لیا ہے اور یہ کہ ان کے لیے صبر کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے ۔ جزع و فزع ان کے شایان شان نہیں ہے اور یہ جھوٹ بادی النظر میں جھوٹ ہے جو یہ لوگ گھڑ رہے ہیں ۔ اس کے بارے میں اللہ ہی سے شکایت کر سکتے ہیں ۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (۱۲ : ۱۸) "یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا ۔ اچھا' صبر کروں گا اور بخوبی صبر کروں گا' جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے"۔

---ooo---

اب ہم جلدی سے واپس ہوتے ہیں کہ اندھے کنوئیں میں یوسف علیہ السلام کس حال میں ہیں ۔ اس طرح اس قصے

کی پہلی کڑی ختم ہوتی ہے :

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ
يَٰبُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ
۱۴ع بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾
۱۲

"ادھر ایک قافلہ آیا اور اس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔سقے نے جو کنوئیں میں ڈول ڈالا تو (یوسف کو دیکھ کر) پکار اٹھا "مبارک ہو یہاں تو ایک لڑکا ہے"۔ ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا' حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔ آخر کار انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اسے بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے"۔

یہ اندھا کنواں شارع عام پر تھا' شارع عام کے ارد گرد لوگ ہمیشہ پانی کی تلاش میں بوقت ضرورت نکلتے ہی رہتے ہیں۔ خصوصاً بارش کا پانی بھی ایسے کنوؤں میں جمع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ کنواں خشک بھی ہوتا ہے۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ (۱۲:۱۹) "ادھر ایک قافلہ آیا"۔ عربی میں قافلے کو سیارہ اس لیے کہتے ہیں کہ سیر کے معنی چلنے کے ہیں اور قافلہ بھی ایک طویل سفر پر ہوتا ہے' اسے نشانہ حوالہ اور فمامہ بھی کہتے ہیں۔

فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ (۱۲:۱۹) "اور اس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا"۔ وارد بمعنی سقہ اسے وارد اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پانی ان کی طرف لاتا ہے۔

فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ (۱۲:۱۹) "سقے نے کنوئیں میں ڈول ڈالا"۔ تاکہ وہ دیکھے کہ کنوئیں میں پانی ہے۔ اب یہاں سیاق کلام میں اس بات کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ ڈول کے ساتھ لٹک گئے کیونکہ یہ بات بالکل عیاں ہے اور یہاں قارئین کو ایک حیران کن صورت حال سے دوچار کرنا مطلوب ہے۔ یہ کسی بھی قصے کا فنی کمال ہوتا ہے۔

قَالَ يَٰبُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ (۱۲:۱۹) ("یوسف ؑ کو دیکھ کر) مبارک ہو یہاں تو ایک لڑکا ہے"۔ یہاں قصے کی مزید تفصیلات کو حذف کر دیا جاتا ہے کہ یوسف ؑ کس قدر خوش ہوئے' یا ان کے تاثرات و حالات کیا تھے' صرف یوسف ؑ کے انجام کی طرف اشارہ آجاتا ہے۔

وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً (۱۲:۱۹) "ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا"۔ انہوں نے اسے نہایت ہی خفیہ سامان تجارت سمجھا۔ ارادہ کر لیا کہ یہ غلام کی حیثیت میں بہت ہی اچھا فروخت ہو گا' چونکہ درحقیقت وہ

غلام تو تھا نہیں اس لیے انہوں نے اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا لیا۔ اور چونکہ چوری کا مال تھا' اس لیے کم قیمت پر فروخت کر دیا اور اونے پونے سکوں کے عوض۔

وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ (۱۲ : ۲۰)

"آخر کار انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اسے بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے۔ ان کو توقع نہ تھی کہ اس سے وہ کچھ زیادہ نفع کمائیں گے...... غرض اللہ کے اس برگزیدہ نبی کے لیے یہ حالات نہایت ہی حوصلہ شکن تھے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۷ ایک نظر میں

یہ سبق اس قصے کے دوسرے حلقے پر مشتمل ہے ۔ اب یوسف علیہ السلام مصر پہنچ گئے ہیں ۔ غلام کی طرح بک گئے ہیں، لیکن جس شخص نے اسے خریدا' اس نے دیکھ لیا کہ یہ بچہ نہایت ہی ہونہار ہے ۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو ان کے بارے میں ہدایات دیں کہ یہ بچہ غیر معمولی ہے ۔ یہاں سے حضرت یوسف کے خواب کی تعبیر شروع ہوتی ہے ۔

لیکن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے حضرت یوسف کے لیے ایک دوسرے قسم کا امتحان ابھی باقی تھا ۔ حضرت یوسف کو اللہ نے منصب رسالت کے شایان شان علم و حکمت عطا کیا ہوا تھا اور یہ آزمائش ایسی تھی کہ محض اللہ کا فضل و کرم ہی اس امتحان میں کسی کو بچا سکتا تھا ۔ حضرت یوسف اعلیٰ طبقات کے آزادانہ ماحول میں پل رہے تھے ۔ ایسے طبقات بالعموم عیاشی اور فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ ان طبقات کے اکثر نوجوان بے راہ روی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ حضرت یوسف محض فضل الٰہی سے اس گندے ماحول سے پاک دامن بن کر نکلے ۔ ان کے لیے یہ مشقت سابقہ آزمائشوں سے کچھ کم نہ تھی ۔

---()()()---

درس نمبر ۱۰۷ تشریح آیات

۲۱ ---- تا ---- ۳۴

وَ قَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ
عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ؗ
وَ لِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَ اللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

مصر کے جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا "اس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں"۔ اس طرح ہم نے یوسف ؑ کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا، اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں"۔

ابھی تک ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت کو کس نے خریدا۔ لیکن قدرے بعد یہ بتایا جائے گا کہ خریدار عزیز مصر ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ مصر کے اکابر میں سے تھا۔ لیکن ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اب مصیبت اور مشقت کے دن بیت گئے اور اب ان کے لیے اچھے سے اچھے دن آنے والے ہیں۔

اَكْرِمِیْ مَثْوٰهُ (۱۲ : ۲۱) "اس کو اچھی طرح رکھنا" مثوی ثوی سے اسم ظرف ہے یعنی رات گزارنے کی جگہ اور ٹھہرنے کی جگہ۔ اکرام مثوی سے مراد خود ان کا اکرام ہے۔ لیکن اس کے مقام کا اکرام کرو، زیادہ مبالغہ ہے اس سے کہ کوئی کہے اس کا اکرام کرو۔ یعنی صرف اس کی ذات کا اکرام ہی نہیں بلکہ اس کی بجائے قیام کا بھی اکرام ہو۔ اب ایک تو اس کا جائے قیام اندھے کنویں میں تھا جو ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا اور ہر طرف مصائب ہی مصائب تھے۔ اور اب یہاں ان کا تمکن ہے۔

عزیز مصر اپنی بیوی کو یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس بچے سے اس کی کیا امیدیں وابستہ ہیں؟

عَسٰی اَنْ یَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (۱۲ : ۲۱) "بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں"۔ جس طرح بعض روایات مین آتا ہے شاید اس کے ہاں کوئی بیٹا نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس شخص نے یہ عندیہ دیا کہ اگر یہ بچہ صاحب فراست نکلا تو اسے بیٹا بنالیں گے' جس طرح حضرت یوسف ؑ کے مزاج اور طور طریقوں سے معلوم ہوتا تھا' بعد میں وہ نہایت ہی رجل رشید ثابت ہوئے۔

اب یہاں قصے کے واقعات کو روک لیا جاتا ہے اور درمیان میں ایک مختصر سا تبصرہ آتا ہے اور بتایا جاتا ہے یہ تدابیر اللہ نے اس لیے اختیار کیں تاکہ حضرت یوسف ؑ کے قدم مصر میں جم جائیں۔ اب حضرت یوسف ؑ نے اس خریدار کے دل اور اس کے خاندان میں قدم جمالیے ہیں اور ان کی ترقی کا دور شروع ہو چکا ہے اور آگے جاکر ان کو اس بلند سوسائٹی میں رکھ کر معاملہ فہمی کے مواقع فراہم ہوں گے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام امور پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے منصوبے اسی طرح نافذ ہوتے ہیں جس طرح اللہ چاہتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۲۱) "اس طرح ہم نے یوسف ؑ کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

یہ کس طرح؟ دیکھو یوسف ؑ کے بھائیوں نے ان کے خلاف کیا سازش کی اور اللہ نے ان کے لیے کیا سوچا اور چاہا۔ اور اللہ نے جو چاہا وہ کامیاب رہا۔ کیونکہ اللہ کو تمام امور پر کنٹرول حاصل ہے لہٰذا ان کی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں اور حضرت یوسف ؑ کے بارے میں اللہ کا منصوبہ کامیاب رہا۔

مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ جو اللہ چاہتا ہے' وہ ہوتا ہے اور لوگوں کے چاہنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

"اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا' اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں"۔

حضرت یوسف ؑ کو اللہ نے یہ صلاحیت دی کہ وہ ہر معاملے میں صحیح فیصلہ کرنے' واقعات کے نتائج وہ پہلے سے معلوم کر لیتے' خوابوں کی تعبیر وہ بہت ہی اچھی طرح جانتے۔ تاویل احادیث اور تاویل رؤیا کا مفہوم عام بھی ہو سکتا ہے یعنی زندگی کے تمام معاملات کو وہ اچھی طرح سلجھاتے تھے اور یہ صلاحیت ان کو ان کی نیکی اور حسن سلوک کی وجہ سے دی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ محسنین کو اسی طرح جزا دیتا ہے۔

---ooo---

اب حضرت یوسف ؑ پر ان کی زندگی کا سخت ترین امتحان آتا ہے اور یہ ان کے لیے سخت ترین آزمائش ہے۔ یہ ابتلا اس وقت آتا ہے جب اللہ نے ان کو علم دے دیا ہے اور صحیح فیصلے کی توفیق دے دی ہے تاکہ وہ ان کے ذریعے ان

مشکلات پر قابو پالیں اور سرخرو ہو کر ان سے نکلیں۔کیونکہ یہ صالح اور پاکیزہ نوجوان ہیں اور محسنین کے ساتھ اللہ کا یہی سلوک ہوتا ہے۔

اب ذرا ملاحظہ کیجئے اس خطرناک منظر کو:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ
قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ
لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا
الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا
جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِیَ
رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ
مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ
فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ
اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾ یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٜ وَ
۳
۹ع اسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـئِیْنَ ﴿۲۹﴾
۱۳

"جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آجا"۔یوسف ؑ نے کہا "خدا کی پناہ' میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف ؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ایسا ہوا' تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں' درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔آخر کار یوسف ؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف ؑ کی قمیص (کھینچ کر) پھاڑ دی۔دروازے

پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی: "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے؟" یوسف ؑ نے کہا "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی"۔ اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ "اگر یوسف ؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا' اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا"۔ جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف ؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں' واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف ؑ اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت' تو اپنے قصور کی معافی مانگ' تو ہی اصل میں خطاکار تھی"۔

یہاں قرآن مجید نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی عمر کیا تھی اور نہ یہ بتایا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کی عمر کیا تھی؟ یہاں ہم محض اندازے سے دونوں کی عمر کا تعین کر سکتے ہیں۔

جب حضرت یوسف ؑ کو قافلے نے اٹھایا تو وہ لڑکے تھے۔ انہیں مصر میں فروخت کر دیا گیا۔ گویا ان کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ کیونکہ عربی میں غلام اسی عمر کے لڑکوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے لوگوں کے لیے فتی' شاب کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اس کے بعد رجل کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسی عمر ہی میں حضرت یعقوب ؑ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں کہیں بھیڑیا کھا نہ لے جبکہ اس وقت عزیز مصر کی بیوی ایک بیوی ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اولاد بھی نہیں ہے

اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ان کی اولاد نہ تھی۔ متبنی بنانے کا خیال ہی تب آتا ہے کہ اولاد نہ ہو' یا یہ کہ انسان جب مایوس ہو جاتا ہے کہ اب بچے پیدا ہونے کا کوئی موقعہ نہیں ہے تب وہ متبنی کے لیے سوچتا ہے۔ لہٰذا معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس جوڑے کی شادی کے بعد کافی وقت گزر گیا ہے اور اب غالباً یہ جوڑا اولاد سے مایوس ہو گیا ہے' بہرحال یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مصر کا وزیراعظم چالیس سال سے بھی کم عمر کا ہو' نیز اس وقت اس کی بیوی بھی کسی صورت میں تیس سال سے کم نہیں ہو سکتی۔

بہرحال قرین قیاس یہ ہے کہ یوسف کی عمر ۱۵ سال اور عزیز مصر کی بیوی کی عمر ۴۰ سال تھی تقریباً حالات یہ بتاتے ہیں کہ اس واقعہ کے وقت فریقین کی عمریں یہی تھیں۔ اس عورت کے معمر ہونے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اس واقعہ کے بارے میں اس نے جو موقف اختیار کیا وہ ایک پختہ عورت اور جرأت والی عورت کا موقف ہے' جو اپنی سازش کے تانے بانے پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے۔ اس عورت کے بارے میں مصری خواتین کے تبصرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ معمر عورت ہے۔

امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا (۱۲ : ۳۰) "کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے"۔ اگرچہ فتی غلام کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن عبد کے لیے بھی وہ اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ اس میں فتوت کا مفہوم ہوتا ہے اور یوسف ؑ ایسے ہی تھے۔ بہرحال شہادت احوال و کوائف ان حقائق کی تائید میں ہے۔

یہ بحث ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ اس سے ایک متعین نتیجہ اخذ ہو۔ یہ کہ اس عورت نے صرف ایک حادثے میں

یوسف ؑ کو ورغلانے کی کوشش نہ کی تھی جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے زمانہ مراہقت سے مسلسل اس ابتلا میں رہے ' کیونکہ وہ وزیر اعظم کے محل میں تھے اور اس وقت عورت کی عمر ۳۰ / ۴۰ سال کے درمیان تھی ۔ اور اس معاشرے کے اندر جو حالات تھے وہ اس عورت کے خاوند کے اس قول سے اچھی طرح معلوم ہوتے ہیں :

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِىْ لِذَنْبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ

(۱۲ : ۲۹) " یوسف ؑ اس معاملے سے درگزر کر ۔ اور اے عورت ' تو اپنے قصور کی معافی مانگ ' تو ہی اصل میں خطاکار تھی " ۔

نیز عورتوں کی چہ میگوئیاں کہ عزیز مصر کی بیوی کیا کر رہی ہے اور اس کی جوابی تدبیر اور دعوت کا انتظام اور ان کے سامنے یوسف ؑ کا حاضر ہونا اور سب کا حیران رہ جانا اور اس کا یہ تبصرہ :

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ

الصّٰغِرِيْنَ (۱۲ : ۳۲) " بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا ' اگر یہ میرا کہا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا " ۔

یہ سوسائٹی جس میں اس قسم کی باتیں آزادانہ ہوتی ہوں ' یہ اونچے طبقے کی سوسائٹی ہوتی ہے ۔ یوسف ؑ اس میں بطور غلام پھنسے ہوئے تھے اور اسی میں پل رہے تھے ۔ اور عمر کا زمانہ ایسا تھا جسے فتنے اور آزمائش کا زمانہ کہا جاتا ہے ۔ یہ تھا یوسف ؑ کا ایک طویل اور کٹھن امتحان اور اس میں وہ ثابت قدم رہے ۔ وہ اس سے سرخرو ہو کر نکلے ' اور اس سوسائٹی اور اس عمر کے فتنوں کے مقابلے میں کامیاب رہے ۔ ان کی عمر اور عورت کی عمر کو مدنظر رکھ کر سوچا جائے کہ اس عورت کے ساتھ وہ ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں ' ان سب امور سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے کس قدر طویل عرصے تک حالات کا مقابلہ کیا ۔ اگر یہ واقعہ صرف یہی ایک ہوتا تو وہ بسہولت اس کا مقابلہ کر لیتے اور ان کے لیے مشکل پیش نہ آتی خصوصاً جبکہ مرد مطلوب ہو ' خود طالب نہ ہو ' خصوصاً جبکہ عورت کی خواہش ہو تو مرد اس سے انکار نہیں کر سکتا اور اس واقعہ میں عورت خواہشمند تھی ۔

اس تمہید کے بعد اب تشریح آیات ۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ (۱۲ : ۲۳) " جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازہ بند کر کے بولی " آجا " ۔

اس بار یہ عورت کھلے بندوں حضرت یوسف ؑ کو ورغلانے کی کوشش کرتی ہے اور اس میں وہ واضح طور پر آخری مرحلے کے لیے دعوت دیتی ہے ۔ دروازے بند کرنا آخری مرحلے پر ہوا کرتا ہے اور یہ عورت اب اس انتہا تک پہنچ چکی ہے ' جسمانی خواہش کا یہ آخری مرحلہ ہے ۔

وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ (۱۲ : ۲۳) اور یہ آخری' واضح اور علانیہ دعوت کسی عورت کی طرف سے پہلی مرتبہ نہیں ہوتی۔ یہ بڑی تمہیدات کے بعد ہوتی ہے۔اگر عورت جسمانی خواہش کے اعتبار سے مجبور نہ ہو جائے تو ایسی دعوت وہ ہرگز نہیں دیتی۔نوجوان چونکہ ان کے گھر میں ہی رہا تھا' اس کی جسمانی قوت آہستہ آہستہ مکمل ہوئی تھی اور عورت کی خواہشات (هیت لك) کہنے سے قبل کئی مراحل سے گزری ہوں گی اور اس آخری مرحلے سے پہلے اس کی کئی اداؤں کا مقابلہ حضرت یوسف ؑ نے کیا ہو گا۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۲ : ۲۳) "یوسف ؑ نے کہا" خدا کی پناہ' میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔ معاذ اللہ' میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔

اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ (۱۲ : ۲۳) "میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی ہے"۔اس نے مجھے اندھے کنویں سے نجات دے کر باعزت جگہ دی اور ایسے اونچے گھرانے میں رکھا۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۲ : ۲۳) "ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے"۔جو حدود اللہ سے تجاوز کرتے ہیں اور تم جس بات کی دعوت دے رہی ہو یہ تو سراسر حدود اللہ سے تجاوز ہے۔

یہاں قرآن اس بات کی تصریح کرتا ہے اور قطعیت کے ساتھ تصریح کرتا ہے کہ عورت کے اس ورغلانے کے عمل اور دروازے بند کر کے حضرت یوسف ؑ کو علانیہ دعوت گناہ دینے کو حضرت یوسف ؑ نے بغیر تامل کے رد کر دیا۔ انہوں نے حدود اللہ کو یاد کیا' اللہ کے انعامات کو یاد کیا جبکہ قرآن نے اس کی دعوت گناہ کو بھی غلیظ الفاظ کے بجائے مہذب الفاظ میں بیان کیا یعنی

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (۱۲ : ۲۴) "وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف ؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا"۔

یہ آخری مرحلہ تھا اور تمام مفسرین نے اس پر طویل کلام کیا ہے۔ قدیم مفسرین میں سے بعض لوگوں نے اسرائیلیات کا اتباع کیا ہے اور اس بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں۔ان روایات میں یہ ذکر ہوا ہے کہ یوسف ؑ بھی ایک عام نوجوان کی طرح اس آخری فعل کے ارتکاب پر مائل تھے' آگے بڑھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ ان کو برہان پر برہان دکھا رہا تھا مگر وہ رک نہ رہے تھے۔اس تنہا خانے میں حضرت یعقوب ؑ کی تصویر ظاہر ہوئی اور انہوں نے اپنی انگلی دانتوں میں دبا رکھی تھی۔ اور ان کے سامنے ایک ایسی تختی اچانک آ گئی جس کے اوپر آیات قرآنی مکتوب تھیں۔ قرآنی آیات! جن میں یہ لکھا تھا کہ ایسے کام سے باز آ جاؤ' لیکن . . پھر بھی نہ رکے تو اللہ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا اور کہا کہ پہنچو میرا بندہ گرنے لگا ہے۔وہ آئے اور انہوں نے حضرت یوسف کو سینے میں ایک ضرب لگائی۔یہ اور ایسی دوسری روایات جو واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ یہ جعلی اور بناوٹی ہیں۔

رہے جمہور مفسرین' تو انہوں نے یہ کہا ہے کہ عورت نے تو ارادہ گناہ کر لیا تھا اور حضرت یوسف ؑ نے بھی اس کے بارے میں سوچ لیا ہوتا' اگر اس پر اللہ کا برہان روشن نہ ہو گیا ہوتا اور پھر انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر لیا۔

سید رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار میں جمہور علماء کی اس تفسیر پر رد فرمایا ہے۔ اصل مفہوم یہ ہے کہ یہ جابر مالکہ تھی اور اس نے اسے دعوت گناہ دی اور اسے مارا پیٹا کیونکہ اس نے انکار کر کے اس کی توہین کی تھی اور حضرت یوسف ؑ نے اس کی زیادتی کا جواب دیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے بھاگنے میں عافیت سمجھی اور اس طرح اس نے اسے پکڑ کر قمیص پھاڑ دی۔ (ھم) کا مفہوم مارنا اور مارنے کا جواب دینا ایک ایسی تفسیر ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ ایک کوشش ہے پاک صاف ثابت کیا ہے۔ لیکن یہ تفسیر تکلف سے خالی نہیں ہے۔ اور نہ عربی الفاظ اس کے متحمل ہیں۔

ان نصوص پر غور کرنے کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف ؑ اس پختہ کار عورت کے ساتھ ایک مکان میں رہ رہے تھے اور یہ ایک طویل عرصے تک رہ رہے تھے۔ علم و حکمت عطا ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی موجود تھے۔

اس آیت سے میں جو سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اس میں آخری مرحلے کو بیان کیا گیا ہے۔ اس عورت نے ایک طویل عرصہ ان کو ورغلانے کی سعی کی اور آپ نے انکار کیا' اس عرصے میں حضرت یوسف ؑ ان مشکل حالات کا مقابلہ کرتے رہے اور قرآن اس آیت میں آخری مراحل کا ذکر کر دیا کہ انہوں نے پاکیزگی اختیار کی اور اللہ کے برہان کو دیکھ لیا۔ اس کشاکش کو یہاں قرآن مجید نے نہایت ہی مختصراً بیان کیا ہے اور اسے مختصر جگہ دی ہے۔ اس کے لیے مناسب اور ضروری الفاظ استعمال کیے۔ کشاکش کے آغاز اور انجام کو ان الفاظ میں قلم بند کر دیا کہ آغاز میں انہوں نے انکار کیا اور انتہا میں انہوں نے براہین الٰہیہ کو دیکھا لیکن ابتدائی اور آخری مرحلے کے درمیان ممکن ہے کہ کمزوری کے لمحات بھی آئے ہوں اور اس طرح حقیقت پسندانہ سچائی اور پاک فضا دونوں مکمل ہوئی ہوں۔

ان حالات و نصوص کا مطالعہ کرتے وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے۔ یہ بات انسانی مزاج اور طبیعت کے بھی قریب ہے اور منصب نبوت کے بھی ہم آہنگ ہے۔ حضرت یوسف ؑ بہرحال انسان تھے اور ایک برگزیدہ انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نفسیاتی میلان صرف میلان ہی رہا۔ اور جب ان کے اپنے قلب اور ضمیر میں اللہ کا برہان ظاہر ہوا تو ان کا یہ نفسیاتی میلان بھی ختم ہو گیا اور وہ حالت اعتصام اور مکمل انکار کی طرف لوٹ آئے۔

علامہ زمخشری کشاف میں کہتے ہیں "سوال یہ ہے کہ ایک نبی کس طرح برائی کا "ھم" کر سکتا ہے اور کس طرح وہ ارادہ کر سکتا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔ جواب یہ ہے کہ یہ ایک نفسیاتی میلان تھا' جوانی کی خواہشات کا دباؤ ہر انسان پر ہوتا ہے۔ یہاں اسے ھم اور قصد سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ ایسے حالات میں انسان پر سخت دباؤ ہوتا ہے اور عزم اور مدافعت کے ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے' لیکن حضرت یوسف ؑ اللہ کے براہین کے ملاحظے کے بعد اس دباؤ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر یہ میلان ہی نہ ہوتا اور جسمانی دباؤ نہ ہوتا تو حضرت یوسف ؑ اس کام سے رک کر قابل ستائش کس طرح ہو گئے۔ کیونکہ صبر' برداشت اور ابتلا پر اجر تب ہی ہے کہ انسان کے اندر قوت اور میلان موجود ہو"۔

---ooo---

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲ : ۲۴)

"ایسا ہوا' تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں' درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا"۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲ : ۲۵) "آخر کار یوسف ؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے"۔ حضرت یوسف ؑ نے اپنے آپ کو اس کے چنگل سے آزاد کرنے کے لیے بھاگنے میں عافیت سمجھی اور یہ عورت بھی ان کے پیچھے بھاگی تاکہ ان کو پکڑے کیونکہ یہ ابھی تک جنسی ہیجان میں تھی۔

وَ قَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ (۱۲ : ۲۵) "اور اس نے پیچھے سے یوسف کی قمیص پھاڑ دی"۔ اس کے کھینچنے کی وجہ سے قمیص پھٹ گئی کیونکہ اس کی کوشش یہ تھی کہ دروازے سے اسے واپس لے جائے۔

وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ (۱۲ : ۲۵) "دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا"۔ یہاں یہ عورت اب مکمل طور پر بالغ نظری کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ صورت حالات ایسی ہے کہ اس میں کسی بھی فریق پر شک کیا جا سکتا ہے' اس عورت کا جواب حاضر ہے' یہ کہ وہ فوراً نوجوان پر الزام لگا دیتی ہے۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا (۱۲ : ۲۵) "کہنے لگی "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے"۔ لیکن اس کو چونکہ حضرت یوسف ؑ سے محبت بھی تھی اور اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے قتل ہی نہ کر دیا جائے اس لیے خود ہی ہلکی سی سزا تجویز کر دیتی ہے۔

اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۲ : ۲۵) "سوائے اس کے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے؟" اور حضرت یوسف ؑ فوراً اس الزام کی تردید کرتے ہیں کہ خود اس عورت نے انہیں ورغلانے کی کوشش کی۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ (۱۲ : ۲۶) "یوسف ؑ نے کہا "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی"۔

یہاں قرآن کریم واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اس موقعہ پر اس عورت کے رشتہ داروں میں سے کوئی موجود تھا جس نے شہادت احوال یعنی موجود قرائن پر فیصلہ دے دیا اور نزاع ختم ہو گیا۔

وَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ (۲۶) وَ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ

(۲۷) (۱۲:۲۶ ـ ۲۷) ''اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ ''اگر یوسف ؑ کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا' اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا''۔

سوال یہ ہے کہ اس شاہد نے کہاں شہادت دی؟ کیا یہ خاوند کے ساتھ اس وقت موجود تھا یا اس واقعہ کو دیکھ کر بیوی کے خاندان میں سے ایک معمر شخص کو بلایا گیا اور اس کے سامنے عزیز مصر نے یہ ماجرا رکھا جیسا کہ ایسے حالات میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ خصوصاً ایسے اونچے طبقات میں ایسا ہی ہوتا ہے جن کا خون ٹھنڈا ہوتا ہے اور جن کے ہاں اخلاقی قدریں ڈھیلی ہوتی ہیں۔

یہ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں اور مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس شخص کے فیصلے کو یہاں شہادت کہا گیا ہے کیونکہ فریقین کی طرف سے اپنا اپنا موقف اس کے سامنے پیش ہوا' اس نے فتویٰ دیا یا رائے دی اور اسے شہادت کہا گیا اس لیے کہ شہادت سے بھی انسان سچائی تک پہنچتا ہے۔ قرائن کی شہادت یہ ہے کہ اگر آگے سے قمیص پھٹی ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد حملہ آور ہے اور عورت مدافع ہے۔ لہٰذا وہ سچی اور یہ جھوٹا ہے۔ اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ بھاگ رہا تھا اور یہ اسے پکڑ کر کھینچ رہی تھی لہٰذا یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔ اس شخص نے پہلے عورت کی سچائی کی صورت پیش کی کیونکہ وہ مالکہ ہے اور یہ غلام ہے۔ لہٰذا مناسب یہی تھا کہ مالک اور اپر ہینڈ کے حق میں جانے والی بات پہلے کی جائے۔ دونوں صورتوں میں شہادت احوال موجود ہے۔

فَلَمَّا رَاٰقَمِيْصَهٗ قُدَّمِنْ دُبُرٍ (۱۲:۲۸) ''جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف ؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے''۔ تو اس کو معلوم ہوا ہوگا کہ واقعاتی شہادت کے مطابق عورت جھوٹی ہے۔ اسی نے اس کو ورغلانے کی کوشش کی ہے۔ وہی ہے جس نے اسے متہم کرنے کی سازش کی ہے۔ یہاں ترقی یافتہ سوسائٹی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ اور وہ بھی صدیوں اور ہزاروں سال پرانی ترقی یافتہ سوسائٹی۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا وہ آج ہی کی ترقی یافتہ سوسائٹی ہے۔ اس قسم کی سوسائٹی کی پہلی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ اس میں جنسی سکینڈل نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کو چھپایا جاتا ہے۔ ایسے معاشروں کی یہ اہم باتیں ہیں۔

قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۲۸) يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ (۲۹) (۱۲:۲۸ ـ ۲۹)) ''تو اس نے کہا ''یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں' واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں۔ یوسف ؑ اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت' تو اپنے قصور کی معافی مانگ' تو ہی اصل میں خطاکار تھی''۔

بالکل درست' واقعی عورتوں کی چالیں غضب کی ہوتی ہیں۔ یوسف اس سے درگزر کرو' یہ تو چاپلوسی ہے۔ ایسا واقعہ جو خون گرما دیتا ہے' اسے دیکھ کر صرف یہ کہنا کہ تمہارا مکر بڑا عظیم ہوتا ہے اور وہ بھی ان الفاظ میں کہ تمام عورتوں کا مکر غضبناک ہوتا ہے۔ یہ تو اس عورت کی تعریف ہے کہ یہ بڑی مکار اور پختہ کار ہے اور وہ کامیاب چال چلنے والی ہے۔

یوسف کی طرف متوجہ ہو کر بھی یہی کہا گیا

اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا (۱۲ : ۲۹) ”درگزر کرو“ یعنی اس بات کو یہیں چھوڑ دے ' اس کا تذکرہ نہ کر ' حالات کو جوں کا توں رکھو - اس قسم کے معاشرے میں یہ اہم بات ہے -

اور عورت جو رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی اس کے لیے یہی تبصرہ کہ تم خطاکار ہو لہٰذا اپنے گناہوں پر معافی مانگو - یہ ہیں اس وقت کے سرکردہ بیورو کریٹ اور بڑوں کے حاشیہ نشین - ہر جاہلیت میں یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں -

اب پردہ گرتا ہے اور یہ منظر ختم ہوتا ہے - سیاق کلام میں اس مرحلے کو اپنے تمام حالات 'تاثرات اور اشارات کے ساتھ پیش کر دیا گیا ' لیکن اس نازک مرحلے کو حیوانی لذتیت سے پاک رکھا گیا اور نہایت ہی انسانی اور شریفانہ انداز اختیار کیا گیا -

---ooo---

حالات یہ ہیں کہ اس عورت اور اس کے اس غلام کے درمیان ابھی تک جدائی نہیں ہے - حالات روٹین کے مطابق آگے بڑھ رہے ہیں اور بڑے بڑے محلات میں حالات اسی طرح آگے بڑھتے رہتے ہیں - لیکن محلات کی دیواریں ہوتی ہیں اور دیواروں کے کان ہوتے ہیں - قدم اور چشم ان کے اندر ہوتے ہیں ' اندر جو کچھ ہوتا ہے ' وہ لازماً باہر آتا ہے ' خصوصاً اونچے اور مراعات یافتہ طبقات کے محلات ہیں - ان محلات کے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ لوگوں کی مجالس ' محافل میں اور زبانوں پر ہوتا ہے - لوگوں کی راتوں کے لیے یہ چٹ پٹا مسالہ ہوتا ہے -

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

”شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ ”عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے ' محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے ' ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے“ -

یہ کلام اور یہ چہ میگوئیاں بعینہ ایسی ہیں جیسا کہ ہر جاہلی دور میں موضوع سخن ہوتی ہیں - یہاں آکر ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت عزیز مصر کی بیوی ہے اور یہ کہ حضرت یوسف کو مصر کے جس شخص نے خریدا تھا وہ عزیز مصر تھا ' یعنی مصر کا وزیر اعظم - اس شخص کے نام اور اس کی بیوی کے نام کو ابھی تک مجمل رکھا گیا تھا ' اب نام اس لیے لیا گیا کہ پورا مصر اس واقعہ سے خبردار ہو گیا ہے -

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۲ : ۳۰) ”شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ ”عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے ' محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے ' ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے“ -

یعنی عورت کا حال یہ ہے کہ وہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ عاشق زار بن گئی ہے۔غلام کی محبت اس کے دل کے پردے میں اتر گئی ہے۔شغاف اس پردے کو کہتے ہیں جس کے اندر دل لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن یہ حرکت اس عورت کے لیے مناسب نہیں ہے کہ خاتون اول اور وزیر اعظم کی بیوی ہوتے ہوئے وہ عبرانی غلام پر عاشق ہو جائے جو زرخرید ہے (فتها) کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ شاید اس جاہلی سوسائٹی میں فری سیکس اس قدر معیوب نہ تھا مگر عبرانی زرخرید غلام کے ساتھ زیادہ معیوب تھا۔

---()()()---

اب وہ بات وقوع پذیر ہوتی ہے' جو ایسے ہی نام نہاد اونچے طبقات ہی میں وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔یہ خود سر عورت ایک دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔یہ جانتی ہے کہ مصری عورتوں کی مکاریوں اور پروپیگنڈے کا جواب وہ کس طرح دے گی۔ذرا ملاحظہ ہو:

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ۝ قَالَتْ فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ۖ وَلَقَدْ رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصَّاغِرِينَ ۝

"اس نے جو ان کی یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک چھری رکھ دی' (پھر عین اس وقت جبکہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسف ؑ کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اٹھیں "حاشا ﷲ' یہ شخص انسان نہیں ہے' یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"۔عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا' یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا' اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا"۔

اس نے ان عورتوں کو اپنے محل میں ایک دعوت میں بلایا' اس دعوت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعوت نہایت ہی ترقی یافتہ لوگوں کی دعوت تھی۔ایسی ہی عورتوں کو محلات میں دعوتیں دی جاتی ہیں۔اور نہایت ہی پر تکلف کھانے پیش کیے جاتے ہیں۔یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مشرقی روایات کے مطابق تکیہ لگا کر کھانا کھایا جاتا تھا۔چنانچہ اس نے کھانے کے لیے ایسی جگہ تیار کی جہاں یہ عورتیں تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں۔پھر ہر ایک کو چھری دی گئی تاکہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مصر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بہت ہی آگے نکل گیا تھا اور محلات میں لوگ پرتعیش زندگی بسر کرتے تھے۔کیونکہ ہزاروں سال قبل چھری کے استعمال کی اطلاع سے معلوم

ہوتا ہے کہ مادی اور تمدنی لحاظ سے مصری معاشرہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ یہ عورتیں گوشت اور میوے کاٹنے میں مشغول تھیں کہ عزیزہ نے یوسف ؑ کو حکم دیا کہ ذرا سامنے آؤ۔

قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ (۱۲ : ۳۱) "اس نے یوسف ؑ کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ"۔

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ (۱۲ : ۳۱) "جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں" اس کو دیکھ کر مبہوت رہ گئیں اور ان پر دہشت طاری ہو گئی۔

وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ (۱۲ : ۳۱) "اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں" اچانک دہشت زدگی کی وجہ سے انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر دیئے۔

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ (۱۲ : ۳۱) "اور بے ساختہ پکار اٹھیں ' "حاشا ءللہ" ' تخلیق قدرت پر حیراں ہو کر حاشاءللہ کہا جاتا ہے۔ دراصل حاشاءللہ کلمہ تنزیہ' اس موقعہ پر بولا جاتا ہے جہاں کسی ذات سے کسی الزام کی شدت سے نفی کی جائے۔

مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (۱۲ : ۳۱) "یہ شخص انسان نہیں ہے' یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"۔ جیسا کہ ہم نے اس سورت کے دیباچے میں کہا' ان تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کے بعض تصورات مصری معاشرے میں پھیل چکے تھے۔

اب عزیز کی بیوی کو یقین ہو گیا کہ اس نے میدان مار لیا ہے' اور اس کے خلاف باتیں بنانے والی عورتوں سے انتقام لے لیا ہے' اور خود یہ عورتیں دہشت زدہ' حیران بلکہ مبہوت ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب یہ عورتوں کے سامنے کھل جاتی ہے اور اپنے جنسی سکینڈل کو عورتوں کے سامنے کھول کر بیان کرتی ہے اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتی۔ اب وہ دھمکی آمیز لہجے میں اقرار کرتی ہے کہ اس شخص کو میری مرضی کے مطابق چلنا ہو گا ورنہ..... اب اس کی باتوں کا انداز اور ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (۱۲ : ۳۲) "عزیز کی بیوی نے کہا" "دیکھ لیا' یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں"۔ دیکھ لیا تم نے۔ ذرا اپنی حالت کو تو دیکھو' بتاؤ تم کیوں حیراں و پریشان اور حواس باختہ ہو گئی ہو۔

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ (۱۲ : ۳۲) "بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا"۔ اس نے مجھے اسی طرح حواس باختہ کر دیا ہے' میں نے اسے ورغلانے کی بہت کوشش کی مگر یہ بچ نکلتا ہے۔ یہ میری تمام کوششوں اور فتنہ سامانیوں کے مقابلے میں اپنے اصول پر جما ہوا ہے لیکن..... تعجب یہ ہے کہ اس مصری معاشرے میں اونچے طبقے کی یہ عورت علانیہ تمام عورتوں کے سامنے اپنے جنسی عزائم کا اظہار کر رہی ہے اور دھمکی بھی دیتی ہے۔

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ (۱۲ : ۳۲) ””اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا“۔

اب یہ عورت صنف نازک کے ورغلانے والے حربوں کے علاوہ بڑے فخر سے تشدد اور دھمکی کے ذرائع بھی استعمال کر رہی ہے۔ یہ دھمکی عورتوں کے مجمعے میں یوسف ؑ کو کھلے بندوں دی جا رہی ہے۔ اور انہی عورتوں کے سامنے جن میں سے ہر ایک اپنی فتنہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اور یہ دھمکی اسے خود اپنی مالکہ دے رہی ہے ' چنانچہ ایسے نازک اور خطرناک حالات میں صرف رب تعالیٰ ہی سے مدد لی جا سکتی ہے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ

””یوسف ؑ نے کہا“ ”اے میرے رب! قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کر[illegible] یہ مجھ سے چاہتی ہیں“۔

حضرت یوسف اب صرف عزیز کی بیوی کے خلاف دست بدعا نہیں بلکہ مصر کے اس اعلیٰ طبقہ [illegible] رتیں اب ان کے پیچھے پڑ گئی ہیں ' اپنی حرکات اور اپنی باتوں کی وجہ سے تمام عورتیں ان پر بچھی جا رہی [illegible] ہ اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں اور ان فتنوں کے مقابلے میں وہ اللہ کی نصرت طلب کرتے ہیں [illegible] ت سے ڈرتے ہیں کہ انہیں ہر طرف سے ورغلایا جا رہا ہے اور کسی بھی وقت ان سے کمزوری ظاہر نہ ہو [illegible] لیے وہ ان حالات میں اور ایسی سخت آزمائش میں خوف کھا رہے ہیں۔

وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾

””اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا“۔ یہ اس انسان کی پکار ہے جسے اپنی شریعت کا احساس ہے ' وہ جانتا ہے کہ انسان انسان ہے۔ وہ اگرچہ بچے ہوئے ہیں لیکن اپنی کمزوریاں بھی ان کی نظر میں ہیں۔ لہٰذا وہ اللہ کی حفاظت مزید چاہتے ہیں تاکہ وہ ان فتنوں کا مقابلہ اطمینان سے کر سکیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۴﴾

””اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کر دیں ' بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے“۔

اللہ نے ان کی سازشوں کو کس طرح پھیرا ' یہ کہ وہ ان سے مایوس ہو گئیں ' انہوں نے بہت سی چالیں چلیں اور تجربات کیے مگر وہ ان کے دام میں نہ آئے کہ عنقا را بلند است آشیانہ--- یہ بھی صورت تھی کہ ان فتنہ سامانیوں کا حضرت پر اثر ہی نہ ہوتا ' --- اللہ سمیع و علیم ہے وہ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے ' سن رہا ہے ' یہاں آکر حضرت یوسف ؑ زندگی کے اس دوسرے امتحان اور آزمائش میں کامیاب رہے۔ (بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ)

---○○○---

درس نمبر۱۰۸ ایک نظر میں

یہ سبق اس قصے کی تیسری کڑی ہے اور حضرت یوسف ؑ کی مشکلات زندگی کی بھی تیسری اور آخری کڑی ہے۔ اس کڑی کے بعد حضرت یوسف ؑ کی زندگی کے مشکل دن ختم ہونے والے ہیں۔اب آرام اور سکون ہی ہو گا۔اب حضرت یوسف ؑ کی زندگی کا امتحان دوسرے انداز میں ہو گا۔پہلے مصائب میں ان کی آزمائش تھی' اب عیش و آرام اور اقتدار کی زندگی میں ان کی آزمائش ہوگی۔اس کڑی میں ان کی آزمائش جیل جانے میں ہو رہی ہے یہ عجیب آزمائش ہے کہ وہ الزام سے بری ہوگئے ہیں پھر بھی جیل میں ہیں' ایک گناہ گار تو صبر کر لیتا ہے کیونکہ اس کو علم ہوتا ہے کہ اس نے قصور کیا ہے لیکن ایک بے گناہ جب قید ہوتا ہے تو اس کے لیے سزا ناقابل برداشت ہوتی ہے۔اگرچہ دل میں اسے یہ سکون ہوتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔

اس عرصے میں حضرت یوسف ؑ پر اللہ کے انعامات ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔اب ان کو تعبیر رؤیا کا علم لدنی عطا کر دیا گیا ہے' اسی طرح وہ تاویل احادیث میں ماہر ہو چکے ہیں' واقعات کے آغاز ہی میں وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ان کے نتائج کیا ہوں گے اور اس کے بعد اب بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف ؑ کی براءت کا بھی انتظام ہو رہا ہے' خود بادشاہ عورتوں کو بلا کر انکوائری کرتا ہے۔اب حضرت یوسف ؑ کی خفیہ صلاحیتیں سامنے آ رہی ہیں۔وہ بادشاہ کے مقرب خاص ہو کر تمام اختیارات کے مالک اور مقتدر اعلیٰ بن جاتے ہیں۔اور جس مقام پر اللہ نے ان کو پہنچانا تھا وہ پہنچ جاتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۰۸ تشریح آیات

۳۵ ـــــ تا ـــــ ۵۲

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾ ۴ ع۶ ۱۴

"پھر ان لوگوں کو یہ سوجھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ (اس کی پاک دامنی اور خود اپنی عورتوں کے برے اطوار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے"۔

محلات کی فضاؤں میں' آمریت کی چھاؤں میں' نوابوں کے درباروں میں اور جاہلیت کے نظاموں میں ایسے ہی فیصلے ہوتے ہیں۔ انہوں نے یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا' انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ عورت اس فرشتہ سیرت شخص کو عورتوں کی مجالس میں پیش کرتی ہے اور برملا دھمکیاں دیتی ہے' تمام مصری عورتوں کو یقین تھا کہ یہ عورت اپنے غلام کی محبت میں اندھی ہو رہی ہے اور اپنی فریفتگی کا اعلان کرتی پھر رہی ہے۔ یوسف علیہ السلام پر ان عورتوں کا دباؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ اللہ سے استعانت طلب فرماتے ہیں۔ دوسری جانب یہ عورت بھی اس بات پر تلی ہوئی ہے اور اعلان کر رہی ہے کہ یوسف کو اس کی مراد پوری کرنا ہوگی یا اسے قید خانوں میں ذلیل و خوار ہونا ہوگا' اب یا تو وہ حکم کی تعمیل کرے گا یا جیل جائے گا۔

ان حالات کے بعد یہ لوگ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ ایک عرصے کے لیے یوسف ؑ کو قید کر دیا جائے۔ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ یہ عورت اب مایوس ہوگئی ہوگی' دوسری جانب چہ میگوئیاں عام ہوگئی ہوں گی اور اب ان نام نہاد اونچے گھرانوں کی عزت کا تحفظ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ بے گناہ کو قید کر دیا جائے۔ یہ کام تو ان کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ اس نے چونکہ اس ترقی یافتہ عورت کی خواہشات کو پورا نہ کیا تھا لہٰذا اسے لازماً جیل جانا تھا' کیونکہ وہ بیچاری بدنام ہوگئی اور ہر طرف سے چہ میگوئیاں تھیں اور ہر محفل میں وہ موضوع سخن تھی۔

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ (۱۲ : ۳۶) "قید خانے میں دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے"۔ عنقریب سیاق کلام میں یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ لوگ بادشاہ کے خواص اور خدام میں سے تھے۔ یہاں قرآن مجید میں حضرت یوسف ؑ کے زمانہ قید کے حالات تفصیل سے بیان نہیں کیے گئے' لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ قید خانے میں آپ کی طہارت اخلاق اور نیکی اور سنجیدگی اور وقار اس قدر عام ہوگیا کہ تمام قیدیوں میں آپ ایک مثال بن گئے۔

یہ تمام قیدیوں کے لیے معتمد اعلیٰ بن گئے' ان قیدیوں میں وہ لوگ بھی تھے جو شاہی عتاب کی وجہ سے قید خانے میں پڑے تھے۔کیونکہ شاہی محل اور شاہی دربار میں ان سے کچھ قصور سرزد ہو گئے ہوں گے۔چنانچہ ان پر عارضی طور پر عتاب وارد ہو گیا تھا۔ بہرحال قرآن واقعات قصے کو جلدی آگے بڑھانے کے لیے باقی تفصیلات ترک کر دیتا ہے اور صرف دو نوجوانوں کا تذکرہ کرتا ہے۔یہ دو نوجوان حضرت یوسف ؑ کے پاس آئے اور انہوں نے ان کے سامنے اپنے خوابوں کو پیش کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ آپ ان کی تعبیر بتائیں۔ان لوگوں نے تعبیر خواب کے لیے حضرت یوسف ؑ کا انتخاب کیوں کیا؟ اس لیے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ سچے 'نیک' عبادت گزار اور ذکر و فکر کے مالک تھے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾

"ایک روز ان میں سے ایک نے کہا "میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں"۔ دوسرے نے کہا "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتایئے'ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں"۔

اب حضرت یوسف ؑ کو یہ موقعہ ہاتھ آ گیا کہ وہ قیدیوں کے سامنے اپنا نظریہ حیات پیش کریں۔ان کو صحیح عقیدہ دیں'کیونکہ قیدی کے لیے یہ ممنوع نہیں ہے کہ ان کا عقیدہ اچھا ہو۔قیدیوں کی نظریاتی اور عملی تربیت بھی ضروری ہے۔ لہٰذا حضرت یوسف ؑ ان کو تلقین کرتے ہیں کہ تمام خرابیوں کی جڑ فاسد نظام زندگی ہے جس میں حکم اور اقتدار اعلیٰ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہو۔ چنانچہ وہ ان کو تلقین کرتے ہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کو اس کرۂ ارض کا رب تسلیم کرنا اصل گمراہی ہے'اس طرح حکمران فرعون بن جاتے ہیں۔

حضرت یوسف ؑ اپنی بات کا آغاز اس موضوع سے کرتے ہیں جس میں اس کے جیل کے دونوں ساتھیوں کو دلچسپی ہے لیکن ان سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے دلچسپی کے موضوع پر بات ذرا بعد میں آئے گی۔اور وہ خوابوں کی صحیح صحیح تعبیر بتا دیں گے کیونکہ اس شعبے میں اللہ نے ان کو علم لدنی دیا ہے اور یہ اس لیے دیا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کرتا ہوں اور اللہ کے ساتھ میں اور میرے آباؤ اجداد کسی کو شریک نہیں کرتے'یوں حضرت یوسف ؑ ان لوگوں کو یقین دہانی کراتے ہیں کہ وہ تعبیر خواب بھی بتائیں گے اور یہ کہ حضرت یوسف ؑ کا دین بھی نہایت ہی متین دین ہے۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ

بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"یوسف ؑ نے کہا" یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر' جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں' اپنے بزرگوں ابراہیم ؑ' اسحاق ؑ اور یعقوب ؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ در حقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کی بات کس قدر دل نشین ہے اور وہ بات سے کس طرح بات نکالتے چلے جاتے ہیں اور کس قدر نرمی اور لطافت کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ اس پورے قصے میں حضرت یوسف ؑ کی بات چیت کی یہ امتیازی خصوصیت ہے۔

قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ (۱۲ : ۳۷) "یوسف ؑ نے کہا" یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں"۔

یہ تاکید اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ حضرت یوسف ؑ کو اس معاملے میں ایک خاص علم دیا گیا ہے کہ کھانے آنے سے قبل ہی وہ اپنے اس مخصوص علم کے ذریعے ان کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتا دیں گے۔ اور یہ علم ان کو اس لیے دیا گیا تھا کہ اس دور میں خوابوں کی تعبیر کے فن نے کافی ترقی کی ہوئی تھی۔ "یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں"۔ یہ الفاظ حضرت یوسف ؑ نے اس لیے استعمال کیے کہ ان لوگوں پر نفسیاتی اثر ہو جائے اور حضرت یوسف ؑ کی بات ان کے دل میں اتر جائے۔ اور وہ ان خوابوں کی تعبیر کی وجہ سے یوسف ؑ کی دعوت کو قبول کر لیں جبکہ یہ تعبیر نہایت ہی مخصوص انداز کی تھی۔

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۱۲ : ۳۷)
"واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر' جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں"۔

یہ اشارہ اس قوم کی طرف بھی ہے جس میں ان کی تربیت ہوئی' یعنی عزیز مصر کا گھرانا اور شاہ مصر کے حاشیہ نشین' اور اس پوری قوم کی طرف بھی جو شاہ مصر کی مطیع فرمان تھی' جبکہ یہ دونوں نوجوان ظاہر ہے کہ بادشاہ اور اپنی قوم ہی کے دین پر تھے لیکن حضرت یوسف ؑ ان کے ساتھ بات کرنے میں یہ نہیں فرماتے کہ میں نے تمہارا دین چھوڑ دیا ہے

بلکہ ایک عام بات فرماتے ہیں تاکہ ان نوجوانوں کے دلوں میں دین اسلام سے نفرت پیدا نہ ہو جائے۔ یہ نہایت ہی دانشمندی اور اعلیٰ درجے کی حکمت تبلیغ ہے اور نہایت ہی لطافت اور فراست کے ساتھ بات پہنچانے کا انداز ہے۔

نشانات کفر بتانے کے بعد یوسف علیہ السلام ان نوجوانوں کے سامنے نشانات ایمان بھی رکھتے ہیں' جن پر وہ اور ان کے آباء چل رہے ہیں۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ

مِنْ شَیْءٍ (۱۲:۳۸) "اپنے بزرگوں' ابراہیم ؑ' اسحاق ؑ اور یعقوب ؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک ٹھہرائیں۔

ملت اسلامیہ مکمل توحید کی ملت ہے' اور اس میں اللہ کے ساتھ شرک کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ توحید کی طرف ہدایت کرنا اللہ کی طرف سے فضل و کرم ہے۔ اور یہ فضل و کرم اس قدر عام ہے کہ ہر شخص اس کو قبول کر سکتا ہے اور حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا رجحان اور اس کے اصول انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ اور اس کے اشارات اور براہین انسانی ماحول کے اندر بھی موجود ہیں۔ رسولوں کی ہدایات اور کتب سماوی میں اس کی تعلیمات بھی موجود ہیں لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اس عمومی فضل و کرم سے اپنے آپ کو محروم رکھ رہے ہیں۔

ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا

یَشْكُرُوْنَ (۱۲:۳۸) "درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔

حضرت یوسف ؑ آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں اپنی بات اتار رہے ہیں۔ نہایت ہی احتیاط کے ساتھ' نہایت نرمی کے ساتھ۔ ان کے دلوں میں بات کو بٹھاتے چلے جاتے ہیں اور اپنے عقائد و نظریات کا اظہار آہستہ آہستہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور ساتھ یہ بھی واضح کرتے چلے جاتے ہیں کہ تمہارے اور تمہاری قوم کے عقائد و نظریات غلط' فاسد اور باطل ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں وہ سوسائٹی ایک فاسد سوسائٹی ہے جس میں وہ رہ رہے ہیں۔ اس طویل تمہید کے بعد حضرت یوسف ؑ اصل بات کہتے ہیں۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

"اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو' وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں' اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ان نہایت ہی مختصر' واضح اور فیصلہ کن کلمات کے اندر دین اسلام کے پورے نشانات راہ نقش کر کے رکھ دیئے ہیں۔ اس دین کے پورے عناصر ترکیبی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ حضرت یوسف ان نشانات اور ان عناصر کی طرف براہ راست دعوت نہیں دیتے بلکہ ان کو ایک موضوع غور و فکر کے طور پر ان کے سامنے رکھتے ہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲:۳۹)

"اے زندان کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟"

یہ ایک ایسا سوال ہے کہ براہ راست انسانی فطرت کی گہرائیوں میں لگتا ہے اور فطرت انسانی کو خوب جھنجوڑتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ الہ ایک ہونا چاہئے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ یہ فطرت کا تقاضا ہے تو پھر کیوں تم ارباب متفرقون کے قائل ہو' یعنی جو ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اسے رب اور حاکم تسلیم کیا جائے' جس کی عبادت اور بندگی کی جائے اور جس کی اطاعت کی جاتی رہے۔ وہ صرف اللہ واحد اور قہار ہی ہے۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ انسانی فطرت اور عالم کی فطرت کا الہ اور رب اللہ وحدہ ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کی اختیاری زندگی میں رب' حکم اور شارع وہی اللہ وحدہ ہو۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ وحدہ ہی خالق اور قاہر ہے اور پھر بھی وہ غیر اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں۔ اور اس کے سوا پھر کوئی ان کا حاکم ہو۔ رب ہی الہ اور حاکم ہوتا ہے۔ وہ اس پوری کائنات کے امور کو بھی چلاتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ذات کائنات کو نہ چلا سکتی ہو اور وہ ھُو رَبُّ النَّاس ہو یہ عقلاً ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا اللہ واحد اور قہار ہی اس بات کا مستحق ہے اور بہتر ہے کہ لوگ اس کی بندگی کریں۔ بجائے اس کے کہ وہ ارباب متفرقہ کی بندگی کریں جن کو اندھی جاہلیت نے گھڑ رکھا' جس کی نظر کوتاہ ہوتی ہے اور وہ فریب کے سوا کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ انسانیت کے لیے سب سے بڑی بدبختی ہی یہ ہے کہ وہ ایک الہ کے بجائے متعدد الہوں کو ماننے اور یہ متعدد الہ اس کی زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ ان کے رجحانات اور میلانات کے اندر بھی کشمکش ہو اللہ کے سوا جس قدر ارباب ہم نے بنا رکھے ہیں یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے حق حاکمیت پر دست درازی کرتے ہیں اور ہم نے اپنی جاہلیت کی وجہ سے' وہم پرستی کی وجہ سے خرافات اور قصے کہانیوں کی وجہ سے ان ارباب من دون اللہ کو رب تسلیم کر رکھا ہے۔ یا بعض جبار و قہار انسانی الہوں نے اپنی ربوبیت کا نظام لوگوں پر جبراً مسلط کر رکھا ہے۔ اور یہ انسانی ارباب ایک منٹ کے لیے بھی اپنے ذاتی مفادات' اپنے وجود اور اپنی عزت کی بقا کے جذبات اور خواہشات سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اور ان کے دلوں میں یہ

خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے کہ عوام الناس پر ان کا تسلط جاری اور باقی رہے۔ ایسے الہوں کی پالیسی اور دائمی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ ان قوتوں کو کچل کر رکھ دیتے جن سے انہیں براہ راست یا بالواسطہ کوئی بھی خوف ہو۔ نیز یہ الٰہ ان قوتوں کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں ان کی پرورش کرتے ہیں اور ان کے حق میں پروپیگنڈہ کرتے جو ان کی خدائی کے قیام اور بقا میں مدد و معاون ہوتی ہیں۔ یہ الٰہ ایسے تمام اداروں کی ترقی اور عزت افزائی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

جبکہ اللہ واحد اور قہار ہے اور وہ دونوں جہانوں سے غنی ہے۔ اللہ کا مطالبہ لوگوں سے صرف یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں، نیکی کی راہ لیں اور اپنی اصلاح اور اپنے ماحول کی اصلاح و تعمیر کریں اور یہ اصلاحی اور تعمیری کام اللہ کی قائم کردہ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا کام بھی پورے کا پورا عبادت ہو گا۔ اللہ نے جو عبادات انسانوں کے لیے فرض کی ہیں وہ بھی ایسی ہیں جن سے خود انسانوں کے دل و دماغ اور سیرت و کردار کی اصلاح مطلوب ہے۔ ورنہ اللہ کو تو انسانوں کی طرف سے کسی عبادت اور بندگی کی ضرورت نہیں ہے۔

(یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَ اللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ) "اے لوگو، تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور صرف اللہ ہی غنی اور حمید ہے" اس لئے اللہ کی بندگی اور غلامی اور اللہ کے دوسرے الہوں کی بندگی اور غلامی میں بہت فرق ہے"

اس کے بعد حضرت یوسف ؑ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔ اور اب وہ ذرا کھل کر جاہلیت کے افکار اور اوہام پر تنقید فرماتے ہیں۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۱۲ : ۴۰) "اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی"۔

یہ ارباب، خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا غیر انسان ہوں، مثلاً فرشتے، ارواح اور شیاطین یا دوسری کائناتی قوتیں جو اللہ کے تابع ہیں، یہ کسی معنی میں بھی رب نہیں ہیں۔ اور نہ ان کو حقیقت ربوبیت میں سے کوئی حقیقت حاصل ہے۔ کیونکہ حق ربوبیت اور مقام ربوبیت صرف اللہ وحدہ کو حاصل ہے اور وہی اس کا سزاوار ہے۔ کیونکہ وہی خالق ہے اور اسی کے کنٹرول میں تمام مخلوقات زندہ رہ رہی ہیں۔ لیکن مختلف جاہلیتوں میں لوگوں نے خود اپنی طرف سے بعض قوتوں کو رب کے نام سے موسوم کر دیا ہے، یہ رب حقیقی کی صفات کو ان نام نہاد ارباب کی طرف منسوب کرتے ہیں جبکہ درحقیقت ان کے اندر نہ صفات موجود ہیں اور نہ ان کو رب حقیقی کی طرح کسی پر قہر اور غلبہ حاصل ہے۔

اب حضرت یوسف علیہ السلام ان کے غلط عقائد پر آخری ضرب لگاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اصل سلطنت کا حقدار و سزاوار کون ہے؟ کون اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے؟ کون اس بات کا حقدار ہے کہ اس کی بندگی کی جائے فقط اس کی؟

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ : ۴۰) ''فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو' یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''۔

حکم اور حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے' حاکمیت خاصہ خدائی ہے۔ اس لیے اللہ کے سوا کوئی اور حاکم ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کے سوا کوئی اور شخص اگر اللہ کے اس حق میں کوئی دعویداری کرے گا تو اس کا مقدمہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو گا' چاہے اللہ کے سوا حاکمیت کا دعویٰ کرنے والا کوئی فرد واحد ہو' یا کوئی طبقہ ہو یا کوئی جماعت' یا کوئی امت یا سب کے سب لوگ ہوں یا کوئی عالمی ادارہ ہو۔ اور جو شخص اللہ کے بالمقابل اپنی حاکمیت (Sovereiqnty) کا مدعی ہو گا وہ گویا کفر کا ارتکاب کرے گا اور یہ اس کی جانب سے واضح کفر ہو گا۔ اور یہ آیت اس پر نص صریح ہے۔

اب کوئی شخص کس طرح اللہ کے بالمقابل دعوائے الوہیت کر سکتا ہے؟ کسی بھی صورت میں اگر کوئی دعویٰ کرے گا تو مدعی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گا چاہے وہ فرعون کی طرح دعویٰ کرے اور کہے (اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى) یا وہ کہے (مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ) یا وہ اسلامی شریعت کو نظام حکمرانی سے خارج کر دے یا وہ یہ فیصلہ کر دے کہ حکمرانی اور قانون سازی کا مرجع اللہ کے سوا کوئی اور ہو گا۔ اگرچہ وہ فرد ہو یا انسانوں کا کوئی مجموعہ ہو۔

اسلامی نظام میں امت مسلمہ ہی حاکم کا انتخاب کرتی ہے اور کسی شخص کو حاکمیت کا اختیار دیتی ہے اور وہ یہ اختیارات استعمال کرتا ہے لیکن وہ اپنے اختیارات شرعی حدود کے اندر استعمال کر سکتا ہے۔ اسلامی نظام میں کوئی شخص یا کوئی ادارہ مصدر قانون سازی اور مصدر حاکمیت نہیں ہوتا' حاکمیت اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہو گا۔ بے شمار مسلم مفکرین حق حاکمیت کے استعمال اور مصدر حاکمیت کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان حق حاکمیت کے مالک نہیں ہیں۔ حق حاکمیت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے تو ان کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو نظام قانون اور دستور متعین فرما دیا ہے' انسان صرف اس کے نافذ کرنے والے ہیں۔ لیکن جو دستور اور قانون اللہ نے نہیں بنایا اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اور اس کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اس بات کی دلیل بھی بیان کرتے ہیں: (اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۱۲ : ۴۰) ''اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو''۔ اس دلیل کو ہم تب ہی سمجھ سکتے ہیں جب ہم لفظ عبادت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اسی طرح جس طرح عرب اسے سمجھتے تھے۔

عبد کا مفہوم عربی میں ہے (دان وخضع وذل) یعنی تابع ہوا' تابع فرمان ہوا اور کسی کے سامنے جھکا اور ذلیل ہوا۔ آغاز اسلام میں عبادت کا مفہوم بھی مراسم عبودیت اور پرستش نہ تھا۔ اس لیے کہ جب سب سے پہلے یہ آیات نازل ہوئیں تو اس وقت مراسم عبودیت فرض ہی نہ تھے۔ یہ (نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ اور جہاد) بعد میں فرض ہوئے۔ ابتداء میں عبادت کا لفظ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال ہوا تھا جو بعد میں اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا۔ ابتداءً اس لفظ کا مفہوم یہ تھا کہ صرف اللہ کی اطاعت کی جائے' صرف اللہ کے سامنے جھکا جائے' صرف اللہ کے احکام مانے جائیں' ان

احکام کا تعلق عبادات کے مراسم سے ہو' یا اخلاقی امور سے ' یا قانونی امور سے ' ان تمام شعبوں پر لفظ عبادت کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس کے مفہوم میں اطاعت اور بندگی شامل تھی جس کے بارے میں اللہ کا حکم تھا کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور بندگی نہ کی جائے۔

جب ہم عبادت کے اس مفہوم کو معلوم کر لیں تو پھر ہماری سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے کہا حکم اللہ کا ہے' اس لیے عبادت اور بندگی اور اطاعت بھی صرف اسی کی ہے۔ اگر حکم کسی اور کا ہو تو پھر صرف اللہ کی بندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور حکم اللہ کا ہے' ایک عام اصول ہے اس سے مراد تکوینی حکم بھی ہے کہ اس کائنات کے بارے وہی متصرف فی الامور ہے اور اس سے مراد شرعی اور قانونی حاکمیت بھی ہے کہ شرعی اور تکوینی امور بھی اللہ ہی کے ہوں گے۔

میں اس بات کو دوبارہ دہراتا ہوں کہ جو شخص حاکمیت کے حق میں اللہ کے برخلاف دعویداری کرتا ہے وہ دین اسلام سے خارج ہے۔ اور اس کے بارے میں اسلام کا حکم واضح اور لازمی ہے اور یہ دراصل بدترین شرک اور کفر بواح (صریح کفر) ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ کے بالمقابل حاکمیت کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس کا اقرار کرتے ہیں اور دل سے اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اپنے دل میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے وہ لوگ بھی کفر بواح کے مرتکب ہیں اور وہ دین اسلام سے سے خارج ہیں۔

حضرت یوسف ؑ فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ ہی حاکم مطلق ہے اس لیے اللہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور یہی درست اور صحیح دین ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۱۲: ۴۰) "یہی دین قیم ہے" یعنی اس کے سوا دین قیم کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ درست دین وہی ہے جس میں حاکمیت صرف اللہ کی ہو۔ اور اللہ کی حاکمیت کا اظہار اس طرح ہو کہ لوگ صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں۔

چونکہ لوگ حقیقت کو نہیں جانتے' اس لیے لازم نہیں آتا کہ اپنی جہالت کی وجہ سے وہ دین قیم پر متصور ہوں۔ اس لیے کہ جو دین اسلام کو جانتا ہی نہیں اس کی زندگی میں دین کا وجود متحقق کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر لوگوں کی حالت یہ ہو کہ وہ حقیقت دین ہی سے بے خبر ہیں تو عقلاً' حقیقتاً اور بطور واقعہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دین پر ہیں۔ یہ جہالت کوئی عذر نہیں ہے جو ان کو صفت اسلام سے متصف کر دے۔ کیونکہ جہالت تو سرے سے صفت دین ہی کی نفی کر دیتی ہے کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک اسلام کا اعتقاد نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اسلام کو جانے نہیں۔ یہ بات نہایت ہی منطقی اور بدیہی ہے۔

حضرت یوسف ؑ نے ان واضح اور فیصلہ کن اور مختصر کلمات کے ذریعے شرک کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے اور دین اسلام کے حقیقی نشانات مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اسلامی نظریہ حیات کے تمام بنیادی عناصر یہاں بیان کر دیئے ہیں اور ایک دو فقروں میں جاہلیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔

دنیا میں طاغوتی نظام قائم ہی تب ہوتا ہے جب وہ اللہ سے حق حاکمیت چھین لے اور لوگوں سے اللہ کے بجائے اپنی اطاعت کرائے۔ یعنی لوگ اللہ کی شریعت اور قانون کے بجائے اس کی شریعت کے مطیع فرمان ہوں اور وہ طاغوتی سوچ' طاغوتی قانون اور طاغوتی احکام اور اطاعت رائج کر دیں۔ اس کے سوا طاغوت قائم ہی نہیں ہوتا۔

طاغوتی نظام قائم ہی تب ہوتا ہے جب دین اسلام دنیا سے غائب ہو جائے ۔ جب لوگوں کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ راسخ ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم اور مطاع نہیں ہے اور تمام معاملات زندگی میں انسانوں نے صرف اللہ کی اطاعت کرنا ہے تو اس وقت طاغوتی نظام قائم ہی نہیں ہوتا۔

یہاں حضرت یوسف اپنا حقیقی درس اور تعلیم ختم فرما دیتے ہیں اور اس تقریر کو انہوں کے ابتداء ہی میں قیدیوں کی مراد اور مطلب سے مربوط کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں تاکہ قیدیوں کے سوال کا جواب بھی دے دیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ

"اے زنداں کے ساتھیو' تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (شاہ مصر) کو شراب پلائے گا' رہا دوسرا تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے"۔

حضرت یوسف نے اچھے انجام پانے والے اور برے انجام تک پہنچنے والے کا یہاں تعین نہیں فرمایا کیونکہ انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ برا انجام پانے والے کو ذاتی طور پر مخاطب کریں البتہ انہوں نے تاکید سے کہہ دیا کہ انجام یہی ہو گا۔ یہ امر فیصل شدہ ہے جس طرح فیصلہ ہے ویسا ہی ہونے والا ہے۔

قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

"فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے"۔

حضرت یوسف ایک نا کردہ گناہ قیدی تھے۔ بادشاہ نے ان کی قید کا حکم بغیر سوچ اور تحقیق کے صادر فرما دیا تھا۔ شاید اس کے حاشیہ نشینوں نے عزیز مصر کی بیوی کے واقعہ کو اس طرح اس کے سامنے پیش کیا کہ اس میں حضرت یوسف کو گناہ گار کر کے پیش کیا ہو' جس طرح بااثر طبقات عموماً ایسا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف نے اس موقعہ پر یہ مناسب سمجھا کہ وہ بادشاہ تک یہ بات پہنچا دیں کہ وہ ان کے معاملے میں تحقیق کرے۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ؗ

"پھر ان میں سے جس کی متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسف نے کہا کہ "اپنے رب (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا"۔

یعنی میرے حالات' میرا واقعہ اور میری حقیقت کا ذکر اپنے رب اور حاکم کے سامنے کرنا جس کے قانونی اور دستوری نظام کے تم تابع ہو۔ اور جس کے احکام کے تم مطیع ہو۔ ان معنوں میں ہی وہ تمہارا رب ہے۔ کیونکہ رب کے

معنی ہی یہ ہیں کہ جو حاکم ' سردار اور قانون دہندہ ہو۔اسلامی اصطلاح میں ربوبیت کا جو مفہوم ہے یہاں اسے واضح کر دیا گیا ہے ـ یہاں یہ بات پیش نظر رہنا چاہئے کہ حضرت یوسف ؑ گڈریوں کے دور میں تھے اور گڈریئے بادشاہوں کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ وہ خود رب ہیں جس طرح فراعنہ کا عقیدہ تھا۔نہ وہ فرعونوں کی طرح اپنے آپ کو الٰہ سمجھتے تھے ـ ان کے نزدیک ربوبیت کا مفہوم حاکمیت تھا' یہاں لفظ رب صریح طور پر حاکم کے معنی میں استعمال ہوا ہے ـ

اب یہاں سیاق کلام یہ تفصیلات نہیں دیتا کہ قیدی ساتھیوں کا انجام اسی طرح ہوا جس طرح حضرت یوسف نے خواب کی تعبیر کی تھی ـ یہاں قصے میں خلا چھوڑ دیا جاتا ہے ـ قارئین خود معلوم کر لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن جس شخص کے بارے میں حضرت یوسف ؑ کی تاویل یہ تھی کہ وہ نجات پائے گا' اس نے حضرت یوسف کے بارے میں حضرت یوسف ؑ کی وصیت کو پورا نہ کیا۔جب وہ شاہی محلات کی زندگی کی ہماہمی میں دوبارہ پہنچا تو وہ ان سرگرمیوں میں مدہوش ہوگیا' اس نے درس توحید بھی بھلا دیا' حضرت یوسف ؑ کے مسئلے کو بھی پیش نہ کیا۔

۵
ع ۷ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾
۱۵

"مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف کئی سال قید خانے میں پڑے رہے"۔

یہ آخری ضمیر لبث) حضرت یوسف ؑ کی طرف عائد ہے ـ اللہ کی حکمت کی مشیت یہ تھی کہ حضرت یوسف ؑ تمام دنیاوی اسباب سے کٹ کر صرف اللہ پر بھروسہ کریں۔ مشیت ایزدی کے نزدیک یہ بات حضرت یوسف ؑ کے شایان شان نہ تھی کہ ان کی رہائی کسی دنیاوی اور انسانی ذریعے سے ہو۔

اللہ کے مخلص بندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے لیے خالص ہو جائیں' وہ صرف اس کو اپنی حاجات میں پکاریں اور دعاکریں کہ اللہ ان کو ثابت قدم رکھے ـ اور اگر کبھی ان بندوں سے کوتاہی ہو جائے تو پھر ان پر اللہ کا فضل ہوتا ہے ـ اور وہ اپنی حقیقی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں ـ وہ از سرنو شوق' محبت اور رضامندی سے اللہ کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں ـ اور ان پر اس کا فضل وکرم پورا ہو جاتا ہے ـ

منظر پھر منتقل ہو جاتا ہے ـ اب ہم بادشاہ کے دربار میں پہنچ جاتے ہیں۔ بادشاہ نے ایک اہم خواب دیکھا ہے ـ وہ اپنے حاشیہ نشینوں اور کاہنوں اور مذہبی لیڈروں سے اس کی حقیقی تاویل دریافت کرتا ہے ـ

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

"ایک روز بادشاہ نے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں ' اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی ۔اے اہل دربار مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو" ۔لوگوں نے کہا "یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے"۔

بادشاہ نے اس خواب کی تعبیر چاہی اور اس کے اردگرد بیٹھنے والے حاشیہ نشین اور درباری مذہبی لیڈر ان خوابوں کی تعبیر نہ بتا سکے ۔یا انہوں نے محسوس تو کر لیا تھا کہ ملک کو کچھ مشکلات درپیش آنے والی ہیں لیکن وہ بادشاہ کے سامنے کسی بدشگونی کے اظہار کی جرأت نہ کر سکے ۔شاہی درباریوں کا یہ طریقہ کار ہوتا ہے کہ وہ بات کو ٹال دیتے ہیں اور یا جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی اسے نظرانداز کر دیتے ہیں ۔چنانچہ انہوں نے ان اہم خوابوں پر ایسا ہی تبصرہ کیا کہ یہ خواب ہائے پریشان ہیں اور ان کو ان تاویل کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی ہے ۔کیونکہ ان خوابوں میں کوئی واضح اشارہ نہیں ہے ۔

یہاں تک تین خوابوں کے ساتھ ہمارا واسطہ پڑ چکا ہے ۔حضرت یوسف ؑ کا خواب ' یوسف ؑ کے دو قیدی ساتھیوں کے خواب ' اور اب بادشاہ وقت کا خواب ۔ان خوابوں کی تعبیر اور ان خوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مصر اور مصر سے باہر اردگرد کی دنیا میں تعبیر خواب کا فن بہت ہی زوروں پر تھا اور اللہ نے حضرت یوسف ؑ کو اپنی جانب سے جو صلاحیت دی ' کہ وہ خوابوں کی تعبیر تک پہنچ جاتے تھے ' وہ ایک ایسا کمال تھا جو روح عصر تھا ۔اور تمام انبیاء کو جو بھی معجزات دیئے جاتے ہیں وہ ان کے عصری ماحول کی مناسبت سے ہوتے ہیں ۔تو کیا خوابوں کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ایک معجزہ تھا ۔یہاں فی ظلال القرآن میں ہم ایسی بحثیں نہیں چھیڑتے ۔بہرحال بادشاہ نے خواب دیکھا ہے اور اس کی تعبیر کی تلاش ہے ۔

یہاں بچ جانے والے قیدی ساتھی کو حضرت یوسف ؑ یاد آ جاتے ہیں ۔اس سے قبل شیطان نے اس سے حضرت یوسف ؑ کو بھلا دیا تھا اور یہ شخص محل کی ہماہمی ' مہمانوں ' شرابوں اور عیش و طرب میں مصروف ہو گیا تھا ۔اب اسے حضرت یوسف ؑ یاد آتے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے تعبیر بتلائی تھی اور وہ حقیقت کی طرح نمودار ہوئی تھی ۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

"ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی ' اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں ' مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف ؑ کے پاس) بھیج دیجئے"۔

---()()()---

یہ شخص کہتا ہے کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کی تاویل کیا ہے ۔اب یہاں پردہ گرتے ہی یہ منظر ختم ہو جاتا ہے ۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو ہم جیل میں حضرت یوسف ؑ کا مکالمہ سنتے ہیں ۔

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ

يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٦﴾

''اس نے جاکر کہا ''یوسف ؑ اے سراپا راستی ' مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی ' شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں''۔

یہاں یہ شخص یوسف ؑ کے لیے صدیق کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یعنی بکثرت سچائی بولنے والے یہ لفظ اس لیے استعمال کرتا ہے کہ اس نے دیکھ لیا کہ حضرت اعلیٰ درجے کے صدیق ہیں۔ اور پھر بادشاہ کا خواب نقل کر دیتا ہے۔ افتنا.....

یہ شخص خواب کے الفاظ پورے کے پورے نقل کرتا ہے کیونکہ خواب کی تعبیر چاہتا ہے۔ لہذا پورا خواب بتانا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ خواب لفظ بلفظ نقل کرتا ہے۔

یہاں حضرت یوسف ؑ خواب کی تعبیر بھی بتاتے ہیں اور ساتھ ہی تجاویز اور مشورے بھی دیتے ہیں۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ

''یوسف ؑ نے کہا ''سات برس تک لگاتار تم کھیتی باڑی کرتے رہو گے''۔ یعنی مسلسل اور پے در پے۔ یہ سرسبز اور شاداب سال ہوں گے اور ان کی طرف ''بقرات سمان'' سے اشارہ کیا گیا تھا۔

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿٤٧﴾

''اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو ان میں سے بس تھوڑا سا حصہ ' جو تمہاری خوراک کے کام آئے ' نکالو اور باقی کو اس کی بالیوں ہی میں رہنے دو''۔

یعنی ان سالوں میں جو فصل تم کاٹو اسے خوشوں کے اندر چھوڑ دو تاکہ وہ حشرات ارض اور دوسرے موسمی اثر سے محفوظ رہیں۔۔ ہاں جسے تم نے استعمال کرنا ہے اسے صاف کرو لیکن استعمال شدہ حصہ تھوڑا ہونا چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ غلہ مشکل وقت کے لیے بچ جائے۔

ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿٤٨﴾

''پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اس زمانے میں وہ سب غلہ کھا لیا جائے گا جو تم اس برے وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو''۔

یہ سات سال اس طرح سخت ہوں گے کہ ان میں زرعی پیداوار نہ ہوگی۔ ''یہ سال سب کچھ کھا جائیں'' اس سے

مقصود یہ ہے کہ یہ سال قحط سالی کے ہوں گے اور ان سے وہی کچھ بچے گا جو تم نے سابقہ سالوں میں محفوظ کر لیا ہو گا۔

ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ ۶ ع۷ ۱۲

"اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں باران رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں گے"۔

اب یہ سات خشک سال ختم ہوں گے' تمہارا سابقہ محفوظ غلہ بھی ختم ہو گا اور اب سرسبزی اور شادابی کا دور لوٹ آئے گا۔ بارشیں ہوں گی' پانی اور فصل زیادہ ہوں گے' انگوروں کی فصل بکثرت ہو گی اور لوگ ان کا جوس نکالیں گے' شراب بنائیں گے۔ اسی طرح تل اور زیتون اور دوسرے مغزیات ہوں گے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ سات سالہ خشک سالی کے بعد خوشحالی کے اس دور کی طرف بادشاہ کے خواب میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے لدنی اور نبوی علم کے بل بوتے پر کہہ رہے ہیں' اس طرح حضرت یوسف ؑ نے اس شاہی فرستادے کو خوشخبری دی کہ سات سالہ مشکل دور کے بعد وسیع پیمانے پر خوشحالی کا دور آئے گا تاکہ وہ بادشاہ کو اس کی اطلاع دے۔

---()()()---

اب یہاں ہمارے سامنے ایک دوسرا منظر آتا ہے اور ان دونوں مناظر کے درمیان ایک خلا ہے۔ یہ خلا انسانی تخیل خود بھر دیتا ہے۔ اب ہم دوبارہ شاہی دربار میں ہیں۔ یہاں فرستادۂ شاہی نے مکمل رپورٹ دے دی ہے' خواب کی تعبیر بتا دی گئی ہے۔ اب اس نے بادشاہ کو حضرت یوسف ؑ کی ناجائز سزا کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ لیکن سیاق کلام میں یہ باتیں مذکور نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے بادشاہ کی خواہش آتی ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ

"بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ"۔

مزید تفصیلات ترک کر دی جاتی ہیں۔ بادشاہ کا حکم ہے۔ ہرکارہ خود حضرت یوسف ؑ کے پاس پہنچتا ہے۔ لیکن حضرت یوسف ؑ ہرکارے کو لوٹا دیتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ یہ ہرکارہ وہی ساقی ہے یا کوئی اور ہے۔ شاہی اوامر کا نفاذ شاید کسی اور کے ذمے ہو۔ لیکن حضرت یوسف ؑ طویل قید کے بعد بھی قید خانے سے نکلنے میں جلدی نہیں فرماتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے مقدمے کا صحیح فیصلہ ہو' احقاق حق ہو اور غلط کار لوگوں کی سازشیں بے نقاب ہوں اور وہ باعزت طور پر بری ہو کر نکلیں۔ یہ اطمینان قلب اور یہ طمانیت صرف ربانی تربیت کے نتیجے میں آ سکتی ہے۔ اب وہ اس قدر پختہ کار ہو گئے ہیں کہ ان کے مزاج میں عجلت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

حضرت یوسف ؑ کی سنجیدگی اور پختہ کاری اور طمانیت دونوں موقف میں واضح ہوتی ہے' پہلے انہوں نے ساقی کو صرف یہ کہا کہ اپنے رب کے پاس میرا تذکرہ کر دے۔ اور دوسرے میں انہوں نے رہائی کے احکام کے باوجود یہ کہہ دیا

کہ پہلے میرے مقدمے کی تحقیقات کرو' لیکن پہلے موقف اور دوسرے موقف میں فرق ہے کیونکہ چند سالوں کی قید اور تربیت نے ان کو مزید پختہ کار بنا دیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۝

''مگر جب شاہی فرستادہ یوسف ؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا ''اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے''۔

حضرت یوسف ؑ نے رہائی کے شاہی احکام کو اس لیے مسترد کیا کہ بادشاہ کو صحیح طرح معلوم تو ہو جائے کہ ان کی معاملے کی حقیقت کیا ہے اور ان عورتوں کے الزامات کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت یوسف ؑ نے عورتوں کے واقعات کی طرف اشارہ کر کے گویا یہ کہہ دیا کہ تحقیقات ہونے پر وہ عورتیں اصل صورت حال بتا سکتی ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ یہ تحقیقات یوسف ؑ کی عدم موجودگی میں ہو تاکہ یوسف کی شاہی دربار میں موجودگی غیر جانبدارانہ تحقیقات کو متاثر نہ کر دے۔ یہ سب اس لیے کہ حضرت یوسف ؑ کو اپنی بے گناہی کا یقین تھا اور وہ مطمئن تھے کہ نتیجہ لازماً ان کے حق میں ہو گا۔ کیونکہ سچائی چھپ نہیں سکتی' نہ اسے دیر تک چھپایا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم نے حضرت یوسف ؑ کی زبان سے لفظ رب استعمال کرایا ہے اور اسے مخاطب کی طرف مضاف کیا ہے (ربک)۔ اس لیے کہ حضرت یوسف ؑ کا رب تو اللہ ہے جبکہ اس فرستادے کا رب بادشاہ جس کے نظام حکومت کا وہ کارندہ ہے اس سے رب کا یہ مفہوم سامنے آتا ہے کہ حکمران بھی رب ہوتا ہے۔

اب یہ فرستادہ واپس ہوتا ہے' رپورٹ دیتا ہے' لیکن قرآن کریم کی درمیانی کڑیاں انسانی تخیل پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ تحقیقاتی مجلس کا منظر

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ

''اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا'' تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف ؑ کو رجھانے کی کوشش کی تھی؟''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر کے گھر کیا ہوتا رہا؟ پھر عورتوں نے اپنی مجلس میں جو گفتگو کی وہ پہلے ریکارڈ ہو چکی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی قوم پر خوشحالی آتی ہے تو اس کے اعلیٰ طبقات کی عورتوں میں اس قسم کی اخلاقی گراوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ان کا ماحول پسماندہ ہو' زیر بحث جاہلیت تو قدیم تاریخ کی جاہلیت ہے لیکن جاہلیت جس دور میں بھی ہو' وہ جاہلیت ہوتی ہے اور ہر جگہ اس کے خدوخال وہی ہوتے ہیں اور اس کے خوشحال

طبقات فسق و فجور میں ڈوب جاتے ہیں۔

اب شاہی دربار میں منعقد ہونے والی تحقیقاتی مجلس میں ان عورتوں کے لیے مقام نہ تھا کہ وہ کوئی اور جھوٹ تصنیف کریں۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ

"سب نے یک زبان ہو کر کہا "حاشاللہ 'ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا"۔

یہ حقیقت تھی 'اب ان کے لیے مشکل تھا۔یہ عورتیں نہایت ہی بدکار اور بے باک تھیں مگر معاملہ اس قدر واضح تھا کہ انکار کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔

اب وہ عورت سامنے آتی ہے جو یوسف ؑ کی محبت میں گرفتار تھی۔جو ان سے مایوس ہو گئی تھی لیکن وہ ان کے ساتھ وابستگی کو کاٹ نہ سکی تھی۔یہ عورت سامنے آتی ہے اور صراحت کے ساتھ اقرار جرم کرتی ہے اور یوسف ؑ کی پاکی کی بشارت دیتی ہے۔

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

"عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے 'وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی 'بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔

اب بلی تھیلے سے باہر آگئی ہے سچائی سامنے آگئی ہے۔میں ہی تھی جس نے اسے ورغلانے کی کوشش کی۔

اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَ صّٰدِقِيْنَ (۱۲ : ۵۱) "وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی 'بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔اس نے جس انداز میں شہادت دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اب بھی حضرت یوسف ؑ کی ہمدردی حاصل کرنے کی امید ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسف ؑ کے عقائد اور نظریات اس کے دل میں گھر کر گئے ہیں اور وہ ایمان لے آئی ہو۔اسی لیے وہ کہتی ہے :

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

"یہ اس لیے کہ عزیز مصر جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں 'اللہ ان کی چالوں کو کامیابی کی راہ پر نہیں ڈالتا"۔

اس اعتراف کو سیاق کلام میں اس طرح قلم بند کیا گیا ہے کہ اس کے پس منظر میں جذبات کا ایک طوفان نظر آتا

ہے'جس طرح اس سے قبل اس نے واضح اعتراف کیا اور نہایت ہی خوبصورت انداز میں ۔

اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ (۱۲ : ۵۱) "وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ بالکل سچا ہے"۔ یہ حضرت یوسف ؑ کی پاک دامنی اور مکمل براءت کی واضح شہادت تھی ۔ یہ شہادت اس نے بڑی جرأت سے دی اور اس کی کوئی پروا نہیں کی کہ اس کی ذات پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں ۔

کیا یہ عورت بادشاہ اور اس کے درباریوں کے ساتھ صرف سچائی کی خاطر شہادت دے دی؟ ہاں ایک دوسرا مقصد اور خواہش بھی اس کے دل میں ضرور ہے ۔ وہ یہ کہ یہ مومن شخص جسے اس نے جسمانی مقاصد کے لیے پھسلانے کی سعی کی تھی' اب اس شہادت اور اقرار پر اس کا احترام کرے ۔ کیونکہ جب وہ جیل میں غائب تھا تو اس کے بعد وہ ایمان لے آئی ہے ۔ یہ ہے مفہوم

ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ (۱۲ : ۵۲) "یہ کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کی"۔

اس کے بعد اس عورت کی طرف سے حالات کو درست کرنے کی مزید کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کہتی ہے

وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ كَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (۱۲ : ۵۲) "اللہ خیانت کرنے والوں کی سازشوں کو کامیاب نہیں کرتا"۔ یعنی یہ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے جسے حضرت یوسف ؑ پسند کرتے ہیں ۔

یہ ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے :

وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۵۳)

"میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کرتی' نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو' بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے"۔

یہ عورت محبت کرنے والی تھی ۔ یہ اس ذات کے ساتھ جاہلیت میں بھی جاہلانہ محبت کرتی تھی اور اب اسلام میں بھی اس کے ساتھ محبت کرتی ہے ۔ چنانچہ اس کی سرتوڑ کوشش ہے کہ وہ کسی طرح حضرت یوسف ؑ سے کوئی کلمہ خیر یا توجہ' یا خوشی حاصل کر لے ۔

یہ اس قصے میں انسانی جذبات کا عنصر ہے ۔ یہ محض فنکاری کی وجہ سے یہاں نہیں لایا گیا ۔ محض عبرت اور نصیحت

کے لیے اسے یہاں لایا گیا ہے۔اس لیے تاکہ اس کے ذریعے نظریات و عقائد کو پھیلایا جائے اور دعوت اسلامی کو وسعت دی جائے۔اس قصے میں جہاں جہاں انسانی جذبات' میلانات اور انسانی تخیل و وجدان کو لایا گیا وہ نہایت ہی نرم اور محبت بھرے اور خوبصورت انداز میں لایا گیا ہے۔ایسے انداز میں کہ تمام مؤثرات' تمام واقعات' تمام کرداروں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہو' اور جس ماحول کی طرف اشارہ ہو وہ قدرتی نظر آئے۔

یہاں آکر حضرت یوسف ؑ کے زمانہ اسیری کی مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔اب حضرت یوسف ؑ کو عزت و اقتدار دے کر آزمایا جائے گا۔انسان کے لیے ہر حال آزمائش۔

یہاں یہ پارہ اختتام کو پہنچتا ہے اور مزید واقعات اگلے پارے میں دیکھیں۔

بٹ گرام ۲ نومبر ۱۹۹۲ء

---ooo---

تفسیر فی ظلال القرآن

سید قطب شہیدؒ

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

☆ جلد اول	پارہ ۱ --- تا --- ۴	ہدیہ -/۲۵۰ روپے
☆ جلد دوم	" ۵ --- تا --- ۸	" -/۳۲۵ "
☆ جلد سوم	" ۹ --- تا --- ۱۲	" -/۳۲۵ "
☆ جلد چہارم	" ۱۳ --- تا --- ۱۹	۱۹۹۶ء میں مکمل
☆ جلد پنجم	" ۲۰ --- تا --- ۲۶	ہو جائے گی۔
☆ جلد ششم	" ۲۷ --- تا --- ۳۰	انشاء اللہ